پاکستانی ادب ۱۹۹۳ء

حصہ نثر

مرتبین

ڈاکٹر سلیم اختر
مسعود اشعر

اکادمی ادبیات پاکستان

اورنگ زیب قاسمی

پاکستانی ادب ۱۹۹۳ء

حصہ نثر

اورنگ زیب قاسمی

پاکستانی ادب ۱۹۹۳ء

حصہ نثر

مُرتّبین

ڈاکٹر سلیم اختر

مسعود اشعر

اکادمی ادبیات پاکستان

اس کتاب کے جملہ حقوق اکادمی ادبیات پاکستان کے نام محفوظ ہیں

نگران اعلیٰ : فخر زمان

مہتمم : افتخار عارف

تزئین و طباعت : طارق شاہد

سال اشاعت : ۱۹۹۳ء

تعداد : ایک ہزار

ناشر : اکادمی ادبیات پاکستان، ایچ ۸/۱، اسلام آباد

کمپوزنگ : کیپٹل کمپوزر اینڈ ڈیزائنرز، اسلام آباد

مطبع : کرسنٹ پرنٹرز، اسلام آباد

قیمت : مجلد: روپے

پیپر بیک: [illegible]/- روپے

ISBN 969 - 472 - 097 - 4

اورنگ زیب قاسمی

فہرست

تنقید

زاویے

اقبالیات

نعت

تذکرہ

تعزیت

گلوں کی خوشبو

داستان سرائے

افسانے

تنوع

طنز و مزاح

اورنگ زیب قاسمی

انشائیہ

رپورتاژ

سفرنامہ

تقاریر

تراجم

پشتو

پنجابی

سرائیکی

اورنگ زیب قاسمی

سندھی

پیش نامہ

۱۹۹۳ء کے مطبوعہ پاکستانی ادب کا انتخاب پیش خدمت ہے۔ اس سلسلہ مطبوعات کا آغاز ۱۹۹۰ء میں ہوا تھا اور یوں یہ اس سلسلے کی چوتھی پیشکش ہے۔

اس ضمن میں انتخاب و ادارت کے حوالے سے رشید امجد' منشا یاد' خالدہ حسین' شہزاد احمد' توصیف تبسم' آفتاب اقبال شمیم' قمر جمیل اور محمد اظہار الحق تعاون فرماتے رہے ہیں۔

۱۹۹۳ء کا انتخاب نثر ڈاکٹر سلیم اختر اور مسعود اشعر نے اور انتخاب شعر جاوید شاہین اور پروفیسر سہیل احمد خان نے مرتب کیا ہے۔

اکادمی ادبیات پاکستان کے گزشتہ تین برسوں کے انتخاب ادبی حلقوں میں بالخصوص اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے عمومی حلقوں میں جس انداز سے موضوع گفتگو بنے رہے اس سے ایک فوری یقین اس بات کا ہوتا ہے کہ ادب پڑھا جا رہا ہے اور اس پہ بات بھی ہو رہی ہے۔ کوئی بھی انتخاب ہو اس کو مکمل اور قطعی نہیں کہا جاسکتا۔ اختلاف کی گنجائش رہتی ہیں۔ معیار و میزان کے اپنے رخ سامنے آچکے ہیں کہ اس ضمن میں کسی ایک بات پر متفق ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

اخبارات و رسائل میں ان تحریروں کے حوالے سے بہت باتیں لکھی جاتی رہی ہیں۔ لکھی بھی جانی چاہئیں۔ ہم سے جہاں جہاں پہلے کوتاہیاں ہوئی تھیں اس میں اصلاح کی کوشش بھی کی گئی ہیں۔ غیر جانبداری سے معیاری نگارشات کا انتخاب مکمل طور پر مرتبین کی صوابدید پر ہے مگر ظاہر ہے کہ ان مرتبین کا انتخاب ہماری ذمہ داری ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے ہمیشہ ان لوگوں کی خدمات سے استفادہ کیا جائے جنہیں اہل علم میں اعتبار و امتیاز حاصل ہے۔ اب یہ انتخاب آپکے سامنے ہے اس یقین کے ساتھ کہ آپ کی نظر میں بھی یہ نگارشات "انتخاب" ٹھہریں گی۔

میں بے حد سپاس گزار ہوں اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشین اور ملک کے ممتاز ادیب جناب فخر زمان کا کہ انہوں نے اس انتخاب کے مختلف مراحل میں ہماری رہنمائی فرمائی اور یوں پاکستانی ادب ۱۹۹۳ء کی اشاعت کو ممکن بنایا جا سکا۔ قائم مقام افسر مطبوعات طارق شاہد بھی بجا طور پر داد کے مستحق ہیں جنہوں نے اس منصوبے کو بڑی محنت اور لگن سے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

افتخار عارف

اورنگ زیب قاسمی

پیش لفظ

افتخار عارف صاحب نے جب اکادمی ادبیات پاکستان کے لئے ۱۹۹۳ء کی نثر پر مبنی تحریروں کے انتخاب کی دعوت دی تو میں نے اس نوع کے انتخاب کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے نثر کو محض تنقیدی مقالات کے مترادف سمجھنے کے برعکس اور گلدستہ میں سے چند پھول چن لینے کے بجائے بھرے باغ سے سبد گل تیار کی! یوں منتخبہ مواد جب مناسب عنوانات کے تحت مرتب ہوا تو سال بھر کی نثر میں تحقیق' تنقید' فلسفہ' اساطیر' علمی مضامین' شخصیت نگاری' خود نوشت سوانح عمری' اداریہ' طنزو مزاح' سفرنامہ' انشائیہ' "ڈائری" الغرض ------ کے حوالہ سے اسالیب کے تنوع کو ------ ایک سال سے منسوب ہونے کے باوجود ------ پاکستانی نثر کے عمومی مزاج کا آئینہ دار اور پاکستانی اہل قلم کی سوچ کے متنوع زاویوں کا مظہر قرار دیا جاسکتا ہے۔

۱۹۹۳ء کا انتخاب عمومی طور پر پسند کیا گیا شاید اسی لئے افتخار عارف صاحب نے ۱۹۹۳ء کی نثر کے لئے انتخاب کا فریضہ پھر سونپا جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں اس لئے بھی کہ گزشتہ کی مانند اب بھی انہوں نے کسی طرح کی دخل اندازی نہ کرکے آزادانہ انتخاب کرنے دیا۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی گزشتہ طرز انتخاب ملحوظ رکھتے ہوئے ۳۴ جرائد میں مطبوعہ ۶۲ اہل قلم کے نثر پارے پیش ہیں۔ اس ضمن میں تقریباً" سبھی قابل ذکر (بلکہ ناقابل ذکر بھی) جرائد پیش نظر رہے۔ کسی جریدہ میں مطبوعہ تحریر کی عدم شمولیت کا مطلب جریدہ کا غیر معیاری ہونا نہیں کہ یہ تو نگاہ فتنہ ساماں کا قصور ہے' جس کے لئے مرتب کی معذرت!

دونوں مرتبہ ایک الجھن بھی رہی۔ بعض اوقات طوالت کی بنا پر کسی اچھے مقالہ سے صرف نظر کرنا پڑا تاکہ تیس صفحات کے ایک مقالہ کے بجائے تین مقالات شامل ہو سکیں۔ انتخاب میں اپنی تحریر شامل کرنا مرتب کا حق سمجھا جاتا ہے اور ہر مرتب یہ حق فیاضی سے استعمال بھی کرتا ہے مگر میں بدرضا و رغبت اور بلا جبر و اکراہ اس حق سے دستبردار ہوا تاکہ میرے بجائے کسی اور کا اچھا مقالہ چھپ جائے۔ فوٹو گرافر کی خوشی اچھا گروپ فوٹو اتارنے میں ہوتی ہے نہ کہ خود گروپ کا حصہ بننے میں۔ میں بھی آپ سے اچھے گروپ فوٹو کی داد چاہوں گا۔ اتنی سی تعلی کی اجازت تو ہے نا؟

سلیم اختر

ابتدائیہ

۱۹۹۳ء کے افسانوں کا انتخاب میں نے کیا ہے کہ اس سال قرعۂ فال میرے نام نکلا تھا۔ اب شاید یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ ہر انتخاب لا محالہ انتخاب کرنے والے کی اپنی پسند ہی ہوتا ہے اس لئے میں اس کے لئے کوئی عذر پیش نہیں کروں گا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ پچھلے سال جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب میری نظر سے گزر جائے اس کے لئے سلیم اختر صاحب نے بھی میری مدد کی ہے کہ جو رسالے میرے پاس نہیں تھے وہ ان سے مل گئے لیکن اگر کوئی افسانہ اس کے بعد بھی میری نظر سے نہیں گزر سکا تو میں اس کے لئے معافی کا طلب گار ہوں۔

میری عادت ہے کہ میں ہر رسالے میں سب سے پہلے افسانہ ہی پڑھتا ہوں اور اچھے برے سارے ہی افسانے پڑھ ڈالتا ہوں یہ سوچ کر کہ شاید کہیں کوئی اچھی چیز مل جائے۔ اب ان افسانوں سے انتخاب کرنے کے لئے ان پر دوبارہ نظر ڈالنا پڑی تو یہ تلاش کرنے کی کوشش بھی کی کہ کیا اس سال ہمارے افسانے میں کوئی نیا رجحان کوئی نیا موضوع یا کوئی نیا اسلوب سامنے آیا ؟ موضوع کی حد تک تو کہا جا سکتا ہے کہ قومی اور بین الاقوامی سیاست ہمارے کئی افسانہ نگاروں کا موضوع بنی اور کشمیر اور بوسنیا تک کی صورت حال پر افسانے لکھے گئے لیکن جہاں تک اسلوب اور سٹائل کا تعلق ہے بیانیہ کی طرف مراجعت کا وہ عمل جو گذشتہ دو تین سال سے سامنے آ رہا ہے اسی طرح جاری رہا۔ ایک دو افسانہ نگار تجریدی اور علامتی انداز میں اب بھی لکھ رہے ہیں لیکن ان کا یہ انداز بھی بیانیہ کے ہی زیادہ قریب ہے ۔ یہاں میں یہ بات واضح کر دوں کہ میں اسے کہانی کی واپسی نہیں کہتا کیونکہ کہانی تو افسانے سے کبھی گئی ہی نہیں تھی ۔ تجرید میں بھی کہانی ہی بیان کی جاتی ہے۔

بیانیہ کیوں واپس آ رہا ہے ؟ اس سوال پر پاکستان کے کسی افسانہ نگار یا نقاد نے ابھی تک غور کرنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی۔ اتفاق سے انہی دنوں میں نے نیویارک ریویو آف بکس میں اسمٰعیل مرچنٹ کی تازہ فلم THE REMAINS OF THE DAY پر ایک صاحب ایان بروما (IAN BURUMA) کا تبصرہ پڑھا۔ اگر آپ نے کازوو اشی گرو (KAZUO ISHIGURO) کا وہ ناول پڑھا ہے جس پر یہ فلم بنائی گئی ہے تو آپ کو بخوبی علم ہو گا کہ وہ ناول خالص وکٹورین انداز میں لکھا گیا ہے ۔ (ناول کی خوبصورت زبان اور شائستہ انداز کی وجہ سے میں نے اسے دوبار پڑھا ہے۔) اس پر جو فلم بنائی گئی ہے وہ بھی بقول بروما کے کہ " اگر وکٹورین لوگ فلم بناتے ہوتے تو ایسی ہی بناتے ۔" اس فلم کو آسکر انعام تو نہیں ملا البتہ آسکر کے لئے اس کا نامزد ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک شاندار فلم ہے۔ بروما صاحب نے اس پر لکھا ہے۔ " شاید یہ رد عمل ہے ساٹھ اور ستّر کی دہائی کی خود پسندی اور تنگ چڑھے پن کے خلاف مگر آج ہم ایک رجعتی

اورنگ زیب قاسمی

(یا مراجعتی) دور میں آ گئے ہیں ۔ اس دور میں وکرم سیٹھ کا ساڑھے تیرہ سو صفحے کا " نو وکٹورین ناول " (AHSUITABLE BOY) سامنے آ رہا ہے' نو وکٹورین موسیقی (گوریک) سنائی دے رہی ہے اور نو وکٹورین اخلاقیات کا بول بالا ہو رہا ہے(امریکہ میں خاندانی رشتے دوبارہ جوڑنے کی تحریک چل رہی ہے اور اقوام متحدہ نے اس سال کو خاندانی اقدار کا سال قرار دیا ہے۔)"

اشی گرو کے ناول کو اگر ۱۹۸۹ء کا سب سے بڑا برطانوی ادبی انعام " بکر پرائز" ملا تو وہ اس کا حق تھا لیکن وکرم سیٹھ کے ناول نے خاص ادبی حلقوں میں جو شہرت پائی اور جسے بکر پرائز ملتے ملتے رہ گیا وہ غالباً" اس رد عمل کا نتیجہ ہے' جس کا ذکر بروما صاحب کر رہے ہیں ۔ مجھ سے پوچھیں تو اس ناول کے واقعات در واقعات اور جزوئیات در جزوئیات نے مجھے ایسا بیزار کیا ہے کہ پچھلے پانچ مہینے سے میں اسے پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور ابھی تک مکمل نہیں کر سکا۔ پڑھتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں' پھر کچھ دن بعد پڑھنے لگتا ہوں کہ آخر اس میں ہے کیا کہ اسے پسند کیا گیا!

یہاں میں نے یہ بحث اس لئے چھیڑی ہے کہ شاید ہمارے نقاد بھی اس صورت حال پر غور فرمائیں کہ بیانیہ ہمارے ہاں بھی واپس آ گیا ہے۔ ویسے تو ہم ایسی بحث اس وقت شروع کرتے ہیں جب مغرب میں ان کا جنازہ اٹھ رہا ہوتا ہے۔

بہرحال یہ انتخاب پیش خدمت ہے۔ اس کا سارا گناہ ثواب میرے سر ہے۔

مسعود اشعر

تنقید

اورنگ زیب قاسمی

ادیب سہیل

اردو کا پہلا ڈراما؟

کسی فن پارے کو اولیت دینے کی خاص عینک نے ناقدین کو بڑے گھپلے میں ڈال رکھا ہے صرف یہی نہیں ناقدین اس کی وجہ سے ایک تنگ دائرے میں چکر کاٹنے لگے۔ اور انھیں ایک بڑے عرصے تک اپنے دائرے سے نکل کر باہر دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ یہ روایت تحقیق کے میدان میں کسی نہ کسی عنوان اب بھی چلی آتی ہے ' جس کے نتیجے میں بہت سے اہل قلم کی حق تلفی ہوئی ' اس کے ساتھ ہی قارئین و ناظرین تک غلط اطلاعات پہنچتی رہیں۔ محققین حضرات نے اس راہ میں تلاش و جستجو کے بجائے اگلے ہوئے نوالے پہ اکتفا کیا۔ ان کے مبلغ علم کا انحصار دوسروں پر رہا۔ اس طرح خود مشقت کھینچنے کے بجائے مکھی پہ مکھی بٹھانے کی روایت کی ہمت افزائی ہوئی اور تن آسانی کو فروغ حاصل ہوا۔

میدان تحقیق میں ایک اور رسم یہ چلی کہ ڈرامے کی اولیت کا سہرا کون باندھے اور کس کے سر باندھا جائے' اس تگ ودو میں ہر ناقد نے اپنی سی کی۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے سلطان واجد علی شاہ کی تحریر " رادھا کنہیا کا قصہ " کو اردو کا پہلا ڈرامہ قرار دیا' پھر خود ہی اپنے فیصلے کو بدل کر انھوں نے آغا حسن امانت لکھنوی کے " اندر سبھا (۱۸۵۳ء) کو اردو کے پہلے ڈرامے کا اعزاز بخشا' ان سے آگے نکل کر " ناٹک ساگر " کے مصنفین " نور الہی و محمد عمر نے " اندر سبھا " کو اردو ڈراما کا باوا آدم کہا۔

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی " اردو تھیٹر " (چار جلدوں میں) کے مصنف کا خیال ہے کہ ۱۸۵۳ء میں بمبئی میں کھیلا جانے والا ڈراما گوپی چند جالندھر (گجراتی سے منتقل شدہ) اردو کا پہلا ڈراما ہے۔

ڈاکٹر مسیح الزماں بہرام جی فریدوں جی کے ڈراما " خورشید " کو اردو کا پہلا ڈراما کہتے ہیں ۔ یہ ۱۸۷۱ء میں اسٹیج ہوا اور گجراتی سے اردو میں منتقل کیا گیا تھا۔ اس کے مکالمے نثر میں ہیں۔

پٹنہ (صوبہ بہار) میں ۱۸۷۳ء میں ایک اردو ڈراما " سجاد سنبل " لکھا اور کھیلا گیا۔ اس کے مصنف کیشورام بھٹ ہیں ' یہ سرتاسر نثر میں ہے ' " بہار میں اردو اسٹیج ... " کے مصنف پروفیسر سید حسن نے " سجاد سنبل " کو اردو کا اولین ڈراما کہا ہے' کیشورام بھٹ نے دو اور اردو ڈرامے بھی لکھے ہیں ۔ ایک " شمشاد سوسن " دوسرا " اندھوں کو آنکھ " ۔ "شمشاد سوسن" نایاب ہے ۔ لیکن " اندھوں کو آنکھ " (۱۸۸۰) میری تحویل میں ہے اس پر میرا مقالہ انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی جریدہ " اردو " ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ کیشورام بھٹ کے یہ دونوں ڈرامے (سجاد سنبل اور اندھوں کو آنکھ) نثر میں لکھے گئے ہیں۔

ممتاز منگلوری نے ڈھاکہ کے ایک مصنف نواب سید محمد آزاد کے ڈرامے " نوابی دربار " کو اردو کا

پہلا ڈرامہ کہا ہے یہ " اودھ پنچ " لکھنؤ میں سلسلہ وار چھپا تھا۔ اس کا زمانہ اشاعت ۱۸۷۶ء ہے۔

ڈھاکہ ہی میں سید واقر حسین نے ایک ڈراما " بیمار بلبل " تحریر کیا۔ جس کو ڈرامے کے مشہور نقاد عشرت رحمانی اردو کا پہلا ڈراما کہتے ہیں ۔ بیمار بلبل کو اردو کا پہلا ڈراما کہنے کا سبب وہ مغالطہ ہے جو اس کے سال تصنیف سے پیدا ہوا ہے انہوں نے اپنی تصنیف "اردو ڈراما کا ارتقاء" میں اس کی سال تصنیف ۱۸۵۹ء بتائی ہے ہم ان کی اس دریافت کو یکسر رد بھی نہیں کر سکتے کیونکہ " بیمار بلبل " ۱۸۸۰ء کا جو نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن اور خود میری تحویل میں ہے ' اس سے عشرت رحمانی کے محولہ نسخے کے کرداروں کے نام اور کہیں کہیں متون میں فرق ہے ان دنوں بنگال (کلکتے اور ڈھاکہ) بہار 'بمبئی اور مدراس میں نثری ڈراموں کا رواج تھا اور وہ تکنیک کے اعتبار سے انگریزی روایت سے مطابقت رکھتے تھے ۔ صرف لکھنؤ میں ڈرامے کی روایت منظوم تھی 'اوپیرا جیسی۔ اردو میں اس طرح کے ناٹک کی مثال " اندر سبھا " ہے ۔

" اندر سبھا" کو خود اس کے مصنف آغا امانت لکھنوی نے رہس یا جلسہ کہا ہے ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے اپنی کتاب اردو تھیٹر (چار جلدوں میں) مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں اسے رہس کے باب میں شامل کیا ہے۔

بنگال میں جو اردو ڈرامے ۱۸۵۷ء کے بعد لکھے گئے ہیں " صولت عالمگیری "،"نوابی دربار " اور "بیمار بلبل " نمایاں ہیں ۔ یہ تینوں ڈرامے ۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۰ء کے دوران منظر عام پر آئے۔ اول الذکر دوڈرامے یعنی " صولت عالمگیری " اور " نوابی دربار " سر تا سر نثری ہیں البتہ " بیمار بلبل " میں نثر کے ساتھ نغموں کا التزام بھی "اندر سبھا" کے طرز پر رکھا گیا ہے ۔ ہر نغمے کے ساتھ اس راگ اور تال کا بھی اندراج ہے جس میں وہ بندھا ہوا ہے ۔ اس کے مصنف سید واقر حسین نے دیباچے میں اسے پہلا نثری ڈرامہ کہا ہے۔

بنگال کے تینوں اولین ڈراموں کے مصنفین انگریزی سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ " صولت عالمگیری" کے مصنف ابوالفضل الفیاض نے اس کے دیباچہ میں ' شیکسپیئر اور ابسن کا حوالہ دیا ہے۔ جس سے اس بات کا ثبوت بہم ہوتا ہے کہ " صولت عالمگیری" کے مصنف کی رسائی انگریزی ڈراموں تک تھی۔

" بیمار بلبل " کے مصنف سید واقر حسین ڈرامانگار ہونے کے ساتھ ساتھ اردو فارسی اور انگریزی کے شاعر بھی تھے اور " نوابی دربار" کے مصنف نواب سید محمد آزاد کے انگریزی مضامین کلکتے کے اخباروں میں چھپا کرتے تھے۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ تینوں اولین ڈراموں ("صولت عالمگیری"،" نوابی دربار "،" بیمار بلبل") کے مصنفین کی حیثیت بنگالے کی تھی ان کی مادری زبان بنگلہ تھی ۔ لیکن ان سب نے ڈرامے اردو میں لکھے ۔ بنگال کی مادری زبان بنگلہ ہوتے ہوئے بھی ڈھاکہ خاص کی بول چال کی زبان ایک طرح کی اردو ہی تھی ' جو " کلکتیہ اردو " کے عین مشابہ تھی اسے عرف عام میں " ڈھکیہ "کہا جاتا تھا ۔ بنگلہ دیش کے دیگر علاقوں سے زبان کے معاملے میں ڈھاکہ کا یہ فرق اپنے پیچھے ایک تہذیبی تاریخ بھی رکھتا ہے۔ ڈھاکہ کی خاص آبادی کا رہن سہن علاوہ طریق طعام و قیام اور تہذیب و معاشرت بھی بنگال سے جداگانہ ہے۔ ڈھاکہ کی یہ آبادی کئی نسلوں سے ان لوگوں پر مشتمل ہے ' جن کے آباء و اجداد مغل دور میں پچھم سے آکر آباد ہوئے ' ان میں فوجی بھی تھے ' مختلف پیشے سے تعلق رکھنے والے بھی تھے اور وہ ہزاروں سرکاری عمال بھی تھے جو ڈھاکہ میں مغل بادشاہ کے مفادات کی دیکھ بھال کے لئے مامور تھے۔

اورنگ زیب قاسمی

۱۸۵۷ء کے بعد بنگال اور بہار میں لکھے جانے والے ڈرامے پریوں کے دیس کی سیر نہیں کراتے ' ان کا تعلق زمین سے ہے ' ان کے موضوعات اس وقت کے سماج کی نمائندگی کرتے ہیں مواد اور پیش کش کے اعتبار سے بھی جدید ہیں ' مثال کے طور پر " بیمار بلبل " میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ اسی برس کا بوڑھا ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ لیکن یہ شادی ناکام رہتی ہے ۔ یہ ڈراما انمل بے جوڑ شادی پر ایک بھرپور احتجاج ہے!

نواب سید محمد آزاد کا ڈراما " نوابی دربار " لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کے انحطاط کا نقشہ کھینچتا ہے ۔ جب سلطان واجد علی شاہ انگریز کے ہاتھوں جلا وطن ہو کر ۱۸۵۶ء میں کلکتہ پہنچ چکے تھے ۔ معاشرہ معاشی اور معاشرتی 'دونوں اعتبار سے زوال کی لپیٹ میں آچکا ہے اور اس کا کوئی والی وارث نہیں رہا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر میں جو اردو ڈرامے لکھنے کی تحریک شروع ہوئی اس کا محرک مشرق اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور جنوب میں فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ ہی اس کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اردو کتب کی تصنیف و تالیف اور تراجم کے کام کا آغاز کروایا' اس کے لئے ایسے صاحبان علم کی خدمات حاصل کیں جو بیک وقت ایک سے زائد زبانوں پر دسترس رکھتے تھے ۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کے ارباب اقتدار کالج سے متعلق اور غیر متعلق منشی یا صاحبان قلم کو تصنیف و تالیف کی جانب راغب کرنے کے لئے انعام و اکرام سے بھی نوازتے تھے ۔ مدراس کے گورنر سرہنری پاٹینجر (SIR HENRY POTTINGER) صاحب بہادر سپریم گورنمنٹ کے حکم کے مطابق دو زبانوں یا زیادہ زبانوں کو سیکھ کر امتحان پاس کرنے والے کو یکمشت ایک ہزار روپے کا انعام دیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر گلکرسٹ کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اردو ادب میں ڈرامے کی کوئی روایت نہیں ' اس کا یہ خانہ یکسر خالی ہے ۔ چنانچہ انہوں نے ایک منصوبے کے تحت اس سمت میں پیش رفت کا قصد کیا۔ اور اس مقصد کے لئے انہوں نے ۱۸۰۱ء میں کاظم علی جوان اور للو لال جی کی مدد سے ترجمت نواز کالی داس کے مشہور ناٹک " شکنتلا " کو آسان اردو میں منتقل کرایا۔ اردو ڈراما کے ایک محقق ڈاکٹر افضال الدین اقبال (پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی دکن) کے مطابق کالی داس کا یہی ڈراما اردو ڈراما نگاری میں حرف آغاز ثابت ہوا۔ بعدازاں اسی مترجم ڈرامے نے نواب واجد علی شاہ کے رہس امانت لکھنوی کے اندر سبھا اور دیگر اندر سبھاؤں کے لئے راستہ ہموار کیا۔

اسی تسلسل میں جب ہم دو ڈھائی سو برس پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ فورٹ سینٹ جارج جس کا ابھی اوپر ذکر ہوا ہے ' وہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے عمر میں ۸۳ سال بڑا ہے گورنر جنرل لارڈ ولیسلی کے حکم سے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اور گورنر مدراس جوزف کلکٹ (JOSEPH COLLECT) نے ۱۸۱۲ء میں فورٹ سینٹ کالج اسکول کی بنیاد رکھی جو عرف عام میں رائٹرس کالج بھی کہلاتا تھا۔ دکن میں اردو کی ترویج و اشاعت اور اردو ادب کی تصنیف و تالیف کا کام اسی کالج کے ذریعے ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں اسے یہ اختصاص بھی حاصل تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہ پہلا تعلیمی ادارہ تھا جہاں جونیئر انگریز ملازمین (رائٹرس) کو اردو اور فارسی اور دوسری زبانوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ اور انہیں

اس قابل بنایا جاتا تھا کہ جن لوگوں سے دوران کلام ان کا سامنا ہو ان کی زبان سے یہ اچھی واقفیت رکھتے ہوں ' اسی لئے فورٹ ولیم اور فورٹ سینٹ جارج کالج کے کچھ انگریز طلباء کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو فارسی اور اردو میں نہایت اعلیٰ دسترس کے ساتھ ' اردو فارسی شعر کہتے اور ان زبانوں میں شعر کہنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔

فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کا تعلیم یافتہ ایسا ہی ایک انگریز کیپٹن گرین آوے تھا جس نے ۱۸۵۲ء میں " علی بابا چالیس چور " کے نام سے اردو میں ایک نثری ڈراما تحریر کیا اور اسے تعلیم الاخبار پریس سے منشی سید حسین اور غلام حسین اینڈ کمپنی مدراس کے زیر اہتمام چھپوایا۔ ان دنوں کیپٹن گرین آوے چھیالیسویں رجمنٹ میں تعینات تھا۔ اس ڈرامے کے مطالعے سے اس کی دکنی اردو یا اردو پر دسترس کا تو پتہ چلتا ہی ہے اس کے ساتھ اس بات کی سند بھی حاصل ہوتی ہے کہ وہ شاعر تھا۔ اس نے " علی بابا چالیس چور " میں دو غزلیں بھی لکھی ہیں ۔

تقریباً سوا سال بعد اس ڈرامے (علی بابا چالیس چور) کو ڈاکٹر افضل الدین اقبال صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن نے دریافت کیا ۔ اور تفصیلی تعارف کے ساتھ ۱۹۸۳ء میں اسے کتابی صورت میں چھاپ دیا ۔ ڈاکٹر افضل الدین کو یہ ڈراما پروفیسر محبوب سابق اسسٹنٹ پروفیسر اردو نیو کالج مدراس کے خاندانی کتب خانے سے دستیاب ہوا۔

ڈاکٹر افضل نے اس کتاب کا نام " اردو کا پہلا نثری ڈراما اور کیپٹن گرین آوے " رکھا ہے ۔ کتاب کی ضخامت کل ۵۶ صفحات (مروجہ کتابی سائز) ہے۔ ۱۹ صفحات پر ڈرامے کا متن ہے اور باقی صفحات میں ڈراما سے متعلق عمومی مباحث ہیں ۔ جن کے خاص خاص عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اردو کے ابتدائی ڈرامے اور ان کی حقیقت
۲۔ اردو ڈرامے کے ارتقاء میں اہل یورپ کا حصہ
۳۔ ڈرامہ کی توسیع میں پرتگیزوں کا حصہ
۴۔ فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس
۵۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ
۶۔ اردو ڈرامے کے ارتقاء میں فورٹ ولیم کالج اور فورٹ سینٹ جارج کالج کا حصہ
۷۔ اردو میں ڈرامے کی ابتداء
۸۔ اردو کا پہلا نثری ڈرامہ۔ " علی بابا چالیس چور"
۹۔ اردو کا پہلا ڈرامہ نگار۔ کیپٹن گرین آوے
۱۰۔ ڈرامہ " علی بابا چالیس چور " کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے ان سب عنوانات کے تحت نہایت اختصار کے ساتھ بحث کی ہے لیکن سند کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے ۔ ان تمام عنوانات کے تحت جو مباحث سامنے آتے ہیں ان سے اردو ڈرامے کے آغاز وارتقا اور اس کے محرکات کی ایک واضح تصویر نظر کے سامنے پیش ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر افضل الدین اقبال کی مرتبہ اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے کئی طرح کے سوالات ذہن میں ابھرتے

اورنگ زیب قاسمی

ہیں ۔ جب برصغیر پاک و ہند میں شائع ہونے والی قدیم ڈراموں کی کتب تک رسائی زیادہ مشکل نہیں تو پھر کیوں وہ علاقے مسلسل نظر انداز ہوتے آرہے ہیں ' جہاں ڈرامے کا چرچا زیادہ رہا ہے' میری مراد بنگال اور بہار سے ہے۔ اس کے بارے میں کچھ یقین سے کہنا تو مشکل ہے لیکن تساہل ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ڈاکٹر افضل الدین اقبال بھی ڈرامے کی تلاش میں بنگال میں لکھے جانے والے ابوالفضل الفیاض کے ڈرامے " صولت عالمگیری " تک ابراہیم یوسف کے توسط سے تو پہنچ گئے ۔ لیکن ان کی رسائی نواب سید محمد آزاد " نوابی دربار " (۱۸۷۶ء) اور سید واقر حسین (مقیم ڈھاکہ) کے ڈرامے " بہار بلبل " (۱۸۸۰ء) تک نہ ہو سکی ۔ اور بہار میں لکھے گئے ڈرامے " سجاد سنبل " (۱۸۷۳ء) " شمشاد سوسن " اور "اندھوں کی آنکھ " ۱۸۸۰ء تک تو سرے سے ان کی رسائی ہی نہیں ہو پائی ۔ یہ سب کے سب اپنے دور کے مقبول ڈرامے ہیں ۔ یہ اردو ڈرامے نہ صرف نثری روایت کا حرف آغاز ہیں بلکہ اردو میں جدید ڈرامے کا آغاز بھی کہے جاسکتے ہیں۔

ان علاقوں کے ڈراموں کے نظر انداز ہونے یا انہیں نظر انداز کئے جاتے رہنے کی روایت بہت پرانی ہے ڈاکٹر عبدالعلیم نامی اور ڈراموں کے دیگر اہم ترین محققین بھی اس سلسلے میں یہی کچھ کرتے آرہے ہیں ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ادبی و تاریخی حقائق ان دیارے محققین کی نظر سے کس طرح اوجھل ہوجاتے ہیں ' تو اس کا ایک سیدھا سادا معصوم سا جواب تو یہ ہے کہ محققین کی رسائی ان ڈراموں تک نہیں ہو پاتی ' لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عام طور پر ہماری تحقیق کا مدار لکھے ہوئے کو لکھنے اور کہے ہوئے کو کہنے پر ہے چنانچہ ایسے محققین کو اس دائرے سے باہر نکلنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی جو ایک عرصے سے اس میں چکر کاٹ رہے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ عرصہ دراز تک انہیں دائرے کے باہر کا علم ہی نہیں ہوپاتا۔ مثال کے طور پر (اگرچہ اس بات کا ذکر ایک بار پہلے بھی اپنے کسی مضمون میں کیا ہے) " نوابی دربار " کو اردو کے بڑے بڑے صاحبان علم و نقد و تحقیق' چکبست سے لے کر رام بابو سکسینہ' علی عباس حسینی اور ان سے آگے بھی ناول کہتے چلے آرہے تھے ان میں سے کسی نے بھی " نوابی دربار " میں عبدالغفور شہباز عظیم آبادی کا دیباچہ پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی جس میں اس امر کا صاف اعلان ہے کہ ڈرامہ " نوابی دربار " فسانہ مکالمت ہے جسے آج کی زبان میں ڈراما کہتے ہیں۔

ایک اور رویہ جو تساہل ناقدین و محققین میں قائم ہے وہ یہ کہ شاعری کا ذکر ہو یا ناول اور ڈرامے کا ذکر ہو' گاڑی ایک دبستان سے چلتی ہے اور دوسرے دبستان پر آکر رک جاتی ہے ' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں یا اس سے آگے ریلوے ' مستقر کا وجود ہی نہیں ہے ' حالانکہ مشرق میں ریلوے لائنیں کلکتہ تک مغرب میں لاہور تک اور جنوب میں حیدر آباد دکن تک گئی ہیں۔ چلو پرانے لوگوں نے کسی بھی سبب سے حقائق سے چشم پوشی کو شعار بنائے رکھا لیکن کیا ضرور ہے کہ آج کا ناقد و محقق بھی مکھی پر مکھی بٹھانے کی روش کو اپنائے رکھے اور ناموں کے گنانے کے باب میں ایک خاص قسم کا رٹا لگائے۔ تنقید و تحقیق کا ذکر ہو تو سرسید ' حالی اور شبلی ناول کی بات چلے تو ڈپٹی نذیر احمد " آگے آیئے حالانکہ ڈپٹی نذیر احمد کے " مراۃ العروس" (۱۸۶۹ء) سے تقریباً ۷۷ سال پہلے سید حسن شاہ کا ناول " نشتر" (۱۷۹۳ء) منظر عام پر آچکا تھا اور اپنے زمانے اور بعد کے زمانے میں ایسا گمنام بھی نہیں رہا ہے ۔ پھر " مراۃ العروس " سے ٹھیک" تین چار سال بعد " تین جلدوں میں شاد عظیم آبادی کا ناول " " صورت الخیال" شائع ہوچکا تھا جو جدید ناول کے تمام تقاضے پورے

کرتا ہے۔

کم سے کم ناقدین اور محققین کو تو ایسے رویے سے اب باز آجانا چاہیے اور تلاش و تحقیق میں گھر سے گھر تک کے انداز نظر کو ترک کرنا چاہیے اس انداز نظر سے ماضی میں جو تحقیق کا نقصان ہوا' اب اس کی تلافی کی ایک ہی صورت ہے کہ گھر سے باہر دور دور تک سفر کی زحمت اٹھائیں۔

پچھلے دنوں ڈرامے کے باب میں دو تین مضامین دیکھنے میں آئے۔ ان میں سے اکثر نئی نسل کے لکھنے والوں کے ہیں۔ لیکن وہ بھی ڈرامے کے آغاز کا سرا "اندر سبھا" کے سر منڈھ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ڈاکٹر افضال الدین کے دریافت کردہ ڈرامے "علی بابا چالیس چور" (۱۸۵۲ء) کو شائع ہوئے بھی دس بارہ برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔

ڈاکٹر محمد افضال الدین اقبال کی دریافت "علی بابا چالیس چور" نے یہ مسئلہ سردست حل کر دیا ہے کہ اردو کا پہلا ڈراما کون سا ہے؟ جب تک کوئی اور اردو ڈراما اس سے پہلے کا لکھا اور چھپا ہوا دریافت نہیں ہو جاتا اولیت کا مستحق "علی بابا چالیس چور" ہے کیونکہ یہ اندر سبھا(۱۸۵۳ء) سے دو سال بڑا ہے' اس کا سال اشاعت ۱۸۵۲ء ہے' ناقدین حضرات کو چاہیے کہ اولیت کی سند تفویض کرنے کے چکر سے نکل کر اس طرف دھیان دیں کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جو ڈرامے لکھے گئے اس میں حسن و قبح کیا ہیں؟ اور وہ جدید ڈرامے کے معیار پر کہاں تک پورے اترتے ہیں' اب سالہا سال تک اڑائی جانے والی اس دھول پر پانی ڈال دینا چاہیے جو "اندر سبھا" کو اول ثابت کرنے کے لئے اڑائی جاتی رہی ہے۔

کتابیات

۱۔ اردو تھیٹر (چار جلدوں میں) از ڈاکٹر عبدالعلیم نامی
۲۔ بہار میں اردو ڈراما اور اسٹیج از پروفیسر سید حسن
۳۔ "صولت عالمگیری" از ابوالفضل الفیاض
۴۔ "بیمار بلبل" از سید وافر حسین
۵۔ "نوابی دربار" از سید محمد آزاد
۶۔ "علی بابا چالیس چور" از کیپٹن گرین آوے

("صریر" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

کلامِ غالب میں لفظ "تمنا" کی تکرار بطور استعارۂ فلسفہ آثار

کسی شاعر کی تفہیم اور اس کے ذہن کی گرہ کشائی میں' اس کے یہاں شعوری یا لاشعوری طور پر استعمال ہونے والے بعض الفاظ و استعارات کی تکرار بہت اہم کردار ادا کرتی ہے خصوصاً "غالب جیسے پرپیچ دہ کار شاعر کی تفہیم کے سلسلے میں جس کا دعویٰ یہ ہو کہ:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

مطالعے کا یہ طریقہ کار کلیدی حیثیت اختیار کر لیتا ہے چنانچہ جب اس خاص زاویے سے غالب کے دیوان پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ایک سادہ سے لفظ "تمنا" کا استعمال ان کے فکر و فن کے بعض بہت اہم نکتوں اور بنیادی رویوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ چنانچہ ان کی سرشت مزاج کا وہ خاص پہلو جو انہیں بہ ہرگام و بہ ہر روش جدت پسند و فلسفہ طراز' مستقبل بیں و فردا شناس' خودبیں و آزادہ رو' ہر لحظہ متغیر و متجسس' اندیشہ ہائے دور و دراز میں غلطاں اور مشاہدہ حق کی گفتگو میں از خود رفتہ بنائے رکھتا ہے' دراصل لفظ "تمنا" میں پوشیدہ ہے' اور ان کا طرز فکر جس طرح لفظ "تمنا" سے ابھر کر ہوتا ہے کسی دوسرے لفظ سے نہیں ہوتا۔ گویا "تمنا" کا لفظ غالب کے یہاں محض وسیلہ حسن تکرار نہیں بلکہ معنی کی سطح پر ایک استعارۂ فلسفہ آثار بھی ہے۔ اس لفظ سے سراغ لگتا ہے کہ ان کے اکثر افکار و خیالات جنہیں عموماً "منتشر سمجھا جاتا ہے وہ منتشر نہیں ہیں بلکہ ایک خاص فکری رشتے میں جڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت اسی ایک لفظ یعنی لفظ "تمنا" کے حوالے سے غالب اور کلام غالب کا مطالعہ مقصود ہے۔

"تمنا" کا لفظ اصلاً" عربی اور تفعل کے باب میں تمنی بلکہ تمنی ہے اور فعل لازم اور فعل متعدی دونوں کی خصوصیات رکھتا ہے۔ م ن ی اس کا مادہ ہے مصدری صورت میں اس کے معنی ہیں توفیق دیا جانا' امتحان لیا جانا' انتظار کرنا اور ارادہ کرنا' خواہش کرنا' خواہش مند ہونا' آرزو کرنا اور آرزو مند ہونا' اسم کے معنی میں آرزو' خواہش' طلب' اشتیاق اور شوق وغیرہ اس کے مترادف ہیں۔ اردو میں بھی عموماً" انہی معنوں میں مستعمل ہے کبھی یکسر سادہ معنی رکھتا یعنی "تمنا ہے" یا "تمنا رکھتا ہے" کا عام مفہوم یہ ہے کہ "جی چاہتا ہے" لیکن اکثر جگہ اس میں شدت آرزو کا مفہوم پایا جاتا ہے یعنی کسی چیز کی شدید خواہش' شدید آرزو' انتہائی آرزو' حد درجے کی خواہش' نہایت درجے کی طلب' خواہش پیہم' نہ ختم ہونے والی آرزو' سراپا آرزو' سراپا شوق و اضطراب۔ گویا سراپا آرزو اور سراپا طلب ہونے کا نام تمنا ہے۔ علامہ اقبال نے "حرف تمنا" کو فلسفہ و شعر دونوں کی حقیقت سے موسوم کیا ہے۔ بال جبریل میں شامل ان کی نظم "دعا" کا مشہور شعر

ہے:

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

فلسفہ و شعر کو " حرف تمنا" کہنے سے غالباً علامہ کی مراد یہ ہے کہ آرزوئے دل کا کماحقہ اظہار ' خواہ فلسفے کے ذریعے ہو یا شاعری کے ذریعے ممکن نہیں ہے' اول تو الفاظ ' اس کے اظہار کے متحمل ہی نہیں ہو سکتے اور بالفرض ایسا ہو بھی تو " حرف تمنا" کی تشریح و تفسیر کا پورا حق ' الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا' وجہ غالباً یہ ہے کہ انسان کے آرزو یا " تمنا" کی بیکرانی و بے پایانی کی کوئی حد نہیں ہے اور الفاظ کی رسائی اور کنڈا تنگی بہرحال موجود ہے گویا فلسفہ و شاعری دونوں آرزو مندی یا تمنا کی نقاب کشائی یا اس کی توضیح و تشریح کے باب میں بے دست و پا ہیں۔ تعجب اس امر پر ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے مندرجہ بالا شعر میں فلسفہ و شعر کو ایک ہی منصب پر اور ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ حالانکہ ان دونوں کے اثرات و نتائج کے سلسلے میں انہوں نے ایک جگہ واضح طور پر یہ حکم لگایا ہے کہ :

" فلسفہ بوڑھا بنا دیتا ہے شاعری تجدید شباب کرتی ہے۔ (۱) "

اشعار میں تو کئی جگہ اس طرح کی بات کی ہے کہ :

بو علی اندر غبار ناقہ گم
دست رومی پردۂ محمل گرفت

بہت ممکن ہے اوپر کے شعر میں علامہ کے کہنے کا مفہوم کچھ اور ہو اس لئے کہ ان کے یہاں فلسفے کو بالعموم شوق و آرزو یا عشق و تمنا کا حلیف و مماثل نہیں بلکہ حریف و مدمقابل ظاہر کیا گیا ہے تمنا اور حرف تمنا میں نازک سا فرق ہے اور ممکن ہے کہ اقبال کے نزدیک فلسفہ و شعر کو " حرف تمنا" کہنے کا مفہوم صرف " تمنا " کا وسیلہ اظہار ہو اور انہوں نے صرف وسیلہ اظہار ہی کو ما حصل قرار دیا ہو۔ علامہ کا اصل موضوع کیا ہے ؟ اور انہوں نے کیا کہنا چاہا ہے یہ بات تو اس جگہ لفظ " تمنا" کے حوالے سے ضمناً زیر بحث آگئی ۔ عرض یہ کرنا تھا غالب کے کلام میں " تمنا" کا لفظ ایک بہت ہی کرشمہ ساز لفظ ہے اور جیسا کہ آگے وضاحتیں آئیں گی اس لفظ کے ذریعے غالب کے ذہن کی بعض ناکشودہ گرہیں کھلتی ہیں اور یہ گرہیں زندگی کے بارے میں ان کے طرز فکر سے متعلق ہیں۔

غالب کے یہاں " تمنا" کا لفظ ایک جگہ نہیں بار بار استعمال ہوا ہے ۔ مفرد صورت میں شاید انہوں نے اسے ایک آدھ جگہ ہی استعمال کیا ہے ۔ لیکن مرکبات کی صورت میں انہوں نے داغ تمنائے نشاط ' ساز گریبانے تمنا' عہد تجدید تمنا' دام تمنا' تپ عشق تمنا' تماشائی نیرنگ تمنا' زخم تمنا' افسون انتظار تمنا' بے کسی ہائے تمنا' آئینہ تکرار تمنا' تمنائے حسیدن' عشرت قتل گہ اہل تمنا' عیش تمنا' تمنا فکار' تمناکدۂ حسرت ذوق دیدار' اسباب تمنا' سرمایہ ایجاد تمنا' ذوق تمنائے شہادت' دسترس وصل تمنا' پاس تمنا' درکیفیت اور ہجوم تمنا جیسی بہت بطور فارسی تراکیب ایجاد کی ہیں اور اردو و فارسی دونوں میں استعمال کی ہیں۔

ان میں دو لفظی تراکیب سے لے کر چار لفظی و پنج لفظی تک ہر نوع کی تراکیب شامل ہیں قواعد کی زبان میں ان میں سادہ تراکیب بھی ہیں اور توالی بھی لیکن خاص بات یہ ہے کہ یہ سب مل کر ایک ایسا دائرہ بناتی ہیں جو ایک مشترک معنوی مرکز رکھتا ہے یعنی ظاہری سطح پر یہ ترکیبیں رنگارنگ اور الگ الگ ہیں لیکن معنی کی سطح پر یہ باہم مربوط و یک رنگ ہیں ۔ ان کی یہی معنوی یکسانگی ' غالب کے ذہن کے بعض سربستہ و منتشر اجزا

اورنگ زیب قاسمی

کو واشگاف کرتی ہے اور ایک کل کی صورت میں ہمارے سامنے لاتی ہے ۔ یہ کیفیت ' فکر غالب کا وہ گوشہ خاص یا رخ ہے جو انہیں اپنے عہد کا سب سے بڑا تجدد پسند بناتا ہے یعنی اہل تمنا کے لئے محبت میں جان دینا باعث رنج نہیں بلکہ عین راحت ہے ۔ دوسرے شعر کا اصل مطلب صرف اس قدر ہے کہ بظاہر تکمیل تمنا کی خوشی میسر نہ آئی اور غالب جیسے صاحبان محبت کی آرزو مندی ' تشنہ تکمیل ہی رہی لیکن یہ خوشی کیا کم ہے کہ ان کی اس شکست آرزو سے ان کے محبوب کا دل باغ باغ ہو گیا۔ تیسرے شعر میں زخم تمنا کھانا ' دل کے لئے تکلیف دہ ہونے کے بجائے عشرت دل یا نشاط روح کا باعث ہے اور زخم جگر کا فرق نمکداں ہونا ' اذیت کا باعث ہونے کی بجائے لذت خاص کا وسیلہ ہے ۔ اس طرح تینوں اشعار میں تمنا کی شکست یا نامرادی غالب کے لئے وجہ دل شکنی نہیں بلکہ باعث حوصلہ مندی ہے اس شکست سے ان کی آرزو مندی کی تڑپ کم نہیں ہوتی بلکہ کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔

ایک ہی غزل کے دو شعر اور دیکھیے۔ کل چار اشعار کی غزل ہے جس کے دو شعروں میں تمنا کا لفظ سہ لفظی اور چہار لفظی مرکب کی صورت میں استعمال ہوا ہے۔ شعر یہ ہیں :

مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

نہ لائی شوخی اندیشہ ' تاب رنج نومیدی
کف افسوس ملنا عہد تجدید تمنا ہے

ان اشعار کی تشریح میں شارحین نے اپنی اپنی وسعت علم کے عجیب و غریب کمالات دکھائے ہیں لیکن اگر ان کی باتوں کو اشعار کی اصل روح تک ہی محدود رکھا جائے تو پہلے شعر کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ شاعر کی ذات میں تمناؤں کی وہ کثرت یا ہجوم ہے کہ اس کا وجود سراپا حیرت آباد بن گیا ہے ۔ پھر بھی شاعر کے لئے اس حیرت آباد کی فضا ناگوار خاطر نہیں ہے چنانچہ شاعر نہ تو اس فضا سے نالاں ہے اور نہ بیزار بلکہ یہ فضا اس کے لئے ایسی پرسکون اور طمانیت بخش ہے کہ نالہ و شیون کا دور دور تک بھی گزر نہیں ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ چیزیں اس فضا کے لئے عنقا ہوں ۔ مختصر یہ کہ تمناؤں یا آرزوؤں کا ہجوم جو کہ عشاق کے لئے عموماً اذیت ناک و صبر آزما ہوتا ہے ' وہ بھی اپنے عام اثرات کے برعکس عاشق کے لئے وجہ سرور و سکون ہے۔

دوسرے شعر کا مفہوم قدرے آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے اور صرف اس قدر ہے کہ شاعر کی شوخی اندیشہ یا فکر کی ترنگ اور جولانی کسی قیمت پر نومیدی کا رنج یا مایوسی کا غم اٹھانے کی تاب نہیں لا سکتی ۔ مراد یہ ہے کہ مایوس ہونا شاعر کی فطرت کے یکسر خلاف ہے اس کی آرزوئیں پوری ہوں یا نہ ہوں ۔ وہ ان سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ دست برداری کا خیال اگر کبھی پیدا بھی ہو اور تمنا کے عدم تکمیلے پر کبھی غم بھی ہو تو ' سرشت مزاج کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک نئی تمنا جنم لے لیتی ہے اور اس طرح " تجدید تمنا" کا ایک تازہ عہد نامہ وجود میں آجاتا ہے خلاصہ یہ کہ تمنا کی عدم تکمیل شاعر کو نہ تو مایوس و ناامید کرتی ہے اور نہ کبھی اسے ترک تمنا کی ترغیب دیتی ہے ۔ بلکہ اگر کبھی یاس کی فضا پیدا بھی ہو جائے تو وہ ایک تازہ تمنا کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

میں نے اوپر کے اشعار کی تفہیم اور ان کے معانی کے تعین میں بعض دوسرے شارحین غالب کے علاوہ عبدالباری آسی ' نظم طباطبائی ' شاداں بلگرامی ' حسرت موہانی ' پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور سعید الدین احمد سے بطور خاص مدد لی ہے اور ان کی پرپیچ و طویل بحثوں سے جو کچھ اخذ کر سکا ہوں اسے بطور خلاصہ درج کر دیا

ہے۔ لیکن جن حضرات نے غالب کے اشعار کی وضاحت میں حد درجہ اختصار سے کام لیا ہے۔ ان کا موقف بھی مذکورہ بالا معنی سے مختلف نہیں ہے مثلاً علامہ نیاز فتح پوری

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

کی مختصر ترین تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

"مفہوم یہ ہے کہ تمناؤں کے ہجوم نے مجھے حیرت کدہ بنادیا ہے اور عالمِ حیرت میں انسان خاموش رہتا ہے اس لئے نالہ و فریاد کا کیا ذکر' نالہ و فریاد کو عالمِ حیرت کا عنقا کہنا اس بنا پر ہے کہ عنقا کا بس نام ہی نام ہے بظاہر کہیں اس کا وجود نہیں پایا جاتا۔"

دوسرے شعر یعنی

نہ لائی شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

کے معنی انہوں نے اس طور پر بیان کئے ہیں:

"جب انسان مایوس ہوتا ہے تو کفِ افسوس ملتا ہے اور جب باہم معہود پیاں ہوتا ہے تو بھی ہاتھ سے ہاتھ ملایا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں میں عالمِ یاس میں کفِ افسوس ضرور ملتا ہوں لیکن چونکہ ناامیدی و یاس کی تکلیف میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے اس لئے میں اپنے دل کو سمجھاتا ہوں کہ میرا کفِ افسوس ملنا' ناامیدی کی بنا پر ضرور ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ تجدیدِ تمنا کا عہد و پیاں بھی ہو۔"

نیاز نے غالب کی تراکیب پیچیدہ کی مختصر لیکن بہت جامع وضاحتیں کر دی ہیں۔ لیکن دونوں شعروں کے مفہوم کا خلاصہ ان کے یہاں بھی صرف اس قدر ہے کہ تمنا میں کامیابی یا ناکامی شاعر کے لئے کسی طرح کے دردِ سر کا درجہ نہیں رکھتا۔ وہ تو فقط" تمنا کا اشتیاق ہے اور کامیابی و ناکامی یعنی اس کے اچھے برے نتائج سے بے نیاز رہ کر تمنا کا تمنائی رہتا ہے۔

ایک اور شعر دیکھیے غالب کے بعض دوسرے شعروں کی طرح یہ اپنی ذات میں غزل بھی ہے فرد بھی ہے اور دو مصرعوں کی اکائی بھی ہے اس لئے کہ یہ غالب کے دیوان متداولہ میں ی ردیف میں تن تنہا ہے حالانکہ اس کی پیشانی پر غزل نمبر ۲۳۴ درج ہے' شعر یہ ہے:

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

یہاں تمنا کے معنی و مفہوم کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی واضح طور پر بلند حوصلگی کے بارے میں بتادیا گیا ہے کہ میرا مقصود تو صرف تمنا کرنا اور تمنا کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے' مجھے اس سے غرض نہیں کہ کوئی تمنا بر آتی ہے یا ناکام رہتی ہے۔ غالب ہی کے لفظوں میں:

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے' شکستِ آرزو مطلب مجھے

لفظ تمنا کے حوالے سے غالب کا ایک اور قدرے مقبولِ عام شعر دیکھئے اس میں تمنا کو مزید کارگر بنانے کا اشتیاق ظاہر کیا گیا ہے:

وہ تپِ عشقِ تمنا ہے چوں رشتۂ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

مطلب یہ ہے کہ میں صرف تمنا سے نہیں بلکہ عشقِ تمنا سے سرشار ہوں اور مجھ پر اس کا اثر بہت شدید ہے پھر بھی میری خواہش یہ ہے کہ یہ اثر شدید تر ہو جائے۔ ایک طرح کا شعلۂ غم بن جائے اور میری نبض

اورنگ زیب قاسمی

جگر میں اس طرح ریشہ دوانی کرتا چلا جائے جس طرح رشتۂ شمع اپنی سوزش سے شمع کی آخری حد تک ریشہ دوانی کرتا چلا جاتا ہے۔ گویا غالب اپنی ذات پر آرزو پر آرزو اور تمنا پر تمنا بہرحال طاری رکھنا چاہتا ہے خواہ جسم و جان کے لئے وہ کتنی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔

ان کا مندرجہ ذیل شعر تو بہت مشہور ہے اور ان کی فکرِ تازہ و ارتفاعِ ذہنی کے حوالے سے اکثر نقل کیا جاتا ہے:

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیِ شوق' تراشے ہے پناہیں

نئی چیزوں کو اپنانے پر ہر لمحہ آمادہ رکھتا ہے روشِ عام پر چلنے سے باز رکھتا ہے' خراب سے خراب حالات سے آنکھیں چار کرنے اور حقائق کو فراخ دلی کے ساتھ قبول کرنے کا حوصلہ رہتا ہے۔ ان کا تجدد پسند ذہن بھی ان سے یہ کہلوا کر:

"مردہ پروردن مبارک کار نیست"

سرسید جیسے جدید ذہن رکھنے والے دوستوں کی ناراضگی کا سبب بنتا ہے اور کبھی وہابیوں اور مقلدوں کی نزاع میں "امتناعِ مثل و نظیر" کے مسئلے میں مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے مخلص و محسن' صاحبِ ذوق کی رائے سے اتفاق کرنے کے بجائے ان کے موقف سے گریز کی صورت نکال لیتا ہے۔ غالب کی فکر کا یہ خاص پہلو جس کا تعلق کبھی نہ ختم ہونے والی غالب کی آرزو مندی سے ہے اور قدیم و جدید کو لبیک کہنے سے ہے لفظ "تمنا" کے علاوہ غالب کے بعض دوسرے اشعار میں بھی نمایاں ہوا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

رنجِ رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

یقیناً غالب کے عظمت پسندانہ و مجتہدانہ اور سرکش و باغیانہ ذہن کا کچھ اندازہ اس قسم کے اشعار سے بھی ہوتا ہے لیکن اس کی واضح اور یکجائی نمود لفظ "تمنا" کے وسیلے سے ہوئی ہے۔ "تمنا" کے لفظ کا تکرار کے ساتھ استعمال غالب کے یہاں پہلی بار ان کی اس مشہور غزل میں ہوا ہے جس کا مطلع ہے:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اس غزل میں کل نو اشعار ہیں۔ چوتھے شعر کے بعد تین مسلسل شعر جن کا لفظ "تمنا" کا استعمال ہوا ہے یہ ہیں۔

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے ' شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو' اور آپ بہ صدرنگ گلستاں ہونا

عشرت پارۂ دل ' زخم تمنا کھانا
لذت ریش جگر ' غرق نمکداں ہونا

تینوں شعروں میں "تمنا" کا لفظ اگرچہ پہلو بدل بدل کر "اہل تمنا" "داغ تمنائے نشاط" "زخم تمنا" کی صورت میں آیا ہے اور یہ صورت گری بظاہر نوع بہ نوع انداز کی ہے لیکن معنوی منصب کم و بیش تینوں کا ایک ہے پہلے شعر میں اہل تمنا سے مراد ہیں ' صاحبان عشق یا عشاق اور مفہوم صرف اس قدر ہے کہ عاشقوں کے لئے محبوب کے ہاتھ میں عریاں شمشیر کی دید' مثل ہلال عید ہے اور قتل گاہ ' مانند عشرت گاہ ہے۔

اس میں غالب نے یہ ظاہر کیا ہے کہ دیر و حرم کو تمناؤں کا مقصد حاصل سمجھ لینا درست نہیں ہے کسی کی تمنا صرف حرم تک پہنچ سکی اور کسی کی صرف دیر تک اس لئے تمنا کی اصل رسائی تو نہ ہوئی بلکہ واماندگی ہوئی ۔ اس صورت حال کی روشنی میں دیر و حرم کو تمنا کا آئینہ یا آئینہ تکرار تمنا تو کہہ سکتے ہیں لیکن منزل قرار نہیں دے سکتے۔ ان مقامات کو تمنا کا مقصود تصور کرنا ہرگز درست نہیں ہے بلکہ یہ تمنا کی واماندگی کی پناہ گاہیں ہیں ۔ یعنی میری تمنا تھکن کے سبب کبھی دیر کو کبھی حرم کو اپنی آرام گاہ بنالیتی ہے۔ لیکن انہیں اپنی منزل نہیں سمجھتی' بلکہ تازہ دم ہو جانے کے لئے ایسا کرتی ہے کم و بیش اسی مفہوم کا ایک شعر اور دیکھیے :

واماندۂ ذوق طرب وصل نہیں ہوں
اے حسرت بسیار تمنا کی کمی ہے

اس شعر میں غالب نے کہا ہے کہ اگر میری آرزوئیں یا تمنائیں کامیاب بھی ہو جائیں اور انہیں وہ نشاط روح بھی میسر آجائے جسے وصال محبوب کا حاصل خیال کیا جاتا ہے تو بھی میرا شوق آرزو مندی کم نہ ہو گا۔ اس لئے میری تمنائے بے پایاں کے بارے میں یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ وہ وصل و کامیابی کی خوشی سے سرشار ہو کر آئندہ کے لئے واماندہ و بیکار ہو گئی اور اب اس میں کوئی جان باقی نہیں ہے یہ خیال سراسر غلط ہے کہ میں کسی تمنا کے وصال یا کامیابی سے مطمئن ہو جاتا ہوں اور مزید تمنا سے بے نیاز ہو جاتا ہوں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ میری بے شمار تمنائیں اسی طرح حسرت بنی رہتی ہیں اور میں ان کے حصول کے لئے بے تاب رہتا ہوں' اس خیال کو غالب نے کئی جگہ ظاہر کیا ہے اور ان کا یہ مشہور شعر بھی اسی نوع کا ہے :

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یہ ضرور ہے کہ اس شعر میں تمنا کی بجائے حسرت کا لفظ آیا' لیکن اس جگہ تمنا ہی کے مترادف ہے لیکن لفظ تمنا کے ساتھ بھی اس مفہوم کا شعر ان کے یہاں موجود ہے:

اسد یاس تمنا سے نہ رکھ امید آزادی
گداز آرزوہا' آبیاری آرزوہا ہے

خود کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ یہ خیال بالکل درست نہیں ہے کہ تمناؤں میں ناکامیوں کے سبب میں مایوس ہو جاؤں گا اور مجھے کشمکش بے دلی سے نجات مل جائے گی۔ یا اب میرے اندر کوئی تمنا پیدا نہ ہوگی۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یاس تمنا' مجھ پر یکسر الٹا اثر کرتی ہے یوں سمجھنا چاہیے کہ جو تمنائیں یا آرزوئیں گداز ہو کر پانی ہو جاتی ہیں وہ نئی آرزوؤں کی آبیاری کا وسیلہ بن جاتی ہیں' گویا تمنا کی موت نئی تمنا کو جنم دیتی ہے اس طرح تمنا میں یاس سے دوچار ہونے کے بعد تمنا کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا بلکہ اس میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

غالب کے نسخہ متداولہ میں لفظ "تمنا" کے سادہ مرکب استعمالات اور بھی ہیں میں نے اوپر صرف چند اشعار بطور مثال پیش کر دیے ہیں لیکن ان اشعار کے ساتھ ساتھ دوچار شعر' نسخہ حمیدیہ کے بھی دیکھتے چلیے' تاکہ لفظ تمنا کا وہ فلسفہ طراز نکتہ جسے واضح کرنا مقصود ہے مبہم نہ رہے:

ہو گئے باہم و گردش پریشانی سے جمع
گردش جام تمنا' دور گردوں ہے مجھے

اس شعر میں غالب نے گردش جام تمنا کو دور گردوں کے ہم رنگ و ہم شکل بتایا ہے "پریشانی" کا لفظ ان دونوں میں وجہ شبہ و وجہ اشتراک ہے کہنے کا مقصود صرف اس قدر ہے کہ گردش آسمانی کی طرح میری گردش جام تمنا کو بھی کسی کروٹ چین نہیں ہے دونوں اضطراب و گردش میں ہیں اور رہیں گے گویا میری تمنا کو اپنے حرکت و عمل کے اعتبار سے وہی دوام حاصل ہے جو دور گردوں کو :

وہ تشنہ سرشار تمناہوں کہ جس کو
ہر ذرہ بہ کیفیت ساغر نظر آوے

اس شعر میں بھی تمنا کا مفہوم وہی ہے جو اوپر کے شعر کا ہے فرق یہ ہے کہ پہلے شعر میں اضطراب کے حوالے سے بات کی گئی تھی اس میں سرشاری و مستی کے توسط سے کی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ تمنا رکھنے کے باوجود میں تشنگی ء تمنا کا شکار ہوں ۔ چاہتا ہوں کہ ہمہ وقت تمناؤں میں کھویا رہوں میری تشنگی ء تمنا کی کیفیت کا یہ عالم ہے کہ مجھے ہر ذرہ ایک ساغر لبریز نظر آتا ہے اور مجھے تمنا افروزی و تمنازائی کی ترغیب دیتا ہے یعنی شاعر کی تمنا کی کوئی حد نہیں ہے اس سلسلے میں اس کی تشنگی ہر لمحہ بڑھتی رہتی ہے اور اسے مزید تمناؤں پر اکساتی رہتی ہے بات وہیں پہنچتی ہے کہ "نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ۔"

دلا عبث ہے تمنائے خاطر افروزی
کہ بوسہ لب شیریں ہے اور گلوسوزی

اے دل یہ خیال کرنا کہ اس سے مل کر یا اس کے لب شیریں کا بوسہ لے کر میں خوشی سے کھل اٹھوں گا درست نہیں ہے ایسی خاطر افروزی کی آرزو میری آرزو مندی کے سلسلے میں عبث ہے اس لئے کہ لب شیریں کا بوسہ بظاہر لذت کام و دہن کا باعث تو ہوتا ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ معمول سے زیادہ شیرینی' گلے میں سوزش کا سبب ہوتی ہے اور یہی سوزش "رگ جاں تک پہنچ کر جان لیوا بھی ہو سکتی ہے ایسے میں بوسہ لب شیریں کو شگفتہ خاطری یا تمنائے شگفتہ خاطری کا وسیلہ خیال کرنا بے معنی ہے:

جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

میری تمنا کی اثر پذیری کا یہ عالم ہے کہ ذرے ذرے میں میری تمنا ہی ہوئی ہے اور اس کے سبب ہر ذرہ ایک ایسا ساغر بن گیا ہے جو میری تمنا آموزی سے سرشار نظر آتا ہے خدا جانے میں کس قسم کی تمنا رکھنے والے عاشق اور فریفتہ کا دل ہوں کہ اسے کسی ایک شے یا ایک شخص سے نہیں بلکہ دونوں عالم کی ایک ایک چیز اور ایک ایک شخص سے وابستہ رکھا گیا ہے یہاں بھی شعر کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ میری تمنائیں بے شمار و بے حساب ہیں اور ان کا تکملہ یا ان کا آسودہ ہونا آسان نہیں ہے۔

ایک ہی غزل کے دو شعر اور دیکھیے۔ دونوں میں تمنا کا بیان ہے۔ مرکزی خیال تو قریب قریب دونوں کا ایک ہے البتہ پیرایۂ بیان الگ الگ اور منفرد انداز کا ہے:

عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
ورنہ جو چاہیے اسباب تمنا ساب تھا

شوق ' ساماں فضول ہے ورنہ غالب
ہم میں سرمایہ ایجاد تمنا کب تھا

پہلے شعر میں تمنا کی غیر معمولی قوت رسائی کا ذکر ہے یعنی شاعر اگر چاہتا تو اپنے شوق بے پایاں کی مدد سے اپنی منزل مقصود تک آسانی سے پہنچ جاتا' اس لئے کہ سارے وسائل مہیا تھے لیکن اس نے اس امر پر نہ تو اصرار کیا اور نہ اس پر خاطر خواہ توجہ دی اس لئے کہ ایسا کرنے سے وہ لطف انتظار ختم ہو جاتا جو تمنا کی عدم تکمیل کی وجہ سے میسر تھا۔

دوسرے شعر میں کم و بیش یہی بات دوسرے پیرائے میں کہی گئی ہے بقول غالب ' شوق یا عشق کا پیدا ہونا ' کسی کی آرزو کرنا ' کسی کی تمنا میں مرنا ' اور جینا' سب مہمل باتیں ہیں اور شوق فضول کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے کہ کبھی مجھے ان میں کامیابی نہ ہو گی لیکن یہ سب کچھ میرا شعوری عمل نہیں ہے میں نے انہیں مشغلے کے طور پر اختیار نہیں کیا اس لئے کہ مجھ میں ایسا کرنے کی نہ تو قوت تھی اور نہ اس کے لئے سازوسامان ہی مجھے میسر تھا بس یہ ایک طبعی اور خداداد بات تھی کہ میں کسی کی تمنا میں گرفتار ہو گیا۔ یہ شوق' اگرچہ بظاہر سامان فضول ہے لیکن عطیہ الٰہی ہے۔ میری مجبوری ہے اور میں اس میں خوش ہوں ایک جگہ اسی خیال کو اس عزم و حوصلہ کے ساتھ ادا کیا ہے کہ :

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوق فضول و جرأت رندانہ چاہیے

تمنا کے لفظ کا استعمال کم و بیش ایک ہی معنی و رنگ میں غالب کے یہاں جیسا کہ عرض کیا گیا دو چار جگہ نہیں درجنوں جگہ ہوا ہے دیوان متداول میں بھی اور حمیدیہ میں بھی ۔ مثلاً" تشریح معنی کے بغیر چند اشعار دیکھیے :

سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

خیال مرگ کب تسکیں دل آزردہ کو بخشے
مرے دام تمنا میں ہے اک صید زبوں وہ بھی

تمنائے زباں' محو سپاس بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

سر ہوئی نہ وعدہ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

ہے تمنا کدۂ حسرت ذوق دیوار
دیدہ گو خوں ہو ' تماشائے چمن مطلب تھا

ہے دل شوریدۂ غالب' طلسم پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

اے خوشا ذوق تمنائے شہادت کہ اسد
بے تکلف بسجود خم شمشیر آیا

اس طرح کے درجنوں اشعار ہیں اور ان کی مختصر ترین تشریح سے بھی کام لیا جائے تو یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا لیکن اس نکتے کی وضاحت و تفہیم کی غرض سے کہ غالب کے یہاں " تمنا" کا لفظ غالب کے شوق بے پایاں اور آرزوئے لا متناہی کا نمائندہ خاص ہے ' صرف دو شعر اور دیکھیے ۔ ایک شعر دیوان متداول سے اور ایک نسخہ حمیدیہ سے ' دونوں شعر مقبول و مشہور ہیں اور یقین ہے کہ قارئین کے ذہن میں محفوظ ہوں گے ۔ پہلے نسخہ حمیدیہ کا شعر دیکھیے :

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

بقول غالب ہماری سعی پیہم' یا آرزوئے بیکراں اور تمنائے بے پایاں کی فتح مندی و رسائی کا یہ عالم ہے کہ اس نے سامنے کے دشت دنیا ہی کو نہیں بلکہ انسان کی نظروں سے پوشیدہ دنیاؤں کے دشت و میدان یعنی

اورنگ زیب قاسمی

امکانی دنیا کو بھی بہ یک قدم طے کر لیا۔ ایک نقش پا پایا سے مراد یہ ہے کہ صرف ایک معمولی کوشش اور ایک ہی جنبش قدم سے دیدہ و نادیدہ اور ظاہر و پوشیدہ ' ساری دنیا کی وسعتوں کو طے کر لیا گیا' ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ کائنات ظاہری و کائنات مخفی دونوں زیر نگیں آ گئیں ' جب میری تمنا کی قوت تسخیر کی یہ صورت ہے کہ اس کی ایک معمولی جست سے ' امکانی کائنات تک اس کے تصرف میں آجاتی ہے تو ایسے میں کوئی بتائے کہ تمنا کے دوسرے قدم کے لئے کون سی جگہ باقی رہ جاتی ہے مراد یہ ہے کہ انسان کی آرزو مندی اور اس کی تسخیر کی کوئی حد نہیں ہے ۔ اس کی ذہنی قوتیں نئی نئی دنیا کی تلاش کرتی جائیں گی ' انہیں تسخیر کرتی جائیں گی بایں ہمہ مطمئن نہ ہوں گی ۔ کم از کم غالب کی انداز فکر کی یہی صورت ہے وہ سب کچھ حاصل کر کے بھی یہی کہتے جائیں گے:

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اب ایک شعر دیوان متداول کا دیکھیے:

پھونکا ہے کس نے گوش تمنا میں اے خدا
افسون انتظار ' تمنا کہیں جسے

استفہامیہ لہجے میں کہتے ہیں کہ نہ جانے کس نے گوش محبت میں تمنا کے نام سے انتظار کا افسوں پھونک دیا ہے کہ محبت ' خود سراپا انتظار بن کر رہ گئی ہے مراد یہ ہے کہ جس وقت سے محبت کا آغاز ہوا ہے اسی وقت سے تمنائے وصال محبوب نے ایسی شدت و طلسماتی کیفیت اختیار کر لی ہے کہ " انتظار محبوب " کا ایک ایک لمحہ حیرت افزا بن گیا ہے یوں لگتا ہے جیسے تمنائے " افسون انتظار " کی صورت اختیار کر لی ہے اور جسے محبت کہتے ہیں وہ خود مقصد کے حصول و عدم حصول سے بے نیاز رہ کر انتظار مسلسل ہی کو محبت کا حاصل سمجھنے لگی ہے ۔ شعر کا لب لباب یہاں بھی وہی ہے کہ تمنا کی دنیا محدود نہیں لا محدود ہے ۔ تمنا کیا ہے ایک طرح کا افسون انتظار ہے جو زندگی بھر اپنے طلسم میں گرفتار رکھتی ہے ' اس کی نہ کوئی منزل ہے نہ کوئی مقام ' مسلسل اضطراب اس کا مدعا اور بے نہایت کی خواہش اس کا حاصل ہے۔

لفظ " تمنا" کے حوالے سے اوپر کی ساری بحث کو ذہن میں رکھیے تو کہنا پڑتا ہے کہ غالب کے یہاں " تمنا" کا لفظ محض آرزو' خواہش ' شوق اشتیاق ' محبت ' عشق ' طلب ' جذب ' جنوں ' لگن ' لگاؤ' دھن اور مستی وغیرہ کا سادہ مترادف نہیں ہے بلکہ اس میں بڑی وسعت ہے اور یہ دراصل استعارہ ہے حرکت و فعالیت کا ' تحرک و تغیر کا ' خود اعتمادی و خود اختیاری کا ' ناساز گار حالات سے ستیزہ کاری کا' زندگی سے بہرحال وابستہ رہنے کا اور اسے تسخیر کرنے کا ' شرر سے ستارہ اور ستارہ سے آفتاب تک پہنچنے کا ' خوب سے خوب تر کی تلاش میں خود کو کھوئے رکھنے کا ' آدمی کو مختر خیال سمجھنے کا اور ارادہ عمل میں اسے مختار جاننے کا' لا انتہا کی انتہا تک پہنچنے کی آرزو مندی کا بے نہایت حصول کے لئے کوشاں رہنے کا ذہن انسانی کی رسائیوں کو بے کراں جاننے کا اور اس کی فتح مندی و کامرانی پر یقین رکھنے کا ' زمانے کی ناہنجاری کا مقاومت کے ساتھ مقابلہ کرنے کا اور یاس و ناامیدی کی تاریک فضا میں رجائیت و امید کے چراغ جلائے رکھنے کا۔

گویا غالب کے یہاں " تمنا" کا لفظ کم و بیش وہی معنی رکھتا ہے جو اقبال کے یہاں شوق و آرزو یا عشق و جنوں کا مفہوم ہے جس طرح اقبال کے یہاں عشق کسی اضطرابی کیفیت کا نام نہیں بلکہ زندگی کے ایک طاقتور محرک کا نام ہے بالکل اسی طرح غالب کے یہاں تمنا کا لفظ محض سادہ سی آرزو مندی کے معنی نہیں رکھتا بلکہ

یہ فطرت انسانی کے اس ذوقِ طلب اور شوقِ بے پایاں کی نمائندگی کرتا ہے جو زندگی کو متحرک و بامعنی بنائے رکھتا ہے نت نئے نئے مقاصد کی تخلیق کرتا ہے۔ پھر ان مقاصد کے لئے سرگرم رہتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ عمل صبر آزما ہونے کے باوجود اسے درماندہ نہیں کرتا بلکہ اس میں زندگی کی ایک تازہ لہر دوڑا دیتا ہے۔

نتیجتہ " کہنا پڑتا ہے " تمنا " کا لفظ غالب کے اس طبع ایجاد پسند اور فلسفہ طراز ذہن کی گرہ کشائی کرتا ہے جو نامساعد حالات میں بھی ترک انا یا نفی ذات پر آمادہ نہیں ہوتا۔ خود نگری و خودداری اور خود شناسی و خود اعتمادی ' اس کا بنیادی جوہر اور اس جوہر پر وہ بہرحال نازاں رہتا ہے غالب کی طبیعت کا یہ میلان اور ان کے ذہن کا یہ رخ فکر اقبال کو غالب سے بہت قریب کر دیتا ہے۔ اور بہت ممکن ہے اسی ذہنی قربت کے احساس نے علامہ اقبال کو غالب کا گرویدہ بنایا ہو۔ اس لئے کہ بانگ درا سے لے کر جاوید نامے تک یعنی فکر و شعر کے سارے سفر میں اقبال نے غالب کو احترام و تکریم کی نظر سے دیکھا ہے اقبال نے " گلشن راز جدید" میں انسانی وجود کی نفی کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ " میں یہ مان سکتا ہوں کہ یہ دنیائے آب و گل اور یہ کائنات محض خواب ہے اور جو کچھ دیکھ سن رہا ہوں وہ میرے ہوش و حواس اور گوش و چشم کا فتور ہے خود اقبال کے لفظوں میں:

توان گفتن جہان رنگ و بو نیست | زمین و آسمان و کاخ و کو نیست
توان گفتن ہمہ نیرنگ ہوش است | فریب پردہ ہائے چشم و گوش است

لیکن اس بات کو " میں کس طرح مان لوں کہ میں نہیں ہوں۔ اگر میں یہ سمجھوں کہ میرا وجود محض گمان ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میرے اندر کون ہے جو مجھے اپنے وجود کے انکار کا احساس دلا رہا ہے۔ یہ احساس اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ میں موجود ہوں اور میری روح یا میری انا' یا میری خودی ساری کائنات سے زیادہ یقینی اور قطعی ہے۔" بالکل اسی طرح کے سوالات جن سے انسان کے وجود کا اثبات عیاں ہوتا ہے اقبال سے پہلے غالب اٹھاتے ہیں:

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود | پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں | غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں | ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

فرق یہ ہے کہ اقبال کے سوالات ایک منظم فکر کے رشتے میں پروئے ہیں اور ان کے سوال و جواب کی پشت پر ان کے فلسفہ خودی کا ایک پورا نظام ارتقا ہے غالب کے یہاں یہ سوالات ' مختصر صورت میں ہیں اور جہاں تہاں بکھرے ہوئے ہیں۔ پھر بھی اگر ان کے خیالات کو لفظ " تمنا" کے آئینے میں دیکھیں گے تو ان کی فکر میں بھی ایک طرح کا تسلسل نظر آئے گا اور یہ تسلسل اس امر کی نشان دہی کرے گا کہ غالب زندگی کے بارے میں ایک مثبت انداز فکر رکھتے ہیں اور یہ انداز فکر وہ ہے جو انہیں تازہ بہ تازہ منزلوں کی تلاش میں سرگرم عمل رکھتا ہے اور سکون کے مقابلے میں حرکت کو' منزل کے مقابلے میں سفر کو' تکمیل کے مقابلے میں سعی تکمیل کو آسودگی کے مقابلے میں تشنگی کو' آسانی کے مقابلے میں دشواری کو' سلامتی کے مقابلے میں خطرات کو' وصل کے مقابلے میں طلب کو اور خارجی سہارے کے مقابلے میں اپنے زور بازو کو ترجیح دیتا ہے اس انداز فکر کی تائید میں غالب کے بعض دوسرے اشعار بھی پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن ان کے اس طرز فکر کی

اورنگ زیب قاسمی

جیسی واضح تائید لفظ " تمنا" سے ہوتی ہے کسی اور لفظ سے نہیں ہوتی۔

پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے ایک جگہ شاعری اور زندگی کے تعلق پر عمومی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " شاعر کا مذہب محبت ہے اور محبت نام ہے تعلقات میں جکڑے رہنے کا۔ لاکھ محرومیوں اور مایوسیوں کا سامنا ہو' ہجر کی سختیاں جھیلنی پڑیں' زمانہ لاکھ ستائے لیکن محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے ہنستے کھیلتے گوارا بنایا جائے۔ یہ بات محبت کرنے والے کے شایان شان نہیں کہ وہ صعوبتوں سے گھبرا کر محبوب کو ترک کر دے اور الامان کہتا ہوا گوشہ عافیت اختیار کرلے ' بلکہ اس کے برعکس وہ ہر مصیبت اور ہر غم پر هَلْ مِنْ مَزِيْد کا ترانہ بلند کرتا ہے وہ اگر روتا ہے تو ہنس ہنس کر اور مزے لے لے کر اور یہ سبق دیتا ہے کہ زندگی کا راز دھن اور لاگ میں ہے۔ مانا زندگی بلا ہے ' جنجال ہے ' شریر قوتوں کا اندھیر ہے لیکن ہم اسے اپنے لئے گوارا بناسکتے ہیں۔ ہم کو اپنی بے چینیوں ہی میں سکون حاصل کرنا ہے ' راحت و سکون کوئی خارجی چیز نہیں ہے بلکہ خود اپنے اندر موجود ہے اگر یہ سچ ہے کہ:

نام کا ہے مرے وہ دکھ جو کسی کو نہ ملا | کام کا ہے مرے وہ فتنہ جو برپانہ ہوا (غالب)

تو انسان کو اس خیال سے خوش ہونا چاہیے اور اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے کہ:

" ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر"

جیسا کہ عرض کیا گیا یہ مجنوں گورکھپوری کے غالب سے متعلق مضمون کا کوئی اقتباس نہیں بلکہ یہ باتیں انہوں نے شاعری اور زندگی کے رشتے پر عمومی بحث کرتے ہوئے کہی ہیں اور غالب کا ایک شعر اور ایک مصرع ضمناً" اس میں آگیا ہے لیکن سچ بات ہے کہ اس اقتباس کا جیسا بھرپور اطلاق غالب کی زندگی اور شاعری پر ہوتا ہے شاید اقبال کے سوا کسی دوسرے اردو شاعر پر نہیں ہوتا' بلکہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اوپر میں نے لفظ " تمنا" کو کلید بنا کر اور اسے استعارۂ فلسفہ آثار کہہ کر ' غالب کے جس طرز فکر پر جو طویل بحث کی ہے ' مجنوں گورکھپوری نے میری طرف سے اس کی تلخیص دے دی ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ غالب کے ذہن اور ان کی شخصیت کے مطالعے کے سلسلے میں اس سے پہلے بھی کلام غالب میں استعمال ہونے والے بعض الفاظ و تراکیب سے مدد لی گئی ہے' مثلاً" بعض کا خیال ہے کہ غالب کے یہاں آگ ' روشنی ' شعلہ ' شعاع ' برق ' شرر ' آتش ' نجم و سحر اور خورد خورشید وغیرہ کے الفاظ کی تکرار اس بات کی دلیل ہے کہ حرکت و روشنی اور حرارت و تازگی ان کی سرشت مزاج کے اجزائے خاص تھے اور یہی اجزا انہیں زندگی کے ہر متحرک اور انقلابی رویے پر لبیک کہنے پر آمادہ رکھتے تھے۔ اسی طرح بعض نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ غالب کے کلام میں آئینہ ' جوہر آئینہ ' صیقل ' عرض ' جوہر اندیشہ اور آبگینہ وغیرہ کا یہ تکرار جو استعمال نظر آتا ہے وہ بیدل کا عطیہ ہے البتہ غالب نے ان لفظوں کو بیدل کی طرح انسان کی مجبوری و بے دست و پائی یا ترک دنیا و بیزاری حیات کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ غالب نے ان الفاظ کے ذریعے زندگی کو لمحہ بہ لمحہ حقیر اور انسان کو ارادۂ عمل میں بااختیار ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

خود میں نے اب سے چالیس سال پہلے اپنے ایک مضمون " کلام غالب میں استفہام " مطبوعہ نگار ' لکھنؤ جون ۱۹۵۲ء میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ غالب معروف معنوں میں نہ فلسفی تھے اور نہ علم فلسفہ سے ان کا کوئی خاص تعلق تھا لیکن وہ فلسفیانہ ذہن ضرور رکھتے تھے اور ان کا یہ ذہن ان کے کلام میں کلمات استفہام

یعنی کیا، کیوں، کہاں، کیسے، کیونکر وغیرہ کے کثرت استعمال سے کھلتا ہے۔

میرا یہ مضمون ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔ بعضوں نے اپنے مضامین میں اس سے استفادہ کیا ہے، بعض نے حوالے کے ساتھ اور بعض نے بغیر حوالے کے۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء میں غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے "تنقید غالب کے سو سال" کے عنوان سے جو کتاب شائع ہوئی اور جس میں غالب کے متعلق اور بیشتر تنقیدی مضامین شامل کئے گئے، اس کے لئے بھی میرا یہ مضمون انتخاب کیا گیا۔ پھر یہ مضمون میری کتاب "تحقیق و تنقید" مطبوعہ کراچی ۱۹۶۳ء میں اور بعد ازاں "غالب شاعر امروز فردا" مطبوعہ اظہار سنز لاہور ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔

میں نے اس مضمون میں غالب کی سوائے قوافی و ردیف کی غزلیات اور ان کے یہاں کلمات استفہام کے نوع بہ نوع استعمال سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ غالب کے یہاں اگرچہ کوئی مربوط نظام فکر نہیں ملتا لیکن ان کا ذہن بہرحال فلسفیانہ تھا اس لئے کہ وہ کیوں، کیا، کیسے کے بغیر آگے نہیں بڑھتے تھے اور اب لفظ "تمنا" کے مطالعے کی مدد سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ غالب، اصطلاحی مفہوم میں فلسفی رہے ہوں یا نہ رہے ہوں، لیکن فلسفیانہ ذہن رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک حیات افروز نظام فکر و فلسفہ بھی رکھتے تھے یہ فلسفہ زندگی کو مسلسل منقلب و متحرک جاننے، انسان کو اپنے ارادۂ عمل میں بااختیار سمجھنے، تسخیر کائنات کے باب میں مسلسل سعی کرتے رہنے اور سعی میں کامیابی و ناکامی سے بے نیاز رہ کر خوش و خرم رہنے کا فلسفہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ لفظ "تمنا" کے مطالعے سے غالب کے یہاں جو نظام فلسفہ سامنے آتا ہے وہ دراصل مولانا روم کے لفظوں میں:

آں کس یافت ی نہ شود آنم آرزو است

اور علامہ اقبال" کے لفظوں میں:

علم نہایت آں کہ نہایتے نہ دارد

کا فلسفہ ہے، اور لفظ "تمنا" کا استعارہ اردو میں فکر تازہ کا پہلا اشارہ ہے سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر غالب کے انداز فکر کی واقعی یہ صورت ہے تو پھر ان کے اس قسم کے اشعار کا کیا جواز ہے:

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

یہ سوال میرے ذہن میں بھی تھا اور اسی لئے میں، اس کا جواب ایک الگ اور قدرے طویل مضمون "غالب کی شاعری اور مسائل تصوف" میں دے چکا ہوں۔ یہ مضمون ماہنامہ صریر (کراچی) کے سالنامہ بابت ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا ہے۔ یقیناً بعض قارئین کی نظر سے گزرا ہوگا اس مضمون میں وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ غالب کے متصوفانہ اشعار دراصل "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان کا غالب کے باطن یا ان کی بنیادی فکر سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ تو ان کا مزاج صوفی کا تھا اور نہ ہی ان کے شب و روز کا کوئی تعلق تصوف کے مسائل و مشاغل سے تھا چنانچہ ان کے بہترین اشعار وہ نہیں جن میں مسائل تصوف کا ذکر آیا ہے بلکہ وہ اشعار ہیں جو تصوف کے وحدت الوجودی عقیدے کی یکسر نفی کرتے ہیں یا ان پر

اورنگ زیب قاسمی

ضرب لگاتے ہیں۔

حواشی:

۱۔ شذرات فکر اقبال مرتبہ ڈاکٹر جاوید اقبال و ترجمہ ڈاکٹر افتخار صدیقی صفحہ ۱۰۹ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول ۱۹۷۳ء

("اوراق" لاہور)

محمد علی صدیقی

اورنگ زیب قاسمی

استعارہ اور علامت

(ایک اہم عصری تفریق)

شاعری کی تفہیم اور انتقاد کے بارے میں زیادہ تر دو نظریات کار فرما نظر آتے ہیں۔ افلاطونی اور ارسطوئی۔ اگر مشرقی بوطیقہ کے حوالے سے بھی تنقید شعر پر غور کیا جائے تو اردو شاعری کی حد تک فارسی روایت کے تطبیع میں افلاطونی اور ارسطوئی انداز نظر نمایاں ملتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے منطقہ میں مشرقی روایت کی زوال حالی اور مغربی مکاتب تنقید کی مقبولیت نے بھی جس بنیادی تضاد کو پروان چڑھایا ہے وہ بھی افلاطونی اور ارسطوئی ہے ۔ بس فرق یہ ہے کہ اب ایرانی اور عرب نقادوں کے بجائے مغربی نقادوں کے افکار "نصاب تعلیم اور تنقیدی مباحث کا حوالہ بنتے ہیں۔

استعارہ اور علامت کے مابین فرق کی عمر تقریباً" نوع انسانی کی عمر کے برابر ہے نسل انسانی کی اولین اہم رزمیہ شاعری میں تمثال سازی کا جس قدر رواج ملتا ہے وہ ایک طرح سے استعارہ سازی ہی کا عمل ہے ۔ شاعری حسن حقیقی تک رسائی کا ذریعہ بھی ہے ۔ ابتدائی دور میں بھی حسن کا ظہور ایک نوع کی تخئیلی ربط و ضبط سے پیدا ہوا کرتا تھا۔ حسن تک رسائی کی تخئیلی کوششوں میں وہ شاعر سبقت لے جایا کرتے تھے جن میں اعلیٰ درجے کی تمثال سازی کی قدرت موجود ہوتی تھی۔ استعارہ سازی کیا ہے ؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے " یعنی وہ (استعارہ سازی) چیزوں کے ان علائق کو ابھار کرتی ہے جن کا کسی کو اس سے پہلے ادراک نہ ہوا تھا" اور استعارہ سازی سے آگے کی منزل یہ ہے کہ استعارے افکار کی سالم و مکمل تصویریں نہیں رہ پاتے بلکہ افکار کی قسموں یا ان کے حصوں کی علامتیں بن جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ علامت" استعارہ کے مقابلہ میں کسری اور اک کا دعویٰ کرتی ہے لیکن یہ اپنی بے پناہ اشاراتی قوت کی وجہ سے نہ صرف استعارہ کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ کل ادراک پر حاوی ہوتی ہے اور مفاہیم کی ترسیل کو اس قدر جامع اور رواں بناتی ہے کہ کامیاب علامت نگاری دراصل اعلیٰ پائے کی ایک ایسی تمثال سازی بن جاتی ہے کہ جو انسانی تجربے کو بے پناہ گہرائی اور ترفع بخشتی ہے ۔ تمثال سازی افلاطون کے مقابلہ میں ارسطوئی انداز نظر کے قریب ہے' ان معنوں میں کہ ارسطو شاعری کی پرکھ کے معیارات شاعری کے اندر تلاش کرتے ہیں ۔ جب کہ افلاطون کے یہاں شاعری الہامی ہے۔ شاعری کی پرکھ کے لئے ایک باقاعدہ "قانون" ہے یعنی بطلانہ شاعری کی تردید۔ افلاطون فیڈرس (phaedrus) میں اس تصور کو اس طرح پیش کرتا

ہے۔

" جنون کی تیسری قسم وہ ہے جو ان لوگوں کو لاحق ہوتی ہے جن کے سر پر فنون کی مقدس دو شیزاؤں کا سایہ ہو۔ یہ جنون کسی لطیف اور منزہ روح میں حلول کر جاتا ہے اور اس روح کے اندر ایک خروش پیدا کر کے اس سے غنائیہ کلام تخلیق کرتا ہے' جس میں قدیم زمانوں کے سورماؤں کے کارنامے آئندہ نسلوں کی ہدایت کے لئے بیان کئے جاتے ہیں لیکن اگر کسی شخص کو فی الواقع یہ جنون نہ ہو اور وہ بت خانے کے دروازے پر آکر دستک دے " اس امید پر کہ وہ اپنے ہنر کے بل بوتے پر اندر داخل ہو سکے گا" تو ایسے شخص کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے ' اس میدان میں فرزانہ دیوانے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

" مکالمات " میں سقراط نے داستان گو این ion سے ہم کلام ہوتے ہوئے کہا تھا:

" وہ ملکہ جو تمہیں ودیعت ہوا ہے محض ایک فن یا ہنر نہیں ' وہ ایک الہامی قوت ہے ' تم قدسی طاقتوں کے زیر اثر ہو۔ شاعر ایک لطیف الجلت' پرواز کی طاقت رکھنے والی اور مقدس ہستی ہوتا ہے اور وہ کوئی چیز اس وقت تک تخلیق نہیں کر سکتا جب تک کہ اس پر ایک الہامی قوت کا قبضہ نہ ہو جائے اور اس کے حواس یکسر زائل نہ ہو جائیں۔ خدا شاعروں کے دماغ معطل کر دیتا ہے اور پھر ان سے اپنے پیغمبروں کا کام لیتا ہے۔

ارسطو' افلاطون کے تصور نقل کے حق میں ہے' اس کے نزدیک تین قسم کی چیزوں کی نقل ممکن ہے۔

- وہ تمام چیزیں جیسی کہ وہ تھیں یا ہیں۔
- وہ چیزیں جیسی کہ وہ نقل کرنے والے کے تصور کے مطابق ہیں اور
- جیسا کہ انہیں ہونا چاہیے۔

افلاطون نے تیسری قسم کی چیزوں کو " مثال " کا نام دیا تھا۔ شاعر تیسری قسم کی نقل سے پہلی دو اقسام کی ناقص چیزوں کو کامل بنا دیتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک شاعری تاریخ نویسی سے زیادہ فلسفیانہ عمل ہے ۔ افلاطون کے یہاں شاعری اور فلسفہ کے مابین مماثلت ایک بعد عمل تھا لیکن ارسطو کے یہاں شاعری خود فلسفہ کے لئے بھی بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ ارسطو نے کیا عجیب و غریب بات کہی تھی کہ " قرین قیاس نا ممکنات کو خلاف قیاس پر ترجیح دینی چاہیے"

ظاہر ہے کہ مغرب کے بورژوا ادب میں گذشتہ چند دہائیوں سے جس رجحان نے فروغ پایا ہے وہ افلاطون سے زیادہ ارسطو کے تتبع میں ہے خالص ادب اور خالص شاعری کے وکلاء شاعری کی پرکھ کے لئے شاعری سے باہر کے نظریات کو خواہ ان کا تعلق سیاسی'معاشی ' معاشرتی یا کائناتی فکر سے ہو' شاعری کی قلمرو کے لئے " بیرونی " عناصر سمجھتے ہیں۔ جب تھامس لیوپیکاک (Thomas Lovepeacock) نے اپنی تصنیف " شاعری کے چار ادوار " میں دعویٰ کیا تھا کہ شاعری فضول مشغلہ بن چکی ہے اور بہتر یہ ہے کہ اس سے فراغت پالی جائے کیونکہ ایک ایسے دور میں جو علم ' عقل اور روشن خیالی کا دور ہے ' شاعری محض توہم پرستی کو اکساتی ہے اس مقالے کے جواب میں شیلی نے اپنا شہرہ آفاق مقالہ " شاعری کے دفاع میں "

(Defence of Poetry) رقم کیا تھا اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ " شاعر تخیل سے کام لے کر افلاطونی عالم امثال سے براہ راست تعلق پیدا کرتا ہے اور اس طرح محض ان مثالوں کے پرتو کی نقل نہیں کرتا بلکہ حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے بعد شاعری پر تابڑ توڑ حملے ہوئے ۔ میتھیو آرنلڈ نے شاعری کا بھرپور دفاع کیا لیکن

اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ " ہمارا مذہب امورِ واقعی ' فرضی امورِ واقعی ' کا مدعی بن کر گویا مادہ پرست بن گیا ہے ۔ اس نے اپنے جذبات کو امورِ واقعی کے ساتھ وابستہ کر لیا ہے اور امورِ واقعی نے اس کے ساتھ بے وفائی کی ہے لیکن شاعری کے لئے امورِ واقعی کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ اس کے لئے خیال ہی سب کچھ ہوتا ہے ۔ باقی سب مایا ہے ۔ وہم ہے ' فریب ہے ' شاعری اپنے جذبات کو خیالات کے ساتھ وابستہ کرتی ہے ' خیالات ہی اس کے لئے واقعات ہوتے ہیں۔"

جدید مغربی تنقید میں شیلے اور آرنلڈ کے دو متحارب دھارے اب مختلف رنگ بدل چکے ہیں لیکن شیلے اور آرنلڈ کے تنقیدی دھارے ساتھ ساتھ بہہ رہے ہیں ۔ یہ رویے بھی اپنی اصل میں افلاطونی اور ارسطوئی ہیں کیا دلچسپ صورت حال ہے کہ شیلے افلاطون کے ساتھ ہے اور آرنلڈ ارسطو کے ساتھ ۔ افلاطون اور ارسطو کے مابین جہاں اور بہت سے فرق ہیں وہاں تمثال سازی کے بارے میں تصورات میں بھی فرق ہے۔ افلاطون استعارہ کی اہمیت کے باب میں خاموش ہیں جب کہ ارسطو استعارہ اور پھر علامت کی ترقی یافتہ شکل کا موید ہے ارسطو تخلیقی قوت کی مدد سے استعارہ کو جس مقام پر فائز کرنا چاہتے ہیں وہ افلاطون کے ذہن میں دور دور تک موجود نہ تھا۔ ارسطو نے آج کے بورژوا ادب کو جمالیاتی اور مابعد الطبیعیاتی زبان کا خوگر بنایا ہے اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جسے آج کے علامت نگار اس درجہ اچھالتے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ استعارہ ہی سب کچھ ہے۔ اور علامت اس کی ترقی یافتہ شکل۔ اگر استعارہ اور علامت کو ابلاغ کی راہ میں سدِ راہ نہ بننے دیا جاتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن جب علامت ہی غایت اولیٰ بن جائے اور ابلاغ غیر ضروری بلکہ غیر ادبی مطالبہ۔ تو پھر اس بحث کے بارے میں غور و خوض ضروری ہو جاتا ہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ استعارہ بلاشرکت غیرے حکمران تھا۔ بسا اوقات علامتیں بھی توسیع شدہ استعاروں (Extended Metaphors) کے ذیل میں آجایا کرتی تھیں ' جب ہماری زندگیوں میں علم سے مراد کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانا جانے لگی اور ایک صدی پہلے کا سالم علم درجنوں ذیلیت علوم میں تقسیم ہونے لگا تو ہماری جمالیاتی زندگی میں کلیت کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ سائنس اور فنون میں کچھ اختلاف نظر ضرور ہے ۔ فنون میں سائنس کے برخلاف ' کلیت ساز اجزاء کو الگ الگ تناسب کے حوالے سے اور پھر پوری کلیت میں زندگی کی ارفع تر صورت گری کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مونالیزا کی مسکراہٹ صرف چہرہ کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ پورے وجود کا مطالعہ ہے ۔ اس وجود کا بھی جو مسکرانے والے کے وجود کے اندر پروان چڑھ رہا ہے۔ ارسطو سے کروچے اور پھر سوسین کے لینگر (Susank Langer) تک کا سفر استعارہ کا سفر ہے ' وہی استعارہ جو آج بھی شاعری کی جان ہے لیکن جب استعارہ محض الفاظ کے بار خانے کا عمل بن کر رہ گیا۔ اور اس لئے بہت ہی قابل تعریف تخلیقی قوت کا نشان تو پھر ایک زیادہ طاقتور " نشان " کی ضرورت پیش آئی جو استعارہ سے زیادہ حاوی اظہار کا نعم البدل ہو سکے اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا تھا جب انسانی زندگی پر حاوی رموز و کنایے (یعنی علامتیں) زندگی کی تشریح کا کام اپنے سر لے لیں۔ علامت اس طرح صرف ایک نشان یا نشاندہی کرنے والا اظہار نہیں رہ پاتی بلکہ پوری زندگی کا روپ دھار لیتی ہے ۔ علامت استعارہ سے کہیں زیادہ سلیس (Lucid) ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس کا استعمال کرنے والا اس درجہ اعلیٰ پایہ کا فنکار ہو کہ وہ اپنی علامت یا علامتوں کے لئے اپنے قارئین یا سامعین کے ذہن میں وہ فضا (Myth)

اورنگ زیب قاسمی

لاکھڑی کر دے جس میں وہ علامت سانس لیتی ہے اگر علامت مخفی ہے یعنی فنکار نے اسے توسیع شدہ استعارہ کی حیثیت سے تخلیق کیا ہے۔ تب بھی مخفی علامت اپنے تلازموں کی مدد سے اس درجہ روشن (Post Sign) کا روپ دھار لیتی ہے کہ علامتوں کے ذریعہ تخلیقی محاکات واضح تر ہو جاتے ہیں ۔ اگر ایسا نہیں ہو پاتا ہے تو اس میں علامت یا (Extended Metaphor) کا قصور نہیں ہے بلکہ یہ فنکار کا عجز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں کامیاب علامت نگاروں کی مختصر فہرست ہمیشہ موجود رہتی ہے لیکن ناکامیاب علامت نگاروں کی لمبی قطاریں بلبلوں کے جزم میں پہلے گونگی اور پھر معدوم ہوتی رہتی ہیں ۔ شاعرانہ انصاف کی ایک شکل یہ بھی ہے علامت کی ضرورت کیوں پیدا ہوتی ہے ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ علامت نگار صاف اور سادہ اظہار کا خوگر نہ ہو اور اپنے قارئین کے لئے صرف ایسے نفوس کا انتخاب کرنا چاہتا ہو جو اس کے تخلیقی عمل کی داد دے سکیں ۔ ہمارے حصہ میں زیادہ تر ایسے فنکار آئے ہیں جو حضرت " ادب برائے ادب " کے سہل انگار فلسفہ سے متاثر ہو کر اپنے کلام کے ابلاغ میں خواہ مخواہ رکاوٹیں کھڑی کرتے رہتے ہیں ۔ علامت نگاری کی ایک شکل وہ ہوتی ہے جو کلاسیکی غزل گو شعراء اور کلاسیکی شاعری کے ڈکشن کے زیرِ اثر نظم گوئی کا راستہ اختیار کرنے والے شعراء نے اختیار کی جیسے کہ فیض ' اختر الایمان ' ن۔ م راشد ' مخدوم ' علی سردار جعفری ' احمد ندیم قاسمی ' عزیز حامد مدنی اور بعض دیگر شعراء 'راشد اور اختر الایمان کی علامت نگاری کے نظام قدرے مختلف ہیں ' اول الذکر شعراء اور ان کے قبیل کے دیگر شعرا نے استعاروں کو علامتیں بنایا ہے۔ ان شعرا کی مخفی علامتیں بھی کسی دوسری شعری روایت کی مستقل البنیاد علامتی نظام سے اخذ کردہ ہوتی ہیں ۔ یہ تمام شعراء تضمینی اور تعبیری معانی میں فرق روا رکھتے ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی سائنسی اور ادبی اظہار کے مابین فرق مٹانے کی کوشش نہیں کی ۔ تقریباً تمام شعراء ابہام ' اہمال ' تناقض اور تضاد سے اعلیٰ پایہ کا ادبی کام لیتے ہوئے ملتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ تضمینی معانی محض حاشیہ آرائی اور خارجی زینت کا کام نہیں دیتے بلکہ وہ شاعرانہ اظہار کا ایک لازمی عنصر ہوتے ہیں۔ شاعری ' الفاظ کے متعین معنوں کو مجھوڑتی رہتی ہے اور اس طرح لغوی معنی کی اہمیت کم کرتی رہتی ہے استعارہ تحویلی (سائنسی) اور جذباتی (شاعرانہ) اظہار سے ہٹ کر چلتا ہے۔ علامت و استعارہ کے مابین ایک فرق یہ ہے کہ استعارہ میں تحویلی و جذباتی اظہار کے بارے میں جس کج روی کا مظاہرہ ملتا ہے ' وہ علامتی اظہار میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے ۔ علامتی اظہار دراصل زیادہ موثر اور کامیاب استعاراتی اظہار کے خام مواد سے جنم لیتا ہے۔ یہ بڑی حد تک ایک وجدانی عمل ہے ۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس ہوستہ میں تشبیہہ اور استعارہ کی بحث ہنوز جاری ہو اور استعارہ کے حق میں زیادہ ووٹ پڑ رہے ہوں وہاں علامتی اظہار کا چلن ایسا ہی ہے جیسے سادہ تر طرزِ بیان کی خوگر پبلک کے لئے بہت زیادہ پیچیدہ طرزِ اظہار پر اصرار علامتوں کو شعوری طور پر سمجھنے کے لئے جس تعلیمی استعداد کی ضرورت پیش آتی ہے ' وہ فی الحال ہمارے یہاں چند فیصد قارئین میں پائی جاتی ہے ۔ عوام الناس لوک ورثہ کی کہانیوں اور گیتوں میں تہذیبی علامتوں کی موجودگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن جب یہی علامتیں زبان اور (Syntax) کی شکست و ریخت اور درآمد شدہ لفظیات اور تجربات کی مدد سے پیش کی جاتی ہیں تو یہ علامتیں مذاق بن کر رہ جاتی ہیں۔

استعارہ اور علامت ایک طرز نگارش ہی نہیں بلکہ ایک طریقہ تفکر کی نشاندہی کرتے ہیں اربن ؔ اپنی تصنیف (Language and Reality) میں لکھتا ہے۔

" تمام شاعرانہ علامات یا تو بجائے خود استعارے ہوتی ہیں یا استعاروں سے پیدا ہوتی ہیں لیکن علامت استعارہ سے بڑی چیز ہے۔ استعارہ صرف اس وقت علامت بنتا ہے جب ہم اس کے ذریعہ کوئی مثالی مضمون جو اور کسی طرح ادا نہ کیا جاسکے' ادا کریں ـــــ ہم استعارے کا استعمال تمثیلی طور پر اس وقت کرتے ہیں جب ہمیں ایسے افکار یا منطقی قضیے بیان کرنے ہوں' جن کا اظہار غیر مجازی الفاظ میں کیا جاسکتا ہو۔ استعارہ اس وقت علامت بنتا ہے' جب وہ اظہار مطالب کا واحد وسیلہ ہو ـــــ " علامت دراصل طبعی چیزوں کی تمثالوں یا خصوصیتوں کی مدد سے اتفاقی یا روحانی چیزوں کی نمائندگی کرنے والا لفظ یا غیر لفظی نشان ہوتا ہے۔

شاعر فاعلی استعاروں' نہ کہ تزئینی اور تمثیلی استعاروں کو کام میں لاتا ہے۔ علامت نگاروں نے اس بات کو یہاں تک کھینچا کہ کسی نظم کو اپنے وجود سے باہر کسی اور معنی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے اب علامت نگاری کی تحریک بذات خود ایک فلسفہ شعر بن گئی اور علامتی نظموں کی تاویل و تشریح اس طور کی جانے لگی کہ انسانی زندگی سے متعلق تمام علوم راندۂ درگاہ کر دیئے گئے۔ اس مکتب شعری رو سے شاعری کے کسی شہ پارہ کی اس طرح تاویل نہیں کی جاسکتی کہ نظم کے سیاسی معاشرتی' معاشی' تاریخی یا کائناتی سیاق پر روشنی ڈالی جاسکے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعریف اس قدر غلط بنیاد پر استوار ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے بیشتر ترقی پسند شعراء نے اپنی اعلیٰ معیاری شاعری کے ذریعہ " علامتوں " کو انقلاب کی سرخی میدان کار زار اور صبح بنا دیا۔ انقلاب کے شاعروں نے انقلاب کو ایک ایسی چیز سے مشابہت کر دیا جس کے لئے تزئینی اور تمثیلی استعاروں کا استعمال زور پکڑ گیا اور اس طرح استعاراتی اور علامتی اظہار کے باوجود ایک مخصوص (Rhetric) نے جنم لیا۔ جس کا وجود انقلاب کے خواب یا ذاتی تجربے کے ساتھ مخصوص ہے۔ علامت نگاری کے بارے میں پر از غلو داخلیت کے عقیدہ کی ڈانگ اس مضحکہ خیز دعویٰ پر ٹوٹی ہے کہ "شاعر اپنے کلام کے معانی سے خود بھی آشنا نہیں ہو سکتا" شاعری کیا ہوئی ایک ایسا وڈیو گیم (Video Game) ہو گئی۔ جسے شاعر کامل غیر جذباتیت کے ساتھ کھیلتا رہے اور بس (پال ویلری) (Paul Valery) کے مطابق " اعلیٰ کلام میں اکثر اوقات اتنی ہمواری' اتنی روانی اور اتنی بے تکلفی ہوتی ہے کہ پڑھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ گویا وہ تمام و کمال آورد کا نتیجہ ہے یعنی کسی خارجی قوت نے شاعر کو اپنا آلہ کار بنا کر اسی سے کہلوایا ہے اس کا نام حرف عام میں وجہ الرم انسام' القائد وغیرہ ہے۔

یہی وہ موڑ ہے جہاں سے شاعری کے بارے میں اس نوع کی بوعتیں بلکہ بوعیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جن کی رو سے شاعری کا ترجمہ یا شرح شاعری کے ساتھ مذاق ٹھہری ہے بلکہ ایک بات بڑی شدومد کے ساتھ کہی گئی کہ " اگر ہم کسی علامت کے مطلب کی تفسیر کرنا چاہیں تو ہمیں اس کی تشریح کرنی پڑتی ہے۔ یہ تشریح صرف لغوی زبان میں کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر ہم ایسی تشریح کریں تو علامت کا مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی علامتی حیثیت زائل ہو جاتی ہے" اب معاملہ قدرے صاف ہو جاتا ہے' علامت بے شک استعارہ سے بھی زیادہ موثر اظہار کی ایک شکل ہے لیکن علامت کی تشریح ضروری ہے اور قاری کی تشریحی صلاحیت ہی پر علامت سے حظ اندوزی ممکن ہو پائے گی۔

ترقی پسندوں کے یہاں علامت سے زندگی کی تفہیم کا کام لیا جاتا ہے علامت ذہن انسانی کی انتہاء ارتقا یافتہ

اورنگ زیب قاسمی

زبان ہے۔ جسے علوم کے تقابل باہمی کے ذریعے ہی سمجھا جاسکتا ہے ارسطو کے یہاں استعارہ یا علامت سازی کی بے پناہ طاقت ودیعت کی گئی ہے ہر وہ شے جسے انسان نے پیدا کیا ہے بذات خود علامت ہے علامت ہی وہ چابی ہے جو ہر سوال کا دروازہ کھولتی ہے علامت نگاری کے باب میں یہ خیال کہ علامت اپنی تشریح سے فوت ہو جاتی ہے کچھ ایسا ہی ہے کہ جیسے کہ ہمیں علامتی دور میں رہتے ہوئے بھی علامتوں کی تفہیم سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے یہ بڑا دلچسپ بلکہ مضحکہ خیز مطالبہ ہے۔ موجودہ دور شاید اسی لئے علامتی دور ہے کہ اس دور کا سب سے حاوی پہلو سائنسی فکر سے عبارت ہے اور تمام سائنسی (Formulations) اپنی بنیاد میں اعلیٰ درجہ کا علامتی اظہار ہوتے ہیں۔ سائنسی دور میں علامتوں کو ماورائے تشریح سمجھنا گویا" ذہنی کج روی سے زیادہ اعلانیہ علم و سائنس دشمنی ہے۔ حیرت ہے کہ ادب میں استعارہ اور علامت کے وکلای استعارہ اور علامت کو الہامی و اتفاقی بنانے پر تلے ہوئے ہیں جبکہ زندگی دوست ادباء اور قارئین ادب استعارہ اور علامت کی خوبصورتیوں سے نہ صرف بہرہ مند ہونے کے قائل نظر آتے ہیں بلکہ علامتی حسن سے رغبت اور ترقی کے لئے ایک ایسے معاشرے کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں' جہاں غربت' جہالت اور بیماری کے پیدا کردہ رکاوٹات (Inhibitions) اور رکاوٹوں (Bottle Necks) کو دور کر دیا گیا ہو۔ میں استعارہ اور علامت کے مابین اس بین فرق پر زور دینا نہیں چاہتا۔ جس کی رو سے استعارہ غیر واضح اور پیچیدہ اور علامت واضح اور صاف تصریحی ہے۔

علامت اپنی تمام تر انفرادیت میں بہرطور' نفس مضمون کے باطن میں پائی جانے والی ابہام' اجمال' تناقض اور تضاد کو دور کرتی ہے اور ایک ایسا رہا معنوی اور صوری سامنے لاتی ہے جس سے lization Rationa آسان ہو جاتا ہے۔ علائم نگاری زبان و بیان کی خوبیوں سے حد درجہ متمتع ہونے کی ایک سعی ہوتی ہے جس کے حصول میں صرف وہی ادبا اور شعراء بہ طریق احسن کامیاب ہو پاتے ہیں' جو محض اس لئے علائم نگاری کی جانب متوجہ نہیں ہوتے کہ اس میدان میں بڑے بڑے نام جو گزرے ہیں۔ کامیاب علامت نگار صرف وہی شاعر ہو سکتا ہے جو اپنے اظہار کی خارجی منطق اور باطنی منطق کو ایک دوسرے پر منطبق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس کے لئے علائم نگاری صفحہ قرطاس پر ایک رقص معنی بن کر رہ جائے علائم نگاری صرف ان ادیبوں پر سجتی ہے جو تفصیلات سے بکسر یا بڑی حد تک اجتناب برتنے کے فن سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ حقیقت نگاری کے برخلاف علائم نگاری ایک خاص قسم کی انتخابیت (Selectivity) سے مشابہ ہوتی ہے۔ فنکار' علامتوں کے استعمال پر قدرت کے ذریعے زیادہ ٹھنڈے اور جذباتی طور پر متوازن کرہ احساس میں داخل ہو جاتا ہے علامت جز کا کل کے ساتھ معنوی رشتہ استوار کرتی ہے یہ ایک طرح سے (Microcosm) کے ذریعہ (Macrocosm) تک پہنچنے کا ذریعہ ہے زبان بذات خود علامت ہے اور اس علامتی بنت میں زیادہ مختصر تجرید کے ذریعے جزے اور واضح مفہوم کی طرف سفر جس قدر دلکش ہو سکتا ہے' اسی قدر مشکل اور خطرناک بھی بسا اوقات علامتی اظہار کے چہار عمل میں بہت سی علامتیں اپنے رمی اور متعین معانی کھو بیٹھتی ہیں اور رمی اور متعین معنوں کی موت سے نئے معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔ بعض ترقی پسند شعراء نے اردو میں خصوصیت کے ساتھ فیض احمد فیض نے رمی اور متعین علامتوں کو بکھرتے مفاہیم دے دیئے ہیں۔ لورکا اور نرودا کے یہاں یہ عمل اور بھی زیادہ شدید ہے۔ بعض غیر ترقی پسند شعراء کے یہاں اسی نوع کا عمل موجود ہے

مثلاً" ایلیٹ اور پاؤنڈ کے یہاں لیکن وہ خود پر جس نوع کی منفی صلاحیت (Negative Capability) کی قید لگاتے ہیں اس سے شاعر اور تخلیق میں یک گونہ بعد اور مغائرت پیدا ہوجاتی ہے جو ترقی پسند بوطیقہ شاعری کے یکسر خلاف ہے۔

اصل فرق کس قدر کم تبدیل ہوا ہے آج بھی افلاطون ' شیلے اور ترقی پسند فکر سے مطابقت رکھنے والے ارسطوئی بوطیقہ کی اس بنیادی فکر سے متصادم ہیں کہ شاعری کی قدریں خود اس کے اندر ہوتی ہیں ' ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ کے اس خیال کے خلاف صف آراء ہیں کہ شاعری ذات کی ترجمانی نہیں بلکہ ذات سے فرار ہے ۔ تشریح سے ماورا علامتوں پر قرنوں تر زور ارسطوئی مکتب فکر کا خاصہ ہے۔

ارسطوئی مکتب فکر کے حضرت علامت کو عرض حال کے بجائے اخفائے حال کے لئے استعمال کر رہے ہیں تاکہ شاعری بذات خود وہ جزیرہ بن جائے جس کے کنارے دوسرے علوم کے ساحلوں سے نہ مل پائیں ' یہ اور بات ہے کہ ساختیات (structuralism) اور اس کے بعد متن آفرینی کا مکتب فکر (Deconstruction) نے شاعری کو محض ایک (Rhetoric) بنا کر رکھ دیا ہے اور ظاہری متن کے بطن سے ایک اور متن (Construct) پیدا کرنے کے شوق میں استعارہ اور علامت ہی کیا ادب کا بیانیہ اور ماوطلاقی کردار مجروح ہوتا دکھائی دے رہا ہے ' ہرچند کہ ساختیاتی Structural تنقید دم توڑ چکی ہے لیکن متن آفرینی کا مکتب فکر بھی ساختیاتی مکتب فکر کی طرح فقط فکر یا " مقصد " کے خلاف ہے۔

ہمت افزا بات یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی ترقی کا مرحلہ ہے ہمارے یہاں ایسے تمام فیشن ایبل ادبی نظریات کی کوئی گنجائش نہیں ہے ' جو ادب سے زندگی کا شعور چھین لینا چاہتے ہیں چونکہ ان کے نزدیک سیاسی اور سماجی شعور کی شرط " قیراطی " ہے ممکن ہے کہ دنیا کی سب سے مضبوط معیشتوں میں شاعری اور ادب غیر ضروری قرار دے دیئے جائیں چونکہ وہ اشتراکی معیشتوں سے زیادہ فعل اور طاقتور ہونے کا دعویٰ کر رہی ہیں اور شاید (Peacock) کے ۱۸۲۰ء کے مشورہ پر بہت تاخیر سے عمل پیرا ہونے کا ارادہ رکھتی ہیں ۔ لیکن ترقی پذیر ممالک کے بارے میں یہ کلیہ کس طرح نسب قرار دیا جاسکتا ہے۔ استعارہ اور علامت کی بحث ہمارے لئے افلاطونی یا ارسطوئی بوطیقہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارے لئے شاعری کے " روز قیامت " کی باتیں اتنی ہی لایعنی ہیں جتنا کہ یہ خیال کہ ہمارے یہاں ان طریقوں (Methodologies) پر گرفت حاصل کرلی گئی ہے جس سے متن (Text) کے بطن سے ایک اور متن وضع (Construct) کیا جاسکے گا۔

ہمیں افلاطونی اور ارسطوئی نظریات میں سے کسی ایک نظریہ کی تقلید سے گریز پائی کی ضرورت نہیں بلکہ استعاروں اور علامتوں کے رد و قبول کے بجائے ان کے ابلاغ پر زور دینا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں مکس میولر (Max Mueller) کے تتبع میں بنیاد استعارہ اور شاعرانہ استعارہ میں بھی فرق روا رکھنا چاہیے۔ شاعرانہ استعارہ کیا ہے ؟ اگر ایک اسم یا فعل کو جو کسی معین شے یا عمل سے منسوب ہے ' کسی اور شے یا عمل سے منسوب کر دیا جائے مثلاً" سورج کی کرنوں کو سورج کے ہاتھ یا انگلیاں کہا جائے تو یہ شاعرانہ استعارہ کا روپ دھار لیتا ہے اور اگر سورج کی کرنوں کو طاقت کا سرچشمہ سمجھ لیا جائے۔ تو یہ علامت دراصل لفظ کے اندر پنہاں ایک سیاق و سباق اور اس کے اصل یا جوہر کی طرف ایک ایسے اشارے سے عبارت ہے ' جو ظاہر سے باطن اور پھر اس کے حقیقی جوہر کی جانب سفر کرنے پر مجبور کردے۔

اورنگ زیب قاسمی

اکثر شعراء کی علامتیں بڑی یک طرفہ ہوتی ہیں ۔ وہ نفس مضمون سے علیحدہ نظر آتی ہیں زیادہ بہتر علامت وہ ہے جو فطری ہو اور نفس مضمون کے ساتھ پیوست ہو وہ ایک ایسی (Myth) کا جزو ہو جو ہماری یادوں میں بسا ہوا ہو' اگر علامت کے پس پشت قیاس اور بنیادی تعقل کا نشان نہ ہو ' جیسے وقت کا تصور اس کے پیچھے سمندر اور سمندر کے ساتھ مدوجزر کی **نغمگی** ۔ اگر سمندری لہروں کی **نغمگی** سے وقت کا تصور نہ ابھرتا ہو تو پھر وقت کی علامت خارجی (Extrinsic) یا یک طرفہ (Arbitrary) قرار پائے گی ' یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ سب سے پہلے ظاہر قدرت یا انسانی فعل کی آواز تھی پھر اس آواز کا نشان اور اس کے بعد علامت' علامت اصل منظر تک اور اصل منظر علامت تک ایک ٹائم مشین کے مسافر کی طرح سفر کرتے رہتے ہیں ۔ ہر علامت کا امتحان ہی یہ ہے کہ وہ آپ کے قیاس کو کہاں تک لے جاسکتی ہے۔ اگر وہ ہماری توجہ اصل واقعہ منظر یا کردار تک نہیں لے جاسکتی تو پھر علامت ' استعارہ بھی نہیں بن پاتی کجایہ کہ وہ استعارہ کی ترقی یافتہ شکل ہو۔

استعارہ اور علامت کی بحث زیادہ موثر ابلاغ سے متعلق ہے اور اگر یہ بحث اخفائے مطلب کی وظیفہ خوار بن جاتی ہے تو پھر یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی " ادب برائے ادب " کا ایک ادنیٰ سا کرتب ہے کہ شاعری کو تشریح اور تاویل سے محروم کرکے اسے کائنات سے الگ تھلگ کر دیا جائے۔ معروف معنوں میں علامت نگاری ' فی زمانہ اخفائے حال سے عبارت ہو کر رہ گئی ہے ۔ یعنی انسداد ابلاغ کی ایک شکل موخر الذکر شکل کے علاوہ جو شکل ہے وہی افلاطونی شیلیائی (Shelleyian) اور زندگی افروز مکتب فکر ہے جو علامتی اظہار کے اصل مقصد یعنی زیادہ بہتر اظہار کا موئد اور وکیل ہے۔

("تشکیل" کراچی)

" تاریخ تصوف " اقبال کی ایک نامکمل کتاب

علامہ اقبال ابتدا میں تصوف کے معترف تھے۔ انہوں نے سلسلہ قادریہ میں بیعت بھی کی تھی۔ ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے سے بھی ان کی تصوف میں گہری دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کی مایوسی اور بے عملی کی حالت دیکھ کر انہوں نے طے کیا کہ قوم کی مایوسی کو دور کیا جائے اور اسے عزم و عمل کی راہ پر گامزن کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اس سطحی تصوف کی مذمت ناگزیر تھی جو بے سروسامانی میں گھری ہوئی مسلمان قوم کو تن بہ تقدیر کر کے مزید بے عمل اور مایوسی کا شکار بنا رہا تھا۔ اس حوالے سے اقبال نے جہاں یونانی فلسفی افلاطون کے ایسے افکار پر تنقید کی وہیں فارسی کے عظیم شاعر خواجہ حافظ پر بھی نکتہ چینی کی۔ یہ ۱۹۱۵ء کی بات ہے۔ مثنوی " اسرار خودی " میں اقبال کے خیالات سامنے آئے تو ان کی مخالفت میں ایک طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ حافظ اور تصوف کی حمایت میں اقبال پر شدید اعتراضات کئے گئے۔ بعض صاحبان نے تو مثنوی " اسرار خودی " کا باقاعدہ جواب لکھا۔ اس معرکہ آرائی میں خواجہ حسن نظامی پیش پیش تھے۔ اقبال نے رسائل و جرائد کی حد تک ان اعتراضات کے جوابات دیئے اور اپنے موقف کی وضاحت کی تاہم اب انہیں تصوف کی اسلام میں حیثیت پر سنجیدگی سے غور کرنے کا موقع ملا۔ اس غور و خوض نے انہیں اپنے تصور خودی میں مزید پختہ کر دیا اور برصغیر کے مسلمانوں کی بقا اور فلاح ان کا نصب العین بن گیا۔

علامہ اقبال کے والد کو حافظ سے ایک گونہ عقیدت تھی چنانچہ انہوں نے ذاتی طور پر اقبال کو نصیحت کی اکبر الہ آبادی نے بھی غلط فہمی کے باعث عام مسلمانوں میں پیدا ہونے والے اشتعال کو محسوس کیا اور اقبال کو مشورہ دیا۔ چنانچہ اقبال نے " اسرار خودی " کا دیباچہ کتاب سے نکال دیا اور حافظ کے بارے میں وہ اشعار بھی حذف کر دیئے جو تنازعہ کی صورت اختیار کر کے مسلمانوں کے باہمی جھگڑے کا باعث بن رہے تھے اس سارے عمل کے دوران اقبال اسلام میں تصوف کی حیثیت کے تعین کی جو کوشش کرتے رہے اس حیثیت کا اندازہ ان کے ایک مضمون کے اس اقتباس سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ " مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک عرصہ تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیاء کے ساتھ خاص ہیں اور بعد میں قرآن شریف پر تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے ..... تصوف کے مقاصد سے مجھے کیونکر اختلاف ہو سکتا ہے کوئی مسلمان ہے جو ان لوگوں کو برا سمجھے جن کا نصب العین محبت رسول ﷺ ہے اور جو اس ذریعہ سے ذات باری سے تعلق پیدا کر کے اپنے اور دوسروں کے ایمان کو پختگی کا باعث ہوتے ہیں اگر میں تمام صوفیاء کا مخالف ہوتا تو مثنوی میں ان حکایات و منقولات سے استدلال نہ کرتا۔" (مضمون اسرار خودی تصوف از

اورنگ زیب قاسمی

علامہ اقبال مطبوعہ اخبار وکیل امرتسر ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء) اسی مضمون میں اقبال نے یوں اپنا ارادہ بھی ظاہر کیا:

" اگر وقت نے مساعدت کی تو میں تاریخ تصوف کی مفصل تاریخ لکھوں گا۔ انشاء اللہ ایسا کرنا تصوف پر حملہ کرنا نہیں بلکہ تصوف کی خیر خواہی ہے کیونکہ میرا مقصد یہ دکھانا ہو گا کہ اس تحریک میں غیر اسلامی عناصر کون کون سے ہیں۔"

اقبال نے " تاریخ تصوف " کے موضوع پر اپنی کتاب کے دو باب لکھے اور مزید نوٹس بھی تیار کئے لیکن پھر اسے ایک تو اس لئے مکمل نہ کر سکے کہ انہیں اس موضوع کے متعلق سے مناسب مواد نہیں مل پایا جیسا کہ اقبال کے اس خط سے واضح ہو رہا ہے میں نے ایک تاریخ تصوف کی لکھنی شروع کی تھی مگر افسوس کہ مسالہ نہ مل سکا اور ایک دو باب لکھ کر رہ گیا۔ پروفیسر نکلسن " اسلامی شاعری اور تصوف کے نام سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں جو عنقریب شائع ہو گی ممکن ہے یہ کتاب ایک حد تک وہی کام کرے جو میں کرنا چاہتا ہوں " (مکتوب اقبال بنام مولانا اسلم جیراجپوری ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء) کتاب مکمل نہ کر سکنے کی دوسری وجہ ڈاکٹر محمد ریاض کے مطابق یقیناً " یہی تھی کہ " انہوں نے دیکھا کہ آہنگ خودی عالمگیر ہوتا جارہا ہے لہٰذا مخالفانہ جوابات میں قوت صرف کرنا انہوں نے مناسب نہ جانا اور ان کا یہ فیصلہ صائب تھا۔" (پیش گفتار از ڈاکٹر محمد ریاض کتاب " تاریخ تصوف " صفحہ ۱۰)

ہر چند اقبال نے اپنی ادھوری کتاب کو مکمل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی لیکن عاشقان اقبال کے لئے تو ان کی ہر تحریر اور ان کا لکھا ہوا ہر حرف تبرک کا درجہ رکھتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر صابر کلوروی بھی ایک ایسے ہی عاشق اقبال ہیں۔ انہوں نے پی ایچ ڈی کے لئے " باقیات شعر اقبال " جیسے اہم اور تحقیق طلب موضوع کو اپنایا۔ دردر کی خاک چھانی اور گوہر مقصود یوں ہاتھ آیا کہ علامہ کے ذاتی کاغذات اور بیاضوں تک جا پہنچے۔ مسودات کی چھان پھٹک کے دوران انہیں ان کا وہ نا تمام نثری مسودہ بھی مل گیا جو ان کے مختلف خطوط میں " تاریخ تصوف " کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پی ایچ ڈی کے مقالے سے فراغت کے بعد صابر کلوروی صاحب نے اس نایاب ادھوری کتاب پر کام شروع کیا۔ کتاب کے پہلے دو ابواب مکمل تھے تیسرے باب کے لئے اقبال نے نوٹس تیار کر لئے تھے بلکہ اگلے ابواب کے لئے متفرق اشارات لکھ لئے تھے۔ صابر کلوروی صاحب نے پہلے دو ابواب کے ساتھ نہایت اہم حواشی دیئے نیز اگلے نامکمل ابواب جو نوٹس اور اشارات کی شکل میں ہیں۔ ان کے ساتھ بھی حواشی درج کر کے تصوف اور اقبالیات کے طالب علموں کے لئے بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔ یہ حواشی خاصی تحقیق اور محنت کے ساتھ ترتیب دیئے گئے ہیں۔ تصوف کے بارے میں اقبال کے افکار کا جائزہ لینے کے لئے یہ کتاب " تاریخ تصوف " بے حد مفید اور اہمیت کی حامل ہے۔

باب اول (تصوف کی ابتدا کیوں کر ہوئی) میں علامہ اقبال نے بڑے عالمانہ انداز سے یونانی تصوف کی کہانی بیان کی ہے تصوف کا اصل نام علم باطن ہے۔ باطنی تحریک کا آغاز فیثا غورث سے ہوا۔ فیثا غورث کے خیالات کو افلاطون نے ایک مکمل فلسفے کی صورت میں پیش کیا۔ اقبال کے نزدیک تب تک " یہ تمام باطنی حقائق محض ایک فلسفہ تھے۔" پلوٹائنس نے بعد میں نوفلاطونیت کی بنیاد رکھی اور اسے ایک نصب العین کے طور پر رومن قوم کے سامنے پیش کیا۔ پلوٹائنس رومن نژاد فلسفی تھا اور ۲۰۳ یا ۲۰۵ قبل مسیح پیدا ہوا تھا۔ اقبال نے پلوٹائنس کے فلسفے کو یوں بیان کیا ہے:

ہر فلسفی نظام کا ایک پہلو خالص فلسفہ ہے اور دوسرا پہلو خالص مذہبی اور اخلاقی ہے اس حکیم کے نزدیک ذات باری وراء الورا ہے اور انسانی ادراک سے بالاتر اگرچہ ہم اس کی طرف کسی قسم کی صفات کو منسوب نہیں کر سکتے تاہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حقیقی قوت فاصلہ وہی ہے اور نظام عالم اسی کا ظہور ہے اگر ہم یہ پوچھیں کہ ذات باری وراء الورا ہے تو تخلیق عالم کا فعل کیونکر اس کی طرف منسوب کیاجاسکتا ہے تو اس کا جواب پلوٹائنس استعاروں کی صورت میں دیتا ہے یعنی نظام عالم کی تخلیق ہستی مطلق کے اندر حیات کی طغیانی آجانے کی وجہ سے ہوئی۔ چونکہ ایک سے ایک ہی صادر ہو سکتا ہے۔ یعنی وحدت بھی وہی کچھ دکھا دیتا جو میں دیکھ رہا ہوں تو یہ مجھے بھی سزا نہ دیتے۔ اور اگر مجھ سے وہ چیز چھپالیتا جوان سے چھپا رکھی ہے تو میں بھی "انا الحق" کا نعرہ نہ لگاتا۔ اے اللہ میرے قاتلوں کو معاف کر دے۔" (تاریخ تصوف صفحہ ۸۳) جب آپ کو شہید کیا گیا اس کا حال یوں بیان کیا گیا ہے۔

"تذکرۃ الاولیا میں لکھا ہے کہ حلاج کے ہر عضو سے انا الحق کی آواز آتی تھی اور ان کے خون کا ہر قطرہ اللہ اور انا الحق کی شکل اختیار کر لیتا تھا تاریخ قزوینی میں درج ہے کہ "جب منصور کو پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا گیا تو اس نے کہا جب مجھے جلایا جائے گا تو دجلہ کا پانی چڑھ جائے گا۔ اس سے بغداد کے غرق ہونے کا خدشہ ہو گا۔ ایسے وقت میں میری راکھ کو اس پانی میں ڈال دینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب راکھ پانی میں پھینکی گئی تب سیلاب تھما۔" (تاریخ تصوف صفحہ ۸۳۔۸۴)

علامہ اقبال کو بھی حسین بن منصور حلاج کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا پڑیں اور یوں ان کی رائے تبدیل ہو گئی۔ یہاں تک کہ حلاج کے دعویٰ انا الحق کو اقبال نے خودی کا بھید قرار دیا:

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی — مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش
حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر — اک مرد قلندر نے کیا راز خودی فاش

پھر حلاج کے بارے میں علمائے ظاہر کے موقف پر یوں طنز کیا:

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی — کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

"زبور عجم" میں اقبال نے حلاج کو "صدیق خودی" قرار دیا:

دگراز شکوہ منصور کم گوئے — خدارا ہم براہ خویشتن جوئے
بخود گم بہر تحقیق خودی شو — انا الحق گوئے و صدیق خودی شو

اور "جاوید نامہ" میں تو گویا اقبال نے خود منصور کا کام سنبھال لیا ہے جب فلک مشتری پر حلاج سے اقبال کی ملاقات ہوتی ہے تو حلاج اقبال سے کہتے ہیں:

آنچہ من کردم تو ہم کردی بترس — محشری بر مردہ آوردی بترس

یعنی تو بھی تو وہی کر رہا ہے جو میں نے کیا۔ اس لئے مرے انجام سے سبق سیکھ۔

"باب چہارم" (اسلام اور تصوف) میں علامہ اقبال نے ایک طرف ایسے نوٹس تیار کئے جن میں صوفیائے کرام کی عظمت کا اقرار ہے یہ وہ صوفیائے کرام ہیں جو باعمل تھے اور جن کی زندگیاں تمام مسلمانوں کے لئے آج بھی مشعل راہ ہیں جبکہ دوسری طرف اقبال نے ایسے متکلمین کے نام بھی جمع کئے ہیں جو بظاہر مسلمان تھے لیکن بباطن مانوی یا ثنوی تھے مثلاً صالح بن عبدالقدوس، محمد بن عبید اللہ اور یزدان بخت وغیرہ۔

اورنگ زیب قاسمی

اہم اشارات کی صورت میں اقبال نے اسلامی تعلیمات اور صوفیانہ تعلیمات کا موازنہ بھی کیا ہے۔

باب پنجم (تصوف اور شاعری) میں اقبال نے چند ایسے فارسی اشعار جمع کئے ہیں جو اسلامی عقائد اور تعلیمات سے متصادم ہیں حافظ، عرفی، خواجو کرمانی، رازی، نظامی، غالب، دارا شکوہ، صائب، ابو طالب کلیم، خواجہ شیراز، بیدل، ابوالفضل جیسی بلند پایہ شخصیتوں کے اشعار اپنے معانی کے لحاظ سے اسلام سے متصادم ہیں تاہم اقبال یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ فلسفے کی صورت میں تصوف مسلمانوں کی عملی زندگی میں شدید نقصان دہ ثابت ہوا ہے برصغیر کے اس زمانے کے مخصوص سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کے پس منظر میں اقبال کا موقف بالکل درست تھا۔ اس وقت مسلمانوں کو عزم و عمل اور مسلسل جدوجہد کی راہ پر گامزن نہ کیا جاتا تو مسلمان آج بھی غیر مسلم حکمرانوں کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے ہوتے اور دنیا کی پسماندہ ترین قوم شمار کئے جاتے۔ علامہ اقبال کا ہم پر احسان ہے کہ انہوں نے وقت کے تیور کو پہچانا، اس کی آواز کو سمجھا اور اس کے مطابق مسلمان قوم کو تیار کرنے کے لئے اپنے تصور خودی کو واضح کیا۔ تصوف کے مثبت اور باعمل پہلو کی تعریف کرنے کے ساتھ پیشہ ور صوفیوں کے طور طریقوں کو اجاگر کیا ان کی زندگی کی بے عملیوں اور بدعملیوں کو واضح کیا اور اس طرح تصوف کے نام پر رائج کی جانے والی مریضانہ اور تعطلانہ روش کی مذمت کرکے مسلمان قوم کو عزم و عمل کی راہ پر گامزن کیا اور اس میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی۔

علامہ اقبال کی ادھوری کتاب "تاریخ تصوف" اس زمانے کے مسائل کی ہمیں پوری کہانی سناتی ہے شرط صرف یہ ہے کہ سننے والے کان ہوں یہ کتاب تبرکات اقبال میں بے حد اہم ہے اسے دریافت کرنے اور پھر اس کی ترتیب و تدوین پر اس کے مرتب پروفیسر ڈاکٹر صابر کلوروی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

("اوراق" لاہور)

مفکر انقلاب ایران ۔ ڈاکٹر علی شریعتی اور اقبال کے ذہنی روابط

علامہ اقبال نے اپنے ملی خاکستر میں جب بھی دبی چنگاریوں کی بات کی یا تازہ انجم کا فضائے آسمان میں ظہور اپنی چشم بین آنکھ سے دیکھا' یا کھوئے ہوؤں کی جستجو میں کوئی سمت غبار آلود دیکھی تو مسلم نشاۃ الثانیہ کے خواب کی تعبیر پانے پر والہانہ سرشاری کا اظہار کیا' فارسی کو ذریعہ اظہار بنانے کا ایک سبب افغانستان' ایران اور وسط ایشیا کے مسلمانوں سے مخاطبت کی وہ آرزو تھی' جو آج ان علاقوں میں مسلمانوں کی ذہنی اور سیاسی بیداری کے واضح آثار کے حوالے سے اپنی باثر معنویت واضح کرتی ہے۔

آل احمد سرور کے نام ۱۲ مارچ ۱۹۳۷ء کے ایک مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں:

" تیموری روح کو اپیل کرنے سے تیموریت کا زندہ کرنا مقصود نہیں' بلکہ وسط ایشیاء کے ترکوں کو بیدار کرنا مقصود ہے۔"

(اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط' ماہ نو' لاہور' اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۳۳۲)

پھر اقبال کے کلام میں ابن یمین' سرمد' بوعلی سینا' فردوسی' خیام' فارابی' غزالی' رازی' بابا طاہر عریاں' خواجہ نصیر طوسی' عطار' سنائی' شیخ محمود شبستری' ناصر خسرو' رومی' جامی' سعدی' حافظ' نظامی' خاقانی اور نظیری کے حوالے جس طرح تہذیبی رفیقوں کی اپنائیت کے ساتھ آتے ہیں' اس سے یہ اندازہ باسانی کیا جاسکتا ہے کہ ایران کے ساتھ اقبال کے قلبی اور ذہنی رشتے کی نوعیت کیا ہے' اس رشتے کی وضاحت اس طرح بھی ہوتی ہے کہ اقبال نے ایم اے اور پھر ڈاکٹریٹ کے لئے جو مقالہ تحریر کیا وہ ایران میں مابعد الطبیعات کے ارتقاء کے موضوع پر تھا یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس تحقیق کے نتیجے میں ایرانی ذہن و فکر کے مخصوص رجحانات اور تصوف کے آغاز و ارتقاء کے تاریخی عوامل کے بارے میں جو حقائق منکشف ہوئے وہ تصوف کی حقیقت و ماہیت پر مزید غور و فکر کی بنیاد بن گئے یہی وجہ ہے کہ جب اقبال سے میر حسن الدین نے ۱۹۲۷ء میں مقالہ کے ترجمے کی اجازت طلب کی تو اقبال نے اجازت تو دے دی اور یہ فلسفہ عجم کے عنوان سے ترجمہ ہوا مگر یہ بھی لکھا "یہ کتاب اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی' اس وقت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آچکا ہے' جرمن زبان میں غزالی' طوسی وغیرہ پر علیحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں جو میری تحریر کے وقت موجود نہ تھیں' میرے خیال میں اس کتاب کا صرف تھوڑا سا حصہ باقی ہے' جو تنقید کی زد سے بچ سکے" (فلسفہ عجم' کراچی' طبع ششم ۱۹۶۹ء ص ۹)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ایران کی ادبی اور تہذیبی روایت سے آگاہ تھے بلکہ ان کے بارے

اورنگ زیب قاسمی

میں تازہ ترین حوالوں سے بھی آشنا تھے یہی نہیں ایران کے سیاسی نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ ان کے معاصر ادبی و فکری رویوں سے بھی ان کی گہری دلچسپی تھی' ۴ اگست ۱۹۳۲ء کو پروفیسر محمد اکبر منیر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

" حال کی ایرانی شاعری میں کچھ نہیں' البتہ اس قوم کی بیداری کے شواہد کے طور پر اسے ضرور پڑھنا چاہیے۔"

(روح مکاتیب اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی اقبال اکادمی لاہور نومبر ۱۹۷۷ء ص ۳۵۰)

اسی طرح ۸ مارچ ۱۹۳۳ء خان محمد نیازالدین خان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

" زمانہ حال کے ایران کی نثر پڑھنے کے قابل ہے' نظم میں کچھ نہیں"

(روح مکاتیب اقبال' ص ۳۶۷)

فروری ۱۹۲۶ء میں پروفیسر ایم ۔ ایم ۔ شریف کو اپنے ایک (انگریزی) خط میں لکھتے ہیں:

" دنیائے اسلام بالخصوص مصر و ایران میں ہے اور فلسفہ اب بھی دینیات کے ساتھ زیر مطالعہ ہے"

(روح مکاتیب اقبال ص ۳۵۶)

قاچار خاندان کی حکومت کے خاتمے کے بعد جب رضا شاہ پہلوی اول نے اقتدار سنبھالا تو اقبال نے کہا:

پہلوی آن وارث تخت قباد
ناخن او عقدۂ ایران کشاد

مگر کچھ عرصہ بعد انہیں یہ اندازہ ہو گیا کہ مغربی استعمار کے غلبے کو مغربی مدنیت و تہذیب کی صورت میں قبول کر کے قومی و ملی شخصیت کے داخلی قالب کو جیسے مجروح کیا جارہا ہے اس سے ایرانی ملوکیت سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ایک بڑے استبداد کی نہ صرف پرچھائیں ہو گی' بلکہ ایک روشن روایت بھی اپنے فطری نمو سے محروم ہو جائے گی۔ چنانچہ اقبال جاوید نامہ میں کہتے ہیں۔

بعد مدت چشم خود بر خود کشاد
لیکن اندر حلقۂ دامے فتاد
کشتۂ ناز بتان شوخ و شنگ
خالق تہذیب و تقلید فرنگ
کار آن وارث ملک و نسب
ذکرے شاہ پور است و تحقیر عرب
روزگار او تہی از واردات
از قبور کہنہ می جوید حیات
با وطن پیوست و از خود درگذشت
دل برستم داد و از حیدر گذشت
نقش باطل می پذیرد از فرنگ
سرگذشت خود بگیرد از فرنگ

اور اسی کیفیت میں اقبال نے کہا تھا:

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

مگر اس خطے کے زرخیز امکانات سے اقبال کی والہانہ وابستگی کی شہادتیں جگہ جگہ ملتی ہیں خاص طور پر یہ اشعار دیکھیے:

چوں چراغِ لالہ سوزم درخیابانِ شما
اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما
غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام
تابدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما
فکرِ رنگینم کند نذرِ تہی دستانِ شرق
پارۂ لعلے کہ دارم از بدخشانِ شما

یا

عجم از نغمہ ہای من جواں شد
زسودایم متاعِ او گراں شد
ہجومی بود رہ گم کردہ در دشت
ز آوازِ درایم کارواں شد

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ:

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

چنانچہ جب ۱۶ جنوری ۱۹۷۹ء کو بزعم خویش "ظل الٰہی" آریا مہر شاہ محمد رضا ایران چھوڑ کر بھاگے، عوامی و فکری احتجاج کے ریلے نے امریکہ کے فراہم کردہ ہتھیاروں کے خوف کو بھی بے معنی کر دیا تو اس علاقے میں اپنے سب سے بڑے حواری اس سابق شہنشاہ کو امریکہ نے بھی پناہ نہ دی۔ جس نے ان کے اور ان کے خاندان کے اقتدار کے تحفظ اور تسلسل کا وعدہ کر رکھا تھا (۱۳ فروری ۱۹۷۹ء کو اسی امریکہ نے انقلاب ایران کو "تسلیم" کرنے کا رسمی اعلان کیا) آج انقلاب ایران کے حوالے سے تیسری دنیا بالخصوص عالم اسلام میں یہ سوالات مذہبی، سماجی اور سیاسی علماء کی توجہ جذب کر رہے ہیں:

الف) کیا کسی بڑی طاقت کا طفیلی بنے بغیر اپنے وطن کا دفاع ممکن ہے؟ معاشی تعمیر و ترقی کا سفر جاری رکھا جاسکتا ہے؟ ریاستی اقتدار اعلیٰ کو داخلی اور خارجی پالیسیوں کی تشکیل کا سرچشمہ بنایا جاسکتا ہے؟

ب) جو معاشرہ سرمایہ دارانہ منطقی نظام کی سہولتوں کے ساتھ اپنے مقصد حیات کو منسلک کرلے، اس میں کلیا کلپ کی کتنی گنجائش ہو سکتی ہے؟

ج) اس تناظر میں کہ آج عالم اسلام میں کوئی فلاحی ریاست نہیں، خود مسلم ریاستوں میں مسلمانوں کے بنیادی انسانی حقوق محفوظ نہیں، ملائیت، ملوکیت کے تابع اور مددگار ہے، پیچیدہ ہوتی ہوئی صورت حال کا

اورنگ زیب قاسمی

حقیقی ادراک مذہبی طبقے کی جانب سے ظاہر نہیں ہو رہا، ایران کس حد تک یورپ کی سوشل ڈیماکریٹس ریاستوں کے مقابلے پر قابل رشک تمدنی اور سیاسی نظام وضع کر سکتا ہے؟

د) عرب اور عجم کے روایتی تضاد کو کس طور پر کم کیا جاسکتا ہے (ایران پر عراق کی خون آشام جارحیت اور مسلسل رستے والے زخم دینے کے بعد جبکہ بیشتر عرب ممالک نے عراق کا ساتھ دیا اس پر حج بیت اللہ کے موقع پر ایرانی حجاج کے اجتماعی قتل / تشدد کا سانحہ مستزاد ہے) ایرانی تہذیب کا علم (ماقبل اسلام) جو صدیوں سے پروان چڑھانے والی ایرانی قوم پرستی کی اساس رہا ہے، کس طرح بقول اقبال حجازی کو قبول کر سکتا ہے؟ یا پھر عربی اسلام اور ایرانی اسلام کے طور پر عملاً "دو کیمپ عالم اسلام کی توجہ اور شرکت کے لئے ہوں گے؟

ھ) مسلمانوں میں فرقہ واریت کے پیچھے تاریخی اور فکری حقائق وسائل کارفرما ہیں، مگر انہیں استحکام بخشنے اور مسلمانوں کو جارحانہ اور متشددانہ انداز میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنے میں فروعی عقائد میں غلوے کام لینےوالوں کی جانب سے تاریخ اور عقیدے کو مسخ کرنا اور سادہ لوحوں پر اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کی خواہاں قوتوں کا عمل دخل زیادہ ہے ایران "انقلاب کے بعد کس طرح مسلمانوں کے نسبتاً" اقلیتی فرقے کے مقابلے پر اکثر مسلمانوں کے لئے جاذب قلب و نظر بن سکتا ہے؟

انقلاب دراصل حکمرانوں کی تبدیلی کا نام نہیں اور نہ اس کے کوائف مخصوص لمحے یا کیلنڈر کی متعین تاریخیں ہیں بلکہ ایسے مسلسل ذہنی تجربات و انکشافات سے عبارت ہے جو کسی قوم کے داخلی قالب کی متواتر تبدیلی کو نتیجہ خیز بناتے ہیں، آج انقلاب ایران کے حوالے سے عالمی سیاست، معیشت اور فکر میں (بعض اندیشوں کے باوجود) بنیادی تبدیلیوں کے امکانات پیدا ہو چکے ہیں، خاص طور پر پاکستان، افغانستان، وسط ایشیا کی مسلم روسی ریاستوں اور چین کے ساتھ ایران کے بڑھتے روابط اقبال کے خوابوں کی جھلک دکھاتے ہیں۔ انقلاب ایران میں ایک فکری کردار اقبال کا بھی ہے جسے اجاگر کیا جانا چاہیے مگر اس مبالغے اور سنسنی خیزی کے ساتھ نہیں جو ہماری جذباتی ضرورت بن گئی ہے میں اپنے دعویٰ کہ انقلاب ایران میں ایک فکری کردار اقبال کا بھی ہے، کے ثبوت میں بعض شواہد پیش کرتا ہوں:

الف) اقبال کے کلام پر ایران میں پہلے بھی توجہ دی جاتی تھی، مگر قیام پاکستان کے بعد، پاکستان کے قومی شاعری کا فکر و فن ایرانیوں کے لئے زیادہ جاذب نگاہ ہوا، ملک الشعراء بہار اور دیگر شعراء نے اقبال کو منظوم خراج تحسین پیش کیا اور ایرانی علماء نے بھی اقبال کے فن اور فکر کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا (تفصیل کے لئے دیکھیے ڈاکٹر سلیم اختر کی مرتبہ کتاب ایران میں اقبال شناسی کی روایت، سنگ میل، لاہور اگست ۸۳)

ب) ایران کا ایک باغی شاعر محمد عاصمی آرانی جب لندن میں بیٹھ کر اپنا مجموعہ کلام "دروغ بزرگ" کے نام سے سائیکلو سٹائل کرا کے تقسیم کرتا ہے تو اسے معنون اقبال کے نام کرتا ہے۔

(ایران میں اقبال شناسی کی روایت ص ۱۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انقلاب ایران کے لئے جدوجہد کرنے والوں کے لئے اقبال کا نام اور کلام کس طرح ذہنی و جذباتی تحریک کا موجب بنتا ہے۔

ج) ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ ایران کے انقلابی اجتماعات میں دیگر مشاہیر انقلاب ایران کے ساتھ شرکاء نے اقبال کی بھی تصویر اٹھا رکھی تھی۔

و) مفکر انقلاب ایران ڈاکٹر علی شریعتی نے نہ صرف اقبال سے فیض کشی کا اعتراف کیا ہے۔ بلکہ ما و اقبال کے نام سے ان کی ایک کتاب اور دیگر تقاریر بھی ملتی ہیں جن میں روح عصر کے ادراک اور مسلم نشاۃ ثانیہ کے لئے اقبال کے نقطۂ نظر کی وضاحت محبت اور عقیدت کے ساتھ کی گئی ہے۔

یہاں ضروری ہے کہ ڈاکٹر شریعتی کا سوانحی خاکہ پیش کر دیا جائے' وہ ۲۳ نومبر ۱۹۳۳ء کو سبزوار صوبہ خراسان میں پیدا ہوئے' ٹیچرز کالج مشہد سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں ایک ٹیچر کے طور پر مشہد کے نواح میں قصبہ احمد آباد میں اپنے فکری منصب کا آغاز کیا ۱۹۵۶ء میں مشہد یونیورسٹی کے شعبہ عطیات میں داخل ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں قومی مزاحمتی تحریک کے رکن کے طور پر اپنے والد اور دوسرے اراکین سمیت گرفتار ہوئے اور چھ مہینے قزل قلعہ میں قید کر دیئے گئے ۱۹۶۰ء میں فرانس آکر الجزائر کی تحریک آزادی کے سرگرم رکن کے طور پر نمایاں ہوئے افتادگان خاک ' کے خالق فرانز فینن سے گرمجوش قربت رہی اگرچہ اپنے ایک لیکچر " ہم کہاں سے آغاز کریں " (ویژن لاہور جلد ۱' شمارہ ۳ اپریل ۱۹۹۰ء) میں ڈاکٹر شریعتی کہتے ہیں " فرانز فینن جسے میں ذاتی طور پر جانتا ہوں اور میں نے جس کی کتابوں کے فارسی تراجم کئے ہیں وہ سماجی تحریک میں مذہب کی مثبت اہلیت کے بارے میں پر امید نہیں تھا تاآنکہ میں نے اسے اس امر پر مائل کیا کہ ان چند معاشروں میں جہاں مذہب تہذیب میں اہم کردار ادا کرتا ہے مذہب اپنے وسائل اور نفسیاتی اثرات کے حوالے سے روشن فکر شخص کا معاون ہے کہ وہ اپنے معاشرے کو اسی منزل کی جانب گامزن کرے' جس کی طرف خود فینن اپنے معاشرے کو اپنے غیر مذہبی وسائل کے ذریعے لے جارہا تھا۔ (ص ۲۴)

تحریک آزادی میں اسی لاکھ افراد کی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے مجاہدین کی حمایت پر کمربستہ ہونے والے ڈاکٹر علی شریعتی ۱۹۶۱ء میں پیرس میں قید کر لئے گئے۔ بہرطور عمرانیات اور تاریخ مذاہب کے شعبوں میں ڈاکٹریٹ کی دو ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد وہ ایران واپس آئے تو ترک ایران سرحد پر گرفتار ہوئے اور کئی ماہ تک قید میں رہے' ۱۹۶۵ء میں مشہد کے ایک گاؤں کے ایک ہائی سکول میں مدرس کے طور پر کام کا آغاز کیا آخر کار مشہد یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر ملازم ہوئے مگر طلبہ میں ان کے خیالات کی مقبولیت کے باعث انہیں یونیورسٹی سے جبری طور پر ریٹائر کر دیا گیا۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۳ء تک انہوں نے مشہد حسینیہ ارشاد ' تہران اور دیگر مراکز میں خطبات کا سلسلہ شروع کیا اور یہ ان کی زندگی کا زرخیز دور تھا ستمبر ۱۹۷۳ء میں حسینیہ ارشاد بند کر دیا گیا اور ایرانی خفیہ پولیس ساواک نے شریعتی کی تلاش میں ناکام رہنے کے بعد ان کے معمر والد کو گرفتار کر لیا جس پر شریعتی نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا چنانچہ ۱۸ ماہ تک قید تنہائی کاٹی ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۷ء تک انقلابیوں کی طرح راتوں کو سرگرم عمل رہتے اور خفیہ طریقے سے صبح تک دوسرے لوگوں کے گھروں میں خطبات دیتے ۔۱۶ مئی ۱۹۷۷ء کو وہ یورپ منتقل ہوئے اور تین دن بعد بھیس بدل کر لندن میں داخل ہوئے ۔ ۱۹ جون ۱۹۷۷ء کو ایسے پراسرار حالات میں لندن میں مردہ پائے گئے کہ اس گمان کو تقویت ملتی ہے کہ ساواک نے برطانوی انٹیلی جنس سروس کی مدد سے انہیں ہلاک کیا۔ (سوانحی خاکہ ماخوذ از ویژن لاہور جون ۱۹۸۹ء اور اپریل ۱۹۹۱ء کے شمارے)

ان کی نمایاں تصانیف حسب ذیل ہیں :

۱۔ دانشور اور اس کی ذمہ داری

اورنگ زیب قاسمی

۲۔ اسلام کی تفہیم کے نقطہ ہائے نظر
۳۔ براہیمی مذہب میں فلسفہ تاریخ
۴۔ تہذیب اور آئیڈیالوجی
۵۔ یاد منانے اور یاد رکھنوں کا انقلابی کردار
۶۔ عرانی مکاتب اور مذاہب کی تاریخ
۷۔ ابوذر غفاری
۸۔ حسین وارث آدم
۹۔ اگر علی نے ہاں کہا تھا
۱۰۔ علوی شیعیت اور صفوی شیعیت
۱۱۔ سائنسی علوم میں طریق کار
۱۲۔ ذات کے بغیر انسان
۱۳۔ نشاۃ ثانیہ کی معاشی اور طبقاتی جڑیں
۱۴۔ انسان کے چار زندان

ھ) اقبال نے اپنی ایک ابتدائی نظم " زہد اور رندی " میں ایک مولوی سے اپنے بارے میں یہ کہلوایا ہے:

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیل علی ہم نے سنی اس کی زبانی

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اپنی کتاب عروج اقبال (بزم اقبال لاہور جون ۱۹۸۷ء) میں اقبال کی ابتدائی تخلیقی ذہنی زندگی کے حوالے سے لکھتے ہیں " اس دور کے کلام اور بعض واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقبال اس زمانے میں اہل بیت رضوان اللہ علیہم سے خاص عقیدت رکھتے تھے اس رجحان نیز اپنے ادبی ذوق کے تقاضے سے وہ اپنے دوست میر نیرنگ کے ساتھ ان مجالس عزا میں ضرور شریک ہوتے ہوں گے جو قزلباش خاندان کے ممتاز و سادہ نواب فتح علی خاں اور نواب محمد علی خاں کے زیر اہتمام چوک متی میں منعقد ہوا کرتی تھیں ------ غالبا" انہی محفلوں سے متاثر ہو کر اقبال اس زمانے میں صنف مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور مرثیہ گوئی میں ایک نیا اسلوب اختیار کرنے کا منصوبہ باندھنے لگے۔

(ص ۵۳ واقعات کربلا کو ایسے رنگ میں نظم کروں گا کہ ملٹن کی PARADISE REGAIND کا جواب ہو جائے۔ مطالعہ اقبال مرتبہ گوہر نوشاہی لاہور ' ص ۴۴)

اقبال ایسی طویل رزمیہ نظم تو نہ لکھ سکے مگر اردو اور فارسی میں انہوں نے شہادت حسین کو نہایت موثر پیرائے میں اپنے فکری نظام میں ایک روشن اور زندہ استعارے کے طور پر برتا ہے اس کے علاوہ انہوں نے حضرت علی ؑ اور حضرت فاطمہ ؑ کے بارے میں نہ صرف موثر اشعار کہے ہیں بلکہ انہیں فقر' علم ' پاکبازی اور ایثار کے مظہر کے طور پر اپنے تمثیلاتی نظام میں نمایاں جگہ دی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر علی شریعتی اقبال پر اپنے ایک لیکچر میں کہتے ہیں :

" اہل سنت ہوتے ہوئے بھی وہ اہل بیت کے زبردست مداح ہیں وہ خاندان پیغمبرؐ کے ایک مخلص عاشق اور باخبرو بے ریا ہوا خواہ ہیں ان کا یہ بہت بڑا قرض ہے ' جو ہم اہل تشیع کی گردن پر ہے "

(اقبال ڈاکٹر علی شریعتی کی نظر میں از ڈاکٹر خواجہ یزدانی ویژن لاہور جنوری ۹۰ ص ۵۳)

اسی میں وہ اقبال کے بارے میں بھی کہتے ہیں:

" انہوں نے برگساں کی طرح سوچا' رومی کی طرح عشق اختیار کیا سید جمال الدین کی طرح مسلم اقوام کی آزادی کی خاطر استعمار سے ٹکر لی ۔ انہوں نے عصر حاضر کے انسان کی خشک زندگی میں عشق و روح پھونکنے کی آرزو کی اور اس دور میں مذہب میں تجدید افکار کے ساتھ ساتھ احیائے اسلام اور اس کی نشاۃ ثانیہ کو اپنا مقصد قرار دیا"

(ایضاً" ص ۵۳)

ڈاکٹر شریعتی اقبال کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ تک لکھتے ہیں:

" جب میں اقبال کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے ان کی شخصیت میں حضرت علیؓ کی شخصیت کے اوصاف جھلکتے دکھائی دیتے ہیں ' یعنی ایک انسان جو حضرت علیؓ کی مانند ہے لیکن کسی حد تک مناسب کمی بیشی کے ساتھ اور جو بیسیوں صدی کی انسانی استعدادات کا حامل ہے یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ حضرت علیؓ کی شخصیت ایسی ہے جو اپنے نہ صرف فکر اور گفتار کے ساتھ بلکہ اپنے وجود اور زندگی کے ساتھ انسان کے تمام دکھوں ' دردوں اور ضرورتوں اور تمام پہلودار احتیاجات کا تمام زمانوں میں مداوااتفاقی اور جواب دیتی ہے ۔"

(ایضاً" ص ۵۴)

د) ملوکیت اور استعمار کے ساتھ ساتھ مغربی صنعتی مدنیت کے فروغ کا مشن سنبھالنے خوش شکل مغربی تہذیب کے بارے میں اقبال کے افکار ' اقبالیات سے رغبت رکھنے والوں پر عیاں ہے اسی طرح مسلم نشاۃ الثانیہ کے خواب دیکھنے والا اقبال عصری پیچیدگیوں کے مقابل اسلام کو جامد معتقدات کی تحویل میں دینے کی بجائے زندہ اور متحرک قوت بنانے کا آرزومند ہے اس کے اشعار خطبات اور خطوط میں سے بکثرت مثالیں فراہم کی جا سکتی ہیں محض مختصر اقتباسات اس کے ایک خطبے " الاجتہاد فی الاسلام " میں دیکھیے یہاں اجتہاد پر زور دینے کے ساتھ ساتھ قلب و نظر کے لئے بعض آزمائشوں سے خبردار رہنے کی تلقین بھی کی گئی ہے۔

" اس (توحید) کے اصول کا تقاضا ہے کہ ہم صرف اللہ کی اطاعت کریں نہ کہ ملوک و سلاطین کی "

" تشکیل جدید الہیات اسلامیہ " از نذیر نیازی (ترجمہ) بزم اقبال لاہور ص ۲۴۷)

" اگر اسلام کی نشاۃ الثانیہ ناگزیر ہے جیسا کہ میرے نزدیک قطعی طور پر ہے تو ہمیں بھی ترکوں کی طرح ایک نہ ایک دن اپنے عقلی اور ذہنی ورثے کی قدروقیمت کا جائزہ لینا پڑے گا"(ایضاً" ص ۲۳۶)

" ترک وطن پرستوں نے ریاست اور کلیسا کی تفریق کا اصول مغربی سیاست کی تاریخ افکار سے اخذ کیا اسلام میں یہ صورت حال رونما ہی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے کہ اسلام کا ظہور بطور ایک اجتماع مدنی کے ہوا اور قرآن مجید کی بدولت سے وہ صاف سادہ قانونی اصول مل گئے جن میں یہ زبردست امکانات جیسا کہ تجربہ نے آگے چل کر ثابت بھی کر دیا موجود تھے کہ رومیوں کی " دوازدہ الواح " کی طرح انہیں بھی بذریعہ تعبیر و تاویل مزید وسعت دی جا سکے ۔" (ایضاً" ص ۲۳۹'۴۰)

اورنگ زیب قاسمی

" ہم اس تحریک کا جو حریت اور آزادی کے نام پر عالم اسلام میں پھیل رہی ہے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں مگر یاد رکھنا چاہیے آزاد خیالی کی یہی تحریک اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے ' آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ اور انتشار کی طرف ہوتا ہے ------ عالم اسلام کی قیادت اس وقت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے ' ان کا فرض ہے یورپ کی تاریخ سے سبق لیں ' انہیں چاہیے اپنے دل و دماغ پر قابو رکھتے ہوئے اول یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ بحیثیت ایک نظام مدنیت اسلام کے مقاصد کیا ہیں " (ایضاً" ص ۲۵۲)

" عالم انسانی کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے کائنات کی روحانی تعبیر' فرد کا روحانی استخلاص اور وہ بنیادی اصول جن کی نوعیت عالمگیر ہو اور جن سے انسانی معاشرے کا ارتقاء روحانی اساس پر ہوتا ہے" (ایضاً" ص ۲۷۵'۷۶)

ڈاکٹر علی شریعتی اپنے ایک خطبے " ہم کہاں سے آغاز کریں " میں اقبال کے نقطہ نظر کی ہی ترجمانی جوش وجذبے اور بلند آہنگی کے ساتھ کرتے ہیں :

" المیہ یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ جو گذشتہ دو صدیوں سے ہمارے مذہب کے ٹھیکیدار ہیں انہوں نے اسے اس کی موجودہ منجمد حالت میں تبدیل کر دیا ہے اور دوسری طرف ہمارے روشن فکر لوگ جو عصر حاضر اور ہمارے زمانے اور نسل کی ضرورتوں کا فہم رکھتے ہیں مذہب کی فہم سے عاری ہیں۔

دانشور مطالعے سے اسلام سے متعارف ہوئے اور رجعت پسندوں نے اسے عوام کو مدہوش کرنے کے لئے استعمال کیا تاکہ ان کے ذاتی مفادات اختتام کو نہ پہنچ سکیں'یوں بہ حقیقی اسلام ان جاہلوں تاریخ میں محبوس رہا عوام اپنی منجمد اور محدود روایات میں دفن ہوئے اور دانشور عوام سے علیحدہ ہوگئے اوربےپیند کئے جانے لگے۔"

(تہذیب ' جدیدیت اور ہم مترجم و مرتب ڈاکٹر سعادت سعید۔ اقبال شریعتی فاؤنڈیشن لاہور ۱۹۹۹ ص ۱۰۸)

اپنے اسی خطبے میں ڈاکٹر شریعتی نے ان نیم پختہ انقلابی دانشوروں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے ' جو تضادات کے اجتماع اور ابھار سے از خود مطلوبہ تبدیلی کے آرزومند ہوتے ہیں اور جدلیات کی باطنی تحریک کو اپنی بے عملی کا نعم البدل خیال کرتے ہیں :

" معاصر دانشور عمومی طور پر خیال کرتے ہیں کہ کسی معاشرے میں سرگرم عمل جدلیاتی تضادات ضرورت کے تابع معاشرے کو آزادی اور انقلاب کی جانب آگے بڑھاتے ہیں اور وجود کی ایک نئی حالت کی پیدائش کا باعث ہیں ------ یہ تصور فی الحقیقت ایک بڑے دھوکے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے ' کوئی معاشرہ اس بناء پر نہ تو متحرک ہو سکے گا اور نہ ہی اپنی آزادی کی تحصیل کرپائے گا کہ غریب اور امیر کے درمیان المیاتی عدم مساوات اور طبقاتی اختلاف موجود ہیں ' غربت اور طبقاتی اختلافات کسی معاشرے میں کسی نئے نظام کی شعوری تخلیق کے بغیر ہزاروں سال تک قائم رہ سکتے ہیں جدلیات کوئی باطنی تحریک نہیں رکھتی۔"(ایضاً" ص ۱۰۳)

اسی طرح استبداد مسلط کرنے کی خواہاں قوتیں جس طرح بفریب اور دل خوش کن نعرے اور نظریے وضع کرکے انہیں جذباتی اپیل سے مرصع کرکے مقبول عام بنانے کی منظم کوشش کرتی ہیں ڈاکٹر علی شریعتی اس سے متنبہ کرتے ہیں :

" مشترکہ مذہبی اعتقادات اور رسومات کی موجودگی کے بہروپ کے تحت مذہب بھی استحصال زدہ اور

استحصال کے مابین باطل اور مصنوعی رشتوں کی تخلیق کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے " (ایضاً ص ۱۰۳)

" دیگر اقوام کے مقدروں پر حکمران عالمی طاقتیں انسان دوستی کا نظریہ اس لئے استعمال کرتی ہیں تاکہ آباد کاروں اور مغلوب مقامی باشندوں کے مابین جعلی اور باطل رشتے قائم کئے جاسکیں " (ایضاً" ص ۱۰۴)

۱۹۵۰ء میں الجزائر میں لوگوں کو منقسم کرنے اور من گھڑت قصبوں کا گرویدہ بنانے اور شمالی افریقہ میں ایک بڑی تباہی کی پریشانی داخل کرنے کے لئے آباد کار طاقتوں نے روس ' والٹیر اور موریس ذوبرے کے ترقی پسند نظریات کی تشہیر کی یہ نظریات سائنسی ہیں اور قوم پرستی کو اہم گردانتے ہیں ' قوم پرستی کے اس مرکزی نقطہ نظر کی ہر قوم کو اپنی خود مختار ریاست کا حامل ہونا چاہیے عربوں اور بربروں کو منقسم کرنے کے لئے استعمال کیا گیا"(ایضاً" ص ۱۰۳)

اگر کوئی افریقی یورپی تہذیب قبول کر لیتا ہے' تو وہ بے سرا ہو جاتا ہے ------ وہ عجیب انسان کی صورت ہو جاتا ہے کہ جس کے داخلی اور خارجی کوائف ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہوتے "

(تہذیب اور آئیڈیالوجی تہذیب جدیدیت اور ہم ' ص ۴۵)

ڈاکٹر علی شریعتی نے مغربی استعمار کی تہذیبی حکمت عملی کو " تہذیب نو آباد کاری " کی اصطلاح دی ہے جس کے خلاف فکر اقبال مزاحمت کرتی ہے اور گذشتہ ایک صدی میں عالم اسلام میں ابھرنے والی فکری تحریکوں کی قیادت بھی' چنانچہ ڈاکٹر شریعتی اقبال کی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق کے انداز میں اپنے خطبے " کیا کیا جانا ہے " میں کہتے ہیں :

" تہذیبی نو آباد کاری سے آزادی اور خود مختاری کی جدوجہد مسلم معاشروں میں بھی شروع ہو گئی ہے تیسری دنیا کے دانشوروں اور ادیبوں اور فنکاروں میں اپنی ذات کی جانب لوٹنے کی تحریک کے اثرات نے اسلامی ملکوں کے نئے مغرب زدہ اور تعلیم یافتہ گروہوں میں ہر دم بڑھتی ہوئی نئی لہروں کو تخلیق کیا ہے ----- محمد بن عبدہ نے قرآن کی طرف لوٹنے کا نظریہ اور علامہ اقبال نے خودی کا فلسفہ پیش کیا ----- سید جمال ' عبدہ اقبال اور ایسے ہی دیگر رہنماؤں کی شروع کی ہوئی تحریکیں رجعتی اور لکیری فقیر نہیں تھیں وہ وقت کا دھارا پیچھے کی طرف موڑنا نہیں چاہتے اور یہ افراد ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے نئی سائنسوں کو خوش آمدید کہا اور مذہبی مطالعوں اور اسلامی علوم کو اپنے عہد کی روح نئے نقطہ نظر اور نئے یورپی تمدن سے متعارف کروایا۔ وہ قدیم تہذیبی اور تعلیمی مراکز کے ترقی پسند اور جدت پسند رہنما تھے۔

(تہذیب ' جدیدیت اور ہم ص ۷۹' ۸۰)

کتابیات

۱۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ' (ترجمہ سید نذیر نیازی) بزم اقبال ' لاہور' مئی ۱۹۸۳ء

۲۔ روح مکاتیب اقبال (مرتبہ محمد عبداللہ قریشی) ' اقبال اکادمی لاہور نومبر ۱۹۷۷ء

۳۔ ایران میں اقبال شناسی کی روایت (مرتب ڈاکٹر سلیم اختر)' سنگ میل لاہور ' اگست ۱۹۸۳ء

۴۔ اقبال ممدوح عالم' (مرتب ڈاکٹر سلیم اختر) ' بزم اقبال لاہور

۵۔ عروج اقبال (ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)' بزم اقبال 'لاہور 'جون ۱۹۸۷ء

۶۔ تہذیب ' جدیدیت اور ہم (منتخب مضامین ڈاکٹر علی شریعتی) (ترجمہ ڈاکٹر سعادت سعید) اقبال شریعتی فاؤنڈیشن ' لاہور ' جنوری ۱۹۹۱ء)

۷۔ فاطمہ ' فاطمہ " ہے (ڈاکٹر علی شریعتی ترجمہ پروفیسر سردار نقوی) ' ادارہ احیاء تراث اسلامی کراچی ۱۹۸۲ء

۸۔ تشیع ' تقاضے اور ذمہ داریاں (ڈاکٹر علی شریعتی ترجمہ سید غضنفر عباس بخاری) الرضا' لاہور' طبع اول۔

۹۔ ویژن ' لاہور (اقبال فاؤنڈیشن)

مندرجہ ذیل شمارے ' جون ۱۹۸۹ء' ستمبر ۱۹۸۹ء ' جون ۱۹۹۰ء ' اپریل ۱۹۹۰ء' جولائی ۱۹۹۰ء ' جنوری ۱۹۹۱ء ' اپریل ۱۹۹۱ء

10. The Islamic Revolution in Iran, Edited by Eqbal Ahmad Vanguared Lahore Jan 1980

(" دانش " اسلام آباد)

اورنگ زیب قاسمی

محمد صدیق

اقبال اور میسینون

برصغیر میں تحریک آزادی اپنے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں نئے دستور کی تجاویز کے مراحل میں داخل ہو چکی تھی ۔ تو یہ بات واضح طور پر سامنے آئی کہ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں ' خاص کر مسلم لیگ اور کانگریس ' کے نقطہ نظر میں زمین و آسمان کا فرق موجود ہے ۔ اسی ذہنی اور اصولی خلیج کو پاٹنے کے لئے حکومت برطانیہ نے لندن میں گول میز کانفرنس کا اہتمام کیا تاکہ آئینی اور سیاسی مسائل کا متفقہ حل تلاش کیا جاسکے۔

پہلی گول میز کانفرنس نومبر ۱۹۳۰ء سے ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء تک جاری رہی۔ اس کا افتتاح جارج پنجم شاہ برطانیہ نے کیا۔ اس کانفرنس میں علامہ اقبال کو شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ دوسری گول میز کانفرنس ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء سے شروع ہو کر یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک منعقد رہی اور تیسری گول میز کانفرنس کا اجلاس ۷ نومبر ۱۹۳۲ء سے ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء تک جاری رہا۔ دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں علامہ اقبال کو شرکت کی دعوت دی گئی اور آپ ان دونوں کانفرنسوں میں شرکت کے لئے لندن گئے۔

تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے جب علامہ اقبال انگلستان کو روانہ ہوئے تو سید امجد علی ان کے رفیق سفر تھے۔ روزگار فقیر ' جلد اول میں سید فقیر وحید الدین (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۷۵ء) رقم طراز ہیں : " ۱۹۳۲ء کی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کا جہاز بندر گاہ " وینس " پر لنگر انداز ہوا ۔ تو ڈاکٹر نے سید امجد علی سے ' جو ان کے رفیق سفر تھے ' فرمایا کہ یہاں سے لندن ٹرین میں چلیں گے اور راستہ میں دو تین دن پیرس میں ٹھہریں گے ! چنانچہ یہ دونوں وینس سے ٹرین میں سوار ہو کر پیرس پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے امراؤ سنگھ مجیٹھیا موجود تھے ۔ پیرس پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب نے امراؤ سنگھ مجیٹھیا سے کہا کہ مجھے پیرس میں پہلے نپولین کی قبر پر جانا ہے ۔ پھر مشہور ریسرچ اسکالر میگ نون (میسینون) سے ملاقات کرنی ہے ۔۔۔۔۔۔ اور تیسرا کام یہ ہے کہ میں فرانس کے شہرۂ آفاق فلسفی برگساں سے ملنا چاہتا ہوں ۔ " (۱)

سردار امراؤ سنگھ شیر گل مجیٹھیا (۲۳ مئی ۱۸۷۰ء ۔ ۹ نومبر ۱۹۵۴ء) پیرس میں مقیم تھے۔ انہوں نے پیرس کو اپنا وطن ثانی بنا رکھا تھا۔ شاعر اور صحافی ہونے کی حیثیت سے جو شہرت کمائی تھی ' اس علمی تجربے امراؤ سنگھ کو اس دور کی بہت سی عظیم علمی شخصیات کے قریب کر دیا تھا۔ برگساں (۱۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء۔ ۴ جنوری ۱۹۴۱ء) اور میسینون (۱۸۸۳ء۔ ۱۹۶۲ء) بھی ان حضرات میں سے تھے جن سے ان کے دوستانہ مراسم

اورنگ زیب قاسمی

تھے۔ اس لئے میسینون کے ساتھ ملاقات کے وقت سید امجد علی کے علاوہ امراؤ سنگھ بھی موجود تھے۔

جب " جاوید نامہ " طبع ہوا تو علامہ اقبال نے اس کا ایک نسخہ میسینون کو ارسال کیا ۔ اور یہ امر طے شدہ ہے کہ امراؤ سنگھ اور میسینون کے درمیان علامہ اقبال کے متعلق تفصیلی گفتگو بھی رہی ہو گی کیونکہ امراؤ سنگھ علامہ اقبال کے دوست تھے ' مداح تھے ' ان پر مضامین تحریر کر چکے تھے ' ان کے اشعار کا انگریزی میں ترجمہ بھی کر چکے تھے ' اسی لئے جب عطیہ بیگم فیضی (۱۸۸۲ء ۔ ۱۹۶۷ء) نے علامہ اقبال سے ان کے کلام کے انگریزی ترجمے کی فرمائش کی تو علامہ اقبال نے انہیں ۷ جولائی ۱۹۱۱ء کو ایک خط تحریر کیا۔

" میں نے اپنے دوست سردار امراؤ سنگھ صاحب کو (جنہیں امید ہے آپ جانتی ہوں گی) لکھا ہے کہ مجھے ان اشعار کا انگریزی ترجمہ بھیجیں .... " (۲)

اتفاق ایسا ہوا جب علامہ اقبال پیرس میں تھے تو برگساں پیرس میں موجود نہ تھا۔ اس وجہ سے برگساں سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔ چنانچہ وہ نپولین کی قبر پر تشریف لے گئے۔ بال جبریل میں موجود ان کی نظم " نپولین کے مزار پر " (۳) اس واقعہ کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اس کے بعد اقبال نے ۱۳ نومبر ۱۹۳۲ء کو میسینون کے گھر پر ان سے ملاقات کی۔ جس کا ذکر خود میسینون نے بھی کیا ہے ۔ (۴) اس ملاقات میں علامہ اقبال نے ان سے اسلام مطالعہ اسلام اور مغربی سکالرز کا مذہب اسلام سے متعلق تعصب جیسے اہم موضوعات پر بحث کی ۔ ان علمی مباحث کا ذکر سید وحید الدین نے روزگار فقیر ' جلد اول (۵) میں یوں کیا ہے اور ڈاکٹر لئیق بابری (۶) نے بھی اپنے مضمون میں حوالہ دیا ہے۔

" مشہور اسکالر میگ نون سے ملاقات کے وقت سید امجد علی ' ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ موجود تھے ۔ ڈاکٹر صاحب نے میگ نون سے دریافت کیا کہ مغرب کے مورخین کو اسلام سے جو تعصب و عناد ہے ' وہ وقت گزرنے کے ساتھ کم ہو رہا ہے اور اسلام کی صداقت و حقیقت ان پر آشکار اور واضح ہوتی جاری ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

فرانسیسی عالم نے جواب دیا کہ یہ بات درست ہے کہ اب مغربی مورخین نسبتاً غیر جانبدارانہ نقطہ نگاہ سے اسلامی تحریکوں کا جائزہ لے رہے ہیں ۔ میگ نون نے یہ بھی کہا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ پر مسلمانوں کے عظیم احسانات ہیں ۔ انہوں نے تمدنی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا اور تعلیم و معاشرت کے بہت سے شعبوں میں مغرب کی ترقی کے لئے نئے نئے مواقع عطا کئے۔ میگ نون سے ڈاکٹر صاحب کی ملاقات بہت دیر تک رہی اور ان دونوں عالموں کے درمیان اہم تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ " (۷)

علامہ اقبال میسینون کی مرتب کردہ معروف تحقیقی کاوش " کتاب الطواسین " کے مطالعہ کے بعد ذاتی طور پر میسینون کے بہت زیادہ قریب ہو گئے ۔ کیونکہ ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء کو انہوں نے حافظ اسلم جے راج پوری کے نام ایک مکتوب میں تحریر کیا کہ " منصور حلاج کا رسالہ " کتاب الطواسین " جس کا ذکر ابن حزم کی " فہرست " میں ہے ' فرانس میں شائع ہو گیا ہے موقف (میسینون) نے فرنچ زبان میں نہایت مفید حواشی اس پر لکھے ہیں ۔ آپ کی نظر سے گزرا ہو گا۔ حسین کے اصلی معتقدات پر اس رسالے سے بڑی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان منصور کی سزا دہی میں بالکل حق بجانب تھے۔ اس کے علاوہ ابن حزم نے کتاب الملل میں جو کچھ منصور کے متعلق لکھا ہے ' اس کی اس رسالے سے پوری

تائید ہوتی ہے ۔ لطف یہ ہے کہ غیر صوفیانہ قریباً" سب کے سب منصور سے بیزار تھے۔ معلوم نہیں متاخرین اس کے اس قدر دلدادہ کیوں ہو گئے۔ (۸)

اس خط میں علامہ اقبال نے میسینون کی تحقیقی محنت اور علمی تبحر کی تعریف کی ہے کہ انہوں نے "کتاب الطواسین" کو مفید اور پر مغز حواشی اور تعلیقات سے آراستہ کر کے شائع کیا ہے ۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات " Reconstruction of Religious thought in Islam " کے چوتھے خطبے " The Human Ego--- His Freedom and Immortality " میں میسینون کے منصور حلاج پر مرتب کئے ہوئے تحقیقی کام کو سراہا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ان کے تحقیقی اور علمی کام نے اسلامی دنیا میں منصور حلاج کے متعلق موجود بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔ ان کا کام اس کی تعلیمات کو سمجھنے میں ممد معاون ثابت ہوا ہے ۔ علامہ تحریر کرتے ہیں:

"Devotional Sufism alone tried to understand the meaning of the unity of inner experience which the Quran declares to be one of the three sources of knowledge the other two being History and Nature.The development of this experience in the religious life of Isalm reached its culmination in the well-known words of Hallaj---'I am the creative truth, The contemporaries of Hallaj as well as his successors interpreted these words pantheistically but the fragments of Hallajcollected and published by the French Orientalist L.,Massignonleave no doubt that the martyr-saint could not have meant to deny the transcendence of God, (9)

جب سید نذیر نیازی مرحوم (متوفیہ ۲۲ جنوری ۱۹۸۱ء) علامہ اقبال کے خطبات کا اردو ترجمہ کر رہے تھے تو وہ دوران ترجمہ اپنی اشکال کا تذکرہ علامہ اقبال سے کیا کرتے تھے اور ان کے مشورہ سے کام کو آگے بڑھاتے تھے ۔ چنانچہ جب سید نذیر نیازی نے تیسرے خطبے "The Conception of God and the Meaning of Prayer" (ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا) کا ترجمہ کرتے ہوئے اپنی مشکلات کا ذکر کیا تو علامہ اقبال نے ان کو "کتاب الطواسین" کا مطالعہ کرنے کی ہدایت کی اور اپنی ذاتی کتاب ان کو مستعار دی جس کی تفصیلات نذیر نیازی کے الفاظ میں پیش خدمت کی جا رہی ہیں۔

"ایک روز تیسرے خطبے کے سلسلے میں ' جہاں خودی کی بحث آئی ہے ' حلاج کا ذکر آیا اور حضرت علامہ نے بعض مسائل کی تشریح کرتے ہوئے اس صوفی مصلوب و مظلوم کی "کتاب الطواسین" کا حوالہ بھی دیا جس کی شہادت نے "دار ' اور منبر" اور " راز اور وعظ " ایسے الفاظ میں ایک جہان معنی پیدا کر دیئے ہیں " اور پھر ارشاد ہوا کہ مجھے خود (نذیر نیازی) بھی اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میں نے عرض کیا ' یونیورسٹی لائبریری میں تو شاید اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ۔ فرمایا " کیا مضائقہ ہے ' میرا ذاتی نسخہ لے جاؤ اور بغور اس کا مطالعہ کرو۔"

لیکن ۳۱ جولائی (۱۹۳۰ء) کی شام کو جب میں لاہور سے دہلی روانہ ہوا اور حضرت علامہ سے اجازت طلب

اورنگ زیب قاسمی

کی تو فرمایا " کتاب الطواسین " کہاں ہے میں نے عرض کیا' صاحب آج اسماعیل ہی بغرض استفادہ لے گئے ہیں ' صبح آپ کی خدمت میں پہنچا دیں گے ۔ حضرت علامہ نے فرمایا' بہتر لیکن میں نے دیکھا کہ بہتر کہتے ہوئے ان کا چہرہ کچھ متغیر سا ہو گیا جس پر مجھے بڑی ندامت ہوئی اور میں نے محسوس کیا کہ حضرت علامہ سے اجازت لئے بغیر مجھے کتاب اسمٰعیل صاحب کو نہیں دینا چاہیے تھی۔ میں اس وقت بڑی مشکل میں تھا۔ میرا دہلی جانا ضروری تھا اور اسمٰعیل صاحب سے ملنے کی کوئی صورت نہیں تھی ' لہٰذا میرے لئے بجز خاموشی کوئی چارہ نہیں تھا ' خجالت آمیز خاموشی جس کو شاید حضرت علامہ نے بھی محسوس کیا تھا ۔ بہرحال اگلے روز دہلی پہنچ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے عزیز دوست سید سلامت اللہ شاہ سے بذریعہ تار درخواست کی کہ اسمٰعیل صاحب سے ملیں اور کتاب اگر حضرت علامہ کی خدمت میں نہیں پہنچی تو فوراً" پہنچا دیں۔ لاہور سے روانہ ہوتے ہوئے بھی میں یہی بات کہہ آیا" ان سے کہہ آیا تھا مگر خلاف توقع انہوں نے میرے تار کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب میں بڑا پریشان تھا ' سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ مارے خجالت کے حضرت علامہ کی خدمت میں کچھ لکھنے کی جرات نہیں ہوتی تھی ۔ پھر جب تیسرے روز شاہ صاحب کا خط آیا کہ اسمٰعیل صاحب تو لکھنؤ میں ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت علامہ کا ایک عتاب نامہ بھی ' تو میرے اضطراب کی کوئی انتہا نہ رہی۔

Lahore

3rd August 1930

My dear Niazi Sahib

I am sorry to say that you made no arrangements for the return of the Book I lent to you, I think it was your duty to see that the book was returned to me before your departure to Delhi,As a rule I do not part with my books especially these which I keep constantly with me, Nothing is more painful to me than to be deprived of the use of a book in this way, Such carelessness is unworthy of a man who is himself fond of reading,

Yours affly

Muhammad Iqbal,

یہ عتاب نامہ خلاف معمول انگریزی میں تھا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ مسائل فلسفہ یا زیادہ گہری علمی گفتگو کی طرح حضرت علامہ خفگی کا اظہار بھی انگریزی ہی میں کرتے ہیں ۔ آخر مجبور ہو کر یہی سمجھ میں آیا کہ اس بے بسی میں ایک خط تو سید سلامت اللہ اور ایک لکھنؤ میں اسمٰعیل صاحب کو لکھوں ۔ بارے ان کا جواب آیا کہ کتاب حضرت علامہ کی خدمت میں پہنچ گئی اور میری پریشانی دور ہوئی۔ لیکن حضرت علامہ خاموش تھے ' "لہٰذا معطلہ" میں بھی خاموش رہا۔ آخر خدا خدا کر کے ۱۵ اگست کو ایک گرامی نامہ موصول ہوا۔

ڈئیر نیازی صاحب ' السلام علیکم !

آپ کا خط مل گیا ہے "کتاب الطواسین " بذریعہ ڈاک لکھنؤ سے آگئی ہے۔ جلسہ لیگ ملتوی ہو گیا ہے۔

اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ہوگا' غالباً" لکھنؤ میں - یہ بھی ممکن ہے کسی اور جگہ ہو - لکھنؤ پنجاب والوں کے لئے ذرا دور ہے- بہت سے لوگ جانے کو تیار تھے مگر اخراجات سے گھبراتے تھے - عابد حسین صاحب سے کہہ دیجئے کہ مناسب تراجم کے بعد بل بھجوا دیں- میں روپیہ بھجوا دوں گا-

سورتی صاحب سے ضرور مل لیجئے- وہ آپ کو تراجم کے متعلق (بالخصوص اصطلاحات کے تراجم کے متعلق) بہت مفید مشورہ دیں گے- عابد صاحب سے یہ بھی پوچھئے کہ فاؤسٹ میں Prolegomena In Heaven کا کیا اردو ترجمہ انہوں نے کیا ہے ؟ والسلام -

محمد اقبال

لاہور- ۱۳- اگست ۱۹۳۰ء (۱۰)

میسینون نے منصور حلاج کی حیات و آثار کے متعلق مفصل ' اور ثقہ تحقیقات کی ہیں- سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ منصور حلاج ہی کی طرف کیوں متوجہ ہوئے ؟ تو اس مسئلہ کو تو انہوں نے خود ہی حل کر دیا ہے- ۳۱ مارچ ۱۹۵۸ء کو مولانا (ابوالکلام آزاد ستمبر ۱۸۸۸ء- ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) کے متعلق اپنی یادوں اور تعلقات کو تازہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں - جنوری 'فروری ۱۹۵۷ء سے قبل جب جنوری ۱۹۵۳ء میں گاندھی کی سیمینار میں مولانا ابوالکلام آزاد کی دعوت پر نئی دہلی آئے تو ۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو مولانا آزاد کی رہائش گاہ پر دوپہر کے کھانے کی تفصیل انہی کے الفاظ میں سنئے:

" میں اس دن کو بھول نہیں سکتا (۸ جنوری ۱۹۵۳ء) جب وہ مجھے اکیلے اپنے ساتھ دوپہر کے کھانے کے لئے گھر لے گئے تھے - ہم دونوں کی زندگی کا بڑا حصہ ختم ہوچکاتھا------ میں نے ان سے اس ورثہ کا ذکر کیا جو بغداد میں اس سال مجھے نصیب ہوا جب ہم ایک ساتھ تھے - (۱۹۰۷ء-۱۹۰۸ء) اور جب حسین منصور حلاج نے ایک عجیب و غریب کشف کے ذریعہ میری تمام علمی و معاشرتی تحقیقات کا ڈھانچہ تیار کر دیا اور صرف اسی دنیا کے لئے نہیں -" (۱۱)

منصور حلاج کی معروف کتاب "کتاب الطواسین " ان کی گفتار کا مجموعہ ہے یہ مجموعہ گفتار عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہے - " کتاب الطواسین " علامہ اقبال کی عزیز ترین کتب میں سے ایک تھی- میسینون نے اسے مرتب کرکے ۱۹۱۳ء میں پیرس سے شائع کروایاتھا- وہ لکھتا ہے کہ منصور حلاج کی عارفانہ گفتگو چند مقامات پر ناقابل فہم ہے - ان دو تین مقامات کے علاوہ باقی سب باتیں معنی خیز اور گہری ہیں - اس کتاب پر غور کرنے سے منصور حلاج کی زبردست شخصیت سامنے آتی ہے-

لفظ " طواسین " طاسین کی جمع ہے - یہ قرآن پاک کے حروف مقطعات میں سے ہے- ان حروف کے معنی معلوم کرنا ناممکن ہیں - منصور حلاج نے اسی لئے اپنی تصنیف کا نام "کتاب الطواسین " رکھا کہ اس میں اسرار و رموز تصوف بیان کئے گئے ہیں - "کتاب الطواسین " درج ذیل گیارہ طاسین پر مشتمل ہے:

۱- طاسین سراج محمدی	۲- طاسین فہم	۳- طاسین صفا
۴- طاسین دائرہ	۵- طاسین نقطہ	۶- طاسین ازل و التباس
۷- طاسین مشیت	۸- طاسین توحید	۹- طاسین اسرار توحید
۱۰- طاسین تنزیہہ	۱۱- طاسین بوستان معرفت	

اورنگ زیب قاسمی

۱۹۲۹ء میں میسینون نے ایک تذکرہ صوفیا Recueil De Textex Indedits کے عنوان سے مرتب کیا- یہ کتاب فارسی اور عربی زبان میں ہے- انہوں نے یہ کتاب سردار امراؤ سنگھ کو پیش کی - سردار امراؤ سنگھ نے یہ کتاب علامہ اقبال کی خدمت میں ارسال کر دی کہ یہ آپ کے مطالعہ کے لائق ہے ' میرے نہیں --- کیونکہ آپ عربی میں مہارت کامل رکھتے ہیں - اب یہ کتاب اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں مخزونہ اقبال کولیکشن کا حصہ ہے --- اس تذکرے کا مختصر تعارف یوں ہے-

اس کتاب کا موضوع تصوف اور تاریخ تصوف ہے- جس میں مولف نے حیات ' حیات بعد ممات 'روح اور حقیقت روح کے متعلق مسلمان صوفیاء اور صوفی شعراء کے اقوال عربی اور فارسی میں جمع کئے ہیں - ان صوفیاء اور صوفی شعراء کا مختصر سوانحی خاکہ بھی فرانسیسی زبان میں تحریر کیا ہے- یہ کتاب ۲۶۰ صفحات پر مشتمل ہے جس کو میسینون نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے - پہلے سیکشن میں یکم ہجری سے ۲۹۰ ہجری تک کے صوفیاء کے کلام اور سوانحی خاکے موجود ہیں- دوسرا سیکشن ۲۹۰ ہجری سے ۵۷۷ ہجری تک کے صوفیاء کے کلام اور سوانحی خاکوں کا حامل ہے --- جبکہ تیسرا سیکشن ۵۷۷ ہجری سے شروع ہو کر آخری دور تک آتا ہے اور چوتھا سیکشن مسلم صوفی فلسفیوں کے خیالات' فلسفہ اور ان کے حالات زندگی کا حامل ہے- اس کتاب کے ٹائٹل پیج پر سردار امراؤ سنگھ نے مندرجہ ذیل آٹھ سطری تحریر بزبان انگریزی ثبت کی ہے اور ۱۳ نومبر ۱۹۲۹ء کو پیرس سے ان کو ارسال کی ہے-

My Dear Dr,Iqbal

I am sending to you this work which was presented to me kindly by the author, It will be more useful to you as you are at home in Arabic.

Yours

Umrao Singh

Paris (12)

نامور دانشور اور محقق ڈاکٹر لیئق بابری اپنے تحقیقی مقالے میں تحریر کرتے ہیں کہ

"ALLAMA IQBAL made two intellectual contracts in France one With Henri Bergson the renowned philosopher and the other with Louis Massignon the French Islamaloguethe importance of which cannot be overlooked in the development of his philosophic thought." (13)

اس کے بعد علامہ اقبال نے اپنی حیات فانی کے آخری ایام تک میسینون سے اپنے علمی اور ذاتی تعلقات استوار رکھے - چنانچہ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی (۱۸۹۶ء - ۱۹ ستمبر ۱۹۸۵ء) جس زمانہ میں پیرس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے علامہ اقبال نے ۱۸- اگست ۱۹۳۷ء کو یعنی اپنی رحلت سے تقریباً" ۸ ماہ پہلے عبداللہ چغتائی کو ایک مکتوب تحریر کیا اور اس میں عظیم فرانسیسی مستشرق کے نام سلام بھیجا- اس خط کی نقل پیش خدمت ہے-

لاہور ۱۵۔ اگست ۱۹۳۷ء

ڈیئر ماسٹر عبداللہ !

آپ کا خط مل گیا ہے ۔ الحمدللہ کہ آپ بخیریت ہیں ۔ چغتائی صاحب سنا ہے کہ لاہور پہنچ گئے ہیں ۔ لیکن مجھ سے اب تک ملاقات نہیں ہوئی۔ ان کے ذہن میں جو تجویز ہے 'اس کے معلوم ہونے پر رائے ظاہر کر سکوں گا۔

اطالین رسالوں کے مضامین کا انگریزی ترجمہ بہت جلد ارسال کیجئے بلکہ اصلی رسالے بھی ترجمہ کے ساتھ بھیج دیجئے۔ یہ دونوں رسالے محفوظ رکھے جائیں گے اور جب آپ واپس آئیں گے تو آپ کو دے دیئے جائیں گے یا اگر آپ چاہیں تو ان کو بذریعہ ڈاک آپ کے پاس بھیج دیا جائے گا۔

باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے ۔ شیدائی صاحب اور ان کی بیگم صاحب کا سلام قبول کریں۔ لاہور میں سخت گرمی ہے ۔ ساون کا مہینہ غیر معمولی طور پر خشک گزرا ہے ۔ آج کل پیرس میں خوب موسم ہو گا ۔ قادیان کے احمدیوں میں خانہ جنگی ہو رہی ہے اور خلیفہ قادیان پر ان کے باغی مریدوں کی ایک جماعت نے نہایت فحش الزام لگائے ہیں نقص امن کے احتمال سے وہاں کل سے دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کیا گیا ہے۔

سید راس مسعود وزیر معارف بھوپال دفعتہً " اس جہان فانی سے انتقال فرماگئے۔ خدائے تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے۔ بڑے مخلص اور دردمند آدمی تھے ۔ پروفیسر Massignon سے آپ کی ملاقات ہو تو میری طرف سے ان کی خدمت میں سلام عرض کیجئے۔ والسلام

محمد اقبال (۱۴)

" مولانا آزاد سے میری ملاقاتیں " میں میسینون نے علامہ اقبال سے پیرس میں اپنی ملاقات کا ذکر اس طرح کیا ہے ۔ اس ملاقات میں " جاوید نامہ " میں حلاج اور ابلیس کے ذکر پر بحث ہوئی۔

" میں نے ان (آزاد) سے ذکر کیا کہ مجھے بنگال میں حلاجی اثر و نفوذ سے کس قدر دلچسپی رہی ہے ۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان (آزاد) کی رائے میں منصور کے یہ پیرو حلاج کے اس ابلیسی نمونہ کے مشابہ ہیں جس کو اقبال نے اپنے جاوید نامہ میں پیش کیا ہے ۔ (اقبال نے خود مجھے اپنی وفات سے دو سال قبل پیرس میں مل کر پرجوش طریقہ سے اس کو (جاوید نامہ میں ابلیس کے ذکر اور نقل و عمل) سمجھایا بھی تھا) ہم نے سید سلیمان ندوی کے متعلق بھی گفتگو کی (جن کو اقبال نے حلاج پر میری تحقیقات کی نسبت لکھا تھا) اور موت سے قبل ان کی خلوت و عزلت کا بھی ذکر رہا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا (سید سلیمان ندوی) کو حلاج کے نظریہ صداقت " انا الحق " کی اس تعبیر سے دلچسپی تھی جس کو میں نے پیش کیا تھا۔" (۱۵)

علامہ اقبال ۳ نومبر ۱۹۳۲ء کو میسینون سے ان کی رہائش گاہ پر ملے ۔ مگر میسینون تحریر کرتے ہیں کہ وہ اپنی ملاقات سے دو سال قبل ان کو ملے تھے۔ جبکہ علامہ اقبال کی تاریخ وفات ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مراد ۱۹۳۶ء سال ہو گی۔ کیونکہ حضرت علامہ نے اس جہان فانی کو ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو خیرباد کہا۔ لیکن میسینون ۱۹۴۵ء میں سیاحت برصغیر کے لئے آتے ہیں تو ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو شاعر مشرق کی وفات کے ساڑھے سات سال بعد ان کی آخری آرام گاہ پر حاضری دیتے ہیں ۔ (۱۶)

ایک بار پھر ۱۹۵۳ء میں گاندھی جی (۱۸۶۹ء۔ ۱۹۴۸ء) سیمینار میں شرکت کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کی دعوت پر میسینون برصغیر آئے اور پہلے وہ جنوری ۱۹۵۳ء میں لاہور آئے اور یہاں سے وہ سرحد پار کرکے

اورنگ زیب قاسمی

بری راستہ امرتسر دہلی گئے ۔ اگرچہ انہوں نے اپنے اس مضمون میں وضاحت نہیں کی کہ قیام لاہور کے دوران وہ مفکر عظیم کے مزار پر حاضر ہوئے یا نہیں ' لیکن ایسا ناممکن دکھائی دیتا ہے کہ وہ لاہور آئے ہوں اور علامہ اقبال کے مزار پر حاضر نہ ہوئے ہوں ۔ (۱۷)

نہ صرف علامہ اقبال بلکہ میسینون نے بھی اپنی حیات فانی کے آخری ایام تک ان سے اپنا قلبی اور روحانی رشتہ استوار رکھا اور ۱۹۶۲ء میں جہان ناپائیدار کو خیرباد کہا۔ (۱۸)

عظیم فرانسیسی مستشرق خاتون میڈم ایوا میرو وچ (Madam Eva Meyero Vitch) نے علامہ اقبال کی پیام مشرق اور جاوید کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا اور جب میڈم موصوف نے علامہ اقبال کے خطبات کا فرانسیسی ترجمہ بعنوان

Lectures of the Allamas Reconstruire La pensee religieuse de l'Islam

تیار کیا تو میسینون نے علامہ اقبال کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

"Tribute to Iqbal:""The writers of the quality of Iqbal prove that the new independent Muslim nations can rethink philosophy and religious experience through the traditional vocabulary of Islam.The mysticism of Iqbal is not passive and his mystic philosophy did not isolate him from the movement of life and miseries of the people." (19)

میڈم موصوف Jehilard de Chardin کو علامہ اقبال کا ہم خیال اور ہم فکر خیال کرتی ہیں ۔ میسینون نے ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم کے فلسفہ اور نظریات پر ایک مستند کتاب تحریر کی ۔ انہوں نے مسلمانوں کے عہد قدیم پر بھی بہت کام کیا ۔ ان کی "کتاب الطواسین " ۱۹۱۳ء اور " اخبار حلاج " ۱۹۱۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں ۔ ان کے علاوہ Mr. Luce Claude اور Mr. Andre Guimbretire Martre نے فکر اقبال کو فرانس میں متعارف کرایا۔ ان کے فکر و فن پر مضامین تحریر کئے۔

لوئی میسینون ۲۵ جولائی ۱۸۸۳ء کو پیرس کے نزدیک ایک گاؤں Nogentsor Marine (نوجاں) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان آبائی طور پر Ilshe Adam کے نزدیک French Vrench کا باسی تھا اور نقل مکانی کے بعد ۱۸۷۹ء سے پیرس میں مقیم تھا۔ ان کے والد فرنانڈ میسینون (Fernand Massignon) ایک ماہر مجسمہ ساز اور مصور تھے ۔ ان کا قلمی نام ' فنکارانہ یا تخلص Pierre Roche تھا ۔ انہوں نے پیرس کے لئے بہت سے اعلیٰ مجسمے تراشے ۔

میسینون ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۹ء تک پیرس کے معروف تعلیمی اداروں Lycee Mohtaigne اور Louis Le Grand Lycee میں اپنی ابتدائی اور سیکنڈری تعلیم حاصل کرتے رہے۔ Lycee Louis Le Grand میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے مستقبل کے (Sinologue) عظیم ماہر چینی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادبیات Maspero Henry سے ملاقات ہوئی۔ جو اس کے بعد College de Franco میں ان کے رفیق کار بھی تھے۔ ہنری ماسپیرو کے والد گیسٹون ماسپیرو (Gaston Maspero) ایک عظیم علم دوست انسان تھے ۔ ان کے مصریات پر مشتمل کتاب خانہ نے میسینون کے دل میں مطالعہ مشرق (مشرقی علوم و

فنون) کا جذبہ ابھارا۔ ۱۹۰۰ء میں Lycee سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ University of Paris میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں انہیں پہلی مرتبہ مسلم ممالک کے مطالعاتی دورہ کا موقعہ ملا۔ ۱۹۰۴ء میں وہ اپنے Diplome de Etudus Superievres کے سلسلہ میں مراکش (مالی) گئے۔ یہاں وہ شہر FE2 میں خاص طور پر گئے ' جہاں قرون وسطیٰ میں Leon the African مقیم تھے جو میسینون کی ڈگری ریسرچ کا موضوع تھا۔ ان کی یہ کتاب جلد ہی پیرس میں اشاعت پذیر ہوئی تو میسینون نے de Foucauld Charles کو ان کی خانقاہ Beni Abbes میں تلاش کی ۔ Charles de Faucaulds ایک کیتھولک درویش تھے۔ انہوں نے شمالی افریقہ میں عظیم مشنری کام کئے ۔ انہوں نے مسلم ممالک کے نیک ' عابد ' زاہد اور صحرائی عربوں جیسی سادہ زندگی بسر کی۔ میسینون کی کتاب ان دونوں بزرگوں کی دوستی کی ابتدا تھی اور پھر ان کے مراسم گہرے ہوتے چلے گئے۔

۱۹۰۶ء میں جب میسینون نے کلاسیکل اور جدید عربی کی ڈگری انسٹی ٹیوٹ آف عربی سٹڈیز پیرس سے حاصل کی تو عربی زبان کے متعلق ان کے جذبے میں مزید اضافہ ہوا۔ خود تحریر کرتے ہیں :

There is a kind of transcendance in the language which I have already felt towards Arabic. (۱۷)

۱۹۰۵ء میں انہیں French Institute of Archaeology قاہرہ کا رکن نامزد کیا گیا۔ تو عرب فنون و تہذیب کے متعلق ان کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہوا۔ حقیقت میں جب انہوں نے اپنی پی ۔ایچ ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے منصور حلاج پر ریسرچ کا آغاز کیا اور مواد کی تلاش میں قسطنطنیہ کے کتاب خانوں کی ریسرچ کی اور یہیں سے وہ قاہرہ چلے گئے اور جامعہ الازہر میں فلسفہ کے مطالعہ کے لئے داخل ہوئے اور یہاں ان کی ملاقات مولانا ابوالکلام آزاد سے ہوئی ۔ (۱۸) لیکن میسینون خود رقم طراز ہیں کہ مولانا سے ان کی پہلی ملاقات بہ عمر ۲۳ / ۲۴ سال ۰۷-۱۹۰۸ء میں بغداد میں مسجد مرجان میں ہوئی تھی ۔ جہاں وہ دونوں (آزاد اور میسینون) استاد الحاج علی آلوسی بن نعمان آلوسی بن محمود آلوسی کے شاگرد تھے علی آلوسی ۷/۶ جنوری ۱۹۲۴ء کو فوت ہوئے اور ان کا مرقد اسی مسجد مرجان کے صحن میں موجود ہے۔ یہ وہی علی آلوسی ہیں جنہوں نے سید صدیق حسن خان بھوپالی (۱۴ اکتوبر ۱۸۳۲ء ۔ ۲ فروری ۱۸۹۰ء) سے تعلیم حاصل کی تھی۔ (۱۹)

۱۳-۱۹۱۲ء میں یونیورسٹی آف قاہرہ ' مصر میں خطبات دینے کے لئے انہیں نامزد کیا گیا اور اس جامعہ میں انہوں نے عربی زبان میں History of Muslum Philosophical Doctrines پر چالیس خطبات دیئے۔ یہاں ان کے طلباء میں بیسویں صدی کے عظیم مسلمان عالم طٰہٰ حسین (پ ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء) بھی شامل تھے۔

جب انہیں فرانسیسی وزارت خارجہ میں پریس اتاشی مقرر کیا گیا تو ان کی اپنی درخواست پر انہیں مشرقی ممالک فلسطین اور شام بھیجا گیا۔ یہاں ان کی ملاقات J.E Lawrence سے ہوئی ۔ ۱۹۲۳ء میں انہیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن اور اکادمی آف سائنسز یو ۔ایس ۔ ایس آر لینن گارڈ کے خارجی رکن کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۵۴ء تک کالج دی فرانس پیرس میں مسلم سوشیالوجی کے پروفیسر رہے ۔ فرانس کے اس معتبر اور موقر تعلیمی ادارے میں اسلام پر بہت اہم خطبات دینے کا موقعہ ملا۔ ان خطبات کو ان کی

اورنگ زیب قاسمی

زندگی کا اہم کارنامہ اور سرمایہ تصور کیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں وہ عربی زبان اکادمی کے رکن بنے اور یہاں ہر ماہ انہوں نے عربی زبان کی لغت مرتب کرنے میں حصہ لیا۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۳ء تک انہوں نے شمالی افریقہ کے مسلم کارکنوں کو اسلام پر لیکچر دیئے۔ ان کو Evening Lectures کا نام دیا گیا۔

سماجی ' معاشرتی اور انسانی میدان میں بھی ان کی خدمات بے مثل اور لاجواب ہیں ۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۲ء تک وہ جیل خانہ جات کے باقاعدہ رکن رہے ۔ خاص کر شمالی افریقہ کے قیدیوں کی ملاقات کے لئے وہ ہر ہفتہ جیل جایا کرتے تھے ۔ جہاں کہیں بھی اسلام کی خدمات کا سوال پیدا ہوا انہوں نے ممکن حد تک موثر خدمات سرانجام دیں ۔ فلسطینیوں اور اہل الجزیرہ کی جنگ آزادی کے بارے میں بہت فکر مند رہتے تھے ۔اسی بنا پر انہیں قتل کی دھمکیاں بھی دی جاتی رہیں ۔ وہ خود تحریر کرتے ہیں :

" ہم دونوں (آزاد اور میسینون کی زندگی کا بڑا حصہ ختم ہو چکا تھا ۔ ہم دوبارہ مل رہے تھے اور دونوں اس امر کے خواہش مند تھے کہ اسلام کو ایک تیسری بڑی قوت کا مقام دلائیں اور مسلمان اقلیتوں کی مساوات کے حقوق حاصل کرنے میں مدد دیں۔ وہ ہندوستان میں اور میں مغربی افریقہ میں ۔ ہم دونوں سلف ہی کو ہر معاشرتی اصلاح کے طریقوں کی مستحکم اساس تسلیم کرتے تھے ۔" (۲۰)

۱۹۵۸ء میں Charles de Foucauld پر کانفرنس کے دوران جونہی Intellectuala Univ-ersity Centre of Catholic کے ہال میں انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز کیا تو ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ وہ زخمی ہوئے ' تاہم انہوں نے اپنا لیکچر جاری رکھا۔

میسینون نے فرانسیسی سکالرز اور مستشرقین Roger Arnaldez Regis Blachere Henri Corbin اور بہت سے دیگر حضرات کو متاثر کیا۔ عراق ' ایران ' مصر ' مراکش ' الجیریا ' ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے علماء کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے ۔ میسینون عام علماء کی طرح تنگ نظر نہیں تھے ' بلکہ اپنے عہد کے بہت سے ادبا' شعرا علماء اور فلسفیوں سے ان کے تعلقات استوار تھے۔ Jacques Maritain اور Etienne Gilson سے ان کی گہری دوستی تھی۔ فرانسیسی شاعر Paul Caludel اور فرانسیسی ادیب Farancois Mauriac سے ان کی مستقل خط و کتابت رہتی تھی۔ معروف فرانسیسی شاعر Louis Aragon سے ان کی گہری دوستی تھی ۔ یہ شخص غیر مقلد تھا۔ وہ ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ اپنی نظم سب سے پہلے میسینون کو سناتا' مشورہ لیتا' پھر شائع کرواتا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ میں منصور حلاج کا مطالعہ صرف میسینون کی بدولت کر سکا۔ میسینون کی وفات پر یوں اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔

"That morning I was preparing to write to him: to whom in this world I Would ask advice before finishing the poem I had started which necessitated more knowledge on Islam than I had... I was going to request him to receive me to listen to me, And I opened the newspaper where it was his death." (21)

ماخذ

۱۔ روزگار فقیر' ج۔۱ص ۱۳۳/ ۱۳۴' ایڈیشن ۱۹۶۱ء

۲۔ روزگار فقیر' ج۔۱ص ۱۳۳ / ۱۳۴' ایڈیشن ۱۹۶۱ء

۳۔ روزگار فقیر' ج۔۱ص ۱۳۳ / ۱۳۴ ' ایڈیشن ۱۹۶۱ء

۴۔ مولانا آزاد سے ملاقاتیں از لوئی میسینون 'ص ۳۵

۵۔ Iqbals Meeting with Bergson and Massignon (Pakistan Times - - - 12,7,78)

۶۔ روزگار فقیر' ج۔۱ص ۳۵

۷۔ روزگار فقیر' ج۔۱ص ۱۳۵

۸۔ مکتوبات اقبال ' مرتبہ نذیر نیازی ' ص ۲۹۔۳۰

۹۔ Reconstruction of Religious thought in Islam (Saeed edition pp,77)

۱۰۔ مکتوبات اقبال ' مرتبہ نذیر نیازی

۱۱۔ مولانا آزاد سے میری ملاقاتیں ' لوئی میسینون ' ص ۳۴

۱۲۔ Recueil De Textex Indedita

۱۳۔ Iqbals Meeting with Bergson and Massignon

۱۴۔ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ' ج۔۲ص ۳۲۶

۱۵۔ مولانا آزاد سے میری ملاقاتیں ' لوئی میسینون ' ص ۳۵

۱۶۔ Iqbals Meeting with Bergson and Massignon

۱۷۔ Massignon - - - Man who discovered

۱۸۔ Mansur Hallaj Pakistan Times : Sept 221789

۱۹۔ مولانا آزاد سے میری ملاقاتیں

۲۰۔ مولانا آزاد سے میری ملاقاتیں

۲۱۔ Massignon - - - Man who discovered Mansur

("فاران" ' لاہور)

پروفیسر حفیظ تائب

اردو نعت پر قرآنی اثرات

اورنگ زیب قاسمی

گزشتہ تیرہ صدیوں میں دنیا بھر کے علوم و فنون نے قرآن پاک سے بہت استفادہ کیا ہے۔ بالخصوص ادبیات عالم پر اس کتاب مبین نے گہرا اثرات مرتسم کئے ہیں ۔ علامہ سعد الدین تفتازانی نے اپنی مشہور کتاب " مختصر المعانی " میں علم معانی اور علم بیان کی تمام مثالیں قرآن حکیم ہی سے اخذ کی ہیں۔ دراصل قرآن مجید کے نزول کے بعد فصاحت و بلاغت کے نئے معیار سامنے آئے اور یہی کتاب منبع صنائع بدائع کا اعتبار ٹھہری۔

اس فصاحت کا نہیں عالم امکاں میں وجود جس کو حاصل نہ ہو تائید کتاب محکم

(حافظ محمد افضل فقیر)

قرآن پاک کی فصاحت کے سامنے ' کچھ لوگ تو گنگ ہو گئے ' جیسے لبید بن ربیعہ عامری" انہوں نے قبول اسلام کے بعد شاعری ترک کر دی۔ حضرت عمر فاروق" نے اپنے عہد خلافت میں اس بات کا جائزہ لینا شروع کیا کہ اسلام نے شعر و ادب کو کس حد تک متاثر کیا ہے ۔ اس سلسلے میں جب انہوں نے حضرت لبید" سے استفسار فرمایا تو انہوں نے جواباً" سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا کہ اس کتاب کی موجودگی میں اب شاعری کی کیا ضرورت ہے ۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ حضرت لبید" اپنے وقت کے ملک الشعرا اور صاحب معلقہ شاعر تھے۔۔۔ دوسری طرف قرآن پاک سے اخذ و استفادہ کا سلسلہ شروع ہوا اور اب تاابد علوم و فنون اس کے سائے میں پرورش پائیں گے۔

نعت پر قرآن پاک کے اثرات بہت نمایاں ہیں ' اور سچ تو یہ ہے کہ نعت کا سب سے بڑا ماخذ ہی قرآن مجید ہے ۔ نعت کی بیشتر اصطلاحات اور موضوعات اسی کتاب سے لئے گئے ہیں ۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ" نے خلق محمدیؐ کی تعریف میں " کان خلقہ القرآن " فرما کر پوری کتاب آسمانی کو نعت کے موضوع سے ہم آہنگ قرار دیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات روح قرآن ہے ۔ اور قرآن حکیم آپؐ ہی کی سیرت مطہرہ کے حوالے سے ابدی منشور ہدایت ٹھہرا ہے ۔ اسی لئے حضرت علامہ اقبالؒ نے کہا۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب گنبد آبگینہ رنگ' تیرے محیط میں حباب

اور پھر فرمایا۔

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر وہی قرآں ' وہی فرقاں' وہی یٰسیں' وہی طٰہٰ

زیر نظر مضمون میں اردو نعت پر قرآنی اثرات کا مختصر سا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ (المتوفی ۱۰۲۰ھ) کا نعتیہ کلام اردو نعت کی تاریخ کا پہلا اہم شعری کارنامہ قرار دیا گیا ہے۔ جس میں قرآنی اثرات بہت واضح نظر آتے ہیں۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے

بیتاں دل و جیوسوں قرآن دیکھے
احمدؐ کے سو حق پر توں سب احسان دیکھے
دیکھ حلقہ خاتم النبیین میں توں
دل نیں موہ تاضع رحمان دیکھے

صنعتی نے اپنے " قصہ بے نظیر" المعروف قصہ تمیم انصاری" (تصنیف ۱۰۵۵ھ) جو نعتیہ شعر لکھے ہیں ان میں قرآن کریم سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

نبیؐ کریمؐ شفیع امین
رسولؐ خداؐ رحمت اللعالمین
ثنا جس کی بولیا سبحان ہے
سو طٰہٰ و یاسین و قرآن ہے
فلاحی علی عبدہ کا شرف
براں حق نے نازل کیا تج طرف

گیارہویں صدی ہجری تک کا بیشتر نعتیہ کلام مثنویوں کی صورت میں ہے اور اس میں نہ صرف مضامین قرآن پاک سے اخذ کئے گئے ہیں ' بلکہ قرآنی الفاظ کا بھی بے تکلفانہ استعمال کیا گیا ہے۔

ولی دکنی (المتوفی ۱۱۱۹ھ) نعت نبیؐ لکھتے ہوئے اپنی نظر قرآن پاک سے بہت کم ہٹاتے ہیں۔

لا مکاں پر بنا احمدؐ جو بنا بھلایا
تب ملائک نے وہیں صلوا علیہم گایا
حورو غلماں نے ترانے سنوں وہ تجھے بولے
قاب قوسین کا توشہ تو ہے بھایا سب کو
یاسین وطٰہٰ و الضحیٰ نازل ہوئے تجھ شان میں
واللیل اور والشمس ہے تجھ زلف و مکھ کے درمیان

قدما کے دور میں عام شاعری کے ساتھ ساتھ نعت پر بھی بہت نکھار آیا۔ نعت میں تبلیغی عنصر بھی شامل ہوا اور قرآن حکیم سے بالواسطہ اور بلاواسطہ استفادہ کا دائرہ پھیل گیا۔

تی سے بیتقی وجہ ریک کی سدا سرن کی پھیر
دور کر من سے خیال من علیہا فان کا
(سراج اورنگ آبادی (المتوفی : ۱۱۷۷ھ)

محمدؐ کنت کنزاً کی کوانی
محمدؐ عالم علم الٰہی
سودا (المتوفی : ۱۲۲۰ھ)

قدمائی کے دور کے مولانا محمدؐ باقر آگاہ (المتوفی ۱۲۲۰ھ) نے سیرت النبیؐ کے موضوع پر ایک نہایت گراں قدر کتاب " ہشت بہشت " لکھی۔ انہوں نے اس منظوم سیرت کو آٹھ رسالوں میں تقسیم کیا اور اسی لئے نام " ہشت بہشت " رکھا۔ آگاہ نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس کے مضامین سیرت کی معتبر کتابوں سے لئے ہیں۔ چنانچہ قرآنی مضامین اور الفاظ ہر رسالہ میں جابجا آتے ہیں۔ رسالہ " من ہرن " ظہور نبیؐ کی بشارت کے بیان میں ہے۔ اس میں لکھتے ہیں۔

جس کو ہے خوش نام رؤف و رحیم
سب کے اوپر جس کی ہے رحمت عمیم

رؤف و رحیم وہ اسماء ہیں جو حضورؐ کے لئے سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۱۲۸ میں آتے ہیں۔

" لوگو! تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک ایسے رسولؐ آئے ہیں جن پر تمہاری تکلیف شاق گزرتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند ہیں اور مومنوں کے ساتھ رؤف (شفقت کرنے والے) اور رحیم (مہربان) ہیں۔"

اورنگ زیب قاسمی

" رحمت عمیم " کی ترکیب سورۃ الانبیاء کی آیت نمبر ۱۰۷ سے اخذ کی گئی۔ جس میں ارشاد ہوا۔

" ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں (مخلوقات) کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔"

رسالہ ہفتم " من درپن " حضورؐ کے معجزات کے بیان میں ہے۔ اس کے دو شعر دیکھئے۔

ہے وہ ام الکتاب و نور قدی
کہ جس کی آیۃ الکرسی ہے کرسی
مقام خاص او ادنیٰ ہے جس کا
خدا بن کوئی نہیں داتا ہے جس کا

متوسطین کا دور اردو نعت کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے کہ نعت کا اصل فروغ اسی دور میں شروع ہوا۔ رنگ تغزل سے نعت کو وسعت دینے کا عمل بھی اسی زمانے سے متعلق ہے۔ زبان و بیان کی صفائی اور تشبیہات و استعارات کی ندرت کا اہتمام بھی زیادہ تر اسی دور میں ہوا۔ قرآن سے اخذ و استفادہ کا رجحان بھی بڑھا۔ قرآن و سیرت کی ہم رنگی و ہم آہنگی کا چرچا ہوا۔

معانی قل ہو اللہ احد کے ہیں یہاں " ناسخ"
برائے قافیہ رکھا ہے میں نے میم احمدؐ کا
ناسخ (المتوفی : ۱۲۵۴ھ)

ہے سورۃ والشمس اگر روئے محمدؐ
واللیل کی تفسیر ہوئی موئے محمدؐ
کرامت علی شہیدی (المتوفی : ۱۲۵۶ھ)

مطلع دو جہاں و مطلع الہ
سرفراز جہاں عہد پادشاہ
بہار ازل خاتم المرسلین
گل اولین و بہ آخرین
مومن (المتوفی : ۱۲۶۸ھ)

واللیل تیرے گیسوئے مشکیں کی ہے ثناء
والشمس ہے ترے رخ پر نور کی قسم
بہادر شاہ ظفر (المتوفی : ۱۲۷۹ھ)

گیسو تھے وہ مفسر واللیل اذا یغشیٰ
رخ سے عیاں تھے معنی والشمس والضحیٰ
وہ ریش پاک اور رخ سرور انبیاء
گویا دھرا تھا رحل پہ قرآں کھلا ہوا
اوڑھے سیاہ جبہ جو عالم پناہ تھا
کعبہ کا صاف حاجیوں کو اشتباہ تھا
انیس لکھنوی (المتوفی ۱۲۹۲ھ)

کیا قامت احمدؐ نے شیبائی ہے
چہرے پہ عجب نور کی زیبائی ہے
سنت کو نہ کیوں فخر ہو اس صورت پر
قرآن سے پہلے یہ کتاب آئی ہے
دبیر لکھنوی (المتوفی ۱۲۹۳ھ)

متوسطین کے دور میں جن دو شاعروں کی بدولت اردو نعت نے مستقل فن کی حیثیت اختیار کی ' وہ تھے غلام امام شہید (المتوفی۔ ۱۲۹۶ھ) اور لطف بریلوی (المتوفی ۱۲۹۸ھ) شہید کا نعت لکھنے اور پڑھنے کے سوا کوئی شغل نہ تھا۔ ان کے یہاں قصیدہ ' مثنوی' غزل اور ترجیع بند سب میں نعت ملتی ہے۔

لطف نے بھی پوری شاعرانہ صلاحیتیں نعت کے لئے وقف کردیں اور نعت میں پیرایہ غزل کی مقبولیت انہی کی کوششوں سے ہوئی۔ قرآنی نعت کے سلسلے میں لطف بریلوی کا اعتراف بھی دیکھئے۔

خداوند دو عالم ہے ترا مداح قرآں میں — تری تعریف لکھنے کی کہاں طاقت ہے انساں میں
داب لی ہے منہ میں اپنے صورت غنچہ زباں — ہم نے قرآں میں ترے وصف و ثنا کو دیکھ کر

متاخرین کے دور میں امیر مینائی اور محسن کاکوروی جیسے عظیم نعت گو ہوئے۔ جذبات کی فراوانی اور ندرت و لطافت سے نعت کا ادبی معیار بہت بلند ہوا۔ خیال آرائی کی طرف رجحان بڑھا تاہم اپنے بنیادی ماخذ سے نعت کا رشتہ بدستور قائم رہا۔

قوسین دوئی اور تعلی سے ہے ظاہر — مابین نہ تھا کوئی بھی حائل شب معراج
شائق حیدر آبادی (المتوفی:۱۳۱۵ھ)

کھلا ارباب عرفان پہ وہ نعتا عنک ورک سے — اٹھا جو خود قدرت نے چتارا محمدؐ کا
وہ مزمل وہ مدثر وہ طٰہٰ اور وہ یاسین — پکارا نام کس کس طرح سے پیارا محمدؐ کا
بیان یزدانی (المتوفی:۱۳۱۷ھ)

دونوں رخساروں کیصحت میں ہوا موزوں جو شعر — ترجمہ شمس الضحیٰ بدرالدجیٰ کاہو گیا
امیر (المتوفی: ۱۳۱۸ھ)

عنان کرم کے در منثور — قرآن شریف کے سورۂ نور
ہے جس کی شگفتہ رنگ تقریر — ما ینطق عن الہویٰ کی تفسیر
نزول نسخہ پاکیزہ کلام مجید — ترے عروج، تری حمد کے بیان کے لئے
محسن (المتوفی:۱۳۲۳ھ)

اردو نعت کے دور جدید کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہوا۔ نعتیہ شاعری میں بھی نئی روح پھونکی گئی۔ حقیقت پسندی کا رجحان غالب ہوا۔ تکلف و تصنع سے گریز کیا جانے لگا۔ مولانا حالی اور مولانا شبلی کے علاوہ مولانا احمد رضا بریلوی، مولانا کفایت علی کافی، مولانا حسن رضا خان اور مفتی غلام سرور لاہوری جیسے علمائے کرام اس میدان میں آئے تو نعت تعلیمات محمدیؐ کی تفسیر اور فیوضات رسالت کی تفصیل بنی۔
عزیز لکھنوی، غریب سہارنپوری، محمد مظفر الدین معلی احمد حیدر آبادی، ممتاز گنگوہی، کیف ٹونکی، اکبر میرٹھی، مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، حافظ جلیل مان کپوری، حافظ پیلی بھیتی، دلو رام کوثری نے نعت کا دامن مزید وسیع کیا۔

علامہ اقبالؒ نے اگرچہ براہ راست نعت نہیں لکھی مگر ان کی پوری شاعری کا اصل محور حضور اکرمؐ کی ذات گرامی تھی انہوں نے نعت گوئی کے لامحدود امکانات سمجھائے۔
مولانا ظفر علی خان اردو نعت کے لئے مجدد ثابت ہوئے اور دور حاضر ان کی رہبری کا ممنون ہے۔

شاد عظیم آبادی اور نفیس خلیلی نے بھی نعت کے رنگ جدید میں حصہ ڈالا۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری اور ماہر القادری نے نئی نعت کے خدوخال سنوارنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ ان کے ساتھ مولانا ضیاء القادری، حمید صدیقی اور بہزاد لکھنوی نے نعت میں والہانہ پن کا اضافہ کیا۔ اس دور کو اگر علماء کا دور کہا جائے۔ تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ لہذا قرآن پاک سے اخذ و استفادہ کا رجحان بھی اس زمانے میں بہت بڑھا۔

کُل ملاذغ البصر آنکھوں میں وہ چھایا ہوا — مژدہ روشن ہو رہا ما طغیٰ صلی علی
مفتی سرور لاہوری (المتوفی:۱۳۲۱ھ)

جو آیا ہے قلتنا کن لہ مضمون قرآں میں — بیان حال وصف صنعت چالاک دیتی ہے
بیان فاتبعونی سے یہ حجت مسلم ہے — کہ طاعت احمدؐ مرسل کی عین حق پہ تی ہے
محمد مظفر الدین معلی (المتوفی:۱۳۳۵ھ)

رخشاں ذکر پہ تصدق — سب اونچوں سے اونچی ہے شوکت کسی کی
اترے گے مازمیت یہ اللہ — چڑھی ایسے زوروں پہ طاقت کسی کی
گرا خوش ہوں تیر لک کی صدا ہے — کہ دن دونی بڑھتی ہے دولت کسی کی
فرشتوں نے ڈالی ہیں باہیں گلے میں — کہ وہ جائے راضی طبیعت کسی کی
حسن بریلوی (المتوفی:۱۳۲۶ھ)

انت فیہم نے عدو کو بھی لیا دامن میں — عیش جاوید مبارک تجھے شیدائی دوست
تیرے خلق کو حق نے عظیم کہا — تری خلق کو حق نے جمیل کیا
کوئی تجھ سا ہوا ہے نہ ہوگا شہا — ترے خالق حسن و ادا کی قسم
وہ خدا نے ہے مرتبہ تجھ کو دیا — نہ کسی کو ملے، نہ کسی کو ملا
کہ کلام مجید نے کھائی شہا — ترے شہر و کلام و بقا کی قسم
مولانا احمد رضا خاں بریلوی (المتوفی:۱۳۴۰ھ)

قرآنی مضامین کو جذب کر کے اپنے لفظوں میں بیان کرنے کا انداز بھی عام ہوا اور قرآنی لہجے کو اپنانے کی کوششیں بھی کی گئیں۔

وہ علم و حکمت سکھانے والا — پیام حق کا وہ لانے والا
کلام حق کا سنانے والا — عذاب حق سے ڈرانے والا
مقام محمود پانے والا — وہ بیت اقصیٰ کا جانے والا
ہے جسم محمدؐ سراپا منیرا — کہ ہے شان میں جس کی ذکراً کثیرا
جو حضور خالق ہوئی رہنمائی — محمدؐ کو بھیجا بشیراً نذیرا
خدائے محمد نے امت کو بخشی — وہ جنت، صفت جس کی ملکاً کبیرا
اکبر میرٹھی (المتوفی:۱۳۴۸ھ)

حفظ مراتب، پاس اخوت، سعی و توکل، رزق و قوت — تلک حدود اللہ میں مضمر [illegible]
اقبال سہیل (المتوفی:۱۳۷۵ھ)

ان ھو الا وحی یوحیٰ جس کی شان میں آیا ہے — رحمت عالم بن کے اک امی اس مکتوب کو لایا ہے
جاء الحق و زہق الباطل اس کی زبان پہ آتے ہیں — کفر کے پرچم سرنگوں ہے پرچم دیں لہرایا ہے
مولانا ظفر علی خاں (المتوفی:۱۳۷۶ھ)

اے تیریؐ ذات عقل کا پیرایہ دوام
تیرا عمل ہے معنی آیات بینات

اسریٰ جیسہ ہے ترے قرب کی دلیل
یہ سب ہیں تیری ذات کے قدسی تصرفات

(عبدالمجید سالک (المتوفی ۱۹۵۹ء))

عرش والا زمیں پہ آتا ہے
فاعتبروا یا اولی الابصار

(امجد حیدر آبادی (المتوفی ۱۹۶۱ء))

وہ شاہد وہ مبشر وہ نذیر و آمر و ناہی
خدا کے حکم سے حاکم مطاع ازماہ تک ماہی

(ابوالاثر حفیظ جالندھری)

قیام پاکستان کے بعد اردو نعت نے ارتقا کی منازل بہت تیزی سے طے کی ہیں۔ اس نظریاتی مملکت میں یہ ترقی بالکل قدرتی اور فطری ہے۔ نعت کے ذریعے کائنات انسانی کے مطالعے کا کام لیا جانے لگا ہے۔ نعت میں اس انقلاب کی بازگشت سنائی دینے لگی ہے۔ جسے برپا کرنے کے لئے ہی آخر الزمان ﷺ دنیا میں تشریف لائے تھے۔ حضورؐ کی تعلیمات اور منشور حیات کو نہایت خوبصورتی سے سمویا جا رہا ہے۔

آج کا نعت گو اپنے ذاتی اور کائناتی دکھوں کا علاج حضورؐ کی سیرت اطہر میں سے تلاش کرتا ہے۔ یوں اردو نعت زندگی سے ہم آہنگ ہو کر مقبولیت کی حدوں کو چھونے لگی ہے۔ ہیئت کے تجربے بھی ہو رہے ہیں ۔ قرآن حکیم سے نعتیہ مضامین اور الفاظ لینے کا سلسلہ بہت پھیل گیا ہے۔ مگر یہاں صرف چند مثالیں دی جائیں گی۔

حرف لا تقنطو اترا پیام
تجھ سے امید کا دیا روشن

تیرا خلق عظیم لا تثریب
تیرا عزم صمیم لا تحزن

نعرہ لاتخف سے "صہبائی"
اہرمن زہر سرنگوں رہزن

(اثر صہبائی)

رحمت ہیں آپؐ سارے جہانوں کے واسطے
آئے ہیں آپؐ سارے زمانوں کے واسطے

(محشر رسول نگری)

انا بشر کا جو اعلان و اعتراف کرے
نہیں جو وحی خدا میں مجاز بیش و کم

اے وہ کہ مل چکی جن کو نعمت ایماں
صلوا علیہ وسلمو تسلیما

(عبدالعزیز خالد)

حرف الم نشرح علیم ہے گواہ
حسن تکمیل ہے بعثت ان کی

(احمد ندیم قاسمی)

"کنت کنزا" کی وادیوں کا نور
آسمان قدم کا ماہ تمام

و رفعنا کی رفعتوں کا امیں
ابو الارواح کا بھی پیش امام

راز دار دنیٰ و او ادنیٰ
کتنا ارفع ہے عبدہ کا مقام

تھا یہی انشراح صدر کا راز
اس سے لینا تھا آئینے کا کام

(محمد اعظم چشتی)

عیاں ہے آیہ ما ینطق سے حسن کلام
رسولؐ پاک کے حسن بیاں کی بات کرو

(قمر یزدانی)

("اوج" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

پروفیسر محمد یونس حسرت

چند نعتیہ شہپارے اور علم الاعداد

یہ امر تو کسی وضاحت اور تشریح کا محتاج نہیں کہ اللہ جل شانہ نے اس کائنات اور کائنات کی تمام اشیاء کی تخلیق نور محمدی ﷺ سے فرمائی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب تخلیق کائنات کا ارادہ کیا تو پہلے اپنے پیارے حبیب محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کے نور کو پیدا فرمایا اور پھر اس نور سے اور اس نور کے صدقے میں کائنات اور کائنات کی ایک ایک شے وجود میں آئی۔

جو کچھ ہے کائنات میں تیرے طفیل ہے
ہوتا نہ کچھ ہوا ہے نہ ہو گا تیرے بغیر

گویا جو کچھ وجود میں آچکا ہے وہ بھی اور جو کچھ قیامت تک وجود میں آئے گا وہ بھی اسی نور محمدی (ﷺ) کی بدولت اور اسی نور محمدی (ﷺ) کے صدقے میں ہے اور ہو گا۔ قیامت تک جسے بھی اور جو کچھ بھی ملے گا اسی نور محمدی (ﷺ) کے صدقے میں ملے گا۔ کائنات اور عالم موجودات کی ایک ایک شے اور ایک ایک وجود تو نور محمدی کا صدقہ ہے ہی 'لطف کی بات یہ ہے کہ کائنات اور عالم موجودات کی ایک ایک شے اور ایک ایک وجود کا نام بھی نور محمدیؐ ہی کا صدقہ ہے۔ یعنی کائنات میں ہر شے اور ہر وجود کا نام محمد ﷺ کے نام نامی اور اسم گرامی سے مشتق ہے۔

علم الاعداد کا ایک دلچسپ اور حیرت انگیز کلیہ اس حقیقت کا بصیرت افروز ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ مگر اس حیرت انگیز کلیے کے بیان سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود علم الاعداد کے بارے میں چند ابتدائی باتیں بیان کر دی جائیں تاکہ اس کلیے کو سمجھنے میں دشواری محسوس نہ ہو۔

علم الاعداد دنیا کے قدیم ترین علوم میں سے ہے۔ آج بھی اگرچہ اس کا شمار علوم مخفیہ میں ہوتا ہے مگر اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اس کائنات میں اربوں اور کھربوں بلکہ اس سے کہیں آگے تک کا حساب صرف نو اعداد پر مشتمل ہے۔ قدیم مصریوں اور یونانیوں کو علم الاعداد پر کامل دسترس حاصل تھی۔ وہ انسانی زندگی پر اعداد کے اثرات کی بدولت پیدا ہونے والے نتائج سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ان اثرات اور نتائج پر بحث کرنا تو زیر نظر مضمون کے دائرے سے خارج ہے مگر ان قدیم لوگوں کے صدیوں پر محیط تحقیقی کام اور تجربات و مشاہدات کی بدولت ہی یہ حیرت انگیز امر سامنے آیا ہے کہ کائنات کے تمام پیچ در پیچ حساب کتاب کی بنیاد صرف ایک سے لے کر نو تک کے اعداد پر ہے۔

علم الاعداد کے ماہرین کسی چیز 'جگہ 'شے یا وجود کے نام کے اعداد نکالنے کے لئے حروف ابجد کی جدول سے استفادہ کرتے ہیں ۔ یہ جدول درج ذیل ہے۔

جدول حروف ابجد مع اعداد

ابجد				ھوز		
ا	ب	ج	د	ہ	و	ز
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷

حطی			کلمن			
ح	ط	ی	ک	ل	م	ن
۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰

سعفص				قرشت			
س	ع	ف	ص	ق	ر	ش	ت
۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰

ثخذ			ضظغ		
ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

علم الاعداد میں تمام حروف کی مندرجہ بالا قیمتیں شمار کی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل مزید امور کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔

۱۔ مد ( ) اور ہمزہ (ء) کا کوئی عدد شمار نہیں کیا جاتا۔

۲۔ اللہ ' الٰہی رحمٰن اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ میں بعض حروف پر جو چھوٹا الف ہوتا ہے اس کا کوئی عدد شمار نہیں کیا جاتا۔

۳۔ پ کے عدد ب کے مساوی شمار کئے جاتے ہیں۔

۴۔ ٹ کے عدد ت کے مساوی لئے جاتے ہیں۔

۵۔ ڈ کے عدد د کے مساوی شمار ہوتے ہیں۔

۶۔ چ کے عدد ج کے مساوی لئے جاتے ہیں۔

۷۔ ژ کے عدد ز کے مساوی شمار ہوتے ہیں۔

۸۔ ڑ کے عدد ر کے مساوی لئے جاتے ہیں۔

۹۔ گ کے عدد ک کے مساوی شمار ہوتے ہیں۔

ان اشارات کے مطابق ہم کسی چیز' شے یا وجود کے نام کے اعداد معلوم کر سکتے ہیں۔ مثلاً چاند 'قمر' مہتاب ' ماہتاب کے اعداد ملاحظہ فرمایئے۔

چاند: چ + ا + ن + د

۵۴= ۵۰ +۱ +۳

قمر: ق + م + ر

۳۴۰ = ۲۰۰ + ۴۰ + ۱۰۰

ماہتاب: م + ا + ہ + ت + ا + ب

۴۴۹ = ۲ + ۱ + ۴۰۰ + ۵ + ۱ + ۴۰

اسی طرح ہم علم الاعداد کے اس قاعدے کے مطابق کسی بھی چیز' جگہ ' شے یا وجود کے نام کے اعداد معلوم کر سکتے ہیں۔

علم الاعداد کی ان چند ابتدائی باتوں کے بعد ہم اس کلیے کی طرف آتے ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے ۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ علم الاعداد کا یہ کلیہ شروع ہی سے بزرگوں اور علماء کی دلچسپی کا مرکز بنا رہا ہے۔ جس طرح بعض بزرگوں نے قرآن مجید کی قرات کے قواعد کو منظوم کیا ہے یا جس طرح بعض شاعروں نے تقویم کے قاعدوں کو شعر کی صورت دی ہے اسی طرح اس کلیے کو بھی ابیات کی صورت میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں بھگت کبیر اور بابا نانک کے نغمے دوہے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

بھگت کبیر کہتے ہیں ۔

عدد نکالو چیز سے ' چوگن کر لو دائے
دو ملا کر پنچ گن کر لو' بیس کا بھاگ لگائے
باقی بچے کے نوگن کر لو' اس میں دو اور ملائے
کہت کبیر سنو بھئی سادھو' نام محمدؐ آئے

ترجمہ: ہر چیز سے عدد نکالو' اس کو چار گنا کر لو پھر دو ملا کر پانچ گنا کر لو اور بیس پر تقسیم کر دو جو باقی بچے اسے نو گنا کر کے اس میں دو اور ملا لو۔ بھگت کبیر کہتا ہے کہ سنو بھئی سادھو! اس طرح محمد [illegible] کا نام آئے گا۔ بھگت کبیر کے اس نغمے دوہے کے بعد اب ذرا بابا نانک کا نغمہ دوہا بھی ملاحظہ ہو۔ وہ کہتے ہیں۔

نام لو جس اچھر کا' کر لو چوگن سار
دو ملا کر پنچ گنا ' بیسوں دو اڑا
جو بچے سو نوگن کر دو اور لو ملا
نانک تن بدن سے محمدؐ لو بنا

ترجمہ: کسی بھی چیز کا نام لو۔ اس کے عدد نکال کر چار گنا کر لو۔ اس میں دو ملا کر پانچ گنا کر لو اور پھر بیس پر تقسیم کر دو جو باقی بچے اسے نوگنا کر لو اور پھر اس میں دو اور ملا لو۔ اے نانک اس طرح تم تن بدن سے محمدؐ بنا سکتے ہو۔

ان دوہوں میں علم الاعداد کے جس حیرت انگیز کلیے کو نظم کیا گیا ہے ۔ ذیل میں ہم اسے سادہ الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔ جس سے اس کلیے کی پوری ترکیب بھی معلوم ہو جائے گی۔

۱: کوئی نام یا لفظ لیں اور ابجد کے حساب سے اس کے عدد نکالیں۔

۲: حاصل شدہ عدد کو چار سے ضرب دیں۔

اورنگ زیب قاسمی

۳: حاصل ضرب میں دو جمع کریں۔

۴: حاصل جمع کو پانچ سے ضرب دیں۔

۵: حاصل ضرب کو بیس پر تقسیم کریں۔

۶: تقسیم کے بعد جو عدد باقی بچے اسے نو سے ضرب دیں۔

۷: حاصل ضرب میں دو جمع کریں۔

اس عمل سے ۹۲ کا عدد حاصل ہو گا جو محمد ﷺ کا عدد ہے ۔ یعنی

م + ح + م + د

۴۰ + ۸ + ۴۰ + ۴ = ۹۲

اس حیرت انگیز کلیے اور اس کے عمل کی وضاحت ذیل میں چند مثالوں سے کی جاتی ہے۔

۱: چاند کے اعداد بحساب ابجد = ۵۹

۲: ۵۹ کو چار سے ضرب دیا تو حاصل ضرب = ۲۳۶

۳: حاصل ضرب میں دو جمع کیا تو ۲۳۶ + ۲ = ۲۳۸

۴: حاصل جمع ۲۳۸ کو پانچ سے ضرب دیا تو ۲۳۸ x ۵ = ۱۱۹۰

۵: حاصل ضرب کو بیس سے تقسیم کیا تو ۱۱۹۰ ÷ ۲۰ باقی ۱۰ بچے

۶: دس کو نو سے ضرب دیا تو ۱۰ x ۹ = ۹۰

۷: حاصل ضرب میں دو جمع کئے تو ۹۰ + ۲ = ۹۲

اور ۹۲ محمد کا عدد ہے۔

مثال نمبر ۲ اوپر " قمر " کے عدد ۳۴۰ بتائے گئے ہیں۔ اب ذرا عمل ملاحظہ ہو۔

۱: قمر کے اعداد بحساب ابجد = ۳۴۰

۲: ۳۴۰ کو چار سے ضرب دیا تو ۳۴۰ x ۴ = ۱۳۶۰

۳: حاصل ضرب میں ۲ جمع کیا ۱۳۶۰ + ۲ = ۱۳۶۲

۴: حاصل جمع ۱۳۶۲ کو پانچ سے ضرب دیا تو ۱۳۶۲ x ۵ = ۶۸۱۰

۵: حاصل ضرب کو ۲۰ سے تقسیم کیا تو ۶۸۱۰ ÷ ۲۰ باقی ۱۰ بچے

۶: ۱۰ کو ۹ سے ضرب دیا ۱۰ x ۹ = ۹۰

۷: حاصل ضرب میں دو جمع کئے تو ۹۰ + ۲ = ۹۲ محمدؐ کا عدد ہے۔

مثال نمبر ۳ اوپر " مہتاب " کے عدد ۴۴۸ بتائے گئے ہیں۔ اب ذرا عمل ملاحظہ ہو۔

۱: مہتاب کے عدد بحساب ابجد = ۴۴۸

۲: ۴۴۸ کو چار سے ضرب دیا تو ۴۴۸ x ۴ = ۱۷۹۲

۳: حاصل ضرب میں ۲ جمع کیا تو ۱۷۹۲ + ۲ = ۱۷۹۴

۴: حاصل جمع کو پانچ سے ضرب دیا تو ۱۷۹۴ x ۵ = ۸۹۷۰

۵: حاصل ضرب کو ۲۰ سے تقسیم کیا تو ۸۹۷۰ ÷ ۲۰ باقی بچے ۱۰

اورنگ زیب قاسمی

۶: ۱۰ کو ۹ سے ضرب دیا تو ۱۰ x ۹ = ۹۰

۷: حاصل ضرب میں ۲ جمع کئے تو ۹۰ + ۲ = ۹۲ اور ۹۲ محمدؐ کا عدد ہے۔

مثال نمبر ۴ اوپر ماہتاب کے عدد ۴۴۹ بتائے گئے ہیں۔ اب ذرا ملاحظہ ہو۔

۱: ماہتاب کے عدد بحساب ابجد = ۴۴۹

۲: ۴۴۹ کو ۴ سے ضرب دیا تو ۴۴۹ x ۴ = ۱۷۹۶

۳: حاصل ضرب میں ۲ جمع کیا تو ۱۷۹۶ + ۲ = ۱۷۹۸

۴: حاصل جمع کو پانچ سے ضرب دیا تو ۱۷۹۸ x ۵ = ۸۹۹۰

۵: حاصل ضرب کو ۲۰ سے تقسیم کیا تو ۸۹۹۰ ÷ ۲۰ باقی بچے ۱۰

۶: ۱۰ کو ۹ سے ضرب دیا تو ۱۰ x ۹ = ۹۰

۷: حاصل ضرب میں ۲ جمع کئے تو ۹۰ + ۲ = ۹۲ اور ۹۲ محمدؐ کا عدد ہے۔

یہ صرف اس چاند کے چند ناموں کی مثالیں ہیں جو محمد ﷺ کی انگلی کے اشارے سے دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کا اشارہ پا کر الٹے پھرنے والے سورج' شمس یا آفتاب پر بھی اس کلیے کا عمل کیا جائے تو ۹۲ ہی کا عدد حاصل ہو گا۔ ایک چاند یا سورج ہی پر موقوف نہیں۔ اس کائنات کی کسی شے اور کسی بھی وجود کے نام پر اس کلیے کا عمل کیا جائے تو ۹۲ ہی کا عدد حاصل ہو گا جو محمد ﷺ کا عدد ہے۔ اس طرح یہ بات پایہ ثبوت تک کو پہنچ جاتی ہے کہ اس کائنات اور عالم موجودات کی ایک ایک شے اور ایک ایک وجود کا نام محمد ﷺ کے نام نامی اور اسم گرامی سے مشتق ہے۔

اوپر " امجد علی " کے نام کے عدد ۱۵۸ بتائے گئے ہیں لگے ہاتھوں ہم اس نام پر بھی علم الاعداد کے اس کلیے کا عمل آزماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو اس کی مثال۔

مثال نمبر ۵

۱: امجد علی کے نام کے اعداد بحساب ابجد = ۱۵۸

۲: ۱۵۸ کو ۴ سے ضرب دیا تو حاصل ضرب ۱۵۸ x ۴ = ۶۳۲

۳: حاصل ضرب میں ۲ جمع کئے تو ۶۳۲ + ۲ = ۶۳۴

۴: حاصل جمع ۶۳۴ کو پانچ سے ضرب دیا تو ۶۳۴ x ۵ = ۳۱۷۰

۵: حاصل ضرب کو ۲۰ سے تقسیم کیا تو ۳۱۷۰ ÷ ۲۰ باقی ۱۰ بچے۔

۶: ۱۰ کو ۹ سے ضرب دیا تو ۱۰ x ۹ = ۹۰

۷: حاصل ضرب میں ۲ جمع کئے تو ۹۰ + ۲ = ۹۲

اور ۹۲ محمد ﷺ کا عدد ہے ۔ گویا کسی بھی نام پر اس کلیے کا عمل کیا جائے تو ۹۲ کا عدد حاصل ہو گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کائنات کی ایک ایک چیز ہی نور محمدیؐ سے مشتق نہیں بلکہ کائنات کی ایک ایک چیز کا نام محمدؐ کے نام نامی اور اسم گرامی سے مشتق ہے۔ اس طرح دیکھنے والی آنکھیں کائنات کی ایک ایک چیز میں نور محمدیؐ کا جلوہ دیکھ سکتی ہیں اور اس فرمودۂ نبوی کی صداقت کا زندۂ جاوید ثبوت ملاحظہ کر سکتی ہیں کہ والخلق کلھم من نوری (الحدیث)

ترجمہ : اور اللہ نے تمام کائنات کو میرے نور سے پیدا کیا ہے۔
اور اب آخر میں علم الاعداد کے اس حیرت انگیز کلیے کی ایک اور منظوم اور آسان صورت ملاحظہ کیجئے۔

ہر شے میں محمدؐ ہیں، یہ بڑھ بڑھ کر صدا دو
منکر کو حساب ابجد و ہوز کا سکھا دو
ہر شے پہ لکھا اسم مبارک ہے خدا نے
یہ صفت خالق ہے گے سب کو بتا دو
ترکیب ہے یہ، لفظ کے اعداد کی تجمیع
مضروب کرو چار سے پھر دو کو ملا دو
پھر ضرب کرو پانچ سے اور بیس سے تقسیم
باقی جو بچیں، ضرب انہیں نو سے ذرا دو
پھر حاصل مضروب میں دو اور ملا دو
زاں بعد محمدؐ کے عدد سب کو دکھا دو
بے شبہ ہوئے مالک کونین محمدؐ
یہ پیکر عاجز کا سخن سب کو سنا دو
(محترمہ بلقیس رضویہ لکھنؤ)

نعت کے یہ چند شاہپارے جو علم الاعداد کی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں مزید تحقیق پر ایسے اور بھی یقیناً" نعتیہ اشعار مل جائیں گے جو سرکار دو عالم ﷺ کے اسم گرامی کا بلاشبہ ایک معجزہ ہوں گے ۔ جس سے علم الاعداد کی بوقلمونی بھی سامنے آئے گی اور اعداد و الفاظ کی دنیا میں عقیدت و محبت کے نئے پھول بھی کھلتے محسوس ہوں گے۔

("اوج" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

عالمی ادب میں جدید شعری تحریکات

انقلاب فرانس (۱۸۳۰ء) کے بعد واقعیت (Realism) ہی سب سے پہلی ادبی تحریک تھی، جس نے فرانس، روس، برطانیہ، اسپین، امریکہ غرض مغرب کے تقریباً" تمام ممالک پر ۱۸۵۰ء سے ۱۸۸۰ء تک اپنا سکہ جما لیا۔ مقامی رنگ میں زندگی کا ہر معمولی سے معمولی مسئلہ موضوع سخن کا درجہ پانے لگا اور شعر میں روزمرہ کے الفاظ کا استعمال ہونے لگا۔ ۱۸۳۹ء میں فوٹو گرافی کے ایجاد نے شعراء کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ایک فنکار کو ایسا اسلوب اختیار کرنا چاہیے جو بہت مناسب الفاظ میں حقیقت کی عکاسی کرے۔ انیسویں صدی کے واقعیت پسند ادباء میں فلابرٹ، ترگنیف، بالزاک، دوستوفسکی، جارج ایلیٹ، ٹوس مان، موریکے، کیلر اور ابسن وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بیسویں صدی کی جدید واقعیت پسندی قنوطیت پسندی کی حامل ہے اور موجودہ سوسائٹی کی بے تعلقی کا گہرا رنگ اس پر چھایا ہوا ہے ۔ اس کے برعکس روس میں اشتراکی واقعیت (Socialist realism) کا اثر زیادہ ہے۔ جس کا مقصد مارکس نظریات کی فنکارانہ عکاسی ہے ۔ گورکی اور شولو خوف وغیرہ کو اس اشتراکی واقعیت کے پیش رو ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یورپ میں واقعیت کی تحریک سے بہت پہلے برصغیر میں اردو کا ایک ایسا شاعر نظیر اکبر آبادی موجود تھا جو موضوع سخن اور انداز بیان کی ہر حیثیت سے واقعیت پسند شاعر کہلایا جاسکتا ہے۔ اس نے ہولی، پیسہ، آدمی کی مفلسی، روٹی وغیرہ پر جو واقعیت پسند نظمیں لکھیں، ان کا اسلوب اور تیکھا پن ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اردو میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ ۱۹۳۵ء سے حصول آزادی تک اشتراکی واقعیت کو خاص طور پر فروغ حاصل ہوا۔ ادھر مغرب میں اسی زمانے میں آڈن، اسپنڈر اور سی ۔ ڈے لوئیس وغیرہ انگریزی کے شعراء نے بھی اپنی نظموں میں مارکس اور فرائڈ کے نظریات سے گہرا اثر قبول کیا تھا۔

نظریہ ڈاروِن سے اثر قبول کرنے کے بعد واقعیت نے فرانس اور جرمنی میں ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ Naturalism کی شکل اختیار کر لی۔ Naturalism کا تقاضہ ہے کہ انسان کو میراث اور ماحول کی پیداوار تصور کرنا چاہیے۔ اس میں انسانی فطرت اور بورژوا معاشرے کی خرابیوں کے پس پردہ میراث اور ماحول کے اثرات کی عکاسی کو اہم سمجھا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کی واقعیت نے تاثریت (Impressionism) کے لئے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ تاثریت کے مصوروں کو اسٹوڈیو سے باہر نکال کر قدرت کی کھلی فضا میں لا کھڑا کر دیا۔ اور قدرت کے ہر آن بدلتے رنگ کو بغیر غور و خوض کے کینوس پر اتارنے کے لئے مجبور کیا۔ اس لئے فنکار کے ذہن میں اشیاء پہلی نظر میں جو تاثر پیدا کرتی ہیں اس کی ہو بہو عکاسی اس طرح کرنا کہ شاعر یا مصور

کی شخصیت کا اظہار نہ ہو ' تاثریت کا اہم مقصد ہے۔ اس میں زندگی کے غیر متعلقہ مشاہدات کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔

گون کورٹ نے پہلی بار ۱۸۵۹ء میں تاثریت کی تحریک کا آغاز کیا۔

Impressionist شعراء Pink pigs blossoming upon the hillsides جیسی شاعری کرنے لگے ایڈبرٹ اشلنز نے جرمنی زبان میں اس تحریک کو قبول عام بخشا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے تاثریت پسند شعراء میں جیکب سن ' تومن مان (رلکے) رلکے وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تاثریت نے جس تحریک کو اپنایا وہ علامت پسندی (Symbolism) کی تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

فرانس نے ادیب جین موریس (Jean Moreas) نے پہلی بار ۱۸ ستمبر ۱۸۸۶ء میں علامت نگاری کی اصطلاح کا استعمال کیا۔ حالانکہ فرانسیسی شاعری میں علامت نگاری کا آغاز بودلیئر کی شاعری سے ہوا۔ لیکن اس کے بعد کے شعراء۔ ورلین ' لوفورگ ' رمباؤ ' ملارمے وغیرہ نے اس تحریک کو قبول عام بخشنے میں اہم حصہ لیا۔ علامت سے مراد ایک ایسا لفظ یا ایک ایسا ذہنی پیکر ہے جس کی ظاہری معنویت کے علاوہ ایک وسیع باطنی معنویت بھی ہوتی ہے۔ چونکہ شاعری کے بعض ماورائی اور مابعد الطبیعی تجربات کے اظہار کے لئے مروجہ الفاظ کا ذخیرہ کافی نہیں ہوتا اس لئے وہ اپنے ان تجربات کو ظاہر کرنے کے لئے علامت کی مدد حاصل کرتا ہے۔ مثلاً اقبال کے یہاں " شاہین " کی علامت زندگی کی اس ماورائی کیفیت کی علامت ہے جسے تکاپوئے " دوام " سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی مکمل کیفیت کا اظہار ممکن نہیں۔ اسی طرح ایلیٹ نے زندگی کے خشک پہلوؤں کی طرف Rock کی علامت استعمال کی ہے۔ غرض کہ علامت بظاہر چند الفاظ میں محدود رہنے کے باوجود رمزو ایماء کی وجہ سے اپنے دامن میں کافی وسعت کی گنجائش رکھتی ہے۔ چونکہ ایک علامت کے پیچھے مختلف قسم کی پیچیدہ جذبات و احساسات کی کارفرمائی ہوتی ہے اس لئے علامت کی تشریح ہمیشہ ممکن نہیں۔ فرانس کے علامت پسند شعراء نے علامتوں کی مدد سے داخلیت اور خارجیت کے درمیان ہر طرح کا فرق ختم کر دیا۔ ان شعراء نے خود اپنے اندر ایک مابعد الطبیعی کائنات کا سراغ لگایا اور حسن پرستی کے ساتھ ساتھ ماورائی حقیقت کی بابت متصوفانہ مزاج کا ثبوت دیا۔ علامت نگاری کے باوجود بودلیئر کی شاعری میں ابلاغ کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔

علامت نگاری کی تحریک کا آغاز دراصل یورپ کے عقل پرستی ' میکانکی اور سائنسی رجحانات کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر ظاہر ہوا۔ نیوٹن اور ڈیکارٹ کے منطقی قوانین نے لوگوں کے ذہن پر اتنا اثر کیا کہ وہ ہر چیز کو سائنسی اور منطقی قوانین کی روشنی میں دیکھنے لگے۔ اس میکانکی انداز فکر کے خلاف رومانی تحریک وجود میں آئی۔ جس میں کائنات منطقی کم اور پراسرار زیادہ تھی۔ لہٰذا مغرب کے شعراء نے اس میکانکی اور بے حس انداز فکر کے خول کو توڑا۔ یہ انیسویں صدی کا دور تھا۔ جب قدیم نظام اقدار کی شکست وریخت مکمل ہو گئی تھی اور زندگی کا کوئی ایسا واضح نقشہ پیش نہیں کیا تھا جو محض غیر سیاسی اقتدار پر مبنی ہو۔ ہمارے ہاں میر اور سودا کا دور بھی اسی نوعیت کا تھا۔ پرانی اقدار تباہ ہو رہی تھیں اور نئے اقدار حیات کی تشکیل نہیں ہو سکی تھی۔ لہٰذا ان حالات میں شاعر باہر کی دنیا سے گریز کرکے اپنی ہی ذات کو انجمن خیال کرنے لگتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ معاشرے کی از سر نو تشکیل بھی چاہتا ہے۔ اس کی یہ دنیا بیشتر تصور ' تخیل اور خیال و خواب پر مبنی

اورنگ زیب قاسمی

ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ اسے رومانی دنیا میں لے جاتی ہے۔ رومانی تصور چونکہ ٹھوس اور متعین راہوں سے انحراف کی کوشش کرتا ہے اس لئے نئے امیجز ' پراسرار اور انجانی دنیائیں اور نئی علامتیں خود بخود ظہور میں آنے لگتی ہیں۔ مغرب میں رومانی تحریک سے ہی علامت نگاری نے جنم لیا ہے۔ انگریزی ادب میں علامت نگاری کی ابتدائی مثالیں ہمیں کولرج کی نظموں میں مل جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ قطعی علامتی نظمیں نہیں ہیں تاہم یہ علامت نگاری کی طرف ابتدائی قدم کہی جاسکتی ہیں۔

(The Ryme of the ancient Mariner) میں چاند ستارے ' پانی ' کشتی ' سانپ وغیرہ قدیم دیومالائی تصورات کے ساتھ ساتھ نئی معنویت کی بھی نشاندہی کرتی ہیں۔ اسی طرح Kubiai Khan میں جنت اور Christabel میں دوزخ کا تصور ملتا ہے لیکن یہ دوزخ اور جنت صرف فنکار کی ہی ہیں۔ شیلے کی شاعری کے دوسرے پہلو یعنی رومانی شاعری میں بھی ہمیں علامتی اظہار مل جاتا ہے۔ جو اس کی انقلابی شاعری سے مختلف ہے۔ Yeats نے شیلے کے اس پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

" اس شاعری میں جگہ بہ جگہ رمزیہ تصاویر ملتی ہیں جو علامات کی قطعیت کی حامل نہیں ہیں مگر جوں جوں سال گزرتے گئے وہ انہیں ارادتاً بطور علامات استعمال کرتا گیا۔"

آج کے دور میں ہم جس علامت نگاری کا ذکر کرتے ہیں اس کا آغاز فرانس سے ہوتا ہے۔ ۱۸۸۶ء میں فگارو (Figaro) نے علامتی شاعر کا ایک مینیفسٹو پیش کیا جس میں اس نے کہا کہ الفاظ کو معروضی باتوں کے اظہار کی بجائے ذہنی کیفیات کا عکاس ہونا چاہیے۔ وہ لکھتا ہے کہ " علامتی شاعری خیال کو حسی صورت میں ملبوس کرتی ہے جو بہرحال اس کا مدعا نہیں ہے۔ اس فن میں تمام ٹھوس پیرایہ اظہار حقیقت فقط حسیاتی صورتیں ہیں جو ابدی خیالات کے ساتھ ان کے باطنی رشتوں کی تصویر کشی کرتی ہیں۔"

نئی علامتوں کو لطیف اور دل پذیر بنانے کے لئے اس تحریک نے مصوری اور موسیقی کے تاثر کا سہارا لیا۔ بودلیئر (Boudelaire) کہتا ہے کہ " اس زندگی کے جو مکاشفے ہیں اور ان کے ماوراء جو حقائق ہیں ان کی بجھائے نہ بجھنے والی پیاس ہمارے غیرفانی ہونے کا زندہ ثبوت ہے۔ یہ شاعری اور اس کی معاون موسیقی کے طفیل ہی ہے کہ روح حیات بعد الممات کے جلوؤں کا نظارہ کرتی ہے اور جب کوئی اعلیٰ نظم ہماری آنکھوں میں آنسو لے آتی ہے تو وہ آنسو فرط مسرت کا ثبوت نہیں ہوتے بلکہ ایک تکلیف دہ غم کی نشانیاں اعصاب کے تشنج کی علامتیں اور اس امر کی دلیل ہوتے ہیں کہ ہماری فطرت جو اپنے اصلی مسکن سے جلاوطن ہو کر اس ناقص و ناتمام دنیا میں قید کر دی گئی ہے۔ اس جنت کو جو اس کی آنکھوں پر یکایک بے نقاب ہو گئی ہے۔ اسی دنیا میں فوراً پالینا چاہتی ہے" (۱)

یعنی بودلیئر معروضی اشیاء کو وسیلہ اظہار بنانے میں تامل سے کام لیتا ہے اور جہاں کہیں بھی وہ خارجی وسیلوں کا سہارا لیتا ہے تو ان کا مفہوم روایتی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذہن کی انفرادی کیفیت کا عکس ہوتا ہے جو اپنے اندر کئی انجانے جذبے اور احساس رکھتا ہے۔

اس ذیل میں ہم اس کے مشہور سانیٹ کو پیش کر سکتے ہیں جو علامت نگاری کا مینیفسٹو بھی ہے اور اس میں شاعر خود بھی علامات کے جنگل سے گذر رہا ہے۔

Natures temple where each living columon,

At times gives forth vague words,There Man advances
Through forest- graves of symbols strange and soleman,
Who follow hime with their familiar glances,
As long drawn echoes mingle transfuse
Till in a deep dark union they swoon
Vast as the night or as a vault of noon-
So are commiagled perfumes sounds and bues
There can be perfumes cool as childrens flash
Like feddle sweet like meadows greenly fresh
Rich complex and triumphant others roll.

With the wast rang of all non-firite things
Amber musk incense,besyamineach sings
The Transports of the sense the soul(2)

فطرت کا معبد جہاں ہر زندہ کالم
بعض اوقات مبہم الفاظ بکھیرتا ہے۔ وہاں انسان بڑھتا ہے
علامات کے گھنے جنگلوں میں سے ۔ اجنبی اور سنجیدہ
جو اپنی شناسا نگاہوں سے اس کا پیچھا کرتے ہیں

جیسے گنبد کی گہری آواز مدغم متبدل ہو جاتی ہیں
حتیٰ کہ ایک گہری گھنی ظلمت میں وصال پاتی ہیں
دوپہر کے گنبد کی طرح بارات کی طرح وسیع
ایسے ہی خوشبوئیں' آوازیں اور رنگ میں مدغم ہو جاتے ہیں

ایسی خوشبوئیں بھی ہیں جو بچوں کے گوشت کی طرح نرم ہیں
نفیری کی طرح میٹھی ' مرغزاروں کی طرح تازہ
بھرپور، بھمبیر اور ظفر مند۔ دوسری پھیلتی ہیں
لاتناہی اشیاء کی ابدی وسعت میں
عنبر' مشک ' عود اور بخور تمام گاتے ہیں
حسیات اور روح کے (متبدل مدغم) عارفانہ نغمات (۳)

اس نظم میں علامتوں کا استعمال اگرچہ نظم کو نفوس پیرایہ ء اظہار عطا کرتا ہے لیکن معنی کے لحاظ سے اسے تجریدی بنانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ یعنی اس میں الجھے ہوئے خیالات کے معنوی رشتوں کو علامات کے ذریعے لاتناہی اور پرکیف بنانے کی سعی ملتی ہے۔ اور یہ اظہار موسیقیت سے قریب تر لایا گیا ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

بودلیئر کے بعد رمبو (Rimboud) نے اپنی اندرونی اور روحانی دنیا کے اظہار کے لئے علامتوں کا استعمال کیا لیکن اس کے ہاں بھی ہمیں کوئی منطقی یا واضح تسلسل نہیں ملتا۔ اس کے خیال میں شاعر کو اپنے اوپر ایسی کیفیت طاری کر لینی چاہیے۔ جس سے شعور کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے اور وہ متعین قواعد سے ہٹ کر حقیقی ذہنی تصاویر پیش کرے جو وہ محسوس کرتا ہے۔ ورلین (Verlaine) کی شاعری بھی رمبو (Rimboud) کی شاعری سے متاثر ہے ۔ اس نے بھی رمبو کی طرح وقت کے حصار اور مقام سے ماوراء ہو کر اپنی روحانی زندگی کی تاریخ علامتی تصاویر (Visions) میں بنائی ہیں جہاں منطقی تسلسل نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں دوسرے علامتی شعراء کی طرح ورلین نے بھی موسیقانہ اسلوب کا سہارا لیا ہے تاکہ ذہنی تصویر زیادہ موثر اور واضح ہو کر سامنے آسکے۔

ملارمے جو بودلیئر کے بعد سب سے بڑا علامتی شاعر کہلایا جاسکتا ہے اس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ :
" ہر لفظ بیک وقت تصویر ہی نہیں ۔ فکر کا پیکر ' جذبے کی لہر اور فلسفے کی علامت بھی ہو" اس کے سانیٹ اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ بھی منطقی اصولوں کی بجائے رومانی اور علامتی دونوں کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر ایسی فضا پیدا کرنا چاہتا تھا جو بیک وقت حسیاتی بھی ہوں اور تاثراتی بھی۔ اور اس کی تشکیل کردہ فضا ایک نئی دنیا کا احساس دلائے۔

اسی طرح ہمیں انگریزی ادب میں ییٹس (Yeast) اور ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ بھی علامتی شاعری میں نمایاں مقام رکھتے ہیں ۔ Yeast کی نظم "A Coat" اور ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ کی نظم "Waste land" کی بات کی دلیل ہیں کہ انہوں نے قومی اور فکری جذبوں کو نظم کا پیراہن عطا کرنے میں نئی نئی علامتوں کو وضع کیا۔ "A Coat" میں کوٹ ایک علامت کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے جس پر قدیم دیومالائی نقش و نگار ہیں لیکن کم عقلوں کی نقالی سے وہ قدیم اور عظیم تہذیبی ورثہ تباہ ہو گیا ہے۔ Yeats اب اس کوٹ سے نجات پانا چاہتا ہے یعنی جدید تہذیب اس کے نزدیک اعلیٰ قدیم تہذیب کی بگڑی ہوئی شکل میں موجود ہے ۔ The Second Coming میں Yeast نے اس خیال کو اور واضح طور پر پیش کیا ہے۔

ایلیٹ کی نظم Waste land بھی دراصل جدید تہذیب کا ایک نوحہ ہے ۔ یہ نظم پہلی جنگ عظیم کے معاشرتی اور تہذیبی تغیر اور اس کے دردناک نتائج کے ردعمل کے طور پر سامنے آئی ۔ اس میں جدید تہذیب کے بانجھ پن کو ظاہر کرنے کے لئے جدید علوم ' کلاسیکی ادبیات اور دیومالائی کہانیوں کی اکثر علامتوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اب ہم اردو شاعری کی طرف آتے ہیں ۔ جدید دور سے پہلے بھی ہماری شاعری میں علامت نگاری کے نمونے مل جاتے ہیں۔ قدیم شاعری علامتی اظہار سے یکسر خالی نہیں ہے۔ اس شاعری میں چند علامات تو بار بار اپنے متعین مضمون کے ساتھ مل جاتی ہیں ۔ مثلاً" شمع ' مے ' صنم ' بتکدہ ' ابلیس ' عیسیٰ وغیرہ نہ صرف ایک مخصوص معنوی رشتوں کے عکاس ہیں بلکہ کہیں کہیں ان کا استعمال پہلودار بھی ہے مثلاً"

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس شعر میں شمع نہ صرف استعارہ ہے بلکہ یہ زندگی کے سفر کی مکمل داستان بھی ہے۔ یہ زندگی کے بیچ

وقتی، الم و خوشی، بے ثباتی اور زندگی کو بطور بسر کرنے کی ایک علامت بھی ہے۔ اسی طرح نظیر اکبر آبادی کی نظم "ہنس نامہ" مکمل طور پر ایک علامتی نظم ہے۔ اس نظم میں بھی انسانی زندگی کے سفر کو ایک "ہنس" کے ذریعے علامتی اظہار کے طور پر برتا گیا ہے۔ اور زندگی کی رنگا رنگی، دوسروں سے تعلقات اور یگانگت، دنیا سے محبت اور آخر انسانی سفر کے خاتمے پر یہ نظم مکمل ہو جاتی ہے۔

دنیا کی جو الفت ہے تو اس کی ہے یہ کچھ راہ
جب شکل یہ ہووے تو بھلا کیونکر ہو نباہ
ناچاری ہو جس جا میں تو واں کھینچے کیا چاہ
سب رہ گئے جوں ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

اسی طرح "بنجارہ نامہ" بھی علامتی نظم میں شمار ہو سکتی ہے جس میں فانی انسان کی بے مایہ خواہشات اور حرص و ہوس کو بے معنی قرار دے کر یہ ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ تیل بدن کا ہانکے گا
کوئی ناج سمیٹے گا تیرا کوئی گون سیئے اور ٹانکے گا
ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں تو خاک لحد کی پھانکے گا
اس جنگل میں پھر آہ نظیرؔ اک بھنگا آن نہ جھانکے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

تو یہ بنجارہ صرف ایک متعین کردار نہیں ہے بلکہ زندگی کی حرکت اور کوششوں کی علامت ہے اور انسانی خواہشات، کیفیات، آرزوؤں اور ان کے نتائج کی پوری داستان ہے۔

علامتی شاعری کی بنیاد امیجری (Imagery) ہے۔ شاعر کا وجدانی اور تخلیقی عمل اپنے اظہار کے لئے رمزیہ تصاویر کے سانچے بناتا ہے۔ اس وجدانی عمل کے لئے اسے لامحالہ معروضی سہاروں سے کنارہ کش ہو کر مکمل تمثالی اختیار کرنی پڑتی ہے یہ تمثالی بہت مشکل اور خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ روح کے انکشاف کو نکل تو کھڑا ہوتا ہے لیکن ایک بہت بڑا خطرہ بھی مول لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ذات کی گہرائیوں میں گم ہو کر ایک نیا امیج دیتا ہے تو وہ ایک روشن حقیقت کی طرح سامنے آجاتا ہے لیکن اگر شاعر کو اپنے اظہار کی قوت پر پوری گرفت نہیں ہے تو اس کی علامتیں اور امیجز ابہام اور گنجلک ہو جاتے ہیں۔

عالمی ادب میں علامت پسندی کی غیر معمولی مقبولیت کا بہت بڑا سبب غالباً یہ ہے کہ اس نے شاعر کے پیچیدہ جذبات کے ساتھ ساتھ موجودہ حیات کے الجھے ہوئے مسائل کو علامتوں کی مدد سے اپنے فن کے دامن میں جذب کر لیا ہے۔

علامت نگاری کی تحریک کے بعد کی تحریک استقبالیت (Futurism) کہلاتی ہے۔ اٹلی میں ماری نتی (Mari Natte) نے ۲۰ فروری ۱۹۰۹ء کو اپنے فرانسیسی مضمون استقبالیت کا مینی فیسٹو (Manifestedu Futurism) میں اس تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اس تحریک نے ماضی سے رشتہ منقطع کر کے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے مشین، فیکٹری اور صنعت کا لحاظ رکھتے ہوئے شاعری شروع کی۔ اور اہل قلم نے سارل

اور نطشے کے فلسفوں کو سیاست میں بھی داخل کر دیا۔ فاشزم کی حوصلہ افزائی کی گئی اور جنگ کو دنیا کی آسودگی کا باعث قرار دیا۔ اسلوب اور انداز بیان کے اعتبار سے ان لوگوں نے الفاظ کے استعمال میں آزادی کو مد نظر رکھا اور منطق اور استدلالی جملوں کے استعمال سے گریز کیا۔ اس کے علاوہ شاعری میں کیمیائی اصطلاحات، ریاضی کے فارمولے اور بے معنی ہم آواز الفاظ (Onomatopoeia) کے استعمال کو جائز قرار دیا۔ یہ تحریک زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہ سکی اور ۱۹۳۰ء میں ختم ہو گئی۔ استقبالیت طفلانہ (Nihilist) رجحان کی حامل ہونے کے باوجود یورپ کے ادب پر گہرے اثرات چھوڑ گئی اور اس تحریک نے بعد کی تحریکوں مثلاً "کیوب ازم"، "ڈاڈا ازم"، "ایکسپریشنزم" اور "سرریلزم" کے لئے راستہ ہموار کیا۔ استقبالیت روس میں پہنچ کر انائی استقبالیت (Ego Futurism) اور مکعبی استقبالیت (Cubo futurism) میں تقسیم ہو گئی۔ پہلے گروہ کے رہنما اگر سیوریانن نے قواعد کی پابندی سے خود کو آزاد کر کے الفاظ کے بے دستور استعمال کو جائز قرار دیا۔ کیوبو فیوچرازم کے حامی اداہ میں مایا کوسکی شامل ہیں جنہوں نے روس کی کلاسیکی ادب (جیسمل گورکی) کے ادبی رجحان سے کنارہ کشی اختیار کر کے مشینی انکشافات کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن ۱۹۱۷ء کی جنگ کے بعد مایا کوسکی استقبالیت پسندی ترک کر کے رجعت پسندی کی طرف مائل ہو گیا۔

مکعبیت (Cubism) کی تحریک استقبالیت کی ہم عصر ہے۔ مصوری میں مکعبیت سے مراد جیومیٹری کی اشکال کا ایک ایسا امتزاج ہے جو بادی النظر میں غیر مربوط معلوم ہو لیکن غور سے دیکھنے پر پوری تصویر ایک کیوب یا مکعب کے اندر سجایا ہوا مصور کا کوئی طور تجربہ نظر آئے۔ شاعری میں مکعبیت سے مراد غیر مربوط ذہنی پیکروں (Images) اور مبہم اسلوب کا امتزاج ہے جس میں ایک داخلی ربط و تسلسل قائم کیا جاتا ہے اس کے لئے کبھی کبھی جیومیٹری کی اصطلاحات کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ ایسی شاعری تجربات کو مختلف اجزاء میں پریشان کر کے انہیں نئے انداز میں پھر سے ترتیب دیتی ہے گوئیلام اپولیر، کمنگس اور گرٹروڈ سٹائن وغیرہ نے شاعری میں مکعبیت کے تجربے کئے ہیں۔

علامت پسند شعراء جو غیر ضروری اور نمائشی الفاظ بکثرت استعمال کرتے تھے، اس کے رد عمل کے طور پر ٹی۔ ای۔ ہیوم کی راہنمائی میں ایذرا پاؤنڈ نے ۱۹۱۲ء میں پیکریت (Lanagism) کی بنیاد ڈالی جس میں شاعرانہ تجربات کے اظہار کے لئے مناسب ترین ذہنی پیکر کے استعمال کو ضروری سمجھا جانے لگا۔ اس تحریک کا آغاز دراصل ہیوم کے ایک شاعرانہ مکتب سے ہوا جس کی بنیاد ۱۹۰۸ء میں ڈالی گئی تھی۔ شروع میں ٹیگور، ایلیٹ اور لارنس کو بھی اس تحریک سے وابستہ کیا گیا تھا لیکن بعد میں ان لوگوں کو علیحدہ کر دیا گیا۔ ۱۹۱۴ء میں مس ایمی لوول نے اس تحریک کی راہنمائی کی اور بعد میں (Vorticism) کی ابتداء کی جس میں مناسب ترین الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ کلام میں سادگی، حسن، ہم آہنگی، خیالات کی آزادی وغیرہ کو بھی ضروری سمجھا جانے لگا۔ Some Imogists ۱۹۱۵ء میں ایذرا پاؤنڈ نے پیکریت کے لئے ذیل کے نکات کو ضروری سمجھا ہے۔

(۱) عام بول چال کی زبان میں مناسب ترین الفاظ کا استعمال (۲) نئے موڈ کے لئے نئے آہنگ کا استعمال (۳) موضوع کے انتخاب کی مکمل آزادی (۴) ذہنی پیکر کا استعمال اور مبہم شاعری کی بجائے ٹھوس اور واضح شاعری کی تخلیق (۵) مرکزیت کو شاعری کی روح تسلیم کرنا۔

لفظ "ذہنی پیکر" (Image) دراصل اپنے دامن میں کافی وسیع معنویت رکھتا ہے جو بقول ٹی۔ ای۔

اورنگ زیب قاسمی

اورنگ زیب قاسمی

. رچرڈز تحریر شدہ الفاظ سے وابستہ ذہنی پیکر سے شروع ہو کر آزادانہ ذہنی پیکر ' اشارات ' کنایات ' جذبات اور مجموعی تاثر کے مدارج سے ہوتے ہوئے ہمیں نشاط اور انبساط عطا کرتا ہے ۔ اس معنی میں شعری اس وجدانی کیفیت کو ذہنی پیکر سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ اور ذہنی پیکر کے حصار میں تشبیہ ' استعارہ ' علامت وغیرہ بھی آسکتی ہے ۔ لیکن پیکری شعراء جس معنی میں ذہنی پیکر استعمال کرتے ہیں وہ کچھ مختلف ہے ۔ یہ شعراء عموماً" فطری اشیاء کے چلتے پھرتے مناظر کو ذہن میں غیر منطقی اور غیر استدلالی طور پر مرتب کرکے اس میں سے ایک ماورائی کیفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں ۔ یا اپنے ماورائی تجربات کے اظہار کے لئے مادی اشیاء سے مماثلت کا رشتہ ڈھونڈ نکالتے ہیں ۔ ان کے خیال میں ذہنی پیکر کا فطری اشیاء کا ذہنی عکاس ہونے کی وجہ سے قارئین کا ردعمل بھی اس طرح متنوع ہونا چاہیے جیسا کہ فطری شے مثلاً" سمندر ' پہاڑ یا جنگل کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ یہ ردعمل جس قدر متنوع اور وسیع ہوگا' شعری وجدانی کیفیت میں اسی قدر اضافہ ہوگا۔ چنانچہ شاعری کی قدریں اسی قدر بلند ہوں گی۔ مختلف اشیاء کی باہمی مطابقت اور مماثلت (Analogy) کے ذریعے ذہن میں تعلقات کی کڑیاں تلاش کرکے جو وجدانی کیفیت پیدا کی جاتی ہے' اس کا اصول پیکری شعراء نے فرانس کے فلسفی برگساں سے لیا ہے اس مماثلت میں اشیاء ایک دوسرے سے جس قدر قریب ہوں گی' اسی قدر شعری قدریں اور احساس مسرت کم ہوتی جائے گی۔ بعض نقادوں کے خیال میں ذہنی پیکر مادی اشیاء کے ذہنی انعکاس کے لئے مخصوص ہے لہٰذا اسے مرئی (Visual) ہونا چاہیے۔ اور اس میں تجرید (Abstract) کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ان نقادوں کا یہ خیال زیادہ صحیح نہیں ہے۔

سی ۔ ڈے ۔ لوئیس کامیاب شاعرانہ ذہنی پیکر کے لئے شدت (Intensity) تازگی (Freshness) اور قوت ابلاغ (Evocative power) کو از حد ضروری قرار دیتا ہے ۔ دور جدید کے نقادوں نے زمانہ قدیم کے شعراء کے یہاں بھی خوبصورت علامتوں اور ذہنی پیکروں کا سراغ لگایا ہے دراصل دور قدیم کے شعراء ان چیزوں کو محض تشبیہات اور استعارات تصور کرتے تھے۔ عالمی ادب میں پیکری شاعری کا استعمال ہوا ہے اس پر بے حد تعجب ہوتا ہے:

ہوں گرمئ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں
چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلہ آواز ہے

بعض جدید شعرا (Synesthesia) کا جو تجربہ کر رہے ہیں اس کی مثال غالب کے مذکورہ بالا شعر میں پائی جاتی ہے۔

امپریشنزم کے ردعمل کے طور پر فرانس کے مصور ہروے نے ۱۹۰۱ء میں اظہاریت یا (Expressionism) کی بنیاد ڈالی۔ اور آسٹریا کے ادیب ہرمان باہر نے ۱۹۱۴ء میں پہلی بار ادب میں اس کا تجربہ کیا۔ اظہاریت میں فنکار کے شخصی جذبات و تخیلات (جو شاعر میں خارجی ماحول کا ردعمل ہوتے ہیں) کے اظہار کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ تحریک جرمنی ادب میں پہلی جنگ عظیم کے قبل سے ۱۹۲۳ء تک فروغ پاتی رہی اور اس نے سرریلزم کی تحریک کو خاص طور پر متاثر کیا۔ برگساں کے فلسفۂ حیات' ہسرل کے

نظریہ ذکاوت اور فرائڈین تحت الشعور کی علامتی حیثیت نے اس تحریک پر کافی اثر ڈالا۔ مادی اشیاء کی خارجی شکلوں سے استدلالی طریقوں پر جو اصلیت حاصل ہوتی ہے اسے نظر انداز کرکے اظہاریت پسند شعراء ان اشیاء کے باطن میں گہری معنویت کی تلاش کرتے ہیں ۔ اظہاریت پسندوں کا اسلوب بیانیہ نہیں بلکہ رمزیہ ہے۔ لہٰذا علامت نگاری اور اظہاریت میں ایک حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔اظہاریت پسندوں نے کبھی بے جان اشیاء کو ذی روح تصور کیا ہے اور کبھی نوع انسان کو بے جان مشین سمجھا ہے۔ ہیم ' ہٹلر ' جارج قیصر ' کارن لفڈ وغیرہ مشہور اظہاریت پسند شعراء و ادباء ہیں۔

کرکیے گور ' نطشے اور ہسرل کے نظریات سے متاثر ہو کر بیسویں صدی کے آغاز میں وجودیت (Existentialism) کی بنیاد پڑی جس میں سوچا جاتا ہے کہ انسان کا وجود اپنے ماحول کے درمیان تشکیلی دور سے گزر رہا ہے اور انسان اپنی قوت ارادی کے ذریعے اپنے تاریک ماحول سے خود کو نکال لینے کا اہل بن سکتا ہے۔ قوت ارادی کے اس عمل کو وجودیت پسند ادباء و شعراء (Engagement) کا نام دیتے ہیں۔ فرانس میں سارتر' مارلو ' البرٹ کامیو ' وغیرہ کے زیر اثر اس تحریک کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ شاعروں میں فرانسس پونج قابل ذکر وجودیت پسند شاعر ہیں ۔ دیکھا جائے تو اردو شاعروں میں اقبال اور جمیل مظہری کو بھی وجودیت پسند کہا جاسکتا ہے ۔ اقبال کے کلام میں Engagement کا عمل انہیں ایک واضح راستہ دکھاتا ہے اور بھٹکنے نہیں دیتا۔ بلکہ قادر مطلق تک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن جمیل مظہری کا کلام مغرب کے دیگر وجودیت پسند شعراء کی طرح خالق مطلق سے متعلق شاعر کے جذبہ تشکیک کا مظہر ہے۔

انیسویں صدی کی علامت پسند تحریک نے اس کے ہم عصر فرائڈین تحت الشعور کی سائنسی تحریک کا اثر قبول نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ دونوں تحریکیں فوق الواقعیت (Surrealism) میں پہنچ کر آپس میں مل گئیں اور خواب ' پاگل پن ' خواب بیداری (Day dream) سے وابستہ موضوعات کو بھی شاعری اور مصوری میں اہم مقام دیا جانے لگا۔ اس تحریک کے آغاز دراصل ۱۹۱۶ء میں ڈاڈا ازم کی شکل میں ہوا جس کے لکھنے والوں میں زارا ہنس آرپ اور اینڈری برٹین شامل ہیں ۔ ڈاڈا ازم میں بچوں کی توتلی بولی کے ہم آواز الفاظ کے استعمال سے روایتی اور بور ژوائی قدروں کے خلاف آواز بلند کرکے موجودہ تہذیب کے کھوکھلے پن کا اظہار کیا جاتا ہے ۔ یہ تو ہکلاہٹ دراصل موجودہ زندگی کی بکھری ہوئی آوازوں کی بازگشت ہے ۱۹۲۰ء میں اینڈری برٹین نے زارا سے اختلاف کے بعد (Surrealism) فوق الواقعیت کی بنیاد ڈالی اور شعر کہتے وقت غیر ارادی (Automatic) طور پر الفاظ کے انتخاب کو ضروری قرار دیا۔ تاکہ کلام میں خواب کی سی کیفیت پیدا کی جاسکے۔ کیونکہ خواب میں انسان کے ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔اور خیالات فیل بے زنجیر کی طرح آزاد ہوتے ہیں ۔ اس لئے شاعر غیر مربوط اور بے معنی ترکیبوں کو ایک ساتھ اس طرح پرو دیتا ہے جن کا مطلب عموماً" شعری تخلیق کے بعد ہی سمجھ میں آتا ہے ۔ یہ شاعری غیر ارادی طور پر معرض وجود میں آنے کے باوجود شاعر کے مرکزی جذبات کی باگ ڈور میں بندھی رہتی ہے۔ اس لئے فوق الواقعیت میں بھی کامیاب شاعری ہوسکتی ہے بشرطیکہ اس کے ابلاغ میں جذبات کی اضافی فراوانی موجود ہو۔

مندرجہ بالا تحریکوں کا اثر تقریباً" تمام ترقی یافتہ زبانوں پر پڑا۔ جدید تقاضوں سے کس کو مفر ہو سکتا ہے ؟ جدید شاعری میں جدید طرز حیات کی عکاسی لازمی ہے جس کے بغیر شاعری وقت کے تقاضوں پر پوری نہیں اتر

سکتی۔

اس وقت اردو زبان اور دوسری زبانوں کے نئے لکھنے والے کسی مخصوص ادبی تحریک سے وابستہ نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ یہ شعراء بیک وقت مختلف مختلف ادبی تحریکوں کا اثر قبول کر رہے ہیں ان کی شاعری میں وہ تجربات بھی موجود ہیں جن کی وساطت سے بیسویں صدی کی شاعری یہاں تک پہنچی ہے ۔ کہ شاعری Escape نہیں Inscape ہے۔

("دستگیر" کوئٹہ)

اورنگ زیب قاسمی

قاضی قیصر الاسلام

اسلوبیات .... ایک وضاحت

اسلوبیات .... " اسلوب کو پرکھنے کی سائنس ہے۔" یہ جدید لسانیات کی ایک شاخ ہے اس سائنس کے تحت ادبی اسلوب (Literary Style) کا تفصیلی تجزیہ کیاجاتا ہے ۔ یا اس سلسلے میں ایک اور بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ اسلوبیات ایک ایسی سائنس ہے جس کے تحت بولنے والے (Speakers) اور لکھنے والے (Writers) دونوں " لسانی انتخاب " سے کام لیتے ہیں۔ اسلوبیات کی اس مختصر سی تعریف میں لفظ " اسلوب " قابل توجہ ہے۔ اسلوبیات جدید لسانیات کا ایک شعبہ ضرور ہے تاہم اسلوبیات کی اصطلاح جس قدر نئی ہے اس کے برعکس لفظ " اسلوب" خود اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ زبان یا لسان اپنے ماخذ میں ہوسکتے ہیں ۔ لفظ اسلوب اپنی تمام تر قدامتوں کے باوجود اپنی نوعیت معنی کی سطح پر اگر اسے دیکھا جائے تو اس کے معنی کا تعین ماہرین زبان کے لئے آج بھی ایک ٹیڑھی کھیر بنا ہوا ہے ادبی تنقید کے میدان میں اسلوب کی تعریف کے تعین کے مباحث آج سے نہیں بلکہ ارسطو یا پھر اس سے بھی پہلے چھیڑے جاتے رہے ہیں مگر ہنوز اس لفظ کی کوئی تسلی بخش یا جامع تعریف ممکن نہیں ہو سکی ہے کیونکہ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ " اسلوب " کا ایک استعمال جو آج ہو رہا ہے کل یہ استعمال متروک قرار دے دیا جاتا ہے ..... یعنی عمل تنقید کسی ایسے قطعی تعین سے متعلق نہیں ہے جس کے تحت یہ باور کیا جاسکتا ہو کیونکہ بعض مصنفین یا کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا کوئی ایک اسلوب ہوتا ہو (یعنی یہ Stylish ہوں) اور بعض لکھنے والے یا بعض کتابیں ایسی ہوتی ہوں کہ جن کا کوئی اسلوب ہی نہیں ہوتا ہو ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلوب اپنے مفہوم یا معنی کے اعتبار سے ایک متنازع فیہ مسئلہ ہے یا یہ کہ اس کی موزونیت اپنی نوعیت میں نزاعی ہے لہٰذا ہمیں یہ فرض کر لینا چاہیے کہ تمام تحریری متون (Texts) کسی نہ کسی اسلوب کے مظہر ہوتے ہیں کیونکہ اسلوب تو ایک ایسی چیز ہے کہ جو پوری زبان پر محیط ایک معیاری خدوخال کی حیثیت رکھتا ہے .... اور یہ کہ اسلوب نہ تو ادب سے مخصوص کوئی فاضلانہ (De Luxe) خصوصیت ادب ہے اور نہ ہی اسلوب کو کسی قدر ادب کی کوئی صورت قرار دیاجاسکتا ہے۔

گویا معلوم ہوا کہ اسلوب اظہار کا ایک انداز ہے جسے لسانی حدود میں بیان کیاجاسکتا ہے ..... یعنی ایسی لسانی حدود جن کو غیر لسانی عوامل کے اعتبار سے بیش قیمت اور حق بجانب قرار دیا جانا ممکن ہوسکتا ہے اظہار کے انداز کا یہ تصور گویا ایک متنازع سی صورت حال ہے مگر اسلوب کی تعریف کے دوسرے دو اجزا متنازع نہیں ہیں کیونکہ یہ بیان کے کئی پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے جس کے لفظی اوصاف کے مقابلے میں ..... ذاتی یا ثقافتی

اظہار سے اپنی ایک منفرد اہمیت ہے تنقید سے متعلق بعض مورخین ادب پر فکری دسترس کی صورت حال کو جس نام سے موسوم کرتے ہیں اس فکری صورت حال کے تحت زبان کے مختلف پہلوؤں پر عمیق نظری سے کام لیتے ہوئے اس کے اندر موجود امیجری (Imagery) آواز کی ساخت (Structure Sound) اور نحویات (Syntax) وغیرہ کی صورتوں کو زیر بحث لایا جاتا ہے ۔ اور اس طرح اپنی زبان میں اسلوبیات (Stylistics) کے مذکورہ پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے کسی بھی تحریری متون (Written Texts) کے اسلوب کا تجزیہ کیاجاتا ہے۔۔۔۔۔ مگر تنقید سے متعلق مورخین ادب کی یہ دسترس فکر بڑی حد تک گمراہ کن فکری صورت حال ہے اور یہ گمراہ کن اس لئے ہے کہ اسلوبیات کا شعبہ تنقیدیات یا انتقادیات کے شعبے کا ایک ایسا تقسیم پذیر حصہ ہے جسے تاریخی طور پر ہمیشہ سے بالکل جدا شعبہ قرار دیاجاتا رہا ہے اور یہ کہ اس شعبے کے اپنے بالکل ہی الگ اصول اور متقاضیات ہوا کرتے ہیں ۔ عصر حاضر کی جدید ترین تنقید کا فکری طالع (Verbally Oriented) لفظیاتی تنقید پر مبنی ایک ایسا رجحان تنقید رکھتا ہے جس میں اصولوں کا فقدان ہوتا ہے اور یہ کہ جس رجحان فکر کی مثالیں آمیں اور بلخ' کرال اور اسپائزر(Auerbach Croll Spitzer) کے تنقیدی عمل میں طرلیقیاتی اور فکری جانبداری کی صورتوں میں نظر آتی ہیں ..... لہٰذا جب صورت حال یہ ہو تو ایسی صورت میں اس رجحان فکری کو اسلوبیات کا نام دینا گویا تنقیدی عمل کو منہ چڑھانے کے مترادف کسی عمل سے تعبیر کرنا ہے ۔ اسلوبیات لسانیات کی ایک ایسی شاخ ہے جس میں بکھراؤ یا پھیلاؤ کی بڑی گنجائش ہے اس میں عمومی تنقیدی عمل کے تقابل میں رکھ کر پرکھا جائے بالکل اسی نہج پر لفظ اسلوب (Style) فی ذاتہ نسبتاً تیکنیکی تعبیرات کا حامل لفظ ہے یعنی اسلوب کی تعبیرات کی کچھ ایسی صورتیں مثلاً..... لب ولہجہ (Tone) یا عمومی طور پر اسے خطابیہ (Rhetoric) بھی کہہ سکتے ہیں۔

کسی لسانی صورت کو قطعی طور پر ان تصورات کے زیر دام لا کر جن کا اظہار ہم چاہتے ہیں گرفت میں نہیں لایا جاسکتا۔ پیغامات کو الفاظ میں ڈھالنے کی متبادل صورتیں ہو سکتی ہیں اور ان متبادل صورتوں کے انتخاب کئے جانے کا عمل غیر لسانی اصولوں کے تحت انجام پاتا ہے ..... مثلاً ذرا ان جملوں پر ہی غور کیجئے۔ یعنی اگر میں یہ جملہ کہوں کہ "Shut The Door !!" دروازہ بند کر دو۔ تو اس میں تحکم کا لہجہ اور تاثر پایا جاتا ہے اور پھر اس بات کو اس جملے میں کہوں کہ ۔۔۔

I Wonder If You Would Mind Closing The Door Please

دیکھیے گر آپ کہیں برانہ مان جائیے گا..... از راہ کرم ذرا دروازہ بند کر دیجئے ... گا... تو اس جملے میں درخواست اور التجا کا لہجہ اور تاثر ملتا ہے گویا دونوں جملوں میں " منشائے بیان " تو ایک ہی ہے تاہم دونوں جملوں میں لہجہ و تیور ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے اور " تحکم و التجا(Order / Request) کے تعین کا انحصار جملوں میں استعمال کئے جانے والے الفاظ سے کہیں زیادہ ان جملوں کے " طرزادا" (Style) کا مرہون منت ہے ..... یعنی کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ابلاغ و اظہار کے وقوع کی تشکیلی نوعیت (Structuring) کہ جو کسی جملے کی بجائے خود ایک جزو لازم ہی ہوا کرتی ہے ... اس اولا فعلی تشکیلی وقوعہ کی پوری ساخت کا ماجرا کسی شخص کی ذاتی صورت حال سے وابستہ حقائق' یعنی اس کی ادائیگی ' اظہار یا طرز ادائے مطلب کے اس کے اپنے خاص زاویہ پر مبنی ایک صورت ہوتی ہے ۔ گویا اسلوبیات " اظہار و ابلاغ"

اورنگ زیب قاسمی

(Expression / Communication) کا ایک ایسا باضابطہ منظم ڈسپلن (Dicipline) ہے جو یہ فریضہ انجام دیتا ہے کہ جس کے تحت " اسلوب " (Style) کا مبہم باشان شہزادہ بحیثیت ایک سوار کے رہوامتن (Textualy Ridden) کو بطور ایک سواری (Vehicle) کے (اس متن) کو استعمال کرتا ہے اور یوں گویا یہ یعنی اسلوب ' متن سے علاوہ یا متن سے فاضل (Extra- Textual) ایک چیز تو ہوتا ہے مگر یہ اپنے اثرات متن پر کچھ اس طرح چھوڑتا ہے کہ خود متن (Text) بھی مبہم باشان ہی کسی شے کے قالب میں ڈھل جاتا ہے اور یوں یہ متن خود بھی تو قیود تنظیم کی حامل ایک چیز بن جاتا ہے چنانچہ اس طرح اسلوبیاتی نظام لسانی تزئین و تنظیم کی صورتوں کو تشکیل دے لیتا ہے ۔۔۔۔۔ یعنی کچھ ایسی لسانی صورتوں کی تزئین و تشکیل جو بجائے خود پابند شکل کے حامل اوصاف سے مزین اور زیادہ اہم نوعیت کی ہوتی ہیں ۔۔۔۔۔ ان میں فاضل لفظیاتی عوامل کے مخصوص اغراض یا علامتی میلان کا ظہور عمل میں آتا ہے اسلوب کی یہ متعین صورت ایک ایسے سیاق (Context) میں رہ کر کام کرتی ہے کہ جس کی ایک جہت کو اگر ادب کی " طرف خارجی " (Outside Litrature) کے نام سے بھی موسوم کیا جاسکتا ہے تو اس کی دوسری جہت کو " طرف داخلی " (Inside Litrature) کے نام سے بھی موسوم کیا جاسکتا ہے ادب کے ان ہر دو قطبین (Poles) کو ہم بہ الفاظ دیگر ادب کی ظاہری ساخت (Surface Structure) اور باطنی ساخت (Deep Structure) کے نام سے بھی موسوم کر سکتے ہیں یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ آخر ادب کی طرف خارجی اور طرف داخلی سے مراد کیا ہے تو آیئے ہم ادب کی ان ہر دو جہتوں کو رولاں بارتھ کے مضمون تاریخ یا ادب میں دیئے گئے ذیل کے اقتباس سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں :

" رے سائن (Racine) خود کو کئی زبانوں کامرہون منت سمجھتا ہے ان میں تحلیل نفسی' وجودی' المیہ اور نفسیاتی زبانیں شامل ہیں (ان زبانوں کے علاوہ بعض زبانیں ایجاد کی جاسکتی ہیں اور بعض تو ابھی ایجاد کی جائیں گی) ان زبانوں میں سے کوئی زبان بھی ایسی نہیں کہ جسے بے داغ (Innocent) کہا جاسکے۔ مگر رے سائن سے متعلق کسی زبان میں ایسی کوئی بھرپور صلاحیت کار موجود نہیں کہ وہ اس کے بارے میں پوری سچائی ' کے ساتھ کچھ بتاسکے۔ چنانچہ زبان کی اس بے بضاعتی اظہار کو اگر تسلیم کیاجانا مقصود ہے تو پھر بالآخر ٹھیک ٹھیک طور پر سب سے پہلے ادب کی کسی مخصوص حیثیت یا اس کے مرتبہ کا تعین کیا جانا از بس ضروری ہے مگر ادب کی کسی ایسی حیثیت کے تعین کا یہ ماجرا اپنے پس پشت ایک نہ ایک مغالطے کو شامل رکھتا ہے ۔۔۔۔ یعنی وہ ایک چیز جسے ادب کہتے ہیں اپنی مجموعی حیثیت میں قوانین و ضوابط مصنوعات تکنیکی صورتوں کے علاوہ ان ادب پاروں پر مشتمل کوئی چیز یا ایک صورت حال ہے ' جس کا اصل وظیفہ یہ ہے کہ وہ ہمارے معاشرے کی عمومی طور پر اجتماعی تنظیم و ترتیب کا بنیادی کام انجام دیتا ہے ۔۔۔ گویا کسی معاشرے کو ٹھیک طور پر اس کی موضوعی صورت حال سے نکال کر اس کو ایک ادارے کے پیکر (Institutionalised Subjectivity) میں ڈھال دیتا ہے لہٰذا اس فکری تحریک کی تقلید اگر مقصود ہو تو نقاد کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے بجائے خویش " ناقص فکر کے عمل سے گزرتے ہوئے گویا خود کو مقدر کی بازی جیتنے یاہار جانے کے خطرناک کھیل سے وابستہ

رکھتے ہوئے ' رے سائین کے بارے میں پوری سچائی کے ساتھ کچھ کہنے کے لئے ' صرف اور صرف ایک ہی راہ پر چلتے رہنے کا عزم صمیم باندھے اور وہ یہ نہ کرے کہ کبھی یہ راہ تو کبھی وہ راہ اختیار کرکے خود تذبذب فکری کا شکار جائے --- اور وہ (نقاد) ایسا صرف اس لئے کرے کہ بالآخر وہ بھی تو ادب کی دنیا سے ہی وابستہ ایک فرد ہوتا ہے ---"

رولاں بارتھ نے اپنے مضمون " تاریخ یا ادب " میں رے سائین (Racine) (!) کے حوالے سے مذکورہ بالا اقتباس میں ادب کی دو مختلف جہتوں کے درمیان واضح اور مخصوص امتیاز قائم کرنے کے لئے اساس فراہم کرنے کی سعی کی ہے ۔ ادب کے اس پورے محیط میں ادب کی ان ہر دو جہتوں کے درمیان ایک واضح بنیاد قائم کئے جانے کی ضرورت اس کو اس لئے پیش آئی کہ ادب کا یہ پورا محیط ایک طویل عرصے سے جس الجھاؤ یا تذبذب فکری کا شکار چلا آرہا ہے اس کو اس الجھن سے نجات دلائی جاسکے--- اور وہ الجھاؤ یہ ہے کہ ادب کی تاریخ کی یہ صورت حال کہ یہ ' یعنی ادب کی تاریخ کی ادب سے وہ وابستگی جو بحیثیت ایک ادارے کے اس کے ساتھ ہے (Literature As A Institution) اور ادب کی دوسری جہت اس کی تخلیقی نوعیت (Literature As A creation) کا باجرائے دگر ہے اور ادب کی ہر دو صورتیں ہدف تنقید بنتی ہیں۔

جہاں تک اول الذکر جہت (ادب بحیثیت ادارے کے) کا تعلق ہے ' اس سلسلے میں بارتھ استدلال کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ ادبی تاریخ کو اگر نہایت موزوں اور ٹھیک طور پر عقل کے زیر دام لاکر اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا مقصود ہو تو پھر بجائے خود ادبی تاریخ کو کچھ ایسے ادبی وظائف کا تعلق پیداوار' ابلاغ' ترسیل' عمل تصریف کے علاوہ اس کے تمام وظائف کے حالات یا شرائط کار کے متعین کئے جانے سے ہوتا ہے ۔ بہ الفاظ دیگر اس کے کہنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ " ادبی تاریخ " کی تشکیل و ترتیب اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک کہ یہ خود کو اس پورے معاشرے سے وابستہ و پیوستہ نہ بنائے رکھے جس معاشرے میں کہ خود یہ ادب پیدا ہوتا یا پروان چڑھ رہا ہوتا ہے گویا رولاں بارتھ کے نزدیک ادب معاشرتی یا اداراتی سرگرمیوں کی پیداوار ہوتا ہے افرادی صلاحیتوں کا ماحصل نہیں ہوتا اس کا کہنا ہے کہ ادب کو تاریخی ' ادبی اور وظائفی سطح پر لاکر اگر دیکھا جائے تو گویا ادب کا وجود بنیادی طور پر ایک وجود منقلب (Radically Transformed) ہی ٹھہرتا ہے بارتھ کہتا ہے کہ جب ادب ایک وجود منقلب کی صورت حال قرار پاتا ہے تو ایسی صورت میں یہ ' یعنی ادب اپنے معروض یا مقصد کو تحلیل کر دیتا ہے چنانچہ اس نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ادب کا مطالعہ --- قوانین و ضوابط ' رسوم و روایات اور اجتماعی ذہنیتوں کا مطالعہ قرار پاتا ہے --- کسی فرد کی انفرادی تخلیقی مساعی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔

چنانچہ معلوم یہ ہوا کہ ادب کی ان ہر دو جہتوں کا تعلق جن دو صورتوں سے ہوتا ہے ان میں سے ایک صورت تو ادب کا وہ مقام ہے جسے ہم ادب کی " طرف داخلی " بھی کہہ سکتے ہیں اور ادب کی یہ طرف داخلی اپنے محیط میں رہتے ہوئے حسب دستور رسوم و روایات کے مطابق اپنی کار آوری انجام دیتا رہتا ہے کہ جن روایات کے تحت موضوعیت کی مختلف صورتوں کی تشکیل کا پہلو نکلتا ہے --- اور اس کی (ادب) دوسری صورت وہ ہے جس کے تحت ادب ادب کی "طرف خارجی " کی حیثیت اختیار کرجاتا ہے تاکہ یہ (یعنی ادب) اپنی تاریخ کچھ اس طرح سے لکھ سکے کہ جیسے یہ خود ادب کے وظائف ' قوانین و ضوابط ' تکنیکی

اورنگ زیب قاسمی

صورتوں کے علاوہ اداروں کی کوئی تاریخ ہو--- مختصراً یہ کہ یہ تاریخ ادب گویا خود اپنی ہی سطحی یا واضح صورتوں کی کوئی ایسی تاریخ ہو--- جس کی اپنی کوئی پوشیدہ گہرائیاں نہ ہوں یا ایسا کوئی باطنی داخل نہ ہو کہ جس میں پایاب جانا ممکن ہی نہ ہو سکے۔

غرض یہ کہ مندرجہ بالا وضاحتوں سے معلوم یہ ہوا کہ کسی سیاق (Context) کے ہاتھوں کسی اسلوب کا تعین کیا جانا ایک ایسا عمل ہے جو ادب کی طرف خارجی اور طرف داخلی کے ہر دو قطبین یا ہر دو جہات کے اندر رہتے ہوئے ہوتا ہے ۔ لہذا ادب میں اسلوب کی مذکورہ صورت حال کے پیش نظر ہم یہ نتیجہ برآمد کرسکتے ہیں کہ اسلوب کی مختلف صورتوں کے اوصاف کو اگر دیکھا جانا ممکن ہے تو ان اوصاف کو کسی مخصوص مصنف یا ادیب' کی ایک عہد یا پھر کسی مخصوص ترغیب و تحریک ' یعنی کسی ایک صنف ادب کے حوالے میں زیر بحث لایاجاسکتا ہے چنانچہ ادبی اسلوب نگار حضرات عموماً جو طریقہ نگارش اختیار کرتے ہیں اس کے تحت یہ لوگ جن مفروضات کو پرکھتے ہیں ان کی نوعیت کچھ یہ ہے مصنف کے اسالیب نگارش لسانی نشانات انگشت (Linguistic Fingerprints) وغیرہ ۔ اس صورت حال کو ہم جن تعمیمی صورتوں کے تحت ظاہر کرسکتے ہیں۔ان میں کچھ تو مخصوص طور پر مصنفین یہ ہیں ۔ سسرو ' سینکا اور اٹک Senecan Attic) مذکورہ مصنفین اور اٹک کے علاقائی طرز اسلوب کو ہم جن اسالیب نگارش کے تحت لاسکتے (Ciceronian ہیں ان کو ہم Beroque یعنی بے ضابطہ یا ناقص اسلوب ' Mannered یعنی باسلیقہ اسلوب Grand عظیم الشان اسلوب Middle اوسط اسلوب Low ' پست اسلوب' Terse مختصر و جامع اسلوب' Expansive ۔ وسعت پذیر اسلوب' Florid ۔ آراستہ و مزین اسلوب Periodic عہد وار اسلوب کے مختلف ناموں سے موسوم کرسکتے ہیں۔

سطور بالا میں اسلوب کے جو مختلف تحلیل زیر بحث آئے ہیں وہ اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ ادبی مطالعہ کے دوران اسلوبیات (Stylistics) ایک درجہ بند حیثیت کی حامل چیز ہے جس کے تحت مختلف تقسیمی معیارات (Taxonomic Criteria) کی بنیاد پر متن کی مختلف درجہ بندیاں کی جاتی ہیں --- اور یہ درجہ بندیاں عموماً لسانی / صوری ' فاضل لسانی / یا پھر دیگر صورت احوال کے تحت معرض وجود میں آتی ہیں۔

اسلوب کا انحصار ' نمایاں پیش منظر کے بعض مخصوص خدوخال پر ہوتا ہے --- یا اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلوب ظاہرہ لسانی ساخت کے نمایاں پیش منظر (Fore-Grounding) کے تحت تشکیل پذیر ہوتا ہے یہ عین ممکن ہے کہ کسی اسلوب کی اپنی ایک مخصوص بندش الفاظ (Diction) ایسی ہو جو پورے متن میں بہت نمایاں ہو ۔ اس اسلوب کی اپنی ایک متواتر اور مستقل رواں موزونیت تحریر ہو--- یا پھر اس میں اس کی اپنی نحویاتی ترتیب و تنظیم (Syntactic Orgnization) کے اندر کوئی تکراری صورت حال نفوذ پذیر ہو سکتی ہے اسلوب کی یہ ثقل نوعی (Density) زبان کے ایک جزو کے اعتبار سے ہو سکتا ہے کہ ہماری شعوری توجہ اپنی طرف نہ کھینچ سکے ۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ صورت حال ہمارے اندر اپنا ایک مخصوص اسلوبیاتی تاثر تو بہرحال چھوڑ سکتی ہے۔ اور ہمیں بہرکیف یہ محسوس تو ہو سکتا ہے کہ فلاں فلاں متن کسی مخصوص مصنف یا کسی مخصوص معاشرتی ثقافتی ماحول کی ایک نمایاں جھلک اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسلوب کا یہ

ثقل نوی (Density) زیر احتساب کچھ اس طرح پر لایا جا سکتا ہے کہ یہ یعنی اسلوبیات بلاشبہ (لسانیات کے برعکس) مفروقی طور پر اپنی نوعیت میں مقداری (Quantitative) ہے بلکہ اسلوبیات کی یہ صورتحال بسا اوقات تعریفی طور پر بھی اپنی ماہیت میں مقداری ہے۔ چنانچہ اگر ہم مقداری اسلوبیات (Quantitative Stylistics) کی انتہا پسندانہ مثالیں دیکھنا چاہیں تو ہمیں جی یو یلز (G.U.Yules) کی ادبی لغت سے متعلق شماریاتی تحریروں میں مل سکتی ہیں اور عصر حاضر کے قریب ترین زمانوں میں تصنیفی انکشافات کے ضمن میں کئے جانے والے وہ مطالعاتی نتائج جو کمپیوٹر کی مدد سے منظر عام پر لائے جا رہے ہیں غرضیکہ ان مطالعاتی نتائج سے بات واضح طور پر سامنے آتی جا رہی ہے۔ یہاں پر احتساب کی یہ صورتحال دریافت کی جانب رجوع کرتی نظر آتی ہے۔ یعنی ہم عموماً مفروضوں کی توثیق کرتے ہیں ---- گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسی صورتحال میں ایک ایسا نحوی یا لغوی رجحان پایا جاتا ہے کہ جس رجحان کے تحت ایک مخصوص عہد کے اسلوب سے متعلق ہمارے ادراک کی توجیہہ ہوتی ہے ایک ایسے ادراک کی واضح مثال ہمیں جوزفین مائل (Jesophine Mile) کی تحریروں میں ملتی ہے۔

اسلوب کے اس تصور میں انتخاب کا تصور کچھ اس طرح سے شامل ہوتا ہے کہ اس کے دوران ایک ہی طرح کی نوعیت فکر میں اظہار کے مساوی طریقہ ہائے کار کارفرما ہوتے ہیں لہٰذا نئے ناقدین کے نزدیک اس طرح کی کوئی تجویز یا منصوبہ قابل قبول نہیں ہوا کرتا۔۔۔۔ کیونکہ ان ناقدین کے نزدیک کسی متن میں لفظ کی تبدیلی گویا لازمی طور پر معنی و مفہوم کی تبدیلی خیال کی جاتی ہے اور جملوں کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قضایاتی مافیہ تو وہی ہوتا ہے مگر اس کا اظہار دوسرے مختلف طریقوں سے ہوتا ہے تاکہ معنی و مفہوم سے متعلق قاری کی تفہیم کا طریقہ کار واضح طور پر معنی کا تعین کر سکے۔ رچرڈ اوہمان (Richard Ohmann) نے معنیاتی مافیہ (Semantic Content) اور اسلوبیاتی یا خطابیہ صورت کے مابین اس طرح کے واضح امتیاز کی تجویز پیش نظر رکھی ہے۔ تاکہ واضح امتیاز کے اس طریقہ کار کی توجیہہ ایک ایسی تقسیم کے تحت کی جا سکے کہ جہاں (Generative) لسانیات میں موجود اس کی ظاہری یا بیرونی ساخت اور اس کی اندرونی گہری ساخت دونوں کی تشریح کی جانی ممکن ہو سکے۔ نظریہ اسلوب پر لسانیات اور اطلاقیات کے درمیان مفاہمت کی جدید ترین صورت نہایت ہی موزوں اور مناسب طریق پر کی گئی ہے۔ کیونکہ اسلوبیات تو الگ نوعیت کا ایک ایسا موضوع ہے جو اس وقت معرض وجود میں آیا کہ جب جدید لسانیات منظر عام پر آئی اور جدید لسانیات نے آج بھی لسانیات کی بعض تکنیکی صورتوں کو اختیار کر رکھا ہے۔

چارلس بیلے (Charles Bally) ایک مشہور فرانسیسی اسلوب نگار گزرا ہے جو سابیر کا شاگرد بھی تھا۔ بیلے نے اسلوبیات کے موضوع پر جو کام کیا ہے اس ماہر زبان کے کام کو آگے بڑھانے کا سہرا لیو اسپزر (Leo - Spitzer) کے سر جاتا ہے۔ اسپزر نے لسانیات اور ادبی تاریخ کے مابین موجود خلیج کو پر کرنے کی مستحسن کوششیں کی ہیں۔ اسپزر کے بعد دوسرا بڑا نام اسٹیفین المان (Stephen Ulmann) کا ہے جو نہ صرف یہ کہ معنیات (Semantics) کے سمجھنے کا ماہر تھا بلکہ یہ فرانسیسی فکشن کے میدان میں بھی اسلوب نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہوا ہے۔

اسلوبیات (Stylistics) یا نئے لسانی اسلوبیات کے نام سے بھی جانا جاتا ہے ایک ایسا شعبہ زبان ہے

اورنگ زیب قاسمی

جس کا اصل فریضہ یہ ہے کہ یہ ادب کا تحلیلی مطالعہ اس طرح سے کرتا ہے کہ اس مطالعہ کے دوران جدید لسانیات کے تکنیکی طریقوں اور اس سے متعلقہ تصورات کو کام میں لایا ہے۔ چنانچہ یہ بات زیادہ مناسب اور قابل ترجیح ہے کہ اس اصطلاح کو اسلوب کے لسانی مطالعہ تک محدود رکھا جائے۔۔۔۔ یعنی اسلوب کا ایک ایسا محدود مطالعہ جس کا تذکرہ ہم ابھی سطور بالا میں کر چکے ہیں اور لسانیات کے دیگر ادبی اطلاقات کے ضمن میں بعض دوسری موزوں اصطلاحات وضع کر لیں جائیں۔

حواشی:

۱۔ Racine .... ایک مشہور المیہ نگار فرانسیسی شاعر ہے جس کو المیہ نگاری کے میدان میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ (مصنف)

("قومی زبان" کراچی)

ادب میں ہیئت پسندی کی تحریک

"اولی معاصرانہ نظریات" کے مصنف رومن سیلڈن کے مطابق ادب کے جن طلبہ نے اینگلو امریکن "نئی تنقید" (New Criticism) کی اس روایت میں پرورش پائی ہے جس نے عملی تنقید اور فن پارے کے متن کے معنوی وحدت پر زور دیا ہے وہ روسی فورملزم (Russian Foralism) سے اپنے آپ کو مانوس پائیں گے۔

روسی فورمیلسٹ طریق کار (Method) سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اور ادبی نظریے کی سائنٹفک بنیاد کے لئے زیادہ فکر مند تھے ابتدائی روسی فورملسٹوں کا خیال تھا کہ کسی تصنیف کا انسانی متن (جذبات، خیالات اور حقیقت) اپنے اندر کوئی ادبی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ ادبی اختراعات (Literary Devices) کے لئے صرف ایک سیاق فراہم کرتا ہے۔

روسی فورملسٹوں نے نئے نقادوں (اینگلو امریکن نئی تنقید سے تعلق رکھنے والے نقاد) کے اس میلان سے بچنے کی کوشش کی کہ جمالیاتی فارم کو اخلاقی اور ثقافتی معنویت عطا کی جائے۔ جہاں نئے نقادوں نے ادب کو انسانی ادراک کی ایک شکل قرار دیا وہاں روسی فورملسٹوں نے ادب کو زبان کا ایک خاص استعمال تصور کیا۔

ادب کے فورملسٹ مطالعے کی بنیادیں ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب سے پہلے ماسکو لسانیاتی حلقہ اور اوپو ییز (Opajaz) یعنی شعری زبان کے مطالعے کی سوسائٹی میں مستحکم ہو چکی تھیں۔ ماسکو لسانیاتی حلقہ کی بنیاد ۱۹۱۵ء میں پڑی تھی اور اوپو ییز کی بنیاد ۱۹۱۶ء میں۔

ماسکو لسانیاتی حلقہ' کی سب سے نمایاں شخصیت رومن جیکوبسن (Roman Jacobson) تھا جس نے ۱۹۲۶ء میں پراگ لسانیاتی حلقہ' کے قیام میں بھی مدد دی۔ پراگ لسانیاتی حلقہ میں وکٹر شکلووسکی (Victor Shklovsky) اور بورس ایکن بوم (Boris Eikenbaum) بعد میں نمایاں ہوئے۔ ابتدائی تحریک Futurist نے فراہم کی تھی۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے ان کی (Futurists) کی ادبی کوششیں زوال پسند بورژوا کلچر کے خلاف تھیں۔ خصوصاً شاعری میں علامتی تحریک اور بصری فنون کے خلاف انہوں نے بریوزوف (Briusov) جیسے شاعروں کی متصوفانہ وضع کا مذاق اڑایا جنہیں یہ اصرار تھا کہ شاعر رموز واسرار کا محرم ہوتا ہے۔ مایا کووسکی جیسے فیوچرسٹ شاعر نے مشینی عہد کی پر شور رعایت پرستی کو 'شاعری کا گھر' قرار دیا۔ فیوچرسٹ حقیقت نگاری کے اتنے ہی مخالف تھے جتنے کہ علامت پسند اہل قلم۔

شکلووسکی نے ادب کی ایک تعریف یہ کی تھی کہ ادب ان تمام اسلوبی اختراعات (Devices) کا مجموعہ ہے

اورنگ زیب قاسمی

جو اس میں استعمال کی جاتی ہیں۔' ادب کی یہ مشہور تعریف فورملزم کے ابتدائی دور کا نچوڑ پیش کرتی ہیں۔

ٹراٹسکی نے اپنی کتاب 'ادب اور انقلاب' (۱۹۲۳ء) میں فورملزم پر جو اعلیٰ درجے کی تنقیدیں لکھیں انہوں نے اس نظریے کو ایک نئے دفاعی مرحلے میں داخل کر دیا جس کا نقطۂ عروج جیکوبسن اور ٹائی انوف (Tynyanov) کے نظریئے ہیں جو ۱۹۲۸ء میں سامنے آئے۔

روس کی سرکاری ہٹ دھرمی فورملزم کی تحریک کو ۱۹۳۰ء میں ختم کرنے کا باعث بنی۔ اس نظریے کی عمرانیاتی سمت نے اس دور کے ادب کی بعض بہترین کتابوں کو جنم دیا خصوصاً "(Bakhtin School) کی تحریروں میں جو فورملسٹ اور مارکسیت روایات کا نہایت بار آور امتزاج ہیں۔ ساختیاتی قسم کی فورملزم جس کا آغاز جیکولبسن اور ٹائی انوف نے کیا اسے زیچ فورملزم نے اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ نازیوں نے اسے ختم نہ کر دیا۔اس گروپ کے بعض لوگ جن میں رینے ویلیک اور رومن جیکولبسن بھی شامل ہیں ترک وطن کرکے امریکہ چلے گئے۔ جہاں انہوں نے بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے میں نئی تنقید کے ارتقاء پر گہرا اثر ڈالا۔

روسی فورملسٹوں نے ادب کو زبان کے ایک خاص استعمال کے طور پر دیکھا جس کی امتیازی خصوصیت عملی زبان سے انحراف کرنا اور اسے مسخ کرنا ہے۔ عملی زبان ابلاغ عامہ کے لئے استعمال کی جاتی ہے جبکہ ادبی زبان کا کوئی عملی فریضہ بالکل نہیں ہوتا۔ وہ ہمیں صرف مختلف انداز سے دیکھنے کے قابل بناتی ہے۔ ابتدائی فورملسٹوں کے اندر ادبیت اور شعریت کو مترادف سمجھنے کا میلان تھا۔ یہ دکھانا آسان ہے کہ بنیادی طور پر کوئی ادبی زبان ادبی نہیں ہے ہم ادبی زبان کو ادبی صرف اس لئے سمجھتے ہیں کہ اسے کسی ادبی تصنیف میں پڑھتے ہیں۔ جو چیز ادب کو عملی زبان سے متمائز کرتی ہے وہ اس کی تعمیر کردہ صفت (Constructed Quality) ہے فورملسٹوں نے شاعری کو زبان کے ادبی استعمال کا نمونہ کامل یعنی مثراتم قرار دیا۔ اس کا سب سے زیادہ تعمیری عنصر آہنگ ہے۔

فورملزم کے ابتدائی دور پر وکٹر شکلووسکی کا غلبہ رہا ہے جس کی نظریہ سازی پر فیوچرسٹوں کا اثر تھا اور جس کی نظریہ سازی زور دار اور بت شکن تھی۔ جہاں علامت پسندوں (Symbolists) نے شاعری کو کسی بھید یا غیر مرئی حقیقت کے اظہار کے طور پر دیکھا تھا وہاں شکلووسکی نے زمینی زاویہ نگاہ اختیار کیا اور اس نے ان تکنیکیوں کی تصریح کرنے کی کوشش کی جو خاص اثرات پیدا کرتے ہیں۔

شکلووسکی نے اپنے انتہائی دلکش تصورات میں سے ایک کو نرالایا انوکھا بنانے (Ostranenie) کا نام دیا اس کے نزدیک یہ آرٹ کا خصوصی فریضہ ہے کہ وہ ہمیں ان چیزوں کی پہلی آگہی واپس کرے جو ہماری روزمرہ آگہی کی بدولت معمول کی چیزیں بن گئی ہیں اس نے اپنے مضمون "آرٹ بحیثیت تکنیک" (۱۹۱۷ء) میں لکھا کہ آرٹ کا مقصد چیزوں کو وہ سنسنی عطا کرنا ہے کہ وہ کس طرح محسوس کی گئیں نہ کہ وہ کس طرح معلوم کی گئیں۔ آرٹ کی تکنیک چیزوں کو انوکھا بنانا ہے ادراک کا عمل بذات خود ایک جمالیاتی مقصد ہے آرٹ کسی چیز کے (Artfulness) کے تجربے کا نام ہے اس تجربے میں چیز کی اہمیت نہیں ہے۔

روسی فورملسٹوں کی بیانیہ تکنیک میں کہانی اور پلاٹ کے درمیان جو فرق ہے اسے بڑی

نمایاں جگہ دی گئی ہے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ صرف پلاٹ ادبی چیز ہے نہ کہ کہانی جو خام مال کی حیثیت رکھتی ہے اور ادیب کے تخلیقی ہاتھ کی منتظر رہتی ہے لارنس اسٹرن (Lawrence Sterne) پر شکلووسکی کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ پلاٹ کے بارے میں فورملسٹوں کا تصور ارسطو سے زیادہ انقلابی تھا۔ ارسطو نے کہا تھا کہ پلاٹ واقعات کی ترتیب کا نام ہے ارسطو کے ہاں پلاٹ کا مقصد زندگی کی اصلی اور جانی پہچانی صداقتوں کا فراہم کرنا تھا پلاٹ کا قابل قبول (Plausible) ہونا یعنی اس میں ایک قسم کی ناگزیریت کا ہونا ضروری تھا جبکہ فورملسٹوں سے پلاٹ سے متعلق نظریئے کو (Ostranenie) کے تصور سے منسلک کر دیا ان کے خیال کے مطابق پلاٹ ہمیں واقعات کو شناسندہ اور مانوس تصور کرنے سے روکتا ہے۔

بورس ٹاما شیوفسکی (Boris Tomashevsky) نے پلاٹ کے سب سے چھوٹے حصے کو قوت محرکہ کہا ہے وہ آزاد اور غیر آزاد قوت محرکہ میں فرق کرتا ہے آزاد قوت محرکہ وہ ہے جو کہانی کے لئے ضروری نہ ہو۔ غیر آزاد وہ ہے جو کہانی کے لئے ضروری ہو۔ فورملسٹ کسی نظم کے خیالات' موضوعات اور حقیقت کے حوالوں کو فنی اختراعات کے استعمال کا خارجی بہانہ تصور کرتے ہیں۔ شکلووسکی کے نزدیک لارنس اسٹرن کا ناول ٹرسٹرم شینڈی (فورملسٹوں نے اپنے (Ostranenie) والے نظریئے کی مثال کے طور پر اسٹرن کے ناول 'ٹرسٹرم شینڈی اور سوفٹ کے ناول 'گلی ورز ٹریولز' کو خاص طور پر استعمال کیا۔ قوت محرکہ سے بالکل خالی ہے فورملسٹوں نے متن کے ناقابل فہم اور ناقابل تشریح پہلوؤں پر غائر نظر ڈال کر ساختیاتی اور مابعد ساختیاتی فکر کی پیش بندی کی فورملزم کے بعد کے دور میں باختن اسکول نے فورملزم اور مارکسزم کا بار آور امتزاج پیش کیا اس مکتب فکر کی کئی بنیادی تصانیف کے مصنفوں کی شناخت متنازعہ فیہ ہے لیکن ان تصانیف کے اصلی سرورق پر جن لوگوں کے نام ہیں وہ یہ ہیں۔ (۱) میخائل باختن (Mikhail Bakhtin) (۲) پول میدویدو (Pavel Medvedev) اور (۳) ولنتین ولوشی نوف (Volintin Voloshinov) یہ مکتب فکر اس لحاظ سے فورملسٹ رہا کہ وہ ادبی تصانیف کی بنیاد لسانیاتی ساخت میں ڈھونڈتا تھا لیکن اس مکتب فکر کا یہ عقیدہ مارکسزم کے گہرے اثر کا نتیجہ تھا کہ زبان کو آئیڈیولوجی سے الگ نہیں کر سکتے آئیڈیولوجی اپنے وسیلہ اظہار میں زبان سے الگ نہیں کی جا سکتی۔ زبان جو سماج کا بنایا ہوا نشانات کا ایک نظام ہے خود ہی ایک مادی حقیقت ہے۔

باختن اسکول کو اس قسم کی مجرد لسانیات سے دلچسپی نہ تھی جو بعد میں ساختیات کی بنیاد بنی۔ زبان سے اس کا تعلق ایک سماجی مظہر کی حیثیت سے تھا۔ ولوشی نوف کا خیال تھا کہ الفاظ فعال اور حرکی سماجی نشانات ہیں جو مختلف سماجی اور تاریخی حالات میں مختلف قسم کے سماجی طبقات کے لئے مختلف معنی اختیار کر سکتے ہیں باختن اسکول نے ان ماہرین لسانیات پر حملہ کیا (سوشیور (Saussure) بھی حملے کی زد میں آیا) جو زبان کو تحقیق کا ایک مردہ' غیر جانبدار اور جامد موضوع سمجھتے تھے۔

میخائل باختن نے ادبی متن کے لئے زبان کے اس حرکی تصور کو فروغ دیا۔ بہرحال اس نے ادب کو سماجی عوامل کا براہ راست عکس قرار نہیں دیا اور یہ دکھایا کہ بعض ادبی روایات میں زبان کے فعال اور حرکی کردار کا اظہار کس طرح ہوا ہے باختن غیر استحالی نظریئے کا آدمی تھا۔ اس کی کلاسیک کتاب (The Problem of Dostoveski) (۱۹۲۹ء) ہے جس میں اس نے ٹالسٹائی اور دوستوفسکی کے ناولوں

اورنگ زیب قاسمی

کے تضاد کو نمایاں کیا ہے ٹالسٹائی کے ناولوں میں تمام آوازیں مصنف کے مقصد کی تابع ہیں جبکہ دوستوفسکی کے ہاں مختلف کرداروں کے مختلف نقطہ نظر کو متحد کرنے کی کوشش نظر نہیں آتی۔ دوستوفسکی کے کردار اپنی آزادی اور کلیت کو برقرار رکھتے ہیں۔

قدیم رنگ رلیوں (Carnival) کا اصناف ادب کی تشکیل میں جو حصہ ہے اسے بیان کرنے کے لئے باختن Carnival Isation کی اصطلاح استعمال کی ہے قدیم رنگ رلیوں سے جو بالکل ابتدائی اصناف ادب وجود میں آئیں ان میں سے ایک تو سقراطی مکالمہ ہے اور دوسری صنف Menippean طنز اول الذکر زبانی مکالمے سے قریب ہے جس میں حقیقت کی دریافت جدلی خیال کے طور پر تصور کی جاتی ہے نہ کہ تحکمانہ خود کلامی کے طور پر۔

باختن نے ایسے بہت سے موضوعات چھیڑے جن پر بعد کے نظریہ سازوں نے بحثیں کی ہیں۔ تصنیف اور مصنف کے باہمی رشتوں کے معاملے میں رولینڈ بارتھ اور دوسرے ساختیاتی نقادوں کے ہاں مصنف کا کردار جس طرح مشکوک ہو گیا ہے اگرچہ باختن کے ہاں اس طرح کا کوئی شک نہیں پایا جاتا پھر بھی باختن رولینڈ بارتھ سے مشابہ نظر آتا ہے۔

۱۹۲۶ء میں جو پراگ لسانیاتی حلقہ قائم ہوا اس کی سرگرمیاں جاری رہیں اور اس حلقے نے ادب میں ساختیاتی زاویہ نگاہ پیدا کیا مکاروفسکی (Mukarovsky) نے تنقیدی تجزیے سے زائد از ادب (Extra-Literary) عوامل کے اخراج کو مخالفت قرار دیا۔ جمالیاتی ساختوں (Structures) کے بارے میں ٹائی نی انوف (Tynanov) کو جو حرکی رائے تھی اسے اپناتے ہوئے مکاروفسکی نے ادب اور سماج کے درمیان تناؤ (Tension) پر بہت زور دیا۔

مکاروفسکی کا ایک خیال یہ تھا کہ ایک ہی چیز کے کئی فریضے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک چرچ عبادت گاہ بھی ہو سکتا ہے اور فن کا ایک نمونہ بھی اس کے نزدیک ہر زمانے کے فیشن (ہر زمانے کی وضع) پیچیدہ علامتوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور علامتیں سماجی' سیاسی' مشتبہ اور جمالیاتی فرائض انجام دے سکتی ہیں۔ فرائض کا یہ تنوع (Variability) ادبی تخلیقات میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک سیاسی تقریر' ایک سوانح عمری' ایک خط' کوئی پروپیگنڈہ مختلف معاشروں اور مختلف ادوار میں جمالیاتی قدر کے حامل بھی ہو سکتے ہیں اور نہیں بھی۔ آرٹ کا گھیراؤ (circumference) ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور معاشرے کی ساخت سے اس کا رشتہ حرکی ہوتا ہے۔

مارکسی نقادوں نے مکاروفسکی کی بصیرتوں سے فائدہ اٹھا کر آرٹ اور ادب کے سماجی اثرات پر زور ڈالا۔ کسی چیز کی جمالیاتی قدر متعین کرنا ایک سماجی عمل ہے جسے مروجہ آئیڈیولوجی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

باختن کے نظریات' جیکولبسن اور ٹائی انوف کے مقالات اور مکاروفسکی کی تصانیف شکلوفسکی' توماشے فسکی اور ایخن بوم کی روسی فورملزم سے آگے جاتی ہیں فورملسٹوں نے ادبی نظام کو دوسری چیزوں سے علیحدہ کر دیا اور مارکسی نقادوں نے ادب کو سماج کا تابع بنا دیا۔ ان دونوں نظریات کا تضاد اور ان کی کشمکش واضح ہے۔

ژاتسکی نے اپنی تصنیف و ادب اور انقلاب میں روسی فورملسٹوں پر جو حملے کئے ہیں ان میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ ادب کے اپنے قوانین اور اصول ہوتے ہیں۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد ایک اشتراکی نظریہ پیدا ہوا جس نے فورملزم کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور انیسویں صدی کی روسی حقیقت نگاری کو نئے اشتراکی معاشرے کی جمالیات کے لئے ایک مناسب بنیاد تصور کیا۔ ۱۹۱۰ء کے قریب یورپ میں آرٹ، موسیقی اور ادب کے اندر جو انقلابات (پکاسو، ٹی ایس ایلیٹ وغیرہ) پیدا ہوئے ان کو سوویت نقادوں نے سرمایہ دارانہ معاشرے کی زوال آمادہ پیداوار کہا۔

("صریر" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

انتظار حسین

جھینی جھینی بنی چدریا

"مجھے عبدل بسم اللہ کہتے ہیں۔"

"جھینی جھینی بنی چدریا" کا ایک کردار حاجی امیر اللہ یہ نام سن کر حیران ہوا۔ اپنی بنارسی اردو میں بولا: "اے کیتر کا جلاں ہے میاں۔ اے عبداللہ کو تو ٹھیک ہے اے عبدل بھی اور بسم اللہ بھی۔"

"گورو جی نے بسم اللہ کے ساتھ عبدل جوڑ دیا تو میں کیا کروں۔"

"او استاد ہندو رہے ہوئیے۔"

حاجی امیر اللہ نے ٹھیک سمجھا۔ تعلیم اس کے مصنف نے ہندی میں پائی استاد ہندو ملے ان کے طفیل بسم اللہ کے ساتھ عبدل جڑ گیا۔ شاگرد کی سعادت مندی دیکھو کہ نام کو گورو کے اضافے کے ساتھ قبول کر لیا۔ پیدائش الہ آباد ضلع کے ایک گاؤں بلاپور میں ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ الہ آباد وشوودیالیہ سے ہندی ساہیہ میں ایم اے اور ڈی فل کیا۔ دس سال بنارس کے ایک کالج میں پڑھایا۔ اب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہندی شعبے سے وابستہ ہیں۔

دوسری تصانیف کے علاوہ کہانیوں کے تین مجموعے ہیں: ٹوٹا ہوا پنکھ، کٹتے کٹتے سوال، رین بسیرا۔

"جھینی جھینی بنی چدریا" نام سے ناول لکھا اور اس پر نسو ایوارڈ پایا۔

"جھینی جھینی بنی چدریا" کو پڑھنے کے بعد میں نے عبدل بسم اللہ کی عقل پہ بہت ماتم کیا۔ اس عزیز سے ایک بڑی چوک ہو گئی۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ جب سنت کبیر اللہ کو یا خود کبیر کی زبان میں رام اور رحیم کو پیارے ہوئے تھے تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت جھگڑا ہوا۔ ہندو کہتے تھے کبیر ہندو تھا، ہم اسے جلائیں گے مسلمانوں نے واویلا کیا ہندوؤ، خدا کے خوف سے ڈرو۔ کبیر مسلمان تھا، ہم اسے دفن کریں گے۔ چھوٹے پیمانے پر یہی کام اب 'گئودان' کے سلسلے میں ہوا ہے ہندی والے اسے ہندی کا ناول بتاتے ہیں اردو والوں کو اصرار ہے کہ وہ اردو ناول ہے اور یہ سب پریم چند کی عقل مندی کی وجہ سے ہوا ہے۔ انہوں نے اسے لکھا اس رنگ سے اور پھر شائع اس طرح کرایا کہ ہندی اور اردو والے سر پھٹول کرتے رہیں اور طے نہ کر پائیں کہ وہ "اصلا" اور "اولا" اردو ناول ہے یا ہندی ناول ہے۔ عبدل بسم اللہ نے کام آدھا کیا ہے لکھا اسے ایسی زبان میں ہے کہ اسے اردو ناول کہنے میں مجھے تو کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔ مگر عبدل بسم اللہ سے جو چوک ہوئی ہے وہ اس کی اشاعت کا معاملہ ہے۔ اگر انہوں نے تھوڑی عقلمندی دکھائی ہوتی اور اسے ہندی میں چھاپنے کے ساتھ ساتھ انہیں دنوں اردو رسم الخط میں منتقل کر کے بھی چھپوا دیا ہوتا تو اس ناول کو پریم چند

کے 'عنوان اور سنت کبیر کے جنازے والا مرتبہ حاصل ہو جاتا۔ عبدل بسم اللہ سے جب میں نے اس ناول کے سلسلے میں استفسار کیا تو انہوں نے مجھے لکھا تو تھا کہ وہ اردو میں بھی شائع ہونے والا ہے لیکن اب شائع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تازہ اب اگلی کسی ایسی نسل کے لئے منتقل ہو گیا جس کا کوئی محقق یہ سوال اٹھانے کا شرف حاصل کرے گا کہ یہ ناول پہلے اردو میں شائع ہوا تھا یا ہندی میں "اس وقت تو صرف میں کہوں گا کہ یہ اردو ناول ہے جسے میں نے اٹک اٹک کر ہندی رسم الخط میں پڑھا ہے۔

مگر مجھے پہلے یہ تو بتانا چاہیے کہ اس ناول تک میری رسائی کیسے ہوئی ایسا نہیں ہے کہ میں نے پڑھتے پڑھتے اس ناول کو دریافت کیا اور اس پر ریجھ گیا ملاقات پہلے مصنف سے ہوئی۔ پھر اس کی تحریروں سے دلی کے پچھلے پھیرے میں میں نے جامعہ ملیہ کی ایک محفل میں اپنی بندر کہانی جو خالی تجربے میں شامل ہے سنائی تھی عبدل بسم اللہ اس محفل میں موجود تھے یہ کہانی سن کر انہیں اپنی ونت کتھا یاد آ گئی۔ مجھے تجسس ہوا کہ یہ ونت کتھا کیا شے ہے جواب میں انہوں نے اپنی ونت کتھا اور کہانیوں کا ایک مجموعہ مجھے پکڑا دیا۔

میں نے گھر واپس آ کر بس ونت کتھا کر جاننے کے شوق میں وہ مختصر ناول اٹک اٹک کر پڑھنا شروع کر دیا۔ بس یہ شوق ہی تھا کہ اس رسم الخط سے زیادہ مانوس نہ ہونے کے باوجود اسے پڑھ لیا۔ مرنے کی آپ بیتی تھی آدم زادہ کے ستائے ہوئے مرنے کی۔ خوب تھی۔ پھر لگے ہاتھوں کہانیاں بھی پڑھ ڈالیں۔ دوستوں سے سنا تھا کہ انہوں نے ایک ناول " جھینی جھینی بنی چدریا" کے عنوان سے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے اب مجھے تو ہوئی کہ وہ ناول کیا ہے آخر خود عبدل بسم اللہ سے رجوع کیا اور یہ ناول حاصل کیا۔

تو اس طرح میں عبدل بسم اللہ سے متعارف ہوا کہ وہیں کہیں بنارس کے آس پاس کے رہنے والے ہیں اور اچھا خاصا وقت بنارس میں گزارا ہے۔ یہ ناول لکھ کر اس مہربان شخص کا انہوں نے سارا قرض اتار دیا۔ لکھا ہندی میں اور ہیں بھی وہ ہندی ہی کے لیکھک۔ مگر میری ہٹ دھرمی دیکھو کہ میں اسے اردو کا ناول بتا رہا ہوں۔

خیر' اگر یہ ناول اس اردو تک محدود رہتا جو آج کل ہم لکھ پڑھ رہے ہیں تو میں اس پر اردو کا لیبل چپکانے کی ہرگز حرکت نہ کرتا۔ جو اردو آج کل ہم لکھتے ہیں اور جو ہمیں بالعموم پڑھنے کو ملتی ہے مجھے اس سے ایسی کوئی رغبت نہیں ہے کہ میں بچارے عبدل بسم اللہ کو ان کانٹوں میں گھسیلنے کی کوشش کرتا۔ مگر ہوا یہ کہ یہ ناول پڑھتے پڑھتے میرا ایک اور ہی طرح کے محاورے سے تعارف ہوا۔ اور میں نے سوچا کہ اچھا ایک اردو یہ بھی ہے اس کا تو مجھے سرے سے پتا ہی نہیں تھا۔

کون سی اردو؟ دیکھیے ہم تو ایک زمانے سے دلی کی اردو کے کشتہ چلے آتے ہیں۔ مگر کون سی دلی کی اردو؟ وہ اردو جو میرامن دلی والے نے لکھی۔ اس زبان کے کیا کہنے۔ جو اس سے انکار کرے وہ کافر۔ پھر غالب نے اپنے خطوط میں سے ایک نیا ذائقہ عطا کیا سبحان اللہ! ڈپٹی نذیر احمد نے دلی کی وہ زبان لکھی ہے جسے ٹکسالی اردو کہتے ہیں اس کا اپنا چٹخارہ ہے بلکہ اسے کہنا ہی چاہیے چٹخارے دار اردو۔ آگے چل کر اشرف صبوحی نے یہ چٹخارہ اڑایا اور خوب زبان لکھی۔ مگر اس سب کے باوجود میں کڑھتا ہوں کہ دلی والوں نے دلی کی زبان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ محض اشرافیت کے چکر میں انہوں نے دلی کے ایک جاندار محاورے کو ذات باہر قرار دے دیا۔ یہ وہ محاورہ ہے جسے کرخنداری اردو کہا جاتا ہے افسوس کہ کرخنداری اردو کو کوئی ڈپٹی

اورنگ زیب قاسمی

نذیر احمد میسر نہ آیا۔

بہرحال میں یہ سمجھتا تھا کہ کرخنداری اردو خالی دلی کا کرشمہ ہے مگر " جھینی جھینی بنی چدریا" سے پتا ملا کہ بنارس کی اپنی کرخنداری اردو ہے اس کرخنداری اردو کو بنارس کے جولاہوں نے پالا پوسا ہے یا کہ کہیے کہ بنارس کے کرگھوں پر پروان چڑھی ہے سو اسے کرگھا اردو بھی کہہ سکتے ہیں معاف کیجئے میں ان لوگوں کو اپنی روانی میں جولاہا کہہ گیا عبدل بسم اللہ نے انہیں بنکار لکھا ہے اور چونکہ وہ بنارسی ساڑھیاں بننے والے ہنرمند ہیں اس لئے ساڑھی بنکار ٹھہرے اس خطاب میں کم از کم ہتک کا وہ پہلو نہیں ہے جو جولاہا کے لفظ میں پایا جاتا ہے شاید میں اس تعصب کا شکار ہو گیا ہوں جو اشرافیت گزیدہ مسلمانوں کے یہاں دستکاروں کے خلاف بالعموم نظر آتا ہے۔ میں اپنی صفائی میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اس برادری کے ایک دانا نے اپنے آپ کو اسی نام سے پکارا ہے:

جات جلاہا' نام کبیرا' اج ہوں ونجوتا ہیں
جات جلاہا' نام کبیرا' بن بن پھروں اداسی

تو ذکر تھا بنارس کی کرخنداری اردو کا یعنی کرگھا اردو کا کرگھے والوں کی زندگی تو جیسا کہ اس ناول میں پیش کی گئی ہے جھینی جھینی چدریا کی مثال ہے مگر جو زبان ان کے بیچ بنی گئی ہے وہ کسی طور بھی جھونا نہیں ہے اس کی بنت اتنی ہی ٹھسی ہوئی ہے اور اتنی ہی پربہار جتنی بنارسی ساڑھی کی ہوتی ہے ساڑھی بنکاروں کی زندگی کا بیان اگر اتنا موثر اور کھرا ہے تو اس میں زبان کا بہت دخل ہے عبدل بسم اللہ نے ان لوگوں کے بیچ بولی جانے والی زبان کو اپنے قابو میں لا کر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس زبان کا فیض ہے کہ یہ کردار اتنے زندہ نظر آتے ہیں اور ان کی گزر بسر کا نقشہ اتنا سچا نظر آتا ہے ویسے نقشہ بہت درد بھرا ہے وہ جو میر نے کہا تھا کہ:

مناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی

مگر یہ ازاں جملہ والی بات نہیں ہے۔ یہ مناع کچھ زیادہ ہی خوار ہیں کچھ ان کے اپنے بھی عیب ثواب ہیں۔ لیکن اصل میں تو وہ ان لوگوں کے ہاتھوں خوار ہیں جو ان کی محنت اونے پونے خریدتے ہیں اور اس کے زور پر دھنا سیٹھ بن جاتے ہیں دکھ بھریں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔ ہنر ساڑھی بنکاروں کا اور چاندی دھنا سیٹھوں کی اور یہ بنارسی ساڑھی جس کا اتنا شہرہ ہے اور جہیزوں کی زینت ہے خود ان ہنرمندوں کی بہو بیٹیوں کی تقدیر میں نہیں ہے اس ناول میں ایک بی بی شاید مرکزی کردار متین کی بیوی علیمن ہے جسے حسرت ہے کہ کبھی بنارسی ساڑھی زیب تن کرے غریب خون تھوکتے تھوکتے مر جاتی ہے اور اپنی حسرت کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔

عبدل بسم اللہ نے استحصال کا بھی خوب نقشہ دکھایا ہے اس کے خلاف جدوجہد بھی دکھائی ہے یہ تو اس ناول کا تبلیغی پہلو ہے اس کے ساتھ ایک پہلو اور ہے اور اسے بھی مصنف نے شاید اسی قدر اہمیت دی ہے ساڑھی بنکاروں کا اپنا رہن سہن ' اپنی بولی ٹھولی ' اپنے شادی بیاہ ' ریت رسمیں اس کے ساتھ میلوں ٹھیلوں میں تیج تیوہار میں ان کا شغف اس سارے کی تصویر کشی اس طرح کی ہے کہ ایک پورا کرگھا کلچر پھلتا پھولتا نظر آتا ہے۔

چونکہ یہ بنکار مسلمان ہیں اس لئے بیچ تیوہار کا جو نقشہ باندھا گیا ہے وہ مسلمانوں والا ہے رمضان ' عید ' بقر عید ' محرم ' شب برات ' ---- ہر تیوہار کی خوب تصویر کشی کی گئی ہے مگر جب بقر عید سر پہ آگئی ہوئی تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ عبدل بسم اللہ تیوہار کی تصویر کشی کرتے کرتے بیچ میں رکتے ہیں اور تیوہار کا پس منظر بیان کرنا شروع کرتے ہیں وہی حضرت ابراہیم کے خواب اور حضرت اسماعیل کی جگہ مینڈھے کے چھرے تلے آجانے کا قصہ۔ اور مجھے پڑھتے پڑھتے اچانک احساس ہوا کہ میں یہ بیان کیوں پڑھ رہا ہوں یہ میرے لئے تھوڑا ہی لکھا گیا ہے یہ تو عبدل بسم اللہ نے اپنے ہندی قارئین کی خاطر قلمبند کیا ہے جن کا تہذیبی پس منظر مختلف ہے اور جن کی معلومات میں اس کے پڑھنے سے یقیناً" اضافہ ہوگا اور یہاں سے مجھے یہ اشارہ ملا کہ کرگھا نگری کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ عبدل بسم اللہ نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ واسطے سے مسلمانوں کی مذہبی اور تہذیبی زندگی کی بھی ایک تصویر پیش کر دی جائے ہندی فکشن کے متعلق میری معلومات کم بہت ہی کم ہے قیاس یہ کہتا ہے کہ وہاں ایسا کام کم ہی ہوا ہوگا اس لئے عبدل بسم اللہ کی یہ کوشش ایک اہمیت اور معنویت کی حامل ہے ویسے ایسی پیشکش بامعنی اسی صورت بنتی ہے جب بیان تجربے کی سطح پر ہو۔ ویسے ہوتا یہ ہے کہ اچھا اچھا لکھنے والا کسی نہ کسی منزل پر آ کر جوش بیان میں چغلی کھا جاتا ہے اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اب تجربے کی سطح سے گزر کر معلومات فراہم کی جا رہی ہیں اردو میں کامیاب مثال سرشار کی ہے اور ہاں نظیر اکبر آبادی بس جیسے بچے بیچ تیوہار پہ نئے کپڑے پہن کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور میلوں ٹھیلوں میں جا کر ایسے مگن ہوتے ہیں کہ تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ سرشار اور نظیر اکبر آبادی بھی اس معاملے میں بالکل بچے ہیں۔ خیر اس وقت تو ذکر عبدل بسم اللہ کا ہے۔ ذرا ان کے یہاں بھی تو دیکھیے کہ میلوں ٹھیلوں کا کیا نقشہ ہے اور بیچ تیوہار کا کیا رنگ ہے رمضان کی بقول بنارس والوں کے ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے عید کی تیاریاں شروع ہیں جلاہوں کی گلیوں میں گہما گہمی ہے:

" گلیوں میں، قبرستانوں میں اور ہر خالی جگہ میں تانیاں ہی تانیاں نظر آ رہی تھیں۔ دھاگے ہی دھاگے لوگ ہی لوگ۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر بن کر ایک الجھا ہوا تانا بن کر رہ گیا ہے۔"

رمضان کی دوسری ٹانگ بھی کتنے دن ہوئے ٹوٹ چکی۔ اب چاند رات ہے۔ گلیوں بازاروں میں بھیڑ بھڑکا ہے کھوے سے کھوا چھلتا ہے:

" دال منڈی آج بارات گھر کی طرح سجی ہوئی ہے اس منڈی میں دال کبھی نہیں بکی ہاں روپ کا بیوپار ضرور ہوا تھا کسی زمانے میں اب تو مسلمانوں کا یہ بہت بڑا بازار ہو گیا ہے۔"

" چوک سے جیسے ہی اندر گھسیے تو سجی ہوئی دکانوں سے آنکھیں چندھیا اٹھتی ہیں زیادہ تر بھیڑ لنگیوں کی دکانوں پر ہے سارے انصاری بھائی اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے لنگیاں خرید رہے ہیں۔"

" لنگیوں کی دکانوں کے بعد یہ بھیڑ ٹوپیوں کی اور بڑھتی ہے۔ پھر جوتوں چپلوں کی اور کچھ لوگ رومال گنجی (بنیان) اور موزے خریدنے میں بھی دلچسپ تھے اور کچھ لوگ عطر اور سینٹ کی دکانوں میں کھڑے ہو کر ایک ایک عطر کو انگلیوں کے اوپر رگڑ کر ان کا پریچھنشر کر رہے ہیں۔
اے کا ہے میاں خس ' خس عطر کے ہوتے میاں۔"

یہ مسلمانوں کا بنارس ہے۔ چاند رات میں رونق بازاروں میں تھی۔ صبح ہوتے پر عید گاہوں اور مسجدوں

اورنگ زیب قاسمی

نے رونق پکڑی۔ فاطمان کی عید گاہ سے بڑھ کر نمازیوں کا ہجوم لاٹ بھیرو کی مسجد میں ہے:

" اس مسجد کے آنگن میں ایک مندر بھی ہے اور مسجد کے آنگن میں مندر ہو' یہ بات شاید بنارس میں ہی سمبھو ہے اس کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک انگریز کلکٹر نے ایسا آرڈر دیا کہ یہاں پوجا بھی ہوگی اور نماز بھی پڑھی جائے گی۔ لیکن نماز کے وقت پوجا نہیں ہوگی۔ سو ابھی تک یہ بات چلی آ رہی ہے۔"

مسجد کے آنگن میں مندر " یہ بات شاید بنارس میں ہی سمبھو ہے " ۔ ہاں شاید اجودھیا میں تو یہ ممکن نہ ہو۔ مگر بنارس میں بھی کب تک مگر ہاں اس نگر میں ایک مسجد اور بھی ہے جس کے متعلق اس ناول کے رؤف چاچا یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ کاشی میں جان چند نام سیٹھ کی ایک بیٹی تھی واپی چندے آفتاب چندے ماہتاب ایک دن وہ وشوناتھ مندر میں پوجا کرنے کے لئے گئی مگر پھر واپس نہیں آئی۔ آبرو بھی گئی اور جان بھی۔ سیٹھ نے اورنگ زیب سے فریاد کی اس درخواست کے ساتھ اس مندر کو ڈھا دیا جائے۔ اورنگ زیب نے درخواست منظور کی اس رنگ سے کہ مندر ڈھا کر وہاں ایک مسجد کھڑی کر دی۔ رؤف چاچا کا خیال ہے کہ " جان چند اور اس کی بیٹی واپی کا تعلق ہونے ہی کی وجہ سے یہ مسجد جان واپی کی مسجد بولی جاتی ہے۔"

شاید ایسا ہی ہو مگر رؤف چاچا کی سنائی ہوئی روایت پر اب اعتبار کون کرے۔ مسجد تو اب ہٹ لسٹ پر ہے۔

خیر' مطلب تو ناول نگار کا یہ دکھانا تھا کہ بنارس کے بیچ مسلمانوں کا بھی ایک بنارس ہے اور کیا خوب یہ بنارس ہے پھر اس بیچ ان کا بنارس جن کا رشتہ پیچھے کہیں جا کر کبیر سے ملتا ہے بس یہ سمجھو کہ اصل میں بنارس کے اندر یہ بنارس کبیر کا بنارس ہے جات جلاہا نام کبیرا ' رؤف چاچا' متین' بن بن پھروں اداسی ' آگے بھی خوار پھرتے تھے اب بھی خوار پھرتے ہیں مفلوک ہیں سب خوار ازاں جملہ ہیں یہ بھی انگلیوں میں ہنر بھرا ہے مٹھیاں خالی ہیں بنارسی ساڑھیاں کیا خوب بنتے ہیں۔ مگر خود ان کی اپنی زندگی کا تانا بانا ---- کچھ مت پوچھو---- جھینی جھینی بینی چدریا!

ہاں چلتے چلتے زبان کے سلسلے میں پھر ایک وضاحت ہو جانی چاہیے یہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا کہ عبدل بسم اللہ زبان کیسی لکھتے ہیں وہی جو ہم آپ لکھتے ہیں بس بیچ بیچ میں کوئی اکا دکا لفظ شدھ ہندی کا واقعوں کے بیچ آ کر کراک سے بولتا ہے مگر میں نے اس زبان کے حوالے سے نہیں بلکہ کرگھا اردو کے حوالے سے اس ناول کو اردو کا ناول کہا ہے باقی یہ جو زبان ہے جو ہمیں اردو سے مختلف نظر نہیں آتی اس کا تو اب ہندی فکشن میں چلن عام نظر آتا ہے یعنی وہ جو ہم اردو والوں کا تصور تھا کہ ہندی کا بول چال کی زبان سے رشتہ کمزور ہے اردو سے مختلف نظر آنے کے لئے سیدھے سادھے روزمرہ کے لفظوں کے لئے بھی شدھ ہندی کے لفظ وضع کرتے پڑتے ہیں سو اب وہ بات نہیں ہے کم از کم افسانہ ناول لکھنے والوں نے اس روش کو ترک کر دیا ہے۔ اب مجھے لگتا ہے کہ میرے اور ہندی افسانے کے بیچ صرف رسم الخط کی دیوار ہے زبان کی نہیں ہندی زبان کے لئے تو یہ نیک شگون ہے مگر اردو والوں کو اس سے چوکنا ہو جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اردو سے جو بڑے پیمانے پر افسانے کی ہندی میں منتقلی ہوئی ہے اسی کا یہ فیض ہو۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے زبانیں کسی اخلاقیات کی قائل نہیں ہوتیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک بنتی ہوئی زبان جس سے فیض اٹھاتی ہے بالآخر اسے ہی کھا جاتی ہے۔

("سویرا" لاہور)

ہرمن ہیس کا ناول سدھارتھ

سدھارتھ اپنے دوست گووند کے ساتھ آموں کے جھنڈ میں، جوان ہوتا ہے اور پھر اپنے پتاجی اور دوسرے پنڈتوں کے ساتھ بحث مباحثوں میں شریک بھی ہوتا ہے اور جب گیان دھیان کا وقت شروع ہوتا ہے اپنی آتما کو اپنے وجود میں تلاش کرتا ہے وہ آتما جو ساری کائنات کی روشنی ہوتی ہے اور ساری کائنات اس سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ پتاجی اس سے خوش تھے اس لئے نہیں کہ انہیں یقین تھا کہ ان کا بچہ بڑا ہو کر ...... لیکن خواب اور بے چینی سدھارتھ کا مقدر تھے۔ رات میں ستاروں کی چمک اور دن میں سورج کی کرنوں سے ان گنت خواب اور خیال اس کے ذہن میں آتے تھے ماں باپ کی محبت اس کے لئے کافی نہیں تھی۔ پنڈتوں نے اسے بہت سارا علم دے دیا تھا مگر اس کا دل اب بھی خالی تھا اس کا ذہن اب بھی غیر مطمئن تھا۔ اس کی روح میں اب بھی سکون نہیں تھا وہ سوچتا تھا برہما سے ملنا چاہتی ہی تو سب کچھ نہیں ہیں وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کی ذات، اس کی سب سے گہری ذات آخر ہے کہاں؟ یہ ذات صرف شعور یا خیال نہیں ہو سکتی اس تک پہنچنے کا راستہ نہ اس کے پتاجی نے بتایا تھا اور نہ دوسرے برہمنوں نے۔ سام وید کہتا ہے کہ جب انسان سو رہا ہوتا ہے تو وہ اپنی ذات کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے، اس وقت انسان دراصل آتما میں رہتا ہے یہ دانش سدھارتھ کے لئے اتنی خوشگوار اور شیریں تھی جتنا شہد ہوتا ہے برہمنوں کی نسلاً بعد نسلاً جمع کی ہوئی یہ دانش ان برہمنوں کا علم ہی نہیں ان کا تجربہ بھی تھی مگر سدھارتھ جان گیا تھا کہ اصل حقیقت خود اس کی اپنی ذات میں ہے مگر وہ اس ذات تک کیسے پہنچے۔ یہ سدھارتھ کا مسئلہ تھا یہی اس کی پیاس تھی اور یہی اس کا دکھ!

سدھارتھ درختوں کے نیچے بیٹھ کر گیان دھیان کرتا تھا اور یہ الفاظ دہراتا تھا کہ اوم کمان ہے روح اس کا تیر ہے اور برہما اس تیر کا نشانہ ...... اتفاق سے تین بھکشو گھومتے ہوئے اس کے گاؤں میں آ نکلے نیم برہنہ بھکشو جن کے جسم کو سورج نے جھلس رکھا تھا سدھارتھ نے ان کو دیکھا اور اپنے دوست گووند سے کہا کل سویرے میں بھی ان بھکشوؤں میں شامل ہو جاؤں گا۔

"کیا پتاجی تمہیں اجازت دیں گے؟" گووند نے کہا "تم فکر نہ کرو۔" سدھارتھ نے کہا "پھر سدھارتھ کمرے میں چلا گیا اس کے پتاجی چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے وہ چپ چاپ پتاجی کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔

پتاجی نے کہا" تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

اورنگ زیب قاسمی

سدھارتھ نے سر جھکا کر کہا "مجھے بھکشوؤں کے ساتھ جانے کی اجازت دیجئے پتاجی!"

بوڑھا برہمن چپ رہا اتنی دیر تک کہ کئی ستارے چھوٹی سی کھڑکی کے سامنے سے گزر گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہتے ستاروں کی ساری ترتیب بدل گئی بوڑھے برہمن کا لڑکا خاموش کھڑا رہا۔ ہاتھ باندھے ہوئے بوڑھا برہمن چٹائی پر بیٹھا رہا اور ستارے کھڑکی سے گزرتے رہے۔

ترجنیف کے بارے میں کہا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس نے کردار کو ٹائپ اور فرد دونوں کی حیثیت سے پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے ناول شاعری کی اعلیٰ صفات کا حامل بھی ہوتا ہے ایسا لگتا ہے کہ ہرمن ہیس یورپ کے ذہن کو مستقبل کے عہد کی فکر کے لئے تیار کرنا چاہتا ہے اسپنگلر کی مشہور تصنیف "مغرب کے زوال" پہلے سے ہی اس نے لکھ دیا کہ یورپ مر رہا ہے ہرمن ہیس کے ناولوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حقیقت جو مظاہر کے اندر چھپی ہوئی ہے ناول اس کو سامنے لا سکتا ہے۔ ترجنیف کی طرح ہرمن ہیس بھی اپنے شاعرانہ تخیل کو فطرت کے قریب رہ کر کنٹرول کرتا ہے۔

ہرمن ہیس کے ناول Narcissus and Goldmund نرگس اینڈ گولڈ منڈ میں اس کی انسانیت پسندی اور اس کا گہرا فلسفیانہ مزاج ظاہر ہوا ہے۔ ۱۹۴۳ء میں اس کا ناول دی گلاس بیڈ گیم شائع ہوا تھا۔ The Glass Bead Game ٹیس ایس ایلیٹ نے سوئٹزرلینڈ کے ایک گاؤں لوگانو میں جا کر اس سے ملاقات کی تھی۔ وہ جرمنی سے آ کر اسی گاؤں میں آخر وقت تک مقیم رہا۔ اپنی مشہور نظم ویسٹ لینڈ میں بھی ایلیٹ نے ایک جگہ ہرمن ہیس کی کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ ہرمن ہیس نے ناولوں کے علاوہ مضامین بھی لکھے ہیں۔ شاعری اور مصوری بھی کی ہے اس کے لئے زندگی اور فن اتنے ملے جلے تھے کہ اگر گفتگو زندگی سے شروع ہوتی تو فن تک پہنچ جاتی اور اگر فن سے شروع ہوتی تو زندگی پر ختم ہوتی۔ ہرمن ہیس کو یقین تھا کہ یورپ کا زوال شروع ہو چکا ہے اور یہ کہ یورپ کی روح کو کراما زوف کا ایشیائی آدرش ختم کر دے گا۔ یورپ اخلاقی قانون کو توڑ کر کسی آفاقی معیار تک پہنچنا چاہتا ہے لیکن یورپ کا یہ زوال ایک تشدد آمیز واقعہ نہیں، ایک باطنی انقلاب ہوگا ہرمن ہیس نے دوستوئفسکی کے ناولوں کی بہت تعریف کی ہے۔ دوستوئفسکی کے مشہور ناول ایڈیٹ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس ناول کے ہیرو مشکن سے اس کے سارے دوست نفرت کرتے ہیں کیونکہ جس طرح اس کے دوست دنیا کو دیکھتے ہیں وہ نہیں دیکھتا مشکن کے سارے دوست یورپ کے عام آدمیوں کی طرح پرانے نظام اقدار سے لپٹے ہوئے ہیں۔ اور ان کے برعکس مشکن زندگی کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے واقعی زندگی ہے یعنی مشکن ان سرحدوں پر جا کر کھڑا ہو جاتا ہے جہاں سارے تضادات مٹ جاتے ہیں جب تک ہم روایتی حقیقت کے تانے بانے میں رہتے ہیں ہم زندگی کو متصادم اور متضاد حقیقتوں کے روپ میں دیکھتے ہیں لیکن ہم اگر ایک لمحہ کے لئے بھی حقیقت کے اس فریم ورک سے باہر نکل کر سوچیں تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ حقیقتیں جو بظاہر متضاد اور متصادم ہیں ایک عظیم ترکل کے ہم آہنگ اجزا ہیں بلکہ ایسے اجزا جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

ہرمن ہیس کا خیال تھا کہ فرائڈ اور یونگ کی ساری دریافتیں ماضی کے عظیم مصنفوں کے یہاں ملتی ہیں، تحلیل نفسی موجود علم کی ایک باضابطہ شکل کا نام ہے۔ تحلیل نفسی کوئی نئی ایجاد نہیں ہے مگر ...... تحلیل نفسی سے دلچسپی نے آخر کار ہرمن ہیس کو مجبور کر دیا کہ وہ ان شعوری مسائل پر بھی توجہ کرے جن کو منطقی

معاشرے کے لوگ اپنے اندر دبا کر ذہنی مریض ہو جاتے ہیں اور ان مسائل کو نسل در نسل دباتے چلے جاتے ہیں اپنے مشہور ناول ڈی مین ' میں اور اپنے مضامین میں بھی اور ان مضامین میں بھی جو اس نے دوستو سکی پر لکھے ہیں ہرمن ہیس نے ذاتی مسائل سے اپنی توجہ ہٹا کر زندگی پر کر دی ہے اور انسان کی ان اقدار پر توجہ کی ہے جن میں افراتفری پیدا ہوئی ہے ہرمن ہیس کا یہ عقیدہ تھا کہ ساری کائنات میں وجود کی باطنی وحدت کارفرما ہے لیکن اس وحدت پر یقین اور اس وحدت کا تجربہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب متصادم اور متضاد حقیقتیں مل کر ایک ہو جائیں۔ یہی جدلیاتی عمل ہرمن ہیس کے ناول میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ سدھارتھ روح کی دنیا سے حواس کی دنیا تک پہنچتا ہے اور آخر میں یہ دونوں دنیائیں مل کر ایک ہو جاتی ہیں اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب سدھارتھ اس دریا کے کنارے ہوتا ہے جو ان دونوں دنیاؤں کے بیچ بہتا ہے نرگس اینڈ گولڈ منڈ میں بھی ایسی ہی وحدت دو مرکزی شخصیتوں کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کو مکمل کرتی ہیں اور یہ وحدت بھی ایک علامتی وحدت ہوتی ہے علامت دراصل ایک ایسی نمائندگی کرتی ہے جس کا مقصد کسی چیز کی نقل نہیں ہوتا بلکہ لامحدود کا کچھ اظہار۔ لامحدود کی کچھ تجسیم ہوتی ہے۔ لامحدود کی علامت کے ذریعے محدود سے ملا دیا جاتا ہے علامت کے ذریعے حقیقت کا آخری جوہر اور چیزوں کی روح پیش کی جا سکتی ہے جزئیات کے ذریعے ناول نگار کائنات میں جو نہ دکھائی دینے والی زندگی ہے اس کو علامت کے طور پر دکھا سکتا ہے ہرمن ہیس کے ناولوں کی طرح اس کے مضامین میں بھی یہی جدلیاتی عمل اس کا موضوع ہے ہرمن ہیس کا خیال تھا کہ دوستو سکی نے دکھایا ہے کہ روسی آدمی نیکی اور بدی دونوں میں بیک وقت یقین رکھتا ہے۔ دوستو سکی پر اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ روسی آدمی اور یورپی آدمی کا تضاد ایک ایسی علامتی وحدت میں تبدیل ہوتا ہے جو حقیقت کو روایتی طور سے متضاد صورتوں میں دکھانے کے خلاف ہے۔ ہرمن ہیس دو متضاد قسم کے انسانوں سے بحث کرتا ہے۔ ایک عقل کا آدمی اور دوسرا احمق آدمی۔ اور وہ ان دونوں کو ملا کر ایک کر دینا چاہتا ہے ہرمن ہیس کہتا ہے کہ دیومالا میں اور مذاہب میں یہ مقام ضرور آتے ہیں پہلا مقام جنت ہے یا وہ بچپن جب انسان پر کوئی ذمہ داری نہ ہو۔ دوسرا مقام گناہ کا احساس ہے اور تیسرا وہ زمانہ ہے جب انسان میں نیکی اور بدی کی تمیز پیدا ہو جائے اسے خیر و شر کا فرق معلوم ہو جائے جب انسان کے سامنے اخلاقیات اور مذہب کے آدرش ہوں اور الیہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ جان جائے کہ یہ آدرش انسان حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ مایوسی انسان کو تباہ کر دیتی ہے یا پھر اسے یقین کامل عطا کر دیتی ہے اس تیسرے مقام پر تقویٰ اور دانش ایک ہو جاتے ہیں۔ تضادات حل ہو جاتے ہیں اور انسان اپنی انسانیت حاصل کر لیتا ہے۔

ہرمن ہیس کے ناولوں میں کردار قدروں کو چیلنج کرتے ہیں ' انہیں رد کرتے ہیں اور پھر ایک نیا شعور حاصل کرتے ہیں۔ ہرمن ہیس کا شمار کافکا کی طرح بیسویں صدی کے عظیم ناول نگاروں میں ہوتا ہے وہ جنگ کے مقابلہ میں امن کا علمبردار ہے ' وطنیت کے مقابلہ میں آفاقیت کا اور یورپی تہذیب کے مقابلے میں عالمی کلچر کا وہ کہتا ہے کہ آسمان کا تھوڑا سا ٹکڑا باغ کی وہ دیوار جس پر درختوں کی سبز ٹہنیاں لٹک رہی ہوں ' مضبوط ' توانا گھوڑا ' ایک خوبصورت کتا ' بچوں کا ایک گروہ ' ایک خوبصورت چہرہ ' ہمیں ان سے محروم کیوں کیا جائے ؟ جو دیکھنے کا ہنر سیکھ گیا ہے ' وہ تھوڑی سی جگہ میں وقت ضائع کئے بغیر بہت خوبصورت چیزیں دیکھ سکتا ہے۔

خوبصورت چیزیں دیکھنے سے تھکن نہیں ہوتی۔ ہر چیز اپنے اندر خوبصورت پہلو رکھتی ہے یہاں تک کہ

اورنگ زیب قاسمی

غیر دلچسپ اور بدشکل چیز بھی جس آدمی کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور جو فضول چیزوں میں دلچسپی بھی لینا چاہتا میں اسے یہ مشورہ دوں گا کہ ہر روز زیادہ سے زیادہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں جمع کرے بڑی خوشیوں کو بچا کر رکھے چھٹیوں اور مناسب اوقات کے لئے ہمیں تفریح کے لئے چھوٹی چھوٹی خوشیاں دی جاتی ہیں۔ روزانہ کے دکھوں سے نجات کے لئے اور ان کا بوجھ اتارنے کے لئے بڑی مسرتیں نہیں چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں۔

جب خوبصورت کملاسہ پہر اپنے درختوں کی جھنڈ کی طرف آ رہی تھی سدھارتھ نے جھک کر اس کا استقبال کیا اور سدھارتھ نے کملا کے غلام سے کہا ایک نوجوان برہمن اس سے ملنا چاہتا ہے کچھ دیر کے بعد غلام آیا اور سدھارتھ کو اس سائبان میں لے گیا جہاں کملا موجود تھی سدھارتھ نے کہا کہ میں ایک برہمن کا لڑکا سدھارتھ ہوں ۔ اور میں نے تین سال سے اپنے گھر کو چھوڑ رکھا ہے اور میں جنگلو ہو گیا تھا لیکن اب میں نے یہ راستہ چھوڑ دیا ہے کملا میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ تم پہلی عورت ہو جس سے میں نے اپنی آنکھیں نیچے کئے بغیر گفتگو کی ہے اب میں کسی عورت کے سامنے اپنی آنکھیں نہیں جھکاؤں گا کملا مسکراتی رہی اور مور کے پروں سے بنے ہوئے پنکھے سے کھیلتی رہی۔

سدھارتھ نے کہا کہ میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں اس لئے کہ تم بہت خوبصورت ہو۔ کملا میں چاہتا ہوں کہ تم میری دوست بن جاؤ اور کملا کا قہقہہ فضا میں گونجنے لگا۔

ہرمن ہیس کہتا ہے کہ میں ایک پناہ گاہ چاہتا ہوں یہ خواہش میرے دل میں برسوں رہی ہے اس خواہش نے مختلف اوقات میں مختلف روپ دھارے ہیں میں چاہتا ہوں کہ ایک چھوٹی سی کٹیا ہو جس سے میں جھیل کے کنارے تک آ سکوں ۔ وہ کبھی آلپس کی پہاڑیوں میں کسی لکڑہارے کی جھونپڑی میں رہنا چاہتا تھا ایسی جھونپڑی جس میں بس اتنی جگہ ہو کہ میں سو سکوں اور اپنے قریب ترین پڑوسیوں سے بھی کم سے کم چار پانچ گھنٹے دور رہ سکوں ۔ کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ پہاڑیوں کے قریب کسی کھنڈر میں رہوں۔ اخروٹ کے جنگلوں کے پاس۔ انگور کی بیلوں کے قریب ہاں ایسے گھر میں جس میں کھڑکی اور دروازے ہوں یا نہ ہوں ۔ کبھی جی چاہتا تھا کیبن میں بیٹھ کر جہاز میں سفر کروں۔ تین چار مہینے کے لئے چاہے یہ سفر کسی بھی سمت میں کیوں نہ ہو..... ہاں بعض اوقات جی چاہتا تھا کہ زمین میں چھوٹا سا گھر ہو۔ چھوٹی سی قبر ہو۔ جسے اچھی طرح کھودا گیا ہو یا نہ کھودا گیا ہو۔ جس میں کفن ہو۔ جس میں کفن ہو یا نہ ہو جس پر پھول ہوں یا نہ ہوں۔ جنگل یا قریبی جھیل بڑی اچھی پناہ گاہ ہو سکتی تھی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ لوگ نہ ہوں دکھ کے پیغام نہ آئیں خیالات کے چور اچکے نہ گھس سکیں ۔ خط اور تار نہ آئیں۔

ہاں قریب ایک نمر جیب جاپ یا شور مچاتی ہوئی بہہ سکتی ہے۔ آبشار گر سکتا ہے بھوری چٹانوں پر سورج کی شعاعیں آ سکتی ہیں ۔ تتلیاں نظر آ سکتی ہیں سی گل گھونسلے بنا سکتی ہیں آخر کار اس امتحان کا وقت بھی آ گیا۔ مجھے ایک چھوٹا سا گھر مل گیا۔ جنوبی جھیل کے قریب ایک پہاڑی پر لیکن جب مجھے یہ گھر ملا تو میں نے اس میں ہر طرح کے عیب نکالے اور میرے خواب کا جھوٹ مجھ پر کھلنے لگا۔ رینگتا ہوا یہ خواب واپس جانے لگا جیسے وہ دھوکہ باز اپنا پتا غلط بتاتا ہے اور آخر کار اسے پہچان لیا جاتا ہے آج انجیل مقدس کے یہ لفظ میرے کان میں گونجتے ہیں کہ خدا کی بادشاہت تیرے اندر ہے اب میں ایک نئے سفر پر روانہ ہو رہا ہوں۔ ایک نئی قوت میری رہنمائی کر رہی ہے اس کے لئے اپنی جان نچھاور کر سکتا ہوں میرا مقصد اب بھی وہی ہے ایک پناہ گاہ لیکن

غار نہیں' جہاز نہیں میں اپنے اندر اپنی پناہ گاہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ ایسی جگہ جہاں صرف میں ہوں۔ پہاڑوں اور غاروں سے زیادہ محفوظ جگہ کفن اور قبر سے زیادہ محفوظ جگہ جہاں کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ وہ میں نہ بن جائے۔

کملا کا قہقہہ فضا میں گونجتا رہا۔ ہرمن ہیس کہتا ہے کہ خواہش کی آنکھ چیزوں کو مسخ کر دیتی ہے۔ اگر میں جنگل کو اس نیت سے دیکھوں کہ جنگل خریدلوں یا کرایہ پر اٹھالوں یا کٹوا دوں یا رہن رکھ دوں یا شکار کروں تو سمجھو کہ میں جنگل کو نہیں دیکھ رہا ہوں جنگل کو اپنے تعلق سے دیکھ رہا ہوں۔ جنگل سے اپنے منصوبوں اور اپنی جیب کے تعلق کو دیکھ رہا ہوں۔ جب کوئی خواہش نہ ہو اور میں جنگل کو دیکھوں تو یہ جنگل میرے لئے ایک زندہ جنگل بن جاتا ہے۔

اسی طرح جس آدمی کو میں امید لالچ یا مطلب کی آنکھ سے دیکھتا ہوں وہ آدمی نہیں رہ جاتا میری خواہشات کا ایک دھندلا آئینہ بن جاتا ہے گیان دھیان محبت کا دوسرا نام ہے یہ ہماری روح کا سب سے اونچا مقام ہے فطرت ابدی طور سے لاانتہائی تخلیقی زندگی کا ہر لمحہ بدلتا ہوا مظاہرہ ہے اس لئے آدمی کا رول اور اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی روح کی نمائندگی کرے۔ ہم پودوں اور جانوروں میں روح نہیں دیکھتے ہم اسے وہاں ڈھونڈتے ہیں جہاں یہ سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔ اجتماعی انسانیت بھی روح کا مظاہرہ ہے جس طرح میں پہاڑوں اور چٹانوں میں قوت تخلیق کو کار فرما دیکھتا ہوں اسی طرح میں انسانوں میں روح کو کار فرما دیکھتا ہوں انسان کی روشن آنکھ اس کا فن اس کی روح طبعی زندگی کا سب سے بڑا مقام ہے ابتدائی عہد والے انسانوں کی روح جو اب بھی کئی قبیلوں میں ہمیں ملتی ہے اس میں میکانکی زندگی نے کوئی اجنبیت یا کوئی علیحدگی پیدا نہیں کی ہے۔ اجتماعی طور پر سادہ اور بچوں کی سی روح ہے یورپ کا ہر آدمی اپنی روح کا مظاہرہ نہیں کرتا بلکہ وہ ایک منظم قوت ارادی کا مظہر ہوتا ہے یعنی منظم منصوبوں اور اسکیموں کا یورپ نے اپنی روح دولت اور شکوک میں رکھ دی ہے یورپ کو اپنی روح دوبارہ تلاش کرنی پڑے گی۔ لیکن یورپ کو اپنی دوبارہ کھوئی ہوئی روح نہیں ملے گی۔ بلکہ اس سے زیادہ نازک اور باریک اور بہت زیادہ ذاتی' دولت مند اور ذمہ دار روح ملے گی۔ انسان کا راستہ دوبارہ اپنے بچپن کی طرف نہیں جارہا ہے۔ شخصیت کی طرف' ذمہ داری کی طرف "آزادی کی طرف" روح محبت ہے' روح مستقبل ہے اور اس کے سوا سب مادہ ہے۔

سدھارتھ کہتا ہے میں تم کو اپنا رہنما بنانا چاہتا ہوں۔ اور کملا کا قہقہہ فضا میں گونجتا ہے اور ہرمن ہیس کہتا ہے روح کے پاس علم نہیں ہوتا۔ فیصلہ نہیں ہوتے پروگرام نہیں ہوتے۔ اس کے پاس صرف کام کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے اور مستقل دھرتی کی شکل بدل رہی ہے ہر شہر' ہر منظر میں تبدیلی آرہی ہے اور اسی طرح ایک انقلاب انسانوں کی روح میں آرہا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے تباہی کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ ہم نے جس کلچر میں آنکھ کھولی' آج اس کی موت کا اعلان کر رہے ہیں۔ کلچر اور اخلاقیات کو سب سے بڑا دھکا لگا ہے یورپ میں اب بغیر لکھا ہوا کوئی ایسا معاہدہ نہیں ہے جس کی روح سے کوئی چیز انسانوں کے لئے اچھی یا بری ہو آج ایک نئی مابعد الطبیعات کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے ایک نئی روحانیت کی تعمیر کی ضرورت سب کو ہے زندگی کے مقصد کی تلاش جاری ہے نیا آرٹ اس تلاش کا مظہر ہے بھوت پریت میں یقین سے لے کر سچے فلسفیانہ افکار تک انسان کا سفر جاری ہے۔ اور آج کا انسان سچے مذہبی جذبے تک پہنچنا

چاہتا ہے ایک نئے تصوف کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے لاؤ سی کا ترجمہ تقریباً" یورپ کی ساری زبانوں میں ہو رہا ہے چینی کرداروں سے میری دلچسپی کا تعلق بدھ مت یا زین سے بالکل نہیں ہے مجھے قدیم چین کی اس کلاسیکیت سے دلچسپی ہے جب وہاں بدھ مت نہیں پہنچا تھا۔ ہومر' افلاطون اور ارسطو کے علاوہ کیفو شس' لاؤتسی اور شوانگ زو سے میری دلچسپی ہے انہوں نے میری تعمیر میں ...... میرے تصورِ خیر کی تعمیر میں حصہ لیا ہے نیک دانشمند اور کامل انسان کا تصور میں نے ان چینی مفکروں سے لیا ہے۔ مجھے نروان سے زیادہ تاؤ میں دلچسپی ہے۔ اسی طرح مجھے چینی مصوری سے بھی دلچسپی ہے۔

مصوری کا روایتی اور مکمل اسلوب جو خطاطی کی طرح لگتا ہے پسند ہے زین مصوری کی رو سے بہتر لگتا ہے جو توانا بھی ہے اور کم منضبط بھی' مصر کے آرٹ کے علاوہ چین' سیام اور جاوا کا آرٹ بھی یورپ میں مقبول ہے افریقہ کی بت تراشی بھی امریکا میں مقبول ہو رہی ہے یہ یورپ کے زوال کا ایک اور ثبوت ہے۔

برازیل حتیٰ کیلی فورنیا اور نئی گنی کا آرٹ بھی یورپ کا انئی تاپ ہے اس آرٹ سے جنگل اور مرگھٹوں کی خوشبو آتی ہے۔

("دریافت" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

اورنگ زیب قاسمی

آلبیر کامیو کا ناول "اجنبی"

اجنبی شائع تو ہوا تھا ناول کی حیثیت سے مگر ۱۹۴۲ء سے اب ۱۹۷۵ء تک کے عرصے تک یہ ایک تاریخی دستاویز بن گیا ہے۔ اسے نہ تو دوسری جنگ عظیم سے الگ کیا جاسکتا ہے نہ ۱۹۶۸ء کی طالب علموں کی شورش سے، نہ مغرب کے نوجوانوں کی وارفتگی اور ذہنی و اخلاقی پراگندگی سے، نہ مغربی شہروں کی لاحاصل اور بے مقصد تشدد پسندی سے مراد یہ نہیں کہ یہ ساری شورشیں اسی کتاب سے پیدا ہوئی ہیں مگر یہ کتاب اس پوری صورت حال کا ایک جز ضرور ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ نہ صرف مغرب میں بلکہ مشرق میں بھی بعض نوجوانوں کی ذہنی ساخت و پرداخت میں اس کتاب کا خاصا دخل ہے چنانچہ فی الحال اس کتاب پر محض ناول کی حیثیت سے غور کرنا کافی نہ ہوگا۔

علاوہ ازیں اس کتاب کو مصنف آلبیر کامیو کی ذاتی زندگی سے بھی الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ فرانس سے باہر کامیو کی شہرت دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوئی اور وہ حریت پسند انسان دوست ڈراما نویس، ناول نگار اور فلسفی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے سارتر کی دوستی نے ان کی شہرت کو اور ہوا دی اور انہیں بھی فلسفہ زیست والے گروہ سے متعلق سمجھا گیا مگر چند دن گزرے تھے کہ ان کی سارتر سے توتو میں میں ہوگئی اور سارتر نے اعلان کر دیا کہ کامیو کا فلسفہ زیست والی جماعت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ فلسفی بھی نہیں۔ "معلم اخلاق" ہیں۔ یہ فرانسیسی ادب کی ایک خاص اصطلاح ہے جو سترہویں صدی کے ان ادیبوں پر دلالت کرتی ہے جنہیں ذہن انسانی کی تفتیش کا شوق تھا اور اپنی اس تفتیش سے چند اخلاقی نتائج برآمد کرتے تھے۔ گو ان میں سے بعض نتائج ہم مشرقی لوگوں کو بداخلاقی سے قریب تر معلوم ہوں گے۔ خیر جن دنوں یہ لڑائی ہوئی اس زمانے میں سارتر استعمار کی مخالفت اور حریت پسندانہ تحریکوں کی حمایت کر رہے تھے۔ گو فی الحال وہ کھلے کدھر جھکیں گے، بیت کی طرف کے، صدق اسرائیل کے حامی ہیں سارتر کی چوٹ پر استعمار کے حامیوں نے کامیو کو بانس پر چڑھایا اور انہیں "عظیم انسان دوست" کا لبادہ اڑھایا۔ کامیو نے بھی اس لبادے کا خوب حق ادا کیا۔ اور انسانی جذبات سے ہمدردی اور رقت قلب کے بجائے الجزائر کی تحریک آزادی کی مخالفت کر ڈالی اور نوبل پرائز بھی عنایت میں لے لیا۔ اگر موٹر کے ایک "بے مقصد" حادثے میں وہ ہلاک نہ ہو جاتے تو کئی اور انعام لے بیٹھے ہوتے۔

یہ باتیں سنانے سے میرا مطلب قارئین کو اس کتاب اور اس مصنف سے بدظن کرنا نہیں بلکہ ان دونوں کی شدید اہمیت واضح کرنا ہے یہ کتاب پڑھے بغیر آپ نہ تو مغرب کے موجودہ معاشرے سے پوری طرح واقف

ہو سکتے ہیں نہ مغرب کی سیاست سے جس حد تک مشرق کے لوگ اندھا دھند مغرب کے ذہنی رجحانات کا اثر قبول کر رہے ہیں وہاں تک مشرق کے بعض طبقوں کو سمجھنے کے لئے بھی یہ کتاب پڑھنا ضروری ہے کیونکہ عربی زبان کے ادبی رسالوں میں بھی "العبث" کا نعرہ جلی حروف میں چھپا ہوا نظر آ رہا ہے۔ غرض اس کتاب کی کئی حیثیتیں ہیں یہ ناول بھی ہے، اخلاقیات کی کتاب بھی ہے فلسفہ طرازی بھی ہے اور مغربی معاشرے میں رونما ہونے والے اثرات اور نتائج کے اعتبار سے نوجوانوں کے لئے ہدایت نامہ بھی۔

پہلے ناول کے اعتبار سے دیکھیے پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان مغربی ناول میں ایک رجحان یہ بھی چل پڑا تھا کہ جس چیز کو عام لوگ "کہانی" کا نام دیتے ہیں وہ عنصر کم سے کم ہو۔ اس کے برخلاف فرانس میں مارلو کے ہاں اور امریکہ میں ہیمنگ وے وغیرہ کے ناول بھی تھے جن میں واقعات اور جسمانی افعال کی خاص اہمیت تھی مگر فی الجملہ جدید طرز کے ناولوں میں دروں بینی کا رنگ بڑھا ہوا تھا۔ کامیو نے دروں بینی اور خود نگری کے بجائے اپنے ناول کی بنیاد کہانی پر رکھی۔ ان کی جدت یہ تھی کہ جو افعال اور واقعات بیان کئے جائیں وہ اتنے معمولی ہوں کہ بے کیف بن جائیں یوں تو اس ناول میں قتل بھی ہوتا ہے لیکن اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ہیجان انگیزی کی شق میں نہیں آتا قتل کرنے والا ایک خود کار مشین کی طرح عمل کرتا ہے اس لئے یہ واقعہ جذبات سے خالی ہے جہاں تک پیش پا افتادہ تفصیلات بیان کرنے کا تعلق ہے یہ کام زولا کے پیرو سو سال پہلے سے کر رہے تھے کامیو نے خارجی ماحول کی صرف وہ تفصیلات بیان کی ہیں جو ایک مردہ دل اور بے کیف آدمی کے شعور میں تھوڑا بہت ردعمل پیدا کر سکتی ہیں۔ اسی بات کو ان کے قصیدہ خواں یوں کہتے ہیں کہ کامیو کا طرز تحریر "جوہری" ہے اور وہ ہر ایسی تفصیل سے بچتے ہیں جو غیر ضروری ہو۔ مصنف کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے ہر منظر سے اکتاہٹ اور بے نیازی کی فضا پیدا کی جائے۔ مرکزی کردار کا شعور اس وقت جاگتا ہے جب اس سے ارادے کے بغیر ایک قتل سرزد ہو جاتا ہے اور اسے جیل میں رہنا پڑتا ہے یہاں سے کہانی عام قاری کے لئے بھی دلچسپ ہو جاتی ہے۔ خصوصاً مقدمے کی کارروائی لیکن انہی واقعات سے کامیو نے اپنے اخلاقیاتی اور فلسفیانہ نکتے پیدا کئے ہیں۔

کردار نگاری میں کامیو کی جدت یہ ہے کہ ان کے ناول کا ہیرو کوئی واضح شخصیت ہی نہیں رکھتا' بس عادات کا غلام ہے' خارجی زندگی میں بھی اور داخلی زندگی میں بھی اور عادات بھی وہ جو آج کل کے شہروں میں نچلے متوسط طبقے کے ہر آدمی کی ہوتی ہیں۔ نہ تو اس کے جذبات میں کوئی شدت ہے نہ احساسات میں تازگی۔ سوچنے کی صلاحیت تو اس میں ہے ہی نہیں بلکہ اپنی ہستی کا شعور بھی نہایت مبہم ہے جیل کی کوٹھڑی میں بند ہونے کے بعد اسے اپنی ذات کا احساس ہوتا ہے اور عدالتی کارروائی کے دوران چڑھتا جاتا ہے بلکہ حالات اسے معاشرے اور انسانی زندگی کے بارے میں بھی سوچنے پر مجبور کرتے ہیں دراصل اس عمل کو "سوچنا" نہیں کہا جاسکتا۔ یہ ہیرو مغربی شہروں کے عام آدمیوں کی طرح غبی ہے اس کا ذہن از خود حرکت کر ہی نہیں سکتا لیکن عدالت میں اسے نئے تجربات پیش آتے ہیں وہ دیکھتا ہے کہ اس کے معمولی سے معمولی اور بے ضرر فعل کو الٹے معنی پہنائے جا رہے ہیں۔ مثلاً اس کی سنگ دلی کا ثبوت یہ ہے کہ جب اس کی ماں کا جنازہ تدفین کا انتظار کر رہا تھا تو اس نے قہوے کی ایک پیالی قبول کر لی تھی۔ اس طرح کے خارجی واقعات اسے سوچنے پر نہیں بلکہ یہ دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ اس کے معاشرے میں' اور پھر انسانی زندگی میں کوئی بات عقل کے

مطابق نہیں ہوتی اور اس کا چھوٹے سے چھوٹا فعل یا احساس معاشرے کی نظر میں ملعون بن سکتا ہے۔ اوپر سے وہ معاشرے کو خوش کرنے کا فن نہیں جانتا اور صرف وہی کہتا ہے جو محسوس کرتا ہے اب اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس معاشرے کا رکن نہیں بلکہ محض اجنبی اور بیگانہ ہے اس سے آگے بڑھ کر وہ دیکھتا ہے کہ معاشرہ تو الگ رہا وہ تو پورے نظام زندگی اور کائنات میں بھی اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا کسی چیز سے کوئی رشتہ نہیں چونکہ اپنے معاشرے یا کائنات یا زندگی سے یگانگت کا رشتہ حاصل کرنے کا کوئی طریقہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے اس کی حیثیت باغی کی بھی ہو جاتی ہے بہرحال یہ حقیقت اس کی سمجھ میں آجاتی ہے کہ زندگی اور کائنات کا نظام بے عقل (عرب ادیبوں کی اصطلاح میں لا معقول) مہمل' بے معنی' بے مقصد اور عبث ہے۔ یہ "عرفان" حاصل کرنے کے بعد وہ خوشی خوشی پھانسی کے تختے پر چڑھ جاتا ہے۔

اس کہانی اور اس کردار کے ذریعے کامیو نے پہلے تو مروجہ اخلاقی اقدار کی خامی دکھائی ہے کہ وہ فرد کی داخلی کیفیات اور عوامل کو نظر میں رکھے بغیر نیک اور بد کے فیصلے صادر کرتی ہیں۔ اور اس طرح فرد کے ساتھ ہمیشہ بے انصافی ہوتی ہے۔ یہ نقطہ نظر نیا نہیں۔ انیسویں صدی کے روسی ناول نگار یہ بات بار بار کہہ چکے ہیں۔ اخلاقیات کا یہ تصور سوز و گداز سے مملو ہے۔ لیکن اگر اس پر عمل ہونے لگے تو دنیا میں عدالتیں اور قانون سب معطل ہو جائیں۔ مغرب کے بعض نوجوان پانچ سات "بے مقصد" قتل کرنے کے بعد اس اصول کے سہارے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرتے ہیں۔ خود کامیو نے اپنی ایک کہانی میں فرد کے لطیف احساسات سے ہمدردی کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ الجزائر کو آزاد نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس طرح کامیو کا مجوزہ اخلاقی نظام ایک طرف تو مغرب کی معاشرت کو درہم برہم کر رہا ہے اور دوسری طرف مغربی استعمار کا حامی بھی ہے۔

اس ناول سے جو فلسفہ برآمد ہوتا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی جبلت کے مظاہر' معاشرے کے عوامل' زندگی اور کائنات کی نیرنگیاں ہر چیز لامعقول ہے' بے مقصد ہے' مہمل اور عبث ہے کیونکہ ہم جس چیز کو عدل اور انصاف سمجھتے ہیں اس کے خلاف جاتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم جو ایک مسرت انگیز اور مربوط زندگی کی تمنا رکھتے ہیں وہ پوری نہیں ہونے پاتی۔ اگر آپ دو سال کے بچے سے اس کا کھلونا چھین لیں تو اس کی چیخوں سے بھی یہی فلسفہ برآمد ہوگا لیکن کیا کیا جائے مغرب کے دانشوروں کی ذہنی بساط بس اتنی ہی ہے۔ اس چیز کو وہ مابعد الطبیعات کہتے ہیں۔ مغرب کا ذہنی زوال چودھویں صدی میں شروع ہوا تھا۔ آج ہم مغرب کو انحطاط کی اس منزل کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہے ہیں جہاں ذہن مکمل کر غائب ہو جاتا ہے۔ سترہویں صدی کے شروع میں دیکارت نے انسانی وجود کی یہ دلیل پیش کی تھی۔

"میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں۔"

سوا سو سال بعد روسو اور اس کے مقلدین کے یہاں اس کی شکل یہ ہوگئی۔

"میرے اندر جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے میں ہوں۔"

انیسویں صدی کے وسط میں ایک حیثیت سے بودلیئر کا قول ہے۔

"میرے حواس خمسہ کام کر رہے ہیں اس لئے میں ہوں۔"

تیس سال بعد رماں بو آیا۔

"میرے حواس خمسہ الٹا کام کر رہے ہیں۔ اس لئے میں ہوں۔"

۱۹۳۰ء کے قریب معاشی اور سیاسی بحران پھیلا تو مالرو ہیمنگ وے اور ان کے ہم نوا بولے۔

"میں ارادی طور پر جسمانی فعل کا ارتکاب کرتا ہوں۔ اس لئے میں ہوں۔"

دوسری جنگ عظیم کے دوران کامیو نے انسانی ذہن کو بالکل ہی خارج کر دیا۔

"مجھ سے غیر ارادی طور پر بے معنی و بے مقصد جسمانی فعل سرزد ہو سکتا ہے اس لئے شاید میں ہو جاؤں۔"

اور جب "اجنبی" کا مرکزی کردار ہو جاتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی پوری ہستی مہمل اور عبث (قرآن شریف کی اصطلاح میں باطل) ہے۔ اپنی ہستی' اپنا معاشرہ اور اپنی کائنات اسے بے معنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جس قسم کا عدل اور مسرت معقولیت اور مربوطیت حاصل کرنے کی اسے تمنا تھی وہ تمنا پوری نہیں ہوئی۔ اس حقیقت کے عرفان کا نام مغرب میں مابعد الطبیعیاتی کرب اور بیگانگی رکھا گیا ہے۔

اس حقیقت کا اصلی نام ہوا پرستی ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق مسرت انگیز اور مربوط زندگی بسر کرنے کی یعنی گولر کے پھول لینے کی ہوس ہمیشہ اور ہر زمانے میں رہی ہے۔ یہ غفلت انسان کے خمیر میں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے سورۃ النجم میں اس بات پر غور کرنے کی تعلیم دی ہے کہ انسان جس چیز کی تمنا کرتا ہے کیا وہ اسے ہمیشہ مل جاتی ہے مگر انسان اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گھبراتا ہے۔ اوپر سے شیطان اسے لمبی چوڑی امیدیں دلاتا ہے۔ اسی لئے قرآن شریف میں یہ مضمون بار بار آیا ہے کہ کافر اصل میں تو اپنی ہوس کو پوجتے ہیں۔ یہی ان کا خدا ہے (مثلاً بیکن سے لے کر مارکوزے تک سب کا خدا یہی ہے) یہ خدا مختلف شکلیں اور نام اختیار کرتا ہے۔ قرآن شریف نے کافروں سے خطاب کرتے ہوئے بار بار یہ بھی کہا ہے کہ جن خداؤں کو تم پوجتے ہو یہ تم نے خود گھڑے ہیں اور تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے ان کے نام بھی خود ہی رکھ لئے ہیں (مثلاً ایڈم اسمتھ' روسو' مارکس' نٹشے' "فرائڈ" برگساں' ڈی ایچ لارنس' سارتر اور کامیو نے) شروع سے آج تک سب کافروں کے رنگ برنگ فلسفوں کا بنیادی اصول یہی رہا ہے کہ نظام کائنات ہماری ہوا و ہوس کے مطابق نہیں چل رہا۔ اس لئے عبث اور لامعقول ہے۔ ہماری رائے کے مطابق چلنے لگے تو بامعنی معقول اور مربوط بن جائے گا۔ اس کے برخلاف قرآن شریف نے سورۃ الملک میں انسان کو ایک خاص مراقبے کی تعلیم دی ہے فرمایا ہے کہ ہماری بنائی ہوئی کائنات پر بار بار نظر ڈال کے دیکھو۔ اس میں تمہیں کوئی رخنہ نظر آتا ہے۔ جب بھی دیکھو گے تمہاری نگاہ درماندہ ہو کر لوٹ آئے گی۔ اس مراقبے کے بعد بھی آدمی میں بصیرت پیدا نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں۔ کان سن نہیں سکتے۔ دل سمجھ نہیں سکتا۔ چنانچہ کائنات کو عبث اور لامعقول بتانے والوں کے متعلق سورہ ص آیت ۲۷ میں فرمایا ہے۔

و ماخلقنا السماء و الارض و ما بینہما باطلا ‘ ذالک ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا من النار○

(ہم نے آسمان و زمین کو اور جو چیزیں ان کے درمیان موجود ہیں ان کو خالی از حکمت نہیں پیدا کیا۔ یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو کافر ہیں۔ سو کافروں کے لئے بڑی خرابی ہے۔ یعنی دوزخ (ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی)

یہ تصور ہر دینی روایت کا لازمی جز ہے۔ اور عیسائیت میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ کتاب مقدس میں آیا

اورنگ زیب قاسمی

ہے کہ خدا نے کائنات بنانے کے بعد اس پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ بہت اچھی ہے۔ اسی بات کو ازمنہ وسطیٰ کے عیسائی متصوفین یوں کہا کرتے تھے کہ ہماری دنیا ساری ممکن دنیاؤں میں بہترین ہے اور جو کچھ موجود ہے یا جو کچھ واقع ہوتا ہے اس کے مقاصد اور نتائج بہترین ہوتے ہیں۔ یہ مقولے آج کل اٹھارویں صدی کے رجائی فلسفیوں سے منسوب ہیں۔ خصوصاً لائب نزر سے لیکن لائب نزر نے اس حقیقت کو یہ معنی دے دیئے ہیں کہ موجودات اور وقوعات کے بہترین مقاصد اور نتائج انسانی عقل کی گرفت میں آسکتے ہیں۔ رجائی فلسفی اس اصول پر اس سختی سے عمل پیرا ہوئے کہ مضحکہ خیز بن گئے۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ زلزلے سے پرتگال کے لوگ تباہ ہوئے تو اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ارجنٹینا کے لوگ بچ گئے۔ اس لئے والٹیر جیسے عقل پرست نے اپنی کہانی "کاں دید" میں ان فلسفیوں کا مذاق اڑایا۔ روسو نے عقل کی مخالفت میں "فطرت" یعنی انسانی جذبہ اور جبلت کی پیروی کا اصول نکالا۔ اس کا خیال تھا کہ کائنات کے سارے تضاد جذبات کے ذریعے حل ہو سکتے ہیں۔ یہ دراصل مارٹن لوتھر اور پروٹسٹنٹ لوگوں کا مذہبی عقیدہ ہے۔ بودلیر کے زمانے تک یہ بھی پتہ چل گیا کہ زندگی اور کائنات کے تضادات جذبے کی مدد سے بھی دور نہیں ہوتے بلکہ جذبات ایک خوفناک جہنم پیدا کرتے ہیں۔ راں بو نے دعویٰ کیا کہ میں تو اسی جہنم میں اتروں گا اور اسی کو جنت میں تبدیل کروں گا۔ مگر اسی زمانے میں صنعتی نظام بھی زور پکڑ رہا تھا اور انسان کو مشین میں تبدیل کرتا چلا جارہا تھا۔ یہ رنگ بودلیئر جیسے شاعروں کے علاوہ مارکس نے بھی دیکھ لیا تھا اور اس نے ماحول اور زندگی کے مظاہر سے مشینی دور کے انسان کی بیگانگی پر پوری تجزیاتی ہمت صرف کی ہے۔

کامیو کے ناول میں انسان مشین بن چکا ہے۔ اب نہ تو اس کی عقل کام کرتی ہے نہ جذبات' البتہ انسانیت کی آخری نشانی جبلت رہ گئی ہے اور وہ بھی میکانکی طور پر عمل کرتی ہے جس میں نہ تو انسانی ارادے کو دخل ہے نہ اختیار کو۔ ناول کے مرکزی کردار سے ایک قتل سرزد ہوجاتا ہے کیونکہ دھوپ تیز ہے اور اس کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ یہ شخص بیزار اجنبی اور بیگانہ سہی لیکن دوسرے انسانوں کے درمیان رہنے پر مجبور ہے۔ یہ لوگ بھی اپنی میکانکی عادتوں کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہیں جنہیں معاشرتی' اخلاقی یا انسانی اقدار کہتے ہیں لہٰذا یہ لوگ قاتل کو جیل میں ڈال دیتے ہیں۔ قاتل مشین تو بن چکا ہے لیکن مرنے کو راضی نہیں۔ چھپکلی بھاگ گئی کٹی ہوئی دم ابھی پھڑک رہی ہے۔ صدیوں کے انسانی ترکے میں سے چند تصورات ابھی باقی ہیں جو قتل کرتے وقت تو اسے یاد نہیں آئے تھے لیکن اپنے اوپر مصیبت پڑی تو اس کی کھوپڑی میں کلبلانے لگے۔ مثلاً عقل' جذبہ' عدل' جیل کی کوٹھری میں اس پر یہ تجلی ہوتی ہے کہ زندگی اور کائنات نہ تو عقل کو تسکین دیتی ہے نہ جذبے کو خصوصاً انسانی تمناؤں کو تو ذرا بھی پورا نہیں کرتی۔ لہٰذا کائنات عبث اور باطل ہے۔

کامیو کے نزدیک یہی اصلی دانش مندی اور حکمت ہے۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ اس طرح تو ساری اقدار ہی ختم ہوجاتی ہیں اور زندہ رہنے کا جواز بھی باقی نہیں رہتا اس کے جواب میں کامیو نے کہا کہ کائنات کے عبث ہونے کا عرفان تو دانش مندی کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہاں سے آگے چل کر ہر فرد اپنے لئے ایک مثبت نظام زندگی تلاش کرسکتا ہے۔ چنانچہ اس ہدایت کے مطابق جن لوگوں نے سلوک کی راہ میں قدم بڑھایا ان میں سے بعض چرس پینے لگے بعض مینار پر چڑھ کے راہ گیروں پر گولیاں برسانے لگے اور بعض یہ خواب دیکھنے لگے کہ اگر ساری دنیا کا تیل اور معدنی ذخائر ہمارے قبضے میں آجائیں تو پھر راوی چین ہی چین

اورنگ زیب قاسمی

لکھتا ہے۔

یہ تو ہوئی مغرب کی دانش وری۔ جس سے پوری طرح واقف ہونے کے لئے اس ناول کا نہ صرف پڑھنا بلکہ اس کے رموز کو اچھی طرح سمجھنا لازمی ہے۔ دانش وری کی یہ صنف کوئی چار سو سال پہلے شروع ہوئی ہے۔ گو انگریزی شاعر پوپ نے تو چودھویں صدی کے آخر میں ہی اعلان کردیا تھا کہ اب جہالت کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دانش وری کا نقطہ آغاز یہ اصول ہے کہ اپنی زندگی کی تنظیم کے لیے انسان وحی کی رہنمائی سے آزاد ہوکر اپنے لئے اقدار خود ہی پیدا کرسکتا ہے۔ چار سو سال کے عرصے میں ہم نے دیکھا کہ مغرب نے جو اقدار بھی پیدا کیں وہ ہوا و ہوس کا مظہر تھیں اور خود مغرب کے لیے تباہ کن ثابت ہوئیں۔ نظام کائنات کو اٹھارویں صدی والوں کی طرح معقول سمجھا جائے یا بیسویں صدی والوں کی طرح لامعقول نتیجہ واحد ہوگا۔

اس کے برخلاف وحی کی رہنمائی یہ ہے کہ اقدار وہی کارآمد ہوں گی جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے ذریعے قائم ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ کے احکام بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو تکوینی اور دوسرے تشریعی۔ فی الاصل دونوں قسم کے احکام کی مصلحت پوری طرح انسانی عقل کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ لیکن اسلام میں انسانی عقل کو دیس نکالا نہیں دیا گیا۔ امام غزالیؒ اور دوسرے مجتہدین کے نزدیک تشریع کے دائرے میں جو اصولی احکام ہیں ان کی مصلحت عقلی دلائل کے ذریعے ثابت کی جاسکتی ہے۔ البتہ جزئیات میں ایمان بالغیب ضروری ہے۔ تکوینی احکام کی مصلحت معلوم کرنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ بات تو وہی جان سکتا ہے جو کائنات کے ذرے ذرے سے اور اس کی ابتدا و انتہا دونوں سے واقف ہو اور یہ علم کلی صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ انسان **مکلف** ہے صرف **تشریعی** احکام پر عمل کرنے کا۔ تکوینی احکام میں دین دار انسان قضا و قدر کی موافقت کرتا ہے اسے عبث نہیں بتاتا۔ کافر قضا و قدر سے لڑتا ہے۔ اور دین و دنیا ہر جگہ خوار ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض دفعہ تکوینی احکام اور **تشریعی** احکام میں کھلا ہوا تضاد نظر آئے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے **تشریعی** حکم دیا کہ صرف میری عبادت کرو اور تکوینی طور پر مسلمان بھی پیدا کئے اور کافر بھی۔ پھر ہمیں یہ حکم بھی دیا کہ کفر اور کافر سے نفرت کرو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بے معنی اور عبث پیدا نہیں کی۔ ان احکام کا تضاد دور ہوتا ہے ایمان کے ذریعے۔ مغرب والوں کے نزدیک ایمان کا مطلب ہے۔ ایک جذباتی کیفیت جس کا عقل سے کوئی واسطہ نہیں۔ مغرب جب انسانی عقل کو چھوڑتا ہے تو نیچے حیوانی جبلت میں گرتا ہے۔ ہم انسانی عقل کو چھوڑتے ہیں تو اوپر اٹھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک عقل بھی دو قسم کی ہے۔ عقل معاش اور عقل معاد۔ قرآن شریف نے بتایا ہے کہ عقل معاد کا مقام ہے قلب (مغرب والوں کے نزدیک عقل بھی جبلت کی آلہ کار ہے اور قلب بھی جبلت کے مترادف ہے) اس عقل معاد کے ذریعہ اسلام ایمان اور احسان کی حقیقت حاصل ہوتی ہے عقل معاش یا نفس کی نظر سے دیکھا جائے تو کائنات عبث اور باطل معلوم ہوتی ہے۔ عقل معاد کی نظر سے دیکھا جائے تو کائنات کا حق ہونا ظاہر ہوجاتا ہے کیونکہ کائنات کا بنانے والا موجود حق ہے۔

کائنات کو عبث سمجھنے سے کیسی زندگی پیدا ہوتی ہے وہ تو ہم اوپر دیکھ ہی چکے ہیں۔ زندگی کو حقیقی معنوں میں مربوط بنانے کا نسخہ کیمیا ہمیں قرآن شریف نے دیا۔ سورہ آل عمران میں ایک طویل دعا آئی ہے جس کے مختلف اجزا کو رسول اللہ ﷺ [illegible] اور خلفائے راشدین نے اپنے لئے خاص کر لیا تھا۔ رسول اللہ [illegible]

کی خاص دعا مرتبہ شہود میں یہ تھی۔

ربنا ما خلقت هذا باطلا سبحنك فقنا عذاب النار ○

(اے ہمارے رب! تو نے یہ عبث نہیں پیدا کیا۔ تو پاک ہے پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔)

یعنی اللہ تعالیٰ کو ہر نقص سے پاک سمجھنے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کی بنائی ہوئی کائنات کو عبث نہ کہا جائے اور ایسے باطل عقائد کی پیدائش سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مقام خوف میں فرمایا کرتے تھے۔

ربنا انك من تدخل النار فقد اخزيته وما للظلمين من انصار ○

(اے ہمارے رب! تو جسے دوزخ میں ڈالے تو ضرور اسے رسوا کر دیا اور سیاہ کاروں کا کوئی ساتھی نہیں۔)

یہاں ان لوگوں کا عبرت ناک انجام بیان ہوا جو کائنات کو عبث کہہ کر اللہ تعالیٰ کی سبحانیت سے انکار کرتے ہیں۔ ایسے انجام سے بچنے کے لئے انبیاء علیہ السلام کی پیروی اور متابعت ضروری ہے لہٰذا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مقام تصدیق میں یہ دعا مانگتے تھے۔

ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان امنوا بربکم فامنا ○

(اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو ایمان کے لئے پکارتے ہوئے سنا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ' سو ہم ایمان لے آئے۔)

اس کے بعد ضرورت ہوتی ہے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور اپنی غلطیوں کی معافی چاہنے کی۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مقام انابت میں فرمایا کرتے تھے۔

ربنا فاغفر لنا ذنوبنا و کفر عنا سیاتنا وتوفنا مع الابرار ○

(اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے اتار دے اور ہمارا نیکوں کے ساتھ خاتمہ کر۔)

اس کے ساتھ یہ بھی لازمی ہے کہ آدمی اپنے اعمال اور عبادات کو قبولیت کی امید رکھے کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایمان خوف اور امید کے درمیان ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ مقام رجا میں فرماتے تھے۔

ربنا واتنا ما وعدتنا علی رسلک ولا تخزنا یوم القیمۃ انک لا تخلف المیعاد ○

(اے ہمارے رب! اور ہمیں دے جو اپنے رسولوں کی معرفت تو نے ہم سے وعدہ کیا۔ اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر تو وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔)

امید میں بھی انبیاء علیہ السلام کا دامن نہیں چھوٹا۔ تمنا بھی اس چیز کی نہیں کی جو نفس نے چاہی' بلکہ ان چیزوں کی جن کا وعدہ خود اللہ نے رسولوں کی معرفت کیا ہے اور امید ہے بھی تو اپنی لیاقت کے بھروسے پر نہیں بلکہ اللہ کی رحمت سے۔ غرض اپنے نفس کو پوری طرح اللہ تعالیٰ کے ارشادات اور اس کے رسولوں کے فرمودات کے تابع کر دیا۔ یہ ہوئی مربوط زندگی جس میں اجنبیت اور بیگانگی کا نام و نشان تک نہ رہا۔ جیسا حضرت شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا ہے اکیلا تو وہ ہوتا ہے جو اللہ سے غافل ہو۔ جب نفس کی ایک ایک خواہش اور حرکت وحی کی تابع ہو گئی تو نفس ہی فنا ہو گیا۔ اب کون یگانہ رہا اور کون بیگانہ' سب حق ہی حق ہو

اورنگ زیب قاسمی

گیا۔

تو مغرب کی دانشمندی ہمیں کیا سکھائے گی۔ بے چاری تنگی کیا نبائے گی' کیا چھوڑے گی لیکن مغرب کے ہاتھوں میں ہائیڈروجن بم بھی ہے۔ ہمیں دیکھتے رہنا چاہیے کہ یہ ہاتھ کس وقت کس طرح عمل کرتے ہیں۔ اپنی حفاظت کے لئے آپ کا سیوکلیہ ناول ضرور پڑھیے۔ کامیوکی کتابوں کے ایرانی مترجم جلال آل احمد نے تو اپنے طویل مضمون غرب زدگی میں اس ناول کو " غیرارادی بعنوان ایک شرقی بلکہ درست بعنوان یک مسلمان صدر اسلام کہ بوی آسانی معتقد بود " پڑھا ہے۔ اور اس کتاب میں قیامت کی علامتیں اور آثار پائے ہیں اور اپنے مضمون کو اس طرح ختم کیا ہے۔

بہمیں مناسبت قلم خودرا ایں آیہ تطہیر؟ کنم کہ فرمود ..... اقتربت الساعۃ وانشق القمر ○

("دریافت" کراچی)

احتشام حسین اور پلیخانوف

(چند اشارے)

اورنگ زیب قاسمی

اس موضوع پر ان مختصر شذرات کے جو چند محرکات ہیں ان کا بطور اختصار ذکر کر دینا ناگزیر ہے تاکہ احتشام حسین اور پلیخانوف کے خیالات اور نظریات کے تعلق کا ایک ہلکا سا خاکہ سامنے آجائے اور ہماری گفتگو تمہید قائم ہو سکے۔

اولاً ۔ ۔ ۔ پروفیسر ممتاز حسین مرحوم کا ایک توسیعی خطبہ جس کا عنوان تھا مارکسی جمالیات۔

ثانیاً ۔ ۔ ۔ پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا ایک مقالہ جس میں احتشام حسین کے تصور جمالیات کو مارکس اور پلیخانوف کے حوالوں سے سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی گئی ہے اگرچہ اس سے کچھ اختلافی پہلو نکلتے ہیں۔

ثالثاً ۔ ۔ ۔ ان تمام مارکسی نقادوں کے مقالات اور مضامین جنہوں نے مارکس کے مادی جدلیاتی نظریات کی تفہیم کے لئے پلیخانوف حوالے استعمال کئے ہیں۔

رابعاً ۔ ۔ ۔ لینن کا یہ مقولہ کہ آپ صحیح معنوں میں ایک باشعور کمیونسٹ نہیں بن سکتے جب تک آپ پلیخانوف کی تمام فلسفیانہ تحریروں کا مطالعہ نہیں کر لیتے ' میری مراد گہرا مطالعہ ہے کیونکہ تمام دنیا میں مارکسزم پر اس سے بہتر تحریر نہیں لکھی گئی۔

خامساً ۔ ۔ ۔ روس کی موجودہ صورت حال ' اٹھارویں صدی کا فرانسیسی نظریہ مادیت فرانس کے مورخین اور ان کے تجربے سوشلزم اور آئیڈلسٹ ' جرمن فلسفے کی مثالیت پسندی اور اصل مادی جدلیاتی نظریات بحوالہ پلیخانوف۔

یہاں جواب آں غزل کے طور پر یہ شذرات نہیں لکھے جارہے ہیں بلکہ مارکس کے ایک سمجھدار شارح اور مفسر اور اردو کے ایک بڑے مارکسی نقاد کے مابین تفکر کے اشتراک کی تفہیم کی خاطر اپنی کم مایہ اور طالب علمانہ کوشش کا اجرا مقصود ہے خصوصاً اس لئے بھی کہ کارل مارکس کی انقلابی تعلیمات کو روسی معاشرے میں پلیخانوف نے جس طرح متعارف کرایا اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے ۔ مارکس کے نظریات کو ہمارے برصغیر کے معاشرے میں سجاد ظہیر ' ڈاکٹر عبدالعلیم اور ملک راج آنند ' وغیرہ نے عام کیا۔ نقادوں میں اختر حسین رائے پوری ' مجنوں گور کھپوری اور احتشام حسین کے بعد ممتاز حسین ' ڈاکٹر محمد حسن ' ڈاکٹر قمر رئیس ' ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور ڈاکٹر شارب ردولوی وغیرہ نے بھرپور طریقے سے استعمال کیا اور غالباً ان تمام نقادوں نے کم و بیش پلیخانوف سے بھی استفادہ کیا۔ یاد رہے کہ پلیخانوف محض مفسر نہیں بلکہ مارکسیت کے

فلسفہ عمرانیات ' سیاسی اقتصادیات ' مادی جدلیات مارکسی نظریہ جمالیات وغیرہ کا بہترین شارح بھی ہے۔

ممکن ہے کہ پلیخانوف اور احتشام کے مابین فکری اور نظریاتی اشتراک اور اختلاف کو کسی ایک مختصری نشست میں دریافت کرنا ممکن نہ ہو سکے کہ دونوں کے مختلف امہات ہمہ گیر موضوعات ایک مبسوط مقالے یا چند مختلف کتابوں کے متقاضی ہیں جنہیں غالباً تحریر کرنے کی شاید اس کمترین کو توفیق نصیب ہو سکے لیکن کوشش یہ ہو گی کہ چند اشارے ضرور مرتب ہو جائیں تاکہ ایک لائحہ عمل سامنے آجائے خصوصاً اس لئے بھی کہ پلیخانوف کے پیش نظر فرانس ' جرمنی انگلستان اور روس کے معاشرے تھے جبکہ احتشام حسین نے خصوصی طور پر برصغیر کے معاشرے اور تاریخ کو ملحوظ رکھ کر اور مادی جدلیات کے مارکسی اصولوں کو سامنے رکھ کر معروضی تجزیے کئے اور بعض ایسے نتائج کا استنباط کیا جو معتبر بنے اور متنازعہ بھی۔

بدقسمتی سے احتشام حسین نے مارکسی نظریات پر مبنی کوئی باقاعدہ اور باضابطہ ایسی کتاب نہیں لکھی جو اس فن میں مددگار ہو سکتی صرف ان کے متفرق مضامین ہی سے ان کے نظریات کا استنباط کیا گیا ہے ان کی بیس بائیس کتابوں میں مختلف النوع ادبی ثقافتی تہذیبی اور لسانی موضوعات پر مضامین بکھرے ہوئے ہیں دوسرے لفظوں میں علمی تنقید سے نظری تنقید مستنبط ہے اور ظاہر ہے کہ تمام کتابوں کے تمام مضامین کا احاطہ اور ان سے مارکس ' انگلز کے نظریات کا پلیخانوف سے تعلق ممکن نہیں ہے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر احتشام حسین کی صرف دو کتابیں ملحوظ رکھ کر (یعنی ادب اور سماج اور ذوق ادب اور شعور) جو نتائج نکالے جائیں گے وہ شاید معروضی بن سکیں کہ میری ناچیز رائے میں یہی دونوں کتابیں زیادہ معتبر اور موقر ہیں۔

ادب اور سماج میں احتشام حسین نے ادب کے سماجی رشتوں کا تعین کیا ہے اور ادب برائے ادب کے فرسودہ مہمل اور ازکار رفتہ نظریے کو پوری طاقت اور توانائی کے ساتھ رد کیا ہے آج تو ادب برائے زندگی کا نظریہ عام ہے لیکن حالی اور آزاد کے زمانے سے لے کر ترقی پسند تحریک تک اس سلسلے میں جو کاوشیں ہوئیں وہ تاریخ ادب کا بیش قیمت حصہ ہیں ترقی پسند نقادوں نے اس نظریے کے قیام میں عموماً اور احتشام حسین نے خصوصاً بڑی کدوکاوش سے کام لیا کہ تاریخ کے مادی جدلیاتی تجزیے سے کام لے کر اردو ادب کے قارئین کی تربیت و تہذیب کی ' ادب اور سماج کے اکثر مضامین میں جو موقف اختیار کیا گیا ہے وہ نہایت واضح ' غیر مبہم اور مدلل انداز میں تاریخی جمالیاتی ' معاشرتی ' عمرانی ' ثقافتی ' تہذیبی ' لسانی اور معاشی محرکات اور عوامل کے معروضی اور سائنٹیفک تجزیوں پر مبنی ہے جس سے مارکسی نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اختر حسین رائے پوری مجنوں گورکھپوری اور پروفیسر عبدالعلیم وغیرہ احتشام حسین کے پیش رو تھے اور اسی زمانے میں ڈاکٹر عبادت اور ان کے بعد ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ ترقی پسند ادب کی تحریک میں شامل ہو رہے تھے لیکن احتشام حسین محض ترقی پسند نہیں بلکہ مارکسی ترقی پسند نقاد تھے اور غالباً اپنے پیش روؤں اور جانشینوں میں سب سے زیادہ واضح اور غیر مبہم مارکسی نظریات کی ترویج و اشاعت ادبی اور علمی لحاظ سے کر رہے تھے۔ احتشام حسین کے بعض معاصرین کے مبلغ علم میں کلام نہیں لیکن مارکسی نظریات کی تفہیم اور ان کے اسلوب بیان میں کلام ضرور ہے کہ اس میں ژولیدگی اور ابہام پایا جاتا ہے مارکسی نظریہ مادی جدلیات کی تفہیم کا احتشام حسین کی تحریروں میں بتدریج ارتقاء ملتا ہے۔ ذوق ادب اور شعور میں ایک مضمون ہے " غالب کا تفکر " اس مضمون میں احتشام حسین نے غالب کے ذہنی افق کے تعین میں تاریخی حالات کا جو معروضی جائزہ پیش کیا ہے

وہ مارکس کے مادی جدلیات کے فلسفہ و فکر کی بہترین تفسیر ہے اور یہاں تاریخیت یا روح عصر اور Historicity کے علم سے وہی کام لیا گیا ہے جو خاص پلیخانوف سے تعلق رکھتا ہے مغلوں کے فرسودہ اور ازکار رفتہ جاگیردارانہ نظام کا معروضی تجزیہ کیا ہے ایسٹ انڈیا کمپنی نے جس استعماری تجارتی لیکن صنعتی نظام کی کلکتے کے معاشرے میں داغ بیل ڈالی تھی اور اس کے جلو میں جو زرعی معاشرہ رفتہ رفتہ مشینی اور صنعتی زندگی میں ڈھل رہا تھا اور جس کے سبب اجتماعی زندگی کی رفتار تیز ہو رہی تھی اس نے کلکتے کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی غالب کا ذہنی افق اسی کلکتے کو دیکھ کر وسیع ہوا تھا۔ احتشام حسین نے برصغیر کی تاریخ کو عام مورخ کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور عام مورخین کی طرح سلاطین کے کارناموں یا نام نہاد کارناموں کو مطلقاً" اہمیت نہیں دی بلکہ عوامی معاشرے کے دروبست پر تجزیاتی نگاہ ڈالی۔ ان کی تحریکوں' ان کے جذبوں اور ان کے جذبات و احساسات اور نظریات کو کھنگال کر مادی جدلیاتی روح کو گرفت میں لیا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ غالب کا ذہنی افق کیونکر اور کیسے اور کن اسباب کے تحت وسیع ہوا۔ برصغیر میں بھی ایسے نام نہاد مفکر موجود تھے جو ہیگل کی طرح مادے پر شعور کو غالب سمجھتے تھے اور ان کی تحریروں سے جو اشتباہ پیدا ہوا تھا اس سے اہل دانش کا ایک کارواں صحیح ڈگر سے بھٹک چکا تھا۔ احتشام حسین نے اس غلط فہمی کو دور کیا اور واضح کیا کہ مارکسی نقطۂ نظریہ ہے اور درست ہے کہ شعور پر مادہ غالب ہے چنانچہ غالب کے ذہنی افق کی توسیع میں جو مادی اسباب و علل معین و مددگار ہوئے وہ یہ تھے کہ مغلوں کے فرسودہ محول اور ازکار رفتہ جاگیردارانہ نظام کا حامل شہر دہلی اور ان کے اسی نظام کے تحت قائم ہونے والی اجتماعی زندگی کا زرعی معاشرہ کلکتے کے لئے تجارتی اور صنعتی معاشرے کے مقابلے میں کہنہ' خستہ' پرانا اور بے کار ہو چکا تھا کلکتے کی صنعتی زندگی کی رفتار تیز تھی اس میں زندگی زیادہ آزاد متحرک فعال اور تیز رفتار تھی اس میں چمک اور روشنی زیادہ تھی' دخانی کشتیاں بادبانی کشتیوں کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتاری سے تجارتی اجناس اور مسافروں کی نقل و حمل میں کام آتی تھیں۔ اونٹوں اور خچروں پر بار برداری کے مقابل ٹریک بچھا کر جو ٹرالیاں چلائی جاری تھیں ان سے اجتماعی زندگی میں سرعت اور خوبصورتی پیدا ہو رہی تھی سڑکیں کشادہ' مکانات ہوادار بن رہے تھے۔ باغات کی جگہ کھلے ہوئے پارک وجود میں آتے جارہے تھے اور بقول غالب وکٹوریہ گاڑیوں پر میمیں سیر کرتی پھرتی تھیں۔ وہ کسان جو جاگیردارانہ نظام میں جاگیردار کا کوڑیا غلام تھا' بلکہ اس کی آل اولاد تک غلام ابن غلام چلی آتی تھی' اسے آزادی کی کھلی فضا نصیب ہوئی اور اس نے روپے پیسے کی شکل دیکھی اور اسے خرچ کرنے کی عملی آزادی حاصل کی کہ اسے فیکٹری میں یومیہ مزدوری پر ملازمت مل گئی۔ جاگیردارانہ نظام کی چکی میں جب وہ پس رہا تھا تو اسے موٹے جھوٹے کی روٹی کے سوا اور کچھ میسر نہ آتا تھا' جنگ کی صورت میں تلوار یا نیزا اٹھا کر اور جاگیردار کی فوج میں شامل ہو کر محاذ پر پہنچ جاتا تھا اور جاگیردار کے لئے کٹ مرتا تھا' استحصال اس کا اس نظام میں بھی ہوتا تھا اور استعماری نظام میں بھی جاری تھا۔ لیکن اس کی حالت اس نظام میں قدرے بہتر تھی۔ اسی مقام پر دونوں معاشروں کے موازنے سے صورت حال واضح ہوتی ہے۔

احتشام حسین نے مارکسی نظریہ مادی جدلیت کے مفسر پلیخانوف کے ان تجزیوں کو ملحوظ رکھا جو اس نے فرانس' جرمنی' انگلستان اور روس کے زرعی معاشروں کو صنعتی معاشروں میں تبدیل ہوتے وقت کئے تھے غالباً" یہی وجہ ہے کہ لینن نے شروع شروع میں پلیخانوف کے بعض نظریات سے اختلاف کیا تھا لیکن جب

اورنگ زیب قاسمی

روسی زرعی معاشرے کو عملاً" صنعتی معاشرے میں تبدیل ہوتے ہوئے اور بعض حقائق سے عملاً" دوچار ہوتے ہوئے لینن نے مشاہدہ کیا' اسے جب پلیخانوف کے مارکسی نظریات کی تفسیر کی افادیت نظر آئی تو اس نے برملا کہا کہ آپ جب تک پلیخانوف کی تمام فلسفیانہ تحریروں کا مطالعہ نہیں کر لیتے آپ صحیح مارکسی نہیں بن سکتے۔

مجھے احساس ہے کہ نئے روس میں لینن کا بت گرایا جاچکا ہے لیکن مجھے یہ بھی احساس ہے کہ نئے روس کے لیڈر یلسن اب دوسری دنیا کے بجائے تیسری دنیا کی صف میں نظر آرہے ہیں اور کاسۂ گدائی ان کے ہاتھ میں ہے اور یورپ کا سرمایہ داران کا ان داتا بنا ہوا ہے یعنی سوشلزم جو ایک سائنس ہے اس کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ نظام اس لئے کامیاب نہیں ہو سکا کہ اس کی بنیاد اور اساس استحصال پر ہے دوسرے لفظوں میں روس کی شکست وریخت نظریے کی ناکامی نہیں بلکہ اس انتظامیہ کی ناکامی ہے جو اسے چلا رہی تھی لہٰذا نہ تو مارکسی نظریات کی شکست ہوئی ہے اور نہ پلیخانوف اور احتشام حسین فرسودہ ہوئے ہیں بلکہ وہ تیسری دنیا جو خود پہلی دنیا یعنی امریکہ کے (Slums) سطح تک پھیلی ہوئی ہے اور اس کا بھی استحصال سرمایہ دار اسی طرح کر رہا ہے اس لئے پہلے سے کہیں زیادہ مادی جدلیت کے نظریے کی افادیت بڑھ چکی ہے دوسری بات یہ ہے کہ اس نظام سرمایہ داری کی کوئی سائنس نہیں ہے بلکہ سرمایہ داری بجائے خود اندھا نظام ہے جو بہرحال اور بہرصورت اپنے مفادات کے تحفظ کی اساس ہر زمانے اور ہر معاشرے میں استحصال پر قائم رکھتا ہے' جو فرد کا اور معاشرے دونوں کا استحصال کرتا ہے مارکس اینگلز پلیخانوف اور احتشام حسین ہر قسم کے استحصال کے خلاف ہیں۔ چنانچہ جب اس جملہ معترضہ سے قطع نظر کرکے فرانس اور جرمنی کے ان ارباب دانش کے نظریات پر پلیخانوف نے توجہ دی جو مارکس اور اینگلز کے مادی جدلیات کے غلط نظریات کی غلط توضیح اور تشریح کر رہے تھے اور مثالیت پسندی اور آئیڈیل ازم کو مارکسزم قرار دے رہے تھے پلیخانوف نے اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہوئے ان کی تصحیح کی۔ احتشام حسین کو بھی بعض ایسے ہی ترقی پسندوں سے واسطہ پڑا تو انہوں نے نہایت نرمی' علمی اور بردباری سے ان کی تصحیح کی اور ایک ایسا خط فاصل قائم کیا جو ترقی پسندوں اور مارکسی ترقی پسندوں کے مابین آج تک قائم ہے کیونکہ ہمارے بعض نام نہاد ترقی پسند مابعد الطبیعیات کے موضوعات' میں جذبے' خیال اور وجدان کی ماورایت میں خود بھی گم ہو جاتے ہیں اور اپنے قارئین کو بھی گم کرکے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بدستور ترقی پسند ہیں حالانکہ تفکر و تعقل کی ارضیت سے ان کے پاؤں اکھڑ چکے ہوتے ہیں' منطقی استدلال سے ان کا ناطہ ٹوٹ چکا ہوتا ہے' معروضیت سے وہ دست کش ہو چکے ہوتے ہیں مادی جدلیات اور تاریخی ارتقاء کو وہ چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں پلیخانوف اور احتشام حسین کے فکری اور تشریحی ڈانڈے مل جاتے ہیں کیونکہ دونوں بہرحال طین Taine کے تثلیث' وقت' زمانے اور سماج کے بنیادی نظریے کو تاریخ کے مادی تصور کے ارتقاء کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں۔

احتشام حسین نے اردو ادب کے جملہ اصناف کے تخلیقی پس منظر کو ملحوظ رکھ کر جو تجزیے پیش کئے وہ ان کے محاکمے نہیں ہیں لیکن ہر تجزیہ بجائے خود اس لئے مکمل مفصل اور وقیع ہے کہ اپنے معاشرتی' تاریخی اور معاشی سیاق وسباق سے پیوستہ ہے۔ اس میں ماضی کا شعور' حال کا ادراک اور مستقبل کی طرف ایک واضح اور بلیغ اشارہ موجود ہے شاید اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس میں احتشام حسین کا وسیع علم اور ان کی بصیرت موجود ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ احتشام حسین نے سائنٹفک' معروضی اور مادی جدلیت پر عملی تجزیے کئے

ہیں۔ احتشام حسین کی تحریروں میں معروضیت اس درجہ غالب ہے کہ واحد متکلم ان کے مضامین میں مشکل سے نظر آتا ہے ان کی تحریروں میں ژولیدہ بیانی اس لئے نہیں ہے کہ ان کا ذہن واضح، ان کے نظریات غیر مبہم اور ان کے خوبصورت فقرے مربوط، مرتب اور منظم ہوتے ہیں۔ جن مارکسی نقادوں کی تحریروں میں واحد متکلم کا بکثرت استعمال ہوتا ہے ان کے خیالات اور نظریات اکثر پیچیدہ اور ان کا اسلوب بیان ژولیدہ ہوتا ہے
احتشام حسین کے فن میں تنقید نہ محض تنقیص ہے اور نہ محض تحسین بلکہ اس کا دوسرا نام علمی ادبی سطح پر تحسین کے بجائے تفہیم ہے کہ جس کا فکر اور عقل سے تعلق ہوتا ہے بعض نقادوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ وہ نظام تفکر و تعقل وضع کر رکھا ہے اور اپنی علیحدہ لوح استبداد بھی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی لوحستائی ڈنکیاڈنڈ کوئی اور لکھے گا۔ احتشام حسین نے ایسا کوئی پیچ و خم نہیں بنایا بلکہ سچ پوچھیے تو وہ عام قاری کے ذہن کی سطح تک خود پہنچ کر ایک افہام و تفہیم کا رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔ ۱۹۳۲ء سے لے کر تادم واپسیں ان کی ہر تحریر اس نہج پر قائم ہے جس کا سبب غالباً" یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذہن کی تربیت و تہذیب خود کی اور مارکسی فکر کے بنیادی نظریات اور مادی جدلیات کے مسائل کے تعین میں پلیخانوف جیسے مفسروں سے، جو خود بے حد واضح ہیں، مدد لی۔

("ارتقا" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

ضمیر علی بدایونی

میر تقی میر اور رولاں بارت عالم کثرت میں

سامیر کے نزدیک زبان سے باہر صرف شور ہے اور رولاں بارت کہتا ہے کہ متن میں شور کے علاوہ کچھ نہیں اور میر تقی میر کہتے ہیں۔

جہاں سے دیکھئے اک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہرجا میرے دیواں میں

میر کے نزدیک بھی شور متن کے اندر موجود ہے جسے وہ دیوان کا نام دیتا ہے اور یہ شور بھی قیامت کے شور کی مانند ہے دیوان کا لفظ بھی قیامت کی مناسبت سے استعمال کیا گیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

اپنے شہید ناز سے بس ہاتھ اٹھا کہ پھر
دیوان حشر میں اسے لایا نہ جائے گا

دیوان کی ذو معنویت سے میر نے فائدہ اٹھایا ہے یعنی دیوان، معنی عدالت یا دفتر اور دیوان، معنی بیاض اشعار یا مجموعہ کلام یا اس لحاظ سے دیکھا جائے۔ تو شعر کی تکثیر معنویت اس طرح متعین ہوتی ہے جس طرح قیامت میں ہر طرف ایک ہنگامہ بپا ہوگا۔ اسی طرح دیوان میں بھی شاعری کی شورانگیزی نے ایک ہنگامہ بپا کیا ہوا ہے جو شور قیامت سے کسی طرح کم نہیں۔ اس شعر میں میر نے اظہار کی ایمائیت اشاراتی فضا قائم کی ہے۔ یعنی میرے ہر شعر میں ایک جہان معنی آباد ہے۔ آوازوں کا ایک حشر بپا ہے چیزیں نابود بھی ہو رہی ہیں اور دوبارہ بھی پیدا ہو رہی ہیں۔ معانی کا ایک سیلاب بہہ رہا ہے۔ مختصر یہ کہ میرا ہر شعر شور انگیز اور قیامت خیز ہے اور بقول رولاں بارت ہر شعر میں عالم کثرت کی جلوہ آرائی اور شور کی فرمانروائی ہے جسے شاعر بھی ختم کرنے پر قادر نہیں۔

آج رہتی نہیں خامہ کی زباں رکھیے معاف
حرف کا طول جو مجھ سے بھی گھٹایا نہ گیا

یعنی حرف و سخن سے جو معنی کی کثرت پیدا ہوتی ہے اسے مصنف کی ذات بھی روک نہیں سکتی۔ حشر تک باقی رہنا اس کا مقدر بن چکا ہے۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

یعنی میری شاعری سے ایک سیل معنی ہر لحظہ بہہ رہا ہے جو قیامت تک بہتا رہے گا اور کوئی قوت سیل

معانی کے بہاؤ پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا

حشر تک دیوان اسی صورت میں باقی رہ سکتا ہے جب ہر عہد اور ہر قاری کی حظ اندوزی اور معنی آفرینی کے امکانات سے شاعری کا ظرف لبریز ہو ۔ میر کا دعویٰ ہے کہ میرا ہر شعر تعبیر و توضیح کے بے شمار امکانات اپنے اندر رکھتا ہے میرے اشعار کی کثیر المعنویت نے جو دھوم مچائی ہے اس کا چرچا قیامت تک ہوتا رہے گا لوگ اس سے لذت اندوز اور تعبیر کی نقش آرائی کرتے رہیں گے۔ شور دراصل معنویت (Signification) کا شور ہے۔ اشعار کی معنی خیزی انہیں تاحشر قائم رکھے گی۔ میر اپنے اشعار کی معنی آفرینی اور تہ داری کی طرف بار بار اشارہ کرتا ہے۔

تیرے بالوں کے وصف میں میرے
شعر سب پیچ دار ہوتے ہیں

بار بار اپنی شاعری کی کثیر الجہتی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

ہر ورق ہر صفحے میں اک شعر شور انگیز ہے
عرصۂ محشر ہے عرصہ میرے بھی دیوان کا

اس شعر میں میر نے اپنے فن کی زمانی و مکانی جہات کو یکجا کر دیا ہے ۔ زمان و مکاں کی وحدت کے شعور سے اپنے فن کو ایک عالم بنا دیا ہے جسے ہیڈیگر World کا نام دیتا ہے۔ وقت اور مکان Time and Space اس عالم میں موجود ہیں۔ عالم وقت اور مکاں میں موجود نہیں اور انسان عالم آفرینی کے عمل میں گرفتار ہے فن کی دنیا گویا ایک عالم کی تخلیق ہے انسان کا فطرت پر تصرف و اختیار اپنی دنیا آپ تخلیق کرنے میں مضمر ہے میر نے قیامت اور حشر کے استعارے یا تشبیہات غیر شعوری طور پر استعمال نہیں کئے ہیں ۔ قیامت اور حشر میں جس طرح موجودات دوبارہ زندہ ہو جائیں گی ۔ اسی طرح میر کے دیوان میں بھی فطرت اور انسانی فطرت دوبارہ جی اٹھتی ہے یہ وہی نکتہ ہے جس کی جانب کافکا نے اشارہ کیا تھا کہ " فن ایک ایسی آگ ہے جس میں اشیاء جل کر دوبارہ پیدا ہو جاتی ہیں ۔" گویا اپنی آئیڈیل فارم میں نمودار ہو جاتی ہیں میر نے ایک لفظ دیوان میں یہ سارے مفاہیم پوشیدہ رکھے ہیں ۔ بار بار اپنے دیوان کو دیوان حشر کا نام دیتا ہے۔

کرتے ہیں باتیں کس کس ہنگامے کی یہ زاہد
دیوان حشر گویا دیوان ہے ہمارا

میر کا دعویٰ بجا ہے ۔ ان کے سخن کا شور ' قیامت سے ہم آواز ہو جاتا ہے ان کے اشعار کے مفاہیم بہت آگے تک پھیلے ہوئے ہیں وقت اور مقام دونوں کی قید سے آزادانہ طور پر آگے بڑھ رہے ہیں اور پوری تہذیبی دنیا کو تسخیر کر رہے ہیں۔

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

میر کی شعری کائنات وسعت پذیر ہے ۔ اس کا انداز گفتگو ہر عہد کے طرز فکر و احساس

اورنگ زیب قاسمی

(Sensibility) کے لئے سامان دلکشی رکھتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم نئے تناظر یعنی پس جدید ثقافت (Post Modern Culture) کی عالمی اقدار کی روشنی میں میر کی شاعری کی صوری و معنوی امکانات کا جائزہ لیں۔

ٹی ایس ایلیٹ نے بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ آج شیکسپیئر وہی ہے جو ہم اسے سمجھتے ہیں ۔ حدود امروز سے شیکسپیئر کی شاعری نہیں ' کوئی بھی فن پارہ قدم باہر نہیں نکال سکتا۔ آنے والا عہد جب بھی نمودار ہوگا امروز کے افق پر نمودار ہوگا تو آئیے دیکھتے ہیں کہ Paradigm میں شعر شور انگیز کی معنویت کیا رخ اختیار کرتی ہے۔

شعر شور انگیز میں کلیدی لفظ شور ہے جس کے متعلق برصغیر کے ممتاز نقاد و شاعر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب رقمطراز ہیں۔

" میر نے شاعری کے بارے میں خصوصاً شور اور شور انگیزی اور با آواز بلند قرات کا ذکر اس کثرت سے کیا ہے کہ یہ نتیجہ نکالے بغیر چارہ نہیں کہ شعر کے آہنگ کے سلسلے میں یہ باتیں میر کے یہاں مرکزی اہمیت بھی رکھتی ہیں۔"

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے میر کی شاعری کو جس زاویہ نظر سے دیکھا ہے اور جس عرق ریزی سے کام لیا ہے اس کی داد نہ دینا قرین انصاف نہیں ۔ انہوں نے اپنی جگہ ایک قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ لیکن لفظ شور صرف بلند آہنگی کی جانب اشارہ کرتا ہے اسے قبول کرنے میں البتہ کلام ہے ۔ میر کے یہ اشعار ملاحظہ ہو۔

جہاں سے دیکھئے اک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہرجا میرے دیوان میں

ہر ورق ہر صفحے میں اک شعر شور انگیز ہے
عرصۂ محشر ہے عرصہ میرے بھی دیوان کا

فاروقی صاحب وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" یہاں شور انگیز بطور اصطلاح ہے ۔ لیکن " شور " کے لفظی معنی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میر نے دونوں شعروں میں قیامت کے ہنگامے کا ذکر کیا ہے۔ یہ ہنگامہ اس وجہ سے تو ہے ہی کہ شعر کو سن یا پڑھ کر سب سر دھن رہے ہیں لیکن یہ ہنگامہ اس وجہ سے بھی ہے کہ کلام کا آہنگ بلند اور گونجیلا ہے ملحوظ رہے کہ دونوں شعروں میں دیوان کے اندر قیامت کا ہنگامہ یا محشر کا عالم ہے ۔ یہ عالم دیوان کے باہر نہیں ہے ۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ گفتگو بنیادی طور پر کلام کے آہنگ کی ہو رہی ہے۔"

فاروقی صاحب کی اس وضاحت سے پوری طرح اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے تجزیاتی مطالعہ کے اس پہلو کی داخلی تصدیق میر کے دوسرے اشعار اور عمومی شعری رویے سے نہیں ہوتی اور میر کا یہ کلیدی استعارہ یعنی لفظ شور تحقیق مزید اور گہری توجہ کا طالب ہے۔

آئیے سب سے پہلے " شور " کے مفاہیم کو اپنی شعری روایت میں تلاش کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد یہ

دیکھتے ہیں کہ میر نے اس روایتی مفہوم سے کس حد تک انحراف کیا ہے اور موجودہ عہد میں اس کی معنویت کیا متعین ہوتی ہے۔

آیئے شعر حافظ سے آغاز کرتے ہیں۔

شمہ از داستان عشق شور انگیز ماست
ایں حکایت ہا کہ از فرہاد وشیریں کردہ اند

یہاں شور انگیزی سے مراد جنون خیزی ہے یعنی جنون خیز داستان عشق ۔ وہ داستان عشق جس سے ہنگامہ حیات برپا ہے۔ جس سے شورش و کیفیت پیدا ہے۔ عراقی کہتا ہے۔

عشق شورے در نہاد ما نہاد
جان ما در بوتہ سودا نہاد

یہاں بھی عشق شور انگیز ہے لیکن کیفیت بدلی ہوئی ہے تذکرہ دولت شاہ عراقی کے متعلق لکھتا ہے۔

عنان پر شور و عاشقانہ دارد' در وجد و حال بے نظیر عالم بودہ و موحدان و عارفان تحسین او را معتقدند

(بزم صوفیہ صفحہ ۱۴۹)

یہاں عشق کی شوریدہ سری وحدت الوجودی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ کیف و مستی اور وجد و حال عشق کی شور انگیزی کے مختلف مظاہر ہیں ۔ شور جو ہمارے وجود کا سرچشمہ بھی ہے اور وحدت الوجود کی ازلی و ابدی خاموشی سے ہم آہنگ بھی' جس کی غزالی مشہدی نے ترجمانی کی ہے۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

شور کے ساتھ عالم کثرت نمودار ہو جاتا ہے جس کی جانب غالب نے بھی اشارہ کیا تھا۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کردیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

شور کی قوت سے عالم خیالی وجود میں آجاتا ہے اور وحدت کا پردہ بن جاتا ہے۔ میر پہلے تو اس عالم کثرت کو اپنے روبرو دیکھتا ہے اور پھر مست مئے وحدت بن جاتا ہے۔

آؤ ساقی شراب نوش کریں
شور سا ہے جہاں میں گوش کریں

یہاں شور اور جہاں دونوں ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں یعنی عالم کثرت ' اس روشنی میں شعر کی معنویت دوسرا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

شعور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے عالم کثرت کا محتاج ہے لیکن وجدان میں محبوب واحد کی تڑپ ہے اور وہ عالم اشیاء یا عالم کثیر سے نجات چاہتا ہے تاکہ محبوب واحد تک رسائی ہو سکے۔ اس کے لئے سرمستی' کیف و جذب اور از خود رفتگی کی کیفیت چاہیے جو صرف عشق کی شراب کی بدولت حاصل کی جا سکتی ہے اس لئے شاعر مئے عشق کی مستی کا طالب ہوتا ہے جو اسے شور جہاں یعنی عالم کثرت سے نجات دلا سکتا ہے اور اس شور کے پیچھے جو وحدت ہے اس تک ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ محبوب حقیقی کی بزم سکوت ہی شاعری

اورنگ زیب قاسمی

منتہائے مقصود ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں خلوتی راز نہاں بن جاتا ہے۔

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

وہ پہلے تو اس عالم و مستی کا نظارہ کرتا ہے لیکن پھر عشق کی قوت سے اپنی ہستی کو گم کر کے اس عالم کا اور اس کیفیت کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

اس کیفیت کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں لیکن میر اس کا اظہار کرتا ہے اور اپنی گمشدگی کا اعلان کرتا ہے۔

جی اپنا میں نے تیرے لئے خوار ہو دیا
آخر کو جستجو نے تری مجھ کو کھو دیا

اب عالم کثرت معدوم ہو جاتا ہے اور وحدت کا نقش قائم ہو جاتا ہے۔

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

مقصود کی وحدت اور عالم کثرت میر کے تخلیقی وجدان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ یہی وہ کیفیت ہے جو میر کی شاعری کو گل ہزار رنگ بنا دیتی ہے۔ اور کثرت میں جلوہ وحدت دیکھتی بھی ہے اور دکھاتی بھی ہے۔

اب کی چمن میں اور ہی لائی بہار رنگ
اک معنی شگفتہ کو باندھا ہزار رنگ

رولاں بارت سخت کافر تھا جس نے زندگی بھر عالم کثرت سے قدم باہر نہیں نکالا۔ وہ ادبی تخلیق کو کثرت کا مظہر سمجھتا تھا یہاں تک کہ اس نے متن سے بننے والی معنویت کو رنگوں کی بارش قرار دیا اور ادب کو وہ شور آفرینی کا فن قرار دیتا ہے لیکن یہ شور آفرینی (Art of Noise) کیا ہے رولاں بارت پھر ہمیں عالم کثرت کی طرف لے جاتا ہے جس طرح ایک جنگل میں بیک وقت کئی آوازیں پیدا ہو جائیں تو ایک شور کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے رولاں بارت اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے:

Literatures are in fact arts of Noise

یعنی سارا ادب فن شور انگیزی ہے۔ اپنے اس باریک نکتے کی توضیح کرتے ہوئے رولاں بارت لکھتا ہے:

Literatures are in fact arts of Noise.

"In relation to an ideally pure message (as in mathematics) the division reception constitutes a "noise" it makes communication obscure fallacious hazardous uncertain yet this noise this uncertainty are emitted by the discourse

with a view toward communcation : they are given to the reader so that he may feed on them what the reader reads in a counter communcation."

رولاں بارت کا یہ اقتباس اس کی مشہور کتاب باڑاک سے لیا گیا ہے یہ اقتباس کلیدی اہمیت کا حامل ہے اس اقتباس میں رولاں بارت کا پورا نظریہ ادب اجملا" موجود ہے۔

رولاں بارت ادبی و فنی تخلیق میں اصول وحدت کار فرما نہیں دیکھتا اس کے نزدیک متن ایک معشوق ہزار شیوہ اور گل ہزار رنگ ہے میرانیس نے دعویٰ کیا تھا کہ ایک رنگ کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں۔ لیکن رولاں بارت کے نزدیک ایسے کسی دعوے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ اس کے خیال میں متن میں پہلے ہی ہزاروں معنویتیں پوشیدہ ہیں ۔ نئے قاری آتے رہیں گے اور نئے معنویت سے بہرہ ور ہوتے رہیں گے ۔ متن اپنے وجود کا تار پود خود ہی بنتا ہے ۔ مصنف تو ایک قصہ پارینہ ہے اور شہر متن میں اس کی حیثیت ایک اجنبی اور ایک واہمے سے زیادہ نہیں۔ میر تقی میر بھی اس حقیقت کے رمزشناس ہیں لیکن کیفیت کچھ بدلی ہوئی ہے۔

مشہور ہیں عالم میں تو کیا' ہیں بھی کہیں ہم
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

میر کا کمال یہ ہے کہ وہ مست مئے وحدت ہونے کے باوجود عالم کثرت میں بھی قدم رکھتا ہے۔

سرولب جوالالہ وگل' نسرین وسمن' ہیں شگوفے بھی
دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا

متن کی کثرت آرائی رولاں بارت اور سخن کی تہہ داری میر کے حصے میں آئی۔

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر
کیا کیا کہا کریں ہیں زبان قلم سے ہم

میر کا طائر سخن کبھی کثرت سے وحدت کی جانب سفر کرتا ہے اور کبھی عالم وحدت سے دنیائے کثرت میں مقیم ہو جاتا ہے۔

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

یعنی ماورائے شعور اور ماورائے موجود روالگ ہستیاں بھی ہو سکتی ہیں اور واحد بھی یہی وہ مقام ہے جب میرا ایسا فنکار ہو جاتا ہے جو فانی انسان کی تقدیر ہے یعنی حقیقت اپنی کثیر الجہتی کے ساتھ ہمارے روبرو آجاتی ہے اور غیب و شعور کے دوراہے پر فنکار ایک گم کردہ منزل مسافر کی طرح کھڑا ہو جاتا ہے۔

از خویش رفتہ ہردم' فکر وصال میں ہوں
کتنا میں کھویا جاؤں یارب کہ تجھ کو پاؤں

کبھی وحدت کی بے رنگی اور کبھی کثرت کی رنگا رنگی دامن دل کو اپنی جانب کھینچتی ہے ۔ حقیقت کی اس دورنگی اور بے رنگی سے میر کا تار نظر ہمیشہ الجھتا رہا۔

دیبا چمن سے سادہ نکلا نہیں کوئی
رنگینی ایک اور خم و چم بہت ہے یاں

میر نے حقیقت کی دورنگی کو بنظر غائر شاعر دیکھا ہے لیکن اس متضاد کیفیات کی حامل دنیا میں وہ اپنا تراشہ وحدت نہیں بھولتا۔ یہ میر کا کمال فن ہے کہ وہ عالم کثرت ہی سے وحدت کے تار پود بنتا ہے۔
وہ حقیقت کی تضاد نمائی کو بھی فراموش نہیں کرتا۔ دیکھئے کس خوبصورتی سے عالم کثرت کا جال بنتا ہے۔ اور وحدت کی تمثل آرائی بھی کرتا ہے۔

دل نے ہم کو مثال آئینہ
ایک عالم کا روشناس کیا

آئینے کی فطرت عکاس اپنے لئے ایک عالم کثرت پیدا کر لیتی ہے لیکن اس کے باوجود صفائے آئینہ اور خلائے آئینہ باقی رہتا ہے ایک عالم سے روشناس ہونے کے باوجود آئینہ کی تمثالی زوال پذیر نہیں ہوتی۔ عارف کا دل بھی اس بے ہمہ اور باہمہ کیفیت سے ہردم دوچار رہتا ہے اور اظہار حیرت سے کبھی فارغ نہیں ہوتا۔

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

آئینے کی حیرت اپنے سواد نظر میں عالم کثیر کو اپنے روبرو پاتی ہے لیکن اس کے تجربے میں وحدت کے سوا کچھ نہیں۔

کچھ نہیں اور دیکھے ہیں کیا کیا
خواب کا سا ہے یاں کا عالم بھی

میر عالم کثرت میں پڑاؤ نہیں ڈالتا بلکہ مسلسل گرم سفر رہتا ہے۔

اے شمع اقامت کدہ اس بزم کو مت جان
روشن ہے ترے چہرے سے تو گرم سفر ہے

رولاں بارت متن سے باہر نہیں جھانکتا اس کی ساری کائنات متن کی اپنی دنیا ہے اس کے نزدیک عالم کثرت کا تجربہ متن کی ہزار رنگی ہے متن گویا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر قاری اپنی ہی تصویر دیکھتا ہے۔ متن کے فریم میں معنی کی جگہ خلا ہے جو ہر دیکھنے والا اپنے طور پر پر کرتا ہے جس طرح پیغام کی ترسیل میں شور سب سے بڑی رکاوٹ ہے اسی طرح ادب پارے میں ابہام اور ایہام یا لفظوں کا ہیر پھیر (Equivocation) معنی کے ابلاغ میں ایک مزاحمت یا ایک رکاوٹ ہے لفظ چکنے پتھروں کی طرح ہیں جن پر چل کر قاری پھسل جاتا ہے اور معنی کی جگہ رد معنی یا ابلاغ کی بجائے رد ابلاغ (Counter Communication) تک پہنچ جاتا ہے اور اس طرح مصنف کی ارادی معنویت زبان و بیان کی بھول'۔ بھلیوں میں گم ہو جاتی ہے معنی کا سفر مستقبل کی جانب ہے لیکن ہم اسے مصنف کی معنویت یا ماضی میں تلاش کرتے ہیں ۔ صورت حال یہ ہے کہ مصنف اپنی ارادی معنویت کو لفظوں میں کبھی منتقل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ الفاظ معروضی طور پر موجود ہیں ۔ قاری کی مخصوص داخلیت کے ساتھ مل کر وہ نئی ہستیوں کو جنم دیتے ہیں اور نئی معنویت کی تخلیق کرتے ہیں اس طرح معنویت کا عمل پراسرار نقش و نگار بنانے پر خود ہی قادر ہو جاتا ہے قاری کی دریافت کردہ معنویت خود اس کی اپنی دین یا Contribution ہے جس طرح آئینے

اورنگ زیب قاسمی

میں خلا کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا اسی طرح متن اپنے خلا کی تکرار سے کبھی فارغ نہیں ہوتا اس کے درو دیوار سے ایک شور ٹکراتا رہتا ہے اور مختلف آوازیں گونجتی رہتی ہیں جو معنی کے چہرے کو مسخ اور زخمی کر دیتی ہیں۔

رولاں بارت نے شور کے استعارے میں پوری ساختیاتی تفصیلات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے جس کی تفہیم کی شاہراہ پر کئی معتبر نقاد گامزن نظر آتے ہیں۔

میر تقی میر نے بھی شعر کی شور انگیزی کو ایک نیا مفہوم اور ایک نئی تعبیر دینے کی کوشش کی ہے میر کے نزدیک شور ایک لفظ بھی ہے اور استعارہ بھی اور کہیں علامت بھی اور یہ تینوں تعبیری قرینے میر کی شاعری میں اس طرح موجود ہیں جس طرح بادل میں بجلی پوشیدہ ہوتی ہے۔

میر کو اپنی بلند آہنگی پر ناز نہیں اس کی تخلیق اشارات اور ایمائیت سے بے پناہ توانائی حاصل کرتی ہے اور اس کا تخلیقی سفر کنایوں اور علامتوں کی مدد سے جاری رہتا ہے اس کی شاعری کی ساری شور انگیزی اس کے ایمائی لب و لہجہ کی مرہون منت ہے میر اپنی زیر لب سخن طرازی کے جوہر کا بھرپور طریقے سے اظہار کرتا ہے۔

ایک آفت زماں ہے یہ میر عشق پیشہ
پردے میں اپنے مطلب سارے ادا کرے ہے

سخن کا دائرہ اثر ایمائیت ہی سے وسعت پذیر ہوتا ہے۔

کس کے کہنے کو ہے تاثیر کی اک میر ہی سے
رمز و ایما و اشارات و کنایات کیجیے

میر بار بار اپنے انداز شعر گوئی کی تہہ داری کی جانب توجہ مبذول کراتا ہے۔

ہے تامل کہ شناسای طرز گفتار مرا
دیدہ نازک کن کہ فہمی حرف تہہ دار مرا

فارسی ہی میں نہیں اردو بھی اپنے طرز گفتار کی پیچیدگی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

زلف سا پیچدار ہے ہر شعر
ہر شعر ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

میر کا شعور فن گہرا اور ایمائیت سے گرانبار ہے جس میں تاثیر کی ایمائیت اور جذبے کی شور انگیزی تاثر آفرینی کرتی ہے تہہ داری دراصل معنویت کا تسلسل ہے معنی کی یک رنگی کو میر قابل اعتنا نہیں سمجھتا وہ شاعری میں صدرنگی کا قائل ہے۔

جلوہ ہے مجھی سے لب دریائے سخن پہ
صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں

معنویت کی صدرنگی سے ہی میر کی شاعری کا شہرہ یا شور ہے شور کا لفظ میر نے بار بار استعمال کیا ہے اور اس کے مفاہیم کا دائرہ خاصا وسیع ہے کبھی دھوم یا شہرت کے معنوں میں اور کبھی شور کی تہہ میں خلا کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

کہیں معنی آفرینی کے لئے اور کہیں فقدان معنی کے لئے

نمو کیوں ریختہ ہے شورش و کیفیت و معنی
گیا ہو میر دیوانہ رہا سودا سو مستانا

اور اب فقدان معنی بھی ملاحظہ ہو۔

راہ کی کوئی سنتا نہ تھا یاں رستے میں مانند جرس
شور سا کرتے جاتے تھے ہم بات کی کس کو طاقت تھی

جس طرح بات کے لئے معنی و مفہوم کا ہونا لازمی ہے اسی طرح شور کے لئے فقدان معنی ضروری قرار پایا اس شعر میں شور علامت بن گیا ہے انسان کی ازلی و ابدی بے خبری کا جس کی طرف کبھی حافظ نے اشارہ کیا تھا۔

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست
این قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

اب اس روشنی میں میر کے اس شعر کو دوبارہ پڑھیے۔

راہ کی کوئی سنتا نہ تھا یاں رستے میں مانند جرس
شور سا کرتے جاتے تھے ہم بات کی کس کو طاقت تھی

گویا شور اور بات یا سخن دو متضاد کیفیات کی نمائندہ ہیں کیونکہ بات کا سرچشمہ انسانی شعور اور ارادہ ہے جو معنویت پیدا کرنے پر قادر ہے لیکن معنی صرف شعور و ارادے سے پیدا نہیں ہوتے اس کے لئے زبان کے اشاراتی، اظہاری اور افتراقی نظام کی موجودگی لازمی ہے اور زبان جب حرکت میں آتی ہے تو قاری بھی وجود میں آتا ہے اور زبان کے ساتھ قاری بھی فن پارے کی معنویت میں شرکت کرتا ہے اور معنویت کے انفرادی عمل کی تخلیق آرائی کرتا ہے۔

بادہ گر خام بود پختہ کند شیشہ ما

اس لئے بات کے لئے ضروری ہے کہ وہ معنویت کی حامل ہو اور شور معنویت کا فقدان۔ شور صرف ایک اضطراری کیفیت کا اظہار کرتا ہے لیکن جس طرح کثرت تعبیر سے خواب پریشاں ہو جاتا ہے اسی طرح کثرت معانی سے شور کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور مصنف کی معنویت نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ نہیں ہوتی۔ نقش وحدت محو ہوتے ہی عالم کثرت وجود میں آجاتا ہے میر تقی میر اور رولاں بارت دونوں شور کو عالم کثرت کی علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ معنی حقیقی یا وحدت کی بلندی تک انسان اس لئے رسائی حاصل نہیں کر سکتا کہ عالم کثرت درمیان میں حائل ہے اور انسان خود اس دنیائے کثیر کا ایک حصہ ہے۔

عالم کے ساتھ جائیں چلے کس طرح نہ ہم
عالم تو کارواں ہے ہم کاروانیاں

اس صورت حال میں معنی حقیقی اور صداقت مطلق تک کیونکر رسائی حاصل ہو۔ ہمارے چاروں طرف

شور ہی شور ہے بے معنی و بے ہنگم شور ۔ میر تقی میر کی معنی جو طبیعت اس جہان شور سے نجات کی طالب ہے۔

لاؤ ساقی شراب نوش کریں
شور سا ہے جہاں میں گوش کریں

شور جہاں دراصل اس عالم کثرت کا تصور ہے جسے وہ شور جہاں سے تعبیر کرتا ہے۔

ہے غبار وادی وحدت جہاں
کثرت اعیان ہو گی اب عیاں

عالم کثرت کا وجود میں آنا ایک واقعہ ہے میر کی نگاہ حقیقت پسند اس عالم کو موجود دیکھتی ہے اور اس کی موجودگی کا جواز ماورائی عالم میں تلاش کرتی ہے اور ایک جہان معنی کی بازیافت کرتی ہے۔

آئینہ ہو کر صورت معنی سے ہے لبالب
راز نہاں حق میں کیا خود نمائیاں ہیں

عالم کا وجود میں آنا گویا عالم کثرت کا وجود میں آنا ہے جہاں ، شور جہاں اور عالم کثرت ایک ساتھ وجود میں آتے ہیں ۔ غزالی مشہدی۔

شورے شدو از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

شور عالم کثرت ہے جسے میر شور جہاں بھی کہتا ہے اس شور کے پس پردہ آواز تو ایک ہی ہے۔

گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سن شور جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

رولاں بارت شور جہاں سے آگے نہیں بڑھتا اس کی رسائی معنیاتی شور Semantic Noise سے آگے نہیں لیکن میر سخن ساز کی یکتائی تک پہنچ جاتا ہے لیکن عالم کثرت کے وجود سے انکار نہیں کرتا اور یہی وہ مقام ہے جہاں میر تقی میر اور رولاں بارت ہم آواز ہو جاتے ہیں۔

عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصور بے بدل
ہائے کیا پردے میں تصویریں بناتا ہے میاں

رولاں بارت عالم کثرت میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور میر اسی کثرت سے وحدت کا اثبات کرتا ہے۔

آیات حق ہیں سارے یہ ذرات کائنات
انکار تجھ کو ہووے سو اقرار کیوں نہ ہو

رولاں بارت متن سے باہر نہیں جھانکتا اور معنیاتی شور سے اس کی ساری تحریریں گونج رہی ہیں۔ متن کے گنبد میں ایک سے زیادہ آوازوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے جس سے ایک طرح کے شور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے یہ شور وحدت کا نہیں کثرت کا ہے اسی لئے رولاں بارت نے ادب کو "شور آفرینی" کا فن قرار دیا ہے۔
یہ شور معانی کی کثرت کا آئینہ دار ہے جس طرح آئینہ میں کوئی عکس موجود نہیں ہوتا ہر آئینہ بیں اپنا عکس اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اسی طرح آئینہ متن میں ہر قاری اپنا عکس خود دیکھتا ہے میر آئینہ کائنات میں یہی کیفیت

اورنگ زیب قاسمی

دیکھتا ہے۔

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں در آ
عالم آئینہ کے مانند در باز ہے ایک

اگر عالم ایک متن ہے تو رولاں بارت اور دریدہ اس کے روحانی سیاح ہیں جو کثرت معانی اور التوائے معنی کے گرداب سے گزر رہے ہیں میر دنیائے کثرت میں موجود ہونے کے باوجود نظارہ وحدت میں گم ہے وہ دریائے کثرت کی بیکرانی بھی دیکھتا ہے اور اس کی حقیقت سے بھی آگاہ ہے۔

جہاں کا دریائے بے کراں تو سراب پایان کار نکلا
جو لوگ تہ سے کچھ آشنا تھے انہوں نے لب تر کیا نہ اپنا

میر عالم کثرت کے وجود سے انکار نہیں کرتا فطرت کے جمال اور جلال دونوں سے وہ اکتساب فیض کرتا ہے۔

ساقی ٹک ایک موسم گل کی طرف بھی دیکھ
ٹپکا پڑے ہے رنگ چمن میں ہوا سے آج

یہ تو ایک پہلو فطرت کے حسن کی فراوانی و تمول کا تھا۔ فقدان و خلا بھی ملاحظہ ہو۔

مہمان میر مت ہو خوان فلک پہ ہرگز
خالی ہے مہر و مہ کی دونوں رکابیاں ہیں

لیکن یہ سب کچھ کیا ہے ؟ سبزہ و گل صبوحہ ، کوہ و دریا ، زمین و آسمان میر ان کو عناصر کے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

ہیں عناصر کی یہ صورت بازیاں
شعبدے کیا کیا ہیں ان چاروں کے بیچ

انسان تماشائی اور یہ دنیا ایک تماشا ہے۔

ہو رہتا ہے جہاں میں اک روز و شب تماشا
دیکھا میں سیر کر ہے دنیا عجب تماشا

عالم موجود تو ہے لیکن اس کی حقیقت مشکوک و مشروط ہے۔

بنا کیا رکھی تھی عالم میں میں نے
ہوں بندہ خیالات باطل کا اپنے

عالم کثرت کی موجودگی انسانی داخلیت سے باہر بھی ثابت نہ ہو سکی لیکن داخلیت کے پردوں پہ نمودار ہونے والی دنیا ، کیا واقعی دنیا یا عالم وجود کے درجے پہ فائز ہے اس سلسلے میں ہیڈیگر نے ایک بڑے پتے کی بات کی ہے ہیڈیگر کے نزدیک انسان دنیا یا جہاں یا عالم اپنے ساتھ لاتا ہے اس لئے انسان کو اس نے ہستی در عالم Being in the world کا نام دیا یعنی ہستی اور عالم دونوں باہم دگر مشروط ہونے کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں جس طرح انسان کے بغیر عالم کا وجود موہوم ہے اسی طرح عالم کے بغیر انسان کا وجود ناقابل تصور ہے

دونوں ایک رشتہ لزوم میں جکڑے ہوئے ہیں عالم اشیاء موجود ہے لیکن ایک انتشار اور پراگندگی کے سوا کچھ نہیں۔ انسان وجود زبان کے عمل سے اشیاء کو انتشار اور بکھرنے کے عمل سے نجات دیتا ہے اور ایک مرتب و بامعنی دنیا نمودار ہوتی ہے ہیڈیگر کے نزدیک زبان کے بغیر دنیا اور معنی کا تصور محال ہے زبان کی مدد سے انسانی وجود اپنے امکانات کا اظہار کرتا ہے اور کثرت کو عالم کثرت میں تبدیل کر دیتا ہے میر تقی میر نے انسان کی پیدا کردہ معنویت کو ہر شے کی اساس قرار دیا ہے۔

اتنا ہی مجھ کو علم ہے کچھ میں ہوں بہرچیز
معلوم نہیں خوب مجھے بھی کہ میں کیا ہوں

ہیڈیگر بھی انسان کے احساس و شعور Sense of Being کی اساس پر ایک عالم کی تعبیر کرتا ہے یعنی انسان کے شعور ہستی کے بغیر نہ ہستی ہے اور نہ عالم کثرت لیکن خود انسان کیا ہے ایک ایسا معمہ ہے جسے حل کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی ہے علم کی روشنی صرف گردوپیش کو روشن کر سکتی ہے۔ لیکن اس تیرگی کا پردہ چاک نہیں کر سکتی۔ جو چاروں طرف سے ہمارا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ میر کے احاطہ شعور سے یہ حقیقت بھی باہر نہیں۔

کام کیا آتے رہیں گے معلومات
یہ تو سمجھے ہی نہ کہ کیا ہیں ہم

انسان جو خود شعور وجود رکھتا ہے خود اپنے لئے ناقابل فہم ہے اس کی ہستی دراصل خود حجاب ہستی ہے۔

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

لیکن اس کے باوجود یہ انسانی وجود کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ عالم کثرت معنی سے آشنا ہوتا ہے انسان نہ ہو تو معنی کے سارے امکانات بھی نہ ہوں۔

اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہے یاں

آدمی کے وجود سے معنی کا افق روشن ہے ۔ حقائق کائنات منتشر بھی ہیں اور ایک دوسرے سے متصادم بھی ۔ جو قوت اشیاء کو انتشار و تصادم سے بچاتی ہے اور ترتیب و معنی سے آشنا کرتی ہے وہ انسان کی معنی آفرینی کی قوت ہے کائنات کی ساری معنویت انسان کے دم سے ہے۔

صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وے معنی
اہل نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں

معنی آفرینی کا عمل انسان کی Ontological یا وجودیاتی سرگرمی ہے اس لئے ہیڈیگر الفاظ کو Ontological کہتا ہے۔ یعنی الفاظ کے بغیر معنی آفرینی کا عمل ممکن نہیں گویا زبان مصروف معنی آفرینی ہے اسی لئے رولاں بارت معنی کو متن کے اندر تلاش کرتا ہے لیکن متن معنی بھی پیدا کرتا ہے اور وہ معنی بھی اسی لئے سازمتن سے مختلف آوازیں نکلتی ہیں جنہیں رولاں بارت سمفنیاتی شور کا نام دیتا ہے۔ جس سے عالم کثرت وجود میں آتا ہے میر دنیائے کثرت میں موجود ہونے کے باوجود نظارہ وحدت میں گم ہے وہ کثرت کے دائروں

میں اسیر ہونے کے باوجود مرکز وحدت سے جدا نہیں ہوتے۔ رولاں بارت اور دریدا گرداب کے معنی میں گرداں ہونے کے باوجود کثرت کی نقش آرائی میں مصروف ہیں متن سے چونکہ ہمہ وقت ایک سیل معانی بہتا رہتا ہے اس لئے کسی ایک معنی کا تعین دائمی طور پر نہیں کیا جاسکتا ۔ یعنی سیل معانی کے باوجود متن معنی سے خالی ہے۔ متن کے خلا سے عالم کثرت کی تخلیق رولاں بارت اور دریدا کا کارنامہ ہے لیکن کثرت آرائی کے لئے وحدت کا ہونا لازمی ہے۔ مرزا غالب نے اسی نکتہ کی جانب اشارہ کیا تھا۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کردیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فرانسیسی فلسفی وحدت کی بے رنگی سے بھاگ کر کثرت کی رنگارنگی میں پناہ ڈھونڈھ رہے ہیں میر عالم کثرت کے وجود سے انکار نہیں کرتا لیکن اس کی نظروں میں تو عالم وحدت ہی سمایا ہوا ہے کیونکہ اگر وحدت نہ ہو تو کثرت آرائی کا عمل معطل ہو جائے گا میر تقی میر وحدت و کثرت کے اس نازک رشتے کی پوری فہم اور ادراک رکھتے ہیں اور اس کا اظہار بھی کر چکے ہیں۔

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

کیا وحدت کے بغیر کثرت کا کوئی تصور قائم کیا جاسکتا ہے؟ میرا یہ سوال صرف فرانسیسی فلسفیوں سے ہے جو صرف عالم کثرت کی خبر دیتے ہیں میر تو اس سلسلے میں اپنے موقف کا اظہار کر چکے ہیں۔

اپنی تو جہاں آنکھ لگی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

فرانسیسی دانشوروں کی پریشاں نظری اور میر کا وحدت مشاہدہ دو مختلف دنیائیں ہیں دونوں کا تصور کثرت مختلف بلکہ متضاد ہے میر عالم کثرت کو بھی ایک متن سمجھ کر اس کا مطالعہ کرتا ہے اور حقیقت واحدہ سے اسے مربوط کر دیتا ہے۔ رولاں بارت متن ہی میں عالم کثرت کو جلوہ گر دیکھتا ہے میر کا عالم کثرت وحدت اساس ہے اور رولاں بارت کا متن اساس ہے۔ جو چیز میر اور رولاں بارت کے تصورات میں مشترک ہے وہ ایک علامتی اور استعاراتی اتحاد ہے اور وہ ہے آرٹ کی شور آفرینی جو کثرت معانی کا سرچشمہ ہے میر اور رولاں بارت دونوں انکشاف معانی کے لئے شور آفرینی کا جمالیاتی اور تخلیقی استعمال کرتے ہیں ۔ شور آرٹ کو یک رخی سے محفوظ رکھتا ہے اور فن پارے کو ہمہ جہت بنا دیتا ہے شور ایک درمان ہے جو معانی کو آرٹ میں قیام پذیر ہونے سے بچاتا ہے جرمن فلسفی گیڈیمر (Gadamar) نے اس سلسلے میں ایک اہم جمالیاتی نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے اس کے نزدیک آرٹ نے جب آرٹ ہونا چاہا تو اس نے قابل فہم ابلاغ Intelligible Communication کو رد کر دیا۔ اور آرٹ اپنے تخلیقی عمل کے ذریعے جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ معنی سے زیادہ ہوتا ہے آرٹ کا جواز صرف یہ ہے کہ وہ موجود ہے لیکن گیڈیمر معنی کی نفی نہیں کرتے وہ آرٹ کے جدید رویوں سے پوری طرح متفق نہیں ۔ وہ زبان اور شاعری کے تعلق کو ایک مختلف نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اس کے نزدیک عام زبان میں اور شاعری کی زبان میں وہی فرق ہے جو ایک سکے (Coin) اور سونے (Gold) میں پایا جاتا ہے سکہ کسی کی نمائندگی کرتا ہے اور یہی نمائندگی اس کی قدر متعین کرتی ہے جبکہ سونا کسی کی نمائندگی

اورنگ زیب قاسمی

نہیں کرتا وہ خود قابل قدر ہے اسی طرح شاعری میں جو زبان یا الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ خود قابل قدر ہوتے ہیں ان کی قوت ماخوذ اور مستعار نہیں ہوتی وہ بجائے خود قوت کا سرچشمہ ہوتے ہیں اور یہ بات صرف شاعری ہی کے لئے نہیں پورے ادب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

میر کی شاعری کے ادراک و فہم کے لئے یہ قطعاً" ضروری نہیں کہ وہ عالم کثرت یا اور کسی حقیقت کو تسلیم کرتی ہے یا رد کرتی ہے۔ وہ خود اپنی قوت کا سرچشمہ ہے رد و قبول شاعری کی جمالیاتی اقدار کو متاثر نہیں کر سکتے۔ موجودہ مطالعہ کا مقصد میر کے کائناتی نقطۂ نظر World View کو خالصتاً" شعری حوالوں سے سمجھنا ہے میر کا World View اس کی شاعری میں اس طرح موجود ہے جیسے بیج میں پورا درخت موجود ہوتا ہے میر کا کوئی تصور حیات و کائنات اہم نہیں۔ قابل قدر اور اہم اس کی شعری کائنات ہے اس لئے میر کے کسی خیال یا تصور کو اس کی شعری کائنات سے الگ کرکے سمجھنے کی کوشش لاحاصل ہوگی۔ اسی انداز قرات سے ہم میر کی شاعری میں موجود متحرک اور سیال ساختوں (Fluid Structures) تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ سارے حوالے باطل ہیں۔ میر کی شاعری کی قرات میر کے حوالے کی بجائے میر کی شعری کائنات کے حوالے سے ہی ممکن ہے کیونکہ بقول رولاں بارت کی شعری کائنات (Lexicon of Signification) یعنی ادبی متن تعبیر و تفسیر کے لامحدود امکانات کا حامل ہوتا ہے۔ ادبی متن کثیرالجہات ہوتا ہے اور اس طرح معنی کی فراوانی سے عالم کثرت وجود پذیر ہوتا رہتا ہے۔ میر نے لفظ شور میں ادبی متن کے سارے معنوی امکانات سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اور کمال اختصار سے اپنے موقف کا اظہار کیا ہے عالم کثرت کی موجودگی کو ایک نئے رنگ اور ایک نئے انداز میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

میر کر کثرت عالم کی میری جان کے بھر
تن تنہا ہے تو اور کج مزاج آخر کار

عالم میں انسان کی موجودگی اسے کثرت سے دوچار کر دیتی ہے جو بالآخر آغوش الحد کی تنہائیوں میں گم ہو جاتی ہے۔

میر کی شاعری عالم کثرت کا ایک متحرک امیج پیش کرتی ہے اور تجریدی فکر کو اس طرح محسوس پیکروں میں ڈھال دیتی ہے کہ تجرید کی بے رنگی پیدا نہیں ہوتی اور شعر شور انگیز ہو جاتا ہے اور اس طرح معنویت کے نئے چراغ روشن ہو جاتے ہیں اور اسی طرح ادراک کی گہری ساختیں نئے در وا کرتی ہیں۔ اس سارے عمل کو رولاں بارت معنیاتی شور (Semantic Noise) کا نام دیتا ہے اور میر اسے شعر شور انگیز کہتا ہے اور دریدہ اس عمل کو استعاروں کا لامحدود سفر کہتا ہے۔ میر نے تو پردے میں اپنا مطلب ادا کر دیا ہے اس کی فلسفیانہ تعبیر کے لئے فرانسیسی دانشوروں سے رجوع کیجئے۔

("دریافت" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

انیس حسن

ایلیٹ کی تنقید نگاری۔ ایک بنیادی جہت

ٹی ایس ایلیٹ بیسویں صدی میں انگریزی ادب کا ممتاز ترین اور بااثر نقاد گزرا ہے جس کی شاعری بھی اتنی ہی بلند پایہ اور غیر معمولی خصوصیات کی حامل ہے اگرچہ اس مضمون میں اس کی تنقیدی حیثیت کے متعلق ہی گفتگو کی جائے گی۔ لیکن اس کی شخصیت کو شاعر اور نقاد کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ شاعری اور تنقید تو ایک ہی ذوق اظہار کے دو مختلف پہلو ہیں جو الگ ہو کر بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں' بلکہ ایک اکائی کی تشکیل کرتے ہیں' اس کی تنقید اصولوں کے ایک منضبط (۱) سلسلے پر قائم ہے۔ یہ ایک ایسا وصف ہے جو اسے بیشتر ہم عصروں سے ایک جداگانہ مقام عطا کرتا ہے۔ اس کا نظریاتی (۲) نظام کبھی جامد نہیں رہا اس لئے اس کے ذہنی سفر کی نشاندہی' اس کی مکمل تفہیم کے لئے لازمی ہے۔

لیکن پہلے اس حقیقت کو ملحوظ خاطر رکھیں کہ دو غالب (۳) رویے' ایک ادبی دوسرا مذہبی' اس کی تنقیدی تحریروں میں نمایاں ہیں لیکن اس کی شاعری کے مطالعہ سے ان کی الگ الگ شناخت اور بھی مشکل ہے اس کی ملٹن (۴) کی تنقیص اور ڈن (۵) کی تحسین' اسی عجیب ادبی ذوق کی مرہون ہے اور (۶) ہارڈی' (۷) لارنس (۸) جارج ایلیٹ پر اس کی کڑی تنقید اور (۹) بادلیر (۱۰) دانتے اور جوائس (۱۱) کی تعریف بھی اس عجیب مذہبی رویے کی نشاندہی کرتی ہے لیکن (۱۲) دانتے اس کو دونوں سطحوں پر مطمئن کرتا ہے۔

تھامس سٹیرنس ایلیٹ' ۲۶ ستمبر ۱۸۸۸ء کو سینٹ لوئی امریکہ میں پیدا ہوا۔ اس کے اسلاف سترھویں صدی کے وسط میں سومرسٹ برطانیہ سے امریکہ جا بسے تھے۔ ایلیٹ بچپن ہی سے بہت ذہین تھا اور ۱۹۰۰ء میں اسکول میں لاطینی زبان کی استعداد کے لئے طلائی تمغہ حاصل کر چکا تھا۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۰ء تک وہ مشہور جامعہ ہارورڈ میں زیر تعلیم رہا جہاں اس نے کلاسیکی ادب' جرمن' فرانسیسی اور انگریزی زبان و ادب کا تقابلی مطالعہ کیا اور یہیں وہ (۱۲) دانتے اور (۱۳) ڈن ایسے دو شاعروں سے روشناس ہوا جن کا اثر بعد میں اس کی تخلیقات اور فکر میں رونما ہوا اور یہیں اسے دو معروف اشخاص کے لیکچرز سننے کا موقع ملا۔ جن کے خیالات خصوصاً" روایت (۱۴) کے متعلق ہیں' وہ بہت متاثر ہوا۔ میری مراد' ارونگ بیبٹ اور جارج سانتیانا ہے اس زمانہ میں ہارورڈ میں ڈرامہ کے متعلق بہت جوش و خروش پایا جاتا تھا اور یہیں اسے ڈرامہ لکھنے کی تحریک ملی۔ ۱۹۰۸ء میں اس نے آرتھر (۱) سائمن کی کتاب "ادب میں علامتی تحریک" کا مطالعہ کیا۔ اسی مطالعہ کے ذریعہ وہ لافورگ (۲) سے روشناس ہوا جس کا اثر ایلیٹ کی ابتدائی شاعری پر بہت نمایاں ہے۔ گریجویشن (۳) کے فوراً" بعد بھی اس نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور پیرس جا کر مشہور جامعہ سوربون میں ایک سال تک معروف ہم عصر اور

ماقبل فرانسیسی ادیبوں کا مفصل مطالعہ کیا۔ لیکن ۱۹۱۱ء میں وہ ہارورڈ واپس ہو گیا ' جہاں اس نے فلسفہ کا ایک بنیادی کورس کیا' اور سنسکرت زبان سے آشنائی حاصل کی۔ ۱۹۱۴ء میں وہ جرمنی کے جامعہ ماربرگ میں داخل ہوا لیکن پہلی جنگ عظیم چھڑ جانے کے بعد ۱۹۱۵ء میں وہ آکسفورڈ واپس آکر ایک سال تک میرٹن کالج میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ ۱۹۱۶ء میں اس نے تنگدستی کے ہاتھوں پریشان ہو کر ایک اسکول میں استاذی کا پیشہ اختیار کیا۔ پھر لائیڈ بنک میں کچھ دنوں ملازمت کرنے کے بعد وہ فیبر اینڈ فیبر نامی اشاعتی ادارے سے منسلک ہو گیا جہاں آخر میں وہ ڈائرکٹر کے عہدہ پر فائز ہوا۔

اپنے مشہور مضمون میں تنقید (۴) کا وظیفہ میں جہاں اس نے ذوق کی تصحیح کی بات کی ہے وہاں اپنے ابتدائی ذوق مطالعہ کے متعلق بڑے مزے کی بات کی ہے جس سے اس کی ذہنی پختگی کا پتہ چلتا ہے ورنہ ہمارے یہاں لوگ تو عمریں گزار دیتے ہیں اور شاعری میں ہجر و وصل کے آگے نہیں جا پاتے ہیں۔ وہ اقرار کرتا ہے کہ کم عمری میں اس نے فٹنز (۵) جیرالڈ کے ' عمر خیام ' کو بہت پسند کیا تھا اور عنفوان شباب (۶) کے دور میں بائرن ' شیلی اور کیٹس کے سحر میں گرفتار رہ چکا تھا قبل بلوغت کا یہ زمانہ اس کی عمر کے بائیس سال تک محیط رہا لیکن رفتہ رفتہ اس کا ذوق بدل گیا۔ وہ اس زمانہ کو " شدید لطف اندوزی کے دور " کا نام دیتا ہے لیکن ساتھ ہی خبردار کرتا ہے کہ ہم عنفوان شباب کے شاعرانہ تجربہ کی شدت کو شاعری کے شدید تجربے سے گڈمڈ نہ کریں ..... صرف پختگی کے بعد ہی کسی کو یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ شیکسپیئر یا ڈانٹے یا سوفوکلس کو ان کا مقام کیونکر عطا کیا گیا ہے۔ اس کلام معترضہ کے بعد پھر موضوع کی طرف واپس آتا ہوں۔

ایلیٹ کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا اس میں اس کی وہ ابتدائی نظمیں شامل تھیں جو ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء کے درمیان لکھی گئی تھیں ان کے مطالعہ سے حیرت ہوتی ہے کہ بہت ہی کم مدت میں اس نے اپنی شعری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر تخلیقی پختگی کس طرح حاصل کر لی۔ اس کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ لافورگے اور دوسرے فرانسیسی علامت پسندوں سے متاثر ہو کر کس حسن و خوبی سے ان کے کامیاب طریقہ اظہار کو ان اولین نظموں کے تار و پود میں سمو کر ایک نئے باب کا اضافہ کیا گویا جدید انگریزی شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے بعد بھی اس کا ایک شعری مجموعہ شائع ہوا لیکن اس کی مستقل شناخت دی ویسٹ لینڈ کی اشاعت ۱۹۲۲ء کے بعد ہی ہوئی۔ یہ طویل نظم تقریباً" ایک سال قبل ہی لکھی جا چکی تھی لیکن پاؤنڈ کی نظرثانی اور مصرعوں کی تعداد میں تخفیف کے بعد ہی منظر عام پر آسکی۔

شاید ہی اس سے قبل کسی انگریزی نظم کی اشاعت اتنی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی ہے کچھ ناقدوں نے اسے اہم ترین جدید نظم تسلیم کیا تو دوسروں نے اسے دانستہ مذاق قرار دیا اور واشگاف لہجے میں اس کی مذمت کی اس کی غیر معمولی تکنیک' پیچیدہ اسلوب ' دوسری زبانوں کے محاوروں سے مملو اقتباسات' استہزاری اثر کے لئے حوالے اور بازگشت کا اثر ' یہ سب عام قاری کی سمجھ سے باہر تھے۔ تاہم جلد ہی یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ اس نے ایک اہم موضوع جدید زندگی کی خشک سالی اور روحانی تشنگی سے جاں بلب تہذیب کی دہشت ' پر قلم اٹھایا تھا اور اپنے اظہار کی تازگی سے اسے زندگی بخش دی تھی ' کچھ ہی دنوں میں یہ نظم گم شدہ نسل کی انجیل بن گئی۔ بہت دنوں تک اسے پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپی تہذیب کے زوال کا اظہار سمجھا جاتا رہا یا موجودہ صدی کی دوسری دہائی کی بے اطمینانی کا لیکن خود ایلیٹ نے (اس نظم میں) ایک نسل کی بے اطمینانی کے

اورنگ زیب قاسمی

اظہار سے انکار کیا۔ اس انکار کے پیش نظر ہم اس نظم کی تاریخی و ثقافتی ابعاد کو اس طرح ملحوظ رکھیں جو کسی شے کی طرح نظم کے مرکز میں موجود نہیں ہے بلکہ معروضی مترادف کے طور پر ان زیریں محسوسات کے لئے آئیں جو گہرے لیکن واضح طور پر منعکس ہیں۔ گویا شاعر نے موجودہ اور گزشتہ صدی کی ذہنی نشوونما کو رگ و پے میں اتار کر اپنی تخلیقی قوت کے ساتھ ذہن جدید کی گرہ کشائی کی ہے۔ یہ ماہر نفسیات اور بشریات کے ذریعہ انسانی نسل کے ماضی اور انسانی روح کی گہرائیوں کی سیاحی ' خاص دریافتوں کے مباحث کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتی ہے بلکہ اسے شاعر اپنے لئے ایک طریقہ کے طور پر متعین کرتا ہے تاکہ جس طرح اس کے خیالات اور ذریعہ اظہار متاثر ہوئے ہیں ان کو گرفت میں لا سکے۔

لیکن آش وڈنسڈے کی اشاعت (۱۹۳۰) سے بھی کوئی کم کہرام نہیں مچا' اس بار اس سے وہ حلقہ متاثر ہوا جو ایلیٹ کے مداحین کا تھا کیونکہ یہاں جدید سوالوں میں سب سے اہم یعنی ایمان کو موضوع بنایا گیا تھا۔ جدید انسانی ذہن کی کشاکش جو چاہتے ہوئے بھی اپنے روحانی خشکی اور فتووں اور رائی کے باعث یقین کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ مسئلہ کے مذہبی حل کو قبول کرے۔

SUFFER ME NOT TO BE SEPERATED
AND LET MY CRY COME UNTO THEE

ایلیٹ نے کئی مداحین کی ناراضگی مول لے لی۔ یہ سیکولر ذہنیت رکھنے والی تیسری دہائی کو نسل کے خلوص تک رسائی نہ حاصل کر سکی اور اس نتیجہ پر پہنچ گئی کہ وہ اپنے پہلے موقف سے غداری کر چکا ہے۔ اس کے باوجود بعضوں کو متفق ہونا پڑا کہ نظم میں زبان و بیان کی وہ بلندیاں ہیں جو ہم عصر شاعری میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں۔

گرچہ " دی ویسٹ لینڈ " جدید دور کی بے ایمانی کے شدید ادراک سے مملو ہے لیکن اس میں کسی مثبت مذہبی ایمان کا وجود نہیں ہے تیرو نیشن میں بچ ہی جاتا ہے اور دی ویسٹ لینڈ میں وہ روحانی شکار کی آخری تجسیم ہے اسے سرجیمس فریزر کے پھانسی یافتہ دیوتا اور ہارورٹ ناش کے پتوں کے پھانسی یافتہ انسان کے برابر پہچان دی جاتی ہے لیکن اپنے ذہنی ارتقاء کے اس مقام پر ایلیٹ نے کی بشریات کی اصطلاحوں میں ہی دیکھ پا رہا تھا فریزر کی اثر پذیری اور خود اپنے پس منظر کی حدود ' اس کے لئے عیسائی مذہب کو ایک فعال یقین کا نقطہ اتصال ٹھہرانے میں نارسائی کا سبب رہے ہوں دی ویسٹ لینڈ کے آخر میں ایمان کی راہیں ہندوستانی مذہب کی طرف مڑ جاتی ہیں (یہ غالباً" ہارورڈ میں سنسکرت زبان کی تعلیم کا اثر ہے) گرچہ یہ نظم یاس کی کیفیتوں سے گزرتی ہے پھر بھی اس کا اختتام تین بار شانتی کے اعلان سے ہوتا ہے جو اپنشد کے رسمی خاتمہ کی طرح ہے اور جس کے انگریزی متبادل کے لئے ایلیٹ نے سینٹ پال کے ان الفاظ کا اعادہ کیا ہے۔

THE PEACE OF GOD WHICH PASSETH ALL UNDERSTANDING
SHALL KEEP YOUR HEARTS AND MINDS THROUGH JESUS CHRIST.

لیکن ناقد تو غیر محدود ہوتا ہے ایک طرف تو اپنے ذخیرہ الفاظ کے ذریعہ وہ شاعری کے جسم میں نئی روح پھونک رہا تھا دوسری طرف اس کا ذہن تنقید کے مروجہ پیمانوں سے غیر مطمئن تھا۔ انہیں دنوں ایذرا پاؤنڈ سے جو اس وقت لندن کی اہم ترین ادبی شخصیات میں سے ایک تھا۔ اس کی ملاقات ہو چکی تھی جو کئی جہات سے

بہت اہمیت کی حامل تھی ۔ پاؤنڈ ہی کی وساطت سے اس کی نظموں کو ناشر میسا ہو سکا پہلے امریکی رسالے پوئٹری بعد میں دوسرے انگریزی رسالوں میں اس کی نظمیں شائع ہوئیں۔ اور آخر میں نظموں کے اولین مجموعہ کی اشاعت ممکن ہو سکی) اور ادبی حلقوں میں تعارف بھی حاصل ہو سکا جہاں اسے ای ایم فارسٹر' ڈی ایچ لارنس ' وب انیس ' جیمس جوائس ' وندہم لوئس' ورجینیا وولف مع اس کے شوہر لیونارڈ وولف کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ وہ لوگ تھے جو تخلیقی فن کے اعلیٰ ترین ممکن معیار کے حصول کے لئے نہ صرف کوشاں تھے بلکہ اس کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر چکے تھے اور پورے براعظم یورپ میں فن کے رجحانات سے باخبر رہتے تھے۔

تنقیدی مضامین لکھنے کی تحریک اسے ڈنٹن مرے سے ملی جس کی ادارت میں اتھینیئم نامی رسالہ ایک مختصر مدت کے لئے شائع ہوتا رہا۔ دی سیکرڈ ووڈ کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچہ میں ایلیٹ رقم طراز ہے کہ " ان مضامین میں سے بیشتر ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء کے درمیان لکھے گئے تھے وہ ایک عبوری دور جنگ کے فوراً" قبل اور بعد کے زمانے کی نمائندگی کرتے ہیں ..... یہ وہ دور تھا جب ہم لوگ پرانے ابلاغ کی از سرنو زندہ اور نئے کی تخلیق کی کوشش میں نبرد آزما تھے ۔ لیکن اس تمام دور میں اس کے ذہن میں خیالات و سوالات کے انکھوے پھوٹتے رہے جن کا جواب ہنوز اس کے پاس نہیں تھا۔ اپنے دیباچہ میں وہ آگے رقم طراز ہے کہ " اس کتاب میں اپنے وقت اور دوسرے وقتوں کی روحانی اور معاشی زندگی سے شاعری کے رشتہ کو مس نہیں کیا گیا ہے لیکن یہ کتاب تو صرف منطقی اور زمانی طور سے آغاز ہے ..... میں اپنے قارئین سے التجا کرتا ہوں کہ میرے کام کو ' اسے نسبتاً" ایک بڑے اور مشکل موضوع کی تمہید سمجھیں۔"

اور اس مشکل موضوع پر ایلیٹ کی تحریریں وقتہ وقتہ سے منظر عام پر آتی رہیں گرچہ ادب ۔ " شاعری اور ڈرامہ " ۔ پر اس کی تنقید کمیت کے لحاظ سے بہت باوزن ہے ثقافت ' معاشرہ ' مذہب ' تہذیب ' اخلاقی اقدار اور اداروں پر بھی اس کی تحریریں کمیت میں کم ہونے کے باوجود کیفیت میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

گرچہ ایلیٹ بذات خود ناقد کو خانوں میں تقسیم کرنے کا روادار نہیں لیکن معاشرتی ناقد کی حیثیت سے مندرجہ ذیل تصنیفات اس کے خیالات کی تفہیم حاصل کرنے میں تو ہمیں راستہ دکھاتی ہیں ہی ' اس کے تنقیدی نظام کی جہت بھی متعین کرتی ہیں۔

آفٹر سٹرینج گاڈس ۱۹۳۳ء

دی آئیڈیا آف اے کرسچن سوسائٹی ۱۹۳۹ء

نوٹس ٹوورڈز دی ڈیفینیشن آف کلچر ۱۹۴۸ء

یہاں یہ بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ۱۹۲۷ء میں ایلیٹ نے انگریزی شہرت اختیار کر لی اور باقاعدہ عیسائی مذہب قبول کرنے کا اعلان کیا۔ مذہب کی طرف اس کی یہ پیش قدمی کسی اضطراری کیفیت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے مفکرانہ ذہن کی جستجوئے مسلسل کا حاصل تھی۔

اس کے نظریاتی نظام کا ماخذ ' امریکی تنقید کی وہ تحریک تھی جسے انسانیت پسندی کے نام سے جانا جاتا ہے اور جس کے سرخیل ارونگ بیبٹ اور پال المر مور تھے یہ تحریک جسے نوکلاسیکیت کی ایک جدید قسم کہا جاسکتا ہے ادب میں " رومانویت پسندی اور حقیقت پسندی " اور سیاست میں لا محدود جمہوریت اور انسانیت پسندی کے

اورنگ زیب قاسمی

خلاف تھی اور تنقید میں کلاسیکی پیمانوں کی متلاشی تھی اخلاقی پہلو سے دیکھا جائے تو امریکی انسانیت پسندی انسان کی دوہری فطرت سے مسلسل آگاہی کی ضرورت پر زور دیتی تھی اور جسمانی و جبلی فطرت پر روحانی اور ارادی تسلط کی خواہاں تھی دی سیکرڈ ووڈ (۱۹۲۰ء) جو اس کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے اس میں ایلیٹ کا تنقیدی موقف ' انسانیت پسندوں سے عملی طور پر غیر لائق امتیاز ہے۔

لیکن رفتہ رفتہ اس نے یہ محسوس کیا کہ جدید ناقد کا فرض منصبی یہ ہے کہ ایک طرف قدیم و جدید کلاسک کے تئیں اپنے رویہ کی تعریف کرے تو دوسری طرف ادبی تخلیقات کا اندازہ ایسے کلاسک کے واسطے سے ہی لگائے لیکن اس منزل کے آگے ایلیٹ کی ذہنی نشوونما ' انسانیت پسندی کے اخلاقی مفروضوں سے اس کی بڑھتی ہوئی بے اطمینانی سے وجود پذیر ہوئی آہستہ آہستہ اس کا یہ احساس فزوں تر ہوتا گیا کہ ان کا دفاع ممکن نہیں چنانچہ بعد کی تصنیف جیسے آفٹر سٹرینج گاڈس ' میں نے اس نے یہ لازمی محسوس کیا کہ جیمس جوائس ' ڈی ایچ لارنس اور کیتھرائن میس فیلڈ جیسے جدید مصنفوں کو نہ صرف جمالیاتی بلکہ اخلاقی طور پر بھی پرکھا جائے ۔ ایلیٹ کے روحانی منصب نے اسے مجبور کیا کہ وہ انہیں دہریہ کی حیثیت سے مجرم گردانے۔

درحقیقت ایلیٹ کے دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ بیسویں صدی کا معاشرہ زوال پذیر اور روحانی قوت سے خالی ہو چکا ہے دی ویسٹ لینڈ جس کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔ ثقافت کے متعلق اس کا تصور اسی ایقان کی بنیاد پر استوار ہوا ہے ۔ اس نے ثقافت کو نہ تو مذہب سے متحد سمجھا نہ الگ ' اس کے لئے ۔

"RELIGION AND CULTURE ARE ASPECTS OF ONE UNITY AND THEY ARE TWO DIFFERENT AND COUTRASTED THINGS,"

پہلی نظر میں یہ قول محال اور خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے لیکن قریبی مطالعہ کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت اسی میں مضمر ہے جب ہم کسی معاشرہ کی ثقافت کی بات کرتے ہیں تو ہم اس کے مذہب کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں۔ اپنے مذہبی آدرشوں کے ذریعہ وہ معاشرہ اپنی روحانی ' اخلاقی ' فنی اور فلسفیانہ آرزوں کا اظہار کر پاتا ہے گویا ثقافت کسی قوم کے مذہب کی تجسیم ہے لیکن ایلیٹ مکمل طور پر عمرانیات کے ارتقائی داستان (جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں نمو پذیر ہوا) کا طرفدار نہیں تھا اس کے خیال کے مطابق ایک ترقی پذیری کا سلسلہ ہے جو اسے تکمیل تک پہنچاتا ہے ۔ اس کے نزدیک مغرب اپنے ان تخلیقی جمالیاتی اور پیش رفتی صفات سے جو کبھی اس کا خاصہ تھیں ' محروم ہو چکا ہے اور اسے اپنے ورثہ کے حیاۃ ثانیہ کی سخت ضرورت ہے۔

" وقت کی ضرورت یہ ہے کہ مغربی ثقافت کی ترقی ہو ' ایسی ترقی جس کی بنیاد مضبوط مذہبی اصولوں پر قائم کی جائے ۔" یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ ایلیٹ کے لئے ثقافت کا مطلب تھا یورپی ثقافت اور معاشرہ سے مراد مغربی معاشرہ تھا وہ اینگلو کیتھولک مذہب کا تابع تھا جیسا اس نے خود For Lanceoletandre کے دیباچہ میں لکھا ہے اسی طرح وہ ادب میں کلاسیکیت پسند اور سیاست میں قدامت پسند تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ فوجی یا خونی انقلاب کے حق میں نہیں تھا کیونکہ اس کے خیال کے مطابق اس سے ثقافت کی ترقی نہیں ہوتی ہے بلکہ معاشرہ میں عدم تحفظ اور فردی انسانی سطح پر بے حرمتی ہوتی ہے۔

ایلیٹ کے مطابق دو ہزار برسوں سے ' عیسائیت یورپی ثقافت کی سب سے نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ یہ

عیسائیت ہی ہے جس نے یونانی و رومی اور دوسری ثقافتوں کے اجزاء کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے گرچہ اس کی وجہ سے لاتعداد فرقے اور مسلک وجود میں آئے ہیں، لیکن یورپی ثقافت کی بنیادی حیثیت جو حریت اور انسانیت پسندی کی روایات کی حامل رہی ہے، عیسائیت ہی سے سب کچھ حاصل کرتی ہے اور اسی کی وجہ سے یورپ کی ثقافت اتنی کشادہ ذہنی اور ثقافتی وحدت کی صورت حاصل کر سکی اور اسے دنیا کے تمام براعظموں میں فخر کا مقام حاصل ہے۔

بقول ایلیٹ وہ یک جان کرنے والا عنصر یورپ والوں کو ملا ہے عیسائیت ہی کی سب سے بڑی دین ہے۔ ثقافت کسی ایک خاص جماعت یا فرد کی جائیداد نہیں بلکہ وہ کسی معاشرہ کے بہترین معلومات اور خیالات کا جمع شدہ خزانہ ہے مختلف رجحانات، طبقے اور افراد کو معاشرہ میں ان کا مخصوص مقام اس وقت ملتا ہے جب ثقافت کا عمل جاری رہتا ہے۔ مذہب ہم آہنگی کے سلسلے میں کو بھی آسان بناتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ثقافت میں شامل دوسرے اجزاء اس کے لئے اہم نہیں لیکن مذہب روح و رواں کی طرح ثقافت کی رگ و پے میں جاری و ساری رہتا ہے۔ ایلیٹ کے نزدیک مذہب صرف اخلاقی تعلیمات یا عقیدوں کا ہی مجموعہ نہیں بلکہ اس کا مقصد تو انسانی شخصیت کی ہمہ جہت ترقی ہوتا ہے اور مذہب ہمیں تلقین کرتا ہے صبر و تحمل کی، اچھے عادات و اطوار کی اور کچھ اور بھی جو صرف ظاہری نرم خوئی سے زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے۔

ایلیٹ نے سیاسی اتفاق اور ثقافتی اتفاق کے درمیان حد فاصل کو تسلیم کیا، اس کے خیال میں سیاسی اداروں کی اتفاق کے مقابلہ میں ثقافتی اتفاق صرف ایک ہی وفاداری کی طالب نہیں ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ کسی طرح کی وفاداریاں مشروط ہوں گی۔ یہ وفاداریاں مختلف فرقوں یا ذات پات کی ہوں گی یا مختلف معاشرتی جماعتوں یا اداروں کی۔

اپنے ادبی موقف کے برخلاف، اس نے ثقافت میں نظریہ اشرافیہ کی تائید نہیں کی۔ لیکن پرولتاری ثقافت کے مارکسی نظریہ میں بھی اسے خامیاں نظر آئیں گرچہ اس کی خوبیوں کا بھی اس نے اعتراف کیا۔ اس کے نزدیک ثقافت ایک پیچیدہ عمل سے ظہور میں آتی ہے جس میں صرف چند گنے چنے افراد ہی نہیں بلکہ معاشرہ میں رہنے والے تمام لوگوں کا حصہ ہوتا ہے۔

ایک بار اور ثقافت کے لئے مذہب بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ کسی معاشرہ کا اطوار کا ایک دستور اور اخلاقی پس منظر کی ضرورت ہوتی ہے ایلیٹ کے خیال میں عیسائیت کے بغیر یورپی ثقافت درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ یورپ میں مطلق العنانی کی راہ میں سب سے پائیدار رکاوٹ، رومن کیتھولیکیت ہی ثابت ہوئی ہے۔ اسی لئے اس کے نزدیک ثقافت ان مسیح اقدار کو روبہ کار لانے والی ہے جو چرچ کے حکم کے مطابق ہیں اور چرچ نظر نہ آنے والے اللہ کی نظر آنے والی صورت ہے اس نے مذہب کو رسموں کا ایک مجموعہ ہی نہیں بلکہ زندگی کا ایک طریقہ قرار دیا۔ مختصراً ایلیٹ نے ثقافت کی شناخت عیسائیت سے کی جسے ہر حال میں اپنی الگ پہچان قائم رکھنی چاہیے۔

عیسائیت پر ایمان لانے کے بعد، ایلیٹ کی شخصیت کی کایا کلپ ہو گئی اس (عیسائیت) نے اسے نہ صرف ذہنی سہارا دیا بلکہ دیدہ بینا بھی بخشا اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ اپنی ابتدائی نظموں کی مایوسی اور ناخوشی کی کیفیت سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔ ایلیٹ اب اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ کیتھولک چرچ کے دائرے میں رہ کر

اورنگ زیب قاسمی

بنی نوع آدم کے لئے اپنے نیک اعمال کے ذریعہ اپنی نجات کی راہ متعین کرنا چنداں مشکل نہیں۔ اس چرچ کے مطابق وحی الٰہی کرم کا ایک عمل ہے (اور یہی دنیا کے اندھیروں میں روشنی کی راہ دکھا سکتا ہے) کرم کا اظہار حضرت عیسیٰؑ کی تجسیم سے ہوتا ہے مشہور ناقد ایچ آر ویبسن کیتھولک عقیدہ کی تجسیم پر تاکید کو بہت اہم سمجھتا ہے، اور یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ پروٹسٹنٹ لوگوں نے کفارہ کو خطرناک حد تک بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔

ایلیٹ کے خیال کے مطابق، چرچ کی زندگی، تنہائی اور خود مرکزیت جو جدید تہذیب میں بہت ہی شدید ہے کا حل پیش کرتی ہے چرچ میں روایت ایک زندہ شے ہے جو تقرب الٰہی کو حقیقی بنا سکتی ہے۔ اپنی ذات کی نفی کر کے اور ترک کے عمل سے کوئی شخص بھی اپنی تنہائی کے حصار کو توڑ سکتا ہے اور خدا تک بھی رسائی حاصل کر سکتا ہے یہاں پر اس کا موقف تصوف سے بہت قریب ہو جاتا ہے ایلیٹ کے مذہبی تصور کی وضاحت کرشیان سمتھ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے:

HE (ELIOT) LEANS TO CATHOLICISM IN STRESSING THE DOGMA OF INCARUATION RATHER THAN THAT OF ATONEMENT THE PERFECTION OF THE WILL AND RELIGOUS DISCIPLINE RATHER THAN THE INTENSITY OF FAITH PENANCE CONFESSION AND PURGATION RATHER THAN PRIVATE WORSHIP. SUCH THINGS AS THE ADORATION OF THE VIRGIN AND THE BELIEF IN THE INTERCESSION OF STAINS ARE MORE SUPER FICIAL CATHOLIC ELEMENTS OF HIS POETRY

پس! یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تنقید صرف اس کے شاعرانہ اعتقاد اور عمل کی پشت پناہی کرتی ہے اور تنقید کے لئے جن قدروں کی سفارش کی گئی ہے وہ پوری کی پوری ادبی نہیں ہیں۔

یہاں تک تو ایلیٹ کے تصورات مذہب اور ثقافت کے متعلق پیش کئے گئے۔ آئیے اب معاشرہ اور فرد کے رول کے بارے میں اس کے خیالات کا جائزہ لیں۔

معاشرہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے اور اگر ثقافتی اور مالی حیثیت سے مستحکم ہو گا تو اس کے افراد بھی امیر اور صحت مند ہوں گے ٹی ان ریسوک کے الفاظ ہیں۔ معاشرہ کی باہمی اور کامیاب تنظیم ان ہی سے ممکن ہے جو انسانی مشاغل کا صحیح ادراک رکھتے ہیں نہ کہ ان لوگوں سے جو زندگی کے تجربوں کو نظر انداز کر کے کسی تجریدی اور غیر حقیقی یقین کی موافقت میں مکمل ہم آہنگی اور انضباط تلاش کرتے ہیں۔ آدمی پیدا ہی ہوا ہے بے آزادی میں زندہ رہنے کے لئے اور اس بے آزادی کا کسی بھی انسانی مسئلہ کی کامیاب سوچ میں منعکس ہونا ضروری ہے بے شک ایلیٹ کو یقین تھا کہ معاشرہ کی تنظیم بہتر یا بدتر خطوط پر ہو سکتی ہے۔ معاشرہ کی اچھائی یا برائی ان حالات پر منحصر کرتی ہے جو وہ اپنے افراد کے لئے پیدا کرتی ہے۔

ایلیٹ نے حریت پسندی کو جدید مغربی معاشرہ کا مخصوص مسلک قرار دیا۔ جہاں معاشرتی تنظیم کی اگر تعریف کی جائے تو بیشتر ان پہلوؤں پر مشتمل ہوگی یہ نشاندہی ہو سکے گی کہ وہ کس کی مخالفت میں ہیں نہ کہ ان

سے کسی کی موافقت کا سراغ مل سکے گا۔" یہ حریت پسندی ایک حتمی قوت ثابت ہوتی ہے جو ان کو رہا کرنے کا رجحان رکھتی ہے نہ کہ اسے جمع کرنے کا جو آسائش کی سمت لے جاتی ہے نہ کہ قلعہ بند حصاروں میں۔"

ایلیٹ معاشرہ اور فن میں ایک طرح کی تربیت کا خواہش مند ہے جبکہ حریت پسندی نہ صرف اس کی راہ میں حائل بھی تھی بلکہ ایک طرح سے اس کے خلاف بھی تھی۔ " حریت پسندی ایک خلا پیدا کرتی ہے لوگوں کی روایتی معاشرتی عادتوں کو بگاڑ کے لوگوں کی فطری اجتماعی شعور کی انفرادی اجزاء میں تحلیل کرکے احمق ترین کو بھی رائے دہی کی اجازت دے کے تعلیم کے بدلے ہدایت سے خانہ پری کرکے عقل مندی کی بجائے چالاکی کی ہمت افزائی کرکے اور نو دو لیتے کو نہ کہ فاضل کو موقع دے کے ۔" ایلیٹ کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح کا کنٹرول لازمی ہے یہ کنٹرول صرف قدامت پسندی سے نہیں حاصل ہو سکتا کیونکہ اگر حریت پسندی افراتفری کے مترادف ہے تو قدامت پسندی ' انجماد کی نمائندہ ہے تو پھر اس بعد القطبین کو ہم کیسے پاٹ سکتے ہیں ؟ ایلیٹ کا جواب یہ ہے کہ ہم ایسا کرسکتے ہیں " روایت " سے کام لے کر۔ روایت اس کی نظر میں ایک بنیادی کردار ادا کرتی ہے اور اس کی تنقیدی نظریہ سازی میں بھی اہمیت کی حامل ہے۔

آفٹر سٹرینج گاڈس میں اس نے روایت کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے " روایت پورے طور پر یا بنیادی طور پر بھی ' صرف چند کٹر عقیدوں کا برقرار رکھنا ہی نہیں ہے ان عقیدوں نے ایک روایت کی تشکیل کے دوران اپنی زندہ شکل اختیار کی ہے میرا کہنا یہ ہے کہ روایت تمام خصائل ' عادات اور رسوم پر مشتمل ہے اہم ترین مذہبی رسوم سے لے کر ایک اجنبی کو خوش آمدید کہنے کے ہمارے رسمی طریقہ تک ' جو ایک ہی جگہ کے رہنے والے ایک ہی لوگوں کے خونی رشتہ کی نمائندگی کرتا ہے۔" پہلی نظر میں اس تعریف سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ ایلیٹ کے لئے روایت اور ثقافت ایک اور یکساں ہے لیکن درحقیقت اس کے نزدیک روایت زندہ ثقافت کا جزو ہے جو ماضی سے ورثہ میں بھی ملتا ہے اور حال کی کارکردگی میں بھی حصہ لے رہا ہوتا ہے۔

اپنے مقالہ " روایت اور انفرادی صلاحیت " (جو ۱۹۱۷ء میں لکھا گیا تھا) کی ابتداء ہی میں ایلیٹ نے اعتراف کیا ہے کہ " ہم زیادہ سے زیادہ لفظ کو صفات کے طور پر استعمال کرکے یہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں کی شاعری روایتی یا صددرجہ روایتی ہے یہ لفظ عیب جوئی یا مذمت کے علاوہ شاذ ہی کسی دوسرے معنی میں استعمال ہوتا ہے اگر کبھی دوسرے معنی میں استعمال ہوتا بھی ہے تو مبہم تعریفی معنی میں سچ تو یہ ہے کہ رومانیت پسندوں اور ان کے ورثاء نے لفظ روایت کا استعمال کچھ نہ کچھ حقارت آمیزی سے کیا ہے۔

لیکن ایلیٹ کے تصور روایت کا مدعا کچھ اور بھی ہے اور یہ بہت اہمیت کا حامل ہے اس کا کہنا ہے کہ اگر روایت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے سے پہلی نسل کے طریقوں اور کامیابیوں کی پیروی آنکھیں میچ کے یا سہمے کی جائے تو ایسی صورت میں یقیناً" روایت کی ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیے۔ ہم نے ایسی کئی سہل لہروں کو جلد ہی ریگ میں گم ہوتے دیکھا ہے اور جدت تکرار سے بہتر ہے یہ وراثت میں نہیں ملتی اور اگر کوئی اسے حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے کڑے ریاض کی قیمت ادا کرنی ہوگی ۔اس کے حصول کے لئے پہلے پہل تو تاریخی شعور کی ضرورت پڑتی ہے جو ہر اس شخص کے لئے لازمی ہے جو پچیسویں سال کے بعد بھی شاعری کرتا

اورنگ زیب قاسمی

رہے اور تاریخی شعور نہ صرف ماضی کی گزشتنی بلکہ ماضی کی موجودگی کے تصور کا بھی طالب ہوتا ہے تاریخی شعور مجبور کرتا ہے کہ لکھنے والا نہ صرف اپنی نسل کو ملحوظ خاطر رکھے بلکہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ یورپ کا سارا ادب ہومر سے لے کر اب تک اور اس ملک کا سارا ادب ایک ساتھ زندہ ہے یا ہم وقتی وجود رکھتا ہے اور ایک ہم وقتی نظام ' کو معرض وجود میں لاتا ہے یہی تاریخی شعور ' جو زمان و مکان کی قیود سے ماورا ہونے اور زمان و مکان سے منسلک ہونے کا ادراک ہے ۔ کسی ادیب کو روایتی بناتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کو زمانہ میں اپنے مقام یعنی اپنی ہم عصریت سے آگاہ کرتا ہے ۔"

کوئی شاعر کوئی فنکار خواہ کسی بھی فن سے تعلق رکھتا ہو ' تن تنہا اپنی کوئی مکمل حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت اور اس کی بڑائی اس میں مضمر ہے کہ پچھلے شعرا اور فنکاروں سے اس کا کیا رشتہ ہے ؟ الگ رہ کر اس کی اہمیت متعین نہیں کی جاسکتی' اسے پچھلے شعراء اور فنکاروں کے درمیان رکھ کر تقابل وتفاوت سے کام لینا ہوگا۔

ایلیٹ تمام یورپی ثقافت کو ایک زندہ افزائش کی حیثیت سے دیکھتا ہے جو عیسائی یونانی رومی ثقافت کی شاخ سے پھوٹ رہی ہے اور یورپ کی ثقافتی وحدت کا مرکزی خیال ایک دھاگے کی طرح اس کی تمام تحریروں کو منسلک کرتا ہے۔

روایت زیادہ تر لاشعوری ہوتی ہے اور ثقافت بھی اسی کی مانند ہے اور روایت سے آتی ہے لیکن ایلیٹ کا یقین یہ ہے کہ ماضی کا ایک احساس یا تاریخ کا ادراک ثقافت کے لئے لازمی ہے ۔ روایت کو کھو کر ہم حال پر اپنی گرفت کھو دیتے ہیں ۔ اس لئے ہمیں حتی الامکان اپنی روایتوں کا شعور ہونا چاہیے۔ اگر موجودہ اضطراب کو ختم کرکے نظم و ضبط قائم کرنا ہے تو انتظامی اور معاشی اتحاد سے بالاتر اختلاف میں اتفاق کی ضرورت ہے اور نیا اتحاد صرف پرانی جڑوں پر ہی قائم ہو سکتا ہے عیسائی مذہب اور کلاسیکی زبان جو یورپ والوں کا مشترک ورثہ ہے میرے خیال میں یہ چیزیں باہم دگر اس طرح پیوست ہیں کہ انہیں الگ نہیں کیا جاسکتا۔

یہ ظاہر ہے کہ ایلیٹ یورپی ثقافت کی تشکیل میں عیسائیت کے کردار کو اہمیت دینے میں حق بجانب ہے لیکن اس کا یونانی رومی ثقافت کی بنیادی اہمیت پر زور دینا بہت حد تک بے جا معلوم ہوتا ہے یہ سچ ہے کہ رومی سلطنت ' یونانی اور رومی ثقافت نے یورپ میں عیسائیت کو پھیلانے میں کلیدی کردار ادا کیا لیکن وہ ایک روبہ زوال سلطنت تھی اور مشکوک ہے آیا اس کی تہذیب کے ثقافتی اصول ' اس کا علم اس کے فلسفے اور فنون درحقیقت مسیحیت سے مطابقت بھی رکھتے تھے یا نہیں باہم نما خیالوں کو لاادریت ۔ جو رہبانیت کا حصہ تھی۔ کے کچھ نتائج ہمیں یونان روم اور مسیحیت کے کسی آسان فارمولے کو قبول کرنے سے باز رکھتے ہیں اور ایلیٹ یورپ والوں کی ثقافتی روایت کے دوسرے دھاگوں کی طرف کم دھیان دیتا ہے ۔ مثلاً" پرو ٹسل اور سلٹک۔

فن زندہ افزائش کے ایک جزو کی تشکیل کرتا ہے جسے ایلیٹ ثقافت کا نام دیتا ہے اور چونکہ ادب فنون میں سے ایک ہے وہ بھی ثقافتی کل کے ایک جزو کی تشکیل کرتا ہے اور یہ فطری ہے کہ وہ اس سے اثر پذیر بھی ہو گا اور اس پر اثر آفریں بھی ہوگا۔ لکھنے والا ایک فرد ایک فنکار ' دونوں حیثیت سے اپنے وقت سے نظام سے ' معاشرہ سے جس میں وہ موجود ہے لازمی طور پر اثر قبول کرتا ہے اپنے نواح کے خلاف ردعمل میں بھی جیسا کہ کئی لکھنے والوں کا شیوہ ہے وہ معاشرہ سے الگ نہیں بلکہ اس کے جزو کی حیثیت سے اپنی پابندیدگی

کو زبان بنتا ہے اور اگر یہ بات شرف قبولیت حاصل کر سکی ہے کہ ایک انفرادیت مصنف فطری طور پر ایک ایسے عنصر کی طرح ہے جو اپنے معاشرہ سے خود بھی تشکیل پاتا ہے اور اپنے معاشرہ کی تشکیل میں خود بھی حصہ لیتا ہے تو یہ قبولیت جزوی طور پر ایلیٹ ہی کی مرہون منت ہے جو شدید انفرادیت پسندی کے زمانے میں بھی اس نکتہ پر زور دیتا رہا۔

آفٹر سٹرینج گاڈس ' کا ذیلی عنوان ہے جدید کفر کا ایک قاعدہ جس میں اس کا کہنا ہے کہ ادب کے کے میدان میں کفر ' روایتی مضمون کے پس منظر اور امیجری کی تلاش کا نتیجہ ہے صرف ایک روایت ہی یہ پس منظر اور امیجری عطا کر سکتی ہے اور جس کی موجودگی کسی بھی ادیب کے لئے لازمی ہے۔ ایک مشترک فرہنگ الفاظ اور ایک مشترک پس منظر کا وجود بہت ہی ضروری ہے اگر ایک معاشرہ کے افراد ایک دوسرے سے افہام و تفہیم کا رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں ایک ادیب معاشرہ کا سب سے زیادہ فصیح اللسان فرد ہوتا ہے چنانچہ اسے اس سازوسامان کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایلیٹ نے مزید وضاحت کی ہے کہ عیسائی اور کلاسیکی ثقافتی بنیاد میں انحطاط کے بعد مصنفوں کو نئے فنی نظام اظہار کے لئے دور ازکار اور خطرناک ' ایقان اور خیال کی جستجو رہی ہے جس کے لئے کچھ اپنے اندر دیکھتے ہیں جیسے کہ لارنس جو غیر اخلاقی قوت زندگی میں یقین رکھتا ہے اور کچھ غیر عقلی اور قدیم صوفیانہ نظام میں جیسے کہ ایٹس جو ابتدائی دور میں سلک اور نجومی مسلک سے وابستہ رہا ہے لیکن سبھی ایک اسطور یا معاشرتی ضابطہ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جس پر اپنی تصانیف کی بنیاد رکھ سکیں اور جسے پاؤنڈ یا جسس اور ایلیٹ جیسے عیسائی اور کلاسیکی شعراء نے بھی ضروری سمجھا ہے کہ جس نظام خیال سے وہ منسلک ہیں اس کے معنی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نبرد آزما رہیں۔ ایلیٹ نے اس کی توجیہہ یہ پیش کی ہے۔ " ایسا روایت کی گمشدگی کے باعث ہوتا ہے اور ادبی رائخ الاعتقادی کی گمشدگی کے باعث بھی جو فن کی ہر سطح پر اپنی غیر موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے " اس کا کہنا یہ ہے کہ ایک نظام کے کنٹرول اور تخلیقی تحریک کی آزادی کے درمیان توازن ہونا فن کے لئے لازمی ہے اگر کنٹرول باقی نہیں رہے تو تخلیقی انار کی در آتی ہے اور آزادی گم ہو جائے تو تخلیق بے ثمری کا نتیجہ نکلتا ہے " درحقیقت ادبی ماضی سے مکمل انحراف خطرہ پیدا کرتا ہے اور یہ لاعلمی بھی دانستہ یا نادانستہ کہ پہلے کیا کچھ گزر چکا ہے ایک منہ زور بغاوت بھی پورے طور پر روایتی ہو سکتی ہے کوئی بغاوت اس یقین کا شاخسانہ ہوتی ہے کہ ایک ادبی تکنیک بانجھ ہو چکی ہے اور نئے خیالات کے اظہار سے عاجز ہے نہ کہ کسی نظام خیال کی نامنظوری ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ روایت سے مکمل قطع تعلق کیا جائے گا۔ ادب میں بغاوت ہمیشہ ہوتی رہتی ہے تقریباً" ہر نئی ادبی نسل کسی حد تک اپنی نسل کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتی ہے۔ اور یہ لازمی ہے تاکہ روایت کی ترقی ہو سکے کیونکہ ایک نسل ادب میں وہ سب کچھ نہیں کر سکتی جو اس سے ممکن ہے کبھی کبھی اگر بغاوت انتہا پر ہوتی ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پیروکار نے روایت سے مکمل انقطاع کر لیا ہے خود ایلیٹ اور جس میں جوائس جو شاید وکٹورین اور جورجین داستانوں کے خلاف بغاوت کرنے والوں میں پیش پیش رہے ہیں ' ہر لحاظ سے مکمل روایت پسند تھے اور کافی بحث و تمحیص اور وقت گزرنے کے بعد ہی ان کو وہ مقام مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔

ایلیٹ نے ایک ادبی روایت کے اندر ترقی کا مکمل جائزہ " وات از اے کلاسک " میں پیش کیا ہے جب

اورنگ زیب قاسمی

وہ ترقی کی بات کرتا ہے تو اس کا مفہوم ہوتا ہے افزائش اور پیچیدگی نہ کہ کسی تکمیل کی سمت پیش قدمی ' اس لئے تبدیلی کسی بھی زندہ ادبی روایت کے لئے بہت ہی لازمی ہے۔ ادب کی ترقی اس معاشرہ کی ترقی پر انحصار کرتی ہے جس میں وہ ادب تخلیق ہوتا ہے ایک اکیلا مصنف بھی انفرادی حیثیت سے اپنی زبان کی ترقی کے لئے بہت کچھ کر سکتا ہے لیکن وہ اس زبان کو پختگی کی حد تک نہیں پہنچا سکتا جب تک کہ اس کے پیش روؤں نے اس زبان کو اس کے آخری لمس کے لئے تیار نہیں کر رکھا ہے ایک پختہ ادب کے عقب میں ایک تاریخ ہوتی ہے جو صرف وقائع نگاری ہی نہیں ہوتی یا اس قسم و آں قسم کے مخطوطوں اور تحریروں کا ایک خزینہ ہی نہیں بلکہ کسی زبان کی منضبط گرچہ لاشعوری پیش رفت بھی ہوتی ہے جس سے وہ اپنی حدود میں رہ کر بھی اپنے امکانات کو بروئے کار لاتی ہے۔

گرچہ ادبی روایت ایک لاشعوری افزائش ہے ایلیٹ ہمیشہ اسے حاصل کرنے اور اسے قائم رکھنے کی شعوری کوشش پر زور دیتا ہے۔ اگر وہ روایت کی شعوری کاشت کی ضرورت کے متعلق مبالغہ آمیز خیالات کا حامل ہے تو یہ شاید اسی ادبی افراتفری کے خطروں کا شاخسانہ تھا جس کا مشاہدہ اس نے بغاوت کے جوش سے لبالب انفرادیت کے انتہا پسندانہ دور میں کیا تھا جس نے یورپ کے فن اور خیال کو دوسری دہائی اور تیسری دہائی کے کچھ حصہ میں اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ تہذیب فن کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے اور ایک ایسے وقت میں جب فنی عمل پر عائد تمام رسوم و قیود کی ملامت اور تحقیر کی جا رہی تھی اور ان سے روگردانی کی جا رہی تھی ' ایلیٹ کا ماضی کے احترام کی ضرورت اور تہذیب پر تاکید کرنا بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ماضی وہ زندگی بخش شجر ہے جس پر حال کی شاخیں برگ و بار لاتی ہیں اور تہذیب کی حدود میں بھٹکنے سے بچاتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ دور انتشاری تھا کہ یورپی معاشرہ اور ثقافت کی ہر سطح پر تبدیلی و بغاوت کا مظاہرہ ہو رہا تھا اس لئے ادبی تسلسل کے کسی جامع اسلوب کی سمت نتیجہ اخذ کرنے کے لئے نامناسب ہے۔

ابتدائی بیسویں صدی میں رومانیت کے احیاء کی تحریک اتنی انتہا پسند نہیں تھی ' اس کے سربراہوں نے زیادہ سے زیادہ ایک تکنیک کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا جبکہ موجودہ صدی کے آغاز میں اقدار کے صرف ایک ہی نظام کو ہدف نہیں بنایا گیا بلکہ اپنے پیش روؤں کے ہر نظام یا معیار کی مذمت کی گئی۔ ایسی کھلی چھٹی کے زمانہ میں ایلیٹ نے عظیم شخصی ایمانداری کا مظاہرہ کیا۔ اس وقت تک اپنی شعری تصنیفات کی بدولت اس کو ماضی کی زنجیروں سے آزاد ہونے والوں کا امام تسلیم کیا جا چکا تھا لیکن وہ ماضی سے حقیقی وابستگی کے لئے پریشان رہا اور فنی یا تنقیدی ایمانداری کی راہوں سے کبھی نہیں بھٹکا۔

فن کی ترقی کے لئے روایت کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تخلیقی فنکار کے لئے ہر دور میں روایت کے احساس کی شعوری کاشت نہ تو ضروری ہو گی نہ ہی سود مند ثابت ہو گی جب ایک معاشرہ صحت مند ہو گا اور بہت کم اختلاف سے ترقی کر رہا ہو تو اس کی ثقافت اس کی زندگی اور افزائش کا اٹوٹ انگ بن جاتی ہے اور اس کا تعلیمی نظام اس کی ثقافتی ضروریات کے تابع ہو جاتا ہے کہ ماضی کا احساس ' ہر عمل کے لئے ایک جزولاینفک کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور ایسے وقتوں میں صرف کسی کے فنکار ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ روایتی فنکار ہے اس سے اہم نکتہ یہ نکلتا ہے کہ روایت کی شعوری تلاش کا یہی مطلب ہے کہ اس کی ثقافت اپنے ماضی کی قدروں سے کسی نہ کسی حد تک بیگانہ ہو چکی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ ایسی ثقافت ہے

جو روبہ زوال ہے یا انتشار کا شکار ہو چکی ہے۔ ایلیٹ کے احساس روایت کی شعوری کاشت کے رویئے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یورپی ثقافت ہنگامی حالات کی زد میں آچکی تھی۔

اپنی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

IT IS A PART OF THE BUSINESS OF THE CRITIC TO PRESENT TRADITION WHERE A GOOD TRADITION EXISTS. IT IS A PART OF HIS BUSINESS TO SEE LITERATURE STEADILY AND TO SEE IT AS A WHOLE BUT THIS IS EMINENTLY TO SEE IT NOT AS CONSCERATED BY TIME BUT TO SEE IT BEYOND TIME.

تنقید کے لئے روایت کے صحیح ادراک سے یہ فائدہ ہوگا کہ گزشتہ نسلوں کے ذوق سے بندھی نہیں رہے گی اور دوسری انتہا یعنی صرف جدیدیت ہی کو اچھائی کا معیار سمجھنے سے بھی بچی رہے گی۔ اس کے خیال میں ماضی اور حال کے درمیان توازن بہت لازمی ہے لیکن اس کا حصول بہت مشکل ہے خاص کر جہاں ہمعصرادیبوں کے کارناموں یا اہمیت کی قدروقیمت کا اندازہ لگانا ہو۔

ایلیٹ کی معاشرتی تصریح کا دوسرا حصہ (پہلا حصہ روایت ہے) راسخ الاعتقادی یہ تقسیم اس نے خود اپنی کتاب آفٹر سٹرینیج گاڈس' میں کی ہے راسخ الاعتقادی روایت سے منسلک ہے اور آخرالذکر کی تصحیح کی خدمت انجام دیتی ہے اسے مشترک ایقان کے وضع شدہ نظام (شعوری ذہانت کا نتیجہ) کے مساوی سمجھا جاتا ہے جبکہ روایت کو انتھائی خصائل اور احساسات (لاشعوری ذہانت کا نتیجہ) کے مساوی گردانا جاتا ہے اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہب ' ثقافت اور معاشرہ ' راسخ الاعتقادی کی خاص امتیازات ہیں ۔ بہترین زندہ روایت میں بھی خوب وزشت کا امتزاج ہوتا ہے اور زشت کو راسخ الاعتقادی کے ذریعہ روکا جاسکتا ہے اگر روایت خون کی نمائندہ ہے تو راسخ الاعتقادی دماغ کی نمائندہ ہے ایک کو دوسرے کی ڈوف بینی کی ضرورت ہوتی رہتی ہے۔

ایک طرف حریت پسندی کے منفی اثرات اور دوسری طرف مطلق العنانی کی خود سری سے محفوظ رکھنے کی خاطر' ایلیٹ کے یقین کے مطابق ہمیں تاریخی عیسائی تجربہ ' سے حمایت اور ہدایت حاصل کرنی چاہیے۔ آئیڈیا آف اے کرسچن سوسائٹی میں تو وہ کھلے عام تبلیـیغ پر اتر آتا ہے اس کا یہ بیان کسی بھی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رکھتا۔ ملاحظہ ہو:

"کسی بھی معاشرہ کے لئے جو پنپنا چاہے اور ترقی کی راہوں پر گامزن رہنا چاہے اور تمدن کے فنون میں اپنا تخلیقی عمل جاری رکھنا چاہے اس کے لئے نجات کا واحد راستہ اسی میں ہے کہ عیسائی ہو جائے۔"

ظاہر ہے کہ ایلیٹ کے اس دعویٰ اور ہدایت کو کسی صورت بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بعد وہ ایسے ہامیاتی معاشرہ کا ضروری خاکہ کھینچتا ہے وہ عیسائی حکومت ' عیسائی فرقہ اور عیسائیوں کی جماعت کے اشتراک سے عمل میں آتا ہے مختلف سطحوں کے مراتب سے مملو معاشرہ کا یہ تصور ایلیٹ کے خیالات میں بہت دلچسپی کا حامل ہے وہ جماعت کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے ۔ ایک وہ جو کم تعداد میں ہیں اور شعور کی دولت سے مالا مال ہیں اور دوسرے وہ جو اپنے معاشرتی درجہ سے قطع نظر اپنے عیسائی ایقان کا اظہار ' صرف اپنے طور طریقوں سے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان میں سے کثیر تعداد مسلسل ذہنی عمل کی استعداد سے محروم ہے

بقول ایلیٹ عیسائی معاشرہ کی انجیل مقدس کی قوت حاصل ہے جو اسے جذباتی اور ادراکی دونوں توانائیوں سے استوار کرتی ہے اس طرح معاشرہ ہامیاتی صورت حاصل کرتا ہے نہ کہ میکانی۔

ایلیٹ رومانویت پسندی کو برداشت کر ہی نہیں سکتا کہ یہ اس کے اصولوں کے نظام سے قطعی ہم آہنگ نہیں ہے عیسائی اعتقاد کے ایک کٹر معتقد ایلیٹ کو رومانویت پسندوں میں تواضع اور خود ضبطی کی کمی نظر آتی ہے اس کے مطابق شاعر زندگی میں ایک بہت ہی نیک کاز رکھتا ہے اور نور برداری کا کام انجام دیتا ہے ایک پوری نسل کی آرزوئیں اس کے وجود میں اختتام پذیر ہوتی ہیں اور اس کا تجربہ ایک پوری قوم کا عام مشترک تجربہ ہو سکتا ہے لیکن رومانویت پسندی ' انسانی شخصیت کے بارے میں ' مبالغہ آمیز خیالات کو جنم دیتی ہے تمام رومانویت پسند انسانی شخصیت میں انا یا خود پرستی پر بہت زور دیتے ہیں اگر شخصیت میں کوئی مطلق قدر و قیمت موجود ہے تو منفی خبط اور تجربات بہت زیادہ اہمیت اختیار کر لیتے ہیں اسی لئے رومانویت پسندوں کے یہاں منفی اور جذباتی موافقت میں تعصب اور فن میں اس کے اظہار کا ایک سودا موجود رہتا ہے غیر منفی اور معروضی ہونے کے متعلق اس کا خیال ایک مذہبی نظام کے زیر اطاعت محسوسات کو تابع رکھنے کی ضرورت ' روایت ' نظم وضبط اور تعقیل میں تخیل اور تصور میں صفائی یہ تمام خیالات ' رومانویت پسندی کے مناقض ہیں وہ ایک کٹر کلاسیکی پسند ہے جیسا کہ اس کی شاعری میں فنائے شخصیت ' روایت کے خیال اور معروضی مترادف حسیت کی تکمیر ' ناقد کا روحانی اقدار ' اور Catalyst کی اصطلاحوں کی تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی شاعری کلاسیکی خصوصیات ذہانت اور تنظیم سے متصف ہے اور اس کی شاعری میں جذباتی قطعیت کے بجائے ذہنی تخیل کی فراوانی ہے لیکن اس کا تصور روایت اور اس سے ایک فنکار کا رشتہ ہی شاید وہ بنیاد ہے جس کی بنا پر وہ خود کو کلاسیکیت پسند کہتا ہے اس نے اپنی اولین شاعری (مع ویسٹ لینڈ) کی داخلیت کی توجیہہ کی ہے اور اس کا جواز پیش کیا ہے ساتھ ہی ساتھ اس نے شاعر کو تمام فلسفیانہ نتائج سے بری الذمہ قرار دیا ہے یہ وضاحت پیش کرکے کہ شاعری کے دوران شاعر کو مشکل ہی سے پتہ ہوتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے اور یہ فن اور واقعہ کے درمیان فرق قطعی ہوتا ہے۔

انسانیت پسندی ' نشاۃ ثانیہ کی ایک خصوصیت ہے جس کی بنیاد ' علم خصوصاً' یونان و روما کے علم میں دلچسپی اور کائنات کی فطرت (جس طرح وہ بنی آدم پر اثر انداز ہوتی ہے) کا انکشاف ہے گویا دلچسپی اللہ کے بجائے انسان کی ذات کو منتقل کر چکی ہے انسانیت پسندی میں رومانویت پسندی کی خصوصیات میں سے ایک ہے فاؤسٹ اور پرومیتھیس جیسے کرداروں میں دلچسپی ایک انسانی لہر کی نشاندہی کرتی ہے ایلیٹ کا انسانی فطرت کا فلسفہ ' انسانیت پسندوں کے فلسفہ سے بھی اتنا مختلف ہے جتنا رومانویت پسندوں کے فلسفہ سے انسانیت پسندوں نے رومانویت پسندوں پر سبقت لے جانے کی خاطر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ آدمی کی ذات فطری اور انسانی صفات کا آمیزہ ہے لیکن مافوق الفطرت کا وجود؟ ایلیٹ کا کہنا ہے کہ آدمی اور فطرت کی یہ ثنویت صرف مافوق الفطرت کو لازمی شے قرار دینے سے ہی قائم رہ سکتی ہے کیونکہ اس کے خیال کے مطابق اگر مافوق الفطرت کو دبایا جاتا ہے ..... تو مافوق الفطرت اور فطرت کے بیچ کی یہ ثنویت آن واحد میں ختم ہو جاتی ہے آدمی اس لئے آدمی ہے کہ وہ مافوق الفطری حقیقتوں کو پہچان سکتا ہے ان کی ایجاد نہیں کر سکتا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ سچائی وقت کی نہیں بلکہ ازل کی بنی ہے یعنی ہم سچائی تک توجیہات یا وجدان کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی

اورنگ زیب قاسمی

انہی کے ذریعے پہنچے ہیں دنیا کی بہترین ثقافت اور فکر ۔ قدیم ۔ متوسط اور جدید کے امتزاج جیسا کہ جدید انسانیت پسندوں کا شیوہ ہے کے بجائے ایلیٹ روایت اور کلر روایت (دوری یافتہ سچائی کا خزانہ ہے) کا تصور پیش کرتا ہے۔

ایلیٹ کا انسانی فرد کا تصور اسے بیسویں صدی کے دانشورانہ مزاج سے الگ کرتا ہے اور انگریزی مابعد الطبعاتی مفکرین سے اس کی دلچسپی کی پہچان قائم کرتا ہے بات گھوم پھر کر پھر وہیں آجاتی ہے یعنی مذہب تک ' قصہ یہ ہے کہ ایلیٹ فرد کا مذہبی تصور رکھتا ہے یعنی کہ انسانی نصیبہ کو مذہب کے ذریعہ ہی حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن وہ فرد کی اہمیت پر زور دیتا ہے فرد کی تکمیل اور روایت راسخ الاعتقادی ' مذہبی اور سماجی اداروں کے درمیان لازم و ملزوم کا رشتہ ہے مذہب کا مقصد یہی ہے کہ انفرادی شخصیت تکمیل تک پہنچے ایک ایسے وقت میں جب افراتفری کا دور دورہ ہو ' روایتی رسم وفاداریاں اور کردار کے معیار نے اپنا ہمہ گیر اقتدار کھودیا اور نئی قدروں نے پرانی قدروں کی جگہ نہ لی ہو انفرادی شخصیت مذہبی تعلیم ایلیٹ کا بیش قیمتی کارنامہ ہے بالفاظ دیگر ایلیٹ معاشرہ و ثقافت کو مذہب سے ہم آہنگ دیکھنا چاہتا ہے۔

اسی لئے جمہوری آدرشوں' میں اسے فرد کی آزادی اور سربلندی کو آمرانہ نظام کی بہ نسبت زیادہ خطرے لاحق نظر آتے ہیں یہ خطرے اکثریت کے جبر اور ہجوم کی مطلق العنانی سے پیدا ہوتے ہیں ہجوم ' آمریت سے کہیں زیادہ انفرادیت کا گلا گھونٹ سکتا ہے لیکن ایک حقیقی جمہوریت اس کو روک سکتی ہے ۔ ایلیٹ جمہوریت کے خلاف نہیں ہے لیکن وہ سچی جمہوریت کی وکالت کرتا ہے اس طرح وہ اپنے وقت کا ترجمان ہے کہ اس نے اپنے عصر کے غالب ترددات اور محسوسات کا اظہار کیا ہے اس کی نظموں کے ذریعہ بھی انسان کی داخلی کشمکش کو زبان عطا کی گئی ہے۔

غرضیکہ اس کے فلسفہ کا مرکزہ یہ ہے کہ زندگی کا مقصد ' انفرادیت کی تکمیل ہے کسی بھی فرد کو خوب سے خوب تر ہونے کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملنے چاہئیں۔ معاشی اور سماجی اداروں کا واحد مقصد یہی ہونا چاہیے۔ ایلیٹ نے اپنے مضمون Essays:Ancient and Modern میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ انفرادی آزادی کا تصور ' ہرانسان کی مثالی اہمیت پر قائم ہونا چاہیے اور اس ادراک پر کہ آخر کار ہر فرد خود اپنی نجات کے لئے ذمہ دار ہے اور اس کے نتیجے میں ہر معاشرہ کا یہ فرض ہوتا ہے کہ ہر فرد کو اپنی انسانیت کی ترقی کا موقع فراہم کرے۔ لیکن جب تک انسانیت کو خدا کی ذات سے ہم رشتہ نہیں کیا جاتا ہے دوسرے انسانوں کو کچھ لوگ اپنے فائدے کے لئے جبر کا نشانہ بناتے رہیں گے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایلیٹ نے ایمان داری اور بے باکی سے اپنے ایقان اور راسخ الاعتقادی کا اظہار کرکے اپنے وقت کی ذہنی فضا کو بہت حد تک اپنے خیالوں سے ہم آہنگ کرلیا۔ جس طرح اس کی نظم آش ونسڈے کی اشاعت کے بعد اس کی نیک نیتی پر شبہ کا اظہار کیا گیا تھا اسی طرح اس کے کئی مقالوں کی سچائی پر بہت لوگوں کو یقین نہ آسکا لیکن اس کے وسیع مطالعہ اور علمی تجربے کی صاحب فیصلوں کو اس کے مضبوط ترین مخالفین بھی رد نہ کرسکے اس نے لفظ روایت۔ جو خفی معنی میں استعمال ہوتا ہے کی نئی تشریح و توضیح کر کے اسے طرۂ امتیاز بخشا۔ رومانیت پسندوں کی شہرت کو اس کی مدلل تحریروں سے نقصان پہنچا۔ غرض یہ کہ اس نے ذوق سلیم کی اشاعت کرکے ذہنی انقلاب پیدا کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ مذہبی نقطہ نگاہ سے لکھی گئی اس کی

اورنگ زیب قاسمی

تنقیدوں نے اپنے وقت کی فکر کے دھارے کو جو لادینی انسانیت پسندی کے موافق تھا پلٹ کر رکھ دیا۔

کتابیات:

1 The SACRED WOOD.
2 AFTER STRANGE GODS.
3 THE IDEA OF A CHRISTIAN SOCIETY.
4 ESSAYS: ANCIENT AND MODERN.
5 NOTES TOWARDS THE DEFINATION OF CULTURE.
6 SELECTED ESSAYS.
7 BRAD BOOK M.C.T.S.ELIOT.
8 GARDNER HELEN THE ART OF T.S.ELIOT .
9 THE PELICAN GUIDE TO ENGLISH LITERATURE VOL.7 EDITED BY BONSFORD.
10 NEW BEARINGS IN ENGLISH POETRY-F.R.LEAVIS.
11 AXELS CASTLE EDMUD WILSON.
12 MODERN POETRY AND TRADITION CLEANTH.

("اوراق" لاہور)

اردو تنقید پر ایلیٹ کے اثرات

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اردو شعر و ادب میں ایک تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جدید دور میں ایلیٹ کے اردو پر اثرات قدیم زمانے میں حافظ و سعدی کے اثرات سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ اثرات جدید اردو شعر، تنقید اور کلچر سے متعلق مباحث کی رگوں میں گرم خون کی طرح رواں ہیں۔ اردو کے جدید اور جدید تر لکھنے والوں کے ساتھ جدید اردو ادب کے طلبہ اور قارئین کے ادبی اور تنقیدی شعور کی تربیت اور جدید طرز احساس کی پرداخت زیادہ تر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی مرہون منت ہے۔ اس دعوے کے ثبوت کے لئے ہمیں اردو پر ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کے اثرات کا نقطہ آغاز تلاش کرنا ہوگا۔ جہاں تک ہم تلاش کر پائے ہیں اس کے مطابق ہمیں ن۔م۔ راشد کا ایک مضمون "ادبیات میں اجتہاد" دعوت تأمل دیتا ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ "شاہکار" لاہور، بابت جولائی ۱۹۳۵ء میں اداریہ کے طور پر شائع ہوا تھا(ن۔م۔راشد، شخصیت اور فن، مرتبہ ڈاکٹر مغنی تبسم و ڈاکٹر شہریار، نئی دہلی ۱۹۸۱ء، ص ۱۹۳ تا ۱۹۷) کیا حسن اتفاق ہے کہ جولائی ۱۹۳۵ء کے رسالہ اردو میں اختر حسین رائے پوری کا مشہور مضمون "ادب اور زندگی" شائع ہوا۔ بہرحال اس اداریہ میں ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کے مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ ایلیٹ کا یہ مضمون ۱۹۱۹ء کی تصنیف ہے (Cordine Behr;'T.S.Eliot:A Chronology of his life and works)' مطبوعہ میکملن پریس ۱۹۸۳ء ص ۱۷)۔ راشد اور ایلیٹ کے مضمون کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو راشد کے مندرجہ ذیل اقتباسات پر نظر ٹھہرتی ہے: "دنیا بھر کے ادبیات پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ہر قوم کے ذہنی رجحانات دوسری قوم کے ذہنی رجحانات سے الگ ہوتے ہیں..... وقت کے مدوجزر سے خود بخود قوم کے احساسات، جمالی تصورات اور معیار اخلاق میں فرق پڑتا رہتا ہے۔ یہ تغیر قوم کے ادبی ذوق پر بھی اسی طرح اثر انداز ہوتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض اوقات قوم کے مطالبے پر یا اس مطالبے کے امید میں ادبی تغیرات واقع ہونے لگتے ہیں اور بعض اوقات ایک بہت بڑا جوہر جمود توڑنے کے لئے نمودار ہوتا ہے..... نوجوانوں کو، جن کے ہاتھ سے بالعموم نئی تحریکات شروع ہوتی ہیں، جمود اور تکرار ہمیشہ ناگوار گزرتی ہے اور وہ ہر گوشے میں جدت اور ندرت کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں..... مزید برآں اجتہاد کرنے کے لئے صرف قدیم ہیئات شعری کی تخریب ہی کافی نہیں بلکہ اس تخریب میں سے تعمیری ادب کو ایک نئی صبح کی طرح نمودار ہونا چاہیے۔ اس اجتہاد کا جواز صرف وہ افکار و خیالات ہی پیش کر سکتے ہیں جن کی خاطر کسی ادیب نے اپنے لئے نئے راستے اختیار کئے ہیں... " (ڈاکٹر مغنی تبسم: کتاب مذکور، ص ۱۹۳، ۱۹۷)۔

راشد نے اپنے مضمون میں کہیں ایلیٹ کا نام نہیں لیا، اس لئے دنیائے اردو میں ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کی

شاعرانہ شخصیت سے پہلی بار تعارف اور ان کی شاہکار نظم "ویسٹ لینڈ" کے مطالعے کا موقع رسالہ "اردو" کے شمارہ جنوری ۱۹۳۷ء میں بصورت ترجمہ فراہم ہوا۔ اس تعارف اور ترجمے کا پس منظر یہ ہے کہ عزیز احمد نے ۱۹۳۴ء میں جامعہ عثمانیہ سے انگریزی میں بی۔ اے آنرز کیا۔ ۱۹۳۵ء میں لندن گئے۔ وہاں سے ۱۹۳۸ء میں انگریزی میں بی۔اے آنرز کیا۔ عزیز احمد کے قیام لندن کے دنوں میں ایلیٹ کا ادبی اور اسٹیج کے حلقوں میں بہت چرچا تھا۔ ۱۵ جون ۱۹۳۵ء کو ایلیٹ کے ڈراما Murder in the Cathedral کی پہلی Performance کنٹربری کیتھیڈرل میں ہوئی۔ ناقدین نے اس کا فوراً پرجوش خیرمقدم کیا اور The New Yorker جیسے اخبارات نے اپنے تبصروں میں اس ڈراما کی بے حد تعریف و توصیف کی۔ اس کا یکم نومبر ۱۹۳۵ء لندن کے مرکزی تھیٹر میں افتتاح ہوا The Times نے ایک عظیم کھیل (Play) قرار دیا (Behr: کتاب مذکور، ص ۴۷)۔ عزیز احمد کی ایلیٹ سے دلچسپی کا حال ان کے مضمون "ای۔ایم۔فاسٹر سے ملاقات" سے معلوم ہوتا ہے وہ ۱۹۳۵ء میں تعلیم کے لئے انگلستان گئے تو سرما کی چھٹیاں پیرس میں گزار کر واپس آئے اور ۴ اکتوبر کو مولوی عبدالحق کا تعارفی خط لے کر فاسٹر سے ملاقات کے لئے گئے۔ اس ملاقات میں عزیز احمد لکھتے ہیں:

"میں نے جدید انگریزی شاعری کا ذکر چھیڑا۔ وہ ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کے مداح ضرور تھے، مگر میں نے ان کی تعریف میں کوئی خاص جوش نہیں دیکھا۔ کچھ عرصے بعد ان کے مضامین کے مجموعے Adinger Howest میں ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کا ذکر پڑھا تو اس تاثر کی تصدیق ہوئی۔ وہ ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی شاعرانہ شعبدہ گری کے قائل ضرور تھے مگر یہاں اور انسان کا ان پر اتنا اثر تھا کہ اینگلو کیتھولک تحریک میں انہیں کوئی قدر مشترک نہیں مل سکی تھی" (انتخاب عزیز، مرتبہ صدیق جاوید، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۳۴۹)۔ ۵ مارچ ۱۹۳۶ء کو فیبر اینڈ فیبر سے ایلیٹ کی کتاب Essays Ancient and Modern شائع ہوئی۔ اس پر ایف۔ آر۔لیوس نے Scrutiny (۱۹۳۶ء، پہلا شمارہ) میں تبصرہ کیا (importance of Scrutiny 'The مرتبہ Eric Bentley، نیو یارک ۱۹۴۸ء ص ۲۸۳، ۲۹۱)۔ ۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو فیبر اینڈ فیبر نے ایلیٹ کی کتاب Collected Poems شائع کی اور اس پر Scrutiny (۱۹۳۶ء شمارہ ۲) میں D.W.Harding کا تبصرہ شائع ہوا (Bentley: کتاب مذکور، ص ۲۹۴، ۵۲۲)۔ عزیز احمد (پیدائش ۱۱ نومبر ۱۹۱۳ء) میں اکیس سال کی عمر میں کئی مضمون تحریر کر چکے تھے۔ ان میں ان کا مضمون "جدید روسی تھیٹر" قابل ذکر ہے، جو رسالہ "اردو" شمارہ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس ذہنی اور تصنیفی پس منظر اور ۱۹۳۵ء۔ ۱۹۳۶ء کی ایلیٹ کے حوالے سے لندن کی ادبی فضا میں عزیز احمد نے ایلیٹ کی اجازت سے اردو نثر میں ترجمہ کیا جس کا تعارف

" رسالہ اردو" کے ۱۱ صفحات پر مشتمل ہے اور اس پر جینیوا ۱۹ اگست ۱۹۳۶ء کی تاریخ درج ہے۔ نظم کا ترجمہ ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے بہرحال اردو خوان دنیا نے "ویسٹ لینڈ" کا یہ تعارف اور ترجمہ رسالہ "اردو" کے شمارہ جنوری ۱۹۳۷ء میں ملاحظہ کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں یورپ میں کئی ہندوستانی طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے جنہیں ادب سے دلچسپی تھی اور وہ سوشلزم سے متاثر ہو رہے تھے۔ ان نوجوانوں نے انڈین پروگریسو رائٹرز

اورنگ زیب قاسمی

ایسوی ایشن کا مینی فیسٹو تیار کیا۔ اس انجمن کے لندن میں اجلاس ہونے لگے۔ ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند ادیبوں نے اپنی تحریک کا جو پہلا مینی فیسٹو تیار کیا تھا اس پر ڈاکٹر ملک راج آنند، سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے ایس بھٹ، ڈاکٹر ایس سنہا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے دستخط تھے۔ اس مینی فیسٹو میں ایک جگہ یہ کہا گیا تھا کہ:

"..... اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرستوں کے اجارے سے نکال کر عوام سے قریب تر لایا جائے...... ہم ہندوستان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے ملک کے انحطاطی پہلوؤں پر بڑی بے رحمی سے تبصرہ کریں گے" (خلیل الرحمن اعظمی: اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، علی گڑھ ۱۹۸۴ء، ص ۳۲)۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ عزیز احمد بھی ان دنوں یورپ میں تھے۔ وہ ادبی سطح پر سرگرم عمل بھی تھے، مگر اس انجمن کے سلسلے میں ان کا نام سامنے نہیں آتا۔ لندن سے سجاد ظہیر نے انجمن کا مینی فیسٹو ہندوستان میں اپنے دوستوں کو ارسال کیا۔ جن میں باہمی مشاورت ہوئی۔ سجاد ظہیر بھی ۱۹۳۵ء کے آخر میں تعلیم ختم کر کے ہندوستان لوٹ آئے۔ ان کی کوششوں سے ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو چند ماہ میں بے پناہ مقبولیت ہوئی، لہٰذا لکھنؤ میں اپریل ۱۹۳۶ء میں پریم چند کے زیر صدارت انجمن کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر انجمن کے جاری کردہ اعلان نامہ میں کہا گیا:

"..... زندگی ..... کی حقیقت اور اصلیت سے بھاگ کر ہمارے ادب نے بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی کی آڑ میں پناہ لی ہے ..... ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کی ترجمان بنا کر روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔" اس اعلان نامے میں ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین قدروں کے وارث ہونے اور اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے استفادہ کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا۔ ان سطور کا اگر دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کے بانیوں کے ذہن میں ایلیٹ کے افکار ضرور موجود ہیں جن کے ایک حصے سے انہیں اختلاف ہے اور روایت سے ہم آہنگی کے خیال سے انہیں اتفاق ہے۔

پریم چند نے اپنے خطبہ صدارت میں افادیت کو آرٹ کی میزان قرار دیا۔ ۱۹۳۷ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی جو کانفرنس الہ آباد میں منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت کے لئے مولوی عبدالحق کو آنا تھا۔ وہ نہ آسکے مگر ان کا خطبہ کانفرنس میں پڑھ کر سنایا گیا۔ اس خطبے کے بعض حصوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے ذہن میں ایلیٹ کے مشہور مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" کی بازگشت ہے اگرچہ انہوں نے مضمون اور مضمون نگار کا نام نہیں لیا۔ مولوی عبدالحق نے لکھا تھا کہ: زندگی مسلسل ہے، اسی طرح ادب بھی مسلسل ہے، اس لئے گزشتہ کا مطالعہ حال کے سمجھنے کے لئے اور ماحول کا مشاہدہ حال کی اصلاح اور آئندہ کی تیاری میں مدد دے گا۔ ادب میں بے شک آپ کو نئے اسلوب، نئے خیالات پیدا کرنے ہوں گے اور بہت سے پرانے مضر خیالات اور توہمات کی بیخ کنی کرنی ہو گی ..... ہمیں پچھلوں کا کام اور ان کی محنتوں سے حسب ضرورت فائدہ اٹھانا چاہیے اور ایسے ادب کی بنیاد ڈالنی چاہیے جو ہماری زندگی میں تازگی پیدا کرے اور ہماری جدید ضروریات کے مطابق ہو اور پھر آئندہ آنے والے اپنی نئی ضروریات اور حالات کے مطابق اس میں ترمیم و اصلاح کریں اور یہ سلسلہ جاری رہے ـ ـ ـ ـ ـ اس لئے ہر ترقی پسند ادیب کا فرض ہے کہ وہ گزشتہ ادب

اورنگ زیب قاسمی

کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ ہمارے ادب میں کہاں تک آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے؟ کن چیزوں کا ترک کرنا مناسب ہے؟ جو چیز آپ کو ورثا" ملی ہے اگر آپ اس کے حسن و قبح سے واقف نہیں ہیں تو اصلاح کیسی اور انقلاب کیسا؟ ہم صرف حال ہی کے سامنے جواب دہ نہیں، آئندہ کے بھی جوابدہ ہیں" (اعظمی: کتاب مذکور، ص ۴۰، ۵۰، ۵۱) ترقی پسند ادب کے ترجمان رسالہ "نیا ادب" کے پہلے اداریے میں ایک غلط فہم اور عام تاثر کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا: "یہ کہنا غلط ہے کہ ترقی پسند ادب پرانی چیز کے خلاف نفرت و احتجاج کا نام ہے۔ ترقی پسند ادب ہر چیز کو اس کے ماحول اور تاریخی پس منظر میں دیکھتا ہے اور ادبی کارناموں کی یہی کسوٹی ہے۔ ترقی پسند ادب قدیم ادب سے ناتا نہیں توڑتا۔ وہ پرانے ادب کی بہترین روایات کا حامل ہوتا ہے اور انہیں روایتوں کی بنیاد پر نئی عمارتیں کھڑی کرتا ہے۔ ترقی پسند ادب ہی دراصل قدیم ادب کا سب سے معتبر امین اور وارث ہے" (اعظمی: کتاب مذکور، ص ۵۹)۔

اس اقتباس کے پیش نظر یہ کہنا شاید محض قیاس ہو کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے تصور روایت کا یورپ اور امریکہ میں جو وزن محسوس کیا جا رہا تھا اسے ترقی پسندوں کے ذی فہم حلقے نظر انداز نہ کر سکے۔ وہ بھی جدید نقطہ نظر اور نئے تصورات کے حامی اور موید ہیں مگر ادب میں جدت و ندرت کی ضرورت کے بارے میں ان کی تحریروں میں اصلاح و اجتہاد کی تلقین کی بجائے انقلاب اور بغاوت کا آہنگ پایا جاتا ہے۔

بہرحال اس زمانے میں ادب میں نئے خیالات اور نئے اسلوب اور نئے آہنگ کا رواج عام ہو رہا تھا۔ ترقی پسندوں کے علاوہ ادیبوں میں مغربی ادب سے بہرہ ور ایسے نوجوان بھی تھے جو یورپ کی ادبی تحریکوں مثلاً" اظہاریت، اشاریت، اور تجریدیت وغیرہ سے متاثر تھے۔ ان میں میراجی، راشد، محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں اور ممتاز مفتی وغیرہ ترقی پسند مصنفین کے متوازی علمی و ادبی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ انہی دنوں چند ہم خیال دوستوں نے لاہور میں "بزم داستان گویاں" کے نام سے ایک حلقہ قائم کیا جس کا پہلا جلسہ ۲۹ اپریل ۱۹۳۹ء کو حفیظ ہوشیارپوری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ بزم یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء کو حلقہ ارباب ذوق میں بدل گئی (یونس جاوید: حلقہ ارباب ذوق لاہور ۱۹۸۴ء ص ۲۳، ۲۴) حلقہ ارباب ذوق کو انجمن ترقی پسند مصنفین کا رد عمل بھی کہا گیا، مگر اس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ انجمن اور حلقہ میں ایک قدر مشترک نئے ادب کی ترویج و ترقی کی خواہش تھی۔ حلقہ ارباب ذوق سے متعلق ادیبوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین سے تصادم کی بجائے ادب کے مسئلہ پر ہمیشہ تعاون کیا۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی نے لکھا ہے: "تیسری کل ہند کانفرنس (مئی ۱۹۴۲ء) میں دہلی میں ـ ـ ـ ـ ـ ادیب بھی شریک ہوئے جو ادبی نظریات میں ترقی پسند تحریک سے متفق نہیں تھے، خاص طور پر حلقہ ارباب ذوق لاہور کا گروپ جو ادب کی افادیت کا منکر تھا اور ترقی پسند ادب کی تحریروں کو "پروپیگنڈہ" کہتا تھا۔ اس گروہ کے اکثر ادیب انگلستان اور فرانس کے اشاریت پسندوں اور ہیئت پرستوں سے متاثر تھے۔ اور فرائڈ کے نظریہ جنس کو اپنی شاعری اور افسانہ نگاری میں برت رہے تھے، چنانچہ اس اجلاس میں جہاں ایک طرف سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم، کرشن چندر، مجاز، سردار جعفری، سبط حسن اور رشید جہاں کا گروہ تھا تو دوسری طرف راشد، میراجی، مولانا صلاح الدین احمد اور قیوم نظر وغیرہ نیز مولانا عبدالمجید سالک اور حفیظ جالندھری اس کانفرنس میں شریک تھے" (اعظمی: کتاب مذکور، ص ۴۳، ۴۴)۔ اس باہم دگر ہمدردانہ رویے اور باہمی افہام کا بنیادی سبب ادب کا ناتا تھا۔ ترقی پسند انجمن سے متعلق مصنفین مغرب کے نئے ادبی اور تنقیدی

تصورات سے متعارف ہوئے۔ اسی طرح حلقہ ارباب ذوق کے ادبی مقاصد سے دلچسپی رکھنے والے بیشتر اصحاب بھی جدید یورپی ادبی تحریکوں سے واقف تھے۔ اس یک نظری اور ہم خیالی کے باوجود انجمن اور حلقے کے نقطہ نظر میں تفاوت بڑھتا چلا گیا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ رسائل میں عموی بحث کا محور دو موضوع رہے چنانچہ بقول پروفیسر صدیق کلیم: "اس عرصے (۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء) میں اگر ہم ادبی رسائل کا مطالعہ کریں تو ہمیں بے شمار تنقیدی مضامین ملیں گے جو کم وبیش ان دو عنوانات کے تحت لکھے گئے ہیں: ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب" (تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند' مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۷۲ء' ص ۳۹۱)۔ انجمن اور حلقے کی پرجوش علمی سرگرمیوں کے باوجود ٹی۔ ایس۔ایلیٹ کے شعری اور تنقیدی کاموں سے عدم دلچسپی کا رجحان نظر آتا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ انجمن اور حلقہ کی سرپرستی کے بغیر محض اپنے کارناموں کے بل بوتے پر اور مغرب کے ادبی حلقوں میں مقبولیت کے باعث برعظیم میں بھی توجہ کا مرکز بننے لگا۔ عزیز احمد کے "ویسٹ لینڈ" کے ترجمہ اور ایلیٹ کے تعارف کے بعد ممکن ہے ادھر ادھر اردو کے کسی تنقیدی مضمون میں ایلیٹ کا ذکر آیا ہو' مگر ہماری تلاش کے مطابق ۱۹۳۹ء میں آل احمد سرور کی "انگریزی شاعری" کے موضوع پر ایک ریڈیائی تقریر میں ایلیٹ کا ذکر آیا ہے۔ سرور کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ تنقیدی اشارے کے نام سے پہلی بار ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ زیر نظر مضمون کے فٹ نوٹ میں مولف نے وضاحت کر دی ہے کہ "اس مضمون میں لیوس (Lewis) کی کتاب Hope For Poetry سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔ انگریزی کی شاعری کی ترقی میں سائنس ایک دیوار کی طرح حائل نہیں بلکہ اسے مدد دینے اور اس کے لئے خام مواد مہیا کرنے کے لئے ہے۔ سائنٹیفک مزاج' مشینوں کے دور' ریڈیو' ہوائی جہاز' انجن' آپریشن ٹیبل کو غیر شاعرانہ کہنے والے شاعری کی ترقی میں سدراہ بنتے ہیں۔ ان میں ایک آہنگ یا شعریت ہے۔ شاعری ان سے بھی کچھ نہ کچھ اخذ کر سکتی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ایلیٹ کی ایک مشہور نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:

Let us go then you and i
When the evening is Spread out against the sky
Like a patient ethas upon a table

چنانچہ کئی جدید شعرا مثلاً" لیوس (C.Day Lewis)' آڈن (Auden)' سپینڈر (Spender) وغیرہ کے یہاں بجلی کے تاروں' انجن کی بھاپ اور عظیم الشان مشینی قوتوں سے تشبیہ و استعارے اخذ کئے گئے ہیں۔ ایلیٹ مابعد الطبیعیاتی شعرا سے زیادہ متاثر ہے ہر دور کا ایک فلسفی ہوتا ہے اس دور کا فلسفی ٹی۔ایس۔ ایلیٹ ہے اس کی نظم "خرابے" کا ترجمہ رسالہ "اردو" میں چھپ چکا ہے۔ اس میں اور "کھوکھلے آدمی" میں اس دور کی مایوسی اور تلخی پورے طور پر موجود ہے۔ چاہے وہ ایلیٹ کا ہیرو Pruefrock ہو یا ہکسلے کا Spandrell' دونوں بس ذہن ہی ذہن رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ کھو چکے ہیں اور اتنا ذوق یقین نہیں رکھتے کہ کچھ پا سکیں۔ ہمارے یہاں چونکہ اتنی تڑپ' خلش اور آرزو نہیں ہے' اس لئے ہم ان کا تصور بھی اچھی طرح نہیں کر سکتے۔ ایلیٹ تو خیر فلسفی ہے اور فلسفی ادھر یا ادھر نہیں ہوتا' وہ محض بلند ہوتا ہے (آل احمد سرور: تنقیدی اشارے لکھنؤ ۱۹۴۹ء ص ۱۷۶-۱۷۷)۔ اس کے بعد کئی سال ایلیٹ کے تذکرے کا سراغ نہیں ملتا۔ محمد حسن عسکری' جو ادبیات کے بہت زیرک طالب علم اور انگریزی ادب کے استاد تھے' اپنے

وسعت مطالعہ اور وقت نظر کے لئے بہت مشہور رہے ہیں۔ اردو میں جدید یورپی ادب کی ممتاز شخصیات اور نئے سے نئے ادبی رجحان کو متعارف کرانے میں ان کا بڑا حصہ ہے محمد حسن عسکری کی تحریروں اور ترجموں کے ذریعے سے بیسویں صدی کی پانچویں دہائی سے لے کر جنوری ۱۹۷۸ء میں ان کی وفات تک نئی نسلیں ادب کے عالمی تناظر سے واقف ہوتی رہی ہیں۔ عسکری نے جس مرعوب کن انداز میں ایلیٹ کو پیش کیا اور پھر اس سے اختلاف کرکے اسے اردو میں ایک متنازع شخصیت بنایا یہ اس کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں ایلیٹ کا مطالعہ ایک علمی امتیاز قرار پایا۔ عسکری نے اپریل ۱۹۴۳ء کے رسالہ "ساقی" دلی میں اپنے مشہور کالم "جھلکیاں" میں جدید شاعری کے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے دو مقامات پر ایلیٹ کا یوں ذکر کیا ہے: "جن شاعروں نے کسی سیاسی نظریے یا مذہبی یا نیم مذہبی نقطہ نظر کو اپنا لیا ہے ان کے یہاں ابہام کا امکان نسبتاً" کم ہے لیکن جب شاعر اپنے آپ کو کسی آفاقی نظام سے وابستہ کرنے پر تیار نہ ہو تو ایک چیز سے دوسری چیز کا رشتہ تلاش کرنے کے لئے اسے مجبور ہو کر سائنس کے معروضی قانون (Affective Association) کا سہارا لینا پڑے گا۔ ایسا ہی اردو میں بھی ہونا شروع ہو گیا ہے اور اسے روکنا نہ میرے بس کی بات ہے نہ آپ کے' جب تک کہ ہم دنیا کو نہیں بدل سکتے۔ یہ تو خارجی اور معروضی حالات کا ذکر تھا لیکن ابہام پر نظریاتی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے ہم اسے بذات خود ایک شعری نقص قرار دے سکتے۔ نقص تو درکنار' کولرج نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ شعر سے ہم اس وقت سب سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں جب ہم نے اسے پوری طرح نہیں بلکہ جزوی طور سے سمجھا ہو۔ اب کولرج کے مخالف مدرسہ فکر کے ایک نمائندے کی رائے بھی سن لیجئے: ٹی۔ایس۔ایلیٹ کا خیال ہے کہ ہم لغوی معنی سمجھے بغیر بھی شعر کو سمجھ سکتے ہیں۔ ٹی اظال میں "ادبی روایت" سے کوئی ایسا شعر پیش کرنے سے قاصر ہوں جو لغوی معنی سے اس قدر آزاد ہو' لیکن اس کی سب سے بڑی مثال تو جوئس کا ناول "Pinnegans Wake" ہے۔ جو لوگ اس کتاب کے سخت دشمن ہیں اتنا تو وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسے باآواز بلند پڑھنے سے لطف حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خود جوئس کی چند نظمیں ایسی ہیں جن کا مطلب سیدھا سادا ہے' لیکن ان کے لفظوں کی موسیقی اتنی تسلی بخش ہے کہ ہم معنی کی طرف توجہ کرنا بھی بھول جاتے ہیں۔ گو اردو میں ابھی ایسی نظمیں پیدا نہیں ہوئیں لیکن ہمارے دوستوں کو ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ تکنیک تو الگ' ایلیٹ نے تو سنسکرت کے اشلوک تک اپنی نظم میں نقل کر دیے ہیں۔ اسی طرح فارسی کے اسالیب کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے۔ نئی دنیا میں کنوئیں کے مینڈکوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اپنی اور صرف اپنی اور محض اپنی ادبی روایات کو کوٹھری میں بند کر کے نہیں رکھا جا سکتا۔ ہر قوم اور زبان کا علم و ادب ساری دنیا کی مشترکہ جائیداد ہے روایت کا مفہوم اتنا تنگ نہیں کہ باہر کی کوئی چیز اس میں شامل ہی نہ ہو سکے۔ ادب کی تاریخ اس مفہوم کی تردید کرتی ہے۔ روایت تو ایک بڑھنے اور پھیلنے والی چیز ہے جو عجیب سے عجیب تجربے کو بھی اپنا لیتی ہے۔ اگر اپنی روایت کو وسیع کرنے کا احساس ان لوگوں میں نہ ہوتا تو ہمیں نہ چاسر نظر آتا نہ شیکسپیر نہ ملٹن' نہ پروست' نہ جوئس اور نہ ان تجربات سے ان قومی اور نسلی خصوصیات کو کوئی خدشہ ہو سکتا ہے جن پر آپ اس قدر مصر ہیں۔ وہ تو خود بخود اپنی جگہ بنالیتی ہیں' لیکن شعوری طور پر بھی نئی اردو شاعری میں ملکی روایات کا احترام نظر آتا ہے۔ راشد کی تشبیہیں دیکھیے جسے آپ بھول گئے تھے۔ میراجی' مختار صدیقی وغیرہ کے یہاں بار بار کرشن اور

اورنگ زیب قاسمی

رادھا کا ذکر اور ہندو فلسفے کے اثرات ملاحظہ فرمایئے بلکہ ایسی نظم مشکل ہی سے ملے گی جس میں ہندوستانی زندگی اور مزاج کا عکس نہ جھلکتا ہو' تاہم نئی شاعری کے سلسلے میں یہ ضرور یاد رکھیے کہ ہماری ادبی روایات میں ساری دنیا کا ادب شامل ہے" (محمد حسن عسکری : جھلکیاں' مرتبہ سہیل عمر خانہ عمر' مطبوعہ لاہور' ۷۵' ۲۳۴)۔

عسکری کلیہ کلم اوراق گم شدہ کی حیثیت اختیار کرچکا تھا کہ رسالہ " نقوش "(۱۹۴۹ء شمارہ ۵) میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا مضمون' " روایت کی اہمیت " شائع ہوا۔ آئندہ برس یہ مضمون" ۱۹۴۹ء کا بہترین ادب " میں نقل ہوا۔ اس مضمون کی اشاعت سے ایلیٹ کے مطالعے کا احساس عام ہوا۔ زیر نظر مضمون کی ابتدائی سطور بعض دوسری معلومات کے اعتبار سے بھی اہم ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:"ٹی ایس ایلیٹ نے ایک جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جو لوگ اپنی روایات کا خیال نہیں کرتے اور جان بوجھ کر ان سے چشم پوشی کرتے ہیں' ان کی حیثیت ان غیر تہذیب یافتہ جنگلیوں اور وحشیوں کی سی ہوتی ہے جنہیں عقل و شعور سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ایلیٹ کا یہ خیال مجھ تک اس وقت پہنچا جب میں ایک انڈر گریجوایٹ کی حیثیت سے ایک یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ اس وقت تک میں نے ایلیٹ کو پوری طرح نہیں پڑھا تھا۔ صرف یہ سنی سنائی بات میرے ذہن میں تھی کہ ٹی۔ایس۔ ایلیٹ انگریزی ادب کا سب سے بڑا باغی اور جدت کا علمبردار ہے۔ اور دنیا جہان کے نئے ادیب اس کو اپنا امام سمجھتے ہیں " (بہترین ادب' مرتبہ ادارہ ادب لطیف' لاہور' ص ۱۳۶)۔ ۱۹۵۳ء میں اسی مضمون کے عنوان (روایت کی اہمیت) سے عبادت بریلوی کے تنقیدی و تحقیقی مقالات کا مجموعہ شائع ہوا ہے یہاں اس مضمون میں کسی قدر ترمیم کردی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس سلسلے کے دوسرے دو مضمون "اردو شاعری میں حب وطن کی روایت " اور " اردو تنقید میں روایت اور تجربہ" بھی شامل ہیں (عبادت بریلوی: روایت کی اہمیت' مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۳ء)۔

ایلیٹ کی شاعری میں تاثر آفرینی کی یہ کیفیت ہے کہ اردو ادب کی پرانی نسل سے تعلق رکھنے والوں میں بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں ان بزرگوں میں سے جنہوں نے اپنے دل ودماغ کھلے رکھے اور جو نئی تحریکوں کی حمایت کرتے ہیں۔ ایسی کیاب شخصیات میں سر عبدالقادر کا نام بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے " ہماری شاعری کا ایک نیا میلان " اشاریت اور ابہام " کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو ماہنامہ " نگار " شمارہ جنوری و فروری ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایلیٹ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ ہم یہاں ان کی درج ذیل عبارت بطور مثال نقل کرتے ہیں : " علامات وضع کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: پہلی یہ کہ پرانی علامات کو نئے معنی پہنائے جائیں جیسا کہ دانتے اور اقبال نے کیا ہے ' دوسری صورت یہ کہ نئی علامات کو ایک ایسے ماحول میں پیش کیا جائے جس سے قاری کو اس تصور تک پہنچنے میں مدد ملے جو شاعر کا مقصود ہے ' یعنی وہ داخلی اور تخیلی ہونے کے باوجود بعید ازقیاس نہ ہو' مثلاً W.B.Yeats کی شاعری کے ابتدائی دور میں زندگی کی سنگلاخی سے گریز پایا جاتا ہے اور وہ تخیلات کی جنتیں آباد کرکے اس میں پناہ لیا کرتا تھا Fairy Land اس کے ہاں ایک علامت ہے Imagination کے لئے T.S.Eliot نے اپنی مشہور نظم Waste Land میں " پانی " کو آزادی اور روح کی بالیدگی کی علامت قرار دیا ہے اور Land Waste کی مناسبت سے یہ بعید از قیاس بھی نہیں " (مقالات عبدالقادر' مرتبہ حنیف شاہد' لاہور ۱۹۸۹ء ص

اورنگ زیب قاسمی

۳۴۴' ۳۴۵)۔

برصغیر پاک و ہند کی یونیورسٹیوں میں انگریزی اور اردو ادب وغیرہ کے ایم اے کے نصاب میں مغربی تنقید کی تاریخ اور اس کے ارتقاء کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے' مگر مطالعے میں آسانی کی خاطر فن تنقید کی تاریخ کے ادوار تجویز کر دیئے جاتے ہیں یا ان عہد ساز اور نظریہ ساز فلسفیوں اور نقادوں کی تخصیص کردی جاتی ہے جو اپنے دور کے نمائندہ ہوتے ہیں ' مثلاً" پنجاب یونیورسٹی میں انگریزی پوسٹ گریجویشن کی سطح پر ایلیٹ کی شاعری بھی نصاب کا حصہ ہے ۔ اردو ایم۔ اے کے تنقید کے پرچے کے لئے ایم اے انگریزی ' اردو اور پنجابی میں تنقید کے پرچے میں ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کو بحیثیت نقاد شامل کیا گیا ہے۔ انگریزی میں تاریخ تنقید کی کتابیں تجویز ہوتی ہیں جن میں ارسطو کی بوطیقا (ترجمہ عزیز احمد) کے علاوہ Scott James کی The Making of Literature اور David Daiches کی Approaches to Literature شامل ہیں۔ لہٰذا اردو میں بھی مغرب کے تنقیدی افکار کی تاریخ قلم بند کرنے کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا' چنانچہ " تنقیدی نظریے " کے عنوان سے ملک حسن اختر نے نومبر ۱۹۶۶ء میں ایک کتاب شائع کی۔ اس کے ساتھ دسمبر ۱۹۶۶ء میں پروفیسر سجاد باقر رضوی نے " مغرب کے تنقیدی اصول " کے نام سے اپنی کتاب شائع کی۔ تنقید میں ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کو بیسویں صدی کا ترجمان اور نمائندہ نقاد قرار دیتے ہوئے متذکرہ کتابوں کے آخری باب میں ایلیٹ کے تنقیدی نظریات و خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ ان کتابوں میں عظیم مغربی ناقدین کے افکار پیش کرتے ہوئے ان کے سوانح کے بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا' چنانچہ ملک حسن اختر کا ایلیٹ پر باب ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے: " ایلیٹ کا نظریہ روایت نہ صرف تنقیدی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتا ہے بلکہ ایلیٹ کے نظریہ شعر و انتقاد کو سمجھنے کے لئے بھی بڑا ضروری ہے۔ ایلیٹ کے ہاں نقاد کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ روایت کا تحفظ کرے چنانچہ ایلیٹ کے تنقید اور شاعری کے متعلق خیالات کا جائزہ لینے سے پیشتر ہم ایلیٹ کے نظریہ روایت کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد مولف نے پہلے چھ صفحات میں ایلیٹ کے تصور روایت کامفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: "ایلیٹ کا نظریہ روایت آرنلڈ سے کسی حد تک متاثر ہوا ہے ..... مگر ایلیٹ بقول سمن لیوی پوری طرح آرنلڈ کا مرہون منت نہیں بلکہ وہ خود اس کا (روایت کے نظریے کا) موجد اور شارح ہے" (حسن اختر: تنقیدی نظریے ' لاہور ۱۹۶۶ء ص ۱۶۸' ۱۶۹' ۱۷۷)۔

آگے چل کر مولف نے ایلیٹ کے چند مضامین مثلاً" شاعری کا مصنف' شاعری اور ڈراما' کلاسیک کیا ہے ؟ مذہب اور ادب' تنقید کا منصب وغیرہ کے حوالے سے ایلیٹ کا تصور تنقید واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب " مغرب کے تنقیدی اصول " کے پیش لفظ میں مولف لکھتے ہیں کہ انہوں نے : " یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے (ایم اے کلاس) کے طلبہ اور طالبات ..... کو پڑھانے کے لئے مغرب کے تنقیدی تصورات کو اردو میں منتقل کرنا شروع کیا جو ایک کتاب کی صورت اختیار کر گئے۔ ایلیٹ پر ۱۸ صفحات کے مضمون کا آغاز ایلیٹ کی ذہنی تنظیم کے بیان سے ہوتا ہے جو رومانوی روایت کے رد میں اروِنگ بیبٹ' ٹی ای ہیوم اور ایذرا پونڈ کے خیالات سے وجود میں آئی۔ پھر ایلیٹ کے قابل ذکر تنقیدی اصولوں کا جائزہ لیا گیا ہے' مثلاً" ادبی تنقید میں فن کار کی بجائے فن پارے کی اہمیت ' تنقید کا فریضہ کیا ہے اور ناقد کا کیا کام ہوتا ہے' روایت کا تصور اور اس کی اہمیت ' شاعری شخصیت کا اظہار نہیں بلکہ اس سے فرار ہے' استعارہ شاعری کا اصل

ہو رہا ہے' ایلیٹ کے مضمون " علت اور اس کے مسائل " میں غیر شخصی اظہار فن کا نظریہ اور اس پر Eliseo Vives کے اعتراض پر بحث۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب " اشارات تنقید " بھی طالب علموں کے لئے لکھی گئی ہے۔ مؤلف نے اجمال اور اختصار سے کام لیا ہے۔ ایلیٹ کی تنقیدی تصانیف اور اس کے تنقیدی خیالات سات صفحات پر محیط ہیں۔ مؤلف نے ایک ایک پیراگراف میں ایلیٹ کے مضامین کا خلاصہ دے دیا ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھیے: " شاعری جذبات کے سیلاب کا نام نہیں بلکہ ان سے بچنے اور ان سے گریز کی ایک صورت ہے۔ یہ شخصیت کا اظہار و انعکاس بھی نہیں بلکہ شخصیت سے گریز اور اس کا اخفا ہے ایلیٹ کہتا ہے: " شاعر کی خصوصیت اس کی شخصیت سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کے میڈیم (وسیلہ اظہار) سے " (سید عبداللہ 'اشارات تنقید' لاہور ۱۹۶۶ء ص ۱۵۶'۱۵۷)۔ یہ کتاب Outlines کے طرز اردو میں ایک اچھی کوشش ہے۔ عام طالب علموں میں ایلیٹ کو روشناس کرانے میں اس کتاب نے بڑی کامیابی حاصل کی ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مغربی تنقید کی تاریخ اور اس کے ارتقا کے سلسلے میں ایک کتاب " ارسطو سے ایلیٹ تک " کے نام سے ہے طریق کار اور نفس مضمون کے اعتبار سے یہ بہت مختلف کتاب ہے اس کے مترجم و مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں۔ اس کے ٹائٹل نے ایلیٹ کا نام روزمرہ اور محاورہ میں شامل کر دیا ہے۔ یہ کتاب شاعری ' ڈراما ' ناول اور تنقید سے متعلق مسائل پر " مغربی تنقید کے شاہکار مضامین کا اردو ترجمہ " ہے۔ مؤلف و مترجم نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب نوجوانوں کے لئے مرتب کی ہے تاکہ وہ ادبی فکر سے براہ راست شناسائی حاصل کر سکیں۔ ترجمے کی اہمیت اور ضروریات کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف نے لکھا ہے: " ... ہر زندہ زبان کا ادب مختلف ادوار میں مختلف زبانوں اور ان کے ادبیات کے اثرات قبول کر کے اپنی شکل بدلتا آگے بڑھتا ہے۔ اردو زبان و ادب کے ساتھ ' دنیا کی دوسری بڑی زبانوں کی طرح ' یہی فطری عمل ہوتا رہا ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں اس نے برصغیر کی مختلف زبانوں اور ان کے ادبیات کے اثرات سے اپنے خدوخال ابھار کئے ..... انیسویں صدی سے اس نے انگریزی زبان و ادب کے اثرات سے اپنے وجود کو نئی زندگی دینے کا عمل شروع کیا اور اب یہ زبان سارے مغرب کے اثرات سے اپنے تخلیقی و فکری وجود کو قائم کر کے اپنی شکل بنا رہی ہے (جمیل جالبی: ارسطو سے ایلیٹ تک ' کراچی ۱۹۷۵ء ص ۷۰' ۷۱' نیز دیکھیے پیش لفظ و اندرونی ٹائٹل)۔ کتاب کا پہلا حصہ ۸۱ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ڈھائی ہزار سال کی مغربی تنقیدی فکر کا ارتقا پیش کیا گیا ہے۔ یہ مقدمہ دراصل نئے پرانے مغربی ناقدین کے نظریات کا مختصر تعارف ہے۔ (ان میں آئی۔ اے۔ رچرڈز اور ایف۔ آر۔ لیوس کے درمیان ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا تعارف ہے)۔ اس کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ مغربی تنقید کے ہر شاہکار کو ترجمے کی صورت میں پیش کرنے سے پہلے متعلقہ مصنف و مفکر کا اجمالی تعارف ' اس کے مجموعی کام پر مختصر تبصرہ اور زیر نظر مضمون پر تمہیدی رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا آخری تنقیدی مفکر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ہے۔ یہاں ایلیٹ اور اس کے تنقیدی کارناموں کا پانچ صفحات میں جائزہ لیا گیا ہے اس کے بعد ایلیٹ کے دو نہایت معروف اور مشہور مضمون " روایت اور انفرادی صلاحیت " (۱۹۱۷ء) اور " شاعری کا سماجی منصب " (۱۹۴۵ء) شامل ہیں۔ پھر کتابیات کی فہرست اور اشاریہ ہے۔ بہرحال یہ

اورنگ زیب قاسمی

کتاب اپنے نفس مضمون اور طریق پیشکش کے لحاظ سے اہم ہے اور پاکستان اور ہندوستان میں بار بار چھپ رہی ہے۔ اس کتاب کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایلیٹ کا نام زبان زد عام کر دیا ہے۔

ہماری معلومات کے مطابق ۱۹۴۳ء میں " ویسٹ لینڈ " کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ اس کے بعد سترہ اٹھارہ سال ایلیٹ کی کسی تحریر کا ترجمہ نہیں ہوا۔ ایلیٹ کا تنقیدی مضمون " روایت اور انفرادی صلاحیت " ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس نے تنقیدی حلقوں میں بحث کے دروازے کھول دیئے۔ انگریزی میں اس سے اتفاق اور اختلاف پر بھی بہت سے مضامین شائع ہوئے۔ اردو رسالہ " سویرا " کے شمارہ ۱۷۔۱۸ میں ' جو ۱۹۵۴ء یا اوائل ۱۹۵۵ء میں چھپا ' مختار صدیقی کا ایلیٹ کا متذکرہ مضمون کا ترجمہ ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مترجم نے " ایلیٹ 'روایت اور انفرادی صلاحیت " کے عنوان سے ایک توضیحی مضمون میں لکھ کر شامل کیا۔ ادارے نے اردو کے مندرجہ ذیل ادیبوں اور نقادوں سے ایلیٹ کے مضمون پر تبصرے حاصل کئے: مظفر علی سید ' ظہیر کاشمیری ' عبادت بریلوی ' سجاد ظہیر ' عارف عبدالمتین ' ممتاز مفتی ' ڈاکٹر محمد حسن ' شاد عارفی ' اسی شمارے میں روایت کے تصور پر " خوشبو کی ہجرت " کے زیر عنوان شیخ صلاح الدین ' ناصر کاظمی ' انتظار حسین اور حنیف رامے کے درمیان ایک مکالمہ بھی شامل ہے کہا جاسکتا ہے کہ ایلیٹ کے اس مضمون کے اردو ترجمے اور اس کے بارے میں اردو کے ممتاز ادیبوں کی آرا کی اشاعت سے ایلیٹ کی طرف عام قارئین کی توجہ منعطف ہوئی۔ اردو میں ایلیٹ شناسی کا یہ اہم مرحلہ ہے ' چنانچہ ڈاکٹر وحید قریشی نے ۱۹۵۹ء میں ایلیٹ کے مضمون کے تذکرے ' ترجمے اور سمپوزیم کے حوالے سے " تنقید اور روایت " کے عنوان سے مضمون لکھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال کے مطابق چونکہ " ایلیٹ کے پیش نظر اس مقالے میں زیادہ تر شاعری ہی تھی ' ہمارے ادبا نے بھی شاعری کو پیش نظر رکھ کر روایت کی تشکیل پر زور دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ روایت کے بعض پہلو پوری طرح ابھار نہیں ہو سکے۔ نقاد کے لئے روایت کی کیا اہمیت ہے؟ اس کے نقد و نظر کے اصولوں کو روایت سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ قدیم ادب کا تجزیہ کرنے میں روایت کا ادراک کس حد تک اور کس طرح ضروری ہے؟ ان مسائل کا تھوڑا بہت جواب ایلیٹ نے دوسرے مقالے The Function of Criticism میں دیا ہے " (وحید قریشی: تنقیدی مطالعے ' لاہور ۱۹۶۷ء ص ۱۵۳'۱۵۴)۔

" روایت اور انفرادی صلاحیت " کا تین دوسرے لوگوں نے بھی ترجمہ کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا ترجمہ ان کی مستقل کتاب " ایلیٹ کے مضامین " لاہور ۱۹۸۹ء میں شامل ہے اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہی ترجمہ ان کی مرتبہ کتاب " ارسطو سے ایلیٹ تک " میں شامل ہے جس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پروفیسر صدیق کلیم نے زیر نظر مضمون کا ترجمہ سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی ' گورنمنٹ کالج لاہور کے لئے کیا جو سوسائٹی کی طرف سے ۱۹۹۸ء میں شائع کردہ کتاب " نئی تنقید " میں شامل ہے۔ تیسرا ترجمہ رسالہ " نقوش " (مئی ۱۹۶۵ء) میں شائع ہوا۔ ایلیٹ کا انتقال جنوری ۱۹۶۵ء کو ہوا۔ مدیر " نقوش " نے موقع کی مناسبت سے زیر نظر شمارہ میں ایلیٹ کے ایک مضمون اور ایک نظم کا ترجمہ شائع کیا۔ مضمون کے ترجمہ نگار افضال حسین نقوی ہیں۔ انھوں نے مضمون کے عنوان کا ترجمہ " ادبی روایت اور شخصی استعداد " کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمہ نگار نے شعوری طور پر پہلے تراجم سے کچھ فرق کرنے کی کوشش کی ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کے مجلہ " نئی تحریریں " لاہور کے شمارہ ۳ (غالباً ۱۹۵۹ء) میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مشہور

مضمون "کلاسیک کیا ہے" کا ترجمہ از سید قاسم محمود شائع ہوا۔ ٹی۔ایس۔ ایلیٹ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے: "میں نے جو موضوع چنا ہے وہ صرف اتنا سا سوال ہے کہ کلاسیک کیا ہے؟ اور یہ کوئی نیا سوال نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اسی عنوان سے مشہور مضمون سانت بو St.Beuve کا ہے۔ "ٹی۔ایس۔ایلیٹ کے مضمون کی اہمیت اور اس کی تفہیم کے پیش نظر ادارہ "نئی تحریریں" نے اہتمام کیا کہ ایلیٹ کے مضمون سے پہلے سانت بو کا مضمون مترجمہ غلام یعقوب انور اور ایلیٹ کے ترجمہ مضمون کے بعد "کلاسیک کیا ہے؟" کے عنوان پر سید عابد علی عابد سے مضمون لکھوا کر شائع کیا۔ یہ تینوں مضامین "کلاسیکیت اور رومانیت' ایک مطالعہ" مرتب یوسف زاہد (لائل پور ۱۹۶۷ء) میں بھی شامل ہیں۔ یاد رہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اس مضمون کا ترجمہ کیا "ایلیٹ کے مضامین" ص ۱۹۵)۔

اسی طرح ایلیٹ کے ایک اور مضمون کے دو ترجمے مختلف عنوانات کے تحت ملتے ہیں: ڈاکٹر جالبی نے اپنے ترجمے کا عنوان "شاعری کا سماجی منصب" قرار دیا ہے (کتاب مذکور، ص ۱۷۷) جبکہ فاقر حسین نے "شاعری کے معاشرتی فرائض" عنوان رکھا ہے (فاقر حسین: ادب اور ادیب لاہور ۱۹۸۸ء، ص ۸۱ تا ۹۶)۔

ایک ہی مترجم کا ترجمہ شدہ مضمون کئی جگہ' لیکن مختلف عنوان سے بھی شائع ہوا ہے' مثلاً "جمیل جالبی کا ایک ترجمہ نیا دور (کراچی) میں "منظوم ڈرامے کا نصب العین" "نگار (کراچی' ستمبر دسمبر ۱۹۶۷ء) میں "منظوم ڈرامہ اور اس کا فن" اور کتاب "ٹی۔ ایس ایلیٹ کے مضامین" میں "شاعری اور ڈرامہ" ایک ہی چیز ہیں۔ ایلیٹ کے تنقیدی مضامین کے تراجم کے اس پس منظر سے یہ پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کو ایلیٹ کے مضامین اردو میں منتقل کرنے میں زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ جمیل جالبی نے ۱۹۶۰ء میں ایلیٹ کے نو مضامین کے ترجموں پر مشتمل کتاب "ایلیٹ کے مضامین" شائع کی' جن کی فہرست یہ ہے: (۱) شاعری کا سماجی منصب (۲) شاعری کی تین آوازیں (۳) شاعری کی موسیقی (۴) شاعری اور ڈرامہ (۵) روایت اور انفرادی صلاحیت (۶) کلاسیک کیا ہے؟ (۷) مذہب اور ادب (۸) تجزیہ اور تنقید (۹) تنقید کے حدود کتاب کے آخر میں کتابیات کے ذیل میں ایلیٹ کی تصانیف اور ایلیٹ پر تنقیدی حوالوں کی فہرستیں دی گئی ہیں اور کتاب کے آخری تین صفحات ایلیٹ کی سوانح کے لئے وقف ہیں۔ اس کے مقدمہ میں جمیل جالبی نے ایلیٹ کے حوالے سے تنقید کی ماہیت ' اہمیت اور ضرورت بیان کی ہے اور نہایت اختصار کے ساتھ اس کے تنقیدی خیالات و نظریات کا تعارف پیش کیا ہے اور آخر میں لکھتے ہیں: ایلیٹ ایسی شخصیت جس نے انگریزی ادب کو اس طور پر اس درجہ متاثر کیا ہو اس سے ہم اردو والے کیا سیکھ سکتے ہیں: "ایلیٹ ایسی شخصیت جس نے انگریزی ادب کو اس کے تنقیدی خیالات و نظریات کا تعارف پیش کیا ہے اور آخر میں لکھتے ہیں: "ایلیٹ ایسی شخصیت جس نے انگریزی ادب کو اس طور پر اس درجہ متاثر کیا ہو اس سے ہم اردو والے کیا سیکھ سکتے ہیں' یہ کوئی ایسی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے ..... کیا اچھا ہو اگر ہم ایلیٹ کی تنقیدوں کے انداز فکر و طرز ادا کو سامنے رکھ کر اپنے ادب کا نئے سرے سے جائزہ لیں اور اس کی روایت کو جدید تقاضوں کے پیش نظر مرتب کر سکیں۔" انہوں نے اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں ایلیٹ کے نہ صرف پانچ مضامین (شاعری اور پروپیگنڈا' بودلیئر ادب اور عصر جدید' صحافت اور ادب 'تنقید کا منصب) شامل کئے بلکہ کتاب کا پہلا حصہ "ٹی۔ایس۔ایلیٹ: ایک مطالعہ" بھی قلمبند کیا جو ان ذیلی عنوانات پر محیط ہے: ایلیٹ بحیثیت نقاد' بحیثیت شاعر' بحیثیت ڈرامہ

اورنگ زیب قاسمی

نگار ' ایلیٹ کا ادبی مقام ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایلیٹ کی تنقید کے کلیدی اور بنیادی تصورات پر ۱۹۶۶ء میں "ٹی۔ایس۔ایلیٹ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ یہی مضمون متذکرہ کتاب میں "ایلیٹ بحیثیت نقاد" شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "..... جب میں ایلیٹ کی نثر کو اس کی شاعری سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں تو اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اس کے تنقیدی کارناموں کو اپنی زبان کے لئے اس کی شاعری سے زیادہ مفید سمجھتا ہوں اور دوسرے یہ کہ اس کی تنقید اس کی شاعری کا ایک ذیلی حصہ نہیں ہے بلکہ شاعری سے الگ ایک زندہ سرگرمی ہے ..... ایلیٹ سے میری دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ اس نے تنقید میں فکر کو جذب کر کے اسے ایک نئی قوت دی ہے ..... اس کی تنقیدی زبان اس کے اپنے تجربے اور شخصیت کا پورا اظہار کرتی ہے۔ طویل جملوں اور جملہ ہائے معترضہ کے باوجود اس کا انداز بیان برجستہ اور دلکش ہے۔ اس کی شاعری کی طرح' اس کی نثر کی خوبی یہ ہے کہ وہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ہم اردو والے ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں" (جمیل جالبی: تنقید و تجربہ' لاہور ۱۹۸۸ء ص ۲۹' ۳۳-۳۴)۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ایلیٹ کے فکر اور اسلوب سے بے حد متاثر ہیں۔ ان کی تنقیدی مضامین پر مشتمل چار کتابوں یعنی "تنقید اور تجربہ" ۔ "نئی تنقید" ۔ "ادب کلچر اور مسائل" اور "معاصر ادب" کے مندرجات کے مختلف مقالات سے اس کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ بعض مضامین میں ایلیٹ کے اقوال بے ساختہ آجاتے ہیں' مثلاً "ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ" یا پھر مضمون کا عنوان ایلیٹ سے مستعار کر لیا ہے اور مضمون کے آغاز میں ایلیٹ کا اقتباس دیا ہے' مثلاً" اپنے مضمون "بوسیدہ مکان" کے آغاز میں ایلیٹ کے یہ دو جملے نقل کئے ہیں: "میرا مکان بوسیدہ ہو چکا ہے اور اس کی دہلیز پر یہودی مالک مکان آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے (جمیل جالبی: ادب کلچر اور مسائل' مرتبہ خاور جمیل 'کراچی ۱۹۸۸ء' ص ۵۱' ۵۳)۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے علاوہ اردو میں بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے بعد کم و بیش ہر اہم اردو تنقید نگار کے ہاں جلی و خفی انداز میں ایلیٹ کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ان تنقید نگاروں میں آل احمد سرور' احتشام حسین ' سید عبداللہ' وقار عظیم' عبادت بریلوی' ڈاکٹر وحید قریشی ' الطاف گوہر' حسن فاروقی' خلیل الرحمن اعظمی ' شمس الرحمن فاروقی ' وارث علوی ' سلیم احمد ' عزیز احمد' حسن عسکری ' رفیق خاور ' انیس ناگی' وزیر آغا' صدیق کلیم ' عزیز حامد مدنی' تبسم کاشمیری ' سہیل احمد خاں اور ڈاکٹر سلیم اختر وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ اردو میں تنقیدی مضامین رسائل میں ہوں یا مجموعوں میں ' ایلیٹ کے بالواسطہ یا بلاواسطہ حوالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہاں اس بات کا موقع نہیں کہ ہر نقاد کی تحریروں کے حوالے سے ایلیٹ کے اثرات کی نشاندہی کی جائے۔ بطور مثال ہم صرف ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی اپنی کتاب" اردو میں ترقی پسند تحریک " کے حصہ سوئم میں " ترقی پسند تنقید کا ایک تجزیاتی مطالعہ " کرتے ہیں اور آخر میں تقریباً" دس ممتاز ترین ترقی پسند نقادوں کا انفرادی جائزہ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم پر نوٹ میں لکھتے ہیں کہ ترقی پسندوں کو اپنی انتہا پسندی کا احساس ہو گیا تھا" چنانچہ ڈاکٹر علیم نے ۱۹۵۳ء کے اپنے مضمون " ادب اور مارکسزم " میں لکھا تھا" مارکسی فلسفہ تاریخ ہمیں بتاتا ہے کہ ماضی کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش لاحاصل ہے اس کو مثال کے طور پر ہم اپنے سامنے رکھ سکتے ہیں ' اس سے عبرت اور بصیرت حاصل کر سکتے ہیں ۔" اس پر خلیل

الرحمٰن یوں تبصرہ کرتے ہیں: ڈاکٹر علیم ماضی کے ادب سے صرف عبرت و بصیرت حاصل کرنے پر ہی اکتفا کرنا چاہتے ہیں ..... کیا اعلیٰ فنی شاہکاروں کو...... ہم ..... ماضی کا ایک مردہ نقش اور بے جان پیکر سمجھیں یا وہ ادبی نمونے اب بھی ہماری روح کے تاروں کو چھیڑ سکتے ہیں اور ہماری حس لطیف کو آسودہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہمارے لئے یہ اب بھی زندہ اور معنویت سے بھرپور ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ روایت کو جوں کا توں اور بعینہٖ قبول کرنا اور اسے نئے زمانے میں عائد کرنا الٹی گنگا بہانے کے مترادف ہے' مگر روایت کو مکمل طور پر مردہ سمجھ کر اسے تاریخی آثار قدیمہ کے روپ میں دیکھنا ایک مورخ کے لئے مفید ہو گا مگر ادبی تخلیقات کے ساتھ ادیب کا یہ سلوک کچھ مناسب نہ ہو گا۔ روایت کے جامد تصور کے بجائے اس کے تسلسل کو سمجھنے اور اس کے کچھ عناصر کو رد اور کچھ عناصر کو قبول کرنے میں ہی ادب کی عافیت ہے اور ہمارا خیال ہے کہ ترقی پسندی کا مسلک اس امر کے مانع نہیں ہے۔ سجاد ظہیر اور مجنوں گورکھپوری کا یہی موقف ہے (اعظمی: کتاب مذکور' ص ۳۱۱'۳۱۲)

یہاں چند ناقدین کے اہم مضمونوں کا ذکر البتہ ضروری ہے: عزیز احمد کا تعارف ' خراب آباد (ویسٹ لینڈ ' در رسالہ ' اردو' جنوری ۱۹۳۸ء) ' صدیق کلیم: ویسٹ لینڈ (رسالہ ادب لطیف ' ۱۹۵۹ء) ' صدیق کلیم: فکرو فن (لاہور ۱۹۶۳ء' ص ۱۳۹'۱۵۴) ' شمس الرحمٰن فاروقی: ٹی ایس ایلیٹ ' شاعر اور مصلح (شب خون' الٰہ آباد ۱۹۶۵ء) ' سہیل احمد خان: ٹی ایس ایلیٹ کی تنقید (ماہنامہ قومی زبان ' کراچی' جولائی ۱۹۹۱ء) وارث علوی کے بارے میں کہا گیا ہے: " مغرب کے نقادوں میں وارث سب سے زیادہ ٹی ایس ایلیٹ سے متاثر ہیں (یا مرعوب ہیں) اور ان کے نزدیک ایلیٹ کی فرمائی ہوئی ہر بات ہمیشہ بصیرت افروز ہوتی ہے" (علی حماد عباسی: جدید اردو تنقید پر مغرب کے اثرات ' مطبوعہ اعظم گڑھ' ص ۱۰۰)۔ ممتاز حسین کا مضمون " شاعری اور شخصیت" رد عمل یا منفی اثرات کی ایک مثال ہے۔ وہ اس مضمون کے آخری صفحات میں لکھتے ہیں۔ " ... جس قدر مضر اور برا اثر ایلیٹ نے اپنی معاصر اور اس کے بعد آنے والی نسل پر چھوڑا ہے ' اتنا برا اثر ان سے بڑے قد کے کسی بھی شاعر نے نہیں چھوڑا ہے۔ اس کی غیر افادیت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جب ایلیٹ کی تخریبی کاروائیوں کی سخت تنقید کی جاتی' ان کی اتنی کاروائی کہ وہ تیسرے درجے کے شعراء کو اوپر اچھالتے اور بڑے شعرا کو پستی میں لے جانے کی کوشش کرتے تو وہ ہر دس پندرہ برس کے بعد اپنی رائے بدل دیتے۔ رائے بدل دینے کے معنی ہوتے ہیں کچھ ترمیم ' کچھ تنسیخ' کچھ اصلاح کے ' نہ کہ اس طرح پلٹ جانا کہ منہ پشت کی جانب اور پشت منہ کی جانب ہو جائے۔ (ممتاز حسین: نقد حرف' نئی دہلی ۱۹۸۵ء)۔ اردو میں ایلیٹ کے رد عمل ہی کے ضمن میں محمد حسن عسکری کا نام نہایت اہم ہے جبکہ عسکری ان دو تین نقادوں کی فہرست میں شامل ہیں جو اردو میں ایلیٹ شناسی کے محرک ہیں۔ محمد حسن عسکری کے تنقیدی شعور کی تشکیل میں جو مختلف عناصر کار فرما ہیں ان میں ایلیٹ کے تنقیدی تصورات ایک قابل ذکر عنصر ہے۔ عسکری کے تنقیدی مضامین پر اظہار خیال سید وقار حسین ان الفاظ میں کرتے ہیں: " عسکری صاحب نے شعر اور نثر دونوں میں اردو ادب کی مرکزی روایت کا ایک تصور قائم کر رکھا تھا۔ یوں تو اس سلسلے میں انہوں نے ایلیٹ کا نام نہیں لیا لیکن یہ امر قرین قیاس ہے کہ اس کا نظریہ روایت ان کے سامنے تھا۔ اس نظریے نے عسکری صاحب کی جانب جو بھی رہنمائی کی ہو لیکن انہوں نے اسے جوں کا توں اردو ادب پر مسلط ہرگز نہیں کیا...... "

(مشرق کی بازیافت ' مرتبہ ابو الکلام قاسمی' علی گڑھ ۱۹۸۲' ص ۵۸)۔

("علامت"' لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

رفیق سندیلوی

جاپانی ہائیکو کا ابتدائی دور

یہ جاننا آسان نہیں کہ موسموں کی شاعری " ہائیکو" کی ابتدا کیسے ہوئی۔ یہ شاید تخلیق کائنات کے ساتھ ہی معرض وجود میں آ گئی ہو گی جب صبح کے ستارے جھلملاتے تھے اور تمام روح کا خوشی سے دیوانہ وار جھومتے تھے یا کم از کم اس کی ابتدا اس وقت ہوئی ہو گی جب پہلا جاپانی جاپان کی سرزمین میں وارد ہوا ہو گا۔ آیا وہ جنوب کے باشندے تھے یا شمال کے کوئی نہیں بتا سکتا کہ کون اپنے ساتھ عام شاعری لے کر آیا اور فطرت کے بطون میں موجود چہار گانہ مسرت سے آشنائی حاصل ہوئی ' مسرت جو معصوم صفت تھی' فنکارانہ تھی' مذہبی تھی' معروضی تھی ' جذباتیت رومانیت اور فلسفے سے بے نیاز تھی ' ایسا ہی تاثر جاپان کے قدیم شعری مجموعے " مان یوشو" میں دکھائی دیتا ہے۔ " مان یوشو" شاعری کی تین اصناف پر مشتمل ہے۔ اول " چوکا" جس میں ۵-۷-۵-۷-۵ ارکان اور دوم " تانکا" جس میں ۵-۷-۵-۷-۷ ارکان اور سوم " سیدوکا" جس میں ۵-۷-۷-۵-۷-۷ ارکان ہوتے ہیں شاید قدیم جاپانیوں کے ہاں باری باری پانچ یا سات سلیبل کی تکرار سے مراد فطرت کی باقاعدگی اور بے قاعدگی کا اظہار تھا۔ ہائین عہد (۱۱۸۵ء - ۷۹۴ء) میں تانکا طبقہ اشراف کی محبوب صنف سخن تھی مگر اس کے خاتمے پر رینگا ایک مشہور صنف کے طور پر ابھری۔ وہ احساس جس نے رینگا کو جنم دیا وہ دو افراد میں باہم مقابلے کی فضا تھی۔ نویں صدی کے اوائل میں ایسے کئی کھیل موجود تھے جن میں موازنے اور مقابلے کی فضا پائی جاتی تھی۔ مثلاً " گھاس کی پتیوں کا موازنہ" جس نے بعد ازاں "جڑوں کے موازنے" کو جنم دیا۔ ان کھیلوں میں حصہ لینے والے پودوں کی جڑوں کو جمع کرتے اور پھر اپنی اپنی جمع شدہ جڑوں کی لمبائی کا موازنہ کرتے تھے۔ اس سے بعد ازاں گل داؤدی کے مقابلے ' گلنار' یا گل لالہ کے مقابلے ' سمندری سیپیوں کے مقابلے ' عام استعمال کے برتنوں کے مقابلے اور پنکھوں کے مقابلے منصہ شہود پر آئے۔ بہرکیف ہائیکو کا ماخذ و منبع رینگا ہے لہٰذا ایک تو اس بنا پر رینگا کی اہمیت مسلم ہے ' دوسرا یہ کہ گزشتہ آٹھ سو سالوں سے ہائیکو کے پہلو بہ پہلو اس کا تخلیقی سفر جاری رہا ہے۔ باشو ' بوسن اور اسا بھی رینگا کے اساتذہ تھے ' رینگا ان کا اوڑھنا بچھونا تھی رینگا ایک جڑی ہوئی نظم ہوتی ہے جو یکے بعد دیگرے ۱۷ اور ۱۴ ارکان کی کڑیوں سے ایک مسلسل زنجیر بناتی ہے۔ ہر کڑی کو علیحدہ طور پر نظم کیا جاتا ہے لیکن اسے پہلے کی کڑی سے مختلف معنوی زاویوں سے مربوط کر دیا جاتا ہے۔ بذات خود رینگا کا ماخذ انکو " تانکا " ہے جس کو دو افراد مل کر مکمل کرتے ہیں کہ ایک شخص پہلا تانکا باندھتا ہے جبکہ دوسرا اگلا تانکا باندھتا ہے ' اس طرح دو اشخاص کے تانکوں سے ایک رینگا نظم بن جاتی ہے۔ اب ایک تانکا نظم دیکھیے جس میں ہائیکو کی روح موجود ہے۔

لوگ کہتے ہیں
ہم بے حس ہیں
مگر ہم بالکل درست سماعت سے بہرہ ور ہیں
لہٰذا ہم بادصبا کو سنتے ہیں
باغ کے صنوبروں میں

بہرکیف ایک خیال یہ ہے کہ پہلا ہائیکو جسے رینگا سے الگ کر کے لکھا گیا' غالباً" شہنشاہ ہوری کاوا (۱۰۷۸ء تا ۱۱۰۷ء) کا تھا۔ ملاحظہ کیجئے۔

بانسری نواز" کورواتو کو"
بانسری بجاتا ہے
" کورودو" کے نزدیک

" کورودو" محل کا شمالی حصہ تھا' کیونکہ یہ شاہی مطبخ کے نزدیک تھا اس لئے اس کو کالا دروازہ کہا جاتا تھا۔ " کورواتو" کا مطلب ہے کالا آدمی ۔اس ہائیکو میں اگر کوئی نقطہ ہے تو بس یہی کہ اس میں کمزور طریقے سے صنعت ایہام کا مزاحیہ استعمال کیا گیا ہے ۔ یہ امر معلوم ہے کہ ہائیکو کی ابتدا کس نے کی مگر امکان اغلب ہے کہ ہائیکو سب سے پہلے کونایا کے عہد میں لکھا گیا مثلاً" فیوجی وارا سادائی کا یہ ہائیکو دیکھیے جس کا شمارا ابتدائے کار ہائیکو میں ہوتا ہے۔

طوفان
بکھرے ہوئے پھولوں کے
تعاقب میں ہے

بہرکیف پہلے تانکا کے قالب میں مقیم رہا پھر رینگا میں چلا آیا۔ بعدازاں رینگا کی صنف ہائیکو میں بدل گئی۔ اس تبدیلی کے عقب میں ثقافتی' معاشرتی اور شخصی رویے کارفرما تھے جداگانہ سطح پر بھی اور اشتراکی سطح پر بھی سولہویں صدی کے آخر میں رینگا اپنی شہرت و طاقت کھو چکی تھی' بس جس چیز نے اس کی روح کو تھوڑا بہت سہارا دے رکھا تھا وہ مزاح' ایہام' طنزو تضحیک' کہاوتیں اور متناقضات وغیرہ کا استعمال تھا۔ رینگا کے بعد ہائیکائی کا چلن عام ہوا۔ یہ رینگا کی مشہور ہیئت تھی جس کے ضابطے عام آدمیوں کے لئے پیچیدہ تھے۔ دراصل یہ ایک طویل نظم تھی جس کو انتہائی طور پر مکمل کیا جاتا تھا ۵۔۷۔۵ ارکان پر مبنی اس کے ابتدائی حصے کا نام " ہوکو" تھا جس کی بنیاد موسم کے اختصاص پر قائم تھی بعد میں یہی حصہ الگ ہو کر ہائیکو کہلانے لگا۔ ہائیکائی سنجیدہ صنف نہیں تھی بلکہ یہ ایک طرح کا شعری تماشا تھا جس میں شریک ہو کر شاعر کی انفرادی صلاحیت مختلف مزاجوں اور آہنگوں میں دب جاتی تھی سو ہائیکو کی جداگانہ ہیئت کے قیام کے پس پشت جاپانی شعرا کی انفرادی شناخت کی طلب بھی موجود ہے۔

باشو سے پہلے شاعروں میں سوگی' سوکان اور موری تا کے کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ یہ تینوں ہائیکائی کے مخترع اور بنیاد ساز شاعر تھے۔ ہائیکو کی تاریخ میں سوگی (۱۴۲۱ء تا ۱۵۰۲ء) کا مقام یہ ہے کہ اس نے ہائیکو کو الگ اور آزاد صنف بنانے کے رجحان پر زور دیا۔ اس نے کئی ایک ہوکو لکھے جن کو رینگا اور ہائیکائی کے پہلو بہ پہلو

ہائیکو کہنا درست ہے ۔ سوگی کو بجائے ہائیکو کہا جاسکتا ہے مگر ایک اپروا بجائے ہائیکو۔ سوگی ان معنوں میں باشو کا پیشرو ہے کہ وہ سفرپسند ہے خلوت سے محبت کرتا ہے اور شاعری کو لمحات آگہی کا اظہار سمجھتا ہے تاہم اس میں باشو جیسی انسانی سرد محبت کی کمی ہے عالم ضعیفی میں سوگی کو اس بات کا غم تھا کہ اس نے اشیائے دنیا کی وابستگی میں اپنی زندگی گزار دی اور حیات آخرت کے تصور کو بھلا کر فریضہ رہبانیت ادا نہ کیا۔ سوگی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مواد اور ہیئت پرندے کے دوپر ہوتے ہیں جن میں توازن پایا جاتا ہے فن کا حسن اسی توازن سے عبارت ہے۔ تاہم اگر مواد وہیئت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو مواد کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گی۔ سوگی کا ایک ہائیکو ملاحظہ کیجئے۔

طوفانی جھونکوں نے
جنگلی چیری کے پھولوں کو نہیں بتایا
کہ موسم گرما آگیا ہے

پہاڑوں پر جنگلی شاہ دانے کے پھول اپنی چھب دکھا رہے ہیں ۔ ان کو ابھی موسم گرما کے آنے کی اطلاع نہیں ملی۔ سوگی نہیں چاہتا کہ اواخر بہار کی شدید ہوائیں ان پھولوں کو بکھیر دیں۔
سوکان (۱۴۵۸ء تا ۱۵۴۶ء) سمورائی خانوادے میں پیدا ہوا اس نے اپنی زندگی ایک خانقاہ میں سادہ انداز سے گزار دی۔ درج ذیل نظم دیکھیے جس میں بذلہ سنجی اور مزاح کی چاشنی موجود ہے۔

ممکن ہے تمہارا بدن ٹھنڈا ہو
مگر تم خود کو آگ مت تاپنا
اے برف کے پتلے!

ایسی ہی ہائیکو نظموں کی بنیاد پر سوکان ہائیکو سے بھی زیادہ سن ریو کا پیشرو دکھائی دیتا ہے۔
موری تاکے (۱۴۷۲ء تا ۱۵۴۹ء) عمر میں سوکان سے بڑا تھا وہ زندگی بھر ایک خانقاہ " اسے " میں شنتومت کے پادری کا فریضہ انجام دیتا رہا۔ وہ ایک ہنرمند رینگا شاعر اور عالم فاضل شخص تھا۔ باشو سے پہلے کے دیگر شعرا کی طرح موری تاکے نے ذومعنی الفاظ کا سہارا بھی لیا ہے مثلاً" یہ ہائیکو:

ہانا یوری سو
ہانائی آری کے او
ملی اوکاکا
رسیلی خوشبو
اتنی زیادہ پھول میں نہیں
جتنی کہ ناک میں

ہانا کا مطلب ناک بھی ہے اور پھول بھی ۔ یہ لفظ قدیم وقتوں سے مزاحیہ ایہام کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس ہائیکو میں موری تاکے نے لفظی کھیل تماشے کی انتہا سے خوشبو کی انتہا تک پہنچنا چاہا ہے اس کا ایک اور ہائیکو ملاحظہ کیجئے۔

تڑکے میں

اورنگ زیب قاسمی

موسم خزاں کی بارانی بوندیں
ہائے! کس قدر شاعرانہ ہیں
اب موری تاکے کی ایک نظم دیکھیے جو اس نے بسترِ مرگ پر لکھی۔
افسوس کہ میرا وقتِ آخر
آج ظہور پذیر ہو سکتا ہے
طلوعِ سحر کی طرح

موری تاکے کے بعد تانکن دبستان کے بانی تائی تو تو (۱۵۷۰ تا ۱۶۵۳ء) کی اہمیت مسلم ہے اس نے واکا اور رینگا کی تعلیم یوسائی جیسے استاد فن سے حاصل کی جس نے ایک دن اس سے کہا تھا کہ "اگر اس ملک میں شاعری بہت زیادہ ہر دلعزیز ہو گی تو تم بہت شہرت کماؤ گے۔" تائی تو تو نے جواباً کہا تھا کہ میں بہت خوش ہوں کہ ایسا نہیں ہو گا اور اگر ہو گا تو میں معاشرے میں داخل ہو جاؤں گا۔" اس مکالمت سے تائی تو تو کے کردار کی منکسر المزاجی عیاں ہوتی ہے اس نے ۴۹ برس کی عمر تک آرام دہ اور خوش باش زندگی گزاری۔ بعد ازاں اس کی بینائی میں کوئی نقص پیدا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں تکلیف رہنے لگی جس کا اظہار اس نے ایک نظم میں کیا ہے۔

سمندر کی یہ تاریک رات
مجھے امید ہے کہ میرے سرہانے سے
سحر طلوع ہو گی
اور آنکھیں
لوگوں کو دیکھ سکیں گی

تائی تو تو کے بعد سوئن (۱۶۰۵ تا ۱۶۸۲ء) کا نام آتا ہے جس نے ہائیکائی شاعروں کا ایک نیا گروپ منظم کیا جسے ذزن سکول کہتے ہیں اور جو تانکن سکول کا مخالف ہے سوئن سمورائی تھا اور ادب دوست مخلص تھا۔ ۲۹ برس کی عمر میں وہ راہب بن کر کیوتو کے نزدیک رہنے لگا جہاں اس نے رینگا کا مطالعہ کیا۔ وہ تائی تو تو کے مشہور اور مروج اسلوب سے نامطمئن تھا۔ سو اس نے سوکان اور موری تاکے کی طرف رجوع کیا۔ وہ ہائیکو کو 'آزاد' الگ اور دلچسپ صنف کے طور پر تشکیل دینے کا خواہش مند تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ہر قسم کی لفظیات و مواد کے استعمال کی اجازت دے دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاعروں نے ابتذال' سوقیت اور ناشائستگی تک سے گریز نہ کیا۔ اس ضمن میں سائیکاکو کلام بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ آزادی اور کھلی چھٹی تانکن اسکول کے منافی تھی۔ سو تانکن اور ذزن سکول کا تنازعہ طیش و غیظ کی حدوں کو چھو گیا اور نتیجتاً بغرض استدلال دونوں دبستانوں کی طرف سے بہت سی کتب لکھی گئیں۔ سوئن کا ایک ہائیکو ملاحظہ کیجئے۔

گیلاس کے شگوفوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے
میری گردن کی ہڈی
دکھنے لگتی ہے

سوئن یہاں صداقت کا پورا چہرہ دکھا رہا ہے "واکا" (تانکا) کے شاعر زندگی کے ناخوشگوار، قبیح اور غیر

اورنگ زیب قاسمی

شاعرانہ حقائق سے دامن بچاتے ہیں لیکن یہاں "گردن کے درد" نے شاعرانہ دلچسپی کے لئے ایک عمدہ امکانی شہادت فراہم کی ہے اور ہائیکو کی گہری اور ماورائی سطح کو نمایاں کر دیا ہے اور یہ کہ درد محبت ہے اور محبت درد ہے۔ اس ہائیکو کی اساس "شن کو کن شو" میں سائی گیو کی ایک واکا نظم پر رکھی گئی ہے مثلاً

مسلسل تکتے ہوئے، مسلسل تکتے ہوئے
چیری کے پھولوں کو
میری محسوسات کیا ہیں!
لیکن جب یہ گر جاتے اور رخصت ہو جاتے ہیں
میں کتنا افسردہ ہو جاتا ہوں

ذزن اسکول کے ایک شاعر سائی جن کا ایک ہائیکو دیکھیے جو ۱۶۷۱ء میں فوت ہوا اور جس نے شاعری کی تربیت سوئن اور سائیکا سے پائی۔

چیری کے پھولو
امشب بکھر جائیں گے
نئے چاند کی کلہاڑی تلے

ذزن دبستان کے اختتام اور باشودبستان کے آغاز کے درمیان بہت سے شاعر ہو گزرے ہیں جن میں ناکاماسا اور سائیکاکو نمایاں ہیں۔ ناکاماشا کا ایک ہائیکو ملاحظہ کیجئے۔

چوہاہہ کی قربان گاہ میں جاتا ہے
اس کا سر آراستہ ہے
بنفشے کے پھولوں سے

اس نظم پر اس حوالے سے تنقید کی گئی ہے کہ آیا یہ چوہے سے متعلق کوئی ہائیکو ہے یا بنفشے کے پھولوں سے۔

سائیکاکو (۱۶۴۲ تا ۱۶۹۳ء) اپنے عہد کی ہائیکائی دنیا میں اہم حیثیت کا حامل شاعر ہے اس کے ہائیکو اسلوب پر نہ صرف یہ کہ تانکن اسکول نے چوٹ کی بلکہ باشو سکول نے بھی اسے ہدفِ ملامت بنایا۔ اس کا ایک ہو کو دیکھیے۔

گرما کی بارش میں
چھوٹے سے پل کے نیچے لالٹین لٹک رہی ہے
دریائے "یودوگاوا" پر

یہ ہائیکو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے ڈکنز نے لندن کا "سیں" "ایوو" کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

باشو کے عہد میں اونیتسورا (۱۶۶۱ تا ۱۷۳۸ء) بھی اچھے ہائیکو کہہ رہا تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ سوئن سکول میں داخل ہوا۔ پچیس برس کی عمر میں اس نے اچانک محسوس کیا کہ ہائیکائی کی صداقت' ایک کامل صداقت کا نام ہے اور صداقت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس کا ایک ہائیکو دیکھیے جو اس نے اپنے بیٹے کی موت پر لکھا۔

اس کو میں مٹی میں دفن تو کر دیتا ہوں
لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے
کہ کچھ اس میں سے اگ آئے گا

لونتسو رابو " ماکوتو" یعنی خلوص کو دنیا کا اہم عنصر قرار دیتا ہے ' اپنی زندگی کے آخری سالوں میں مبلغ ہو گیا اور بالآخر اس نے مذہبی پیشوا کا منصب اختیار کر لیا۔ اس کا ایک عمدہ ہائیکو پڑھیے۔

ہوا سیٹی بجاتی ہے
آسمان میں
سرما کے گل ہائے نعمان

یہاں صرف ٹھٹھری بے رنگت ہوا اور بڑے بڑے سرخ پھولوں کے مابین تضاد کو اور سرما کے تند جھونکوں اور پوپی یا نعمان کے پھولوں کے درمیان طاقت کے تقابل کو بیان کیا گیا ہے اب اس کا ایک اور ہائیکو دیکھیے۔

ٹھنڈی ہوا
بہشت کا تہ خانہ بھر گیا ہے
صنوبر کی آوازوں سے

لونتسو کے ہاں باشو جیسا تعمق تو نہیں ہے لیکن اخلاص و صداقت اس کے محبوب رویے ہیں اور انہی کو وہ مقصد حیات کا درجہ دیتا ہے۔

باشو کے پیشرو ہائیکائی شعرا نے ہائیکو کے لئے ایک فضا ہموار کر دی تھی۔ چنانچہ باشو نے آگے بڑھ کر ہائیکائی کے طویل اور اتفاقی نظمیہ آہنگ سے نجات حاصل کر کے "ہوکو" کو ایک الگ اکائی کے طور پر قبول کر لیا۔

("قومی زبان" کراچی)

محمد رئیس علوی

تنکا اور غزل

اردو غزل برصغیر پاک و ہند کے چمن ثقافت میں ایک سدا بہار درخت ہے کتنے دو ر بدلے ' نظام بدلے ' تعلیمی نصاب بدلے ' سیاسی رویے بدلے ' شہریار و انداز شہریاری بدلے۔ زراعت سے صنعت تک ' غلامی سے آزادی تک ' بادشاہت سے جمہوریت تک ' ولی سے محسن احسان تک ' دکن سے پشاور تک اور کلکتہ سے کوئٹہ تک اس کا جادو آج بھی ویسا ہے جیسا میرو غالب اور داغ و حسرت کے زمانوں میں تھا۔

غزل میں اختصار ہے ' غزل میں علامتوں کی زبان ہے ' غزل میں استعارہ ہے ' تصوف ہے ' معاملہ بندی ہے ' جذبات ' فکر' احساس ' نفسیات ' تخیل ' حقیقت نگاری ' درد ' حسرت ' عشق بتاں ' اور آہ و فغاں ہے۔

غزل زندگی کی ان گنت ' کیفیتوں اور صورتوں کو سمیٹنے کا فن ہے ' میر نے درد و الم جمع کئے ' درد نے گلزار معرفت کے بیج ڈالے ' سودا نے فکر و جدان کو سمویا ' آتش نے قلندری اور قوت دل کا رنگ جمایا ' غالب نے تخیّل کو حقیقت سے اور حقیقت کو تخیل سے مطلوب کر کے زندگی کے وسیع تر دائرے میں رقص درویش کی مستی کو عقل چالاک کے تازیانے سے جستجو کی گردش دی۔ مومن نے گل پیرہن کی باتیں کیں اور ذوق نے زبان و بیان سے محاوروں اور ضرب الامثال کے شہر آباد کئے پھر داغ ' حالی ' اقبال ' حسرت ' فانی ' اصغر ' یگانہ ' جگر ' مجاز ' فیض ' فراق اور بہت سے شعرا آئے جنہوں نے اپنے جدا جدا انداز و رنگ میں عشق ' تہذیب ' سیاست ' فلسفہ ' تصوف ' خودی ' رندی ' رومان ' انقلاب ' امن اور اصنام خیالی کی تصویر و تعبیر کی۔

تنکا تاریخ کے تسلسل میں جاپان کی مقبول ترین صنف شاعری رہی ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں اسی تنکا کے بطن سے ہائیکو نے جنم لیا تھا۔ ہائیکو نے مقبولیت کی بے کراں وسعتوں اور فلک بوس بلندیوں کو طے کیا مگر اس کے باوجود جاپانی معاشرے میں تنکا کی مقبولیت و قیمت میں کمی نہیں آئی۔

جاپانی معاشرے کی شائستگی اور اس کی عملی صلاحیتوں کا تو سارا زمانہ معترف ہے جدید جاپان دور حاضر کا ایک معجزہ ہے جنگ عظیم میں ناکامی سے دوچار ہونے اور جوہری تباہکاری کا براہ راست نشانہ بننے والی قوم دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی صف اول کی اقتصادی قوت بن گئی۔ یہ ایک ایسا حیرتناک واقعہ تھا کہ بعض ملکوں کے کئی لوگ اس پر یقین کرنے کو تیار نہ تھے ' وہ اپنی قوم کی کم عملی اور کم تر اتفاقی حالت پر پردہ ڈالنے کے لئے اپنی دلیلوں میں جاپان کے بارے میں کئی بے بنیاد باتوں پر بھروسا کرتے تھے لیکن امید ہے کہ اب ان کے عقائد بھی بدل گئے ہوں۔

بات یہ ہے کہ کسی معاشرے کی تفہیم کے لئے زیر زمیں سے لے کر ماورائے فلک تک جانا پڑتا ہے ہم

اورنگ زیب قاسمی

کتنی گہرائی تک اتر سکتے ہیں یا کتنی بلندی تک پرواز کر سکتے ہیں؟ یہ ہمارے حوصلے پر منحصر ہے کیونکہ کوئی ایک فرد خواہ کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو کسی معاشرے پر مکمل طور پر حاوی نہیں ہو سکتا۔

مشہور ناول نگار بالزاک خود کو فرانسیسی معاشرے کا جنرل سیکریٹری کہتا تھا۔ شاید اس کا یہ دعویٰ علامتی تھا لیکن بہرحال یقینی ہے کہ وہ فرانسیسی معاشرے کی تفہیم پر فخر کرتا تھا۔ اب غور کیجئے کہ کسی دوسرے معاشرے کی تفہیم کا عمل کتنا غیر معمولی ہو گا۔

جاپان کے سجے ہوئے شہروں' شفاف جھیلوں اور ہرے جنگلوں سے بھرے ہوئے پہاڑوں کی سیر کرنے والے اس تہذیب اور اس کے فطری حسن سے متاثر ہوتے ہیں سیاسی لوگ وہاں کے طریق سیاست اور صنعت کار اس کی صنعت گری کے حوالے سے اس کی باتیں کرتے ہیں مذہبی عالم معاشرے کے عقائد و میلانات کے وسیلے سے اس کی اصل تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں۔ ہم نے جاپانی شعر و ادب میں تنکا کے متنوع مناظر اور مثالی کیفیات کے سرچشموں سے اردو غزل کی زمینوں تک راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔

جاپانی جمالیات کا جادو اصل میں ان کی تہذیبی تاریخ کا تسلسل ہے جاپان کے لوگ لمحہ موجود کے پائیدان پر کھڑے ہو کر اپنی تہذیب کے گزشتہ سواروں اور رہواروں کو دیکھ سکتے ہیں۔ تاریخ کے ایک لمبے سفر میں فطرت ان کے ہمراہ ہے جاپانی ادب شاعری' رقص' موسیقی اور تمثیل کے رنگارنگ' منفرد اور مجموں سے مالا مال مظاہر فطرت کی فراوانی سے فروزاں ہیں۔

شنتوازم' بدھ مت' بہار و خزاں کے جلوے' موسم گرما کی حدت اور جاڑے کی کاٹ سبھی کیفیتیں ان کے شعر و ادب اور فنون لطیفہ کا حصہ ہیں۔ خاندان سے محبت اور شہنشاہ سے عقیدت ان کے جذبہ حب الوطنی کی طرف بھی اشارہ ہیں۔

جاپان کی دیسی نظم کو واکا کہا جاتا ہے اور تنکا بھی واکا کی ایک صورت ہے یہ پانچ مصرعوں کی ایک مختصر نظم ہے۔ جس میں مصرعے بالترتیب ۵-۷-۵-۷-۷ کی صوتی آہنگوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس میں موضوع کی کوئی قید نہیں سوال جواب شکوہ فطرت کے رنگ شاہ سے عقیدت' خاندان کی محبت' سیاست' وصل ہجر' رنج' خوشی اور سرمستی و سطوت کے سارے منظر' خیال' جذبے اور تجربے غزل کی طرح تنکا کا بھی موضوع بن سکتے ہیں۔

منیوشو کے بعد دسویں صدی عیسوی سے لے کر چودھویں صدی تک باقاعدہ طور پر شہنشاہ وقت کے حکم سے تنکا کے انتخاب مرتب کئے جاتے رہے ان میں کوکنشو (دسویں صدی) اور شن کوکنشو (تیرھویں صدی) خاص طور پر نہایت اہم ہیں۔ ایدو عہد (۱۶۰۳-۱۸۶۸) کے دوران تنکا کے موضوعات و مضامین میں جدت کی کمی اور روایتی اسلوب کو دہرانے کے عمل سے اس میں یکسانی اور فرسودگی بڑھتی گئی...... تازگی' طراری' اور توانائی مفقود ہو گئی۔

میجی دور (۱۸۶۸-۱۹۱۲) کے تیسرے سال ۱۸۷۱ء میں شاہی محکمہ برائے شاعری قائم کیا گیا۔ اس محکمہ کے صاحبان اختیار بھی اس رسمی اور روایتی تنکا کے حامی تھے نتیجہ یہ ہوا کہ اگلی دہائی میں روایت پرستی سکہ' رائج الوقت بن گئی۔ تنکا میجی دور میں تیزی سے رونما ہونے والے تہذیبی تغیرات' مغربی علوم کے اثرات اور بڑھتی ہوئی صنعت کاری کا ساتھ نہ دے سکی' تنکا کی ہیئت اور اس کے اسلوب پر اعتراضات سامنے آئے' اس

اورنگ زیب قاسمی

کے انحصار کو نشانہ بنایا گیا۔ اور تنکا کے سلسلے میں: بقول غالب

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

والا مسئلہ درپیش ہوا۔ شعرا نے تنکا کو ترک کر کے اس کی جگہ کسی نئی ہیئت کی تلاش اور نئے مضامین کو اختیار کرنے کی کوشش میں: (مغرب کے زیر اثر) طویل تر نظمیں لکھیں۔

یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ تقریباً" اسی زمانے (۱۸۵۷ء) کے بعد برصغیر پاک و ہند میں انگریز حکومت کی پالیسیوں اور اخلاقیات کے تحت مغربی ادب و تہذیب کی آمد آمد شروع ہوئی۔ اردو شاعری اور خاص طور پر اردو غزل کا تنقیدی جائزہ لیا گیا۔ پنجاب سرکار کی ایماء پر فروری ۱۸۶۵ء میں انجمن اشاعت مطالب مفید پنجاب (انجمن پنجاب) کے نام سے ایک ادبی اور علمی مجلس کا قیام عمل میں آیا۔

ابتداء میں اس کے بیشتر ممبر سرکاری عہدیدار تھے انجمن کے کئی کام تھے۔ کتب خانے کا قیام اور تصنیف و تالیف کے ساتھ انجمن کے جلسوں میں مختلف علمی اور ادبی موضوعات پر مقالے پڑھے جاتے تھے' جون ۱۸۷۴ء سے محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر کرنل ہالرائڈ کے مشورے پر ایسے مشاعروں کا آغاز ہوا جن میں غزل کے مصرعہ طرح کی بجائے موضوع یا عنوان دیا جاتا تھا اور شعرا ان موضوعات پر نظمیں پڑھتے تھے' ان مشاعروں کے فروغ میں محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کے نام بہت نمایاں ہیں یہ نظم جدید کا نقطہ آغاز تھا۔ اس کو ہم غزل کی جد جہد کا شاید سب سے مشکل مرحلہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ مطلوبہ تیز رفتاری سے تغیرات کا ساتھ نہ دے سکنے کی بنا پر تنکا کی طرح غزل کی ہیئت' اسلوب اور موضوعات پر روایت پرستی اور فرسودگی کا بڑا شدید الزام تھا۔

علم و ادب میں افادی نقطہ نظر' مذہب میں عقلیت پسندی اور معاشرے میں اخلاق و عمل کی تحریک بھی سرسید نے اسی دور میں شروع کی تھی۔ ان کا رسالہ تہذیب الاخلاق شاعری پر آزاد کے لیکچرز اور حالی کا مقدمہ شعر و شاعری سب اسی دور دورہ متدلور عہد انحراف کا تاریخ ساز سرمایہ ہیں۔

یہی زمانہ تھا کہ ۱۸۸۲ء میں "نئی ہیئت میں شاعری" کے نام سے ٹوکیو میں ایک ادبی انجمن قائم ہوئی تنکا ہیئت پر اعتراضات کئے گئے اور طویل نظموں کی حمایت میں مضامین لکھے گئے اسی زمانے میں یوشی یوکی ہاگینو نے "تنکا کی اصلاح" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ انھوں نے اس میں تنکا کی لغت کو جدید' موضوع کو مردانہ اور اسلوب کو مزید آزاد بنانے کا مشورہ دیا۔

۱۸۹۳ء میں جاپانی ادب و شاعری کی نامور شخصیت کاؤوی او چی آئی نے ٹوکیو کے ایک علاقے کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی' او چی آئی کے ساتھیوں میں تیکان یوسانو کا نام نمایاں تھا۔ انھیں آپ قدیم یا روایتی اسکول کا باغی کہہ سکتے ہیں۔

۱۸۹۴ء میں " قومی زوال کی دعوت دینے والی شاعری " کے عنوان سے تیکان نے تنکا کے مضامین و اسلوب کے خلاف ایک زور دار مضمون لکھا جس میں انہوں نے مردانہ شاعری کا دعویٰ کیا انہوں نے کہا کہ قوم کی خوشحالی کا تعلق براہ راست ادب سے ہوتا ہے اور اس دور کی محدود نسوانی تنکا جاپان کے لئے ضرر رساں ہے تیکان نے خود بھی قوت و جرأت کی شاعری کی ہے۔ وہ ہمیں حالی کے مقدمے' سرسید کے قومی اخلاق

اور اقبال کے شاہین کی جھلک بہ انداز دگر دکھاتے ہیں اگر آپ چکبست کی وطنی شاعری کو بھی اس میں شامل کر لیں تو اس موازنے کا لطف اور بڑھ جائے گا۔ یہاں تیکان کی ایک تنکا دیکھیے۔

کہسار کو دیا پر
بادِ خزاں کے جھونکے
میں،
ہاتھ پھیرتا ہوں!
شمشیر بے لال پر

نومبر ۱۸۹۹ء میں تیکان نے ٹوکیو کی نئی شاعر برادری کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد رکھی اور پھر ایک رسالہ "ستارہ صبح" جاری کیا۔ تنکا کے فروغ کے لئے دوسرا اہم رسالہ اس کے ذرا بعد نامور شاعر اور اسکالر "سو گئی ساتو" نے "شجرِ نو" کے نام سے نکالا تھا۔ مذکورہ بالا شعرا کے ساتھ ساتھ اس دور میں تنکا کے شعرا میں ناکامورا سیتگی، توسیکایا ماکوا، ساتو قوی، تاکیو کواشی کلوا، آزدو یاپچی اور اکیکو یوسانو بہت اہم اور مشہور ہیں۔
ان کے علاوہ اسی زمانے میں ناکاموراکوتارو اور ہاگیوارا سکوتارو جیسے نظم آزاد کے نامور شعرانے تنکا نظمیں بھی لکھیں۔ توسیکو یاماکوا صرف ۲۹ برس کی عمر ۱۹۰۹ء میں انتقال کر گئیں۔ مگر اکیکو یوسانو نے تنکا کو نئی علامات، جدید حسیت اور آزادی اظہار کے تیر آفریں تحفے دیے۔

انیسویں صدی کی آخری تین دہائیاں جاپان میں جس طرح تنکا نے آزمائشوں میں گزاریں اسی طرح غزل نے برصغیر میں۔ مگر مقصدیت روایت اور جدیدیت کے سخت حملوں کے بیچ تنکا اور غزل دونوں نے خود کو حالات کے مطابق ڈھالا اور اس مشکل وقت سے کچھ اس طرح نکلیں کہ بقول فراق گورکھپوری۔

شب وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

غزل کے معنی خوبصورت عورتوں سے باتیں کرنا بتائے گئے ہیں مگر فارسی غزل کی روایت اور برصغیر پاک و ہند کے سیاسی اور تہذیبی میلانات نے اردو غزل کو نئے نئے موضوعات سمیٹنے اور ہر گھڑی اپنا دائرہ فکر و خیال وسیع کرنے کی بے انتہا قوت عطا کی۔

مولانا الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں لکھا تھا "ایسی غزلیں کوئی لکھنا چاہے تو کسی قدر طولانی مضمون بھی باندھ سکتے ہیں مثلاً" ہر اک موسم کی کیفیت، میلے، تماشوں کی چہل پہل، قبرستان کا سناٹا" سفر کی روئیداد، وطن کی دلبستگی اور اسی قسم کی بہت سی باتیں غزل مسلسل میں بہت خوبی سے بیان ہو سکتی ہیں۔" آگے چل کر حالی لکھتے ہیں۔

"پس ملک میں نیچرل شاعری پھیلانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ غزل میں ہر قسم کے لطیف و پاکیزہ خیالات بیان کئے جائیں" مولانا حالی نے اپنے دونوں تبصروں میں دو نکات اٹھائے ہیں پہلے پیرے میں غزل کے انتشار اور موضوعاتی اعتبار سے ہر شعر کے الگ الگ ہونے کی خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غزل مسلسل کی اہمیت بیان کی ہے اور دوسرے میں نیچرل شاعری کی ضرورت بتاتے ہوئے اس کے پھیلانے کا بہترین پیمانہ یا وسیلہ غزل کو بتایا ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

آپ جانتے ہیں کہ غزل کا ہر شعر ایک وحدت ہوتا ہے اور اپنے معنی کے لحاظ سے مکمل اور آزاد ہوتا ہے مگر کبھی کبھی کسی ایک ہی فضا، کیفیت، جذبہ یا خیال پر منحصر غزل مسلسل بھی لکھی جاتی ہے۔

میں نے یہاں مولانا حالی کے اعتراضات اس لئے بیان کئے کہ وہ غزل کے ایک سخت گیر نقاد تصور کئے جاتے ہیں لیکن حالی کا ایک مقصد تھا۔ وہ غزل کو بھی اس مقصد کے حصول کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے مگر اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ حالی نے غزل میں وہ امکانات دیکھے تھے جن کی جھلک قدیم غزلوں میں بھی ملتی ہے اور مستقبل میں جن پر توجہ دینے کی ضرورت تھی، ساتھ ہی حالی نے معاشرے میں غزل کی قوت نافذہ اور نیچرل شاعری کے لئے اس کی فطری صلاحیتوں کا کھلا ہوا اعتراف بھی کیا ہے۔

حالی کے بعد لکھی جانے والی غزلوں کے موضوعات کی وسعت اور گہرائی میں اضافہ ہوتا گیا نظم جدید کی آمد کے شور نے غزل کو بیدار کر دیا۔ حالات بدلتے رہے۔ غزل میں تنوع بڑھتا گیا۔ اقبال کی غزلیں فلسفیانہ افکار کے ساتھ جدوجہد کے راستے کو روشن کرتی ہیں حسرت کی سیاسی شاعری اور قحط بنگال پر جگر کی مشہور غزل:

شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آج کل

نے اس کی گزشتہ پچاس برسوں کی آفاقیت کی تلافی کر دی تھی۔

رشید احمد صدیقی غزل کے عاشق تھے۔ انہوں نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں:

" غزل میں فن ہی نہیں فسوں بھی ہے شاعری نہیں تہذیب بھی وہ تہذیب جو دوسری تہذیبوں کی نفی نہیں کرتی بلکہ ان کی تصدیق کرتی ہے۔"

رشید صاحب نے غزل کو جس طرح دیکھا ہے اس میں غزل سے ان کی محبت کے ساتھ ساتھ ان کی حق جوئی بھی شامل ہے وقت کی بھول بھلیوں میں سے ہمیشہ اس کا بچ کر نکل آنا اور تاریخ کے تضادات میں ہر موقع پر قبولِ عام کی سند حاصل کرنا غزل کی تہذیبی قوت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

غزل کے بارے میں بہت سی باتیں کی گئیں کسی نے کہا کہ یہ چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کا فن ہے کسی نے اسے کوزے میں سمندر کو بند کرنا بتایا، کسی نے کہا کہ یہ چھوٹی چھوٹی تصویریں بنانے کا ہنر ہے کسی نے نیم وحشی صنف سخن کہہ کر اسے شعری سطح پر گرایا، کسی نے قافیہ پیمائی کی پابندی کو ہدف بنا کر اس کی وضع داری کا مذاق اڑایا کسی نے صوفیوں کو عشق الٰہی پر جاتے دیکھا، کسی نے کسی کو قرار دار پر نعرہ لگاتے دیکھا، کسی نے اسے تہذیب کا راز کہا، کسی نے اسے عشق کا نیاز کہا، کسی نے اسے پریشاں خیالی کی ڈگر کہا، کسی نے غفلت کا سفر کہا۔ بعض نے معاشرے کی محبت اور بھلائی میں اس سے برسرِپیکار ہوئے اور بعض نے اس کی الفت میں معاشرے سے بیزار ہوئے۔ غرض کہ برصغیر پاک و ہند کی معاشرتی زندگی میں جو بھی نشیب و فراز آئے غزل نے اپنے فطری ضبط و تحمل کے ساتھ ان کو اس طرح جذب کیا کہ کچھ لوگ جانتے اور کچھ نہ پہچانتے غزل کا رد عمل تیز نہیں ہوتا وہ گھلا گھلا کر رس چھتی ہے پھر آپ اس کے ریشے ریشے میں بسی ہوئی بھینی بھینی خوشبو کی بہار لوٹئے۔

اب غزل اور تنکا کی ہم خیالی اور ہم آہنگی کے کچھ نمونے پیش خدمت ہیں۔
اور سوتوکاچو کی ایک تنکا ملاحظہ کیجئے۔

زندگی تماشا ہے
دو گھڑی کا میلا ہے۔
بس فنا کا رستہ ہے۔
جب سے میں نے سمجھا ہے۔
دل بہت فسردہ ہے۔

(۵۔۷۳)

میر تقی میر کی مشہور غزل آپ کو یقیناً یاد آئی ہو گی۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

آتش لکھنوی کے انداز میں تنبیہہ ہے۔ وہ خبردار کرتے ہیں

موت کو سمجھے رہیں گبرو مسلماں آئی
روح قالب میں ہے دو روز کو مہماں آئی

مرزا اسد اللہ خان غالب نے ایک اور انداز ایجاد کیا۔ وہ کہتے ہیں۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

غالب نے تو اپنی مسند چبوترے پر لگائی ہے وہ خود اس تماشے میں شامل نہیں ہوتے بلکہ بلندی پر سے اس کا تماشا کرتے ہیں' شاید ان کی انا بھی ان کی خواہشات سے بالاتر تھی۔ اب دیکھیے کہ اردو غزل کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی دکنی اس مضمون کو کیسے باندھتے ہیں۔

فنا ہے حسن کو دولت کو' زندگانی کو
جہاں میں نہ کوئی باغ بے خزاں دیکھا

اردو کے بیشتر شعرائے تنکا کے نامور شعرا کی طرح غزل کے اشعار میں زندگی کی بے ثباتی اور فنا کے موضوع کے متنوع انداز و مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔

تنکا کے عظیم جاپانی شاعر سی گیو کی ایک خوبصورت صوفیانہ نظم دیکھیے۔

دنیا کو
سمجھتا ہوں
میں خواب گھڑی بھر کا
دل ہے
کہ غفلت سے بیدار نہیں ہوتا

میر صاحب نے غزل میں اسی بات کو اس طرح کہا تھا۔

مستی میں شراب کی جو دیکھا
عالم یہ تمام خواب نکلا

اورنگ زیب قاسمی

غالب نے اس صورت کو آئینے در آئینہ دیکھا۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

موضوع کی مماثلت کا ایک اور پہلو دیکھیے کہ اصغر گونڈوی نے اسے کس طرح سمجھا اور پیش کیا۔

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

غزل کا ایک اور شعر درج بالا تنکا کی قربت میں ملاحظہ کیجیے۔

میں نے کہا بس ایک تمنا ہے زندگی
اس نے کہا کہ جاگنے والے یہ خواب ہے

تنکا اور غزل کے موضوعات اور لہجے میں ایک گہرا ربط پایا جاتا ہے شاید شعر کا یہ مشرقی تعلق ہو۔ ایک نظم دیکھیے:

خیال اب نہیں کوئی
یہ حال رہتا ہے
کہ دل میں
بس وہی
ترا جمال رہتا ہے

(اسے نواراتسوے ۵۰۵-۴)

اب غزل کا شعر ملاحظہ کیجیے

نہ دن کو چین نہ راتوں کو خواب آنکھوں میں
بسا ہے جب سے وہ خانہ خراب آنکھوں میں

مذکورہ بالا تنکا کے حوالے سے سنیے میر صاحب کیا کہتے ہیں۔؟

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

حضرت درد نے سرمستی اور سرخوشی کی ایک دشوار بیان کیفیت دکھادی۔

اس کے خیال زلف نے سب سے ہمیں چھڑا دیا
گرچہ پھنسے ہیں دام میں دل مگر فراغ ہے

غالب نے میر کی روایت میں کلام کیا۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ساری گفتگو کا موضوع وہی معشوق ماہ رخ اور وہی جمال جہاں نما ہے اسی سلسلے کا ایک شعر سنیے:

مجنوں میں مسافت کے مرحلوں سے الگ
پس تمہارا یہ شعر خیال کیسا ہے؟

ذرا غور کیجئے تو تنکا اور غزل کے مزاج میں کس قدر ہم آہنگی اور دونوں کی اداؤں میں خوشگوار تیرگی پائی جاتی ہے۔ دو تنکا ملاحظہ کیجئے۔

جاؤں جو اس کے پاس اچانک
ڈالوں اس کو حیرت میں
اس کا چہرہ کھل اٹھے گا
ابرو وہ مری آنکھوں میں
چبھتے ہیں 'لہراتے ہیں۔

(نامعلوم ۱۱-۳۵۴۹)

ہلال دور کو دیکھا سرشام
تو یاد آیا مجھے وہ حسن بے نام
جنہیں دیکھا تھا میں نے
صرف ایک بار
پھر سے نظروں میں وہ ابروئے خم دار

(اوتوموتویاکا موچی ۲۰۹۹۳)

جاپانی ادب اور خاص طور پر تنکا میں غزل کی طرح معشوق کے سراپا کا بیان ملتا ہے اور یوں اس دلبرنواز کے چہرے کے تیز اور تیکھے نقوش کا ذکر کرکے شعراء اکثر ہمارے ضبط کا امتحان لیتے ہیں جاپانی شاعری میں ابرو' بہت دلکش اور دلآویز صورت میں دکھائی دیتے ہیں کبھی ہلال سے ان کی تشبیہہ ہے اور کبھی تنجرو کمان سے استعارہ ہے اردو غزل میں بھی ابرو کے یہی ڈھنگ ہیں۔ تنکا اور غزل میں اس سلسلے میں فرق بس اتنا ہے کہ تنکا میں آنکھوں کے تاثرات بھی بعض وقت ابرو سے ملتے ہیں ۔ غزل میں ابرو کی بہ نسبت آنکھوں کے حوالے زیادہ ہیں۔

" جاؤں جو اس کے پاس اچانک " کے زاویے میں ایک ایسا منظر سامنے آتا ہے جو شاعر کے ذوق لطیف اور حسن مزاج کا آئینہ دار ہے ۔ ہندوستان کے آخری تاجدار حضرت بہادر شاہ ظفر کا یہ شعر تنکا اور غزل کے رویوں میں مماثلت کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

ذرا ان کی شوخی تو دیکھیے لئے زلف خم شدہ ہاتھ میں
مرے پیچھے آئے دبے دبے ارے سانپ کہہ کے ڈرا دیا

واقعہ کی صورت دونوں جگہ تقریباً یکساں ہے ۔فرق یہ ہے کہ ایک جگہ ایک نامعلوم مخلص ہے اور دوسری جگہ بادشاہ وقت ایک جگہ لطف تعبیر ہے پھر ادائے اظہار کا جواب کہاں ڈھونڈیں۔ اب دیکھیے کہ آتش نے ابرو کو کیسے باندھا ہے۔

واہ رے لوہے کبھی سان کے اوپر چڑھنے
تیغ ابرو نہ گئی خنجر مژگاں نہ گیا

اورنگ زیب قاسمی

مگر ذوق دہلوی نے ابرو کو چڑھا کر ایک اور کمال دکھایا ہے مصرعہ ہے
آرزو لکھنوی کا ایک مصرعہ اور دیکھیے:

کہ ہوتی سان پہ ہے تیغ تیز تر چڑھ کر
تلوار اٹھالی پھر رکھ دی ابرو پہ بل آیا لب پہ ہنسی

غرض کہ تنکا اور غزل دونوں میں ابروئے خمدار سے حسن طرح دار کا اشارہ یکساں ہے۔ دونوں زبانوں کے شعراء نے ابروؤں کی ان کمانوں کے حضور اپنی سلامتی کے لئے مجرے پیش کئے ہیں۔
ذرا ایک شعر اور سنیے:

زلف پیچاں کریں ہے بس مجھ کو
قتل پھر ابروئے خمدار کریں

حیات عشق میں ہجر کی ساعتیں کبھی سوز بے پناہ سے سینے کو جلاتی ہیں اور کبھی حسرت و یاس کا طوفان ہو تو سرد اور یخ بستہ آہوں کا ایک سیل فضاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔
ایک تنکا ملاحظہ کیجئے:

کوہ اتو پہ ہے
کہر چھائی ہوئی
ہے مری
سرد آہوں کی
لائی ہوئی

(یاماتواوے تواکورا ۷۹۹ء-۵۰)

اب ذرا میر صاحب شعر دیکھیے:

ہم کبھو غم سے آہ کرتے تھے
آسماں تک سیاہ کرتے تھے

کئی صدیوں اور ہزاروں میل کے فاصلے کے باوجود لہجہ' انداز اور موضوع دونوں اس طرح مل گئے ہیں کہ تنکا اور غزل کی قربت کے ثبوت کے لئے اب کسی دلیل کی ضرورت باقی نہیں۔
ایک تنکا دیکھیے

مدہم مدہم عکس کی صورت
آکے گئی اور دل کو لبھایا
میں ہوں اس کے ہجر میں جیسے
لمبا پتلا صبح کا سایہ
ٹھیک سے جس کو دیکھ نہ پایا

(کاکینوموتو ہیتومارو کاشو ۷۰۴۳۴۹۳)

اب ذرا میر صاحب کی غزل کا ایک شعر بے تبصرہ سنیے:

نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

تنکا اور غزل میں مشترک موضوعات بے شمار ہیں ۔ چاند، گل، بلبل، بہار، خزاں، آستین، زلف، ابر وغیرہ متعدد الفاظ تنکا میں بھی اکثر اسی طرح استعارے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں ! جس طرح غزل میں ، مثلاً بلبل کو دیکھیے۔

شاخ پاک پہ
عندلیب جو ایک
منتظر تھا
بہار کا شاید
اب تو نغمہ سرا ہوا ہوگا۔

(یامابے نوا ہیتو ۸۰۴۳۳۱)

غالب کا ایک شعر سنیے:

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ زن
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

جاپانی لباس کیمونو میں آستین، بڑی، کشادہ، طویل اور اہم ہے "آستین کی لمبائی علامتی ہوتی ہے" روایتی اعتبار سے اس سے کئی کام لیے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے ایک کام بہرحال غم ہجر میں آنسوؤں کو جذب کرنا دیکھئے۔

یاد ز کل کی جدائی کی گھڑی
آستیں اشکوں سے تھی بھیگی ہوئی
چپکے چپکے بے صدا روتی ہوئی
ملک دل کے وہ فسردہ تاجدار
یاد آتی ہے وہ صورت بار بار

(او ساکابے نو آئی ناکیکوٹی ۲۰۰۴۳۵۷)

برصغیر پاک و ہند میں قمیص یا کرتے کی آستین کیمونو کی طرح طویل نہیں ہوتی اور عرض بھی نسبتاً بہت کم ہوتی ہے۔ غزل میں تو اکثر اس سے آنسو پونچھنے کا کام لیا جاتا ہے مثلاً میر صاحب کہتے ہیں۔

جیب اور آستیں سے رونے کا کام گزرا
سارا نچوڑ اب تو دامن پہ آرہا ہے

آتش کا شعر دیکھیے:

فرقت یار میں اشکوں کو مرے روک سکے
آستیں کا ہے نہ یہ کام، نہ کار دامن

عاشق جاپان کا ہو یا برصغیر پاک و ہند کا محبت میں اسے کبھی نہ کبھی ہجر کے دن ضرور جھیلنے پڑتے ہیں۔

اورنگ زیب قاسمی

عشق میں رونے کی رفتار یا مقدار دونوں جگہ برابر ہے لیکن یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ چونکہ برصغیر میں لباس کی آستینوں کی لمبائی اور عرض کم ہے اس لئے نچوڑ دامن تک پہنچتا ہے پھر آتش نے تو آستین اور دامن کو اشکوں کے لئے ناکافی قرار دیا ہے۔

اس کے علاوہ میرانیس نے اپنی غزل میں " جامہ اصل کی آستینوں " کا تذکرہ کیا ہے ۔ اور امیر مینائی نے۔

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

کہہ کر قاتل کو خبردار کیا ہے انیس کے ہاں گفتگو کی چنی ہوئی آستین ہے جس کا جوڑ جامہ اصل سے ملتا ہے اور امیر مینائی آستین کے لہو کو گواہ کے طور پر دریافت کرتے ہیں یہ استعارے روش سے الگ مگر یہ اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔

اب ذرا جاپانی زبان میں آستین کا ایک نیا زاویہ بھی دیکھیے:

آستین باہم ملا کر سوئے تھے
چاہتا تھا
اس کی خوشبو جذب ہو
آج اک گل کی مہک سے یک بیک
یاد تازہ ہو گئی اس رات کی

محبوب کی خوشبو جذب کرنے کے لئے اس کی آستین سے آستین ملا کر سونے کا عمل محبت کی ایک انوکھی تصویر ہے۔ یہ روایت صرف کیمونو سے وابستہ ہے۔ ی گیو کی ایک اور تنکا سنیے:

" جو اکثر دیکھتا ہو چاند کو پھر
تو ہو جاتی ہے ایسی دل کی حالت
اسی حیلے کے
پردے میں ہماری
شکستہ آستیں بھیگی رہی ہے

عجیب درد بھرا ہے اس تنکا میں ۔ محبت کا اظہار بھی ممکن نہیں ۔ اشک رواں رہتے ہیں' آستین بھیگی رہتی ہے اور آستین بھی کیسی ؟ تو وہ بھی شکستہ ہے تو پھر لوگوں سے اپنے عشق کو کیسے چھپائیں بس یہی بہانہ ہے کہ چاند کو دیکھ کر دل کی حالت ایسی ہوتی ہے ورنہ تو گویا سب ٹھیک ہے سبحان اللہ

ایک تنکا ملاحظہ کیجئے:

کمرے میں کرن ہے
چاندنی کی
باہر ہے ہوا کا تیز طوفان
وہ مرا یار کہاں ہے اس دم
یاد آرہا ہے وہ ملنا کہاں

(منیوشو: ۳۲۱۷ء)

فراق گورکھپوری کا ایک شعر سنیے:

یہ نکہتوں کی نرم روی، یہ ہوا، یہ رات
یاد آرہے ہیں عشق کے ٹوٹے تعلقات

یہ ہجر کا ایک خوبصورت مگر اضطراب سے بھرا ہوا منظر ہے اسی کو اگر آئینے میں دیکھیں تو مونالیزا کی مسکراہٹ کی طرح وصل کا ایک نایاب نظارہ نگہ خیال میں پھرتا ہے آتش لکھنوی کا شعر پڑھیے۔

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

آخر میں زندگی کی بے ثباتی اور آدمی کی کم حیاتی پر ممی منزنی کی ایک تنکا دیکھیے کس سادگی سے اسے بے بنیاد و بے نقش و بے نشاں بتایا ہے اور پھر کس آسانی اور اک ذرا سی بے خیالی سے ایک میلا منظر معدوم ہو جاتا ہے۔

زندگی کی مثال کیا ہے
صبح کشتی چلے ہے ساحل سے
اور پھر دیکھیے
تو پانی پہ
نقش باقی نہیں کوئی پیچھے

(۳۰۳۵۱)

مجھے استاد ذوق کا ایک شعر یاد آتا ہے۔
دیکھیے تنکا اور غزل کا تعلق عاشقانہ دیکھیے

گزرتی عمر ہے یوں دور آسانی میں
کہ جیسے جائے کوئی کشتی دخانی میں

خیال کی اب اس سے زیادہ قربت اور کیا ہو گی! لہجے اور اسلوب میں بھی انسیت کی لہریں آ آ کر ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ زمان و مکان کی دوریوں کے باوجود تنکا اور غزل دونوں دل درد مند کی فصل نوبہار ہیں اور یہ تعلق بھی ان کے اشتراک کی بنیاد کو قوی تر کرتا ہے تنکا اور غزل کا یہ مختصر جائزہ بنیادی طور پر منیوشو کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔

فطری شاعری کا عظیم ترین مجموعہ منیوشو جاپانی شاعری کا پہلا انتخاب ہے۔ اس کی پہلی نظم پانچویں صدی عیسوی میں شہنشاہ نننتو کے عہد میں لکھی گئی ہے جبکہ اس کی آخری نظم ۷۵۹ء میں پڑھی گئی۔ خیال ہے کہ منیوشو کی بیشتر نظمیں سال ترتیب کے آخری سو سال کے عرصے میں لکھی گئیں تھیں۔ کم و بیش بارہ سو سال قبل مرتب کیا جانے والا یہ شعری مجموعہ آج بھی جاپان کی ثقافت اور حسیت کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

منیوشو میں شامل ساڑھے چار ہزار نظموں میں ۹۰ فیصد سے زیادہ نظمیں تنکا کی صورت میں ہیں۔ منیوشو

اورنگ زیب قاسمی

کے بعد تنکا نظموں کے کئی انتخابات شہنشاہ کے حکم سے مرتب کئے گئے۔ اور اس طرح یہ ایک روایت بن گئی۔ یہاں تک کہ آج بھی شاہی محل میں وکا / تنکا کا سالانہ مشاعرہ منعقد ہوتا ہے جس میں شہنشاہ خود بھی وکا پڑھتے ہیں۔

تنکا، جاپانی معاشرے کی روح کا آئینہ ہے اور غزل برصغیر کے معاشرے کی تہذیب کا پرتو جمال ہے میں تو تنکا کے مزاج کی نرمی، اس کے موضوعات کی نیرنگی، اس کے اسلوب کی آدمیت اور اس کی ہیئت کے اختصار کی بناء پر اسے اردو غزل کی "ہمشیر صنف" سمجھتا ہوں۔

گل صد برگ کی پہلی جلد کی اشاعت سے قبل میں نے ٹوکیو برائے زبانہائے خارجی میں شعبہ اردو کے صدر محترمی پروفیسر سوزوکی تاکیشی کے مشورے سے بارھویں صدی کے عظیم جاپانی شاعر سئی گیو کی ایک سو ایک تنکا نظموں کا ترجمہ کیا تھا جو چاند کے چار رنگ کے نام سے شائع ہو چکا ہے اب گل صد برگ (منیوشو سے منتخب نظمیں) کی دوسری جلد کی اشاعت میرے لئے بڑے فخر و اعزاز کی بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ اردو شعر و ادب کے قاری کے لئے انسانی احساس و فکر کی صداقتوں کے اس نرم آہنگ سفر میں جاپان سے آگہی اور اپنی شناخت کے کئی پہلو سامنے آئیں گے۔

("دائرے" کراچی)

"ہندوستانی" کا ذکرِ خیر

(غیر مطبوعہ تحریر)

برطانوی عہد حکومت کی لسانی اصطلاح میں "ہندوستانی" سے مراد شمالی ہند کا وہ روزمرہ تھا۔ جو برصغیر میں عام طور پر بولا اور سمجھا جاتا تھا۔ اٹھارویں صدی میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہاں کے کاروبار اور سیاست میں دخل درانداز‌ی شروع کی تو اس کے انگریز اہل کاروں نے دیکھا کہ مسلمان حکمرانوں کی زبان فارسی ہے لیکن عوام کی اپنی زبان کچھ اور ہے جسے انہوں نے "ہندوستانی" کا نام دیا۔ انیسویں صدی کے آغاز تک جب کمپنی نے از کلکتہ تا دلی سیاسی تسلط حاصل کر لیا تو ضرورت پیش آئی کہ اس کے کارندے ملکی زبانوں سے باقاعدہ واقفیت حاصل کریں چنانچہ فورٹ ولیم کالج میں بالخصوص اردو کی تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا مناسب انتظام کیا گیا۔ اس طرح صحیح معنوں میں اردو نثر کی تشکیل شروع ہوئی۔ اس وقت تک "ہندوستانی" کا نام فقط یورپین لیتے تھے ان کے نزدیک اس کی حیثیت اردو کی عام فہم شکل سے جدا نہ تھی۔ ہندی نثر کا ذکر تو کیا اس کے نام کا وجود بھی نہ تھا اور اس کی پرانی شاعری برج بھاشا' اودھی اور مگدھی سے موسوم تھی البتہ اردو ہی کو کبھی کبھی ہندوی کہا جاتا تھا۔ عدالتوں اور دفتروں میں فارسی کا چلن چھ سو سال سے زیادہ قدیم تھا حتیٰ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کی حیثیت عدالتوں اور دفتروں میں ۱۸۳۵ء تک برقرار رکھی اس وقت برطانیہ نے بارہ دفتروں میں فارسی کی جگہ انگریزی اور عدالتوں میں اردو کو دی اس فیصلے کا اثر دور رس ثابت ہوا ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب "اردو ہندی تنازعہ" میں ان مسائل پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

۱۸۵۷ء تک اردو کے ساتھ ہندوستانی کا نام اس طرح آتا رہا گویا ایک ہی زبان کی دو شکلیں ہیں لیکن اس کے فوراً بعد جیسے ہی ہندو قومیت بیدار ہوئی اور اس نے ہندی کے فروغ کو اپنی شناخت کا محور بنایا تو وہ لسانی تنازعہ شروع ہوا جس کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے طرفین کے اعتراضوں اور دلیلوں کا منصفانہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا بیشتر ہندی والوں کا اصل اعتراض اردو رسم الخط پر تھا ورنہ آسان زبان کے وہ بھی منکر نہ تھے خواہ اسے کھڑی بولی کہا جائے یا "ہندوستانی" تاہم اپنے تاریخی اعتراض اور مذہبی پس منظر کی وجہ سے یہ معاملہ وقت کے ساتھ زیادہ پیچیدہ ہو آگیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندو و مسلم اکابر نے شدت سے محسوس کیا کہ آزادی کی کامیابی کی ضمانت متحدہ محاذ ہے چنانچہ دونوں قوموں کے جن اختلافات کو مٹانے کی بھرپور کوشش ہوئی ان میں ہندی اردو کا قصہ سرفہرست تھا اب انگریزوں کا پرانا نسخہ کام آیا اور کانگریس کے پلیٹ فارم پر متفقہ طور پر یہ تجویز منظور کی گئی

اورنگ زیب قاسمی

کہ ہندوستان کی قومی زبان "ہندوستانی" کہلائے گی خواہ وہ ہندی رسم الخط میں لکھی جائے خواہ اردو رسم الخط میں۔

ترک موالات اور خلافت کی ان تحریکوں کا جوش دو چار سالوں میں ہی ٹھنڈا پڑ گیا البتہ لسانی شورہ پشتی پر مفاہمت کا جو مرہم رکھا گیا تھا۔ وہ تقریباً" پندرہ سال سودمند رہا ۱۹۳۶ء میں مہاتما گاندھی نے خواہ مخواہ ان بھڑوں کے اس چھتے کو اس طرح چھیڑا کہ ساری فضا مسموم ہو گئی اس تکلیف دہ قصہ کو دہرانے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اپنے پرانے کاغذات کا جائزہ لیتے لیتے چند غیر مطبوعہ خطوط دریافت ہوئے جن کا تعلق گاندھی جی کی اس مذکورہ بالا کانفرنس (ساہتیہ پریشد) سے ہے جو انہوں نے ۱۹۳۶ء میں ناگپور میں منعقد کی تھی ملک بھر سے ایک سو دانشوروں اور ادیبوں کو اس جلسہ میں شرکت کرنے کی دعوت دی گئی تھی میں نے بھی گاندھی جی کے اس اذن پر لبیک کہا اس تاریخی جلسے کے شرکاء میں اب میرے سوا دو چار ہی باقی رہ گئے ہیں ساہتیہ پریشد کی لسانی معرکہ آرائی کا ذکر مولوی عبدالحق' ڈاکٹر فرمان فتح پوری وغیرہ کی تحریروں کے ساتھ میری سرگزشت "گرد راہ" میں بھی مل جائے گا ہندوستانی کا نام تو انہوں نے تکلفاً لیا تھا ورنہ منشاء یہ تھا کہ قومی زبان "ہندی" کہلائے گی پھر جو ہنگامہ برپا ہوا اس کی نوعیت لسانی کم اور سیاسی زیادہ تھی۔

گاندھی جی نے لسانی تنازعہ کا جو جن بوتل سے باہر نکالا پھر وہ ان کے قابو میں نہ آیا ۱۹۳۷ء میں انہوں نے مولوی عبدالحق پریم چند' پنڈت سندر لال وغیرہ کو جمع کر کے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن بات نہ بنی اگلے سال جب ڈاکٹر راجندر پرشاد کانگریس کے صدر بنے تو معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انہوں نے مولوی عبدالحق کے ساتھ ایک اقرار نامہ شائع کیا جس کی رو سے کانگریس کی پرانی تجویز کی از سر نو تصدیق کی گئی اور قومی زبان بلا شرکت غیر "ہندوستانی" قرار پائی باایں ہمہ ہندی اور اردو کا یہ حق تسلیم کیا گیا کہ وہ اپنے اپنے ادب کو فروغ دینے کی مجاز ہے۔ اس عارضی مفاہمت کے باوجود جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا اور اس معاملے میں گاندھی جی کی ساکھ بگڑ گئی۔

سچ تو یہ ہے کہ ہندی اور اردو کی تسلیم شدہ جداگانہ حیثیت کے باوجود ان میں جو قدر مشترک تھی اسی کا نام "ہندوستانی" تھا البتہ اس کی ادبی شکل کا واضح تعین ممکن نہ تھا۔ پریم چند ایسی آسان زبان استعمال کرتے تھے جو رسم الخط کے فرق کے ساتھ ہندی اور اردو میں شائع ہوتی تھی۔ بڑی حد تک یہ بات سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے متعلق کہی جا سکتی ہے میں نے خود میکسم گورکی کی آپ بیتی اور "پرل بک" کے ناول "گڈ ارتھ" کا ترجمہ "پیاری زمین" کرتے وقت اسی زبان کو ملحوظ خاطر رکھا سنسکرت کے کالی داس کے ڈرامے "شکنتلا" کا ترجمہ بھی ایسی ہی زبان میں کیا ہے قومی اتحاد اس وقت میرا بھی جزو ایمان تھا۔ اور "ہندوستانی" کے فروغ کو اس کا وسیلہ ہی سمجھتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء تک جب میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہا تو اور خدمات کے علاوہ ہندوستانی لغت کمیٹی کی صدارت میرے سپرد ہوئی جس کے اردو مشیر چراغ حسن حسرت اور ہندی مشیر ایس ای واتسائن تھے۔ اس وقت تک ریڈیو میں ہندی اور اردو کے بجائے ایک مشترک زبان "ہندوستانی" میں خبریں نشر ہوتی تھیں اور ہماری کمیٹی کا کام مشکل اصطلاحوں کے عام فہم مترادف تلاش کرنا تھا یہ کام بڑی محنت سے انجام دیا گیا میرے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ تکنیکی اصطلاحوں کے اس ہندوستانی لغت کو زمانہ کی نظر کھا گئی البتہ اس میں درجنوں اصطلاحیں زبان زد

خاص و عام ہیں۔ ہم سب سے بڑھ کر پنڈت سندر لال ہندوستانی کے علم بردار تھے کیونکہ ان کے نزدیک اس مسئلے کا تعلق براہ راست ہندو مسلم اتحاد سے تھا جو ان کی زندگی کا مشن تھا۔ وہ پنڈت نہرو کے ہم وطن اور ہم جماعت تھے ترک موالات کے وقت کالج سے تاریخ کی پروفیسری تج کر اس مہم پر وہ یوں چل کھڑے ہوئے کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا انگریزی ' ہندی ' سنسکرت کے علاوہ اردو ' فارسی ' عربی پر انہیں کامل دسترس حاصل تھی۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہندوستانی کی جداگانہ ادبی حیثیت ہے وہ " نیا ہند " کے نام سے مدتوں الہ آباد سے ایک ماہنامہ شائع کرتے رہے جس میں ایک ہی عبارت دو جدا رسم الخطوں میں آمنے سامنے چھپا کرتی تھی۔

آخری خط کے مضمون کی وضاحت ضروری ہے جو پنڈت سندر لال نے اپریل ۱۹۴۰ء میں الہ آباد سے مجھے بھیجا تھا۔ ایک سال قبل گاندھی جی کے ساتھ سندر لال بھی قید فرنگ سے آزاد ہوئے تھے اور انہوں نے از سر نو سوچنا شروع کیا کہ لسانی گتھی کو کس طرح سلجھایا جائے جو کانگریس اور مسلم لیگ کی رقابت کی وجہ سے از حد پیچیدہ ہو گئی تھی۔ اب گاندھی جی کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اور اس کی تلافی کے لئے ہندوستانی ' کو توسیع اور ترقی کے علاوہ کوئی راستہ نہ سجھائی دیا اسی سلسلے میں انہیں میرے تعاون کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا ذکر سندر لال نے اپنے خط میں کیا ہے عین اسی وقت برطانوی حکومت ہند کے فیڈرل پبلک سروس کمیشن نے میرا انتخاب معاون مشیر تعلیم کے عہدہ پر کر لیا تھا اور میں امرتسر سے شملہ منتقل ہونے کی تیاری کر رہا تھا " گرد راہ " میں ان واقعات کی تفصیل ملے گی' ہندو و مسلم خلق کی شدت میں لسانی مسئلے کو لاینحل بنا دیا تھا اس ماحول میں " ہندوستانی " کا نعرہ صدا بصحرا ہو کر رہ گیا تھا لہٰذا میں سندر لال کی پیشکش کو منظور نہ کر سکا اس وقت تو انہیں میرے انکار سے ملال ہوا لیکن دو سال کے اندر تقسیم کی وہ تلخ حقیقت سب کے سامنے آ گئی جس کی آہٹ میں پہلے سے سن رہا تھا۔ مذہب اور زبان نے بھی انسانوں میں افتراق پیدا کیا ہے اور بھی خلق انسانی تعلقات میں اتفاق اور خلق کے کئی پہلو ہوتے ہیں سوال یہ ہے کہ ان میں سے کس کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے۔

بول چال کی وہ زبان جو آج بھی باقی ہے جو صدیوں سے برصغیر کے عوام کو باہمی ربط کا موقع فراہم کرتی ہے لیکن اب اسے کوئی " ہندوستانی " نہیں کہتا کیوں کہ غیر منقسم کی جس روایت نے اسے جنم دیا تھا وہ انقلاب زمانہ کی نذر ہو گئی۔

("قومی زبان" کراچی)

اردو غزل میں ایک منفرد آواز

اورنگ زیب قاسمی

(یہ مضمون مجھے یوسف ظفر مرحوم نے ۱۹۶۸ء میں " نئی تحریریں " کے شمارہ ۹ کے لئے ارسال کیا تھا لیکن یہ شمارہ بھی شائع نہ ہو سکا اب پرانے کاغذوں میں یہ برآمد ہوا ہے تو طباعت کی نذر کر رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سید امجد الطاف)

پچھلے برسوں میں اردو غزل کو حیات نو ملی ہے ۔ اس حیات نو کے دور میں اردو غزل کی ازلی جاذبیت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مخصوص نظم گو شعرا کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا اور ان سے بڑی رچی ہی اور ترشی ترشائی غزلیں کہلوائی ہیں۔ غزل کی اس نشاۃ ثانیہ کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں ۔ نظم کے پرستاروں نے غزل کی اس بڑھتی ہوئی ترویج کو نظم کی ترویج و ترقی کے منافی تو نہیں گردانا' یہ ضرور کہا کہ نظم کے پرستاروں کے پاس یا تو کہنے کی چیزیں نہیں رہیں ' فکر کی راہیں اور راستے مسدود ہو گئے ہیں اور یا جس طرح ہر بڑے ملکی یا سیاسی انقلاب کے بعد فارسی اور اردو غزل کا زریں دور شروع ہو جاتا ہے اسی طرح تقسیم کے خونیں انقلاب کے دور نے غزل کے ایجاز و انداز کو ذریعہ ' اظہار ٹھہرایا ہے تاکہ ماحول کے شدید تاثر اور حالات کے رد عمل یا احساس کی چوٹ کو اسی شدت تاثر کے ساتھ بیان کیا جا سکے۔

اردو غزل کی پہنائی اور مطالب دونوں میں پرانے اور نئے فنکاروں نے قابل قدر اضافے کئے ہیں۔ جن فنکاروں نے ایک نئے شعور اور نئے ذوق کے ساتھ غزل کی سنگلاخ وادی میں قدم رکھا ہے اور غزل کی روایات کو جانچ پرکھ کر اسکے انداز و اظہار میں ڈوب کر اپنی انفرادیت نمایاں کرنے کی واضح کوشش کی ہے ان میں باقی صدیقی کا نام نمایاں حیثیت حاصل کر رہا ہے۔

باقی صدیقی اپنی عمر اور سخنوری کے اعتبار سے نئے فنکاروں میں شامل نہیں ' لیکن اس کی غزل نے نئے پرانے ہر فنکار اور قاری کو چونکایا ہے۔ اس نے اپنی پختگی اور قدرت کلام کو فکر و نظر کے ایک نئے عالم سے روشناس کیا ہے ۔ باقی کی غزل کا امتیازی وصف اس کا منفرد لہجہ ہے ۔ غزل کی روایت ہمارے ادب میں اتنی مستحکم ہے کہ کیا انداز بیان ' کیا مضامین و موضوعات ' دونوں اعتبار سے اردو غزل کا سرمایہ ' کمالات کا ایک حیرت خانہ ہے ۔ متقدمین کے ہاں دیکھیے تو انہوں نے اردو غزل کی تشکیل و تہذیب کا کام انداز بیان ہی سے شروع کیا۔ مضامین لگ بھگ وہی تھے جو ان تک فارسی کی عظیم غزل نے پہنچا دیے تھے۔ خصوصاً فارسی شاعری کے دور متاخرین میں ' جس کا آغاز بابا فغانی سے سمجھنا چاہیے ' عرفی اور نظیری ' ابو طالب کلیم اور طالب آملی اور آخر میں میرزا بیدل اور ناصر علی سرہندی نے نازک خیالیوں اور مضامین کی تلاش و تہذیب ' پیرایہ اظہار کی چابکدستیوں اور لطافتوں سے ایسا طلسم باندھا کہ کیا مضامین ' کیا لطف بیان ' دونوں میں

فکر کی راہیں تنگ ہو گئیں چنانچہ جب اردو میں شعر گوئی شروع ہوئی تو کہنے والے ایسے تھے کہ ان کی زبان تو فارسی تھی مگر شعر اردو میں کہنے کی کوشش ہوتی تھی۔ ایک نئی زبان میں شعر موزوں کر لینا ہی بڑی بات تھی۔ میر و میرزا کا دور اردو شاعری کا پہلا عظیم الشان دور ہے۔ اس دور میں خیالات اور مضامین کا تنوع تو نہیں البتہ انداز و اظہار (یعنی اردو میں فارسی شعر کے مروجہ مضامین کو نت نئے انداز سے باندھنے کا) تنوع ضرور ہے۔ گویا اردو شاعری کی بنیاد ہی انداز و اظہار پر رکھی گئی اور جب متوسطین اور متاخرین نے آنکھ کھول کر دیکھا تو اردو شاعری میں اس وقت تک بات کہنے کا ڈھنگ 'بات بچا کر کہنے کا انداز' بات کے پہلو نکالنے کا اسلوب' سب کچھ موجود تھا' چنانچہ ان لوگوں نے پہلے بات کہنے کی راہیں نکالنے میں جان کاہی کی اور پھر کہیں (لکھنؤ میں دور ناسخ و آتش اور دلی میں دور مومن و غالب) مضامین کی تلاش' موضوعات میں نئے نئے پہلو پیدا کرنے کا زمانہ آیا' لیکن اس مضمون آفرینی کے دور عروج میں بھی انداز و اظہار نے بڑا زور باندھے رکھا۔ ذرا مومن و غالب کو دیکھیے اور ان کے مشاہیر شاگردوں مثلاً" شیفتہ' حالی اور سالک وغیرہ کا انداز دیکھیے' مضامین کا خاص پہلو خاص طرح سے بندھا ہوگا اور نئے مضامین ہوں گے تو ان پر بھی زاویہ نگاہ کی چھوٹ مخصوص طریقے سے پڑتی رہے گی۔ غرض انداز و اظہار کا مسئلہ ہو یا اسلوب کا' اردو شعر و ادب کا دامن گوناگوں اور متنوع کمالات سے مالا مال ہے۔

اس صورت میں آج کے غزل گو کے سامنے بڑی روایت یہ ہے کہ اگر محفل میں اپنی بات منوانی ہے' اسے وقیع حیثیت دینی ہے تو اس میں لہجے اور انداز کا جادو پیدا کرے۔ یہ روایت آج کے غزل گو کی صلاحیتوں کے لئے غالباً" بہت بڑا چیلنج بھی ہے کیونکہ اگر لہجہ اور انداز اپنا نہیں تو عمر بھر کا سرمایہ شعر و قصائد کے بیکراں دفتر میں کہیں گم ہو کر رہ جائے گا۔

اس لئے آج کے غزل گو اور آج کی غزل کا پہلا جواز یہی پیدا ہوتا ہے کہ اگر اردو غزل کے اس عظیم الشان ذخیرے کے پیش نظر غزل سرائی کرنی ہے تو پہلے اپنے لہجے' اپنی انداز کی بات پیدا کرنا ضروری ہے۔ باقی زندگی آج کل بہت متنوع اور بے حد وسیع ہو چکی ہے۔ موضوعات نئے مل سکتے ہیں۔ ہر قدم پر عالمگیر انقلابات اور عالمگیر مسائل موضوعات کا ہجوم سامنے لاتے ہیں' مگر یہی موضوعات اپنی گہماگہمی اور تنوع کی بدولت تقاضا کرتے ہیں کہ اگر زاویہ نگاہ رکھتے ہوئے بات کرنے کا لہجہ اور بیان کا انداز قدرت میں ہے تو ہمیں چھیڑو ورنہ غزل کا ہر شعر شعریت سے عاری ہو جائے گا' غزل کی فضا مردہ لفظوں کے بے جان ناموں سے پٹ جائے گی' لطافت کی جگہ سطحیت اور صلابت غزل کے شیرازے کو تباہ کر دے گی' غرض آپ کی غزل محض کلام موزوں بن کر آپ کے مقصد تخلیق اور خود آپ کے وجود پر حرف زن ہو گی۔

باقی صدیقی نے ہماری غزلیہ روایت کا یہ سرمایہ اور اس کا یہ چیلنج بڑے حسن و خوبی سے قبول کیا ہے اور وہ محض اپنے خلوص کے بل بوتے پر اپنی آواز کو ایک منفرد حیثیت دینے میں کامیاب ہوا ہے' چنانچہ وہ مضمون کے بیان میں نہ تو لفظی چابکدستی اور رنگا رنگی کا سہارا لیتا ہے اور نہ اپنے مطالب کے اظہار کے لئے لفظوں کی خاص قسم کے انتخاب اور ان کی خاص قسم کی اصوات پر تکیہ کرتا ہے وہ محض ایک تاثر' ایک جذبے یا رد عمل کو اپنے الفاظ میں اپنی جلا دے کر پیش کرتا ہے:

اورنگ زیب قاسمی

ہمیں غیروں سے ڈرائے نہ کوئی
ہم نے اپنوں کی ادا دیکھی ہے

انقلابات کے آئینے میں
صورت راہنما دیکھی ہے

اک نئی صبح کی راہ میں باقی
تیرگی آبلہ پا دیکھی ہے

بولے نہ ہنسے نہ مسکرائے
آئے مرے غمگسار آئے

جب سے اٹھتے ہیں تری محفل سے
ہم کہیں اور بھی کم جاتے ہیں

جانے ان راہوں میں کیا کھو آئے
روز کچھ ڈھونڈنے ہم جاتے ہیں

آج ہے اور کل نہیں ہوگی
زیست بھی آسرا ہے مفلس کا

زیست کس مرحلے پہ آپہنچی
وضعداری کا بھی سوال گیا

مندرجہ بالا اشعار محض ایک سرسری انتخاب کے بعد میں نے پیش کئے ہیں تاکہ باقی کا لہجہ اور اس کے لہجے کی مخصوص انفرادیت' اس کا رچاؤ اور خلوص بیان آپ کے سامنے آجائے۔ اس کا یہ انداز اور یہ لہجہ اس کے ہر مصرعے میں قائم ہے کیونکہ اس کے بغیر کوئی شعر اس کا نہیں ہو سکتا۔

خلوص کے بعد اس لہجے کی امتیازی بات اس کی متانت ہے کلام کی متانت بھی لہجے کی طرح اکتسابی چیز نہیں۔ اس کا تاروپود شاعر کی شخصیت کے تانے بانے میں مضمر ہے متانت کلام کے عناصر کا احساس مشکل ہے۔ نظریات کی دنیا میں جن تصورات کا احاطہ مثبت انداز میں کرنا دشوار سمجھا جاتا ہے ان کے لئے یہ قاعدہ مقرر ہے کہ ان کی ضد اور ان کے اوپر بحث کی جاتی ہے' چنانچہ متانت کلام کے سلسلے میں کہا جاسکتا ہے کہ متانت کلام وہاں ہو گی جہاں رکاکت اور ابتذال نہ ہو' اوچھاپن اور سطحیت نہ ہو۔ متانت کلام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ نپی تلی بات نپے تلے انداز میں کی جائے' اس میں ابہام نہ ہو' بات نہ زیادہ مجرد ہو نہ مفصل' پھر بات ایسی ہو اور اس طرح کی جائے کہ متانت کی حدیں خشکی اور یبوست کو نہ چھولیں۔ گویا متانت کے ساتھ شیوا بیانی شرط ہے۔ اس صورت میں لہجے اور بات کی متانت کے ساتھ لطافت اور حسن بیان ضروری ہو جاتے ہیں اور جو شوخی اور پہلو دار انداز متانت کے ساتھ کلام میں رچ بس جاتا ہے وہ شعر کی پاکیزگی اور تاثیر کو دوبالا کر دیتا ہے۔ اس کی چند مثالیں باقی کے ہاں ملاحظہ ہوں:

آئی ترے قہقہوں کی آواز
یہ پھول کہاں برس رہے ہیں

اور جاجا کے عرض حال کرو
لو سلام و پیام سے بھی گئے

اس قدر بڑھی شکایت ہے
پھوڑئیے ہم نے مدعا پایا

سب کو احساس سے خالی نہ سمجھ
درد مندوں کو سوالی نہ سمجھ

عشق کس بات پہ اب ناز کرے
ذلت جنس وفا دیکھی ہے

رنگ محفل کا دیکھ کر چپ ہیں
ورنہ ہم پر بھی ظلم کم نہ ہوئے

کس کا احسان تھا غم دنیا
لوگ کیوں خو گر ستم نہ ہوئے

باقی صدیقی کے اس لہجے اور اس کی متانت و پاکیزگی نے اسے اس کی مخصوص زمینیں اور ان زمینوں کے لئے مخصوص بحریں دی ہیں۔ اس کا عام انداز یہی ہے کہ بات کو ناپ تول کر اس طرح پہلو بچا کر کہنا چاہتا ہے کہ اس کی صدا جانی پہچانی بھی جائے اور سب سے منفرد اور سب سے الگ بھی نظر آئے۔ متانت اور اس کی

لازی شرط لطافت کلام کے لئے یہ از بس ضروری ہے کہ بات میں اختصار اور ایجاز ملحوظ رکھا جائے' تفصیلات سے دست کش رہا جائے' مگر ابہام کے لئے بھی کوئی گنجائش نہ چھوڑی جائے۔ اردو کی مستعمل بحروں میں ایجاز و اختصار کے معجزے ان بحروں میں نظر آتے ہیں جنہیں عرف عام میں چھوٹی بحریں کہا جاتا ہے' جو عام طور پر مشکل رکنی ہوتی ہیں۔ میر کے جاں گداز بہتر نشتروں سے لے کر غالب کے معجز نما سہل ممتنع شاہکار انہی بحروں میں حلقہ بند ہیں۔ بیان کی جو چستی اور بندش کی جو وارفتگی اور بانکپن ان بحروں میں ممکن ہے وہ عام طور پر ہشت رکنی بحروں کی لمبائی میں مشکل سے جھلک پاتا ہے' چنانچہ باقی نے بھی "مبعا" اپنی خوش مجھی اور تحسین لطافت کے لئے عام طور پر انہیں بحروں کو منتخب کیا ہے۔ یہی اس کی دلی باتوں کو لفظوں کا قالب پہنانے کے لئے ساز گار فضا مہیا کرتی ہیں اور انہی میں اس کی بات کا حسن' اس کی اپج' اس کی سپردگی اور اس کا حسن بیان نکھرتا ہے۔

باقی صدیقی کی غزل میں جدید ماحول اور جدید تقاضوں کا بڑا تیکھا شعور نظر آتا ہے اسے احساس ہے کہ ہمارا معاشرہ کسی مرحلے پر تو سرمایہ و محنت کی آویزش سے گھٹا چکا ہے اور کہیں حالات کی عام ناسازگاری اور کسی واضح نصب العین کے فقدان کی وجہ سے بے راہ ہوا جارہا ہے۔ کہیں اقدار غلط ہیں تو کہیں ان کو سرے ہی سے جنس فضول سمجھا جارہا ہے۔ ان باتوں سے اس کا احساس شدید تاثر لیتا ہے۔ مگر اس تاثر یا بعض حالتوں میں شدید ردعمل کو وہ نہ وعظ و تذکیر کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ نہ آواز عصر بن کر بزعم خویش ان کا مداوا تجویز کرنے کی سعی لا حاصل کرتا ہے۔ اس کا کلام زیادہ سے زیادہ محاکمہ ہے' دیانتدارانہ عکاسی ہے' زیادہ سے زیادہ اپنے گرد پھیلی ہوئی ناسزائی اور بے اقداری پر فریاد ہے' مگر یہ فریاد کہیں چیخ میں تبدیل نہیں ہوتی کیونکہ بکا اور شیون اس کی طبیعت' اس کی وضعداری کے خلاف ہیں۔ وہ اپنے سینہ سوزاں سے بھرپور آہ کھینچتا ہے مگر اپنی آہوں کی تشہیر اسے منظور نہیں کیونکہ تشہیر اور نمائش اس کی طبعی متانت پر بار گزرتی ہیں۔
اسی طرح وہ وعظ و تذکیر کو بھی اپنا منصب نہیں سمجھتا کیونکہ اس مسند ارشاد کی تہ میں اسے خود ساختہ مصلحین کی طبعی نمائش پسندی اور بلند آہنگی اور تلقین نوازی (Pedagogy) نظر آتی ہے۔ جسے اس کی طبع قبول نہیں کرتی' لہٰذا وہ حالات کے تاثر اور ماحول کے تجزیے اور محاکمے پر زیادہ اکتفا کرتا ہے اور اس میں بڑے خوبصورت لفظوں اور کم کم علامتوں اور استعاروں سے اپنا مافی الضمیر (Attitude) بین السطور میں واضح کرنے کی زیادہ سعی کرتا ہے:

تھمے آشنا ہے سطح دریا
کبھی کشتی' کبھی موج رواں گم
چمن کی وسعتوں سے شور اٹھا
قفس میں ہو گئی بجلی چمک گم
بڑھی جاتی ہے راہ منزل غم
ہوا جاتا ہے میر کارواں گم
ہونٹوں سے آہیں چھینے والے ادھر تو دیکھ
ہم چپ تو ہو گئے ہیں مگر مطمئن نہیں

اورنگ زیب قاسمی

سر منزل خموش بیٹھے ہیں
وہ میں کہتے تھے راہبر کیا کیا
میں کہتا ہوں بات گئی
تم کہتے ہو زخم سلے
کیا کیا تھے اصول زندگی کے
مشکل نہ پڑی تھی کوئی جب تک
خاموش ہیں یوں اسیر جیسے
جھگڑے تھے تمام بال و پر کے

یہ اس کا عام رنگ ہے اور اس کے انداز و اظہار میں بھی اس نے بلند بانگ دعووں یا زیر لب کراہوں دونوں سے دامن بچایا ہے اور اپنے ردعمل کو ہمیشہ متوازن اور معتدل رکھنے کی کوشش کی ہے تاکہ کلام کی تلخی اتنی نہ بڑھ جائے کہ طنز و ہجو پر چغلی کھائے' نہ اتنی دبی گھٹی ہو کہ بلند آہنگی کی اس شورا شوری میں روایتی طوطی کی صدا بن کر گم ہو جائے' بلکہ دونوں میں توازن رہے اور دونوں کے امتزاج سے ایک لطیف اور پہلودار بات پیدا ہو جائے۔

اصل میں یہی توازن اور امتزاج باقی صدیقی کی غزلیات کا جوہر ہے اس کے خیالات و تصورات میں اتزان اور امتزاج کی روح ہر جگہ کارفرما ہے۔ وہ روایت اور جدت' کہ قدیم اور اکتشافات جدید دونوں کا خوشہ چیں ہے' دونوں کو قابل قبول سمجھتا ہے' مگر روایت برائے روایت (کہ بعض کے نزدیک برائے غزل گفتن خوب است) کا وہ قائل نہیں کیونکہ اس کا ذاتی توازن' اس کی منصفانہ نظر اس تقلید کے مشرب کو شعر و فن اور فکر کی موت سمجھتی ہے۔ اسی طرح وہ جدت برائے جدت اور تنوع محض کا بھی قائل نہیں کیونکہ اس کی متانت اسے ہر قدم پر بھاتی ہے کہ نئی چیز کی چمک' اس کی خوبی کی ضامن نہیں۔ نئی چیز کی دلکشی محض ہمارے ذہنی عجب کی بدولت ہوتی ہے جو واقفیت اور قرب کے بعد پھیکی یا فلاکی میں بدل جاتی ہے' لہٰذا وہ جدت اور روایت دونوں کو پرکھ کر بات کرتا ہے اور ان کے باہمی توازن اور امتزاج' ان کے ایک دلکش سنگم سے اپنا مقام معین کرتا ہے۔

جدت اور روایت کا یہ امتزاج اور توازن ہی اس کی غزل کی توانائی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ انہی کی بدولت وہ فکر و نظر کو کسی مخصوص مکتب خیال کی اندھا دھند تقلید سے آزاد رکھ سکا ہے۔ اپنے لہجے کی متین شگفتگی' اپنے انداز کی انفرادیت' اپنی آواز کی خود اختیاری قائم رکھ سکا ہے۔

("علامت" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

احمد ندیم قاسمی

ادیب اور آزادیٔ اظہار

(اہلِ قلم کانفرنس ۱۹۸۵ء کا کلیدی خطبہ)
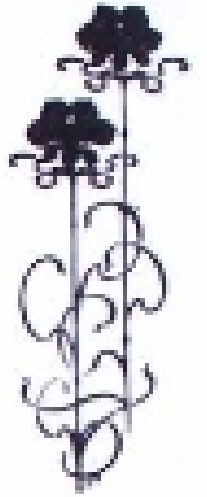
قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک ادب اور ادیب کو وہ اہمیت کبھی نہیں دی گئی جو ایک مہذب ملک میں دی جانی چاہیے کہ ادب ہی تو کسی قوم کی تہذیب کی پہچان ہوتا ہے اور ادیب ہی تو تہذیب کے خدوخال کا تخلیق کار ہوتا ہے اور وہی تو اہلِ وطن کے ضمیر کا ترجمان ہوتا ہے ادیب کو سبق بہت سکھائے گئے ہیں۔ اسے تلقینیں بے حد کی گئی ہیں۔ اسے پاکستان سے محبت اور نظریہ پاکستان کی حفاظت کے گر بے شمار سکھائے گئے ہیں۔ کم ہی کسی نے سوچا ہے کہ پاکستان سے محبت تو پاکستانی اہلِ قلم کے خمیر اور ضمیر میں رچی ہوئی ہے بس یہ ہے کہ یہ اہلِ قلم نظریہ پاکستان میں حریتِ فکر اور آزادیٔ اظہار کو بھی شامل سمجھتے ہیں کیونکہ پاکستان فکر و اظہار کے انہیں ہتھیاروں سے مسلح ہو کر حاصل کیا گیا تھا۔ میں نے علمی و ادبی جماعتوں میں بعض بڑے بڑے اربابِ اقتدار اور اہل الرائے کے اس نوعیت کے ارشادات بھی سنے ہیں کہ یہ زمانہ شاعری اور افسانے اور ناول اور ڈرامے کا زمانہ نہیں ہے بلکہ ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے اور اہلِ ملک کو غزلوں، نظموں اور کہانیوں سے مسحور رکھنے کے بجائے ان کے ہاتھوں میں پلاس تھمانے کا وقت آگیا ہے۔ یقیناً" یہ ٹیکنالوجی کا دور ہے مگر کیا ہاتھ میں پلاس آتے ہی انسان گنگنانا بھول جاتا ہے؟ یا کیا اس طرح وہ اچھے اچھے خواب دیکھنے سے دست کش ہو جاتا ہے؟ شعر و ادب ٹیکنالوجی کے اس دور میں بھی ذہن کو شاداب، دل کو گداز اور ضمیر کو بیدار رکھنے کا ایک موثر ترین ذریعہ ہیں۔ اگر کسی قوت نے ٹیکنیکل لحاظ سے ترقی یافتہ انسان کو اب تک مشین بننے سے روک رکھا ہے تو یہ شعر و فن اور علم و ادب ہی کی قوت ہے۔ اور پھر سائنس اور ادب میں بعد کہاں ہے۔ سائنس کی ترقی تو شاعر اور ادیب کی قوتِ متخیلہ کا ایک ٹھوس روپ ہے۔ سائنس دان حقائق اور ان کے امکانات سے نمٹتا ہے اور فن کار کا زادِ سفر جذبہ و احساس اور خیال و خواب ہوتے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ یہ خیال و خواب بھی حقائق ہی کی سرزمین سے پھوٹتے ہیں اس لئے آگے بڑھتی ہوئی انسانیت کے کارواں میں فن کار اور سائنس دان ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں کہ سائنس دان اور فن کاروں کے خوابوں کو حقائق میں بدلنے پر مامور ہوتے ہیں۔ یوں اہلِ دانش کے یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور ان میں سے کسی ایک کی نفی کرکے دوسرے کا اثبات ممکن ہی نہیں۔ میرا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ شعر و ادب اور علم و فن کو تہذیبی لحاظ سے ثانوی حیثیت دینا ایک فیشن سا بن چلا ہے اور قومی ہیئتِ اجتماعیہ میں تو شاعروں اور ادیبوں کے مسائل کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ بڑی تلخ بات ہے مگر حق بات ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

دراصل پاکستان میں ادب اور ادیب کے مسائل کے ساتھ سنجیدگی سے نمٹنے کی کوئی روایت ہی موجود نہیں ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں اعلیٰ شعر و ادب کی کوئی کتاب ایک ہزار سے زیادہ کی تعداد میں شاید نہیں شائع ہوتی ہے بلکہ اس نوع کی بعض کتابوں کو تو پانچ سو سے زیادہ کی تعداد میں چھاپنے کا حوصلہ نہیں کیا جاتا۔ چند برس پہلے کا ذکر ہے' غیر ملکی ادیبوں کے وفد کے ایک رکن نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تمہارے ہاں اعلیٰ ادب کی کتاب کا پہلا ایڈیشن کتنی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔ وطن کے وقار کا مسئلہ تھا اس لئے میں نے دس گناہ دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا اور کہا۔ "دس ہزار کی تعداد میں۔" اس پر اس غیر ملکی نے مجھ سے باقاعدہ بھرائی ہوئی آواز میں اظہار ہمدردی کیا۔ میں سوچتا ہوں اگر میں اس کے سامنے سچ بول دیتا تو اس کی تو حرکت قلب بند ہو سکتی تھی! بہرحال ہماری یہ ہزار پانچ سو کتابیں بھی اگر سال دو سال میں فروخت ہو جائیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ کتاب کی "ریکارڈ سیل" ہوئی ہے۔ اعلیٰ معیار کے ادبی' فنی اور علمی رسائل بھی ہزار پانچ سو سے زیادہ کم ہی چھپتے ہیں۔ اب غور فرمایئے کہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں خواندگی کا تناسب تیس پچیس فیصد ہے۔ ان میں سے اگر سو میں ایک فرد بھی اعلیٰ ادب کا مطالعہ کرے تو دس کروڑ کے اس ملک میں دس لاکھ ایسے افراد ہونے چاہئیں جو اعلیٰ ادب خریدیں۔ چلئے پانچ لاکھ سہی' ایک لاکھ سہی' پچاس ہزار سہی' پچیس ہزار سہی' دس ہزار سہی' پانچ ہزار سہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر جب دس کروڑ کی اس مملکت میں پانچ ہزار بھی ایسے نہیں ہیں جنہیں اعلیٰ ادب کا ذوق ہو تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ پانی کہیں نہ کہیں مر رہا ہے ۔ کیا ہمارے ہاں ادب کی تعلیم ناقص ہے؟ کیا ہمارے نوجوانوں کو اعلیٰ ادب پڑھنے کی ترغیب اور تربیت ہی نہیں دی جاتی؟ کیا ہمارے ہاں قوت خرید اتنی کم ہے کہ آٹھ کروڑ میں سے پانچ ہزار افراد بھی کتابیں خرید کر نہیں پڑھ سکتے؟ کیا ہمارے ہاں تخلیقی ادب کا معیار گر رہا ہے؟ ممکن ہے ادب اور ادیب کی بدحالی میں یہ بھی اسباب شامل ہوں مگر میری رائے میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ تہذیب و ثقافت کی ترجیحات کی جو فہرست مرتب کی جاتی ہے' اس میں ادب اس فہرست کی شاید آخری شق ہوتا ہے۔ بصورت دیگر ہمارے ہاں ہزاروں کی تعداد میں سکول ہیں' کالج ہیں' دانش گاہیں ہیں اور ان میں سے ہر ادارے میں لائبریری موجود ہے ۔ تعلیمی اداروں کے علاوہ بھی قومی زندگی کے مختلف شعبوں کی اپنی لائبریریاں ہیں۔ اگر حکومت انہیں اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کی معیاری کتابیں اور معیاری رسائل کی خریداری کا پابند کردے تو چند ماہ کے اندر اعلیٰ معیار کے کتب و رسائل کی تعداد اشاعت ایک ہزار سے بڑھ کر پچاس ہزار تک تو یقیناً" جا سکتی ہے اور اگر اہل قلم کی کاوشیں اتنی تعداد میں شائع اور فروخت ہونے لگیں تو ادیب کے معاشی مسائل حتمی طور پر حل ہو سکتے ہیں ۔ اس صورت میں حکومت کو وظائف جاری کرنے کی تکلیف کرنی پڑے گی اور نہ اہل قلم میں سے کسی کے مر جانے کے بعد اپیلیں شائع ہوں گی کہ اس کے پسماندگان کی گزر بسر کا کچھ بندوبست کیا جائے۔ اگر ایک کتاب کی قیمت پچاس روپے ہے اور موجودہ حالات میں یہ کم سے کم قیمت ہے' اور یہ کتاب پچاس ہزار کی تعداد میں شائع ہوتی ہے اور ادیب کو کم سے کم رائلٹی دس فیصد کے حساب سے ملتی ہے اور یہ کم سے کم رائلٹی ہے' تو میری اس گزارش کے حوالے سے ایک کتاب کے صرف ایک ایڈیشن کی رائیلٹی ڈھائی لاکھ روپے بنتی ہے۔

مگر اس طرح کے مسائل پر ہمدردی سے غور کم کیا جاتا ہے اور ادیب کو زیادہ شک کی نظر سے دیکھا جاتا

رہا ہے کیونکہ ادیب ہمیشہ آگے بڑھ کر سوچتا ہے اور جمود اور انحطاط سے کبھی سمجھوتا نہیں کرتا۔ وہ حق بات کہنے سے کبھی باز نہیں آتا' چاہے اپنی بات کو تشبیہہ استعارہ اور علامت کا لباس پہنا دے۔ یوں وہ بظاہر کم سہی' مگر باطن عموماً" معتوب ٹھہرتا ہے اور اسی لئے اس کے مسائل کو کم ہی لائق اعتنا سمجھا جاتا ہے مگر ادب اور ادیب کو عملاً" نظر انداز کر کے اپنی تہذیب کے خدوخال کو نمایاں کرنے کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ حسن کاری ادیب کا شیوہ ہے اور حسن کا مطلب ہے عدل' خیر اور ارتقاء ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چلئے ادیب کا نیک مقصد ہی اس کا معاوضہ سہی۔

ندیمؔ' کوئی مرے فن کا اجر کیا دے گا
میں خاک چاٹ کے بھی تشنۂ ہنر میں رہوں گا

("چہار سو" راولپنڈی)

اورنگ زیب قاسمی

انسانی رشتے اور ہمارا عہد

ہماری ٹریڈیشنل تہذیب ایک اکائی تھی۔ یہ اکائی عالم خارجی کے اندر تین رشتوں میں ظاہر ہوتی تھی (۱) انسان کا انسان سے رشتہ (۲) انسان کا کائنات سے رشتہ (۳) انسان کا خدا سے رشتہ ۔ ۔ ۔ عالم خارجی کی طرح انسان کی داخلی فطرت بھی ایک اکائی تھی اور اس کا اظہار بھی انسانی داخلیت کے اندر تین جہات میں ہوتا تھا۔ یعنی ایک تو انسان کا اپنے محسوسات سے رشتہ دوسرے انسان کا اپنے تعلقات سے رشتہ اور تیسرے انسان کا اپنی جبلتوں سے رشتہ ۔ ۔ ۔ اور یہ سب رشتے الگ الگ نہیں تھے بلکہ ایک دوسرے سے مل کر ایک وحدت بناتے تھے۔ چنانچہ غالب سے پہلے ہمارے پرانے معاشرے میں انسان کی تعریف ہی یہ تھی کہ وہ ایک رشتے کا نام ہے ایک تعلق کا نام ہے اور یہ تعلق خود اس کے اپنے نفس اور اپنی ذات سے شروع ہو کر پورے معاشرے کے اندر مختلف رشتوں میں اپنا اظہار کرتا ہوا خدا تک پہنچتا تھا۔ یہ معاشرہ میر، نظیر اور انیس کا معاشرہ تھا۔ نظیر کا انسان اس معاشرے کا ایک ایسا تماشائی تھا جو بنجاروں کے ساتھ دیس دیس اور نگر نگر گھومتا پھرتا تھا وہ دنیا میں انسانوں کے درمیان اس طرح رہتا تھا جیسے دریا میں کنول ۔ میر کا انسان ایک ایسا عاشق تھا جو محبوب سے لے کر کائنات تک سب سے ہم آہنگی کے رشتے میں بندھا ہوا تھا' اور انیس ! انیس کا انسان وہ انسان تھا جو رشتوں کے انفاس تازہ سے مہک رہا تھا ۔ یہ وہ معاشرہ تھا جس کے اندر انسانی رشتے نہ صرف یہ کہ زندہ تھے بلکہ انسانی وجود کی لازمی شرط تھے ۔ رشتوں کے بغیر انسانی زندگی کا کوئی تصور اس معاشرے میں ممکن نہ تھا۔ انسان رشتوں کے بغیر نہ تو وجود میں آسکتا تھا اور نہ ہی اپنے وجود کو برقرار رکھ سکتا تھا۔ انسان کا خدا سے رشتہ ہو یا کائنات سے ' محبوب سے رشتہ ہو یا دوسرے انسانوں سے ' یہ تمام رشتے اس معاشرے کی زندگی کے لئے رگ جاں کی طرح تھے' اور پورے معاشرے میں زندگی دراصل انہی رشتوں سے عبارت تھی ۔ چنانچہ جو شاعری اس معاشرے نے پیدا کی اس میں بھی یہ رشتے بالکل اسی طرح منعکس ہوئے ہیں جس طرح کہ وہ معاشرے میں موجود تھے اس کی بہترین مثال انیس کی شاعری ہے جس میں تمام انسانی رشتے اپنی جھلک اسی طرح دکھاتے ہیں جس طرح آئینے میں عکس۔

اردو شاعری میں انسانی رشتوں کا بنیادی حوالہ عشق تھا عشق ایک ایسی قوت تھی جو انسانی وجود کے مختلف اجزاء کو سمیٹ کر ایک اکائی بناتا تھا اور اس کا رشتہ مختلف چیزوں سے جوڑتا تھا۔ یہ رشتہ خدا سے بھی ہو سکتا تھا' کائنات سے بھی اور انسانوں سے بھی انسانوں کے باہمی رشتہ کا مرکزی استعارہ محبوب سے تعلق تھا اور عشق دراصل رشتوں کی ہم آہنگی کا استعارہ تھا ۔ مثال کے طور پر ایک میر ہی کی شاعری کو لیجئے' میر کے ہاں جو

عاشق ہے اس کا رشتہ محبوب اور کائنات دونوں سے کیا ہے یہ معلوم کرنے کے لئے ہمیں ان کے اس قسم کے اشعار پر غور کرنا چاہیے:

چھٹے جی کوچہ دلدار سے جایا نہ گیا
اس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا

" چھٹے جی کوچہ دلدار سے جایا نہ گیا " کا مطلب یہ ہے کہ میر کے لئے کوچہ دلدار ہی کائنات کے مترادف ہو گیا ہے اور پوری زندگی حیات عشقیہ کے یا یوں کہیے کہ عشق کی اقدار کے تابع ہو گئی ہے۔ میر کا عاشق جس نظر سے محبوب کو دیکھتا ہے اسی نظر سے کائنات کو بھی دیکھتا ہے اور دونوں سے اس کا رشتہ ہم آہنگی کا رشتہ ہے فراق صاحب نے کہا تھا کہ کارلائل کی کتاب " ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ " میں ایک باب کی کمی ہے یعنی ہیرو بطور عاشق کے ۔ ہیرو بطور عاشق کے کیا ہوتا ہے اس کا مکمل نمونہ ہمیں میر کی شاعری میں ملتا ہے۔ یہ عاشق صرف انسانی رشتوں ہی کی علامت نہیں ہے بلکہ خدا اور کائنات سے بھی مثالی تعلق کا آئینہ دار ہے اچھا۔ اب دوسری چیز اس شعر میں دیکھنے کی یہ بھی ہے کہ میر کے لئے عشق کوئی جزوقتی کام نہیں بلکہ زندگی بھر کا سودا ہے ان کے ہاں پوری زندگی کی اقدار اسی ایک مرکز یعنی عشق پر قائم ہیں۔ اس کے مقابلے میں غالب کو دیکھئے تو عشق کی صورت حال ان کے ہاں بالکل مختلف نظر آتی ہے مثال کے طور پر ان کی ایک بہت اچھی عشقیہ غزل ہی کا شعر دیکھیے:

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ غالب کے لئے عشق کوئی ہمہ وقتی مشغولیت نہیں۔ میر کی طرح زندگی بھر کا روگ نہیں ' بلکہ محض فرصت کا مشغلہ ہے اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ عشق کی اکائی ان کے ہاں اندر سے ٹوٹ گئی ہے اور میر کے ہاں وہ جو انسان سے لے کر کائنات تک سب سے ہم آہنگی کا رشتہ تھا۔ وہ بھی ان کے ہاں ٹوٹا ہوا نظر آتا ہے بلکہ اوروں کا تو کیا ذکر خود محبوب سے غالب کا تعلق ہم آہنگی اور یگانگت کا نہیں۔ ان کی شاعری میں عاشق اور محبوب کے درمیان ایک بعد ہے ایک خلیج ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اس خلیج کو پاٹنے کی بھی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں میر کے ہاں انسان کی اچھائی برائی سمیت پورے وجود کی قبولیت کا جو محبت بھرا انداز اس قسم کے اشعار میں ملتا ہے:

ادائیں دیکھیں لیاں کج ادائیاں دیکھیں   بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں
ہم فقیروں سے کج ادائی کیا   آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

اس کا بھی غالب کے ہاں دور دور پتہ نہیں ۔ ان اشعار میں میر کا لب و لہجہ دیکھیے۔ وہ اپنے محبوب سے بے التفاتی اور بے اعتنائی کی شکایت بھی کرتے ہیں تو کیسے بچے ' کیسے پر خلوص اور محبت بھرے انداز میں ۔ اس کے برعکس غالب کے ہاں طنز ہے' تمسخر ہے ' پھبتی کسنے کا انداز ہے اور کچھ ایسا لب و لہجہ ہے جو کبھی کبھی ذاتی پھٹکار میں بدل جاتا ہے:

ہرایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے   تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا   کہاں تک اے سراپاناز کیاکیا

دراصل غالب کے ہاں اس کی انا ' اس کی ذات سے الگ ہو گئی تھی اور یہی "انا" ہے جو اسے محبوب سے ہم آہنگی کے رشتہ میں منسلک نہیں ہونے دیتی۔ ہماری ٹریڈیشنل تہذیب میں وہ ایک کیمیا سازی تھی جو عشق کے ذریعے انسان کی پوری شخصیت اور ذات کو ہم آہنگ کر دیتی تھی اس کا اثر غالب کے ہاں مفقود نظر آتا ہے کیوں ؟ اس لئے کہ اس کی "انا" اس کی راہ میں ایک سنگ گراں کی طرح حائل ہے۔ انسان کا انسان سے رشتہ ہو یا کائنات اور ماورائے کائنات سے غالب پورے انسانی روابط کو اپنی "انا" کے زاویے سے دیکھتا ہے اور کسی بھی ہم آہنگی کے رشتے میں منسلک نہیں ہو پاتا۔ وہ خدا سے لے کر خدا تک سب سے شاکی ہے ۔ سارے انسانی رشتے اس کے لئے زہرناک بن چکے ہیں۔ حتیٰ کہ فطرت سے بھی اس کا رشتہ زہرناکی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ وہ جو میر کے ہاں " نازکی اس کے لب کی کیا کہئے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے" یا " چلتے ہو تو چمن کو چلیے" اور " پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں" والی کیفیت تھی۔ وہ غالب کے ہاں نظر نہیں آتی۔ وہ باغ کی سیر کو جاتا ہے تو اس کیفیت کی بجائے اس کے لئے وہاں بھی ایک ایسی قلاوس نما صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جس میں اسے " سایہ شاخ گل " بھی افعی نظر آنے لگتا ہے:

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایہ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

انسانی زندگی دراصل رشتوں ہی سے عبارت ہے وہ رشتہ ماں باپ سے ہو یا بھائی بہنوں سے ' دوست احباب سے ہو یا بیوی بچوں سے انسانی دنیا کے یہی وہ رشتے ہیں جو مل جل کر زندگی کو زندگی بناتے ہیں اور پھر انسانی دنیا سے بھی وسیع تر ایک دنیا چاند سورج اور ستاروں کی ہے سبزہ و گل ' کوہ و دمن ' دشت و دریا' شجر حجر اور چرند پرند کی ہے یہ بھی انسانی زندگی کے رشتوں میں شامل ہے ۔یہی یہ تمام رشتے ہمارے ہاں زندہ تھے میر اور نظیر سے لے کر انیس تک برابر ہم ان رشتوں کو اپنے خون کی گردشوں میں محسوس کرتے تھے لیکن انیس سے غالب تک آتے آتے ہمارا معاشرہ ایک بہت بڑی تبدیلی سے دوچار ہو گیا ۔ غالب ہمارے ہاں پہلا آدمی ہے جس کے ہاں رشتوں کے ٹوٹنے کا عمل سب سے پہلے اندرونی طور پر شروع ہوا۔ غالب کا انسان تمام رشتوں کی نفی کر کے اپنی حقیقت آپ بن جانا چاہتا ہے غالب اور میر انیس کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر دیکھیے تو پتہ چلتا ہے کہ انیس جس دنیا کا آدمی تھا غالب اس دنیا کے غائب ہونے کی خبر دے رہا ہے غالب ایک ایسی جگہ کھڑا ہے جہاں وہ انسان رخصت ہو رہا ہے جس نے میر انیس کے رشتوں والی شاعری پیدا کی تھی۔ میرانیس اور ان کے معاشرے کے لئے یہ رشتے کیا معنی رکھتے تھے اور وہ انہیں کس طرح محسوس کرتا تھا ' اب ہمارے لئے اسے واضح طور پر جاننا بھی شاید آسان نہیں۔

لیکن شعر و ادب ہمارے ماضی کے گمشدہ تجربات کی باز آفرینی کا ایک بہت اچھا ذریعہ ہیں میرانیس اور ان کے معاشرے سے ہم آج کتنے ہی دور سہی لیکن ذرا ایک بار انیس کو پڑھ کر دیکھیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ بھائی بہن 'ماں باپ 'ماموں بھانجے 'پھوپی 'بھتیجے ' شوہر بیوی رشتوں کی کتنی ہی شکلیں ایسی ہیں جو انیس کی شاعری میں آج بھی زندہ ہیں اور ان جذبات و محسوسات کو آئینہ دکھاتی ہیں جو کبھی ہماری زندگی کا سب سے قیمتی

اورنگ زیب قاسمی

سرمایہ تھے ۔ گو کہ آج ہم ان رشتوں کو اس طرح محسوس نہیں کرتے جس طرح میرانیس نے انہیں محسوس کیا تھا' اس لئے کہ اب ہمارے لئے یہ رشتے اتنے حقیقی نہیں جتنے انیس اور ان کے معاشرے کے لئے تھے ۔ یوں ہونے کو تو یہ رشتے معاشرے میں خارجی طور پر اب بھی موجود ہیں لیکن ان کا داخلی احساس مردہ یا نیم مردہ ہو چکا ہے اب ہمارے لئے ہماری بہنیں ' خالائیں اور پھوپیاں وہ نہیں جو میرانیس کے معاشرے کے لئے تھیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے بعض رشتے اب بھی ایسے ہیں جو ہمیں زندہ محسوس ہوتے ہیں مثلاً والدین اور اولاد کا رشتہ ' لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ رشتے زندہ ہونے کے باوجود اب اتنے زندہ نہیں جتنے میرانیس یا ان کے معاشرے کے لئے تھے۔

میرانیس کی دنیا کے مقابلے میں غالب کی دنیا ایک ایسے فرد کی دنیا ہے جو اپنے اندر اور باہر تمام رشتوں سے کٹ کر بجائے خود ایک کل بن جانا چاہتا ہے ۔ یہ انسان دراصل ہر رشتہ کی نفی ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ جو کچھ ہو اپنی ہستی سے ہو۔ وہ دہر سے کوئی اثر لینے کو بھی ہنگامی زبونی ہمت کہتا ہے:

ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو   آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
ہنگامہ زبونی ہمت ہے انفعال   حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا بے رشتہ و بے اضافت فرد بن جانا چاہتا ہے جو بجائے خود مطلق (Absolute) ہو۔ غالب کے بعد ہمارے ہاں جو معاشرہ پیدا ہوا وہ دراصل غالب ہی کا معاشرہ ہے ہمارے عہد کا سمبل (Symbol) ہے اور اس کا گلشن ناآفریدہ دراصل ہماری ہی دنیا ہے اس دنیا کا المیہ یہ ہے کہ اس میں سارے خاندانی ' معاشرتی اور کائناتی رشتے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے ہیں یوں ہونے کو تو یہ رشتے ظاہری طور پر اب بھی کسی نہ کسی سطح پر باقی ہیں ۔ مگر وہ ہمارے لئے راحت بخش اور مسرت آفریں ہونے کی بجائے تکلیف دہ اور اذیت ناک بن چکے ہیں اور اسی لئے ہم انہیں توڑ کر ان سے آزاد ہو جانا چاہتے ہیں۔

ہماری روایتی تہذیب میں معاشرہ ایک فطری چیز تھا۔ اس تہذیب میں فرد اور معاشرہ کے درمیان ہم آہنگی کا رشتہ تھا جو فرد کی طرف سے اطاعت اور معاشرے کی طرف سے تعاون کی بنیاد پر قائم تھا' لیکن اس کی حیثیت کسی خارجی عہد و پیمان کی نہیں تھی' اور نہ ہی یہ رشتہ کسی قانون یا عمرانی معاہدہ کے ذریعے وجود میں آیا تھا بلکہ یہ ایک حقیقی اور فطری رشتہ تھا ایسا رشتہ جس کی جڑ فرد کی ذات اور معاشرے کے باطن کی انتہائی گہرائیوں میں پیوست تھی' چنانچہ اس تہذیب میں فرد کے لئے معاشرہ بالکل ایک ایسی ہی حقیقی اور فطری چیز تھا جیسے مچھلی کے لئے سمندر۔ جب تک فرد اور معاشرے کے درمیان یہ فطری رشتہ قائم رہا۔ فرد اپنے آپ کو معاشرے کا جزو سمجھتا رہا اور اس کی طرف سے عائد ہونے والی پابندیوں اور ذمہ داریوں کو اپنے ہی وجود کا ایک فطری تقاضہ سمجھ کر قبول کرتا رہا لیکن ہمارے نئے معاشرے میں فرد اور معاشرے کے درمیان یہ رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ اب فرد اپنے آپ کو معاشرے کا جزو نہیں سمجھتا۔ معاشرہ اب اسے اپنی آزادی کے خلاف ایک جبری بندش اور اپنے اوپر خارج سے تھوپی ہوئی چیز معلوم ہونے لگا ہے اب یہ وہ سمندر نہیں جس میں مچھلی تیرتی ہے بلکہ وہ جال ہے جس میں مچھلی پھنسی ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ اب وہ معاشرے کے اس جال کو توڑ کر اس سے آزاد ہونے میں لگا ہوا ہے یہ روسو کا وہ فرد ہے جو آزاد پیدا ہوا تھا مگر ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا گیا یہ زنجیریں روایتی معاشرے کے مذہب واخلاق' قانون و معاشرت ' اقدار و روایات اور انسانی رشتوں ہی سے تو

عبارت ہیں ۔ چنانچہ روسو کے بعد سے لے کر آج تک یہ فرد ہر جگہ ان زنجیروں کو توڑ رہا ہے روسو کے بعد کی پوری تاریخ دراصل اس فرد کی آزادی کی تاریخ ہے۔

یہ فرد جو روایتی معاشرے کی شکست و ریخت سے پیدا ہوا' اپنی پیدائش کے لئے کئی صدیوں سے تاریخ کے بطن میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا رینے گینوں کا کہنا ہے کہ عہد جدید کا ظہور دراصل اسی فرد کا مرہون منت ہے بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس فرد کے بغیر عہد جدید کی پیدائش ہی ممکن نہیں تھی۔ بہرحال آج بیسویں صدی میں یہ فرد اپنے پورے قدوقامت کے ساتھ ہمارے سامنے ہے ۔ اس صدی میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان بپا ہونے والی کشمکش بھی دراصل اسی فرد کی پیدائش کا ایک نتیجہ تھی۔ سرمایہ داری میں یہ فرد اپنی تمام زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو چکا تھا جبکہ اشتراکیت اسے دوبارہ زنجیر میں باندھنے کی کوشش تا تمام سے عبارت تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں فرد نے انسانی زندگی کے انفرادی پہلو ہی کو سب کچھ سمجھ کر اپنے آپ کو باپ سے خاندان سے اور تمام معاشرتی رشتوں سے کاٹ لیا جبکہ اشتراکیت اس کے اجتماعی پہلو ہی کو سب کچھ سمجھ کر اسے بہ جبر معاشرے کے کھونٹے سے باندھنا چاہتی تھی لیکن یہ اس مسئلہ کا درست حل نہ تھا فرد پرستی ہو یا اجتماعیت پرستی' دونوں ہی ادھوری سچائیاں ہیں ۔ لہٰذا جب تک فرد کی ذات کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں ان کے فطری مقام پر نہیں رکھا جائے گا۔ اس وقت تک فرد اور معاشرے کا حقیقی رشتہ بحال نہ ہو سکے گا۔

ادب اور فن کی دنیا میں اس فرد کا کام ماضی کو یکسر مسترد کرنا اور ان تمام روایات و اقدار کی نفی کرنا ہے جو فرد کو ایک موجود معاشرے سے جوڑتی ہیں ۔ ہماری ادبی دنیا میں غالب کے بعد یہ فرد یگانہ کے ہاں اپنے وجود کے مرکزی مسائل سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ یگانہ کی شاعری میں ہمیں ایک ایسا فرد نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے جس کا رشتہ روایتی اقدار سے ٹوٹ چکا ہے ۔ غالب اور یگانہ دونوں کے ہاں یہ فرد معاشرے کی اقدار روایات کی تنقید اور نفی اپنی "انا" کے ذریعہ کرتاہے اور اپنی "انا" ہی کو حق و باطل کا آخری معیار سمجھتا ہے وہ اپنی انا کی مدد سے مذہب 'اخلاق ' مروجہ اقدار اور معاشرے کی تمام خارجی شکلوں سے لڑتا ہے بلکہ پوری کائنات کے مقابل کھڑا ہو جاتا ہے نہ صرف کائنات کے بلکہ خالق کائنات کے بھی ۔ عسکری صاحب کہتے ہیں کہ یہ پرانی کائنات اور پرانی اقدار کو رد کرکے نئی کائنات اور نئی اقدار کی تلاش کا عمل ہے مگر نئی اقدار کا سراغ تو کہیں ملتا نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس ہم تو یہی دیکھتے ہیں کہ یہ فرد اپنے معاشرے کی مذہبی اخلاقی ' معاشرتی اوضاع کو مسترد کرکے یا تو انحطاط' اجنبیت ' داخلی انتشار اور زندگی کی مہملیت سے دوچار ہو جاتا ہے اور نئی تعمیر کی کلید اس کے ہاتھ آتا تو درکنار اس سے دور سے دور تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

فرد پرستی ' جدید معاشرے کی بنیاد ہے جبکہ روایتی معاشرے کا بنیادی پتھر خاندان تھا ' خاندان کا نام آتے ہی ہمارے ذہنوں میں پررونق دالانوں بھرے پرے زنان خانوں اور کھیلتے کودتے بچوں سے بھری ہوئی انگنائیوں کا نقشہ گھومنے لگتا ہے خاندان کے اس تصور میں اتنی وسعت ہے کہ بیوی بچے' ماں باپ ' بھائی بہن' سب کو اپنی آغوش محبت میں سمیٹ لیتا ہے خاندان کے اس روایتی تصور کے مقابلے میں نئے عہد نے ہمیں خاندانی منصوبہ بندی کا تصور دیا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی والے کہتے ہیں کہ بابا! آج کے دور میں ہمارے قومی وسائل اس بارگراں کے متحمل نہیں ہو سکتے ۔ لہٰذا ماں باپ ' بھائی ' بہن' سب کو ہٹایئے اور کم سے کم بچوں

اورنگ زیب قاسمی

پر اکتفا کیجئے۔ پرانے زمانے میں بڑی بوڑھیاں سہاگنوں کو دعائیں دیتی تھیں کہ دودھوں نہاؤ' پوتوں پھلو ' صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے لیکن مانگ سے صندل تو بالوں کے نئے فیشن پہلے ہی لے اڑے اب خاندانی منصوبہ بندی والے کہتے ہیں کہ گود بچوں سے بھری رہنے کی بجائے جیب نوٹوں سے بھری رہنی چاہیے بھلا وہ اولاد کس کام کی جس سے گود تو بھر جائے مگر جیب خالی ہو جائے ۔ لہٰذا نئے شادی شدہ جوڑوں کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ اپنی محبت کے نتائج کو معیاری اعدادو شمار سے آگے نہ بڑھنے دیں لیکن روایتی معاشرے میں خاندان اپنی تمام تر وسعت کے ساتھ نہ صرف یہ کہ قابل قبول تھا بلکہ سمجھا یہ جاتا تھا کہ خاندان ہی حقیقت میں انسانی معاشرے کی بنیاد ہے بلکہ خود انسانیت ہے اس معاشرے میں خاندان کے بغیر کسی وحشی یا نبی کا تصور تو ممکن تھا کسی مہذب انسان کا نہیں ۔ لہٰذا ایسے معاشرے میں نہ تو کبھی خاندانی منصوبہ بندی پیدا ہو سکتی تھی اور نہ ہی خاندانی منصوبہ بندی والے۔

روایتی معاشرے کا خاندان ' باپ کی اتھارٹی کی بنیاد پر قائم تھا اور خاندان میں مرکزی حیثیت بھی باپ ہی کو حاصل تھی۔ لہٰذا خاندان کا سارا نظام شمسی اسی مرکز کے گرد گھومتا تھا چنانچہ جب اس معاشرے میں رشتوں کی شکست وریخت شروع ہوئی تو اس کا نقطہ آغاز بھی دراصل باپ ہی کے خلاف بغاوت کی لہر سے متعین ہوا اور وہ یوں کہ جب غالب نے فرزند آزر کی سنت کے مطابق دین بزرگاں سے انحراف کو صاحب نظری کی علامت قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

بامن میاویزاے پدر' فرزند آزر رانگر!
ہر کس کہ شد صاحب نظر' دین بزرگاں خوش نکرد

تو پھر جو عمل اندرونی طور پر غالب کے ہاں رونما ہوا تھا' اس کا جلد یا بدیر خارجی طور پر معاشرے میں ظاہر ہونا بھی لازمی تھا' چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کے بعد پیدا ہونے والے نئے معاشرے میں باپ کی اتھارٹی کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جاتی ہے اور جتنی یہ اتھارٹی کمزور ہوتی ہے ' نئے معاشرے کا فرد اتنا ہی اپنے حقیقی خدوخال میں ہمارے سامنے آتا جاتا ہے۔

روایتی معاشرے کے والدین چونکہ اتھارٹی رکھتے تھے اس لئے ممکن ہے وہ بعض اوقات زیادتی کے مرتکب بھی ہوتے ہوں ' لیکن زیادتی کے باوجود اولاد ان سے منحرف نہیں ہوتی تھی یا یوں کہیے کہ روایتی معاشرے کا فرد معاشرے سے منقطع نہیں ہوتا تھا وہ ناراض ہو سکتا تھا ' غصے کا اظہار کر سکتا تھا' احتجاج کر سکتا تھا مگر اس کے باطن میں معاشرے سے ایک تعلق پھر بھی باقی رہتا تھا یہ باپ بیٹے کا اختلاف تھا ۔ بیٹا باپ سے ناراض ہو سکتا تھا مگر جانتا تھا کہ باپ پھر باپ ہے اسی طرح باپ بھی بیٹے کے غصے اور ناراضگی کے باوجود اسے بیٹا ہی سمجھتا تھا لیکن ہمارے نئے معاشرے میں صورت حال بالکل مختلف ہو چکی ہے اب باپ' باپ کہلانے کی بجائے اولاد کے دوست اور مشیر بننا زیادہ پسند کرتے ہیں جب باپ بیٹا دوست ' اور ماں بیٹیاں سہیلیاں بن جائیں تو جبر اور زیادتی کا سوال ہی کہاں باقی رہتا ہے۔ والدین اب اتنی ہمت بھی نہیں رکھتے کہ اولاد کے سامنے اپنی بات کھل کر کہہ سکیں۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ اب والدین اپنی اولاد کو یہ نہیں سکھاتے کہ انہیں کیسا ہونا چاہیے بلکہ اولاد والدین کو بتاتی ہے کہ انہیں کیسا ہونا چاہیے۔ یہ خیال اب خاصا عام ہو چلا ہے کہ نئے زمانے کی ضروریات کو والدین کے مقابلے میں اولاد زیادہ بہتر طور پر سمجھتی ہے ' اس لئے کہ والدین ماضی

کی چیز ہیں اور اولاد مستقبل کی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اس مستقبل پرستی پر اعتراض کرتے ہوئے ایک جگہ کہا ہے کہ مجھے اولاد کی ضرورت اس لئے ہے کہ وہ میری اقدار کی امین بنے گی اگر وہ میری اقدار کی امین نہیں تو ایسی اولاد کو پروان چڑھانے سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو آگے چل کر مجھے بندر کہے گی۔

روایتی معاشرے کا خاندان باپ کی اتھارٹی پر بنیاد پر قائم تھا باپ اپنی اولاد کو وہی کچھ سکھاتا تھا جو اس نے خود اپنے ماں باپ سے سیکھا تھا اور پھر یہ سلسلہ یونہی ایک نسل سے دوسری نسل تک آگے چلتا رہتا تھا مذہب ' روایت ' اخلاق ' رسوم ' ادب و آداب سب کے تحفظ کا یہی عملی طریقہ تھا اور یہی طریقہ معاشرے کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی ضمانت بھی تھا روایتی معاشرے میں باپ کی اتھارٹی کا اصول معاشرے کے تسلسل کی ضمانت تھا تو جدید معاشرے میں فرد کی آزادی کا اصول معاشرے کے تسلسل کو توڑنے کا اصول ہے۔ چنانچہ اس اصول کے عام ہوتے ہی مذہب و اخلاق ' اقدار و روایات ' قانون و معاشرت اور ہر وہ چیز جو ایک معاشرے کو منضبط اور منظم بناتی ہے ' انکار اور بغاوت کی زد میں آجاتی ہے اور اتھارٹی کا انکار ہر اس چیز کا انکار بن جاتا ہے جو فرد سے اوپر ہونے کا دعویٰ کرتی ہو نتیجہ یہ کہ گھر میں باپ معزول ہوتا ہے مکتب میں استاد نعوذباللہ آسمان پر خدا کو بھی معزول سمجھا جانے لگتا ہے۔ غالب کے زمانے میں عملی صورت خواہ کچھ بھی رہی ہو ' لیکن ان کے گلشن ناآفریدہ کے پیدا ہونے کے بعد یہ نیا فرد اپنے تمام تر انکار اور بغاوت کے ساتھ ہمارے درمیان موجود ہے اب دین بزرگاں کو کوئی قدر اسے کسی بھی حد میں رکھنے سے قاصر ہے یہ فرد اپنی آزادیوں کے حصول میں جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی اندرونی اور بیرونی طور پر اپنے تمام رشتوں سے منقطع ہوتا چلا جاتا ہے اور بالآخر اس کے تمام انسانی رشتے ' خواہ ان کی بنیاد خاندانی ریلیشن شپ (Relationship) پر ہو یا معاشرتی اور کائناتی تعلق پر ' سب کے سب منہدم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اگر اس فرد کا کسی دوسرے فرد سے کوئی رشتہ ہوتا بھی ہے تو وہ کسی مثبت بنیاد پر نہیں بلکہ افادہ اور استحصال کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے ' اور ٹھیک یہی وہ صورت حال ہے جو آج ہمیں اپنے معاشرے میں ہر طرف نظر آتی ہے۔ آج ایک انسان دوسرے سے یا تو استحصال اور افادہ کی غرض سے ملتا ہے یا محض رعب جھاڑنے کے لئے۔

اورنگ زیب قاسمی

روایتی معاشرے میں باپ سے لے کر خدا تک تمام رشتے ایک ایسے نظام مراتب سے وابستہ تھے جس میں ہر چیز کی ایک اپنی حیثیت اور جگہ متعین تھی۔ زمین پر بادشاہ خدا کے نائب کی حیثیت رکھتا تھا خاندان میں باپ کی حیثیت وہ تھی جو مملکت میں بادشاہ کی ہوتی ہے ' اسی طرح باپ بیٹے ' ماں بیٹی ' میاں بیوی ' بھائی بہن ' استاد شاگرد وغیرہ تمام رشتے اپنے اپنے مخصوص مقام اور مرتبہ کے ساتھ روایتی بنیادوں پر قائم تھے اس نظام مراتب میں جس چیز کی جو حیثیت اور جگہ متعین تھی وہ نہ تو کوئی اس سے چھین سکتا تھا اور نہ ہی خود کسی اور کی جگہ لے سکتا تھا اس کے مقابلہ میں آج ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں وہ اس کا بالکل الٹ ہے یہاں کسی چیز کی کوئی خاص متعین جگہ نہیں اور ہر جگہ ہر چیز کے لئے ہے۔ خاندانی اقدار الٹ ہو چکی ہیں۔ ماں باپ ' بھائی بہن ' شوہر بیوی ' استاد شاگرد ' سب رشتے اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر کچھ سے کچھ بن چکے ہیں۔ قدرت پرست معاشرے کی نئی تہذیب نے ہر اس چیز کو شخصی بنا کر رکھ دیا جو ہماری ٹریڈیشنل تہذیب میں قطعاً غیر شخصی ہوتی تھی مثلاً باپ بیٹے کا رشتہ روایتی تہذیب میں غیر شخصی بنیادوں پر قائم تھا یعنی بیٹا باپ سے اس لئے محبت نہیں کرتا تھا کہ باپ چند انفرادی خصوصیات کی بنا پر اس کا مستحق ہے بلکہ باپ کی محبت اور اطاعت

اس کے باپ ہونے کی بنا پر تھی یہ ایک غیر شخصی رشتہ تھا لیکن جدید تہذیب نے اس غیر شخصی رشتہ کو شخصی رشتے میں تبدیل کر دیا۔ اب باپ بیٹے ایک دوسرے کے دوست اور ماں بیٹیاں سہیلیاں بن چکی ہیں اسی طرح شوہر بیوی کا رشتہ بھی پہلے ایک غیر شخصی رشتہ تھا۔ روایتی معاشرے میں شوہر کو خدائے مجازی کا جو مقام حاصل تھا وہ اسے کسی انفرادی خصوصیت کی بنا پر نہیں بلکہ محض شوہر ہونے کے ناطے حاصل تھا ' چنانچہ بیوی گھر کی مالکہ ہونے کے باوجود ہر حال میں شوہر کی خدمت اور اطاعت کو اپنا فرض سمجھتی تھی لیکن نئے معاشرے میں شوہر خدائے مجازی کے مرتبہ سے معزول ہو چکا ہے۔ اب اسے بھی اپنی انفرادی خصوصیات کی بنا پر شوہر کا استحقاق ملنے لگا ہے۔

غرض کہ نئے معاشرے میں کوئی بھی رشتہ اپنے روایتی مقام اور مرتبہ کے ساتھ اصلی حالت میں باقی نہیں رہا۔ علاوہ ازیں آج سے پہلے رشتے ہمارے وجود کا لازمی تقاضا اور ہماری روح کی بنیادی ضرورت ہوتے تھے لیکن اب ہم اپنی تمام ضرورتوں سے بڑی حد تک بے نیاز ہو چکے ہیں اب دوسروں سے ہمارا ہر تعلق یا تو ٹوٹا ہوا ہے یا کسی نہ کسی مصلحت اور غرض کی بنیاد پر قائم ہے اب ہم میں سے شاید ہی کوئی رشتہ ایسا ہو جس کے بغیر ہمیں اپنی زندگی ادھوری معلوم ہوتی ہو اور خواہ ہم اعتراف کریں یا نہ کریں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب بہت سے رشتے ہماری مجبوریوں کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً ایک شوہر اپنی بیوی کا کفیل ہوتا ہے اور بیوی محسوس کرتی ہے کہ وہ اس کا کار آمد معاشی سہارا ہے اس اعتبار سے اسے اپنا شوہر یقیناً بہت اہم محسوس ہوتا ہوگا اور بچے بھی اگر ماں باپ کے بارے میں کم و بیش اسی طرح محسوس کرتے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ رشتوں کی کوئی حقیقی شرط نہیں ' حقیقی ' سچا اور زندہ رشتہ وہ ہوتا ہے جو بجائے خود اہم ہو ' جو ہمارا ذریعہ نہ ہو مقصد ہو ' جو ہمارے گوشت پوست کا حصہ ہو اور جس کی ضرورت ہم خود اپنی روح میں محسوس کرتے ہوں لیکن اب ہمارے ہاں کسی ایسے رشتے کا ملنا شاید ڈھونڈنے سے بھی ممکن نہیں جو صحیح معنوں میں سچا اور زندہ رشتہ ہو ہاں جھوٹے ' مصنوعی اور بے جان رشتے البتہ موجود ہیں ایسے رشتوں کا ملنا شاید ڈھونڈنے سے بھی ممکن نہیں جو صحیح معنوں میں سچا اور زندہ رشتہ ہو۔ ہاں جھوٹے مصنوعی اور بے جان رشتے البتہ موجود ہیں ایسے رشتوں کی ایک مثال وہ تجریدیت ہے جو تصور پرستی سے جنم لیتی ہے۔ مثلاً انسان پرستی ایک تصور ہے ترقی پسندوں کی طرح اس تصور کو اپنا شعار بنانے والے لوگوں کے دل گوشت پوست کے زندہ آدمی کی محبت سے خالی ہو جاتے ہیں اس لئے کہ تصور ایک طرح کی کاملیت کا تقاضا کرتا ہے جبکہ وہ زندہ انسان کامل نہیں ناقص ہوتے ہیں اور پھر ان میں سو طرح کی کمزوریاں بھی ہوتی ہیں جو تصور پرستی کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ لہٰذا ہم زندہ انسان کو مجرد انسان کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اب یہ مجرد انسان ہمارے حواس پر اس حد تک طاری ہو جاتا ہے کہ ہم زندہ انسانوں کو دیکھنا ہی چھوڑ دیتے ہیں اور میاں بیوی تک ایک دوسرے کو مثالی روپ میں دیکھنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان کا رشتہ ایک دوسرے سے دو زندہ افراد کا رشتہ نہیں بلکہ ریاضی کی مساوات کی طرح ایکس اور وائی کا رشتہ بن کر رہ جاتا ہے مطلب یہ کہ دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھتا بلکہ دونوں ہی اپنے اپنے تصور کو دیکھتے ہیں یہ ایسے لوگوں کی تصور پرستی انہیں کہاں لے جا کر چھوڑتی ہے یہ دیکھنا ہو تو ہمارے موجودہ ادب اور بالخصوص تجریدی افسانے ہی کو دیکھ لیجئے آخر ہمارے افسانوں اور نظموں سے جیتے جاگتے کردار اور انسانوں کے جذبات و محسوسات یونہی تو غائب نہیں

ہو گئے۔ اس کی وجہ ہماری یہی تصور پرستی ہے ہمارے دل اب زندہ انسانوں کے درد سے نہیں دھڑکتے۔ ہم اب انہیں ٹھوس انسانوں کی بجائے ریاضی کی مساواتوں کی شکل میں دیکھتے ہیں اور ریاضی کے فارمولوں ہی کی طرح انہیں حل کرنا چاہتے ہیں۔

ایک اور مثال ہمارے نئے تعلق کی یہ ہے کہ اندر سے تو ہم ہر تعلق اور ہر رشتے کو توڑ چکے ہیں مگر خارج میں ایک دوسرے کی نقل کرتے رہتے ہیں۔ ہمارا ہمارے پڑوسی سے کوئی رشتہ نہیں ' لیکن جب ہمارا پڑوسی کار یا رنگین ٹی وی خریدتا ہے تو ہم بھی اس کی حرص میں ان چیزوں کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اندر تمام رشتے ٹوٹ چکے ہیں سوائے ایک رشتے کے اور یہ رشتہ اندھی مسابقت کا رشتہ ہے ہم دوسروں کے وجود کا صرف اتنا ہی احساس رکھتے ہیں جتنا جذبہ مسابقت ہمارے اندر پیدا کر دیتا ہے اندھی مسابقت کا یہ جذبہ ہمارے موجودہ معاشرے کی بنیاد ہے ہم اگر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ آج جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں وہ بالآخر ہمیں بے رشتگی کی کس منزل کی طرف لے جا رہا ہے۔

انسان اور انسان کے درمیان جتنے رشتے ہیں ان میں سب سے بنیادی اور اہم ترین رشتہ وہ ہے جو عورت اور مرد کے درمیان شادی کے ذریعے قائم ہوتا ہے عورت اور مرد کا یہ وہ اولین رشتہ ہے جو دوسرے تمام رشتوں پر مقدم ہے دوسرے رشتے یا تو اس رشتے کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں (مثلاً" اولاد اور والدین کا رشتہ ' بھائی اور بہن کا رشتہ) یا اس بنیادی رشتے کے تابع ہوتے ہیں۔ روایتی معاشرے میں یہ رشتہ طرفین کے درمیان باہمی محبت کی بجائے والدین کے انتخاب اور پسند کی بنا پر عورت کی طرف سے ایجاب اور مرد کی طرف سے قبولیت کی بنیاد پر قائم ہوتا تھا اور شادی کو لڑکے لڑکی کا انفرادی معاملہ سمجھنے کی بجائے خاندانی مسئلہ سمجھا جاتا تھا لیکن رشتوں کی شکست و ریخت کی آندھی جب پرانے معاشرے میں چلی تو سب سے پہلے اس کی لپیٹ میں جو چیز آئی وہ شادی کا یہی پرانا نظام تھا گویا " اسی پہ چوٹ پڑی جو شجر پرانا تھا" چنانچہ غالب کی معنوی اولاد نے فرزند آزر کی سنت پر عمل کرتے ہوئے شادی کے اس پرانے نظام کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت رومانی محبت کے نام پر کی گئی۔ اور مطالبہ اس کے پیچھے یہ تھا کہ اولاد کو خود اپنی پسند سے شادی کرنے کا حق دیا جائے۔ خواہ یہ حق خاندانی تصورات سے کتنی ہی متصادم کیوں نہ ہو۔ رومانی محبت دراصل فرد کی جنسی آزادی کی طرف پہلا قدم تھا۔ ہمارے ناول نویسوں' شاعروں اور ڈرامہ نگاروں نے نوجوانی کی جنسی کشش کو ایک مقدس شے بنا کر دکھانے میں اپنے قلم کا سارا آب و رنگ ختم کر دیا۔ اس محبت کو جس کی عمر بیشتر چند سال سے زیادہ نہیں ہوتی ' ایک ایسی قدر کے طور پر پیش کیا گیا جس کے لئے فرد' مذہب و اخلاق ' روایات و اقدار ' خاندان اور نسل' غرض ہر چیز سے بغاوت کر سکتا تھا' اس بغاوت کا نتیجہ ' جیسا کہ ہم جانتے ہیں اولاد کے حق میں نکلا اور شادی کا پرانا نظام اپنی جگہ چھوڑ بیٹھا۔ لیکن اس کی جگہ جو صورت حال نمودار ہوئی اس میں جیت محبت کی بجائے پیسے کی ہوئی۔ یعنی جنگ تو محبت کے اصول پر لڑی گئی تھی مگر فتح بالآخر زر کی ہوئی اور مزہ اس وقت آیا جب رومانوں کی محبوباؤں کو ڈاکٹر' انجینئر' فوجی افسر اور وہ لوگ لے اڑے جن کی معاشی حالت ہمارے رومانی ہیرو سے بہتر تھی۔ دوسرے لفظوں میں رومانی محبت کے ذریعے معاشرے میں جو تبدیلی آئی اس کا اصول مذہب' خاندان' ذات برادری یا چال چلن نہیں بلکہ پیسہ اور سماجی حیثیت تھا۔ چنانچہ ایک طرف تو ہم دیکھتے

اورنگ زیب قاسمی

ہیں کہ آگے چل کر بیویاں اپنے شوہروں کی سماجی حیثیت کا چلتا پھرتا اشتہار بن جاتی ہیں اور دوسری طرف رومانی ادب میں پیار کی ہار اور پیسے کی جیت کا رونا عام ہو جاتا ہے اور بالآخر ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب زر کی محبت پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے کر تمام انسانی رشتوں میں زہر گھول دیتی ہے۔

لیکن ابھی یہ منزل ذرا دور تھی ابھی تو ہمارے رومانی ہیرو کو اپنے زردار رقیبوں سے پیار کی شکست کا بدلہ لینا تھا اس مقصد کے حصول کے لئے انقلاب کا طریقہ سب سے بہتر سمجھا گیا۔ چنانچہ مجاز اپنی محبوبہ کو دعوت انقلاب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

پتہ نہیں مجاز کی محبوبہ نے اس پیغام کا کیا جواب دیا لیکن اس کے بعد معاشرے میں ایک انقلاب ضرور آیا' اس انقلاب میں آنچلوں سے پرچم بنے ہوں یا نہ بنے ہوں' لیکن ماتھوں سے آنچل ضرور غائب ہو گئے اور جب کسی معاشرے میں عورتوں کے ماتھوں سے آنچل غائب ہو جائیں تو ایک فہمیدہ ریاض ضرور پیدا ہوتی ہے جو چادر اور چار دیواری کے تصور کو مرد پرست سماج کا ڈھونگ قرار دے کر اس کا مذاق اڑاتی ہے چنانچہ ایک طرف تو فہمیدہ ریاض مرد کی بالادستی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی ہے اور دوسری طرف کشور ناہید اس بغاوت کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے شوہر پر اپنی بالادستی کا اعلان کر دیتی ہے مگر عورت اور مرد کے درمیان مساوات کا رشتہ پھر بھی قائم نہیں ہوتا۔ علامہ اقبال نے کہا تھا کہ:

نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

لیکن جدید عورت کو اپنی نسوانیت کی اتنی فکر نہیں جتنی اپنی آزادی کی چنانچہ اس آزادی کو حاصل کرنے کے لئے وہ اپنی نسوانیت تک کو قربان کر دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی مرد اور عورت کے رشتے کا وہ تقدس بھی ٹھکانے لگ جاتا ہے جو پوری انسانی تہذیب کا حاصل اور ہمارا سب سے قیمتی اور عزیز ترین سرمایہ تھا۔

مرد اور عورت کے درمیان شادی کی بنیاد پر قائم ہونے والا رشتہ کبھی ہمارا سب سے زیادہ گہرا' سب سے زیادہ پر اسرار اور سب سے زیادہ حقیقی رشتہ تھا لارنس کے بقول یہ مرد اور عورت کے لہو کا سنجوگ تھا۔ اس سنجوگ میں مرد اور عورت کے لہو کے جدا جدا بہنے والے دھارے ' ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوئے بغیر ایک اکائی کی صورت کائنات اور اس کے نظام سے ہم آہنگ ہوتے تھے لیکن عہد جدید میں اس حقیقی رشتہ کی جگہ غیر حقیقی رشتہ نے لے لی ہے۔ یہ غیر حقیقی رشتہ پورے وجود کی بجائے ذہن اور شخصیت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے جبلی ہم آہنگی کی بجائے ذہنی ہم آہنگی کو اپنی اساس بناتا ہے لیکن یہ دراصل "انا" کا کھیل ہے اور اس کھیل سے صرف ایک ہی چیز تقویت پاتی ہے انانیت۔ دیکھیے ہمارے فیض صاحب نے صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ:

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

مرد اور عورت کے رشتے کی طرح کائنات اور اشیائے کائنات سے بھی کبھی ہمارا رشتہ ایک زندہ رشتہ تھا لیکن افسوس کہ ہم نے مردوں اور عورتوں کو علیحدہ علیحدہ " شخصیتوں " میں اور اس جیتی جاگتی کائنات کو مادے اور توانائی میں تقسیم کر دیا۔ لہٰذا اب صرف انسانوں ہی سے نہیں بلکہ کائنات اور ماورائے کائنات اگر

کوئی حقیقت ہے تو اس سے بھی ہمارا فطری رشتہ ٹوٹ چکا ہے ہم اپنی داخلی زندگی کے سرچشموں سے جو کائنات میں ابدی طور پر جاری و ساری ہیں کٹ کر رہ گئے ہیں ہم سورج کے طلوع و غروب کو چاند کے گھٹنے بڑھنے کو ستاروں کے ڈوبنے ابھرنے کو اور موسموں کے آنے جانے کو اپنی محبتوں کے زیروبم میں اور زمین ' سورج اور چاند ستاروں کی گردش کو اپنے خون میں محسوس نہیں کرتے' اس لئے کہ ہم کائنات اور اس کے نظام سے ہم آہنگی کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔ کائنات جو کبھی ہمارے لئے زندہ تھی' اب مردہ ہو چکی ہے اب کوئی ستارہ سحری ہم سے ہمکلام نہیں ہوتا۔ سائنس کے بڑھتے ہوئے علم نے سورج کو گیس کی ایک دہکتا گیند اور چاند کو مٹی کا ایک ایسا بے جان ڈھیلا بنا کر رکھ دیا ہے جس پر چیچک کے داغوں کی مانند آتش فشانوں کے مردہ دہانے ہیں۔ اب نہ تو ہم فراق کی طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

تارے بھی ہیں بیدار زمیں جاگ رہی ہے
پچھلے کو بھی وہ آنکھ کہیں جاگ رہی ہے

اور نہ ہی میر کی طرح احساس کی اس نزاکت کو پا سکتے ہیں کہ:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

خدا کائنات اور انسان سب سے ہمارے رشتے فرسودہ اور بے جان ہو کر رہ گئے ہیں رشتوں کے زندہ احساس کے بغیر زندگی 'زندگی نہیں رہتی' موت بن جاتی ہے رشتہ نہ ہونے سے منفی رشتہ کا ہونا ہی اچھا ہے لگاؤ نہ ہو تو لاگ ہی سہی ' محبت نہ ہو تو عداوت ہی سہی 'مگر حیات بے تعلق کے کوئی معنی نہیں۔ یہ مردوں کی زندگی ہے ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ رشتوں کا احساس ہمارے ہاں مردہ یا نیم مردہ ہو چکا ہے۔ ہم ان کی زندگی کو اپنے خون میں محسوس نہیں کرتے۔ اس کے معنی سوائے اس کے اور کیا ہیں کہ ہم پوری طرح زندہ نہیں ۔ کوئی چیز ہے جو ہم میں گم ہو گئی ہے کوئی ایسی چیز جس کے بغیر زندگی' زندگی نہیں رہتی' موت کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

("اقدار" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

ڈاکٹر جمیل جالبی

میں کیا جواب دوں؟

یہ کچھ عرصے پہلے کی بات ہے۔ گرمیوں کے دن تھے اور رات کی رانی کی خوشبو سے اسلام آباد کے گلی کوچے مہکے ہوئے تھے کسی نے گھنٹی بجائی۔ میں نے دروازہ کھولا تو بھابی کھڑی تھیں۔ ان کا جوان بیٹا بھی ساتھ تھا۔ اندر آئیں اور بیٹھتے ہوئے کہنے لگیں "بھیا! آج آپ سے ایک مشورہ کے لئے آئی ہوں۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ اسی سال اس نے ایم اے کیا ہے۔ شعر کہتا ہے اور دن رات پڑھنے اور شعر کہنے میں لگا رہتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں صرف شاعری کے لئے زندہ رہنا اور زندگی میں صرف اور صرف یہی کام کرنا چاہتا ہوں۔ ہر وقت مجھ سے الجھتا ہے میں نے اسے بہت سمجھایا کہ شاعری ہی کا جنجال ہے عمر بھر کا دکھ ہے اور پھر بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں کامیابی ہو گی یا نہیں ۔ چلئے اگر یہ بڑا شاعر بن بھی گیا تو یہ بات میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ شاعری ذریعہ معاش نہیں بن سکتی۔ اس کے والد نامور وکیل ہیں' ان کے ساتھ کام کر سکتا ہے۔ ایم بی اے کر سکتا ہے سی ایس ایس کے امتحان میں قسمت آزمائی کر سکتا ہے۔ یونیورسٹی میں پڑھا سکتا ہے۔ ایم اے میں اس نے دوسری پوزیشن حاصل کی ہے۔ آخر شاعری کے ساتھ زندگی کیسے بسر ہو سکتی ہے ۔ پیٹ بھی تو انسان کے ساتھ لگا ہے ۔" بھابی اپنے اکلوتے جوان بیٹے کی طرف سے اس لئے پریشان تھیں کہ شاعری کے تعلق سے انہیں بیٹے کا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا زندگی بھر دکھ جھیلے۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ جز وقتی شاعر تو ہو سکتے ہیں۔ اسے مشغلے کے طور پر اپنا سکتے ہیں لیکن کل وقتی شاعر نہیں ہو سکتے۔ میں سنتا رہا۔ میرے پاس اس کا کوئی حل نہیں تھا۔ میں دل سے تو یہی چاہتا تھا کہ خواب دیکھنے والا یہ ہونہار نوجوان' جو شاعری کے لئے زندگی وقف کرنا چاہتا ہے' ایسا ضرور کرے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ صرف شاعری سے وہ پیٹ نہیں پال سکتا۔ اول تو ہمارے ہاں ابھی ریڈنگ کلچر ہی پیدا نہیں ہوا ہے پھر کتاب بکتی ہی کتنی ہے؟ مشاعروں میں گلوکاروں کی مانگ ہے نیشنل بک کونسل نے شاعری کو خرید کتب کے دائرے سے خارج کر دیا ہے ۔ اکثر ناشرین شاعری کے مجموعے چھاپنے سے گریز کرتے ہیں اور اگر چھاپتے بھی ہیں تو اخراجات خود شاعر سے لیتے ہیں۔ آج کا انسان شاعری سن تو لیتا ہے لیکن عام طور پر شاعری پڑھتا نہیں ہے پھر جس قسم کی تعلیم ہمارے ہاں آج کل دی جاری ہے اس میں طالب علم ' حصول تعلیم کے بعد ' خود اپنے معاشرے ' اپنے کلچر اور اپنی زمین ' اپنی روایت سے دور ہو کر اجنبی بن جاتا ہے اور " مغرب " کی طرف دیکھنے لگتا ہے ۔ اپنی تہذیب اس کی نظر سے گر جاتی ہے بھابی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون اور یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ کچھ دیر ہم تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا کہ اس مسئلے پر غور

کرکے میں کچھ دن بعد عرض کروں گا۔ جب بھائی چلی گئیں تو میں سوچنے لگا کہ عجیب معاشرہ ہے کہ انسان اپنی خواہش کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ شاعری کوئی معمولی کام تو نہیں ہے۔ زندگی کی انتہائی لطیف سرگرمی ہے۔ ایک شعر یا ایک نظم انسان کی کایا کلپ کر دیتے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ ۱۹۵۲ء میں حکومت پاکستان نے اچانک طلبہ کی فیسوں میں اضافہ کر دیا۔ اس پر طلبہ نے احتجاج کیا اور ایک بڑا سا جلوس لے کر وزیر تعلیم سے ملنے کے لئے چلے۔ وزیر تعلیم نے ملنے سے انکار کر دیا۔

اس انکار پر نوجوانوں کا یہ جلوس وزیر تعلیم کے دفتر کی طرف بڑھنے لگا اور جب قریب پہنچا تو پولیس نے پہلے آنسو گیس استعمال کی اور پھر گولی چلا دی۔ جس سے کئی طلبہ زخمی ہو گئے۔ اور ایک نوجوان اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس خبر سے سارے شہر میں تہلکہ مچ گیا۔ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم تھے۔ شام تک انہوں نے فیسوں میں اضافے کا حکم منسوخ کر دیا اور طلبہ کے وفد سے ملاقات کا وقت بھی دے دیا۔ میں جلوس میں شریک تھا اور اس واقعہ کے بعد ایک ایسے روحانی کرب میں مبتلا تھا کہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ اچانک غالب کا ایک شعر میرے ذہن کے نہاں خانے سے ابھرا اور زبان پر جاری ہو گیا:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

میں زور زور سے شعر پڑھتا جاتا تھا۔ رقت کی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ کرب کی شدت اس شعر کے ورد سے کم ہو رہی ہے اور میں اپنی اصل حالت میں واپس آرہا ہوں۔ اس دن پتا چلا کہ شعر انسانی زندگی کی باطنی حالت اور داخلی کیفیت میں کیا کام کرتا ہے مجھے یاد ہے کہ جب عراق میں انقلاب آیا اور بادشاہی ختم ہوئی تو باغیوں نے نوری السعید کی لاش کو جیپ سے باندھ کر بغداد کے گلی کوچوں میں گھسیٹا۔ ۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کے اس سانحے کی جب یہ خبر چھپی تو میری حالت دگرگوں ہو گئی اور شدید کرب کی کیفیت نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ میں اسی کیفیت میں تھا کہ غالب کے ایک شعر نے سر نکالا اور مجھ سے ہم کلام ہو گیا:

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادہ ہوائے سر رہ گزار تھا

صبح سے شام تک اس شعر کا ورد کرتا رہا اور میں نے محسوس کیا کہ شعر نے کرب کی اس کیفیت کو ہلکا کرکے میرے باطن کی درد مندی کا تزکیہ کر دیا ہے۔ انسانی زندگی میں شاعری اور صرف شاعری ہی یہ کام کرتی اور کر سکتی ہے شاعری ہمارے محسوسات اور جذبات کو زبان دیتی ہے وہ جو بے صورت تھے انہیں صورت دیتی ہے ہمارے باطن کے انتشار کو درست کرتی ہے ہمیں سمجھتی ہے' باخبر کرتی ہے' آسودہ کرتی ہے ہمارا تزکیہ کرتی ہے۔ اسی لئے شاعری' جب تک انسان زندہ ہے' باقی رہے گی۔

شاعری ایک عظیم تخلیقی کارنامہ ہے۔ ایک شعر یا اکثر ایک مصرع دل کی بات کو اس طرح بیان کر دیتا ہے کہ انسان کا باطن روشن اور اندوہ غم کا کرب ہلکا ہو جاتا ہے۔ تخلیقی سطح پر یہ سب سے مشکل کام ہے شاعر اسی لئے ایک گونہ اضطراب اور اضطراری کیفیت سے دوچار رہتا ہے۔ یہ تخلیقی عمل اسے دنیا کے کسی دوسرے کام کا نہیں رکھتا۔ وہ زندگی کو دیکھتا ہے' اپنی حساسیت سے اس کا مقابلہ کرتا ہے اور احساس کی لطیف اور

اورنگ زیب قاسمی

ناقابل بیان جہتوں کو لفظوں کی گرفت میں لانے کے عمل میں ایسی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے کہ ساری دنیا اسے تنگ معلوم ہوتی ہے اور وہ اجنبی بن کر رہ جاتا ہے اس سطح پر جنون اور پیمبری مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔

شاعری کے تخلیقی عمل پر غور کیجئے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شاعری میں بنیادی اہمیت خود شاعری کی "آواز" کی ہوتی ہے ایک ایسی آواز جو کسی مخصوص طبقے سے مخاطب نہیں ہے شاعری اسی لئے فکشن سے مختلف تخلیقی عمل ہے اس میں فکشن کی طرح کوئی کردار یا ناول نہیں ہوتا۔ شاعری کا اثر' شاعری کا لہجہ' شاعری کے معنی اور صوت کا امتزاج سب کچھ خود شاعری کی "آواز" کے اندر ہوتا ہے اور اس سے الگ وجود نہیں رکھتا۔ ناول میں اس دنیا کا بیان ہوتا ہے جس میں ہم رہتے ہیں اس میں جو لوگ چلتے پھرتے ہیں ان میں انسانی پہلو موجود ہوتا ہے اور ساری باتیں قابل یقین ہوتی ہیں۔ ہم فکشن کو اس لئے دلچسپی سے پڑھتے ہیں کہ اس میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس سے براہ راست یا بالواسطہ ہم واقف ہوتے ہیں لیکن ایک شعر یا ایک نظم میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ نہ تو "معلوم" کے ذیل میں آتا ہے اور نہ "نامعلوم" کے ذیل میں آتا ہے وہ ماحول یا وہ تجربہ جس نے شعر یا نظم کو جنم دیا ہے عام طور پر خود پس منظر میں چلا جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظم یا شعر خود اس دنیا کی جگہ لے رہے ہیں اور اس لئے لے رہے ہیں کہ خود کو سامنے لانے' نمایاں کرنے اور اپنی حیثیت منوانے کا اس کے پاس صرف یہی طریقہ ہے۔ شعر یا نظم میں جو چیز معلوم ہے وہ صرف اور صرف اس کی زبان ہے .... وہ الفاظ جو شاعری میں ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ ان الفاظ کو آپ شعر میں دیکھیے تو یہ بھی مختلف سے نظر آتے ہیں حتیٰ کہ عام الفاظ بھی ذرا کچھ الگ سے لگتے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زبان بدل سی گئی ہے یا بدل سی رہی ہے غور سے دیکھیے تو ایک شعر یا ایک نظم میں ہر لفظ یکساں اہمیت کا حامل ہوتا ہے لفظوں کی یہ اہمیت اس طرح اور اس طور پر فکشن میں نہیں ہوتی۔ فکشن میں ہماری توجہ الفاظ پر مرکوز نہیں ہوتی لیکن شاعری میں الفاظ ہی "عمل" کا درجہ رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ شاعری میں ایک شعر یا نظم کو جنم دیا ہے عام طور پر خود پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظم یا شعر خود اس دنیا کی جگہ لے رہے ہیں اور اس لئے لے رہے ہیں کہ خود کو سامنے لانے' نمایاں کرنے اور اپنی حیثیت منوانے کا اس کے پاس صرف یہی طریقہ ہے۔ شعر یا نظم میں جو چیز معلوم ہے وہ صرف اور صرف اس کی زبان ہے .... وہ الفاظ جو شاعری میں ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ ان الفاظ کو آپ شعر میں دیکھیے تو یہ بھی مختلف سے نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ عام الفاظ بھی ذرا کچھ الگ سے لگتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زبان بدل سی گئی ہے یا بدل سی رہی ہے غور سے دیکھیے تو ایک شعر یا ایک نظم میں ہر لفظ یکساں اہمیت کا حامل ہوتا ہے لفظوں کی یہ اہمیت اس طرح اور اس طور پر فکشن میں نہیں ہوتی۔ فکشن میں ہماری توجہ الفاظ پر مرکوز نہیں ہوتی لیکن شاعری میں الفاظ ہی "عمل" کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری میں ایک شعر یا صرف ایک مصرع اثر انداز ہو کر اپنا لوہا منوالیتا ہے اور ہمارے دل میں اتر جاتا ہے اتنے کم لفظوں میں ایسا گہرا فنی اثر ... یہی شعر کا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے ناول کے ایک یا دو جملے پڑھ کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ناول اہم ہے یا نہیں۔ عام طور پر دس بیس صفحے پڑھنے کے بعد ہماری توجہ ناول پر مبذول ہوتی ہے بلکہ صحیح معنی میں اس وقت مبذول ہوتی ہے جب اس کی زبان واقعات میں گم ہو

جاتی ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ غزل پڑھتے ہوئے ہم اس وقت زیادہ اطمینان محسوس کرتے ہیں جب غزل کی زبان ہماری توجہ واقعات سے نہ ہٹائے۔ نظم میں صورت حال اس سے مختلف ہوتی ہے یہاں توجہ لفظوں پر رہتی ہے جن سے شاعر اپنی "آواز" کو ظاہر کر رہا ہے۔ غزل کے برخلاف نظم یا شعر میں ایک "دھیما پن" آہستہ روی ہوتی ہے ہر لفظ اپنا رنگ' اپنا ذائقہ' اپنی خوشبو' اپنا لطف ساتھ لے کر شاعر کی "آواز" کو ابھار کرتا ہے۔ اسی لئے شاعری میں زبان کی قوت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

عہد حاضر کے حوالے سے شاعری کے سلسلے میں ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے۔ جدید تہذیب تیز رفتاری کی تہذیب ہے۔ ہزاروں میل کے فاصلے گھنٹوں میں طے ہو رہے ہیں۔ قدم قدم پر تیز رفتاری سے واسطہ پڑتا ہے۔ تیز رفتاری سے کتاب پڑھنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ چلتے کھانوں (فاسٹ فوڈ) کا عام رواج ہوگیا ہے ۔ٹیلی وژن پر دس سیکنڈ کی خبریں پیش کی جاتی ہیں۔اسی طرح کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کے نئے نئے طریقے تلاش کئے جارہے ہیں۔اس صورت حال میں اب آپ خود فیصلہ کیجئے کہ یہ تہذیب ایسی صنف ادب یا ہیئت کو' جسے ہم شاعری کہتے ہیں' کیسے پسند یا قبول کر سکتی ہے جو اسے "تیز رفتاری" کے بجائے "آہستہ روی" کی طرف لے جاتی ہو یا جو اس کی رفتار میں دھیما پن پیدا کرتی ہو۔ جدید زندگی کی سرعت نے اسی لئے ٹھہراؤ کے عمل کو کمزور یا ختم کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ ایک قابل توجہ بات اور بھی ہے۔ سائنس دن رات اس بات پر لگی ہوئی ہے کہ وہ کائنات کے سربستہ رازوں کو معلوم کرکے اس کے اسرار کو دور کرے جب کہ شاعری اس "اسرار" کو باقی رکھتی ہے۔ وہ یقین کو ابہام کی صورت عطا کرتی ہے۔ شاعری اسی لئے آج کے قاری کے لئے مشکل اور غیردلچسپ شے بنتی جارہی ہے۔ شاعری میں ایک معنی کے بجائے مختلف معانی و مفاہیم پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شعر یا نظم میں ماورائے معنی کسی اور چیز کو سامنے لارہے ہوں۔ ایک ایسی چیز جسے شاعر نے تو جنم نہیں دیا لیکن جو زبان کی دھندلی دھندلی روشنی میں' اپنے وجود میں آنے کے عمل سے پہلے کسی لمحے میں از خود پیدا ہو گئی ہے۔ اسی لئے جب آپ شاعری پڑھتے ہیں تو نامعلوم کی تلاش کا کام انجام دیتے ہیں..... کسی ایسی شے کی تلاش جو تجربے کے بطن میں تو موجود ہے لیکن جسے واضح طور پر بتایا یا بیان نہیں کیاجاسکتا۔ شاعری میں علم یا معلومات کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہ پراسرار اور پرابہام ہوتی ہے اور جب قاری اسے پڑھتا ہے تو وہ اسے مسحور کرتی ہے اور جب قاری کسی نظم یا شعر کے نامعلوم کو تلاش کرنے کے لئے متن کو تلاش اور اس کی تعبیر کرتا ہے تو اس طرح وہ اس کے خدوخال اور اس کے کچھ حصوں کو بیان تو کر دیتا ہے لیکن اس کی یہ تلاش خود اس نظم یا شعر کی جگہ نہیں لے سکتی۔

جدید تہذیب' جیسا کہ جرمن فلسفی ہیڈیگر نے ایک جگہ لکھا ہے' فکری سطح پر ریاضیاتی (Mathematical) ہے' استغراقی (Meditative) نہیں ہے' اسی لئے وہ خشک ہے' تکراری ہے سطحی ہے تیز رفتار اور بے لوچ ہے۔ اگر آپ کی فکر کا انگر آپ کی زمین میں نہیں ہے تو شاعری وجود میں نہیں آسکتی۔ شاعری کا انگر تو اس کے اپنے کلچر اور اس کی اپنی روایت میں ہوتا ہے اور اسی لئے شاعری میں روایت اور ماضی کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ ہر نظم روایت کو بدلتی بھی ہے اور جدید زندگی کی حیثیت کے اظہار کے لئے اس سے انحراف بھی کرتی ہے اس کا اس لمحہ سے بھی رشتہ قائم رہتا ہے جس میں

اورنگ زیب قاسمی

وہ تخلیق کی گئی ہے اور ساتھ ساتھ اس روایت سے بھی جو اس کی پشت پر موجود ہے۔ وہ پرانی علامات' رمزیات وکنایات کو استعمال کرتی ہے' "کبھی ذرا سا بدل کر اور کبھی اشارتاً" ۔ اس طرح شاعری اپنی روایت کو عہد حاضر میں لاکھڑا کرتی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ شاعری اپنی روایت کو کبھی ترک نہیں کرتی بلکہ ہمیشہ اس کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ اسی لئے شاعری آفاقی ہوتے ہوئے بھی قومی ہوتی ہے اور قومی ہوتے ہوئے بھی آفاقی ہوتی ہے۔ جیسے زبان کلچر کے وجود کی توسیع ہے اسی طرح شاعری زبان کے وجود کی توسیع ہے۔ شاعری کے بغیر ہم بے زبان اور گونگے ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی قوم میں اچھی شاعری تخلیق نہیں ہو رہی ہے یا کم ہو رہی ہے تو یہ بات بذات خود بڑے خطرے کی علامت ہے۔

یہ سطور لکھ کر میں سوچ رہا ہوں کہ اب میں اس نوجوان کو کیا مشورہ دوں جو اپنی زندگی شاعری کے لئے وقف کرنا چاہتا ہے اور بھائی سے کیا کہوں جو اپنے نوجوان بیٹے کے مستقبل کی طرف سے پریشان ہیں۔

("دستاویز" لاہور)

(مرتب کا نوٹ : یہ مقالہ "شاعری کا مستقبل" کے عنوان سے "مستقبل" (اسلام آباد) میں بھی طبع ہوا)

اردو گنتی ۔ ایک نیا آہنگ

دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان میں بھی ہندسوں اور الفاظ دونوں صورتوں میں گنتی موجود ہے ہندسوں کی تعداد Decimal سسٹم کے تحت صفر سے نو تک یعنی دس اعداد ہے۔ اگر عربی ' انگریزی اور اردو کے مستعمل ہندسوں پر ایک نظر ڈالیں تو چند مماثلتیں از خود سامنے آجاتی ہیں:

اردو	۰	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹
عربی	٠	١	٢	٣	٤	٥	٦	٧	٨	٩
انگریزی	0	1	2	3	4	5	6	7	8	9

مثلاً " صفر کو اردو اور عربی میں ایک بڑے نقطے سے ظاہر کیا جاتا ہے جو کہ انگریزی صفر ہی کی ایک مختصر شکل کہی جاسکتی ہے۔ دور حاضر کے اعشاری نظام کے تحت جب اردو میں اعشاریہ لگانے کی ضرورت پیش آئی تو اردو / عربی والے صفر نے ذرا پھیل کر اپنا حجم بڑھالیا ورنہ اعشاریہ اور صفر کی پہچان مشکل ہو جاتی۔ مندرجہ بالا تینوں زبانوں میں اکائی کی شکل ایک ہی ہے یعنی ا۔ یہ الگ بات ہے کہ ا۔ کو خوبصورت بنانے کے لئے اسے 1 کر لیا جائے۔ دوسرے اور تیسرے ہندسے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ انگریزی ہندسے 2 کی کش کو ذرا طول دے کر یعنی 2 بنا کر اسے نوے درجے کے زاویے پر دائیں جانب گھما دیا جائے تو اردو یا عربی کا دوسرا ہندسہ ۲ بن جائے گا اسی طرح ۳ کے نیچے کش لگا کر یعنی ۳ کو دائیں طرف نوے درجے کے زاویے پر دائیں جانب گھما دیا جائے تو اردو یا عربی کا دوسرا ہندسہ 3 بن جائے گا۔ اردو کے چوتھے ہندسے کے لئے ۴ کے دندانے کو ذرا بڑھائیں یعنی ۴ کر کے ایک سواسی درجے پر گھمائیں یعنی الٹائیں تو ۴ بن جاتا ہے ۔ عربی میں چوتھے ہندسے کے لئے جو شکل استعمال ہوتی ہے اسے نوے درجے پر گھمائیں تو انگریزی حرف w بن جاتا ہے یہی شکل یعنی یونانی حرف گنتی میں سگما کہلاتی ہے اور ریاضی میں بھی استعمال ہوتی ہے اردو اور عربی کا پانچواں ہندسہ تقریباً" ایک جیسا ہے جو پان کے پتے کی شکل رکھتا ہے اس طرح چھٹا ہندسہ دوسرے ہندسے کا عکس ہے یعنی ۲ کو اگر آئینے میں دیکھیں تو ۶ نظر آئے گا۔ انگریزی کا 9 بھی 6 کو ایک سواسی درجے پر گھمانے سے وجود میں آیا۔ ساتواں ہندسہ عربی میں ٧ کی شکل رکھتا ہے جو ایک انگریزی حرف گنتی بھی ہے یہی شکل رومن گنتی میں پانچ کے مترادف ہے۔ عربی سات (٧) کو دائیں جانب اسی درجے پر گھمائیں تو اردو سات (۷) اور بائیں جانب اسی درجے پر گھمائیں تو انگریزی سات (7) کی شکل بن جاتی ہے اردو سات ریاضی میں

اورنگ زیب قاسمی

Less Than اور انگریزی سات ریاضی میں Greater Than کی علامتیں بھی ہیں۔ عربی سات کو الٹ دیں تو عربی اور اردو کا آٹھواں ہندسہ یعنی ۸ کی شکل بن جاتی ہے البتہ نویں ہندسے کی شکل حذف کر کے بالا تینوں زبانوں میں ایک ہی ہے جو دائرے اور ایک خط مستقیم سے مل کر بنتا ہے۔

یہ چند مثالیں تینوں زبانوں میں گنتی کی ان مماثلتوں کو واضح کرتی ہیں لیکن کسی بھی ایک زبان کی گنتی میں کوئی اشکالی ربط موجود نہیں ہے جس کے فقدان کے باعث ایک زبان کی گنتی اپنے اندر کی چند مماثلتوں اور کسی دوسری زبان کی گنتی سے مشابہتوں کے باوجود کسی ضابطے کی پابند نظر نہیں آتی۔ حالانکہ ایک ذرا سی محنت سے کم از کم اردو ہندسے ایک ضابطے کے پابند ہو سکتے ہیں ۔ مثلاً"

مستعمل ہندسے: ۰ ۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹

مجوزہ ہندسے:

اس مثال میں پانچ اور چھ' چار اور سات' تین اور آٹھ اور دو اور نو کے جوڑے بنا کر ان کی اشکال کو الٹ دیا گیا ہے اسی طرح ہندسوں کی ایک ترتیب بھی تخلیق کی جاسکتی ہے جس کے بنیادی ارکان نصف دائرہ اور خط مستقیم ہوں۔

اس ترتیب کو ہم شکل ۲ کی ترتیب بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ تمام ہندسے اسی شکل کی مختلف حالتیں ہیں۔
تیسری ترتیب میں شکل ۲ کی بجائے انگریزی ہندسہ 6 کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے جس کی صراحت اس طرح کی جاسکتی ہے جو اوپر کی مثال میں موجود ہے یعنی

ایک اور ترتیب درج ذیل ہے جو پہلے دی گئی تین مثالوں کی موجودگی میں از خود سمجھ میں آجاتی ہے۔

ان گزارشات کا مقصد یہ کہنا ہے کہ مروجہ ہندسوں کو ایک مدت سے دیکھتے اور لکھتے چلے آئے ہیں لہٰذا یہ ہمارے بصری شعور کا ایک حصہ بن گئے ہیں لیکن ان ہندسوں کی شکلوں میں کوئی باقاعدہ ربط موجود نہیں اور اگر یہ باقاعدہ ربط پیدا کر لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں جیسے انگریزی گنتی میں ایک کو ا لکھیں یا 1 یا کسی اور خوبصورتی کے ساتھ مگر جب ڈیجیٹیل انداز میں دیکھیں گے تو تمام ہندسوں میں ایک مماثلت نظر آئے گی۔

0 1 2 3 4 5 6 7 8 9

یعنی ہر ہندسہ 8 کی شکل میں مختلف تراشم سے پیدا ہوتا ہوا دکھائی دے گا گویا اس ترتیب کی شکل لگتا ہے اب تک کی بحث کو سمیٹتے ہوئے اگر کچھ مروجہ اور کچھ مجوزہ ہندسوں کا ایک خاکہ مرتب کیا جائے گا تو وہ کچھ

یوں بنے گا:

	۹	۸	۷	۶	۵	۴	۳	۲	۱	۰
عربی	٩	٨	٧	٦	٥	٤	٣	٢	١	٠
اردو	۹	۸	۷	۶	۵	۴	۳	۲	۱	۰
انگریزی	9	8	7	6	5	4	3	2	1	0
ڈیجٹیل	9	8	7	6	5	4	3	2	1	0
رومن	IX	VIII	VII	VI	V	IV	III	II	I	
مجوزہ اردو ۱	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
مجوزہ اردو ۲	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
مجوزہ اردو ۳	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
مجوزہ اردو ۴	[illegible]	۸	۷	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	۱	۰

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہندسوں میں ہم نے ایک Uniformity کو اپنا رکھا ہے یعنی دس کے لئے ۱۰، گیارہ کے لئے ۱۱، بارہ کے لئے ۱۲ وغیرہ یعنی ہندسوں کے Combination سے جیسے کہ وہ ہیں' گنتی کو آگے بڑھاتے چلے گئے ہیں اور بنیادی دھائی یعنی صفر سے نو کے بعد کے اعداد کے لئے ۱ کو پہلی دھائی کا اشارہ فرض کرکے آگے چلتے ہیں جیسے ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹ یعنی دوسری دھائی کی Position پر ۱ رکھ کر اس کے دائیں جانب پھر صفر سے نو تک کے ہندسوں کو دہراتے ہیں اور یہی اصول ہر اگلی دھائی کے لئے بھی استعمال ہے لیکن جب انہیں ہندسوں کی ترتیب کو ہم الفاظ کا روپ دیتے ہیں تو کسی اصول کا خیال نہیں رکھتے (ویسے بھی اردو گنتی کے سارے الفاظ ہندی کے ہیں ماسوائے ایک اور دو کے جو علی الترتیب اردو اور فارسی کے ہیں)

اب ایک نظر اعداد کے صوتی آہنگ پر ڈالیں:

عدد	ہندی	فارسی	اردو	پنجابی	انگریزی
۱	اک	یک	ایک	اک	One
۲	دو	دو	دو	دو	Two
۳	تین	سہ	تین	تن	Three
۴	چار	چہار	چار	چار	Four
۵	پانچ	پنج	پانچ	پنج	Five
۶	چھ	شش	چھ	چھے	Six
۷	سات	ہفت	سات	ست	Seven
۸	آٹھ	ہشت	آٹھ	اٹھ	Eight
۹	نہ	نُہ	نو	نوں	Nine

اورنگ زیب قاسمی

عدد	ہندی	فارسی	اردو	پنجابی	انگریزی
۱۰	دس	دہ	دس	دس	Ten
۱۱	گیارہ	یازدہ	گیارہ	یاراں	Eleven
۱۲	بارہ	یازدہ	بارہ	باراں	Twelve
۱۳	تیرہ	سیزدہ	تیرہ	تیراں	Thirteen
۱۴	چودہ	چہاردہ	چودہ	چوداں	Fourteen
۱۵	پندرہ	پانزدہ	پندرہ	پندراں	Fifteen
۱۶	سولہ	شانزدہ	سولہ	سولاں	Sixteen

چونکہ Decimal سسٹم میں اعداد کی تعداد دس مانی گئی ہے لہٰذا ہر بنیادی شکل کے ساتھ اس کا صوتی آہنگ بھی مختلف ہونے کا متقاضی ہے۔ جیسا کہ اوپر دیئے گئے موازنے سے ظاہر ہے لیکن بنیادی' اعداد' کے بعد آنے والے مرکب اعداد کے لئے کوئی اصول وضع نہیں کیا گیا جیسا کہ بنیادی یا مفرد اعداد کو ایک خاص طرز پر Formulate کیا گیا ہے مثلاً" ۱۱ کو ایک ایک یا ایکدس ۳۰ کو ددوس وغیرہ نہیں کیا گیا لیکن کہیں کہیں ایک اصول عمل پیرا بھی نظر آتا ہے جیسے اکیس' اکتیس' اور اکتالیس وغیرہ میں " اک " مشترک ہے جو گیارہ میں نہیں تو کیوں نہ گیارہ کو اکیارہ کہہ لیا جائے تاکہ یہ لفظ بھی اس صوتی آہنگ کا حصہ نظر آنے لگے جو اس کے باقی الفاظ میں ہے لیکن بارہ کے بعد تیرہ کا لفظ " آرہ " کے اس صوتی آہنگ سے محروم ہے جو Status گیارہ' بارہ اور اٹھارہ میں پایا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا پہلے ہمیں بنیادی دس اعداد کا تلفظ یا آہنگ متعین کرنا چاہیے تاکہ پھر انہی کی بنیاد پر باقی اعداد کو ایک منضبط مجموعی آہنگ کی لڑی میں پرویا جاسکے جیسے:

اکیس' اکتیس' اکتالیس' اکیاون	وغیرہ سے لفظ	اک	بنیاد بنتا ہے تاکہ	ایک
بارہ' بائیس' باون' باسٹھ	وغیرہ سے لفظ	با	بنیاد بنتا ہے تاکہ	دو
تیرہ' تیئس' تینتیس' تینتالیس	وغیرہ سے لفظ	تے	بنیاد بنتا ہے تاکہ	تین
چودہ' چوبیس' چونتیس' چوالیس	وغیرہ سے لفظ	چو	بنیاد بنتا ہے تاکہ	چار
پچیس' پچپن' پچھتر' پچاس	وغیرہ سے لفظ	پچ	بنیاد بنتا ہے تاکہ	پانچ
چھبیس' چھتیس' چھیالیس' چھپن	وغیرہ سے لفظ	چھ	بنیاد بنتا ہے تاکہ	چھ
سترہ' ستائیس' ستاون' ستر	وغیرہ سے لفظ	ست	بنیاد بنتا ہے تاکہ	سات
اٹھارہ' اٹھائیس' اٹھاون' اٹھہتر	وغیرہ سے لفظ	اٹھ	بنیاد بنتا ہے تاکہ	آٹھ
انیس' انتیس' انتالیس' انچاس	وغیرہ سے لفظ	ان	بنیاد بنتا ہے تاکہ	نو

اس حساب سے ہمارے بنیادی صوتی آہنگ درج ذیل ہوئے۔

اک' با' تے' چو' پچ' چھ' ست' اٹھ' ان

اسی طرح

گیارہ' بارہ' اٹھارہ	وغیرہ میں آواز	آرہ	مشترک ہے
اکیس' بائیس' تیس'	وغیرہ میں آواز	ائیس	مشترک ہے

اکتیس' بتیس' تینتیس وغیرہ میں آواز تیس مشترک ہے
اکتالیس' بیتالیس' سیتالیس، وغیرہ میں آواز تالیس مشترک ہے
اکیاون' باون' ستاون وغیرہ میں آواز آون مشترک ہے
اکسٹھ' باسٹھ' تریسٹھ وغیرہ میں آواز سٹھ مشترک ہے
اکہتر' بہتر' تہتر وغیرہ میں آواز ہتر مشترک ہے
اکیاسی' بیاسی' تراسی وغیرہ میں آواز آسی مشترک ہے
اکیانوے' بانوے' ترانوے وغیرہ میں آواز آنوے مشترک ہے

اس حساب سے دھائیوں کی ہجّی میں آنے والے آہنگ درج ذیل ہوئے۔

آرہ' الیس' تیس' تالیس' آون' سٹھ' ہتر' آسی' آنوے

مندرجہ بالا Logic کا اطلاق اگر ایک سے سو تک کی گنتی پر کریں تو اردو گنتی کا ایک نیا آہنگ وجود میں آئے گا جو درج ذیل ہوگا

	انارہ	انیس	انتیس	انتالیس	انلون	انسٹھ	انہتر	اناسی	انانوے
	آرہ	الیس	تیس	تالیس	آون	سٹھ	ہتر	آسی	آنوے سو
اک	اکارہ	اکیس	اکتیس	اکتالیس	اکاون	اکسٹھ	اکہتر	باہتر	اکانوے
بارہ	بارہ	بائیس	باتیس	باتالیس	باون	باسٹھ	باہتر	باسی	بانوے
ترے	تیارہ	تیئس	تینتیس	تینتالیس	تیاون	تیسٹھ	تیہتر	تیاسی	تیانوے
چو	چوارہ	چوبیس	چوتیس	چوتالیس	چواون	چوسٹھ	چوہتر	چواسی	چوانوے
پچ	پچارہ	پچیس	پچتیس	پچالیس	پچاون	پچسٹھ	پچہتر	پچاسی	پچانوے
چھ	چھارہ	چھبیس	چھتیس	چھتالیس	چھاون	چھسٹھ	چھہتر	چھاسی	چھانوے
ست	ستارہ	ستیس	سینتیس	سیتالیس	ستاون	سسٹھ	ستہتر	ستاسی	ستانوے
اٹھ	اٹھارہ	اٹھیس	اٹھتیس	اٹھتالیس	اٹھاون	اٹھسٹھ	اٹھہتر	اٹھاسی	اٹھانوے

مندرجہ بالا معروضات کی روشنی میں اردو گنتی کا ایک منضبط عددی اور لفظی آہنگ بنتا ہوا دکھائی دے رہا ہے جو اہل علم و نظر کی قبولیت کا منتظر ہے۔

("صریر" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

ڈاکٹر وحید قریشی

اکیسویں صدی کی تیاری

(مشکلات و مسائل)

آج دنیا بیسویں صدی کے دہانے پر کھڑی اکیسویں صدی کا انتظار کر رہی ہے۔ بیسویں صدی نے نئے نئے سیاسی اور سماجی اداروں اور نئے نئے اقتصادی عوامل کو پھلتے بڑھتے اور ترقی کرتے دیکھا۔ سائنسی پیش رفت نے دنیا کی طنابیں کھینچ کر مختلف ممالک میں عمل اور ردعمل کی نئی نئی صورتیں نکالیں۔ ذرائع ابلاغ کی توسیع نے دنیا کو باخبری کا ایک نیا شعور دیا اور فکرواحساس کے نئے نئے زاویوں نے جنم لیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا دراصل دو بڑی طاقتوں کے رحم و کرم پر تھی پھر صورت حال بدل گئی۔ اس صدی کے آخری ایام نے ایک بڑی طاقت کو اپنے پورے نصب العینی ڈھانچے کے ساتھ اقتصادی عوامل کے ہاتھوں خود ہی بکھرتے دیکھ لیا۔ دوسری بڑی طاقت بھی اقتصادی طور پر اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے لیکن اس نے اپنے بچاؤ کے لئے ایشیا میں توسیع پسندی کا نیا انداز نکالا اور اس غلبے کی مدد سے کچھ عرصے کے لئے بینکوں کے نظام کو شکست و ریخت سے بچا لیا ہے۔ مغرب اپنی کامیابیوں کے گراف کو اوپر جاتے دیکھ کر اپنی برتری منوانے کے لئے فوج کشی' اقتصادی ناکہ بندی' ثقافتی اثر پذیری اور سیاسی دباؤ کے حربے آزمانے میں مصروف ہے' اس سے مشرق میں ایک نئی صورت حال کی نشان دہی ہوتی ہے اور مشرقی ممالک کو ایک بار پھر اپنی اپنی آزادی کا امتحان درپیش ہے۔ "نیو ورلڈ آرڈر" امریکی یلغار کو مربوط طور پر بروئے کار لانے کا ایک حربہ ہے جسے ذرائع ابلاغ کا غیر معمولی تعاون حاصل ہے۔

وسیع تر تناظر سے پیچھے ہٹ کر روس کی طاقت ضعیف ہو گئی اور دنیا میں اقتدار کی ایک نئی کش مکش سامنے آئی۔ پاکستان اس کی زد میں ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد بھارت سے روس کی دوستی ایک موثر کردار رہا ہے یہ صورت حال کشمیر اور افغانستان کے بارے میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کے لئے کھلا چیلنج تھی۔ روس ایک عالمی قوت نہ سہی' اس کی جغرافیائی موجودگی اپنی سابقہ عظمت کو کاندھوں پر اٹھائے' پاکستان جیسی چھوٹی ریاستوں کے لئے آج بھی آزمائش سے کم نہیں۔ روس کو بہت بڑا امتحان درپیش ہے لیکن ابھی اس میں اتنی طاقت ہے جو ہمارے حوصلوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ روسی پسپائی نے روس کے اندر مرکز گریز طاقتوں کو تقویت دی اور وہ داخلی طور پر مصروف پیکار ہیں۔ ایسے میں پاکستان کے لئے موقع ہے کہ وہ اپنی خارجہ پالیسی دوبارہ ترتیب دے اور اقتصادی توانائی کے لئے روس کی مشرقی ریاستوں سے نتیجہ خیز تعلقات قائم کرے۔ روس ابھی ایسی حالت میں نہیں کہ ہمیں کوئی بڑا چیلنج دے

سکے۔ ایک دو سال کی مختصر مدت میں ہم اگر اپنی خارجہ پالیسی کو صحیح سمت دینے میں کامیاب ہوئے تو اس سے پاکستان کے استحکام میں موثر اضافہ ممکن ہے اب ہمارے لئے خوف کی سیاست کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کن مرحلہ بھی آپکا ہے۔ ضروری ہے کہ ہم اپنی خارجہ پالیسی کو ڈر اور خوف سے نجات دلا کر اسے صحت مند بنیادوں پر متشکل کریں۔ اس کے لئے غیر معمولی جرات رندانہ کی ضرورت ہوگی کیونکہ دفتر خارجہ کے اہل کار اس نئی پالیسی میں رکاوٹ ثابت ہوں گے اور پرانی روش کو خیرباد کہنے پر مشکل ہی سے آمادہ ہوں گے۔

امریکی بنکاری کا نظام آجکل بہت دباؤ میں ہے اور اسے اپنی اصلی حالت پر آنے میں طویل مدت درکار ہے ایسے میں ایشیا میں آزاد اقتصادی پالیسی اور غیر ملکی قرضے کی بجائے آزاد معیشت کا امکان بڑھ گیا ہے جس سے پسماندہ ممالک فائدہ اٹھاسکتے ہیں اور اپنے آپ کو قرضوں کے چنگل سے بچاسکتے ہیں۔

بھارت کی اقتصادی حالت پاکستان کے مقابلے میں زیادہ مستحکم نہیں۔ وہ داخلی طور پر انتشار کی تحریکوں کی زد میں ہے اسی لئے پاکستان سے اس کی سردجنگ شدت اختیار کر گئی ہے۔ کشمیر کے بارے میں روسی حکومت کا حالیہ بیان اسی امکان کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بھارت اگر کشمیر پر آنکھیں لگائے بیٹھا ہے تو شمالی علاقہ جات روس کی چشم گرسنہ سے زیادہ دور بھی نہیں لیکن فی الحال اس پیش قدمی کا امکان نہیں۔ افغانستان کی پھانس جب تک روس کے گلے میں ہے پاکستان کو امریکہ اور روس زیادہ پریشان کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔ آئندہ افغانستان کے بارے میں پاکستان کا موقف کیا ہوتا ہے اور وہ موجودہ پیچیدہ صورت حال کو کس حد تک طول دے سکتا ہے اسی پر ہماری سلامتی کا انحصار بھی ہے۔

داخلی طور پر پاکستان اکیسویں صدی کے چیلنج کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے یا نہیں ؟ اس کا جواب تجارت کے فروغ سے ممکن ہے اور تجارت کا فروغ جبھی ہو سکتا ہے کہ ملک کے اندر حالات معمول پر رہیں جب تک حالات کو روبہ سکون لانے کی کوششیں نہیں کی جاتیں داخلی استحکام ممکن نہیں۔ کیا ملک گیر پیمانے پر ہم اس ضرورت کا احساس دلانے میں کامیاب ہیں ؟ اس کا جواب فی الحال نفی میں ہے تعلیمی پستی بھی اس خرابی میں اضافے کا باعث ہے۔ روز بروز ہم تعلیمی لحاظ سے پست تر ہوتے جارہے ہیں ہم تعلیم میں ابھی تک اپنی ترجیحات بھی مرتب نہیں کر سکے۔ درمیانی طبقہ معاشرتی زندگی سے منہا ہو چکاہے۔ سارا نظام حکومت اور ساری معیشت سرمایہ دار طبقے کے ہاتھوں میں جا چکی ہے۔ نظام تعلیم بھی طبقاتی بنیادوں پر چل رہا ہے اور پورا نظام تعلیم اعلیٰ طبقوں کے مفادات کو تحفظ دے رہا ہے۔ ذریعہ تعلیم کا مسئلہ بھی سالہا سال سے حل طلب چلا آرہا ہے ملکی وسائل کا خیال کئے بغیر ہم تعلیمی معاملات میں مغرب کا ہاتھ تھامتے ہیں سماجی سطح پر انگریزی داں طبقہ مذہب سے بے گانہ ہے یہ دوئی نفاذ اسلام کے راستے میں حائل ہے اس دوئی کی وجہ سے ہمارا سارا نظام اخلاق بھی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہے پورا ملک اخلاقی بحران کا شکار ہے۔ منافقت ہماری پہچان بنتی جارہی ہے ہم جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں اور جو کرتے ہیں اس کے نقصانات کو نہیں کرتے۔ اہل سیاست یا اہل علم اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہیں ۔ ایسے میں ہر حل ہمارے ہاں اڈیہاک ہے ہم وقتی فیصلوں اور وقتی مصلحتوں کے بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں۔ دور اندیش مستحکم خارجہ پالیسی ' دوربین داخلہ پالیسی ' واضح مقاصد کی طرف پیش قدمی کرنے والی تعلیمی پالیسی ہماری زندگی کو درست سمت میں لے جاسکتے ہیں اور ان سب میں اسلام کی روح کی کارفرمائی ضروری ہے۔ جب تک ہم اسلام کے نظام اخلاق کو عملاً" اختیار نہیں کرتے

اورنگ زیب قاسمی

معاشرے سے دوئی کو مٹانا ممکن نہیں ہمیں آج جمہوریت کا درس دیا جاتا ہے اور ترقی یافتہ ملکوں کا انداز حکومت اپنانے کی تلقین کی جاتی ہے۔ مذہب کا نام لینے والا بنیاد پرست کہلاتا ہے۔ اس الزام سے بچنے کے لئے مغربی اداروں کی طرف ہم للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں تاکہ ہم پر بنیاد پرستی کا لیبل نہ لگ جائے۔اس ڈر اور خوف کی وجہ سے مشرق کی ہر چیز ہمارے لئے ناقابل قبول بنتی جارہی ہے۔ دوسری طرف علماء میں اس کا ردعمل بھی شدید ہے۔وہ اپنے آپ کو سیاسی طور پر منظم کرنے کی فکر میں ہیں اور مشرقی تمدن کے پچھلے ادوار' قرون وسطیٰ کے فقہی دبستانوں پر اصرار کرنے لگے ہیں ۔ رواداری اور برداشت دونوں فریقوں میں نہیں۔ ایک اسلامی نظام کو قرون وسطیٰ کے حوالے سے دیکھتا ہے اور دوسرا جدیدیت کا علمبردار بن کر ہر مغربی قدر کی تائید اسلام سے حاصل کرنے کے درپے ہے۔ یہ جنگ اقتدار کی جنگ بن چکی ہے۔ جمہوریت کو گملوں میں لگا کر اس کی نشوونما کا سامان کیا جارہا ہے ہمارا آئیڈیل ہماری رسائی سے بہت دور ہے کہ خود ہمارا معاشرہ ابھی تک ترقی کے ابتدائی مراحل میں ہے اور جمہوری ادارے ابھی تشکیل نہیں پاسکے نہ ابھی ہم عوام کی سیاسی تربیت ہی کر پائے ہیں۔اس جنگ میں تعلیم یافتہ طبقہ ' سرمایہ دار طبقے کے مفادات کا محافظ ہے اور علماء اپنی قوت کے لئے عوام کی طرف دیکھتے ہیں جو سماجی لحاظ سے ان کی گرفت میں نہیں آرہے۔ عوام کو تو روٹی کپڑے کا نعرہ سماجی ضرورتوں کے تحفظ کا سبز باغ دکھاتا ہے اس لئے علماء کی آواز بیچ کھچیے درمیانے طبقے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے ۔ جمہوریت مفادات کی آلۂ کار ہو جائے تو اس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے سیاسی عمل تو اتر کے ساتھ آگے بڑھنے میں ناکام رہا ہے پے درپے مارشل لاء کی آمد نے سیاسی اداروں کی نموکو روکے رکھا حتیٰ کہ ہمارا موجودہ دستور بھی کئی اعتبارات سے ۱۹۳۵ء کے دستور ہی کی ترمیم شدہ شکل ہے ۔ پاکستان میں چالیس برس سے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے دفعات کی ترمیم کا عمل جاری ہے گویا سیاسی - - - - - - - - - طور پر ہم ابھی تک جمہوری اداروں کی تشکیل کا مناسب بندوبست نہیں کرپائے ایسے میں جمہوریت کا نعرہ اگر طبقاتی مفادات کو تحفظ مہیا کر رہا ہے تو اس میں اچنبھے کی بات نہیں۔ جمہوریت کے نفاذ کے لئے جمہوری اداروں کی ترقی ضروری ہے اور اس میں بھی ہمیں جمہوریت کو گملوں میں لگا کر نہیں اس سرزمین کی سابقہ تاریخ میں پیوست کرکے یہ پودا اگانا ہوگا موجودہ جمہوری عمل کی جڑیں زمین میں نہیں کیونکہ ہم نے ابھی تک ماضی ' حال اور مستقبل کو ایک کل کے طور پر اپنانے کی سعی کی ہے ہم تو اپنے ماضی سے شرمساری اور عبرت بھی حاصل نہیں کرتے ہم اس لئے کوئی مثبت رویہ اختیار نہیں کرتے کہ ہمیں ہمیشہ یہ خدشہ رہتا ہے کہ یورپ ہمیں بنیاد پرست نہ کہہ دے۔

سیاسی طور پر آج کا مرحلہ ارتکاز اختیارات کا نہیں تقسیم اختیارات کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ ہمارا ماضی کا تجربہ ہے ملک کے وسیع تر مفادات کو پیش نظر رکھ کر ہی داخلی استحکام ممکن ہے اور یہ نظام اخلاق کو استوار کرکے ہی ہو سکتا ہے۔ نظام اخلاق اور نظام تعلیم کو وسیع تر مقاصد سے ہم آہنگ کرکے ہی کامیابی ممکن ہے اور اس میں بھی نیت کی درستی امرلازم ہے اس کے بغیر جمہوری ادارے نمائش کی چیزیں اور جمہوریت ایک مذاق بن جائے گی۔

("اردو نامہ" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

اکیسویں صدی

کیلنڈر کی رو سے اکیسویں صدی سنہ دو ہزار کے آخری نقطہ پر طلوع ہو گی لیکن کیا واقعی ؟ کیونکہ سارے کیلنڈر انسان کے اپنے اختراع کردہ ہیں۔ قدرت نے کبھی انہیں تسلیم نہیں کیا لہذا یہ کہنا کہ کوئی صدی کسی خاص تاریخ کو اتنے بج کر اتنے منٹ پر طلوع ہو گی ایک مفروضے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر صدی اپنی مرضی سے جب چاہے اور جہاں چاہے' وقت کی چادر کو پھاڑ کر برآمد ہو جاتی ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ پر پرزے نکالتی ہے ہمیں اس کی موجودگی کا علم صرف اس وقت ہوتا ہے جب اس کے خدوخال بن چکتے ہیں بیسویں صدی کی مثال لیں۔ کیا بیسویں صدی نے سن انیس سو کے آخری نقطہ پر ہی درشن دیا تھا۔ ہرگز نہیں بیسویں صدی تو انیسویں صدی کے وسط میں پیدا ہو گئی تھی ۔ یعنی ١٨٥٥ء اور ١٨٩٠ کے درمیانی عرصہ میں یہ دورانیہ اس لئے اہم ہے کہ اس میں چار ایسے مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے بیسویں صدی کی فکری نہج کو مرتب کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا یعنی درکھیم' ہسرل' فرائیڈ اور سوسیئر اسی دوران ١٨٥٩ء میں چارلس ڈارون کی کتاب Origin of Species شائع ہوئی جس نے انیسویں صدی کے تیقن پر کاری ضرب لگا کر جہد للبقا اور بقائے بہترین کے تصورات کو پھیلایا۔ ١٨٥٩ء ہی میں تیل کا پہلا کنواں بھی دریافت ہوا جس نے بیسویں صدی کی مشین کے لئے قوت مہیا کی ۔ برصغیر پاک و ہند کے حوالے سے دیکھئے تو ١٨٥٧ء میں ہماری جنگ آزادی کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں ہندوستان اور پاکستان کی دو آزاد ریاستیں وجود میں آگئیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا اکیسویں صدی بھی بیسویں صدی کے دوران ہی پیدا ہوئی ہے؟ اور اگر ایسا ہوا ہے تو اس کا سال پیدائش کون سا ہے ؟ اس سلسلے میں ابھی وثوق کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں کیونکہ کسی بھی صدی کے جنم دن کا صحیح علم اس کی پیدائش کے ایک سو برس کے بعد ہوتا ہے تاہم اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو اکیسویں صدی بھی قریب قریب انہیں تاریخوں میں پیدا ہوئی ہے جن میں بیسویں صدی نے جنم لیا تھا یعنی ١٩٥٧ء کے لگ بھگ ! مگر اس کا پیدائش کا دورانیہ نسبتاً لمبا لگتا ہے یوں کہہ لیجئے کہ اکیسویں صدی نے ١٩٥٧ء اور ١٩٦٨ء کے درمیانی عرصہ میں جنم لیا۔ اس دورانیہ کا آغاز سپوتنک کی پرواز سے ہوا اور انجام چاند پر انسان کے پہلے قدم سے ! درمیان میں جنسی آزادی کی تحریک کا آغاز امریکہ سے ہوا جس کے ساتھ Aids کا پہلا کیس بھی منسلک ہے ١٩٦٥ء کے لگ بھگ Big Bang کی تھیوری کی تصدیق ہوئی جس کے نتیجے میں Steady State Theory مسترد ہو گئی۔ حیاتیات کا قصہ یہ ہے کہ ہر چند ١٩٥٣ء Double Helix میں دریافت ہو گیا تھا مگر ١٩٦٦ء Genetic Code میں مرتب ہوئی جس نے RNA کی چار حرفی زبان کا پروٹین کی

بیس حرفی زبان میں ترجمہ "پڑھ" لیا۔ اس عرصہ میں طبعیات کے میدان میں Hadrons دریافت ہوئے اور یہ اٹل یقین انکشاف ہوا کہ ذرات (Particles) بیک وقت مفرد (Elementary) بھی ہوتے ہیں اور مرکب (Composite) بھی۔ یعنی قطرہ بیک وقت قطرہ بھی ہے اور دجلہ بھی ! اس انکشاف نے کائنات کی ہم رشتگی اور اس کے امتزاجی مزاج کا ایک ایسا تصور پیش کیا جس نے جملہ علوم و فنون کو متاثر کیا۔ ادب میں ساختیاتی تنقید کا آغاز ہوا جس نے بعدازاں ساخت شکنی کے مکتب کو تحریک دی۔ ایلون ٹافلر نے اس دورانیہ کے فوراً بعد دو کتابیں لکھیں۔ ایک فیوچر شاک (Future Shock) اور دوسری تھرڈ ویو (Third Wave) پہلی کتاب کا لب لباب یہ ہے کہ مستقبل قبل از وقت ہی آگیا ہے کیا اس سے یہ مراد لی جائے کہ اکیسویں صدی نے مقررہ وقت سے پہلے ہی جنم لے لیا ہے ؟ دوسری کتاب نے اس عظیم فکری اور ثقافتی لہر کی نشاندہی کی جو اصلاً" آنے والے زمانے کی لہر ہے مگر جو بیسویں صدی کے دوران ہی نمودار ہو گئی ہے۔

بیسویں صدی جس نے انیسویں صدی کی کوکھ سے جنم لیا تھا' مزاج اور ہئیت کے اعتبار سے " مرکز " کے بجائے " لامرکزیت " فرد کے بجائے معاشرہ' شعور کے بجائے اجتماعی لاشعور تیز شے کی بجائے رشتوں کے جال کی قائل و گرویدہ تھی مگر یہ تو اس کی داخلی سطح تھی ۔ خارجی سطح پر ارتقا (Evolution) کے نظریے نے جہد للبقا اور بقائے بہترین کے جن تصورات کو جنم دیا تھا ان کا نتیجہ ہمیں نطشے کے فوق البشر سے لے کر اس کی معنوی اولاد یعنی ہٹلر' مسولینی اور سٹالن کی صورت میں صاف دکھائی دیتا ہے اور وقت اور تاریخ کے تابع ہے لیکن آج کہ ہم زمانی فاصلے سے اس دور پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اصل ہئیت معاشرے اور لاشعور کی بے معانی ہی کی تھی جسے مخالف نقطہ نظر نے فقط مہمیز کی تھی۔ ادب کے میدان میں دیکھیے تو انیسویں صدی کے آخری ایام میں مصنف کو بطور فوق البشر) کس قدر اہمیت ملی تھی۔ مگر پھر ایلیٹ نے شخصیت کے انہدام کا تصور پیش کیا اور روایت کی " بے زمانی " کو پیش نظر میں لانے کی کوشش کی۔ اسی طرح " نئی تنقید " نے " تصنیف بغیر مصنف " کا نعرہ لگایا۔ سماجی سطح پر اشتراکیت کے نظام کو تقویت ملی جو فرد پر سماج کی بالادستی کا مؤید تھا۔

سیاست کے حوالے سے دیکھیں تو بیسویں صدی کا پہلا نصف سلطنتوں کی تشکیل یعنی Building Empire کا دور ہے مگر نصف آخر میں سلطنتوں کے ٹوٹنے کا آغاز ہو گیا ہے پہلے نازی اور اطالوی سلطنتوں کا خواب تار تار ہوا۔ پھر برطانوی سلطنت جس پر سورج طلوع نہیں ہوتا تھا لخت لخت ہو گئی۔ آخر میں روسی سلطنت پارہ پارہ ہو گئی اور اب جنوب مشرق ایشیا کی سلطنتیں ڈانواں ڈول ہیں مگر جس طرح برطانوی سلطنت نے ایک اور سطح پر کامن ویلتھ قائم کی اسی طرح روسی سلطنت بھی کامن ویلتھ تشکیل دینے کی کوشش میں ہے اور اگر کوئی اور سلطنت ٹوٹی تو اسے مال کار دولت مشترکہ ہی کا روپ دھارنا ہو گیا ۔ یہی حال یورپ کا ہے جس کے ملک اپنے اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے ایک بلند سطح کا ساختیہ بنانے کی دھن میں ہیں۔ یورپی اقتصادی منڈی اس ساختیہ ہی کی طرف ایک قدم ہے۔ مزید غور کریں تو بیسویں صدی کے پہلے نصف کا سیاسی نظام ایک "نظم" کی طرح گندھا ہوا نظر آئے گا۔ نظم جس میں ایک لفظ یا لائن بھی اپنی جگہ سے سرک جائے تو نظم کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جائے۔ مگر بیسویں صدی کے نصف آخر میں سیاسی نظام "غزل" کی طرح ابھر رہا ہے یعنی ہر ملک (غزل کی شعری طرح) اپنی جگہ آزاد ! مگر قافیہ اور ردیف کے ذریعے

غزل کی کلاسن ویلتھ سے منسلک! یہ گویا اکیسویں صدی کی وہ بنیادی جہت ہے جو بیسویں صدی میں نمودار ہو گئی ہے یعنی ایک ایسی جہت کہ جس کے تحت نہ تو فرد معاشرے پر محیط ہو گا اور نہ معاشرہ فرد پر!

اکیسویں میں انسانی معاشرتی نظام کیا صورت اختیار کرے گا اس کے بارے میں بل ڈیوڈسن نے اپنی کتاب Vision 2020 میں ایک مزیدار بات کی ہے اس کا کہنا ہے کہ اکیسویں صدی کا انسان بغیر کسی درمیانی وسیلے کے براہ راست "اشیاء" "کتب" "فلموں" "واقعات" "لیکچرز اور کھیلوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور یہ نتیجہ ہو گا کمپیوٹر" ٹیلیفون اور ٹیلی ویژن کے رشتہ باہم کا۔ اس کے مطابق نشر ہونے والا ٹیلی ویژن کا نظام اور تاروں پر انحصار کرنے والا ٹیلی فونی نظام" یہ دونوں ختم ہو جائیں گے اور ان کی جگہ ایسا پاکٹ کمپیوٹر لے لے گا جو گھڑی کی طرح ہر دم فعال اور بٹوے کی طرح ذاتی چیز ہو گا۔ یہ شے" کسی بھی قسم "کتاب" کمرہ جماعت "عبادت گاہ" کھیل کا میدان یا کسی بھی قسم کے "پروگرام" میں شرکت کرنے پر قادر ہو گی چنانچہ درمیانی وسیلے بالکل ختم ہو جائیں گے۔ اور انسان اصل واقعہ "جلسہ" وعظ یا کھیل کی کارروائی کو اپنی واردات بنا سکے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی شخص محض ایک چھوٹے سے کمپیوٹر کی مدد سے پوری دنیا کے ساتھ ہمہ وقت منسلک اور مربوط ہو گا۔ دوسرے لفظوں میں جزو (فرد) کل (پوری دنیا) کو محسوس کرنے اور اس کی سانس میں اپنی سانس ملا کر جینے کے قابل ہو جائے گا۔ اس کی حیثیت محض ایک ناظر کی نہیں رہے گی بلکہ شریک کار کی ہو جائے گی قیاس غالب ہے کہ معاشرتی سطح کی یہ ہم آہنگی اور امتزاج' اکیسویں صدی کی سب سے بڑی جہت قرار پائے گی۔

فکر و فلسفے کے میدان میں دیکھیے کہ یہاں بھی ثنویت کے قدیم تصور نے ایک امتزاجی رویے کے لئے جگہ خالی کرنا شروع کر دی ہے سوچنے کی بات ہے کہ انسان نے "حقیقت اولیٰ" کو جاننے کے لئے کُل تین قدم اٹھائے ہیں۔ پہلا قدم وہ تھا جب قدیم انسان نے "حقیقت" کو ایک مرکز آشنا ساخت (Centre Oriented Structure) کی صورت میں محسوس کیا۔ اس کا یہ احساس اس عام سے مشاہدہ کی دین تھا کہ ہر شے کے جملہ اجزا ایک مرکز سے بندھے ہوتے ہیں۔ مثلاً" وہ دیکھتا کہ اس کا کرہ ارض ایک ایسا "مرکزہ تھا جس کے گرد تمام سیارے اور ستارے طواف کرتے تھے اور اس کا دل جسم کے سارے نظام میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا وغیرہ۔ روزمرہ کے اس مشاہدہ کا اطلاق جب اس نے پوری کائنات پر کیا تو اسے ایک ایسی مرکز آشنا ساخت "دکھائی دی جس کا مرکزہ ساخت کے اندر ہونے کے باوجود ساخت سے ماورا بھی تھا۔ پوری ساخت اس مرکزہ کے دم قدم ہی سے قائم تھی بلکہ اس مرکزہ کی زائیدہ تھی۔ یہ مرکز آشنا ساخت کچھ یوں تھی:
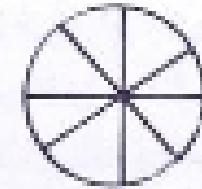
مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ قدیم زمانے ہی میں انسان نے مرکز آشنا ساخت سے ایک قدم آگے بڑھا کر ایک ایسی ساخت کا بھی ادراک کیا جس میں جزو اور کل کی تفریق نہیں تھی اس ساخت کے ہر جزو میں پورا کل سمایا ہوا تھا۔ غالباً" انسان کا یہ تصور اس کے اس مشاہدہ کی دین تھا کہ بیج میں سایہ دار درخت چھپا ہوتا ہے اور

اورنگ زیب قاسمی

درخت پورے کا پورا مال کار ایک ننھے سے بیج میں سمٹ جاتا ہے اس مشاہدے کا اطلاق جب اس نے پوری کائنات پر کیا تو اس کو "مرکز آشنا ساخت" کے بجائے ایک ایسی ساخت دکھائی جو "رشتوں کا ایک جال" تھی کچھ یوں:
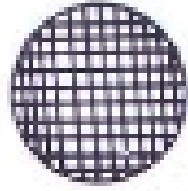
اس ساخت کا ہر خانہ (جزو) اندر سے خالی تھا اور جن چار خطوط سے اس خانے کی سرحدوں کا تعین ہوتا تھا۔ وہ بھی اردگرد کے خانوں سے مستعار تھے دیگر جملہ خانوں کا بھی یہی حال تھا۔ ان میں سے ہر خانہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ تھا۔ پوری ساخت کے تمام خانے ایک دوسرے سے مشروط تھے۔ گویا ہر خانے میں پوری ساخت یوں سمائی ہوئی تھی جیسے بیج میں سارا درخت!

انیسویں صدی کے ربع آخر تک مغربی فکر میں آشنا ساخت کا تصور ہی غالب تھا حتیٰ کہ نیوٹن کی طبیعیات بھی "مرکز" ہی کو بنیادی اہمیت تفویض کرتی تھی نیز مغرب کا کارٹیزین فلسفہ (Cartesian Philosophy) بھی Cogito ہی کو مرکزہ قرار دیتا تھا مگر بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی صورت حال تبدیل ہونے لگی۔ اس سلسلے میں بنیادی پیش رفت جدید طبیعیات میں ہوئی جس نے نہ صرف زماں اور مکاں کے امتزاج کا احساس دلایا' نہ صرف Mass اور Energy کو ایک ہی شے قرار دیا بلکہ ایٹم کے نیوکلئیس میں ایک ایسی ساخت بھی دریافت کر لی جو مرکزہ سے تہی' محض "رشتوں کا ایک جال تھی" جدید طبیعیات کے مطابق بظاہر" حقیقت کے دو رخ ہیں۔ ایک ہیئت Form بصورت پارٹیکل اور دوسرا مواد Content بصورت ویو (Wave) مگر انسان بیک وقت ان دونوں رخوں کو دیکھ نہیں سکتا۔ جب وہ دیکھتا ہے تو اسے حقیقت کا صرف "پارٹیکل رخ" دکھائی دیتا ہے جب نہیں دیکھ رہا ہوتا تو حقیقت اپنے "ویو رخ" کا مظاہرہ کر رہی ہوتی ہے دونوں رخ ایک دوسرے کو خارج کرتے ہیں مگر ایک کے بغیر دوسرے کی پہچان ناممکن ہے۔ اصلاً" دونوں ایک ہی شے ہیں۔ دوسری طرف لسانیات میں (1) سوسئیر نے بھی دو رخوں کا ذکر کیا۔ ایک وہ رخ جو گفتار (Parole) کی صورت میں دکھائی دیتا ہے یعنی جب ہم گفتگو کے دوران حرف سے الفاظ سے جملے بنا رہے ہوتے ہیں دوسرا رخ جو زبان کے سسٹم یعنی "لینگ" کی صورت "گفتار" کی تہہ میں موجود ہوتا ہے مگر دکھائی نہیں دیتا۔ دونوں ایک دوسرے کی پہچان اور ایک دوسرے سے مشروط ہیں۔ معانی کی ترسیل دونوں کے امتزاج ہی کی مرہون منت ہے۔ ساختیاتی تنقید کا یہ موقف تھا کہ ساخت مرکز سے ناآشنا رشتوں کے ایک جال کا نام ہے مگر اس کے اندر نظر نہ آنے والی Conventions and Codes کا ایک سسٹم کارفرما ہے جس کے مطابق ساخت میں گرہ اور پیچ و خم بصورت تخلیقات نظروں کے سامنے ابھرتے ہیں۔
جدید نفسیات نے اجتماعی لاشعور کا تصور پیش کیا جو لسانیات کے "لینگ رخ" ساختیات کے "کوڈ کونش رخ" اور جدید طبیعیات کے "ویو رخ" کے مماثل تھا اور ایسی آرکی ٹائپل کہانیوں سے عبارت تھا جن کے مطابق نظر آنے والے شعوری اقدامات مرتب اور متشکل ہوتے ہیں۔ اسی طرح فلسفے کے میدان میں برگساں نے

Elan Vital کا تصور پیش کیا جو تمام مظاہر کی روح رواں ہے اور کروچے نے انسان کے باطن میں موجود وجدانی وحدت (Singularity of Intuition) کا احساس دلایا اور ارتکاز کے اس لمحے ہی کو تخلیقات کا منبع اور مخرج گردانا بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں انیسویں صدی میں مادہ کا ایک ٹھوس وجود تھا جس کا اپنے خالق کے ساتھ ایک واضح تعلق تھا وہاں بیسویں صدی میں ٹھوس مادے کی جگہ " ساخت " نے لے لی ہے جو رشتوں کا ایک جال ہے لہذا ثنویت کے بجائے امتزاج اور ربط باہم کا وہ نظریہ اب سائنسی بنیادوں پر استوار ہونے لگا ہے جسے ہمارے صوفیانے اس قدر اہمیت دی تھی۔ واضح رہے کہ آج طبیعیات کے سامنے سب سے بڑا قضیہ یہ ہے کہ کس طرح ایک ایسی Unified Theory پیش کی جائے جو اس بات کو ثابت کرے کہ کائنات کی چاروں قوتیں یعنی:

1-Electromagnetism 2- Strong Nuclear Force

3- Weak Nuclear Force 4- Gravitation

درحقیقت ایک ہی مشعل کی کرنیں ہیں اور چاروں میں کوئی فرق نہیں ہے اب تک سائنس داں (جن میں ڈاکٹر عبدالسلام کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے) تین قوتوں کو مربوط کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں مگر تاحال کشش ثقل ان کی گرفت میں نہیں آسکی' جس روز یہ قوت بھی زیر دام آگئی تو کائنات کے پس پشت ایک " عظیم قوت" کا وجود سائنسی سطح پر بھی ثابت ہو جائے گا توقع ہے کہ اکیسویں صدی میں کائنات کا یہ امتزاجی روپ صاف نظر آنے لگے گا۔

بیسویں صدی کے ربع آخر تک آتے آتے مغربی انسان نے حقیقت اولیٰ کو جاننے کے لئے تیسرا اقدام بھی اٹھایا ہے اب وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جزو اور کل کو ایک ہی سکے کے دو رخ قرار دینا بھی ایک طرح کی ثنویت کو قبول کرنا ہے گویا ساخت رشتوں کی ایک مرتب اور مدون صورت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک " گنجلک " ہے جو کسی قاعدہ قانون کے تابع نہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ کوڈ' سسٹم' گرامر' قاعدہ' قانون اور صفت سے ماورا ہے کچھ اس طرح:

یہ ایک طرح کا رقص ہے مگر ایسا رقص جو رقص کی کسی گرامر یا اصل الاصول کا تابع نہیں ہے ساخت شکن ' مفکرین (Deconstructionists) نے اسے گنجلک یا Labyrinth قرار دیا ہے تاہم اس فکری جست پر موجودیت کے کچھ اثرات بھی صاف نظر آتے ہیں کیونکہ موجودیت والوں کا بھی یہ موقف تھا کہ انسان ہمہ وقت نیم غنودگی کے عالم میں مبتلا " حقیقت " کی بالائی سطح ہی سے چمٹا رہتا ہے مگر وہ جب کسی بحرانی کیفیت کی زد میں آتا ہے تو یکایک سطح میں ایک شگاف یعنی Rupture پیدا ہوتا ہے جس میں سے حقیقت کا Being-in Itself روپ بصورت گڑاز (Abyss) دکھائی دیتا ہے اور یہ روپ ایسا ہے کہ اس کی محض ایک جھلک پاتے ہی انسان بے معنویت ' دہشت اور متلی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے مگر یہ کربناک لمحہ انسان کے لئے " آزادی" کا لمحہ بھی ہے کیونکہ اس لمحے کے دوران ہی وہ صحیح معنوں میں " جاگتا " ہے ویسے بھی

اورنگ زیب قاسمی

زمان مسلسل (Serial Time) میں اسیر رہتا زنجیروں میں جکڑے رہتا ہے مگر زماں کی جکڑ سے آزاد ہو کر متسلسل (Duratioin) میں لمحہ بھر کے لئے آجاتا "آزادی" کا مزہ چکھتا ہے ہمارے صوفیا کے ہاں بھی " رکنے " کا یہ لمحہ بطور ایک عارفانہ کیفیت بار بار ابھرتا تھا جب وہ زماں کے تسلسل یعنی اس کی Temporality سے آزاد ہو جاتے تھے اس وقت مظاہر کی دبیز چادر میں ایک شگاف سا پیدا ہوتا تھا جس میں سے وہ " حقیقت اولیٰ" کی صدائے کن فیکون سننے میں کامیاب ہوتے تھے ایک ایسی صدا جو انہیں وجد میں مبتلا کر دیتی تھی عجیب بات یہ ہے کہ موجودی فلاسفر جب حقیقت کی " جھلک " پاتا ہے تو دکھی ہو جاتا ہے جبکہ صوفی جب جھلک پاتا ہے تو وجد کے عالم میں آجاتا ہے ان دونوں کے برعکس ساخت شکن مفکر کا یہ خیال ہے کہ انسان دراصل " گنجلک " میں راستہ بناتا ہے (جو شگاف یا جھری میں سے دیکھنے کے مترادف ہے) مگر یہ راستہ ساتھ ہی ساتھ معدوم بھی ہوتا جاتا ہے تاہم اس عمل میں اسے لطف ضرور حاصل ہوتا ہے اس کے مطابق لفظ اور معنی لفافہ اور ملفوف ہیئت اور مواد کی ثنویت کا کوئی جواز نہیں ہے بنیادی چیز ہی لفافہ (Envelope) یا ہیئت (Form) ہے جو اصلاً" مکانی یعنی (Spatial) ہے نہ کہ زمانی یعنی (Temporal) گویا ہیئت کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور یہ ہیئت دال (Signifiers) کا ایک رقص ہے تاہم یوں لگتا ہے جیسے ساخت شکن مفکر کی پیش رفت ' گنجلک " کو محسوس کرنے اور اس میں سے راستہ بنانے کی سعی نامشکور کی حد تک ہے اس میں " گنجلک" سے جست لگا کر حقیقت عظمیٰ کے تخلیقی رخ کا نظارہ کرنا (جیسا کہ مشرق کے صوفیوں اور ویدانتیوں نے کیا ہے) اس کے بس میں نہیں ہے۔

ساخت شکنی کا یہ نظریہ ابھی کٹھالی میں ہے اور مغربی ذہن میں جو قاعدہ قانون' منطق اور گرامر کا گرویدہ رہا ہے اس کے لئے کسی ایسی ساخت کا تصور کرنا جو اصولوں ' صفتوں اور صورتوں کی نفی پر منتج ہوتا حال قابل قبول نہیں ہے حالانکہ مشرق میں حقیقت اولیٰ کا تصور کہ وہ تمام صفات سے ماورا بھی ہے از منہ قدیم ہی سے رائج رہا ہے لہذا اکیسویں صدی میں ایک ایسی ساخت کی مقبولیت کے امکان تو ہے جو مرکزیت کے بجائے " رشتوں کے جال " کی موید ہو مگر ایسی ساخت کا فروغ ابھی مشکل نظر آتا ہے جو انسان کے منطقی دماغ ہی کے لئے ناقابل قبول ہو۔

اب کے زاویئے سے دیکھیں تو محسوس ہو گا کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں لکھاری کے بجائے لکھت (Text) کو اور فرد کے بجائے اس کے اندر کے (Culture Man) کو اہمیت ملی تھی جبکہ اس سے قبل انیسویں صدی کے ربع آخر میں مصنف اور اس کا سوانحی اور تاریخی تناظر اہمیت کا حامل قرار پایا تھا تاہم بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب ساختیاتی مباحث کا چلن عام ہوا تو بنیادی جست (ثنویت کے تصور کو برقرار رکھنے کے بجائے) ایک امتزاجی رویئے کو سامنے لانے کی طرفدار نظر آنے لگی۔ چنانچہ ساختیاتی نظام تنقید میں " لکھت ' شعریات اور قاری" تینوں نے مل جل کر ایک اکائی تشکیل دی جو ایک امتزاجی عمل تھا۔ سب جانتے ہیں کہ تنقید کے میدان میں دو رویے ہمیشہ سے مروج رہے ہیں۔ ایک وہ جس میں نقاد یا قاری ایک نر (Male) کی طرح تصنیف کی جانب بڑھتا ہے اور جو بقول پولٹ (Poulet):

" Forces Himself Takes Hold of Appropriates and Fills "

یہ قاری یا نقاد تصنیف کے " معنی " کی تلاش نہیں کرتا بلکہ اپنا معنی (بطور نطفہ) تصنیف میں سموتا ہے

اور پھر اس کے بار آور ہونے کا منظر دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسرا رویہ وہ ہے جس کے تحت قاری یا نقاد مادہ (Female) کی طرح تصنیف کے معنی یا پیغام کو قطعاً" منفعل انداز میں قبول کرتا ہے۔ تنقید کے یہ مردانہ اور نسوانی پہلو ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں اور نظر آسکتے ہیں انیسویں صدی کے آخری حصے میں مصنف نطشے کے فوق البشر کی طرح Will To Power کا علمبردار تھا اور قاری کو اپنے ساتھ بہالے جانا چاہتا تھا جبکہ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں یہ خیال رائج ہوا کہ تصنیف یا پیغام کا گہوارہ ہے اور نقاد کا کام اس معنی یا پیغام کو منفعل انداز میں قبول کرنا ہے۔ یہ دونوں انتہا پسندانہ رویے تھے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں ابھرنے والی ساختیاتی تنقید نے دونوں کو باہم آمیز کر دیا۔ ساختیاتی تنقید کا یہ موقف تھا کہ چونکہ تخلیق کا ایک اپنا منفرد ساختیہ ہے جو تخلیق کار کی شخصیت اور سوانح یعنی اس کے سوانحی رخ کی مطلق العنانی سے بے نیاز ہے تاہم ساختیہ ایک طرف عالم گیر کوڈ یا ماڈل (بصورت شعریات) سے منسلک ہے اور دوسری طرف قاری کی شرکت سے خود کو مکمل بھی کرتا ہے یوں دیکھیے تو ساختیاتی تنقید نے مصنف' شعریات اور قاری کو ایک دوسرے کے قریب لا کر رشتوں کے ایک ایسے پیٹرن کو ابھارا جس کے اکیسویں صدی میں نشوونما پانے کے امکانات بہت روشن ہیں دوسری طرف پس ساختیاتی مباحث میں مصنف مسترد ہوا ہے ' تصنیف محض Signifiers کا مجمع قرار پائی ہے اور قاری کا کام فقط Text کو کھولنا اور بے نقاب کرنا مقصود ہوا ہے نہ کہ اس میں بند معانی کو یا اس کے عقب میں موجود شعریات کو نشان زد کرنا یا ان کی تشریح کرنا۔

ہر چند اردو تنقید ابھی ساختیاتی تنقید سے پوری طرح آشنا نہیں ہوئی تاہم اپنے خاص حالات کے تحت اس نے بھی ایک طرح کے امتزاج کی طرف قدم بڑھانے شروع کر دیے ہیں وہ یوں کہ نصف صدی پر محیط اس نظریاتی آویزش کے بعد جو دائیں اور بائیں بازو کے ادیبوں میں جاری رہی ہے اردو تنقید اب ایک امتزاجی جہت کو قبول کر رہی ہے۔ میں نے اپنی کتاب "" تنقید اور جدید اردو تنقید "" میں اردو تنقید میں ابھرنے والی اس امتزاجی جہت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور آخر آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ:

> جدید اردو تنقید کے مطالعہ سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اعلیٰ تخلیق کی طرح اعلیٰ تنقید بھی ایک لمحہ آزادی کی مرہون منت ہے یعنی ایک ایسے لمحے کی جس میں تخلیق کار یا نقاد شدت جذبات یا شدت نظریات سے آزاد ہو کر خود اپنے روبرو آکھڑا ہوتا ہے یوں وہ خود کو اس قابل پاتا ہے کہ فن پارے کی یکتائی اور انفرادیت کا احترام کر سکے۔ جدید اردو تنقید ایک طویل نظریاتی آویزش کے بعد اب آہستہ آہستہ اس لمحہ آزادی کی طرف بڑھنے لگی ہے (جو تخلیقی عمل کے زاویے سے دیکھئے تو ہمیشہ امتزاج اور انقلاب کے عمل ہی سے پھوٹتا ہے)

یہی صورت حال اردو افسانہ کی ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ل۔ احمد اور سجاد حیدر یلدرم کے زمانے میں اردو افسانہ ماورائیت کا مظہر اور اعلیٰ آدرشوں کے حصول کے لئے کوشاں تھا۔ مگر پھر ترقی پسند تحریک نے اسے زمین اور اس کے مسائل کی طرف متوجہ کر دیا اور مثالیت پسندی یعنی Idealism کے بجائے حقیقت پسندی یعنی Realism کی ایک رو اسلوب اور مواد دونوں میں جاری و ساری ہو گئی۔ اس کا رد عمل پچھلی دہائی میں علامتی اور تجریدی افسانے کی صورت میں ہوا جس نے اس دھند کو گرفت میں لینے کی کوشش کی جو پیٹرن Pattern سے عبارت ساخت میں لازمی طور پر موجود ہوتی ہے۔ اس عمل میں اس نے بعض اوقات خود کو

کہانی اور کردار سے منقطع بھی کر لیا اور محض پرچھائیوں کی معیت میں آگے بڑھنے لگا۔ اب بیسویں صدی کے آخری ایام میں اردو افسانے کے علامتی اور تجریدی کینوس پر پلاٹ اور کردار دوبارہ ابھر آئے ہیں۔ گویا حقیقت پسندی اور تجریدیت کا ایک امتزاج سارونما ہونے لگا ہے۔

جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے تو اقبال نے نظم اور غزل کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن بعدازاں جب آزاد نظم کا چلن عام ہوا تو نظم اور غزل میں خاصی بڑی خلیج پیدا ہو گئی۔ تاہم بیسویں صدی کے آخر تک پہنچتے پہنچتے ہیئت یا فارم کے اعتبار سے تو ان دونوں کا فرق مزید واضح ہوا مگر غزل میں نظم کے کنکریٹ امیجز کے نفوذ اور نظم میں غزل کے ماورائی اور اشاراتی انداز کی آمیزش نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اکیسویں صدی میں ان دونوں کا ہیئتی اور مزاجی فرق مٹ جائے گا تاہم اس فرق کو قائم رکھنے کے باوجود شاعری بحیثیت مجموعی ایک ایسا امتزاجی انداز ضرور اختیار کرے گی جو اکیسویں صدی کی روح سے ہم آہنگ ہو گا۔ ممکن ہے کہ قلم کی وساطت سے شاعری کا ایک ایسا روپ ابھر آئے جس میں دونوں رویے فنی التزام کے ساتھ باہم آمیز ہو جائیں۔ تاہم وثوق کے ساتھ کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔

رہا انشائیہ تو اس سلسلے میں امتزاج اور آمیزش کے امکانات نسبتاً" زیادہ ہیں۔ وجہ یہ کہ انشائیہ بنیادی طور پر ایک ایسی امتزاجی صنف ہے جس میں شعر کا گداز' فکر کی جولانی' کہانی کا کیف اور عارف کی نظر' باہم آمیز ہو گئے ہیں۔ مگر اس طور پر نہیں کہ انشائیہ ان مختلف عناصر کی حاصل جمع قرار پائے انشائیہ اصلاً" ایک ایسا ساختیہ ہے جو اپنے عناصر کی حاصل جمع سے کچھ زیادہ ہوتا ہے اور "کچھ زیادہ" ہونا ایک تخلیقی عمل کی دین ہے غور کیجئے کہ انشائیہ میں زمانی عنصر' مکانی عناصر سے اس طور ہم آہنگ ہیں کہ Space Time Continuum کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انشائیہ اپنے امتزاجی رویے کے باعث اکیسویں صدی کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس لئے اس بات کے امکانات کو مسترد کرنا مشکل ہے کہ انشائیہ اکیسویں صدی کی مقبول ترین صنف ادب کا درجہ حاصل کر لے گا۔

مجموعی طور پر دیکھیں تو یوں لگتا ہے جیسے اکیسویں صدی اپنے عام تخصیصی رویوں کے باوجود ایک امتزاجی عمل کی مظہر ہوگی اور یہی اس کا اہم ترین تقاضا قرار پائے گا لہٰذا وہی اصناف ادب اسے بہتر طور پر منعکس کریں گی جن کی اپنی ساخت امتزاجی ہو گی یا جو اپنی ساخت کو اکیسویں صدی کی طلب کے مطابق منتخب کرنے میں کامیاب ہو سکیں گی۔

("صریر" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

حسن عابدی

افلاس کا کلچر اور کلچر کا افلاس

پاکستان میں ایک ہی آسمان کے نیچے بیک وقت دو کلچر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ سانس لے رہے ہیں۔ ایک وہ کلچر جو آسانی سے حاصل ہونے والی بے حد و حساب دولت کا پیدا کردہ ہے اور دوسرا کلچر افلاس کی دین ہے ممکن ہے یہ صورت حال دوسرے ملکوں میں بھی ہو' لیکن جس طرح خط استوار کے قریب کے ملکوں میں سورج کی کرنیں سیدھی پڑتی ہیں اسی طرح قلت زر کے "استوائی منطقے" میں رہتے ہوئے ہم اس کی جھلسا دینے والی تمازت کو سیدھے اپنے بدن پر روح کے اندر تک محسوس کرتے ہیں۔

دولت کے کلچر کی خصوصیت "کنزیو مرازم" ہے یعنی زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا' ذاتی اسباب راحت کی فراہمی پر' تعیش و تفریح پر اور زروماں کی نمائش پر۔ اس طرح نہ صرف سماجی مرتبے میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اثرورسوخ بڑھتا ہے اور حصول زر کے کچھ دروازے کھلتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں افلاس کے کلچر سے کچھ اور طرح کا افلاس پیدا ہوتا ہے اس کی محرک آسائش کے اسباب فراہم کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی خواہش ہوتی ہے لیکن نادار آدمی کے لئے قانونی ذرائع سے مال کمانا دشوار ہوتا ہے قانونی ذرائع بھی انہی کو میسر آتے ہیں جو قانون کو اس کی قیمت ادا کر سکیں۔ بے وسیلہ آدمی اس صورت حال سے مایوس ہو کر خاموش ہو جاتا ہے لیکن "کنزیو مر" کلچر اس کی جان نہیں چھوڑتا اور مسلسل اس کے درپے آزار رہتا ہے ایک اچھے گھر' اچھے لباس' اچھی سواری اور بیوی بچوں کی فرمائشوں سے عہدہ برا ہوتے رہنے کی خواہش اسے مضطرب رکھتی ہے۔ معاشرہ اسے مسلسل شہ دیتا رہتا ہے کہ سماج میں تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔ یوں بے ننگ و نام ہو کے جینا بھی کوئی جینا ہے پھر وہ غیر قانونی اور غیر اخلاقی ذرائع اختیار کرتا ہے۔ یہاں یہ بات واضح کرتے چلیں کہ ہم نے قانون اور اخلاق کے درمیان ایک لکیر کھینچ رکھی ہے بہت سی باتیں غیراخلاقی ہوتی ہیں لیکن سرکاری اجازت نامے سے فائدہ اٹھا کر یا قانونی سقم کی بدولت ہم انہیں قانونی بنا لیتے ہیں۔

افلاس کا کلچر صرف احتیاج سے پیدا نہیں ہوتا حصول زر کی بے اختیار خواہش سے جنم لیتا ہے جوا لاٹری' جعل سازی اور چوری ڈکیتی' پلاٹوں پر قبضہ' اسلحہ اور منشیات کی اسمگلنگ' یہ سب اسی افلاس کے کلچر کی پیداوار ہیں اور "ثروت مند" لوگوں کی سرپرستی میں فروغ پا رہے ہیں۔

جب ایک صاحب ثروت تین کروڑ روپے کی رولز رائس خریدتا ہے تو وہ افلاس کے کلچر کو فروغ دیتا ہے جب وہ سینکڑوں ایکڑ اراضی پر بنگلہ تعمیر کرتا ہے' نجی سواری کے لئے ہیلی کاپٹر خریدتا ہے اور آسائش کے ایسے ایسے اسباب فراہم کرتا ہے جس کا کروڑوں ہموطنوں نے شاید نام بھی نہ سنا ہو تو وہ افلاس کے کلچر میں

اورنگ زیب قاسمی

اضافہ کرتا ہے کچھ تو اس طرح کہ وہ سرمایہ جو ملک کی تعمیری اور پیداواری سرگرمیوں میں صرف ہونا چاہیے تھا' ضائع ہو گیا اور صرف ضائع نہیں ہوا اس نے ملکی وسائل زر پر کاری ضرب لگائی اور کچھ اس بنا پر کہ اس مثال سے دوسروں میں ہر ممکن طریقے سے دولت کمانے اور عیاشی میں خرچ کرنے کی مجرمانہ خواہش پیدا ہوئی۔

اب کوئی مانے یا نہ مانے' ہر بڑے سرمائے کے پیچھے کسی بڑی دھاندلی کا ہاتھ ہوتا ہے اکثر اوقات قانون اس دھاندلی کو چھپالیتا ہے لیکن افلاس کے کلچر کو اس سے تقویت تو بہر طور پر ملتی ہے افسوس تو اس بات کا ہے کہ "کنزیو مرازم" کو فروغ دینے میں اور افلاس کے کلچر کو بنیادیں فراہم کرنے میں ہمارے ذرائع ابلاغ خاص طور پر سرکاری ذرائع ابلاغ "الیکٹرانک میڈیا" پیش پیش ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے جب فنانس کمپنیوں نے روپیہ جمع کرانے والوں کے لئے ناقابل یقین شرح منافع کا اعلان کیا تو لاکھوں افراد کیا امیر اور کیا غریب ان کے دفاتر پر ٹوٹ پڑے' غریب لوگ یقیناً زیادہ ہوں گے جو پہلے سے زیادہ غریب ہو گئے۔ ایک رفاہی ادارے نے اور بعد میں اس کی دیکھا دیکھی دوسرے اداروں نے بھی جب لاکھوں روپوں کے انعامات کے عوض دس دس روپوں کے ٹکٹوں کی فروخت کا اعلان کیا تو لوگ بینکوں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ بھی افلاس کے کلچر کا مظاہرہ تھا۔ وہ سرپھرے جو اسلحہ کا استعمال جانتے ہیں' وہ بینکوں میں اور طرح داخل ہوتے ہیں' لیکن کمزور مفلس تو بس یہی کر سکتا ہے کہ اپنے دس روپے داؤ پر لگا دے۔

افلاس کے کلچر کا ایک اور مضحکہ خیز مظاہرہ گزشتہ دنوں دیکھنے میں آیا' جب ٹی وی کے ایک چینل سے انعامات کی پیشکش کی گئی۔ سوالات کند ذہن بالغوں اور چھوٹے بچوں کو سامنے رکھ کر بنائے گئے تھے' لیکن شرط یہ تھی کہ ہر شام تین چار گھنٹے ٹی وی کے سامنے "نگاہ روبرو" بیٹھے رہو اور جوابات فون پر لکھوا دو' نتیجہ یہ کہ پاکستان کے کئی بڑے شہروں میں ٹیلی فون کے ایکس چینج "جام" ہو گئے بلکہ کئی دنوں کے لئے پورا انتظام ہی درہم برہم ہو گیا اور لاکھوں افراد کا جو وقت ضائع ہوا اس کا کوئی حساب نہیں ٹی وی اسکرین پر لوگوں کو مسلسل ترغیب دی گئی کہ تمہارے لئے بجلی کے نہایت مہنگے اور مفید آلات اور راحت کے کیسے کیسے اسباب موجود ہیں۔ اس ترغیب کے بعد بھلا کس نادار آدمی کا دل نہ چاہے گا کہ سب سے پہلے فون پر اپنے جوابات لکھوائے اور کسی ایسے بیش قیمت انعام پر ہاتھ صاف کرے جس سے اس کے سارے دلدر دور ہو جائیں۔ ہاں شاید یہ بھی ہوا ہو۔ آخر لاٹری میں کچھ لوگوں کو بھاری رقوم ملیں' اور چند افراد نے بیش بہا انعامات بھی حاصل کئے لیکن کیا اس سے معاشرے کا افلاس دور ہو گیا کسانوں کو زمینیں' بیروزگاروں کو روزگار مل گئے کیا نئی صنعتیں لگ گئیں۔ تعلیم سے محروم گلی کوچوں میں مزدوری کرنے والے بچوں کو اسکولوں میں داخلہ مل گیا ہسپتالوں میں مریضوں کی چارہ جوئی کا انتظام بہتر ہو گیا' آخر ہمارے ذرائع ابلاغ کس کلچر کو فروغ دے رہے ہیں؟ تعیش اور زروماں کی نمائش کا کلچر اور افلاس کا کلچر' یا کچھ اور؟

وہ دولت جو محنت کے بغیر آسانی سے ہاتھ آئے آدمی کو ذہنی' روحانی اور جسمانی طور پر بھی کمزور کر دیتی ہے تھانوں میں مجرموں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لاکھوں روپے جو انہوں نے بینک ڈکیتی' جعلسازی یا کاروں کی چوری سے حاصل کئے تھے ہوئے' شراب اور عیاشی میں صرف ہو گئے۔ بے جواز دولت مندی اور جاں گسل مفلسی' دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور دونوں انسان کو حریص' خود غرض اور اکثر سفاک بنا دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں مفلسی کا جو کلچر فروغ پارہا ہے اس سے عہد برا ہونے کے لئے ہمارا دانش ور طبقہ ' ہمارا ادیب اور شاعر' افسانہ نگار اور ڈراما نویس کیا کر رہا ہے ؟ کیا اس صورت حال پر وہ ملول اور دل گرفتہ ہوتا ہے ؟ اس بارے میں سوچ کر اداس ہوتا ہے ؟ اور کیا اس رنج و کرب کا اظہار اس کی تحریروں میں ملتا ہے ؟ ادیب و شاعر بلکہ ہر تخلیق کار کا غم ایک تو خالصتاً" نجی ہوتا ہے ' دوسرا کچھ وہ جو سماج کی ناہمواریوں اور ماحول کے جبر کی پیداوار ہوتا ہے لیکن تخلیق کار اسے اس شدت سے محسوس کرتا ہے کہ اس کو اپنی ذات کا المیہ اور اپنی روح کا زخم بنالیتا ہے ایک تخلیقی فنکار اسی بنا پر عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے کہ جس اذیت ناکی سے دوسرے لوگ لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں وہ اس کو اپنا ذاتی غم سمجھتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب معاشرے کی قیادت دانشوروں اور فلسفیوں کی گرفت سے نکل کر سائنس دانوں اور سیاست کاروں کے ہاتھوں میں چلی گئی یہ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں رونما ہونے والی سائنس اور ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی کا زمانہ تھا جب اقتدار اور اراضی کی تقسیم کا مرحلہ آیا تو قانون دانوں' مدبروں اور سیاست کاروں نے اختیارات سنبھال لئے اور دنیا کے نقشے پر نئی لکیریں کھینچی جانے لگیں۔ اب ہم ایک اور مرحلے سے دوچار ہیں ' یہ ہماری یعنی پاکستان کے وجود اور اس کے عوام کی سلامتی اور آزادی کا مرحلہ ہے ٹیکنالوجی کی ترقی اور سیٹلائٹ کی بالادستی نے اقوام عالم کو ایک ہی چھت کے نیچے لاکھڑا کر دیا ہے زمین کا عرصہ بڑھتی ہوئی آبادی کے مقابلے میں تنگ ہوتا جارہا ہے وسائل پسماندہ قوموں کے ہاتھوں سے نکل کر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ترقی پذیر قوموں کے سپرد ہوتے جارہے ہیں یہ ہمارا مفلسی کا کلچر عیش کوشی کی خواہش اور دولت و ثروت کی نمائش' ہمارے کیا کام آئے گی اور کتنے دنوں ساتھ دے گی ؟

ہم جو اسی فیصد ناخواندہ آبادی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں ہم جو غیر ملکی قرضوں کے مارے نڈھال اور اپنی پیداوار کا بڑا حصہ قرضوں کی قسطیں ادا کرنے پر اٹھا رہے ہیں ہم جو دوسروں کو لوٹ کر اور انہیں جہل و افلاس میں مبتلا کرکے نہایت خود غرضی سے اپنا اپنا گھر بھرنے پر تلے ہوئے ہیں ' ہم جو چھوٹے چھوٹے تعصبات میں گرفتار اور کبھی لسانی اور نسلی ' کبھی مذہبی اور علاقائی اختلاف کو ہوا دے کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں کیا ان خطرات کو یکسر فراموش کر چکے ہیں' جو مغرب اور اب انتہائی ترقی یافتہ متمول مشرقی اقوام کی صنعتی پیش قدمی سے پیدا ہو سکتے ہیں ' کیا ہمیں سرحد کے دوسری طرف سر اٹھانے والی دوسری طرح کی بنیاد پرستی کا بھی ڈر نہیں ' جو پورے ایشیا میں " ہندو اسٹیٹ " بنانے کے خواب دیکھ رہی ہے ہمارا خیال ہے کہ اس وقت قومی سلامتی اور بقا کی جنگ میں سب سے موثر کردار ہمارے ذرائع ابلاغ کو ادا کرنا ہوگا ' یہ ذرائع ابلاغ اشتہارات کا لالچ دے کر بدکار لوگوں سے ان کا روپیہ اور قیمتی وقت اور ذہنی سکون چھیننے والے افراد کے تصرف میں نہیں ہونا چاہیے ' ان پر ہمارے دانشوروں ' سماجی علوم کے ماہروں ' ہمارے ادیبوں ' شاعروں اور تخلیق کاروں کا حق ہے لیکن یہ حق جتانے سے پہلے انہیں اپنی تخلیقات سے ذہنی بیداری کا وہ کام لینا ہوگا جو سرسید' حالی ' اقبال اور ان کے بعد آنے والے شاعروں اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات سے انجام دیا آج معاشرہ جب احساس محرومی ' کرب ' اضطراب اور بے یقینی میں مبتلا ہے ان کیفیات کا اظہار اس کی تحریروں میں بھی ہونا چاہیے۔

ایک شاعر' ایک تخلیق کار ہمیشہ حالت جنگ میں ہوتا ہے یہ جنگ سب سے پہلے وہ اپنے اندر لڑتا ہے

اورنگ زیب قاسمی

ماحول کی ناہمواریوں معاشرے کے جہل' تعصبات' منافرت ' غیر انسانی رویوں ' ہوسناکیوں اور سفاکیوں کو دیکھ کر اس کے وجود میں یہ جنگ شروع ہو جاتی ہے وہ ان خرابیوں کو برداشت کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور اس کا اظہار کبھی نعروں' کبھی استعاروں میں اپنے طریقے سے کرتا ہے' اس انکار کو وہ اپنے فن کی بقا کے لئے ضروری سمجھتا ہے اگر وہ معاشرے کے جبر' بے اعتدالیوں اور بے انصافیوں سے ہار مان کر صرف اپنی ذاتی محرومیاں سمیٹ کر بیٹھ جائے تو پھر تخلیق کار کاہے کو ہوا ۔ ذاتی غم تو سبھی کے ہیں۔ جب ہماری ذات نہ ہوگی ' تو یہ غم بھی نہ ہوں گے لیکن جب تک انسانی معاشرہ موجود ہے ' انسان کی ناآسودگیاں' محرومیاں اور ناکامیاں کسی نہ کسی صورت میں نمودار ہوتی رہیں گی اور تخلیق کار ان سے نبرد آزما ہوتا رہے گا۔

(" افکار" کراچی)

یہ سیہ وقتی فروغ شب تلک کی بات ہے

برصغیر ایک بار پھر مذہبی جنون اور منافرت کی آندھیوں کی زد میں ہے۔ بھارت کے صوبے اتر پردیش کے صدر مقام لکھنؤ کے مضافات کی آبادی ایودھیا میں قائم مسلمانوں کی ایک عبادت گاہ کو جو بابری مسجد کے نام سے موسوم ہے' شہید کرنے کے نام پر ہندو فرقہ پرستوں نے ہندوستان بھر میں جو طوفان اٹھایا ہے اس کے نتیجے میں وہاں ایک ہزار سے زائد افراد مارے گئے اور پاکستان اور بنگلہ دیش میں اس کا شدید ردعمل ہوا۔ یہ جنون اور اس کے ردعمل کا وسیع اور پرپیچ ہوتا ہوا دائرہ تینوں ملکوں میں مذہبی بنیاد پرستی کے عفریت کو انسان دوستی کا خون پلا کر زیادہ توانا اور مہیب بنا رہا ہے۔

سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ان ممالک میں کٹر فرقہ پرست تعداد کے لحاظ سے بہت مختصر ہیں۔ ان کی سیاسی تنظیموں کو کبھی بھی بہت زیادہ عوامی پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی۔ ان کے رہنما ایسے ذہنی بونے ہیں جو عصری تقاضوں سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ انکے پاس جہالت' بے روزگاری' بھوک' افلاس اور پسماندہ آبادی کے مسائل کا' جن میں سارے برصغیر کے عوام مبتلا ہیں' نہ کوئی شعور ہے نہ حل۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ یہ لوگ بار بار مذہبی منافرت کا طوفان کھڑا کر دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کس طرح عوام کی بڑی اکثریت کو' جن ان کی حامی نہیں ہے' گمراہی بنائے ہوئے ہیں۔

ہماری دانست میں ان کی قوت کا ایک سبب اس کثیر آبادی کی بے عملی میں پنہاں ہے جو غیر فرقہ پرست اور رواداری کی حامل ہے اور اس بے عملی کی ذمہ داری روشن خیال اور انسان دوستی کی دعویدار تنظیموں اور اداروں کی کج روی پر ہے۔ یہ تنظیمیں اور ادارے اپنے تمام تر دعووں کے باوجود مذہبی اور فرقہ وارانہ کٹرپن کو اپنا حقیقی ہدف قرار دینے' اس کی تخفیف اور تحلیل کو اپنا نصب العین بنانے اور اس سمت کاوش کو اپنا پروگرام بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ ذاتی تحفظ و بقا سے بھی بڑھ کر وقتی مفاد پرستی کے باعث ہمارے معاشرے ان رہنماؤں سے عاری ہیں جنہوں نے اس قابل نفرت انسان دشمن رجحان کو چیلنج کر سکنے کی جرأت رندانہ کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ برصغیر کے صوفی سنتوں کی روایت تھی مگر طریقت کے نشے میں سرشاری اور اہنسا کے اصول کی پاسداری کے لاکھوں دعویداروں' مدعیوں میں سے کوئی بھی تو نہ نکلا جو فضیلت کی اس پر خطر راہ کا راہی بنتا۔

بظاہر ہندوستان' پاکستان اور بنگلہ دیش میں آج کی فرقہ پرستانہ Polarisation اسی تفریق کا تسلسل ہے جو ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کا جواز بنی تھی۔ یہ درست ہے کہ فرقہ پرستی کی زہرناکی محض برصغیر تک ہی محدود نہیں ہے دنیا کے کئی دوسرے خطے بھی اس آزار میں مبتلا ہیں' مگر باقی دنیا میں عموی طور پر نسل'

اورنگ زیب قاسمی

زبان اور رنگ انسانوں کے مابین تفریق کے نمایاں اسباب کے طور پر نظر آتے ہیں۔ وہاں مذہبی اور فرقہ وارانہ تقسیم زیر سطح رجحان کے طور پر تو ضرور موجود ہے مگر قتل و غارت کا واحد سبب نہیں بنتی۔ اس کے برعکس برصغیر میں بیسویں صدی میں اور خصوصاً گذشتہ ۶۰ سال میں لاکھوں انسان اس عفریت کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا یہ مرض لاعلاج ہے یا اس کا کوئی حل ممکن ہے؟ ان سوالات اور ایسے ہی دیگر متعلقہ سوالوں کے جوابات کے لئے گہرے اور وسیع مطالعے درکار ہیں۔ اس ضمن میں سینکڑوں تحقیقی مقالے اور کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور آئندہ بھی تفہیم کی یہ عملی کوششیں جاری رہیں گی۔ ظاہر ہے کہ ہم اس مختصر اظہار میں اس مسئلے کا نہ تو تفصیلی تجزیہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہمارے لئے اس کا کوئی شافی حل پیش کرنا ممکن ہے تاہم چند باتیں اور پہلو غوروخوض کے لئے پیش خدمت ہیں۔

برصغیر کی آبادی کی اکثریت بے پڑھی لکھی اور علم سے بے بہرہ ہے۔ ۱۹۴۷ء میں نو آبادیاتی تسلط سے آزادی کے باوجود اس سمت میں پیش رفت نہیں ہوئی۔ (جبکہ اس سے بھی بعد میں آزاد ہونے والے بہت سے ممالک میں عموی تعلیم کا اوسط ۹۰ فیصد سے بڑھ چکا ہے۔)

یہاں آبادی کی بڑی اکثریت غربت کی سطح سے بہت نیچے جانوروں کے انداز کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اس کی سوچ اور عمل دونوں زندہ رہنے کے لئے پیٹ بھر خوراک کے حصول کی خاطر جبلی حد تک محدود اور تحفظ کی گروہی جبلت کے محدودات میں اسیر ہیں۔

زیادہ تر لوگ ابھی تک زراعت سے متعلق ہیں اور بڑی حد تک زرعی نظام کے جبری نظام فکر اور سماجی بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس اقلیت میں بھی جو زراعت پر اپنی معاش کا دارومدار نہیں رکھتی اور دیہی علاقوں سے بودوباش ترک کر کے شہروں میں آباد ہو چکی ہے' ایک بڑی اکثریت ابھی تک زراعتی عہد کے نظام ایقان' سماجی رسوم و قیود اور امورونواہی کے تصوراتی چوکھٹے کے تعینات (توہم پرستی' ماورائی' الفطرت' اساطیر پر ایمان قدرت کے اندھے جبر کے سامنے سپراندازی) سے اپنے اذہان کو مکمل طور پر آزاد نہیں کر پائی ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ دنیا کے ترقی یافتہ حصوں کے تکنیکی فروغ کے ثمرات سے آشنائی نے ان پسماندہ معاشروں میں صدیوں سے مستحکم نظام اقتدار کی چولیں ہلا ڈالی ہیں اور انہیں ڈانواں ڈول کر دیا ہے۔ جس کے ردعمل کے طور پر وہ اپنے تحفظ' استحکام اور بقاء کے لئے زیادہ شدت سے ماضی کے اقتداری نظام کی بوسیدہ چھتری میں پناہ تلاش کرتے ہیں۔

ہماری دانست میں یہ وجوہ ہیں جن کی بناء پر موقع پرست و مفاد پرست سیاسی بازیگر برصغیر کی کثیر آبادی کو اپنے 'فریب نظر بندی' میں مبتلا کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو مذہب کے راستے اس دکھ بھری زندگی سے نروان' فرقہ واری گروہ بندی کے ذریعے تحفظ اور ماضی پرستی کے وسیلے سے استحکام کی جھوٹی نوید دے کر اور بہتر مستقبل کے خوش آئند خواب دکھا کر ان کی پیدا کردہ دولت کو لوٹتے چلے جانے کا استحقاق حاصل کئے رہیں۔ ان کی پشت پناہی کی بنیاد پر ریاست میں اقتدار کے سرچشموں پر قبضہ کئے رکھیں اور ان کے خوف کی جبلت کو مہمیز کئے رکھنے کے لئے غیر مماثل گروہوں سے انہیں برسرپیکار رکھیں تاکہ وہ اپنے تحفظ و بقاء کی خاطر ان کی رہنمائی اور سربراہی کے شکنجے میں جکڑے رہیں۔

ان سیاسی قسمت آزماؤں کے کھیل کھیلنے کے لئے ہندوستان میں ہندو مسلم اور سکھ تفریق کا میدان ایک

بہترین موقع فراہم کرتا ہے جبکہ پاکستان میں یہ کام ہندوستان اور ہندو دشمنی کے ساتھ ساتھ خود مسلمانوں کی اندرونی فرقہ واری تقسیم کی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر کیا جاتا ہے۔ فرقہ واری منافرت کا یہ چار ان کا سیاسی حربہ اس لئے ہے کہ ان کے پاس ریاستی اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے اور اپنا تابع بنانے کے سوا کوئی اور راہ عمل موجود نہیں ہوتی ہے ان کے پاس عوام کے حقیقی مسائل یعنی غربت' جہالت اور سماجی پسماندگی کے حل کے لئے نہ تو کوئی منصوبہ موجود ہیں اور نہ یہ ان کے بتانے پر قادر ہیں۔ ان کا انتہائی مقصد اپنے آج کے مفادات کو قائم رکھنے اور مستقبل میں ان کو مستحکم کرنے کے سوا کچھ اور نہیں۔ انہیں بدلتی اور ترقی کرتی ہوئی دنیا میں اپنے موجودہ مفادات خطرے میں نظر آتے ہیں۔

زراعتی نظام فکر کی بیڑیوں کے ٹوٹنے سے بتدریج خود آگاہ اور خود نگر ہوتے ہوئے عوام انہیں ان کی اپنی قائم کردہ جکڑ بندیوں سے نکلتے ہوئے اور ان کے استحصالی استحقاق کے آئینوں کو چکنا چور کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ ہر ممکن ذریعے سے عوام الناس کو اپنے مخصوص تصور مذہب اور فرقہ واریت کی اندھیری کال کوٹھری میں مقید رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ان کا آزمودہ اور پر اثر نسخہ فرقہ وارانہ منافرت کا خطرناک زہر ہے جسے وہ سماج کی شریانوں میں داخل کرتے رہتے ہیں۔

برصغیر کے ممالک میں نہ صرف یہ کہ خود ساختہ مذہبی ٹھیکیدار سیاستدانوں نے بلکہ ان کی دیکھا دیکھی دیگر سیاسی قسمت آزماؤں نے بھی اسی طریق کو سہل الحصول اور فوری نتائج کا حامل دیکھتے ہوئے بھی ڈھکے کھلے طریقہ کار کے طور پر اپنایا۔ انجام ہمارے سامنے ہے۔

بھارت ' جہاں آزاد ریاست کے بانی مہاتماؤں نے مذہبی اور فرقہ واری تقسیم سے بالا تر ہونے کے دعوے کے ساتھ سیکیولرازم کو نو آزاد مملکت کی بنیاد قرار دیا تھا نہ صرف اپنے وجود کے پورے دور میں مذہبی اور فرقہ وارانہ فسادات کی بھٹی میں جلتا رہا ہے بلکہ آج اس مقام پر آپہنچا ہے کہ جہاں صرف سیکیولرازم ہی نہیں خود ریاست کے تاروپود بکھر جانے کا شدید خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

پاکستان ' جس کی تشکیل کی ذمہ دار سیاسی جماعت مسلم لیگ نہ صرف یہ کہ مذہبی جماعت ہونے کی دعوے دار نہیں تھی بلکہ جس کی سیاسی جدوجہد مسلمہ مذہبی تنظیموں کے ساتھ تضاد اور ٹکراؤ سے عبارت تھی اور جس کے بانی قائداعظم نے پہلی دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس میں پاکستان کے شہریوں کے مابین مذہبی بنیاد پر ہر تفریق کی واشگاف الفاظ میں نفی کر دی تھی " آج ہندو دشمنی کے ساتھ ساتھ ہر نوعیت کی فرقہ وارانہ منافرت کی آماجگاہ ہے قادیانی تو غیر مسلم قرار دیے جانے کے بعد اچھوت بنا دیے گئے تھے اب معاملہ اس سے بھی بہت آگے نکل گیا ہے۔

سنی' شیعہ' بریلوی' سپاہ صحابہ' دیوبندی اور اہل حدیث فرقے متشدد اور مسلح تنظیموں کی شکل میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔

اکثر مقامات پر باہمی جھگڑوں اور فسادات کے نتیجے میں بہت سے لوگ مارے گئے اور املاک تباہ ہوئیں۔

ریاستی اداروں میں فرقہ پرست مذہبیت کے بڑھتے ہوئے اثرورسوخ کے نتیجے میں جو " شرعی قوانین" اور "شرعی عدالتوں" کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے' مذہبی اقلیتوں میں عمومی طور پر احساس عدم تحفظ بڑھتا جارہا ہے۔

آج ملک میں کوئی موثر سیاسی جماعت ایسی نہیں جو کھلے طور پر سیکیولرازم کو اپنی سیاست کی بنیاد قرار دیتی اور

اورنگ زیب قاسمی

اس پر اصرار کرتی ہو۔ یہ مذہبی فرقہ وارانہ جنون اس نسلی لسانی اور علاقائی عصبیت پر مستزاد ہے جس نے عوام کو تقسیم اور ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر رکھا ہے۔

برصغیر کے ممالک باہمی اور اندرونی تضاد' منافرت اور تصادم کے آتش فشاں کے دہانے پر آپہنچے ہیں جو پوری شدت سے پھٹ پڑنے پر ہے۔ اس کے نتیجے میں جو تباہی ہو گی وہ ناقابل اندازہ بھی ہے اور ناقابل تصور بھی۔ اس نوبت تک پہنچنے کی ساری ذمہ داری ان ممالک کے حکمران گروہوں کی بے بصیرت سیاسی حکمت عملی پر ہے جو اپنے ذاتی اور محدود گروہی مفادات کی خاطر عوام کو تقسیم در تقسیم کرنے کی پالیسیوں پر عمل پیرا رہے ہیں۔ اس سیاست کی جڑیں تو اسی جاگیردارانہ' زمیندارانہ پیداواری اور سماجی نظام کی ذہنیت میں پنہاں ہیں جس سے ہم ابھی تک نجات حاصل نہیں کر پائے ہیں لیکن عالمی سامراجی ریشہ دوانیاں بھی اس رجحان کی آبیاری کرنے اور مضبوط بنانے کی ذمہ دار ہیں ان کا مفاد اسی امر میں ہے کہ عوام نہ صرف بٹے رہیں بلکہ آپس میں دست و گریباں بھی رہیں تاکہ حکمرانی کے اداروں پر ان کے لئے پالکوں کی گرفت قائم اور مستحکم رہے اور ان ممالک کی سیاسی و معاشی پالیسیاں سامراجی معاشی و سیاسی عزائم کی تابع رہیں۔ اس سیاسی حکمت عملی کا طرہ امتیاز عدم رواداری ہے۔

انسانی معاشرے باہمی رواداری اور احترام حقوق کی اساس پر ہی قائم ہوئے اور آج بھی فرد اور معاشروں کے مہذب ہونے کی پہچان یہی ہے کہ ان میں رواداری کے رویے اور روایات کتنی اور کس حد تک مستحکم ہیں۔ اس معیار پر پرکھا جائے تو آج برصغیر میں تہذیب اور انسانیت دشمنی کی قوتیں ابھار پر ہیں جو یہاں کے معاشروں کو از منہ وسطیٰ کے اندھیروں کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ اب اہل دانش اور سوچنے سمجھنے والے افراد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس خوفناک سیلاب کے سامنے بند باندھیں۔ فرقہ واریت اور عصبیت کی قوتیں بظاہر متصادم ہوتے ہوئے بھی ایک ہی مقصد کی حامل ہیں۔ ان کے طریقہ ہائے کار اور پالیسیاں ایک جیسی ہیں۔ ان کے اقدامات ایک دوسرے کو مضبوط اور طاقتور بناتے ہیں۔ ان کے مقابلے کے لئے انسانیت اور تہذیب نواز قوتوں کو بھی اپنی اپنی جگہ رہتے ہوئے ایک دوسرے کی حمایت اور پشت پناہی کرنا ہو گی۔ انہیں شاعر کا یہ پیغام عام کرنا ہوگا

تم کسی مذہب کے ہو اور ہم کسی مسلک کے ہوں
زندگی تو اک نصاب مشترک کی بات ہے

پاکستان کے سیاق و سباق میں انہیں نہ صرف اپنے ملک میں مذہبی و فرقہ وارانہ تنگ نظری کے خلاف علمی ' فکری اور عملی میدانوں میں سرگرم عمل ہونا ہوگا اور باہمی رواداری کے رویوں کو مستحکم بنانا ہو گا بلکہ بھارت میں سرگرم عمل فراخ دلی' مذہبی رواداری اور شرف انسانیت کے فروغ کے لئے سرگرم عمل قوتوں کی حمایت کی اخلاقی ذمہ داری بھی اٹھانا ہو گی۔

اندھیرے کی قوتیں بظاہر کتنی ہی طاقتور کیوں نہ نظر آتی ہوں وہ تاریخ کے بہاؤ سے متصادم ہیں۔ اکیسویں صدی کی دہلیز پر یہ امر طے شدہ ہے کہ ان کا خاتمہ مسلم اور قریب ہے لیکن بھڑکتے ہوئے چراغ کی طرح اپنے خاتمے سے پہلے یہ انسانیت کشی کی جس کاوش میں مصروف ہیں اس کا سد باب کرنا روشن خیال' انسان دوست اور تہذیب پرور اہل فکر و نظر کا فرض منصبی ٹھہرتا ہے۔ ہم تو یوں جانتے ہیں کہ:

پھر شفق کے رنگ لہرائیں گے بام صبح پر
یہ سیہ رتی فروغ شب تلک کی بات ہے

("ارتقا" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

زاہدہ حنا

دشت خیال

مئی کا مہینہ برصغیر کی تاریخ کے کسی بھی طالب علم کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے آج سے ۱۳۶ برس پہلے اسی مہینے کی دسویں تاریخ کو میرٹھ سے اس عظیم واقعے کا آغاز ہوا تھا جس کی دھمک برصغیر کے طول و عرض میں محسوس کی گئی اور جسے آج بھی ہم ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کے بارے میں لکھتے ہوئے گریہ ناک ہو جانا ہماری مجبوری ہے ہم وہ ہیں کہ جن کے خاندانوں نے حسب استطاعت اور حسب توفیق خون کے نذرانے دیئے اور جس پر ہم ایسے ہزاروں' لاکھوں افراد اپنا سر فخر سے بلند کرتے ہیں۔ اپنے اپنے شہیدوں کا نام غرور سے لینے کے ساتھ ہی اگر ہم تاریخ کے طالب علم ہیں تو یہ بھی ہماری مجبوری ہے کہ اس واقعہ عظیم کو ماضی' حال اور مستقبل کے تناظر میں دیکھیں اور جب ہم ایسا کرتے ہیں تو ایک طرف برصغیر کا چند صدیوں پر پھیلا ہوا حالیہ ماضی ہمیں دل گرفتہ کرتا ہے وہیں حال تشویش میں مبتلا کرتا ہے اور مستقبل کے بارے میں بے شمار وسوسے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

تاریخ سہولت کی خاطر صدیوں اور سنین میں تقسیم کی جاتی ہے لیکن درحقیقت یہ واقعات کے ایک ایسے بہاؤ کا نام ہے جس میں اٹھنے والی ہر لہر بظاہر کسی ایک خاص لمحے پر سر اٹھاتی ہے لیکن اس کا آغاز عموماً صدیوں پہلے ہو چکا ہوتا ہے۔

برصغیر پر برطانوی تسلط کے بارے میں ہمارے یہاں عموماً ایک بہت جذباتی رویہ پایا جاتا ہے ہم انگریزوں کو برابھلا کہتے نہیں تھکتے جو تاجر کے روپ میں ہمارے ساحلوں پر اترے' جنہوں نے ہمارے شہنشاہوں سے تجارتی مراعات حاصل کیں اور پھر دیکھتے دیکھتے ہمارے آقا بن بیٹھے۔ یہ تمام باتیں حرف بہ حرف درست ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اور بھی بہت سے حقائق ہیں اور جب تک تمام باتوں کا معروضی انداز میں جائزہ نہ لیا جائے اس وقت تک ہم اپنے حال اور مستقبل کو مستحکم بنیادوں پر غیروں کے تسلط سے آزاد دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ہم یہ سوچنے کی زحمت ذرا کم ہی کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کا سقوط آخر ممکن کیوں کر ہو سکا؟ ہم اس پر بھی توجہ نہیں دیتے کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے ہزاروں میل دور بسنے والی ایک غیر قوم کے مٹھی بھر افراد کو وہ طاقت بخش دی کہ انہوں نے ہمیں ہماری ہی سرزمین پر شکست دے دی۔ ہم اس ضمن میں اپنے حکمرانوں کی سیاسی غلطیوں' فوجی کمزوریوں اور انتظامی ناکامیوں پر غور کرنے کے بجائے ان کے شاندار دربار' ان کے شاہانہ جلوس اور جنون کی حد تک پہنچی ہوئی ان کی شاہ خرچیوں کا ذکر نہایت فخر سے کرتے ہیں۔

معروضی حقیقت یہی ہے کہ ۱۸۵۷ء میں دلی کے سقوط کا آغاز اس سانحے کے رونما ہونے سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ مغلوں کے زوال کی تمام تر ذمہ داری عموماً" مرہٹوں اور انگریزوں پر ڈال دی جاتی ہے لیکن ایسا کرنے والے اس حقیقت سے آنکھ بند کر لیتے ہیں کہ زوال آمادہ مغل سلطنت کو اپنی بنیادوں سے ہلا دینے میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے بھی بڑا کردار ادا کیا ہے۔

۱۷۵۷ء میں پلاسی کے مقام پر سراج الدولہ کو جو شکست ہوئی اور برطانوی سامراج جس طور پر مستحکم ہوا' اس کی تمام ذمہ داری میر جعفر کی غداری کے سر ڈال کر ہم اپنے دل کو تسکین دیتے ہیں لیکن اس تاریخی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اس شکست کے صرف سات برس بعد ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر نواب بنگال میر قاسم' نواب شجاع الدولہ اور شہنشاہ ہند شاہ عالم ثانی کے لشکر جرار اور ان کی متحدہ قوت کو انگریزوں نے مٹھی بھر برطانوی افسروں اور چند ہزار کرائے کے سپاہیوں سے شکست فاش دے کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ہندوستانی سلطنت کے دن گنے جا چکے اور ہمارے پاس ان کے مقابلے کا کوئی بھی جرنیل نہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی مکمل ناکامی کی وجوہ جاننے کے لئے ہمیں ان عمومی رویوں کا جائزہ لینا ہو گا جو صدیوں سے ہمارے مشرقی معاشرے کا روز مرہ ہیں اس بارے میں آہ و زاری کرتے ہوئے ہمیں اس معاملے کو اس کے آغاز سے دیکھنا چاہیے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کہ ہم اپنی آزادی اور خود مختاری کو کن عیش کوشیوں کے عوض غیروں کے ہاتھوں گروی رکھتے آئے ہیں۔

تاریخ کی عجب ستم ظریفی ہے کہ برصغیر جس کے مسلمانوں اور ہندوؤں' دونوں ہی نے اپنی عورتوں کو پس دیوار رکھا' اسی برصغیر کی قسمت کے بنیادی فیصلے دو عورتوں نے کئے۔ برصغیر سے تجارت کا فرمان ملکہ الزبتھ اول کے نوک قلم سے نکلا اور اس کی غلامی پر مہر تصدیق ملکہ وکٹوریہ نے ثبت کی۔ یہ ملکہ الزبتھ اول تھی جس نے ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو لندن کے چند تاجروں کو ایک شاہی فرمان کے ذریعے یہ اجازت دی کہ وہ دی آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم کر سکتے ہیں اور ہندوستان سے تجارت کا آغاز کر سکتے ہیں۔

ہم مغل برصغیر کے جاہ و جلال اور شان و شکوہ پر نظر ڈالتے ہوئے جب دوسری اقوام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو وقائع نگار ہمیں بتاتے ہیں کہ ۱۶۰۰ء سے ایک سو سات برس پہلے ۱۴۹۲ء میں تو آبادیاتی نظام کا آغاز ہو چکا تھا اور تمام مغربی اقوام شاندار مہمات میں مصروف تھیں۔ ان مہمات کا مقصد نئی سرزمینوں پر اپنا فوجی تسلط قائم کرنا اور سمندری راستوں کے ذریعے ساری دنیا سے تجارت کرنا تھا۔ ایک طرف ان کے تجارتی بحری بیڑے دنیا کے سات سمندروں کی سیاحی کر رہے تھے تو دوسری طرف ان کے بڑے بڑے شہروں میں بینک اور چیمبر آف کامرس قائم ہو رہے تھے مارسیلز میں پہلے چیمبر آف کامرس کی داغ بیل پڑتی ہے ۱۶۰۰ء میں ایمسٹرڈم بینک قائم ہوتا ہے۔ ۱۶۰۰ء میں ہی ستر ہزار پونڈ کے خطیر سرمائے سے ایسٹ انڈیا کمپنی وجود میں آتی ہے یورپ میں بینکاری نظام اس تیزی سے ترقی کرتا ہے کہ ۱۶۰۸ء میں " چیک " سے لین دین رائج ہوتا ہے اور ۱۶۱۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی پہلی مرتبہ " شیئرز " (حصص) کا اجراء کرتی ہے۔

افراد مہم جوئی پر نکلتے ہیں اور لندن سے جاپان جا پہنچتے ہیں۔ ۱۶۰۰ء میں ایک انگریز انجینئر اور جہاز راں ولیم ایڈمز ٹوکیو (پرانا نام یدو) پہنچتا ہے۔ اس وقت کے شہنشاہ جاپان کے دربار میں صنعت جہاز سازی کا مشیر و نگراں مقرر ہوتا ہے اور جاپانیوں کے لئے ترقی کی راہیں کھولتا ہے۔ ایجادات کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور ۱۶۰۰ء میں ہی

اورنگ زیب قاسمی

ایک طرف پر گیلیلیو ٹیلسکوپ ایجاد کرتے ہیں اور دوسری طرف جرمن میجک لینٹرن۔ غرض زندگی کے ہر شعبے میں سارا یورپ ایک ہماہمی' ایک سرشاری اور مہم جوئی میں مبتلا ہے۔

اب اگر ہم اسی زمانے میں اپنی تاریخ کی ورق گردانی کریں تو شہنشاہ اکبر برصغیر سے باہر اپنی نوآبادیات قائم کرنے کی فکر میں مبتلا ہونے کی بجائے اپنے نافرمان ولی عہد شہزادہ سلیم سے لڑائیاں لڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ ادھر جرمنی میں اور مغرب کے دوسرے ملکوں میں روزنامے اشاعت پذیر ہو رہے ہیں' عوامی شعور کو بیدار کر رہے ہیں۔ سائنس اور کلیسا کے درمیان ہونے والی لڑائی میں سائنس کا ساتھ دے رہے ہیں' یورپ میں دانشوروں اور سائنس دانوں کی سرپرستی ہو رہی ہے اور ہمارے یہاں ۱۶۰۲ء میں شہنشاہ اکبر کا اکلوتا بیٹا اور چہیتا ولی عہد' اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم اور دانشور' شیخ ابوالفضل کو قتل کراتا ہے' باپ کی ناراضگی مول لیتا ہے اور پھر اپنی " تزک " میں اس قتل پر فخر کا اظہار بھی کرتا ہے۔

۱۶۱۰ء میں برصغیر کا شہنشاہ جہانگیر نیل گائے اور شیر کے شکار میں مصروف تھا اور عین اسی وقت ہندوستان کی سرزمین پر قدم جمانے کے لئے اور تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کے لئے انگریزوں اور پرتگیزی فوجوں اور بحریے میں لڑائیاں ہو رہی تھیں اور مغل شہنشاہ کو اس کی پروا نہ تھی کہ اس کی مملکت میں دوسری قوموں کے فوجی کیا کر رہے ہیں اور ایک دوسرے سے دست و گریباں کیوں کر ہیں۔

۱۶۱۱ء میں جب شہنشاہ جہانگیر اپنی "تزک" میں ایک دن میں ۳۳۰ مچھلیوں کے شکار کا اندراج کر رہا تھا اور ایک سائیس اور دو کہاروں کے سامنے آجانے پر نیل گائے کے بھڑک کر بھاگ جانے کی سزا میں سائیس کو قتل کروا رہا تھا اور دونوں کہاروں کے پیر کٹوا کر انہیں نشان عبرت کے طور پر گلی گلی پھروا رہا تھا' عین اسی برس انگلستان میں پارلیمنٹ اور شاہ جیمز اول کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی ہو رہی تھی۔

برصغیر کے حکمران اور امراء اپنی دولت شان و شوکت کے مظاہروں اور قصیدہ خواں شعراء پر لٹا رہے تھے جبکہ یورپ کے امراء سائنس دانوں اور عالموں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ اس سرپرستی کے ثمرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں انگلستان میں ایجادات اس تیزی سے شروع ہوئیں کہ ۱۶۲۴ء میں انگلستان میں " پیٹنٹ " کے قوانین کا اجراء ہوا اور سرکاری طور پر موجدوں کے حقوق کا تحفظ کیا جانے لگا۔

ہمارے مبلغین آج بھی فروعی معاملات پر بحث میں مصروف رہتے ہیں لیکن عیسائی مبلغین ۱۶۲۴ء میں ایک مبلغ انٹونیو ڈی آندراڈے آگرہ میں اپنے " مشن " کی عمارت سے نکل کر ہمالیہ اور تبت کی کوہ پیمائی اور اس علاقے کے بارے میں جغرافیائی اور موسمیاتی معلومات اکٹھا کرنے کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔

غرض ۱۶۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک واقعات اور معاملات کا ایک ہجوم ہے اور جب ہم ان معاملات کا موازنہ اس زمانے کے برصغیر سے کرتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ ہمارے صناع' کاریگر' معمار' نجار اور ہنر کار انگلستان کے ہنروروں سے کم نہ تھے لیکن مسئلہ ان کی سرپرستی اور درست سمت میں ان کی رہنمائی کا تھا۔ ہمارے معمار ایک شہنشاہ کے اشارہ ابرو پر سترہویں صدی میں " تاج محل " ایسا شاہکار اس کی ذاتی تسکین کے لئے تعمیر کر رہے تھے اور مغرب کے معمار تیرہویں اور چودھویں صدی میں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں سے الحاق شدہ بیشتر ان کالجوں کی تعمیر مکمل کر چکے تھے جن میں داخلہ ملنے کے خواب ہمارا ہر ذہین نوجوان آج بھی دیکھتا ہے ۔ گویا مسئلہ ترجیحات کا تھا ہمارے شہنشاہ اپنے مقبرے یا محلات تعمیر کراتے تھے ان کے بادشاہ

محلات کے ساتھ تعلیمی ادارے ' سائنسی تجربہ گاہیں اور کتب خانوں کی تعمیر پر بھی توجہ دیتے تھے۔

ہندوستان میں بڑے اور قابل جرنیلوں کی کمی نہ تھی لیکن ان قابل اور جری جرنیلوں کی کمان میں لڑنے والی فوج غیر پیشہ ور غیر منظم افراد پر مشتمل ہوتی تھی جو تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود برطانوی جرنیلوں کی کمان میں لڑنے والی منظم اور تربیت یافتہ دیسی فوج سے شکست کھا جاتی تھی۔ انگریزوں نے برصغیر کی سرزمین پر قدم رکھنے سے لے کر ۱۸۵۷ء میں لال قلعے پر اپنا پرچم لہرانے تک ہر آن میں اس بات کا احساس دلایا کہ ان کی بحری بالادستی نے برصغیر میں انھیں اپنی گرفت مضبوط کرنے میں بے پناہ معاونت کی۔ اور یہ بھی کہ آلات حرب اور دفاعی سائنس میں ان کا ہمارا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ ان کے فوجی اور سول افسران قواعد و ضوابط کے مکمل طور پر پابند ہوتے اور یہی ڈسپلن وہ اپنی دیسی فوج کو بھی تعلیم کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ ۱۷۵۷ء' ۱۷۶۴ء' اور ۱۸۵۷ء میں جب بھی برصغیر کے مفادات کا تحفظ کرنے والی غیر منظم فوج 'کرائے کے منظم اور تربیت یافتہ دیسی فوجیوں کے سامنے آئی تو ٹھہر نہ سکی۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں انگلستان جس صنعتی انقلاب سے دوچار ہوا اور وہاں علم و دانش اور سائنس کا جو ابھار ہوا' اس کے سبب اس کے جرنیلوں کی صمات' اس کے سائنس دانوں کی فتوحات کے سامنے گرد ہو گئیں۔ نوبل انعام جس کا اجراء ۱۹۰۱ء میں ہوا' اسے حاصل کرنے والے ۱۱ سائنس دان اور ۹ ادیب ۱۸۵۷ء' سے کئی برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ ان میں قطع نظر ۱۸۵۷ء کے آس پاس سائنس دانوں کی ایک فوج ظفر موج تھی جو تاج برطانیہ اور انگریز امراء کی سرپرستی انگلستان کے لئے ہر گھنٹہ گھڑی کوئی نیا کارنامہ انجام دے رہی تھی۔

ان تمام حقائق پر نظر ڈالی جائے تو اپنے شہیدوں کے لئے گریہ ناک ہونے کے باوجود' سمجھ میں آتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جو کچھ بھی ہوا' اسے ہونا ہی چاہیے تھا۔ ہم کسی بھی مرحلے پر انگریز کی ذہانت اور ذکاوت کے مقابل نہ آسکے۔ نہ ہمارے اندر قوم پرستی کا وہ شدید جذبہ تھا جو ہر انگریز کے سینے میں موجزن تھا۔ قوم پرستی کے جذبے کے فقدان کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عوام سیاسی شعور سے بے بہرہ تھے اور جب کسی ملک کے باشندوں میں سیاسی شعور نہ ہو تو ان سے منظم انداز میں کسی انقلاب کے برپا کرنے کی توقع' عبث ہے۔

۱۸۵۷ء یا ۱۹۵۷ء کے حوالے سے جب ہم اپنی موجودہ تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو طبیعت کچھ اور مضمحل ہو جاتی ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ ہم نے نوآبادیاتی تسلط کی تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا۔ ہماری آپس کی رنجشیں' چپقلشیں' ذاتی ہوا و ہوس' خواص میں سیاسی شعور اور قوم پرستی کا فقدان ہمیں ایک بار پھر اغیار کا دست نگر بنا رہا ہے پہلے وہ ہمارے قلعوں پر اپنے پرچم لہراتے تھے' اب ہماری معیشت اور اقتصادیات کی شہ رگ میں ان کے دانت اترے ہوئے ہیں۔ پہلے ہمارے کسان انھیں لگان ادا کرتے تھے۔ اب ہمارے نوجوان انھیں اپنی ذہانتوں کا خراج ادا کر رہے ہیں۔

("روشن خیال" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

سحر انصاری

تنقید کا جن

میر تقی میر کے پاس کچھ لوگ پہنچے اور فرمائش کی کہ کچھ کلام عطا ہو جائے۔ میر صاحب نے کہا میرا کلام آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ان صاحبوں نے جواب دیا۔ "حضرت ہم انوری و خاقانی کا کلام سمجھ لیتے ہیں' آپ تو پھر ہماری زبان میں شعر فرماتے ہیں۔" میر صاحب نے کہا انوری و خاقانی کی شرحیں موجود ہیں۔ میرے کلام کو سمجھنے کے لئے جامع مسجد کی سیڑھیاں گھنا ضروری ہے۔

تنقید کے بعض نئے رجحانات پر قلم فرسائی کرنے والے نقادوں کے ہاتھ بھی "شرحیں" لگ گئی ہیں۔ اور وہ نئے سے نئے موضوع پر لکھے چلے جا رہے ہیں۔ پہلے ان نقادوں۔ تحریروں میں حوالے وغیرہ غائب ہوتے تھے۔ جب گرفت ہونے لگی تو طریقہ کار یہ نکالا کہ دوسروں کا بیان کردہ سب کچھ لکھ کر آخر میں کتابیات کے نام سے وہ "شرحیں" گنوادی جائیں۔

اصل کتابوں کا مطالعہ صفر کے برابر ہے۔ جو لوگ برابر ساختیات اور پس ساختیات پر لکھ رہے ہیں ان کی تحریروں میں سوسیر' یاکب سن' لیوی اسٹراوس' دریدا' لاکاں اور رولاں بارتھ کی اصل کتابوں کے حوالے (الاماشاء اللہ) نظر نہیں آتے۔ بلکہ ان پر لکھی ہوئی کتابوں کے حوالے ہوتے ہیں۔ اور جو حوالے دیئے بھی جاتے ہیں ان کا انحصار اور انتشار یہ بتاتا ہے کہ یہ بہ عجلت ثانوی ' ماخذوں سے لئے گئے ہیں۔

میر صاحب کے واقعے سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مفہوم یا متن تک رسائی کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں عارف و عامی ہوتے ہیں۔ اور دنیا کی ہر زبان میں یہ روایت موجود ہے کہ کسی مشکل متن یا کلام کو کچھ خاص افراد اپنے علم اور عقل اور تجربے کی بنا پر سمجھتے اور دوسرے نسبتاً" کم دسترس رکھنے والوں کے لئے متن کے الفاظ و تراکیب ' معانی و مفاہیم یا Signified کی شرح کر دیتے ہیں۔

دوسری جہت وہ ہے جس کی طرف میر صاحب نے اپنے خاص انداز میں اشارہ کیا ہے کہ کسی لسانی معاشرے کے اس سرچشمے تک پہنچا جائے جہاں سے زبان کے محاورے' روزمرے' لب و لہجہ اور پیرائیہ بیان و اظہار جنم لیتے ہیں۔ اس طرح سماجی لسانیات یا Socio-Linguisitics کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ لیکن کوئی سماجی عمل نفسیاتی عوامل سے آزاد و مبرا نہیں ہوتا اس لئے نفسی لسانیات یا Psycho Linguisitics کے مسائل بھی اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

جدید ادب کے نام پر نظم و نثر میں جو کچھ پیش کیا گیا یا کیا جا رہا ہے اس کے بیشتر حصے کی تفہیم کے سلسلے میں دو قسم کے انتہا پسندانہ رویے عموماً" دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک طرف ہئیت' زبان اور علامتی اظہار کو

ضروری سمجھنے والوں کے پاس اپنے اسلوب اور پیرائیہ اظہار کے بارے میں دلائل ہیں جن کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ آج کی پیچیدہ اور تہ در تہ زندگی کا حقیقی اظہار اسی طرح ممکن ہے جس طرح انھوں نے کیا ہے۔ دوسری انتہا پر اچھے خاصے تعلیم یافتہ بلکہ بیشتر کہنہ مشق ادیب شاعر و نقاد ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم شیکسپیئر، ملٹن، دانتے، گوئٹے، پاؤنڈ، ایلیٹ، جوائس، کافکا، آئین اشٹائین، اور ہائزن برگ، کو تو زبان، روایت اور ہر طرح کی اجنبیت کے باوجود سمجھ لیتے ہیں لیکن یہ ہمارے ادیب و شاعر کیسے ہیں کہ ہماری اپنی زبان میں لکھتے ہیں لیکن ہمارے لئے ان کی تحریریں ایک چیستاں اور معما بنی ہوئی ہیں۔ اس کے جواب میں پہلی بات تو وہی کہی جاسکتی ہے جو میر صاحب نے کہی تھی۔ چنانچہ یہ سارے مغربی شعراء ادیب اور سائنس داں شرحوں، تفسیروں اور مطالب کی تسہیل کے دیگر وسیلوں کے ذریعے سمجھ میں آجاتے ہیں جب کہ ہمارے یہاں نئی چیزوں کی نہ شرحیں اس جامعیت اور کثرت سے دستیاب ہیں اور نہ لکھنے یا پڑھنے والوں کی طرف سے ان کی تفہیم کے بارے میں کوئی ہمدردانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے لکھنے والا کہتا ہے آپ میری تحریر کو سمجھنے کے لئے کچھ پڑھیے، نفسیات، معاشیات، بشریات کے علاوہ جدید سائنسی اور صنعتی معاشرے میں فرد کی بے دخلی کا تجزیہ کیجئے اور پھر ان علامات پر غور کیجئے جن کے سہارے ان انتہائی داخلی تجربات کو خارج کی دنیا اور اس کے برتاؤ سے ہم آہنگ کرکے پرت در پرت پیش کیا گیا ہے کہ انسانی تجربہ محض واقعات کا گوشوارہ یا خبرنامہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ محسوسات کی سطح پر اس کا ابلاغ ہو سکے۔ دوسری طرف قارئین یا نقادین کا رویہ ذرا دوسرا ہوتا ہے وہ کہتے ہیں آپ نے کون سا ایسا شہ پارہ لکھ دیا ہے جس کی تفہیم اور معنی کی رسائی کے لئے ہم اتنی تگ و دو کریں۔ ہم میر، غالب اور اقبال ہی کو کیوں نہ پڑھیں جو سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اب یہ سوال الگ رہا کہ وہ بھی ان تن آسان قارئین اور ناقدین کو کتنا سمجھ میں آتے ہیں۔

میں نے تن آسان اس لئے کہا کہ جدید ادب کے بارے میں معیار، نظریات اور ادب کے معاشرتی پہلوؤں سے ہٹ کر جب زبان، تکنیک یا تجربوں کی اجنبیت وغیرہ کا شکوہ کیا جاتا ہے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان صاحب نے اپنے مکتبی یا ذاتی نصاب میں نئی آگہی اور نئے شعور کے اس تسلسل سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھا جس کے باقاعدہ اور سنجیدہ مطالعے سے نئی زندگی کی شناخت آسان اور ممکن ہو سکتی ہے خواہ اس کا اظہار ادب میں ہوا ہو خواہ مصوری، موسیقی یا فن تعمیر میں۔

اب اس کے معنی اگر یہ لئے جائیں کہ کسی ایک طبقے کو جدید ادب اور جدید آگہی کے بارے میں سنجیدہ قرار دے کر باقی سب کو غیر ذمہ دار، ناقواعدہ یا کم علم ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے تو یہ سراسر ناانصافی ہوگی۔ مسئلہ یہ ہے کہ آج انسانی تخلیق کے کسی عمل کو سماج اور نفسیات کے دائرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہر لفظ اور ترکیب، استعارے اور علامت کے بارے میں ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ قواعد اور بلاغت کی کتابوں میں جو معنی بتا دیئے جاتے ہیں اس کے علاوہ بھی لفظ میں معنی و مفہوم کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جن کا تعلق انسانی ذہن اور معاشرے کے ارتقاء اور نفسیات کے تلازمات سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ بلکہ کوئی لفظ کہنے یا لکھنے سے قبل ہی اس کا احساس یا اس کی تیز ذہن کو ہوتی ہے اور وہ معرض اظہار میں آنے سے قبل ہی اپنی ایک صورت بنانے لگتا ہے جسے گفتگو یا تحریر سے پہلے کی حالت یا (Pre-Speech Condtion) کہا جاتا ہے۔

جدید علوم میں لسانیات کے بعض مباحث اس اشتہاراتی دور اور صنعتی جادوگری کے زمانے میں انسان کے

اورنگ زیب قاسمی

ادب میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ یہ اردو ڈرامے میں اپنے وقت کی ایک ترقی یافتہ صورت ضرور تھی۔ زبان، منظر کشی، کردار، ماحول، پیغام غرض یہ کہ سبھی عناصر اس میں موجود تھے اور ادب کے طالب علم کی دلچسپی بھی اس میں شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ یہ ڈراما سٹیج پر بھی کامیاب ہوا، مگر اس کی بھی وہ ادبی حیثیت نہیں کہ ہم اس کو عالمی ڈرامائی ادب کے مقابلے میں رکھ سکیں یا اہم کلاسیکی ڈراموں سے اس کا موازنہ کرسکیں۔ اس زمانے میں اور اس کے بعد آج تک ہمارے لکھنے والوں نے سینکڑوں ڈرامے لکھے، لیکن بدقسمتی سے ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے کوئی اہم ادبی حیثیت دی جاسکے۔ ایسے لکھنے والے بھی ڈرامے لکھتے رہے جنھوں نے اردو افسانہ نویسی میں کمال پیدا کیا، مگر ان کے بہترین ڈرامے ان کے اچھے افسانوں کے مقابلے میں بہت کمزور رہے۔ فلم نے آکر سٹیج ڈرامے کے رہے سہے امکان بھی کم کر دیئے۔ فلم کی مقبولیت سے پہلے ایک خاص قسم کے سٹیج ڈرامے کو بہت فروغ ہوا۔ ان ڈراموں کو "منڈوا" کہا جاتا تھا اور یہ آغاز شب سے شروع ہو کر صبح تک چلتا۔ مگر اس کی بھی ادبی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ خود فلم کی کامیابی کے دور میں بھی فلموں کو ادبی معیار پر کبھی نہ پرکھا گیا اور نہ ان میں وہ جوہر تھا کہ انھیں ادب پارے قرار دیا جاتا۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ڈراموں سے یہ توقع ضرور کی جاسکتی تھی کہ یہ ادبی معیار پر بھی پورے اتریں گے اور اعلیٰ ادب میں اضافہ کریں گے۔ لیکن یہ سوال اکثر اٹھایا گیا ہے کہ کیا ان ڈراموں کی کوئی ادبی حیثیت ہے بھی یا نہیں؟ ان کو عالمی ادب کے مقابلے میں رکھنے کا تو ویسے بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر عوامی ڈراموں کا رواج ہوا۔ گھروں اور گلیوں میں بھی بعض ڈرامے پیش کئے گئے۔ ان کے اپنے مقاصد تھے، وہ شاید کسی حد تک پورے ہوئے ہوں، مگر ان میں بھی ایسے ڈرامے نظر نہیں آئے جن کو ادب کے دائرے میں داخل کر لیا گیا ہو۔ یہ ادب کی ایک بہت بڑی صنف ہے اس کو عالمی ادب کی روایت میں ایک محکم مقام حاصل ہے۔ یونانی اور سنسکرت ڈرامے کی روایت ہزاروں سال پرانی ہے، اور مغرب کا کوئی ترقی یافتہ ملک ایسا نہیں جس کے ادب میں عظیم ڈرامے تخلیق نہ ہوئے ہوں۔ ترقی یافتہ ملکوں کی زبانوں میں آج تک ڈرامے میں نئے سے نئے تجربے ہو رہے ہیں اور ڈرامے کی حیثیت ان زبانوں میں شاعری اور فکشن سے کسی طرح کم نہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے یہاں ڈرامے کو ادبی طور پر فروغ حاصل نہیں ہوا؟

اس کا ایک سبب تو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کو سرکار دربار میں کبھی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ ہمارے برعظیم کے درباروں میں شعرا اور گائیک تو اپنا جوہر دکھاتے رہے مگر ڈرامے کو دربار میں پیش کرنے کے مواقع میسر نہیں آئے۔ پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں ایسے سٹیج ہی نہیں تھے کہ ڈراما پیش کیا جاسکتا۔ اول تو ایسے علاقے میں جہاں کالی داس کی روایت موجود ہو یہ سوال ہی نہیں اٹھنا چاہیے۔ پھر عہد حاضر سے پہلے تو سٹیج کا مسئلہ اتنا اہم اور پیچیدہ بھی نہیں تھا۔ یونانیوں کی سٹیج کس قدر سادہ ہوتی تھی اور کیسے عظیم ڈرامے وہاں تخلیق ہوئے حتیٰ کہ شیکسپیئر کے زمانے میں بھی سٹیج کا مسئلہ اتنا اہم نہ تھا ناظرین بہت کچھ تصور سے کام لیتے تھے اور باقی کسر ڈرامے کے مکالمے پوری کر دیتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ آج ڈرامے کی سٹیج میں خود ایک حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ آج کی تکنیکی سہولتوں کے طفیل کئی کئی منزلوں کی گھومنے والی اور دس بیس آگے پیچھے سیٹ لگانے والی سٹیج دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے اور روشنیوں کے، رنگوں کے اور قدرتی مناظر پیش کرنے کے ایسے ایسے انداز ممکن ہو گئے ہیں کہ قیاس میں بھی نہیں آسکتے۔ میں نے تیسری دنیا کے بعض

ممالک میں ایسے سٹیج دیکھے ہیں جنہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ جادو گھر میں آگیا ہوں۔ یہ بھی درست ہے کہ ہمارے یہاں سٹیج تیار کرنے کی جو تھوڑی بہت پیش رفت ہوئی ہے وہ نہایت بیدلی سے ہوئی ہے۔ کراچی میں بعض پرانے ہال ڈرامے دکھانے کے لئے استعمال ہوتے رہے ہیں' مگر باقاعدہ ڈراما سٹیج کوئی نہیں۔ اب سے تیس برس پیشتر اس وقت کے ڈپٹی کمشنر جناب الطاف گوہر کی کوششوں سے جو سٹیج تیار کرنے کی سکیمیں بنائی گئیں وہ بھی آج تک آرٹس کونسل میں ایک نامکمل اوپن ایئر تھیٹر قسم کی چیز سے آگے نہ جاسکیں۔ لاہور میں آزادی سے پہلے جی۔ ڈی۔ سوندھی کی سعی پیہم سے اس وقت کے لارنس باغ اور آج کے باغ جناح میں ایک اوپن ایئر تھیٹر قائم ہوا تھا۔ اس کے بعد الحمرا میں اور حال ہی میں قذافی سٹیڈیم کے ساتھ سٹیج کی صورت نظر آئی ہے۔ راولپنڈی اسلام آباد میں بھی ایک اوپن ایئر تھیٹر ایوب پارک میں بنا تھا' مگر یہاں کے ناقابل اعتبار موسم کے باعث وہ بھی استعمال نہیں ہوتا البتہ لیاقت ہال کی پرانی شکستہ و خستہ سٹیج کسی نہ کسی کام ضرور آتی رہتی ہے۔ باقی جگہوں پر اگر کوئی سٹیج ہیں تو مجھے ان کا علم نہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تمام سہولتوں سے آراستہ سٹیج کے بغیر اچھا ادبی ڈرامہ تخلیق نہیں ہو سکتا تھا؟ کیا دنیا کی دوسری زبانوں میں نہایت اعلیٰ ڈرامے اس وقت تخلیق نہیں ہوئے جب سٹیج کی موجودہ صورت نہ تھی؟ پھر یہاں اچھا ڈراما کیوں تخلیق نہیں ہوا؟ یہ بھی نہیں کہ عوام میں ڈرامے کی مانگ نہیں۔ ریڈیو ٹیلی وژن کے سب سے مقبول پروگرام ڈرامے ہیں۔ فلم کی مقبولیت کا کوئی ثبوت دینے کی ضرورت نہیں۔ عوام کی سب سے پسندیدہ اور شاید ریڈیو' ٹی وی ڈرامے کے بعد سب سے سستی تفریح فلم ہے اور سٹیج ڈراما تو اتنا مقبول ہے کہ لوگ محض جگت بازی' بھکڑ مکالمے اور بیہودہ حرکتیں دیکھنے کے لئے پیسہ اور وقت دونوں برباد کرنے پر شاداں و فرحاں نظر آتے ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ اچھا ڈراما نہیں لکھا جارہا؟ ان کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ اس ملک میں تعلیم اتنی کم ہے۔۔۔ یہاں تک کہ شرح خواندگی بھی شرمناک ہے۔۔۔ جس کے باعث اچھا ڈراما یا ادبی معیاری ڈراما اس ملک کے عوام میں مقبول ہو ہی نہیں سکتا' مگر یہ بات بھی مطمئن نہیں کر سکتی کیونکہ کالی داس' سوفوکلیز اور شیکسپیئر کے زمانے میں تعلیم اور شرح خواندگی کی کیا صورت تھی؟ یہ بھی نہیں کہ یہ سوال پہلے نہیں اٹھایا گیا۔ اردو ڈرامے پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کی مختلف جہتوں پر بہت کچھ کہا گیا ہے ہمارے بہت سے خود فریب نقادوں نے اردو ڈراما نگاروں پر قصیدے بھی تحریر کئے ہیں' مگر ان سب باتوں سے یہ طے نہیں ہو پایا کہ آخر ہمارے یہاں ادبی ڈرامے کو وہ فروغ حاصل کیوں نہیں ہوا جس کی بجا طور پر توقع کی جاسکتی تھی۔

ساٹھ کی دہائی میں جب پاکستان کی یک جہتی کونسل کی سربراہی میرے ذمے تھی تو اس کونسل نے ڈرامے پر ایک ہفتے کا سیمینار کروایا تھا جس میں سٹیج' ریڈیو' ٹیلی وژن ڈرامے کے علاوہ فلم کے ہر پہلو پر تبادلہ خیال ہوا تھا۔ اس میں ڈرامے کے سکرپٹ اور مصنف بھی زیر بحث آئے تھے مگر ڈرامے کو سٹیج کرنے میں جو دشواریاں تھیں' وہی زیادہ تر زیر غور رہیں۔ اس لئے کہ مصنف کی تخلیق اس قسم کے سیمینار یا مشوروں کی محتاج نہیں ہوتی۔ ہمیں ابھی تک ایسے ڈراما نگار میسر نہیں آئے جو ہمارے ڈرامے کو عالمی ڈرامے کی سطح پر لے آئیں۔

اردو کے ایک صاحب الرائے نقاد نے ایک محفل میں اردو ادب میں ڈرامے کے فروغ نہ پانے میں بہت

اورنگ زیب قاسمی

دلچسپ بات کی۔ انہوں نے کہا کہ یہ سوال ہی سرے سے غلط ہے۔ اسلامی روایت میں اردو ڈرامے کا وجود ہی نہیں ہے اس لئے ڈراما ہماری بنیادی اقدار اور ہمارے مزاج ہی کے خلاف ہے۔ یہ بات ایک حد تک تو درست معلوم ہوتی ہے دوسرے مسلم ممالک میں بھی ڈرامے کی وہ حیثیت نہیں ہے جیسی دوسری اصناف کی ہے۔ لیکن پھر بھی ادب کا قاری یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اسلامی روایت میں تو تصویر کشی اور موسیقی کی بھی گنجائش کم ہی نظر آتی ہے پھر اتنے عظیم مصور اور موسیقار کیسے پیدا ہو گئے؟ یہ عتاب آخر صرف ڈرامے پر ہی کیوں ہوا؟ تمثیل نگاری بھی اگر اتنا ہی بڑا عیب ہے جتنی تصویر کشی یا موسیقی تو پھر ان میں بھی فروغ نہ ہونا چاہیے تھا۔

ہمارے ہاں اچھے ڈرامے لکھے تو گئے مگر وہ ہماری اچھی شاعری اور اچھے افسانوں کی طرح عالمی ادب کے مقابلے میں نہیں رکھے جاسکتے۔ دنیا میں ڈرامے نے بہت ترقی کی۔ ترقی یافتہ زبانوں میں آج بھی ڈرامے کی صنف میں نمایاں تجربات ہو رہے ہیں' علامتی ڈرامے سے ابسرڈ (Absurd) ڈرامے تک! ہمارے یہاں ڈرامے کو کیوں فروغ نہیں ہوا اور اس کے مستقبل میں کیا امکانات ہیں؟

("علامت" لاہور)

تنقید کی اصطلاح اور جدید نظریات

اردو ادب میں سب سے پہلے "تنقید" کا لفظ کس نے استعمال کیا۔ یہ بات تحقیق طلب ہے لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ اس لفظ کا مصدر نقد ہے جس کے اور بہت سے معنوں میں ایک معنی دراہم کو پرکھنے کے ہوتے ہیں ۔ شاعری کے لئے نقد الکلام استعمال ہوتا ہے اور لفظ "نقد" کے کچھ اور بھی معنی ہوتے ہیں جن کو اگر استعارةً ہماری تنقید پر لاگو کیا جائے تو وہ تنقید میں مثبت اور حتی عمل کی علامت بن جاتے ہیں ' مثلاً "نقد الطائر" پرندوں کے چونچ مارنے کو کہتے ہیں جو تحقیق اور تفہیم کے مشابہ ہے اور " نقدة الحیہ " سانپ کے ڈسنے کے معنی میں آتا ہے جو ایسے نقادوں کی رائے کی علامت ہے جو پسند نا پسند (Taste) یا تعصّبات پر مبنی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں لفظ "نقد" کے ماخذ کے کچھ اور معنی دلچسپی سے خالی نہیں۔

"مناقدہ" کسی معاملے میں جھگڑا کرنے کو کہتے ہیں۔ "تنقید" کھوٹے سکے الگ کرنے کو اور شعر کے عیب ظاہر کرنے کو کہتے ہیں اس کے ایک معنی دیمک کاٹنے کو کھوکھلا کرنے کے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو ہماری روایتی تنقید حقیقتاً و مجازاً" ان تمام عوامل کو اپنے اندر لپیٹی نظر آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ لوگ تنقید میں معروضیت پر زور دیتے آئے ہیں اور اسے سبجیکٹو تنقید سے الگ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ۔ (سبجیکٹو کا ترجمہ انہوں نے داخلی ' موضوعی' یا داخلی کیا ہے لیکن تینوں الفاظ سبجیکٹو کے مفہوم کو پوری طرح ادا نہیں کرتے' اس لئے کم سے کم ادب میں Objective یا Objectivity کے بالمقابل اپوزیشن کے طور پر ہم سبجیکٹو یا سبجیکٹویٹی کو اردو مان لیں تو بہتر ہوگا)

ہم سب تنقید میں معروضیت کے قائل ہیں لیکن جب کسی فن پارے میں "نقد" یا "پرکھ" یا قدر اور Value کا تعین کرنے کی بات کرتے ہیں تو ہمیں مطلق معیار پہلے سے متعین کرنا پڑتا ہے اور اس کی جامعیت اور قبول عام ہونے کو بھی فرض کرنا پڑتا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ ہم سونے کے معیار مقرر کرتے ہیں اور اسے کیرات سے ظاہر کرتے ہیں چوبیس کرات خالص ہوگا۔ تیس کیرات میں اس قدر ملاوٹ ہوگی بائیس میں اتنی اور اکیس میں اتنی' اور اسی معیار پر ہم سونے کے سکے یا زیور کی ویلیو متعین کرتے ہیں۔ یہ عمل آسان ہے اس لئے کہ یہ عمل بین الاقوامی طور پر متعین کیا گیا ہے ۔ ادب پارے میں جب ہم کوئی معیار متعین کرتے ہیں تو وہ صفات کی ایک لمبی لسٹ کی صورت میں ہوتا ہے اور اکثر اتنا مبہم اور غیر واضح اور نسبی ہوتا ہے کہ وہ معیار بن ہی نہیں سکتا مثلاً" یہ کہ زبان و بیان کی خوبی۔ فصاحت و بلاغت ' لفظی تکرار وغیرہ۔ شاعری میں عروض بحور معائب و محاسن فن کے بہت سے فارمولے بنے۔ کچھ پر عمل ہوا اور کچھ پر نہیں' کچھ نے بنا

کچھ نے نہیں مانا۔ لہجہ اور ڈکشن ہمیشہ زیر بحث رہا۔ کوئی معیار نہ بن سکا۔ کلاسیکی دور میں جب تخلیق و تعمیر کے حدود متعین نہیں ہوئے تھے اور تقریباً" ہر فن پارے میں تعمیر وتنقیح کے عناصر ضروری ہوتے تھے تو فن پارے کے وجود میں آنے کے اصول ہی تنقید کا معیار متصور ہوتے تھے۔ انگریزی شاعری کے لئے الگزنڈر پوپ نے ایک فارمولا تیار کیا تھا جو شاعری کی تخلیق اور تنقید دونوں کے لئے ایک مطلق معیار متعین کرتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ادبی تخلیق یا تعمیر Imitation' نقل کی تھیوری پر قائم تھی اور تنقید بھی اسی کے بنائے ہوئے معیار کا احاطہ کرتی تھی۔ پوپ کا فارمولا یہ تھا:

پہلے فطرت کا کرو اتباع' اور اپنے فیصلے کے قیام کو
منصفی معیار پر فطرت کے رکھو' اور یہ معیار ابدی ہے
وہ فطرت جس سے غلطی ہو نہیں سکتی' الوہیت سے روشن ہے
یہی شفاف لاتغیر ہے اور نور دنیاوی کا مخزن ہے

(First Follow Nature And Your Judgment Frame
By Her Just Standard Which is Still The Same
Unerring Nature Still Divinely Bright
One Clerar Unchange'd Universal Light)

فطرت کے اتباع کا اصول محض فارمولا نہیں بلکہ اس مطلقیت پر یقین کی جانب اشارہ کرتا ہے جو کلاسیکی دور کی خصوصیت تھی اٹھارویں صدی کے بعد کے زمانے میں جب ٹی-ایں-ویکو کی تاریخیت نے ان اصولوں کی مطلقیت پر ضرب لگائی اور وقت کے ساتھ ان میں تبدیلی آنے کا بالکل مخالف نظریہ پیش کیا تو تنقیدی اصولوں میں کم سے کم زمانی Relativity کا نظریہ شروع ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ ادب پارے کی مختلف صفات متعین ہوئیں۔ ڈاکٹر جانسن کا بھی یہی نظریہ تھا۔ اس نے ایک مبلغ کا رول ادا کیا۔ تنقید میں تعصب اور تنقیص کے رجحان کو کم کرنے کی تلقین کی اور اصولوں کے مرتب ہونے کی بات کی۔ ڈاکٹر جانسن کا قول تھا کہ تنقید سائنس نہیں ہے بلکہ وہ ایسے لوگوں کی ترنگ ہے جو بزعم خود قانون ساز بنے ہوئے ہیں' اور عقل و دانش کی فطری سم جوئی اور جدت طرازی کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں (ادبی تنقید کی تاریخ۔ ہیری بلیماڑ/ میکملین سیریز) ۱۸۶

اٹھارویں صدی کے آخر میں ایمنیویل کانٹ کے فلسفہ جمالیات نے تنقید پر اثر ڈالا لیکن اس میں تاثرات اور اخلاقیات کی اقدار کے مطابق فن پارے کی تنقید اس کی Value کو معیار باقی رہی۔ وکٹورین زمانے میں جمالیات کے تحت جمالیات کے Abstraction کو معیار بنانے کے بجائے حسین چیزوں کو معیار بنایا گیا مگر Value کا تصور پھر بھی قائم رہا۔ بیسویں صدی میں مارکسی تنقید نے ادب کی افادیت اور تطہیر کا ذریعہ بننے کا تصور پیش کیا اور تنقید کا معیار بھی سماجی حقیقت شناسی متعین کیا لیکن اس میں بھی اچھے ' برے ' مضراور مفید' رجعت پسندی اور ترقی پسندی کے متضاد تصورات قائم رہے اور Value ہی معیار رہا۔ نئی تنقید نے قاری کے رد عمل" فن پارے کی مطلقیت' ابہام اور سمبل کی ادبی قدر قیمت کا نظریہ پیش کیا جس نے بڑی حد تک تنقید میں تشریح اور تحلیل کو جگہ دی۔ لیکن معیار کے Relative ہونے کی وجہ سے اور Taste اور

اورنگ زیب قاسمی

تاثر کی دخل اندازی کی وجہ سے یہ تنقید بھی Value تنقید کے زمرے میں آتی ہے۔

جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے مولانا حالی ہی کو ایک منظم اور مدلل تنقید کا بانی کہا جاتا ہے اس سے پہلے تذکرے اور کلاسیکی صفات کے معیار پر انحصار رہا۔ فن پارے کی صفات کے برابر درجہ مصنف کی سوانح حیات کو دیا جاتا رہا وہ بھی بہت ہی Sketchy اور تنقید نگار کے ذاتی تعصب اور تاثر سے بھرپور' ہمیں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ اردو میں تنقید نے جو شکل اختیار کی ہے اور جو کچھ اب تک لکھا جاتا رہا ہے وہ مغرب کی دین ہے - چاہے وہ ہیئت ہو' متن کی جمالیات ہو' اس کی افادیت ہو' تعریف یا تشریح ہو۔ پچھلے بیس سالوں میں تنقید کے میدان میں جو پیش رفت ہوئی ہے اور جسے ہم اردو میں جدید تنقید کہتے ہیں اس میں بہت سے عناصر ماورائی' رومانی' کلاسیکی دور کے بھی شامل ہیں اور تنقید نگار اب بھی اپنے مبہم پیمانوں یا پہلے سے موجود کلیشے کے ذریعہ تنقیدی مقالے اور کتابیں لکھتے رہتے ہیں جن میں مطلق فیصلے کا رجحان غالب رہتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ Initiative ہمیشہ نقاد کے پاس ہوتا ہے جو چند صفات کو اپنے طور پر متن میں دریافت کرکے یا اس پر چسپاں کرکے اچھے اور برے' بہترین اور ممتاز وغیرہ کے فیصلے صادر کر دیتا ہے۔ یا پھر اپنی تنقید میں شامل کرکے Value Judgment کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ اگر نقاد کسی سے ناراض ہے یا کسی کو پسند نہیں کرتا جس میں نظریہ اور شخصیت دونوں شامل ہیں' تو تنقیص کے ذریعے اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے اور انانیت' تاثر' تعصب وغیرہ جیسی انسانی خصوصیات کے ذریعے اچھے خاصے فن پارے کو غیر فن قرار دے دیتا ہے اور اگر وہ مصنف یا فن پارے کے مجموعی تاثر سے خوش ہے تو تنقید کو تعریف میں بدل دیتا ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب معیار جو Value متعین کرتے ہیں' یا چند مفروضے اور نظریات کی بنا پر ادب پارے کو پرکھتے ہیں' وہ نہ فن پارے کے ساتھ انصاف کرتے ہیں اور نہ اپنی تنقیدی صلاحیت کو اجاگر کرتے ہیں اور اسی لئے کچھ ان میں سے قصیدہ گو ہوتے ہیں اور کچھ ہیرا سائٹر۔ ویسے یہ جنرلائز نہیں کیا جاسکتا۔ اردو ادب میں بہت سے ایسے نقاد ہیں جو بات کو ناپ تول کر کہتے ہیں - فن پارے کی صفات کو اجاگر کرتے ہیں' محاسن اور معائب کا بیان منطقی طور پر کرتے ہیں۔

یوں تو تنقید میں تحلیلی رویہ رچرڈز' امپسن' ایلیٹ وغیرہ کے وقت سے کسی حد تک شروع ہو گیا تھا مگر ساختیات' پس ساختیات اور ڈی کنسٹرکشن نے اسے فروغ دیا۔ اب فن پارے کی Value پر یا کسی متعینہ اور مقررہ معیار پر' اسے نہیں پرکھا جاتا بلکہ اس لسانی سسٹم سے بنائی ہوئی کائنات میں اس کا وجود' اس کی معنویت کی سطحیں' لسانیات کے کوڈز کے اندر اس کی تشریح' اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ اس میں التواء میں ڈالی ہوئی باتوں اور متضاد بیانات کی نشاندہی وغیرہ منطقی انداز میں کی جاتی ہے سوا چند صفات کے تحریر کے اسلوب کا کوئی متعین طریقہ نہیں ہوتا اس لئے ایسی تنقید پر اسلوبیات کا اطلاق بھی ہوتا ہے مگر اسی حد تک کہ تحلیل کے ذریعہ اسلوب کی نشاندہی کی جائے۔ غرض یہ کہ ادب پارے کی تمام صفات کو اجاگر کیا جاتا ہے لیکن کسی مطلق یا فیصلہ کن حکم سے گریز کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ آپ کوئی زیور سنار کے پاس لے جائیں اور اس سے پوچھیں کہ اس کے بارے میں بتاؤ تو وہ کسوٹی پر رکھ کر یہ بتائے گا کہ اس میں کتنا کیرات سونا ہے' نگ کتنے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر ٹانکا لگا ہے تو کس طرح کا وغیرہ - اب یہ آپ پر ہے کہ اسے

اورنگ زیب قاسمی

خوبصورت کہیں یا نہ کہیں۔ وہ بھی شاید اسی وقت ممکن ہے جب زیور پہن کر کوئی آپ کو دکھائے پھر بھی اس کے اچھے برے کا تعین محض مشاہدے پر نہیں بلکہ ادراک پر منحصر ہوگا لیکن وہ بھی مطلق نہیں ہوگا کیونکہ یہ زیور پہننے والے پر اور دیکھنے والے کے ذوق اور تاثر پر منحصر ہوگا۔ اس لئے نقاد کا کام تحلیل و تشریح ہے' معنویت کی تلاش ہے' کچھ تھیوری اور نظریات کے مطابق جو خود مطلق نہیں ہیں - صفات کا بیان ہے جن کو ڈی کنسٹرکشن کے مطابق رد بھی کیا جاسکتا ہے' ان کمی کی تلاش ہے' لیکن ایسی تنقید میں یہ بھی ضروری کہ آپ کسی فریم ورک یا فارمولا کو نہ اپنائیں اگر فن پارے کی صفات کی تحلیل نفسیات' نسائی تنقید' کلچر تنقید یا نئی تاریخیت کے اصول کے تحت ممکن ہے تو وہ بھی اس تنقید کا حصہ بن سکتی ہے وہ اس لئے کہ اب جو تنقیدی بحث ہمارے سامنے آرہی ہے وہ Post Modern یا مابعد جدید تنقید ہے جس میں نظریات' نئی تاریخیت' نسوانی تنقید' ڈی کنسٹرکشن وغیرہ سب شامل ہیں۔

یہ تو سچ ہے کہ ہم نے اردو ادب میں تنقیدی اصولوں اور اس کے اطلاق کو مغرب ہی سے سیکھا۔ مغربی افکار کے مطالعہ کے وقت ہمارے اسلاف کے اقوال اور تحریروں میں جو اردو فارسی عربی یا ہندی اور سنسکرت میں ہیں ہمیں ایسی باتیں ملتی ہیں جو مغرب کے افکار سے مناسبت رکھتی ہیں ایسی باتوں کو واضح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن یہ ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ اولیت اسی کو حاصل ہے جس نے ہمیں اردو ادب یا مشرقی ادب میں ایسی باتیں تلاش کرنے میں مدد دی - لفظ مشرق بہت وسعت رکھتا ہے ہم جانتے ہیں کہ عربی' فارسی میں بیشتر اور سنسکرت' چینی' جاپانی' کوریائی' زبانوں میں جو بھی تھیوری ہوگی جس کی مماثلت مغربی تھیوری سے ہوگی' وہ ہم نے کسی نہ کسی مغربی زبان اور ترجمے کے ذریعے دریافت کی ہے جہاں تک کسی نظریہ یا فکر کا مغربی افکار سے مختلف یا اس کی ضد ہونے کا تعلق ہے تو یقیناً' ہم اپنے نظریات کو قبول کریں گے لیکن ان کی بنیاد بھی منطق پر ہوگی صرف عقائد اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کی بنیاد ضروری نہیں کہ منطق پر ہو۔

ان معروضات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ "تنقید" کی اصطلاح اپنا کام ختم کر چکی ہے تنقید سے ہم ہمیشہ Value Judgment مراد لیتے ہیں۔ اسی لئے یہ تنقید کرنے والے اور زیر تنقید فن پارے کے مصنف دونوں کے جذبات اور تاثرات یعنی Taste اور انانیت پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے اور فن پارے کے صفات کو معروضی طور پر بیان کرنے اور معنی کی تفتیش تلاش کرنے کا جو عمل ہوتا ہے نقاد کی پسند ناپسند اور مصنف کی خوشی اور غصہ کا شکار ہوجاتا ہے ہو سکتا ہے' "تجزیاتی مطالعہ" تنقید سے بہتر اصطلاح ہو۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے قارئین اس موضوع پر اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔

("عصری" کراچی)

قیصر حکیم

ہم کیوں لکھتے ہیں؟

زندگی میں قدم قدم پر نئے سوال سامنے آتے ہیں اہل فکر و عمل ان پر غور و خوض بھی کرتے ہیں اور پھر لکھتے عام طور پر سب لوگ یہی ہیں کہ یہ شاید کوئی بالکل ہی نرالی صورت حال ہے امر واقعہ اس کے بالکل خلاف ہوتا ہے۔ سوال کوئی بھی کیوں نہ ہو اور کسی بھی شکل میں کیوں نہ درپیش ہو بنیادی طور پر اپنی اصلیت اور نوعیت میں کچھ گنے چنے ازلی استفہامیوں سے مختلف نہیں ہوتا ہے بات فلسفیوں کی ہو یا مرشدانِ حق کی' موضوعات تو یہ تو ہے الجھنے والے خواہ ادیب ہوں یا فن کار۔ کوشش سب کی یہی ہوتی ہے کہ ان ازلی استفہامیوں کا اپنے طور پر جواب ڈھونڈھنے کی کوشش کریں۔ بہت سے مردان حق آگاہ اور اصحاب بصیرت بڑی حد تک مسائل کے حل کی طرف سرگرم سفر رہے ہیں' لیکن اس راہ میں بجیرے ایسے فروعی مسائل بھی دامن کشاں ہوئے ہیں کہ اچھے اچھے اصحاب خود ان ہی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔

ذکر اسی سلسلے میں ایک بنیادی اور ازلی سوال کا بھی آتا ہے کہ ہم کیوں لکھتے ہیں؟ دیکھنے میں یہ سوال ادیبوں اور شاعروں سے متعلق لگتا ہے اور اسی تاثر کی بنا پر "تقریباً" ہر دور کے فن کاروں نے اس کے نامکمل' ادھورے یا صرف یک رخ جواب سوچے ہیں اور لکھے بھی ہیں' مگر یہی سوال ذرا تبدیلی ہیئت کے ساتھ جب کسی حقیقی فن کار کے سامنے پیش ہوتا ہے تو مسئلہ صرف شیریں کے تصور ہی کا نہیں بلکہ اس ابدی بد نصیبی کا رخ اختیار کرلیتا ہے جو خارا شگافوں کے باوصف خود آزارِ حسن و جمال کو نہ صرف یہ کہ مضطرب و گرفتار کرتی ہے بلکہ بیشتر اوقات تیشہ مار کر خودکشی کرنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ ایک زیادہ دور رس اور ژرف نگاہ شاعر بات بڑی خوبی سے کہہ گیا ہے:

تمہیں سچ سچ بتا دو کون تھا شیریں کے پیکر میں
کہ مشت خاک کی حسرت میں کوئی کوہ کن کیوں ہو

فکر و فن کی وادی جنوں میں قدم رکھنے والے دراصل حقیقی شہرت و توصیف کے نہیں ہوتے (یہ تو مشت خاک والی بات ہوئی) بلکہ روبرودان کے دیدۂ بینا کے ہوتا کوئی اور ہی جلوہ مستور ہے۔ کلاسیکی دانشوروں نے اس کی تشریح کے بغیر صرف یہ کہہ کر ٹال دیا ہے کہ " شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باش "

اب یہ جنوں بجائے خود کیا ہے؟ وہ نظریاتی وابستگیاں یا ملک و قوم کے لئے کورچیں محبت یا رنگ و نسل اور عقائد و شریعت عصری کے لئے بہرحال دامن کے چاک اور گریباں کے تار کے تمام فاصلے مٹا دیا جن سے لہو لہان ہے بزعم خود اشرف المخلوقات کی تاریخ یا ان کی' ضمیر آرائیاں جن کے سلسلے جام بائے عشق و

حنظل سے شروع ہو کر سلاسل' تازیانوں' بیڑیوں اور تختہ ہائے دار سے ہوتے ہوئے وادی قرات ہی نہیں بلکہ ہمارے آپ کے الجزائر' ویت نام' شارب ویل اور صبرو وشتیلہ کے علاوہ نئی تاراجی بغداد تک پہنچتے ہیں؟ عام مدرس مختلف امور و مسائل پیش کرنے کے بعد ان کے حسن و قبح کی نشان دہی بھی کرتے ہیں نظریاتی مبلغ واقعات و حوادث کی اپنے طور پر وکالت یا تشریح کرتے ہیں' طبیب و معالج اعضائے انسانی میں عناصر کے ضروری اعتدال یا ان کے دم توازن کا جواب ڈھونڈھ کر نسخہ تجویز کرتے ہیں' مگر تخلیقی فن کاروں کا منصب ان سے بالکل ہی جدا ہوتا ہے' یا ہونا چاہیے' کیوں کہ وہ کوئی جواب ڈھونڈھ نکالنے یا منطقی استدراک و فلسفے کی بھول بھلیوں میں الجھنے کے بجائے یا تو آئینہ دکھاتے ہیں یا پھر استفہامیے پیش کرتے ہیں' ان کا اس فکر میں غلطاں ہونا کہ ادب و فن کا مقصد کیا ہے؟ یہ کہ وہ کیوں لکھتے ہیں ان کو جادۂ صواب سے ہٹانے کا محرک بھی ہو سکتا ہے۔

پیغامبران الٰہیات اور داعیان مذہب و اخلاق نے ہمارے سامنے کچھ جواب اور حل ضرور پیش کئے ہیں کہ مقصد ازلی جنت سے نکالے ہوئے انسان کے دکھوں کا مداوا تھا مگر کیا یہ جواب اس بنا پر تھے کہ وہ جنت خوارنایاں خود حریم آدم میں بار بار آشنائے راز ہو گئے تھے یا یہ کہ کسی قطعی اور فیصلہ کن ہستی القدس نے ان کو وہ بصیرت شافی عطا فرمائی تھی جو حق تھی ام الکتاب کے ارشاد عالی إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ پر؟

روایت ہے کہ یونان قدیم کی اکادمی کے ایک بڑے اجتماع میں طالبان علم فلسفہ اور معلمان اخلاق و مذہب کے روبرو ایک تخلیقی فن کار نے موجودہ مسلمات و معتقدات کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں اور جلد ایک ایسے نقطۂ ابہام پر پہنچ گیا جہاں وجود و عدم گرد راہ سفر بن کر رہ گئے۔ آخر میں اکادمی کے نگراں نے اعتراض کیا کہ آپ نے ہر ایمان و یقین کے سامنے اسفنکس استادہ کر دیے ہیں اور ہر تعلم تخیل کے آگے درانتیوں کی طرح استفہامیے چپکا دیے ہیں' مگر خود آپ کا نسخۂ علاج کیا ہے (Ex Aeoue Et Bone) کون سا نظریہ' کون سی بصیرت اور کون سی قدر حیات درد و غم جہاں کی درماں ہو سکتی ہے؟

فن کار کا جواب تھا۔" ہر قل (Heraccls) کا کام اوجیا(Augeias) کے اصطبل کی صفائی کرنا تھا۔ اس کی بارہ مشقتوں میں یہ شرط شامل نہیں تھی کہ گوبر کی صفائی کے بعد خالی جگہ کا نیا استعمال بھی تجویز کرے۔"

کیا واقعی کام ادیبوں یا اہل فکر کا یہی رہ گیا ہے کہ وہ سوالوں کے جواب پیش کریں؟ شریعت فن کے تحت بنیادی منصب ایک فن کار کا یہی قرار پایا تھا کہ وہ نئے نئے استفہامیے پیش کریں۔ جواب ان کے ممکن ہے کہ خداوند خدا یعنی Zeus کی مسند اعلیٰ سے پھوٹنے والے فنی و ادبی دھاروں میں ہی مضمر ہوں۔ سوال اہل ادب سے یہ کرنا کہ وہ کیوں لکھتے ہیں؟ اسی طرح غیر ضروری ہے جیسے پھولوں سے پوچھنا کہ وہ کیوں کھلتے ہیں؟ خدائے شعر حضرت میر نے ایک معصوم سوال گل کے ثبات کے بارے میں کیا تھا جس پر کلی نے تبسم کیا تھا۔۔ اس کے بعد کیا کسی مزید تشریح کی ضرورت رہ جاتی ہے؟

("افکار" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

دھرتی

اورنگ زیب قاسمی

ریاض صدیقی

قدیم ہڑپا زبان

۱۹۵۰ء سے پہلے جس دراوڑی تہذیب کے لئے دریائے سندھ کی تہذیب کا فقرہ عالمی سطح پر رائج تھا اب ترک کر دیا گیا ہے۔ اسٹین نے اس کے لئے ہندوستانی تہذیب کا نام تجویز کیا تھا جبکہ موتمر ویلر نے بھی اپنی کتاب " دی انڈس سویلائزیشن " میں وادی سندھ کی تہذیب جیسے نام سے اختلاف کیا تھا۔ عالمی ماہرین آثار قدیمہ نے حال ہی میں جب ہڑپادور کو چار بڑے صوبوں یعنی وسطی مشرقی ' جنوبی اور مغربی میں تقسیم کیا اور یہ انکشاف کیا کہ ہڑپہ ایک وفاقی ریاست تھی تو " ہڑپا سلطنت " کا نام رائج کیا گیا اور اب عالمی سطح پر یہی نام سکہ رائج ہے۔

ہڑپاتمدن کے پہلے مرحلے میں زبان اور رسم الخط کا استعمال عام ہو گیا تھا اور اب یہ بات بھی تسلیم کر لی گئی ہے کہ اہل ہڑپا خواندہ تھے اس دور کے بیشتر ایسے معروضات (Objects) دستیاب ہو چکے ہیں جن کی سطح پر دراوڑی رسم الخط میں واضح کتبے کندہ ہیں اس قسم کے معروضات ار'کش ' برک ' اکیڈ سوس' پچور ' بحرین اور فیلک سے بھی ملے ہیں۔ ۱۹۵۰ء تک برصغیر اور مغربی ملکوں کے ماہرین اور اداروں نے رسم الخط اور جملوں کو تحلیلی تکنیک سے پڑھنے کی کوشش کی مگر کوئی قابل قبول نتائج حاصل نہیں ہوئے البتہ روسی ماہرین اور اداروں نے بڑی حد تک حقائق کو گرفت کرنے میں کامیابیاں حاصل کیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد جب عالمی سطح پر توانائی کی برق مقناطیسی ٹیکنالوجی کو عروج حاصل ہوا اور علم لسانیات کی سائنس میں شعبہ ساختیات نے نئی راہیں کھولیں تو قبل مسیح کی پراسرار تہذیبوں کی تسخیر کا عمل ماہرین کی گرفت میں آگیا۔ علم آثار قدیمہ ' علم انسان ' علم سماجیات' علم نفسیات اور علم لسانیات کے لئے یہ سائنسی انقلاب بہت مفید ثابت ہوا۔ زبانوں کا استعمال بطور انفارمیشن تحریری اس عہد کی دین ہے اور عہد حاضر کے کاروباریوں' صنعت کاروں اور مالیاتی اداروں نے زبانوں اور ان کے ادب کی جمالیاتی و ابلاغی قوت تاثیر کو سرمایہ داری اور صنعتی ترقی کے لئے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ہڑپا کی زبان کے غیر حل شدہ معمے کے لئے کمپیوٹر ٹیکنالوجی ' ریڈیو کاربن و ریڈیو یورینیم طریقہ کار اور ساختیات بہت کامیاب ذریعے ثابت ہوئے۔ لسانی تحقیق کے دور اول میں ماہرین کا یہ اندازہ کہ ہڑپا اور براہمی زبانیں دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی تھیں اور ان کی ساخت میں سامی زبانوں کا عنصر بھی شامل تھا صحیح ثابت ہوا ہے۔ اس خیال کا اظہار سب سے پہلے جی۔ آر۔ ہنٹر (G.R.Hunter) نے کیا تھا۔ ایک اصل و قدیم سنہالی کتبہ پر موجود تحریر بھی اس کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ رسم الخط میں سمت کی تبدیلی چودھویں صدی قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ ریڈیو کاربن و

یوریبنیم تکنیک نے قدیم دور کی عمروں کے سن و سال کے تعین کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ فیرسروس اور ڈیلز نے ۱۹۹۰ء کے بعد جب بلوچستان اور کراچی کے علاقوں میں تحقیق شروع کی تو پتہ چلا کہ ان علاقوں میں قبل از ہڑپا کی دیسی تہذیب عروج پر تھی اور مختلف جگہوں پر ہڑپا ملتے جلتے دیسی شہر آباد تھے گویا دراوڑی زبان بھی اپنی بلوغت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ قبل از ہڑپا دور کے جو بڑے دیسی شہر دریافت ہوئے ہیں ان میں کراچی کا "اللہ ڈنو" سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

ہڑپا زبان کو ماہرین نے دو واضح زمانوں میں تقسیم کیا ہے یعنی دور اول یا ابتدائی ہڑپن اور دور دوم یعنی اواخر کا ہڑپن ' ابتدائی دور کے حروف کی فہرست شکلی ہے ان میں چڑیوں' جانوروں ' انسانوں ' پودوں' فرنیچر' گھروں ' پہاڑوں اور جیومیٹری کے خطوط نمایاں ہیں۔ مصری طرز تحریر یعنی - - - (Heiroglyphics) میں بھی اسی قسم کی اشکال ملتی ہیں - یہ واضح رواں خط (Cursive Signs) سے ہم آہنگ ہیں اور بعض نشانات رومن حروف سے بھی مماثل ہیں مثلاً" Y / X / W / V / U / M / E / O چند نشان ایسے ہیں جنہیں ماہرین نے مجازی قرار دیا ہے مثلاً [illegible] یعنی تیر انداز [illegible] بوجھ اٹھانے والا [illegible] ڈھال ساز سپاہی۔

ساختیات کی تکنیک سے استفادہ کرنے والے مغربی و ہندوستانی ماہرین نے پچھلے دور کی مجموعی کوششوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ فیر سروس ' مہادیون اور فادر ہراس (Heras) نے مسئلے کو حل کرنے کے لئے دراوڑی کو اصول اول تصور کیا اور مفروضہ قائم کرکے پیش قدمی کی۔ اس کے نتیجے میں جو معلومات انہوں نے یکجا کی ہیں ان کی حیثیت بھی مفروضوں ہی کی ہے۔ اصول اول جیسے مفروضے کی دیسی کمزوری ہے کہ اس سے اخذ کئے جانے والے نتائج معروضیت سے محروم ہوتے ہیں ماہرین ساختیات کا خیال ہے کہ نئی لسانی تکنیک کے ذریعہ یہ بات یقین کی حد تک سامنے آجاتی ہے کہ کوئی خط تحریر اشکالی (Pictographic) ہے یا تصوری (Ideograiphic) ہے یا علامتی (Logographic) ہے اس کا تعین تحریر میں بنیادی نشانات کی تعداد سے ہو جاتا ہے کوروزو (Kuorozov) اور پار پولا (Par pola) نے کمپیوٹر کی مدد سے بعض نشانوں کے سروں کا بھی دقیق تجزیہ کیا مثلاً" [illegible] / UF / اور انہیں ابی لاحقے قرار دیئے ہیں مرکب نشانوں کے ساختیاتی تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ آخری زمانوں میں ہڑپا زبان کی ساختیاتی وصوتی پیچیدگی میں کمی آئی تھی اور زبان سادگی کی سمت رواں تھی۔ اس میں حرکت اور جوڑے بندی کا رجحان رونما ہو گیا تھا۔ یہ رجحان براہی زبان میں پایا جاتا تھا جس کو براہی نے برقرار رکھا ان دو رجحانات سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہڑپا زبان صوتی تھی - جب ہم ہڑپا زبان کے ترقی یافتہ مرحلے (لوتھل۔ ۳) اور (لوتھل۔ بی) کا احاطہ کرتے ہیں تو مثیل کے چوں' میدان ' مچھو' پہاڑوں ' اور جانوروں کے شکلی نشانات نظر نہیں آتے ہیں اور صرف خط رواں کے نشانات ملتے ہیں۔

ڈیلز نے موہن جوداڑو کے آخری دور کی چھبیس مہروں کا تجزیاتی مطالعہ کیا۔ ان میں سوائے ایک کے سب پر خط رواں کے نشانات کندہ تھے۔ ایک ہی ایسی مہر تھی جس پر میدان کا نشان تھا اور ہو سکتا ہے کہ یہ مہر دور اول کی ہو۔ ان مظاہر سے بھی یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ آخری دور میں ہڑپا زبان بہت کچھ سادہ ہو چکی تھی۔ خط رواں کے تمام متعدد نشانات کی علیحدہ کر دینے کے بعد اصل بنیادی نشانات کو جو فہرست مرتب کی گئی

ہے اس میں خط رواں کے ۳۴ اور تصویروں کے ۲۸ نشانات ہیں جن کی ترتیب کے ساتھ تعداد آخری دور میں کم ہو کر ۲۲ اور ۲ رہ گئی تھی۔ جب بنیادی نشانات اس حد تک کم ہوں تو وہاں صوتی ہونا ہی ممکن ہے (شکل نمبر) زیادہ قریبی ہڑپا کے رواں نشانات موہن جوداڑو' رنگ پور ' لوتھل ' بیٹ دوار کا' اور دائم آباد سے جمع کئے گئے ہیں ان کا زمانہ سولہ ' تیرہ قبل مسیح کا ہے۔ اشوک دور کے براہمی کتبیات سے ان کے موازنے کے بعد معلوم ہوا کہ ہڑپا زبان کے سولہ نشانات بالکل اصل صورت میں براہمی کا بھی حصہ تھے ان کی اصل آوازوں میں بھی کوئی فرق نہیں تھا۔ اسی طرح ہڑپا زبان اور سامی زبان کے درمیان مشترک نشانات کی تعداد ۱۲ ہے حقائق سے ہڑپا زبان کی بھی کیفیت اور روابط کا اندازہ ہوتا ہے جو ان تین معاصر زبانوں کے مابین تھے اور یقیناً" یہ زبانیں اپنے عہد کی "دی ورلڈ" زبانیں تھیں گویا اردو ایک لسان تاظر کے بطون سے پیدا ہوئی اور اس اعتبار سے اردو کا دور حاضر کی مقبول رائج زبانوں سے کوئی موازنہ نہیں کیاجاسکتا۔ چونکہ ہماری تمام علاقائی زبانیں' اسی سرچشمے کے دھارے ہیں اس لئے ان کی ہم کیفیت اور اردو سے قرابت داری کا خونی رشتہ ناقابل تردید صداقت ہے۔

ہڑپا زبان کے تجزیاتی مطالعے کا آخری مرحلہ معنی کی تلاش و تعین کا تھا۔ ماہرین نے جب (Separator) (Word کے ذریعہ بعض صورتوں کو مہروں کی تحریر سے علیحدہ کیا تو لفظوں اور فقروں کے معنی کھل گئے معنوں کی اس فہرست (دیکھئے شکل ۲) میں ہمیں ایسے بہت سے الفاظ ملتے ہیں جو عام اردو علاقائی زبانوں کی بول چال میں آج بھی مستعمل دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے تلفظ اور ان کی آوازوں میں بھی بہت کم فرق رونما ہوا ہے

اضافی نشانات		بنیادی نشانات	
ہڑپا دور آخر	ہڑپا دور اوّل	ہڑپا دور آخر	ہڑپا دور اوّل
[illegible]	[illegible]	V ...	V O ...
کل تعداد ۲	کل تعداد ۲۸	کل تعداد ۲۲	کل تعداد ۳۴

شکل نمبر ایک ' اشکال اور خط رواں حروف کے چند نمونے بحوالہ ایس آر راؤ

اردو اور ہندی کے تلفظ	انگریزی تلفظ	اتھروید میں	رگ وید میں	ہڑپا زبان کے مرکبات
[illegible]	PA	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	PAKA	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	MANNA	[illegible]	[illegible]	[illegible]

اس، وہ	DASA	←	←	[illegible]
اپ۔ آپ یا اپنا	AP	←	←	[illegible]
انا یا انّا	ANNA	—	←	[illegible]
ترِدا یعنی تین دستے یا ترادا	TRIDA	—	←	[illegible]
ترِکا یعنی تین	TRIKA	—	—	[illegible]
دا یا دو	DA	←	←	[illegible]
دوا یا دو	DVA	—	—	[illegible]
پرا یا پڑا	PRA	—	←	[illegible]
منا یعنی بیل وزن کی مقدار	MANA	←	—	[illegible]
سا یا سات	SAS	—	—	[illegible]
گا یا گاتے واو	GA	←	←	[illegible]

شکل نمبر ۲ چند ان لفظوں کے نمونے اور معنی جو اردو ہندی اور علاقائی زبانوں میں موجود ہیں ۔ ایس اے راؤ

مرکب	نشان نشان نشان	مرکب	نشان نشان	مرکب نشان نشان
[illegible]	O + O + E =	[illegible]	O + E =	[illegible] = O + J + O
[illegible]	O + O + V + V =			[illegible] = O + [illegible]

نشانات سے بنائے جانے والے مرکبات کے چند نمونے ۔ ایس اے راؤ

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]		[illegible]

ابتدائی اور آخری زبانوں کی ایک سوسینتیس ۲۳۷ تحریروں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ صوتیات' لغت' معنی اور ساخت کے اعتبار سے قدیم اردو یا ہڑپائی زبان ہند آریائی یعنی ویدوں کی زبان بن گئی تھی۔ ایسے تمام الفاظ جن کا حوالہ یہاں دیا گیا ہے اگ وید (RV) اور اتھرو وید (AV) میں بھی موجود ہیں ۔
اس طرح اردو کی ابتدا و نشوونما کے بارے میں ڈاکٹر سہیل بخاری کی مجموعی تحقیقات کو بھی سند حاصل ہو جاتی ہے اور یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ اردو کی ادبی و لسانی تصویری اپنے اصل تاریخی و ثقافتی اور ماحولیاتی و نسلی حوالوں سے کٹی ہوئی ہے اردو اور علاقائی زبانوں اور اردو و ہندی کے درمیان تنازعات کی پوری تاریخ کا ایک فعال عنصر رائج لسانی و ادبی تصویری بھی ہے جو حکمران اور ان کے معاون طبقوں کے مجموعی مفادات کی نگہبانی کرتی ہے اس تصویری کو برقرار رکھنے کی صورت میں لسانی تنازعات کا لاوا اسی طرح بہتا رہے گا اور انگریزی زبان و کلچر کا تسلط نہ صرف مضبوط ہو گا بلکہ اس کی مزید نشوونما کا امکان بھی پیدا ہو جائے گا جس کو

اب انگریزی داں اردو طبقہ میں الاقوامی زبان کا نام دے کر فروغ دے رہا ہے۔

کتابیات:

بخاری سہیل' ڈاکٹر۔ اردو کی کہانی ۔ لاہور
برجٹ۔ اسکیمن ۔ ر ۔ منٹ۔ دی رائز آف سولائزیشن ان انڈیا۔ دہلی ۱۹۸۳ء
کوروزؤ۔ پروٹو انڈیا۔ ماسکو ۔ ۱۹۷۰ء
کاک۔ سبھاش اے فریکوئنسی انالیسس آف دی انڈس اسکرپٹ۔ جینسن ۔ راوگ ۔ ایل ۔ اے ۔ یو ایس اے ۱۹۸۷ء
صدیقی' ریاض' اردو زبان و ادب کے مسائل' نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۸۸ء
گرک اور جگدیش' گلمپسنز آف انیشینٹ انڈیا قمر و سویٹ آئیز' سندیپ پرکاشن دہلی ۱۹۸۹ء
راؤ۔ ایس اے۔ ڈان اینڈ ڈولوشن آف دی انڈس سولائیزیشن۔ ادیتا پرکاشن دہلی ۱۹۹۱ء
ہنٹر۔ جی آر ۔ دی اسکرپٹ آف ہڑپا اینڈ موہن جودارو۔ لندن ۱۹۳۴ء
وہیلر مورٹمر ۔ دی انڈس سویلائزیشن ۔ کیمبرج یونیورسٹی پریس لندن ۱۹۵۳ء
والٹر فیرسروس۔ پری ہسٹورک بلوچستان۔ دہلی ۱۹۸۶ء
ایضاً "ایکسپلوریشن ایت اللہ ڈاٹو (کراچی) مقالہ مطبوعہ نیویارک ۱۹۷۷ء

("اوراق" لاہور)

سلیم خان گمی

دنیا کی قدیم ترین زبان پنجابی

بشریات کے عالمی شہرت یافتہ امریکی ڈاکٹر پل ہم نے ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۷ء تک وادی سواں میں کھدائی کے بعد اعلان کیا کہ انسانی ارتقاء کی اولین بنیاد وادی سواں میں رکھی گئی۔ یہ انقلابی واقعہ ڈیڑھ کروڑ سال پہلے ظہور پذیر ہوا۔ ظاہر ہے وادی سواں کے انسان نے ترک وطن نہ کیا اگر ترک وطن مقصود ہوتا تو قدرت کاملہ اس انقلابی واقعہ کو پنجاب کی وادی سواں میں ظہور پذیر نہ کرتی۔ وادی سواں کا انسان ارتقاء کی مختلف منزلیں طے کرتا رہا۔ اس ارتقاء کی قدم بہ قدم پیش رفت وادی سواں سے حاصل ہوئے فوسلز سے آشکار ہے اور ڈاکٹر ڈیوڈ پل ہم اس پیش رفت کے گواہ ہیں۔

دنیا بھر کے لسانیات اور بشریات کے ماہر یہ بات مانتے ہیں کہ زبان ایک لاکھ دس ہزار سال پہلے معرض وجود میں آئی۔ تب زبان اکھڑ' اجڈ اور نیم وحشی انسانوں کی زبان تھی۔ ایسی زبان کہاں وجود میں آئی یعنی دنیا کے کس خطے میں پیدا ہوئی۔ اس سلسلے میں کوئی بات یقین کے ساتھ بیان نہیں کی جاسکتی۔ کئی لسانی نظریات پیش کئے گئے ہیں لیکن لسانیات اور بشریات کے ماہروں کا خیال ہے کہ زبان یا افریقہ میں تخلیق ہوئی یا پاکستان کے خطہ پنجاب میں۔ اس خیال سے آثار و علائم کے ماہر بھی متفق ہیں۔ ان تمام ماہروں کا خیال ہے کہ بندر نما انسان سب سے پہلے خطہ پنجاب کے علاقہ پوٹھوہار کی وادی سواں میں وجود میں آیا۔ وادی سواں جیساکہ نام سے ظاہر ہے' دریائے سواں کی وادی ہے لیکن بشریات کے ایک ماہر رچرڈ لیکی اور اس کے چند ساتھیوں کا خیال ہے کہ بندر نما انسان نے سب سے پہلے افریقہ میں جنم لیا۔ دنیا کے کئی دوسرے ماہر رچرڈ لیکی اور اس کے ساتھی ماہروں کی بات تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ بندر نما انسان سب سے پہلے خطہ پنجاب کے علاقہ پوٹھوہار میں پیدا ہوا یعنی دریائے سواں کے کناروں پر۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ افریقہ میں بندر نما انسان بعد میں وجود میں آیا۔ ان ماہروں کے سربراہ امریکہ کے ماہر بشریات ڈاکٹر ڈیوڈ پل ہم ہیں۔ ڈاکٹر پل ہم کے خیالات سے تفصیلی آگاہی کے لئے دیکھئے۔

۱۔ رسالہ " ایشین آرکیالوجی " کیمبرج یونیورسٹی پریس ' لندن ۱۹۸۸ء

۲۔ رپورٹ۔ ساؤتھ ایشین سٹڈیز' لندن ' جلد چہارم' ۱۹۸۸ء

۳۔ رپورٹ ۔ ساؤتھ ایشین سٹڈیز' لندن ' جلد پنجم' ۱۹۸۹ء

۴۔ انٹرویو۔ ڈاکٹر ڈیوڈ پل ۔ ہم۔ امریکن سنٹر' اسلام آباد' ۱۹۷۷ء

اس انٹرویو کی نقول ڈاکٹر سیف الرحمن ڈار' گلاب گھر' مال روڈ ' لاہور اور پروفیسر محمد آصف خان'

اورنگ زیب قاسمی

سیکرٹری' پاکستان پنجابی ادبی بورڈ' سنت نگر' لاہور کے پاس بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ایک نقل میرے پاس بھی موجود ہے امریکن سنٹر اسلام آباد کے مسٹر محسن سے بھی رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

انگریزی روزنامہ " ڈان" کراچی شمارہ ۱۰ فروری ۱۹۸۳ء میں عظیم قدوائی کا ایک مقالہ بعنوان " کیا انسان نما بندر کے پیش رو پوٹھوہار سے نمودار ہوئے " شائع ہوا۔ مقالہ نگار نے جو سوال اٹھایا ہے اس کا جواب " ہاں " میں دیا جاسکتا ہے۔ بشریات کا موضوع ایک علمی معاملہ ہے اور اب جب یہ موضوع چھڑا ہے تو اسے آگے بڑھنا چاہیے۔ اس کی ابتدا دیہات سے کریں گے۔ دیہات میں تفریح مہیا کرنے والے قلندر تو آپ نے دیکھے ہوں گے۔ یہ قلندر شہروں میں بھی نظر آتے ہیں ' ریچھ' بکری اور بندر کا تماشہ دکھاتے ہیں۔ ان کے پاس چھڑی اور ڈگڈگی ہوتی ہے۔ ان کے ذریعے یہ لوگ بندر کو نچاتے ہیں۔ تماشہ دکھانے والے بندروں کے اسلاف مدت ہوئی ختم ہو گئے یہ ان کی اولاد ہیں۔ مرنے والے بندر تعداد میں زیادہ تھے اور ان کے نسلی گروہ بھی زیادہ تھے۔ وہ آج سے تین کروڑ سال پہلے پیدا ہوئے۔ جی ہاں تین کروڑ سال پہلے۔ امریکہ کا ایک مشہور مجلہ " سائنس" ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ ایک کروڑ ستر لاکھ سال پہلے براعظم افریقہ (عرابستان سمیت) براعظم ایشیاء اور براعظم یورپ سے ٹیکٹانک پلیٹ (Tectonic Plate) کی بدولت جڑے ہوئے تھے یعنی افریقہ اور یوریشیا (یورپ اور ایشیا) کے براعظموں کے درمیان سمندر نہ تھا۔ ٹیکٹانک پلیٹ کا مطلب یہ ہے کہ جیالوجی یعنی علم الارضیات کے مطابق زمین میں کچھ ایسی قوتیں اللہ تعالیٰ نے رکھ دی ہیں کہ زمین سکڑتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ سکڑنے اور پھیلنے کے عمل کے ساتھ ساتھ یہ آگے پیچھے بھی ہوتی ہے یعنی اپنی جگہ سے کھسکتی بھی ہے اس کا اوپر والا حصہ ابھر کر اور کھسک کر اوپر نیچے ہو جاتا ہے ' جو حصہ سکڑ کر یا پھیل کر اور کھسک کر آگے ہوتا ہے یا پیچھے جاتا ہے اسے ٹیکٹانک پلیٹ کہتے ہیں ۔ اس عمل کے کچھ اصول ہیں اور ان اصولوں کا ایک عمل ہے جسے ٹیکٹانکس (Tectonics) کہا جاتا ہے۔

ایک کروڑ ستر لاکھ سال پہلے جب افریقہ اور یوریشیا باہم مل گئے تو افریقہ کے بندر نما انسان یا انسان نما بندر گھومتے گھماتے اور پھرتے پھراتے ایشیا میں آگئے اور ایشیا کے بندر نما انسان یا انسان نما بندر خوراک کی تلاش میں افریقہ چلے گئے ' جب ایشیا اور افریقہ کے براعظموں میں پانی یا سمندر کی رکاوٹ ختم ہو گئی تو پھر ان بندر نما انسانوں یا انسان نما بندروں کی آمد و رفت کون روک سکتا تھا؟ ڈاکٹر ڈیوڈ پل ہم اور ان کے ساتھی محقق ٹیکٹانک پلیٹ اور بندروں کی آمدورفت کی بات تسلیم کرتے ہیں ' لیکن وہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے انسان نما بندر (Hominid) خطہ پنجاب کے علاقے پوٹھوہار میں پیدا ہوا ' نہ کہ افریقہ کے براعظم میں ان کا دعویٰ ہے کہ انسان نما بندر ایک کروڑ سال اور ایک کروڑ تیس لاکھ سال کے درمیان وادی سواں میں ارتقا پذیر ہوا۔

راولپنڈی کے قریب ۱۹۸۸ء میں آثار قدیمہ کا ایک برطانوی مشن پاکستان آیا تھا اور اس نے رواٹ اور جہلم کے قریب ہی کی پہاڑیوں کی کھدائی کی۔ اس مشن کی رپورٹ کے مطابق ٹیکٹانکس کے علم کی رو سے افریقہ اور انڈیا جس مقام پر اکٹھے ہوئے ہیں وہ پنجاب تھا اور پنجاب میں پوٹھوار کا علاقہ۔ پوٹھوہار کا دریا سواں اور اس دریا کی معاون ندیاں دریائی تہذیب و ثقافت کی ایک انوکھی اور مکمل داستان بیان کرتی ہیں' یہی وجہ ہے کہ دریائے سواں اور اس دریا کی معاون ندیاں دریاؤں کی عالمی تاریخ میں بے حد اہمیت حاصل کر چکی ہیں۔

پاکستان کے قیام سے پہلے بشریات اور آثار قدیمہ کے ماہروں کو اولین طور پر جس انسان نما بندر کے فوسلز

دستیاب ہوئے اسے راما پتھی کس کا نام دیا گیا۔ راما تو وہی ہے رام لچھمن اور سیتا والا یعنی ہندو قوم کا ہیرو اور پتھی کس یونانی زبان میں بندر کو کہا جاتا ہے ۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ رام جیسا بندر یا انسان جیسا یا انسان جیسا بندر کیونکہ رام بھی تو انسان تھا۔ رام کا حوالہ اس لئے بھی دیا گیا کہ قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان میں ہندو اکثریت میں تھے۔ راما پتھی کس کا قد چھوٹا چھوٹا تھا اس کے بعد بڑے قد کاٹھ والے انسان نما بندر کے فوسلز دستیاب ہوئے۔ بڑی قامت والے انسان نما بندر کا نام ماہروں نے سیوا پتھی کس رکھا۔ سیوا سے مراد شو ہے جسے ہندو شوجی مہاراج کہتے ہیں۔ وہی نحوست والا شوجی۔ اور کچھ طے ہو یا نہ ہو یہ طے ہو گیا کہ شوجی کا قد رام جی سے بڑا تھا۔ سیوا پتھی کس کا نام بھی اس لئے دیا گیا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور پھر یوں ہوا کہ ڈاکٹر ڈیوڈ پل بیم اور ان کے ساتھیوں کو وادی سواں سے اور فوسلز مل گئے۔ اس انسان نما بندر کا نام انہوں نے راما پتھی کس پنجابی کس (Rama Pithicus Punjabicus) رکھا۔ یہاں یہ بتا ضروری ہے کہ ماہروں کی رائے کے مطابق " سیوا پتھی کس " کی نسل آگے نہ بڑھی وہ ختم ہو گئی لیکن راما پتھی کس کی نسل آگے بڑھی۔ راما پتھی کس کی اولاد میں گوریلا چیمپنیزی نام کے بندر اب بھی جنگلوں اور چڑیا گھروں میں موجود ہیں۔ یہ ماہر ایک اور بات بھی ہمیں بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ گوریلا کو کسی سے خطرہ نہ تھا وہ خود دوسروں کے لئے خطرہ تھا۔ اس لئے وہ سوچنے پر مجبور نہ ہوا۔ چیمپنیزی کو اپنے بچاؤ کے لئے سوچنا پڑا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گوریلا کا دماغ چھوٹا رہا اور چیمپنیزی کا دماغ بڑا ہو گیا ۔ درست لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ڈیوڈپل بیم کو پوٹھوہار سے " سیوا پتھی کس " کے جو فوسلز یعنی آثار الحجر دستیاب ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ " سیوا پتھی کس " کے تالو اور آنکھوں کے مقامات اس بندر سے ملتے جلتے ہیں جسے ہم اورنگ ٹین (Orangtuan) کہتے ہیں۔ اورنگ ٹین کا قد بڑا اور بازو لمبے ہوتے ہیں اور اسے ایشیائی بندر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بندر ساٹرا اور بورنیو میں عام ملتا ہے۔ یہ سوکلو وزنی ہے اور قد کی لمبائی ڈیڑھ میٹر' رسالہ " سائنس " کی رپورٹ کے مطابق تحریر ہے کہ اس بندر کی نسل سے علاقہ پوٹھوہار میں ڈیڑھ کروڑ سال پہلے بندر نما انسان ارتقاء پذیر ہوا اور اس کا نام " پاکستان کا سیوا پتھی کس انڈیکس " رکھا گیا۔ قصہ مختصر انسان نما بندر کا نام " راما پتھی کس " ہو یا " سیوا پتھی کس " ۔ دنیا کے اکثر ماہروں کا خیال ہے کہ پاکستان کا صوبہ پنجاب کا علاقہ پوٹھوہار بشری' نسلی اور لسانی اعتبار سے دنیا میں سب سے اہم مقام ہے۔

ایک بار یوں ہوا کہ میں ۱۹۸۹ء میں شعبہ پنجابی ادبیات یونیورسٹی اور ینٹل کالج لاہور میں پنجابی لسانیات پر لیکچر دے رہا تھا۔ کلاس روم میں کئی عالم تشریف فرما تھے مثلاً" ڈاکٹر اسلم رانا' ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد ' خالد ہمایوں' پروفیسر حفیظ تائب ' سوال و جواب کی باری آئی تو ایک طالب علم نے نہایت مشکل سوال پوچھا۔ سوال تھا " جو انسان پوٹھوار میں ارتقاء پذیر ہوئے کیا ان کی نسل اب پنجاب میں موجود ہے ؟ " ظاہر ہے آپ سوال کا جواب یقین سے نہیں دے سکتے ' آپ صرف اپنا خیال ظاہر کر سکتے ہیں ' یعنی آپ اپنا نظریہ پیش کر سکتے ہیں۔ کوئی دوسرا اس سے اتفاق کرتا ہے تو خوبصورت بات ہوئی بصورت دیگر اسے اپنا خیال مبارک ۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ جس عہد پارینہ کا ذکر ہو رہا ہے اس وقت آبادیاں تو تھیں نہیں۔ انسان نما بندر یا بندر نما انسان یا ابتدائی وحشی انسان خانہ بدوش تھے۔ گھومتے رہتے تھے کبھی خوراک کی تلاش میں کبھی شکار کی تلاش میں اور کبھی بارش اور سردی سے بچنے کے لئے غاروں کی تلاش میں ۔ پھر یہ بھی ہے کہ کبھی خشک سالی ہوتی تھی کبھی

اورنگ زیب قاسمی

قحط پڑتا تھا۔ کبھی سیلاب آتے تھے تو کبھی بھونچال آتے تھے لوگ ایک جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے' اگر ایک قبیلہ یا خاندان کوئی جگہ چھوڑتا تھا تو کچھ عرصہ بعد دوسرا قبیلہ یا خاندان اس کی جگہ لینے کے لئے آجاتا تھا۔ یہ تاریخ سے پہلے کا دور ہے جب تاریخی دور شروع ہوا تو لوگ خانہ بدوش زندگی گزارنے لگے یعنی جھونپڑیوں میں رہنے لگے' لیکن بھونچال ' سیلاب ' یا قحط کی وجہ سے وہ بھی نقل مکانی کرتے رہتے ۔ پہلے انسان غاروں میں رہتا تھا پھر جھونپڑیوں میں رہنے لگا لیکن ارضی و سماوی آفتوں نے انہیں ٹکنے نہ دیا' وہ نقل مکانی پر مجبور رہا۔ انسان نما بندر' بندر نما انسان ' آسٹرک نسل کے لوگ ' کول ' بھیل ' اور منڈا قبائل کے لوگ اور پراچین دراوڑ یہ سب گھومتے پھرتے رہتے تھے اور نقل مکانی کرتے تھے۔ اگر بستیاں قائم کیں تو وہ دراوڑ تھے ایک وقت آیا کہ یہ لوگ بلوچستان ' سندھ' راجستھان ' پنجاب اور صوبہ سرحد میں پھیل گئے۔ یہ منظر نامہ آریاؤں کی آمد سے پہلے کا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے پوٹھوہار کا ارتقاپذیر انسان ان لوگوں سے گھل مل گیا جن کو آسٹرک (Austric) کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ موسموں کی شدت یا ارضی و سماوی آفات سے پوٹھوہار کا انسان مٹ گیا اور اس کی جگہ ان لوگوں نے لی جو افریقہ سے انڈیا میں سیدھے آئے یا جنہوں نے انڈیا آنے کے لئے بحیرہ روم کا راستہ اختیار کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان لوگوں کی آمد کے پیش نظر پوٹھوہار کے انسان خوف زدہ ہو کر جنگلوں میں چھپ گئے ہوں۔

آثار قدیمہ کے ماہروں کو سب سے پرانے اوزار دریائے سواں کے کناروں سے ملے ہیں تعداد کے اعتبار سے بھی زیادہ اوزار دریائے سواں کے دونوں کناروں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ کچھ اوزار ایسے ہیں جن کی مدد سے دوسرے اوزار تیار کئے جاتے تھے' کچھ اوزار ایسے ہیں جن سے اشیائے ضرورت کاٹی جاتی ہیں۔ ان اوزاروں میں چاقو بھی ہیں اور تیر بھی ہیں۔ کمان ایجاد ہو چکی تھی اور تیر سے شکار کیا جاتا تھا۔ انسان اس وقت غاروں میں رہتا تھا۔ اس نے جانوروں کو گھاس پتے کھاتے دیکھا تو خود بھی گھاس پتے اور پھل کھانے لگا۔ اس گھاس پات میں گندم' جو اور چاول بعد میں شامل ہوئے۔ یوں فصلوں کا پتہ چلا اور ہل ایجاد ہوا۔ فصلیں کاٹنے کے لئے درانتی تیار کی گئی لکڑی کاٹنے کے لئے کلہاڑی اور کلہاڑے وجود میں آئے۔ یہ وہ دور ہے جسے مورخ پتھر کا دور کہتے ہیں اور اس کو زمانہ قبل از تاریخ بھی لکھتے ہیں۔

زمانہ قبل از تاریخ کے بعد قدیم آبادی کے آثار مہر گڑھ سے ملے ہیں۔ مہر گڑھ کوئٹہ (بلوچستان) سے ۹۵ میل دور مشرق اور جنوب کی کڑ میں ہے۔ یہاں سبی کے قریب بولان کے میدان میں سب سے پہلے ۱۹۷۶ء میں آثار ملے تھے۔ مہر گڑھ میں سات ہزار سال قبل از مسیح لوگ آباد تھے یعنی آج سے نو ہزار سال پہلے لوگ مہر گڑھ میں گھر بنا کر رہتے تھے۔ یہاں سے مٹی کے برتن مورتیاں اور پتھر کے اوزار ملے ہیں۔ مٹی کے برتن ۷۰۰۰ ق م اور ۲۰۰۰ ق م کے درمیان بنائے گئے ۔ مہر گڑھ کے آثار قدیمہ پاکستان میں کانسی کے دور کی تحقیق کے لئے مفید' ضروری اور اہم ہیں۔

کوٹ ڈیجی موہنجوڈرو سے ۲۵ میل دور مشرق کی جانب ہے۔ یہاں کھدائی کے بعد الگ الگ سولہ عدد تہیں اور پرتیں ملی ہیں جن سے کوٹ ڈیجی کی تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔ آخری تین تہیں وادی سندھ کی اصلی تہذیب سے روشناس کرتی ہیں۔ ان کا تعلق ۲۹۰۰ ق م سے ۲۷۰۰ ق م تک سے ہے۔ کوٹ ڈیجی کے برتن چاک کے بنے ہوئے ہیں اور ان کی بناوٹ آمری تہذیب کے برتنوں سے مشابہت رکھتی ہے ۔ پوٹھوہار'

مرگڑھ، ہڑپہ، موہنجوداڑو، کوٹ ڈیجی وغیرہ کا ذکر اس لئے کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں عہد قدیم کے دوران میں الگ الگ آبادیاں اور بستیاں موجود تھیں جن میں مختلف رنگ و آہنگ کی بولی بولی جاتی تھی۔ ان سب میں قدیم ترین معاشرت خطہ پوٹھوار کی وادی سواں سے تعلق رکھتی ہے۔

ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ میں آبادی اتنی زیادہ نہ تھی جتنی آج ہے۔ ویسے تو آج بھی بلوچستان کے ایک مربع میل میں اٹھارہ افراد بستے ہیں لیکن اس پرانے زمانے میں تو آبادی بہت ہی کم تھی، جنگل عام تھے۔ لوگ دریاؤں کے کناروں کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ کیونکہ پانی آسانی سے مل جاتا تھا جنگل سے شکار کے لئے جانور آسانی سے مل جاتے تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ جنگل صاف کر کے کھیتی باڑی شروع ہوئی لوگوں نے آوارہ گردی اور خانہ بدوشی ترک کی اور دھرتی سے رشتہ جوڑ لیا۔ پہلے جھونپڑیاں بنائی گئیں پھر کچے کوٹھے بنے اور اس کے بعد پکی اینٹوں کے مکان اور گلیاں تیار ہوئیں۔ گاؤں، قصبے اور شہر بھی وجود میں آگئے۔ پھر شہری ریاست کی داغ بیل ڈالی گئی۔ جس کا انتظام مذہبی لوگوں کے ہاتھوں میں تھا۔ ان کو کاہن اور پروہت کہا جاتا تھا۔ ہڑپہ شہر کا انتظام پروہتوں کے پاس تھا۔ وہ اپنی رعایا کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے شہر کے اندر قلعے بنوائے اور شہر کے باہر فصیل تعمیر کی جو اتنی اونچی تھی کہ دشمن حملہ کی صورت میں اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ فصیل کچی اینٹوں کی تھی لیکن اس کا جنوبی دروازہ پکی اینٹوں کا تھا۔ فصیل کے باہر لیکن ساتھ ساتھ سڑک تھی۔ فصیل کے اندر بھی فصیل کے ساتھ ساتھ سڑک تھی جو شہر ہڑپہ کی آبادی کا احاطہ کرتی تھی۔ شہر کی زبان دراوڑی تھی اور دراوڑی تیسری زبان تھی۔ پہلی زبان وہ تھی جو منڈا قبائل سے پہلے آسٹرک نسل اور پوٹھوار کے قدیم لوگ بولتے تھے۔ اسے آپ پوٹھواری بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ علاقہ پوٹھوار میں بولی جاتی تھی۔ جب اس زبان کے لوگ ملتان گئے تو اسے ملتانی کا نام دیا گیا۔ بہرحال یہ قدیم ترین پنجابی تھی۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ دریائے جہلم سے دریائے سندھ تک اور کوہالہ پل سے سرگودھا علاقے سون سکیسر تک کا علاقہ پوٹھوار ہے یہ درست نہیں ہے پوٹھوار کا علاقہ سوہاوہ سے لے کر اسلام آباد کے قریب مارگلہ تک ہے۔ مغل بادشاہ جہانگیر (۱۶۰۵ء ـ ۱۶۲۷ء) نے تزک جہانگیری میں پوٹھوار کے متعلق یہی لکھا ہے پروفیسر انور بیگ اعوان اپنے مقالہ بعنوان "پوٹھوار" (مطبوعہ ماہنامہ "پنج دریا" لاہور، ۱۹۹۳ء) میں "تزک جہانگیری" کی تائید کرتے ہیں۔ پوٹھوار کا پہلا نام سطح مرتفع کوہستان نمک تھا۔ سب سے پہلے سی ڈی این ولایا نے ۱۸۵۳ء میں سطح مرتفع کوہستان کو سطح مرتفع پوٹھوار لکھا۔ جب ۱۰۰۱ء میں مسلمان درہ خیبر کے راستے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تو انہوں نے اس علاقہ کو تیلاب لکھا۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے بدھ مت کے دور اقتدار میں دریائے جہلم سے پشاور اور سوات تک کے علاقہ کو گندھارا کہا جاتا تھا۔ دراصل پوٹھوار گندھارا اور تیلاب کا حصہ تھا۔ جب ۶۳۰ء میں چینی سیاح ہیونگ سانگ اس علاقہ میں آیا تب یہ علاقہ اجڑ چکا تھا۔ نویں صدی عیسوی میں پوٹھوار کشمیر کا حصہ تھا۔ کشمیر کے شاہ میر سلطان شہاب الدین غازی کاشمیری (۱۳۵۴ء ـ ۱۳۷۳ء) کے وقت بھی پوٹھوار کشمیر کا حصہ تھا۔

جناب عین الحق فرید کوٹی کی تحقیق کے مطابق پالی زبان کی جنم بھومی پنجاب ہے، ان کا خیال ہے کہ پنجابی پالی سے کئی لحاظ سے گہرا تعلق رکھتی ہے اور پالی کا پنجابی سے بھی گہرا تعلق ہے کیونکہ پالی ٹیکسلا میں بولی جاتی

اورنگ زیب قاسمی

تھی اور پالی کے بعد پنجابی بھی ٹیکسلا میں مروج تھی اور عام لوگ پنجابی بولتے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اشوک نے بدھ مت اختیار کر کے پاٹلی پتر چھوڑ دیا اور ٹیکسلا کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ ظاہر ہے ٹیکسلا اور اردگرد کے علاقہ میں یعنی گندھارا میں سرکاری زبان پالی کا سکہ چلا۔ پالی نہ صرف اشوک کی وجہ سے سرکاری زبان تھی بلکہ بدھ مت کی تعلیمات کی بدولت بدھ مت کے ماننے والوں کی مذہبی زبان بھی تھی۔ کابل یعنی افغانستان بھی اشوک کے ماتحت تھا۔ بدھ مت کے مبلغ (بھکشو) ٹیکسلا کے اردگرد کے علاقوں میں گھوم کر تبلیغ کیا کرتے تھے۔ بدھ مت کی تبلیغی جماعتوں کی کوشش سے بھی پنجاب بھر میں پالی نے بے حد ترقی کی۔ پالی سے پہلے پوٹھوار کی مقامی بولی ویدی (رگ وید کی زبان) اور سنسکرت سے معاشرتی تعلق قائم کر چکی تھی اور یوں ویدی اور سنسکرت کے کئی الفاظ پوٹھوار کی زبان کا معاشرتی تعلق ویدی اور سنسکرت کے بعد پالی سے ہوا۔ اب غور فرمایئے کہ ویدی، سنسکرت اور پالی تینوں زبانیں مذہبی ہیں یعنی مذہبی تعلیمات کے فروغ کے لئے استعمال ہوتی ہیں اور کاہن پروہت پنڈت اور بھکشوان زبانوں کے مبلغ ہیں۔ جب ان زبانوں کے الفاظ معاشرتی میل یا معاشرتی ضرورتوں کے پیش نظر یا مذہبی امور و معاملات کی ادائیگی کے سلسلے میں اس بولی میں در آئے جو مقامی لوگ بولتے تھے تو پنڈتوں، پروہتوں اور بھکشوؤں نے اس بولی کو پنجابی کا نام دیا۔ یعنی اجڈ، اکھڑ اور کچا گوشت کھانے والے گندے لوگوں کی بولی۔ ویدی سنسکرت اور پالی نہریں تعلیم یافتہ، مہذب، صاف ستھرے شائستہ لوگوں کی زبانیں۔ پنجابی دراصل وہی زبان تھی جو پنجاب کے خطہ پوٹھوار کے لوگ منڈاری اور دراوڑ قبائل کی آمد سے پہلے بولتے تھے۔ معاشرتی لسانیات کے اصولوں کے مطابق جو قبائل عہد بہ عہد پوٹھوار میں آتے رہے ان قبائل کی زبانوں اور بولیوں کے الفاظ پنجابی میں شامل ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی پنجابی زبان اور اس زبان کی بولی پوٹھواری میں منڈاری، دراوڑی، ویدی، سنسکرت اور پالی کے الفاظ ملتے ہیں، یہی زبان لے کر جب اس کے بولنے والے مختلف علاقوں میں حفاظت کی خاطر یا تلاش روزگار کے لئے گئے تو جغرافیائی لسانیات کے اصولوں کے مطابق لہجہ میں فرق آگیا کبھی یہ زبان ملتانی ہوئی کبھی ماجھی کبھی لاہوری کبھی ہندی اور کبھی اردو۔

اب کچھ زبانوں کے الفاظ اور جملے نیچے درج کئے جاتے ہیں تاکہ تقابل کا کچھ پتہ چل سکے۔

۱۔ سید وارث کا ایک شعر ہیر کی داستان سے۔

والے اکھوں کلیے مندرے بھٹھ ملنگی توں نمانڑا   تے   خانہ خچ جلایا ای
کوئی حسن دی کلن گمان مندرا اک وہیے دا انت نہ پایا ای

اس شعر میں الفاظ مندرے اور ملنگی منڈاری ہیں۔

۲۔ سید وارث شاہ کا ایک اور شعر

اک تخت ہزار دی گل کیجے، جتھے رانجھیاں رنگ مچایا ای
چھیل گبھرو مست البیلڑے نیں، سندرا اک تھیں اک سوایا ای

اس شعر میں رنگ گل، چھیل، اور البیلا دراوڑی الفاظ ہیں۔

۳۔ ویدی زبان کا ایک جملہ "سترزو ستو نیبور تا اشواش ابیام سوبکر نابھی شو"

(تمہاری بگھیوں کے دھرے مضبوط اور گھوڑوں کی زنجیریں چلتے ہوں)

۴۔ سنسکرت کا ایک جملہ " بڑ عکیارو گونک سندر راستی (بوڑھا گھوڑا خوبصورت ہے)
۵۔ پالی کے کچھ جملے (۱) کتوں توں اچھاس (تو کہاں سے آیا ہے ؟)
(۲) اہاں پاکستانو دیساؤ اچھاس (میں پاکستان دیس میں آیا ہوں)
(۳) کتھاتواں کماں کروی ؟ (تو کہاں کام کرتا ہے)
۶۔ جدید پوٹھوہاری کی ایک نظم۔
اچیاں کندھاں ڈک نہ سکن پھلاں نی خوشبو (شاعری باقی صدیقی)
(اونچی دیواریں پھولوں کی خوشبو نہیں روک سکتیں)
۷۔ جدید پوٹھوہاری کی ایک اور نظم۔
گڈی نکھ گئی تے پچھے رہ گیا
بھاں بھاں کرتا اسٹیشن تے شاں شاں کرنے کن (باقی صدیقی)
(گاڑی چلی گئی اور پیچھے رہ گیا بھائیں بھائیں کرتا سٹیشن اور شائیں شائیں کرتے کان)
۸۔ پنجابی زبان کی ایک اور بولی وہ ہے جسے ہم جانگلوبا جانگلی کہتے ہیں۔ یعنی جنگل میں رہنے والے لوگوں (جنگلیوں) کی بولی (جانگلی بولی بہت ہی پرانی بولی ہے۔ یہ قدامت میں پوٹھوہاری کی بہن ہے اور یہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔ سوتیلی نہیں ہیں۔ جانگلی ان لوگوں کی بولی ہے جو حملہ آور انسان دشمن قبائل سے جان بچانے کے لئے جنگلوں کی طرف نکل گئے اور صدیوں تک جنگلوں میں رہے۔ یہ بولی دنیا کا قدیم ترین لسانی سرمایہ ہے جس پر ہمیں بجا طور پر فخر ہونا چاہیے۔ پوٹھوہاری تو وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہی' منڈاری ' دراوڑی' ویدی ' سنسکرت اور پالی سے الفاظ مستعار لے کر اپنا دامن وسیع کرتی رہی لیکن جانگلی جامد ہو کر رہ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج اپنی اصلی اور صاف صورت میں ہمیں دستیاب ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ معاشرتی لسانیات کے اصولوں کے تحت اس میں بھی دیگر زبانوں اور بولیوں کے الفاظ در آئے ہیں لیکن اتنے نہیں ہیں جتنے پوٹھوہاری میں ملتے ہیں ' پوٹھوہاری کے متعلق ایک اور بنیادی بات کا اظہار بھی ضروری ہے۔ پوٹھوہاری پہلے زبان تھی بعد میں بولی بن گئی۔ چھاچھی اور اعوان کاری اس کے لہجے (Varieties) ہیں۔ جانگلی پہلے بھی بولی تھی اور اب بھی بولی ہے اتنا طویل جمود شاید ہی دنیا کی کسی دوسری زبان پر آیا ہوگا' اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ جانگلی کا لسانی مطالعہ کیا جائے۔

جانگلی کا موجود روپ۔

باغ لویں آں تے وچ لویں آں جموں
بجناں میہاں دی پردیس تیاری اے
لاہم کیہڑی لوں مینں نہ نیوں
نیک وار کوار اے
دوئی بھلی پئے ویندے ہیں جاتوں
ماپیاں توں چوری کتاب وکھائی اے
واہ لا کے رہی ایں کتوں

اورنگ زیب قاسمی

ہین ہتناں توں بجن چھوڑی جاندے
ہین لاہ کے متوں

ترجمہ :

میں جو باغ لگوا رہی ہوں
اس میں جامن کا درخت لگواؤں گی
میرا محبوب پردیس جانے کی تیاری کر رہا ہے
لیکن مجھے اس کی منزل معلوم نہیں
سفر شروع کرنے کا دن نحس ہے اور چاند کی کیم تاریخ بھی مبارک نہیں
میں نے اپنے والدین سے چھپ کر جوتشی سے حساب لگوایا ہے
اور جوتشی کو معاوضے کے طور کان سے بالا دیا ہے
وہ عاشق کبھی زندہ نہیں رہ سکتے
جن کے محبوب انہیں دل سے نکال دیں

طے یہ ہوا کہ زبان ابلاغ کا ایک موثر ذریعہ ہے اور ابلاغ کی ضرورت معاشرہ کی اہم ترین ضرورت ہے جب معاشرہ ہی نہ ہو گا تو ابلاغ کی ضرورت نہ پڑے گی۔ وادی سواں کی معاشرت دنیا کی قدیم ترین معاشرت کو بھی ابلاغ کی ضرورت تھی اس کے لئے زبان وجود میں آئی۔ قدیم ترین معاشرہ کی زبان بھی قدیم ترین تھی اس لئے یہ دعویٰ بلا خوف تردید کیا جاسکتا ہے کہ وادی سواں کے لوگوں نے جس زبان کی بنیاد رکھی وہ زبان ہی دنیا کی سب سے پہلی زبان تھی' پنجابی اس زبان کا قدیم ترین روپ' جانگلی کی شکل میں اب بھی دستیاب ہے اور ہاں پنجابی کا جدید ترین روپ ہے اردو زبان۔

("الوہیات"" اسلام آباد)

جان ڈن اور بلھے شاہ

اورنگ زیب قاسمی

ادب مشرق کا ہو یا کہ مغرب کا ' انسانی شعور کے ارتقاء کی داستان پیش کرتا ہے ' یہ داستان زندہ انسانی رویوں کی رزمگاہ اور انسانی روح کی موسیقی ہے ' ہر ادیب اور فنکار ایک خاص تہذیبی اور فکری ماحول کی پیداوار ہوتا ہے ' اور اپنی مخصوص ذہنی اور نفسیاتی اپروچ کے مطابق اپنے ماحول کے ساتھ اپنے تعلق کا اظہار کرتا ہے ' معاشرہ جس میں ادیب زندہ رہتا ہے ' اور سانس لیتا ہے ' جہاں وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ تعلقات بناتا اور بگاڑتا ہے ' اس کے فن پاروں کا موضوع بالواسطہ یا بلاواسطہ یہی معاشرہ ہوتا ہے ' اگر وہ اپنی واردات قلب بیان کر رہا ہو تو بھی یہ اس انسان کی واردات قلب ہوتی ہے جس کے ذہنی ' فکری اور جذباتی سانچے اس خاص معاشرے کے ذہنی ' فکری اور جذباتی پس منظر میں مرتب ہوتے ہیں ' جس میں وہ زندگی بسر کرتا ہے ' جیلانی کامران کے الفاظ ہیں۔

" جس نوع کا کلچر ہو گا اسی نوع کا انسان ظاہر ہو گا اور ایسے انسان سے اسی نوع کی تہذیب وقوع پذیر ہو گی۔ انسانی اور تہذیبی رویئے دراصل کلچر مرتب کرتے ہیں اور ایک اعتبار سے یہ رویئے کلچر کا پرتو ہوتے ہیں۔" (۱)

کلچر راتوں رات کھڑی ہو جانے والی کسی عمارت کا نام نہیں ۔ بلکہ یہ ایک ایسے درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں عمیق ماضی میں ہوتی ہیں اور اس کی شاخوں پر مستقبل کے شگوفے پھوٹتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا۔

" کلچر کا عمل درخت کی نمو اور پھیلاؤ کا عمل ہے .... کلچر کی نمو کا عمل تو سراسر " لاشعوری وقت کے وسیع کینوس کے تابع اور معاشرے کے ایک خاص نفسیاتی عمل کی پیداوار ہے جسے کسی جادوئی چھڑی کی مدد سے بیدار نہیں کیا جا سکتا۔" (۲)

یہی کلچر ایک خاص نفسیاتی عمل کے ذریعے ادبی فن پاروں میں اپنا اظہار کرتا ہے اس ضمن میں J.B.Priestley لکھتا ہے ۔ ۔ ۔

"They have behind them thousands of generations of human beings who acquired and handed on certain patterns of behaviour feeling thought that find their way into literature either emerging from the unconcious or coming from various concious modification of culture itself." -(۳)

جان ڈن (۱۵۷۲ ـ ۱۶۳۱) اور بلھے شاہ (۱۶۸۰ ـ ۱۷۵۸) کی علمی اور فکری آبیاری مختلف قسم کی تہذیبوں

نے کی ہے۔ اول الذکر یورپی تہذیب کے فکری اور ادبی رویوں کا جبکہ مؤخر الذکر مشرقی تہذیب کے فکری اور ادبی رویوں کا پروردہ ہے۔

اور بقول "Scheller" ۔ ۔

" یورپ اور ایشیا نے انسانیت کے سر علم کو بالکل مختلف نقطہ ہائے نظر سے دیکھا ہے ۔ یورپ کی سمت سفر مادے سے روح کی طرف ہے اور ایشیا کی سمت روح سے مادے کی طرف ۔" (۴)

لہٰذا جان ڈن اور بلھے شاہ کے تقابلی جائزے سے قبل دونوں کے فکری اور تہذیبی پس منظر کو جاننا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جان ڈن کو سترہویں صدی کا شاعر گردانا جاتا ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی شاعری ۱۶۳۳ء میں پہلی بار منظر عام پر آئی ۔ R.G.Gox لکھتا ہے۔

"Yet he was born only ten years later than shakespeare by no means all of what we now consider to be typically Elizabe then poetry was in existence when he began to write." (۵)

J.B.Priestley اس عہد کے تہذیبی رویوں کی یوں نقشہ کشی کرتا ہے۔

"Within the national uinty of this comparitively small society there was astonishing variety it contained for example not only Anglican but also Catholics paritan Sceptics and etheist, It was grimly ascetic and wildly licentious it reached extreme of brutality and refinement. ....The life of this London was an incredible medley of lutes and lice silks and reduce madrigals and the plague industrious apprentices and pimps and harlots white faced puretan preachers and red faced drunker poets ... To this age we feel everything was titanic, Was there a glimpse of some new moral order in the universe then it came looming through the mists of ignorance and superstitions colossally intimidating but the mounting individualism prepared todefy it went marching on slits.... There was then this variety there was all these contradictions there were these pols of opposites ....." (۶)

پریسٹلے کا یہ قدرے طویل اقتباس اس عہد کے تنوع ' رنگا رنگی ' انتشار اور تضادات کی منظر کشی کرتا ہے ۔ اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے " یوجین آئنکو " کہتا ہے ۔ ۔ ۔

" اس کا سبب یہ تھا کہ کلچر نے انسان کو مرکز بناتے ہوئے ماوراء اور بیتا فزکس کو اپنے کائناتی نقشے سے خارج کر دیا تھا۔" (۷)

۱۵۴۳ء میں جب Copernicus کی De Revolutionibus شائع ہوئی تو یورپ کی فکری دنیا میں

تسلسل بچ گیا۔ صدیوں سے تسلیم شدہ نظریات کی عمارت میں شگاف پڑ گیا۔ روایتی مسیحی فکر کے مطابق زمین کائنات کا مرکز تھی۔ لیکن کاپرنیکس کی تحقیقات نے اس کے برعکس نتائج اخذ کئے تھے۔ یورپ کا تمام تر علامتی نظام زمین کی مرکزیت پر استوار تھا۔ جبکہ کاپرنیکس کی تھیوری میں سورج کی مرکزیت پر اصرار تھا۔ اس کا نتیجہ اجتماعی شعور اور اجتماعی لاشعور میں تضاد کی صورت میں نکلا۔ اور معاشرے کا تہذیبی ڈھانچہ ٹوٹنے اور بکھرنے لگا۔ الغرض ایک ایسا معاشرہ جو مختلف قسم کے تضادات کا مرقع تھا۔ جس کا ثقافتی ڈھانچا ایک اچانک تبدیلی کی زد میں شکست و ریخت کا شکار تھا۔ جان ڈن کی فکری آبیاری کا ذمہ دار تھا۔ اس صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہے۔

"It was in the face of those historical cultural and intellectual eventualities that Donne began to write.Revolution displacement secularity eccentricity and the theoratical problem of the status of writing itself all conditioned his output and seemed to propose a poetic stance of speculative scepticism." (۸)

جان ڈن کی طرح بلھے شاہ کا عہد بھی کچھ کم پر آشوب نہ تھا۔ بقول توفیق رفعت۔

"Bulleh Shah lived at a time of great upheaval.The Mughal Empire was breaking up and the punjab was being persistently rent by petty cheifs and maruders. The full bitterness of Bulleh Shahs "برا حال ہویا پنجاب دا" will come through against this backdrop." (۹)

بلھے شاہ نے جب آنکھ کھولی تو مغلیہ سلطنت کا آفتاب نصف انتشار پر تھا۔ بلھے شاہ ابھی صرف ستائیس برس کے تھے جب اورنگزیب عالمگیر کی وفات ہوئی۔ عالمگیر کی وفات کے ساتھ ہی مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ یہ وہ دور تھا جب پنجاب پر سکھوں کی یورش کا آغاز ہوا۔ اور بندہ بیراگی نے پنجاب میں غارت گری شروع کر دی۔ نواب عبدالصمد خان کی صوبیداری (۱۷۱۵ء۔۱۷۲۶ء) کے زمانے میں سکھوں کی تاخت و تاراج بڑھ گئی۔ فرخ سیر بادشاہ کے عہد میں بندہ بیراگی کو گرفتار کر کے ختم کر دیا گیا۔ نواب زکریا خاں کے عہد صوبیداری (۱۷۲۶ء۔۱۷۴۳ء) میں ہندوؤں کی جانب سے مخاصمت شروع ہوئی اور حقیقت رائے کا فتنہ اٹھا۔ سکھوں اور ہندوؤں کی مشترکہ مخالفانہ کوششیں ظاہر ہوئیں۔ نواب معین الدین خان کی گورنری کے زمانے (۱۷۴۸ء۔۱۷۵۳ء) میں لاہور کے اردگرد سکھوں کی یورش شدت اختیار کر گئی اور سکھ باغیوں کو نوکھا بازار میں اس جگہ پھانسی دی گئی جسے شہید گنج کہا جاتا ہے۔ اس دوران احمد شاہ ابدالی نے لاہور پر تین بار حملے کئے اور ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ ابدالی نے لاہور پر چوتھا حملہ کیا اور لاہور کو سلطنت دہلی سے کاٹ دیا گیا۔ لیکن ابدالی کے جاتے ہی سکھوں نے دوبارہ یورش شروع کی اور چونکہ بے حد دلیر بھی ہو چکے تھے۔ اس لئے آدینہ بیگ گورنر لاہور نے ان کے ساتھ صلح کر لی۔ اس صلح اور حکمت عملی کا آدینہ بیگ کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور اس کی صوبے داری کے باوجود سکھوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ یہ دیکھ کر ۱۷۵۷ء میں آدینہ بیگ نے مرہٹوں کو پنجاب میں مداخلت کی دعوت دی۔ مرہٹے اس وقت تک دہلی تک آ پہنچے تھے۔

اورنگ زیب قاسمی

مرہٹے لاہور داخل ہوئے اور ان کے داخلے کے ساتھ ہی ان کا اقتدار دریائے سندھ تک پھیل گیا۔ لاہور سکھوں اور مرہٹوں کا شہر بن گیا۔ پنجابی کا لفظ تکڑا اسی زمانے کی یادگار ہے۔ ۱۷۵۸ء میں بلھے شاہ نے وفات پائی۔ انہوں نے کسی اور تہذیبی ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور کسی اور ماحول میں انہوں نے زندگی کو خیرباد کہا۔ سکھوں کی چارکردہ تباہی اور بربادی کو مورخوں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سرہند شہر کی تباہی (۱۷۱۰ء) کے بارے میں مشہور مورخ خافی خان لکھتا ہے۔

" آں سگ سیرتاں بدخصال شروع بغارت مال و قتل رجال و اسیر نمودن اطفال و عیال و وضیع و شریف نمودہ تاسہ چہار روزچناں بیداد و ظلم نمودند کہ شکم عورت حاملہ راپارہ ساختہ' ہر طفل کہ زندہ بری آمد بر زمیں زدند۔ و عمارات را سوختہ فقیر و غنی رایک صورت می ساختند و ہرجا کہ مسجد و مقبرہ و مزار بزرگان یافتند سکستن و کندن بر آوردن استخوان مردہ تحقیر نمودند۔" ۔(۱۰)

ایک سکھ مورخ گنڈا سنگھ اپنی کتاب " بندہ سنگھ بہادر " میں اسی تباہی کے بارے میں لکھتا ہے۔

"The heartless Muslim population was subjected to indiscriminate pounder,city lost in life and property." (۱۱)

ایک اور سکھ مورخ گیان سنگھ سرہند کے قتل عام کے بارے میں لکھتا ہے۔

" سکھوں نے شہر میں داخل ہو کر لوٹ مار کی وہ آفت برپا کی جس کا بیان نہیں۔ جو سامنے نظر پڑا مارا گیا بچہ کیا جوان ' کیا ادھیڑ عمر کیا بوڑھا تلوار سے دو ٹکڑے ہوا۔ بیچاری پٹھانوں کی مستورات اور امیرزادیاں جنہوں نے کبھی کسی دوسرے آدمی کی شکل نہ دیکھی تھی۔ بازاروں اور جنگلوں میں ماری ماری پھریں۔ نہ ماں کو بچی کی خبر رہی نہ بیٹے کو باپ کی سدھ۔ سب کو اپنی اپنی پڑ گئی۔" (۱۲)

انسانیت کی یہی تذلیل اور عورت کی بے حرمتی دیکھ کر بلھے شاہ کا حساس دل پکار اٹھا تھا۔

چھڑاں آپو اپنی پے گئی
دھی ماں نوں لٹ کے لے گئی

طوائف الملوکی' قتل و غارت ' لوٹ مار ' چوری ڈاکے' اور بیرونی حملہ آوروں نے جہاں امن و سلامتی کے پرخچے اڑا دیئے وہاں معاشرے کی سیاست ' معیشت اور سماجی اقدار کو بھی تار تار کر دیا۔ پنجاب کی تہذیبی زندگی بے چینی اور بدامنی کا شکار ہو گئی ' لوگوں کو ہروقت اپنی جانوں ' عزتوں اور فصلوں کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ الغرض معاشرتی زندگی کا شیرازہ بری طرح بکھر گیا۔

بلھے شاہ اور جان ڈن دونوں نے ایسے معاشروں میں آنکھ کھولی جو تبدیلی کے عمل سے گزر رہے تھے اور دونوں شعوری اور لاشعوری طور پر اس تبدیلی کے عمل سے متاثر ہوئے اور ان کی شاعری میں اس تبدیلی کے حوالے سے رد عمل بہت واضح دکھائی دیتا ہے جان ڈن کی تمام شاعری Thomas Docherty کے بقول اس تبدیلی کا رد عمل تھی۔ Docherty کہتا ہے۔

"..... The adeption of metaphysical anti-literal mode of writing in donnes poetry and prose is of some more immediate relevance in relation to those revolutions in

and time which dominates his contemporary intellectual world."- (۳)

space

جان ڈن کی شاعری کا مطالعہ اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ وہ شعوری طور پر اس تبدیلی اور اس کے اثرات سے آگاہ تھا۔ وہ زمان و مکان کے بدلتے ہوئے تصورات ' مغربی تہذیب کے ایک نئے عہد کے آغاز اور معاشرتی ڈھانچے کی شکست و ریخت اور ان سب کے نتائج سے آگاہ تھا اور H.J.C.Grierson کے الفاظ میں۔

"Donne the most thoughtful and imaginative of them all is more aware of disintegration than of comprehensive harmony of the clash between older physics and metaphysics on the one hand and the new science of Copernicus and Galileo and Vesalius and Bacon on the other." (۴)

John Donne کہتا ہے:

And new philosophy calls in doubt
The element of fire is quite put out
The sun is lost and the earth and mans wit
Can well direct him where to look for it,
And freely men confess that this worlds spent
When in the planets and the firmaments
They seek so many new they see that this
Is crumbled out again to his atomies,
Tis all in peeces all cohaerence gone
All just supply and all relation:
Prince subject Father Sonne are things forgot
For every man alone thinks he hathgot
To be a phoenix and that then can bee
None of that kinde of which he is but hee" (۵)

بلھے شاہ بھی اپنے عہد کی بدلتی ہوئی صورت حال سے متاثر ہوئے۔ اور ان کی متعدد کافیوں میں اس کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ اس ضمن میں جیلانی کامران کا یہ تبصرہ قابل توجہ ہے۔

" بلھے شاہ کی کافیوں کے جائزے سے علم ہوتا ہے کہ ان کی کافیوں کا ایک رنگ وہ ہے جہاں وہ اپنے ماحول کا ذکر کرتے ہیں اور زمانے کے ناسازگار حالات کو شدت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ مثلاً " اٹھ جاگ

اورنگ زیب قاسمی

گھراڑے مار نتیں۔ ایہہ سون ترے درکار نتیں " بڑی وضاحت کے ساتھ اپنے عہد کی شکست و ریخت کی نشاندہی کرتا ہے۔ ..... اس کافی کے یہ جملے قابل غور ہیں۔

پھلاں پھل چنبیلی لا لا
سوسن سنبل سرو نرالا
یار لڑاں کیتا ہے حالا
نرگس نت خمار نتیں
"تھے میر ملک سلطاناں
سبھے چھڈ چھڈ گئے ٹکاناں
کوئی مار نہ بیٹھے ٹھاناں
لشکر جنہاں شمار نتیں"

اس ضمن میں ایک اور کافی کے جملے غور طلب ہیں:

در کھلیا حشر عذاب دا
برا حال ہویا پنجاب دا
وچ ہاویہ دوزخ ساڑیا
ساکوں آ مل یار پیاریا"

اور یہی کیفیت اس طرح بھی بیان کی گئی:

مغلاں زہر پیالے پیتے۔ بھوریاں والے راج کیتے
سب اشراف پھرن چپ کیتے ۔ بھلا اونھاں نوں جھاڑیاں ای
رہ رہ کے مشتاق ماریا ای۔ کہ کس نوں یار اتاریا ای

اسی طرح وہ کافی بھی جس کا عنوان ہے " الٹے ہور زمانے آئے " ایسی ہی حالات زمانہ کی عکاسی کرتی ہے۔ ان کافیوں کے اشارے تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کی طرف ہیں اور زمانے کی صورت بد سے بدتر ہوتے دکھائی دیتی ہے " (۶)

جان ڈن کی شاعری کا ایک متنازعہ پہلو اس کا مابعد الطبیعاتی ہونا ہے۔ کچھ نقاد اسے پورے وثوق اور یقین سے مابعد الطبیعاتی شاعر قرار دیتے ہیں جب کہ بعض نقاد اسے کسی پہلو سے بھی مابعد الطبیعاتی شاعر ماننے کو تیار نہیں۔ یہ امر ایک حقیقت ہے کہ جان ڈن کو مابعد الطبیعاتی شاعر قرار دینے والے بھی اسے اصطلاحی معنوں میں مابعد الطبیعاتی شاعر نہیں مانتے۔ اس ضمن میں ایک معتبر نام H.J.C.Grierson کا نام ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"A metaphysical a philosophica poet to the degree to which even his contemporary Greville might be called such Donne was not-" (۷)

ایک اور مقام پر وہ اسی بات کو یوں کہتا ہے۔

"Metaphysical in this large way Donne and his followers to Cowley are not." (۱۸)

اس موضوع پر R.G.Cox کی رائے بھی قابل غور ہے ۔ وہ کہتا ہے۔

"The term may be regarded simply as a label of no precise significance and it is often convenient to leave it at that" (۱۹)

جان ڈن اگرچہ بلاشبہ وسیع معنوں میں مابعد الطبیعاتی شاعر نہیں تھا۔ لیکن اس کی شاعری میں مابعد الطبیعاتی عناصر ملتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ H.J.C. Guierson کی تحقیق کے مطابق John Donne خود کو Dante کی قبیل کا مابعد الطبیعاتی شاعر سمجھتا تھا۔ اس ضمن میں متوازن رائے Priestley J.B کی ہے جو Donne کی شاعری کو Introspective and quasi-metaphysicae verse قرار دیتا ہے۔(۲۰)

جان ڈن کی طرح بلھے شاہ بھی معروف معنوں میں مابعد الطبیعاتی شاعر ہرگز نہ تھے ۔ لیکن ان کی شاعری میں بھی مابعد الطبیعاتی موضوعات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ اس ضمن میں تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند " کے مصنف کی رائے قابل توجہ ہے۔

" بلھے شاہ کی شاعری جہاں پر اثر ہے وہاں اعلیٰ درجے کے مابعد الطبیعاتی افکار بھی رکھتی ہے جیسے کائنات کی تخلیق کے بارے میں فرمایا ہے۔

کن فیکون کہیا کمایا
بے چونی سے چون بنایا
احد دے وچ میم رلایا
تاں کیتا ایڈ پسارا(۲۱)

John Donne مغربی ادب کے ان معدودے چند شاعروں میں شامل ہے جنہوں نے محبت کے جملہ پہلوؤں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ جان ڈن کی شاعری کا بڑا حصہ ان Love Poems پر مشتمل ہے جن میں Donne نے محبت کے فکری اور جذباتی پہلوؤں کو موضوع سخن بنایا ہے ۔ Donne کی شاعری میں Cynical love، Conjugal love اور Platonic Love کے تین ممیز ادوار ملتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی Donne کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہجر، وصل ، جفا اور وفا کی کیفیات کو جس انداز میں پیش کرتا ہے وہ مغربی ادب کے لئے بہت حد تک اجنبی اور مشرق کی صوفیانہ روایت کے بہت قریب ہیں۔ خصوصاً کیفیت وصل بیان کرتے ہوئے وہ بلھے شاہ کے بہت قریب چلا جاتا ہے جان ڈن بھی بلھے شاہ کی طرح وصل سے شعری طور پر آشنا ہوا ہے۔

John Donne کی نظم The good-morrow کا آخری Stanza قابل غور ہے

My face in thine eye thine in mine appeals
And true plain hearts doe in the faces rest

Where can we finde two better hemiospheares
Without sharpe north without declining West
What cur dyes was not mixt equally,
If ovr two loves be one or thou and I
Love so alike that none doe slacken none candie

Lovers infiniteness میں وہ کہتا ہے۔

Then changing heart to Joyne them so wee shall
Be one and one anothers All.

محبت کی وہ کیفیت جہاں محبوب کے ساتھ اتصال کی سرشاری میں عاشق اپنے وجود سے بے خود ہوتا دکھائی دیتا ہے بلھے شاہ کی شاعری کا بھی ایک اہم پہلو ہے۔

رانجھا رانجھا کردی ہن میں آپے رانجھا ہوئی
سدو مینوں دھیدو رانجھا ہیر نہ آکھو کوئی
رانجھا میں وچ میں رانجھے وچ غیر خیال نہ کوئی
میں نہیں اوہ آپ ہے اپنی آپ کرے دل جوئی

جیلانی کامران بلھے شاہ کے کلام کے اس پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

" بلھے شاہ کے کلام کا اصل مزاج وصل اور کیفیت وصل کا ہے جہاں وقت کی مداخلت کو روکا گیا ہے اور جہاں حجاب کے اٹھ جانے کا ذکر ہے اور تبع و اتحاد کا تذکرہ ہے ۔ تصور شیخ کی مدد سے دل نے جس نظارے کی نعمت حاصل کی ہے اور قلب جس سعادت سے آشنا ہوا ہے وہاں تلاش کرنے والے اور تلاش ہونے والے نے ایک دوسرے کی پہچان کی ہے۔ اس رشتے نے رانجھے اور ہیر کی دوئی کو حذف کر دیا ہے۔ اور ایک غیر منقسم کیفیت وصل کو آشکار کیا ہے جو دل پر وارد ہوتی ہے یہ سارا نظارہ الف اور میم کی معرفت سے نمایاں ہوتا ہے۔ بلھے شاہ کی شعری سرشت جذب اور استغراق کی ہے ۔ جس سے دائمی احساس مسرت پیدا ہوتا ہے کیفیت وصل نے بلھے شاہ کے کلام کو اس کی قائم رہنے والی تازگی دی ہے۔ جو تازہ ہوا کی طرح انسانی دلوں کو موسم بہار سے آگاہ کرتی ہے ۔ ۔ ۔ ایسے شاعر شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں جو وصل سے شعری طور پر آشنا ہوتے ہیں۔ بلھے شاہ کیفیت وصل کی بنا پر منفرد ہیں ۔ اور غالباً اسی وصل کے تاثر کے لئے ہمارے تمدن نے نسل در نسل بلھے شاہ کی طرف برابر رجوع کیا ہے آج سے پچاس برس قبل بلھے شاہ کی واردات وصل سے نسبت قائم کرنے کے لئے کچھ اس طرح کے شعر عام سنے جا چکے تھے۔

بلھے شاہ میں تھیاں سائیاں
میں عاجزوں پائیاں جدائیاں
یار رنگیں جدوں اکھیاں لائیاں
بنے بھانبڑ لا کے یار
لگا کیسے ہن چھپنا کیسے ہن(۲۲)"

اورنگ زیب قاسمی

بلھے شاہ کی شاعری' بابا فرید اور امیر خسرو کی صوفی روایت کا تسلسل ہے اسلامی تاریخ میں روایت عرفان کا سب سے امتیازی وصف یہ ہے کہ مسلمان معاشرہ جب بھی سیاسی انحطاط کا شکار ہوتا ہے تصوف معاشرے کے تہذیبی اور فکری رویوں کے تحفظ کی ذمہ داری سنبھال لیتا ہے۔ یوں ثقافتی ڈھانچا' سیاسی انتشار کے اثرات سے بڑی حد تک محفوظ رہتا ہے۔ بلھے شاہ نے بھی اپنے عہد میں یہی فریضہ سرانجام دیا۔ جس کے نتیجے میں طویل سیاسی غلامی کے باوجود پنجاب میں مسلمانوں کی تہذیبی روایات مٹنے سے محفوظ رہیں۔ بلھے شاہ کے کلام میں مسلمانوں کی تہذیبی روایات اس موثر طریقے سے ظاہر ہوئی ہیں کہ دست بردزمانہ ان کے آثار محو کرنے میں ناکام رہا۔ بلھے شاہ کا یہی کارنامہ ان کو مسلم برصغیر کے تہذیبی نقشے میں مرکزی مقام عطا کرنے کا باعث ہے John Donne کی شاعری میں بھی تہذیبی روایت کی بقا کا سوال مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ T.S.Eliet جان ڈن کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت Unificatin sensibility یعنی جذبہ و فکر کی وحدت قرار دیتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے صوفیاء ظاہر و باطن میں ہم آہنگی قرار دیتے ہیں۔ یہ رجحان داخل اور خارج میں توازن کی کوشش کا مظہر ہے۔ وہ توازن جو انسانی شخصیت کے ماورائی پہلو اور طبعی پہلو' میں مناسبت پیدا کرنے سے عبارت ہے John Donne کے عہد میں قرون وسطی کے مذہبی طرز احساس اور احیائے علوم کے جدید طرز فکر میں شدید تضاد پایا جاتا تھا جس کے نتیجے میں اجتماعی شعور اور اجتماعی لاشعور میں ہم آہنگی ختم ہو چکی تھی۔ اور معاشرہ شدید قسم کے فکری اور جذباتی تناؤ کا شکار تھا۔ جان ڈن کی شاعری اس تضاد کو کم کرنے کی کوشش ہے۔

Thomas Docherty کے بقول:

"Donnes basic impulse in his various manipulations of space and time is to merge the seculas wored of his writing with the incantatory word of sacred scripture." (۲۳)

جان ڈن اپنی کوشش میں مکمل طور پر کامیاب ہو جاتا۔ مگر Bacon کی نثر اور Milton کی نظم نے مغرب کی ادبی روایت کو بالکل ہی مختلف رخ دے دیا۔ اور جذبہ و فکر کا تضاد شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی عیسوی میں آکر Donne کی طرف دوبارہ رجوع ہوا۔ اور ۔ ۔ ۔

"The poetry of Donne thus became a means of thirapy for the modernist poet or reader suffering form our split conciousness and in need of restitution wholeness and pure individuality." (۲۴)

جان ڈن اور بلھے شاہ کی شاعری میں ایک حیرت انگیز مماثلت لہجے کی بھی ہے۔ اگرچہ دونوں' دو مختلف زبانوں میں شاعری کر رہے تھے لیکن دونوں کا لہجہ بالکل ایک جیسا ہے۔ جان ڈن کے شعری اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے R.G.Cox لکھتا ہے .....

"The first point likely to strike the reader who comes to Donne from the smoth fluncy of average elizabe than lyric or sonnet is the surprizing directness

of the speaking voice conveyed by his rythm and diction. For God sake hold your tongue and let me love." (۲۵)

یہاں موسیقیت اور نغمگی سے زیادہ ابلاغ پر توجہ ہے۔ لیکن یہ بات نہیں کہ Donne کی شاعری موسیقیت سے تہی ہے بلکہ ۔ ۔ ۔

"As in dramatic verse the aim of Realism is of course not absolute whatever metrical licences are taken the pattern of line and stanza remains to reinforce modify or generally play against the rhythms of speech with the effects of highlened intensity and concentration proper... Donnes lyrics have a music of their own though immediate effects is of vivid speech rather than song." (۲۶)

جان ڈن کی طرح بلھے شاہ بھی منفرد اسلوب کے حامل ہیں۔ جس کی سب سے بڑی خصوصیت مکالماتی لہجہ ہے بقول خالد احمد:

"Bulleh shah is more frequentlyquoted poet in punjabi conversation one reason for this popularity is his relatively modern vocabulary but the other more powerful reason is that his lines are essentially non-poetic in terms of rythme.quality with a vocative use of the proper noun bulleh makes for precise assimilation in common speech" (۲۷)

بلھے شاہ بھی جان ڈن کی طرح روایتی اسلوب کی پابندی نہیں کرتے بلکہ ۔ ۔ ۔

"Although cast in varied meter and rhythme the poems of Bulleh shah seem to obey only the rules of spontaneous speech of the punjab " (۲۸)

حوالہ جات:

۱۔ جیلانی کامران ۔ ہمارا ادبی اور فکری سفر ۔ ۳۲

۲۔ وزیر آغا' ڈاکٹر "تنقید اور احتساب" ۔ ص ۳۰

۳۔ J.B prisetley Literature and western man P (ix)

۴۔ Scheller, Sociology of knowledge

اورنگ زیب قاسمی

۵۔ R.G.Cox: polican gaide to english Literature:vol:iii,p 106
۶۔ J.B priestley: literature and western man:p:27,28
۷۔ جیلانی کامران "ہمارا ادب اور فکری سفر" ص ۳۷
۸۔ Thomas dochirty:John Donne undonne:P:28
۹۔ Taufiq rafat bulleh shah vindered into english:P:xvi
۱۰۔ خافی خان : منتخب اللباب ص ۶۰۵ کلکتہ ۱۸۶۹ء
۱۱۔ گنڈا سنگھ : بندہ سنگھ بہادر ص ۲۸۷ امرتسر ۱۹۳۵ء
۱۲۔ گیان سنگھ : "شمشیر خالصہ" ص۔ ۱۰۹
۱۳۔ Thomas docherty:Jahn donne undonne:P:30
۱۴۔ H.J.C Gvierson: Metaphysical lyrics and poems:P:xiv
۱۵۔ Thomas docherty: John donne undonne:P:39
۱۶۔ جیلانی کامران : ہمارا ادبی اور فکری سفر ص ۸۰۔۸۱
۱۷۔ H.J.G Gvierson:Metaphysical lyrics an po emes:P:xxviii
۱۸۔ Ibid:
۱۹۔ R.C Cox:pelican guide to english literature:valty:P:113
۲۰۔ Priestlly: literature and western man:P:29
۲۱۔ تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان و ہند جلد نمبر ۳ ص ۳۰۵
۲۲۔ جیلانی کامران : ہمارا ادبی اور فکری سفر ص ۸۱'۸۲
۲۳۔ Docherty:John dinne undinne P: 5152
۲۴۔ 4Ibid:P:
۲۵۔ Cox:pelican guide toenglish literature:val iii,R 107
۲۶۔ Ibid:
۲۷۔ Khalid Ahmad: introduction to Bulleh Shah:P:219-220
۲۸۔ Khalid Ahmad :introduction to Bulleh Shah:P:5

("شبیہ" خوشاب)

اورنگ زیب قاسمی

عبدالخالق طور

شاہ حسین کے کلام کا یورپی شاعری سے موازنہ

لاہور شہر کا ایک صوفی شاعر حسین جس کا مزار شالامار باغ کے قریب باغبانپورہ میں واقع ہے۔ "شاہ حسین" تخلص کرتا تھا اور اس کا دور زندگی ۱۵۳۸ء سے ۱۵۹۹ء رہا۔ اس کے کلام میں اور یورپی شاعری میں علامتی مماثلت اور فکری ہم آہنگی کا ملنا تعجب خیز ہے۔ کیونکہ اس دور میں بین الملکی رابطے نہ ہونے کے برابر تھے خصوصاً ادیبوں اور شاعروں کے لئے۔

ہومر اور جعفری چاسر حسین سے قبل کے دور کے شاعر ہیں۔ جبکہ شیکسپیئر جو الزبتھ اول کے عہد کا شاعر و ڈرامہ نویس تھا حسین کا ہمعصر ہے۔ اس وقت ہندوستان میں مغل شہنشاہ اکبر اعظم کی حکومت تھی۔

راقم نے کوئی ساڑھے تین سو کے قریب ایسے اشعار ڈھونڈ نکالے ہیں جن میں ایسی مماثلت ملتی ہے مگر یہ ایک لاانتہائی سلسلہ ہے۔ اگر کوئی طالب علم اس کی کھوج کرے تو یہ پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ بن سکتا ہے۔

نمونے کے طور پر چند اشعار درج کرتا ہوں۔ قارئین محسوس کریں گے کہ حسین کے کلام میں ڈرامائی انداز اور پختہ کاری ہے۔ یورپی شعرا جبکہ خیال کو سپاٹ طریقے سے منظوم کرتے ہیں۔

بھولے ماۓ کتیا لوڑیں
اس چرخے نوں ساڈیاں لوڑیں
(شاہ حسین)

"For fate has wove the thread of life
And twins even from the birth are
misery and man."

HOMER Odyssers
BK viiL,263(POPetr.)

لکھی لوح قلم دی ماۓ
موڑ نے سکی ایسے موڑ
(شاہ حسین)

"As when a thing is shapen it shall be."

G,CHAUCER:

The Knightes TaleL,608

کوئی دم رشتاں مویاں دی خبر نہ کائی
چوتھ جتیاں دل ڈولی چائی ساھڑے پچھائی
سس نال دیون طعنے داج وہونی آئی
(شاہ حسین)

جنھاں کھڑی نہ کتی میری ڈوری
مائے کیہ دوش کماراں نوں
کولوں تیرے لد لد ویندے
تیں نہ پدھا بھاراں نوں
(شاہ حسین)

چوتھ جتیاں دل ڈولم ڈولی
کندھ اٹھائی ڈنڈا ڈولی
جنگل جانے ساہوڑا
(شاہ حسین)

"Who makes the bridal bed
Bridal Say truely "
"The grey headed sexton
That delves the grave duly.
"Tell me thou bonny bird
When shall I marry me
When six braw gentlemen
Kirkward shall carry ye."
Scot("1771-" 1832)

اگے بھوجل تارو نہ گھرا
ارلے ونج نہ چپا گھرا
جڑا ونج پیا ونج لاہور
تاں میں کوک سنایا ای
(شاہ حسین)

"He taised a sigh so piteous and profound
That it did seem shatter all his bulk
and end his being.

اورنگ زیب قاسمی

SHAKSPEARE Hamlet

Act,11,Sc,1L94

بھول ہاں نہ کھیڈن دیندی
ہنجو درد روایاں تیں
چاہڑ کے چاندن سیاں کھیڈن
جا گل تر دہایاں تیں
(شاہ حسین)

"A minute of smile and a hour to weep in
A pint of joy to a peck of trouble
And never a laugh but moans come double
And that is life.

PAULLAURENCEDunbar

life,

ٹج جیندے بھولے مائے
جن کر لاۓ باپ نی
(شاہ حسین)

"In his conception wretched from womb
So to the tomb:"

SIR FRANCIS BACON THE World

جم رویاں قل رووان گے
پلڑ پیا دن کھانی را
(شاہ حسین)

"We wawl and cry
When we are born we cry that we have
come
To the Stage of fools."

SHAKESPEARE King Lear

Act,ib Sc,6.

آپ کیہن تیری عقل کمینی
کون کے توں داناں

انہیں راہیں جاندے ڈٹھے
میر ملک سلطان
(شاہ حسین)

i) "O: why do wretched men so
desire to draw their day unto the utmost
date

SPENSER Faerrie Queen
BK.iv canto iii St.1.

ii) Where is Caesar gone now in
command high and able
Or xerxes the splended complete in his
table
Or fully with power of eloquence
ample
Or Arestotal of genius the highest
example

JACOPONE DA TODI
De contempu Mundi(colestr)

چڑی آئی وصل نہ کلّی
کیا راجہ کیا رانا
(شاہ حسین)

"The begger and the King
with equal step tread forward to their
end"

THOMAS SOUTHERN
The fatal marrage Act, 11 Sc.2.

اک دن تیّوں سپنا تھیسیں
گلیاں پاٹل والیاں
اُڈ گئے بھور پھلاں دے کولوں
سُن پتراں سُن ڈالیاں
(شاہ حسین)

اورنگ زیب قاسمی

i) "When all that we know or feel
or see
Shall pass like an unreal mystery.

SHELLEY On death.

ii) "Then Hasten we maid to twin
our braid
to- morrow the dreams and flowers will
fade.

THOMAS MOORE
Lalla Rokh the light Harem
L.380

اس جیوّں دا وڈ کیہ بھرواسا
جیوّں دہن سرائں رات
(شاہ حسین)

"A fair where thousand meet but non
can stay
an inn where traveller bait then post
away.

ISAACHAWKINS BROWNE
Immortality of Soul (tr.from Latin

("چہار سو" راولپنڈی)

میاں محمد بخش کا تصورِ حسن

میاں محمد بخش (۱۸۳۶ء۔ ۱۹۰۷ء) ریاست جموں و کشمیر کے صوبہ جموں کے رہنے والے ایک عظیم پنجابی شاعر کی حیثیت سے اپنے صوبہ جموں سے باہر پنجاب میں بھی نہایت مقبول ہیں۔ ان کی شاعری پنجاب ہی کی پنجابی شاعری کی مرکزی روایت کا تسلسل اور اس کی توسیع ہے اور یہ مرکزی روایت وحدت الوجودی تصوف کے تصورات و واردات کے زیادہ تر پنجاب کی اپنی فطری اور تہذیبی تمثالوں اور پنجابی اوزان میں اظہار پر مبنی ہے۔

میاں محمد بخش اپنی ایک شعری تصنیف مرزا صاحباں میں لکھتے ہیں:۔

مدح حسن دی وچ تے ورد اندر میٹھوں جاندے نہیں ہار کبہنے

چنانچہ ان کی شاعری حسن کی مختلف صورتوں اور ان کے تصور حسن کا اظہار بھی ہے اور شعری حسن آفرینی کا ایک لازوال مظہر بھی۔ سید علی عباس جلال پوری کہتے ہیں کہ

"حسن کے اظہار کی تین صورتیں تسلیم کی گئی ہیں۔ صوفیا حسن ازل کو چوتھی صورت قرار دیتے ہیں۔ فطری مناظر کا حسن، حسن نسوانی اور حسن ادا یا اسلوب فن کا حسن۔"

(مجلہ فنون (غالب نمبر) لاہور۔ مئی جون ۱۹۶۹ء ص ۳۳)

میاں محمد بخش چونکہ ایک صوفی شاعر ہیں اس لئے وہ حسن ازل کے وجود کے بھی قائل ہیں۔ یہ نظریہ وحدت الوجودی تصوف کی بھی اساس ہے اور سید علی عباس جلال پوری کے مطابق:

"اس کا سب سے بڑا شارح سکندریہ کا نواشراقی فلسفی فلاطینوس تھا وہ کائنات کے تمام مظاہر کو حسن ازل کی تجلی گاہ سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ حسن وجمال خواہ کسی روپ میں ہو، حسن ازل ہی کا عکس ہے۔"

(مجلہ "فنون" (غالب نمبر) لاہور" مئی جون ۱۹۶۹ء ص۔ ۳۱)

میاں محمد بخش کے وحدت الوجودی تصور حسن کے مطابق اللہ تعالٰی کی ذات ہی حسن مطلق اور حسن ازل ہے اور انسانوں سمیت کائنات کے سارے مظاہر میں اسی حسن مطلق یا حسن ازل کا پرتو ہے جس کی کشش درد عشق پیدا کرتی ہے۔ اپنی معروف تصنیف سفر العشق (سیف الملوک) میں کہتے ہیں:

جلوہ حسن گجھے دا وسدا ہر وچ ہردا پھیرا
انہیں نہیں محمد بخشا دل دا حسن لٹیرا!
جے کر صورت وچ نہ ہوندا مالک آپ دلاں دا

اورنگ زیب قاسمی

فیسوں چمک ہمار دلاں دی کیہڑا جیو ملا تدا
ہر ہر وچ نہ ہوون بے کر ہر دے روپ سمانے
واثق مندیاں دا دل کھچی کد معشوق لیانے
توڑنے پتے روپ و سکیان توڑے تھوڑے
اصل اندر سبھ یک ہوون گے ندیاں نیر وچھوڑے

میاں محمد بخش کے نزدیک اللہ تعالٰی کی ساری مخلوقات میں حسین ترین ہستی انسان کی ہے۔ اور انسان کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ:

آدم باجھوں دھرت نہ سوہجے، زیب زمین دا ایہی
شان انسان جوان بھلے دا ملکاں ناوں اگے

اور نوع انسانی میں حسن و جمال کا بلند ترین مرتبہ محبوب خدا حضرت [illegible] کو حاصل ہے لہذا عشق رسول عشق خدا ہی کا واسطہ ہے اسی حوالے سے میاں محمد بخش رسول کریم [illegible] کی تعریف میں کہتے ہیں کہ:

دوزخ جنت وچ اساناں جو خلق اللہ دی وسدی
پاک جمال تساڈے کا رن ہر دی جان ترسدی
عشق ترے وچ گھائل ہوئے مائل حسن ازل دے
سوہنے پرتی نہ کیتی شادی کرکر ہلدے

میاں محمد بخش کے خیال میں حسن ازل تک رسائی مرشد کی راہ نمائی دل کی بیداری ہی سے ممکن ہے چنانچہ انہوں نے "سفرالعشق" ("سیف الملوک")میں شہزادہ سیف الملوک کو انسانی روح اس کے والد شاہ عاصم کو مرشد کی اور شہزادی بلکہ خاتون کو دل کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے سیف الملوک کو دوشاہ مہرہ کی صورت میں شاہ عاصم سے راہ نمائی ملتی ہے جو صدق اور محبت کی علامتیں ہیں اور جب ملکہ خاتون طلسمی نیند سے بیدار ہو جاتی ہے تو سیف الملوک کو بدیع الجمال تک رسائی ہو جاتی ہے۔ بدیع الجمال حسن ازل کی علامت ہے۔

میاں محمد بخش وحدت الوجودی تصور حقیقت کے تحت ہی انسان اور فطرت دونوں میں حسن ازل کی جھلک دیکھتے ہیں اور اس کو اپنی شاعری میں موقع و محل کے مطابق تفصیل یا اجمال کے ساتھ بڑے شفقت سے پیش کرتے ہیں۔ انسانی حسن بالعموم اور اس میں نسوانی حسن بالخصوص ان کا موضوع ہے انہوں نے اپنی تصانیف سفرالعشق' سوہنی میہنوال' مرزا صاحباں سسی پنوں اور ہیر رانجھا میں مرکزی کرداروں کے ساتھ ساتھ دوسرے اہم کرداروں کی بھی عمدہ سراپا نگاری کی ہے اور اس سراپا نگاری میں حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ وہ مردانہ کرداروں میں جمال کے ساتھ جلال کو بھی ابھارتے ہیں جب کہ ان کے بیشتر نسوانی کردار لطافت و نزاکت کے مثالی نمونے ہیں ان کے نسوانی حسن کا تصور ایرانی اور پنجاب و جموں کی خصوصیات کے امتزاج سے صورت پذیر ہوا ہے چنانچہ ان کے نسوانی کرداروں کے قد لمبے' چہرے روشن' ہونٹ سرخ اور پتلے' آنکھیں بادامی' ناک ستواں' پیشانیاں کشادہ اور ان پر بندیاں' سیاہ زلفیں اور ان میں پیچ اور مینڈھیاں ہیں۔ انہوں نے سراپانگاری میں بھی ایرانی اور مقامی دونوں طرح کی فطری اور تہذیبی تشبیہات

سے کام لیا ہے "سفر العشق" میں بدیع الجمال کا سراپا بیان کرنے سے پہلے باقاعدہ وضاحت کرتے ہیں کہ:

جیویں محبوباں دی گل وسدا تکھی مرچ مسالیا
کجھ کجھ ڈول ہو دے گی اوہو کدھرے ہوگ پنجالی
جو جریاں دی لذت بجتی نرے آکھیے ماسوں
لذت دار سلونا بھائی تو محمد پاسوں!

جو جرے سبزی ملے گوشت کے سالن کو کہتے ہیں جو میاں محمد بخش کے نزدیک سادہ گوشت کے سالن سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے گویا وہ نرے ایرانی سراپا کی بجائے ایرانی اور مقامی حسن کے امتزاجی روپ کو زیادہ موثر جانتے ہیں بدیع الجمال کے حسن کے بعض پہلوؤں کی پیش کش دیکھیے۔ کہتے ہیں:

کنڈل دار دو زلفاں سرتے کالے ناگ ڈنگالے
ہر مینڈھی سرکڈھے جیوں کر بشیر بسیہ نکالے
خوب بداں اکھیں بھلی چیر میاں اب بھاڑی
کل لنک حلک سارے جیوں کریک اجاڑی
چناچم سفید قلم دا جیوں کاغذ شمیروں
ریشم قسم اجی دا پای لیھا سوت حریروں

میاں محمد بخش کو اپنے وحدت الوجودی تصور کے رشتے ہی سے فطری مناظر و مظاہر کے حسن و جمال سے بھی گہرا لگاؤ ہے اور ڈاکٹر غلام حسین اظہر کے بقول:

" اس رویے کی بدولت خواجہ فرید اور میاں صاحب نے مظاہر فطرت کی عکاسی کا بھی حق ادا کیا ہے۔ خواجہ فرید کے یہاں روہی اور چولستان کا حسن پر تو فگن ہے تو میاں صاحب کے یہاں کشمیر کا فطری حسن و جمال۔ جمال پسندی ان کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔"

(میاں محمد بخش۔ ۱۹۸۹ء۔ ص ۳۷)

میاں محمد بخش کا مشاہدہ بہت وسیع ہے اور ان کی تصانیف میں اپنے وطن جموں و کشمیر کے ساتھ ساتھ پنجاب کے فطری مناظر و مظاہر کے خوبصورت لفظی مرقعے بھی ملتے ہیں۔ وہ عام طور پر فطری حسن کا بھی تندہی تشبیہی تمثالوں کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔ اور فطرت کے ساتھ جموں و کشمیر اور پنجاب کی تہذیب کو بھی اجاگر کرتے چلے جاتے ہیں۔ "سفر العشق" سے چند اشعار دیکھیے:

جتھ کھلار چنار کھلوتے زاہد یار کنارے
کرن دعائیں مولا سائیں پری دکھا کے مارے
رنگا رنگ بہار پھلاں دی جیوں کڑیاں وچ میلاں
بھر بھر جھنج پھلاں دے کڈھن ویلاں دین روپیلاں
ہوا بہاڑی پنچھی بولن تھاں تھاں لاکھڑی
سو ہے سارے چٹے کالے تتری رنگ سنہری

انہوں نے فطرت کے محض ایک دو شعبوں اور ان کی .... تمثالوں کی بجائے تقریباً سارے فطری شعبوں کی مخصوص تمثالیں کثرت سے پیش کی ہیں۔

اورنگ زیب قاسمی

میاں محمد بخش نے اپنی تصانیف میں شعری حسن ادا کے متعلق اپنے تصورات بھی جگہ جگہ بیان کئے ہیں وہ شعری حسن ادا کو شعری تجربے کی مطابقت میں دیکھتے ہیں اور مخصی تجربہ ان کے نزدیک یہی شاعری کی اساس ہے۔

سروائے جس حال خنائے لعل جواہر اوہا
جس اسمتر سنی خلائی مل اوخاں دا لوہا

شعری حسن ادا میں وہ بیان کی صفائی، لطافت، تہ داری، تازہ کاری، ترنم و نغمگی اور پختگی کو خاص طور پر سراہتے ہیں۔ چند اشعار، جن سے ان اوصاف میں سے بعض کی پسندیدگی ظاہر ہوتی ہے یہ ہیں:

پنچھی خوش آواز ہزاراں جو باغاں بولن
شاعر کجھے انہاں تھیں ہوئے سخن جواہر تولن
مقبل دی گل سدھی سادی ہے مقبول پیاری
لفظ کسیں نے سمجھے جتے یار رکھن دی کاری
رانجھا برخوردار سنی دا بلبل باغ سخن دی
شعراوہدا جیوں داؤ گجھری آتے باس چمن دی
جس وچ گجھی رمز نہ ہووے دردمنداں دے حالوں
بہتر چپ محمد بخشا سخن اجیہے نالوں!

میاں محمد بخش کی شعری تصانیف جمال الہی، حسن انسانی، حسن فطرت اور حسن اسلوب شاعری سے ان کی گہری وابستگی کا اظہار بھی ہیں اور معنوی اور صوری حسن آفرینی کے زندہ جاوید نمونے بھی۔ جن سے کروڑوں پنجابی خواں ہمیشہ لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔

(" تخلیق " لاہور)

اشفاق سلیم مرزا

ہماری دیومالا۔ تاریخی مغالطہ یا حقیقت

اورنگ زیب قاسمی

عمومی طور پر تاریخ سے مراد بنی نوع انسان کے حوالے سے ماضی میں بیتے ہوئے واقعات لیا جاتا ہے۔ تاریخ نگاری اولین ادوار میں صرف وقائع نگاری تک محدود تھی۔ ان واقعات کی مربوط صف بندی اس ضمن میں نہیں آتی تھی بلکہ یوں کہئے کہ اس زمانے میں تاریخ کا ایسا وقوف' خیال آرائی سے باہر تھا۔ بعد ازاں تاریخ کے مختلف ادوار میں ایسے قوانین دریافت ہوئے جو کسی بھی دور میں حالات و واقعات کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ ایسے قوانین کی دریافت کا سہرا ابن خلدون اور کارل مارکس کے سر ہے۔ ان دریافتوں کے بعد تاریخ شناسی اور تاریخ نگاری کے نئے افق کھلے۔

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو تاریخ ایک ایسا علم ہے جو اس روئے زمین پر ہونے والے ہر سماجی عمل کو ایک انسانی کاوش کے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے ایسا کرتے ہوئے یہ علم صرف زمینی حوالوں کو ہی خاطر میں لاتا ہے اور تمام تر ماورائی حوالوں کو رد کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے چلن میں اس قدر سر و مہر ہے کہ وہ تمام تر اساطیری اور مذہبی حوالوں کی گرہیں اسی ڈھنگ سے کھولنا چاہتا ہے اور ہر واقعہ کی اسی کلیے سے عقدہ کشائی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ غرض کہ ہر واقعہ جو ماضی میں دیوتاؤں سے منسوب ہے یا پھر ماورائیت کی رومانیت میں گم ہے۔ تاریخ اس کا انسانی حوالوں سے کھوج لگانا چاہتی ہے تاکہ اس کی بکھری ہوئی کڑیوں کو ایک منطقی ربط دے سکے۔ خواہ وہ کثرت الہیت (Polytheism) سے وحدانیت کی طرف سفر ہو یا ٹرائے پر اگا میمنون کے لشکریوں کی یلغار۔ تاریخ سب بھیدوں کو کھولنا چاہتی ہے۔ تحقیق کی یہ جستجو ہینرک شلیمن (Schliemann) کو ٹرائے لے جاتی ہے اور کئی پرتوں کی کھدائی کے بعد وہ جس محل کو دریافت کرتا ہے۔ وہ اسے پریام کا محل سمجھتا ہے۔ جب اس کی بیوی صوفیہ پریام کے زیورات پہنے دنیا کے سامنے آئی تو بہت سوں نے اس پر یقین نہ کیا۔ شلیمن اس تگ و دو میں تھا کہ ہومر نے جو کچھ لکھا ہے اس کی تاریخی حقیقت کو جانے اور دنیا کو بھی بتائے۔ ہمارے ہاں تاریخ شناسی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم پہلے سے منظور شدہ تاریخی حقیقتوں کے تسلیم کرنے کو نہ صرف باعث سعادت سمجھتے ہیں بلکہ ایسا کرنے سے سرخرو ہوتے ہیں اور انعام پاتے ہیں۔ ہمیں شلیمن کے طرز تحقیق سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بہت سے دانشور اور محقق جو سب کچھ جانتے ہیں انہوں نے مصلحتاً چپ سادھ رکھی ہے لیکن کچھ عرصہ سے چند دانشوروں نے چپ کی دیوار پار کی اور ایسی باتیں کی ہیں جو پہلے نہیں کی گئی تھیں۔

احمد ندیم قاسمی نے ۱۷ جنوری ۱۹۹۳ء کے "جنگ" کے جمعہ میگزین میں انٹرویو دیتے ہوئے کہا" یہ کلچر جو

علم

ہمارا پیدا ہو رہا ہے یعنی ' پنجاب ' سندھ ' سرحد اور بلوچستان کے لوگوں کے ملنے سے جو کلچر پیدا ہو رہا ہے وہ پاکستانی کلچر ہے اور وہ صورت پذیری کے عمل سے گزر کے پیدا ہو رہا ہے ' یہ کہنا کہ پاکستان کا کوئی کلچر ہی نہیں ہے سراسر غلط بات ہے رہا مسلم کلچر۔ تو مسلم کلچر نام کی کوئی چیز نہیں ہے کوئی بھی مسلم کلچر لے لیں وہ دوسرے ممالک کے مسلم کلچر سے مختلف ہوگا لیکن ہماری آب و ہوا ' ہماری تاریخ اور ہمارے تجربات مختلف ہیں تو اسلامی کلچر کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسا اسلامی کلچر جو روس سے لے کر انڈونیشیا تک ایک ہو۔ ہمارے ہاں ایسا کلچر نہیں ہے اس لئے مذہب کا رد عمل یقینی" ہے۔ لیکن بیشتر جو اثرات کلچر پذیری کی وجہ سے ہوتے ہیں وہ وہاں کی تاریخ' آب و ہوا اور پرانے رسم و رواج کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے میں کہتا ہوں کہ جب ہم پاکستان کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا آغاز محمد بن قاسم سے کیوں کریں ؟ کیا محمد بن قاسم سے پہلے اس دھرتی پر کوئی نہیں بستا تھا ان کا اپنا کلچر تھا اور وہ کلچر ہم تک پہنچا۔ یعنی موہنجودڑو کا کلچر بھی ہمارا کلچر ہے" اس طرح قاضی جاوید نے مسلم فلسفہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے " جنگ " کے جمعہ میگزین ۳۱ جنوری ۱۹۹۳ء میں کہا " مسلم فلاسفہ نے فلسفے کے ارتقاء میں کسی اعتبار سے کلیدی کردار ادا نہیں کیا اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ ایسا کردار ادا کر بھی نہیں سکتے تھے۔ فلسفے کا پودا مذہبی سماج میں نشوونما نہیں پاتا اس کے لئے سازگار ماحول صرف سیکولر اور لبرل معاشرے میں مہیا ہوتا ہے البتہ مذہبی معاشرے میں الہیات یا علم کلام یعنی مذہبی عقائد کی عقلی تعبیر و توجیہہ کا رجحان پیدا ہو سکتا ہے۔ امام غزالی سے علامہ اقبال اور علی شریعتی تک جن دانشوروں کو فلسفی قرار دیا جاتا ہے وہ اصل میں متکلمین تھے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے کے علوم کے حوالے سے مذہب کی تعبیر و تشکیل کی لیکن اس قسم کی کاوشیں فلسفے کے ذیل میں نہیں آتیں۔ معاملہ تو یہ ہے کہ پوری مسلم تاریخ میں فلسفی ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔"

تاریخی حوالے سے ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہماری بھی کوئی دیومالا ہے یہ ایک منظور شدہ تاریخی حقیقت ہے جس پر نظرثانی کی اجازت نہیں۔ ہر تخلیق کار کے لاشعور میں یہ ایک ٹیبو (Taboo) کی طرح پھنسی ہوئی خون آشام بلا ہے جس کے انتقام سے ہر کوئی ڈرتا ہے ہم قصداً" تاریخ کے ان ابواب کو کھلوانا نہیں چاہتے جن میں اندر کی کڑک ' چمک اور اگنی کی گرمی ہے ہم ان سے لاتعلق رہنا چاہتے ہیں اردو ادیبوں میں بہت کم ایسے ہیں جن کی تحریروں میں اساطیری میراث کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان میں قرۃ العین حیدر ' وزیر آغا اور انتظار حسین شامل ہیں۔ اگر ہم قدیم تہذیبوں کے تسلسل کو معلوم تاریخ کے تناظر میں دیکھیں تو اولین ادوار میں اساطیری یا دیومالائی ادب کے وسیع میدانوں سے گزرنا پڑتا ہے ہومر اور ہسوئڈ (Hesoid) نے جو کچھ طویل نظموں کی شکل میں یونانیوں کو دیا وہ آنے والے فنکاروں ' ادیبوں اور تاریخ نویسوں کے لئے مشعل راہ بنا۔ سوفوکلیس ایسکائلس اور یوریپیڈیز نے جن کرداروں کے گرد اپنے ڈراموں کا تانا بانا بنا وہ سب دیومالائی کردار انہوں نے ایک منظم طریقے سے متعارف کروائے تھے ان کا یہ سحر ہیں نہیں رہا بلکہ اب تک مغربی ثقافت کی مختلف پرتوں میں ان کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

ہمارے ہاں وادی سندھ کی دیومالائی کہانیوں کا سراغ ابھی تک نہیں ملا۔ نہ وہ رسم الخط پڑھا جا سکا ہے لیکن اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ویدک تہذیب کی سب سے پہلی کتاب رگ وید اسی دھرتی پر نظموں

اورنگ زیب قاسمی

میں ڈھلی جسے آج پاکستان کہتے ہیں رگ وید کا سپت سندھو جسے فارسی دانوں نے ہفت ہند کا نام دیا۔ دراصل اس خطے کو کہتے ہیں جس میں سندھ اور اس کے معاون دریا بہتے ہیں۔ رگ وید میں سندھ سندھو ' جہلم و تستا' چناب اسکنی یا چندر بھاگ راوی پروشنی یا ایراوتی اور ستلج شتادرو کہلاتے تھے۔ آج ہم جسے پنجاب کہتے ہیں وہ ماضی کی رزمیہ نظموں یعنی بھگوت گیتا اور پرانوں کا پنج ند تھا جس کا فارسی میں ترجمہ پنج آب کیا گیا۔ آج جہاں پانچوں دریا ملتے ہیں۔ اس مقام کو پنجند کہا جاتا ہے۔

رگ وید جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس خطے کی قدیم ترین اور ویدک مذہب کے حوالے سے مقدس ترین کتاب ہے اور ان کے نزدیک الہامی کتابوں کے ضمن میں آتی ہے۔ لفظ وید کا مطلب ہے علم یا حکمت اور رگ کے معنی ہیں نظم اس طرح ہم رگ وید کو شعری حکمت کہہ سکتے ہیں۔

رگ وید ایک ہزار سے زیادہ مناجاتوں پر مشتمل ہے اس کو دس منڈلوں یا کتابوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ منڈل کو چکر بھی کہتے ہیں۔ یہ مناجات مختلف رشیوں سے منسوب ہیں۔ زیادہ تر مناجاتیں دیوتاؤں کی نذر کی گئی ہیں جن میں "اگنی" اور " اندر " سرفہرست ہیں اس کتاب میں جہاں ایک نئی سرزمین کو دریافت کرنے کے سلسلے میں آریاؤں کی تگ و دو کے واقعات بیان کئے گئے ہیں وہاں مختلف دیوتاؤں کی مقامی سورماؤں اور لوگوں کے ساتھ چپقلش کی داستانیں بھی رقم ہیں اس میں دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کی عظمت کے گیت بھی ہیں۔

ایک جگہ دریائے سندھ کا ذکر یوں آتا ہے۔ " اے اندر ' فانی انسان تیری نعمتوں کی بدولت گھوڑوں اور مویشیوں کی دولت سے مالا مال ہے " " تو اسے دولت سے ایسے بھر دیتا ہے جیسے دور سندھو پانی سے لبالب ہے"

(کتاب اول ۸۳:۱)

ہمیں آریائی حملے کے وقت مقامی باشندوں کا ہی کثرت سے ذکر ملتا ہے جنہیں رگ وید میں داسیو کہا گیا ہے اکثر محققین کے نزدیک وہ دراوڑی نسل کے لوگ تھے ان کا ذکر رگ وید میں ایک جگہ یوں کیا گیا ہے۔

" ہمارے دشمن بے رسم اور بے خبر داسیو ہیں۔ وہ غیر انسانی افعال کے مرتکب اور مختلف قوانین پر عمل پیرا ہیں۔ او دشمنوں کو غارت کرنے والے ! داسیو کے ہتھیار کو کند کر دے۔"

(رگ وید ۱۰'۲۲'۸)

ان دونوں قوموں کے درمیان رنگ ' نسل ' مذہب اور زبان کا فرق تھا۔ کیونکہ اکثر جگہوں پر آریاؤں نے داسیو کے رنگ کی تضحیک کی ہے اور ناک چپٹی ہونے کے باعث انہیں بلاناک کے لوگ کہا ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ بتانا مقصود تھا کہ اس خطے کی دیومالائی تفصیلات جنہیں ہم آج تک نظرانداز کرتے چلے آئے ہیں معلومات سے مالا مال ہیں۔ وہ تہذیبیں جو آج توحیدی مذاہب کی پیروکار ہیں یا سیکولر نظام حکومت اپنائے ہوئے ہیں تاریخ کے اس دور سے گزری ہیں۔ وہ اپنے ماضی کے نقوش کو اپنانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتیں۔ ان میں سوائے چند ایک کے سبھی روزمرہ کے معمولات میں سے دیومالائی عناصر کو فراموش کر چکے ہیں لیکن اسے اپنا ماضی ضرور مانتے ہیں۔

مصر ہماری طرح ایک مسلم ملک ہے لیکن اس کے باوجود فراعین کے ساتھ ساتھ دیومالائی خداؤں اور س

لوسرس، آمن رے اور اخناتون کے آتون کو اپنی میراث تسلیم کرتا ہے۔ تاریخ اس بات کی طرف توجہ دیتی ہے کہ کس طرح قدیم تہذیبوں کی نشوونما کے دوران کاثر امیت کے نظریے کی جگہ توحیدی نظریے نے جنم لیا۔ یقیناً" ایسا کرتے ہوئے وہ اس سے ماورائی عنصر کو خارج کر دیتی ہے۔ مصر میں توحیدی نظریات مختلف فرعونوں کے زمانے میں پروان چڑھے۔ آمن رے کی شان میں جو مناجاتیں کی گئی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں۔ ایک قدیم دستاویز کے سوہیں اقتباس میں جو کچھ رقم ہے وہ یوں ہے:

" زمانہ قدیم میں جو سب سے پہلے وجود میں آیا وہ آمن ہے وہ اول ہے اور اس کے راز کو کوئی نہیں پاسکا اس سے پہلے کسی دیوتا نے جنم نہیں لیا۔ اور اس کے ساتھ بھی کوئی نہ تھا کہ اس کی صورت کے بارے میں بتاسکتا۔ نہ اس کی کوئی ماں تھی جس کے حوالے سے اس کا کوئی نام ہوتا نہ اس کا کوئی باپ تھا جو اس کو جنتا اور کہتا کہ یہ میں ہوں۔

"Ancient Near Eastern Texts Relating to the Old Testament"

Princeton University Press 1950 PP- 365-368 Editor

James B.Poitchard.

اس کے بعد اخناتون کا توحیدی دور آتا ہے جس نے آمن رے کے بعد آتون کو متعارف کروایا۔ جو اس کا واحد خدا تھا۔ اخناتون کی اپنی تحریریں امرا کے مقبروں کی دیواروں پر کندہ ہیں جنہیں آج بھی تقریباً" ساڑھے تین ہزار سال گزرنے کے بعد ویسے ہی پڑھا جاسکتا ہے۔ اخناتون اس طاقت واحد کو حرارت سے تشبیہ دیتا ہے۔ اس طرح اس کا خدا توانائی اور تخلیق کی علامت اور منبع ہے پہلی دفعہ اخناتون نے اس قوت کو غیر مادی قرار دیا جبکہ اس سے پہلے خدا مادی تھے انہیں دیکھا اور چھوا جاسکتا تھا۔

تاریخ دانوں نے یہیں قیام نہیں کیا۔ بلکہ تقابلی مذاہب کے مطالعہ میں بعض دلچسپ انکشافات کئے جون اے ولسن نے آتونیت اور عبرانی مذاہب میں مماثلتوں سے بحث کی ہے اس نے زبور کی مناجات ۱۰۴ اور آتون کی مناجات کے مندرجات پر غور کرنے کے لئے کہا ہے اس کے نزدیک وہ دونوں بہت ملتی جلتی ہیں۔

زبور (۱۰۴) ۲۰ تا ۲۴	آتون کی مناجات
○ آفتاب اپنے غروب کی جگہ جاتا ہے۔ اندھیرا کر دیتا ہے تو رات ہو جاتی ہے۔	○ جب تو مغربی افق میں غروب ہوتا ہے تو زمین پر موت جیسی سیاہی پھیل جاتی ہے
○ جس میں سب جنگلی جانور نکل آتے ہیں جوان شیر اپنے شکار کی تلاش میں گرجتے ہیں اور خدا سے اپنی خوراک مانگتے ہیں۔	○ ہر شیر اپنی کچھار سے باہر آجاتا ہے تمام حشرات ○ الارض کاٹتی ہیں۔
○ آفتاب نکلتے ہی وہ چل دیتے ہیں اور جا کر اپنے ماندوں میں جا رہتے ہیں۔	صبح کے وقت جب تو افق پر طلوع ہوتا ہے تو اندھیرے کو دور بھگا دیتا ہے۔
○ انسان اپنے کام کے لئے اور شام تک اپنی محنت کرنے کے لئے اٹھتا ہے۔	○ آدمی اٹھ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں تمام دنیا محنت کرنے نکل پڑتی ہے۔
○ اے خداوند تیری صنعتیں کیسی بے شمار ہیں تو	○ آتون تیری صنعتیں بے شمار ہیں انسانی نگاہ سے

اورنگ زیب قاسمی

نے یہ سب حکمت سے بنایا	پوشیدہ ہیں۔
○ زمین تیری مخلوقات سے معمور ہے۔	اپنی مرضی سے مالا مال کیا۔

تاریخ دان جب ایسا تقابلی جائزہ لیتا ہے تو اس کا مقصد کسی کو جھٹلانا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ہر دستاویز مفید ہوتی ہے۔ وہ صرف یہ معلوم کرنے میں کوشاں رہتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان انسانی رشتے کیا ہیں؟ کون سی شے پہلے تھی اور کون سی بعد میں آئی؟ وہ انسانی فکر کے ارتقاء کی درمیانی کڑیوں کے متعلق رشتے تلاش کرتا ہے کہ کیسے انسان قدیم اندھیروں سے نکل کر جدید اجالوں میں آیا۔ لیکن وہ ایک نکتہ ضرور نکالتا ہے کہ یہ سب انسانی ذہن کی اختراع ہے۔ یہ سب دیوتا اور دیویاں اس کے تخیلات کی دین ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کی فکر آج جس مرحلہ میں داخل ہوئی ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ روز اول سے یہاں کے لوگ وحدانیت کو مانتے تھے بلکہ مختلف مرحلوں سے گزر کر وہ اس مقام پر پہنچے ان کی اپنی ایک تاریخ اور دیومالا تھی جو ان کی ثقافتی میراث تھی۔ پسماندہ معاشروں میں ثقافت کی کئی پرتیں بیک وقت مروج ہوتی ہیں جیسے ہندوستان میں کاثر امیت کے ساتھ ساتھ توحید پر ایمان رکھنے والے مسلمان بھی بستے ہیں۔ بدھ اور جین مت کے ماننے والے بھی موجود ہیں۔ قدیم دراوڑی نسل کے دھرتی ماتا کو ماننے والے بھی موجود ہیں۔ سکھ مذہب توحیدی مذہب ہے ہندوستان کی مذہبی ترکیب یک رنگ نہیں ہے اسی طرح یورپ میں آج عیسائیت اور سیکولر نظریات ساتھ ساتھ چل رہے ہیں مگر پھر بھی یونانی اور رومی دیومالا ان کی ثقافت میں رچ گئی ہے۔ یہ ان کے جدید نظریات پر حاوی نہیں ہے۔ ان کے لئے مشکلات پیدا نہیں کرتی۔

("مستقبل" "اسلام آباد)

ڈاکٹر خورشید رضوی

اسلامی ثقافت میں جمود کے اسباب

گزشتہ چند برسوں کے دوران جب مجھے عرب ممالک کی مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچر دینے کا اتفاق ہوا جو بحیثیت مجموعی تاریخ علوم یا علوم کے کسی خاص شعبے میں مسلمانوں کے مقام سے متعلق تھے تو تقریباً ہر مرتبہ یہ سوال مجھ سے پوچھا جاتا رہا کہ وہ اسباب کیا تھے جو اسلامی ثقافت میں جمود کا باعث بنے۔

یہی سوال گاہے گاہے براہ راست یا گھما پھرا کر مجھ سے بہت سے اور لوگوں نے بھی پوچھا جن کے دلوں میں بہت سے شکوک تھے' خصوصاً علم و ثقافت کی تاریخ میں مسلمانوں کے حصے کے بارے میں۔ ان کا یہ متشککانہ موقف سوال کی ساخت ہی سے ظاہر تھا۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ اگر واقعی بقول آپ کے مسلمانوں کو علم و تمدن کی تاریخ میں ایسا اونچا مرتبہ حاصل تھا تو پھر آج مسلمان معاشرے کی اس درجہ پسماندگی کا کیا سبب ہے۔

اس تشکک اور قنوطی نقطہ نظر کی اساس یہ ہے کہ بعض لوگوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ مغربی معاشرہ سے متعارف ہونے کا موقع ملا اور انہوں نے دور حاضر میں اس زبردست فرق کا مشاہدہ کیا جو مغربی معاشرے اور اسلامی معاشرے کی علمی اور تکنیکی سطح کے مابین پایا جاتا ہے۔

بعض اوقات یہ سوال ان لوگوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے جو اپنے علمی و دینی ورثے پر مضبوطی سے قائم ہیں اور انہیں اپنی ثقافت میں جمود کو دیکھ کر نیز مغربی معاشرے کے مقابلے میں اپنی موجودہ پسماندگی کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ پہلے گروہ میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو علوم عقلیہ کی نجات دہندہ و شفا بخش قوت پر ایمان مطلق رکھتے ہیں۔ ان میں کچھ تو ایسے ہیں جو معاشرے میں ایمان اور عبادات کے کسی حد تک موجود رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے جبکہ کچھ وہ ہیں جن کے خیال میں معاشرے کا معیار بلند کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اسے دین اور عقیدے سے یکسر پاک کر دیا جائے' ہر ایسے ثقافتی و تمدنی عنصر کو ترک کر دیا جائے جس کا دین اور عقیدے سے کچھ ربط ہو اور تمام تر توجہ مغربی دنیا کی طرف دی جائے۔ اس قسم کی فکری رو نے بیسویں صدی کے آغاز سے بعض اسلامی ممالک میں رنگ پکڑنا شروع کیا اور میرے وطن (ترکی) پر بطور خاص تسلط جمالیا۔ چنانچہ حکام نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور یہ سمجھنے لگے کہ انہوں نے ایک نئے معاشرے کی تخلیق کے لئے صحیح بنیادی علاج اور اکسیر اعظم کو دریافت کر لیا ہے۔ اب اس علاج کا تجربہ ہوتے ایک صدی ہونے کو آئی ہے اور معالجوں کی اکثریت کو اس کی صحت اور تاثیر پر شک گزرنے لگا ہے۔ چنانچہ اب وہ کوئی اور راستہ تلاش کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ مایوسی و ناکامی بہت سے لوگوں کے ہاں ایک نفسیاتی گرہ کی

اورنگ زیب قاسمی

صورت اختیار کر گئی ہے۔ چنانچہ جس تازہ ترین تجربے کو انہوں نے قبول کیا اور جینے سے لگایا تھا اب اس سے نفور ہیں بلکہ بسا اوقات اس کے خلاف انتقامی جذبات رکھتے ہیں کچھ اور اسباب ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اشتراکیت کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ آخری نجات دہندہ کی حیثیت سے دست شفقت بڑھانے میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ اس گروہ کے لوگوں کی نظر میں اسلامی معاشرے کی پسماندگی کا صرف ایک ہی سبب ہے اور وہ ' ماضی و حال میں ' خود " اسلام " ہے۔ یہ ایک طرف کی بات تھی۔ دوسری طرف روایت پسندوں کی رائے میں معاشرے کی پسماندگی اور اسلامی ثقافت میں جمود کا سبب دینی تعلیمات سے وابستگی میں کمزوری اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں اس کے کامل نفاذ میں کوتاہی ہے۔

ان دونوں فریقوں کے بیچ میں بہت سے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دونوں تو جیہوں سے دامن کش ہیں اور حیرت کا شکار ہیں۔ بسا اوقات وہ ان سہل انگاروں کے ہمنوا ہو جاتے ہیں جو معاشرے کے جمود کو اسلامی سوسائٹی کے کسی خاص ادارے کی سستی یا بگاڑ کا یا کسی غیر مسلم عنصر کی دخل اندازی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگ مجھ سے میرے ذاتی جواب یا میری خاص توجیہ کی توقع رکھتے ہیں جیسا کہ میرے خطبے کے عنوان کا تقاضا ہے۔ میں آپ کے سامنے اعتراف کرنا چاہوں گا کہ یہی سوال جب گزشتہ خطبات کے دوران میرے سامنے پیش کیا جاتا تھا تو میں اس سے دامن بچانے کی کوشش کرتا تھا اور یہ عذر پیش کرتا تھا کہ اس کے جواب کے لئے بہت وقت درکار ہوگا اور یہ وعدہ کیا کرتا تھا کہ انشاء اللہ جلد از جلد اس ذمہ داری کو بھی ادا کروں گا۔

سامعین کرام! اپنی گفتگو کے آغاز میں ' میں آپ تک یہ درخواست پہنچا دینا چاہوں گا کہ آپ مجھ سے اس مسئلے کے حتمی حل ' یا کسی ایسے حل کی توقع نہ رکھیں جو قریب قریب حتمی کہلا سکے۔ میری جانب سے آپ کے سامنے اس مسئلے کا جائزہ محض اس مورخ کی کوشش ہے جسے تاریخ علوم کے ضمن میں تیس برس سے زائد عرصے تک عربی و اسلامی ورثے کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور جو یہ چاہتا ہے کہ موجودہ صدی میں اس مسئلے پر مختلف بحثوں سے واقفیت بہم پہنچانے کے بعد ' ان علوم سے خاص اپنے تعلق کی روشنی میں اس مسئلے پر بحث کرے جس کی اساس اس اصول پر قائم ہو کہ درست توجیہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عربی و اسلامی علوم کی ایک ہمہ پہلو اور ٹھیک ٹھیک تصویر سامنے نہ آجائے جس سے ہمیں پوری وضاحت سے ان عناصر کا علم ہو جائے جنہوں نے ان علوم کی تشکیل و تکوین کی اور جو غالباً" کسی خاص وقت میں کمزور اور مضمحل ہونے لگے۔ اسی طرح ان تخریبی اور رجعت پسند عناصر کا بھی علم ہو جائے۔ جنہوں نے مرور زمانہ کے ساتھ اسلامی معاشرے کے ارتقاء کی رفتار کو سست کرنے اور بالآخر اسے جمود کی کیفیت تک پہنچانے میں حصہ لیا۔

اس مسئلے پر بحث نئی نہیں ہے۔ مسلمان اور مستشرقین اس پر غور کر چکے ہیں اور دوسری عالمی جنگ کے بعد سے اس پر خصوصی توجہ میں اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں فرا نکفرٹ میں " روایتی سانچوں کی تقلید اور ثقافتی زوال کا مسئلہ (Klassizismus and Kulturver fall) کے موضوع پر ایک علمی کانفرنس منعقد ہوئی اور بارہ علماء نے مختلف تہذیبوں کے حوالے سے اس موضوع پر بحث کی جن میں اسلامی تہذیب بھی شامل تھی۔ اس کانفرنس کے چند ماہ بعد فرانس کے شہر Bor Deaux میں ایک اور کانفرنس ہوئی جو بطور خاص اس

موضوع پر اسلامی تہذیب ہی کے حوالے سے بحث کے لئے " تاریخ اسلام میں روایتی سانچوں کی تقلید اور ثقافتی زوال "(۱) کے نام سے منعقد کی گئی۔

اس مسئلے پر بحث میں انیس علماء نے مقالات پیش کر کے حصہ لیا۔ ہر ایک نے اسلامی تہذیب یا علوم کے کسی ایک معین پہلو سے بحث کرنے اور جمود کے جو اسباب و مراحل اس کی نظر میں آسکے ان کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ دینی افکار' اسلامی فقہ' اسلامی فنون' تصوف' فلسفہ اور عقیدہ' عربی ادب اور علوم طبیعیہ کو بھی اسی طرح زیر غور لایا گیا۔ ان علماء میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کی توجیہ حتمی ہے۔ یہ تیجی مشاہدات اور اہم آراء اسلامی علوم و تہذیب کے مختلف گوشوں میں ان کے طویل انہماک کا ثمرہ ہیں۔ مسلمان قاری کو چاہیے کہ وہ ان کا مطالعہ اور ان سے استفادہ کرے۔ ظاہر ہے کہ وہ ان کو کلی یا جزئی طور پر قبول کرنے کا پابند نہیں اور نہ اسے یہ توقع رکھنی چاہیے کہ یہ سب آراء جو پیش کی گئیں درست بھی ہوں یا اسلامی تہذیب سے رشتہ رکھنے والوں کے احساسات سے کاملاً ہم آہنگ ہوں۔

یہاں میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ ان سب اہل علم کے افکار کا خلاصہ بیان کر سکوں۔ نہ میں ان افکار کی صحت پر تفصیل سے بحث کر سکوں گا۔ البتہ دو باتوں کی طرف اشارہ ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک یہ کہ اس مسئلے پر عمومی بحث کے ضمن میں ایک اہم حقیقت ان علماء کی پیش کردہ علمی آراء میں بھی ہمیں نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ عموماً اسباب اور علامات آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس مسئلے کو زیر بحث لاتے ہوئے عمومی اعتبار سے اس فرق کو امتیازی حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہ امر واضح ہوتا ہے کہ جس چیز کو محقق اسلامی تہذیب کے جمود کا سبب تصور کر رہا ہے' بنگاہ غائر دیکھا جائے تو' وہ حقیقت میں " سبب " نہیں بلکہ علامات میں سے ایک علامت ہے۔

دوسرے یہ کہ علوم کی عمومی تاریخ میں ہنوز عربی و اسلامی علوم کے مقام کی شناخت یا وضاحت نہیں کی جا سکی۔ ہرچند کہ مستشرقین نے علوم کے مختلف میدانوں میں مسلمانوں کے بہت سے اہم کارناموں کا سراغ لگایا ہے تاہم دو تین سو برس سے مورخین علوم کے ہاں ویسٹرن کا جو قدیم روایتی انداز ورثے میں چلا آرہا ہے وہ قریب قریب جوں کا توں باقی ہے۔ اسی طرح کسی ایک میدان کے بجائے مجموعی اعتبار سے تاریخ علوم میں مسلمانوں کے مقام کا کوئی ٹھیک اور بھرپور تصور ہنوز تشکیل نہیں پاسکا۔ اس صورت حال کے نتیجے میں مسلمانوں کے مقام کا موازنہ دیگر اقوام ۔ ۔ ۔ خصوصاً اہل یونان ۔ ۔ ۔ کی علمی عطا یا تمدن سے کرنا مناسب نہ ہو گا۔ وہ اس لئے کہ یونانی ورثہ تاریخ علوم میں اس وقت آیا جب اس کے پسند کرنے والوں نے پہلے اسے اپنے ذوق کے مطابق خوب جانچ لیا اور اسے اچھی طرح صیقل اور مرتب کر لیا گیا۔ اور معیاری مواد کو غیر معیاری مواد میں سے چھانٹ لیا گیا۔ چنانچہ کہاں کمزوری ہے اور کہاں مضبوطی نیز کیا عناصر تعمیری ہیں اور کیا تخریبی' اس ضمن میں اسلامی علوم میں اختصاص رکھنے والوں کے تبصرے بیشتر درست یا صائب نہیں ہوتے۔ اس موقع پر میں چاہوں گا کہ اسلامی ثقافت میں جمود کے مسئلے پر ایک توجیہ آپ کے سامنے رکھوں جسے عظیم مستشرق ہلموت ریٹر (Hellmut Ritter) نے بیان کیا ہے۔

وہ سوال اٹھاتا ہے کہ " مسلمان عالم کے ذمے کیا کام ہے ؟ یہ کہ جو کچھ اس کے اساتذہ نے اسے سکھایا پوری پوری صحت و دیانت کے ساتھ آئندہ نسل تک منتقل کر دے۔ اور ہمارے ہاں کیا چیز پیش نظر ہے ؟

اورنگ زیب قاسمی

ایک کلیہ آداب (college of Arts) کی مجلس اساتذہ نے جب فلسفے کی کرسی کے لئے ایک امیدوار کا انتخاب کرنا چاہا تو یوں ہوا کہ اس مجلس نے ایک مشہور جرمن فلسفی کے ایک شاگرد کو امیدوار قرار دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اپنے استاد کے مقابلے میں اس شاگرد نے فلسفے کے میدان میں کوئی نئی چیز پیش نہیں کی کیونکہ وہ بہرصورت کسی ایسے رفیق کار کی تلاش میں تھے جس نے کوئی نئی' انوکھی بات پیدا کی ہو۔ کالج کا یہ موقف ایک بنیادی خیال پر منحصر تھا۔ اور وہ یہ کہ کوئی آخری اور طے شدہ حقیقت وجود نہیں رکھتی۔ رہا اس امکان کا گمان کہ فلاں فلسفی آخری حقیقت تک پہنچ گیا ہے سو یہ ان کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ دور جدید کے لئے حقیقت کا مفہوم بنیادی طور پر ارتقائی ہے جو مسلسل' معلوم سے بلند تر کی طرف سفر کرتا رہتا ہے جبکہ اس کا مفہوم اسلامی اور تھوڑا کسی (مراد عقیدہ اہل سنت) میں ایک حتمی اور مستقل شے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغرب میں مسلسل ایک ذہنی قلق بپا رہتا ہے جبکہ مشرق پر وہی جانی پہچانی آسودگی چھائی رہتی ہے جو اس کا امتیاز ہے اور جس کا اشتیاق گاہے گاہے گوئٹے نے ظاہر کیا۔ مشرقی ذہنیت میں " تبدیل نہ ہونے " کی کیفیت ہمیں جمود نظر آتی ہے جبکہ مسلمانوں کے مسلمہ عقائد میں نئی نئی باتوں کو بدعت تصور کیا جاتا ہے جن کی حقیقت مشکوک اور مشتبہ ہے۔ ان کے ہاں ہر وہ عہد روبہ زوال ہے جو قدیم مثالی معیار سے ہٹ گیا ہو جبکہ ہم کسی عہد کو اس لئے روبہ زوال تصور کرتے ہیں کہ اس میں کوئی تجدید پیدا نہیں ہوا۔"

یہ چند تاثرات ایک عظیم جرمن فاضل کے ہیں جسے عربی و اسلامی ورثے کے ایک بڑے حصے سے واقفیت حاصل تھی' اس نے دوسروں کو اس سے متعارف کرانے میں بڑا حصہ لیا اور اس کے دل میں اس ورثے کے لئے محبت اور احترام کے جذبات پائے جاتے تھے۔ میں جو اس فاضل شاگرد اور اس کا بے حد رہین احسان ہوں' اگر یہ کہوں تو غالباً کسی گستاخی کا مرتکب نہ ہوں گا کہ میرے خیال میں ادب و بلاغت کے موضوع پر عرب علماء کے نہایت اہم کارناموں کا سراغ لگانے والے میرے اس استاد کی مجموعی عربی و اسلامی ورثے پر بھرپور نظر نہیں تھی اور میرے خیال میں وہ سوانحی تحریروں میں وارد ہونے والے نوادر اور قصے کہانیوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے اسلامی تمدن میں جمود کے مسئلے کو پیش کرتے ہوئے ایسے نتائج اخذ کئے ہیں جو ان معلومات سے ہم آہنگی نہیں رکھتے جن کا انکشاف مسلمان علماء کے عمومی موقف' تاریخ علوم میں تازہ کاری کے سلسلے میں ان کے یقین اور صلاحیت' نیز عقل انسانی کی قدرت پر ان کے اعتماد کے سلسلے میں اب تک ہو سکا ہے۔ اتفاق سے مجھے اپنے منصف مزاج استاد کے ان تاثرات پر ۔ ۔ ۔ بعض مثالوں کی مدد سے جو آگے آئیں گی ۔ ۔ ۔ اعتراض پیش کرنے کا موقع بھی ملا۔ اس کے جواب میں جو کچھ انہوں نے کہا وہ یہ تھا " استغفراللہ' میرے ذہن میں جو کچھ آیا میں اس کی خوبی و صحت کے غرے میں رہا حالانکہ اس کی بنیاد محض نفس امارہ پر تھی۔" میں نے ان کی خدمت میں دوسری صدی ہجری کے جابر بن حیان کے بعض اقوال پیش کئے جو علم بشری کے حدود پر اس کے اصولی موقف سے متعلق تھے۔ جابر بن حیان کی رائے یہ تھی کہ علم میں اضافے نیز نئے انکشافات کے سلسلے میں انسان کے سامنے کوئی حد نہیں ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ تمام کائنات کے اسرار منکشف کرنے کی کوشش کرے اور یہ کہ اس عالم سے ماوراء جو اسرار ہیں ان سب کو منکشف کرنے کی صلاحیت اسے عطا کی گئی ہے۔ یاد رہے کہ ارسطو بنی نوع انسان میں ایسی صلاحیت کا انکار کرتا ہے۔

جابر کو شاید اوروں سے بڑھ کر اس بات کا یقین تھا کہ ہماری دنیا مادی اور روحانی دونوں اعتبار سے ایک ہمہ گیر ریاضیاتی قانون پر قائم ہے۔ اسے یقین تھا کہ تمام موجودات عالم اور ان کے عمل عددی قیاس میں لائے جا سکتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ : اگر ہم خواص اشیاء کی عددی تعلیل مہیا کر سکیں تو ہم دنیائے کیمیا میں اپنے کام کو صحیح بنیاد فراہم کردیں گے اور اسی بنیاد پر اشیاء کو قیاس کرنے کا اصول یعنی اشیائے عالم کے لئے ریاضیاتی حتمیت کے میزان کا اصول قائم ہو گا۔ یہ اصول اشیاء اور ان کی داخلی ہم آہنگی کے ایک معقول نظام کی وضاحت کرتا ہے اور ایک اعتبار سے ہر شے میں اس کا ظہور بھی موجود ہے جبکہ دوسرے اعتبار سے یہی دنیا کا مجرد اساسی مفہوم بھی ہے۔ ... وغیرہ وغیرہ "

میں نے ان کو (یعنی اپنے استاد کو) ابن الہیثم کی کتاب " فی الشکوک علی بطلیوس " کے پیش لفظ میں سے اس کا یہ قول سنایا:

" حق مقصود بالذات ہے۔ اور جو چیز مقصود بالذات ہو اس کے طالب کو صرف اسی کے پانے سے غرض ہوتی ہے۔ اور حق کو پانا دشوار ہے اور وہ راستہ جو اس کی طرف جاتا ہے دشوار گزار ہے۔ حقائق ' شبہات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ علماء سے حسن ظن رکھنا سب لوگوں کے خمیر میں ہے۔ چنانچہ علماء کی کتابوں کا قاری اگر اپنی طبیعت کے تقاضے کو راہ دے دے اور اپنا مقصد یہی بنالے کہ ان کے فرمودات کی حقیقت اور ارشادات کی غایت کو سمجھ سکے تو اس کو جو حقائق حاصل ہوں گے وہ محض ان معانی اور مقاصد سے عبارت ہوں گے جو ان علماء نے مراد لئے اور جن کی طرف انہوں نے اشارہ کیا۔ حالانکہ اللہ نے علماء کو معصوم عن الخطا نہیں بنایا اور نہ ان کے علم کو تقصیر و خلل سے محفوظ بنایا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کسی علمی مسئلے پر علماء میں باہمی اختلاف نہ ہوتا اور نہ حقائق میں کسی شے پر ان کی آراء متفرق ہوتیں جبکہ امر واقع اس کے برخلاف ہے۔ لہذا طالب حق وہ نہیں جو متقدمین کی کتابوں کا محض قاری ہو اور ان پر حسن ظن میں اپنے طبعی رجحانات کے ساتھ بہہ جائے بلکہ طالب حق وہ ہے جو ان کے بارے میں اپنے ظن پر بھی شک کرے۔ ان کی کتابوں سے جو کچھ سمجھے اسے تامل کے بعد قبول کرے۔ دلیل و برہان کی پیروی کرے محض قول قائل پر نہ چلے جو خود ایک انسان ہے اور جس کی سرشت کی خصوصیت ہے کہ اس میں طرح طرح کے نقص و خلل شامل ہیں۔ اگر کتب علوم کے کسی قاری کا مقصد حقائق کی پہچان ہو تو اس کو لازم ہے کہ جو کچھ پڑھے اس پر مخالفانہ نظر ڈالے اور اس کے متن و حواشی سب کے بارے میں ذاتی طور پر ذہن دوڑائے اور ہر ہر پہلو سے اس پر کڑی تنقید کرے اور اس تنقید کے عمل میں خود اپنی ذات کو بھی شک و شبہ سے بالاتر نہ سمجھے۔ چنانچہ مخالفت یا موافقت میں توازن کو بگڑنے نہ دے۔ اگر وہ اس روش کو اختیار کر سکے تو حقائق اس پر منکشف ہو سکیں گے اور متقدمین کے ہاں جو امکانی کوتاہی یا اشتباہ رہ گیا ہو گا اسے نظر آجائے گا۔" (۳)

" القانون المسعودی " کے مقدمے میں البیرونی کا یہ قول بھی میں نے استاد محترم کو سنایا:

" میں نے وہی کیا ہے جو ہر انسان کو اپنے فن میں کرنا لازم ہے یعنی اگلوں کے اجتہاد کو ممنونیت کے ساتھ قبول کرے اور اگر کہیں خلل پائے تو بے جھجک اس کی اصلاح کر دے۔ اور جو

اورنگ زیب قاسمی

کچھ اس فن میں خود اسے سوجھے اسے اپنے بعد کے زمانے میں آنے والوں کے لئے محفوظ کر جائے " (۳)

ہو سکتا ہے آپ میں سے بعض کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اسلامی فکر کی تاریخ میں اس نوع کے افکار اور ایسے افکار رکھنے والے لوگوں کا وجود ایک نادر سی چیز رہی ہوگی۔ چنانچہ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے تو بطور خاص یہ واضح کردوں کہ ایسے افکار و اشخاص کا ظہور مناسب ماحول اور سازگار حالات کے بغیر محض اتفاقاً" ہو جانا ممکن ہی نہیں۔ دوسرے یہ کہ واقعتاً" یہ کوئی نادر مظہر نہیں رہا بلکہ علوم کی سب شاخوں کے تعمیری مرحلے میں تسلسل اور کثرت کے ساتھ ان کا ظہور ہوا ہے۔ لیکن تاریخ علوم نے یا تو ان کا احساس نہیں کیا یا پھر تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ اجازت دیجئے کہ اٹھارہ برس پہلے کا ایک واقعہ ' جسے میں بھول نہیں سکتا' اس موقع پر آپ کو سناؤں۔ اتفاق سے میں اپنے جرمن مستشرق ساتھیوں میں سے ایک کی ریڈیائی تقریر البیرونی کے بارے میں سن رہا تھا۔ البیرونی کی مدح و ستائش کے بعد جو ذاتی تبصرہ اس نے پیش کیا وہ یہ تھا کہ ظاہر ہے ہم اسلامی فکر میں تحریک احیائے علوم کے علماء کی توقع نہیں رکھ سکتے۔

میں اس رائے پر اپنے دوست کو ہدف ملامت بنانا نہیں چاہتا کیونکہ فکر اسلامی سے ایک عمومی ربط کے باوجود وہ تاریخ علوم کے اس عادلانہ حکم سے محروم تھا جو مشترک فکر انسانی کی تاریخ میں مختلف اطراف سے لئے جانے والے حصے پر لگایا جانا چاہیے۔ اس کے حافظے میں علوم اور تہذیبوں کی وہی مصنوعی تاریخ تھی جسے ہم نے اور اس نے درس گاہوں میں پڑھ رکھا ہے۔

سامعین کرام! آج کے خطبے سے میرا مقصد یہ نہیں کہ میں تاریخ علوم میں مسلمانوں کے مقام پر گفتگو کروں اور نہ مجھے اس بات سے کچھ خوشی ہوتی ہے کہ تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام ان کی اولاد کے لئے محض اظہار فخر کا ایک وسیلہ ہو۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ آج عربی و اسلامی علوم کے وارث ہیں' ان کے لئے ان علوم کی تاریخ کا تحقیقی مطالعہ بلکہ ضروری ہو گیا ہے جس کا ان پر زندگی بخش اثر پڑے گا۔ یہ عمل ناگزیر ہے تاکہ ان وارثوں کو پہلے تو یہ معلوم ہو سکے کہ ان کے آباء نے علوم کا آغاز کس طرح کیا' وہ کہاں تک پہنچے اور اس سلسلے میں کسی محنت' مستقل مزاجی' کیسی بے نیازی اور صبر' اپنے پیشرووں کے کاموں سے انصاف اور درگزر' ارتقائے علوم کے مسئلے کے واضح فہم ' خود اعتمادی ' اسرار کائنات کا احاطہ کرنے کے لئے اللہ کی عطا کردہ انسانی صلاحیتوں پر وسیع اعتماد' اور کیسی تنقیدی اخلاقیات سے کام لیا تاکہ رفتگاں کے حالات ان کے لئے عمدہ نمونہ بھی ہوں اور پر اثر اور باثمر طریقے پر سامان عبرت بھی۔ اور پھر ان وارثوں کو اس نفسیاتی گرہ سے بھی نجات ہو جو علوم کے جدید ارتقاء کو دیکھ کر ان میں سے بعض کے ہاں پیدا ہو گئی ہے حالانکہ ان علوم میں ان کے آباء کا حصہ دیگر اقوام سے کسی طرح کم نہیں اس طریقے سے ان کے لئے یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ اسلامی علوم میں جمود کے مسئلے کا جائزہ ان کی صحیح تاریخ کے مطالعے کی روشنی میں لے سکیں۔

درست ہے کہ تاریخ علوم اس امر میں شک کی گنجائش نہیں چھوڑتی کہ نویں صدی ہجری کے اوائل میں جمود کا مظہر رفتہ رفتہ تمام عالم اسلام میں محسوس کیا جانے لگا۔ جمود کے اسباب متعین کرنے کا مسئلہ بہت مشکل ہے لیکن خود جمود ایک تاریخی حقیقت ہے جو رونما ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوا۔ میرے خیال میں غالباً" صحیح طریق کار یہ ہو گا کہ ہم ارتقاء اور جمود کے مرحلوں کا باہمی موازنہ کریں اور یہ سمجھنے کی

کوشش کریں کہ کون سے تعمیری عناصر زوال پذیر ہو گئے اور کون سے تخریبی عناصر داخل ہو گئے جو ارتقاء کی رفتار کو گھٹانے کا سبب ثابت ہوئے تاآنکہ اس میں ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس قسم کا موازنہ ' سیاسی و اقتصادی تاریخ کی شرکت سمیت عربی و اسلامی علوم کی تاریخ کی ایک گہری وضاحت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک (اس سلسلے میں) ہمارا علم محدود اور عربی واسلامی علوم کی تاریخ پر جب تک ہمارا مطالعہ غیر ترقی یافتہ ہے 'ظاہر ہے کہ ہمارا تجزیہ اندازوں اور مفروضوں کے دائرے میں رہے گا 'اس سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔ایسی صورت حال میں ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کا آغاز کروائیں اوراس ضمن میں حقائق کا سامنا کرنے سے نہ ڈریں خواہ وہ کتنے ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہوں۔

جمود کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے ' میرے خیال میں ' ایک اہم تمدنی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ عربی و اسلامی علوم چوتھی صدی ہجری کے اواسط سے مغربی دنیا میں منتقل ہوتے شروع ہوئے اور یہ اسی وقت ہوا جب انسانی سطح پر ضروری رابطے کے ذریعے وہاں پر فضا سازگار ہو چکی تھی۔ نویں صدی کے اوائل میں بھی مغرب کی مسیحی دنیا کی طرف عربی و اسلامی علوم کے منتقل ہونے کا یہ عمل جاری رہا۔ اس حقیقت کا مفہوم یہ ہے کہ عربی و اسلامی علوم کو اپنے خلاق تعمیری مرحلے کے موسط میں پہنچنے سے قبل ہی ' ایک اور نمو کا موقع ملا جس کے نتیجے میں وہ ایک اجنبی ماحول میں ارتقاء پذیر ہونے لگے اور اس نئے ماحول کا دامن اپنے مزید انکشافات سے بھرتے رہے تاآنکہ چند صدیوں کے عرصے میں یہ ماحول خلاق اور تعمیری صورت اختیار کر گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ تاریخ علوم اس انخلا اور نئے ماحول میں عربی و اسلامی علوم کے اس تسلسل سے منکر ہو گئی ہے اور اس کا نام " تحریک احیاء کا دور " رکھ دیا ہے اور غالبا" انیسویں صدی عیسوی کے اوائل سے اسے یونانی علوم کے نقش قدم پر مغرب کی مسیحی دنیا کی بیداری قرار دینے کا اور یہ کہنے کا رواج ڈال دیا ہے کہ یونان کا عقلی مسلک ہی وہ مسلک تھا جس نے انسانوں کو قرون وسطی کے اواخر میں اس عقلی قوت پر اعتماد بخشا جو اسے عطا ہوئی تھی۔ اس مصنوعی اور من گھڑت تصور نے جو تاریخی حقائق کی تحریف پر مبنی ہے خود مغربی دنیا میں اعتراضات کو تقویت دینی شروع کر دی ہے۔ اسی چیز کے معاصر فرانسیسی فلسفی اتین جیلسون (Etienne Gilson) کو مجبور کیا کہ وہ ۱۹۵۵ء میں اپنی کتاب میں اس نام نہاد تحریک احیاء کو " جامعات کے اساتذہ کی تحریک احیاء کا نام دے۔ اس کی رائے میں تحریک احیاء کا مفہوم خالصتا" تاریخی مفروضہ نہیں ہے جس کے درجہ صحت کا تعین و واقعات کے حوالے سے کیا جاتا ہو بلکہ یہ ایک اصولی نقطہ نظر کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی سبب سے بحث کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ واقعات نے یہ اصولی موقف پیدا نہیں کیا بلکہ تحریک احیاء کی یہ تعریف جذبات کی ان گہرائیوں سے پھوٹتی ہے جس سے خود واقعات پیدا کئے جاتے ہیں ... " جیلسون یہ بھی کہتا ہے کہ :

" تاریخی حقیقت - - - جسے انسان بعید از امکان سمجھتا ہے یا نظر انداز کر دیتا ہے - - - کے مقابل ایک اور جعلی ' خود ساختہ حقیقت جنم لیتی ہے جسے انسان خود تراشتا ہے۔ پھر وہ اس کی شرح و تاویل جاری رکھتا ہے تاآنکہ باقی تمام حقائق - - - جو ابھی و ہی بنیاد سے لگا نہیں کھاتے - - - کو رد کرنے کے لئے اسی کا سہارا لینے لگتا ہے - " (۳)

اس گریز کے بعد میں اپنے بنیادی موضوع کی طرف لوٹتا ہوں اور دوبارہ یہ عرض کرتا ہوں کہ اسلامی دنیا

اورنگ زیب قاسمی

نے اس طریقے پر ایک طرف تو مغرب کی مسیحی دنیا میں علوم کے سفر کو جاری رکھنے کا سامان مہیا کیا جو (ان علوم کے لئے ایک اجنبی دنیا تھی - اور دوسری طرف اس عمل میں بعض اہم سیاسی' دینی ' اقتصادی' اور عسکری اسباب کے پہلو بہ پہلو - - - ایک اور بہت سے بھی حصہ لیا اور ہماری تہذیب کے جمود و زوال کا سامان کیا۔ یہ درست ہے کہ ہم جمود کے اسباب کو تمام و کمال اسی خارجی سبب پر محمول نہیں کر سکتے۔ بلاشبہ بہت سے داخلی اسباب بھی اس میں شامل تھے۔ مثلا" مسلکی اختلافات' دنیائے اسلام کے مشرق میں منگولوں کی اور مغرب میں بربروں کی پیدا کی ہوئی شدید بے چینی' صلیبیوں کے لگاتار حملے جنہوں نے معمول کے علمی ارتقاء کے تسلسل پر منفی اثر چھوڑا ' علاوہ ازیں علم اور علماء کی سرپرستی کا خاتمہ اور کتابوں کی بربادی ' اعلی درسگاہوں اور علماء کے مابین مسلسل تعلق کا ختم ہونا اور اہم دریافتوں کا دنیائے اسلام کے ایک علاقے سے دیگر علاقوں کی طرف منتقل نہ ہونا۔

مثال کے طور پر یہاں میں علم الفلک کے حوالے سے ایک اہم حقیقت کی نشان دہی کرنا چاہوں گا - ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں مسلمان فلک شناس مشرق میں اپنے جدید نظریات کے ذریعے ،بطلیموس نظام کے زوال کی راہ ہموار کر رہے تھے۔ جبکہ مغربی دنیائے اسلام میں ان کے ہم چشم' چھٹی صدی ہجری میں اسی نظام کے خلاف کچھ اور جدید نظریات پیش کر رہے تھے اور ان نظریات کے ایک جانب سے دوسری جانب تک پہنچنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ تاہم یہ سب جدید نظریات چند ہی سال میں مغربی دنیا تک پہنچ جاتے تھے اور نہ صرف فلکیاتی افکار بلکہ فلسفہ و طبیعیات کے افکار کو بھی آگے بڑھاتے تھے۔

یہ بات خاص طور پر نشان دہی کے لائق ہے کہ ان دونوں صدیوں کے دوران یعنی خود مرحلہ جمود سے فورا" پہلے کے عرصے میں دنیائے اسلام میں بہت ہی عظیم الشان دریافتیں ہوئیں جن سے یہ توقع پیدا ہوتی تھی کہ تجربی اور فلسفی علوم کی تقریبا" سبھی شاخوں میں فکر انسانی ایک نئے مرحلے سے دوچار ہونے والی ہے - تاہم تاریخی حالات ایسے تھے جن کے سبب دنیائے اسلام میں تو یہ (افکار و انکشافات) مقامی سطح تک محدود ہو کر رہ جاتے تھے لیکن بدیسی حلقے کی طرف تیزی سے منتقل کر دیئے جاتے تھے جہاں انہیں ہاتھوں ہاتھ لینے اور عمل میں لانے والے موجود تھے اگرچہ پہلے پہل یہ کام تقلید یا سرقے کی سطح پر ہوتا رہا تاآنکہ آگے چل کر اس نے وہاں اپنے ثمرات پیدا کئے۔

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں یہی صورت حال جاری رہی تاآنکہ عثمانیوں نے آکر عظیم دولت عثمانیہ کی بنیاد رکھی جس کے بارے میں آپ کو معلوم ہی ہے کہ نویں صدی میں ربع مسکون کے ایک بڑے حصے پر حکمران رہی۔ عثمانیوں کی بارعب ' عظمت ' عالم اسلام کے قوئی کو آخری بار مرکوز کرنے سے عبارت تھی - ایک شاندار ماضی سے ورثے میں ملنے والے ان قوئی کی ترکیز نے انہیں نویں اور دسویں صدی ہجری میں اس قابل بنایا کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی سیاسی و عسکری قوت کی حیثیت سے سامنے آسکیں۔ لیکن انہیں یہ خبر نہ تھی - - - بلکہ خبر ہونا ممکن ہی نہ تھا - - - کہ یہ عظمت جو ان دو صدیوں میں قائم و دائم رہی ان کے دشمنوں کے لئے ایک ایسے مرحلے کی ابتدا ثابت ہوگی جس میں وہ ان پر سبقت لے جانے اور علم و سیاست کے میدان میں انہیں ان کے مقام سے ہٹا دینے کا آغاز کریں گے۔

یہ درست ہے کہ عثمانیوں نے عربی و اسلامی علوم نیز جامعات کا تصور اپنے مسلمان اسلاف سے ورثے میں

پایا اور اس پر توجہ دینے میں غفلت بھی نہیں برتی۔ جہاں تک اس تاریخی حقیقت کا تعلق ہے کہ جو علوم ان تک پہنچے تھے وہ تقریباً" ایک صدی قبل جمود اور زوال کے مرحلے میں داخل ہو چکے تھے' سو اس کا عثمانیوں کو احساس نہ تھا اور اس وقت یہ ان کی نظر میں دشوار بھی تھا۔ جبکہ مغرب کی مسیحی دنیا میں ترجیحات علمی کا شعور نیز علم کے میدان میں گہری دلچسپی فروغ پاچکی تھی اور اس صورت حال سے ان لوگوں کی ہمت افزائی ہوئی کہ وہ عربوں کے مقابلے کے لئے اٹھیں اور یہ کیفیت تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر سے واضح ہونے لگی۔ محقق کو جو تاثر ملتا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے اعلیٰ علمی مرتبہ جس تک رسائی کے لئے نویں صدی ہجری کے بعد سے دنیائے اسلامی کوشاں رہی وہ محض اسلاف کے ورثے کو زیادہ سے زیادہ سمیٹ کر محفوظ کر لینے سے عبارت تھا۔ اس زمانے سے آگے چلتے ہوئے محقق کو شاذ ہی کہیں اس ورثے کو بنیادی اعتبار سے آگے بڑھانے کی ضرورت کا شعور نظر آتا ہے۔

عثمانیوں کی یہ دو صدیاں تو اسی کام میں لگ گئیں کہ وہ دنیا کے ایک بڑے حصے پر عسکری تسلط قائم رکھ سکیں۔ پھر انہیں عسکری' سیاسی اور اقتصادی تمام پہلوؤں میں کمزوری اور ضعف کا احساس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے انداز میں بعض اداروں کی تجدید اور ان میں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ وضاحت سے یہ سمجھنے پر قادر نہ تھے کہ اس پسماندگی کا سبب دراصل علمی پسماندگی اور علماء کے معیار کا انحطاط تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ انہیں علامات تو دکھائی دینے لگیں لیکن حقیقی اسباب تک ان کی نظر نہ پہنچ سکی۔

آخری تین صدیوں میں تجدید یا ـ ـ ـ عثمانیوں کے بقول ـ ـ ـ تجدد کی کئی کوششیں سامنے آئیں جن میں حقیقی اسباب کے بجائے علامات پر سطحی سی نظر ڈالی گئی اور ظاہر ہے کہ' یہ اس مسئلے کو نپٹانے کا کوئی مناسب طریق کار نہ تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ ان کوششوں میں سب سے بھرپور اور جرات مندانہ کوشش وہ تھی جو اس صدی کے نصف اول میں میرے وطن (ترکی) میں اس وقت کی گئی جب مغربی دنیا اور اسلامی دنیا میں جو زبردست فرق ہے وہ کھل کر سامنے آگیا تھا۔ تجدید پسند ترکوں کو یہ یقین ہو گیا کہ بیشتر قدیم ورثے کو چھوڑ کر اس کی جگہ جدید مغربی اقدار کا حصول ضروری ہے۔ آج ان میں بعضوں کو یہ احساس ہو چکا ہے کہ وہ کسی حقیقی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکے۔ مگر میرا خیال ہے کہ ہنوز یہ احساس نہیں ہو سکا کہ ان کا تجزیہ غلط تھا اور جس طریقے پر انہوں نے اس مسئلے کو ہاتھ میں لیا اس کے باعث آغاز ہی سے ناکامی مقدر ہو چکی تھی۔

اب جبکہ اس انحطاط کا مفہوم زیادہ کھل کر ہمارے سامنے آچکا ہے جو ہم پر اور دنیائے تمدن میں ہمارے مقام پر پڑی' ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ حقیقت سے آنکھیں چار کریں اور خود اپنے اوپر تنقید سے خوف نہ کھاتے ہوئے' حقیقی اسباب کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔ صرف مغربی نظاموں اور اداروں کی تقلید محض کی کوشش سے نہ اب تک مطلوبہ نتیجہ حاصل ہو سکا ہے نہ آئندہ ہو سکے گا بلکہ ' جیسا کہ میں آغاز کلام میں عرض کر چکا ہوں' اس کے عین برعکس ' ایسی کوششوں سے بڑی حد تک مایوسی اور ابتری ہی پیدا ہوئی ہے۔ تاہم جو لوگ ماضی سے ہو بہو نقل کا اصول اپنانا چاہتے ہیں انہیں بھی لازم ہے کہ یہ نہ بھولیں کہ مسلمانوں کے ہاں بہت سے روایتی ڈھانچے قدامت اور پسماندگی کا شکار ہو چکے ہیں مثلاً" مساجد میں وعظوں اور تقریروں کا مواد۔ ان کا سامعین پر کچھ اثر باقی نہیں رہا کیونکہ واعظ یا خطیب علم کے اس اعلیٰ معیار پر فائز نہیں ہے جس

اورنگ زیب قاسمی

کے بل پر وہ مثبت تبدیلی پیدا ہو سکے اور ماضی کی روایات کے مطابق' معاشرے کی علمی سطح کو بلند کر سکے۔

میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ صورت حال صرف ہماری موجودہ صدی پر طاری ہے۔ تمدنی نقطہ نظر سے عالم اسلام کی گزشتہ چند صدیوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معاشرے کے نقطہ نظر سے ان اسلامی اداروں میں زندگی کی حرارت کئی سو برس پہلے سے ماند پڑنے لگی تھی اور گزشتہ چند صدیوں میں جس مسلمان عالم کی عظمت شان کو تسلیم کیا جاتا تھا وہ درحقیقت اپنے علم کی گہرائی اور گیرائی نیز تازہ کاری کی صلاحیت میں اسلاف کے معیار سے بہت فروتر تھا۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ تین سال ہوئے ترکوں نے ابراہیم حقی اللار ضروی نامی ایک عالم کا یوم ولادت منایا جس کی وفات دو سو برس قبل ۱۱۸۶ ہجری میں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں بطور خاص اس کی کتاب " معرفت نامہ " کی زبردست قدر و حرمت کا چرچا ہوا کیونکہ ترکوں کے خیال میں یہ کتاب نہ صرف تمام اسلامی علوم کا خلاصہ پیش کرتی ہے بلکہ اس میں مولف کے دریافت کردہ بعض اہم نکات بھی شامل ہیں۔ جبکہ درحقیقت اسلامی علوم کی تاریخ پر نظر رکھنے والے کے لئے یہ مشکل نہیں کہ وہ کتاب کے سرسری سے مطالعے کے بعد ہی یہ معلوم کر لے کہ اس میں چند ماخذ ـ ـ ـ جن سے مولف کو استفادے کا موقع ملا ـ ـ ـ کو یکجا کر دیا گیا ہے نیز یہ کہ مولف کو اندازہ ہوتا جس تک مختلف علوم میں مسلمان رسائی حاصل کر چکے تھے۔ اور اس کی اس کتاب میں تازہ کاری نام کی کوئی شے نہ تھی۔

آخر میں نہایت اختصار کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ اسلامی تہذیب میں جمود کی اگر ہم ایک عمومی توجیہ کریں تو اسے ایک ایسی تاریخی حقیقت تسلیم کرنا ہو گا جو تاریخ میں ہر تہذیب پر وارد ہوئی ہے ـ اسلامی تہذیب سے وابستگان کو ' جو مستقبل میں ویسا ہی مقام حاصل کرنا چاہتے ہوں جیسا ماضی میں رہ چکا ہے ' لازم ہے کہ جمود کے اسباب کا ٹھیک ٹھیک سراغ لگائیں۔

ورثے میں ملنے والے اداروں کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کریں' اور تقلید محض سے دامن بچاتے ہوئے دور حاضر کی میراث انسانی کے صالح عناصر کو جرات مندی کے ساتھ اخذ کریں ـ یہ نہایت مشکل کام ہے جو از خود عمل میں نہیں آسکتا۔ اس کا عمل میں آنا حقیقی معنوں میں مجھے ہوئے ذہن اور نہایت عالی مرتبہ علماء کے وجود پر موقوف ہے۔

وقت آچکا ہے کہ اسلامی معاشرہ ایسے مجھے ہوئے اذہان اور ایسے علماء کے حصول کی تدبیر کے سلسلے میں اپنی اہم ذمہ داری کو سمجھے۔ یہیں سے معاصر پڑھے لکھے مسلمان کے فرض کا آغاز ہوتا ہے تاکہ معاشرے کے اس بلند مقصد کا حصول ممکن ہو سکے۔ لازم ہے کہ اس ذمہ داری کو اٹھانے والا پڑھا لکھا آدمی مادی طور پر' انانیت کی سطح پر نیز آرام و آسائش کی سطح پر اس قربانی کے لئے تیار ہو جو اس پر عائد ہوتی ہے نیز اپنے حصے کی بچی اور ضروری بے غرضی کو فراموش نہ کرے تاکہ وہ ایک گہرے اور وسیع سائنسی احیاء کی راہ ہموار کرے۔

حوالہ جات:

1- Classicisme et declin Culturel dans l' histoire de l'Islam, Actes du symposium international d histoire de la Civilisation musulmane(Bordeaux 25-29 Juin 1956) Paris 1957.

۲- الحسن بن الہیثم کا مقالہ "فی الشکوک علی بطلیموس" طبع قاہرہ، ص ۳۰-۳۲

۳- ج ۱، ص ۵ اشاعت حیدر آباد، ۱۹۳۸ء

4- E,Glison Heloise und Abelard,Zugleich ein Beitrag Num Problem vom Mittelalter und Humanismus, Freiburg 1955 S, 98ff; H. Shippergas Ideologie und Historiographie des Arabismus Beiheft Zu Sudhoffs Archin Wiesbaden,1961 S.14

(تحریر: ڈاکٹر فواد سیزگین)

("فکر و نظر" اسلام آباد)

رشید ملک

بھگتی تحریک

"دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں جنوبی ہند کے لوگ عام طور پر بدھ مت کے پیرو تھے۔ جنوبی کنٹرا جینیوں کا بڑا مرکز تھا لیکن بدھ یا جین مت سے کوئی بڑا انقلاب نہیں ہوا کیونکہ ان مذاہب کے ساتھ ساتھ لوگ اپنے پرانے دیوی دیوتاؤں اور ان کے بتوں کو بھی پوجتے رہے۔ شمالی ہند کی طرح جنوب میں بھی نئے اور پرانے مذہبوں میں مفاہمت کا سلسلہ جاری رہا ہو گا۔ ساتواہن قوت زائل ہو چکی تھی' اور دکن اور جنوبی ہند میں ہر جگہ شودتی راجاؤں کی حکومت تھی تو شَو اور وشنومتوں کو ترقی کا موقع ملا۔ شمالی ہند میں بدھ مذہب کا بہت عرصے تک تسلط رہ چکا تھا' اور وہاں ہندو مذہب کی وہ تشکیل' جس کا ذکر کیا جا چکا ہے' انتہا پسندی' فلسفیانہ میلانوں اور تمدنی روایتوں کی وجہ سے جذبات میں گرمی پیدا نہ کر سکی۔ اس کے برخلاف جنوبی ہند کے شَو اور وشنومتوں میں وہ جوش نظر آتا ہے جو کسی نئے اور موثر مذہب کا پرچار کرنے والوں کی خصوصیت ہے۔ دینیات' فلسفے' ادب اور فنون لطیفہ میں جذبات کی ایسی شدت اور تخلیق کا ایسا ذوق تھا جس کا جواب شمالی ہند کی تہذیب کے اس دور میں نہیں ملتا اور یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ساتویں سے تیرہویں صدی تک جنوبی ہند ہندوستانی تہذیب کا مرکز تھا۔ دکن اور جنوبی ہند کے لوگوں میں پرچار کا بڑا جوش تھا' جس سے شمالی ہند کا برہمنی مذہب اپنے اپنے عقیدوں اور قوانین کی وجہ سے محروم رہا اور جنوب مشرقی ایشیا میں شو اور وشنومتوں کا جو چرچا کیا گیا وہ اس زمانے کے پرچار کے نمونوں کی یادگار ہے۔

دینیات کے عالم اور نامور فلسفی' جن میں سب سے ممتاز کمار بھٹ اور شنکر آچاریہ ہیں' اس کوشش میں لگے رہے کہ بدھ متی عقیدوں اور تصورات کو رد کر دیں اور اس کے ساتھ یہ بھی ثابت کریں کہ ان کے اپنے عقیدے وہ ہیں جن کی تعلیم تمام مقدس کتابیں دیتی ہیں اور عبادت کے جن طریقوں اور نجات کے جن ذریعوں کو مقدس کتابوں میں صحیح مانا گیا ہے ان کے سوا اور کوئی مسلک حق پر نہیں ہو سکتا۔ شنکر اچاریہ کی ذہانت حیرت انگیز تھی۔ مناظرے کے فن میں وہ کامل تھے اور ان کی غیر معمولی سرگرمی کی سند ان کی تصنیفوں کی تعداد اور اس کے ساتھ یہ روایت ہے کہ انہوں نے چند سال کے اندر جنوبی ہند سے کشمیر تک اور گجرات سے بنگال تک پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور ہر جگہ بدھ مت کے حامیوں کو مناظروں میں شکست دی۔ دینیات اور فلسفے پر ان کے تسلط کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ان کے بعد جس نے بھی ان موضوعات پر بحث کی اس نے ابتدا انہی کے نظریوں سے کی۔ شنکر اچاریہ کی تعلیمات میں خالص فکر اور منطق کا اثر غالب تھا لیکن اس مذہبی تحریک کی' جو اس زمانے میں پیدا ہوئی' نمایاں خصوصیت بھگتی تھی اور اس کا سلسلہ نہ ویدوں اور دوسری مقدس کتابوں سے ملایا جاتا تھا نہ روایتی فلسفیانہ تصورات سے۔ اس نئی تحریک کے علم

بردار اپنے معبود تک پہنچنے کے لئے کسی واسطے اور وسیلے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے' انہوں نے دینیات اور فلسفہ دونوں کو ہی نظر انداز کیا اور عشق کی جو کیفیتیں ان پر طاری ہوتی تھیں انہیں اپنی زبان میں پیش کیا۔شومتیوں کے بزرگوں میں جو ادیار کہلاتے ہیں' سب سے ممتاز تروگیاں سند موورتی سوامی ' تروناؤکرسو ' سندر موورتی اور مانک واسر ہیں۔ ان میں پہلے دو کا زمانہ ساتویں صدی اور آخری دو کا آٹھویں اور نویں صدی تھی۔ ان کے گیت' جن کا مجموعہ دیوارام کہلاتا ہے' جنوبی ہند کے شومتیوں میں ایک مقدس کتاب کا درجہ رکھتا ہے اور عبادت کے وقت پڑھا جاتا ہے' جیسے کہ شمالی ہند میں وید۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ نئے دینی جذبے نے انسان اور اس کے معبود کے درمیان ایک نیا اور خاص محبت کا رشتہ قائم کیا ہے جس میں معبود رب اور معشوق اور انسان کا بندہ اور عاشق ہے یہی جذبہ اور یہی کیفیت جنوبی ہند کے وشنو بزرگوں کے گیتوں میں نمایاں ہے۔ یہ بزرگ جو آلوار کہلاتے ہیں تعداد میں بارہ مانے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نیچ ذات والے بھی تھے' کچھ برہمن' ایک عورت اور ایک راجہ' ان کے گیت بھی تقدس میں ویدوں کے برابر سمجھے جاتے تھے۔ادیار اور آلوار اپنی زبان میں گیت کہتے تھے' ذات کی ان پابندیوں کو جو برہمنوں نے لگائی تھیں' نہیں مانتے تھے ' اور ان کے کلام میں وہ خلوص اور تڑپ تھی جو فوراً" دل پر اثر کرتی ہے ۔ اسی لئے عوام میں ان کے عقیدوں کا بڑا چرچا ہوا اور لاکھوں ان کے پیرو ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ان کے پیرووں میں عالم اور فلسفی بھی شامل ہوئے اور انہوں نے شنکر اچاریہ کے فلسفہ' یعنی اس تعلیم کی جو دینی جذبے کو رسمی مذہب اور علمی تصورات میں بند کر دینا چاہتی تھی' مخالفت کی۔ رامانج آچاریہ فلسفیوں میں بھگتی کے پہلے ممتاز نمائندے تھے لیکن دل کی وہ آزادی جو ادیاروں اور آلواروں کی امتیازی صفت ہے ' انہیں نصیب نہ تھی شنکر آچاریہ نے ایک موقع پر کہا ہے کہ " میرا عقیدہ ہے کہ جس کسی نے بھی موجودات کو اس (وحدت کے) نقطہ نظر سے دیکھنا سیکھ لیا ہے وہ میرا اصل گرو ہے ' چاہے وہ چنڈال ہو چاہے براہمن" لیکن انہوں نے ذاتوں کے قانون کو رد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ رامانج آچاریہ نے بچنے میں ایک دن ایسا رکھا جب اچھوت ذاتوں کے لوگ ان کے مندر میں آسکتے تھے اور ان کے وعظ سن سکتے تھے ۔ ادیاروں اور الواروں نے تمام بندوں کو معبود کی نظر میں برابر کر دیا اور پوری مساوات برتتے رہے " (مجیب ۱۹۸۶: ۲۵۲ ' ۲۵۳)

مندرجہ بالا اقتباس میں پروفیسر مجیب کا یہ تجزیہ کہ بھگتی تحریک کا رشتہ نہ ویدوں سے اور نہ ہی مذہبی کتابوں سے بنتا ہے۔ بہت اہم ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہم دو متضاد آرا سے دوچار ہوتے ہیں ایک مکتب فکر تو یہی رائے رکھتا ہے جو پروفیسر مجیب کی ہے۔ ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ بھگتی کا ویدوں اور دوسری مذہبی کتابوں سے انحراف
۲۔ قربانیوں اور ان سے متعلقہ رسومات سے بطور ایک طریقہ عبادت اور ذریعہ نجات کا انکار
۳۔ ویدک دیوتاؤں سے روگردانی
۴۔ مذہبی جذبات کے اظہار میں تبدیلیاں
۵۔ براہمنوں کی مخالفت
۶۔ گرو بطور وسیلہ معرفت اور ذریعہ نجات
۷۔ سنسکرت کو بطور ایک مذہبی زبان کے اور مذہبی جذبات کے اظہار کے ذریعہ کے طور پر ترک کرنا اور

اورنگ زیب قاسمی

مختلف علاقائی بولیوں کو معبودیت کے اظہار کے لئے اپنانا۔

دوسرا مکتب فکر بھگتی کو ہندومت کی ہی ایک نئی صورت قرار دیتا ہے اور اس کی جڑیں اسی مذہب میں تلاش کرتا ہے ان کے دلائل یہ ہیں:

" بھگتی تحریک کا مصدر دور ماضی میں ہے لیکن اس کے جذباتی پہلوؤں سے ازمنہ وسطیٰ کے شاعروں نے استفادہ کیا" (رضوی: ۳۲) بھگتی کی توجہ کا مرکز نے ناروں کے لئے شو اور آلواروں کے لئے وشنو تھا۔ شو کا ذکر اگرچہ رگ وید کے دیوتاؤں میں واضح طور پر نہیں ہے لیکن یہ خیال مسلم ہے کہ رگ وید کے " قہری حصے کا مرکزی دیوتا ردر ہے جسے بعد میں شو قرار دیا گیا جو رگ وید کے دیوتاؤں میں سب سے چھوٹا تھا اور جس کے لئے رگ وید کی صرف اڑھائی مناجاتیں وقف ہیں۔ بعد میں یہ ہندوتثلیث کا ایک اہم رکن بن گیا۔" (بھٹا چارجی: ۱۰۹) وید شو کا نام نہیں جانتے لیکن ردر جو اس دیوتا کا دوسرا نام ہے ' اتنا ہی عام ہے اور رگ وید میں واحد اور جمع دونوں صیغوں میں واقع ہوتا ہے۔ اور ان سے ہی عظیم دیوتا شو اور اس کے مظاہر ردرون کا ارتقا ہوتا ہے" (ڈاسن: ۲۹۹)

اوفلے ہارڈی رگ وید کی مناجات ۱۰' ۱۳۶ کے حوالے سے کہتی ہیں " شویا ردر جو شو کے ابتدائی نمونوں میں سے ایک ہے' رگ وید کے آخری زمانے کی ایک مناجات جو ترک دنیا کے متعلق ہے ' ایک تارک الدنیا کا ذکر کرتی ہے جو حالت وجد میں ہے اور آئندہ یوگیوں کا پیش رو ہے اور جو قربانیوں کے مسلک سے متناقض ہے ..... ردر کے نام کے علاوہ اس مناجات میں شو کے کئی عناصر نظر آتے ہیں ۔ آگ ' لمبے بال (جو بعد میں یوگی کی الجھی ہوئی لٹیں بن گئیں)' رنگیلی گیروا اور آلودہ کپڑے' اپسرائیں اور جنگلی جانور (خصوصاً" گھوڑے) اور بالخصوص خبط و جنون جو روایتی ویدک مذہب کی قربانیوں کا شدید متناقض ہے اور جو بعد کے شائیوازم (یعنی شو سے متعلق مذہبی روایت) کے لئے انتہائی لازمی ہے" (اوفلے ہارڈی: ۴۰) شو کے پجاری نے ناروں کی ایک اہم شخصیت مانک واشکر (سنسکرت : مان واچک) تھا جس کے کلام کا مجموعہ تروا چکم شائیو سدھانت پر مبنی ہے اور شائیو سدھانت کا انحصار جتنا اس " تال وید " پر ہے اتنا ہی شو تاش ور تر اپنشد پر ہے " (زینر: ۱۳)

" جو شائیو ازم کی بنیادی کتاب ہے اور جو یجروید کا چوتھا اپنشد ہے " (ڈاکر ۲: ۵۳۳)

آلواروں کی مذہبی توجہ کا مرکز وشنو تھا جو رگ وید کے شمسی مجموعے کے دیوتاؤں میں سے ہے " رگ وید کی پانچ مناجاتیں اس کی شان میں ہیں جن میں اسی کو مخاطب کیا گیا ہے اگرچہ اس کا سراپا تو بیان نہیں کیا گیا لیکن اسے ایک خونخوار جانور سے تشبیہہ دی گئی ہے جو پہاڑوں میں رہتا ہے ۔ ان مناجاتوں میں اس کا شمسی تشخص واضح ہو جاتا ہے۔" (بھٹا چارجی: ۲۸۵) " رگ وید میں یہ صف اول کا دیوتا تو نہیں لیکن اس کا مظہر شمسی توانائی ہے اور وہ ہفت جہت کائنات کو اپنے قدموں سے طے کرتا ہے اور ہر چیز کو اپنے قدموں کی دھول (کرنوں) سے ڈھانپ دیتا ہے " (ڈاسن : ۳۶۰) مہابھارت کا کرشن اسی وشنو کا اوتار ہے۔

یہ وضاحت (فلون : اساطیر ۲ میں) ہو چکی کہ ہندو اساطیر کوئی جامد مظہر نہیں وہ زمانے کے ساتھ بدلتی رہی ہیں۔ رگ وید میں کل ۳۳ دیوتا تھے تو اب ان کی تعداد ۳۳ ہزار تک پہنچ چکی ہے ۔ وقت کے ساتھ چھوٹے دیوتا سامنے آتے چلے گئے اور بڑے دیوتا پس منظر میں جاتے رہے چنانچہ رگ وید کے یہ معمولی دیوتا یعنی شو اور وشنواہم ہوگئے اور اندر' اگنی ' ورن اور سوم گمنامی میں چلے گئے۔ یہ تبدیلی انداز" مہابھارت اور پرانوں

لی تصنیف کے وقت رونما ہوئی۔ ان پرانوں کی تعداد اٹھارہ ہے۔ اور ان کو چھ چھ کے تین مجموعوں میں تقسیم کیا گیا ہے اس طرح چھ پرانوں کا ایک مجموعہ شوپران کہلاتا ہے' دوسرا مجموعہ وشنو پران اور تیسرا برہما پر ان کے نام سے موسوم ہے وشنوپرانوں کے مجموعے میں سے ایک کا نام بھگوت پر ان ہے جس میں اٹھارہ ہزار بند ہیں جو بارہ حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلے نو حصے تو قدیم روایات ہی کی پیروی کرتے ہیں لیکن دسواں حصہ ان سے بہت مختلف ہے اور سب سے زیادہ مقبول ہے (باشم ۸: ۳۲۸) " اس کا تعلق سری کرشن کی پیدائش' بچپن اور جوانی کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ یہ بھگتی کے عظیم الشان اظہار سے پر ہے اسے ہندو ازم کا عظیم ادب شمار کیا جاتا ہے۔ مقامی زبانوں میں اس کے کثیر تراجم (صرف بنگالی میں ۴۰) اس کی مقبولیت کا ثبوت ہیں۔" (باشم (ایڈیٹر) ۱۹۷۵ء۔۳۲۲) اس بھگوت پر ان نے پوری ہندو ثقافت پر اہم اثرات مرتب کئے' مذہب' مصوری' ادب' رقص' موسیقی اور زندگی کے باقی شعبوں میں کوئی ایسا گوشہ نہ تھا جس پر بھگوت پر ان کے اثرات دکھائی نہ دیتے ہوں۔ ایک محقق کے مطابق ایسی عظیم الشان نظم دنیا کے کسی ادب میں نہیں ملتی۔ ازمنہ وسطیٰ کی ملی انگیز مصوری کی روایت نے بہت سارے موضوعات اسی بھگوت پر ان سے اخذ کئے ہیں " (بیسوتھیسن ۱۹۸۳ء' ۳۵) رام اور کرشن دونوں ہی وشنو کے اوتار ہیں۔ اور چارلز کے مطابق ان کے " الوہی منصب پر فائز ہونے کا آغاز پہلی صدی عیسوی کے قریب ہوا۔ اسی عمل کے ساتھ بھگتی تحریک وابستہ تھی یہ بھگتی ایک شخصی معبود کے لئے سنجیدگی سے غوروفکر پر مبنی عبودیت کی ایک دعوت تھی جس کی مثال ہمیں بھگوت گیتا میں نظر آتی ہے پرانوں کے اس نئے ادب میں کرشن سے متعلق اسطور ایک عمیق تقلیب سے گزری۔ رزمیہ کرشن پس منظر میں چلا گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا اب توجہ کا مرکز اس کی معجزاتی پیدائش' بچپن نوجوانی گوالوں سے کھیل کود اور گوپیوں سے چھیڑ چھاڑ عشق بازی اور محبت کے کارناموں پر مرکوز ہو گئی۔ کرشن کی اسطور کی اس تقلیب میں اور بھگتی کی سمت رو تحریک میں بلاشبہ ایک رشتہ ہے۔ شدت جذبات' عمیق دلسوزی اور معبود کی حضوری میں والہانہ مسرت جو اکثر عاشقانہ طرز اظہار پر مبنی ہے' بھگتی تحریک کے آغاز یعنی ساتویں صدی کے اوائل میں پہلی دفعہ تامل ناڈ کے شو کے پجاری نے ناینان اور وشنو کے پجاری آلواروں کی شاعری میں ہوا۔ ساتویں سے دسویں صدی تک کثیر تعداد میں مناجاتی ادب تخلیق ہوا جسے اکٹھا کر کے " تامل وید" قرار دیا گیا جو عوام کا آسمانی صحیفہ اور اس تحریک کے پیشواؤں کا دوسرا وید کہلایا" ۔ (باشم (ایڈیٹر) ۱۹۷۵ء' ۳۴۱' ۳۴۷) اس تامل وید میں وشنو کے پجاری آلواروں کے کلام کا مجموعہ " دیوا رام " اور شو کے پجاری نے ناروں کے سربراہ مانک واشگر کا مذکورہ بالا مجموعہ " ترو بیکم " شامل ہیں۔

اس نظریئے کو اس وقت اور بھی تقویت ملتی ہے جب ہم بھگوت گیتا سے رشتے کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بھگوت گیتا جو شریمد بھگوت گیتا اپنشد' بھگوت گیتا یا صرف گیتا بھی کہلاتی ہے ایک اپنشد ہے جو مہابھارت کا چھٹا باب یا حصہ ہے اس میں (ویدمنتر کے کہنے کا نام بھگت یدوفا جانکار)تھا بھگتی بطور اصطلاح کے اسی قسم کے مذہب کے لئے استعمال ہوتی ہے جس کا آغاز دراوڑی جنوب میں ہوا بعد میں اسے پورے ہندوستان میں پھیل جانا تھا اور ہندو ازم کا حلیہ تبدیل کر کے رکھ دینا تھا بھگوت گیتا میں معبود تک پہنچنے کے تین راستے بتائے گئے۔ گیان (علم) کرم (عمل) اور بھگتی ..... بھگتی ہندو ازم میں ایک نئے بعد کا اضافہ کرتی ہے اونی سطح پر یوگ سوز بھگتی کی اصطلاح سے گریز کرنے کے باوجود خارج میں موجود خدا بھگتی ایک نجات یافتہ روح پر توجہ مرکوز کرتے ہیں

اور ان سوتروں کی شرحوں میں (کہا گیا ہے کہ) خدا نجات حاصل کرنے والی روح کی اپنے فضل کے ذریعے مدد کرتا ہے۔ بھگوت گیتا میں خالق کی روح کا یہ پہلو بہت نمایاں ہے خدا نہ صرف نجات کی طرف " جو حالت برہمن ہے " روح کی راہنمائی کرتا ہے بلکہ اسے اپنے اندر مدغم کر لیتا ہے وہ بدلے میں روح سے محبت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس سے بھی محبت کی جائے ...... ہندو ازم میں خود فراموشی اور تیاگ پر مبنی طریقہ کار سے ہٹ کر خالق کے حضور انتہائی جذباتی خود سپردگی کی تقلیب بھگوت گیتا نے شروع کی اور ٹھوس مذہبی تیج جس نے بھگتی کو شدید متحرک کیا جنوبی ہند کی تامل علاقوں نے مہیا کی۔ دسویں صدی کے بعد ہندوازم کے اہم ترین عناصر کا اظہار بھگتی میں ہی ہوا" (زہنر: ۱۲۶ء' ۱۲۴' ۱۳۴)

بھگتی کے مخارج پر نظر ڈالنے کے بعد اس کے خدوخال دیکھنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

ہندو ازم میں بھگتی کو ایک تحریک قرار دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ اتنا بڑا انقلاب تھا جس کی نظیر ہمیں دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی۔ یہ وہ انقلاب ہے جس نے ویدک مذہب کو موجودہ ہندوازم میں تبدیل کر دیا۔ " کسی حد تک بھگتی کا تقابل پروٹسٹنٹ اصلاح دین کی تحریک سے کیا جاسکتا ہے۔ قربانیوں کا موروثی حق (معبود کے) اور عوام کے رابطے کا توارث تبدیل ہو کر عابد اور معبود کے درمیان ایک شخصی رشتے میں تبدیل ہو گیا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ سنسکرت زبان کی جگہ' جس کو پجاری ہی سمجھ سکتے تھے' مقامی بولیوں نے لے لی۔ اور مقامی زبانوں میں گائے جانے والی مناجاتوں نے پجاریوں کی دعاؤں کی جگہ لے لی۔ یہاں پر مشابہت ختم ہو جاتی ہے۔ براہمنی تنظیم کی شدید مخالفت کے باوجود اس سے واضح طور پر قطع تعلق نہ ہوا۔ اونچی ذات والوں کو دوبارہ پیدائش کی ویدک رسومات --- حمل ٹھہرنے سے لے کر چتا تک --- برہمن ہی ادا کرتے رہے۔ شخصی تعلقات پر مبنی مذہب برہمنوں کے اختیارات سے دامن بچاتا رہا۔ یہ براہمنی اختیارات اس مذہب نے گرو کو سونپ دیئے۔ اس مذہب کے مختلف فرقوں میں گو اختلاف تھا لیکن تامل میں گندھی ہوئی مناجاتوں کا اکثر رقص کے ساتھ گایا جانا ان سب کا مشترک اور مخصوص امتیاز تھا(زہنر: ۱۳۸)

چارلز بھی بھگتی کو ایک ایسا انقلاب قرار دیتا ہے جس کی نظیر ہمیں مسیحیت کی اصلاح دین کی تحریک میں ہی شاید نظر آتے ہیں۔ " پہلے متعدد دیوی دیوتا مذہبی توجہ کا مرکز تھے لیکن اس انقلاب کے بعد مذہب کی تمام تر توجہ ایشور (وشنو) اور اس کے بروز رام اور کرشن پر مرکوز ہو گئی۔ دوسرے دیوتاؤں کی جگہ اب صرف رام اور کرشن کی پرستش ہونے لگی۔ قربانیوں پر مبنی قدیم مذہبی رویے اور راہبانہ دھیان میں زبردست ریلی آئی اور اس کی جگہ شدید جذباتی اور پرجوش بھگتی کی نئی روش ابھری۔ فلسفیانہ قیاس آرائی کی جگہ ایک قابل عمل اور وجدان پر مبنی متصوفانہ رویہ پیدا ہوا اور بے حد مقبول ہوا مذہبی جذبات کے اظہار کی صورتیں بدل گئیں۔ بھگوان کی شان میں محبت سے بھرپور بھجن گائے جانے لگے اور خانگی محفلوں میں کیرتن کی گائیکی کا آغاز ہوا۔ اس نئی تحریک نے پرانے دیوتاؤں ' پرانی مذہبی روشوں' قدیم ثقافتی تصورات اور صورتوں اور اس زمانے کی مذہبی زبان سنسکرت کو پنڈتوں کے ذہنوں میں اور مندروں کے انتہائی اندرونی نہاں خانوں میں دھکیل دیا۔ اپنی ابتدائی صدیوں میں اس تحریک نے جدید مقامی ادب اور ثقافت کو نئے مذہبی سانچوں میں ڈھال دیا اور انہیں عوام کے جذبات اور ذہنوں کے بہت قریب لے آئی۔ قدیم سماجی نظام جو قربانیوں پر مبنی تھا اور جس پر براہمنوں کی اجارہ داری تھی گو بالکل تہس نہس تو نہ ہوا لیکن براہمنوں کی اجارہ داری کو شدید دھکا لگا اور ان

اورنگ زیب قاسمی

تھیں اور بغیر کسی عدالت کی طرف رجوع کئے یا شہادتیں قلم بند کئے 'بادشاہ عین موقعے پر ہی فیصلہ صادر کر دیتا تھا قتل' چوری 'ڈاکہ' راہزنی ایسے جرم تھے جن کا تعلق مدعی اور ملزم کے درمیان تھا اور ریاست کا صرف اتنا فرض تھا کہ ان کے درمیان دادرسی یا سمجھوتا کرایا جائے۔ یہ صورت حال نہ صرف سلطنت کے زمانے میں تھی بلکہ مغلیہ عہد میں جاری رہی۔ عدل جہانگیری کاتصور محض الف لیلوی قصہ ہے ------ چنانچہ انگریز کے زمانے میں جب ہر جرم کو ریاست کے خلاف جرم قرار دیا گیا تو اشراف یا اس مراعات یافتہ طبقے نے عام آدمی کے ساتھ عدالت میں پیش ہونے پر اس لئے اعتراض کیا کہ وہ عام قانون سے بالاتر ہیں (مبارک علی:) یہ صورت حال تقریباً" وہی تھی جس سے آج ہم دوچار ہیں۔

تعلیم کے میدان میں بھی یہ تفریق روا رکھی گئی۔ مدرسے اور مکتب صرف غریب غربا کے لئے تھے جو تعلیم حاصل کرنے کی تھوڑی بہت استطاعت رکھتے تھے' ورنہ اشراف کے بچوں کو پڑھانے استاد ان کے گھروں پر جاتے تھے اور شاید انہیں "مل بھی بیٹھ" کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ اشراف نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بچے اجلاف کے بچوں کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں۔

چنانچہ بھگتی تحریک کا اسلامی نظریات سے متاثر ہونا اس تحریک کے راہنماؤں کا اسلام کے زیر اثر آنا ایک غلط نظریہ ہے موجمدار (ایڈیٹر) (۵۵۳:۶) ہاشم بھی موجمدار کی تائید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہندوؤں کے بنیادی عقائد کو اسلام متاثر نہ کرسکا۔ کبیر اورباسوپر شاید اسلام کی تعلیمات کا کچھ اثر ہو لیکن بنیادی طور پر وہ ہندو ہی رہے (ہاشم: ۹۶' ۹۱ء)

اسلام کے صوفیا اور ہندو صوفیا میں کچھ عمل مشترک نظر آتے ہیں (۱) صوفیا کا خیال معرفت الٰہی عقل سے نہیں بلکہ محبت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے (۲) جسمانی ورزشوں میں مماثلت جیسے حبس دم (۳) کثرت ذکر اور مقدس الفاظ پر اصرار (۴) مذہبی رسومات ترک (۵) فنافی اللہ کے عقیدے پر یقین (۶) سالک اور گرو پر اصرار (۷) ازمنہ وسطیٰ میں بودھی سہجیا شاعری اور صوفی شاعری کی مماثلت۔ ان سب سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کا تصوف اس زمانے کے صوفیا کابودھی سہجیا کے خلاف رد عمل کا نتیجہ تھا۔

لیکن موجمدار اس موضوع کے طالب علموں کو خبردار کرتے ہیں کہ اگرچہ ایسے نتائج معقول نظر آتے ہیں لیکن ان کے غیر استدلالی ہونے کی بنا پر انہیں قبول کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بنیاد پرست اسلام اور بنیاد پرست ہندو دھرم کا ایک دوسرے کو متاثر کرنا غیر اغلب ہے اور اس امر کی کوئی شہادت بھی نہیں۔ لیکن ان مذاہب کے صوفیانہ عناصر کا ایک دوسرے کو متاثر کرنا خارج ازامکان نہیں۔ اس امر کی شہادت بھی میسر ہے کہ یہ ایک دوسرے کے بہت قریب آئے لیکن ہم یہ تعین کرنے سے قاصر ہیں کہ دونوں مذاہب نے ایک دوسرے کو کیسے' کس طرح اور کس حد تک متاثر کیااور اثرات کی گہرائی اور وسعت کتنی تھی۔ ہم وثوق سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ عمل یک طرفہ نہیں تھا۔ اگر مسلمان صوفیانے ہندو تصوف کو متاثر کیا تو بودھی سہجیا کا اسلامی تصوف کو متاثر کرنا بھی لازمی نظر آتا ہے۔ اور ازمنہ وسطیٰ کے تصوف کے خواہ وہ ہندو یا اسلامی ' طلوع و عروج میں ہم دوسرے عوامل مثلاً" مذہبی خیالات کا نارمل ارتقا کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔

اس مقام پر ہم بحث کے دوسرے مرحلے میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں اسلام کے بالواسطہ اثرات کی بحث شروع ہوتی ہے موجمدار کا موقف یہ کہ اسلام جیسا تبلیغی مذہب ہندو دھرم کے لئے ایک زبردست چیلنج تھا

اورنگ زیب قاسمی

جس نے اس مذہب کے راہنماؤں کو خود اپنے مذہب میں حقیقت کی تلاش پر آمادہ کیا۔ یہ صورت حال بعینہ ایسی ہے جیسی کہ انگریزوں کی آمد پر ہندو دھرم کو دوسری دفعہ پیش آئی۔ انگریزوں اور ان کے مذہب کے خلاف ہندو مذہب نے اپنے دفاع کے لئے خود اپنے اندر سے قوت حاصل کی۔ اس کی ایک صورت راجا رام موہن رائے کا قائم کردہ برہمو سماج تھاجس نے وقت کے تقاضوں کے پیش نظر ہندو ازم میں اصلاحات کرکے عیسائیت کا راستہ بڑی کامیابی سے روکا۔ چیلنج خارجہ سے آیا جس کے پیچھے چرچ کی آہنی تنظیم' اس کا تبلیغی مشن ' عیسائیت اختیار کرنے والوں کے لئے سیاسی اور اقتصادی ' تعلیمی اور دیگر مراعات بھی شامل تھیں لیکن اس کا مقابلہ ہندودھرم میں زمانے سے ہم آہنگ اصلاحات کرکے کیا گیا۔ اسی طرح اسلام کے خارجی چیلنج کا راستہ بھی ہندو دھرم نے اپنی اندرونی قوت سے کیا ہوگا جو اس کے حالات اور زمانے کے ساتھ بدلتے رہنے کی صلاحیت میں مخفی ہے۔ یہ اس مذہب کا وہ اندرونی محرک ہے جو تقریباً" پچیس سو برسوں پر محیط اس کی تاریخ کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے ہندو ازم نے اپنی روایات و رسومات اور عقائد کو مضبوط کرکے اسلام کا مقابلہ کیا چنانچہ ہندو تصوف اور بھگتی کو بھی اسی خیال کی روشنی میں دیکھاجارہا ہے کثرت پرستی' اصنام پرستی اور ذات پات عیسائیت کے ہدف تھے لیکن یہی وہ مقامات ہیں جہاں ہندو ازم نے اصلاحات کرکے اسلام اور عیسائیت کا راستہ روکا۔

"اسلام نئے خطرات اور نئے مسائل اپنے ساتھ لایا۔ پہلے کئی حملہ آور آئے اور ہر موقعے پر کسی نہ کسی طرح ذات پات کے نظام میں جذب ہوگئے۔ مسلمان حملے ان سے مختلف تھے۔ اول تو تمام مذاہب کے مقابلے میں اسلام میں حالات کے مطابق تبدیل ہونے کی صلاحیت بہت کم ہے اور دوئم یہ حملہ آور ترکی النسل تھے اور تمام نو مذہبوں کی طرح یہ مذہبی معاملات میں زیادہ متشدد تھے ..... اسلام کے خلاف ہندو ازم کا اپنے آپ کو سکیڑ لینے سے ہی ہندو ازم کا تشخص برقرار رہ سکا۔ ہندو ازم زیادہ بے لچک ہوگیا۔ اس نے اسلام سے اجتناب کم کشش والا رواج یعنی پردہ اپنایا" (زیہنر ۱۳۵ء ۳)

"سترہویں صدی میں اسلام کے خلاف کامیاب جوابی حملہ ہوا۔ اس تحریک کا ہیرو شیواجی جاہی مرہٹہ تھا جو خود ایک مذہبی آدمی تھا ایک غیر ملکی نظام حکومت کے خلاف کشمکش میں اس نے ہندو ازم کے احیاء کی اخلاقی طاقت کی لازمی تائید حاصل کی۔ مرہٹہ ریاست کے قیام میں مرہٹہ خدا پرست بزرگوں کے گیتوں نے کوئی معمولی کردار ادانہیں کیا۔ بھگتی تحریک کی دوسری لہر ایک بے ساختہ رد عمل تھا ایک ایسے مذہب کے جارحانہ تصادم کے خلاف جس نے ہندو ازم اور ہر اس چیز کو جو صدیوں سے ہندو تھی' کو چیلنج کیا" (زیہنر: ۳ء)

اور "برعظیم ہند میں اسلام کو دو خارجی چیلنج درپیش تھے اسے ہندو ازم اور مغربی تہذیب سے خطرہ لاحق تھا۔ باوجود ذات پات کے نظام کے بندھنوں کے مقابلے میں ہندو ازم میں دوسری تہذیبوں کو جذب کرنے کی زیادہ صلاحیت تھی۔ صرف اسلام ہی نے اپنی بے لچک توحید اور فرقہ واری سے الگ تھلگ رہنے کی بنا پر ہندو ازم کے انجذاب کی کشش کی مزاحمت کی۔ تاہم ان مذہبوں اور تہذیبوں کے درمیان ربط اور کشمکش کے زیر اثر چھوٹی چھوٹی ذیلی جماعتیں پیدا ہوگئیں جیسے حسینی براہمن جو دو اسماعیلی طبقوں بوہروں اور خوجوں کے زیر اثر تھیں۔ اور تیرہویں صدی میں خود ہندو ازم میں انتہائی تنقیض والی متصوفانہ بھگتی تحریک اور سکھ ازم کی تشکیل ہوئی جو بعد میں اسلام کی شدید دشمن ہوگئیں۔ موجودہ زمانے میں سیاسی کشمکش بڑی حد تک ازمنہ وسطیٰ

اور موجودہ دور کی سیاسی اور ثقافتی کشمکش کی میراث ہے (عزیز احمد: ۱۶۳)

اس ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے موجمدار اس رائے کا اظہار کرتا ہے کہ ہندوستانی ثقافت میں بھگتی تحریک اور تصوف کے رشتے کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے لیکن اخلاقی روحانی اور فلسفیانہ نقطہ نظر سے اس رشتے کی تاریخی اہمیت بہت محدود ہے کیونکہ ان تحریکوں کے عروج کے وقت ان سے متاثر ہونے والوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔ یہ عروج کا دور بھی کوئی زیادہ طویل نہیں تھا۔ اس لئے متاثرہ لوگوں کی تعداد میں متواتر کمی ہوتی چلی گئی اور یوں ان دونوں مذاہب کے صوفیانہ عناصر یعنی اسلامی تصوف اور بھگتی میں بھی ایک دوسرے کو متاثر کرنے کی قوت میں بتدریج کمی آتی چلی گئی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک ندی کے دو کنارے گو دھارا کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن ندی کا دھارا ان کو ایک دوسرے سے دور رکھتا ہے اگر اس ندی پر پل باندھ دیا جائے تو بھی زیادہ دیر نہیں چل پاتا (موجمدار (ایڈیٹر) ۶: ۵۵۳-۵۵۵) کیا پاکستان کا قیام اس امر کا زندہ ثبوت نہیں ؟

یہ خیالات ایک ہندو ایک انگریز محقق کے ہیں۔ ان میں تعصب کے عنصر کا نہ ہونا غیر ممکن نہیں۔ ہمارے دانشوروں کا فرض بنتا ہے کہ دلیل اور شہادت سے ان خیالات کی تردید کی جائے اور سچ کو تعصبات کی گرد سے باہر نکالا جائے ورنہ ان نتائج کو قبول کرنے کے سوا چارا نہیں۔ بھگتی کو اسلام اور ہندو ازم میں مفاہمت کی کوشش قرار دینا ایک خوش فہمی ہے اور تاریخ کو غلط تناظر میں دیکھنے کے مترادف بیسویں صدی میں برعظیم کی سیاست میں ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ " ہر مسلمان راہنما کا پہلے کانگریس میں شامل ہونا اور پھر اس سے علیحدگی' آل انڈیا کانگریس کا رام راج کا تصور اور اس کے حصول کی کوششیں' پھر قیام پاکستان اور ہندو مسلم فسادات جن کا دائرہ وقت کے ساتھ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ اب بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا تنازعہ اور ان سب پر بھارتی مہاتما گاندھی کا یہ فرمان کہ مسلمان ہندوستان میں باہر سے آئے ہیں اور اگر یہ ہندوؤں کے ساتھ " تعاون " نہیں کرتے تو انہیں ملک چھوڑ دینا چاہیے۔ ایسے شواہد ہیں جو ایسی مفاہمت کے نظریات کی نفی کرتے ہیں۔

اس مسئلے اور اس جیسے دوسرے مسائل کا تجزیہ کرتے وقت دو امور ذہن میں رکھنے چاہئیں۔ اول یہ مسائل ایک بہت بڑے مسئلے کے ذیلی مباحث ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسلام نے کس حد تک ہندو مذہب' تہذیب' تمدن' ثقافت اور طرز زندگی کو متاثر کیا اور کس حد تک خود متاثر ہوا۔ دوسرے امر کا تعلق طریق کار سے ہے۔ ہندوستان کی طرز زندگی میں تبدیلیوں اور انقلابات کو ہم آریاؤں اور مقامی لوگوں' خصوصاً" دراوڑی زبان بولنے والے قبائل اور پھر اسلام سے منسلک کر دیتے ہیں۔ ہندو ازم میں ویدک عہد سے لے کر آج تک بے شمار تبدیلیاں ہوئی ہیں اور اس میں بڑے انقلابات آئے ہیں۔ ان کی توجیہہ جس طرح آج کل ہم کر رہے ہیں۔ ان روایات کو آج کل کے اذہان بہت خصوصاً" پروفیسر ہے۔ گونڈا سب مستشرقین طریقہ کار کہتے ہیں اور وہ لوگ اس سے مطمئن نہیں ہیں ان کی نظر میں ان تبدیلیوں اور انقلابات کا سرچشمہ اس مذہب کے اندر ہی ہے جو اس مذہب اور ہندوستان کی ثقافت اور طرز زندگی کو حالات کے مطابق تبدیل ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی ہندو مذہب کی طویل العمری کا راز ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

BIBLIOGRAPHY:

1-Aziz Ahmad

Islamic Frontiers in Africa and Asia in Schacht and

Bosworth (eds.)The Legacy of Islam OUP 1979

2-Basham A.L.

History of Hinduism Encyclopaedia Britannica

vol.8 1983

3- - - - - (ed.)

Cultural History of India OUP,London 1975

4-Bhattachari'S.

The Indian Theogony' Cambridge 1970

5-Buitenen J.A.B. von

South East Asia People of Encyclopaedia Britannica

vol.17,1973

6-Dawson John.

A Classical Dictionary of Hindu Mythology and Religion

rep.New Delhi 1978

7-Mubarak Ali'Dr.

A Touch above the Rest, The Daily Frontier Post

Lahore August 16 1991

8-Mujamadar R.C(ed)

The history and culture of Indian people

Bharatiya vidya Bhavan,Bombay,1980,vol.6

9-Mujeeb M.

Tarikh-i-Tamadan-i-Hind' New Delhi

10-O'Flaherty,W.D.

Asceticism and Eroticism in the Mythology of

Siva OUP,London 1973

11-Renou'Louis.

Hinduism'Prentice-Hall International ,London 1961.

12-Schacht Joseph

The Legacy of Islam op.cit.

13-Walker'B

The Hindu World, Allen and Unwin London vol 1

1968.

14- Zaehner R.C

Hinduism OUP,London 1975.

("فنون" لاہور)

دانش یونان

دانائے ہفت گانہ اگرچہ ہلکی پھلکی زبان میں لکھی گئی کتاب ہے لیکن اس کے قابل اعتبار ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اس لئے کہ اس میں جتنی معلومات دی گئی ہیں وہ سب مستند اور اولین حوالوں سے لی گئی ہیں کتاب کے آخر میں کتابیات کی فہرست درج ہے اگر آپ کو شبہ ہے کہ اس میں کسی جگہ بے پرکی اڑائی گئی ہے تو تکلیف فرما کر چیک کر لیں۔ اب اگر صداقت ہی کہانی معلوم ہو تو اس میں لکھنے والے کا کیا قصور ہے۔

یہ کہانی یونانی فلسفے کی کہانی ہے اور وہ بھی سقراط سے قبل فلسفے کی۔ بات یہ ہے کہ یونانی فلسفے کا ہمارے فلسفے پر گہرا اثر ہے سارا اسلامی فلسفہ معلم اول ارسطو اور معلم ثانی فارابی کے اثرات لئے ہوئے ہے اور وہ حکما بھی جنہوں نے معلم اول سے اختلاف کرنا چاہا اسی معلم کے علمی طریقے استعمال کرتے رہے ہیں۔ اور تو اور ہمارے مدرسوں میں فرفوریس کی ایسا غوجی اب بھی پڑھائی جاتی ہے جس کے متعلق مدرسے کے ایک فارغ التحصیل مولوی کا جو خود بھی مدرس بن چکے تھے یہ خیال تھا کہ یہ کتاب قرن اول کے کسی مسلمان حکیم کی لکھی ہوئی ہے۔ ایک بہت بڑے عالم جو منقولات کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور خیر آبادی مدرسہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ منطق کے مبادیات پر بات کرنا چاہی اور ان کو ان تبدیلیوں سے آگاہ کرنا چاہا جو منطق میں بیسویں صدی میں آگئی ہیں تو انہوں نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ کثیر الجہتی منطق کو بدعات کے خلاف سمجھتے رہے ان کا کہنا تھا کہ منطق تو ایک ہی ہے۔ بھلا آپ ہی بتایئے کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ارسطو کے قوانین اور خاص طور پر قانون تضاد اور پھر عقل' جوہر اور عرض کے واسطے کے علاوہ اور کون سا واسطہ تفہیم کے لئے استعمال کر سکتی ہے؟ چونکہ زمانہ حال تک ہمارے ذہنوں پر فلسفہ یونان کی ایک ایسی گہری چھاپ ہے اور مذہب اسلام کی تفہیم میں اس کو اتنا ناگزیر سمجھ لیا گیا میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ آپ سے فکر یونان کا تعارف کراؤں اور چونکہ سقراط' ارسطو اور افلاطون سے ماقبل جو مفکرین گزرے ہیں ان کے ذکر اور تفہیم کے بغیر ان تینوں بزرگوں کے خیالات کی تفہیم ادھوری رہ جاتی ہے۔ اس لئے ماقبل سقراط کے دانشوروں کی تاریخ حاضر ہے۔

سقراط سے ماقبل حکمائے ہفت گانہ یا آسان زبان میں سات دانا بہت اہم گزرے ہیں جو تعداد میں بائیس ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان بائیس میں یہ بات طے نہیں کہ کون سے سات بہت اہم ہیں اکثر کی رائے چار پر متفق ہے لیکن سات کی تعداد پوری کرنے کے لئے جب باقی تین شامل کرنے پڑتے ہیں تو دانشوروں میں اختلاف رونما ہو جاتا ہے اس لئے پہلے چار کے علاوہ ہم کو مقابل میں (reserve) کم از کم اٹھارہ اور شامل

کرنے پڑتے ہیں۔ جیسے کرکٹ میں بارہواں کھلاڑی یا ہاکی میں مزید تین یا چار۔ خیر کھیلوں میں تو مزید کی فہرست میں افسروں' دوستوں اور سفارشیوں کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے یہ کام دانشوروں اور فلسفیوں کے باب میں اس لئے نہیں کر سکتے کہ وہ آج کے پاکستان کے دانشور یا فلسفی نہیں ہیں ورنہ مجھے سات دانشوروں کے لئے کم از کم سات سو کی فہرست تیار کرنا پڑتی کیا پتہ کب کون حکومت میں آجائے۔ ماقبل سقراط وہ سات حکمائے یونان یا فلسفی جن کی تعداد بائیس ہے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تھیلس (Thales) (طالیس ملطی) ۔۲۔ پٹاکس (Pittacus)۔۳۔ بیاس (Bias)

۴۔ سولن (Solon) ۔۵۔ کلیوبولس (Cleobulus)۔۶۔ مائی سن (Myson)

۷۔ کلون (Chlion)۔۸۔ پیریانڈر (Periander)۔۹۔ ارسطو ڈیمس (Aristo demous)

۱۰۔ اپی مینڈیس (Epimenides)۔۱۱۔ لیوفانٹس (Leophantus)۔۱۲۔ فیثاغورث (Pythagorus)

۱۳۔ اناکارسس (Anacharsis)۔۱۴۔ اپی کارمس (Epicarmus)۔۱۵۔ آکیوسلاس (Acuslas)

۱۶۔ آرفیس (Orpheus)۔۱۷۔ پیسسٹریٹس (Pisisteatus)۔۱۸۔ فری کائیڈس (Pherecydes)

۱۹۔ ہرمیون کلا ( )۔۲۰۔ لاسوس (Lasos)۔۲۱۔ پام فلیس (Palmphilus)۔۲۲۔ انگ گورس (Anagorus)

ان چار پر تو دانشور متفق ہیں یعنی تھیلس' پٹاکس' بیاس' اور سولن جن کو اس ٹیم کا اصل کھلاڑی سمجھنا چاہیے باقی رہے اٹھارہ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ٹیم کون بنا رہا ہے یا ٹیم میں کس کے پاس مضبوط مہرے ہیں۔ آپ کے قریبی دوست رشتہ داروں میں کوئی وزیر فوجی افسر یا مافیا کا بڑا شامل ہے تو آپ بھی اپنے کسی چہیتے کو ٹیم کا ممبر بنا سکتے ہیں۔ ہم اس بات میں غیر جانب دار ہیں۔

کیا آپ نے کسی دانا کو دیکھا ہے؟ اصل میں میں یہ بات اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ اگر آپ کی ملاقات کسی دانا حکیم سے ہو تو آپ کو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ وہ دانا اور حکیم ہے۔

کراچی جم خانہ کے بلیرڈ روم میں میری ایک دانا سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی عمر بھی داناؤں کی سی تھی۔ سفید داڑھی' اور کم گو مرنجان مرنج معلوم ہوتے تھے۔ اول تو بولتے کم تھے اور جب بولتے تو چند الفاظ منہ سے نکلتے۔ مختصر اور حتمی ماقل و دل۔ کبھی کبھی اسنوکر کا کوئی کھلاڑی کسی نکتہ کی وضاحت چاہتا تو آہستہ خرامی سے میز کی طرف بڑھتے گیندوں کی طرف دیکھتے اور کبھی کہتے سفید کبھی کہتے سرخ۔ بس اسی ایک لفظ میں ساری گتھی سلجھا دیتے۔ قطرہ کو دریا میں بند کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ اعجاز کلام کا اس سے بہتر نمونہ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا اب آپ پوچھیں گے تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ دانا حکیم تھے؟ انہوں نے کون سی باتیں دانائی کی تھیں؟ لیکن مجھے معلوم ہے کہ اگر میں کسی مشکل سے دوچار ہو جاؤں وہ ضروری میری مدد کر سکیں گے۔ اور صرف ان کا ایک لفظ میرے تمام عقدوں کو حل کر دے گا کیا مجھے نہیں معلوم کہ یونان کے حکما بھی اسی طرح کم سخن تھے۔ اور اپنے اعجاز کلام سے تمام مسائل حل کر دیا کرتے تھے جب ہی تو ان کے مختصر مگر جامع پر مغز اقوال مشہور ہیں۔ اگر میرے بلیرڈ روم کے حکیم کی دانائی میں اور اعجاز میں کوئی شبہ ہے تو آپ یونان کے حکیموں کے اقوال سن لیں۔ "اگر جانتے ہو تو خاموش رہو" سولن "جلد بازی کے کلام سے پرہیز کرو۔" بیاس "سننے کے لئے حریص رہو بولنے کے لئے نہیں۔" "کلیوبلس" "تیوار تمہاری زبان تمہارے خیال

اورنگ زیب قاسمی

اورنگ زیب قاسمی

سے آگے نہ نکل جائے "نظون" یہ تمام اقوال میں آپ کو یونانی زبان میں سناؤں تو اور بھی مختصر لگیں۔ اب آپ خود بتائیں کہ کیا اختصار کلام اور دانائی ہم رشتہ نہیں ہیں؟ اختصار کلام بلکہ بے کلامی کے سبب ہی ہم خانہ کے بزرگ داناؤں کے زمرے میں شامل ہیں۔ اسی اختصار کی وجہ سے غالباً" یہ تمام حکما کہاوتوں کے بانی کے جاسکتے ہیں۔ ان کہاوتوں میں سے بعض آج بھی مقبول ہیں۔

مثلاً" کلوبلس کی یہ کہاوت کہ " ہم جنس سے ہی شادی کرو" معاف کیجئے ہم جنس سے میری مراد کفو سے ہے اور غالباً کلوبلس کی بھی یہی مراد ہوگی باقی باتیں آپ کے دماغ کے فتور کو ظاہر کرتی ہیں۔ اسی قسم کی ایک کہاوت دوسری زبانوں میں بھی مشہور ہے جس کا ترجمہ کچھ اس قسم کا ہے " جس کے ساتھ معاملہ کرو اس کو ٹھونک بجا کر چنو" اس کے معنی بھی صاف ہیں ابہام آپ کے یونانی زبان نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ معاملہ کئے بغیر آدمی کیونکر کسی کو ٹھونکے اور بجائے شاید یونان میں یہ ممکن ہو یا یہ قول کہ " اپنی بیوی اور اپنا تیل اپنے محلے سے ہی حاصل کرو " ان سات داناؤں کی شہرت انہی اقوال کی وجہ سے چاردانگ عالم میں پھیل گئی اگرچہ اس زمانے میں اخبار تھے نہ ٹیلی ویژن لوگ صرف افواہوں پر بھروسہ کرتے تھے۔ معاف کیجئے افواہ کا لفظ میں نے خاص اس کے لغوی معنوں میں استعمال کیا ہے یعنی منہ سے نکلی بات جو فوراً" کوٹھوں چڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارا یونان جانتا تھا کہ طالیس اور اس کے ساتھی کیا کہتے پھرتے تھے یہ اقوال والدین اپنے بچوں کی تربیت کے لئے استعمال کرتے تھے جیسے سعدی نے گلستان بوستان میں کئے ہیں۔ اور جو یونانی اثرات کے تحت ہم کو بھی بچپن میں پڑھائی گئی تھیں یہی اقوال سیاست دان اپنی تقریروں میں استعمال کرتے تھے میں چونکہ سیاسی آدمی نہیں ہوں اس لئے آج کل کے سیاست دانوں کو کچھ نہیں کہوں گا۔ ان ہی داناؤں کے گیت فیض احمد فیض کی شاعری کی جگہ ڈنر پارٹیز کے بعد گائے جاتے تھے اور پندو نصائح سے پر ہوتے تھے۔ راگ سے جیسے بجاؤ۔ اس زمانے کے ایک گیت کے ٹیپ بند کا ترجمہ آپ بھی سن لیجئے شعریت نظر نہ آئے اور وزن بھی گرے تو قصور ترجمہ کا ہے۔ " سان چڑھا کر سونا پرکھو اور سونے سے انسان کو پرکھو۔"

ان بائیس دانائے ہفت گانہ میں سب سے بڑا دانا کون ہے اس میں اختلاف پایا جاسکتا ہے کچھ کی رائے میں وہ مائٹیلین(Mytilene) کا رہنے والا پٹاکس (Pittacus) ہے دیوجانس کا کہنا ہے وہ نہ صرف ایک حکیم تھا بلکہ امیر البحر بھی تھا اور اپنی فوجی حکمت عملی کے لئے مشہور تھا۔ فوجی حکمت عملی' سے تیسری دنیا کے ممالک عام طور پر ہم خاص طور پر واقف ہیں۔ شاید ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ اس کے ڈانڈے یونانی فکر میں ملتے ہیں پٹاکس ہماری ایک اور روایت کا بھی پیش رو ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کے ریٹائرمنٹ پر مائٹیلین کے لوگوں نے اس کو ایک جاگیر عطا کی اور اس جگہ کا نام پٹاکس رکھا لیکن صد افسوس ہماری طرح پٹاکس اس عطا کی قدر نہ کر سکا اور اس نے صرف جاگیر کا اتنا حصہ قبول کیا جو اس کی ضروریات زندگی کو پورا کردے اور یونانی حکیم ہونے کے ثبوت میں یہ مقولہ کہا " کل سے نصف زیادہ ہے" اسی پٹاکس کے اور مقولے بھی سماعت فرمائیں۔ " اپنی پلان کا پہلے سے اعلان نہ کرو اگر وہ کامیاب نہ ہوئی تو لوگ تمہارا مذاق اڑائیں گے " "نیک ہونا بہت مشکل ہے" " زمین پر بھروسہ کرو سمندر پر نہیں" اس کا سب سے نمایاں مقولہ "پڑوسی کے تنگ کرنے پر صبر کرو" ہے یہ مقولہ خاص طور پر اہل پاکستان کے لئے حکم احد عشرہ (گیارھواں) حکم بننے کے لئے

موزوں ہے اس لئے کہ یہ انسانی زندگی کی ایک بڑی اچھائی کی طرف متوجہ کرتا ہے یعنی رواداری' اور صرف رواداری ہی کی وجہ سے ہم اس مقولے کے عکس پر عمل پیرا ہیں " یعنی چاہو تو اپنے ہمسایہ کو تنگ کرو۔" حکمائے ہفت گانہ سے متعلق ایک کہانی مشہور ہے کہانی چونکہ مزیدار بھی ہے اور حسب حال بھی اس لئے اس جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ کہانی سچی ہے یا جھوٹی۔ کہتے ہیں ایک دن ساتوں دانا ملک کے لئے شہر سے باہر ڈیلفی کے مقام پر اپولو کے مندر پر جمع ہوئے جہاں استخارہ کیا جاتا تھا۔ مندر کے بڑے پروہت نے گرم جوش استقبال کیا اس کے لئے یہ اعزاز کچھ کم نہ تھا کہ حکمت یونان اتفاقاً" اس کے گرد جمع ہو گئی تھی پروہت نے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکمائے ہفت گانہ سے درخواست کی کہ وہ مندر کی دیوار پر اپنا اپنا ایک **مقولہ** لکھیں اسپارٹا کے کلون نے سبقت کی اور ایک سیڑھی لا کر مندر دروازہ کی پیشانی پر اپنا یہ **مقولہ** کندہ کیا " اپنے کو پہچانو۔" ایک ایک کرکے باقی داناؤں نے پروہت کی خواہش پوری کی کلیوبلس نے صدر دروازے کے دائیں طرف لکھا " اعتدال بہترین رویہ " ۔ ہیپاکٹر نے بائیں طرف یہ **مقولہ** کندہ کیا " طمانیت دنیا میں حسین ترین شے ہے۔" سولن نے زیادہ خاکساری دکھائی اور ستونوں کے پاس نسبتاً" ایک اندھیرے کونے میں یہ مقولہ لکھا " اطاعت کرنا سیکھو گے تو حکم دینا بھی آجائے گا۔" طالیس ملطی نے مندر کی بیرونی دیوار پر جو زائرین کو مندر کے مقدس راستے پر چلتے ہوئے دور سے نظر آتی تھی لکھا " اپنے دوستوں کو یاد رکھو۔" پٹاکس جو ہمیشہ کا نکی تھا اژدہے کی تپائی کے پاس جھکا اور یہ مبہم مقولہ لکھ دیا" جو تمہارے سپرد کیا گیا ہے اسے واپس کردو۔" اب معلوم نہیں کے کیا دینا ہے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ جب سب دانا اپنے اپنے مقولے لکھ چکے تو پرینے کے باشندے بیاس کی باری آئی داناؤں کو بڑا اچھنبا ہوا جب بیاس نے کچھ لکھنے سے انکار کر دیا میرا کچھ لکھنے کو دل نہیں چاہتا بیاس نے داناؤں سے معذرت کی۔ داناؤں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ بیاس کچھ لکھنے سے کیوں انکار کررہا ہے۔ اے بیاس اے ابن ٹیوٹامس! تم جو ہم میں سے بڑے دانا ہو آنے والی نسلوں کے لئے کوئی نصیحت کیوں نہیں چھوڑنا چاہتے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ مندر آنے والے زائرین تمہارے حکمت کے خزانے سے کچھ حاصل نہ کر پائیں؟ بیاس نے پھر بھی انکار کیا اور کہا میرے دوستو بہتر یہی ہے کہ میں کچھ نہ لکھوں مگر داناؤں نے بیاس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اس وقت تک کٹ حجتی کرتے رہے جب تک بیاس تنگ نہ آگیا اور مجبوراً" کانپتے ہاتھوں سے قلم اٹھا کر یہ جملہ لکھ دیا " اکثر آدمی برے ہوتے ہیں " بظاہر یہ ایک بے ضرر جملہ ہے لیکن یہ بلیغ جملہ ایک ایسے ڈرامائی فیصلے کا مظہر ہے جو حکمت یونان نے کبھی صادر نہیں کیا تھا(اکثر آدمی برے ہوتے ہیں) ایک ایسا بم ہے جو کسی بھی آئیڈیالوجی کو تباہ کر سکتا ہے۔ کیا آپ نے تاش کے پتوں کا مکان بنایا ہے اس مکان کے نیچے کا ایک کارڈ کھینچ لیں ساری عمارت دھڑام سے زمین پر آرہتی ہے۔ جمہوریت ' عام رائے دہندگی' مارکسزم ' عیسائیت اور اسی طرح اور دوسرے اصول جو پڑوسی سے محبت کرنے پر مبنی ہوتے ہیں اس مقولے کے دھکے سے مسمار ہو جاتے ہیں۔ روسو (rousseau) کو جس کا کہنا تھا کہ تمام انسان فطرتاً" نیک ہیں ٹامس ہابس سے شکست کھانا پڑتی ہے ' جس کا کہنا تھا کہ انسان لباس انسانیت میں بھیڑیا ہے۔ اگرچہ ہماری عزت نفس بیاس کی قنوطیت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے پھر بھی ہمیں یہ خیال ستاتا ہے کہ کہیں وہ بوڑھا سچ ہی نہ ہو میں سیاسی جلسوں کی بات نہیں کرتا فٹ بال کے میچوں میں یورپ کے تماشائیوں کے رویہ سے آپ واقف ہیں اور اگر

آپ کو کھیل سے دلچسپی نہیں تو ان جنگوں پر نظر ڈال لیجئے جو آپ کے چاروں طرف لڑی جا رہی ہیں ان ہتھیاروں کو دیکھ لیں جو تیار ہوتے ہیں اور غریب قوموں کے ہاتھ بیچے جاتے ہیں۔ اس آلودگی کو دیکھ لیں جو امیر غریب مل کر اس فضا میں پھیلا رہے ہیں۔ کیا یہ سب جاس کے مقولے کی صداقت کا ثبوت نہیں ہیں۔ زمانہ قدیم کے روم کے اکھاڑوں میں ہارنے والے تیغ زن کی قسمت کا فیصلہ محض اتفاقاً نہیں بلکہ جان بوجھ کر شہنشاہ وقت پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے اگر یہ فیصلہ تماشائیوں کے ہاتھ میں ہوتا تو اس غریب کا کیا حشر ہوتا۔ روم کے باعزت شہری جو اپنے خاندان کے ساتھ درندوں کے ہاتھوں انسان کی تکہ بوٹی کا تماشہ دیکھنے جاتے ہوں اور ان کے لئے ظاہر ہے تماشا جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی مزہ آئے گا۔ آج بھی یہ بات قدرے تبدیلی کے ساتھ اسی طرح درست ہے جس طرح رومی مذہب دنیا میں انسان دنیا کی تمام مخلوق میں سب سے زیادہ سفاک ہے جاس کے اس بیان سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ہنری برگساں البتہ اس باب میں رجائی نقطہ نظر رکھتا ہے اس کا خیال ہے کہ انسانیت آہستہ آہستہ "تدریجاً" بہتری کی طرف مائل ہے۔ امید کی اس کرن کے لئے ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے لیکن کم از کم سن ۳۰۰ کا انکار کرنا چاہیے۔ جاس کے مقولے کے ایک معنی اور بھی ہو سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ انفرادی طور پر تو انسان اچھا ہو سکتا ہے یا بعض انسان نیک ہو سکتے ہیں لیکن جب وہ مل جاتے ہیں تو ان کے عمل سے بدی جنم لیتی ہے انفرادی انسان نیک کام کر سکتا ہے لیکن یہی انسان جب انبوہ میں ہوتا ہے تو جنگلی جانوروں کی طرح عمل کرتا ہے میں نہیں جانتا کہ آپ تنہائی پسند ہیں یا مجلسی آدمی ہیں۔ میں البتہ ہمیشہ اقلیتوں کا ساتھ دیتا چلا آیا ہوں اور انبوہ سے گریزاں رہا ہوں چاہے وہ جلوس کی شکل میں ہو یا جشن کی یہ بات البتہ جاننے کی ہے کہ کیا میں بھیڑ کو اس لئے پسند نہیں کرتا کہ میں مجمع کی بدی سے متاثر نہیں ہونا چاہتا یا اس کا سبب یہ ہے کہ میں عوامی ہونے کو ناپسند کرتا ہوں! اور بڑا گھمنڈی ہوں! عام آدمیوں میں اٹھنا بیٹھنا مجھے پسند نہیں کیا یہ ایک غیر جمہوری نفسیات کا احساس ہے جو ان لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ جو اپنے آپ کو اشراف اور خواص سمجھتے ہیں اور عام ہونے پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں؟ ان سوالوں کے جواب میں اس لئے نہیں دینا چاہتا کہ اس طرح وہ مجھے اقرار جرم کی طرف لے جا سکتے ہیں۔ اور میں نے امریکن ناولوں میں پڑھا ہے کہ عدالت میں کوئی گواہ اس وجہ سے سوالوں کے جوابات دینے سے انکار کر سکتا ہے کہ وہ جواب خود اس پر الزام بن سکتے ہیں۔

پانچویں صدی قبل مسیح میں ایتھنز کے رہنے والے ایک نامعلوم شخص نے جو ممکن ہے کہ مہاجر یا خاندان یا ذات باہر رہا ہو ایک پمفلٹ لکھا تھا جو ایتھنز کی نئی جمہوریت کے بارے میں دو شہریوں کے مابین ایک گفتگو پر مشتمل ہے جو سقراط اور سی آئی ڈی کے خوف سے بے خطر ہو کر کھلے ماحول میں کی گئی تھی۔ ان میں سے ایک کہتا ہے "سب سے بہتر انسان میں بداخلاقی اور تمرد قلیل مقدار میں ہوتا ہے اور نیکی کی طرف اس کا میلان قوی ہوتا ہے جب کہ عوام میں جہالت" بدنظمی بدخصالی کی خصوصیات زیادہ ہوتی ہیں اور یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ غربت فضیحت کا سبب ہے اور فضیحت سے ناشائستگی اور قساوت پیدا ہوتی ہے۔ اور ان سب برائیوں کا سبب افلاس اور ناداری ہے۔"

جمہوری نظام پر تاباً" یہ سب سے پہلی تنقید ہے اس کا لکھنے والا اگرچہ ایک کٹر رجعت پسند ہے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ عوام کو اتنا مورد الزام نہیں قرار دیتا جن کے متعلق اس کا کہنا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی

اورنگ زیب قاسمی

مدد کرتے ہیں۔ البتہ خواص جو خود عوام میں سے نہیں ہوتے اپنی کارگزاری دکھانے کے لئے ان شہروں کا ہی انتخاب کرتے ہیں جہاں جمہوری نظام ہوتا ہے نہ کہ ان مقامات کا جہاں ان جیسوں کی حکومت ہوتی ہے انہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ خواص کی حکومت کی بہ نسبت عوامی شہری حکومتوں میں ان کی نفس پرستی اور خود غرضی چھپے رہنے کا زیادہ موقع ہے۔ یہ بات میں نے اپنے دل سے آج کے حالات دیکھتے ہوئے نہیں گھڑی ہے دانش یونانی نے اب سے چار ہزار سال پہلے آج کے حالات بھانپ لئے تھے۔

ایک چیز جو میں نے سیکھی ہے وہ یہ کہ جب ہم دانائی اور حکمت کی بات کریں تو ذرا احتیاط سے اس لئے کہ دانائی اکثر اور قصداً" آئیڈیلزم سے مختلف ہوتی ہے۔ حکمت و دانائی فہم عام (Common Sense) سے زیادہ کچھ نہیں' حقیقت کا ایک پختہ علم۔ جبکہ آئیڈیلزم وہ بے اختیار خواہش ہے' جو ایک بہتر مستقبل پر ایمان رکھنا چاہتی ہے۔ دانائی انسانوں کو ویسے کے وہ ہیں دیکھتی ہے۔ آئیڈیلزم جیسا کہ ان کو ہونا چاہیے پر غور کرتا ہے یہ دنیا میں رہنے کے دو طریقے ہیں حقیقت کو برتنے کے دو راستے ہیں۔ پسند آپ کی اور آپ کے مزاج کے مطابق ہو۔

۱۔ ارسطو کا مشہور کلیہ کہ "کوئی قضیہ بیک وقت صادق و کاذب نہیں ہو سکتا!"

۲۔ ارسطو کے نزدیک دس مقولات ایسے ہیں جن کی مدد سے اشیا کی شناخت ہوتی ہے اور وہ ہیں جوہر' مقدار' عرض' ربط' مقام' زمان' انداز' حالت' عمل اور کیفیت۔

۳۔ دیو جانس لارتیس "عظیم دانشوروں کے حالات" صفحہ ۱۸۸۔

۴۔ یہ مقولہ طالیس ملطی کی جانب بھی منسوب کیا جاتا ہے۔

۵۔ اپولو کے مندر میں رہا ہوا ایک عظیم الجثہ اور عجیب الخلقت اژدہا' یونانی دیومالا کے مطابق اس اژدہے کو اپولو نے دلفی کے مقام پر ہلاک کیا تھا۔

۶۔ دیو جانس ص ۱۸۸۔

۷۔ یہ دستاویز زینوفن "Xenophon" کے آثار میں ملی تھی۔

("سیپ" کراچی)

تذکرہ

حبیب جالب

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ لمحے فن میں ڈھل کر صدیاں بن جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال تو مولانا ظفر علی خان کی استعار دشمن شاعری ہے۔ ان کے فوراً بعد حبیب جالب کا نام آتا ہے۔ اس نے شاعری کا آغاز روایتی موضوعات سے کیا اور کچھ ہی عرصے میں اس نے اپنی انفرادیت یوں تسلیم کرالی کہ اس شاعری کو سہل ممتنع کی ایک بلیغ مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ سلاست اظہار بہت مشکل فن ہے۔ خاص طور سے جب اظہار ایسے جذبات و تصورات کا ہو جن کو فن میں منتقل کرتے ہوئے بیشتر اردو شعراء نے طویل تراکیب اور پے درپے اضافتوں اور عربی فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ کی بھرمار کر دی ہو۔ یوں میں سمجھتا ہوں کہ سلاست اظہار اردو شاعری کی ایک قدیم روایت سے باقاعدہ بغاوت ہے اور جالب نے ابتدائی دور کی غزلوں میں اپنے آپ کو اس طرح کا ایک کامیاب باغی ثابت کیا۔

اس کے بعد جالب نے اپنے فن میں اظہار کی ایک اور صفت کو اتنی خوبی اور تسلسل سے برتا کہ وہ پاکستان کی گزشتہ ۳۵ برس کی تاریخ میں آزادی اظہار اور جرات اظہار کی ایک علامت بن گیا۔۔۔۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ آزادی و جرات کے اظہار میں بھی وہ سلاست اظہار سے دست کش نہ ہوا" بلکہ ' میری رائے کے مطابق ' اس دور میں جالب کی ملک گیر مقبولیت میں اس کے موضوعات کی اہمیت اور ہمہ گیری کے علاوہ اس کی سلاست اظہار کا بھی بڑا ہاتھ ہے کیونکہ وہ جو بھی کہتا تھا' کچھ اس طرح عام بول چال کے انداز میں کہتا تھا کہ اس کا کلام ' پڑھنے اور سننے والے کے دل و دماغ میں براہ راست اتر کر اس کی شخصیت میں رچ بس جاتا تھا۔

حبیب جالب ترقی پسند ادب کی تحریک کی پیداوار تھا مگر گزشتہ ۳۵ برس کے ادبی منظر میں اس کی شخصیت شاید واحد شخصیت ہے جس نے بجائے خود ایک تحریک کا منصب ادا کیا۔ ترقی پسند ادب کی تحریک تو اب تک رواں دواں ہے مگر اس کی تنظیم آج سے نصف صدی پہلے انتشار کا شکار ہو گئی تھی اور تنظیم کی غیر موجودگی میں کسی واحد شاعر کا تحریک سازی کر لینا ہوتا بہت ہی دشوار مرحلہ ہے۔ حبیب جالب نے یہ مرحلہ پامردی سے طے کیا اور اسی لئے وہ معاصر اردو شاعری میں حق گوئی اور بے باک گوئی کی ایک علامت بن گیا۔ ہر فرد اپنی اپنی معاشرتی مجبوریوں کا اسیر ہوتا ہے اور شعراء بھی معاشرے کے افراد ہوتے ہیں اس لئے وہ اس اسیری سے مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ حبیب جالب بھی آپ کی اور ہماری طرح اسی معاشرے کا ایک رکن تھا مگر اس کا امتیاز یہ تھا کہ اس نے اس طرح کی کسی مجبوری کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہی سبب ہے کہ اردو شاعری

اورنگ زیب قاسمی

کی تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا۔ اس نے نہ تو دور از کار علامت کا سہارا لے کر خود کو چلمن کے پیچھے چھپایا اور نہ استعارے کو پھیلا کر اپنے مافی الضمیر کو فنی پینیتروں کے غلافوں میں لپیٹ کر پیش کیا۔ ہر بات براہ راست کی اور قطعی طور پر غیر مبہم اور دو ٹوک انداز میں کی اور اس نے یہ سب کچھ اس دور میں کیا جب سچ بولنا اپنا سر کاٹ کر ہتھیلی پر دھر لینے کے مترادف تھا۔

بے شک اس سے پہلے متعدد شعراء، غزل کو عصری حقائق کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں قابل قدر کام کر چکے تھے اور غزل کو قدیم دور کے معین موضوعات کے حبس سے نکالنے کے لئے زمین ہموار کر چکے تھے مگر جب کوئی کاشت کرنے والا ہی نہ ہو تو ہموار زمینیں بھی ویرانوں میں بدل جاتی ہیں۔ اس دور میں صرف جالب ہی ایک ایسا شاعر تھا جس نے چھپ چھپا کر نہیں بلکہ دن کی روشنی میں اور ساری دنیا کے سامنے ان ممنوعہ زمینوں کا رخ کیا اور ان میں حق و صداقت اور حوصلہ و جرات کی ایسی فصلیں کاشت کیں کہ خود اس کے حصے میں قید و بند کی صعوبتیں آئیں مگر اس نے آنے والی نسلوں کے لئے سچ بولنا آسان بنا دیا۔

یہ طے ہے کہ اس نے جو کچھ بھی کہا، حیرت انگیز حوصلے اور خلوص کے ساتھ کہا۔ یہ حوصلہ اسے صداقت کے اعتقاد نے بھی دیا اور ملک کے ان عوام کی حمایت نے بھی جن کی محرومیاں اور جن کے بنیادی حقوق کی پامالی جالب کی شاعری کا موضوع بنی اور اس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک لیجنڈ بن گیا۔ یہ شہرت اور مقبولیت اور عزت اس پر آسمان سے نہیں پھٹ پڑی تھی، اس نے یہ سب کچھ بے شمار قربانیاں دے کر حاصل کیا کہ اس کی عظیم جدوجہد ہی اس کا استحقاق تھا۔ پاکستان کی ادبی اور سیاسی تاریخ میں اس کا نام اور کام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

("فنون" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

ستار طاہر

ستار طاہر کی موت دبستان لاہور کے نہایت درجہ وسیع المطالعہ ادیب مترجم نقاد اور افسانہ نگار کی موت ہے وہ ایک طرح سے گوشہ نشین فنکار تھا۔ ادبی نشستوں اور تقریبوں میں شاذ ہی شرکت کرتا تھا۔ وہ بس پڑھتا تھا اور لکھتا تھا اور یہی اس کی واحد سرگرمی تھی مگر اس میدان میں بھی اس نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ کسی ادیب نے اتنے مختصر وقفہ حیات میں کم ہی اتنا بہت سا کام کیا ہو گا کہ وہ مقدار اور معیار، دونوں لحاظ سے بے مثال ہو۔

تنقید کے میدان میں اس نے ہمیشہ حق کا پرچم بلند رکھا۔ وہ کسی کی شان و شوکت یا بہتان و دشنام یا دھمکیوں سے متاثر ہونا جانتا ہی نہیں تھا، چنانچہ اسے جب بھی موقع ملا اور جہاں بھی موقع ملا، کسی کے لحاظ و پاس کے بغیر سچی اور کھری بات کی۔ اس سلسلے میں اسے بعض معاصر کی یا وہ گوئیوں کا ہدف بھی بننا پڑا اور بعض جرائد نے تو اس کی نگارشات کو اپنے ہاں جگہ دینے سے بھی معذرت کا اظہار کر دیا، مگر اس نے کبھی ہارنہ مانی، کبھی مصالحت کی زد میں نہ آیا، کبھی مرعوب نہ ہوا اور یوں اردو ادب میں بے خوفی اور حق گوئی کی علامت قرار پا گیا۔

وہ نہ صرف خود ایک عمدہ افسانہ نگار تھا بلکہ دنیا بھر کے اعلیٰ ادب کے ناولوں کو سلیقے کے ساتھ اردو میں منتقل کرتا رہا اور اس ضمن میں اتنا بہت سا کام کیا اگر ہمارا معاشرہ اور ہمارا مقتدر طبقہ انصاف پسند ہوتا تو ان تراجم کے حوالے سے برسوں پہلے وہ حسن کارکردگی کے ایوارڈ کا مستحق گردانا جاتا۔ پھر اس نے صرف فکشن کے تراجم ہی نہیں کئے بلکہ موت سے چند ہی ہفتے پہلے ایران کی ایک مصنف شہلاہائری کی ایک نہایت اہم کتاب کو "چاہت کا قانون" کے نام سے صاف ستھری اور رواں اردو میں منتقل کر کے ثابت کر دیا کہ وہ جملہ علوم پر حاوی ہے اور ان کی اصطلاحوں اور لفظیات کو پوری طرح سمجھتا ہے۔

افسوس کہ اسے کسی ایک مقام پر جم کر کام کرنے کا موقع کم ہی ملا اور وہ یہاں سے وہاں بکھرتا پھرا، مگر جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، وہ حقیقت اور سچائی سے منحرف ہونے کو گناہ سمجھتا تھا اور اس کی اچانک اور بے وقت موت کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے آسودگی کی بے فکری کبھی میسر نہ آئی۔ اردو ادب اور پاکستان کی ثقافت کو اس نے بہت کچھ دیا ہے اس لئے تاریخ ادب اردو کے ایک بھرپور کردار کی حیثیت میں اس کا نام آئندہ صدیوں تک زندہ رہے گا۔

("فنون" لاہور)

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

سیماب --- صراط مستقیم کا شاعر

جب حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد میں ان کے ترجمہ قرآن عظیم (فارسی) پر اعتراضات کئے گئے تو مخالف علماء بہرحال اپنے حق میں چند دلائل رکھتے تھے ان کے نقطہ نظر کی بڑی حد تک حمایت پکتھال مرحوم نے کی ہے جن کا نام قرآن حکیم کے انگریزی مترجموں میں درجہ امتیاز رکھتا ہے۔ انہوں نے بجا طور پر یہ بات کہی ہے کہ قرآن حکیم کا ترجمہ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ ہاں اس کے مفاہیم کی ترجمانی دوسری زبانوں میں ممکن ہے۔

اردو بحمداللہ ایک ایسی زبان ہے جس نے عربی زبان کے الفاظ کو بالعموم اور اسلام کی اصطلاحات کو بالخصوص اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔

جو یقیں رکھتے نہیں ہیں آخرت پر (کفر سے)
ہے جو رب سارے جہانوں کا، رحیم و مہرباں
ان کا رستہ جن پہ انعام و کرم تیرا ہوا
آؤ اے لوگو عبادت اپنے رب ہی کی کرو
اس نے ہی پیدا کیا ہے تم کو اور اسلاف کو
سجدہ آدم کو کرو ہم نے فرشتوں سے کہا
ماسوا ابلیس کے، سب نے اسے سجدہ کیا

عربی الفاظ نے اردو کو اسلامی علوم و فنون کی ادائیگی اور مطالب قرآن حکیم کے اظہار کی توانائی عطا کر دی ہے اگرچہ فارسی کے زیر اثر صلوٰۃ نماز بن گئی صوم روزہ میں تبدیل ہو گیا۔ متقی کے لئے پرہیز گار کی اصطلاح استعمال ہونے لگی لیکن اب اصل عربی اور قرآنی اصطلاحوں کی طرف مراجعت کا سلسلہ جاری ہو گیا ہے۔

علامہ سیماب اکبر آبادی کا منظوم ترجمہ قرآن "وحی منظوم" اس مراجعت کے پہلے نمونوں میں سے ایک ہے انہوں نے بیشتر مقامات پر قرآنی الفاظ کو اردو زبان کے مزاج سے ہم آہنگ کرکے قائم رکھا ہے جس کا اندازہ اوپر کے شعروں اور مصرعوں سے ہو سکتا ہے اور پھر سورہ الحج کی ۱۷ویں آیت کے ترجمہ کا یہ ٹکڑا دیکھیے۔

یہ جو ہیں مسلم نصاریٰ اور یہودی صابئین
اور یہ جو ہیں مجوسی اور (کفر پیشہ) مشرکین

ایسی مثالیں کم و بیش ہر صفحہ پر ملتی ہیں۔ ویسے رب کائنات کے اسم ذات اللہ کے لئے مولانا سیماب بھی

اورنگ زیب قاسمی

قرآن کریم کے بیشتر ترجموں کی طرح خدا کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔

قرآن حکیم کی ترجمانی کے سلسلے میں پکتھال مرحوم نے دوسرا اہم نکتہ یہ بیان کیا تھا کہ مترجم یا ترجمان کے لئے ایمان ایک لازمی شرط ہے۔ اسے قرآن کریم پر کامل یقین ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر وہ قرآن کی روح تک نہیں پہنچ سکتا۔ مولانا سیماب مرحوم کے صاحبزادے مکرمی مظہر صدیقی نے وحی منظوم کے پیش لفظ میں اس منظوم ترجمے کا پس منظر بیان فرمایا ہے۔ اور اس کے مطالعے کے بعد بلا تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ منظوم ترجمہ قرآن مجید کی ایک زندہ کرامت ہے اور سیماب صاحب کا یہ تاثر ایک حقیقت ہے۔ "مسلسل غور و فکر کے بعد اب یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میرے ارادے میں تائید ایزدی شامل ہے۔"

مظہر صدیقی کی روایت کے مطابق قرآن حکیم کا یہ منظوم ترجمہ ۱۹۳۶ء مطابق ۱۳۶۳ھ میں شروع ہوا اور یہ عظیم کام سیماب مرحوم و مغفور نے سات ماہ نو دن میں مکمل کر لیا۔ یہ بات اس لئے ممکن ہو سکی کہ رب جلیل نے تمام مرحلوں کو ان پر آسان فرمایا اور ورنہ میں ذاتی تجربے کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ بسا اوقات ایک گھنٹے کی کاوش اور محنت کے بعد قرآن حکیم کی تین چار آیتوں کا ترجمہ اردو نثر میں کیا جاسکا۔

استاد مکرم پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں مدظلہ' نے وحی منظوم پر اپنی تحریر میں دوسرے منظوم ترجموں کا تذکرہ فرمایا ہے اس تحریر کے مطابق پہلا ترجمہ شائق ایزدی لاہوری کا ہے جو چار جلدوں میں ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوا۔ حضرت آغا شاعر قزلباش نے بھی قرآن حکیم کا منظوم ترجمہ فرمایا پہلے پارے کا ترجمہ ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوا۔ پھر پاکستان میں اس ترجمہ کو بالاقساط شائع کرنے کا سلسلہ ان کے صاحبزادے نے شروع کیا مگر ابھی تک یہ پورا ترجمہ شائع نہیں ہوسکا۔ میرے سامنے پہلی جلد ہے جو دوپاروں کے ترجمہ پر مشتمل ہے حضرت آغا شاعر کے منظوم ترجمہ کے ساتھ شاہ عبدالقادر دہلوی کا منثور ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ علامہ سیماب نے کسی نثری ترجمے کو شامل نہیں کیا لیکن انہوں نے نہایت مفید حواشی شامل کئے ہیں جو کہیں موضوعات کی نشاندہی کرتے ہیں اور کہیں تفسیری نکات پر مشتمل ہیں۔

میں نے وحی منظوم کے جتنے حصوں کا مطالعہ کیا ہے حضرت سیماب کے منظوم ترجمے کو عربی متن سے ہم آہنگ پایا ہے جہاں کہیں ترجمہ تحت اللفظ کی حد سے بڑھا ہے زائد تشریحی الفاظ کی قوسین میں درج کیا گیا ہے حضرت آغا شاعر کے ترجمے میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے حضرت سیماب نے قرآن حکیم کے مطالب کے ساتھ انصاف کرنے کی غرض سے اپنے آپ کو ابیات کی سخت گیری کا تابع نہیں کیا ہے۔ سورہ الفاتحہ کی پہلی تین آیات کا ترجمہ ملاحظہ ہو (الحمد تا یوم الدین)

ہیں سزا وار خدا کے (پاک) ساری خوبیاں
(جو ہے) رب سارے جہانوں کا رحیم و مہرباں
ہے وہی انصاف کے دن کا بھی مالک (بے گماں)

یوں تین آیتوں کا ترجمہ تین مصرعوں میں کیا گیا ہے اور چوتھے مصرعے سے علامہ نے گریز کیا ہے۔ علامہ سیماب نے سورہ الفاتحہ کی معنوی ساخت کو پوری طرح سمجھ لیا۔ سورہ فاتحہ کا پہلا حصہ ان تین آیتوں سے عبارت ہے جس میں اللہ نے انسان کو اپنی حمد سکھلائی ہے چوتھی آیت میں حمد اور دعا دونوں مجتمع ہو گئی ہیں اور آخری تین آیات میں دعائے ہدایت ہے۔ علامہ سیماب نے اپنے ترجمہ الفاتحہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا

ہے ۔ پہلا حصہ تین مصرعوں پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ چھ مصرعوں پر ۔ انہوں نے حمد و دعا کی آیت کو دعا کے ساتھ شامل کر لیا ہے۔

علامہ سیماب" بڑے قادر الکلام شاعر تھے آگرہ خود ایک مرکز ادب تھا۔ جس کی سرزمین سے میر نظیر اور غالب جیسے شاعر ابھرے اور پھر انہیں داغ دہلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ یوں سیماب صاحب آگرہ اور دلی کی شعری و ادبی روایات کے امین تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ریاض اور علم سے انہوں نے شعر اور فن کی دنیا میں کتنے ہی سفر طے کئے اور یوں کہ وہ راہ کے ہر پیچ و خم سے واقف ہو گئے۔ سیماب" صاحب ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تیرہ چودہ سال کی عمر میں باضابطہ شعر گوئی شروع کی ۱۸۹۸ء میں وہ حضرت داغ کے حلقہ تلمذ میں شامل ہوئے (داغ کے شرف و افتخار کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اقبال" اور سیماب" جیسے شاعران کے شاگرد تھے اور جگر کا تعلق بھی اسی دبستان سے ہے۔ داغ جنہیں اقبال" نے جہان آباد کا آخری شاعر قرار دیا) یوں جب حضرت سیماب" نے قرآن حکیم کے منظوم ترجمے کا کام اپنے ذمے لیا" یا یوں کہے کہ جب خدائے علیم و خبیر نے انہیں اس کام کے لئے چنا" تو ان کی زندگی کے کم و بیش پچاس سال مشق سخن میں گذر چکے تھے۔ وہ غزل اور نظم دونوں میں اپنی قدرت کلام کا اظہار کر چکے تھے اور علمی و فنی موضوعات پر ان کی تحریروں کے اثرات ان کے ہم عصر قبول کر چکے تھے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی ساری ریاضت اور جگر کاری کا مقسوم یہی تھا کہ ان کا فن اور زباں دانی ترجمہ کلام اللہ کے کام آئے۔

میں اس گریز کے لئے معذرت خواہ ہوں کہ بات ترجمہ الفاتحہ سے حضرت سیماب" کی ادبی شخصیت کی طرف مڑ گئی مگر حقیقت یہی ہے کہ نقش نقاش سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

تقابلی تنقید کی حدود سے واقف ہوں مگر ترجمہ کو پرکھنے کے سلسلے میں تنقید کا یہ سانچہ خاصا معاون و مدد گار ہوتا ہے اس وقت میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ تمام منظوم تراجم کا تقابل کیا جاسکے لیکن ان دو عظیم ہمعصروں آغا شاعر و سیماب کے تقابل سے شاید چند باتیں واضح ہو سکیں اور یہ تقابل بھی سورہ الحمد کی پہلی چار آیات تک محدود رہے گا۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ○ کا ترجمہ حضرت سیماب" نے دو مصرعوں میں کیا۔

(واقعی) ہم فقط کرتے ہیں تیری بندگی
اور ہوتے ہیں تجھی سے طالب امداد بھی

اب ان آیات کریمہ کا ترجمہ آغا شاعر ملاحظہ ہو۔

تعریف سب خدا کو ، جو رب ہے عالموں کا
جو مہرباں بڑا ہے، بے حد جو رحم والا
محشر کے دن کا مالک (روز جزا کا والی)
تجھ کو ہی پوجتے ہیں ہم تیرے ہی سوالی

" الحمد " کا ترجمہ دونوں صاحبان کمال نے خوب کیا ہے ایک نے جمع کے صیغہ کے استعمال سے (ساری خوبیاں) حمد کا احاطہ کیا ہے اور دوسرے نے " سب " کے ساتھ " تعریف " کو واحد استعمال کرکے بات ادا کر دی ہے ۔ ویسے حمد کا ترجمہ " تعریف " بہتر ہے اور یوں آغا شاعر کا ترجمہ متن قرآن حکیم سے قریب تر ہے

اورنگ زیب قاسمی

لیکن باقی حصے کے ترجمے میں علامہ سیماب" نے الفاظ قرآنی کا زیادہ لحاظ رکھا ہے آغا شاعر نے مالک یوم الدین کا ترجمہ اس مصرعے میں کیا ہے۔

محشر کے دن کا مالک (روز جزا کا والی)

قوسین میں جو ٹکڑا ہے وہ تکرار محض ہے علامہ سیماب" نے بہت اچھا اور تحت اللفظ ترجمہ کیا ہے اور قوسین میں جو لفظ ہے اس نے ترجمے کی وضاحت یوں کی ہے کہ تاکید پیدا ہو گئی ہے۔

ہے وہی انصاف کے دن کا بھی مالک (بے گماں)

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ واِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کا ترجمہ حضرت آغا شاعر نے فرمایا ہے۔

تجھ کو ہی پوجتے ہیں ہم تیرے ہی سوالی

بہت ادب سے عرض کروں گا۔ یہ ترجمہ ناقص ہے۔ اول تو پوجنے کا لفظ ہمارے عہد میں ہندوؤں کی عبادت اور طرز عبادت کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے اس کے علاوہ " ہم تیرے ہی سوالی" کسی بھی عنوان اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کا ترجمہ نہیں۔ علامہ سیماب" کا ترجمہ بے غبار ہے " اور ہوتے ہیں تجھی سے طالب امداد بھی۔"

میں تقابل کو یہیں پر ختم کر دینا چاہتا تھا لیکن اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ کے دونوں ترجمے مجبور کر رہے ہیں کہ انہیں آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ سیدھی ڈگر پہ لے چل (ثابت قدم بنا دے) آغا شاعر

(واقعی) ہم کو سیدھے راستے پر تو چلا۔ علامہ سیماب")

آغا شاعر نے خاصی آزادی برتی ہے جب کہ سیماب" اکبر آبادی کا ترجمہ حضرت عبدالقادر دہلوی کے ترجمے نثر سے بہت قریب ہے۔ جو آغا شاعر کے ترجمہ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ " چلا ہم کو راہ سیدھی"

علامہ سیماب" کے منظوم ترجمے کی سب سے بڑی خوبی میرے نزدیک یہ ہے کہ اس کی نحوی ترتیب اور مصرعوں کی ساخت" نثری ترتیب سے بہت قریب ہے۔ اسی کو مروجہ اصطلاح میں آپ یوں کہہ لیں کہ اس ترجمہ کے کتنے ہی حصے شعر اور مصرعے " سہل ممتنع" کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔

یہ بات تو شاید عرض کی جاچکی ہے کہ علامہ سیماب" کا منظوم ترجمہ قرآن حکیم کے متن سے امکانی وفاداری کی مثال ہے اس کے باوجود شاعرانہ محاسن جگہ جگہ چمکتے نظر آتے ہیں اور یہ ترجمہ ایسا ہے کہ محض ثواب اور برکت کے حصول کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اس کے اشعار آسانی کے ساتھ مجلسوں اور محفلوں میں ان آیات کی تلاوت کے بعد ترجمے کے طور پر پڑھے جاسکتے ہیں۔ چند ایسے مقامات پیش کرتا ہوں جہاں ترجمہ لفظی بھی ہے اور شاعرانہ محاسن کی مثال بھی۔

(البقرہ آیت ۵)

اپنے رب کی دی ہوئی راہ ہدیٰ پر ہیں یکا

اسی طرح سورۃ البقرہ کی سولہویں آیت کا ترجمہ ایک ہی شعر میں کس طرح کیا ہے ملاحظہ ہو اس میں پورا بنیادی مفہوم الفاظ قرآنی کی رعایت کے ساتھ سمٹ آیا ہے۔

مول لیتے ہیں ہدایت کے عوض یہ گمرہی
بے ہدایت رہ گئے بے سود کی سوداگری

البقرہ آیت نمبر ۱۹ کے ٹکڑے کا ترجمہ دیکھیے:

کافروں پر ہے محیط اللہ (بے ریب و گماں)

وحی منظوم کے بیشتر مقامات میں یہی انداز ملتا ہے البقرہ کے ابتدائی حصے آیت نمبر ۵۷ کو علامہ سیماب نے یوں اردو کے قالب میں ڈھالا ہے

ابر کو سر پر تمہارے سایہ افگن کر دیا
من و سلویٰ بھی تمہارے واسطے نازل کیا

چند شعر و مصرعے اور ملاحظہ ہوں

ہم نے جب تم سے لیا پیمان وفا (اسرائیلیو)
اور معلق کر دیا سر پر تمہارے طور کو
(البقرہ آیت نمبر ۶۳)

(یاد رکھو) مشرق و مغرب ہیں سب اللہ کے
جس طرف بھی رخ کرو گے تم خدا کو پاؤ گے
(البقرہ آیت ۱۱۵)

وحی منظوم میں عموماً قرآن حکیم کے مطالب و مفاہیم کو اردو نظم کے وسیلے سے اہل ایمان تک یوں پہنچایا گیا ہے کہ شعری تقاضے اور ضرورتیں مفہوم کو مجروح نہیں کرتیں لیکن کہیں کہیں مفہوم قرآنی ترجمے کے دامن میں نظر نہیں آتا مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۰۸ کا یہ عظیم خیال (اے اہل ایمان اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ یعنی مکمل طور پر اپنی ذات کو اسلام کے حوالے کر دو) علامہ سیماب نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

"مومنو! اسلام کا پوری طرح لو آسرا"

یہاں حضرت آغا شاعر ان سے بازی لے گئے ہیں اور ان کا ترجمہ قرآنی مفہوم کو بہتر طور پر پیش کرتا ہے۔

اے دین دار بندو! ایمان لانے والو
اسلام کی حدوں میں تم پورے پورے آؤ

وحی منظوم مجموعی طور پر اردو نظم میں قرآن عظیم کا سب سے بہتر منظوم ترجمہ ہے۔ شاعرانہ محاسن کے اعتبار سے بھی اور مفہوم کی ادائیگی کے لحاظ سے بھی۔ اس کی کتابت و طباعت میں بھی ذمہ داری کو بدرجہ حسن و کمال (بحد بشریت) ملحوظ رکھا گیا ہے' بڑی حد تک قرآنی رموز و علامات اردو ترجمے میں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ مولانا سیماب" کا یہ کارنامہ اردو زبان کی قوت بیان اور اظہار کے قرینوں اور پیرائیوں کی وسعت کا بھی ایک ثبوت ہے انشاء اللہ تعالیٰ یہ منظوم ترجمہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قبولیت عام حاصل کرتا جائے گا' یہ ایک ادبی شاہکار بھی ہے اور صدقہ جاریہ بھی' یقین ہے کہ اس کے وسیلے سے رب قرآن و محمدؐ مرحوم شاعر کے مراتب میں اضافہ فرماتا رہے گا۔

("افکار" کراچی)

ڈاکٹر انور سدید

شوکت تھانوی: ایک بذلہ سنج ناول نگار

اردو ادب کا جائزہ لیں تو ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک ہمیں اردو افسانے کا عشرہ نظر آتا ہے اس عشرے میں سعادت حسن منٹو' کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی' غلام عباس' ممتاز مفتی' عصمت چغتائی اور متعدد دوسرے افسانہ نگار منظر عام پر ابھرے۔ اور تھوڑے سے عرصے میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے ۔ مولانا صلاح الدین احمد نے اس دور کو اردو افسانے کا دور زریں قرار دیا ہے اور آزادی کے بعد انہوں نے رسالہ " ادبی دنیا" میں متعدد مرتبہ اس خیال کا اظہار کیا کہ اس دور کے بعد اردو ادب میں عظیم قرار دیے جانے اور فن اور فن کو نئے جادوں پر چلانے والے افسانہ نگار اتنی بڑی تعداد میں بیک وقت رونما نہیں ہوئے ان میں سے بعض افسانہ نگاروں نے سماجی ناہمواریوں کو منظر عام پر لانے اور افسانے کے اثر و عمل کو بڑھانے کے لئے طنز و مزاح کو بھی ایک مفید حربے کے طور پر استعمال کیا۔ اردو افسانے کے اس سنہری دور میں عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی دو ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے افسانے کے علاوہ مزاح کی تخلیق کے لئے ناول کے وسیع کینوس پر بھی کام کیا۔ اور عوام الناس کو تفریحی ادب افراط سے فراہم کیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اردو ادب کے فروغ و ارتقا میں ان دو ناول نگاروں کی خدمات کا اعتراف صرف طنز و مزاح کے ضمن ہی میں کیا جاتا ہے۔ اور ناول نگاری کے برعکس طنز و مزاح کو ہی ان کی بنیادی پہچان قرار دیا جاتا ہے۔

اردو ناول میں عظیم بیگ چغتائی کا مایہ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے ہنسی کو تحریک دینے کے لئے مزاحیہ صورت واقعہ سے فائدہ اٹھایا اور کرداروں کو عملی مذاق کا نمونہ بنا کر پیش کیا' اس تفریح میں وہ خود بھی شریک ہوئے اور اس شگفتہ کاری میں انہوں نے اپنے قاری کو بھی شریک کیا۔ " شریر بیوی"۔ " انگوٹھی کی مصیبت" ۔ " کولتار" اور " شہ زوری " وغیرہ ان کے چند ایسے ناول ہیں جن میں محبت کے مقدس جذبے کو ابھارنے کے لئے عملی شرارتوں سے زیادہ کام لیا گیا۔ عملی مذاق شوکت تھانوی کے ناولوں کا بھی جزو لاینفک ہے۔ لیکن انہوں نے ہنسی کو تحریک دینے کے لئے مزاح اور طنز کے دوسرے حربوں سے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ شوکت تھانوی کے طنز و مزاح کا کینوس عظیم بیگ چغتائی سے نسبتاً زیادہ وسیع ہے۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی مناسب ہے کہ شوکت تھانوی نے اپنے مزاج کی ظرافت اور مزاحیہ کیفیات کے اظہار کے لئے صرف ناول یا افسانے کی صنف کو ہی منتخب نہیں کیا بلکہ انہوں نے شاعری کے علاوہ مزاحیہ مضامین بھی لکھے۔ ان میں "سودیشی ریل" کو نمایاں اہمیت حاصل ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ "سودیشی ریل" نے ہی شوکت تھانوی کو فن کے اولین مرحلے پر شہرت عطا کی تو یہ کچھ غلط نہیں ہو گا۔ انہوں نے شگفتہ خاکے

اورنگ زیب قاسمی

لکھے اور یہاں شیش محل کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جو دوستوں کرم فرماؤں اور معاصرین کو نیچی آنکھ سے دیکھنے کی کاوش ہے۔ انہوں نے حالات زمانہ پر تنقید و تبصرہ کرنے اور سماجی ناہمواریوں کو آشکار کرنے کے لئے ریڈیائی ڈرامے لکھے اور ان میں قاضی جی جیسا ہلکا پھلکا اور جیتا جاگتا کردار پیش کیا جو ہر چند بچا چھن جیسی غائب دماغی کا مرتکب تو نہیں ہوتا۔ لیکن سامعین کے باطن سے مسکراہٹیں اگلانے کا کوئی موقع فروگذاشت نہیں کرتا۔ شوکت تھانوی کی "شیاد کھاتہ" ایک ایسی پیروڈی ہے جس میں الفاظ کی ناہمواریوں سے مضحک صورت پیدا کی گئی ہے۔ اس کی ایک دلکش مثال اندلیب صاحب کے نام شوکت تھانوی کا خط ہے جس میں اردو املا کی ناہمواریوں سے مزاح پیدا کیا گیا ہے۔

ان سب باتوں کا اجمالی ذکر میں نے اس لئے کیا ہے مزاحیہ ناول لکھتے وقت شوکت تھانوی نے ان سب حربوں سے حسب ضرورت خاطر خواہ کام لیا ہے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے درست لکھا ہے کہ شوکت تھانوی کے یہاں زبان کا مزا بھی ہے واقعہ کا بھی اور خیال کا بھی وہ روزانہ کے معاملات اشخاص کے کردار اور واقعات کے موزوں انتخاب سے کام لیتے ہیں اور بعض چھوٹی چھوٹی باتوں سے وہ طنز پیدا کرتے ہیں جس میں ظرافت ہوتی ہے اور وہ ظرافت محض دل بہلانے کے لئے ہوتی ہے۔ شوکت تھانوی کا ناول "سوتا چاند" اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

"سوتا چاند" ایک گھریلو طربیہ ہے جو درحقیقت ایک خانگی المیے سے جنم لیتا ہے۔ اس ناول کے ہیرو نے اپنی محبت کرنے والی بیوی کے خلوص سے اغماض برت کر دوسری شادی کر لی ہے۔ شوہر اتنا فعال نہیں کہ اپنی پہلی بیوی کو اپنا ہمنوا بنا سکے لیکن جب سوتن ہو جاتی ہے تو پہلی بیوی اپنے عمل کو مثبت صورت دیتی اور اپنے گھر کی وحدت کو سلامت رکھنے کے لئے سوتن سے پیار پیدا کر لیتی ہے۔ اپنی سوتن سے بے پناہ محبت ہمارے معاشرے کا ایک انوکھا عمل ہے اس ناول میں شوکت تھانوی نے اس انوکھے عمل سے ہی مزاح پیدا کیا اور المیے کو طربیے میں تبدیل کر دیا ہے۔

شوکت تھانوی کے ناول "تنہا" میں پلاٹ روایتی اور سپاٹ ہے لیکن یہ پلاٹ اس دور کا نمائندہ ہے جب لڑکے اور لڑکیاں کھلے بندوں آپس میں نہ مل سکتے تھے اور نہ باتیں کر سکتے تھے محبت کا جذبہ دل میں سلگتا رہتا لیکن اظہار کا موقعہ نہ لڑکے کو ملتا اور نہ لڑکی کو یہ فضا کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا؟ قسم کی تھی شوکت تھانوی نے اس فضا کے خلاف ردعمل ظاہر کرنے اور روتے بسورتے معاشرے کو چند لمحوں کے لئے مسکراہٹیں عطا کرنے کے لئے طلعت اور اختر کے جاذب نظر کردار تخلیق کئے ان کی ملاقات میں ناول کی ہیروئن طلعت کی "تنہا" واسطے اور وسیلے کا کام دیتی ہے طلعت کو ایک نظر دیکھنے اور دل کھو دینے کے بعد اختر جتنی تک آتا ہے رومانس پروان چڑھتا ہے اور آخر سماجی جزرومد گزارنے کے بعد دونوں کی شادی ہو جاتی ہے شوکت تھانوی نے اس تمام عمل میں کرداروں کے عمل اور ردعمل معاشرتی پابندیوں کے جبر کا احوال سماجی زنجیروں کو توڑنے کی کاوش اور زبان و بیان کی پھلجھڑیوں سے قاری کو اپنی گرفت میں رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے اسے ہنسنے مسکرانے کے وافر مواقع فراہم کئے ہیں۔

شوکت تھانوی کا ایک اور ناول "انشاء اللہ" میں بھی مشرق کے پابند معاشرے سے پیدا ہونے والے مصائب اور ان مصائب سے فائدہ اٹھانے والے چند حقیقی کرداروں مثلاً نعیم وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے اس ناول

اورنگ زیب قاسمی

میں مزاح کہیں کرداروں کی بے بسی سے پیدا ہوتا ہے اور کہیں یہ دلہن کی کارستانیوں اور بوالعجبیوں سے نمو پاتا ہے۔ شوکت تھانوی بے شک معاشرتی حقیقتوں کی ہی نشان دہی کرتے ہیں۔ لیکن وہ شعوری طور پر قاری کی نفلی ضرورتوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہیں۔ اور جب دیکھتے ہیں ۔ اور جب دیکھتے ہیں کہ ان کا قاری علمی اور فکری طور پر بالغ نظر نہیں ہے۔تو وہ اسے اپنے بلند معیار تک لانے کے بجائے خود اس کی سطح پر اتر کر گدگدانے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر ناول " انشاء اللہ " میں شوکت تھانوی نے میاں بیوی کی نوک جھونک سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند اقتباسات حسب ذیل ہیں:

○ " بیگم نے بات کاٹ کر کہا ۔ " اے بس' رہنے بھی دو۔ بڑی حساس ہے اور بڑی قابل ہے۔ آخر میں بھی تو تھی۔ کون سے لعل جڑے ہوئے تھے تم میں ؟ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو عیب ہی عیب تھے۔ مگر مرتو نہیں گئی میں۔ نہ کوفت ہوئی نہ کوفتہ۔"

○ نجمہ نے جل کر کہا ۔ " مجھ کو کیوں فکر ہوتی اس لاحنت کے نکلنے کی ' میری طرف سے پہلے بھی چولہے میں تھا۔ اب بھی بھاڑ میں جائے۔"

○ ریحانہ نے کہا۔ " تم نے دولہا کو آج دیکھا ہوتا تو محفل ہی میں چاند پڑتیں' سچ مچ بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں دولہا بنے ہوئے ۔" ساجدہ نے کہا ۔ " اے تیری آنکھوں میں خاک ماشاء اللہ بھی نہیں کہتی۔" نجمہ نے کہا ۔ " ہائے تیری زودنگ " ریحانہ نے ہنس کر کہا۔ " یہ زودنگا کیا بلا ہے ؟" ۔ نجمہ نے کہا یہ ماشاء کی طرح ایک چیز ہے بس محبت میں گز بڑائے تو ماشا کرنے لگتی ہے ۔ بیوی یعنی زوجہ محبت میں بوکھلائے تو اس کو "زودنگا" کہتے ہیں۔"

شاعر ہونے کے ناتے شوکت تھانوی نے اپنے ناولوں میں اشعار کی پیروڈی سے بھی فائدہ اٹھایا۔ اور مکالمے کو اشعار کے برمحل استعمال سے شگفتہ کر دیا ہے۔ یہاں مثال کے لئے ایک مکالمہ پیش کیا جاتا ہے۔

" ببّو نے جوش میں کہا۔" ہاں سنو تو سہی' تمہیں میری قسم عرض کرتا ہوں کہ بھئی

رنگین دوپٹے کا اڑتا ہو آنچل ہے
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آتی

نجمہ نے ہنسی ضبط کر کے کہا۔" کوئی بنتا تو نہیں اس پر" شکیل نے فوراً بات سنبھال لی ۔ ہنسنے کے لئے مسخروں کی کیا کمی ہے۔" ایک اور تصرف اس طرح ہے ۔ قدرنگ انگریز واللہ یا باللہ اس کی ہیم۔"

شوکت تھانوی کی عطایہ ہے کہ انہوں نے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر خامہ فرسائی میں بھی کامیابی حاصل کی اور جب ناول میں زندگی کے ایک پورے دور اور واقعات کے پورے سلسلے کو مزاح کی گرفت میں لیا تو تسلسل کو قائم رکھا اور عملی مذاق کے علاوہ رعایت لفظی' الفاظ کی ساخت تو' ڑ معنویت اور تصرف وغیرہ سے بھی پورا فائدہ اٹھایا۔ اور ناول کی خود روانی کو بھی قائم رکھا شوکت تھانوی کی اس عطا کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ ناول کی کساد تخلیقی کے دور میں انہوں نے متعدد مزاحیہ ناول لکھے اور ایک خاص سطح کے قارئین میں بے دریغ مسرتیں تقسیم کیں شوکت تھانوی کے سامنے چونکہ کوئی بڑا اصلاحی مقصد نہیں تھا' اس لئے ان کے مزاح میں ہمدردانہ انداز نظر ہی خاص کی نظر آتی ہے ' یہ ہمدردانہ رویہ " سودیشی ریل " اور

لکھنؤ کانگریس سٹیشن " جیسے مضامین میں تو نمایاں نظر آتا ہے۔ " قاضی جی " کردار کا رخ بھی واضح طور پر سماج کی طرف ہے اور شوکت تھانوی ناہمواریوں کو ہموار کرنے کے آرزو مند نظر آتے ہیں لیکن اپنے ناولوں میں انہوں نے زیادہ توجہ قارئین کو بے عنوان آسودگی اور بے نام سی لطافت فراہم کرنے پر صرف کی اور اس میں وہ خاصے کامیاب نظر آتے ہیں۔ یعنی قارئین شوکت تھانوی کی شہرت کو تسلیم کرتے اور ان کا نام محبت سے لیتے ہیں۔

شوکت تھانوی ہمارے مشہور مزاح نگاروں میں سے ہیں' لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مقبولیت کا گراف پڑھے لکھے اور عالم و فاضل نقادوں کو مرعوب نہیں کر سکا۔ چنانچہ کلیم الدین احمد نے انہیں عظیم بیگ چغتائی کے ساتھ بریکٹ کیا اور لکھا:

> "ان دونوں کی ذہنیت ترقی کے مدارج طے کرنے کے دوران میں ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئی ہے اور یہ ذہنیت وہی ہے جسے "انڈر گریجوایٹ" ذہنیت کہتے ہیں' دونوں استعداد بہم پہنچانے سے پہلے مصنف بن بیٹھے۔ ان کے کارناموں کو اگر کسی طالب علم کا کارنامہ شمار کیا جائے تو لائق تحسین ہے' اس سے زیادہ وقعت دینا تنقید اور مذاق صحیح پر دانستہ ظلم کرنا ہے۔"

ڈاکٹر وزیر آغا نے شوکت تھانوی کی چند ایک تحریروں سے قطع نظر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی دوسری تحریروں میں کسی خاص بلندی کا احساس نہیں ہوتا اور اگرچہ وہ بعض اوقات علمی مذاق اور بعض دفعہ واقعہ اور کردار سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں۔ "تاہم ہمہ دانہ انداز نظر کی بہرحال محسوس ہوتی ہے۔"

شوکت تھانوی نے لکھنؤی تہذیب کی ناہمواریوں اور جوانی کے ابھرے ہوئے ناپختہ جذبے کے سہارے پروان چڑھنے والی محبتوں سے لطافت' شگفتگی اور مزاح پیدا کیا۔ اور یہ سب عمر کے ایک خاص حصے ہی میں لطافت باری کرتے ہیں دوسرے لکھنؤی تہذیب کا تناظر اور پس منظر بھی آہستہ آہستہ زمانے کی گردش میں گم ہو چکا ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ شوکت تھانوی کا مزاح ایک خاص دور کی پیداوار تھا' اس دور میں اسے خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوئی لیکن مزاح کے پیمانے تبدیل ہو جانے کی وجہ سے اب وہ تاریخ ادب کا حصہ بن گئے ہیں۔ ان کا نام عظیم بیگ چغتائی' ملا رموزی' اور حاجی لق لق جیسے مزاح نگاروں کے ساتھ تاریخ میں زندہ رہے گا۔

("تحقیق" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

حمیدہ اختر حسین

بیاد اختر

سحر انصاری صاحب یہ آپ نے کیا غضب کر دیا کہ "گرد راہ" کا تیسرا ایڈیشن اس شرط پر چھپوانے کی ذمہ داری آپ جب لیں گے کہ میں اپنے قلم سے اختر پر کچھ لکھ کروں۔ انصاف تو کریں کہ کہاں "گرد راہ" اور کہاں میرا قلم اور میرا ہاتھ! میں تو اس کی گرد کو بھی چھونے کی جسارت نہیں رکھتی۔ ہاں اس کا تیسرا ایڈیشن نکل آنے کے شوق نے مجھے قلم پکڑنے کی ہمت ضرور عطا کر دی۔

اختر نے ادب اور اپنے معاشرے کو کیا دیا' اس کا اعتراف آپ سب نے جس فراخدلی اور احترام کے ساتھ کیا ہے وہ بہت کم خوش بختوں کو حاصل ہوا ہوگا۔ میں تو صرف یہ بتا سکتی ہوں کہ ان کی شخصیت کے بے شمار پہلو جو نظروں سے پوشیدہ یوں رہے کہ اپنے متعلق نہ قلم سے لکھا نہ منہ پر لائے۔ اپنی نجی زندگی کے متعلق ذکر کرنا' خواہ کیسا ہی عزیز دوست ہو' ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ یہاں تک کہ مجھ سے اتنی قربت کے باوجود اس معاملے میں میرا شمار بھی اسی قطار میں رہا۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے گاہے گاہے نجی محفلوں میں اختر پر اعتراض کیا کہ خدانخواستہ وہ مذہب کے خلاف ہیں' کیمونسٹ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جب یہ گھوم پھر کر بات ان تک پہنچتی تو صرف ہنس دیا کرتے تھے کہ کہنے سنے کا ہر شخص کو پیدائشی حق ہوتا ہے۔ ان پر ایسی باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اختر تو سچے مومن انسان تھے۔ ان کی اسلام دوستی اور انسان دوستی میں قول اور فعل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ سوشلزم پر صحیح عمل کو انسانوں کے دکھ کا مداوا سمجھتے تھے۔ وہ بالکل قنوطیت پسند نہ تھے بلکہ ان کے برعکس دنیا اور انسان کی ترقی میں ایمان رکھتے تھے۔ ان کی انسان دوستی اور انسانیت بدرجہ اتم ان کی اپنی زندگی کے ہر پہلو سے واضح ہوتی ہے۔ فکر و عمل دونوں ہی طریقوں سے وہ ترقی پسند (Constructive) رستے پر گامزن رہے۔ اپنے سے بڑوں کی تقدیم و تکریم اور چھوٹوں سے شفقت بے حد حتی کہ برابری کا درجہ دیتے۔ زندگی کے مختلف حادثات کے باوجود جو ان کے' میرے اور لڑکوں کے ساتھ پیش آئے وہ ایک شجر سایہ دار کی طرح ہم سب کو اپنے دامن میں سمیٹ کر خوشبوؤں سے ہمکنار کرتے رہے۔ اپنے لڑکے اور ان کے ان گنت دوستوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے جیسے کہ ان کے برابر کے ہوں اور ان کو کبھی کم مائیگی کا احساس ہونے نہیں دیا۔ بحث اور مباحثہ میں میانہ روی' دلائل میں ان کی فکری گہرائی اور آفاقی وسعت نظری نے ہمیشہ دوسروں کا دل موہ لیا اور یہی ہوتا کہ سامع بغیر اس خیال کے کہ وہ اپنا کوئی اثر ڈال رہے ہوں۔ وہ بہت متاثر نہیں بلکہ اپنی جھولی بھر کر اٹھتا اور کوئی نہ کوئی سوچنے کا نکتہ ساتھ لے کر جاتا۔ وہ اشعار کا استعمال اور انتخاب

برمحل اور موزوں کرتے۔ تاریخ' فلسفہ زبانوں کے ادب' معاشیات ' اقتصادیات ' عمرانیات اور دیگر فنون لطیفہ کے علاوہ اور بھی بہت سارے علوم پر گہری نظر تھی۔ اس کے علاوہ مذاہب عالم بالخصوص اسلام پر بڑا گہرا مطالعہ تھا اور ہمیشہ اپنی نپی تلی اور مدلل گفتگو سے قارئین اور سامعین کو متاثر کرتے۔

کسی منصب سے بھی مرعوب نہ ہوتے۔ ان کی نگاہ میں بڑا آدمی وہ ہے جو اچھا انسان ہو۔ اس میں مذہب ' عمر اور تعلیم کی قید نہ تھی۔ کسی کے رتبہ یا حیثیت کا ان پر کوئی اثر پڑتے نہیں دیکھا ہاں اپنے چھوٹے افسران چپراسیوں اور ملازمین سے بے حد جھکاؤ اور برابری سے ملتے ضرور دیکھا۔

اکثر رمضان میں روزے رکھتے بیماری کے ختم ہو جانے کے بعد روزے کم رکھتے۔ مگر سات کو اپنے بھائی کی وفات اور ۲۷ رمضان کو اپنے والد کی وفات کے دن کا روزہ کبھی قضا نہیں کیا۔ عید اور بقر عید کو نماز کے لئے سب سے پہلے تیار ہو جاتے۔ کالی شیروانی اور کالی ٹوپی ان پر بہت جچتی۔ ملازمین اور لڑکے ساتھ جاتے۔ اب کی عید پر جب یہ اپنے چاروں بیٹوں اور پوتے شاکر کو نماز کے لئے لے جا رہے تھے تو پہلی بار میرے دل میں وہم سا آیا میری والدہ اپنے پانچ بیٹوں اور ابا کو ایک ہی دروازے سے جانے نہ دیا کرتیں میرا دل چاہا کہ کہوں کہ سب ایک ساتھ نہ جائیں لیکن اختر کے مذاق اڑانے کے ڈر سے کچھ بھی نہ کہا۔ مجھ سے فرمائش کرکے قرآن پاک کا ترجمہ سنا کرتے تھے۔

اختر کی شخصیت پر مولوی عبدالحق بابائے اردو کی چھاپ ان کی روز مرہ زندگی میں ہر روز ہی نظر آتی رہی۔ زندگی کا ہر قدم سوچ کر اٹھانا باقاعدہ صبح کی ہوا خوری اس کے بعد ورزش کرکے ایک پیالی چائے پی کر تیار ہوجانا۔ ان کو اب جب کہ کہیں آنا جانا نہ تھا مگر آٹھ بجے ٹھیک یوں تیار ہو کر ناشتے کی میز پر جاتے جیسے دفتر جانے والے ہیں سہ پہر کو کپڑے بدل کر ریڈیو سنتے ساڑھے چار بجے نہا کر تیار ہوتے پانچ بجے کمرے سے نکل آتے چائے پی کر لمبی سیر کرکے آجاتے۔

پہلے ہی سے ان کے ملاقاتی یا لڑکوں کے دوست ان کے انتظار میں بیٹھے ملتے اور یہ میر محفل بن کر بیٹھ جاتے کیسی کیسی دلچسپ گفتگو ہوتی کبھی لڑکے اور ان کے دوست گرماگرم بحث کرتے مگر یہ ہیں کہ ایک کے بعد ایک کا جواب دیتے۔ بہت پیچھے کی طرف جا کر سرا پکڑ کر آگے آتے جاتے۔ وجہ تسمیہ اور اس کے اثرات آئندہ کیا پڑیں گے۔ بتاتے۔ ان کی دوربین نظریں کس قدر آگے کا دیکھ لیا کرتیں اور دیر سویر وہ سچ ہی نکل کر سامنے آتا رہا۔

ادھر کئی ماہ سے USSR کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا ان پر بڑا اثر پڑا۔ وہ اس پر بہت کچھ لکھنے کے لئے بڑے بے چین تھے۔ اس ٹوٹ پھوٹ کی اصل وجوہ اور اسباب پر ہی ایک عرصہ خیال کرتے رہے۔ جب آخری بار سردار جعفری انڈیا سے آئے تو دونوں کی باتوں میں خاموش چیخی سنتی رہی۔ اختر نے پوچھا" اب بتائیں جعفری صاحب اگر میں جہاں اور جس بات پر بہت پہلے سے غلط تر عمل پر اعتراض کرتا تھا۔ سب کو ناگوار گزرتا تھا۔ اب دیکھیے یہ سب کیا ہوا؟! جعفری صاحب نے بڑے دکھ بھرے انداز میں کہا " یہ آپ ہی بتائیں یہ سب کیسے اور کیوں ہوا؟! اختر کا کہنا تھا کہ یہ سب سوشلزم کے خلاف بہت بڑی سازش عرصہ دراز سے کی جاری تھی۔ اس کی کڑی کو بہت پیچھے جا کر گرفت میں لایا جاسکتا ہے' کاش میں لکھ سکتا یا کوئی مجھے ایسا مل جاتا جس سے لکھوا سکتا۔ ضروری ہے کہ اس عظیم حادثہ اور المناک واقعات کا کوئی درست سمت میں نشاندہی

اورنگ زیب قاسمی

اس وقت کر دے۔ وقت گزر جانے کے بعد جب ہسٹری کے ایسے واقعات کو قلمبند کیا جاتا ہے' تو وہ بھی اصل روپ میں نہیں رہ جاتی ہے سردار جعفری صاحب نے اپنی ایک نظم جو USSR کے بکھر جانے پر کہی تھی وہ اختر کو سنائی تو اس پر جھوم اٹھے۔ کسی سے یہ بھی نہ کہا کہ ان کو قطعاً" نظر نہیں آتا۔ ہمیشہ یوں کہتے کہ کچھ بینائی کمزور ہو گئی ہے۔ باہر کسی کے ہاں آنے جانے اور کسی میٹنگ کی صدارت کرنے سے بہت ہی کتراتے۔ جب بھی میں نے اصرار کیا کہ حرج کیا ہے چلے جائیں تو مجھے یہ جواب ملتا " آپ بات کو سمجھتی کیوں نہیں ہیں مجھے لوگ لاچار اور مجبور دیکھ کر رحم کی نظر سے دیکھیں گے' یہ مجھے پسند نہیں " لیکن کچھ ایسے مواقع ہوتے کہ چلے جاتے وہ اپنا اخلاقی فرض سمجھ کر۔ زندگی بھر کوئی خطبہ صدارت یا لیکچر اور تقریر لکھ کر نہیں پڑھی اور ہمیشہ اگرچہ بڑے اختصار سے کام لیتے مگر اس میں وزن اتنا ہوتا کہ سننے والوں کو کوئی نہ کوئی بات بالکل نئی اور سوچنے کے لئے مواد مل جاتا۔

قدرت نے دماغ ایسا عطا کیا تھا کہ جو بھی ایک بار نظر سے گزرا تھا' وہ ان کے دماغ کے کمپیوٹر میں محفوظ ہو جاتا آپ ان سے گھنٹوں ہسٹری خواہ ایشیا کی ہو یا یورپ کی ' امریکہ ہو یا چین و جاپان کی باتیں کرتے رہیں وہ تاریخوں کے حوالہ کے ساتھ صدیوں پیچھے لے جا کر دور حاضر میں لے آئیں گے۔

ادب اور شاعری' ایشیا' یورپ ایران اور دیگر ممالک کے۔ ان سب پر کس قدر عبور حاصل تھا۔ موسیقی ایشیائی ہو یا یورپین' دونوں ہی پر یکساں گفتگو گھنٹوں کر سکتے ہیں۔ سیاحی کا ذکر آجائے تو وہ کھل اٹھتے۔ حیران کن باتیں بتاتے' کھانوں پر بات چل پڑے تو مختلف ممالک کے کھانوں پر بولتے اور بتاتے رہتے۔ سیروسیاحت سے والہانہ دلچسپی رہی۔ اس بحر میں ان کے پاس جیسے خزانہ تھا۔ مذاہب عالم میں ان کی علمیت اور معلومات بدرجہ اتم تھیں۔ روحانیت اور فقہ اور تصوف پر جو وہ بتاتے تو بڑے بڑے عالم دین خاموشی سے سنا کرتے۔ میں نے بارہا ان کو کسی کانفرنس کے بعد جشن میں مختلف ممالک کے مبصرین ایک ہی کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں اور اتفاق سے مہمان کچھ یوں بٹھا دیے گئے کہ ایک ہندوستانی بیچ میں پاکستانی اور پھر بنگالی سامنے کوئی ایرانی اور فرانسیسی ہے تو یہ بیک وقت چار زبانوں میں بات چیت اس روانی سے کرتے کہ میں حق دق رہ جاتی۔ کچھ شرارت کے موڈ میں اگر ہندوستانی صاحب آپ کی ہندی تو ہماری سمجھ سے باہر ہے روز مرہ کی زبان استعمال کیجئے نا۔ تو ہنس کر کہتے کہ یہ جو آپ کے ملک میں ہندی زبان میں بے تحاشا سنسکرت کے الفاظ ٹھونسے جا رہے ہیں تو بے چارے عوام پر بڑی بری بیت رہی ہے۔ ان کو تو ریڈیو پروگرام نہ ہی ٹی وی کی خبریں اور نہ ہی درسی کتابیں سمجھ میں آتی ہیں۔

جانوروں سے بے حد پیار کرتے' ان کے پالنے کا شوق ہمیشہ رہا۔ طرح طرح کی چڑیاں ' توتے' کبوتر' کتا خرگوش رکھا کئے ایک زمانے میں ایک بچھڑا بھی رکھ لیا تھا صبح ۵ بجے سے ۶ بجے تک عبادت کے بعد باہر نکل کر چڑیوں کا پانی بدل کر دانہ دینا' مچھلیوں کے حوض میں ان کے لئے چٹکی چٹکی کھانا ڈال کر ان کا تماشا دیکھنے' کتے کو دودھ دیتے' صبح کو ایک پیالی چائے مولوی صاحب کی طرح خود بناتے' نمک گرم پانی میں ڈال کر صبح اور سوتے وقت غرارہ کرنا' یہ عادت بھی مولوی صاحب کی عطا کردہ تھی۔ اس کے بعد ورزش' اس سے پہلے ہوا خوری ہمیشہ پڑھتے ہوئے سونے کی عادت اس طرح قائم تھی کہ اب بھی ایک کوئی نہ کوئی کتاب تکیے کے پاس رکھ کر' اس پر ہاتھ رکھ کر ریڈیو سنتے سنتے سو جاتے۔ یہ بارہا کہا کہ انسان کو کسوٹی پر پرکھنا ہو تو یہ دیکھا جائے

کہ اس کا سلوک بچوں اور جانوروں کے ساتھ کیسا ہے اور پڑوسیوں سے کیسے تعلقات ہیں۔

ضبط اور صبر اور برداشت کی کس قدر طاقت ان کو مولا نے دے رکھی تھی' میں تو حیران ہو جایا کرتی۔ صومالیہ میں کسی دعوت کے بعد ہندوستانی سفیر ہم دونوں کو ہمارے گھر چھوڑنے آ رہے تھے۔ سامنے اختر بیٹھے اور انہوں نے دروازہ بند کیا اور برابر میں بیٹھ کر موٹر چلانا شروع کی۔ اختر کا ہاتھ دروازے پر تھا۔ انگوٹھا درمیان میں آگیا تھا مگر اف تک نہ کی ۔ جب ہم گھر کے گیٹ پر اتر گئے اور موٹر روانہ ہو گئی تو سڑک پر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ انگوٹھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی گوشت قیمہ کی طرح ہو گیا۔ فوراً" فون کر کے UN کا ڈاکٹر بلایا وہ ہسپتال لے گئے دوسرے دن جب میں نے پوچھا کہ اختر آپ نے منہ سے کیوں نہ کہا' تو ہنس کر جواب دیا کہ ہندوستانی یہ نہ سوچیں کہ ہم پاکستانیوں میں قوت برداشت نہیں۔ اپنی رہائش اور لباس میں بڑی سادگی ساری عمر برتی۔ ان کے مزاج کے مطابق یہی شعار میں نے اختیار رکھا۔ آپ سب نے خود بھی یہ دیکھا ہوا ہے کہ ہمارے گھر میں ہر چیز انتہائی اوسط درجے کی رہی۔

دوستوں کی دعوتیں کرنے کا شوق ساری عمر رہا۔ جب جب ان کے احباب کھانے پر آتے۔ میں نے ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا۔ پہلے موسیقی کی محفلیں گھر یا سمندر میں کھڑے کسی جہاز پر کرتے جس ملک میں ان کی پوسٹنگ رہی یا زمانہ تعلیم میں جو بھی موسیقی' بیلے یا ڈرامے ہوتے ان میں شرکت کرنا' ہر میوزیم کو بڑی گہری نظر سے دیکھا کرتے۔ پہاڑوں' سمندر' گھنے جنگلات اور جھرنے ان پر اپنا اثر ایسے ڈالتے کہ کئی کئی روز خوش ہو کر ذکر کرتے اور ساتھ یہ بھی کہا کرتے کاش وہ افریقہ کے کسی جنگل میں کیوریٹر ہوتے اور یوں فطرت کے قریب تر ہو کر زندگی گزار دیتے ۔

جائیداد وغیرہ کے نام سے بڑی نفرت کرتے۔ ۱۹۳۸ میں جب سکول کے لئے برنز روڈ پر ایک بہت بڑی دومنزلہ کوٹھی الاٹ کرا کر چیف کمشنر سے الاٹمنٹ آرڈر اور چابی دکھا کر میں نے کہا " دیکھئے اب میں اپنا ننھا سا سکول جو گھر میں کھول لیا ہے ' اس کو بہت بڑا کر لوں گی' یہ دیکھئے الاٹمنٹ آرڈر۔ کچھ سامان بھی وہاں پہنچا دیا ہے۔ " غصہ سے ان کا چہرہ تمتا اٹھا میرے ہاتھ سے کاغذ لے کر چار ٹکڑے کر دیئے اور چابی کو دور پھینک کر بولے " کل صبح پہلا کام آپ یہ کریں کہ الاٹمنٹ کے ٹکڑے اور چابی واپس کر کے آئیں۔ کیا ہم لوگ یہاں اس لئے آئے ہیں کہ لوٹ کھسوٹ کریں ؟ میں ان کے غصے سے ڈر گئی اور دوسرے دن واپس کر آئی۔ جب جی ایم سید کی گرفتاری کے آرڈر نکلے تو رات کی تاریکی میں ایک چادر اوڑھے ہمارے پاس آئے اپنا نام بتا کر کہا کہ میں گرفتار کر لیا جاؤں گا اور نہ جانے کتنے عرصے کے لئے ایک خواہش آپ کے پاس لے کر اس لئے آیا ہوں کہ میرا بندر روڈ پر ایک بہت بڑا پریس ہے اس کو آپ لے لیں آپ کی ذات کی متعلق جو پڑھا اور سنا ہے اس سے یقین ہے کہ آپ اس کو صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ میری تمنا تھی کہ ایک اخبار نکالوں وہ آپ مجھ سے بہتر نکالیں گے۔ اخبار کے لئے کاغذ ایک سال تک کے لئے منگایا تھا۔ اختر نے پریس لینے سے صاف انکار کر دیا انہوں نے کہا کہ میں کل رات پھر آؤں تب تک آپ کو سوچنے کا وقت مل جائے گا۔ میں نے رائے دی کہ مان لیں آپ کا ساری عمر کا خواب پورا ہو جائے گا کہ اخبار نکال سکیں بگڑ اٹھے کہ کوئی مصیبت میں مبتلا ہو رہا ہو اور میں اس کی چیز کو لے لوں دوسری رات وہ پھر آئے اختر نے اپنی معذوری ظاہر کر کے کہا آپ کو اس کے لئے ان سے بہت بہتر لوگ مل سکتے ہیں وہ بے چارے بڑے مایوس ہو کر چلے گئے۔

اورنگ زیب قاسمی

جب ویر جی بخش کالونی کی اسکیم سلیمان صاحب چیف انجینئر کی زیر نگرانی شروع ہوئی۔ سلیمان صاحب والد کے عزیز دوست تھے۔ والد سے ملنے آئے اور مجھ سے کہا بٹی کیوں نہیں تم دو ملے ہوئے مکان بک کروا لیتی ہو۔ بیچ کی دیوار گروا دو گی تو بڑا مکان ہو جائے گا اور میں نے ایسا ہی کر کے جب اختر کو بتایا تو وہ بگڑ اٹھے کہ افسوس ہم جیسے لوگ ان لوگوں کا حق مارنے کھڑے ہو جائیں جن کو گورنمنٹ رہائش کے لئے مکانات نہیں دے سکی تو اللہ اس ملک کی خیر کرے کل جائیں اور آپ نے ممبرشپ کے جو فارم بھرے ہیں ان کو پھاڑ کر آئیں میں واقعی دل میں بہت شرمسار ہوئی۔ یہ بھی ان کے حکم کے بموجب کر آئی ایوب خاں کے زمانے میں جب کلیم داخل کرنے کی آخری تاریخ کا اعلان ہوا تو میں نے ان کے والد کو پٹنہ کے مکان باغات اور زمین جس کے کاغذات میں نے پٹنہ سے ایک صاحب کے ذریعہ منگا لیے تھے وہ اپنے کاغذات کے لئے پٹنہ گئے اس بنا پر فارم پر کر کے دستخط کے لئے دیئے تو اختر اور شمیم بھائی دونوں بگڑ اٹھے کہ ہم اپنی خوشی سے پاکستان آئے تھے آخر پاکستان گورنمنٹ کس خطا میں اس کا بدل دے میری ایک نہ سنی اس قدر خفگی کو دیکھ کر میں نے خود کاغذ پھاڑ کر پھینک دیئے اختر ایک بار جب دورے پر گئے ہوئے تھے تو میں نے ایک ہزار کی زمین گلشن اقبال میں اردو کالج کے پاس خرید لی جب آئے اور بتایا تو پارہ اس قدر اوپر گیا کہ فوراً" ہی ایجنٹ کو زمین کا نمبر دے دیا اور وہ چند ہفتوں ہی میں فروخت ہو گئی۔ بار بار سرپا کر کہتے افسوس کی بات ہے ۔ ایک مکان رہنے کے لئے موجود ہوتے ہوئے بھی اس نے ایسی حرکت کیوں کر لی۔ ہاں میں پھر ان کے سامنے شرمسار ہو گئی کمرشل پلاٹ ہر ممبر کو دیا گیا تو صرف خود ہی انکار نہ کیا بلکہ ایجوکیشن منسٹری کے ہر افسر کو ایسا بھیانک نقشہ کھینچ کر بتایا کہ لوگ کہتے پھریں گے کہ فلاں فلاں کی دکان سے گوشت خرید کر لاتے ہیں فلاں فلاں کی دکان سے بال کٹواتے ہیں وغیرہ وغیرہ بعد میں یہ سب ہی لوگ ملاقات پر بھی یہ بات ضرور کہا کرتے اختر صاحب آپ نے ہم سب کو کیسا بہکایا کہ ہم سب نے کمرشل پلاٹ نہ لیا۔ آج تو وہ ہوتا تو اچھی گزر جاتی۔ اس پنشن سے کیا بنتا ہے مگر مجھ سے ایک غلطی پھر سرزد ہو گئی کہ جب بلاک نمبر۶ میں کمرشل پلاٹ مل رہے تھے تو ایک لے لیا۔ الاٹمنٹ تو اختر نے واپس کرا دیا مگر وہ روپے جو داخل دفتر کر دیئے تھے ان کو جا کر واپس نہ لیا ایسا بے نیاز اور سیر چشم انسان شاید ہی دیکھنے میں آئے گا۔

اپنی زبان اور خیالات پر پورا پورا قابو تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی عادت پر بھی ساٹھ سال کی سگریٹ کی عادت کو آج سے ۵ سال پہلے ایک دن ڈاکٹر کے کہنے پر چپا چھوڑ دیا اور پھر سگریٹ کا کبھی ذکر بھی منہ پر نہ آیا۔ کھانا بہت اچھا ہو انہیں ہیں کا فرق بھی ہوا تو انہوں نے گرفت کر لیا اور باورچی کو بلا کر ہدایت دیتے مگر خود بہت تھوڑی مقدار میں کھاتے۔

اپنی دس روز کی علالت میں جب وہ ہسپتال میں تھے گو کہ بالٹیوں خون منہ سے نکل چکا تھا۔ آٹھ گھنٹے کا آپریشن کر کے پیٹ کی تین آنتیں کاٹ کر پھینک دی گئی تھیں پر جب ہوش میں آئے تو یوں جیسے سوتے سے اٹھے ہیں۔ جسم کے ہر حصے میں نلکیاں لگی ہوئی خون چڑھ رہا ہے آکسیجن لگی ہے لیکن جیسے ہی کوئی ملاقاتی کوئی دوست عیادت کو آیا تو جس کا جس قسم کا مضمون ہوتا اس سے اسی بحر میں بات کرنے لگتے۔ بے شمار شعروں سے شاعروں کو اپنا حال سنا دیا۔ انتقال والی رات کو ایک گھنٹہ پہلے تک بیٹے کو فارسی میں تصوف کے اشعار سنائے اور ان کا ترجمہ کر کے بتاتے رہے اسپتال میں منہ میں ایک قطرہ پانی نہ دیا گیا تو ایک مرتبہ بھی پانی

نہ مانگا یوں ۲ جون ۱۹۹۴ء کو صبح ۵ بجے ایک عظیم انسان اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

مجھے اس وقت اختر کے گرد راہ ختم کرتے یہ جملے یاد آ رہے ہیں اب خواب اور بیداری میں کوئی فرق نہیں رہا۔ گاہ گاہ فجر کے وقت جب میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو ستارہ صبح مسکرا کر کہتا ہے یونانی اساطیر کا یہ گمان صحیح ہے کہ جسم خاکی سے جدا ہو کر روحیں افلاک میں تاروں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اختر سوختہ تو میرے قریب آ تیرے لئے ایک خاص مقام کا تعین ہو چکا ہے۔ ۲۷ نومبر ۱۹۹۳ء (بہ اجازت مصنف)

("قومی زبان" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

ڈاکٹر طاہر تونسوی

لفظوں کو معتبر کرنے والا شاعر

مجھے اپنی بات اس اعتراف کے ساتھ شروع کرنا ہے کہ فیض کے بعد اپنے لب ولہجے، اسلوب، کرافٹ اور لفظ و معنی کے رشتوں کی پہچان کے حوالے سے اردو شاعری میں اگر کوئی تواتر لمحہ موجود تک ابھری ہے تو وہ افتخار عارف کی ہے۔ وہ افتخار عارف جو ہماری شاعری کا افتخار بھی ہے اور اس کے داخلی وخارجی محرکات، میلانات، احساسات اور تجربات کا عارف بھی۔ وہ اس کا مزاج شناس ہے اور مزاج داں بھی وہ اس کا تصویر کار بھی ہے اور شاہکار بھی وہ اس کا پاسدار بھی ہے اور شہسوار بھی وہ لفظوں کا جوہری بھی ہے اور بازیگر بھی کہ شاعری تو سارا کھیل ہی لفظوں کا ہے۔ لفظوں کے انتخاب کا لفظوں کے دروبست کا، لفظوں کے ادراک کا لفظوں کے شعور کا اور لفظوں کی مزاج شناسی کا۔

افتخار عارف کے ہاں لفظوں کے برتنے کا جو سلیقہ دکھائی دیتا ہے اس کی بنا پر وہ حرمت لفظ کا علمبردار ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے لفظوں کو معتبر کرنے والا شاعر کہا ہے۔

"مہر دونیم" میں افتخار عارف کا تخلیقی اظہار صنف شاعری کے دو پیرایوں کے حوالے سے سامنے آیا ہے۔ ایک غزل کا اور دوسرا نظم کا میں اس وقت اردو کی سدا بہار شاخ سبز یعنی اردو غزل کا قاری ہوں اور میرے پیش نظر افتخار عارف کی غزل کا منظر نامہ ہے اور اس منظر نامے کو جس طرح اس نے شاندار اور جاندار لفظوں سے تشکیل دیا ہے میں آپ کے سامنے اس کا اجمالی خاکہ پیش کروں گا اور افتخار عارف کے دست کوزہ گر کے اس کمال کی تفصیل بیان کروں گا جو اس نے لفظوں کے ذریعے سے دکھایا ہے اور چاک پر جس طرح ترکیب سازی کے خوبصورت مرقعے تراشے ہیں میں اپنے مطالعے کے حوالے سے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ تخلیقی اظہار میرے لئے نیا بھی ہے اور حیران کر دینے والا بھی اور میں ابھی تک طلسم حیرت کے عالم بادگرد میں ہوں کہ ہمارے ناقدین نے دیانت داری کو کیوں تج دیا ہے اور تعصب اور گروہ بندی کی عینک ابھی تک کیوں نہیں اتاری اور افتخار عارف پر اس کی نظم اس کی غزل پر اور اس کے تخلیقی جواہر پر قلم کیوں نہیں اٹھایا میرے لے کر خود افتخار عارف تک غزل پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ ایسا شعر تو میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں مگر مجھے قسم ہے پیدا کرنے والے کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان بھی ہے اور میری زبان بھی میرا علم بھی ہے اور میرا قلم بھی میں نے افتخار عارف کی غزل کے ہر شعر میں ایک نیا اور تازہ ذائقہ محسوس کیا ہے اور مجھے یوں لگا ہے کہ جیسے اس موضوع پر میں نے پہلی بار ایسا شعر پڑھا ہے اور یہی افتخار عارف کا کمال ہے اور اس کے اظہار ہنر کا جواز افتخار بھی کہ اس نے اپنے دیئے خود روشن کئے ہیں اور انہیں خود ہی روشنی عطا کی ہے۔ لطف

کی بات یہ ہے کہ اس نے اپنی غزلوں میں کم و بیش سو تراکیب استعمال کی ہیں اور ایک یا دو کے سوا اس نے ہر شعر میں نئی ترکیب بلکہ ترکیب در ترکیب کو وسیلہ اظہار بنایا ہے اور مجھے غالب اور اقبال کے بعد بہت بڑا ترکیب ساز شاعر محسوس ہوا ہے چنانچہ ظلمت انتساب' لوح آب رواں' بطن صدف' فقیر شہر علم' زکوٰۃ اعتبار' نگاہداری بہار' میثاق تیرگی' عذاب در بدری' خیمہ عافیت' حرم لفظ' پروردگار لفظ' توقیر اہل حاجت' دشت مصلحت' کوئے نفاق' فغاں' قافلہ بے نوا' مال عزت سادات عشق' توہین اطاعت' حرمت حرف' ویرانہ مقتل' دار تشنگی' صبح بشارت' خمیازہ' توہین بہاراں' اندیشہ وگماں' عذاب وحشت جاں' عذاب گرد خزاں' سر قریہ زرد' جواز رہ سفر' فغان خلقت' بے دست دعا' غبار کوچہ' وعدہ پس دیوار' تاریک' دائرہ ہجر اور طناب خیمہ گل کو ان کی باطنی معنویت کے ساتھ اپنے تخلیقی اظہار کا حصہ بنایا ہے اور ان سے لفظ معنی کے رشتے کو استوار کرکے عصری صداقتوں کی جس طرح نشان دہی کی ہے وہ بذات خود انفرادیت کی واضح مثال ہے۔ استعارہ ہو یا علامت تلمیح ہو یا رمز کنایہ سب کے سب لفظ کے محتاج ہیں اور افتخار عارف نے لفظوں کی حفاظت کا برملا مظاہرہ کیا ہے اور اردو غزل کو لفظوں کی یتیمی کے طعنوں سے بچایا ہے۔ اس کے ہاں ہر لفظ اور ہر ترکیب اپنے پورے پس منظر کے ساتھ ابھری ہے اور ایک بلیغ شکل میں اپنا ابلاغ کرتی دکھائی دیتی ہے وہی ابلاغ کی خصوصیت جو غزل کی جان ہے مگر اس باریک بینی میں حد درجہ سلیقہ اور احتیاط کی ضرورت ہے گویا پل صراط سے گذرنے والی بات ہے۔
افتخار عارف ہر پل صراط سے بڑی چابکدستی کے ساتھ گذرا ہے اور لفظ و معنی کا حسین اور خوبصورت عصا ہاتھ میں تھامے غزل کی نرم ونازک اور لطیف ڈور پر شاہانہ چال چلتے ہوئے سب کو حیران کر گیا ہے صرف حیران ہی نہیں اسیر بھی کر گیا ہے اور ہم سب اس کی غزل کے اسیر ہیں اس کے فن کے اسیر ہیں اس کی غزل کی نزاکت کے اسیر ہیں اس کی غزل کی لطافت کے اسیر ہیں اس کے عرض ہنر کے ہی نہیں کمال ہنر کے ہیں ہر چند وہ یہ کیوں نہ کہتا رہے۔

حرم لفظ و معانی سے نسبتیں بھی رہیں
مگر سلیقۂ عرض ہنر نہیں آیا

اگر افتخار عارف کو لفظ و معنی کی حرمت سے نسبتیں ہونے کے باوجود سلیقۂ عرض ہنر نہیں آیا تو پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ کسی کو بھی سلیقۂ عرض ہنر نہیں آیا۔ اور ظاہر ہے ایسا نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہوا ہے پس طے یہ ہوا کہ افتخار عارف کو سلیقۂ عرض ہنر آتا ہے بلکہ اس کے ہاں تو صورت حال یہ ہے کہ اس کے ایک ایک شعر پر ایک ایک الگ مضمون باندھا جا سکتا ہے اس لئے کہ اس کا ایک ایک شعر ایک پوری کہانی بیان کرتا ہے ایک پوری داستان رقم کرتا ہے ایک پورے عہد کا منظر نامہ تشکیل کرتا ہے۔ اس کے ایک ایک شعر میں ہمارا عصر اپنے منفی رویوں کے ساتھ عکس ریز ہے اس کے ایک ایک شعر میں ہماری محرومیاں' ہماری پس ماندگیاں' ہماری ناکامیاں' نامرادیاں اور ہماری مجبوریاں جھلکتی ہیں اس کے ایک ایک شعر میں ہماری تمناؤں' خواہشوں' خوابوں' سوچوں' ہمارے موسموں' ہم پر ظلم وجبر کی کیفیتوں' ان گنت عذابوں' اٹھتے ہوئے تیروں' کھچی ہوئی کمانوں' مقتل گاہ کی شاموں کوئے ملامت کی تاریکیوں' قافلہ زینت کی بے سروسامانیوں' خلقت شہر کی آوازوں' گریہ نیم شبی کی صداؤں' جلتے ہوئے خیمے اور ٹوٹی ہوئی طنابوں کا بھرپور خاکہ موجود ہے جو ہماری زندگی کو ایک کھلی کتاب کی طرح پیش کر دیتا ہے۔ افتخار عارف ان سب کیفیتوں کا

اورنگ زیب قاسمی

لذت آشنا نہ سہی ادراک تو ضرور رکھتا ہے اور یہ ضروری بھی نہیں کہ فن کار خود اس تجربے سے گزرا ہو۔ مشاہدے کے ذریعے وہ ساری صورت حال کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے سب لاشعوری حرکات کو شعوری سطح پہ لفظوں کی مالا پہنا سکتا ہے اور یہی کام افتخار عارف نے بھی کیا اور خوب کیا ہے اگرچہ اس نے بڑے طنزیہ لہجے میں اس کا اظہار بھی کیا ہے:

شگفتہ لفظ لکھے جا رہے ہیں
مگر لہجوں کی ویرانی بہت ہے
سبک ظرفوں کے قابو میں نہیں لفظ
مگر شوق گل افشانی بہت ہے

افتخار عارف کے ہاں اس کی برعکس صورت ہے کہ اس کے شگفتہ لفظ لہجے میں شادابی اور رونق پیدا کرتے ہیں اس لئے وہ نہ تو سبک ظرف ہے اور نہ ہی اسے گل افشانی کا شوق ہے بلکہ وہ تو حرمت فن کا بھی قائل ہے اور حرمت لفظ کا بھی اور اس کے لب و لہجے کی اسیری کا ذکر میں ابھی کر آیا ہوں یقین نہ آئے تو میرے ساتھ ان اشعار کو پڑھیے:

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

کہاں کے نام و نسب علم کیا فضیلت کیا
جہان رزق میں توقیر اہل حاجت کیا
شکم کی آگ لئے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا
اب بھی توہین اطاعت نہیں ہوگی ہم سے
دل نہیں ہوگا تو بیعت نہیں ہوگی ہم سے
روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ
رزق برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے
اجرت عشق وفا ہے تو ہم ایسے مزدور
کچھ بھی کر لیں گے یہ محنت نہیں ہوگی ہم سے

عذاب وحشت جاں کا صلہ نہ مانگے کوئی
نئے سفر کے لئے راستہ نہ مانگے کوئی
بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

وہ ہم نہیں تھے تو پھر کون تھا سرِ بازار
جو کہہ رہا تھا کہ بکنا ہمیں گوارا نہیں
ہم اہلِ دل ہیں محبت کی نسبتوں کے امیں
ہمارے پاس زمینوں کا گوشوارا نہیں

دکھ اور طرح کے ہیں دعا اور طرح کی
اور دامنِ قاتل کی ہوا اور طرح کی
دیوار پہ لکھی ہوئی تحریر ہے کچھ اور
دیتی ہے خبر خلقِ خدا اور طرح کی

خدا لگتی کہیے کہ ان اشعار کے ساتھ آپ نے بھی وہی کیفیتیں محسوس نہیں کیں جو شاعر افتخار عارف کے تجربے اور مشاہدے کا حصہ بن کر تخلیقی اظہار کے حوالے سے بے اختیار چھلک پڑتی ہیں مگر یہ بے اختیاری بات کہنے کی ہے عرض مدعا بیان کرنے کی ہے حرف دعا اٹھانے کی ہے عذاب دہشت جاں سے گذرنے کی ہے مگر اس میں لفظ کی اختیاری کو دخل حاصل ہے اور ایسے لفظ جنہیں افتخار عارف نے معتبر بنا دیا ہے اور مکان کوچہ شہرت کے برعکس اپنا بھرم بھی قائم کیا ہے اور اس طرح رفتار بھی پیدا کی ہے اور گری گفتار بھی۔
۔۔ لفظ و معنی کو اعتبار دینے والا یہ شاعر یوں بھی کہہ اٹھتا ہے:

خداوندا! مجھے توفیق دے میں ایسے زندہ لفظ لکھوں
جو نہ لکھوں میں تو دنیا بانجھ ہو جائے
مگر پھر سوچتا ہوں اتنے زندہ لفظ لکھے جا چکے ہیں
اور لکھے جا رہے ہیں
میں بھی لکھ لوں گا تو کیا ہو جائے گا
کیا یہ پرانا آدمی پھر سے نیا ہو جائے گا
یا دوسرا ہو جائے گا۔

یہ اعتراف ایک طرح افتخار عارف کا عجز فن اور عجز ہنر ہے اور اسی میں کمال ہنر پوشیدہ ہے۔ تو اے میرے شاعر افتخار عارف! تو بھی سن لے کہ تو نے زندہ لفظ لکھے ہیں اور زندہ حقیقتوں کی، زندہ صداقتوں کی اور زندہ کہانیوں کی نقش تصویریں بنائی ہیں اس لئے تو حلقہ معتبر میں ہے اور لفظ و معنی کا وقار تجھ سے ہے اور بقول غالب:

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

("تجدید نو" اسلام آباد)

اورنگ زیب قاسمی

ڈاکٹر محمد اجمل

ینگ کی نفسیات

نفسیات کے دو دھارے ہیں۔ ایک وہ جو لائبنیز کے زیرِ اثر روح کو کائنات کی بنیاد سمجھتا ہے اور ہر فعل کو چاہے وہ مادی ہو یا غیر مادی وہ ایک روحانی حقیقت سمجھتا ہے۔ دوسرا دھارا لاک کے زیرِ اثر ہے جو کہ ہر عمل کو در حقیقت ایک مادے کی کیفیت سمجھتا ہے۔

جب ہم نفسیاتی افعال کو غور سے دیکھتے ہیں تو پانچ قسم کے نظر آتے ہیں۔ ایک اضطراری، دوسرے جبلی، تیسرے جو عادت کی چھاپ میں آگئے ہوں۔ اس کے بعد وہ افعال جو اختیاری ہیں کہ ان میں آپ کو کوئی دو راستوں میں سے ایک اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یہ اختیاری افعال دوسری اقسام سے بلند ہیں کیونکہ ان میں شعور پوری طاقت سے کام کرتا ہے۔

یہ اختیاری افعال وہی ہیں جن کی ذمہ داری ہم لیتے ہیں اور انہیں کسی اور طاقت سے منسوب نہیں کرتے۔ لیکن ان سے بھی بلند ایک اور نفسیاتی کیفیت بھی ہے۔ جسے عاما" ہم نفسیاتی کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں اور وہ ہے محض روحانی۔ اسے ہم روحانی تجربہ کہہ سکتے ہیں۔ اگر سچے خواب آئیں اور ان کی وجہ معلوم نہ ہو سکے تو یہ ایک روحانی تجربہ ہے۔ اگر آپ کسی روحانی کیفیت کے ماتحت مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کر دیں تو یہ بھی ایک اعلیٰ قسم کا نفسیاتی فعل ہے۔

لائبنیز کے زیرِ اثر جو ماہرین نفسیات نظر آتے ہیں ان میں ینگ کا مقام بہت بلند ہے اور ینگ ہی ایک ممتاز حیثیت کے ساتھ ابھرتا ہے ینگ نے جو تصورات ہم کو دیئے ان میں سب سے زیادہ اہم اور مرکزی تصور آرکی ٹائپ کا ہے۔ آرکی ٹائپ سے مراد وہ رجحانات ہیں جو ایک تمام نسل انسانی میں موجود ہوں اور اس کے افعال، حرکات و سکنات میں نظر آئیں۔ دوسرے جونہی کوئی معقول محرک نظر آئے تو کام کرنا شروع کر دیں۔ تیسرے ان کے ہر فعل میں ایک مخصوص جذباتی عنصر موجود ہو اور ان تین اجزا سے جو مرکب بنتا ہے اسے ہم تمام نسل کا ادراک کہیں گے۔ تو یہ نسلی ادراک جو ہے یہ آرکی ٹائپ ہیں۔ اس ادراک کی کئی قسمیں ہیں۔

ہر آرکی ٹائپ علامتی نقطہ نظر سے چیزوں کو پرکھتا ہے مثلاً" سورج ایک علامت ہے باپ کی اور وہ باپ جو کہ غیر شخصی باپ ہے۔ ایک تو آپ کا باپ ہے۔ اسے آپ شخصی باپ کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا ایک غیر شخصی Impersonal باپ ہے۔ اور بظاہر تو کچھ نہیں ہے لیکن آپ کے افعال و اعمال میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا بچہ ہے۔ ماں باپ اس پہ جان فدا کرتے ہیں اس کی ہر بات مانتے ہیں، اس کو پیار دیتے ہیں، شفقت سے پیش آتے ہیں۔ جو وہ چاہتا ہے کرتا ہے لیکن بچے کو جب کہا جائے کہ ماں کی تصویر بناؤ۔ تصویر میں وہ ایک

نہایت ظالم، خونخوار قسم کی ماں بناتا ہے جو کہ ڈراؤنی ہے اور اس کے انداز میں ایک خاص قسم کی حیوانیت ہے۔ یہ ماں جو ہے یہ غیر شخصی ماں کا آرکی ٹائپ ہے۔ یہ اصلی ماں کی تصویر نہیں ہے اور غیر شخصی ماں کا آرکی ٹائپ ہر شخص کی زندگی میں کار فرما ہوتا ہے۔ کسی میں کم، کسی میں زیادہ۔ غیر شخصی ماں کا منفی پہلو تو یہ ہے کہ وہ ظالم ہے جابر ہے ظلم کرتی ہے اسی لئے اسے Devouring Mother یعنی کھا جانے والی ماں بھی کہتے ہیں۔

غیر شخصی ماں کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو کہ اثباتی ہے۔ یہ وہ غیر شخصی ماں ہے جو آپ کو روحانی غذا دیتی ہے۔ آپ کے اندر قوت تخلیق کی گہما گہمی پیدا کرتی ہے۔ ممکن ہے آپ کو خواب آئے کہ ایک بزرگ سی عورت دودھ کا ایک برتن آپ کو پیش کر رہی ہے۔ یہ خواب غیر شخصی اثباتی ماں کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ روحانی غذا دے رہی ہے تاکہ اس سے وہ نشوونما پاسکے۔

آرکی ٹائپ سے ہی اساطیر کی تشریح ہوتی ہے۔ مثلاً "گلگ میش کی اسطور ہے کہ گلگ میش بابل میں ایک ظالم بادشاہ تھا۔ لوگوں نے دعا کی کہ ان پر رحم کیا جائے اور انہیں کوئی نیک بادشاہ ملے تو قدرت نے ایک بڑا طاقتور پہلوان اینکی ڈو Enkidu زمین پہ بھیجا۔ گلگ میش جو کہ بہت طاقتور تھا اس نے اینکی ڈو کے ساتھ کشتی کی لیکن اس کشتی میں دونوں برابر رہے۔ ایسا ہونے سے گلگ میش کی طبیعت میں بجائے ظلم کے رحم پیدا ہو گیا۔ اور وہ اپنی رعایا پہ بڑی محبت کی نظر رکھنے لگا۔ اب یہ ایک دیومالا کی کہانی ہے۔ لیکن دراصل یہ کہانی ہے کہ انسان جب اپنے سایہ Shadow کو قبول کر لیتا ہے تو اس کی جبلت میں رحم پیدا ہو جاتا ہے۔ فرد سائے سے اگر بھاگے یا اس سے نفرت کرے گا تو اس کے دل میں ظلم و ستم کے جذبات حاوی رہیں گے۔ سایہ ایک نہایت اہم آرکی ٹائپ ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور آرکی ٹائپ ہے جسے Anima کہتے ہیں۔ Anima ایک حسین اور جوان عورت کا تصور ہے۔ جو کہ ایک مرد کے ذہن میں رہتا ہے یہ تصور اس وقت کارفرما ہوتا ہے جب کسی مرد کو کسی عورت سے محبت ہو جائے دیو مالا میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں، سسی پنوں ان میں ہیر لیلیٰ اور سسی Anima کی مثالیں ہیں۔ Rider Haggard کا ایک مشہور ناول "She" ہے۔ کہتے ہیں کہ "She" بھی Anime آرکی ٹائپ کی ایک مثال ہے۔

اس کے مقابلے میں Animus کا آرکی ٹائپ ہے۔ یہ آرکی ٹائپ عورت کے ذہن میں ہوتا ہے۔ یہ مرد کا تصور ہے۔ اس آرکی ٹائپ کی صفت یہ ہے کہ عورت کے ذہن میں عقلمندی کے آثار پیدا کرتا ہے۔ ان کے علاوہ Wise Old Man آرکی ٹائپ ہے۔ یہ ایک بوڑھے عقلمند انسان کا تصور ہے جو انسان کی مختلف مشکلات میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اہم آرکی ٹائپ خدا کا آرکی ٹائپ ہے جو کہ کائنات کی ہر چیز کو خدا سے منسوب کرتا ہے اور کائنات کی ہر شے کی وجہ بن جاتا ہے یہ آرکی ٹائپ جب انسان کے ذہن پہ چھا جائے تو انسان تصور میں منڈالا کی شکل دیکھتا ہے منڈالا ایک ایسی صورت ہے جو دائرہ ہے اور وہ دائرہ ایک مربعے میں گھرا ہوا ہے۔ یہ منڈالا دراصل دو متضاد حقیقتوں کا امتزاج ہے۔ دائرہ اور مربع۔

جب منڈالا کا تجربہ ہو تو صوفیانہ کیفیات پیدا ہوتی ہیں انسان میں تصوف کا لگاؤ اور خدا کی طرف بڑھنے کی

اورنگ زیب قاسمی

آرزوئیں جنم لیتی ہیں۔ آرکی ٹائپ ایک طرف انسان کی جبلت سے ملا ہوا ہے اور دوسری طرف وہ خدا کی جستجو کرتا ہے اور اسے پانے کے لئے مختلف راستے ڈھونڈتا ہے۔ ان راستوں میں سے ینگ کے نزدیک سب سے اہم راستہ Active Imagination ہے۔ ActiveImagination وہ تصورات ہیں جو کہ ہمارے ذہن میں آتے ہیں لیکن ہم ان میں سے کسی تصور کو الگ کر کے اس پہ غور کرنا شروع کر دیتے ہیں اور وہ خود بخود بہت سی صورتیں اختیار کرتا ہے جن میں ہماری عقل کو کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ انسان کے Meditation یا عبادت فکر سے جو تصورات اور خیالات پیدا ہوتے ہیں وہ بھی ہمیں خدا کی طرف لے جاتے ہیں۔

ہم نے ابتدا میں دو دھاروں کا ذکر کیا تھا۔ نفسیات میں لائبنز والا دھارا ہمیں خدا کی طرف لے جاتا ہے اور خدا سے ہمارے وصال کی کوشش کرتا۔ لاک کا دھارا ہمیں خدا کی طرف نہیں لے جاتا۔ مادے سے اٹھتا ہے اور مادے پہ جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ اسے خدا یا عاقبت وغیرہ سے کوئی واسطہ نہیں۔

("راوی" لاہور)

محمد سلیم الرحمٰن

موپساں

۱۸۵۰ء ۔ ۱۸۹۳ء

موپساں کا آبائی شہر رواں تھا۔ دادا لیجپ زمیندار تھا' تمباکو کے قومی اجارے کا مقامی کرتا دھرتا اور شہر کے مضافات میں اچھی خاصی جائیداد کا مالک ۔ اس آسودہ حالی کے پیش نظر موپساں کے خوش شکل اور چھیل چھبیلے والد کو روپے پیسے کی کوئی تنگی نہ تھی۔ تھوڑا بہت شغف پینٹنگ سے بھی تھا۔ اتنی صلاحیت تو نہ تھی کہ اس فن میں کوئی مقام حاصل کر سکتا۔ بس لکیریں کھینچ کر اور رنگ بھر کر دل بہلا لیتا۔

موپساں کی ماں لاؤر کا خاندان بھی کچھ کم متمول نہ تھا۔ شوہر کو جتنی رقم جیب خرچ کے طور پر ملتی تھی اس سے کہیں زیادہ مال متاع لاؤر جہیز میں لائی۔ اس کا ذوق بھی شوہر سے زیادہ شستہ تھا۔ نوجوانی میں ایک مدت اسے اپنے جواںا مرگ بھائی' الفرید کا ساتھ میسر رہا تھا جو ادب اور فلسفے کا رسیا اور گستاؤ فلابیر کا جگری یار تھا۔ لاؤر کو انگریزی پر اتنا عبور حاصل تھا کہ شیکسپیئر کے ڈراموں کا متن پڑھ لیتی تھی۔ مذہب کی ظاہری رسوم کا پاس تو ضرور کرتی تھی لیکن حقیقت میں مذہب سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ لباس ایسا پہنتی جس سے قدرے بے باکی کا اظہار ہوتا' سگریٹ پیتی' مردوں کی طرح گھڑ سواری کرتی' شیکسپیئر پڑھتی رہتی۔ قصباتی ماحول میں یہ سب حرکتیں تھوڑی اوپری معلوم ہوتی تھیں اس لئے لوگ اسے کچھ کچھ خبطن سمجھتے تھے لیکن اس کی ذہانت اور دل کشی کے سبھی معترف تھے۔ اس کے برعکس موپساں کے باپ کو کسی نے کبھی ذہین یا پرکشش بیان کرتے دیا۔

موپساں پانچ اگست ۱۸۵۰ء کو نارمنڈی میں دی ایپ کے پاس قدیم وقتوں کی ایک نارمن حویلی میں پیدا ہوا جو اس کے والدین نے کرائے پر لے رکھی تھی۔ وہ بمشکل نو برس کا ہوا تھا کہ میاں بیوی میں ان بن کا آغاز ہو گیا۔ باپ ٹھہرا رنگین مزاج۔ معاشقے لڑانے سے کیسے باز رہتا۔ کم سن ہونے کے باوجود موپساں بہت سی باتوں کو بھانپ لیتا۔ اس زمانے میں وہ پیرس کے ایک مدرسے میں زیر تعلیم تھا۔ وہاں سے اس نے ماں کو خط میں لکھا:

"میں کمپوزیشن میں اول آیا اور انعام کے طور پر مادام ۔ ۔ ۔ مجھے اور پاپا کو سرکس دکھانے لے گئیں۔ ایسا لگا کہ وہ پاپا کو بھی کسی بات کا انعام دے رہی تھیں لیکن پتا نہیں کس بات کا۔"

شادی کو پندرہ سال ہو چکے تھے اور موپساں گیارہ برس کا تھا اور موپساں گیارہ برس کا تھا ماں نے ناچار" شوہر کی بدسلوکی سے تنگ آ کر فیصلہ کیا کہ مزید نباہ ممکن نہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ موپساں باپ کے ناگفتنی رویے سے کس حد تک باخبر تھا مگر اس کے کلکشن پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ والدین کی ازدواجی

زندگی کی روز افزوں بدمزگی اس سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ ان دنوں فرانس میں طلاق لینے دینے میں سو طرح کی خرابیاں تھیں۔ عزت دار خاندانوں میں قانونی علیحدگی کی رسوائی مول لینے کے بجائے ازدواجی رنجشوں سے نباہ کئے جانے کو کم تر شر سمجھا جاتا تھا لیکن لاؤر دھن کی پکی تھی اور قانونی الجھنوں یا خاندانی دباؤ کو خاطر میں نہ لائی۔ قانونی کارروائیوں کے کھٹے میں پڑنا اسے بھی گوارا نہ تھا لیکن شوہر کو (بظاہر کسی خاص وقت کے بغیر) راضی کر لیا کہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہو کر عہد کئے لیتے ہیں کہ آئندہ دونوں الگ الگ رہیں گے۔ یہ بھی طے پایا کہ جو جائیداد وہ جہیز میں لائی تھی اس پر شوہر کا کوئی حق نہ ہو گا موپساں اور اس کا چھوٹا بھائی ایروے ماں کے پاس رہیں گے اور باپ دونوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک معین رقم سالانہ ادا کرے گا۔ اس راضی نامے کے بعد بیوی اور بیٹوں سے باپ کی خط و کتابت تو جاری رہی اور وہ گاہے گاہے ان سے ملنے بھی آ جاتا لیکن اس کی حیثیت خاندان کے فرد کی نہ رہی۔ ایک طرح سے غیر ہو گیا۔ جہاں تک موپساں کا تعلق ہے وہ کھلم کھلا ماں کا طرف دار تھا اور مدتوں بعد اس نے کسی موقع پر لکھا "شادی کے بعد میری ماں کو بے رحمی سے کچلا اور پیٹا گیا۔ وہ سولی پر ٹنگی رہی۔"

ماں کو گھر سنبھالنے کا کوئی خاص شوق نہ تھا۔ درحقیقت وہ تھوڑی سی پھوہڑ واقع ہوئی تھی۔ البتہ موپساں کو گھر پر پڑھانے لکھانے کی طرف سے اس نے کبھی غفلت نہ برتی۔ اسے کہانیاں بھی سناتی۔ اس بارے میں شواہد موجود ہیں کہ کہانی کہنے کا فن اسے خوب آتا تھا۔

نارمنڈی کے دیہی ماحول میں رہتے ہوئے موپساں کو گھومتے پھرنے کے سوا کام ہی کیا کہ بقول وہ پورا "وحل بچھیرا" بنا ہوا تھا ہر طرف سرسبز و شاداب کھیت' سیب کے باغات' جن کے پھولوں کے رنگ اور مہک سے موسم بہار میں فضا شگفتہ رہتی' بھوج' بید' یا صنوبر اور دیودار کے درختوں اور جھاڑیوں میں گھرا' سمندر سے چند سو گز دور وہ اجلا مکان جہاں موپساں اور اس کی ماں اور بھائی رہتے تھے۔ وہ جنگلوں کھیتوں کی سیر کرنے کے بعد ساحل کا چکر لگاتا اس کا خاص مشغلہ تھا تاکہ دیکھے سمندر نے کیا کچھ ریتی پر لا اگلا ہے۔ ماں کی طرف سے اسے جہازوں کی رہبری کے فرائض انجام دینے والے مقامی پائلٹوں کے ساتھ رودبار انگلستان میں چھوٹے موٹے سفر کرنے کی اجازت تھی۔ وہ مقامی ماہی گیروں کے ہمراہ ہیرنگ اور ٹراؤٹ مچھلیاں پکڑنے بھی نکل جاتا۔ ان سمندر باسیوں کے لڑکے اور آس پاس کے کسانوں کے چھوکرے اس کے ساتھی تھے اور ان میں اٹھنے بیٹھنے کے سبب وہ نارمنڈی اس علاقے کی مقامی بولی سیکھ گیا تھا۔ گرمیوں میں سیاح ہجوم در ہجوم ساحلوں کا رخ کرتے' روز پتنگ منانے کی سوجھتی' سیر تماشے ہوتے۔ ایتریتا میں گزرے ہوئے لڑکپن کے یہ دن موپساں کبھی بھلا نہ سکا۔ اس کے خیال میں زندگی کے جو مزے اس وقت لوٹنے کو ملے وہ پھر کبھی نصیب نہ ہوئے۔ ایتریتا اس کی یاد میں ہمیشہ کسی گم گشتہ جنت یا طلسمی سرزمین کے مانند محفوظ رہا۔

ایتریتا سے صرف بیس میل دور لا آور میں ایک نہایت عمدہ مدرسہ تھا لیکن لاؤر نے جانے کیوں اسے نظر انداز کر کے موپساں کو مزید تعلیم کے لئے رواں کے پاس ایک چھوٹے مذہبی مدرسے میں داخل کرا دیا۔ شاید وہ سمجھنے سے قاصر رہی کہ موپساں کے مزاج کی بعض خصوصیات اتنی راسخ ہو چکی ہیں کہ ایسے خشک اور بے لطف مدرسے میں' روکھے استادوں کے درمیان' اس کا جی نہ لگے گا۔ پالا گر ہوا بھی یہی۔ کچھ مدت تو وہ جوں توں کر کے وہاں اڑا رہا پھر اس کا ضبط جواب دے گیا۔ ابھی اس کی تعلیم کا ایک سال باقی تھا کہ موپساں کو

اورنگ زیب قاسمی

بیٹھے بٹھائے شرارت سوجھی۔ مدرسے کے کسی متشرع استاد نے دوزخ کے ہولناک عذابوں پر لیکچر دیا تھا۔ موپساں نے ہم جماعتوں کے سامنے اس استاد کی نہایت خندہ آور نقل اتاری۔ مدرسے کے سنجیدہ ماحول میں اس قسم کا چھچھورپن ناقابل معافی تھا۔ موپساں کو کھڑے پاؤں وہاں سے نکال دیا گیا۔

اس کے بعد ۱۸۶۹ء میں اس نے پیرس میں قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ابھی پڑھائی کا آغاز ہوا تھا کہ جرمنی اور فرانس میں جنگ چھڑ گئی۔ اب پڑھنے پڑھانے میں کیا دھرا تھا۔ موپساں جا کر جھٹ پٹ فوج میں بھرتی ہو گیا اور سپاہی بنا۔ لیکن اس کی رجمنٹ، جس کے پاس جنگی سازوسامان نہ ہونے کے برابر تھا، جاڑوں بھر برف سے ڈھکے ایک جنگل میں پڑی رہی اور آخر میں لڑے بغیر ہی پسپا ہو گئی۔ جنگ میں فرانس ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوا۔

ستم بالائے ستم یہ کہ موپساں کے والد کا کاروبار اچانک ٹھپ ہو گیا۔ چنانچہ باپ بیٹوں کو سال کے سال جو رقم بطور جیب خرچ دیتا تھا وہ کم ہو کر آدھی بھی نہ رہی۔ پہلے موپساں کو باپ کی طرف سے سولہ سو فرانک سالانہ ملتے تھے۔ اب چھ سو فرانک پر اکتفا کرنا پڑا۔ تنگ دستی کی وجہ سے مزید تعلیم کا سلسلہ موقوف ہوا۔ ضرورت آپڑی کہ گزر اوقات کے لئے کوئی ملازمت تلاش کی جائے۔ نارمنڈی فرانس کے اہم سمندری صوبوں میں سے ایک تھا۔ اس وجہ سے باپ کے بہت سے بحری افسروں سے مراسم تھے۔ ان کی تگ و دو سے موپساں کو بحریہ کی وزارت میں جگہ مل گئی۔ پہلے پہل کچھ مدت تنخواہ کے بغیر کام کرنا پڑا۔ پھر فروری ۱۸۷۳ء میں اسے مستقل کر دیا گیا اور سولہ سو پچاس فرانک سالانہ مشاہرہ مقرر ہوا۔ یہ تنخواہ ایسے نوجوان کے لئے، جو پیرس میں رہتا ہو، کافی تو نہ تھی مگر کھینچ تان کر گزارہ ہو سکتا تھا۔

پیرس میں مستقل قیام کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ فلابیر کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملنے لگا۔ فلابیر کے ہاں آنے جانے سے موپساں کی ترگنیف اور زولا سے بھی شناسائی ہو گئی۔ بقول زولا، موپساں خوش شکل اور تنومند جوان تھا جسے دریائے سین پر کشتی رانی اور دریا کے کنارے مٹرگشت کرنے اور رنگ رلیاں منانے کا بہت شوق تھا اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اسے کلرکانہ کام کاج سے دلچسپی نہ تھی۔ بحریہ کی وزارت میں اس نے اپنے فرائض مستعدی سے انجام دیئے۔ محکمے کے سربراہ نے اس کے کام کو سراہتے ہوئے جو ریمارک قلم بند کئے تھے انہیں آج بھی متعلقہ فائل پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں موپساں کو ایک سے زیادہ مرتبہ ترقی ملی۔

فلابیر سے اپنی ملاقاتوں کے حوالے سے موپساں نے لکھا ہے: "میں وقتاً فوقتاً فلابیر کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ انہیں بھی مجھ سے انس ہو گیا۔ میں نے ہمت کر کے چند تحریریں انہیں دکھائیں جو میں نے لکھی تھیں۔ انہوں نے مہربانی فرما کر میرے لکھے پر نظر ڈالی اور کہنے لگے: میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ تم میں صلاحیت ہے کہ نہیں۔ تم نے جو کچھ لا کر مجھے پڑھایا ہے اس سے ایک طرح کی ذہانت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ قول یاد رکھو۔ صلاحیت طویل صبر کا نام ہے۔ سو کام کئے جاؤ۔ انہوں نے یہ بھی کہا: دھڑ دھڑ جلتی آگ یا میدان میں کھڑے کسی درخت کو بیان کرنے کے لئے ہمیں اس آگ یا درخت کے سامنے اتنی دیر تک رہنا چاہیے کہ اس کے بعد وہ ہماری نظر میں کسی اور آگ یا درخت سے مشابہ نہ رہے۔ دنیا بھر میں کہیں ریت کے دو ذرے یا دو مکھیاں یا دو ہاتھ یا دو ناکیں ایسی نہیں جو بالکل ایک سی ہوں۔"

اورنگ زیب قاسمی

ابھی موپساں کے ادبی کیریئر کا صحیح معنی میں آغاز بھی نہ ہوا تھا کہ ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے آخرش اس کی صلاحیتوں کو قبل از وقت تہس نہس کر دیا۔ موپساں عورتوں کا رسیا تھا اور ایام جوانی میں "مفتی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں" کے مصداق اسے زیادہ غرض نہ تھی کہ جس کے ساتھ داد عیش دے رہا ہے وہ کون ہے اور کیسی ہے۔ اس بے محابا نفس پرستی سے انجام کار اسے آتشک کا مرض لاحق ہو گیا جس کا ان دنوں کوئی قطعی علاج ممکن نہ تھا۔ اختلاج قلب کے عارضے سے دوچار ہونا پڑا، سر اور جسم کے بال گرنے لگے، بدن پر آبلوں سے مشابہ چھوٹے چھوٹے پھوڑے نکل آئے۔ جو علاج ہو سکتا تھا کیا گیا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ بال گرنے نہ صرف بند ہو گئے بلکہ دوبارہ اگ آئے اور پھر نہ گرے۔ اس کے علاوہ آتشک کی جو ظاہری علامات تھیں وہ بھی فرو ہو گئیں۔ لیکن درحقیقت آتشکی مادے نے جسم میں جابجا اپنے لئے پناہ گاہیں ڈھونڈلی تھیں اور گھات میں تھا کہ جسم کی دفاعی اہلیت کمزور ہو تو دوبارہ سر اٹھائے۔

۱۸۸۰ء میں موپساں نے اپنا پہلا افسانہ "بول دا سوئف" (چربی کا گولا) لکھا۔ جب اسے چند دوستوں کی محفل میں، جن میں زولا بھی تھا، سنایا گیا تو افسانہ ختم ہونے پر سامعین نے کھڑے ہو کر خراج تحسین پیش کیا۔ فلابیر نے موپساں کے نام خط میں لکھا: "بول دا سوئف ایک شاہکار ہے۔"

اس افسانے میں جو ندرت اور مستحکم بندش نظر آتی ہے وہ دو موضوعات کی کامیاب آمیزش کی مرہون منت ہے۔ اتفاق سے یہ دونوں موضوع موپساں کے لئے خاص معنویت کے حامل تھے یعنی اول تو ایک عورت کی تذلیل کی کہانی اور ساتھ ہی اس ذلت کی روداد جو فرانس کو جرمنی کے ہاتھوں شکست کھانے پر اٹھانی پڑی تھی۔ "بول دا سوئف" کو آسانی سے طبقاتی تنقید کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن معاملہ اتنا سادہ نہیں۔ یوں تو موپساں کہیں بھی متوسط طبقے کے نمائندوں کو بخشنے پر آمادہ نظر نہیں آتا لیکن ان پر لعن طعن کرتے رہنا اس کا مقصد نہ تھا۔ اصل اعتراض اسے بعض رویوں کے دوغلے پن پر تھا جو دوسرے طبقوں کی بہ نسبت متوسط طبقے میں زیادہ بار پا چکے تھے۔ موپساں ٹیپ ٹاپ کے ان رنگین پردوں کو نوچ پھینکنے پر تلا رہتا تھا جو ان پر خود غلط اور ظاہر پرست لوگوں نے اپنی اصلیت کو چھپانے کے لئے اپنے اردگرد تان رکھے تھے۔ اس کے بہترین افسانے ایسے ہی انسانوں کے بارے میں ہیں جن کی گھسی پٹی، کھوکھلی شرافت کا مقصد کل اتنا تھا کہ خود بھی جھوٹ پر قائم زندگی گزاریں اور دوسروں کو بھی دھوکا دیتے رہیں۔

موپساں کی ادبی زندگی کی اس شان دار طریقے سے ابتدا ہوئی ہی تھی کہ فلابیر کا اچانک انتقال ہو گیا۔ شاید موپساں کی حد تک فلابیر کے ذمے صرف اتنا ہی کام تھا کہ اپنی دقیقہ رسی اور باریک خیالی کی مدد سے ہونہار افسانہ نگار کو راہ راست پر لگا دے۔

"بول دا سوئف" کے حوالے سے جو شہرت موپساں کے حصے میں آئی اس کے بعد صحافت کی دنیا میں قدم رکھنا کیا مشکل تھا۔ مئی ۱۸۸۰ء میں اس نے بحریہ کی وزارت میں کام کرنا چھوڑ دیا مگر ازراہ احتیاط استعفیٰ دینے کے بجائے طویل رخصت پر چلا گیا۔ دو سال تو اہل وزارت نے صبر کیا، پھر تنگ آ کر چھٹی منسوخ کر دی۔ یوں موپساں کی سرکاری ملازمت کا جھنجھٹ ختم ہوا۔

قلم تو رواں تھا ہی، موپساں نے اخباری مضامین کا جھاڑ باندھ دیا۔ دو سال تک کوئی ہفتہ ایسا نہ گزرا جس میں اس کے قلم سے کوئی تحریر سامنے نہ آئی ہو۔ طرہ یہ کہ وہ بیک وقت دو اخباروں میں لکھ رہا تھا۔ البتہ یہ

استادی ضرور کی کہ ایک اخبار میں قلمی نام سے لکھا۔ شاید یہ خیال آیا ہو کہ ہر جگہ اپنے ہی نام سے لکھنے کا تو پڑھنے والے جلد اکتاجائیں گے۔ موضوعات کی کوئی قید نہ تھی۔ جو بندھ گیا سوموتی: فلابیر اور دوسری ادبی شخصیات' نئی پرانی کتابیں' سیر و سفر' سیاسیات' معاشرہ' خواتین' طنز و مزاح۔ موپساں نے ان اخباری مضامین سے دہرا فائدہ اٹھایا۔ پہلے اخبار میں کسی واقعے کو حقیقت پسندانہ انداز میں رقم کرتا۔ پھر اس میں نئی نئی تفصیلات بڑھاتا اور کہیں زیادہ جان دار نثر میں قلم بند کرکے افسانے کی شکل دے دیتا۔

لیکن موپساں کی قسمت میں چین نہ تھا۔ ایک طرف شہرت کا یہ عالم' دوسری طرف درد سر کا عارضہ لاحق۔ سر کے اس درد سے آخر تک چھٹکارا نہ ہوا۔ درد وقفے وقفے سے آ دبوچتا اور موپساں کو زندگی وبال معلوم ہونے لگتی۔ ڈاکٹروں کی رائے میں سر کا یہ درد آتشک کی علامات میں سے تھا اور بظاہر اس موذی بیماری سے اس کا دماغ سب سے زیادہ متاثر ہو رہا تھا۔ اس کے بعد سے موپساں کو ایتھر سونگھنے کی لت پڑ گئی۔ ابتداء میں تو ایتھر صرف اس لئے سونگھتا تھا کہ درد سے آرام ملے مگر رفتہ رفتہ اسے ایتھر کے تسکین بخش اور واہمہ آفریں اثرات سے مزہ آنے لگا۔

موپساں کے افسانوں کا پہلا مجموعہ (La Maison Tellier) کے عنوان سے مئی ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا۔ ناقدین اور قارئین نے یک زبان ہو کر اسے سراہا۔ مجموعہ فروخت بھی خوب ہوا اور دو سال میں گیارہ ایڈیشن چھپے۔ تاہم بعض نقادوں اور پڑھنے والوں کو یہ گلہ تھا کہ افسانوں میں نچلے طبقے کی زندگی سے زیادہ اعتنا کیا گیا ہے۔ ایک نقاد نے رعونت سے فرمایا: "میں سمجھتا ہوں کہ موپساں کا ادبی ضمیر دس سال بعد اس پر پشیمان ہو گا کہ ایسی گھناؤنی کتاب کیوں چھپوائی۔"

مجموعہ شائع ہونے کے دو ماہ بعد موپساں سیاحت کی غرض سے الجزائر چلا گیا جو فرانسیسی نو آبادی تھا۔ افریقہ سے واپس آیا تو روس سے ایک خط اس کا منتظر تھا۔ ترگنیف نے لکھا تھا: "تمہارے نام سے روس میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ تمہارا جتنا کام ترجمہ ہو سکتا تھا ہم نے روسی میں ترجمہ کر دیا ہے۔"

اب اخباری تقاضے پورے کرنے کے لئے یا ان اخباروں میں سے' جن میں اس کی تحریریں شائع ہوتی تھیں' ایک کے مزاج کو مد نظر رکھ کر موپساں نے ہلکے' چھچھلے' ظریفانہ اور قدرے شوخ افسانے لکھنے شروع کئے۔ جس طرح کی شوخی کا سہارا لیا گیا تھا اسے صاف صاف فحش کہنا تو مشکل ہے مگر اس نے تو لیے چٹکلے چن کر برتتے وقت موپساں کی نیت بخیر نہیں تھی۔ ان افسانوں کا تانا بانا کسی ایک واقعے کے گرد بنا جاتا تھا۔ بہت جلد یہ نیا' ہلکا پھلکا اسلوب موپساں کے مزاج پر حاوی آ گیا۔ وہ اسے ان افسانوں میں بھی بروئے کار لانے لگا جو فی الاصل شوخ یا رنگین نہیں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اخبار کے صفحوں پر چھوٹے موٹے طربیہ یا المیہ افسانوں یا ہر طرح کے طنز و مزاح کے نمونوں کے انبار لگ گئے۔ فلابیر کی دلی تمنا تھی کہ موپساں "بول دا سوئف" جیسے افسانے لکھتا رہے۔ دس پندرہ افسانے تو اس نے بے شک اپنے استاد کی ہدایات کے عین مطابق تحریر کئے لیکن بہت سے ایسے بھی تحریر کئے جن پر فلابیر جیسا دقت پسند مصنف ہرگز صاد نہ کرتا۔

موپساں کے بہت سے افسانوں کا خاص کردار وہ شوہر ہے جس کی بیوی چوری چھپے چھنالے سے باز نہیں آتی۔ میاں ذلیل و خوار ہو کر لوگوں میں گھومتا ہے صاف ظاہر ہے کہ اس طرح کے افسانے لکھ کر اس بدسلوکی کا حساب بے باق کرنا مقصود تھا جس کا نشانہ لاور بنتی رہی تھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ ماں کی بدنصیبی پر آنسو

اورنگ زیب قاسمی

بہانے کے بجائے موپساں نے شوہروں کا گن گن کر تختہ کر دیا۔ چنانچہ موپساں کے افسانوں میں شاید ہی کوئی والد بزرگوار ایسے ملیں گے جن کی کسی نہ کسی طور شامت نہ آئی رہتی ہو۔ رہ گئے شوہر تو انہیں بالعموم وحش بہائم صفت' چغد' گل تھتھو اور مخبول دکھایا گیا ہے اور ان کا دیوث ہونا تو خیر طے سمجھئے۔ شاید اسی خوف سے موپساں نے شادی نہیں کی۔ سوچتا ہو گا کہ بیوی کوئی ہو' ہوا تو مجھے بھی چونا لگا کر دم لے گی۔

موپساں کا پہلا ناول (Une Vie) ۱۸۸۳ء میں اخبار میں قسط وار شائع ہوا۔ چند واقعات قارئین کو جانے پہچانے لگے کہ انہیں وہ اسی اخبار میں پہلے ہی چھوٹے چھوٹے ماجروں کی صورت میں پڑھ چکے تھے۔ اب ان بظاہر الگ تھلگ واقعات کو چابک دستی سے ناول کے فریم میں بن دیا گیا تھا۔ تھوڑی سی بدمزگی اس وقت پیدا ہوئی جب ایک نقاد نے تبصرہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ مجموعی طور پر یہ ناول ایسا نہیں ہے جسے پڑھنے کی اجازت کنبے کے تمام افراد کو دی جاسکتی ہو۔ یہ تاثر عام ہوا کہ ناول مخرب اخلاق ہے تو آشیت نامی فرم نے جو کتابیں شائع بھی کرتی تھی اور فروخت بھی اور جس کے پاس پورے فرانس میں ریلوے بک سٹالوں کا ٹھیکا تھا' اسے رکھنے سے انکار کر دیا۔ اس من مانی کے خلاف موپساں نے چیمبر آف ڈیپٹیز (آئین ساز اسمبلی) میں درخواست داغ دی۔ عرضداشت پر بحث ہوئی لیکن چیمبر نے بھاری اکثریت سے فیصلہ کیا کہ وہ اس معاملے میں دخل نہیں دے گا۔ عین ممکن ہے کہ مخالفانہ تبصرے' آشیت کی کاروائی اور چیمبر میں بحث مباحثے سے موپساں فائدے میں رہا ہو اور اس کا ناول زیادہ پڑھا گیا ہو۔ سب جانتے ہیں کہ جس کتاب کو برا کہا جائے اور اس پر کسی قسم کی پابندی عائد کی جائے اس کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔

ناول کے بارے میں تالستائی نے لکھا: "کاپا" (Les Miserables) کے بعد بہترین فرانسیسی ناول۔ موپساں سنجیدہ شخص ہے جس کی نظر زندگی کی گہرائیوں میں دور تک پہنچی ہے۔" اس ناول کے لئے موپساں کو آٹھ ہزار سونے کے فرانک ملے۔ آج کل کے حساب سے یہ تقریباً نو لاکھ روپیہ بنے گا۔ یہ صرف اخبار سے ملنے والی رائلٹی تھی۔ کتاب کی کتنی رائلٹی ملی' اس کا علم نہیں۔ اخبار سے اسے طویل افسانے کے کم و بیش پندرہ سو فرانک اور مختصر مضمون کے پانچ سو فرانک ملتے تھے۔ موپساں ہر ہفتے کچھ نہ کچھ لکھتا تھا۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بڑے مزے کی زندگی گزار رہا تھا۔

۱۸۸۳ء میں اس نے "ہار" نامی افسانہ لکھا جسے دنیا کے چند مشہور ترین افسانوں میں سے ایک سمجھا جانا چاہیے۔ "ہار" میں کئی باتیں ایسی ہیں جو قرین قیاس نہیں لیکن اسے اتنی ہنر مندی سے اور اتنے دلنشین پیرایے میں تحریر کیا گیا ہے کہ نقائص کی طرف بالعموم خیال نہیں جاتا۔ شاید ہی کوئی عام قاری ہو جسے افسانے کے چونکا دینے والے اختتام نے جھنجھوڑ نہ ڈالا ہو۔ غیر ادبی قاری نے "ہار" کو عموماً ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے: "یہ افسانہ لکھنا نہیں چاہیے تھا۔ اسے پڑھ کر جی اتنا برا ہوتا ہے۔" حقیقت میں یہ کم نہیں تعریف ہے۔

بہرصورت "ہار" کے اتنا زیادہ مقبول ہونے سے موپساں کی شہرت کو الٹا نقصان پہنچا۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ افسانہ چونکہ عوام الناس نے بہت پسند کیا ہے اس لئے موپساں صرف ادنیٰ درجے کے قارئین کے لئے لکھنے والوں میں ہے۔ باشعور قاری کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں۔ یہ مفروضہ کوئی وزن نہیں رکھتا۔ "ہار" کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ بیشتر انسانوں کے لئے دکھاوا اور ٹیپ ٹاپ ہی سب کچھ ہے خواہ دھوکے دینے اور

دھوکے کھاتے رہنے سے ان کی اور دوسروں کی زندگی اجیرن کیوں نہ ہو جائے۔ نام و نمود کے چسکے سے بھی سیری نہیں ہوتی۔ یہ نمود پسندی تھی جس نے مادام لوازیل کو "ہار عاریتاً" لینے پر آمادہ کیا۔ ہار کی ظاہری شکل صورت سے دھوکا کھا کر وہ اسے بہت قیمتی سمجھ بیٹھی۔ مادام فورستئے اپنی سہیلی کو بتا سکتی تھی کہ ہار بالکل معمولی ہے۔ مگر وہ بھی اپنا بھرم قائم رکھنا چاہتی تھی۔ اس بات سے اس کی شان بڑھتی تھی کہ سہیلی ہار کے ہیروں کو اصلی سمجھ رہی ہے۔ ہار گم کرنے کے بعد مادام لوازیل ایک بار پھر جھوٹی آن بان کی خاطر اپنی بے پروائی پر پردہ ڈالے رکھتی ہے۔ حقیقت اس وقت منکشف ہوتی ہے جب کوئی تلافی ممکن نہیں۔ جو صدمہ مادام لوازیل پر گزرا شاید اسی طرح کے دھچکے سے وہ سیاسی کارکن بھی دوچار ہوتے ہوں گے جو کسی سیاسی عقیدے یا نظریے کی خاطر اپنی زندگی برباد کر دیتے ہیں اور آخر الامر ان پر عقدہ کھلتا ہے کہ جسے تریاق سمجھے آئے تھے وہ تو کوڑی کا مال بھی نہیں۔

اندازے کے مطابق ۱۸۸۴ء میں موپساں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے چھپنے والے صفحوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار تھی۔ ان میں سے ہزار صفحے افسانوں کے تھے۔ اسی سال اس نے اپنا دوسرا اہم ناول (Bel Ami) لکھا "ئی ویت" نامی ناولٹ بھی اسی سال کی یادگار ہے۔ مرکزی کردار ایک طوائف کی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی ہے جسے ماں کے گھر میں لکھنے پڑھنے کے سوا کچھ کام نہیں۔ اٹھارہ برس کی ہونے پر آنکھوں سے پردہ اٹھتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ معاشرے میں اس کا کیا مقام ہے۔ یہ بھی عورت کی تذلیل کی روداد ہے۔ سماج کی دھتکاری ہوئی عورت کے بارے میں لکھتے ہوئے موپساں نے پھر فن کی بلندیوں کو چھو لیا۔

موپساں کے افسانوی سفر کا اگلا سنگ میل (Le Horla) تھا۔ یہ ایک ہراس میں مبتلا جنونی کی کہانی ہے جس نے ایک بد روح سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنے چہیتے گھر کو نذر آتش کر دیا۔ یہ افسانہ بھی "ہار" سے کم مشہور نہیں لیکن زیادہ طاقت کا حامل ہے۔ دہشت ناکی کی کیفیت کو ابھار کرنے کے لئے زبان و بیان کی باریکیوں سے خاص طور پر کام لیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ترجمہ ہونے کی صورت میں افسانے کی اثر پذیری ادھوری رہ جاتی ہے۔ ایک سطح پر یہ افسانہ موپساں کے ذہنی اختلال کی تصویر ہے۔ افسانہ لکھنے سے بہت پہلے موپساں نے ایک دوست کو بتایا تھا: " ہر بار جب میں گھر میں قدم رکھتا ہوں اپنے ہم زاد سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ دروازہ کھولتا ہوں اور میری جو آرام کرسی ہے وہ اس پر بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ اس تجربے سے گزرتے ہوئے بھی مجھے پتا ہوتا ہے کہ یہ فریب نظر ہے۔" ممکن ہے موپساں نے یہ بات دوست سے مذاق میں کہی ہو کیوں کہ اپنی حرکتوں اور باتوں سے لوگوں کو چونکانے کا شوق اسے لڑکپن سے تھا۔

موپساں کی ذہنی حالت کیسی ہی سہی ابھی اتنی نہ بگڑی تھی کہ وہ اچھا نہ لکھ سکتا۔ اس کا بین ثبوت "پیئر اور ژیاں" نامی مختصر ناول ہے جو موپساں کی غالباً سب سے عمدہ تصنیف ہے اور جسے ہنری جیمز نے بے داغ قرار دیا تھا۔ البتہ پہلے کی طرح سینکڑوں افسانے اور خاکے لکھنا اب اس کی بساط سے باہر تھا۔ ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۸ء کے درمیان 'یعنی چھ برسوں میں ' اس نے تقریباً ڈھائی سو افسانے لکھے تھے۔ اس کے برعکس ۱۸۸۸ء میں 'جس سال " پیئر اور ژیاں " شائع ہوا' اس نے صرف چھ افسانے لکھے۔ مضمون ایک بھی نہ لکھ سکا۔ اور یہ افسانے بھی اس کے بہتر کام میں شمار نہیں کئے جاسکتے۔

اسی سال ایک سخت صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ چھوٹا بھائی 'اروے ' خطرناک حد تک پاگل ہو گیا۔ اصل

اورنگ زیب قاسمی

میں اسے بھی جوانی میں آتشک کا عارضہ ہو گیا تھا۔ بیماری نے سب سے زیادہ اثر دماغ پر مرتب کیا اور اروے کو کسی کام کا نہ چھوڑا۔ دیوانگی کے عالم میں اس نے بیوی کا گلا گھونٹ کر قتل کرنا چاہا۔ اسے پاگل خانے میں داخل کرانا پڑا۔ دو سال سے بھی کچھ کم عرصے میں وہ فوت ہو گیا۔

موپساں کے برے دن آگئے تھے۔ کہاں تو وہ فلابیر جیسے نابغہ روزگار کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتا تھا کہاں نوبت یہ آگئی کہ اپنے ایک دوست پول بورژے کے نقش قدم پر چلنے لگا۔ بورژے معمولی قسم کا نویسندہ تھا جس کی رائے میں معاشرے کا صرف بالائی طبقہ ہی ادب کا موضوع بننے کا مستحق ہے۔ چنانچہ اس کے بہکانے میں آکر موپساں نے بھی دو ناول اونچی سوسائٹی کے بارے میں لکھے اور انہیں پڑھ کر موپساں کے قلم کا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ۱۸۸۹ء میں بھی اس کے صرف چھ افسانے سامنے آئے۔ ان میں بھی وہ معیار کی کوئی سطح برقرار نہ رکھ سکا۔ ایک نیا ناول بھی لکھنا شروع کیا مگر پچاس صفحے لکھ کر قلم رکھ دیا۔ ان صفحات کو پڑھ کر خیال آتا ہے کہ اگر موپساں یہ ناول مکمل کر سکتا تو خاصے کی چیز ہوتا۔

۱۸۹۲ء میں نئے سال کے پہلے دن موپساں نے اپنے گلے پر استرا پھیر لیا۔ خود کشی کی یہ کوشش ناکام رہی۔ ڈاکٹر نے بروقت پہنچ کر زخم سی دیا لیکن اب اس میں کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ موپساں پاگل ہو چکا ہے۔ اسے جکڑ جاکٹ پہنا کر پیرس لے جایا گیا۔ یہ خاص طرح کا جاکٹ ہوتا ہے جو متشدد جنونیوں کو پہنا دیا جاتا ہے تاکہ ہل جل نہ سکیں۔ اخباروں کی بن آئی۔ موپساں کی دیوانگی کی خبریں نمک مرچ لگا کر چھاپی گئیں۔ پاگل خانے کے سوا اب اس کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہاں پڑا پڑا وہ سسکتا رہا۔ ۶ جولائی ۱۸۹۳ء کو موت آئی۔ ماں ابھی زندہ تھی۔

آخر میں اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ موپساں بہت عمدہ نثر لکھتا ہے اور اس کی نثر کے اعلیٰ ترین نمونوں پر شاعری کا گمان ہوتا ہے۔ مترجم موپساں کی اس خصوصیت کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتے۔ چنانچہ جب ہم موپساں کو ترجمے میں پڑھتے ہیں تو اس کی تحریر کے جوہر سے محروم رہتے ہیں اور بسا اوقات اسے ادھوری کی قسم کا 'مگر قدرے بہتر' افسانہ نگار سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ایک فاش غلطی ہے۔

موپساں کی کلیات کا ایک امریکی ایڈیشن ایسا بھی ہے جو جعل سازی کے ذیل میں آتا ہے۔ اس میں شامل افسانوں میں بیشتر ایسے ہیں جو موپساں کے لکھے ہوئے ہی نہیں۔ موپساں کا انگریزی سے ترجمہ کرنے والوں کو احتیاطاً (Francis Steegmuller) کی کتاب " موپساں " (جس پر مندرجہ بالا سوانح مبنی ہے) دیکھ لینی چاہیے جس میں ان جعلی افسانوں کی مکمل فہرست درج ہے۔

("سویرا" لاہور)

داستان سرائے

اورنگ زیب قاسمی

آصف فرخی

الرجی

ایک طرف کچھ لوگ اور کچھ لوگ دوسری طرف۔ کمیٹی کمیٹی۔ ضابطوں اور شقوں کی پیدا کردہ' فائلوں اور جمائیوں سے بھری ہوئی کارروائی اور رپورٹوں کے پلندے۔ سکوں کی ڈھیری کی طرح جمع ہوتے ہوئے گھنٹے' منٹ اور سیکنڈ اوب اور اونگھ پر گھسٹتی ہوئی' اس پار سے لڑکھڑاتی' آتی ہوئی کمیٹی۔ اب کہیں جا کر میٹنگ زور پکڑ رہی تھی۔ میرے سامنے فائل کھلی ہوئی تھی۔ میری کرسی بے آرام تھی۔ اس کی پشت اور نشست پر ریگزین منڈھی ہوئی تھی' جس پر رگڑ لگنے سے آواز ہوتی تھی۔ اس وجہ سے پہلو بھی نہیں بدل رہا تھا۔ ایسا لگا کہ کرسی کھنچ کر لکڑی کا ڈبا بن گئی۔ سامنے کھلی فائل سے سارے کے سارے لفظ اڑ گئے۔ میرے سر نے جھونک کھائی۔ سر کو جھٹکا لگتے ہی اونگھ کا کچا تار ٹوٹ گیا۔ میں نے کرسی پر پہلو بدلا۔ کرسی چرچرائی۔ دزدیدہ نگاہ کی کہ کسی نے مجھے اونگھتے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا۔ کوئی بھی میری جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اچھا ہوا بچت ہو گئی۔ ورنہ میری غائب دماغی پکڑی جاتی اور مجھے خفت اٹھانی پڑتی۔ اب جھپکی نہیں آنے دوں گا۔ پچھلی میٹنگ کی روداد آج کے ایجنڈا کی فوٹو کاپی کے ساتھ پن سے منسلک ہوئی سامنے رکھی تھی۔ میں نے کاغذ اٹھا لیا اور بے دھیانی میں انگوٹھے سے پن کی نوک ٹیڑھی کر کے اسے نکالنے لگا۔ دونوں کاغذ الگ ہو گئے اور پن کی سیدھی نوک ناخن کے نیچے کے گوشت میں چبھ گئی۔ میں نے زبان دانتوں میں دبالی۔ تکلیف کی حیرت کے ایک لمحے کے بعد میں دوبارہ سرا پکڑنے لگا کہ کمیٹی کی میٹنگ اب کہاں تک پہنچی۔

قریشی صاحب میں میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی کرسی کیسی ہے میں نے سوچا۔ بھٹکتے ہوئے ذہن کو متوجہ رکھنے کے لئے میں نے ان کی طرف دیکھا۔ پڑھنے کی عینک ان کی ناک پر ٹکی ہوئی تھی۔ سیاہ فریم کا درمیانی حصہ' ناک کی چوڑی ہڈی کو پوری طرح گھیر نہیں پایا تھا۔ انہوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ آدھے کٹے ہوئے شیشوں میں سے جھانکتی ہوئی ان کی آنکھیں دو حصوں میں بٹی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اس وقت بھی وہی بول رہے تھے۔

" اب کی بار مختلف ہونا چاہیے۔ وہ نہ ہو جو ہمیشہ ہوتا ہے کہ ایک کمیٹی بٹھا دی گئی' اعلا اختیارات کی حامل بھی ہو گئی اور قومی سطح کی نمائندہ بھی اور وہی لے دے کے ایک رپورٹ تیار کر دی جس پر محکمے کی کسی الماری میں دھول کی تہیں چڑھتی جائیں گی اب کی بار کام ہو اور نتیجہ نکلے۔"

ان کی بات مکمل کرنے کے لئے دررانی صاحب بول پڑے۔ " ہم بھی اس میٹنگ میں یہ سوچ کر آئے ہیں کہ اپنے سامنے ایک ڈھانچہ ساتھ کھڑا کر دائیں ہیں۔ اب خاص طور پر اتنی دور سے آئے ہیں اور پھر ہم اس
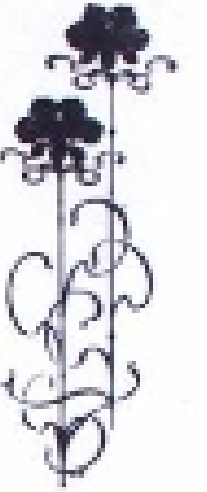
شعبے سے وابستہ سینئر لوگ ہیں ہمیں یہ قدم تو اٹھانا ہے۔"

درانی صاحب کی عینک ان کی آنکھوں کے آگے آ رہی تھی عینک کے شیشے گول تھے' نظر کی عینک ہوگی۔ عینک کے اندر آنکھوں کی پتلیاں سفید ہو رہی تھیں۔ موتیا بند کا پانی اتر رہا ہوگا۔ اگر اس کمیٹی میں یہ سب واقعی ہو جائے۔

قریشی صاحب نے سیدھے ہاتھ میں چھڑی اٹھائی۔ اخروٹ کی لکڑی کی بید' جو پہاڑی مقامات سے لوگ سوغات کے طور پر لاتے ہیں اور اس سے وہ بورڈ پر چارٹوں سے نصب شکل کے مختلف حصوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

"یہ نیا اورگینو گرام ہے جس پر آپ کی رائے طلب کی جا رہی ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس میں رپورٹنگ ریلیشن شپز بالکل واضح ہیں جس کی وجہ سے تمام ملازمین کی نگرانی اور جواب طلبی میں سہولت ہو جائے گی۔ ایک دفعہ مینیجمنٹ کا طریقہ متعین ہو جائے تو پھر ہم یہ دیکھ لیں گے کہ اس آرگنائزیشن کے اغراض و مقاصد کس طرح پورے ہو سکتے ہیں اور ہمیں قومی سطح پر ٹارگٹ کیا رکھنا چاہیے۔ اس لئے میری تجویز یہ ہے۔"

اس وقت مجھے چھینک آگئی۔ قریشی صاحب ایک دم رک گئے' لمحہ بھر کے لئے اپنی تنی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا' پھر وہ تجویز کمیٹی کے سامنے دہرانے لگے۔ بولتے بولتے ان کا چہرہ سوجنے لگا' ذرا تھمیں گی اور پانی بھرے آبلے کی طرح پھوٹ جائے گا۔ ناک' کان' ہونٹ' تقسیم شدہ آنکھیں نہیں' نہیں یہ کمیٹی ہے۔ مجھے یہاں اونگھنا نہیں چاہیے ان کا چہرہ نہیں پھول رہا۔ میرا سر گھوم رہا ہے نیند کے جھونکے کے ساتھ ہر چیز آگے ہوتی ہے' پھر پیچھے ہٹتی ہے۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر جماہی تو روک لوں' مگر دماغ ہی سویا جا رہا ہے۔ سب چیزیں دھندلی ہو رہی ہیں اور گول گول ایک رخ سے دھوپ' کاغذ تحمل کی سطح پر پڑ رہی ہے' جس سے اتنا حصہ چمکنے لگا ہے اس چمک کا سامنا کرنا مشکل ہے آنکھیں مندنے لگتی ہیں اور کھڑکی کے باہر پیڑ ہیں ہرے بھرے پیڑوں کی باترتیب قطار ان کو سیدھ میں لگایا گیا ہوگا اور ایک آواز نہیں۔ باوقار خاموشی سے پتوں کا بوجھ اٹھائے کھڑے ہیں۔ یہ جہاں ہیں' میں تو وہاں ہونا چاہتا ہوں۔ ان کے ہرے بھرے پیکر میں دھوپ جھلملا رہی ہے پتوں کی ہریالی بتا رہی ہے کہ انہیں نکلے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ میں کھڑکی کے باہر پیڑوں کی قطار کو دیکھے جا رہا ہوں اور میٹنگ پھر کہیں پیچھے ہٹ گئی ہے۔ نیند کے جھونکے ہرے بھرے ہیں موسم کی مناسبت سے ان میں نئے کورے پتے پھوٹنے پڑ رہے ہیں۔

صبح بھی یہی محسوس ہوا تھا۔ میٹنگ میں آنے کو میرا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ ائیرپورٹ پر اترنے کے ذرا دیر بعد ہی پتہ چل گیا تھا کہ موسم بہار ہوا میں ہے۔ میں نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر لی' کوٹ اتار کر ہاتھ پر لٹکایا اور دو چار لمبے لمبے سانس بھرے۔ ایک خنک تازگی ہوا میں گھلی ہوئی تھی۔ ائیرپورٹ سے شہر کے راستے میں گھاس کے تختے سرسبز تھے۔ تھوڑے دن پہلے تک جو درخت خشک اور سوکھے کھڑے تھے' ان میں نئے پتوں کا ہیولیٰ گہرے' گیلے رنگ اختیار کر رہا تھا۔ گھاس کے ساتھ پھول کھلے ہوئے تھے اور کتنے ہی درختوں پر بور سا آیا ہوا تھا۔ میں نے گاڑی میں سے درانی صاحب کو درخت دکھائے تھے۔ وہ میرے ساتھ ہی کراچی سے آئے تھے۔ میں لمبے لمبے سانس لے کر اس تازگی کو اپنے پھیپھڑوں میں اتار لینا چاہتا تھا۔

اورنگ زیب قاسمی

"ہم کراچی والوں کے لئے تو ذرا سی گھاس اور سبزہ ہی مستی کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں۔" وہ کہنے لگے۔ "ہمارے شہر میں سارے سال ایک ہی موسم رہتا ہے۔ نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے۔"

گھسی پٹی معمولی باتیں میں نے بیزار ہو کر منہ کھڑکی کی طرف پھیر لیا۔ تو یہ موسم بہار ہے میرا جی چاہا کہ گھاس پر ننگے پاؤں دوڑتا جاؤں۔ جوتے میں بند پاؤں جیسے تھک گئے ہوں اور انہیں آرام کی ضرورت ہو۔ مگر ایک پیالی چائے پینے کے بعد درانی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر صبح کی میٹنگ کے لئے بریفنگ پیپر کا ڈرافٹ تیار کرنا تھا۔ کام پورا ہوتے ہوتے تک یہ حالت ہو گئی جیسے دماغ گھنچل ہو گیا ہو۔

صبح کے وقت بھی نیند کا خمار اتنی دیر تک طاری رہا کہ بستر سے اٹھنے کا جی نہیں چاہتا تھا۔ میٹنگ میں جانا ضروری تھا' اس لئے کہ یہاں آنے جانے کا کرایہ حلال کرنا ہے جو دفتر والوں نے دیا ہے۔ گیسٹ ہاؤس کی کھڑکی سے جھانکا تو گھاس اور پیڑ نظر آئے جیسے مجھے بلا رہے ہوں۔ ان کے بلاوے پر کان نہ دھر سکا اس لئے کہ ابھی شیو کرنا باقی تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے گاڑی درانی صاحب کو اور مجھے لینے آنے والی تھی۔ میں نے پیڑوں کی طرف دیکھا۔ پھر غسل خانے میں چلا گیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر میٹنگ کے لئے روانہ ہوئے تو دفتر سے ذرا پہلے ان ہی پیڑوں کا کنج نظر آیا۔ میں نے گاڑی رکوائی اور درانی صاحب سے کہا آپ چلیے میں ابھی آیا' اور اس پیڑ کی طرف کھنچا چلا گیا۔ صبح کی ہوا گھاس میں سرسراتی تھی۔ ہوا کی داب سے گھاس کی پتیاں جھکنے لگتیں اور پھر سیدھی ہو جاتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ زمین انگڑائی لے رہی ہے۔ یہ ان کھلے قطعوں میں سے ایک تھا جو شہر میں جابجا چھوڑ دیئے گئے ہیں' گھاس اور پیڑوں والی کھلی زمین جس کی وجہ سے شہر سانس لیتا ہے۔ ایسے بہت سے پیڑ میں نے ائیرپورٹ سے آتے وقت بھی دیکھے تھے۔ میں چلتا ہوا ان پیڑوں تک آ گیا۔ ایک پیڑ کے نیچے گھاس ذرا چھدری تھی۔ اس کی جڑوں نے ساری نمی کھینچ لی ہوگی' میں نے سوچا۔ اس کے تنے سے ٹیک لگا کر وہیں بیٹھ گیا۔ ایک لمحے کے لئے بے پایاں سکون کا احساس ہوا۔ نیچے جھکی ہوئی ایک ٹہنی سے ایک پتہ توڑ لیا اور بے دھیانی سے ہاتھوں میں اسے چر مرانے لگا۔ میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ دماغ بالکل خالی تھا۔ شاید وہ بھی پاؤں پسارے آرام کر رہا ہے۔ پتہ میں نے یوں ہی اچھال کر پھینک دیا۔ ہتھیلی سونگھی تو اس میں پتے کی بو بس گئی تھی۔ پیڑ کی ٹہنی سے کچا کچا بور توڑا اور ہتھیلی پر مسل کر دیکھا کہ یہ بو اس کی تو نہیں ہے۔ کئی بار سونگھنے پر بھی پتہ نہیں چلا۔ پیلا سفوف سا جھڑنے لگا' مگر میں نے کوٹ جھاڑنے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی۔ تیز قدموں سے میٹنگ کے لئے روانہ ہو گیا' کیوں کہ اندازہ ہو رہا تھا کہ درانی صاحب کی نظروں کا سامنا کرنے پڑے گا۔

میٹنگ میں آتو گیا' مگر توجہ قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ نیند سے آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ ایسا لگا تھا کہ آنکھوں سے حلق تک نیند گر رہی ہے' جس میں کہیں درانی صاحب بول رہے ہیں' کہیں قریشی صاحب' اور ایک اڑتی ہوئی اونگھ چاروں طرف چھائی جا رہی ہے۔

میں نے پھر توجہ دینے کی کوشش کی۔ چھینک ماری' رومال سے ناک پونچھی اور غور سے سننے لگا کہ کمیٹی کی بحث اب کہاں تک پہنچی۔ (باہر پیڑ لدے پھندے کھڑے ہیں' سرسبز شاداب' بورائے ہوئے) درانی صاحب برابر بولے جا رہے تھے۔

"یہ اسکیم آپ امپلی مینٹ تو لازمی طور پر کر ہی دیں گے۔ اس کے بعد پراونشل سینٹرز کس

مصرف کے رہ گئے؟ نہ لینے کے نہ دینے کے۔ سارے فنڈز بھی آپ فیڈرل سینٹر سے کنٹرول کر رہے ہیں اور گرانٹ کرنے کا اختیار بھی آپ کے ہاتھ میں رہا۔ ہمارے ذمے تو بس چوکیداروں، چپراسیوں کو تنخواہ بانٹنا رہ گیا۔"

قریشی صاحب نے مانگ نکالی ہوئی تھی، مگر بالوں کی جڑیں سفید تھیں۔ انہوں نے بولنے سے پہلے سیدھے ہاتھ سے سامنے کی لٹ سیدھی کی۔ "معاملہ فنڈز دینے کا نہیں ہے۔ فیڈرل سینٹر کو اتنا اختیار تو ملنا چاہیے۔ ورنہ کوالٹی کنٹرول کیسے ہوگا؟" انہوں نے چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا۔ ان کی بنی ہوئی آنکھوں کے دونوں حصے جڑ کر اسی وقت ایک ہو جاتے مگر وہ بولتے ہوئے آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ ان کی آنکھ میں شاید ذرا سا نقص تھا یا پھر شاید اس لئے کہ بحث کرنے والے کو نہ دیکھ سکیں اور درختوں کو بھی نہیں کھڑکی کے باہر سبزے کو بھی نہیں۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ کوالٹی کنٹرول، فیڈرل سطح سے کیوں ہو سکتا ہے۔ پراونشل سینٹر سے کیوں نہیں؟"

"نہیں، نہیں، درانی صاحب، میرا یہ مطلب نہیں۔"

"اور کیا بات ہے؟ جب تک انتظامی امور کا فیصلہ ڈی سنٹرلائز نہیں کا، دوسرے مراکز کا پوٹینشل ابھر کر نہیں آئے گا۔"

قریشی صاحب نے پھر وہی عینک لگائی۔ جناب عالی، "میں تو بس یہی کہہ رہا ہوں کہ جو بھی پروجیکٹ پروپوزل آئیں، پراونشل سنٹر ان کی اسکریننگ کر کے آگے فیڈرل سینٹر تک پہنچا دیں اور یہاں چھان پھٹک کر فیصلہ کر لیں۔ فنڈ دینے یا نہ دینے کا فیصلہ تو یہی کمیٹی کرے گی۔ ہم اور آپ۔ سمجھ رہے ہیں ناں میری بات کو؟"

"اوہو، جب سارے کے سارے پروپوزل آ رہے ہیں پراونشل سینٹرز سے تو ان کی گریڈنگ اور فنڈ دینے یا نہ دینے کا فیصلہ بھی وہیں ہونا چاہیے۔"

"مگر اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ ساری گرانٹ ادھر ادھر بانٹ دی جائے اور فیڈرل سینٹر کے پاس کچھ نہ رہے۔"

"تو آپ کو یہ منظور ہے کہ سارا کنٹرول آپ کے ہاتھ میں رہے اور پراونشل سینٹرز میں کوئی ڈیولپمنٹ نہ ہونے پائے؟"

مجھے دوبارہ چھینک آئی۔ قریشی صاحب نے کراہت بھرے انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں خود جھینپ سا گیا۔ اتنی سنجیدہ بحث میں بار بار چھینکنا، ناک 'سکنا'، اونگھتے رہنا۔ میں اٹھ کر باہر بھی تو نہیں جا سکتا تھا۔ دوبارہ میٹنگ کی کارروائی میں دلچسپی لینے کی کوشش کی۔ مگر اب کی نظریں میری جانب اس طرح سے اٹھ رہی تھیں کہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں غلط جگہ پر غلط آدمی ہوں۔ اب باہر کیسے نکلوں؟

قریشی صاحب اپنی بات کو درست ثابت کرنے کے لئے دلیل دیئے جا رہے تھے۔ کنٹرول، کرپشن، سسٹم کی خرابی، سخت گیر ڈسپلن کی ضرورت۔ میں نے تمام الفاظ سنے اور کوئی بھی میرے دماغ تک نہیں پہنچا۔ میں نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا اور مجھے پھر چھینک آگئی۔

"فنڈز کا معاملہ ہے، فیڈرل سنٹر سے نگرانی رکھنا پڑے گی۔ ہمارے سسٹم میں کرپشن۔" قریشی صاحب

اورنگ زیب قاسمی

ہوش میں آئے ہوئے تھے۔

"آپ بہتر مینجمنٹ کے لئے پلاننگ کیوں نہیں کرتے؟ آخر اس طرح ایڈہاک کام کب چلے گا؟" درانی صاحب بھی کم جوش میں نہیں تھے۔ بحث بے قابو جاری تھی۔ میں نے چاہا کہ میں بھی کچھ بولوں۔ منہ کھولا چھینک پھر آتے آتے رک گئی۔ گلے کی خراش تکلیف دہ ہوگئی۔

اب مجھے بولنا ہی تھا۔ "میرے خیال میں" یکایک میرے گلے میں گولہ سا پھنسا اور ناک سے توپ سی دغی۔ لگاتار چھینکیں   ایک کے بعد ایک آچھوں چھوں چھوں، 'سز' 'سز' سانس چڑھ گیا۔ میں ہانپنے لگا۔ پھر ایسا لگا کہ گلے پر کسی کی بھاری گرفت بڑھتی جا رہی ہے۔ سانس نہیں لیا جا رہا، دم گھٹ رہا ہے۔ میں نے گھبرا کر قریشی صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ عینک اتارے ہوئے میری طرف تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ میں یہ غور کئے بغیر نہ رہ سکا کہ ان کی دونوں آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ کمیٹی کی کارروائی رک چکی تھی۔ مجھے کچھ ہو رہا تھا۔ یہ محض نیند نہیں تھی۔ اس سے کہیں زیادہ مہلک اور اذیت رساں کیفیت تھی۔ یہ موت سی تھی۔ موت کی ابتدائی شکل، اس کے راستے میں پہلی منزل۔ ایک ایک سانس میرا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ دماغ سن ہوا جا رہا تھا اور گلا جیسے آنسوؤں سے رندھ جانے کے بعد بیٹھ گیا ہو۔ مگر اس میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ جن میں پیاس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ بے سدھ بدن پر نیند کا قابو کر رہا تھا اس کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا۔

ایک کرخت لہجے نے چونکایا۔ "کمال ہے ایسا اٹیک، اتنی شدید الرجی ان کو پہلے سے بھی سانس کی کوئی بیماری ہے، میرا مطلب ہے دمہ وغیرہ؟ اور کوئی ایسی عادت تو نہیں، میرا مطلب ہے اسموکنگ وغیرہ؟" میرے برابر کھڑا ہوا کوئی کہہ رہا تھا۔ میں نے خود کو نفی میں سر ہلاتے ہوئے پایا۔ یعنی اس حملے سے پہلے میری کوئی زندگی تھی۔ میں بے ہوش ہی ہوا ہوں کا فوت نہیں، اس لئے کہ میں قریشی صاحب کو اپنی طرف دیکھ کر بولتے ہوئے سن سکتا تھا۔

"ہم تو سمجھے تھے ہارٹ اٹیک ہوگیا اور بس اب گئے۔ یہ کہتے ہیں الرجی ہے ری ایکشن ہوگیا ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب ہیں۔ ان کو ایمرجنسی سے بلوایا گیا ہے۔ فوراً چلے آئے، خیریت ہوگئی نہ، نہ بولنے کی کوشش نہ کرو، لیٹے رہو، زور پڑے گا۔"

مگر اب میں بولے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ میرے ہونٹ ہلے، لفظ ادا نہیں ہوا۔ شاید آنکھوں سے ٹپک پڑا ہو، کیوں کہ ڈاکٹر صاحب سمجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ "ہائپر سنسی ٹیوٹی ری ایکشن ہے۔"

تو یہ زیادہ احساس ہونے کا صدمہ ہے، سوال شاید پورے چہرے پر پھیل گیا ہوگا کیوں کہ پھر جواب آگیا۔

"نہیں، حساس مزاج سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو امیون کریسس ہے۔" میری یہ جان لیوا اذیت اتنے گھمبیر اور ناقابل فہم الفاظ میں کیوں ڈھالی جا رہی ہے۔ اب مجھے احتجاج کرنا ہی تھا۔

"الرجی ہے؟ مگر وہ تو کسی چیز کی وجہ سے ہوتی ہے۔" میں نے ڈاکٹر کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا۔ "مجھے کس چیز سے ہو سکتی ہے؟"

"کسی بھی چیز سے، مٹی سے، ہوا سے، کیڑوں سے غالباً آپ کو پولن سے ہوئی ہے۔" ڈاکٹر کی بات میری سمجھ میں پوری طرح سے نہیں آئی۔

"پولن؟ یعنی وہ جو پیڑ پودوں سے جھڑتا ہے، پھول پتوں سے مگر میری اتنی عمر ہونے کو آئی، آج تک

تو۔"

"آپ شاید اس سے پہلے اس موسم میں یہاں نہیں آئے۔ بہار کے موسم کے ساتھ ہوا بدل جاتی ہے۔ اپریل میں بعض لوگوں کو ہو جاتی ہے۔ پولن کے ذرے ہوا کے ساتھ آتے ہیں' اور آپ کے تو آوٹ پر بھی ہیں۔ آپ تو خود۔" وہ رک کیوں گیا۔ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا؟ مجھے خود ہی اصرار کرنا پڑا۔

"پولن ایسا کون سا ہے؟ ان پیڑوں سے آیا ہوگا؟" مجھے یقین کرنے میں اب بھی تامل تھا۔ جس درخت کے پاس میں گیا تھا وہ اتنا ہرا بھرا تھا۔ ان چھوئی لڑکی کی طرح۔ ہاں انگریزی توت کے بہت درخت منگوا کر لگوائے گئے تھے شہر کی تعمیر کے وقت۔ پیپر ملبری' آپ جانتے ہیں؟ اس کے پولن سے ہو جاتا ہے۔"

"کیا مطلب کہ لگوائے گئے تھے؟" یعنی خاص طور پر؟ میرا ذہن اب بھی سوالوں میں بھٹک رہا تھا۔ "شہر کے تعمیر کے وقت؟"

درانی صاحب پھر مجھے سمجھانے لگے۔ "جب یہ شہر بسایا گیا اور فیڈرل کیپٹل یہاں منتقل ہوا تو لوگ اپنی خصلت اور مزاج کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے درخت بھی لے کر آئے۔ کھلی جگہوں میں یہ درخت لگوائے گئے اب یہ کون دیکھتا پھر تا کہ درخت کی خاصیت اور لوگوں کی خصلت میں کوئی گڑ بڑ تو نہیں ہوگی۔" قریشی صاحب کہہ رہے تھے۔ کمیٹی کے باقی ممبر بے چہرہ اور بے آواز تھے میں ان کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں درختوں کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ یہ ہرے بھرے درخت اس طرح کیسے کر سکتے تھے؟ میری سانس اب بھی مشکل سے آ رہی تھی۔

"درختوں کا کیا ہے' قریشی صاحب وہ تو اپنے حساب سے پھل پھول رہے ہیں۔ ری ایکشن والا مادہ تو لوگوں میں خود ہوتا ہے۔ الرجی والا پولن" قریشی صاحب میری طرف دیکھ کر کہنے لگے۔ انہوں نے عینک اتاری ہوئی تھی۔

کوئی اور صاحب بول اٹھے' جن کا مجھے نہ نام یاد ہے نہ شکل "کئی لوگ اس مہینے میں بیمار پڑ جاتے ہیں۔ منسٹری کو ہم نے پہلے ہی رپورٹ بھجوا دی ہے۔ یہ سارے درخت کاٹ دیئے جائیں گے۔"

ان کی بات سننا میرے لئے مشکل ہو گیا۔ کرسیاں ہٹا کر مجھے دفتر کے قالین پر لٹا دیا گیا۔ خالی سرنج پاس پڑی تھی۔ ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ اس نے اینٹی الرجک انجکشن لگا دیا ہے۔ بلڈ پریشر ناپنے کا آلہ میرے بازو پر بندھا ہوا تھا۔ ناک کے اوپر ایروسول رکھا ہوا تھا تاکہ دوا سانس کے ساتھ اندر جائے پھر بھی میں ہانپ رہا تھا۔ ہانپے جا رہا تھا۔ درخت کٹ رہے ہیں۔ شاید یہ شہر درختوں سے عاری ہو جائے گا۔ پھر کون سانس لے گا اور میرا کیا بنے گا۔ کیا سارے موسم یہ الرجی مجھے مبتلا رکھے گی یا میں اس پولن کا عادی ہو کہ الرجی سے آزاد ہو جاؤں گا؟ دونوں میں سے کون سی حالت زیادہ خراب ہے؟ قریشی صاحب عینک لگائے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے اوپر نیچے بنے ہوئے حصوں ٹوٹے دیدوں میں مجھے ہسپتال لے جایا رہا ہے۔ کھڑکی کے باہر درخت خاموش اور ساکت کھڑے ہیں' گھاس سرسراری ہے۔ اگر وہ انگڑائی تھی' تو یہ زمین کا الوداع ہے۔

("دریافت" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

اسد محمد خان

رکے ہوں ساون

لاتی بائی امیر گڑھ والی نے تقسیم کے فوراً بعد یہاں آکر نیپیئر روڈ کا یہ فلیٹ بسا لیا تھا۔ لاتی بائی اپنی ایک نوچی اور ایک لے پالک لڑکے کے ساتھ بمبئی کے بیلارڈ پیئر سے جہاز پر سوار ہوئی تھی اور جہاز سے اتر کے یہاں کیماڑی کے میول مینشن میں موتی سیٹھ شکار پوری کے فلیٹ میں پندرہ روز ٹھہری تھی۔

وہ ایسے ہی نہیں چل پڑی تھی بڑا مال لائی تھی۔ اسی لئے موتی سیٹھ کے مشورے سے اس نے نیپیئر روڈ پر چوراہے کا یہ فلیٹ خرید لیا پھر ایک شاگرد سے چار شاگردیں ہو گئیں اور وہ جم کے اپنی بیٹھک چلانے لگی۔ گلابی شیڈ والی یہ لائیں پنکھے' صوفہ سیٹ قالین' مخمل والے گاؤ تکیے۔ جو اب بکلائے ہوئے میلے میلے سے لگتے ہیں۔ لاتی نے اسی زمانے میں خریدے تھے۔

رنڈیوں' ڈیرے دارنیوں کے بارے میں افواہیں نہیں اڑا کرتیں۔ اسکینڈل افواہیں تو شریف زادیوں کا کھیوا ڈالنے کے لئے پھیلائی جاتی ہیں مگر عجیب بات تھی لاتی بائی کے بارے میں جاپانی روڈ پر اور شہر میں طرح طرح کی باتیں اڑی ہوئی تھیں۔

کوئی کہتا تھا اس کا اصل نام لیلا ہے کوئی کہتا تھا نہیں لیلی ہے اور یہ امیر گڑھ کے مہاراج کی درباری گائکا تھی' کوئی کہتا تھا بی "مہاراج نے بس ڈال رکھا تھا۔ اسے گانا وانا تو آتا نہیں' پنڈت کوکا کشمیری کے سب شاستر پڑھے بیٹھی تھی سمجھو علم مسری کی منتہی تھی' یہ لیلا ماتی اسی لئے تو مہاراج نے۔۔۔

یہ آخری بات دل کو لگتی تھی' کیوں کہ گانے والی آواز تو لاتی کی کبھی کسی نے سنی نہ تھی۔ خیر خواہوں نے مشہور کر دیا تھا کہ نو عمری میں کوئل کی طرح کوکتی تھی لاتی بائی مگر دشمنوں نے سیندور کھلا دیا بس بیٹھ گئی ہمیشہ کے لئے خود لاتی بائی نے یہ بات کبھی مان کے نہ دی کہ اسے سیندور کھلایا گیا تھا نہ کبھی اس نے یہ کہا کہ اسے سیندور نہیں کھلایا گیا تھا۔

پتا نہیں کس سن میں ایک بہت قریب کے آدمی نے جو اب زندہ بھی نہیں لاتی بائی سے گانے کی فرمائش کی تھی تو لاتی نے کہا تھا کہ ڈپٹی صاحب (قریب کا آدمی ڈی ایس پی ریٹائرڈ ہوا تھا) تو لاتی نے کہا تھا" ڈپٹی صاحب ہم ایک کے لئے گاتے تھے یا ایک لاکھ کے لئے اب نہ وہ ایک رہا نہ ایک لاکھ اب کیا گائیں۔ ہمارے تو بول بھی یہاں سمجھ نہ آئیں گے کسی کو۔"

مگر یہ سب چالاکی کی باتیں تھیں۔

لاڈی بائی کو گانے بجانے سے کیا ملتا جو چار مسہریاں چلانے میں یافت ہو جاتی تھی۔

گل بدن' لاجو' بیلا اور یاسمین ۔ ۔ وہ چار برس بعد لڑکیاں بدل جاتی ہوں گی' مگر چاروں نام یہی رہتے تھے۔ انہیں واجبی سا گانا سکھا دیا جاتا ہو گا تاکہ مجروں کی آڑ میں سب چلتا رہے۔

مختصر یہ کہ لاڈی بائی کی چار "شاگردیں" تھیں اور وہ لفڑا جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ سب اسے " لاڈی والا" کہتے تھے۔

سب مجھے لاڈی والا جاوید کہتے تھے۔

ہم لوگ جب یہاں آئے تھے اور لاڈی صاحب نے یہ فلیٹ خریدا تھا' اس وقت بہت ہوا تو میں سولھا سال کا ہوں گا۔

فلیٹ پر آنے والوں سے میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی مجھ سے کام کے لئے بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ نہ ہی مجھے کسی سے کچھ لینے کی اجازت تھی۔ لاڈی صاحب اس معاملے میں بہت سخت تھیں۔

پھر مجھے لوگوں میں بیٹھنے کا ڈھنگ آیا' بات کرنے کی تمیز آگئی ۔ ویسے میل جول میں نے کم ہی رکھا۔

بس ایک مظفر علی خاں تھے۔ بینک افسر' جن سے میری دوستی سی ہو گئی تھی۔ کبھی میں ان کے دفتر چلا جاتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مظفر علی خاں کوٹھے پر آتے ضرور تھے مگر تماش بین نہیں تھے۔ لاڈی صاحب کے "پرستار" تھے وہ۔ ان کی عمر اس وقت چوبیں پچیس سال ہو گی ۔ ۔ مجھ جیسی عمر کے ہوں گے۔

میں یہ قصہ اپنی یا لاڈی صاحب کی وجہ سے نہیں' مظفر علی خاں کی وجہ سے سنا رہا ہوں۔ بڑے دلیر آدمی تھے۔ پتا نہیں کہاں ہوں گے اب۔

مجھے یاد ہے پہلی بار وہ فلیٹ میں آئے تو دوپہر کا وقت تھا۔ خبر نہیں کیسے فلیٹ کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ لاڈی صاحب لاؤنج میں بڑے تخت پر گاؤ تکیہ اور مخمل غین لگائے ململ کی چادر گیلی کر کے پیروں پر ڈالے آرام سے پڑی کچھ گنگنا رہی تھیں کہ ایک خوب صورت جوان' سفید قمیض پر سرخ مخملی ٹائی باندھے' سرج کی کالی پتلون اور چمچماتے ہوئے بوٹ پہنے فلیٹ کے دروازے پر طبلہ سارنگی کے بیلو کہتا ہوا گھس آیا۔

لاڈی بولیں: "کیا وحشت ہے؟ کہاں گھسے آرہے ہو میاں؟"

یہ "میاں" مظفر علی خاں تھے۔ انہوں نے بڑھ کر لاڈی صاحب کے پیر چھوئے۔ لاڈی نے پیر سمیٹ لیے۔ وہ آنکھیں پھاڑے خاں صاحب کو دیکھے جا رہی تھیں۔

مظفر خاں ہنستی ہوئی آواز میں بولے: "بہت دن سے آپ کے درشن کرنا چاہتا تھا۔ آپ موسیقی کی تاج دار ہیں' بادشاہ ہیں اس فن کی۔"

لاڈی کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں بولیں ۔ "برخوردار' غلط جگہ آگئے ہو ۔ ۔ ۔ وہ ادھر نہیں رہتیں۔"

خان صاحب ہنس کر بولے ۔ "ہمارے لئے تو آپ ہی ملکہ موسیقی ہیں۔ اس علاقے میں تو بس آپ ہی کا حکم چلتا ہے' باقی سب آپ کی رعایا ہیں۔"

اس خوشامدانہ جھوٹ اور ڈھٹائی پر لاڈی ایک دم ہنس پڑیں۔ وہ ہنسیں تو مظفر علی خاں خود بھی ہنسنے لگے۔ بولے: "میڈم' ابھی سامنے بینک میں اسسٹنٹ منیجر ہو کر آیا ہوں۔ اس وقت آپ کا اکاؤنٹ مل جائے تو بہت اچھا ہے۔ کھاتا کھلوا لیجئے میری برانچ میں۔"

لاڈی صاحب انہیں دلچسپی سے دیکھتے ہوئے لب کاٹنے سے تنگ آگئی تھیں۔ ہنس کے کہنے لگیں: "برخوردار' ایسی کیا مصیبت پڑ گئی ہے جو اکونٹ کے لئے کوٹھے جھانکنا شروع کر دیئے؟"

بولے: "ایک حرام الدہر افسر لگ گیا ہے۔ کہتا ہے اسسٹنٹ سے پکا منیجر اس وقت تک نہیں بننے دوں گا جب تک اتنی رقم کے اتنے اتنے کھاتے نہیں کھلواؤ گے۔"

"پھر؟ کوئی کھاتا کھلوا بھی یا ایسے ہی؟"

مظفر علی خاں کہنے لگے: "میں تو آپ کے سوا یہاں کسی کو جانتا نہیں اور میرا منیجر' وہ بالکل ہی گیا گزرا دو آدمی ہے۔ وہ تو آپ کو بھی نہیں جانتا۔ اتنا نیک ہے' صبح پونے نو بجے گاڑی سے اتر کے بینک میں گھس جاتا ہے' پھر پونے پانچ بجے اندر سے نکل کے گاڑی میں ۔ ۔ اور چالیس کی اسپیڈ سے اڑتا ہوا اس علاقے سے باہر۔"

لاڈی صاحب نے کہا: "اے سبحان اللہ!"

مظفر خاں بولے : تو پھر بسم اللہ کیجئے۔ ۔ بچیوں کو بھی بلوا لیجئے۔ میں کھاتوں کے بارے میں انہیں بھی سمجھا دوں گا۔"

چوبیں پچیس برس کے ان خاں صاحب نے "بچیوں" کا ذکر جس طرح کیا تھا اس سے لاڈی بس نہال ہو گئیں۔ بہت دیر تک منہ پر ہاتھ رکھے ہنسی روکنے کی کوشش کرتی رہیں' پھر ایک دم ہنسی میں جیسے پھوٹ پڑیں۔

مظفر علی خاں معصوم شکل بنائے کبھی مجھے دیکھتے رہے۔ لاڈی ہنسے جارہی تھیں تو خاں صاحب مجھ سے بولے: "بھیا' ذرا بلوا لو سب کو ۔ ۔ ٹائم کم ہے۔"

میں نے لاڈی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہنستے ہنستے ہاں میں سر ہلا کے مجھے لڑکیوں کو بلانے کا کہہ دیا۔

مظفر علی خاں ہنستی ہوئی لاڈی کو سمجھانے لگے۔ "میڈم' ہنسی کی بات بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ دیکھیے نا' گنتی کے دن ہیں اور لاکھوں روپے کے اکاؤنٹ کھولنا ہیں۔ آپ ہی بتایئے' میں گھٹنوں اور پیروں کو ہاتھ نہ لگاؤں تو اور کیا کروں؟"

فرصت کا وقت تھا۔ لڑکیوں نے لاڈی صاحب کی ہنسی کی آواز سن لی تھی۔ انہوں نے لاؤنج میں جمع ہونا شروع کر دیا تو خاں صاحب ایک ایک کو سمجھا کر بچت اور بینکاری کے فائدے بتانے لگے کہ "دیکھئے' انسان کتنا غیر محفوظ ہوتا ہے' اور عورتیں تو آپ جانتی ہیں بہت ہی زیادہ غیر محفوظ ہوتی ہیں ۔ ۔ خاص طور پر وہ خواتین جنہیں اپنے پیشے میں چمکنے کے لئے بہت کم ٹائم ملتا ہے' جیسے آپ لوگ ۔ ۔"

"خواتین اور "پیشے" کے لفظ سن کے تو لاڈی کے ساتھ سبھی نے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔

خاں صاحب کی تقریر چل رہی تھی۔ کہہ رہے تھے: "آپ لوگوں کے لئے تو بینک اکاؤنٹ رکھنا اور پیسے بچانا بہت ضروری ہے تاکہ برسات کے دنوں میں جب ۔ ۔ جبکہ سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے ۔ ۔ سمجھ رہی ہیں نا آپ؟ جب قدردان' نیاز مند' پیسا کوڑی خرچ کرنے والے ناز اٹھانے والے نہیں رہتے تو ایک بینک کاؤنٹ ہی ہوتا ہے جو سہارا بنتا ہے ۔ ۔"

لڑکیوں میں سے کچھ ابھی تک منہ پر ہاتھ رکھے ہنسے جا رہی تھیں۔ خاں صاحب ذرا دیر کو رکے ہوں گے کہ گل بدن ایسے شروع ہو گئی جیسے مشاعرے میں داد دے رہی " ہو واہ بھائی جان! واہ سبحان اللہ! بہت اچھی

اورنگ زیب قاسمی

تقریر کرتے ہو!"

خاں صاحب نے بھی مشاعرے کے شاعر کی طرح چار انگلیاں سیدھی کر کے ان پر انگوٹھا' پیشانی سے لگا کر آداب عرض کیا اور اسی رفتار میں پھر چل پڑے۔

گل بدن ویچھا چھوڑنے والی کب تھی' سب سے کہنے لگی: "یہ بہت ذہین' بہت پکا ہے۔ کوٹھوں پہ بہت آتا جاتا رہا ہے اس کا۔۔ سارنگی بجاتا تھا پہلے۔"

لاڈی صاحب کی ہنسی رک گئی تھی' انہوں نے گل بدن کو گھورنا شروع کر دیا تھا۔ مگر مظفر علی خاں نے گل بدن کے فقرے کے جواب میں خود اپنے گالوں پر طمانچے لگائے۔ بولے:" توبہ کرو بلی توبہ۔۔ سارنگی بڑا مشکل ساز ہے۔ گنی' گن وان لوگوں کا کام ہے سارنگی بجانا۔"

گل بدن بے سرا بول گئی۔ لڑکیوں کی طرف دیکھ کے کہنے لگی۔ "تو پھر کوٹھوں کے لیے گاہک گھیر کے لاتا ہو گا۔"

لڑکیاں سب سن ہو گئیں۔ ہر ایک کو احساس تھا کہ گل بدن اوچھا بول گئی ہے۔ لاڈی صاحب تو جیسے پیلی پڑ گئیں۔ مظفر علی خاں کا گورا چٹا رنگ ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔ مگر انہوں نے کسمسا کر سر جھٹکا' ہونٹوں پہ زبان پھرا کر اور گل بدن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے:"نہیں بلی جی! اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں ہم۔۔ قصہ یہ ہے کہ بزرگوں نے اپنے وقتوں میں' اللہ بخشے' بڑی رنڈی بازیاں کی تھیں' تو وہ بے خوفی ہے خون میں۔"

گل بدن کھسیا کے لاجواب ہو گئی۔ لاڈی صاحب نے ہاتھ بڑھا کر مظفر علی خاں کا شانہ تھپک دیا۔ "برخوردار' کچھ خیال مت کرنا۔ پاگل ہے یہ سسری!"

خاں صاحب کچھ دیر بیٹھ کے' لاڈی سے وعدہ لے کے' کہ وہ اکاؤنٹ کھلوانے کا سوچیں گی' چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد لاڈی نے دھیرے سے کہا تھا:"کیا لڑکا ہے بھئی۔۔ مالک خوش رکھے!"

دوچار بار مظفر میاں پھر آئے۔ لاڈی صاحب نے کشمیر ملک ایڈلی شاپ کے مالک کو کھلوا دیا تھا' اس نے اور پانی فلٹر بیچنے والے نیمن ماسٹر نے سب سے پہلے خاں صاحب کے حساب میں کھاتا کھلوایا' پھر سگریٹ کا ہول سیل والا گجراتی بھائی بھی دھیرے دھیرے لائن پر آ گیا۔

مظفر علی خاں ان سب اکاؤنٹوں کے لئے لاڈی صاحب کا شکریہ ادا کرنے آئے تو کرسی پر بیٹھتے ہی انہوں نے اپنا بریف کیس کھولا اور چپٹا سا ایک ڈبا نکالا۔ وہ شہر کی سب سے بڑھیا دکان سے لاڈی کی پسند کی مٹھائی لائے تھے۔ یہ ڈبا انہوں نے ہاتھوں پر رکھ کر لاڈی طرف بڑھایا۔

لاڈی نے پوچھا۔" یہ کس واسطے؟"

کہنے لگے "سوچ لیا تھا لیلاجی کا منہ میٹھا کراؤں گا۔"

"مگر کیوں برخوردار؟ نیمن ماسٹر اور کشمیر ملک والے نے کھاتا کھول لیا کیا اس واسطے؟"

خاں صاحب بولے:"نہیں لیلاجی کھاتے واتے تو کھلتے رہتے ہیں۔۔ وہ سب نہیں۔"

"تو پھر؟" لاڈی نے کہا "پہیلیاں کیوں بجھواتا ہے برخوردار؟ ہاں بھلا؟"

" دیکھیے' اس طرح ہے" مظفر میاں نے مٹھائی کا ڈبا کرسی پر رکھ دیا' خود تخت پر لاڈی صاحب کے برابر آبیٹھے۔

اورنگ زیب قاسمی

"اس طرح ہے میڈم' کہ میں۔۔۔ اس روز جو میں آپ کے فلیٹ میں گھس آیا تھا اور چپڑ چپڑ باتیں کرتا تھا تو یہ مت سمجھیئے کہ بوگی مارتا تھا۔ مجھے اس روز بھی خبر تھی کہ آپ کون ہیں۔ صرف خبر ہی نہیں اس وقت تک میرے پاس آپ کے پانچ گراموفون ریکارڈ آ چکے تھے۔ چھٹا' جس کی بہت دن سے تلاش تھی' کل ملا ہے۔ لیلا جی! میں نے سوچ لیا تھا' وہ ریکارڈ جس دن میرے ہاتھ لگ جائے گا تو آپ کا منہ میٹھا کراؤں گا۔ وہ آپ کے آنے کے بعد نکالا تھا کمپنی نے۔ آپ کے پاس بھی نہیں ہو گا۔ وہی امیا بلاول کہ۔۔ دیاری کہاں گئے وہ لوگ۔۔"

لاڈی بس مظفر علی خاں کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔ خاں صاحب نے بھی بولنا ختم بھی نہ کیا تھا کہ لاڈی نے جیسے نیند میں دہرایا" دیاری کہاں گئے۔۔۔۔ پھر وہ جیسے پوچھنے لگیں: "امیا بلاول؟ نایک صدو کی امیا؟"

مظفر میاں نے سر ہلایا۔ "جی وہی۔"

لاڈی صاحب نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر آہستہ سے پوچھا "کون ہو تم؟ کیسے جانتے ہو مجھے؟"

" میں ؟ میں نے بتایا تو تھا' بینک میں نوکر ہوں' آپ کی اسی سڑک پر جو بینک ہے۔۔ اور میڈم' آپ کو کیسے جانتا ہوں؟ تو آپ کو لیلاجی' آپ کو تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ ہزاروں' شاید لاکھوں۔۔ سن تیس کے بعد گجریاں کس نے گائی ہیں آپ کے سوا؟ کون ہے؟ کس نے گائی ہوں گی؟ لیلا بائی امیر گڑھ والی کی طرح کون گا سکتا تھا؟۔۔ میڈم' ہر اتوار کو صبح سے شام تک سنتا ہوں آپ کے ریکارڈ۔ امیر گڑھ کے سنے تو بیلے جنگل ہو سکتے ہیں آپ کے سروں میں اور مور ملہاری امیر گڑھ کے قلعے کی برجیوں پر بیٹھے ہوئے مور اور مورنیاں بولتی ہیں۔ میں نے وہ آوازیں نہیں سنیں۔۔ مگر ایک جانکار نے' ایک خوب سنے ہوئے نے مجھے سب آوازیں پہچنوا دی ہیں۔ لیلا بائی میڈم خدا جانتا ہے' مجھے موسیقی کی سمجھ اتنی نہیں ہے' مگر آپ کی گائی گجریوں کے ایک ایک نوٹ کی شکل کاغذ پر بنا کے دکھا سکتا ہوں۔"

لاڈی صاحب سختی سے اپنے منہ پر ہاتھ جمائے بیٹھی مظفر میاں کی باتیں سن رہی تھیں۔ انہوں نے لیلا بائی امیر گڑھ والی کہا تو لاڈی نے چہرے پر ایک بار ہاتھ پھیر کر بے آواز دہرایا:" لی لا!"

فلیٹ میں سناٹا تھا۔ میں دیوار سے لگا سب سن رہا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے لاؤنج میں سامنے کسی گزرے زمانے کی میت رکھی ہے۔

مظفر علی خاں نے لاڈی صاحب کے آنسو دیکھ لیے تھے۔ وہ اٹھے انہوں نے بریف کیس اٹھا لیا۔

لاڈی صاحب زانو پر کہنی ٹکائے' منہدی لگی اپنی گول مٹول ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے بت بنی بیٹھی تھیں۔

اپنا بریف کیس ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جھلاتے ہوئے خان صاحب نے اشارے سے لاڈی صاحب کے بت کو سلام کیا اور فلیٹ کے دروازے کی طرف بڑھے۔

لاڈی صاحب نے دھیرے سے کہا "ٹھہرو!" خاں صاحب رک گئے۔ لاڈی نے کہا" پھر آنا"

مظفر علی خاں نے کہا "جی میڈم' آؤں گا۔ ریکارڈ اور باجا بھی لاؤں گا۔"

"نہیں! وہ مت لانا"

"جی اچھا۔" اور مظفر میاں اس روز پنجوں کے بل چلتے ہوئے فلیٹ کی دہلیز پار کر گئے۔

جیسے اپنے پیارے کی موت پر خاموشی سے ہر سہارے کے کوئی نکل جاتا ہے' بالکل اسی طرح۔

("آج" کراچی)

پانے کے باہر سے لا کر ایک ٹھیکری رکھی' شیشے کے سارے گلاس دھو کر انہیں سفید تولیے سے خشک کیا ایک اگر بتی سلگا کر بڑے کمرے میں رکھی اور باہری اپنی نیم پلیٹ اتار کر اندر لے آئے۔ قیمہ پیسنے کی مشین کئی سال سے جم کر یک جان ہو گئی تھی' بابو لطیف نے اس کے بڑے سوراخ میں سرسوں کا تیل ڈال کر اسے رواں کرنے کی کوشش کی تو اس کے دونوں گھٹنے چھل گئے۔ مشین ایک طرف رکھ کر اس نے دونوں گھٹنوں پر برنول لگایا اور پنکھا تیز کر کے اپنی دھوتی میں ہوا بھرنے لگا۔

دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ کو اس نے بنک جا کر پوچھا تو ابھی اس کی پنشن کی رقم کھاتے میں جمع نہیں ہوئی تھی۔ بابو لطیف نے ایک گالی بنک کو' دوسری اے جی آفس کو اور تین گالیاں بابو خیر دین کو دیں۔ پھر اس نے اپنے حساب سے پانچ سو کی رقم نکلوائی اور سیدھا یوٹیلیٹی سٹور چلا گیا۔

شام کو اخبار پڑھتے ہوئے اس نے رشیداں سے کہا کہ اگر ہمارے بھی بچے ہوتے تو اس وقت جوان ہو چکے ہوتے۔ ایک آدھ کی شادی ہو چکی ہوتی' دو تین ابھی کالج میں پڑھ رہے ہوتے' کسی کو نوکری بھی مل گئی ہوتی۔ رشیداں نے اس کی بات جواب نہ دیا اور پیڑھی پر بیٹھ کر اپنے ناخن کاٹتی اور ان پر ریتی مارتی رہی' پھر اس نے نیل پالش کی شیشی کھولی اور اپنے ناخن رنگنے لگی۔ رشیداں بابو لطیف سے کوئی پندرہ سال چھوٹی تھی اور بچہ نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک پوری جوان تھی' اس کے بال لمبے اور قد ذرا سا چھوٹا تھا لیکن میلاد کی محفلوں میں جب وہ کھڑی ہو کر سلام پڑھتی تو دراز قد بیبیاں اس سے چھوٹی نظر آنے لگتیں۔ اس کی آواز کھلی اور دہانہ تنگ' کندھے بھرے بھرے اور جسم کی خوشبو خوشگوار تھی۔ اس نے نیل پالش کا برش روک کر بڑی دیر کے بعد پوچھا "ابھی تم کیا کہہ رہے تھے لطیف؟"

"کچھ نہیں" لطیف نے اخبار ایک طرف کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"ابھی تم ہمارے بچوں کی بابت کچھ کہہ رہے تھے۔"

"اچھا وہ! وہ تو ایسے ہی میرا خیال تھا۔"

"ایسے خیال دل میں نہ لایا کرو' یہ اللہ کی حکمت ہے۔"

"اللہ کی حکمت تو ہے لیکن ایسے خیال خود بخود دماغ میں آ جاتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں' اولاد ہوتی تو شاید ہمیں پریشان کرتی' دکھ دیتی' بدنام کرتی۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے' لیکن اولاد کا ایک سہارا بھی ہوتا ہے۔"

"سہارا بھی ہوا اور دل بھاری بھی ہوتا ہے' ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں' اللہ نے ہمیں اور سب کچھ جو دے رکھا ہے۔"

تھوڑی دیر' بابو لطیف خاموش رہا' پھر کہنے لگا۔

"دراصل میرے مادے میں جرثومے نہیں ہیں۔"

"یہ تو تم پہلے بھی کئی مرتبہ بتا چکے ہو۔"

"میں نے پچھلے سال پھر ٹسٹ کروایا تھا تو ڈاکٹر نے کہا تھا ویسے تو تمہاری صحت بالکل ٹھیک ہے لیکن تمہارے مادے میں جرثومے نہیں ہیں اس لئے تمہارے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی۔"

"لعنت بھی تو لگ جاتی ہے۔" رشیداں نے سیانوں کی طرح جواب دیا۔

اورنگ زیب قاسمی

بیٹرباز

بابو لطیف جس روز نوکری سے رہا ہو کر اپنے گھر آیا تو اس نے شام کی ہانڈی خود پکائی اور گرم مسالے میں کچھ مسالے ایسے بھی ڈالے جو صرف عطاری دوکان سے حاصل کئے جا سکتے تھے۔ آپا رشیداں نے جب اپنے شوہر کے ساتھ مل کر اس کا بنایا ہوا ماحضر تناول فرمایا تو اس کو وہ شام یاد آ گئی جب وہ کوٹھے پر کھڑی اپنے دونوں ہاتھوں سے بالوں کا جوڑا کھول رہی تھی۔ کسی ٹوٹ مرتے نے نیچے سے اتنے زور کا روڑا پھینکا کہ اس کے منہ میں پکڑی ہوئی ساری پنسیں پروانوں کی طرح اڑ گئیں اور اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آج بابو لطیف کی ہانڈی کھا کر بھی اس کے دونوں ہونٹ سوج گئے تھے اور ان میں چلوں چلوں ہونے لگی تھی۔

بابو لطیف نے کہا "منجی کسنے کا فن اللہ بخشے میرے نانا جی نے سکھایا تھا۔ ایسی کمال کی منجی کستے تھے کہ درمیان میں بان کی ایک موٹی سی لڑ بھی آتی تھی۔ ہم دسویں جماعت میں اس لڑ پر اپنی ران چڑھا کر سوتے تھے۔ بہت ہی اچھی نیند آتی تھی۔"

ریٹائر ہو چکنے کے فوراً بعد ساری رات گزار کے' بابو لطیف نے اپنے کوارٹر کے لان میں تین ڈنڈ نکالے اور چوتھے پر گوڈا ٹیک گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اس کی بیوی باورچی خانے کے دروازے میں کھڑی تھی اور سونے کی چوڑیاں ہٹا کر اپنی بانہہ کھجا رہی تھی' بابو لطیف نے لان سے پکار کر کہا "یہ انگریزوں کے ڈنڈ نکالنے کا طریقہ ہے۔ تین مرتبہ وہ سیدھے ڈنڈ نکالتے ہیں اور چوتھے میں گوڈا لگا کر اٹھتے ہیں' ہمارے قصبے کے پادری صاحب اسی طرح ورزش کیا کرتے تھے۔ یہ جسم سڈول رکھنے کا سب سے اعلیٰ طریقہ ہے۔" جتنی دیر میں آپا رشیداں نے اپنی دونوں بانہیں کھجا کر لال سرخ کر لیں اتنی دیر میں بابو لطیف اپنی ورزش ختم کر کے آ گئے۔

اپنی ریٹائرمنٹ کے ایک ہفتہ بعد بابو لطیف نے مسجد میں جا کر نماز پڑھنی شروع کر دی اور پرانے نمازیوں کو یہ سمجھانے لگا کہ نماز دراصل ایک ڈسپلن ہے اور ڈسپلن سے ہی سارا کاروبار چلتا ہے۔ جس دفتر میں ڈسپلن نہ ہو اس میں رشوت اور سفارش عام ہو جاتی ہے اور لوگوں کے کام بند ہو جاتے ہیں۔ نوکری کے زمانے میں آدمی باقاعدگی سے نماز تو نہیں پڑھ سکتا البتہ اگر وہ ڈسپلن پر قائم رہے تو ایک طرح سے اس کی نماز اسی طرح ہوتی رہتی ہے۔

جب بابو لطیف کی ریٹائرمنٹ کو پورا ایک مہینہ گزر گیا اور پہلی کو اسے تنخواہ نہ ملی تو وہ گھبرا کر اپنے گھر کے کمروں میں گھومنے لگا۔ پہلے اس نے کلاک اتار کر اس کو اچھی طرح سے صاف کیا' پھر ہلتی ہوئی میز کے

"ٹھنڈ لگ جاتی ہے!"

"جرثومے بالکل ننگے ہوں تو ان کو ٹھنڈ بھی تو لگ سکتی ہے اور ٹھنڈ سے فٹ نمونیہ ہو جاتا ہے۔" رشیداں کا خیال تھا کہ جرثومہ اس جراثیم کو کہتے ہیں جس نے جرسی پہنی ہوئی ہو اور جس کے کالر ہر وقت اوپر کو اٹھے رہتے ہوں' گرمیوں میں تو خیر ٹھیک ہے لیکن سردیوں میں وہ کس طرح سے زندہ رہ سکتے ہیں۔

لطیف نے کہا" یہ بات نہیں رشیداں ' دراصل مجھے نویں جماعت میں دھانت پڑنے لگی تھی اس سے سارے جرثومے مر گئے اور پھر کلاس میں اکیلا میں ہی نہیں تھا کہ نیل سکھ کو بھی دھانت پڑنے لگی تھی اور وہ بھی کمزور ہو گیا تھا۔"

" لیکن تم خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے' صحت تو اچھی ہے خدا کے فضل سے لیکن اندر ٹھیک نہیں۔"

"یہ ساری باتیں حکیموں ڈاکٹروں کی بنائی ہوتی ہیں لطیف ' حق صداقت صرف اللہ کو معلوم ہے۔"

لطیف پھر اخبار پڑھنے لگا اور اخبار پڑھتے پڑھتے اس نے سوچا کہ ریٹائرڈ ہونے کے بعد بڑے لوگ باغبانی کا شغل اختیار کیا کرتے ہیں کیوں نہ میں بھی اپنے کوارٹر کے گراسی پلاٹ میں کچن گارڈن شروع کر دوں اور سبزیاں اگانے لگوں۔

اس نے اپنی یہ تجویز رشیداں کے سامنے پیش کی تو اس نے مسکرا کر کہا۔ " دفعہ کریں۔ آٹھ آنے کی سبزی سے تو ہم دونوں کے دونوں وقت نکل جاتے ہیں' ہم نے کیا کرنی ہے کچن گارڈن۔"

لطیف نے کہا"مجھ سے یہ اخبار پڑھا نہیں جاتا' بہت ہی مشکل کام ہے۔"

"تو نہ پڑھا کریں۔"

"لیکن ریٹائر ہونے کے بعد اخبار پڑھنا بہت ہی ضروری ہے سارے شرفا اسی طرح کرتے ہیں۔"

"تو ہم نے کسی کی ریس کرنی ہے بھلا۔"

"دراصل مجھے اخبار پڑھنے کا محاورہ نہیں رشیداں ' خبر گم ہو جاتی ہے' آخری صفحے پر تو پھر بھی بقیہ مل جاتا ہے لیکن پانچویں اور ساتویں صفحے پر کچھ نہیں ملتا۔ پھر میری عینک کا نمبر بھی تبدیل ہو گیا ہے' ساری سطریں ایک دوسری پر چڑھ جاتی ہیں۔"

"میں تو کہتی ہوں اب آپ عینک لگایا ہی نہ کریں' دور کی نظر تو مجھ سے بھی اچھی ہے ماشاء اللہ کیا ضرورت ہے عینک کی۔"

ریٹائرمنٹ کے پورے پانچ مہینے گزرنے کے بعد بابو لطیف پر یہ عقدہ کھلا کہ اس نے اپنی ساری زندگی نوکری میں برباد کر دی اور سوائے فائلوں پر غور کرنے اور ان پر اعلیٰ درجے کی ڈرافٹنگ کرنے کے اور کوئی کام ہی نہیں سیکھا جو اس کو بعد میں کام آسکتا اور اس کی زندگی آسان بنا سکتا۔ سیاست سے اس کو دلچسپی نہیں تھی' مسائل کے بارے میں اس کا علم بہت ہی محدود تھا' افسروں پر نکتہ چینی کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی سوادنہ تھا اور رشتہ داروں سے جھگڑنے کے لئے اس کی کوئی جائیداد نہ تھی۔ دوستوں یاروں سے ملنے کا البتہ وہ بہت شوقین تھا لیکن ان کی محفلوں میں وہ صرف یاروں کی باتیں سنتا تھا اور خوش ہوتا تھا اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا تھا' اصل میں بابو لطیف ابتدائی زمانے کا انسان تھا جس کا تعلق صرف زندگی سے بندھا تھا۔ زندگی جس

اورنگ زیب قاسمی

طرح سے ہاتھ تھام کر اس کو وقت کے دشت و صحرا میں سے گزار رہی تھی وہ مزے سے گزرتا جاتا تھا۔ اس کی اپنی تجویز نہیں تھی ' اپنا کوئی زائچہ نہیں ہے' کوئی رائے یا کوئی نظریہ نہیں تھا۔ جس طرح بابا آدم کی چوتھی پیڑھی کے لوگ زندگی بسر کرتے تھے ایسا ہی انداز بابو لطیف کا تھا۔ اس کی عقل اور اس کا علم صرف قاتل تک محدود تھا۔ قاتل سے نظریں اٹھانے کے بعد وہ کائنات کے حوالے ہو جاتا اور جس طرح سورج چاند ستارے عقل کے بغیر زندگی گزار رہے تھے اور کافی لمبی عمریں پار رہے تھے اسی طرح وہ بھی عمر کی طے شدہ طوالت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

رشیداں کے ساتھ بابو لطیف کا ساتھ بڑا پکا ساتھ تھا۔ اصولی طور پر تو آپا رشیداں کو ایک بیزار مضمحل اور فرسٹیڈ خاتون ہونا چاہیے تھا لیکن وہ ایک ایسی محبت کرنے والی بیوی تھی جس میں ماستا کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ بابو لطیف کے چہرے پر ذرا سی بے اطمینانی دیکھ کر سخت بے چین ہو جاتی اور اس کے اردگرد ایک نرس کی طرح گھومنے لگتی۔ بابو لطیف بھی سال میں ایک دو مرتبہ بے لطف ہوتا تھا۔ جب باس کو اس کی ڈرافٹنگ پسند نہ آتی یا صاحب زبانی فیصلہ دینے کے بعد مکر جاتا کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے یہ تو میں نے کبھی کہا ہی نہیں تھا لیکن بے لطفی کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ رہتی۔ رشیداں کی مادرانہ شفقت اسے اپنے آغوش میں لے کر اوپر اللہ لوری کی چادر ڈال دیتی' بابو لطیف اتنے سال رشیداں کی چادر اور چار دیواری میں پلا تھا اور اب ریٹائرڈ ہو کر گھر آگیا تھا جہاں روٹی ہانڈی کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا تھا۔

ایک شام مغرب کے بعد جب چند نمازیوں نے سیاست پر اور ملکی اور غیر ملکی حالات پر شدت سے بحث کی تو بابو لطیف کو احساس ہوا کہ وہ وقت کے دھارے میں بہت پیچھے رہ گیا ہے اور اب اس کے پاس سوائے لوگوں کے منہ دیکھنے کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ندامت کے اس احساس کے ساتھ اس کے اندر کا قفس چادر اور چار دیواری کی حدیں توڑ کر باہر نکلا اور بابو لطیف اپنے تشخص کی تلاش میں سیدھا مارکیٹ پہنچ گیا۔

یوٹیلٹی سٹور کا کاونٹر کلرک اپنی مشین پر جھکا چاقو کی نوک سے ایک چھوٹا سا پیچ کس رہا تھا۔ لطیف نے دونوں ہاتھ کاونٹر پر رکھ کر پوچھا" آپ کے پاس کچھ اچھے اچھے نظریات ہوں گے ؟"

کلرک نے سر اٹھائے بغیر کہا" ہمارے پاس صرف سرکاری نظریات ہیں اور کافی اچھی حالت میں ہیں اگر آپ وہ لینا چاہیں تو ہم کٹ پرائس پر دے سکتے ہیں۔"

لطیف نے قیمت پوچھی تو ذرا گھبرا سا گیا' ہکلا کر بولا " مجھے تو فی الحال تین چار چاہئیں۔ ضرورت پڑی تو پھر لے لوں گا" کاونٹر کلرک نے کہا" ہمارے پاس صرف گفٹ سائز پیکنگ میں دستیاب ہیں ' حکم ہو تو نکال لاؤں جو پچھلے گودام سے لانے پڑیں گے۔"

لطیف نے ڈرتے ڈرتے پوچھا" سنگل سائز پیکنگ میں نہیں مل سکتے ؟"

کلرک نے مسکرا کر کہا" سرکاری نظریات ہمیشہ گفٹ سائز پیکنگ میں ہی ہوتے ہیں بادشاہوں کے نظریات بادشاہی پیکنگ میں ہی آئیں گے ناں۔"

لطیف بھی اس کے ساتھ مل کر مسکرایا لیکن اسے سمجھ نہ آسکی کہ کلرک مسکرا کیوں رہا تھا۔ چلتے لگا تو کلرک نے ازراہ کہا۔

" اگر آپ کو مضبوط پائیدار اور بغلن سائز نظریات کی ضرورت ہو تو انہیں چیک شاپ پر تلاش کریں۔"

پھر اس نے لطیف کے سپاٹ چہرے کو غور سے دیکھ کر کہا "ایسی دکانوں پر تلاش کریں جو ولایتوں کے گھروں کا اور سفارتخانوں کی نیلامیوں کا سامان فروخت کرتی ہیں۔"

"لیکن وہاں سیکنڈ ہینڈ مال ہو گا۔" لطیف نے فکر مندی سے کہا۔

"کوئی ضروری نہیں کہ سیکنڈ ہینڈ مال ہو۔" کلرک ناک چڑھا کر بولا "بڑی بڑی اعلیٰ درجے کی نئی نکور اور ریکنڈیشنڈ چیزیں بھی مل جاتی ہیں۔"

لطیف شکریہ ادا کرکے چلنے لگا تو کلرک نے پھر کہا "زیادہ قیمت نہ دیجئے گا یہ بڑے سستے سودے ہیں۔ اچھے سے اچھے نظریات کی جوڑی سو سوا سو میں مل جائے گی۔"

"جوڑی!" لطیف نے حیرانی سے پوچھا تو کلرک نے کہا "ہم دوکاندار لوگ اسے جوڑی ہی کہتے ہیں گو یہ جوڑی ہوتی نہیں' جس طرح تالے کے ساتھ چابی' بوٹ کے ساتھ تسمے اور پین کے ساتھ اس کی ٹوپی ہوتی ہے اس طرح نظریات ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک واہی کی سلپ جیسی بھی ہوتی ہے۔ جیسے ہوائی جہازوں میں ہنگامی حالات کے لئے ایک کھلنے والی گیس موجود ہوتی ہے۔"

لطیف پھر باہر نکلنے لگا تو کلرک نے ہمدردی سے پوچھا "آپ نے پہلے کبھی نہیں لئے نظریات؟"

لطیف نے نفی میں سرہلایا تو کلرک کو یقین نہ آیا۔ اس نے معذرت بھرے لہجے میں کہا "آپ کی عمر کافی ہوگی ماشاء اللہ اب تک آپ نے کوئی اعتقادی نہیں اپنایا؟"

"کیوں نہیں" لطیف نے زور دے کر کہا "اعتقاد تو میرا اپنے مذہب پر پکا ہے لیکن میں نے کبھی کوئی نظریہ استعمال نہیں کیا۔"

"تو پھر آپ ایسے کریں کہ ابتدا میں ان پر کوئی خرچ نہ کریں کسی سفارت خانے سے مفت لے لیں۔"

"مفت!" لطیف کی باچھیں کھل گئیں۔

کلرک نے کہا "ابتدائی پریکٹس کے لئے مفت کا کام چلانا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ میں تو اب تک گھر بھر کے لئے وہیں سے نظریات لے آتا ہوں۔ میری بیٹی ایم بی بی ایس کے تیسرے سال میں ہے وہ انہیں بڑی ترتیب سے اور بڑے سلیقے سے سنبھال کر رکھتی ہے۔"

لطیف نے کلرک کی بات سن تو لی لیکن اس پر عمل نہیں کیا۔ سیدھا ان دوکانوں پر پہنچ گیا جہاں نیا اور پرانا غیر ملکی سامان ملتا تھا۔ پرانا مال باہر برآمدے میں رکھا تھا اور نیا مال اندر شیشے کی الماریوں میں سجا ہوا تھا۔ سارا مال نیلامی کا نہیں تھا اس میں سے کافی چیزیں کوسری سے چرائی ہوئی بھی تھیں۔ جس دوکان کے باہر پرانے فریج' کپڑے دھونے کی مشین' ساحل کی کرسیاں' بچوں کے چارپائی اور قالینوں کے بوسیدہ رول رکھے تھے اس کے اندر ایک خوبصورت سی عورت اور ایک جوان سا لڑکا کھڑا تھا۔ ایک گاہک کپڑا استری کرنے کا فولڈنگ سٹینڈ بغل میں دبا کر باہر نکل رہا تھا اور اس کی بیوی کار کے اندر بیٹھی چاٹ کھا رہی تھی۔

لطیف نے اندر جاکر لڑکے سے پوچھا "آپ کے پاس کچھ نظریات ہوں گے؟"

"کیوں نہیں" "کیوں نہیں!" عورت نے اپنا بازو لہرا کر کہا "ان دونوں الماریوں میں نظریات ہی نظریات ہیں لیکن آپ کو اصل میں کس چیز کی ضرورت ہے؟" لطیف سوچ میں پڑ گیا تو اس عورت نے ایک منجھے ہوئے سیلز مین کی طرح کہا۔

اورنگ زیب قاسمی

"آپ کو افکار چاہییں' خیال چاہییں یا صرف نظریات کی ضرورت ہے؟"

لطیف نے کہا "سچی بات یہ ہے میڈم کہ میں اس معاملے میں بالکل اناڑی ہوں اور اس فیلڈ میں میرا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ آپ جس طرح سے مجھے گائیڈ کریں گی میں قبول کر لوں گا۔"

عورت نے اسی طرح سے بازو لہرا کر کہا "ڈارلنگ ذرا افکار کی وہ گولڈن جوڑی نکالنا۔"

وہ لڑکا جو پہلے اس کا بیٹا نظر آتا تھا اپنی ڈارلنگ کا حکم سن کر سٹول پر چڑھا اور شیشے کی الماری سے افکار کی جوڑی نکال کر فرش پر کود گیا۔ عورت نے افکار کی جوڑی ریشمی رومال سے صاف کی اور لطیف کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولی "مشکل سے ایک مہینہ بھی استعمال نہیں ہوئی۔ وارنٹی سلپ ساتھ لگی ہے اور پرائس ٹیگ بھی نہیں اترا' ایک ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیٹے کے لئے منگوائی تھی لیکن وہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا' کیسے مرا تھا ڈارلنگ؟"

موٹر سائیکل کے حادثے میں۔" ڈارلنگ نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر صاحب دل برداشتہ ہو کر اس کا سارا سامان فروخت کر گئے' بڑا ہونہار نوجوان تھا۔"

"اور اس کی قیمت؟" لطیف نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ایک سو روپے۔" عورت نے مسکرا کر کہا اور ڈارلنگ سے پوچھنے لگی اس کا ڈبہ بھی مل جاتی؟"

"بالکل ہے۔" جانی نے کہا "یہ خرید لیں گے تو ڈبہ بھی نکال دوں گا۔"

"ایک سو روپے کچھ زیادہ ہیں میرے حساب سے۔" لطیف نے رک رک کر کہا۔

"زیادہ!" عورت زور سے ہنسی' پھر اس نے جھک کر تالی بجائی' ایک چھوٹا سا بھنگڑا کیا اور لپک کر بولی "بظاہر تو زیادہ ہی نظر آتے ہیں لیکن اصل میں بہت ہی کم ہیں' آپ ان کی آب و تاب تو دیکھیں' بڑی سیکسی۔ اپیل ہے ان میں۔"

سیکس اپیل کا لفظ سن کر لطیف کو فوراً اپنے چوڑے یاد آگئے اور اس نے جھٹ سے سو روپے کا نوٹ نکال کر عورت کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

جب وہ چلنے لگا تو ڈارلنگ نے کہا ہمارے پاس کچھ نظریات بھی آنے والے ہیں۔ ان کی بولی بدھ کے روز اٹھارہ تاریخ کو ہوگی۔ ہمارا آدمی گیا ہوا ہے اگر سودا طے پا گیا تو بائے ائر (By Air) واپس آئے گا۔"

"سودا کیوں نہیں طے پائیگا۔" عورت نے سنجیدگی سے کہا "میں نے مسٹر موریس کو فون کرکے کہہ دیا تھا کہ مال ہمارا ہے کوئی اور نہ لیجانے پائے۔"

"ان کی کیا قیمت ہو گی؟" لطیف نے پوچھا تو ڈارلنگ نے کہا "اب یہ تو مال آجانے پر منحصر ہے دیکھیں کیا قیمت لگی ہے لیکن کچھ زیادہ نہیں ہو گی ..... یہی بس ..... کوئی ..... ستر ..... اسی ..... روپے کا ایک نظریہ ہو گا۔"

"اور وہ سارے سیکنڈ ہینڈ ہوں گے؟" لطیف نے پوچھا۔

"ہوں گے تو سیکنڈ ہینڈ ہی۔" نوجوان نے جواب دیا "لیکن زیادہ استعمال شدہ نہیں ہوں گے" اصل میں نظریات ہمارے ہاں مینو فیکچر نہیں سارے باہر سے امپورٹ ہوتے ہیں' نئے تو ہم خرید ہی نہیں سکتے اس لئے استعمال شدہ سے ہی کام چلانا پڑتا ہے۔"

لطیف کو اس نوجوان کی یہ بات کافی بری لگی۔ اس نے حوصلہ کر کے کہا "کیوں ہمارے اپنے نظریات یہاں مینوفیکچر نہیں ہوتے؟ ہمارے اپنے لوگ انھیں کاسٹ نہیں کرتے' اپنے لوگ استعمال نہیں کرتے؟"

"کرتے ہوں گے" عورت نے بے پروائی سے کہا "لیکن مارکیٹ میں ان کی کوئی مانگ نہیں ہے ہمارے اپنے نظریات تو ہاتھ مشینوں کی سویوں جیسے یا الٹی چارپائی پر سکھائی ہوئی بڑیوں جیسے ہوتے ہیں۔ ان کا استعمال تو اب اندرون شہر بھی نہیں رہا' گاؤں میں کوئی استعمال کرتا ہو تو معلوم نہیں۔"

نوجوان نے کہا "سر یہ ترقی کا اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اس میں دیسی نظریات نہیں چلتے' کچھ لوگوں نے سیالکوٹ' ڈسکے اور گوجرانوالے کے استعمال کیے تھے لیکن ان کی موٹریں ہی بیٹھ گئیں' بڑا نقصان ہوا ان کا کچھ تو سنبھل گئے لیکن باقی سارے دیوالیہ ہو گئے۔"

"لیکن اعتقاد تو دیسی ہی استعمال ہوتے ہیں۔" لطیف نے حوصلہ کر کے کہا۔

نوجوان نے کہا "ہمارے پاس کچھ دیسی اعتقاد پڑے ہیں آپ چاہیں تو انھیں مفت لے جائیں' لیکن یہ آپ کے کام نہیں آئیں گے!"

"وہ کیوں" لطیف نے پوچھا۔ عورت نے کہا "گورنمنٹ ان کے استعمال سے منع کرتی ہے۔"

"منع تو نہیں کرتی۔" نوجوان جلدی سے بولا "البتہ گورنمنٹ ان کے استعمال کی حمایت نہیں کرتی' ڈس کرج کرتی ہے۔"

لطیف تھوڑی دیر تک کچھ شرمندہ شرمندہ سا وہاں ایسے کھڑا رہا جیسے قصائی کی دوکان پر پاؤ بھر گوشت لینے والا چور سا بنا کھڑا ہوتا ہے۔ پھر اس نے پرانے ریڈیو سیٹوں ٹوٹی دور بینوں' چلے ہوئے ٹوسٹروں اور ڈاکٹری کے استعمال شدہ اوزاروں میں سے پیتل کا ایک چپو سا اٹھا کر پوچھا "یہ کیا ہے؟"

"یہ ان بھو ہے۔ ایک صاحب انڈیا سے لائے تھے لیکن اس کے کنڈے ٹوٹ گئے' کنڈے ہم نے اس کے اندر رکھے ہیں۔"

"قلعی کا ٹانکا لگنے سے کنڈے مضبوط ہو جائیں گے اگر آپ لینا چاہیں تو بارہ روپے دے دیں۔"

لطیف نے پیتل کا ان بھو ہلایا تو ان کے اندر کنڈے کھڑکنے لگے ہیں۔ اس نے دس روپے کا نوٹ نکال کر کہا "میں اس سے زیادہ نہیں دوں گا۔"

عورت نے دس روپے اس کے ہاتھ سے لے کر کہا "اب جو ان بھو انڈیا سے آ رہے ہیں وہ اس سے ہلکے ہیں۔ قیمت بھی زیادہ ہے اور دیر تک چلتے بھی نہیں لیکن ہمارے لوگ انھیں شوق سے استعمال کرتے ہیں"

لطیف جب دوکان سے باہر نکلا تو اس کے ساتھ وہ نوجوان بھی باہر آ گیا۔ اس نے لکڑی کی ایک پیٹی کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس میں کچھ خیال کچھ تصور کچھ اصول اور کافی ساری اضافتیں' جملے اور حوالے پڑے ہیں۔ آپ چاہیں تو ان میں سے اپنی مرضی کے اچھے اچھے چھانٹ سکتے ہیں' قیمت بھی نہ ہونے کے برابر ہے' چھ روپے کے بارہ!" لطیف اس پیٹی پر جھک کر سامان پھرولنے لگا تو نوجوان نے کہا "ان کی ساخت پر نہ جائیں اپنی اپنی جگہ پر سارے ہی مفید ہیں اور ہر جگہ فٹ ہو سکتے ہیں۔"

"لیکن کافی پرانے ہیں۔" لطیف نے جھجکتے جھجکتے کہا۔

"ہاں جی ہاں" نوجوان نے سر ہلا کر کہا "یہ تو برسات کی وجہ سے زنگیا گئے ہیں۔ آپ ذرا سا براسو ڈال

اورنگ زیب قاسمی

کر رگڑیں گے تو گولڈن کلر کے ہو جائیں گے' ان کا پیتل بڑا زوردار ہے۔"

لطیف نے ڈیڑھ درجن چھوٹے بڑے' نوکدار' کنگریلے اور تیز دھار اضافتے اور حوالے خرید لئے اور انھیں ایک بڑے شاپر میں ڈال کر دوکان کے برآمدے سے باہر نکل گیا۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے اور لوڈشیڈنگ کا زمانہ تھا' لطیف کے تھیلے میں قیمتی سامان بھرا ہوا تھا اس نے بس پر جانے کے بجائے ایک رکشا لیا اور گھر کی طرف چل دیا۔

ٹھیک تین دن بعد عصر کی نماز سے پہلے بابو لطیف نے اپنا دھاریدار سواتی تھیلا کھولا اور اندر سے نقطہ نظر کی بٹیر نکال کر صف پر چھوڑ دی۔ اس وقت کل پانچ نمازی مسجد میں جمع تھے اور اذان میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ مستقیم صاحب نے بٹیرباز کو ایک نظر دیکھا اور چپ ہو گئے۔ ان کے حساب سے یہ کوئی خاص بٹیر نہ تھی جس پر وہ توجہ دیتے۔ حاجی رمضان علی اور ڈاکٹر ارشد صاحب نے اس بٹیر کی بہت تعریف کی اور صف پر انگلی بجا بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ دراز گیسو فقیر منش طالب علم نے وفور شوق سے بٹیر کو اٹھا کر باری باری اپنی دونوں آنکھوں سے لگائی اور پھر اس کی چونچ ہولے سے اپنے ہونٹوں میں دبائی۔ بولا "میں کل ایک دن کے لئے انجینئرنگ یونیورسٹی لے جاؤں گا' ہمارے یہاں انتخاب ہو رہے ہیں۔" مستقیم صاحب نے تسبیح پر اپنی انگلیاں روک کر کہا۔ "بھائی صاحب یہ بٹیر لنگڑی نہیں! ایک طرف سے جھولا مار رہی ہے!!"

بابو لطیف نے بٹیر اٹھا کر واپس تھیلے میں ڈال لی اور اپنی گھڑی دیکھنے لگا۔

رات کے کوئی ساڑھے گیارہ بجے رشیداں نے گہری نیند سے بیدار ہو کر دیکھا کہ لطیف نے اپنے بستر پر سیدھا بیٹھا ہے اور اس نے دونوں پاؤں نیچے لٹکا رکھے ہیں۔ رشیداں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا کہ اس نے سن رکھا تھا ریٹائرمنٹ کے بعد اکثر لوگ فوت ہونے سے پہلے اسی طرح چارپائی سے پاؤں لٹکا کر بیٹھتے ہیں اور پھر ان کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے۔ اس نے ہولے سے آواز دے کر پوچھا "کیا بات ہے لطیف؟" تو لطیف نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بجلی کی طرح اپنی چارپائی سے اٹھی اور لطیف کے قدموں میں بیٹھ کر منہ اوپر کر کے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ لطیف کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مستقیم صاحب نے اس کی بٹیر کو سب کے سامنے لنگڑی کہہ کر اس کا دل توڑ دیا تھا۔ وہ ' ممیں ' ممیں رونے لگا تو رشیداں اس کے ساتھ چمٹ گئی۔

پھر اس نے مسجد جانا چھوڑ دیا اور شام کے وقت اپنے نئے اور پرانے دوستوں کی دیام شالا میں جانا شروع کر دیا۔ یہاں شہر کے دوسرے لوگ بھی آتے تھے اور اپنی اپنی نسبتوں اور اضافتوں کے بٹیر لڑاتے تھے۔ دیر تک پالی جمتی اور نقطہ نظر کے صف شکن بٹیر چونچیں لڑاتے لڑاتے لہولہان ہو کر بے ہوش ہو جاتے۔ بٹیرباز جلدی چونا' ہرنی جاوتری کے مصالحے چڑھا کر انھیں پھر سے زندہ کرتے اور اگلے دن کا وقت مقرر کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ بابو لطیف کے تھیلے میں بھی بہت کچھ ہوتا لیکن وہ اسے باہر نکالتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ایک عجیب طرح کا خوف اسے چاروں طرف سے گھیرے رکھتا کیونکہ یہاں کے لوگ بڑے ظالم اور جابر تھے۔ ان کی آنکھیں بڑی بڑی' ہونٹ موٹے موٹے اور منہ بدبودار تھے۔ بدنوں سے ہیک آتی تھی اور وہ ہر وقت اپنے ایک خاص حصہ جسم کو کھجایا کرتے تھے۔

وہ خوبصورت' گیسو دراز اور نمازی لڑکا جو بابو لطیف سے ایک دن کے لئے اس کا سو روپے والا نظریہ لے کر اپنی یونیورسٹی چلا گیا تھا بڑے ہسپتال کے سپیشل کیئر وارڈ میں پڑا تھا اور اس کے جسم پر پانچ گولیوں کے نشان

تھے۔ اس کے گھر پر ہر وقت آیت کریمہ کا ورد ہوتا رہتا تھا اور اس کے والد تکلس پر بیٹھے ولایت کے ڈاکٹروں سے مشورے طلب کیا کرتے تھے۔۔۔ پتہ نہیں جلدی میں اس لڑکے نے بابو لطیف کا خوبصورت نظریہ کہاں پھینک دیا تھا اور اب وہ کن لوگوں کی تحویل میں تھا لیکن وہ تھا اپنی اصلی حالت میں اس پر نہ تو گولیوں کے کوئی نشان تھے اور نہ ہی ہاتھا پائی میں اس کی ہیئت تبدیل ہوئی تھی۔ اس وقت بابو لطیف کو اس نظریے کے اصل مالک ڈاکٹر صاحب کے بیٹے کی یاد آ رہی تھی جس نے موٹر سائیکل سے گرتے وقت اس نظریے کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا اور کئی گز تک گھسٹنے کے باوجود اس پر خراش تک نہیں آنے دی تھی۔

جس شام بابو لطیف پہلی مرتبہ حلقے کی میٹنگ میں گیا تو اپنے ساتھ چھ روپے درجن والی ساری اصطلاحیں، نسبتیں اور افکار خاکی کاغذ کے ایک دبیز تھیلے میں ڈال کر لے گیا۔ مقالے کے خاتمے پر بڑی عمر کے ایک دبلے پتلے شخص نے جیب سے پلاسٹک کا ایک خیال نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا اور سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ حاضرین نے اس گیجٹ کو غور سے دیکھا تو سامنے بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے اپنے چرمی تھیلے سے ٹین کا ایک گرگٹ نکالا اور اس میں چابی بھر کر میز پر چھوڑ دیا۔ گرگٹ تیزی سے پلاسٹک کے گیجٹ پر جھپٹا اور اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ ایک لڑکی نے پرس سے اپنی لپ سٹک نکال کر بھیگے بھیگے ہونٹوں سے چھوائی اور پھر اسے بند کئے بغیر اپنی ہتھیلی پر رکھ کر زور سے پھونک ماری۔ لپ سٹک نے راکٹ کی طرح میز کے اوپر کوچ کیا اور ڈاؤن شوں کرکے چکر کاٹنے لگی۔ جب اس کی تیزی نے اسے حاضرین کی نظروں سے اوجھل کر دیا تو اس نے ڈائیو مار کر گتھم گتھا جوڑے پر بیلسٹک میزائل جیسا ایک زور دار حملہ کیا۔ چھنک سے ایک شعلہ اٹھا اور آن واحد میں میز پر چٹکی بھر خاکستر باقی رہ گئی۔ حاضرین نے تالیاں بجا کر اس حملے کا سواگت کیا لیکن کچھ لوگوں نے تالی نہیں بھی بجائی وہ جگ میں کب کا پڑا ہوا پانی جواب بالکل گرم ہو گیا تھا گلاسوں میں ڈال کر پینے لگے اور لڑکی کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اس دبلے پتلے بڑی عمر کے آدمی نے اپنی جیب سے پلاسٹک کی ایک اور آرگیومنٹ نکال اسے خاکستر پر رکھ کر پھر سگریٹ پینے لگا۔ یہ آرگیومنٹ کافی پرانی تھی اور جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ اسے ایلفی ڈائٹ لگا کر بڑی محنت سے جوڑا گیا تھا اور اس کے اردگرد سکاچ ٹیپ کی پٹی چپکی ہوئی تھی۔ بابو لطیف نے حوصلہ کرکے اپنے تھیلے سے جنگل کا "ان بھو" نکالا اور اسے میز کے کنارے پر رکھ دیا۔ عینک والے ایک صاحب نے مٹین لیس سٹیل کا ایک کندا استرا جس کا دستہ بانس کی کھپچی سے بنا تھا آگے کھسکا دیا۔ سانولے رنگ اور تیکھے نقوش والی لڑکی نے اپنی چادر سے صندل کی لکڑی کا ایک برہنہ سپاہی نکال کر میدان میں کھڑا کر دیا۔ اس سپاہی کے سر پر لوہے کا ایک خود تھا اور چہرے پر کھلی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ لپ سٹک والی لڑکی نے ایک مرتبہ پھر لپ سٹک نکالی اور اپنے ہونٹوں سے چھوا کر بند کرکے واپس تھیلے میں رکھ لی۔ بڑی دیر تک سارے اپنے اپنے سانس کے خانوں میں چالیں چلتے رہے اور قدم قدم آگے بڑھتے رہے لیکن شہ کوئی بھی نہ دے سکا۔ صاحب صدر نے گھنٹی بجا کر کھیل ختم کرنے کا اعلان کیا اور کھلاڑیوں نے اپنے اپنے مہرے اٹھا کر حفاظت سے سنبھال لئے۔

اس روز جب بابو لطیف چھوٹی پیلی ٹیکسی لے کر گھر پہنچا تو خوشی سے اس کا پاؤں زمین پر نہ پڑتا تھا۔ اس نے رشیداں کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور ناچتے ہوئے بتایا کہ اس کے جنگل کے ان بھوئے میدان میں اترتے سارے افکار کی طبیعت صاف کرکے رکھ دی اور کوئی اس کے آگے بول نہیں سکا۔ "وزنی چیز پھر

وزنی ہوتی ہے" لطیف نے اترا کر کہا اور رشیداں کو جپھی ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ رشیداں نے کہا "کوٹ پتلون تو اتار دیجئے پہلے ہی بہت گرمی ہے۔ میں آپ کے لئے کھانا نکالتی ہوں۔"

"ضرور ضرور" لطیف نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا "جب کسی کا نظریہ قبولیت کے دائرے میں آجاتا ہے تو وہ بہت بھوکا ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی اس وقت اتنی بھوک لگی ہے کہ میں کھڑے کھڑے تم کو کھا سکتا ہوں۔ جلدی کرو اور کھانا نکالو میرے ٹائی اتارتے تک کھانا لگ جانا چاہیے۔"

رشیداں اپنے ریٹائرڈ خاوند کی یہ بات سن کر مسکراتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

زندگی کے اتنے سال جو بابو لطیف نے بڑی شرافت اور عاجزی کے ساتھ لطف میں گزارے تھے اب وہ اس کے سینے کا کابوس بن کر ہر وقت اسے شرمندہ کرتے رہتے تھے۔ اپنی زندگی کے ان مدقوق اور پژمردہ سالوں کی مکافات وہ اس طرح سے کر سکتا تھا کہ موچی دروازے میں ایک جلسہ کرے۔ سو فٹ لمبی اور چالیس فٹ چوڑی اور دس فٹ اونچی سٹیج بنائے اور وہاں سے مجمع کو خطاب کرے۔ اپنے سارے نظریات، اعتقادات اور افکار کی نمائش کرے اور اپنے خیالات پر غلاف کشں ڈال کر چکا چوند کر دے۔ لوگ ترنگ میں آ کر بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیں اس پر سلوگن لگائیں اور اس کی مہابتائیں۔ اس مختصر سی دنیا میں صرف بابو لطیف ہو اور اس کے نظریات ہوں اس کے اصول ہوں اور اس کا نصب العین ہو۔ رات کے وقت پی ٹی وی اس پر تبصرہ کرے اور اپنے نامہ نگار کے حوالے سے مجمع کی تعداد بتائے۔

دن کے وقت وہ اپنے نظریات، خیالات، افکار اور حوالے چڑول سے براسو سے چمکاتا رہتا اور جن کو پچھلے روز مٹی کے تیل میں ڈبویا تھا۔ ان پر ڈبل زیرو کا ریگمال مار کر زنگ چھڑاتا رہتا۔ جن نظریوں کے کنڈے ٹوٹ گئے تھے انہیں ویلڈ کرانے لے جاتا اور جن اصطلاحوں کی پتیاں کثرت استعمال سے پھٹ گئیں تھیں ان پر رشیداں سے پکے دھاگے کے ساتھ رفو کرایا کرتا۔ پرانی کیلوں کی جگہ نئی کیلیں لگانے کے لئے اس نے ایک موچی سے ٹھیکہ کر رکھا تھا جو ایک روپے میں دو کیلیں لگا کر ان پر برش بھی مار دیتا تھا۔ شام کے وقت مارکیٹ کا پھیرا لگاتا اور کباڑیوں سے اور تصور اور مزید نسبتیں اور تلمیحیں خرید لاتا۔ اب اس کے دل میں ایک ہی حسرت باقی رہ گئی تھی کہ کاش اس نے پانچ سال پہلے ریٹائرمنٹ لے لی ہوتی۔

شام کو جب پالی عشق اور نظریات آپس میں گتھم گتھا ہوتے تو ان کے مالک بنچوں کے بل ہو انہیں للکارنے اور شتکارنے لگتے۔ اس ہاہمی اور بدلہوی میں ایک دوسرے کو دھکیلنا پیلنا بھی پڑتا۔ کچھ رکاوٹیں بھی پیدا کی جاتیں کچھ دھکے بھی پڑ جاتے۔ آپس میں بول بلار ابھی ہو جاتا لیکن لطیف صاحب ان چیزوں کے عادی ہو چکے تھے بلکہ ان کو اس کا چسکا لگ گیا تھا۔ اب کپڑے پھڑوا لینا اور گھڑی کا کلائی سے کھل کر زمین پر جا گرنا، دیوار سے ٹکرا جانا یا دھکا کھا کر فرش پر گر جانا ایک عام سی بات تھی۔ سارے کھیلوں میں اسی طرح سے ہوتا ہے۔ تیز گیند کا کیچ لیتے ہوئے کھلاڑی زمین پر کئی لڑھکنیا کھا جاتا ہے۔ خراشیں آجاتی ہیں، کپڑے پھٹ جاتے ہیں خون نکل آتا ہے۔ ایسا تو کھیل میں ہوتا ہی ہے جس روز بابو لطیف پٹ پٹا کر کپڑے پھڑوا کر خون تھوکتا گھر واپس آیا تو رشیداں رونے لگی۔ بابو لطیف نے ہنس کر کہا "بھئی ایسا تو کھیل میں ہو ہی جاتا ہے یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ البتہ اپنے مہرے کو اپنی نظروں کے سامنے پٹوا دینا اور شکست کھا جانا اور دوسرے کی بات مان جانا موت کا مقام ہے۔"

اورنگ زیب قاسمی

موت کا لفظ سن کر رشیداں نے اپنے ریٹائرڈ خاوند کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

یہ سردیوں کی ایک طویل اور تاریک رات کا ذکر ہے جب رشیداں کو یوں لگا جیسے کوئی پانی میں ڈوب رہا ہے اور بلبلوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ لطیف کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہ پا کر اپنی چارپائی سے کود کر بتی جلا دی۔ لطیف اپنے پلنگ پہ ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا اور بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ رشیداں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا کر اس کا ماتھا چھوا تو وہ بالکل ٹھنڈا تھا۔ نبض چل رہی تھی لیکن ہر چار دھڑکنوں کے بعد ایک دھڑکن چھوڑ جاتی تھی۔ دل کی رفتار کافی تیز تھی لیکن سسکیوں کی رفتار اس سے بھی تیز تھی۔

"کیا ہوا۔ کیا ہوا لطیف۔۔" اس نے لطیف کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا تو وہ اور زور سے رونے لگا۔

بڑی دیر تک رشیداں اسے ساتھ لگائے تھپکتی رہی اور اسے بہلاتی رہی لیکن جتنا وہ اسے تھپکتی اس قدر شدت سے وہ کانپنے اور لرزنے لگتا۔ پھر وہ بالکل ساکت ہوگئی اور اس نے لطیف سے اپنی ساری توجہ ہٹالی۔ کوئی بیس پچیس منٹ تک کمرے میں خاموشی کا عالم رہا۔ پھر لطیف نے اس کی طرف منہ پھیر کر کہا "آج بھری محفل میں میری بڑی بے عزتی ہوئی۔" رشیداں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح بیٹھی رہی۔

لطیف کہنے لگا آج جب میں نے کلاسیکل نظریہ نکال کر محفل کے سامنے پیش کیا تو حاضرین مجلس بغلیں جھانکنے لگے اور سب کو سانپ سونگھ گیا۔ قادر میر کے ساتھ ایک ٹھگنوں سا لڑکا آیا تھا۔ گندی شکل۔ گندے دانت۔ آنکھوں پر ٹوٹی ہوئی عینک۔ ہاتھ میں کڑا۔ میرے نظریے کو دیکھ کر کہنے لگا" یہ آپ نے کہاں سے لیا تھا صاحب؟ " سب اس کی طرف دیکھنے لگے میں نے کہا" تم کو اس سے کیا۔ ہمت ہے تو اس کا مقابلہ کر کے دکھاؤ۔ " وہ ہنسنے لگا اور بڑی دیر تک ہنستا رہا۔ کچھ لوگ اس کی بدتمیزی پر تنگ بھی ہوئے لیکن بہت سارے اس کی ہنسی میں شریک بھی ہوگئے' حالانکہ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں ہنس رہا ہے۔ میں نے قہرآلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر کہنے لگا " یہ آپ نے رکنے کباڑیے سے لیا ہوگا۔ رکن الدین اولڈ شاپ سے!" سب مڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر اس نے اپنا کڑا اوپر اٹھاتے ہوئے کہا" یہ میرا لکھا نظریہ تھا اور میں نے ہی اسے پانچ روپے کے عوض رکنے کباڑیے کے پاس گروی رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے چھڑاؤں گا لیکن میں نے نہیں چھڑایا۔ اس میں اب کوئی جان باقی نہیں رہی تھی۔ نہ ہی یہ آگے چلنے کے قابل تھا۔ آپ نے کتنے میں خریدا؟"

لطیف کی آنکھوں میں پھر آنسو تیرنے لگے اور اس نے ہچکی مار کر کہا" وہ ٹھیک کہتا تھا۔ میں نے اسے رکنے کباڑیے کی دوکان ہی سے اسی روپے میں خریدا تھا اور اس کو سب کی نظروں سے چھپا کر عینک کے ایک خالی کیس میں محفوظ کیا ہوا تھا۔ جب لوگ مسکرانے لگے تو اس نے اونچی آواز میں کہا" اس کے ساتھ اعداد و شمار کی تین جھاڑیں بھی تھیں وہ کیا ہوگئیں۔" وہ ٹھیک کہتا تھا اس کے ساتھ اعداد و شمار کی تین جھاڑیں بھی تھیں اور انفرمیشن کے سات چھلے بھی تھے۔ میں نے ان جھاڑوں کو الگ الگ کر کے مختلف اصولوں اور نصب العینوں کے ساتھ ٹانک لیا تھا۔ پھر اس بدبخت نے قادر میر کے کان میں کہا کہ اس کے ساتھ انفرمیشن کے

اورنگ زیب قاسمی

چھلے بھی تھے وہ اب نظر نہیں آتے لیکن قادر کے کان میں کہنا اس کا محض ایک بہانہ تھا۔ اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ ساری محفل نے سنی اور سبھی مسکرانے لگے۔۔۔" لطیف نے ذرا رک کر کہا" میری بے عزتی ہوئی ہے اور میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"

"حد کرتے ہو۔" رشیداں نے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا" یہ بھی کوئی مرنے کی بات ہے۔"

"اس سے بھی زیادہ رشیداں۔ اب اس زندگی میں اور کچھ رہ ہی نہیں گیا لیکن تم فکر نہ کرنا نئے رولز کے مطابق تم کو پوری پنشن ملتی رہے گی۔"

رشیداں نے اس کے پہلو میں ہلکی سی ایک گدگدی کی اور اسے پلنگ پہ چت لٹا کر اس کے ساتھ لیٹ گئی۔

جس شام بابو لطیف کے قل تھے اس روز صبح سویرے رشیداں لطیف کے سارے نظریے' اصول' تصور افکار اور سلسلے حوالے ایک تھیلے میں ڈال کر مارکیٹ لے گئی۔ اس نے دوکاندار سے کہا" میرے پاس کچھ قیمتی نوادرات ہیں اور میں مجبوری کی حالت میں انہیں بیچنا چاہتی ہوں۔" دوکاندار نے تھیلا لے کر سارا سامان میز پر الٹ دیا اور اونچی آواز میں بولا" ذارنگ ذرا باہر آنا۔ ہمارا سودا ایک بار پھر واپس آگیا ہے کمبخت۔" پھر اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر کہا" آپا جی اس سارے مال کے ہم آپ کو چھ روپے دے سکتے ہیں۔ وہ بھی آپ کی خاطر۔"

("دستاویز" راولپنڈی)

ہزار پایہ

اس لڑکی کا خیال آتا ہے تو دل درد و کرب سے بہت بوجھل ہو جاتا ہے اور میں سوچتی ہوں کہ کسی انجانے اور صرف ایک بار دیکھے ہوئے کسی شخص کے لئے اتنا کرب' اتنا درد بھی کسی نے کاہے کو محسوس کیا ہوگا۔

جی! یہ حقیقت ہے کہ صرف ایک بار اس گھر کی دہلیز لانگھی اور اندر قدم رکھا۔ پھر ایک دو نہیں پانچ بلکہ پورے چھ گھنٹے تک انتظار میں بیٹھے رہنے کے بعد اس گھر سے نکل کر دوبارہ اس دہلیز پر قدم رکھنا تو ایک طرف کبھی اس طرف رخ بھی نہ کیا۔ لیکن وہ لڑکی --- اور اس کی یاد --- ہر دوسرے تیسرے ماہ' دل میں سر اٹھاتی ہے۔ بس تعجب ہی ہوتا ہے کہ چند گھنٹے تک بے حد اکتاہٹ اور بیزاری کے عالم میں بیٹھ کر اس کا اور اس کے ماحول کا مشاہدہ کیا جہاں وہ خالی خالی آنکھوں اور ڈھنڈھار دل اور وجود لئے ادھر سے ادھر پھرتی نگاہوں میں آتی رہی تھی' اور وہ ایک وائرس کی طرح میرے دل و دماغ کی جڑوں میں بیٹھ گئی تھی جیسے ..... جیسے کنکھجورا دماغ کے نرم نرم خلیوں اور گودے میں گھستا ہی چلا جا رہا ہو۔

ہاں --- ہزار پایہ ہی تو کہتے ہیں فارسی زبان میں اس کو' اور اس کی یہی خاصیت تو جان لیوا ہوتی ہے کہ ایک بار گوشت پوست میں ملفوف کسی مقام پر بیٹھ گیا تو بیٹھ گیا کہ بے شمار (شاید گنتی میں ہزار ہی ہوں) باریک باریک دھاگوں جیسی ٹانگیں اندر ہی اندر گاڑتا چلا جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ دھندلی دھندلی ویرانی' اندھا اندھا سا خالی پن یہ افسردگی اور سناٹا کچھ اس کی ذات ہی پر منحصر نہ تھا۔ یہ تو پورے ماحول پر چھایا ہوا تھا اور پھر اس سب کے درمیان اس کا ڈھنڈھار اور سوکھے کنویں جیسا وجود --- بس میں کیا کہوں۔ ایسا گھر میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا کہ جس کے اندر قدم ڈالتے ہی ایسا لگے کہ جیسے --- جیسے ابھی ابھی کوئی جنازہ نکل کر گیا ہو۔ میت اٹھ کر گئی ہو یا پھر یہ کہ گھر کے مکین اپنا سب کچھ سمیٹ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لمبے سفر پر ابھی ابھی گئے ہوں اور یہ جو دوچار فلاکت زدہ نحوست مارے خالی خالی آسیب سے چہرے کھڑے بیٹھے یا گھومتے نظر آتے ہیں وہ خالی مکان میں بچا کھچا پسماندہ سامان سمیٹنے آگئے ہیں۔

اچھا ٹھہرئیے دیکھئے میں کوشش کرتی ہوں کہ پوری بات کو ڈھنگ قرینے اور تدریج تسلسل سے بیان کروں۔

اس گھر میں میرا داخلہ ایک خاص مقصد سے ہوا تھا اور مقصد وہی سرکاری ملازمین کا مشترک مقصد یعنی اپنی ماہانہ تنخواہ اور واجبات میں ٹیکس اور کٹوتی اور ان کے ریفنڈ کے معاملات میں متعلقہ کلرک کی مسلسل غیر ذمہ

اورنگ زیب قاسمی

دارانہ' دانستہ یا غیر دانستہ غلطیوں کی بنا پر غلطیہائے مضامین کا ایک پہاڑ' ایک ہجوم بیکراں کھڑا ہو گیا تھا اور میں نے ان کی اصلاح' صحت اور درستی کے لئے اس متعلقہ کلرک کا ایک ماہ تک انتظار کیا تھا کہ جب بھی داخل دفتر ہوتی وہ اپنی میز پر ملتا ہی نہ تھا۔ اچھا اگر کبھی کبھار راہ باٹ میں کسی سبزی یا گوشت کی دکان یا پھر بڑے گوشت والے کی دکان کے بائیں ہاتھ والی گلی میں دانتوں کے امراض کے معالج ڈاکٹر کے مطب میں مریضوں کے کیو میں لگا بیٹھا مکھیاں مارتا ہوتا اور جوں ہی میری نظر اس پر پڑتی میں جھپٹ کر اس کے قریب ترین مورچے پر جا کھڑی ہوتی اور خاصی ناشتہ آواز میں اس کو مخاطب کرنا شروع کر دیتی --- "کیوں بھئی' دفتر سے غائب رہتے ہو --- کبھی اپنی میز اور فائلوں کے قریب نہیں ملتے اور سودا سلف خریدتے پھرتے ہو۔ یعنی کہ ناریل کی جھاڑو تک۔ کیا کہیں گھریلو پارٹ ٹائم ملازمت تو نہیں کرلی؟" (ہاں ہاں میں سچ کہتی ہوں یہ حرکت اس سے کچھ بعید بھی نہ تھی وہ تو اس بات کا بھی اہل تھا کہ پارٹ ٹائم کو فل ٹائم میں تبدیل کر کے دفتری کاموں کے لئے اپنا نام رجسٹری تک تبرک کے طور پر رہنے دے --- اور وہ تو اس حرکت پر بھی قادر تھا کہ ہماری تنخواہوں کے بل وغیرہ بنانے کے لئے کسی ریاضی یا کامرس کے انڈر گریجویٹ زیر تعلیم طالب علم کو پکڑا کر اپنی میز پر بیٹھا کر رجسٹر اس کے سامنے ڈھیر دے بلکہ وہ تو اس سے آگے یہ بھی کر سکتا تھا کہ کسی پرچون فروش اسٹور کے سیلز مین کو بہت ہی واجبی اجرت پر راضی کر کے اسٹاف کی تنخواہوں کے بل بنانے پر مامور کر دے اور وہ پرچون فروش کا سیلز مین ہمارے ناموں کے ہجے غلط لکھتا رہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا ورنہ ناموں کے ہجے تو خود اس کے بھی بہت کچے تھے اکثر میں ہی اس کو پکڑ کر ہجے درست کرواتی اور اس سے کہتی کہ بھلے آدمی اس سے تو اردو میں نام لکھ دیا کرو۔ مگر اس طرح اس کی ذات اور اہلیت میں بٹہ لگنے کا امکان تھا۔ پھر یہ کہ اس کا اردو املاء بھی کچھ ایسا قابل فخر نہ تھا۔ ہاں تو میں کہہ یہ رہی تھی کہ جب بھی میں اس کو یوں سرراہ رنگے ہاتھوں پکڑتی ناریل کی جھاڑو' گنے کی گنڈیریوں کو تھیلیوں' اور سنگھاڑوں کے شاپر اٹھائے ہیں اس کو گھیر لیتی' "بھئی وہ ہمارے حساب میں جو گھپلے' ٹیکس اور ریفنڈ کے رپھڑ کھڑے کر دیئے ہیں' ان کی اصلاح اور درستی کی صورت بنے گی؟ اور کب بنے گی؟" بس اس کی ٹانگیں لرزنے لگتیں۔ نروس ہو کر اپنی چھتری (جی وہ بنگالی کلرکوں کے مانند چھتری اپنی جان کے ساتھ ضرور رکھتا ہے جسے دیکھ کر آپ کو فورٹ ولیم کالج کے بنگالی کلرکوں کا خیال آئے اور شاید اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی اور فورٹ ولیم کے حوالے سے آپ پر ہیبت اور مرعوبیت طاری کرنا چاہتا ہو) تو ہاں وہ نروس ہو کر اپنی چھتری اور شاپر کو ایک ہاتھ سے دوسرے میں تبدیل کرنے لگتا اور ہاتھ بھی لرز رہے ہوتے --- چہرہ پیلا پڑنے لگتا۔ پھر وہ بیٹھی بیٹھی آواز میں دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی بے اختیاری پر میر تقی میر یا کسی اور کلاسیکی شاعر کا شعر سنانے لگتا (ویسے بنیادی اور پیدائشی طور پر اس کی آواز بیٹھی ہوئی نہ تھی' خاصی مضبوط اور پڑھے لکھے آدمیوں کی سی تھی) اب میری یہ مجبوری کہ میں نہ کسی شخص کو اپنے معاملے میں نروس ہوتا دیکھ سکتی ہوں نہ مجھے کسی کی بجھی بجھی آنکھوں اور پیلے پڑتے چہرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ شعر سنانے کے بعد وہ کسی مست خدا درویش کی آواز میں قدرے اطمینان سے کہتا "بی بی! روز ازل سے ہر کام کا ایک وقت قسام ازل کی طرف سے مقرر ہے۔ ہر کام کو اپنے وقت پر ہی ہونا ہے خواہ ہم کتنی ہی بے صبری کریں ---" بس پھر اس کے بعد میں کچھ کہنے سننے کی پوزیشن میں نہ رہتی "آگے بڑھ جاتی۔

بات یہ ہے کہ وہ میری کئی کمزوریوں سے آگاہ تھا۔ اسے پتہ تھا میں مالی معاملات یعنی منی میٹرز سے بیگانگی برتتی ہوں' حساب کتاب اور شماریات کی باریکیوں اور موشگافیوں سے مجھے خفقان ہوتا ہے اور میرا داخلی اور خفیہ طور پر یہ خیال ہے کہ اگر آدمی کو ماہ بماہ اتنی رقم مل جائے کہ وہ دو وقت کی روٹی کے ساتھ ساتھ دیگر معاملات میں شرافت اور سفید پوشی سے گزارا کرلے تو باقی سب فضول اور بیکار ہے اس اطمینان ہی پر اس نے سب سے بڑے اور زیادہ کھیلے میرے ساتھ ہی کئے تھے۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ ایک مجھی پر منحصر نہیں' دوسرے بھی جن کی جزرسی اور سوجھ بوجھ کے سب ہی قائل ہوں' جب اپنی تنخواہ اور گریڈ کے کسی حساب کو سمجھنا چاہیں تو اس کی گھپلائی بات کسی کی عقل میں اترنا بیٹھنا اور آنا ممکن نہ تھی کہ وہ الٹ پھیر کر وہی باتیں الجھا الجھا کر کے جاتا تھا خیر اب کوئی کہاں تک رونا روئے۔

اب یہ ہوا کہ پانی سرسے ہی اونچا ہونے لگا اور ٹیکس وغیرہ کی عدم ادائیگی کے نوٹس کے بعد گویا اب سمن بھی جاری ہونے لگے تھے۔ ایک آدھ سمن لانے والے کی نظروں میں دھول جھونکنے کے بعد ایک دن ایسا بھی آیا کہ سمن لانے والے نے دروازے ہی پر خود اپنے دست خاص سے سمن میرے ہاتھ میں تھمایا۔ اسے پڑھ کر حقیقتاً" دن میں تارے نظر آنے والی بات سچ معلوم ہونے لگی کہ سمن نے مخصوص تاریخ اور وقت پر حاضری اور جواب دہی کا حکم دیتے ہوئے یہ بھی اطلاع دی تھی کہ عدم تعمیل کی صورت میں مطلوبہ شخص کو پکڑ کر بھی لے جایا جاسکتا ہے یعنی یہ کہ گرفتاری بھی عمل میں آسکتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گھبرا کر فوراً" آفس اور اس کی میز کا رخ کیا جو حسب معمول اس کی موجودگی سے محروم تھی البتہ ایک نو عمر لوئر گریجویٹ جو صورت میں سکنز مین لڑکا نظر آتا تھا' دوسرے سرے پر بیٹھا اپنی انگلیوں کے پوروں کو گن گن کر کچھ اندراجات کرنے میں مصروف تھا اور اس کے ہونٹ ساتھ ساتھ یوں ہلتے تھے جیسے کسی دعا یا وظیفے کا ورد کرتا ہو۔

دوسرے تمام کلرک سر جھکائے اپنے آگے دھری فائلوں میں مصروف تھے۔ وہ ہمیشہ ہی مصروف ہوتے اور اس کے بارے میں کسی بھی پوچھ گچھ کے جواب میں خاموشی ہی کو مناسب جانتے ۔ ۔ ۔ آج میں نے معمول سے زیادہ اونچی اور گلوگیر آواز میں گلہ شکوہ اور پوچھ گچھ کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا یہ آدمی تو ہمیں جیل ہی بھجوا کر دم لے گا اور افسران بالا پھر بھی ہماری شنوائی نہ کریں گے ۔کیوں؟ اس لئے کہ ان کے تمام حسابات اور فائلیں درست اور تاریخ وار اندراجات سے مرتب تھیں اور انہیں اس سلسلے میں کوئی درد سر نہ تھا' سو وہ ہماری ایسی شکایتوں پر ہنس ہنس کر دہری ہو جاتی تھیں ۔ ۔ ۔ بالکل اسی طرح جیسے لاڈلے بچے کی شرارتوں کے ذکر کو سن کر ماں پر ہنسی کا دورہ پڑ جائے ۔ ۔ ۔ بہرحال کہتے ہیں بے کسی کا خیال کرکے تو خدا بھی عرش اعلیٰ سے اتر آتا ہے' سو دفتر کے سینئر موسٹ کلرک اٹھ کر برآمدے میں چلے گئے اور وہاں سے انہوں نے اشارہ کرکے مجھے اپنے قریب بلایا اور سرگوشی میں اس کے بارے میں بتاتے ہوئے مجھے اس کا پتہ دیا اور کہا' آپ فوراً" گھر پر جا کر اس کو پکڑیں وغیرہ وغیرہ۔ بعد میں انہوں نے تاکید یہ کی کہ میرا نام ظاہر نہ ہو۔" وہ بیگم صاحب کا بہت منہ چڑھا اور ناک کا بال قسم کا آدمی ہے' اگرچہ نہایت احمق ہے۔"

" تو بیگم صاحبہ بھی کچھ اتنی عقلمند تو نہیں۔" بے خیالی میں میرے منہ سے نکلا اور میں دفتر سے نکل کر تیر کی طرح گیٹ سے باہر تھی۔

اب یہ دیکھیے کہ بھلا مجھے اس سے قبل یہ علم نہ تھا ورنہ اگر مجھے علم ہوتا تو میں اس کے دفتر سے اتنے

اورنگ زیب قاسمی

عرصے اور ہر وقت غائب رہنے پر اتنی کبیدہ نہ ہوتی۔ اب دیکھئے نا' یہ ہنی مون وغیرہ بھی تو انسان کا حق ہوتا ہے خواہ اس کی حیثیت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ چلئے نہ سہی مری نتھیا گلی اور سوات کے پنج تارہ (Five Star) ہوٹل' بندہ اپنے شہر کے گلی محلوں انار کلی' میں گھوم پھر کر اور لچھمی چوک کی دکانوں کے ساتھ والے چھپر تلے بیٹھ کر تکے کباب اور فالودہ تو اڑواسکتا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کیا کھایا اور کیا پیا۔ ہنی مون تو بس ہنی مون ہی ہوتا ہے ۔ وہ خواہ زندگی میں ایک بار آئے خواہ دس بار آئے۔ ہنی مون کی تو اپنی جگہ ایک بات ہوتی ہے۔ اب چاہیے اس دوران ہنی مون منانے والا کسی آشوب ہی سے دوچار کیوں نہ ہو اور میرے نزدیک تو اس قسم کی باتوں میں مداخلت' روک ٹوک یا ناگواری کا اظہار حقوق انسانی کی خلاف ورزی کی صف میں آجاتا ہے (یہ دوسری بات ہے کہ اب حقوق انسانی بھی سپرپاور کے تحفظات سے برکت ہیں) بہرحال اب میں ایسی بھی نہ تھی کہ اس کے اس حق پر ڈاکہ ڈالتی۔

اور پھر اس کا آشوب کہ وہ ایک طرح سے معطل ہے۔ اس کی تنزلی کے امکانات آنے والے ہیں اور اس کو کسی دور افتادہ اور غیر نفع بخش علاقے میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ صرف بڑی بیگم صاحب نے اپنے بعض پیپرز کی تیاری کی بناء پر اس کو ریلیز نہیں کیا ہے کہ وہ چاہتی ہیں کہ سال سوا سال بعد وہ ریٹائر ہوں تو ان کے کاغذات ہر طرح سوالہ آنے درست اور مرتب ہوں۔ بس یوں ہی ان کی فائل مرتب ہوتی نہیں کہ انہوں نے اس کو ریلیز کیا نہیں۔ پھر ان کے بلا سے وہ جائے جہنم میں۔

سچی بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے بھی اس کے آشوب کا احساس نہ ہوا کہ مجھے تو خود جیل کی سلاخیں نظر آرہی تھیں (بقول اس جاری شدہ نامعقول سمن کے) سو اب مجھے تو اس کے گھر جانا ہی تھا۔ البتہ یہ ضرور خیال آتا رہا کہ اب اس پوزیشن میں تنزلی کے بعد اور کون سا گریڈ اور پوزیشن ملے گی نامراد کو؟ اور یہ کہ یہ والی شادی راس بھی نہ آئی اسے۔ اب کوئی غلطی کر ہی بیٹھے تو اس کی اتنی فوری اور کڑی سزا تو نہیں ملنا چاہیے نا اس کو۔

گھر پہونچنے کے تھوڑی دیر بعد بابو آگیا سکول سے ۔ بابو جم خانے کے ہیڈبیرے کا بیٹا تھا اور اس کے والد نے اس کو تعلیم کی غرض سے میرے پاس چھوڑا ہوا تھا۔ وہ نویں جماعت میں پڑھ رہا تھا ان دنوں اس کے ہاؤس ایگزام سر پر کھڑے تھے۔ سکول سے آکر کھانا کھاتے ہی اپنے کمرے میں بند ہو جاتا۔ نہیں معلوم سو جاتا تھا یا پڑھائی کرنے لگتا تھا۔ بہرحال میں اس کو ڈسٹرب نہیں کرتی تھی۔ اس دن وہ کھانا کھا رہا تھا تو میں نے اس سے کہا۔" بیٹا آج تم کو تکلیف دوں گی۔ کھانا کھا کر تیار ہو جانا۔"

"کہیں جانا ہے کیا؟"

" ہاں بیٹا بہت ضروری کام ہے اور دیکھو یہ پتہ۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہے کہاں یہ جگہ!"

"اگر آپ بس سے چلیں تو آسانی سے پہنچ جائیں گے۔ مجھے اس روٹ کی بس کا نمبر معلوم ہے ایک دو بار ادھر گیا ہوں۔"

بابو پانچ فٹ اور سات انچ اونچا پلا پلایا تیار لڑکا' بڑا صاف ستھرا بیضوی چہرہ اور دھنسی ہوئی گہری گہری آنکھیں' سانولی رنگت صحت مندی کے باعث گندمی سے نظر آتی۔ میری نگرانی اور طور طریقوں سے رہنے کے باعث اس کے چہرے کے تاثرات اپنے گھرانے اور طبقے سے بہت مختلف نظر آتے تھے ورنہ تو اس کے باپ کی معقول

آمدنی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا گھرانا خود روزگاری کی سکیم پر خود بخود بغیر کسی تحریک کے عمل پیرا تھا اس لئے خاندانی منصوبہ بندی والوں کا نعرہ یہاں بدل گیا تھا۔ وہ بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ زیادہ بچے بہت خوش حال گھرانا۔ البتہ اس کو پڑھوا رہے تھے۔ بہت اچھا پہناتے تھے اور وہ ہر طرف سے بے فکر تھا۔ بے فکری تحفظ اور ماحول نے اس کے چہرے کے تاثرات میں نرمی اور سیدھا پن پیدا کر دیا تھا۔ کہنا کہا کر اس نے یونیفارم اتاری اور نہا دھو کر تیار ہو گیا میں تو تیار ہی بیٹھی تھی ------ چل پڑے۔

بس ایک لمبے روٹ سے گزر کر اسٹینڈ پر رک گئی تھی۔ لمبے فاصلے کے باوجود راستہ سیدھا سادا تھا۔ سامنے ہی وہ پارک تھا جس کی نشاندہی کی گئی تھی جس کے بائیں جانب چھوٹی سی مسجد تھی اور دائیں طرف نیشنلائزڈ ہائی سکول تھا۔ سکول کے ساتھ سرخ اینٹوں سے پاٹنہ صاف ستھری گلی تھی۔ پوری گلی پر عجب افسردگی سی طاری تھی جیسے کسی حادثے یا طوفان سے پہلے ہرشے دم بخود ہو جائے۔ ویران اور خاموش گلی کے دونوں جانب لوئر گریڈ کے سرکاری کلرکوں کے رہائشی کوارٹروں کا ایک سلسلہ تھا۔اڑی اڑی سی پیلی رنگت والی دیواروں اور سرمئی رنگ کے کواڑوں والے چھوٹے چھوٹے کوارٹر اپنی مکانیت اور گنجائش کے خود گواہ تھے۔ تاہم یہ بھی اللہ کا احسان ہی تھا ان جیسوں پر۔ ان کوارٹروں کی دیواروں میں سے بعض کے پیچھے پن میں ایک روشنی یا قدرے چونچال کا احساس ہوتا اور بعض بعض پر وہ افسردگی اور اداسی تھی جو پیہم بہت بارشوں میں بھیگتی رہنے والی بعض پرانی عمارتوں پر آجاتی ہے۔ کسی کسی مکان کے صحن میں سر اٹھائے کھڑا کوئی پیچے یا دھریک کا پیڑ بھی نظر آرہا تھا۔

وہ مکان جس میں ہمیں داخل ہونا تھا ایسی ہی بھیگی بھیگی اداسی میں بھیگا بھیگا نظر آرہا تھا۔ اس کے صحن سے سر اٹھاتے ہوئے دھریک کے گہرے سیاہی مائل سبز پتے بھی بڑے اداس تھے اور غمزدہ تھے۔ دن ڈھل رہا تھا' اور دھوپ میں بچے ہوئے سونے جیسی ملول اور غمناک زردی بڑی سستی اور بے دلی سے دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ مکان کا چوبی سرمئی دروازہ اندر سے بند تھا۔ بابو کے بار بار کنڈی بجانے پر ایک مریل سا لڑکا جو سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں نظر آتا تھا' دروازے میں سے جھانکا۔ میں نے جلدی سے صاحب خانہ کا نام لے کر پوچھا کہ یہ ان کا ہی گھر ہے۔

"ہے تو یہی مگر وہ باہر گئے ہیں۔" اس کا قطعی ارادہ نہ تھا کہ وہ ہمیں اندر بلائے۔ لاتعلقی اور بے دلی سے جواب دے کر جوں کا توں کھڑا تھا۔

"کب تک آئیں گے ؟"

شاید وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ہماری بات کا جواب دے یا نہ دے کہ پیچھے سے ایک ہاتھ نے کالر سے پکڑ کر اسے کھینچا اور دروازے سے الگ کیا اور اب وہ خود آدھی اندر آدھی باہر ہوئی کھڑی تھی۔ ہم نے اپنے سوال دہرائے۔

اس نے وہی جواب (لڑکے والے) رکھائی سے دہرائے۔ وہ بھی ہمیں اندر بلانے کے موڈ میں نظر نہ آتی تھی۔

میں بے کسی سے اس کی صورت تک رہی تھی۔ کالی کلجھنویں رنگت' روکھی اور بے رونق آنکھیں' اجڑے اجڑے بال بالکل روڑھا سا منہ اور اس پر جابجا چکتے جھائیوں کے نشان یوں لگا جیسے اس خالی

اورنگ زیب قاسمی

خالی ویران مکان میں بسی ہوئی کوئی بدروح سامنے آکھڑی ہوئی ہو۔ ابھی وہ دروازہ بند کرنے ہی والی تھی کہ اس کی نظر بابو پر پڑی جو میرے بائیں ہاتھ قدرے فاصلے سے کھڑا ہوا تھا۔ یہ شاید میرا ہی وہم ہو' تاہم اس لمحے میں نے اس کی خالی خالی اور ڈھنڈھار آنکھوں میں ایک کوندا سا لپکتا دیکھا تھا جیسے کسی نے بجھتے دیئے کی لو کو اکسا دیا ہو۔

"آپ اندر آجائیں۔" اس نے دروازے سے ہٹ کر بڑے تپاک سے کہا اور ہم جو اس دعوت کے منتظر ہی تھے جلدی سے اندر داخل ہوئے۔ دروازے کے ساتھ والے اس چھوٹے اور تنگ کمرے میں ایک سال خوردہ' بغیر وارنش والی سینٹر ٹیبل کے ساتھ فقط ایک ہی کرسی رکھی تھی۔ وہی عام سی کرسی جو بید کے بجائے پلاسٹک سے بنی گئی تھی۔ کرسی بھی میز کی طرح ہی عمر رسیدہ اور بلا وارنش تھی۔ غالباً" نہیں یقیناً" یہ کمرہ بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا جس میں ایک کرسی اور چار افراد اس وقت موجود تھے لڑکی نے لڑکے کو آنکھیں دکھائیں کچھ اشارے کئے تو وہ اندر سے اسی کرسی کی جوڑی ایک کرسی اور اٹھا لایا۔ ابھی وہ کرسی رکھ ہی رہا تھا کہ وہ خود لپک کر اندر گئی اور ایک اور زیادہ پرانی کرسی اٹھا لائی جس کی ایک ٹانگ ہل رہی تھی وہ کرسی رکھتے ہی اس پر خود جم کر بیٹھ گئی اور بقیہ دو کرسیوں کی طرف اشارہ کیا "بیٹھیے" میں نے بابو سے کہا "بیٹھ جاؤ بیٹا" اور خود بھی تیسری کرسی سنبھالتے ہی سوال کیا "تم ان کی کون ہو ؟"

"جی میں ان کی بیٹی ہوں۔" وہ کچھ جھینپ رہی تھی۔

میں نے کچھ خیال نہ کیا اور اپنے مطلب کا سوال پھر جڑ دیا "کہاں گئے ہیں تمہارے والد اور کب تک آجائیں گے ؟"

"جی وہ امی کے ساتھ گھومنے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر تک آجائیں گے۔"

"کچھ اندازہ ہے کب تک ؟"

"بس آتے ہی ہوں گے۔"

قدرے اطمینان ہوا تو میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا --- خیر جیسی بھی وہ تھی اس وقت شرمانے اور جھینپنے کی کوشش یا ایکٹنگ میں مصروف تھی۔ اس چہرے پر کسی بہاریں کیفیت یا کسی رنگ کے آنے جانے کی بات تو کرنا ہی فضول ہے' وہاں تو کوئی رنگ سرے سے موجود ہی نہ تھا البتہ یہ ضرور احساس ہو رہا تھا جیسے تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی پر جمی کائی کی سطح کے نیچے کوئی تموج سا سر اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور اب صاف بات تھی کہ وہ نہ جانے کس بناء پر اس خوش فہمی میں مبتلا ہو چکی تھی کہ میں اس کو دیکھنے اور اس کا رشتہ طے کرنے کی غرض سے آئی ہوں اور لڑکا میرے ساتھ ہے۔

"اچھا' ہم کچھ انتظار کر لیتے ہیں۔" میرے دل کو اپنی پڑی تھی۔

"ہاں ضرور ------ بس آنے ہی والے ہوں گے۔" اس نے گویا ہمیں لارا دیا ----- اور مڑ کر اس لڑکے کی طرف دیکھا جس کے لئے کوئی کرسی باقی نہ رہی تھی اور وہ اندھے دیئے اور بجھے ہوئے انگارے کی طرح کمرے کے ایک کونے میں خاموش کھڑا تھا۔

"جاؤ ----- جا کر ان کے لئے ٹھنڈی بوتلیں لاؤ۔" ---- لہجے میں تحکم تھا۔

"نہیں نہیں! یہ تکلف بالکل نہ کرنا۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ اس لئے کہ گھر کی صورت کمرے میں باری

باری آنے والی کرسیوں کی حالت سے زیادہ ان دونوں کے چہرے' ان کے لباس اور چپلوں کی حالت پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ وہ بوتلوں کی قیمت ان پر بڑا بوجھ بن کر نازل ہو گی اور میں یہ ظلم کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"پھر آپ چائے پی لیں۔"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے جاؤ تم چائے بنا لاؤ۔"

"مگر اس وقت چائے کی پتی ختم ہے اور چائے وہ لوگ لے کر آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے ان کو آجانے دو۔"

مگر وہ اس لڑکے کو ٹالنا چاہتی تھی شاید جلدی سے اس نے حکم دیا۔ "جاؤ تم جا کر گلو کی دکان سے پاپ سیٹ لے آؤ۔"

وہ ایک لفظ کہے بغیر چائے لانے کے لئے چل پڑا۔

"یہ تمہارا ملازم ہے؟"

"میرا بھائی ہے۔" اس نے سچ بولا۔ نہ بولتی تو کیا کرتی۔ وہ کس کس بات کو چھپاتی۔ اچانک ہی وہ بابو سے مخاطب ہوئی۔ "آپ آرام سے بیٹھ جائیں جی۔" یہ کہہ کر اس نے دستی پنکھا اٹھا کر اس کی طرف جھلنا شروع کر دیا۔ کمرے کی چھت پر بھی پنکھا نہ تھا۔

بابو کسمسا کر بولا۔ "نہیں ٹھیک ہے مجھے گرمی نہیں لگ رہی ہے۔ کوئی بات نہیں۔"

اس نے مسکرانے کی ایکٹنگ کی اور زیادہ تیزی سے پنکھا جھلنے لگی۔ مجھے احساس تھا کہ وہ اندر ہی اندر خوش ہے اور بہت پر امید ہے اس کا بھائی ایک ٹین کی تھالی میں پاپ سیٹ اور بسکٹ کا ایک روپیہ والا پیکٹ لے کر واپس آیا تھا۔

میرا دل اپنا مسئلہ بھول کر اب نہ جانے کیوں زاری میں مصروف تھا۔ لگ رہا تھا کہ اندر ہی اندر آنسوؤں کی بلدیہ برکھائیں سب کچھ بھگو جا رہا ہے۔ "آؤ بیٹا تم بھی تو ہمارے پاس بیٹھو۔" میں نے لڑکے سے کہا۔

بوکھلا کر وہ میرا منہ دیکھنے لگا۔ پھر ساتھ والے کمرے سے جا کر ایک چھوٹی سی تپائی اٹھا لایا اور ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا۔

"آپ کہاں پڑھتے ہیں؟" بابو نے وقت گزاری کے لئے اس سے سوال کیا۔

وہ خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھتا رہا اور اس کے بدلے وہ بول پڑی۔ "ارے کہاں۔ پہلے یہ بیمار پڑ گیا پھر فیل ہو گیا تو ابا جی نے اس کو ملازم کروا دیا۔ بات یہ ہے کہ اس کی یادداشت خراب ہو گئی ہے۔"

"اس عمر میں؟ ---" میں نے سوچا یہ کون سی ملازمت کر رہا ہے۔ "تمہاری کیا جاب ہے بیٹے؟"

وہ پھر اس کے بدلے بول پڑی "جاب کیا ہوتی تھی۔ بس پی این لگوا دیا ہے ابا جی نے۔"

میرا تو یہی خیال تھا کہ لڑکے کا دل رو رہا ہے مگر وہ بالکل خاموش تھا۔

چائے پیتے پیتے اور چھوٹے چھوٹے سوال جواب میں ایک گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا "ہمیں تو بالکل شام ہو جائے گی" میں کسی سے مخاطب نہ تھی مگر جواب اسی نے دیا۔

"آتے ہی ہوں گے۔ بات یہ ہے کہ وہ دادا جان اور دادی جان سے ملتے ہوئے آئیں گے۔ آپ تھوڑا سا انتظار اور کر لیں۔"

اورنگ زیب قاسمی

اگلے دو گھنٹے تک وہ مجھے روک روک کر بتاتی رہی ویسے مجھے تو بیٹھنا تھا چاہے رات ہو جائے۔ مختلف باتوں کے دوران ایک موقع ایسا بھی آیا کہ اس نے کہا "آئیے میں آپ کو گھر دکھا دیتی ہوں۔" اور اب میں سوچتی ہوں میرے کن سوالوں کے جواب میں اس نے یہ فیصلہ کیا تھا۔

گھر میں دو کمرے اور تھے آگے مختصر برآمدہ اور برآمدے کے ایک طرف اسٹور تھا۔ برآمدے کی دو سیڑھیاں اتر کر ہم صحن میں پہنچے۔ ایک طرف باورچی خانہ اور اس کے ساتھ ہی غسل خانہ تھا۔ ان کی حالت کو دیکھتے یہ گھر بہت غنیمت سے بھی کچھ زیادہ تنگ رہا تھا۔ صحن کی دوسری طرف دھریک کے گھنے پیڑ تلے' بان کی ایک جھولا سی چارپائی پر ایک زندہ پنجر میلی سی چادر تلے پڑا تھا۔ -- بڑا عجیب سا وجود تھا۔ اتنا نحیف و نزار کہ پہلی نظر میں تو اس کے ہونے کا احساس بھی نہ ہو لیکن اس پر ایسی نحوست کہ صحن کے اس پورے گوشے میں' اس چارپائی پر اور خود اس پر سایہ افگن دھریک کے پورے گھن دار پیڑ پر ایسی ویرانی' ایسا الم طاری تھا کہ سمایا نہ جاتا تھا' اور اس سب سے بڑھ کر اس ڈھانچے کے چہرے کے گڑھوں میں فٹ دو آنکھیں بالکل دھندلا اور سوکھے تالاب جیسی کہ جس میں نہ درد نہ کرب اور نہ تکلیف کا شائبہ نہ شکوہ نہ حسرتیں نہ یاس بس خالی چپ اور بے تاثر آنکھیں --- عجیب سی حالت تھی۔ دل چاہتا تھا کہ اس جھٹکے سے پلنگ کی پٹی پکڑ کر دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دوں --- اس پلنگ کے قریب کھڑے ہوئے میری نظر صحن کے دوسرے گوشے میں باورچی خانے پر پڑی۔ اس دور میں اس باورچی خانے میں مٹی کا چولہا نظر آ رہا تھا جو لکڑیوں کے دھوئیں سے اتنا کالا ہو چکا تھا کہ اس کی مٹی بھی نظر نہ آ رہی تھی۔ راکھ اور دھول سے اٹے چولہے ادھ جلی لکڑیوں میں بجھان سا پڑا تھا جیسے کسی کی موت ہو جانے پر جلتے چولہے پر پانی ڈال کر کسی نے آگ ٹھنڈی کر دی ہو۔ سلور کی بہت پرانی دیگچیاں بھی دھوانسی ہو ہو کر مستقل سیاہ نظر آ رہی تھیں اور یہ دن ڈھلے اترتی شام کا سماں تھا جب گھروں میں چولہے روشن کئے جاتے ہیں اور جو بھی میسر ہانڈیاں چولہوں پر چڑھا دی جاتی ہیں مگر --- یہاں --- یہاں تو تنگی والے گھر کے چولہے چوکے کا سماں تھا عجیب سا کرب و ملال میرے اندر ہزار پائے کی طرح اپنی بے شمار ٹانگیں کھبوتا جا رہا تھا --- ساتھ ہی ایک پچھتاوا تھا کہ آخر میں یہاں آئی ہی کیوں۔ اس سے تو ہزار درجے بہتر ہے کہ آدمی جرمانے اور سزائیں بھگت لے یا سے ہاتھ خالی ہو جائے مگر کھجورے کی باریک باریک دھاگے جیسی بے شمار ٹانگوں سے تو وجود محفوظ رہتا۔

اس احساس سے بچنے کے لئے میں نے اس پنجر کی طرف اشارہ کیا "یہ کون ہیں؟"

سپاٹ چہرہ لئے سپاٹ آواز میں اس نے جواب دیا "یہ بڑی امی ہیں۔"

وہ اس ڈھانچے کی طرف لاتعلقی سے یوں دیکھ رہی تھی گویا اس کے سامنے بڑی امی نہیں بلکہ آخری سانسیں پوری کرتا ہوا خارشی کتا پڑا ہو۔

"بڑی امی! کس کی؟" میں نے جیسے خواب میں دہرایا۔

"ہم سب کی --- یہ جو سب بھائی بہن آپ دیکھ رہی ہیں یہ سب ان ہی کے --- ہاں یہ ہماری ماں ہیں۔" یہ کہتے وقت اس کا چہرہ اور آواز بالکل سپاٹ تھی' البتہ قریب کھڑے ہوئے بڑے والے لڑکے کی (یعنی جو صرف سترہ سال کی عمر میں نائب قاصد کی ملازمت پر کھڑا ہو چکا تھا) آنکھوں میں دکھ تھا' رحم تھا' سانسوں کی آمد و رفت میں جکڑے ہوئے اس پنجر کے لئے ملال تھا۔

دن اپنے زوال کے آخری کنارے پر پہنچ رہا تھا یعنی عصر مغرب کے درمیان ٹھہر گیا۔ یہ بھی عجیب وقت ہوتا ہے لوگ زوال کے اس وقفے کو اکلاج کی ساعت اور گھڑی کے طور پر سعید سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دم واپسیں عالم نزع خواہ دن یا رات کی کوئی ساعت بھی ہو' نزع میں مبتلا انسان کو عصر اور مغرب کی درمیانی ساعت ہی نظر آتی ہے اور میرا دل اس حالت سے قریب تر تھا اور اس کیفیت سے نجات پانے کے لئے میں وہاں سے ہٹ کر دالان اور دالان سے بیٹھک میں آگئی ۔ ۔ ۔ "بابو تم کو توکل کے لئے اسٹاپ کرتا ہے۔"

"جی" وہ بے چارا بڑے صبر سے بیٹھا تھا گرمی اور حبس میں سر جھکائے۔ میرا خیال ہے ماحول نے اس کو افسردہ کر دیا تھا" چلو پھر تم چلے جاؤ۔ میں ایک گھنٹہ انتظار کر کے آجاؤں گی ۔ ۔ ۔ ہاں مگر مجھے وہ اسٹینڈ دکھاتے جاؤ جس سے تم سوار ہو گے تاکہ وہ واپسی میں کسی غلط اسٹینڈ پر نہ کھڑی ہو جاؤں۔"

وہ یوں اٹھا جیسے برسوں کی قید کے بعد اس کو رہائی کا پروانہ ملا ہو میں اس کے پیچھے نکل آئی میں نے دیکھا وہ دروازے سے لگی خالی خالی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہی ہے ۔ میں مڑ کر دروازے تک آئی "میں ابھی آتی ہوں دروازہ نہ بند کر لینا ۔" اطمینان کی ایک گہری سانس لے کر وہ دروازے سے ہٹ گئی اور پھر اس کو بس اسٹینڈ پر کھڑا چھوڑ کر جب میں واپس آئی تو یوں لگا جیسے دروازے کو ہماری واپسی کا شدت سے انتظار ہے ۔ میں چپ چاپ جا کر بیٹھک والی کرسی پر بیٹھ گئی مزید انتظار کرنے۔ اسی آن وہ اندر سے آگئی ۔ ۔ ۔ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے اس نے کھڑے کھڑے سوال کیا ۔ ۔ ۔ "اور وہ کہاں ؟ ۔ ۔ ۔ وہ کہاں گئے ؟"

"کون ؟" میرے ذہن کے کسی گوشے میں بھی بابو کا اس انداز میں خیال موجود نہ تھا کہ وہ اس کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اتنی بے تابی سے سوال کرے گی۔ "وہ جو آپ کے ساتھ آئے تھے ؟"

"اچھا وہ ۔ ۔ ۔ اسے تو میں نے گھر واپس بھیج دیا۔ اس کا صبح امتحان ہے اور مجھے نہ جانے کتنی دیر بیٹھنا پڑے۔" یہ کہتے میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑ گئی۔ اف توبہ ۔ ۔ ۔ خدایا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی خاک دھول سے بھرے میدان میں کھڑی ہو اور آندھی کے جھکڑ چل رہے ہوں اور جھکڑوں میں بگولے اٹھتے ہوں۔ خاک و دھول کے بھنور جن میں کہتے ہیں جنات کی براتیں اور جنازے سفر کرتے ہوں۔ اور مجھے یہ لگ رہا تھا جیسے ان بگولوں میں جنازے ہی جنازے سفر کرتے ہوں اس کی آنکھوں اور چہرے کے سارے نشیبوں میں خاکستری دھول کے سوا اب کچھ نہ تھا ۔ ۔ ۔ اس نے نفرت اور غصے سے ناک چڑھائی۔ دونوں ہاتھوں کو یوں جھٹکا جیسے کہتی ہو' تو پھر تم بھی دفع ہو جاؤ ۔ ۔ ۔ اب بیٹھے کاکیا تک ہے جبکہ جو دیکھنے اور دکھانے کی چیز تھا وہ تو جا چکا ہے۔ اس نے میری طرف سے منہ پھیر لیا اور لمحہ بھر پیٹھ موڑے کھڑی رہنے کے بعد پیر پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔

ہاں میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اس نے بظاہر قصور پیر پٹخنے تھے اور بابو ہی کا انتخاب کیا تھا ۔ ۔ ۔ اور ساتھ ہی وہ پنکھا بھی اٹھالے گئی تھی جو تپاک اور خاطر مدارات کی علامت تھا اور اب مجھے گرمی محسوس ہو رہی تھی لیکن یہی لمحہ ذرا سپ سین کا لمحہ تھا۔

آگے آگے سبزیوں' گوشت' پراٹھوں اور دیگر اشیاء سے ٹھسا کینوس کا تھیلا اور چھتری پکڑے' اس کے ساتھ ہی پختہ عمر' لونیاچتا پرائمری سکول کی ٹیچروں والا چھب دار چہرہ' پیروں میں لیاری کی گلی سطح والی دکانوں سے لیا ہوا سنہری سینڈل' سستے ریشم کلپر شلوار جوڑا اور پورے وجود کو ایک آسمانی رنگ پھولدار چادر سے لپیٹے

'وہ لونیاچتا جوڑا اندر داخل ہوا چہروں پر ٹھنڈی بوتلوں اور فالودے کی ٹھنڈی میٹھی پھوار نے عجیب سی ہلکی پھلکی کیفیت پیدا کر دی تھی اس چھوٹی سی آؤٹنگ نے ۔ ۔ ۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک لمحہ کو چونکا اور دوسرے ہی لمحے یوں اپنی فارم میں آگیا کہ میں اس کے اعصاب پر ششدر رہ گئی ۔ ۔ ۔ اور خود مجھے ایک لمحہ کو احساس ہونے لگا کہ میں اس کے گھر کسی ذاتی کام سے نہیں بلکہ کرٹسی کال پر آئی ہوں۔ اس کے غیر متوقع عقد ثانی پر مبارک باد دینے 'وش' کرنے آئی ہوں۔

سب سے پہلے تو اس نے غریب خانے اور قدم رنجہ فرمانے والی گفتگو کا آغاز کیا اور ساتھ ہی یہ سوال کیا کہ آپ چائے پئیں گی یا ٹھنڈا ؟

شام ڈھل چکی تھی ۔ رات کے سائے اندر رینگ آئے تھے اور میرا دل سخت گھبرا رہا تھا۔ میں نے اپنے آنے کا سبب مختصر ترین الفاظ میں بیان کرتے ہوئے بیگ میں سے سمن نکال کر اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔ "دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ ایک دن یہ نوبت بھی آجائے گی۔"

اس کی نئی نکور پختہ عمر اور پکے سے چہرے والی بیگم اس تمام مسئلے کو ترچھی نظروں سے دیکھتی اپنا پرس پکڑے چادر اتارتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اندر جہاں نحوست ۔ کے سائے تھے۔ پرچھائیں کا یہ وہ تھا' فرزہ آسیبوں کی شکلوں اور خالی خالی آنکھوں والے بچے تھے۔ جہاں دھریک کے سائے تلے اپنی سانسوں کا شمار پورا کرتا ہوا زندہ ڈھانچہ تھا۔ ڈھانچہ جس نے ان تمام کونے کھدروں میں بچھے مرگھٹ کے سایوں کو جنم دیا تھا۔ ۔ ۔ میرا جی چاہا تھا کہ اٹھ کر اس کے قریب جا کر پوچھوں " تمہیں ڈر نہیں لگا اس عفریت خانے میں داخل ہوتے وقت اور دھریک تلے سانسیں لیتے ہوئے ہڈیوں کے اس پنجر کی سوکن بنتے ہوئے ؟" مگر مجھے اپنی جلدی پڑی تھی میرے ہاتھ میں سمن دیکھ کر اس کی آنکھیں جھلی ضرور تھیں لیکن اس کے سکون اور قرار میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

"آپ چائے یا ٹھنڈا تو پی لیں۔"

"چائے مجھے آپ کے بچوں نے پلا دی ہے۔ بڑے اچھے ہیں بے چارے۔"

اور یہ بے چارے کا لفظ میرے منہ سے بے خیالی میں نکلا تھا ورنہ مجھے اس وقت اس پورے کنبے سے زیادہ ان افراد پر رحم آرہا تھا' جو اس بھوت کدے سے نکل کر دو گھڑی ٹھنڈی سڑک کی ہوا کھا کر بشاش نظر آرہے تھے ۔ ۔ ۔ سچ پوچھیے تو اس وقتی بشاشت کو محسوس کر کے دل رو رہا تھا ۔ ۔ ۔ مگر اس " بڑے اچھے ہیں بے چارے " کو اس نے ایک کومل منت کے طور پر قبول کیا تھا۔

" اچھا آپ اس وقت تو تھکے ہوئے ہیں اور مجھے بھی واپسی میں رات ہو جائے گی۔ میں کل آکر تفصیل سے بات کرلوں گی آپ کس وقت موجود ہوں گے ۔" (دراصل میں اب زیادہ دیر تک اس غم کدے میں رہنا نہیں چاہتی تھی۔)

" ارے نہیں۔ آپ اب زحمت نہ کریں مجھے آپ کا کیس معلوم ہے یہ اتنی بڑی اور پیچیدہ بات تو نہیں۔ یہ انکم ٹیکس والے یوں ہی ڈراتے ہیں آدمی کو میں سارے کاغذات درست کروا کر آپ کو سٹیلمنٹ بتلا دوں گا۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "میں چار بجے تک آجاؤں گا آپ کے گھر پر ۔"

کاش اگر پہلے ہی اتنے پولائٹ اور ذمہ دار ہوتے تو ہیں یہاں آکر یہ خدا واسطے کا درد کا ہے کو مول لیتی۔

اورنگ زیب قاسمی

۔ ۔ یہ بات میں نے کہی نہیں تھی صرف سوچی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" میں چل پڑی۔

اس نے قاصد بیٹے کو میرے ساتھ بس سٹینڈ تک بھیجا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ایک بجھا ہوا دیا اٹھا کر میں ہوا میں چل پڑی ہوں ۔ ۔ ۔ ہاں اس لڑکے کو دیکھ کر یہی تو خیال آتا تھا۔

بس میں اطمینان سے بیٹھ چکنے کے بعد میرا ہاتھ بے اختیار سر کے اس حصے پر گیا جہاں حرام مغز کا ہونا بتایا جاتا ہے۔ سچ جانئیے بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے ٹھنڈا ٹھنڈا گلگلا ہزار پایہ اندر ہی اندر گھستا چلا جا رہا ہو۔

اگلے تمام دن اس لڑکی کے چہرے کے صحرا میں اٹھتے بگولوں کے درمیان جنات کے جنازوں کو سفر کرتے دیکھتی رہی۔ سارے بگولوں کے درمیان ایک بارات بھی سفر کرتے نظر آئی تھی۔ مجھے تو اپنے کام کی سدھ بدھ ہی نہ رہی۔

دن کے تین بجے ہوں گے جب بابو نے نیچے سے اوپر آکر مجھے اطلاع دی۔ "وہ آپ کے آفس کے کلرک آئے ہیں۔" میں چونک گئی۔ "اچھا ۔ ۔ ۔ بلا لو میں نیچے آتی ہوں" یقین جانئیے نہ اس کی آمد کی توقع تھی نہ ہی اپنے کام کے مکمل ہونے کی۔

وہ صحن میں ناشپاتی کے پیڑ کے نیچے سر جھکائے کھڑا تھا۔ واقعی کیس تو اس نے میرا اپنے تک سے درست کروایا تھا گویا کوئی بگاڑ ہوا ہی نہ تھا گرمی غضب کی تھی۔ لو چل رہی تھی میں نے بابو کو اشارہ کیا ۔ ۔ ۔ وہ روح افزا کا ٹھنڈا ٹھنڈا گلاس لے کر آیا تو اس نے خلاف معمول تکلف کا اظہار کیا۔ تاہم جب گلاس اس نے پکڑ لیا تو میں نے کہا ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ برا تو نہ مانو گے؟"

وہ ایک ایسے بچے کی طرح نروس ہو گیا جو بالکل ہی رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔ تاہم دبی ہوئی آواز میں بولا "فرمایئے"

اب میں کہنا تو بہت چاہتی تھی۔ بتاؤ یہی کہ ابھی بھی کیا جلدی تھی ۔ اس نیک بخت بجر کو اپنی سانسیں پوری کر لینے دی ہوتیں مثلاً" یہ کہ لڑکے کا حافظہ اور ذہن ساتھ نہیں دے رہا تھا تو اس کو یہ نائب قاصد بنانا کیا ضرور تھا کوئی ہنر ہی سکھلایا ہوتا۔ کیا تم اس کو کنڈکٹر بھی نہیں بنوا سکتے تھے؟ اور یہ کہ لڑکی کی پڑھائی کیوں ختم کر دی۔ مڈل تو پاس کروا لیتے لیکن منہ سے کوئی بات نکلنے سے پہلے میری نظر اس کے چہرے پر پڑی تو میرا دل لرز گیا۔ اس چہرے پر تو وہ بسنت پھول رہی تھی جو یرقان کے حملے سے بہت قریب انسان کے چہرے پر کھنڈی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے ہوئے تھے۔

میں ایک لفظ بھی تو منہ سے نکال نہ سکی' البتہ کہا تو صرف اتنا ۔ ۔ ۔ "بچی کی تعلیم اگر ختم ہو جائے یعنی درمیان سے بھی بہت پہلے ہی رک جائے تو اسے بٹھائے رکھنا کون سی عقل مندی ہے۔ مانا تمہاری بچی بہت نیک اور خاموش ہے ۔ ۔ ۔ مگر ۔ ۔ ۔ دیکھو جو کوئی رشتہ آئے اور اس کے لئے بہت نامناسب نہ ہو تو اس فرض سے ادا ہو جاؤ۔"

"آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔" اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا آنکھیں سوکھے تالاب کی طرح خشک اور پیاسی تھیں۔ اس وقت تو مجھے اپنے ہلکے پھلکے پن کا احساس ہو رہا تھا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا لیکن مجھے یہ احساس جرم بھی ہراساں کر رہا تھا کہ آخر میں نے اس اندھے دیئے اور پانی میں ڈوبے انگارے کو بکسر

اورنگ زیب قاسمی

نظر انداز کیوں کر دیا تھا۔ ایک بات بھی نہ کی اس کے بارے میں۔

پتہ نہیں بہت سی باتیں کر دینا آسان ہوتا ہے لیکن ان پر عمل درآمد اتنا سہل! میں نہیں کہہ سکتی کہ اس نے میرے مشورے پر عمل کر لیا ہوگا کہ نہیں۔ اتنا وقت گزر چکا ہے کہ مجھے اب یہ سب باتیں قاعدے کی رو سے بھول جانا چاہیے تھیں۔

لیکن یہ کیا بات ہے کہ وہ ہزار پایہ بہت تومند اور چاق چوبند انداز میں میرے حرام مغز سے پیوست ہے اور رہ رہ کر کلبلاتا اور اپنے ہزار پیر میرے وجود کے اندر گھبوتا ہے تو میں بہت بے چین ہو جاتی ہوں۔ آندھیاں آتی ہیں بگولے اٹھتے ہیں جن کے درمیان جنات کے جنازے سفر کرتے ہیں اور وہ اندھا چراغ' وہ بجھا ہوا انگارہ کونے میں کھڑا سب کچھ دیکھتا نظر آتا ہے۔

("فنون" لاہور)

چاند، چاندنی اور شہزادہ فلک سیر

چاندنی رات اور وہ بھی برسات کی! آسمان پر ہلکے ہلکے ٹکڑے لیتے ہوئے بادل چاند سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اونچے نیچے راستوں پر لوگ چہل قدمی میں مصروف تھے نیچے مارکیٹ میں خریداروں کا ریلا آ اور جا رہا تھا۔ اس سے بھی نیچے دریائے سوات شور مچاتا ہوا بہہ رہا تھا لیکن آواز نہیں آ رہی تھی۔ بس پھواریں برساتا ہوا پانی چاندنی میں دودھیا لگ رہا تھا۔

"وہ کیا حسن ہے! جنت اس سے زیادہ حسین ہو سکتی ہے؟ اور نیچے بہتا ہوا یہ پانی 'کوثر و تسنیم ہی ہے۔ کیا بات ہے اس کی! یہ اپنا چمن ہے اپنا چمن ہم اپنے وطن کی ...." میں نے قلم ہاتھ میں پکڑتے ہوئے سوچا۔

پچھلے کئی دنوں سے ہم کلام میں مقیم تھے۔ ہمارا سارا کالج ہی یہاں موجود تھا۔ میں ان میں سے ایک تھا اور اپنے نئے ناول کے لئے مواد جمع کر رہا تھا جھٹ سے بجلی چلی گئی۔ سارا ہوٹل اندھیرے میں ڈوب گیا۔ معمول کے مطابق یہ لوڈشیڈنگ کا وقت تھا۔ میں نے برآمدے سے نیچے جھانکا۔ مدینہ مارکیٹ جنریٹر سے منور تھی۔ سامنے سڑک اجاڑ لگ رہی تھی۔ کمرے جنریٹروں سے روشن ہو گئے تھے لیکن برآمدہ تاریک تھا اور احاطہ پھیکی چاندنی میں بے رونق ہو گیا تھا۔

احاطے میں بچے بکھرے ہوئے تھے اور دھند اور اندھیرے کے باوجود کھیلتے نہیں تھک رہے تھے۔ "میری گو راؤنڈ" کے گرد ننھی منی مخلوق اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی اور ان کے درمیان وہ بھی کھڑی تھی جسے فلک سیر سے بڑی دلچسپی تھی اور ایک تھکے ہوئے داستان گو کی طرح وہ فلک سیر کی کہانی سناتے نہیں تھکتی تھی۔ فلک سیر اسے ہر حال میں احاطہ کئے ہوئے تھا۔ چاہے وہ جس رخ کھڑی ہو فلک سیر اس کے سامنے موجود تھا۔ جیسے وہ دبلی پتلی پانچ فٹ آٹھ انچ کی چودہ سالہ لڑکی فلک سیر کا سورج تھی اور فلک سیر سورج مکھی کہ جدھر وہ رخ کرتی فلک سیر سامنے ہی نظر آتا۔

میں پی ٹی ڈی سی کے ہوٹل کے برآمدے میں بیٹھا اپنا قلم مٹھی میں دبائے فلک سیر کی اس چہل سے محظوظ ہو رہا تھا۔ نہ جانے کتنے زمانے کے بعد اسے یہ موقع ملا ہے اور وہ اپنی آنکھیں سینکنے پر مجبور ہے۔ ورنہ اسے منع بھی تو کیا جا سکتا تھا کہ ۔ ۔ ۔ "بھلا چاندنی میں روئی کی طرح اڑتے گالوں کی درمیان برف پوش بلندی کو چھوڑ کر تم اس کمزوری جان کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو ۔ ۔ ۔"

لیکن میں نے اسے منع نہیں کیا کہ کہیں فلک سیر برا نہ مان جائے میں اس کے لئے بالکل اجنبی تھا اور سچی بات یہ تھی کہ فلک سیر نظرباز نہیں تھا۔ اس کے رویے میں عشق کی پاکیزگی ہو سکتی تھی اور ہوس کی آلودگی

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بچے ایک ہی انداز سے "میری گو راؤنڈ" پر اس کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ شور مچ رہا تھا۔ کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ چاند کی دھندلاہٹ میں وہ مجھے صاف نظر آ رہی تھی ۔ ۔ ۔ وہ جو اپنے گلابی آنچل کو غور سے دیکھ رہی تھی کہ صبح جو اس نے ادھر ادھر سے چن کر ستارے لگائے تھے وہ چمک کیوں نہیں رہے ۔ ۔ ۔ اور وہ یعنی فلک سیر اس کی یہ حرکت دور ہی دور سے دیکھ کر محظوظ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

شہزادی جس کا نام اس کی ماں نے ماہ رخ رکھا تھا' ماہ ۔ ۔ ۔ چاند کی کرنوں میں رنگ تلاش کر رہی تھی جبکہ چاندنی صرف اجلے پن کا نام ہے اور اس کی صبیح رنگت کی وجہ سے اس کی سہیلیوں نے اسے چاندنی کا نام دے رکھا تھا۔ فلک سیر ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اس کی ہر حرکت کو دیکھ کر نرمی سے مسکرایا اور اسے غور سے دیکھا ۔ ۔ ۔ وہ جو ماہ رخ تھی اور جس کا نام چاندنی بھی تھا' اور جس پر وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کے لئے اپنے دل و جان نچھاور کر دے' اس کے قدموں سے لپٹ جائے لیکن فلک سیر کے لئے یہ بات ناممکن تھی کہ ۔ ۔ ۔ اس کی زندگی میں بہت کم راتیں ایسی آئی تھیں جب خوشیوں کی چہکار اور پھولوں کی مہکار سے اس کی فضا رچ بس گئی ہو۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ یہ علاقے سنسان ہی رہے تھے۔ نیچے دریائے سوات چنگھاڑتا ہوا بہتا رہتا تھا اور اوپر وہ بے مزہ سی برف میں کروٹیں بدلتا رہتا مگر اب ۔ ۔ ۔ اب تو کچھ اور ہی منظر تھا۔ دریائے سوات کے شور کو انسانوں کے شور نے دبا لیا تھا اور اس کی برف کی چادر اسے اچھی طرح ڈھانپنے کی بجائے کہیں کہیں سے سرک رہی تھی اور اسے اپنی عریانی کا کوئی احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ایک نظر اپنی سرکی ہوئی چادر پر ڈالی' مسکرا کر خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ لڑکی نہیں ہے جس کے لئے چادر اور چاردیواری ضروری ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ اگر چادر سرک بھی گئی ہے تو کیا غم ہے۔ صرف چند دنوں کی بات ہے۔ موسم کی شدت اس کی پھٹی ہوئی چادر کو رفو کر دے گی۔ وہ آہستہ سے ہنسا۔ اس کے ہنستے ہی دور کہیں زوروں کی گڑگڑاہٹ ہوئی اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ ماہ رخ کا چہرہ اسے بے رنگ نظر آ رہا تھا۔

"شاید ڈر گئی ہے" وہ اپنے آپ میں سمٹ گیا۔

بچوں کی آواز بدستور آ رہی تھی اور "میری گو راؤنڈ" کی چوں چوں چڑیوں کی چہکار بنی ہوئی تھی ۔ ۔ ۔ ہوٹل کے کمرے جنریٹر کی روشنی سے منور ہو رہے تھے ۔ ۔ ۔ لیکن احاطے میں اب بھی اندھیرے نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ واپڈا والوں کی لوڈشیڈنگ کا وقت ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔

دھندلی چاندنی میں ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے مسافر چلتے پھرتے سائے لگ رہے تھے۔ کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ البتہ آسمان پر اکا دکا ستارے چمکتے نظر آ رہے تھے اور چاند بھی بادل کی چادر ہٹا کے بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ فلک سیر بھی اپنے سفید لباس میں دور سے کچھ زیادہ ہی اجلا لگ رہا تھا۔

میں نے قلم ہاتھ میں پکڑا اور اندھیرے میں میز پر پڑے کاغذوں کو ٹٹولا۔ ہوٹل کے کمرے بدستور جنریٹر کے طفیل جگمگا رہے تھے پر برآمدہ تاریک سے تاریک تر ہوتا جا رہا تھا۔

ٹھہرا تو میں بھی اسی ہوٹل میں تھا لیکن سارے دن میں میرا خیال کسی کو نہیں آیا۔ نہ دوسرے رفیقوں کو اور نہ ہی میرے ساتھ کمرے میں ٹھہرے ساتھی پروفیسر کو کہ میں جو اتنی دیر سے غائب ہوں تو اس اجنبی علاقے میں گیا۔ کہاں میں تو ان کے ساتھ گلیشئر دیکھنے بھی نہیں گیا اور سارے وقت اپنے کمرے کے

اورنگ زیب قاسمی

برآمدے میں بیٹھا کچھ لکھنے کی کوشش میں لگا رہا۔

لوگ کلام کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ میرے ساتھی خوشی سے سیٹیاں بجا رہے تھے۔ بچے کلکاریاں مار رہے تھے اور میری گورلانڈ چوں چوں کر رہی تھی اور میں مستقل سوچ رہا تھا کہ خوشیاں ہوتی کیا ہیں اور یہ جو اتنا چہک رہے ہیں کیا سچ مچ خوش ہیں۔ یہ مناظر ایسے ہیں کہ آدمی اپنا آپ بھول جائے اور میں --- مجھے کیا ہو رہا ہے کہ نہ جھیل کی طرف گیا نہ پارک کی سمت گیا اور نہ ہی مشہور زمانہ گلیشئر پر چڑھا بلکہ سیر سپاٹے کرنے کی بجائے اسکول کے برآمدے میں رزاق اور صوفی کو کھانا پکاتے اور لکڑیاں ڈھوتے دیکھتا رہا۔

یہ اسکول ہے! میں نے غور سے اس پیلے رنگ کی عمارت کو دیکھا اور یہ کمرہ یقیناً کلاس روم ہے جس میں اینٹوں کا چولہا بنا کر صوفی رات کے کھانے کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں دھوئیں کی وجہ سے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں اور صوفی بار بار الٹے ہاتھ سے انہیں صاف کئے جا رہا تھا۔ ہمارے اس صوفی کا نام زمان خان تھا۔ اسے صرف اس لئے صوفی کہا جاتا تھا کہ اس کی داڑھی تھی۔ اس علاقے میں ہر داڑھی والا صوفی ہے چاہے وہ ابھی طالب علم ہی کیوں نہ ہو۔ صوفی زمان خان جو ہمارے کالج کا خانساماں تھا' پانچ وقت کی نمازوں کا پابند تھا۔ اس کے صاف لباس اور روشن چہرے کو دیکھ کر پاکیزگی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ اللہ کا نیک بندہ تھا۔ عبادت گزار اور مخلص --- مگر اس کے حصے میں آگ دھواں اور تپش کیوں ہے۔ یہ تو دوزخ کے لوزامات ہیں --- میں نے سوچا تھا مگر الفاظ آہستہ آہستہ زبان پر آگئے۔

"جی --- جی ہاں سر۔ یہ آگ' تپش' دھواں بے شک دوزخ کے لوازمات ہیں مگر یہ سب کچھ دوزخ ہی کو پاٹنے کے لئے ہیں۔ دیکھیں نا۔ یہ پیٹ بھی تو دوزخ ہی ہے اور ہم کھانا اس دوزخ کے بھرنے کے لئے ہی پکاتے ہیں۔" صوفی فلسفہ بول رہا تھا۔

"صوفی یار تو بڑا پڑھا لکھا لگتا ہے۔"

"ہاں جی ہاں - میں پڑھا لکھا ہوں۔ قرآن پڑھ لیتا ہوں۔ خط لکھ لیتا ہوں اور کھانا --- کھانا پکا لیتا ہوں۔ بس اسکول نہ جا سکا۔ ہمارے زمانے میں ہمارے گاؤں میں کوئی اسکول نہیں تھا ---"

"اب ہے؟"

"جی سر' بڑا شاندار اسکول ہے۔ میرے بچے وہیں پڑھتے ہیں اور بڑا وہیں استاد ہے۔ حساب وغیرہ پڑھاتا ہے۔ چودہ جماعتیں پاس ہے میرا بیٹا۔" صوفی نے فخر سے اسے دیکھا۔

" واہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے --- اور صوفی جی یہ ہم جہاں بیٹھے ہیں' یہ بھی تو اسکول ہے اور آپ یہاں اس جگہ چولہا جلائے بیٹھے ہیں۔ یہاں کے بچے کہاں گئے؟" میں نے موضوع بدل دیا۔

"بچے سرجی کچھ نیچے چلے گئے ہیں اور کچھ یہاں ہوٹلوں میں وقتی طور پر بیرے لگے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں یہاں پر رونق ہو جاتی ہے نا۔ لوگوں کا روزگار چل جاتا ہے۔ آج کل یہاں گرمی کی چھٹیاں ہیں اس لئے اسکول بند ہیں۔" رزاق نے اسکول کے صحن میں بنے نلکے پر برتن دھوتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے بھئی۔ گرمی کی چھٹیاں ہیں مگر رزاق' یہاں کہاں ہے گرمی؟ پھر سردی کس کو کہتے ہیں؟ اس زمانے میں تعطیل! حد ہو گئی بھئی یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ دسمبر میں تو یہاں برف ہی ہوتی ہے --- پھر یہ تو یہاں کا موسم بہار ہے ---"

اورنگ زیب قاسمی

اب ڈرائیور پرویز کی باری تھی "کوئی زیادتی ویادتی نہیں ہے صاحب جی۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ یہ تعطیل تو بڑی ضروری ہے جی۔ اسکول کے بڑے اور بچے سبھی کام سے لگ جاتے ہیں۔ اس زمانے میں خاصی کمائی ہو جاتی ہے۔ کچھ نہیں تو دو وقت کی روٹی کے ساتھ ساتھ جوتوں کتابوں کا بھی تھوڑا بہت بندوبست ہو جاتا ہے۔ بچوں کے ماں باپ بھی یہی چاہتے ہیں۔"

"کیا؟" میں نے پرویز کو غور سے دیکھا۔

"ہاں جی میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہاں بڑی غربت ہے جی۔ لوگوں نے صاف رہنا تو سیکھ لیا ہے لیکن ان کی جیبیں بھی صاف ہی رہتی ہیں --- ہماری طرح۔" اس نے ہنس کے اپنی خالی جیب الٹ دی۔

" اوہو یہ تو واقعی خالی ہے --- چلو تم ہم سے کچھ لے لینا ---" میں نے ہنس کے کہا۔

"ارے نہیں سرجی۔ بات یہ ہے کہ یہ تو میں نے آپ کو حقیقت بتانے کے لئے کہا ہے۔ جی یہاں ہمیشہ سے بھوک ہے۔ صاف چہروں اور سرخ رنگت پر مت جاؤ۔ سر یہاں تو برف کے ساتھ بھوک ہی آتی ہے۔ ادھر مال روڈ میں آپ نے دیکھا تھا ناجگہ جگہ لوگ بوتلیں بیچتے تھے' پکوڑے تل رہے تھے' بسکٹ کے ڈبے ہاتھ میں پکڑے کھڑے تھے۔ سب کے سب اسکول میں پڑھتے ہیں --- اور ادھر جو آپ کو لکڑیوں کو بوجھ اٹھائے لڑکے نظر آتے ہیں ناجی' یہ بھی لکڑہارے نہیں ہیں۔ یہ اسی اسکول کے طالب علم ہیں جہاں ہم ' آپ بیٹھے ہیں۔ یہ اس ہوٹل اور آس پاس کے ہوٹلوں میں لکڑیاں پہنچاتے ہیں تاکہ ریستوران کے چولہے اور کمروں کے گیزر گرم رہیں اور ان کی آمدنی سے ان کے جھونپڑوں میں چولہے گرم رہیں۔ یہ زمانہ یہاں کے غریبوں کی جنت ہے جی - روزگار کا معاملہ ہے نا ---"

پرویز ڈرائیور اس علاقے کا رہنے والا تھا اور ایک چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا تھا۔ ذہین ' خوش شکل ' خوش مزاج' شگفتہ شگفتہ۔ اگر یہ کسی سردار یا خان کا بیٹا ہوتا تو -- ! میں اکثر اس کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ جب یہ بات کرتا تو اپنی فطری ذہانت کی وجہ سے لوگوں پر چھا جاتا۔ ہر کام میں دخل ضرور دیتا لیکن بگاڑتا نہیں تھا بلکہ ہر مسئلے کو بساط بھر سنبھال لیتا۔ مجال تھی کہ کبھی کسی مشکل سے ہار مان لے اور اس وقت بھی اپنی مشوری رائے سے ہمیں نواز رہا تھا۔

"کچھ پڑھا لکھا بھی ہے پرویز تم نے۔" میں نے اسے غور سے دیکھا۔

"ہاں جی کیوں نہیں - اخبار پڑھ لیتا ہوں۔ میں نے اس اسکول میں مڈل تک پڑھا ہے۔ یہ اسکول سرجی ہمارا بھی ہے۔" اس کی آنکھیں فخر و محبت سے جگمگا اٹھیں۔

"اچھا؟"

"ہاں جی - پر اس زمانے میں یہ ہوٹل موٹل کچھ بھی نہیں تھے ورنہ میں دسویں تک ضرور پڑھتا۔ ان کی طرح مزدوری کر کے۔"

اس کی آنکھوں کی جگمگاہٹ دھندلا گئی --- "مجھے پڑھنے کا بڑا شوق تھا صاحب جی۔ پر روزی روٹی بھوک --- ہماری بھوک مجھے پشاور لے گئی اور وہاں سے ایبٹ آباد اور اب پچھلے بارہ سال سے جی آپ کے ساتھ ہوں۔"

"تم پڑھتے رہتے۔ یہ سرکاری اسکول ہے۔"

"سرکاری ور کاری کیا ہے۔ اسے تو والی نے بنوایا تھا ۱۹۶۰ء میں۔"

"نہیں ایوب خان نے۔"

"رہنے دیں صاحب جی' آپ کو کیا پتہ جی۔ آپ پردیسی لوگ ہیں ایوب خان کیا تھا والی کے آگے۔ یہ والی تھا جسے اپنی رعایا کی تعلیم کا بڑا خیال تھا۔ ۔ ۔ وہ دیکھیں سرجی وہ دیکھیں ۔ ۔ ۔" اس نے نیچے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

کالی نسان پھسلتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

"کیا دیکھیں ۔ گاڑی ہے؟"

"کیا؟ نہیں سرجی یہ صرف گاڑی نہیں ہے بلکہ یہ شہزادے کی گاڑی ہے۔ اس میں شہزادہ جا رہا ہے آگے جھیل پر مچھلی کے شکار کے لئے۔"

"شہزادہ؟"

"ہاں جی شہزادہ ۔ وہ جو کل ریسٹ ہاؤس میں گالف کھیلنے آیا تھا۔"

"اچھا ہاں ۔ ۔ ۔" حسین کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آگیا ۔ ہمارے کالج کا طالب علم ۔ ۔ ۔ آخر یہ اپنے دادا کے بنوائے ہوئے اسکول میں کیوں نہیں پڑھتے ۔ ۔ ۔ یہاں رعایا پڑھے گی اور شہزادے لاہور کے ایچی سن کالج میں اور ایبٹ آباد کے برن ہال میں ۔ ۔ ۔ یہاں کیوں نہیں؟ ۔ ۔ ۔ خیراتی اسکول بنوا دیا جہاں ماسٹر بھی بھوک سے بے چین ہوں اور طلبہ بھی زندگی کے ہاتھوں عاجز ۔ ۔ ۔ حد ہے ان جاگیرداروں کی سیاست کی ۔ ۔ رعایا کا بڑا خیال ہے ۔ ۔ ۔ سب ریاست کی سیاست ہے۔ ریاست جو' اب ان کی نہیں ہے ۔ ۔ ۔ لیکن سیاست سے انہیں کون روک سکتا ہے ۔ ۔ ۔ وہ نہیں تو یہ سہی۔ صرف نام و نمود کا ذریعہ ۔ ۔ ۔ میں نے آنکھیں سکوڑ کے شام کی دھندلاہٹ میں اسکول کے ماتھے پر لگی ہوئی سنگ مرمر کی تختی کو دیکھا "قائم شدہ ۱۹۶۰ء والی ریاست جہاں زیب نے افتتاح کیا۔" اس نام کا ایک کالج بھی تو ہے سیدو شریف میں لیکن اپنی اولاد ۔ ۔ ۔ برن ہال ' ایچی سن' امریکہ ' انگلینڈ۔ مجھے یاد آیا حسین پچھلے دنوں سب سے شمالی شال لیتا پھر رہا تھا۔

"یہ آپ کی بیگم کے لئے سواتی چادر ہے۔ ممی نے خاص طور سے بنوائی ہے۔"

دھاری دار دریوں جیسا نمونہ "ممی نے بنوایا ہے!" ۔ ۔ ۔ بس نام ہی کے شہزادے ہیں۔ سارا مینگورہ بازار ایسی چادروں سے پٹا پڑا ہے۔ میں نے دور اندھیرے میں معدوم ہوتی ہوئی کالی نسان کو دیکھا۔

"توفیق نہیں ہوئی ہماری طرف آنے کی۔ ریاست حکومت کے پاس ہے اور یہ پھر شہزادے ہیں۔"

حسین میرا فرمانبردار شاگرد تھا مگر آج اس کی شہزادگی دیکھ کر پتہ نہیں کیوں مجھے غصہ آرہا تھا ۔ ۔ ۔ شاید اس لئے کہ اس نے ہماری وہ خاطر نہیں کی تھی جس کے ہم خواہاں تھے۔ یا پھر ۔ ۔ ۔ یا پھر ۔ ۔ ۔ یہ نمود و نمائش کے پجاری ہیں ۔ ۔ ۔ یہ شہزادے بھلا یہ کس لائق ہیں ۔ ۔ ۔ ہونہہ ۔ ۔ ۔ میں نے زور سے اس بنچ کو ٹھوکر ماری جس پر میں بیٹھا ہوا تھا ۔ ۔

"کیا ۔ ۔ کیا ہوا صاحب جی ۔ ۔ ۔ چائے ۔ ۔ ۔ یہ آپ کی چائے۔" عطا پریشان ہو کے میرے قریب آیا ۔ ۔ ۔

"نہیں رہنے دو عطا۔ ذرا دیکھو تو یہ شہزادے ۔ ۔ کہاں کے شہزادے ہیں؟"

اورنگ زیب قاسمی

"شہزادہ تو یہ ہے جی ۔ ۔ ۔ آپ دیکھیں نا سر ۔ یہ ہے تو آخر والی کا پوتا ۔ ۔ آپ اس سے کیوں خفا ہیں ۔ ۔ ۔ شاید اس لئے کہ اس نے ریسٹ ہاؤس میں آپ کو نظر انداز ۔ ۔ ۔"

"کیا ۔ ۔ ۔" میں دھاڑا۔

"جی کچھ نہیں سرجی آپ مالک ہیں ۔ ۔ ۔ آپ ہمارے افسر ہیں ۔ ہم جی آپ کے ڈرائیور ۔ ۔ ۔ پر صاحب جی ہے تو وہ شہزادہ ۔ ۔ ۔ ہے نا؟" پرویز کی آنکھوں میں وفاداری کے چراغ لو دے رہے تھے۔

"رہنے دو پرویز ۔ ۔ ۔ ان سے بہتر تو تم ہو ۔ کم از کم صورت تو شہزادوں جیسی ہے t ۔ ۔ ۔" میں اپنی اوقات پر لوٹ آیا۔ آخر وہ پرنسپل کا ڈرائیور تھا۔

"چھوڑیں سرجی ۔ کیسی باتیں کرتے ہیں ۔ ۔ آپ ادھر نہیں گئے نیچے مدینہ مارکیٹ میں۔ سارے ہی خریداری میں جٹے ہوئے ہیں ۔ ۔ اور آپ۔"

"میرے پاس نہ وقت ہے اور نہ پیسے ۔ میں تو ایک پیالی چائے کے چکر میں ادھر ۔ ۔ ۔"

"صاحب جی چائے تو یہ رہی مگر ٹھنڈی ٹھار ۔ ۔ ۔ بس ابھی آتی ہے گرم چائے۔ ابھی لیں صاحب جی۔" عطا فوراً چولہے پر ابلتی ہوئی کیتلی کی طرف لپکا۔

"نہیں عطا بس اب رہنے دو جی نہیں چاہتا۔ ۔ ۔" میں وہاں سے اٹھ کے ہوٹل کے طرف چلا آیا کہ میرا ارادہ کچھ لکھنے کا تھا۔ میں کلام کا حسن محسوس کرتے کرتے تھک گیا تھا اور سب کچھ الفاظ میں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ اور اب دھندلائی شام میں اپنے کمرے کے برآمدے میں بیٹھا سامنے میز پر کاغذ بکھیرے تخیل آنے کا انتظار کر رہا تھا ۔ ۔ اور سامنے وہ یعنی شہزادی ماہ رخ بیچوں کے درمیان کھڑی تھی ۔ ۔ ۔ سیدھی سر اٹھائے ہوئے۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا ۔ ۔ اور فلک سیر چاندنی میں ماہ رخ کو دیکھنے میں محو تھا ۔ ۔ ۔ میں نے سوچا "اگر آج میری جگہ کرشن چندر ہوتا تو "گرجن کی ایک شام" جیسی خوبصورت کہانی ضرور جنم لیتی ۔ ۔ کیسا شاندار لکھنے والا تھا وہ ۔ ۔ اسے رومانس سے انسان کے دکھ تک بات کہنے کا ڈھنگ آتا تھا ۔ ۔ وہ لکھتا کہ "بہار کا موسم تھا۔ رات کا وقت تھا وہ" ۔ ۔ ۔ اسے رومانس سے انسان کے دکھ تک بات کہنے کا ڈھنگ آتا تھا ۔ ۔ وہ لکھتا کہ "بہار کا موسم تھا۔ رات کا وقت تھا۔ آسمان پر چاند بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ نیچے وادی میں ایک شہزادی رہتی تھی جس کا نام ماہ رخ تھا اور اوپر دور بہت دور بلند پہاڑ تھا جس کی چوٹی پر ایک شہزادہ رہتا تھا۔ نام اس کا شہزادہ فلک سیر تھا اور یہ فلک سیر فلک کوہسار سے یعنی شہزادی ماہ رخ سے عشق بازیاں کرتا تھا۔ وہ جدھر جاتی وہ اسے آنکھیں مارتا تاکا جھانکی کرنے میں مصروف نظر آتا ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ شہزادہ ۔ ۔ ۔" میں آنکھیں بند کئے سوچتا رہا تھا کہ ۔ ۔ ۔ اگر کرشن چندر ہوتا تو ۔ ۔ ۔ کیسے یہ کہانی لکھتا اور اگر میں لکھوں تو ۔ ۔ ۔ کیا میری شہرت ۔ ۔ ۔ مجھے اس موڑ پر ۔ ۔ ۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اچانک زور کا شور اٹھا۔ میں نے محسوس کیا جیسے میں تیز روشنی میں نہا گیا۔ گھبرا کے آنکھیں کھول دیں ۔ ۔ ۔ لوڈشیڈنگ ختم ہو گئی تھی اور "میری گورا وانا" بڑے زور و شور سے چکر لگا رہی تھی ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ اور شہزادی ماہ رخ ۔ ۔ ۔ میں نے سرخ رنگ کے چمکتے لباس میں ملبوس اس پانچ فٹ آٹھ انچ کی لڑکی دیکھا جس نے اپنا نام شہزادی ماہ رخ بتایا تھا کہ یہ نام اس کی ماں نے رکھا تھا بجلی کی روشنی میں وہ ایک عام سی لڑکی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اور شہزادہ فلک سیر اسے بالکل آنکھیں نہیں مار رہا تھا ۔ ۔ ۔ بلک بلک ۔ ۔ ۔ شاید اسے رہ رہ کے

اپنی برف کی چادر کے مسک جانے کا افسوس ہو رہا ہو گا۔ ۔ ۔ میں نے فلک سیر کی برف سے ڈھکی چوٹی کو دیکھا ۔ ۔ ۔ کاش ۔ ۔ ۔ کاش برف کا طوفان ہی شہزادی ماہ رخ کو سمیٹ لیتا اور میں کرشن چندر کی طرح لکھ سکتا کہ وادی کلام فلک سیر کے دامن کی ایک خوبصورت وادی ہے جس کے نیچے دریائے سوات بہتا ہے۔ وہاں بنگ کے درخت تلے جھونپڑے میں ایک عام سی لڑکی رہتی تھی جس کا نام شہزادی ماہ رخ تھا اور اس کا نام اس کی ماں نے رکھا تھا۔ وہ فلک سیر کی نور نظر نہیں تھی اور نہ ہی اس لڑکی کو فلک سیر سے محبت تھی وہ تو وہاں کے بنائے ہوئے اسکول میں پڑھنا چاہتی تھی۔ اس میری گراؤنڈ پہ بیٹھنا چاہتی تھی جس پر سیاحوں کے بچے گھوم رہے تھے ۔ ۔ ۔ اور محبت تو اسے صرف اس روٹی سے تھی جو دور دراز سے آئے ہوئے سیاحوں نے ابھی ابھی اس جھولی میں ڈال دی تھی' جو تازہ بھی تھی اور گرم بھی۔

(”فنون“ لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

انتظار حسین

طوطے مینا کی کہانی

طوطے مینا کی بحث لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ روز رات کو وہی قصہ کھڑا ہو جاتا کہ مرد بدذات ہے یا عورت بدنہاد ہے۔ طوطا کہانی سناتا کہ عورت نے کیسا مکر کیا اور غریب مرد کو کس کس طرح خراب کیا۔ جواب میں مینا ایک کہانی داغ دیتی مضمون یہ ہوتا کہ مرد بے وفا' سنگ دل اور فریبی ہے۔ عورت نیک پارسا ہے' بھولی بھالی ہے' مرد کی ستائی ہوئی ہے۔

طوطے مینا کی جو کہانی مشہور ہے اس میں تو یہی قصہ چلتا ہے مگر اصل میں وہاں ایک قضیہ اور کھڑا ہو گیا تھا' جس درخت پہ طوطا مینا بیٹھے یہ بحث کیا کرتے تھے اس درخت پہ اور پرندے بھی ڈیرا کرتے تھے۔ وہ سب اس بحث سے تنگ تھے۔ دن بھر کے تھکے ہارے شام پڑے اس درخت کی مختلف شاخوں پہ آکر براجتے۔ بعضوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ بعض ٹہنی پہ بسیرا کرتے۔ آگے کتنے آرام سے رات بسر کرتے تھے کہ اندھیرا ہوا اور سب پنچھی اپنی اپنی جگہ چپ' جو جہاں اپنی جگہ چونچ بند کیے آنکھیں موندے بیٹھا ہے۔ مگر جب سے اس طوطے اور مینا نے اس پیڑ پہ اپنا ٹھکانا بنایا تھا تب سے ان کی راتوں کا سکون غائب ہو گیا تھا۔ سب پرندے بیکل تھے۔

اسی درخت پہ ایک پدے اور پدنی کا بھی بسیرا تھا۔ پدنی طوطے مینا کی اس بحث پہ کچھ زیادہ ہی ناخوش تھی۔ ایک رات چڑ کر پدے سے کہنے لگی۔

"ان طوطا مینا پہ خدا کی مار' انہوں نے کیا کتے کا مغز کھایا ہے کہ رات بھر بھونکتے رہتے ہیں۔"

پدے نے بے اعتنائی سے کہا کہ "ایک دوسرے کا مغز چاٹتے ہیں' ہمارا کیا لیتے ہیں۔"

"یہ تم نے اچھا کہا کہ ہمارا کیا لیتے ہیں۔ انہوں نے تو ہمارا چین آرام لے لیا۔ آخر یہ مرد عورت ہیں کون جناور کہ ان کا مقدمہ طے ہونے میں نہیں آرہا۔"

"نیک بخت تو مرد عورت کو نہیں جانتی۔ آدم زاد ایک مخلوق ہے جس نے اپنے نر کو مرد کا اور مادہ کو عورت کا نام دے رکھا ہے۔"

"مگر اس غیر مخلوق سے طوطے مینا کا کیا رشتہ ہے۔"

پدے نے زہرخند کیا اور کہا کہ "بہت گہرا رشتہ ہے۔ یہ دونوں اس مخلوق کی قید میں رہے ہیں اور اس مخلوق نے یوں ایسی ایسی چیز ایجاد کی ہے کہ جو دیکھے عش عش کرے مگر اس کی سب سے نرالی ایجاد پنجرا ہے۔ میری جان! پنجرا عجب چیز ہے' جو ایک مرتبہ پنجرے میں چلا گیا' وہ پنجرے سے نکل بھی آئے تو پنجرے میں ہی

رہتا ہے بس سمجھو کہ یہ دونوں ابھی تک پنجرے میں ہیں۔ آدمی کا بھوت ان پر سوار ہے۔ اسی کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔"

"پھر آدمیوں ہی میں جاکے مریں۔" پودنی نے جھلا کر کہا "ہماری نیندیں کیوں خراب کرتے ہیں۔"

"نیک بخت' وہ یہاں کہاں ہیں۔ ان کا دم وہیں اٹکا ہوا ہے۔ جب سے آئے ہیں مجال ہے کہ انہوں نے ہم پہ طائرانہ نظر بھی ڈالی ہو۔ آدم زاد کے اگلے پچھلے اصلی فرضی قصے بیان کر کرکے کٹ حجتی کرتے رہتے ہیں۔ یہ کٹ حجتی بھی تو اسی مخلوق کا وطیرہ ہے ہم پرندے کٹ حجتی کیا جانیں۔ بحث مباحثہ ہمارا شیوہ نہیں۔ ہم تو بس چہچہاتے ہیں۔"

پودنی نے قصے کو مختصر کیا اور کہا۔ "میرے سرتاج' میرا گزارہ ان نحوست ماروں کے ساتھ نہیں ہوگا۔ میری تو صحت کو گھن لگ گیا۔ نیند ہو نہیں آتی۔ ان کا کوئی بندوبست کرتے یا تو وہ چونچ بند رکھیں یا پھر یہاں سے ملے ہیں اور پیڑ بھی تو ہیں وہاں جاکر ٹیں ٹیں کریں۔"

پودنے کو اب واقعی سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔ بہت سوچ کر ایک دم سے پھریری لی۔ کہا کہ "جاکر ان سے بات کرتا ہوں۔"

یہ کہہ پھر سے اڑ طوطا مینا والی شاخ پہ جا اترا۔ اس وقت مینا کہانی سنا رہی تھی اسے پودنے کا یوں بیچ میں آن دھمکنا اچھا نہیں لگا۔ بولی۔

"بھائی پودنے' اس رات گئے کیا افتاد پڑی کہ بے آرام ہوئے اور یہاں آئے۔"

"اری بہنا مینا' آرام اب کہاں۔ تمہاری عورت مرد کی رام کہانی عجب ہے۔ ہماری تو رات کی نیند غائب ہوگئی۔ یہ عورت مرد کا مقدمہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہوگیا۔"

"ہاں لمبا تو ہو گیا۔" طوطا بولا "جب سے اماں حوا نے بچارے بابا آدم کو پھسلا کر گندم کا دانہ کھلایا ہے اس وقت سے چل رہا ہے اور جوں جوں وقت گذر رہا ہے اس میں پیچ پڑتے چلے جارہے ہیں۔ خیر میں نے تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا تھا۔ مگر مینا نے ضد پکڑی ہے۔ مانتی ہی نہیں۔"

مینا نے ترت جواب دیا۔ "میں نہ مانوں والی روش تو تم نے اپنائی ہوئی ہے میں نے مرد کے سارے عیب کھول ڈالے۔ کون سا عیب ہے جو مرد میں نہیں ہے۔ مگر طوطے ہو تمہیں ایک سبق رٹا دیا ہے وہی دہرائے چلے جارہے ہو کہ مرد کی ذات بے عیب ہے عورت عیبوں کی پوٹ ہے۔"

"نیک بختو' تم دونوں اپنی اپنی بات پہ اڑے ہوئے ہو۔ ایسے تو یہ معاملہ نہیں نمٹے گا۔"

پودنا یہ کہتا تھا کہ مور اپنی شاخ سے اڑا اور ان کے برابر آن بیٹھا۔ پودنے کی بات اس نے سن لی تھی۔ اس سے اسے شہ ملی۔ کہنے لگا۔

"صاحبو' صاف بات ہے۔ طوطا مینا کی بحث و تکرار ہمیں بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔ میری مورنی ساری رات بے آرام رہتی ہے۔ صبح اٹھتی ہے تو مزاج چڑ چڑا ہوتا ہے تو اس قصے سے ہمارے گھر میں ایک پریشانی آگئی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ ذ خدا عورت اور تو مرد کا قصہ کب تک چلے گا۔"

مورنی نے اپنے مور کو برہمی سے بولتے سنا تو اس نے بھی پر پھڑپھڑائے اور ان کے بیچ میں آن اتری۔ اس نے ایک اور سوال کھڑا کر دیا۔ "میں یہ پوچھوں ہوں کہ یہ دونوں پنچھی ہیں کون' کہاں سے آئے ہیں۔

اورنگ زیب قاسمی

آپس میں ان کا تعلق کیا ہے کہ چونچ سے چونچ ملا کر باتیں کرتے رہتے ہیں۔ طوطا اور جنس مینا اور جنس۔ پھر یہ اتنے شیر و شکر کیسے ہوگئے اور رات رات بھر کھسر پھسر کرتے رہتے ہیں۔"

مورنی کی اس بات پہ چکوی کے کان کھڑے ہوئے جو برابر والے درخت پہ بیٹھی تھی۔ اس نے چکوے کو ٹہوکا۔ "اے میں نے کہا کہ تم تو اسی درخت پہ بیٹھے ہو یہ وہاں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔"

"طوطا مینا نے آدم زاد کا قصہ شروع کر رکھا تھا اس سے ایک فساد اٹھ کھڑا ہوا ہے۔"

"مگر مورنی کیا رہی ہے۔"

"مورنی تو بے پر کی اڑاتی رہتی ہے۔"

"مگر سنناتو چاہیے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔"

سو چکوا چکوی بھی اڑ کر وہاں جا پہنچے۔ چکوی نے مورنی کی بات پر گرہ لگائی "مینا بھی کوئی چیز ہے۔ ہم چکوا چکوی خیر سے میاں بیوی ہیں لیکن کبھی ایک شاخ پر اکٹھے بسیرا نہیں کیا۔ میں ایک درخت پر تو چکوا دوسرے درخت پر۔"

پودنی بھی آن پہنچی تھی اور چکوی کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ پودنا متفکر بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ مادائیں تو اس قصے کو کچھ اور ہی رنگ دینے پر تلی ہیں۔ اس نے ان کی باتوں کو کاٹا اور بولا۔

"میرے خیال میں فساد کی جڑ آدم زاد کا قصہ ہے۔ اس قصے کو ختم ہونا چاہیے' نہیں تو نئے نئے قصے شروع ہو جائیں گے اور ہم پنچھیوں کی دنیا کا امن سکون بالکل برباد ہو جائے گا۔"

چکوے نے تائید میں سر ہلایا۔ "ٹھیک کہتے ہو میاں پودنے۔ ہماری عافیت اسی میں ہے کہ آدم زاد کا یہ قصہ کسی طرح سے ختم ہو۔"

پودنے کو چکوے کی حمایت سے شہ ملی۔ اس نے اب زیادہ کھل کر طوطا مینا سے بات کی۔ "نیک بختو' تم دونوں اپنی اپنی بات پہ اڑے ہوئے ہو۔ ایسے تو یہ قصہ ختم نہیں ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ کسی منصف مزاج کو بیچ میں ڈالو۔ وہ تمہارے درمیان منصفی کرے اور مقدمے کا فیصلہ سنائے۔"

"اچھی تجویز ہے۔" طوطا بولا۔ "مگر منصف مزاج یہاں کون ہے جس سے فیصلہ کرائیں۔"

"مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔" پودنا بولا۔ "کہ تم دونوں نے پنجروں میں زندگی گذاری ہے اور بس آدم زاد کو دیکھا ہے اس لیے کوئی منصف مزاج نظر نہیں آتا۔ پرندوں کو تم نے کیا پرکھا ہے؟"

"اچھا تو پھر بتاؤ کہ کس کو منصف بنائیں۔"

پودنا مور اور چکوے سے مخاطب ہوا۔ "کیا خیال ہے کسے منصف بنائیں۔"

مور شش و پنج میں پڑ گیا۔ مگر چکوے نے سوچ کر مناسب تجویز پیش کی۔ کہا۔ "اس جنگل میں دانا بینا تو ایک ہی ہے وہ الو ہے سب سے الگ تھلگ بیٹھا ہے نہ کسی کے لینے میں نہ کسی کے دینے میں بس گہری سوچ میں ڈوبا رہتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک" پودنے نے کہا "ہمیں الو کی خدمت بابرکت میں چل کر اس سے التجا کرنا چاہیے کہ اس مقدمے کے بیچ انصاف کرو اور اسے نمٹاؤ۔ کہو مینا بی اور طوطے میاں تمہیں یہ تجویز منظور ہے۔"

طوطے اور مینا دونوں نے پرندوں کی برہمی اور خاص طور پر ماداؤں نے جو شگوفہ چھوڑا تھا اسے دیکھتے

ہوئے خیریت اسی میں دیکھی کہ یہ تجویز مان لی جائے۔

سو سب پرندے اڑے۔ پودنا آگے آگے باقی سب پیچھے پیچھے۔ جنگل کے اس اجاڑ گوشے میں پہنچے جہاں سب سے الگ ایک لنڈ منڈ پیڑ کے ایک تڑے مڑے ٹھنٹھ پر الو اکیلا آنکھیں موندے اونگھ رہا تھا۔ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سن کر ایک الکساہٹ کے ساتھ آنکھیں کھولیں، پرندوں کے غول کو دیکھا اور خشک لہجہ میں بے وقت آنے کی وجہ پوچھی۔

پودنے نے ادب سے گزارش کی۔ "اے دانا بینا طائر، ہم پرندے معافی چاہتے ہیں کہ ہم تیری خلوت میں مخل ہوئے مگر کیا کرتے۔ ہم ایک الجھن میں پھنس گئے ہیں۔ طوطا مینا کے درمیان ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے جس نے ہمارے سکون کو برباد کر دیا ہے۔ اے بزرگ طائر تو دانا ہے اور منصف مزاج اس مقدمے کے بیچ فیصلہ کر کہ اس جھگڑے سے ہمیں نجات ملے۔"

"عزیز پرندو، وہ جھگڑا کیا ہے۔"

"جھگڑا یہ ہے کہ وہ جو آدمی نام کی مخلوق ہے اس میں نیک کون ہے، بد کون ہے مرد یا عورت۔ مینا عورت کو نیک و پارسا اور مرد کو بدذات بتاتی ہے طوطا مرد کو نیک پاک اور عورت کو بد بتاتا ہے۔"

آدمی کا نام سن کر الو کے مزاج میں درہمی پیدا ہوئی۔ تلخ لہجہ میں بولا۔ "اے طائران خوش الحان، تم کس مخلوق کا مسئلہ لے کر میرے پاس آئے ہو۔ عورت اور مرد میں سے اچھا کسے کہا جائے۔ عورت آفت کی پڑیا، مرد پور پور میں فتنہ اس لئے کہ دونوں آدمی کی ذات میں ہیں اور آدمی بدذات ہے۔ بدذات سا بدذات۔ سبز قدم خود ہے، منحوس مجھے بتاتا ہے۔ خود بستیاں اجاڑتا ہے، ہمیں بدنام کرتا ہے۔ اس کا یہ طور دیکھ کر ہی اپنا سر ہوا صحبتوں سے نفور ہوا، عزلت نشینی کو شعار کیا۔ دن کی روشنی ہی سے بیزاری ہو گئی کہ اس روشنی میں خواہ مخواہ اس بدذات کی صورت دیکھنی پڑتی تھی۔ رات کا اندھیرا اور سناٹا ہی کو خوش آیا مگر اس مخلوق نے ایسی کارستانی کی کہ اب راتوں کی پاکیزگی بھی جاتی رہی۔ اب صورت یہ ہے کہ دن میں آدم زاد کا شور و غل، رات کو اس کی بنائی ہوئی مشینوں کا شور اور بجلی کی روشنی۔ ہم عزلت نشین کہاں جا کر منہ چھپائیں۔ ہر جگہ اس سبز قدم کے قدم پہنچے ہوئے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ لٹی لٹی ادھ موئی مرغابیوں کا ایک قافلہ ہانپتا کانپتا قائیں قائیں کرتا اپنے اس ویرانے میں آکر پناہ کا طالب ہوا۔ میں حیران و پریشان کہ کس دیس کی مخلوق اور کہاں آکر پناہ مانگ رہی ہے۔ میں نے کہا کہ اے طائران عزیز، تم پہ کیا افتاد پڑی کہ تم نے اپنی ٹھنڈی لہریں لیتی، آبی اقلیم کو چھوڑا اور یہاں اس ویرانے میں اس حال سے آئے ہو کہ جیسے کسی نے تم سے تڑپنے پھڑکنے کی توفیق ہی سلب کر لی ہو۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ کیسی آبی اقلیم۔ اب وہاں ہڑول امنڈ رہا ہے۔ آدم زاد نے اپنے آپس کے جھگڑے میں ہمارے سمندر کی پاکیزگی کو غارت کر دیا۔ مت پوچھو کہ ان پانیوں میں کیا کیا زہر گھولا گیا ہے۔ میں سناٹے میں آگیا کہ اس بدذات نے ہوا میں تو پہلے ہی کثافت گھول دی تھی، اب سمندروں میں بھی زہر گھول دیا۔ میں نے ٹھنڈا سانس بھرا اور آسمان کی طرف دیکھا مگر آسمان پہ الگ ایک قیامت مچی ہوئی تھی، فضا دھواں دھار۔ پرندے مضطرب جیسے کسی بڑی آندھی نے انہیں آلیا ہو۔"

الو کا یہ کلام سن کر سب پرندے سکتہ میں آگئے۔ پودنا تشویش کے ساتھ بولا۔ "اے دانا، اس نقشہ میں

اورنگ زیب قاسمی

تو مجھے سب پرندوں کی تباہی کا سامان نظر آرہا ہے۔ آدمی ہمارا کیوں دشمن بنا ہوا ہے۔"

"وہ خود اپنا بھی دشمن بنا ہوا ہے۔ اس میں اس کی اپنی تباہی کا بھی تو سامان ہے۔"

"پھر تو آدمی کو سوچنا چاہیے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔"

اس پر پھدکے نے ٹکڑا لگایا۔ "اس کے پاس عقل ہو تو سوچے۔"

الو نے پھدکے کی آدم شناسی کو سراہا اور افسوس کے ساتھ کہا۔ "کم بخت کے پاس ذہن ہے مگر عقل نہیں ہے۔"

"آدمی کو عقل کب آئے گی۔" پودنے نے سوال کیا۔

"پودنے، تو نے مشکل سوال کیا ہے۔" الو بولا "اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔"

"پھر کس کے پاس ہے؟"

الو نے لمبا تامل کیا پھر بولا۔ "یہاں سے دور ہمالہ کی تلیٹی میں ایک گھنا جنگل ہے۔ وہاں پیپل کا ایک بلند و بالا درخت ہے۔ اس کی پھننگ پہ ایک کوا بیٹھا ہے۔ جنگل کے پرند اسے کاکاشی کہتے ہیں۔ اس کے پاس تیرے سوال کا جواب ہو تو ہو۔"

پودنے نے ساتھی پرندوں سے کہا کہ "ساتھیو، کاکاشی کے پاس چلو کہ ہم اس سے اپنے سوال کا جواب لیں۔"

تو پھر پودنا آگے آگے، باقی پرندے پیچھے پیچھے۔ یوں یہ قافلہ ہمالہ کی تلیٹی کی طرف چلا۔ رستے میں ایک تیتر ملا۔ اس نے پوچھا۔ "اے ہمصفیرو کدھر کی اڑان ہے۔"

پودنے نے جواب دیا۔ "ہم کاکاشی سے یہ پوچھنے جا رہے ہیں کہ آدمی کو عقل کب آئے گی تو بھی ساتھ چاہے تو چل۔"

تیتر نے ایک قہقہہ لگایا "آدمی اور عقل، سبحان تیری قدرت۔" پھر اس نے پر پھڑپھڑائے اور اڑ گیا، مستقل ہنستا ہوا اور شور مچاتا ہوا۔ "آدمی اور عقل، سبحان تیری قدرت، آدمی اور عقل، سبحان تیری قدرت۔"

ہرج مرج کھینچتا یہ قافلہ ہمالہ کی تلیٹی میں پھیلے ہوئے گھنے جنگل میں پہنچا۔ دیکھا کہ درختوں کے بیچ ایک بلند و بالا پیپل ہے جس کی پھننگ پر ایک بڑا سا کوا ایک پنکھ کالا ایک پنکھ سفید، آنکھیں موندے، چونچ پروں میں دیئے بیٹھا ہے۔ پودنے نے قریب جا کر بڑے ادب سے کہا کہ "اے کاکاشی ہم دور سے چل کر تمہارے پاس آئے ہیں۔"

کاکاشی نے آنکھیں کھولیں۔ پوچھا "کون؟"

"کاکاشی ہم تم سے یہ پوچھنے آئے ہیں کہ آدمی کو عقل کب آئے گی۔"

کاکاشی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "بھولے پنچھیو، تم نے میرے ساتھ وہی کیا جو میں نے اپنے باپ کے ساتھ کیا تھا۔"

"کاکاشی، تم نے اپنے باپ کے ساتھ کیا کیا تھا؟"

"میرا باپ" کاکاشی سنانے لگا۔ "تب میں تھا ہزار برس تپ میں گذر چکے تھے۔ اس سے اس کے پروں کی ساری کالونس ڈھل چکی تھی۔ ایک پنکھ پہ بس ایک کالی ٹکلی باقی رہ گئی تھی۔ اس بیچ میں اس کے پاس

پھکا اور یوں بولا کہ۔ اے میرے باپ ایک بات پوچھوں۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور کہا' پوچھ۔ باپ میں پوچھتا ہوں کہ آدمی کو بھی عقل آئے گی یا نہیں آئے گی۔ باپ نے مجھے گھور کے دیکھا' چڑچڑا کر عمر سے آرہا ہے۔ باپ میں اڑتا اڑتا کوروکشیتر کی اور نکل گیا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ آدمی آدمی کو مار کاٹ رہا ہے اور خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ باپ نے ٹھنڈا سانس بھرا' بولا' پتر میں نے تجھے منع کیا تھا کہ سب کھونٹ جانا مانو کھونٹ مت جانا اور کبھی آکر مجھ سے اس کی بات مت کرنا۔ ہم کوے لوگ پہلے اجلے ہوا کرتے تھے۔ آدمی کا وبال ہم پہ پڑا ہے کہ ہم کالے ہو گئے ہیں۔ یہ تپ میں اس لئے کھینچ رہا تھا کہ یہ وبال اترے اور ہم پھر اجلے ہو جائیں پر تو نہ مانا۔ مانو کھونٹ گیا اور آکر مجھ سے اس جاتی کی بات کی۔ تو نے میرے تپ کو بھنگ کر دیا۔ اس کے ساتھ میری عمر ختم ہوئی۔ مجھ میں سامس ہو تو میرے تپ کو پورا کر اور اپنی جاتی کے گئے ہوئے اجلے پن کو واپس لا۔ یہ کہہ کر اس نے پران دے دیئے میں نے اس کے جانے کا شوک کیا اور تپ کے لئے بیٹھ گیا۔ سو میں تپ میں تھا کہ تم نے آکر اس میں کھنڈت ڈال دی۔ اب میں یہاں سے اڑتا ہوں اور کسی نرجن بن میں باس کرتا ہوں جہاں میرے کان میں آدمی کا نام نہ پڑے۔"

یہ کہہ کر کاکا جی نے پر پھڑپھڑائے اور اڑنے کے لئے تیار ہوا۔ پودنے نے گھبرا کر جلدی سے پوچھا۔ "گرو جی' ہمارے سوال کا جواب اب کہاں سے ملے گا۔"

کاکا جی نے تامل کیا۔ پھر بولا۔ "یہاں سے دکھن کی اور تاپتی ندی کے پار شوجی کا پرانا مندر ہے۔ اس کے کلس پہ ایک نیل کنٹھ بیٹھا ہے کہ بھگوں کے بھید جانتا ہے۔ اس سے جا کر پوچھو۔"

پھر پودنا آگے تھا اور مور مورنی چکوا چکوی' طوطا مینا اور کتنے دوسرے پرندے کہ رستے میں ساتھ ہو لئے تھے' پیچھے پیچھے اڑتے اڑتے تاپتی ندی کے پار شوجی کے پرانے مندر پہنچے۔

نیل کنٹھ نے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور بھانت بھانت کی چہکار سن کر آنکھیں کھولیں۔ "مترو' کس دیس سے آئے ہو اور کیوں آئے ہو؟"

"مہاراج" پودنے نے ادب سے کہا۔ "ہم دور سے پتہ پوچھتے پوچھتے آپ کے پاس آئے ہیں ایک سوال ہمیں در در لئے پھر رہا ہے جس سے پوچھتے ہیں وہ کنی کاٹ جاتا ہے۔ سب طرف سے مایوس ہو کر آپ سے پوچھنے آئے ہیں۔"

"پوچھو' مترو۔"

"مہاراج' ہم آپ سے یہ پوچھنے آئے ہیں کہ آدمی کو آخر کب عقل آئے گی۔"

نیل کنٹھ نے حیرت سے پودنے کو اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا۔ کہا "بھولے پنچھیو' کیا تمہاری مت ماری گئی ہے کہ ایسا پوچھتے ہو۔ مجھے نہیں دیکھتے کہ میری ساری گردن نیلی ہو رہی ہے۔ سمندروں میں جو وش گھلا ہوا تھا کن مشکلوں سے میں نے اس سارے وش کو پیا کہ میں نیلا پڑ گیا۔ پر آدمی نے سمندروں میں پھر وش گھول دیا' سمندروں میں' بنوں میں' پربتوں میں' ہر جگہ' مترو' آدمی مورکھ ہے۔"

"مہاراج" پودنا بولا۔ "یہی فکر تو ہمیں کھائے جا رہی ہے کہ اس بدھان کو کبھی سمجھ آئے گی بھی یا نہیں۔"

"پنچھیو" نیل کنٹھ نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہر پشو پنچھی کے پاس اپنے اپنے حصے کی عقل ہے ہر آدمی نرالا پشو ہے کہ اسے ذہن تو ایسا ملا کہ آسمان میں تہگلی لگاتا ہے' پر عقل نہیں ملی۔"

اورنگ زیب قاسمی

پودنے نے آدمی کے حال پہ افسوس کیا اور کہا "مہاراج' اگر میں اپنے حصے کی عقل آدمی کو دیدوں تو پھر تو اس میں کچھ سوجھ بوجھ آجائے گی نا؟"

نیل کنٹھ اداسی سے ہنسا اور بولا۔ "پودنے' کیا تو نے اس کوے کی کہانی نہیں جس نے آدمی کو عقل سکھانے کی کوشش کی تھی۔"

"مہاراج' وہ کوا کون تھا اور اس نے آدمی کو کس طرح عقل سکھانے کی کوشش کی تھی۔"

تب نیل کنٹھ نے انہیں کہانی یوں سنائی کہ "اب سے بہت پہلے ایک آدم تھا' سمجھو کہ اس دھرتی پہ پہلا پرش۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک بیٹے نے کہ بہت مورکھ تھا دوسرے کی ہتیا کر دی۔ کرنے کو تو کر دی پر اس ہتیارے کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی لاش کا کیا کرے۔ اس مورکھ نے بھائی کی لاش کو کمر پہ لادا اور چل پڑا۔ ساری دھرتی کھوند ڈالی' پرمت ایسی ماری گئی کہ سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کہاں ٹھکانے لگائے۔ اس کی کمر دکھنے لگی۔ ایک کوے نے اسے اس حال میں دیکھ کر ترس کھایا اور کہا کہ عقل کے اندھے' بھائی کی لاش کو کمر پہ لادے کب تک پھرے گا۔ اس نے دکھی ہو کر کہا کہ پھر کیا کروں اور کیسے اس بوجھ کو اتاروں۔ کوے نے کہا کہ گڑھا کھود اور اس میں اسے داب دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ کوے نے جب اپنے باپ کو یہ بات سنائی تو اس نے سر پیٹ لیا۔ پتر یہ تو نے کیا کیا۔ کوا بہت سٹپٹایا کہ آخر میں نے ایسا کون سا پاپ کر دیا۔ "ارے پاپ سا پاپ" کوے کا باپ بولا۔ "ہم اجلے پنکھوں کے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ اب اس کارن ہمارے بچے کالے پڑ جائیں گے۔"

"باپ ہمارے بچے کس کارن کالے پڑ جائیں گے۔ میں نے اس مورکھ کو عقل کی بات بتائی تھی جو اس کے بھلے میں تھی۔"

"بھولے بیٹے' مورکھ کو عقل کی بات بتانا ایسے ہے جیسے بندر کے ہاتھ میں استرا دے دیا جائے۔ اب یہ مورکھ پتہ ہے کہ کیا کرے گا۔ سدا پاپ کرے گا اور تیری بتائی ہوئی ترکیب سے پاپ کو چھپایا کرے گا۔ وبال اس کا ہم پر پڑے گا کہ ہمارے اجلے پر کالے ہو جائیں گے۔"

پرندے یہ قصہ سن کر سوچ میں پڑ گئے اور طوطے مینا کی آنکھیں تو کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پودنے نے لمبے تامل کے بعد سوال کیا۔ تو مہاراج' پھر کیا کیا جائے۔"

نیل کنٹھ نے کہا۔ "مترو اپنی عقل اپنے ساتھ۔ کوئی کسی کو عقل نہیں سکھا سکتا۔ جو مورکھ ہے وہ مورکھ ہی رہے گا۔ آدمی مورکھ ہے۔"

یہ کورا جواب سن کر وہ پرندے وہاں سے اداس اداس لوٹے۔ اپنے جنگل میں آکر اپنی اپنی شاخ پہ بیٹھ گئے۔ سب اپنی اپنی جگہ چپ تھے اور اداس۔ طوطے مینا پہ تو جیسے اوس پڑ گئی ہو۔ نہ طوطے نے چونچ کھولی نہ مینا کچھ بولی۔

چکوی سے رہا نہ گیا چکوے سے بولی "میرے سرتاج' طوطے اور مینا کو کیا ہو گیا ہے کہاں رات رات بھر ہمارے کان کھاتے تھے' آدم زاد کے قصے سناتے جیسے دنیا میں آدم زاد کے سوا کوئی بستی ہی نہیں اور کہاں اب ایسی چپ سادھی ہے کہ جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔"

چکوا مسکرایا۔ بولا "جانم' اب انہیں عقل آگئی ہے۔ آخر پنجرے سے باہر نکل آئے۔"

("نیا دور" کراچی)

ڈاکٹر انور زاہدی

مختصر دورانیے کا طویل ڈرامہ

پہلا منظر

موہنجوداڑو کے تاریخ بننے کے کئی ہزار سال بعد کی ایک اداس شام عظیم دریا زور شور سے اردگرد کے دیہات میں اپنی من مانی کر رہا ہے۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اقوام متحدہ کے ادارے کی جانب سے موہنجوداڑو کے آثار کو بچانے کے خواہاں ماہرین کا ایک گروہ اس مقام کو دیکھنے آیا ہوا ہے۔ مٹی کے ڈھیر کو بچانے کی تدابیر پر غوروخوض جاری ہے۔ ایک ماہر دوسرے سے بات کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"ہمیں اس عظیم الشان تاریخی ورثے کے آثار کو بہر طور بچانا ہو گا۔"

دوسرا ماہر جواب میں کہتا ہے "اس بار میٹنگ کے ایجنڈے میں سب سے اہم موضوع یہی ہے۔"

ایک صحافی جو وہاں موجود ہے ہمت کرتے ہوئے انگریزی میں غیر ملکی ماہرین سے سوال کر بیٹھتا ہے۔

"لیکن وہ بوسنیا میں مسلمانوں کی نسل کشی کے بارے میں آپ کا ادارہ کیا....."

پہلا ماہر پائپ کو منہ سے نکالتے ہوئے میٹنگ کے منتظمین کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔

"یہ آپ نے اخبار والوں کو یہاں کس لئے بلایا ہے؟؟"

منتظمین میں سے ایک "جی سر وہ دراصل منسٹر صاحب نے بھی ...." ہی کہہ پایا تھا کہ دوسرا ماہر کافی کی پیالی کو میز پر رکھتے ہوئے صحافی کی طرف دیکھے بغیر بول اٹھتا ہے۔ Ignorant People of the third world

صحافی ایک بار پھر جرات کا اظہار کرتے ہوئے بوسنیا کے بارے میں اپنا سوال دہرانا چاہتا ہے۔ اس پر دوسرا ماہر اس کی طرف دیکھ کر بے حد اطمینان سے بول اٹھتا ہے۔ "مسٹر ہمارا کام مردہ چیزوں سے متعلق ہے' زندہ سے نہیں۔ سمجھے!" باہر کاروں کا شور ہوتا ہے اعلان کیا جاتا ہے کہ منسٹر صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ دونوں ماہرین ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ منسٹر صاحب پنڈال میں داخل ہو کر کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوتے ہیں ماہرین کے علاوہ پنڈال میں موجود سارا مجمع منسٹر کی تعظیم میں خاصی دیر مودب کھڑا رہتا ہے۔

اسٹیج سیکرٹری مائیک پر جلسے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے بیرونی ملک سے آئے ہوئے ماہرین کی تعریف و توصیف اور منسٹر صاحب کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا' ہوا عظیم تاریخی ورثے کو بچانے کے لئے منسٹر کی خاندانی خدمات کا جائزہ لیتا ہے۔ پہلا ماہر منسٹر کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے۔

دوسرا ماہر کھڑے ہو کر تالی بجاتے ہوئے منسٹر صاحب سے کہتا ہے۔ "ہمیں امید ہے کہ آپ اس مشن

اورنگ زیب قاسمی

میں ہماری سرپرستی فرمائیں گے۔" منسٹر صاحب جو اس تمام وقت میں اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے اور پنڈال سے باہر دور لان میں پھولوں کی کیاری کے پاس کھڑی ہوئی یورپین لڑکیوں کا بغور مطالعہ کرنے میں مصروف تھے اپنا ذکر سن کر اچانک متوجہ ہوتے ہیں اور سر کے خفیف اشارے سے اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہیں۔ دونوں ماہرین منسٹر صاحب پر نظر ڈال کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں۔

منسٹر صاحب کا پرائیویٹ سیکرٹری ان کے پیچھے بت بنا نوٹس لینے میں مصروف ہے اچانک بادل گرجتے ہیں اور پنڈال سے باہر بوندا باندی شروع ہو جاتی ہے۔

دوسرا منظر

تین دن سے مسلسل بارش ہو رہی ہے۔

بڑے ڈیم کا ریذیڈنٹ انجینئر اپنے ائرکنڈیشنڈ دفتر میں صوفے میں تقریباً" دھنسا ہوا ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھنے میں مگن ہے۔ اس کے سامنے شیشے کی میز پر رکھی ہوئے چائے کی پیالی میں سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

وہ بادل نخواستہ ٹی وی اسکرین پر آنکھیں جمائے ہوئے فون کا ریسور اٹھا کر واپس کریڈل میں رکھ دیتا ہے۔

بارش ہوتی جارہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد پھر فون کی گھنٹی بجتی ہے اور خاصی دیر تک بجے جاتی ہے وہ جھنجلا کر فون اٹھاتا اور زور سے ہیلو کہتا ہے۔ لیکن فوراً" ہی اس کے چہرے سے جیسے سارا خون نچڑ جاتا ہے اور رنگ پیلا پڑ جاتا ہے دوسری طرف منسٹر صاحب لائن پر ہیں - - -

"جی سر۔۔ جی سر بالکل درست فرمایا آپ نے دراصل سر صبح ہی سے فون کی لائنیں ٹھیک نہیں ہیں اس لئے میں.... رائٹ سر۔۔ جی بالکل ... سارا ریسٹ ہاؤس بک سمجھیں آپ ۔۔ میں سمجھ گیا سر... پبلک کا داخلہ ممنوع ہو گا سر... کھانے کی فکر نہ کریں ... میں گھر سے اپنا کک بھجوا دوں گا... ٹھیک ہے سر... جی میں سمجھ گیا سر..." ریسور کو کریڈل میں رکھ کر ریذیڈنٹ انجینئر اپنے ماتھے سے پسینے کو پونچھتا ہے - - - اتنے میں اس کا پی اے اندر داخل ہوتا ہے اور بتاتا ہے کہ فلڈ کنٹرول سیل والے خاصی دیر سے لائن پر ہیں اور بات کرنا چاہتے ہیں۔ "معلوم نہیں تمہیں۔ ابھی منسٹر صاحب سے بات ہو رہی تھی ... میں خاصا پریشان ہوں ... دیکھتے نہیں ..."

"جی سر وہ تو ہے..." پی اے اتنا ہی کہتا ہے۔

"کیا مطلب ہے فلڈ کنٹرول....."

"ہاں ہاں فلڈ کو بھی دیکھ لیں گے۔" بارش جاری ہے۔ ٹی وی اسکرین پر رنگ بدل رہے ہیں۔

تیسرا منظر

شمال کے کوہستانی علاقے میں شور مچاتے دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں کسی فلم کی شوٹنگ جاری ہے۔

ڈانس ڈائریکٹر بار بار ہیروئن کو ڈانس کے لئے نیا اسٹیپ سکھاتے ہوئے اپنے پیٹے کو باہر کی طرف نکالتا

ہے اور اس کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔ " مس ایسے کام نہیں چلے گا۔ آپ اپنے پنجے کو باہر کی طرف یوں اٹھائیں اور دریا میں موجود پتھر پر پاؤں رکھ کر پورے بدن کو اس طرح جھلائیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ خود پورا گھوم جاتا ہے۔

ہیروئن چودھویں بار اپنی چھاتیاں فرضی ہیرو کی طرف اٹھاتی ہے جو فی الحال دریا کے کنارے اسٹول پر بیٹھا سگریٹ پیتے ہوئے ' آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔۔۔ جہاں سیاہ بادل بڑتالی مزدوروں کی طرح اکٹھے ہو رہے ہیں۔

ڈائریکٹر بار بار اپنی ٹوپی اتار کر گنجے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے اور بے بسی سے اردگرد پھیلے ہوئے فلم یونٹ پر نظر ڈالتا ہے۔ اس کا اسسٹنٹ اس وقت ایک ایکسٹرا گرل کی کمر میں ہاتھ ڈالے کچھ کھلانے میں مصروف ہے۔ دوسری ایکسٹرا گرل حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے۔۔۔ اتنے میں موٹی موٹی بوندیں برسنے لگتی ہیں۔

ڈائریکٹر زور سے چلاتا ہے " پیک اپ۔"

بارش برسنے لگتی ہے۔۔۔ سارا یونٹ قریب ہی گڑے ہوئے خیموں میں پناہ لیتا ہے۔

چوتھا منظر

پہاڑوں کے دامن میں واقع ڈیم کے زیریں حصے میں دریا کے کنارے آباد شہر دن ڈھلنے کے بعد روشنیوں میں جگمگا رہا ہے۔

بازار میں دکانوں میں جلتی بجھتی روشنیوں اور گاہکوں کی ریل پیل سے میلے کا سا سماں ہے۔ گرجا کے نزدیک بڑے پارک میں سرکس لگا ہوا ہے۔ بچے بوڑھے عورتیں' جوان سب جوق در جوق سرکس کی جانب رواں ہیں جہاں باہر تختوں کی بنی چھان پر ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی گھرے میک اپ کے مائیک پر بجنے والے پرانے فلمی ریکارڈ کی دھن پر رقص میں مگن ہیں۔ گانے کے بول رات کی خاموش فضا میں گونج رہے ہیں۔

" ریشمی شلوار کرتا جالی کا"

لڑکی بار بار ریشمی شلوار کہتے ہوئے اپنی شلوار کے پائنچوں کو اس طرح اٹھاتی ہے کہ گوری گوری پنڈلیوں کی بجلیاں چمکتی ہیں اور جالی کرتے میں سے کمساروں میں زلزلہ آتا نظر آتا ہے۔

سینما کے سامنے کھلے احاطے میں خوانچہ فروش پکچر ختم ہونے کے منتظر ہیں جہاں فلم " آخری جنگ " چل رہی ہے۔

رات آہستہ آہستہ بھیگ رہی ہے۔ سینما کا آخری شو ختم ہو چکا ہے۔ سرکس کی روشنیاں بجھ گئیں بس بڑے پنڈال کے اوپر جلتا ہوا بلب پورے علاقے میں روشنی بکھیر رہا ہے۔۔۔ چاند سیاہ بادلوں میں چھپ گیا ہے۔

ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی ہے۔

ڈیم کی طرف جانے والی سڑک پر دور جاتے ہوئے ٹرک کی پچھلی بتیاں نظر آرہی ہیں۔۔۔ شہر کے مکانات نیند کی چادر اوڑھ چکے ہیں اچانک ایک مہیب دھماکے کی آواز پہاڑوں میں سے گونج بن کر آسمان کی

اورنگ زیب قاسمی

طرف اٹھتی ہے۔ کتے بھونکنا شروع کرتے ہیں اور پھر جیسے ہوا کا زور بھونکتی ہوئی آوازوں کو مختلف سمت میں لے جاتا ہے مکانوں کی چھتوں پر سوئے ہوئے لوگوں میں بچے سب سے پہلے جاگ کر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر لوگوں کا ملا جلا شور سنائی دیتا ہے۔ اس اثنا میں پانی کی دیوار شور میں فاتح فوج کے ہراول دستے کی مانند در آتی ہے اور کچھ ہی دیر میں انسانی چیخوں کا شور ہر طرف سے بڑھتے ہوئے سیلابی پانی میں ڈوب جاتا ہے۔

پانچواں منظر

ڈیم سے خارج ہونے والے پانی کے سیلاب عظیم نے اپنے دامن میں بسے ہوئے شہر پہ شب خون مارا ہے۔ اب جیتے جاگتے شہر میں ' جو دن بھر کی تھکان کے بعد سویا تھا کچھ نظر نہیں آرہا۔ پانی دریا بن کر شہر پر سے گزر گیا ہے۔۔۔ ایک مسجد کے مینار کے کنگرے پانی کی سطح سے اوپر کنول کے پھول کی طرح نظر آتے ہیں۔۔۔ بارش تیز ہو گئی ہے۔

بازار ' سینما ' سرکس ' ریشمی شلوار کرتا جالی کا سب آخری جنگ کے ملبے میں غائب ہو چکے ہیں۔

پانی سمندر کی طرح آگے بڑھ رہا ہے۔ کہیں دور سے لاشوں کی آوازیں انسانی چیخوں کے شور میں مدغم پڑتی ہیں پھر سارے منظر ایک ایک کر کے ڈوب جاتے ہیں۔

آخری منظر

ریڈیو' ٹی وی اس اچانک سیلاب پر شور مچا رہے ہیں لوگ سیلاب کی صورت حال پر حیران ہیں۔ ایک اخبار اسے عذاب الٰہی سے تعبیر کرتا ہے۔ دوسرے اخبار کا اداریہ سوال کرتا ہے۔

یہ کیسا عذاب ہے جو معصوموں پر ہی اترتا ہے۔

بڑے شہروں کے بڑے لوگ آرام دہ گھروں کے لاؤنجوں ' ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر ٹھنڈے گرم مشروبات پیتے ہوئے بپھرے ہوئے دریاؤں کی صورت حال پر تبادلہ خیال کر رہے ہیں۔ سیاست دانوں کو ڈگڈگی بجانے کا موقع مل گیا ہے۔ عوام انگشت بدنداں ہیں کہ آخر ڈیم کے دروازے اچانک کیوں کھول دیے گئے لوگوں کو پہلے سے باخبر کیوں نہیں کیا گیا۔

دریا کے وسط میں موجود جاچ جہاں کبھی لوگ بستے تھے زندگی موجود تھی اب صفحہ ہستی سے نابود ہیں۔۔۔ دریا شان بے نیازی سے سب کچھ ڈبو کر بہتے جا رہا ہے۔۔۔ شہر کے مکانوں میں دریا کی چھوڑی ہوئی مٹی کے ڈھیر لگے ہیں۔۔۔ شہر غلاظت اور تعفن کی نذر ہو چکا ہے۔ ہزارہا افراد لقمہ اجل بن گئے۔۔۔ شمالی علاقے میں پہاڑی دریا پر بنا ہوا خوبصورت پل جو کچھ عرصہ پہلے ہی تعمیر ہوا تھا دریا کے ساتھ بہہ گیا ہے۔ دریا کے کنارے درختوں کے ساتھ گڑے خیموں میں محض ایک کی طنابیں درخت کے ساتھ بندھی رہ گئی ہیں جو اس بات کی شاہد ہیں کہ کبھی یہاں زندگی کا رقص جاری تھا۔

ڈیم کے کنارے ریذیڈنٹ انجینئر کا اڑکنڈیشنڈ دفتر خاموش ہے۔ اخبار چیخ رہے ہیں ملک کا زیریں زرعی حصہ آب برد ہو چکا ہے۔۔۔ فصلیں نابود ہو گئیں۔

مردوں کے ٹیلے کے قریب بہتے ہوئے مہیب دریا میں مردہ مویشی دیہاتی مکانوں کے چھپر' مل بہتے چلے

جا رہے ہیں۔

عظیم تاریخی ورثے کے آثار کو بچانے والے غیر ملکی ماہرین ہوٹل شیرٹن میں مقیم ڈش انٹینا کی وساطت سے MTV کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں GUNS AND ROSES کی ہوُز موسیقی ہوٹل کے کمرے میں گونج رہی ہے۔

مردوں کے ٹیلے کو سیم سے بچانے والے سیمینار کا آج آخری دن ہے۔

("مستقبل" اسلام آباد)

اورنگ زیب قاسمی

بانو قدسیہ

دشت امکاں

عدیل کو ایک عمر گزر جانے کے بعد علم ہوا کہ وہ ساری عمر دو آرزوؤں کا اسیر رہا ہے اور دونوں آرزوئیں اسے ہمیشہ مختلف سمت میں کھینچتی رہتی ہیں۔ اس کی زندگی کا سارا کرب' اکتاہٹ' بے چینی' پریشانی کی جڑ میں یہی حقیقت تھی کہ اسے بیک وقت تضاد سے اٹھنے والی خواہشوں نے گھیرے رکھا۔

عدیل کی خوبصورت سفید کوٹھی کے بائیں جانب نئے کرائے دار آئے تھے۔ ان کے ہمراہ پجیرو کے علاوہ ایک چھوٹا سا سفید روسی کتا بھی تھا۔ اس کتے کو دیکھ کر عدیل اپنی کار سے اتر گیا اور چوکیدار کی بینچ پر بیٹھ کر ادھر ہی دیکھنے لگا جدھر نئے کرائے دار ٹرک سے سامان اتروا رہے تھے جس زمانے میں عدیل سول سروس امتحان کی تیاری کر رہا تھا اور اسے محنت کی ضرورت تھی' ان ہی دنوں اسے کتوں کا عشق ہوا۔ یہ عشق اس کے دادا کے لہو نے عنایت کیا تھا۔ ہاؤنڈ' بیگل گرے ہاؤنڈ' کولی' گریٹ ڈین اسی قسم کے پیڈیگری کتوں کی اسے تلاش رہتی۔ اسے احساس تھا کہ کھوج میں قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے لیکن اس کے اندر دو اطراف کی کشش ہی اتنی زیادہ تھی کہ کہیں جو کسی پیڈیگری کتے کا سراغ مل جاتا تو وہ کتابیں نوٹس پھینک پھانک کسی کھوجی کی طرح کتے کے ٹھکانے پر ضرور پہنچتا۔ عدیل کو اچھی طرح سے یاد تھا کہ سی' ایس' ایس کے امتحانوں سے ہفتہ بھر پہلے وہ ایک سندھی وڈیرے کی تلاش میں جمعہ گوٹھ پہنچا۔ پورے دو دن کی تلاش کے بعد باسنجی کتے کے درشن ہوئے۔ یہ کتا افریقی نژاد تھا خوبصورتی میں بے مثل' بھونکتا برائے نام اور کھانا کم کھاتا تھا لیکن اگر کسی طرح انگیخت کر دیا جاتا تو ایسی بلبلاتی چیخ مارتا کہ شکاری پوری طرح چوکس ہو جاتے۔ عدیل نے ہر قیمت پر کتا خرید کر لے جانا چاہا لیکن وڈیرے صاحب کو باسنجی کی چیخ سے عشق ہو چکا تھا انہوں نے عدیل کو دو دن مہمان رکھا۔ بڑی مہمانداری کے بعد ایک کالا اٹیچی تحفے میں دیا لیکن باسنجی کی بات بھی نہ کی۔

دادا گھوڑے اور کتے کا عاشق تھا۔ زمینوں پر اصطبل اور سگ خانے تھے۔ گرمیوں میں ائیر کنڈیشنر اور سردیوں میں ہیٹر چلا کر شدید موسم کا مداوا کیا جاتا۔ خاص مزارعے خدمت گاران کی خدمتوں پر مامور اور چوکس رہتے۔ دادا کسی کتے اور گھوڑے کا نام خود تجویز کرتے۔ اسے سیر پر لے جاتے۔ خوراک میں خود دلچسپی لیتے۔ عدیل کو وہ بلڈ ہاؤنڈ نیرو ابھی تک یاد ہے۔ جو اکثر سارا دن فضا میں تھوتھنی اٹھائے کچھ سونگھتا رہتا۔ اسے دادا خود نہلاتے برش پھیرتے' راتب ڈالتے۔ نیرو کے پاس دادا اور کالے گجر کے علاوہ کوئی پھٹک بھی نہ سکتا تھا۔

پتہ نہیں ایک پورا عہد گزر جانے کا اتفاقیہ رنج تھا کہ روسی کتے کی معصوم حرکتیں تھیں' عدیل بار بار

کھیلنے والے کتے کو دیکھتا رہا۔ عدیل نیم پلیٹ کی کوٹھی میں باہر چوکیدار کی بنچ پر بیٹھا عدیل بظاہر تو روسی کتے کو دیکھ رہا تھا لیکن اندر نہ جانے کہاں کہاں کا ٹکٹ کٹا کر کن بھولے بسرے سٹیشنوں پر رک رہا تھا۔ سفید کوٹھی میں سناٹا تھا۔ صرف زیبا کی چہکتی آواز آئی " عدیل پلیز آجائیں کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" بیوی کی آواز میں ٹیلی گرام جیسی امرجنسی تھی۔

اپنا گاؤں ' دادا ' گھرانا دادا کے کتے گھوڑے چھوڑے اسے ایک مدت ہو گئی تھی۔ سول سروس میں کئی سال رہ کر مختلف عہدوں اور جگہوں پر قیام کرتے ہوئے وہ کئی سبق سیکھ چکا تھا۔ اب وہ تبدیلی کو کسی حد تک ویلکم کیا کرتا۔ تبدیلی کے بغیر زندگی میں ایک ایسی بوریت آجاتی جس کا کوئی علاج نہیں۔ پہلے وہ تبدیلی سے خوفزدہ ہو جایا کرتا تھا اگر کرسی میز اپنی جگہ پر نہ ہوتے تو اس کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی۔ اب اگر پورٹ فولیو بدل جائے ' پرانے دوست وقت کے ساتھ بہہ جائیں ' گھوڑے کتے ناواقف ہو جائیں ' برسوں جانی ہوئی عورت کی آنکھ میں پہچان نہ ابھرے تو قیامت نہ تھی۔۔۔ تبدیلی کے تعویذ نے اسے جینے کا نیا گر سکھایا تھا۔

ابھی وہ چھوٹے سے سفید کتے کو بڑی محبت سے دیکھنے میں مشغول تھا اس کتے کے بال آنکھوں پر اس طرح آئے ہوئے تھے جیسے کسی بھرے بالوں والی افلاقی لڑکی کی بھری بڑھ کر بڑھ کر بار بار آنکھوں کو ڈھانپ لے۔

ہوا ' ہمسایہ ' ان ہونی ' ان کہی ' ان کے متعلق کوئی کہاں تک جان سکتا ہے؟ سول سروس سے پہلے عدیل نے ڈاکٹری کی تھی اس وقت اسے شکاری کتے اور موٹی چپت لڑکیاں پسند نہ تھیں۔ وہ ایک لمبا تڑنگا ' ڈھیلا ڈھالا ' سانولا سلونا ایک امیر گرائیں تھا۔ اسے کسی پروفیشن کی ضرورت نہ تھی کیونکہ چنگی کے گاؤں میں اس کے باپ دادا ہزاروں مربعوں کے مالک تھے نہ دادا کو تعلیم کا شوق تھا نہ باپ کو صرف عدیل کی ماں چاہتی تھی وہ چنگی چھوڑ کر شہر میں بڑا ڈاکٹر بن جائے۔ عدیل کی اپنی شہرت ' کمائی اور شان ہو۔ عدیل کی ماں اندر ہی اندر شہری زندگی کی گرویدہ تھی اور اس کی آرزو تھی اس کا عدیل کسی طرح اسی بڑے دھارے میں شامل ہو جائے۔

عدیل فیوڈل سسٹم میں پلا تھا اسے سستی ' کاہلی ' دبدبے اور شیخی سے پیار تھا۔ اس کے پرکھوں نے کتے گھوڑے ' انسان ایک ہی اصول کے پالے تھے ' بے پروائی کے اصول کے۔ جی چاہا تو نچھاور ہو گئے من نہ مانا تو سوکھے ڈال دیا اور بھول گئے۔ وہ لوگوں کو سر پر بٹھانے ' سوٹنے توڑنے ' بھنبھوڑنے ' چھوڑ دینے کے عادی تھے۔ عدیل بھی اسی گندم کی روٹی کھاتا رہا جو اس کے بڑوں نے کھائی تھی۔ اس کا آئی کیو اچھا تھا ماں کو خوش کرنے کی آرزو بھی تھی لیکن وہ ڈاکٹری کے امتحان میں زیادہ نمبر نہ لے سکا کیونکہ وہ جی سے ڈاکٹر بننا بھی نہ چاہتا تھا۔ دو سال لاہور میں رہ کر اور باپ کی ساری سفارشیں استعمال کرنے کے باوجود اسے نوکری نہ ملی۔ وہاں اس دوران اسے فاطمہ جناح میں پڑھنے والی تھرڈ ایئر میڈیکل سٹوڈنٹ صبورہ ضرور مل گئی۔ آہستہ آہستہ یہ ملاقاتیں اتنی بڑھ گئیں کہ چنگی میں بھی ان کا ذکر ہونے لگا۔ وہاں بھی اس تذکرے سے ناک کٹنے لگتی بھی شعلے بلند ہو جاتے۔

صبورہ آپ شناپی تھوڑی سی لڑکی تھی۔ اس کی فیملی میں تین پشتوں سے ڈاکٹروں کی بھرمار تھی۔ باپ چاچا ماموں اپنے اپنے مقام پر پروفیسر(Consaultent) سپیشلسٹ ' امریکہ پلٹ ' لندن بھیجے ' نہ جانے کیسے کیسے کامیاب کلینک چلا رہے تھے شروع شروع میں تو صبورہ کے والد نے بہت کوشش کی کہ عدیل ان کے ساتھ

کلینک پر کام کرے لیکن انہیں جلد ہی یقین ہو گیا کہ اسنے لاڈ پیار میں پلا ہوا شخص نہ تو سرکاری ڈاکٹر بن سکتا ہے نہ کسی کے ساتھ مل کر کلینک چلا سکتا ہے پھر یہ بھی بات تھی کہ صبورہ کے والد کے پاس اپنی بچی کے لئے وقت نہ تھا۔ وہ عدیل کے پیچھے پیچھے کیونکر بھاگتے پھرتے؟

عدیل کو تب علم نہ تھا کہ محبت میں کئی ایسے کرنچ آتے ہیں جن کی اولین سرشاری میں نہ ہوش ہوتی ہے نہ عقل۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کی شتاب رو صبورہ اسے ہمت و حوصلے کا ستون نظر آئی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ صبورہ بھی امیر والدین کی امیر بچی کی طرح "ہبا" کال سٹ الوجود بچی خوری تھی۔ صبورہ کے خاندان کی دولت اثرات نمائش کے باعث ساری اولاد اپنے لئے راستے اور محنت کرنے کی قائل تھی۔

عدیل اور صبورہ جب بھی ملے ان کی گفتگو بڑی آئیڈ لسٹک ہوتی۔۔۔ " میرا تو جی چاہتا ہے یو تھوپیا چلی جاؤں وہاں کے بیدار لوگوں کی مدد کروں۔۔۔"

" مجھے دیکھو تو صبورہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔۔۔۔ نوکری ہی نہیں مل رہی۔ دو سال سے کوشش کر رہا ہوں۔ منسٹروں کی سفارش بھی کارگر نہیں ہوتی۔۔۔"

" عدیل تمہیں پیسوں کی ضرورت ہے؟ مجھے تو نہیں ہے۔ میں تو روٹی پر پیاز رکھ کر گزارہ کر سکتی ہوں۔۔۔" یہ سنوری صبورہ کی زبان سے یہ بات سن کر عدیل اپنے آپ کو بہت ہی کمینہ محسوس کرتا۔

یہاں۔۔۔ پاکستان میں تو ٹاپا" Saturation Point آگیا ہے ڈاکٹروں کا۔۔۔ کئی میرے ساتھی سی ایس ایس کر رہے ہیں۔۔۔"

" کرنے دیں۔۔۔ ہمیں کیا ہم تو چنگی چلے جائیں گے تم بغیر فیس کے غریبوں کا علاج کرنا میں تمہارے ساتھ مرہم پٹی کیا کروں گی۔۔۔ عدیل ہم گاؤں گاؤں بستی بستی سائیکل پر جائیں گے۔۔۔"

" لیکن ہمارے پاس تو گاؤں میں بھی پجیرو ہے۔۔۔" عدیل کہتا۔

" رہے۔۔۔ ہو۔۔۔ ہم تو سائیکل پر جایا کریں گے یار مزہ آئے گا آئے گا ناں؟۔۔۔"

اتنی خوبصورت گروند مندی رنگے بال اور سنہری چہرے والی لڑکی کے منہ سے مارا قریبا قسم کی گفتگو سن کر وہ سکتے میں آجاتا۔ سوچنے لگتا۔ بھلا آج تک وہ کہاں رہا؟ اس کا جی چاہتا وہ جلد از جلد واپس پہنچ جائے۔ صبورہ اور وہ قریہ قریہ جائیں لوگوں کی مدد کریں۔۔۔ لیکن صبورہ تو وہ کم بخت سٹ الوجودہ تھی جو اپنی مدد بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ان کم نصیب لوگوں میں سے تھی جو میرابائی کے بھجن سن کر ہی اپنے آپ کو میرابائی سمجھنے لگتے ہیں۔ منصور حلاج ' سقراط ' مساتابدھ کی باتیں جان کر اپنے آپ کو ان کا حصہ سمجھ لیا کرتے ہیں۔

صبورہ کے ماں باپ نے بہت سمجھایا لیکن صبورہ نے تعلیم ادھوری چھوڑ دی اسے اپنی منزل چنگی میں نظر آئی۔ عدیل اور اس نے دوائیاں ' انجکشن ' پٹیاں جو ہزاروں کا سامان خریدا وہ نئی دلہن کے ساتھ آیا اور بیڈ روم کے پیچھے والے برآمدے میں رکھ دیا گیا۔ یہاں صرف جالی لگی تھی۔ برساتوں میں بارش پھنگ کیسوں پر پڑتی۔ دن بھر دھوپ کھوکھے سینکتی رہتی۔ ان دواؤں کا بھی وہی حشر ہوا جو ہسپتالوں میں عام طور پر جدید مشینری کا ہوا کرتا ہے۔

باتوں کے رسیا ' اچھے کھانوں کے دلدادہ ' خوبصورت گھنے اور کھلوانے کے شوقین سارا سارا دن پلنگ پر پڑے رہتے۔ ٹی وی دیکھتے ' رسالے پڑھتے ' پروگرام بناتے اور کل کے لئے سب کچھ ادھار رکھ کر سو جاتے۔

اورنگ زیب قاسمی

گاؤں کے اردگرد جو بھی دیکھنے کے قابل تھا وہ عدیل صبورہ کو دکھا چکا تھا۔ میوزک میں بھی جو کچھ سنانے کے قابل تھا صبورہ اسے سنا چکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی پیاس سے بلاٹنگ پیپر کی طرح بھیگ چکے تھے۔

عدیل کے متمول پٹھان خاندان میں صبورہ مکمل مل نہ سکی۔ وہ لوگ صبورہ کی پڑھائی اور شہری پن سے خوفزدہ تھے۔ صبورہ ان کی عورتوں کے رسم و رواج' انداز گفتگو سلیقے سے ناآشنا تھی۔ دھیرے دھیرے عدیل کے علاوہ سارے چکنی میں اس کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ عدیل بھی صبورہ کی تنہائی کے پیش نظر بیڈ روم میں گھسا رہتا۔ اسے علم نہ ہو سکا کہ کب برتن بھر گیا اور کب اس کے پانیوں نے برتن سے چھلک کر بہہ جانے کی ٹھان لی۔ صبورہ بھی اب پردے گی کار میں گاؤں کی ہریالی دیکھ کر واپس آتی تو اس کا چہرہ زرد ہی رہتا۔

اس نے میک اپ کرنا چھوڑ دیا' نئے لباس پہن کر عدیل سے نہ پوچھا جاتا کہ وہ کیسی لگ رہی ہے؟ لمبی آہیں بھرنا اور سستی سے دراز ہوئے رہنے میں ہی اسے لطف ملتا۔

ایک شام کالے گجر نے عدیل کے بیڈ روم پر دستک دی۔ عدیل قالین پر صبورہ کے ساتھ یوں لیٹا تھا جیسے کسی ٹھنڈے ڈالنے والی کے سامنے رضائی پڑی ہو۔

"کون ہے؟ - - - عدیل نے بے امید آواز میں پوچھا۔

"میں حضور کا ماجھو - - -"

صبورہ کے چہرے پر ناخوشگواری کی لہر دوڑ گئی۔ اسے دیہاتیوں کی آوازیں' چہرے' ہیرکٹ' لباس' انداز بھی کچھ ناپسند تھا۔

"کیا چاہیے؟ - - -"

"ایک کتا کھاتا سرکار - - -"

عدیل نے نکھیوں سے صبورہ کی طرف دیکھا۔ اسے صبورہ سے بڑی محبت ملی تھی۔ چھ فٹ اونچے لمبے عدیل کی ساری روح اور جسم اس محبت میں بھیگ چکا تھا۔ وہ صبورہ کی ناراضگی سے بڑا ہی خوفزدہ تھا۔ ہر مرد کی طرح محبت کی اس دیوی کے آگے وہ بے حد کمزور محسوس کرنے کا عادی تھا صبورہ کے لئے بھی اس قد آور کی نجی محفل اور بے اتفاقی کے شاہد میں یک التفات بے حد پرکشش تھا۔ وہ بھی اپنے پونڈل کو لمحہ بھر کے لئے علیحدہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

کالے گجر کی آواز نے ان دونوں کی زنجیر کا پہلا کنڈا توڑ دیا۔ صبورہ کے لئے ہر وہ شوق جو ذہنی یا جسمانی طور پر عدیل کو اس سے دور لے جاتا خوف کا باعث بنتا۔ اس کی چھٹی حس جانتی تھی کہ اسی شوق کی بگھی پر سوار ہو کر شہزادہ گلفام اس کی قلمرو سے نکل جائے گا۔ کالے گجر نے دروازے کے ساتھ منہ لگا کر کہا "سرکار ایسا کتا ہے' ایسا کتا ہے آپ میاں جی کلادوستن بھول جائیں گے۔ پولیس والے دیکھ لیں تو ابھی اٹھا کر لے جائیں - - -"

عدیل نے اجازت طلب نظروں سے صبورہ کو دیکھا - - -

کتوں کی محبت صبورہ کے لئے ایک اجنبی ٹاپک تھا خطرے کا سائرن بجا۔ وہ کتوں کے نسلی نام 'پیڈیگری' عادات کسی چیز سے واقف نہ تھی۔ وہ اس شوق میں برابری تو درکنار دلچسپی کی حد تک بھی عدیل کے ساتھ نہ جا سکتی تھی۔

اورنگ زیب قاسمی

عدیل نے نہ منہ سے اجازت طلب کی نہ نظروں سے بھلاپوری کھسے میں پاؤں چھپائے' ریشم جیسے دھسے کو جسم پر لپیٹا اور پہلی بار حویلی سے منسلک چھوٹی کوٹھی سے اکیلا برآمد ہوا۔ باہر کی تازہ ہوا اسے ٹھنڈی لگی۔ اسے محسوس ہوا ہوا میں پکے ہوئے شفتالوؤں کی خوشبو ہے۔ شہد کی مکھیوں کی گنجار اور کہیں دور قرار پر اکسانے والا جیپ کا انجن چل رہا ہے۔

کچے راستے پر ہچکولے کھاتی جیپ چلنے لگی عدیل کو لگا وہ ہوائی جہاز کی طرح ٹیک آف کر جائے گا۔۔۔ اس نے دھسا اتار کر پچھلی سیٹ پر پھینک دیا۔

عدیل کو اب تک علم نہ تھا کہ وہ بیک وقت دو آرزوؤں کا اسیر ہے اور دونوں آرزوئیں مختلف سمتوں کو جاتی ہیں۔

سارا دن عدیل کتوں کے ساتھ رہا اور صبورہ اس دوران روتی رہی۔ اسے بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیوں روتی ہے؟ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ تنہائی ہے --- ایک اجنبی ماحول کی تنہائی جس میں عدیل ہی اس کا ہر طرح سے کفیل تھا۔ عدیل کی غیر موجودگی میں سب کچھ بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ شاید تنہائی بھی نہیں تھی۔ صبورہ کو احساس کمتری نے گھیر لیا تھا۔ اندر ہی اندر اسے علم ہو گیا تھا کہ عدیل کے کچھ ایسے شوق بھی ہیں اور ابھی ہوں گے جن میں صبورہ دخیل نہیں ہو سکتی --- اچانک وہ ناقابل ہو گئی تھی۔

عدیل کو بچپن سے لاڈپیار کی عادت تھی۔ محبت اس کی ایک بنیادی ضرورت تھی۔ وہ محبت وصول کئے بغیر زندہ رہنے کو بے کار سمجھتا تھا۔ جب بھی اسے محبت کرنے کی ضرورت پیش آتی "التفاتاً" جواباً" محبت کرتا از خود لاشعوری طور پر جتلائے عشق ہونا نہ اس کی سرشت میں تھا' نہ ہی کبھی اس نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔ صبورہ سے شادی کے بعد اس میں محبت کا ایک نیا ذائقہ مست اور احساس پیدا ہوا' اس کی اپنی عزیز رشتہ دار لڑکیوں میں اس قدر سپردگی تھی کہ تھوڑی ہی دیر بعد عدیل ان سے بیزار ہو جاتا لیکن صبورہ کی ایک پرسنیلٹی تھی انا تھی اور باتیں ڈسکس کرتے وقت اپنی پسند کا اظہار کرتی اور اپنی رائے کو آسانی سے بدل نہ پاتی۔ اس کے معاشی' پولیٹیکل' معاشرتی نظریے تھے' ذوق جمال کی جہتیں بڑی واضح تھیں۔ ایسی لڑکی کو حصار میں لئے بغیر عدیل محبت کے معاملے میں خود کو محفوظ نہ سمجھتا تھا۔ اسی لئے جب لاہور میں اسے نوکری نہ ملی اور وہ محل نما حویلی میں صبورہ کو لے کر لوٹا تو اسے قلبی سکون تھا۔ یہاں صبورہ کو مقید رکھ کر وہ اس کی محبت کا کلی وارث بنے گا۔ منظر سے تمام توجہ طلب امور' اشیا' بھاگ دوڑ غائب کر کے وہ صبورہ کی توجہ اور خیال کا واحد مرکز بننا چاہتا تھا۔ جس وقت محبت کی اس شدید طلب کے ساتھ مجبور ہو کر عدیل نے صبورہ کو شہزادہ گلفام بنایا' اس وقت عدیل کو علم نہ تھا کہ چاہنے والوں میں جب بھی آزادی سلب ہوتی ہے دونوں طرف تازہ ہوا بند ہو جاتی ہے' جب بھی ہتھکڑی لگتی ہے ہولے ہولے عاشق اور محبوب دونوں ہی قیدی بن جاتے ہیں۔ چکنی کی محل نما حویلی سے منسلک چھوٹی کوٹھی میں صبورہ کچھ دیر کے بعد سمجھ گئی کہ اس کے پاس بھی کچھ ایسے ہتھیار ہیں جن کی مدد سے وہ عدیل کو پرائیویٹ پراپرٹی بنا سکتی ہے۔

صبورہ کے پاس دینے کو محبت بھی تھی اور جنس بھی' ہولے ہولے اس نے یہی دو ہتھکڑیاں لگا کر عدیل کو قیدی کر لیا اور یوں اپنی عمر قید کا چپ چاپ مداوا کیا۔

بڑی دیر تک عدیل کا ماجھو اور بلال کیانی کے ساتھ افغانی کتے ڈسکس کرتا رہا۔ افغانی کتا کسی

پولیٹیکل لیڈر کی طرح منہ بسورے اندر خوف سے چپ لیکن بظاہر بنا بیٹھا رہا تھا۔ اس کی عادات پیڈیگری کھانے پینے کے اوقات ' شکار کرنے کی صلاحیت' وفاداری اتنا کچھ زیر بحث رہا گویا کسی لڑکی کے رشتے کے وقت خاندانی لوگ دھاگا دھاگا' ادھیڑ کر دیکھ رہے ہوں' شام پڑے عدیل لوٹا تو بیڈروم اندر سے مقفل تھا۔ اسے کئی کھڑکیوں پر دستک دینی پڑی ' کئی دروازے کھٹکھٹانے پڑے ' ہار کر جب وہ آوازیں دینے لگا تو صبورہ نے جلدی سے بیڈروم کا دروازہ کھولا اور پھر بھاگ کر غسل خانے میں گھس گئی۔

عدیل کچھ دیر صوفے پر بیٹھا رہا۔ چھوٹی کوٹھی کا یہ اپارٹمنٹ جدید سہولتوں اور آرائش کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا تھا اس کو احساس نہ ہوتا کہ یہ چنگی کی کوئی چارپشت پرانی حویلی کا حصہ ہے عدیل کے دادا نے دل کھول کر اپنے پوتے کی شادی پر خرچ کیا جب وہ لوگ عدیل کو بیاہنے لاہور گئے تو دو ہزار مزارعے کیسری پگڑیاں پہنے ڈھول بجاتے بڑے بڑے (Fioats) سے اترے تھے۔ ایسی منڈی ڈاکٹر صاحب کے گھرانے نے تو کیا سارے لاہور والوں نے بھی کبھی دیکھی ہوگی۔ عدیل نے مسکرا کر اپارٹمنٹ کے سارے سامان کو دیکھا پھر سر ہلا کر جی میں سوچا یہ تو لاہور کا حصہ ہے میں تو صبورہ کو چنگی لایا تھا؟ اور وہ خوشی سے یہاں آنے پر رضامند بھی تھی پھر ان چیزوں کی ضرورت کیا تھی؟ ہمیں تو مرحوم اماں کے پرانے پلنگ پر مزے سے سونا چاہیے تھا۔ شاید وژن آف لائف اختیار کرنے سے ہم دونوں خوش رہ سکتے تھے۔ چنگی میں لاہور امپورٹ کرنے سے کاہا" بات نہیں بن سکتی۔

کچھ بیٹھے رہنے کے بعد عدیل کو احساس ہوا کہ غسل خانے سے چلنے پھرنے کی آواز بھی نہیں آرہی وہ آہستہ سے انتہائی نرمی سے اس نے دروازے پر دستک دی۔ دو چار بار آواز دینے کے بعد اس نے دروازے سے کان لگایا اور کچھ سننے کی کوشش کی۔ اندر بند بند سسکیاں چل رہی تھیں۔ وہ آکر کھڑکی میں کھڑا ہوگیا۔ باہر اندھیرا تھا ہوا میں گوبر کی بو تھی ---- وہ اندر سسکیوں کو سن کر کچھ بھونچکا' کچھ تھوڑا سا ناخوش ہوگیا۔

اس کے جی میں آئی کہ وہ واپس دادا کے کتوں کے پاس چلا جائے لیکن بچھا چڑھے پہلوان کی طرح وہ کسمسا کر رہ گیا۔ وہ صبورہ کے معاملے میں بہت کمزور تھا۔ دیر تک وہ باہر کا اندھیرا دیکھتا رہا۔ پھر نرمی سے صبورہ کو بلایا۔ لگاتار کئی پیار بھرے سے نام پکارے اس قدر اثر اندرونی پر ضرور ہوا کہ اب سسکیاں ہمت پاکر ذرا اونچی ہوگئیں لیکن دروازہ نہ کھلا۔

یہ سلسلہ آدھی رات تک چلا۔ اس دوران غسل خانے کے اندر بند صبورہ نے کئی انتہائی جملے بھی استعمال کئے۔ اس کی بے توجہی کے طعنے بھی دیے۔ عدیل بھی بند دروازوں کے پار پہنچنا جانتا تھا۔ اسے تو جی حضوری کی حد تک محبت کی عادت تھی یہ تجربہ اس کے لئے انوکھا تھا۔ تجدید محبت کے لئے ناک رگڑنا اس کے مسلک میں نہ تھا۔ بھیس بدل کر یکدم گدا صورت کاسہ لئے فقیر بن جانا اس کی انا کے لئے بڑا ہی دھکا تھا۔ آدھی رات گئے وہ مکمل طور پر اس بزدلی صبورہ کے ہاتھوں مجبور ہوگیا۔ آخر عدیل نے زہر کھا لینے کی دھمکی دی تو صبورہ نے کھٹاک سے دروازہ کھولا اور فرش پر بیٹھے عدیل کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ایک دھمے میں لپٹے لپٹے ایک دوسرے سے گلہ کرتے مناتے 'رلاتے ' انہیں صبح کاذب نے گھیر لیا۔

یہ تجربہ عدیل کے لئے بالکل انوکھا تھا اتنی محبت اسے زندگی بھر نہ ملی تھی۔ اب اس نے شعار بنا لیا وہ دوسرے تیسرے دن چپ چاپ باہر نکل جاتا۔ واپسی پر ان دونوں میں بڑا ہی پٹ سیاپا ہوتا۔ انتہائی گفتگو چلتی

اورنگ زیب قاسمی

لیکن آخر میں بھیک کا ٹکڑا عدیل کو بہت ہی میٹھا لگتا۔

شاید اس کے باپ دادا بھی ایسی ہی محبتوں کے سہارے زندہ رہے تھے لیکن اب زمانہ اور لوگ ندی میں بہت آگے جاچکے تھے۔ سپرسنیلیٹی کردار' انا کی شکست وریخت کے بعد عجیب گھڑی ہی محبت پیدا ہوتی تھی۔ فی زمانہ اور سب کچھ تو ایک دوسرے میں حل ہو سکتا ہے' محبت جیسے محلول میں انا کبھی بھی گھلنے کو تیار نہیں۔

پھر مشکل تو یہ بھی عدیل دو آرزؤں کا اسیر تھا اور یہ دونوں خواہشیں اسے دو مختلف سمتوں میں کھینچتی تھیں۔

اسے ہوتے ہوئے پتہ چل رہا تھا کہ جس قدر وہ چنگی کی حویلی میں صبورہ کو اسیر رکھ کر اس پیچھے سے محبت کا شہد نچوڑ رہا ہے اسی تناسب سے وہ خود بھی قیدی بنتا جارہا ہے اور نچوڑا جارہا ہے اگر صبورہ ماں بن جاتی تو ایک چور دروازے سے وہ فرار ہو سکتی تھی لیکن پورے دو سال بعد بھی صبورہ کے لئے صرف عدیل کے سہارے جینا تھا اسی کے گلے میں بانہیں ڈال کر دکھ سکھ رونا تھا۔ عورت عموماً" محبت کے سہارے ہی زندہ رہتی ہے لیکن محبت میں بڑھوتری یا کٹوتی ہوتی ہے تو بات بنتی ہے مرد کی محبت میں اگر یکسانیت اور جمود ہو تو پھر وہ اپنے جذبات کی پشت بندی نہیں کر سکتی اور بکھرنے لگتی ہے۔ دراصل عورت اور بچے کی فطرت میں اسٹک کا عنصر غالب ہوتا ہے وہ جلدی جلدی منظر کی تبدیلی ' حالات کا الٹ پھیر' کھیل کود' ٹک ' تماشا پسند کرتے ہیں۔ بچے کی پرورش کے لئے' اسی لئے عورت زیادہ موزوں ہے کیونکہ ان دونوں کی طبیعتوں میں مماثلت ہے بچے اور عورت دونوں تبدیلی اور کھیل کو پسند کرتے ہیں صبورہ کو جب دن بدن بڑھنے پھلنے پھولنے والا بچہ نہ ملا تو حویلی کی تبدیل نہ ہونے والی جامد زندگی میں اور بھی تعفن اکٹھا ہو گیا۔

عدیل کی اسیری صبورہ سے بھی زیادہ تھی لیکن صبورہ انتہائی گفتگو' لڑنے جھگڑنے ' رونے منانے کے گھیر سے بھی نکل گئی۔ عدیل اسے ہاتھ لگاتا تو وہ پتھر بن جاتی اس کے اندر کے سارے کرنٹ فیوز ہو جاتے۔ عدیل اسے مناتا ' تحفے دیتا اور پھر سیلپنگ پلز پی کر سو رہتا۔ عدیل اور صبورہ کو ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی وہ ایک دوسرے بنا نہیں رہ سکتے تھے لیکن اس وقت ساتھ ساتھ رہنا بھی بڑا ہی تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ عدیل محبت پانے کی خواہش کو اس درجہ پال چکا تھا کہ کوئی بھی قیمت اسے کم لگتی۔ بالآخر اس پیچ ناقص سے بھی صبورہ نے ہی عدیل کو نکالا۔

چنگی پر شام کے وقت چھوٹے چھوٹے تتر کھیے بادل چھائے تھے۔ کوے اور کبوتر ڈار ڈار گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ دیہات کسی ساکت فوٹوگراف کی طرف ساکت وجامد تھا۔ سارے میں چاولوں کی خوشبو تھی۔ عدیل کچھ دیر کے لئے دادا کا ڈوربین دیکھنے گیا تھا۔ لیکن ابھی سورج غروب کی لالی آسمان پر باقی تھی جب وہ وحشی کبوتر کی طرح گھر میں داخل ہوا۔ صبورہ بیڈ سے ملحق ڈریسنگ روم میں ڈریسنگ گاؤن پہنے چند سوٹ کیس دھرے الماریوں سے کپڑے نکال' دھر پلٹ رہی تھی عدیل نے کچھ بولنا چاہا لیکن وہ بھی پھٹے میں پاؤں پھنسانا نہ چاہتا تھا۔ گم سم لمبے صوفے پر بیٹھ کر فیلی میگزین کے صفحے پلٹنے لگا۔ ادھر گھسیٹ رکھ بند نہ ہوئی۔ جب شام اندھیرے میں بدل گئی اور دیہاتی خانساماں نے کھانا بھی لگا دیا تو ابھی تک صبورہ بات کرنے پر رضامند نہ تھی وہ چپ چاپ آکر کھانا کھانے لگی۔

عدیل نے مسکرا کر اسے مسکرانے پر آمادہ کیا۔
صبورہ چپ رہی۔
"کیوں کیا ہوا؟؟"
"کچھ نہیں؟۔۔"
"ناراض ہو۔۔؟" عدیل نے پوچھا۔
"ہرگز نہیں۔۔"
کچھ دیر خاموشی رہی۔ عدیل کی وارثت میں سب کچھ مل چکا تھا۔ صرف عورت کی محبت اس نے خود حاصل کی تھی اور اپنی ذاتی کامیابی کو بے برگ کرنا اس کے لئے بے ٹھکانہ ہونے کے برابر تھا۔
"میں جا رہی ہوں عدیل۔۔"
"جا رہی ہو؟۔۔ کہاں؟"
"لاہور۔۔"
"لاہور۔۔ وہ کیوں؟"
"میں اپنا میڈیکل مکمل کرنا چاہتی ہوں۔ ابو ٹھیک سمجھاتے تھے کہ مجھے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد شادی کرنی چاہیے۔ اس طرح میرے پاس چوائس نہیں ہے۔۔ بس شادی ہی شادی رہ گئی ہے میرے لئے۔"
وہ دیر تک پاؤں تھر تھراتا سوچتا رہا کہ صبورہ کو اب چوائس کی کیا ضرورت ہے؟ وہ اب کس قسم کی چوائس چاہتی ہے؟
"اگر آج میں ایم بی بی ایس ہوتی۔۔ تو۔۔ آج میں پریکٹس کر سکتی تھی۔"
"لیکن صبورہ میں بھی تو سند یافتہ پورا ڈاکٹر ہوں۔۔ پھر۔۔ ہم دونوں نے پلان بنائے تھے کچھ۔"
"میں نہ اپنے لئے فروٹ فل ہوں نہ کسی اور کے لئے۔۔ یہ کوئی زندگی ہے عدیل۔۔؟ بندگوبھی کی طرح پڑے رہنا' نہ کوئی چیلنج نہ کوئی تبدیلی' نہ کوئی منزل۔"
وہ حیران رہ گیا۔ اس نے کئی ناولوں میں نظموں' غزلوں میں پڑھ رکھا تھا کہ محبت جس کھیت کی آبیاری کرے وہ کبھی نہیں سوکھتا۔ من چاہے کا ساتھ ملے تو مسافت تھکاتی نہیں۔ پریمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ہو تو وقت کے پر لگ جاتے ہیں۔ محبوب کی چاکری میں جسم اور روح اصلی فلاح پاتی ہیں۔ ہر رشتے کی ذمہ داری اور بوجھ ہوتا ہے لیکن عاشق پر محبوب کی ذات کا کچھ بوجھ نہیں ہوتا۔
اس وقت عدیل کو پتہ چلا کہ صبورہ اس کی عاشق نہیں ہے۔ وہ بھی عدیل کے علاوہ اور بہت کچھ چاہتی ہے' خود عدیل دو خواہشوں کا اسیر تھا۔ صبورہ کے جذبات جانتے ہی عدیل کی اپنی محبت ساکت ہو گئی اور دوسری جانب آزادی کی خواہش نے اسے [illegible] چڑھا لیا۔ محبت کی خواہش میں اس نے کئی برس کاٹے تھے۔ اب اس خواہش کی پاؤں پھندنی خود بخود کٹ گئی۔ پتہ نہیں کیوں صبورہ کے چلے جانے کے بعد گھوڑوں کی سواری کرتے ہوئے اسے تازہ ہوا کھلی فضا میں ایک پرندے کی سی خوشی محسوس ہوئی۔ وہ نئی اڑانوں کا منتظر رہنے لگا آزادی اتنی پرلطف ہو سکتی ہے اس کا اسے خیال تک نہ تھا۔
ایک آرزو بجھی آگ کی طرح بے نور ہو گئی۔ اب وہ کسی قیمت پر محبت کے لئے کوشش نہ کرنا چاہتا

اورنگ زیب قاسمی

تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عورت کے معاملے میں وہ کمزور ہے عورت کی رفاقت کسی وقت بھی پلا مار کر اس کی آزادی کا دیا بجھا سکتی ہے' پھر بھی اپنی بلوبک سے اس نے عورت سے متعلقہ حصول کی خواہش کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ آزادی کی تمنا کے ساتھ ساتھ عورت کی محبت کا دیا جل نہ سکتا تھا۔
جس روز اس نے صبورہ کے خط کارڈز اور تصویریں جلائیں اسی روز شام کے وقت اسے دادا نے طلب کیا۔ راجپوتی داڑھی مونچھوں والا دراز قد دادا قصوری موڑھے میں اکڑوں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ ساری عمر اس نے کبھی شکست یا احساس کمتری سے شناسائی نہیں کی۔
"آؤ عدیل میاں آؤ۔۔"
"آپ نے بلایا مجھے؟ دادا جی؟"
"بیٹھو۔۔"
عدیل ان مانے جی سے بیٹھ گیا۔
"میں نے دیکھا ہے اگر کتا دانت نکال کر غرائے یا بھونکے تو وہ خطرے سے آگاہ کر رہا ہے اگر اوپر والے سروں میں چلائے تو کتا یا تو ڈر گیا ہے یا پھر تکلیف میں ہے۔ دم کو جلدی جلدی افقی سمتوں میں ہلائے تو جان لو مسکرا رہا ہے' دوستی کرنا چاہتا ہے۔ جب بھی کتا خوفزدہ ہو اپنے کان نکال کر سر نیچا کر لے' پتہ چلتا ہے شرمندہ ہے آدھی رات کو منہ اٹھا کر دیر تک لمبی تان میں بھونکنے والا کتا عموماً افسردہ اور بہت تنہا ہوتا ہے۔۔"
"جی دادا۔۔"
"کیا تم یہ ساری باتیں جانتے تھے؟"
عدیل نے دائیں بائیں سر ہلایا اور پھر آہستہ سے بولا۔۔ "ساری تو نہیں کچھ ضرور معلوم تھیں۔"
"کتے میں اگر نروسس یا دیوانگی کے آثار دیکھیں تو مالک کو پتہ ہونا چاہیے کہ وہ عجیب و غریب حرکتیں کیوں کر رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے دائروں میں بھاگنا قلابازیاں کھانا۔ اس کی فنکشن سے وابستہ کئی حرکتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو صرف مالک ہی سمجھ سکتا ہے۔ کیا تم جانتے تھے کہ کتے بھی دیوانگی کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسی دیوانگی جس کا تعلق فنکشن سے ہے۔
عدیل نے سر نفی میں ہلایا۔
"جب تم ساری عمر کتوں میں رہ کر اس کے جذبات کی زبان نہ سمجھ پائے تو تم عورت کو کیا سمجھے ہو گے۔ تمہیں عورت کا تجربہ [illegible] ہوتا ہے۔" عدیل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
"احمق آدمی۔۔ قرنہا قرن سے مرد عورت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ ماں بچے کی زندگی میں داخل ہونے پر اصرار کرتا ہے لیکن یہاں دخل دینا بے دخلی کو دعوت دینا ہے۔ احمق پوتے عورت سے محبت کرتے ہیں مانگتے نہیں۔ اگر اس سے محبت مانگو گے تو وہ تمہیں قید کرلے گی اور تم ساری عمر آزادی کو ترسو گے عورت کے ساتھ رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے اسے بھی آزاد رکھو خود بھی آزاد رہو۔ وہ بے چاری لاچار ہے۔ محبت صرف اپنے بچے سے کر سکتی ہے۔ ایسی محبت جو سارے عیب ڈھانپتی ہے ہر طرح کی قربانی دے سکتی ہے' سارے ظلم سہہ کر بھی چھوڑتی نہیں' اپنا ٹائم ویسٹ نہ کرو۔۔ ہم لجپال لوگ ہیں ہمیں پاؤں کی زنجیریں تادیر اچھی نہیں لگتیں ہم محبت چاہتے ہیں لیکن آزادی کے ساتھ ساتھ۔ کوئی عورت آزادی دے کر

محبت نہیں کر سکتی۔ آزادی اور محبت کی تمام خواہش چھوڑ دو۔ ان دونوں کی سمت الگ ہے۔ اب جاؤ کاکا گھر کے پاس میں نے کل شام ایک پوئنٹر خریدا ہے ایسا شکاری ہے کہ گھنٹہ گھنٹہ تک چپ چاپ دم آسمان کی طرف اٹھائے گزارتا ہے۔۔"

عدل جانے لگا تو آواز آئی "ہمیشہ سے عورت کبھی شکار نہیں ہوتی۔ لگتا ہے کہ مری پڑی ہے پاس جاؤ تو پھر سے اڑ جاتی ہے۔۔ عورت سے محبت کرو۔۔ لیکن شکار نہ کرو۔۔ شکار اس کو صرف اس کی اولاد کرے گی جان لو عورت جب مرے گی اولاد کے ہاتھ سے مرے گی۔"

عدیل نے کئی سوال کرنا چاہے لیکن دادا اور اس کے درمیان ادب کی دیوار حائل تھی' اس نے دادا کے ساتھ بے تکلف ہو کر کبھی بات نہ کی تھی۔

جب وہ اپنے اپارٹمنٹ میں واپس آیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سی ایس ایس کرے گا اور یہی وہ عہد تھا جب اس نے دادا کے کتوں سے بڑی محبت کی۔ شکار کھیلا۔ گھوڑوں پر چڑھ کر میلوں میل انہیں سرپٹ دوڑاتا رہا۔ اس کی پہلی پوسٹنگ سوات میں ہوئی تو یہ سارے شوق خود بخود چھوٹ گئے۔

کچھ دیر وہ باڑھ کے پار دیکھتا رہا۔

بڑی جیپ سے اتر کر گھر کے نئے کرائے دار اندر چلے گئے لان میں چھوٹے سے روئی کتے سے دو گیند جیسے بچے کھیل رہے تھے۔ کتا بمشکل تمام ایک فٹ اونچا تھا۔ اس کے ریشمی بال آنکھوں پر آئے ہوئے تھے جیسے کسی افغانی بچی کے ماتھے پر بالوں کی ان کئی ہوئی گھنگھریالی جھالر پڑی رہتی ہے۔ چھوٹی سی سرخ زبان منہ سے جھانک رہی تھی یہ کتا مکمل طور پر پیار کے لئے بنا تھا۔ اسے زندگی سے اور کوئی آس نہ تھی۔ وہ بچوں کے ساتھ ان کے اوپر گود میں پلنگ پر رہ کر مطمئن رہ سکتا تھا۔۔ بڑے برس پہلے چھوڑی ہوئی ایک سمت کی خواہش عدیل کو یاد آگئی تب وہ صرف محبت کے لئے جینا چاہتا تھا۔ صبورہ کے جانے کے کئی سال بعد اسے پتہ چلا کہ محبت کرنے کا نام ہے پانے کا نہیں۔۔ اور بدقسمتی سے وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ کئی پشتوں کا فیوڈل لارڈ محبت کر نہیں سکتا اس کے Gene ہی اس شکست خوردہ رول کو اپنا نہیں سکتے' اسے اپنی آزادی بہت پیاری ہوتی ہے۔

اسی لئے وہ جو دو خواہشوں کا اسیر تھا ایک خواہش ساکت ہو جانے پر دوسری سمت میں پورے کروفر کے ساتھ اپنے آپ کو دیکھ دیکھ کر چلنے لگا۔ خشونت کے ساتھ چلنا بھی اس کی آبائی وراثت تھی سی ایس پی کی پہلی پوسٹنگ کے بعد اس کی ملاقات زیبا سے ہوئی اسے ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی جو خود بھی آزاد رہے اور عدیل کو بھی آزاد رہنے دے۔ عدیل نے محبت کے خواب دیکھنے کبھی کے بند کر دیئے تھے۔ اب اسے ایک ایسے ساتھی کی تلاش تھی جو خود کفیل ہو جذباتی معاشرتی اقتصادی طور پر اپنا بوجھ اٹھا سکے۔ زیبا بڑی معروف ماڈل گرل تھی فیشن شوز میں جب وہ بلی کی سی چال چلتی سٹیج پر آتی اور کسی پوز میں جم کر سٹیج میں بیچ ہو جاتی تو سارا ہال دیر تک تالیوں سے گونجتا رہتا۔ ٹیلی ویژن پر اس کے اشتہارات بہت مقبول تھے جب بھی کوئی Sponsor اشتہار بنوانا چاہتا تو زیبا کی ڈیمانڈ کرتا۔ خود اعتمادی سے بھری ہوئی زیبا اپنی ذات کے طلسم میں بند تھی اسے یہ پروا نہیں تھی کہ وہ اندر سے کیوں اور کیسے ہے۔ اسے ایک ہی فکر تھا کہ وہ باہر سے کیسی لگتی ہے۔ اپنی ذات کی تعریف پر وہ زندہ تھی۔ اس کے چاہنے والے بہت تھے لیکن اس نے زندگی میں Choosy ہونا سیکھا تھا۔

اورنگ زیب قاسمی

اپنے ایماندار باپ کے ساتھ رہ کر وہ جان گئی تھی کہ جب بھی آپ راستہ چھوڑتے جاتے ہیں' دوسروں کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں قربانی' ایثار اور صبر کی زندگی بسر کرتے ہیں تو بالآخر آپ کے ساتھ دادی جیسا سلوک ہوتا ہے۔ آپ کی چارپائی گندم والے گودام میں چلی جاتی ہے۔ بہت جلد یہ حقیقت بھی وہ جان گئی کہ اپنی پسند بتانا جتانا اور اس پر جم جانا انسانی حقوق میں اولین ہے۔ وہ سکول کالج میں سہیلیوں میں اور رفتہ رفتہ ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں ڈکٹیٹ کرنے کی عادی ہو گئی۔ وہ کیا کھائے گی' کیا پہنے گی' کس کے ساتھ رہے گی' کون اس کا دوست ہو گا؟ ہوتے ہوتے اس آزاد پسند لڑکی کے گھر میں سب کچھ اس کی پسند کا ہونے لگا۔ ماں باپ تو اس سے خوفزدہ تھے ہی' بہن بھائی بھی اب اس کی راہ چھوڑ کر دیواروں سے لگنے لگے۔

عدیل کی ملاقات اچانک زیبا سے ہوئی۔ منتجا بھائی کا سالانہ ڈنر تھا۔ اس کا مینیجنگ ڈائریکٹر عدیل کا پرانا دوست تھا۔ یہ دونوں جب فائیو سٹار ہوٹل میں داخل ہوئے اسی وقت زیبا پوزن سینٹ سے مٹکی براؤن اور برانز رنگوں کے کپڑوں میں خوبصورت نظر آئی' منتقی ہوٹل کے انٹرنس والے دروازے پر بیچی شیشے کے دروازے کے قریب کھڑے عدیل اور عارف دونوں اندر داخل ہونے کے بجائے چار چار فٹ پیچھے ہٹ گئے' زیبا نے ایفکٹ جمانے والی مسکراہٹ پیش کی اور پاؤں پر برش پھیرتی بلی کی سی چال سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ہوا میں پوزن ہی پوزن تھا۔ ڈنر پر زیادہ تر بزنس سیکٹر کے لوگ موجود تھے لیکن زیب داستان کے لئے شہر کی کچھ ول ڈریسڈ گرومڈ خواتین کو بھی بلایا گیا تھا۔ ان میں ہی زیبا بھی تھی۔ اتفاق سے ڈنر کے وقت عدیل کی سیٹ زیبا کے ساتھ رہی۔ جب فش اینڈ چپس کا کورس آیا تو زیبا نے اس کورس میں سے کچھ نہ لیا۔

"بڑی مزے دار سامن فش ہے آپ ٹرائی کریں۔" عدیل نے اصرار سے کہا۔

نو تھینک یو۔" وہ سوپ پیتی رہی۔

"آپ کو فش اچھی نہیں لگتی؟"

"لگتی ہے۔۔۔" جواب ملا۔

"پھر؟۔۔۔" عدیل نے سوال کیا۔

"بس اس وقت میرا جی نہیں چاہتا۔۔۔"

اس کے بعد اس نے آٹھ کورس کے ڈنر پر بار بار اپنی چوائس کا اظہار کیا اور آخر میں جب سب قہوہ پی رہے تھے زیبا نے منٹ ٹی منگوائی۔۔۔ اور دو گھونٹ پینے کے بعد پیالی پرے کر دی۔

"آپ کی منٹ ٹی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔۔۔" عدیل نے مشورہ دیا۔

"اچھا ٹیسٹ نہیں ہے۔۔۔ میں کھانے کے معاملے میں بہت Choosy ہوں۔۔۔"

کچھ اتنی دیر نہ گزری کہ عدیل کو پتہ چل گیا وہ ہر معاملے میں بڑی آزاد تھی۔

جس روز عدیل نے زیبا کے لئے سالگرہ کا تحفہ خریدا اسی روز اس نے فیصلہ کیا کہ وہ زیبا ہی سے شادی کرے گا۔ محبت کے سارے خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔ اب وہ جان گیا تھا کہ لوگ صرف آزادی کے سہارے زندہ رہ سکتے تھے۔ یہی اس کی دوسری سمت کی خواہش تھی۔ آزادی اور محبت ایسی (Cross Roads) تھیں جو افق پر جا کر بھی نہ ملتیں تھیں۔ وہ عہد گزر چکے تھے جب انسان ذات کی نئی

کر کے ساری آزادی کو اطاعت اور شکر گزاری میں بدل کر' ایک نظر' ایک دیدار کی خاطر عمریں گزار تے تھے۔
اب اکیسویں صدی زمانے کے کواڑ بجا رہی تھی اور نئی نسل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آزادی تازہ ہوا کی مانند ہے جس کے بغیر سانس لینا ممکن نہیں۔ اس آزادی کی تازہ ہوا میں ذرا سی Pollation بھی برداشت نہیں کی جا سکتی۔

عدیل بڑی دیر بعد کسی جیولرز کی دوکان پر گیا۔ یہاں سے اس کی ماں زیور بنوایا کرتی تھی۔ اس کی بہنوں کا بھی تمام زیور اسی دوکان سے بنا تھا۔" کچھ ماڈرن دکھایئے ' آزاد خیال لڑکی کے لئے --- ہلکا لیکن مہنگا---"

" پھر آپ ڈائمنڈ دیکھے سر--- ہلکا پھلکا لیکن قیمتی زیور---"

جیولر چھوٹے چھوٹے مخملی ڈبے نکالنے لگا۔ ابھی تک عدیل کا خیال تھا کہ وزنی کڑے' ہنسلیاں' بھاری بھاری چوڑیاں' پانچ پیس والی' ہار سواد سونے کے کنگن زیور ہوتا ہے لیکن اس روز جیولر کی دوکان پر اس کی آنکھیں کھلیں۔

" اس انگوٹھی کی کیا قیمت ہے ---" اس نے ڈائمنڈ کی ایک انگوٹھی کو اپنی انگشت شہادت اور انگوٹھے میں پھراتے ہوئے پوچھا -" وزن کر کے اصلی قیمت پتہ چلے گی سر' ویسے اندازاً" ڈیڑھ پونے دو لاکھ کی ہو گی۔"

وہ بھونچکارہ گیا۔

" ہمارے ڈائمنڈ کی گارنٹی ہے سر--- دو سال کے اندر اندر آپ رسید اور انگوٹھی لے آئیں' ہم واپس کر لیں گے۔"

یہ نہیں کہ عدیل کے لئے اس قدر قیمتی پتھر خریدنا مشکل تھا لیکن انگوٹھی خرید کر وہ اپنے پرانے نظریات ذبح کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس نے بھاری بل والے دو کڑے خریدے اور زیبا کے گھر پہنچا۔ فون کا چونگا کان اور بغل کی ہڈی میں پھنسائے ' صوفے پر دونوں ٹانگیں رکھے' ہاتھ میں جوس کا گلاس لئے ایک چمکدار مسکراہٹ کو چہرے پر سجائے زیبا تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اس نے عدیل کے سلام کا جواب سر کے بل جھکا کر دیا اور جوس والے ہاتھ سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عدیل نے سنٹر ٹیبل سے ایک فیشن میگزین اٹھایا اور اس میں زیبا کی ہم شکل' ہم اطوار' ہم لباس ماڈل گرل کو دیکھنے لگا۔

" نہیں سر' آج شام میں نہیں آسکتی۔ آج میری برتھ ڈے پارٹی ہے --- نہیں سر' گھر پر نہیں--- میں اور عدیل باہر جا رہے ہیں--- پتہ نہیں کہاں لے جاتے ہیں مجھے ؟--- جی سر' ٹھیک ہے' وارننگ ہی --- "فلرٹ کرنے کے انداز میں وہ دیر تک ہنستی رہی۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد زیبا نے فون بند کر دیا۔ پتہ نہیں یہ زیبا کی ہنسی تھی یا اس کی باتیں تھیں۔ شاید اس کا لباس تھا۔ نشست تھی لیکن عدیل تھوڑا سا آف ہو گیا۔ بھلا اس قدر صاحب رائے پوائنٹنٹر قسم کی لڑکی کی لگام وہ کیسے پکڑ سکتا ہے۔ پھر اندر ہی اندر اس نے اپنے آپ کو تنبیہ کی اور سمجھایا" بھائی اس بار کسی کی لگام نہیں پکڑنی' اس بار کسی محبت کے چکر میں بھی نہیں پھنسنا" جب آدمی کسی عورت کی چھوٹی چھوٹی بات کا نوٹس لینے لگتا ہے تو خطرہ ہے کہ اسے ہتھیار ڈالنے پڑیں گے۔ عدیل نے اندر

ہی اندر عشق میں مبتلا ہونے کے خیال کو جھٹک کر علیحدہ کر دیا۔

"Some Thing For Me" زیبا نے پوچھا۔

عدیل نے نیلا مخملی ڈبہ کھول کر زیبا کی گود میں رکھ دیا۔

" ہاؤ سوئٹ --- " وہ بولی لیکن اس نے بھاری کڑے ڈبے سے نکالے نہیں۔

" پسند آئے ؟ "

تکلفاً" زیبا نے ڈبہ دیکھا۔ پھر ساتھ پڑی ٹیلی فون کی تپائی پر نیلا ڈبہ رکھ دیا۔

" پہن لو ---" عدیل نے کہا اور ساتھ ہی محسوس کیا وہ زیبا کے اقتدار کے آگے گھٹنے ٹیک رہا ہے۔

" اس لباس کے ساتھ ؟ " --- زیبا نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔

" کیوں اس لباس کو کیا ہے ؟--- "

" ان کڑوں کے ساتھ تو کچھ اورنیٹل پہننا پڑے گا جیسے چزی کا لباس' پھلکاری ' کھسہ --- میں سوچوں گی ---"

" پہن کر نہیں دکھاؤ گی ؟ --- " یہ جملہ تو عدیل کے منہ سے نکل گیا لیکن اسے محسوس ہوا کہ یہ اصرار ہی اس کی شکست کا راز فاش کر رہا ہے۔

" نہیں بھئی ' جب میں ان کڑوں جیسا لباس بنواؤں گی پھر --- آپ کو انتظار کرنے پڑے گا عدیل - میں کوئی کام Hap-Hazard طریقے سے کرنا نہیں چاہتی۔ زیور کا استعمال درست نہ ہو تو آدمی ان کلچرڈ لگتا ہے۔"

کڑے وہیں تپائی پر پڑے رہے - پتہ نہیں انہیں زیبا کی والدہ نے اٹھایا کہ کسی ملازم نے ۔ بہرکیف زیبا آزاد رہی --- چیزوں سے بے نیاز' لوگوں سے بے پروا' کسی طرح بھی اپنی آزادی' مرضی ' رائے کو کسی مسلک کے تابع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ وہ احساس تھا کہ اس کی جنس نے غلامی کے ہاتھوں ہر دن موت سہی تھی۔ شاید وہ بھی شادی کے دائرے میں قید رہ کر محبت اور جنس کی بھیک مانگنا نہیں چاہتی تھی۔

اسی لئے جب عدیل نے زیبا کو پروپوز کیا تو زیبا ہڑک کر بولی " دیکھو عدیل میں کچھ باتیں پہلے بتادوں --- میں کسی شخص کی Slave نہیں رہ سکتی۔ میں نے اپنے پہلے شوہر سے اسی لئے Divorce لی تھی۔ وہ آزادی چھینے بغیر محبت دے نہیں سکتا تھا۔ میں اتنی بڑی پرائس نہیں دے سکتی --- مجھے ایک زندگی ملی ہے اور میں اسے بے ثمر گزارنا نہیں چاہتی ---"

" بے ثمر ؟---"

" مشرق میں بہت کم لوگ اور خاص کر عورتیں اپنی زندگی نہیں گزارتیں۔ انہیں دوسروں کی خاطر' دوسروں کی خوشی کے لئے وہ راستے چھوڑنے پڑتے ہیں جن پر چل کر وہ خود خوش رہ سکتی ہیں۔"

" میں بھی کسی ایسی عورت کی تلاش میں ہوں زیبا جو مجھے قید نہ کرے ۔"

زیبا کی باچھیں کھل گئیں۔ " دیکھئے عدیل پہلی بات یہ کہ میں عورت نہیں ہوں --- میں لڑکی ہوں۔ آج کل تیس کے قریب پہنچ کر کوئی عورت نہیں بن جاتی۔ دوسری بات جو میں پہلے سے Clear کرنا چاہتی

اورنگ زیب قاسمی

ہوں کہ الگ بیڈ روم میں رہوں گی ---- مجھے ڈبل بیڈ سے نفرت ہے۔

" عجیب اتفاق ہے میں بھی یہی چاہتا ہوں ---"

زیبا نے یا ہو کا نعرہ لگایا " ایک اور بات بھی بتانا ضروری ہے ---"

" ہاں ہاں ضرور ضرور ---" عدیل نے خوش دلی سے پوچھا۔

" دیکھیے میرا پروفیشن ماڈلنگ ہے مجھے مردوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے' خوبصورت لگنا اور لگتے رہنا میری کمرشل ضرورت ہے ۔ میری دلی آرزو ہے جب تک میری تعریف نہ ہوتی رہے میری ٹریڈ چلتی نہیں ' میں خوش نہیں رہ سکتی' ایسی صورت میں مجھے میڈیا کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے۔ ایسے لوگوں کو بھی ملنا ہوتا ہے جو مجھ سے فلرٹ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ مجھ پر پابندیاں تو نہیں لگائیں گے ؟ ---"

" پابندی مثلاً " ؟ کیسی پابندی ؟ "

" مثلاً" اس شخص سے ملواس سے نہ ملو۔ اس وقت گھر آؤ اس وقت باہر نہ جاؤ ---"

" مجھے کیا مصیبت پڑی ہے کہ میں اپنی زندگی Complicate کروں تمہاری زندگی ہے۔ تمہارا وقت ہے جیسے چاہو گزارو میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں جس شخص کو آزادی درکار ہوتی ہے اسے آزادی دینا بھی پڑتی ہے .... میں تو صرف اتنے کا آرزو مند ہوں کہ تم مجھے شہزادہ گلفام بنا کر نہ رکھو ---"

" وہ کون ہے ؟ ---"

عدیل نے شہزادہ گلفام کی کہانی زیبا کو سنانا چاہی لیکن وہ انٹرسٹڈ نہیں تھی۔

" آپ کو بھی آزادی کا شوق ہے ؟ ---"

" بے حد --- بلکہ مجھے صرف اسی ایک چیز کا دل و جان سے شوق ہے --- مجھ میں صدیوں سے ایسے Genes چلے آ رہے ہیں جو حاکم رہے ہیں میں محکوم ہونا نہیں جانتاGenetically "

زیبا نے اس کی حاکمیت میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ کسی دوسرے کے احساس برتری کو تقویت دینا بھی زیبا کو اپنی آزادی کم کرنے کے مترادف لگتا تھا۔ سوچ لیجئے عدیل صاحب مجھ جیسی لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنا ایک Panful تجربہ ہو سکتا ہے۔ میں جب خوبصورت لگتی ہوں تو Powerful محسوس کرتی ہوں جب میں طاقتور ہوتی ہوں تو خوش رہتی ہوں۔ مردوں کو میں کسی اور فیلڈ میں شکست نہیں دے سکتی لیکن میں نے دیکھا ہے جب خوبصورت لگتی ہوں ہر مرد مجھ سے کمزور ہو جاتا ہے ۔ آئی انجوائے اٹ

" Like looking Beautiful There is noprofession "

" میں تمہیں پاور فل ہی دیکھنا چاہوں گا زیبا۔"

" عدیل صاحب میرے پروفیشن کی عورتوں کا تجربہ ہے آہستہ آہستہ شوہر کو احساس ہوتا ہے کہ ہم اس سے محبت نہیں کرتیں۔ وہ ہماری طاقت کو ہمارے Self Love سے تعبیر کرنے لگتا ہے ۔ پچھلی بار بھی یہی ہوا تھا ---"

" میں محبت کی آرزو ہی نہیں رکھتا --- میں تو فقط ایک ایسا ساتھی چاہتا ہوں' ایک ساتھی جو مجھے پر قبضہ نہ کرے --- مجھے میری طاقت میں مسرور رہنے دے ---"

" واٹ اے سرپرائز آر --- " خوشی سے زیبا نے کہا۔

اورنگ زیب قاسمی

"کیوں ---- ؟"

" مجھے یقین نہیں آ رہا ہسٹ پچ ہی ---"

عدیل نے زیبا کے بازو میں ہلکی سی چٹکی لی " کیوں یقین نہیں آ رہا ---"

" ایسا آدمی مل جائے جو آپ کی آزادی کی عزت کرتا ہو --- ہاؤ گی ----"

" میں تو اپنے آپ کو بھی کچھ رہا ہوں --- میں بھی چاہتا ہوں کہ میرے آنے جانے پر میری Activites پر دوستوں سے 'رشتہ داروں کے ساتھ کوئی عورت حسد نہ کرے --- میری زندگی میری اپنی ہو ---"

" ہائے بھئی ہائی آل میٹر --- میں آپ کی زندگی کیوں گزارنا چاہوں گی بھلا ؟ ---"

" وعدہ ----"

" پرامس --- آپ کو کبھی پچھتانا نہیں پڑے گا ---"

" انشاء اللہ --- " عدیل نے کہا۔

" انشاء اللہ کہہ کر آپ ذمے داری کو اپنے کندھوں سے اتار کر اللہ کے کندھوں پر ڈال رہے ہیں۔ اپنے بل بوتے پر اپنی ذمے داری پر وعدہ کیجئے۔ " زیبا نے اصرار سے کہا۔

عدیل نے اپنے ہاتھ میں زیبا کا ہاتھ لے کیا ان دونوں کے درمیان یہ سب سے لمبا شیک ہینڈ تھا۔

اس مصافحے کے بعد ان کی اڑانیں دور تک اور دیر دیر تک علیحدہ علیحدہ رہیں۔ وہ اکٹھے ہوتے ۔ بلا تکلف ایک دوسرے کو بلا کم و کاست اپنی اپنی واردات سناتے اور پھر الگ ہو جاتے ۔ ان دس سالوں میں جہاں جہاں اس کی پوسٹنگ ہوتی زیبا اس کے ساتھ نہ گئی۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ لاہور ہی میں رہتی اور عدیل لانگ ویک اینڈز پر گھر آجاتا۔ زیبا اس Arrangement سے خوش تھی ۔ اگر اسے کوئی خوف تھا تو صرف اتنا کہ اب اس کی عمر بڑھ رہی ہے اور ماڈلنگ میں نئے چہرے چلے آ رہے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھولنے کے پلان بھی بنا رہی تھی۔ اسے اندر ہی اندر علم تھا کہ اگر وہ ماڈلنگ نہ بھی کر سکی تو کوئی ایسا بڑا Crisis نہیں ہو گا۔ زیبا سے شادی کرنے سے پہلے ایک بات عدیل پر واضح ہو گئی۔ کوئی شخص بیک وقت محبت اور آزادی کو حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ محبت میں جذباتی Pendency پیدا ہو جاتی ہے وہی آزادی کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

لیکن زیبا کے ساتھ رہتے رہتے اس پر ایک اور بھید بھی کھلی ۔ محبت اور آزادی ایک احساس کا نام ہے۔ جو بھی انسان کسی کو چاہنے کا اہل نہیں رہتا۔ اس پر اپنے محبوب کے رویے اثر انداز ہونے لگتے ہیں جس وقت وہ اپنے تحفظ اور محبوب کی عبادت میں مصروف ہوتا ہے اندر سرنگ شروع ہو جاتی ہے جو محبت کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ اسے کھوجنے ' تلاش کرنے ' اس کے پیچھے بھاگنے سے کئی بار حاصل نہیں ہوتی ۔ کچھ غلام قیدی محبوس لوگ مکمل طور پر آزاد ہوتے ہیں۔ قید ان کی آزادی کو مجروح نہیں کرتی اور کچھ آزاد لوگ تازہ ہوا کے جھونکے کو بھی محسوس نہیں کر سکتے۔

ان سالوں میں عدیل ہر سمت اڑ چکا تھا۔ وہ اس قدر آزاد رہا۔ اب اس میں اڑتے پولن کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ زندگی کی سطح آب پر لہروں کے ساتھ بہتا پھرتا۔ آہستہ آہستہ جس طرح وہ محبت کے حصول میں

Dis-illusion ہوا تھا۔ آزادی کے معنی بھی ترنگ اور معنی کھونے لگے۔ اسے اپنے گھرانے کی عورتیں یاد آنے لگیں۔ جو اپنے کھونٹے سے مردوں کو باندھنے کی خواہش میں ساری عمر گھروں میں قید رہ کر بسر کر دیتی تھیں۔

جب دونوں سمتیں بیکار ہو گئیں' نہ اسے محبت سے سروکار رہا نہ آزادی سے ' تو ایک بار پھر اس کے دل میں ایک نئی آرزو ترازو ہو گئی۔ یہ بیماری وہ سفید فام لوگوں سے لے کر آیا تھا۔ مغربی ممالک کے سفروں پر اس نے سیکھا تھا کہ انسان کام کے سہارے زندہ رہ سکتا ہے۔ کام ہی زندگی کا سب سے بڑا مفہوم ہے اور جب تک کوئی کام ادھورا ہے ' جان باقی ہے کام ختم ہو جائیں تو آدمی مرنے سے پہلے مر جاتا ہے --- مغرب کا سفید فام آدمی سو سال کی مہذب زندگی کے بعد لاشعوری طور پر کام کا غلام بن چکا تھا۔ محبت اس کے وقتی جذبے اور آزادی کے اس لئے خلائی سفر تھا۔ اس کے سامنے ان دونوں سمتوں کے درمیان مصروف رہنا' کام کرنا' ہر لمحے مشین بنے اپنے بے معنی سفر کو بامعنی کرنے کا شیڈول تھا۔

وہ بھی پچھلے سولہ سال Work-aholic ہو چکا تھا --- اس کے اردگرد پروگرام ہی پروگرام تھے۔ منصوبوں کے' وقت کے ورک لوڈ کے --- اسے بھی علم نہ تھا کہ وہ اپنے دن بچتے بیتنے کس طرح کترتا جا رہا ہے --- تبدیلی کی خاطر کبھی کبھی سفر' پکنک' پارٹی میں چلا جاتا ہے --- لیکن وہاں پہنچتے ہی زیاں کا احساس ہوتا۔ اسے لگتا کہ تفریح انتقالی بے معنی شے ہے کیونکہ وہاں کام نہ تھا اور جہاں کوئی کام نہ ہوتا وہاں اس کی اہمیت ختم ہو جاتی --- زندگی کے معنی نہ رہتے۔

عدیل نے محبت اور آزادی کے سفر ختم کر دیئے اور دونوں سینڈھوں کو کام کے سامنے ذبح کر دیا۔ ان سولہ سالوں کے بعد اچانک چوکیدار کی تسبیح پر بیٹھ کر ساتھ والی کوٹھی میں جھانکتے ہوئے وہ کچھ عجیب سا ہوتا جا رہا تھا۔ نظر آنے والے منظر میں ایک بے معنی خوشی تھی خوبصورت لان میں چھوٹے روئی کتے کے ساتھ دو تین خوبصورت بچے کھیل رہے تھے۔ چھوٹا گوری کتا بھی ان کے پاؤں میں گیند بن کر گھومتا پھرتا' کبھی کسی گود چڑھتا' کبھی کسی کے کندھے پر سوار ہو جاتا' عدیل دیر تک بیٹھا ان کو دیکھتا رہا۔ اندر سے زیبا نے اسے پھر پکارا نہیں غالباً" وہ لنچ کھا کر سو گئی تھی۔ اسے گھنٹے بعد کسی فیشن شو پر جانا تھا اپنے شام کے شیڈول ذہن میں پھراتا عدیل بینچ سے اٹھا بینچ پر پڑی ہوئی چوکیدار کی تسبیح فرش پر گری عدیل نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ لکڑی کے تسبیح دانے بہت پھرانے کی وجہ سے چمک رہے تھے۔ اس کے پھندنے پھونسڑے بن چکے تھے۔ اس تسبیح کو دیکھ کر اسے اپنے دادا کی یاد آئی۔ دادا کی تسبیح زندگی کے آخری ایام میں ان کے ہاتھوں میں کتنی خوبصورت لگتی تھی۔

اس نے سولہ سال کام سے محبت کی تھی' کام کو اپنا خدا سمجھا تھا۔ بچوں کو کتے سے کھیلتے دیکھ کر اس پر انکشاف ہوا کہ انسان کو کام بھی پوری طرح Contain نہیں کر سکتا۔ اچھی طرح Consume نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ دو سمتوں کا اسیر رہا اور نئی آرزو اسے پہلی خواہش سے الٹے پاسے بھگے جاتی۔ ابھی اسی لمحے جب عدیل کے ہاتھ میں چوکیدار کی تسبیح تھی' اس پر انکشاف ہوا کہ انسان کسی بھی جہت میں سفر کرے یا تو اسے آگے خلا ملے گا یا ایک اور سمت انسان سمتوں کے سفر کے لئے نہیں بنا۔ اسے اوپر اٹھنے کی حاجت تھی --- اپنے سے اوپر ..... اشیاء سے اوپر ..... رشتے ناطوں سے اوپر ..... دھیان کی ریشمی ڈوری سے بندھ کر ..... اوپر ہی اوپر

..... ایسے سفر پر جس کا کوئی منطقی ' جذباتی ' وقتی انجام نہیں ہوتا جس میں کچھ ملنے یا کھونے کی شرط نہیں ہوتی۔ اوپر ہی اوپر آگے ہی آگے ' لا متناہی بلندیوں کی طرف ---

پتہ نہیں کیوں وہ جیب کے اندر تسبیح دانوں کو پھرانے لگا۔ بڑے برسوں کے بعد اسے احساس ہوا وہ بچوں کی طرح معصوم ' یقین رکھنے والا ' محبت سے پر عدیل بن گیا ہے۔ اس کی ساتھی روئی کتوں سے کھیلنے والے بچوں سے جا ملی جنہیں نہ کوئی خوف تھا نہ ملال --- نہ کوئی اندیشہ تھا نہ کوئی تذبذب۔ نہ راستے کے ختم ہونے کا احتمال نہ کہیں پہنچنے کا اضمحلال ..... پتہ نہیں کب کے سنے ہوئے بھولے بسرے دادا کے ہونٹوں پر سسکتے' کلبلاتے ورد اسے یاد آنے لگے اور عدیل اپنے دادا کی طرح تسبیح پھرانے میں مشغول ہو گیا۔

("فنون" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

جمیل سلطان نسیم

اندھیرے سے آگے

اس نے سوچا۔ آج کل اسے اپنی بیوی کی ہر بات پر غصہ کیوں آجاتا ہے ؟ کچھ دن سے وہ عجیب عجیب سوال جو کرنے لگی ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے ..... وہ ریڈیو سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ افغانستان کا مسئلہ ..... ایران عراق کی جنگ ..... فلسطینیوں پر مظالم ..... امریکی امداد کی کہانیاں ..... روسی دوستی کے قصے ..... خبروں کے سمندر پر ذہن اوپر ہی اوپر تیر رہا تھا۔ ایک انسان ہونے کے ناطے ان ساری اطلاعات سے ایک رشتہ ہے تو سہی' لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ پھر بھی ایک عالم بے خبری طاری ہے ۔ ساری دنیا ہے ..... ہم کہاں ہیں ..... لفظوں میں بھی نہیں ..... زمانے بھر کی داستان ہے اور اپنا ہی قصہ نہیں شاید اسی لئے ریڈیائی لہروں کے کچے دھاگے ذہن سے الجھ الجھ کر ٹوٹ رہے ہیں اور بے سوز آوازوں کا اثر دل تک نہیں پہنچ رہا ہے۔

ایک مرتبہ ..... برسوں پہلے ..... سفر کرتے ہوئے' ریل ایک جھٹکا کھا کے رک گئی تھی ..... وہ بھی دوسرے مسافروں کی طرح صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے نیچے اتر آیا ..... انجن سے ذرا فاصلے پر ..... خون اور گوشت کے لوتھڑے اٹھ رہے تھے ..... کوئی جانور ریل کے نیچے آکر کٹ گیا تھا۔ اس منظر نے ایسا تکدر پیدا کر دیا کہ طبیعت کئی دن تک اکھڑی اکھڑی رہی ..... اس وقت سے سوا حالت اب ہے ..... ہر بات سے جی اچٹ کے رہ گیا ہے ..... بے دلی کے اسی عالم میں سنا ..... بیوی قریب آتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

" عجیب دن ہے ..... پتہ نہیں سورج کہاں کھو گیا ہے ؟ "

پل بھر کے لئے یہ اطلاع اس کو خبروں سے زیادہ اہم معلوم ہوئی مگر ایک ہی لمحے میں ذہن نے اس اطلاع کو دہرا کر خبروں ہی کی طرح بے تعلقی کے خانے میں ڈال دیا۔ جب بیوی کو پاس آتے دیکھا تو ریڈیو کی آواز مدھم کی ..... پھر کہا۔

" عجیب ہو گئی ہو تم ۔ رات کو دن سمجھ رکھا ہے ۔ کبھی رات میں بھی سورج نکلا ہے؟"

بیوی ہنس پڑی ..... ہنسی کو اپنی تضحیک سمجھ کر وہ جھلا گیا۔

" ہنستی کیوں ہو ..... میں نے کوئی احمقانہ بات کی ہے یا لطیفہ سنایا ہے ۔"

ہنستے ہنستے سنجیدہ ہونے میں ذرا دیر لگی ..... پھر وہ بولی۔

" میں دیکھ رہی ہوں آپ کچھ دن سے بدل گئے ہیں ..... پہلے تو یوں بات بات پر غصہ نہیں آتا تھا۔"

" پہلے تم بھی تو ایسی باتیں نہیں کرتی تھیں۔"

اورنگ زیب قاسمی

" میں نے کیا کہا ہے ؟ "

" اچھا ..... اب میرا دماغ نہ چاٹو مجھے خبریں سننے دو "

" خدا جانے کون سی خبر سننے کے لئے ہر وقت آپ ریڈیو کے کان مروڑتے رہتے ہیں۔"

" رات میں سورج نکلنے کی خبر سننے کے لئے ..... " لہجے میں طنز بھی تھا اور تلخی بھی۔

" یہ رات ہے ؟ "

" اور کیا دن ہے ؟ "

بیوی کے چہرے پر پھیلی ہوئی سنجیدگی کے مسکراہٹ میں بدلنے سے پہلے ہی اس نے ٹرانسسٹر اٹھایا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ گھر کا یہ کمرہ صحن کے رخ پر تھا اس لئے یہاں زیادہ تر اجالا تھا۔ کھلی کھڑکی سے نظر صحن کی طرف گئی کیا واقعی ابھی دن ہے ..... ؟ پھر ..... مجھے رات کا گمان ہوا ..... ؟ اگر یہ دن ہے تو کیسا ملگجا سا دن ہے ..... دن کے آثار بھی نہیں ہیں ۔ پھر بھی دن ہے ..... دن ڈھلتے وقت بھی آسمان روشن رہتا ہے۔ سورج کی تھکن زمین کے چہرے پر دکھائی دیتی رہتی ہے ..... مگر اب ..... جبکہ آسمان پر بادلوں کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ہے ..... رات کی صورت بھی نظر آرہی ہے ..... یہ ..... یہ دن کیسے ہو سکتا ہے ..... تو کیا رات ہے ..... نہیں ..... آسمان بھی ایسی گواہی نہیں دے رہا ہے ..... رات بھی نہیں ..... دن بھی نہیں ..... شاید دونوں وقت ملنے کا سمے ہے ..... لیکن ..... میری آنکھیں اتنا دھوکا تو نہیں کھا سکتیں ..... جھٹ پٹے کا وقت بار بار دیکھا ہے ..... ایسا تو نہیں ہوتا ..... پہلے یہ معلوم کروں کہ بجا کیا ہے' پھر کوئی اندازہ ہو سکے گا۔

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا ..... پھر ہاتھ جھٹکا ..... پھر گھڑی کو دیکھا' پھر کلائی اٹھا کر گھڑی کو کان سے لگایا۔ یہ کب سے بند ہے ..... ؟ دوسری گھڑی دیکھنے کے لئے وہ لاؤنج میں پہنچا..... وہاں لٹکا ہوا کلاک غائب تھا ..... الجھن بڑھنے لگی۔ اپنے کمرے کا رخ کیا اور پہنچتے ہی بیوی سے پوچھا۔

" لاؤنج کی گھڑی کہاں گئی ؟ "

بیوی نے ہاتھ سے کنگھا رکھا اور اطمینان سے کہا ..... " وہ تو دو دن سے بند پڑی ہے ..... آج ہی تو منصور نے اتار کے رکھی ہے ۔" اس کا پارہ چڑھنے لگا۔

" چیزیں برتنے کا سلیقہ ہی نہیں ہے اس گھر میں ..... زمانے بھر کا سامان لاکے رکھا ہے مگر جب مجھے ضرورت ہوتی ہے تو کوئی چیز نہیں ملتی ۔"

" آپ تو غصہ کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگے ہیں ..... مشین ہی تو تھی چلتے چلتے بند ہو گئی ..... اس میں کسی کا کیا قصور ..... "

" نہیں قصور تو میرا ہے جو اس گھر کو اپنا سمجھ بیٹھا ہوں۔"

پیر پٹختا ہوا وہ پھر صحن سے ملحق کمرے میں چلا آیا۔

اب کچ بحثوں کے منہ کون لگے۔ پلٹ کے جواب دینے کے سوا آتا بھی کیا ہے سارا گھر بے ترتیبی کا شکار ہے ۔ کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر موجود نہیں ..... افراتفری مچی ہوئی ہے جس کا جو دل چاہتا ہے کرتا ہے ..... مگر یہ بات تو سچ ہے کہ مشین تھی خراب ہو گئی ..... پھر میں غصہ کیوں کر رہا ہوں..... بات یہ ہے کہ ..... کہ اب اندھیرا ہے نہ اجالا ہے ..... وقت کا پتہ نہیں ..... کس سے پوچھوں ؟ ہمسائے سے ؟ وہ مذاق نہیں

اڑائے گا ...... ؟ لیکن ...... مجھے مغالطہ کیوں ہوا ...... ابھی تو دن ہے مجھے رات کا دھوکا کیسے ہو گیا ...... ؟ مگر جب دن ہے تو واقعی سورج کہا کھو گیا! ...... دن کے منہ پر کالک تو ملی ہوئی نہیں ہوتی نا ...... فضا میں گرد بھی نہیں ...... آندھی کے آثار بھی نہیں ...... پھر یہ کیا چکر ہے ۔ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ وقت کا پتہ ہی نہیں چل رہا ہے۔ میری گھڑی بند ہے ... لاؤنج والی خراب ہے ۔ اب وقت کیسے معلوم ہو ...... ہاں ...... ریڈیو سے ......

اس نے فریکوئنسی کی آواز بڑھائی۔

قندھار پر مجاہدین کا شدید حملہ ......

اس نے اسٹیشن بدلا ...... دار جلنگ میں انتہا پسند گورکھوں نے مکانوں کو آگ لگا دی۔

اس نے پھر سوئی گھمائی۔ ایران عراق کے درمیان خوف ناک جنگ جاری ...... سوئچ آف کر دیا ...... ہر جگہ دہشت ہے ۔ جنگ ہے ۔ وقت کہاں جا کے چھپ گیا ...... ؟ اس نے پھر غیر ارادی طور سے آستین کھینچ کر کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا ...... پھر جھنجھلاہٹ کے ساتھ خیال آیا ...... ہاں ٹی وی سے وقت معلوم ہو سکتا ہے۔ بچوں کو پتہ ہو گا کہ کس وقت کون سا پروگرام آتا ہے ...... اس نے تیسرے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہاں سب بچے بیٹھے ہوئے کرکٹ میچ دیکھ رہے تھے۔

" آیئے ابو ...... بہت انٹرسٹنگ میچ ہو رہا ہے ۔ دو کھلاڑی باقی ہیں اور فائنٹی فورز کی ضرورت ہے۔ "

" نہیں تم لوگ دیکھو ...... میں تو وقت معلوم کرنے آیا تھا ۔ "

" وقت ...... ! "

" ہاں ...... کیا بجا ہو گا ...... ؟ "

" کہاں ...... آسٹریلیا میں ...... ؟ "

" آسٹریلیا کے وقت سے مجھے کیا لینا ہے ۔ یہاں کیا بجا ہو گا ...... ؟ "

" لاؤنج کی گھڑی تو خراب پڑی ہے ۔ آپ اپنی واچ میں دیکھ لیجئے ...... "

" یہی تو مصیبت ہے ۔ میری گھڑی بھی بند ہو گئی ہے اور ...... "

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ٹیلی وژن سے ایک شور اٹھا ۔ کھلاڑی نے چوکا لگایا تھا ۔ تماشائی غل مچا رہے تھے ... بچے بھی اس ہنگامے کا حصہ بن گئے ...... وہ بھی غیر ارادی طور سے چند سیکنڈ تک ٹی وی پر تبدیل ہوتے ہوئے منظر کو دیکھتا رہا اور جب لڑکے آپس میں کھیل پر تبصرہ کرنے لگے تو اس نے کمرے سے باہر نکل کے دروازہ پہلے کی طرح بند کر دیا۔

اگر دن ہے تو پھر سورج ......

لاحول ولا ...... میں کس سورج کے چکر میں پھنس گیا ۔ سورج تو روز نکلتا اور ڈوبتا ہے ...... یہ بھی کوئی مسئلہ ہے بھلا جو میں دماغ کھپائے جا رہا ہوں ...... مگر ...... آج دن نکلا ہے تو سورج بھی طلوع ہوا ہو گا ...... اور اگر غروب ہو گیا ہے تو رات کیوں نہیں ہوئی۔ یہ سارے سوال اس لئے پیدا ہو رہے ہیں کہ مجھے وقت کی خبر نہیں ہے ۔ بس یہ معلوم ہو جائے کہ ابھی کیا بجا ہو گا تو ساری الجھن ختم ہو جائے۔ وقت سے لاعلمی بھی کیسے مخمصوں میں ڈال دیتی ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

اس نے کمرے میں آکر ریڈیو اٹھایا۔ کھلی کھڑکی میں سے ایک مرتبہ پھر صحن میں جھانکا ...... رات کے شجر سے ٹوٹی کونپلیں بکھری تھیں ...... رات کا شجر اور اگر یہ دن ہے تب ...... ؟

اسے پھر اپنی بیوی پر غصہ آنے لگا ...... مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے اتنے لمبے عرصے کے بعد چھٹی کیوں لی ہے ۔ کمرے میں اکیلا پڑا خود سے کیوں الجھتا رہتا ہوں ...... سمجھ رہی ہو گی شہر کی حالت اچھی نہیں ہے ...... بہت سی بستیوں میں کرفیو دندناتا پھر رہا ہے اسی خوف سے میں گھر میں بیٹھ گیا ہوں ...... بس اندازے سے ہی سارا کام چل رہا ہے ۔ حقیقت معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کسی کو ...... مگر حقیقت کیا ہے میں نے چھٹی کیوں لی ہے ۔ کیوں ...... ؟ اپنے بے معنی سوالوں کا جواب مجھے خود معلوم نہیں ...... وہ بے چاری کیا جانے ...... میری ضرورت سے واقف تو ہونا چاہیے تھا ۔ واقف ہونے کی کوشش تو کرنی چاہیے تھی ...... بس اپنی بات سنانے آگئی ...... پتہ نہیں سورج کہاں کھو گیا ہے ...... ؟ سورج کوئی بچہ ہے کہ کھو جائے گا ۔ کوئی اغوا کر کے لے جائے گا قتل کر دے گا ...... سورج ' سورج ہے ۔ کہاں کھو سکتا ہے پھر اگر کھو بھی گیا ہے تو کھو جائے میری بلا سے ...... میں نے ٹھیکہ لیا ہے سورج کا ...... اندھیرے اجالے کا ...... دن رات کا ...... یہ عورت ایک سوال کر کے مجھے اس طرح خلجان میں مبتلا کر دیتی ہے ...... اور پھر شکایت بھی کرتی ہے کہ آج کل چڑچڑا ہو رہا ہوں ...... اپنی کچھ خبر ہی نہیں ...... کس قدر بدنظمی پھیلا رکھی ہے سارے گھر میں ...... میں نے اس گھر کو بنانے میں کتنی محنت کی ہے ...... اپنی چاہتوں اور خواہشوں کے سارے لمحے سمیٹ کر اس گھر کے در و دیوار میں چن دیئے ہیں۔ لیکن اب ...... مختلف طریقوں سے مجھے احساس دلایا جا رہا ہے جیسے میرا وجود ہی اس گھر کے لئے بے مصرف ہے ...... جیسے یہاں جو کچھ ہے اس پر میرا کوئی حق نہیں ...... بس پریشانیاں میرے حصے کی ہیں۔

" منصور آج کل کالج نہیں جا رہا ہے ...... " ایک دن اطلاع دی۔

" کیوں ...... ؟ "

" کہہ رہا تھا پڑھائی تو ہو نہیں رہی ہے ...... بس ہنگامے ہی ہنگامے ہیں ...... "

" ہاں ...... لڑکوں کے ہاتھ سے کتاب چھین کر کلاشنکوف تھما دی ہے ۔ "

" کس نے ...... ؟ "

میں جب بھی کوئی بات کہتا ہوں تو میری طرف سوال کی گولی داغ دیتی ہے۔ اب مجھے کیا علم کہ کتاب چھینے والا ہاتھ کس کا ہے ...... اور زندگی چھینے والا کس کا ...... مجھے تو وقت بھی معلوم نہیں ...... شاید میری حیثیت اس گھر میں بند گھڑی کی ہو کے رہ گئی ہے ...... اٹھا کے ڈال دو ایک طرف ...... مگر گھڑی بند ہو جائے تو کیا وقت بھی ٹھہر جاتا ہے ...... نہیں ...... پھر میں ایک ہی الجھن کے گرداب میں کیوں چکر کھائے جا رہا ہوں ...... وقت نہ ہوا مصیبت ہو گیا ...... آخر معلوم تو ہونا چاہیے کہ کیا بجا ہے ...... پھر کیا کروں ...... اس طرح حساب لگاؤں تو شاید اس آنکھ مچولی کھیلتے وقت کی کوئی جھلک دکھائی دے جائے ...... صبح چھ بجے سو کر اٹھا تھا ...... سوتا کیا رات بھر کروٹیں ہی بدلتا رہا تھا ...... جب ناشتہ کیا تھا تو ساڑھے سات بجے تھے ...... اور پھر ایک بجے کے قریب دوپہر کا کھانا کھایا تھا ...... تین چار گھنٹے تو ہو گئے ہوں گے ...... اس حساب سے شام کے چار یا ساڑھے چار بجنا چاہئیں ...... مگر ...... مجھے رات کیوں محسوس ہو رہی ہے ۔ کمرے کی بند کھڑکیوں پر پردے

پڑے ہیں ..... لیکن اس کمرے کی تو کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں ..... میں صحن میں دیکھ رہا ہوں ..... وہاں اندھیرے کی دھول کیوں اڑ رہی ہے اور اندھیرا ابھی ایسا جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے ..... اس کا مطلب ہے کہ درمیان ہی میں کچھ گھپلا ہے ..... جب ہی تو وہ کہہ رہی تھی ..... پتہ نہیں سورج کہاں کھو گیا ہے ..... اور پھر وقت کے بارے میں میرا اندازہ بھی اتنا غلط تو کبھی نہیں ہوا .....

خیال کی تیز ہوا میں اڑتا ہوا وہ پھر اپنے کمرے میں آیا تو بیوی پلنگ پر پالتی مارے بیٹھی تھی اور اس کے سامنے کھلا ہوا اخبار پڑا تھا۔

وہ چند لمحوں تک انتظار کرتا رہا کہ بیوی نظر اٹھا کے دیکھتے تو وہ کچھ کہے مگر جب اس کی موجودگی کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تو وہ کھنکارا ..... پھر بھی کوئی ردعمل نہیں دیکھا تو جھنجلاہٹ سست کے لفظوں کے پیچھے بھاگنے لگی اور اس سے پہلے وہ اپنے مزاج کی تلخی جمع کرکے کسی جملے کی صورت اگل دے ..... بیوی نے نظر اٹھا کے اس کی طرف دیکھا اور اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ یہ دو آنکھیں کسی فریادی کی طرح اس کی طرف اٹھی ہیں۔ وہ زبان تک آئے ہوئے فقرے کو نگل گیا ..... بیوی کے قریب بیٹھ گیا اور آہستہ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے ؟"

جواب میں بیوی نے پھر دیکھا ..... آنسوؤں کو روک لینے والی آنکھیں دیکھ کر اس نے محسوس کیا جیسے بیوی کے سامنے اخبار نہیں کوئی میت پڑی ہے۔

"کیا ہوا تمہیں ..... ؟" اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

"آپ نے آج کا اخبار پڑھا ..... ؟" یہ سوال سن کر وہ کھو گیا۔ کیا وہ عورت اس درد کی نشان دہی کر رہی ہے جو سارے بدن کو مٹھی میں بند کئے ہوئے ہے اس نے اقرار کیا۔

"ہاں ....."

وہ محزوں لہجے میں بولی ..... "باپ کو قتل کرکے بیٹیوں کو اغوا کیا ..... اور اب ..... آج ان لڑکیوں کے قتل کی خبر ہے۔"

ان دو سطروں کو بیوی کے لہجے نے دو دھاری خنجر بنا کے اس کے دل میں اتار دیا۔ اخبار کے صفحے پر پھیلے ہوئے کالے کالے لفظوں کو خون کے قطروں کی طرح دیکھتا رہا ..... پھر اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ بیوی کے شانے پر رکھا ..... اور پوچھا۔

"بیٹا کہاں ہے ..... ؟"

"بیٹا ..... !" بیوی چونک اٹھی ..... "بیٹا اپنے کمرے میں ہوگی ..... کیوں ..... کیا ہوا ؟"

"کچھ نہیں ..... ایسے ہی پوچھ لیا تھا ..... سنو ..... دو چار دن اسے کالج نہ جانے دینا۔"

"اچھا ..... مگر دو چار دن بعد ..... ؟"

"دو چار دن بعد ؟ دو چار دن بعد ..... ! دو چار دن بعد ..... پھر شاید سورج نکل آئے ..... " دھیرے دھیرے ذہن پر اترتی ہوئی سوچ کا سہارا لے کے اس نے بے یقینی کے انداز میں کہا اور پھر اس خوف سے کہ بیوی کوئی اور سوال نہ کر بیٹھے وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

("معیار" کراچی)

حسن منظر

بومیدین

"مونچھیں آدمی کا اپنا ذاتی معاملہ ہوتی ہیں۔ انتہائی ذاتی معاملہ۔"

یہ تھے وہ الفاظ جو ان لوگوں کے دوست ڈاکٹر نے اس دن ان سے کہے تھے۔

لوگ ادھر ادھر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ برآمدے میں ایک طرف ایک بوڑھا بیٹھا ایک نو' دس سال کے لڑکے سے شطرنج کھیل رہا تھا اور مستقل ہار رہا تھا جو دوسری میزوں پر بیٹھے تھے ان میں سے ایک وقتے وقتے سے اٹھ کر اپنے ساتھیوں سے پوچھ لیتا تھا کسے کیا لینا تھا ؟ یا ان لوگوں کی زبان میں کسی سے کہتا کہ وہ چائے کی پرواہ کرے گا یا کوئی کی 'یا سوفٹ ڈرنک ؟

باہر گیدڑ گدڑیوں کا بیاہ ہو رہا تھا۔ دھوپ کبھی نکل آتی تھی کبھی چھپ جاتی تھی اور کبھی دھوپ اور مینہ ایک ساتھ پڑنے برسنے لگتے تھے۔

برآمدے کے دوسرے سرے پر بیٹھے ہوئے ساتھی دن بھر تاش کھیل کھیل کر تھک گئے تھے اور ان میں سے ایک بوڑھا بیٹھا ہوا انگلیاں چٹخا رہا تھا' دوسرے نے آرام کرسی پر سر کو پیچھے پھینک رکھا تھا اور لگتا تھا وہ چھت کی کڑیاں گن رہا ہے۔

ڈاکٹر بے دھیانی سے برج کھیل رہا تھا' اس کی توجہ نہ ڈمی پر تھی اور نہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتوں پر۔ جن میزوں پر کھیل ختم ہوتا جاتا تھا وہاں سے اٹھ اٹھ کر لوگ اس کی میز کے اردگرد آ بیٹھتے تھے کچھ اتنی آزادی بھی برتتے تھے کہ کھیلنے والے کے ہاتھ سے پتہ کھینچ کر خود ہی میز پر پھینک دیتے تھے یوں کھیل میں پھر سے جان پڑ گئی تھی ورنہ اکیلے کھیل کھیل کر سب اکتا چکے تھے۔

جو ساتھی میزوں پر جا جا کر سب سے پوچھتا رہا تھا کہ کس کو پینے کے لئے کیا چاہیے آخری بار بوڑھے اور بچے والی میز پر گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے ٹھٹک کر بساط کو دیکھا اور لڑکے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

"یوون" اور بساط کو ڈھیر کر دیا۔

بچے کچھ مہرے چھن سے گر کر بساط کے بیچ میں آ گئے

پھر اس نے بوڑھے کو بازو سے اٹھاتے ہوئے کہ "ایک دن کے لئے اتنا کھیل کافی ہے۔ آیئے ڈاکٹر کی بات سنیں۔ مونچھوں کے بارے میں کچھ اظہار خیال کر رہا ہے۔"

"وہ ؟" بوڑھے نے کہا "اس کی تو مونچھیں ہیں ہی نہیں۔"

"تب ہی تو کر رہا ہے۔"

"اسے مونچھوں کے خلاف بولنے کا کیا حق ہے؟" بوڑھے نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"خلاف نہیں 'حق میں بول رہا ہے۔"

"اس کا بھی اسے کیا حق" بوڑھے نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ پھر وہ بھی اس میز پر آگیا جہاں ڈاکٹر بیٹھا تھا اور جہاں کھیل رک چکا تھا تاش کے پتوں کی گڈیاں بنا کر رکھ دی گئی تھیں اور جہاں ایک ایش ٹرے کے خاصے ماچس کی تیلیوں اور بجھی ہوئی سگریٹوں کے بھر جانے پر دوسری بہت بڑی ایش ٹرے ابھی ابھی لا کر رکھی گئی تھی۔

اپنے ساتھی کے چھن جانے پر لڑکا کسی اور طرح خود کو مصروف نہیں رکھ پا رہا تھا اور جا کر بڑے آدمیوں کی باتیں سننے کو اس کا من نہیں ہو رہا تھا۔ یہ نہیں کہ اس کا باپ اسے بڑے لوگوں سے دور رہنے کا اشارہ کرتا ہو بلکہ حقیقت یوں تھی کہ لوگ ہمیشہ بے مقصد باتیں کیا کرتے تھے جن کا سر پیر نہیں ہوتا تھا اور اگر کوئی دلچسپ بات ان کی گفتگو میں آجاتی تھی تو اپنی آواز کو اتنی دھیمی کر دیتے تھے کہ صرف برابر میں بیٹھا ہوا آدمی ہی سن سکے یا پھر ایسے موقعوں پر ان کے جملے ادھورے ہونے شروع ہو جاتے تھے اور اس حد تک کہ لڑکے کے لئے انہیں سمجھنا مشکل ہو جاتا تھا۔

ڈاکٹر نے نئی سگریٹ کو ہونٹوں میں ادھر ادھر لڑھکاتے ہوئے کہا "اس حد تک ذاتی کہ کوئی شخص اپنی مونچھوں کے بارے میں دوسرے کی رائے سنی تو کیا جانی ہی نہیں چاہتا ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" ایک ساتھی نے کہا "مونچھیں بناتے ہوئے میں نے اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ کسی دوسرے سے پوچھ رہے ہیں برابر تو ہیں نا۔"

"ہاں لیکن اس میں یہ بات مضمر ہے کہ وہ اپنی مونچھوں کی مستقل شکل کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتے۔"

"اور اس کے بارے میں کیا خیال ہے" ایک اور ساتھی نے کہا "کہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے نظر آتے ہیں فرنچ کٹ میرے چہرے پر اچھی لگے گی یا سرسید جیسی یا ٹیگور ۔۔۔۔۔۔"

"ٹھیک ہے" ڈاکٹر نے کہا "لیکن ہم داڑھی کی بات کب کر رہے ہیں۔ بات تو مونچھوں کی ہو رہی ہے۔ داڑھی رواج اور مذہب اور عقیدت نجانے کیا کیا اپنے پیچھے چھپائے ہوئے ہوتی ہے جیسے امریکہ میں اکثر ویشتر فرائڈین سائیکو لوجسٹوں کی داڑھی ۔۔۔"

"ایک طرح سے داڑھی اجتماعی تحت الشعور کی غمازی کرتی ہے۔" ساتھیوں میں سے ایک نے کہا۔
ڈاکٹر نے کہنے والے کی طرف مسکرا کر دیکھا کیونکہ اس بات کا تعلق اس کے اپنے شعبہ فکر سے تھا The Collective Unconscious اور کہنے والے نے اس کے پیشے میں دخل دیتے ہوئے ایک طرح سے چھیڑ خانی کی تھی۔

پھر ڈاکٹر نے بھی اسی لہجے میں کہا "جی ہاں' اور مونچھیں انفرادی تحت الشعور کی۔ کیسے کس کی مونچھیں اس کی شخصیت میں سے کہاں سے نکل کر آتی ہیں یہ انہیں رکھنے والے کو خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔" پھر اس نے سب پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ "کبھی کسی نے اپنے حجام سے مشورہ لیا ہے اس پر کیسی مونچھیں جچیں گی نہ ہی ایک بار رکھ لینے کے بعد اسے یہ جاننے کی بے چینی رہتی ہے کہ وہ اس کے چہرے پر کیسی لگ

اورنگ زیب قاسمی

رہی ہیں ۔۔۔ وہ اس کی شخصیت میں سے ابھر کر آتی ہیں اور اس شخصیت کو مکمل کر دیتی ہیں۔ ایک طرح کا کامپلیمنٹری عمل۔ لوگ داڑھی کے وجود سے اکثر کھیلتے نظر آئیں گے۔ آج ہے 'کل نہیں۔ لیکن مونچھیں؟ ایک بار آگئیں تو آگئیں۔ کوئی انہیں چھلواتا نہیں رہتا ہے۔

اس نے اپنی آواز کو بہت ہی مدھم کرتے ہوئے کہا "اب خواہ وہ اتنی بڑی ہو جائیں کہ اسکے گلے سے مدمقابل کو چھینکیں آنے لگیں یا وہ اس کے نتھنوں میں سرسراہٹ پیدا کرنے لگیں ۔۔۔۔۔۔"

آواز دھیمی ہوتی گئی اتنی دھیمی کہ لڑکے کو ان لوگوں کے پاس سے ہٹ جانا ہی پڑا۔ وہ باہر جا کر بوندوں میں کھڑا ہو گیا اور اس گیت کو یاد کرنے لگا جو بچے ایسی ہی بارش کے لئے گایا کرتے ہیں جو دھوپ کے سنگ پڑ رہی ہو لیکن اس کے ساتھی دور تھے لے دے کے یہی مختلف عمروں کے آدمی اس کے دوست رہ گئے تھے' جن میں سے اول تو کسی کو بچوں کے ساتھ بات چیت کرنا نہیں آتا تھا یا آتا تھا تو اتنا کہ ان میں سے بھی کبھی کوئی آکر اس سے بھی پوچھ لیتا تھا۔

"And What would the youngman like to have "

جس پر اس کا باپ وہیں دور سے چلا کر کہتا تھا۔

" Give him some ice-cream and he would be happy."

لڑکا خود کو آئس کریم اور پوٹیٹو چپس کی عمر سے بڑا سمجھتا تھا لیکن کوئی بھی اسے پسند نہیں تھی۔ ایک طرح سے وہ خود کو کٹی ہوئی پتنگ کی طرح محسوس کرتا تھا اور اسی وجہ سے اس کا باپ اسے یہاں لے آیا تھا۔ نہ وہ اپنی عمر والوں میں سے تھا جو شطرنج کے مہرے تک نہیں پہنچاتے تھے چہ جائیکہ مینجیس ٹل اور بوبی فشر کے بہترین گیمز انہیں یاد ہوتے نہ ہی وہ ان بڑی عمر کے لوگوں میں سے تھا کیونکہ تمام تر توجہ اور عزت دیئے جانے کے باوجود وہ اس سے قریبی نہیں تھے۔ جب بھی کوئی خاص بات آجاتی تھی تو وہ اسے چھپائی جانے والی بات بنا دیتے تھے اور لڑکے کو اٹھ کر ادھر ادھر ہو جانا پڑتا تھا۔

یہ سب کچھ اسی تواتر سے ہر جمعہ کو کئی مہینوں سے ہو رہا تھا ۔۔۔ جب سے محلے کے لڑکوں نے اس کا نام شورٹ سرکٹ رکھ دیا تھا اور وہاں سے یہ بات اسکول تک پہنچ گئی تھی ۔۔۔ اس کا باپ اسے کار میں بٹھا کر اس گھر میں لے آتا تھا جو ایک طرح سے ان لوگوں کا کلب تھا جسے کوئی گمنام فیملی چوری چھپے چلا رہی تھی۔ نہ باہر کوئی بورڈ تھا نہ ہر کسی کو اندر آنے کی اجازت تھی۔ صبح گیارہ بجے سے لوگ آنے شروع ہو جاتے تھے اور وہ ان سب کو پہچان گیا تھا ۔۔۔ کچھ تو وہی تھے جو اس کے گھر بھی آیا کرتے تھے' کچھ نئے تھے جن سے اس گھر میں ہی واقفیت ہوئی تھی۔ کلب چلانے والے نے گھر کے سب سے بڑے کمرے اور اس کے آگے کے برآمدے اور صحن کو کلب میں تبدیل کر دیا تھا اور یوں بھی کہا جا سکتا تھا ہر چھٹی کے دن وہ ان تین حصوں کو کلب میں کنورٹ کر دیتا تھا کیونکہ گھر کی تصویریں اسی طرح لگی رہتی تھیں' سجانے کی چیزیں اپنی اپنی جگہ پر برآمدے کے کھمبوں سے لٹکے ہوئے نازک گملے بھی اسی طرح چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ کوئی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ حتی کہ بجرز کا پنجرہ بھی اپنی جگہ سے نہیں سرکایا جاتا تھا اور کوکاٹو اپنی چھتری پر بیٹھا دوسرے جانوروں اور لوگوں کو پکارتا رہتا تھا۔ انٹونیو' گریگری' تھیلما (Thelma) گریگری بلے کا نام تھا جو دروازے کو دھکا دے کر اندر کے کمروں میں سے باہر آتا تھا اور کچھ دیر کو کاٹو کو دیکھ کر واپس اندر چلا جاتا تھا'

جیسے اس کے سپرد ایک ہی کام تھا۔ انٹونیو ایک بیس بائیس سال کے لڑکے کا نام تھا جو مسز فرنانڈیز کے ساتھ، اگر کبھی تاش کی محفل اتوار کو بھی جمی ہوتی تھی یعنی اگر وہ چھٹی کا دن ہوتا، چرچ سے بارہ بجے کے قریب لوٹتا تھا۔ لیکن تیسلما کون تھی یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

مسز فرنانڈیز انٹونیو کو بیٹا کہہ کر بات کرتے تھے لیکن وہ ان کا لڑکا نہیں تھا۔ اغلب یہی تھا کہ اس کا کام مسز فرنانڈیز کو چرچ لانا لیجانا تھا کیونکہ وہ بہت وزنی تھیں اور ایک طرف سے فیل پا ہونے کے سبب ان کے بے سہارا چلنے میں یہی احتمال ہوتا کہ وہ لڑھک جائیں گی۔ مسٹر فرنانڈیز خود چرچ جانے کے قائل نہیں تھے۔ ان ساتھیوں میں سے وہ کس کے دوست تھے، یہ آٹھ نو سال کی عمر والے کو معلوم نہیں تھا۔ کسی نہ کسی کے تو دوست ہوں گے تب ہی ان لوگوں کو یہاں بیٹھنے کی جگہ انہوں نے دے رکھی تھی۔

کبھی کبھی جب لڑکے کو اٹھ کر پیشاب کے لئے جانا پڑتا تھا تو وہ دیکھتا تھا وہ ایک صوفے میں دھنسے بیٹھے ہیں، برابر میں جھاگ سی بھری ہوئی بیئر کا گلاس رکھا ہے آس پاس کوئی نہیں ہے، ان کی رانوں پر گوا سے آنے والا ایک میگزین کھلا پڑا ہے لیکن اس پر ان کی نگاہ نہیں اٹھتی تھی۔ اس طرح کوئی اکیلے گھنٹوں کس طرح بیٹھ سکتا ہے۔ یہ خیال لڑکے کو اکثر ستاتا تھا۔

دن میں ایک آدھ مرتبہ یوں بھی ہوتا تھا کہ مسز فرنانڈیز اندر کے دروازے کو کھول کر اس کمرے کی دہلیز پر کھڑی ہو جاتی تھیں جہاں مسٹر فرنانڈیز بیٹھے ہوئے تھے، اور یا تو کوئی یا کھانے کے لئے کہہ کر وہ اندر چلی جاتی تھیں یا بغیر کچھ کہے ہی غائب ہو جاتی تھیں ------ یا اپنے ہانپتے ہوئے جسم کے ساتھ چل کر وہ بجرے تک جاتی تھیں، انہیں کنگھی دکھاتی تھیں، پھولے گملوں میں نمی کو چیک کرتیں اور کوا کو ٹھونگ دے کر اس کے سر کو تھپتھپاتی تھیں۔

" ہاؤ آر یو۔"

" ہاؤ آر یو؟ " سلیٹی رنگ کا توتا دہراتا۔

" ہاؤ آر وی ٹوڈے " (How are we today) اس کے باپ کے ساتھیوں میں سے کوئی اپنے حلقے میں شرارت سے، دبے لفظوں میں کہتا۔ اس کے ساتھ ہی مسز فرنانڈیز کی آواز آتی۔

" ہاؤ آر وی ٹوڈے؟"

اپنے پنجرے پر وہ ایک پیر ادھر اور دو ایک پیر ادھر چل کر توتا کہتا " ہاؤ آر وی ٹوڈے؟ "

مسز فرنانڈیز کہتیں " تھینک یو ویری ویل ڈیئر۔"

توتا دہراتا " تھینک یو ویری ویل ڈیئر۔"

لڑکا اپنی میز سے دلچسپی بھری نظروں سے اس سین کو دیکھتا رہتا، اسے معلوم ہوتا تھا اتنی دیر میں اس کا ساتھی نئی چال نہیں چل پائے گا۔ بساط کے وسط پر چھاجانے کی اہمیت کتنی ہے اس سے وہ لوگ، سوائے اس کے باپ اور ڈاکٹر کے، سب ناواقف تھے جن کو شطرنج آتی تھی وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کھیل کیا رہے ہیں کنگس پان اوپننگ ہے یا کوئنس گیمبٹ ڈکلائنڈ، اگر دفاع تو انڈین یا کارو کان

(King's kann defense pawn opening or Queen's gambit declined indianor caro)

ان لوگوں کی شروع کی چالیں بندھی ٹکی تھیں۔ نجانے کب سے وہ اسی طرح بغیر

اورنگ زیب قاسمی

اخراج کے کھیلتے آئے تھے کہ مقابل کی نظر چوکے اور اس کا رخ مارلو اور جب وہ کھیلتے کھیلتے تھک جاتے تھے تو اٹھ کر کنٹریکٹ برج میں شریک ہو جاتے تھے جو ہر میز پر کھیلا جارہا ہوتا تھا اور ہر میز پر اس کا اسکور لکھا جارہا ہوتا۔ نوٹڈ اور پاس، اسٹے ہارٹ اور اسٹے اسپیڈ۔ بس یہ لوگ دن بھر یہی کرتے رہتے تھے اور جب وہ تھک جاتے تھے تو ڈارٹس سرو کئے جاتے تھے دوپہر کا کھانا ہوتا تھا جس کے لئے نزدیک کے کیفے ہیپا کو رنگ کرنا پڑتا تھا اور لوگ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگ جاتے تھے۔

شام آچلی تھی اور کلب سے چلنے کا وقت بھی نزدیک آرہا تھا۔ بارش کی وجہ سے مسٹر اور مسز فرنانڈیز دونوں ہی دیکھنے میں نہیں آرہے تھے ورنہ ایک ہاتھ فرنانڈیز بھی کھیل لیا کرتے تھے۔ شاید دونوں اندر ایک جھپکی لے رہے تھے۔

اچانک ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ کرکے بوندوں نے تیزی سے گرنا شروع کر دیا اور لڑکے کو اندر بھاگنا پڑا۔ اب سب یہاں گھر گئے تھے کم سے کم وہ تو گھر ہی گئے تھے جن کے پاس کار نہیں تھی اور جنہیں جانا بھی دور تھا۔ کسی کی بس ساڑھے چھ بجے نکلتی تھی کسی کو لوکل ٹرین پونے سات پر ملتی۔

کسی نے ڈاکٹر سے کہا

"Forget the moustachetell us something new."

" یہ نیا نہیں تھا جو میں نے بتایا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

" تھا تو لیکن مونچھوں کی دنیا اتنی محدود ہے کہ اس پر زیادہ دیر بات نہیں ہو سکتی ہے۔"

" Who says? " (کون کہتا ہے) ڈاکٹر نے کہا " مونچھوں پر تو آدمی جمال عبدالناصر اور فیڈرل کاسترو کی طرح اٹھائیس اٹھائیس گھنٹے بول سکتا ہے۔ مثلاً سلون ٹانمنٹ پر بنے ہوئے آدمی کی مونچھیں جنہوں نے اس تیل کو عام کا شرف بخشا ہے۔ مونچھوں والا تیل اور اگر کسی کی دیسی مونچھیں ہوں تو انہیں تیل والی مونچھ کہیں گے۔ اس پر تو پورا مقالہ لکھا جاسکتا ہے۔"

" آجئے اپنے پروفیشن پر۔" کسی نے کہا۔

" تو، تو، سلون ٹانمنٹ اشتہاری دوا ہے، میرے پروفیشن سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ ڈاکٹر بھی کسی کے لئے ایسی دوائیں جیسے گھٹی، امرت دھارا، وکس ویپوریپ نہیں لکھے گا۔ ایسی لے مین (Layman) کی دوائیں تو کوئی بھی کسی کو بتا سکتا ہے۔"

" گرائپ واٹر، ایسینشیل آئلز؟ " (Essential Oils) کسی نے لقمہ دیا۔

ڈاکٹر نے اثبات میں ان الفاظ کو دہرایا۔

ساتھیوں میں سے ایک نے کہا " زیادہ تر دوائیں آج کل اسی قسم کی ہیں۔ ہر ایک ہر ایک کو ٹرانکیولائزرز، اینٹی بایوٹکس، پین کلرز اور اینٹی پائریٹکس (بخار اتارنے کی دوائیں) بتا سکتا ہے، بلکہ بتاتا ہے۔ میں اپنی بیوی کی ہر چھوٹی چھوٹی بات کے لئے ڈاکٹر کے پاس دوڑا نہیں جاتا ہوں۔ ہم نے خود گھر میں چھوٹی موٹی ڈسپنسری رکھ رکھی ہے۔"

" اور اس میں سے یہ اور وہ گھر والوں ہی پر آزماتے رہتے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

" اور ڈاکٹر لوگ کیا کرتے ہیں! وہ بھی دوائیں آزماتے رہتے ہیں۔ اس اینٹی بایوٹک نے کام نہیں کیا تو

دوسری سہی۔ دوسری نہیں تیسری۔"

اچانک گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے لڑکے نے کہا

" First generation cephalosporines انہوں نے کام نہیں کیا تو Second generation cephalosporines ہے۔"

" یور آر آل ریڈی اے ڈاکٹر۔" بوڑھے شطرنج کے کھلاڑی نے کہا

لڑکے کے باپ نے کہا " ان کی ماں اکثر بیمار رہتی ہیں۔ یہ اس کا طفیل ہے۔"

سب ہنس پڑے۔

ایک ساتھی نے آواز دھیمی کرکے ان صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جنہوں نے ایک انٹی بایوٹک نے کام نہیں کیا تو دوسری سہی والی بات کی تھی " بات جب بگڑتی ہے جب درد کی جگہ پہچاننے میں غلطی ہو جائے ------ جب بھائی ---- " بات من سن' سن من میں کھو گئی۔

پھر ایک قہقہہ پڑا۔

کسی نے اس پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ بجلی کب کی جا چکی تھی اور اندر کے اندھیرے اور حبس سے تنگ آکر مسٹر فرنانڈیز بھی ان لوگوں میں آکھڑے ہوئے تھے۔ میز پر جھک کر انہوں نے سگار کی راکھ جھاڑی اور بغیر کسی کی طرف دیکھے کہا " آج ڈاکٹر سے اس کا کوئی کیس سنو۔ پیچش' بخار' سر کا درد یہ تو ہر ڈاکٹر کے حصے میں آتے ہیں۔ خون کی الٹی 'Abortion' (اسقاط) اور (Theratened Aborition) جس اسقاط کا دھڑکا ہو بھی' لیکن دوسرے کیس -----"

" کون سے ؟ " ڈاکٹر نے کہا۔

" جو تمہارے حصے میں آتے ہیں (Man) نیچر کے نہیں' ادھر اوپر کے کیس۔" مسٹر فرنانڈیز نے اپنی کنپٹی پر انگلی دھر کے کہا اس پر کسی نے کہا "اس معاملے میں یہ پورا بومیدین ہے۔ کبھی منہ سے نہیں پھوٹے گا۔ میں اسے تین سال سے جانتا ہوں" " بومیدین کیسا وہ الجیریا والا " مسٹر فرنانڈیز نے کہا۔ انہوں نے ڈاکٹر کا یہ نام آج پہلی بار سنا تھا۔

" وہی ----- جیسا وہ گھنا تھا کبھی ٹیلی وژن تک پر نہیں آتا تھا ویسے ہی یہ بھی گھنا ہے۔"

سب ہنس پڑے۔ واقعی میں ڈاکٹر کا یہی نام تھا کم از کم اس کلب کی حد تک۔ جب چھٹی کے دن اس کے آنے میں دیر ہو جاتی تھی یا جس دن وہ نہیں آتا تھا تو سب ایک دوسرے سے بار بار پوچھتے۔

" آج پریذیڈنٹ نہیں آیا۔"

" Where is Boumedine "

اس کے منہ سے مریضوں کے بارے میں کسی سے کوئی نہیں سنی تھی اور سب جانتے تھے وہ جسم کے اس حصے کا ڈاکٹر ہے جو اگر بگڑ جائے تو اس سے ان گنت کہانیاں وجود میں آتی ہیں۔ بعض اسے شرلک بھی کہتے تھے اور ہیڈ شرنکر بھی یعنی دماغ کو سکیڑ دینے والا لیکن اپنا یہ نام سن کر بھی وہ محض ہنس دینے پر اکتفا کرتا تھا۔

بومیدین یا پریذیڈنٹ یا شرلک جو بھی اسے کہا جائے برج کا اچھا کھلاڑی تھا۔ وہ سگریٹ بھی پیتا تھا' سگار بھی' کبھی کبھی جب اس کا کوئی ساتھی اٹھ کر باتھ روم چلا جاتا تھا اور کھیل رک جاتا تو وہ اٹھ کر نو دس سال

اورنگ زیب قاسمی

والے لڑکے کے پاس آکھڑا ہوتا اور پوچھتا "کون جیت رہا ہے؟"

یا مثلاً" اس کے منہ سے نکلا تھا " یو آر ایٹ " ایڈوانٹیج۔ ایک پیول ہی سہی لیکن تم پھر بھی ایڈوانٹیج (فائدے میں) پر ہو۔"

شروع میں اس نے ایک آدھ مرتبہ لڑکے سے اس کے اصلی ساتھیوں کے بارے میں بھی پوچھا تھا کہ ان میں سے کس کس کو کس کس چیز کا شوق ہے اور یہ سن کر سب دن بھر وی سی آر سے چپکے رہتے تھے اور آتشی اسلحہ کے شیدائی تھے۔ اس نے تاسف سے کہا تھا۔

"What a pity' you should have been born elsewhere,This is no place for you,"

(کاش تم کسی اور جگہ پیدا ہوئے ہوتے۔ یہ جگہ تمہارے لائق نہیں ہے۔)

بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور کسی کو گھر جانے کی جلدی بھی نہیں تھی۔ مسٹر فرنانڈیز کے اصرار کے بڑھ جانے پر بومیدین نے بات کو ٹالنے کے لئے کہا۔

" آئیے پھر سے انسانی مونچھ کے بارے میں بات کریں۔ کتنی "Species Specific" چیز ہے۔ اتنی دودھ پلانے والی مخلوق دنیا میں ہے سب کے ناخن اور بال ہوتے ہیں لیکن مونچھ صرف حضرت انسان کے حصے میں آئی ہے۔"

لوگ ہنس پڑے۔

بومیدین نے نو دس سال کے لڑکے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا " ینگ مین واٹ ڈو یو سے ؟

(میاں صاحبزادے سے آپ کیا کہتے ہیں ؟)

لڑکے نے جھینپتے ہوئے کہا " سب ہی کے ہوتے ہیں۔ بلی کے' کتے کے ' خرگوش کے ' چوہے کے۔"

They have whiskers don't they

سب نے ہیر ہیر کہا۔ ڈاکٹر نے بھی۔

" چلو نہیں بومیدین ' اپنا کوئی کیس سناؤ۔" مجمع میں سے کسی نے کہا۔

ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا " اصل میں مشکل یہ ہے لوگ سمجھتے ہیں جرم کے بارے میں سنانے کے لئے سب سے اچھی کہانی پولیس انسپکٹر یا سراغ رساں کے پاس ہوتی ہوگی کیونکہ اس کی زندگی ہی کرمنلز میں گزرتی ہے۔ اسی طرح فلمی دنیا سے متعلق ایکٹرز ڈائریکٹرز کے پاس اور نفسیات سے متعلق سائکریٹسٹ کے پاس ہو کہ بدقسمتی سے ہوں لیکن میں جانتا ہوں نہ پولیس انسپکٹر یا سراغ رساں کے پاس سنانے کے لئے کوئی کہانی ہوتی ہے' نہ فلم والے کے پاس نہ نفسیاتی امراض کے معالج کے پاس۔ سب اندر سے اپنے اپنے پیشے سے بیزار ہوتے ہیں۔"

تھوڑے توقف سے اس نے کہا " بلکہ دیکھا جائے تو نفسیاتی میڈیسن میں پیش آنے والے تمام واقعات خواہ ان کا تعلق ----- " اس نے اس لفظ کو اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ بمشکل ہی اسے کوئی سن پایا ہوگا ----- " سے ہی کیوں نہ ہو سائکرٹسٹ کے لئے اس واقعہ کو کہانی کی دلچسپی سے خالی کر دیتے ہیں۔

اب بھلا یہ بھی کوئی کہانی ہوئی کہ ایک لڑکی جو اپنی سسرال نہیں جانا چاہتی ہے کیونکہ وہاں اس کا سسر -----

" آواز ایک بار پھر اتنی دھیمی ہوگئی کہ سب کو نو' دس سال کے لڑکے کی طرف دیکھنا پڑا جیسے وہ اس کا ذمہ

دار ہو ------ " اور سسرال والی بات بھی کتنے دن میں کھل کر سامنے آتی ہے اور جب کھل کر سامنے آتی ہے تو اتنے کھیڑوں کے ساتھ کہ اس میں سے Suspense کہ دیکھیں اندر سے کیا نکلتا ہے اگر پہلے بھی تھا بھی تو غائب ہو چکا ہوتا ہے اور بالعموم اس تشویش یا سسپنس کے عنصر سے سائکرسٹ پہلے ہی سے واقف ہوتا ہے ۔ تشویش اگر اس کے نزدیک ہوتی بھی ہے تو اس بات کی کہ وہ سبجکٹ یعنی مریض یا مریضہ متوقع راز کو زبان پر لائے گا اور اپنی جسمانی علامتوں کی مسنبندھ اس ہیجان پیدا کرنے والی صورت حال سے ڈھونڈ نکالے گا۔ پھر سارا کام ان جسمانی علامتوں کے ایک ایک کرکے سوچ بند کرنے کا رہ جاتا ہے جو حقیقت میں سائکرٹیسٹ کے لئے اصل مشقت ہے ------ پہاڑ کی چڑھائی۔ آپ نے دیکھا اس سب میں معالج کے لئے کوئی سسپنس نہیں ہے۔" اس کے بعد کے خاموشی کے طویل وقفے میں لوگ باہر پتوں سے ٹپکنے والی بوندوں کی آواز کو سن سکتے تھے۔ پھر کسی نے کہا " تیر تھراپسٹ کے لئے اس میں سسپنس ہو نہ ہو ہمارے لئے تو ہے اور پہاڑ کی چڑھائی والے انجن کا عکس کو ہم پروفیشنل ذمہ داری سمجھ کر نظر انداز کر سکتے ہیں۔"

"کہانی اس کے بنا پر چلینگا" مسٹر فرنانڈیز نے کہا

کسی ایک نے کہا " کہانی وہیں ختم کیجئے جہاں راز کھلتا ہے اور اپنا کوئی کیس سنائیے ۔ چٹ پٹا سا۔"

"کیا ؟ " ڈاکٹر نے کھوئے لہجے میں کہا۔

" جو ہمارے لئے بالکل نیا ہو --- یہ ایڈی پو (Oedipus) ہیلو سی نیشنز (Hallucinations) وغیرہ کا چکر تو اکثر فلموں میں بھی ہم دیکھتے رہتے ہیں۔"

"اور دہری شخصیت بھی۔"

" بلکہ تہری ' چوہری بھی۔"

" یہاں تو ہر بدمعاش کی دو شخصیتیں ہوتی ہیں --- ایک کو وہ مزار کرنے ' رشوت لینے کے کام میں لاتا ہے دوسری کو لے کر حج پر جاتا ہے۔"

مسٹر فرنانڈیز نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا" تم ہمارے کو مروائینگا مین۔ حج پڑھنے کو ایسا آدمی جاتا' یہ بات آج پہلی دفعہ ہم تمہارے منہ سے سنا۔ کوئی باہر لینگا تو کلب بند کرنا پڑے گا۔"

" آپ سب پڑھے لکھے لوگ ہیں' مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے " ڈاکٹر نے کہا " سائیکیٹری میں کوئی کیس ایسا نہیں ہوتا ہے جسے آپ بدلی ہوئی شکل میں کہیں اور پڑھ چکے ہیں' سن نہیں چکے ہیں ' دیکھ نہیں چکے ہیں۔ حوا کے تین بچے تھے۔ ہابیل نے قابیل کو مارا تھا۔"

Man cain was the eldest son of Adam he murdered his younger brother Abel

مسٹر فرنانڈیز نے درست کہا

" اول رائٹ قابیل نے ہابیل کو مارا ہوگا لیکن میری بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ہیروئن کے لئے کوئی نوجوان کس دھوکے سے بہن کے گلے سے اس کی منگنی کا ہار---"

کسی نے ٹوکا "منگنی کی انگوٹھی۔"

ڈاکٹر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا " خیر جو کیس اس وقت میرے ذہن میں تھا اس میں ایک نوجوان نے اپنی بہن کے گلے سے بہانے سے اس کی منگنی کے جوڑے کے ساتھ آیا ہوا سونے کا ہار اتروالیا تھا

اورنگ زیب قاسمی

کہ تھوڑی دیر پہن کر دیکھوں گا--- آج کل نوجوانوں میں یہ رواج ہے نا کسی چیز کے گلے میں ڈالنے کا جنیو کی طرح' یا جس طرح مسٹر فرنانڈیز کے گلے میں بچپن میں کراس پڑا ہے اور گھر والوں کی نظر چوکتے ہی جو وہ گھر سے غائب ہوا تو اس کے گھر والوں کو تیسرے دن پتا چلا کہ وہ الف ------ ٹرسٹ والوں کو کہاں پڑا ملا اور کس حالت میں تھا۔ اس سب میں سسپنس کہاں ہے ۔ دماغی مشقت ہے۔ منشیات کی دنیا لاشعور اور تحت الشعور' کوگنیشن تھیوری ' فینومینولوجی (Gestalt pachology) دہری شخصیت'ا' سکزوفرینیا کے ہیلوسی نیشنز' پیرانوئیا اور حسد --- سب ادب اور ادب سے زیادہ صحافت کی تھکیت بن چکے ہیں۔ سائکرٹیسٹ کے لئے تو یہ اس کا ہیڈ اینڈ بٹر ہیں۔ اس کی روزی ' بے لطف باتیں جن سے اخبار اور ادبی رسائل پڑھنے والے ہی لطف لے سکتے ہیں۔"

" ہم وہی اخبار اور ادبی رسائل پڑھنے والے ہیں۔"

" تو روک کون رہا ہے۔ پڑھتے رہئے۔" ڈاکٹر نے کہا " جب طبیعت بوجھل چیزیں پڑھنے پر آمادہ ہو تو گاندھی جی کی شروع کی زندگی میں (Aggression) جارحیت کو ڈھونڈھیے' پوشیدہ جارحیت کو --- Karl Jaspers کو پڑھیے۔ تصویروں میں چھپی ہوئی پراسرار مسکراہٹ کے رموز کو سمجھنے کی کوشش کیجئے اور جب کہانی پڑھنے پر مائل ہوں تو ایک جہان سے بیسویں صدی کے ادب اور سینما میں --- لطف لیتے ہی رہیے۔"

" اصل میں جس چیز نے نفسیاتی کیس ہسٹری کو دلچسپ بنایا تھا وہ تھا احساس جرم ' یا گناہ کا تصور کہ ہر نفسیاتی مسئلے کے پیچھے ایک حقیقی یا فرضی گناہ چھپا ہوتا ہے ------"

سب نے تو' دس والے لڑکے کی طرف دیکھا جیسے وہاں اس موجودگی ناخوش ہو۔

" اور یہ مفروضہ ہو کہ وہ خود ' یعنی سبجکٹ اپنے اندر چھپے ہوئے اس احساس جرم سے بے خبر رہتا ہے۔ یہی ہوتا تھا پرانے لٹریچر میں ؟ " اس نے زیادہ بولنے والے ساتھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

" کیا مطلب ہے ہوتا تھا۔" اس نے کہا "ہم سمجھتے ہیں ہوتا ہے ۔ ایک آدمی بچپن ' یا نوجوانی میں جرم کرتا ہے یا کہ اس سے جرم سرزد ہوجاتا ہے۔"

ڈاکٹر نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کہا " جی ہاں ' جی ہاں اور شعور اس تکلیف کو پی نہیں سکتا اور کھدیڑ کر حقیقت کو لاشعور کی کال کوٹھری میں پھینک دیتا ہے اس طرح سبجکٹ خود تو نشوونما پاتا رہتا ہے لیکن اس ذہنی زندگی کا ایک حصہ ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے ' جیسے ایک بڑے بڑے پھولوں پتوں والے پودے کی ایک شاخ ایسی ہو جائے کہ اس کے پتے اور پھول بہت چھوٹے ہوتے ہوں۔ اس طرح سبجکٹ جیتا تو ہے لیکن روحانی دوزخ میں کھولتا رہتا ہے اور لطف یہ ہے کہ نہیں جانتا کہ کس جرم کی پاداش میں وہاں پھینکا گیا ہے اور اس دور کے لٹریچر میں اس کی یہ حالت اس وقت تک رہتی تھی جب تک کہ نفسیات کا ماہر جس کا چہرا بالعموم فرنچ داڑھی سے منور ہوتا تھا اسے پچکار پھسلا کے اس کال کوٹھری سے باہر نکالتا تھا--- پھر روشنی پڑنے پر ------ یعنی ان دنوں اسی طرح سمجھا جاتا تھا۔ سبجکٹ کو پتا چلتا تھا کہ اس نے ناحق ایک عام سی بات کو اتنا بڑھا چڑھا کر اپنے اوپر مسلط کر لیا تھا اور یہ یوں تو سب کی زندگی میں ہوتا ہے بلکہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ ذہنی اور جذباتی بلوغت

خود زنانے ویٹنگ روم کی طرف بھاگتے ہوئے جہاں میری ماں تھیں اور بڑی بہن ' میں نے ایک نوجوان کو دیکھا جو گرتے ہوئے فوجی کے ہاتھ سے پستول چھین رہا تھا لیکن اتنی دیر میں ایک فائر ہو چکا تھا۔

اور جب آدھ گھنٹے بعد میں پلیٹ فارم پر نکلا تو اسپیشل ٹرین جا چکی تھی۔ اس جگہ خون کا ایک بڑا دھبا تھا جو پلیٹ فارم سے ریلوے لائن کی سمت کو جاتا تھا لیکن سلیپرز اور پتھر اور پتھریلی وتی سنسان کالے رنگ کے تھے۔ کتنے ہی دن میں سوچتا رہا وہ دونوں کہاں گئے لڑکی اس ٹرین پر تھی یا نہیں۔"

ستھرے چہرے والے شخص نے کہا "یہی کچھ دوسری طرف بھی ہوا تھا۔"

ڈاکٹر نے بے توجہی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا " پھر وہ عورت میرے ذہن میں ابھرتی ہے ------ میری ایک بڑھاپے کو پہنچتی ہوئی مریضہ ------"

حاضرین نے اطمینان کا سانس لیا۔ کسی نے کہا " یہ ہوئی بات۔"

بوسیدین نے کہا " وہ عورت اپنے گود کے بچے کو سنبھالنے میں سب سے پیچھے رہ گئی تھی۔ اس کے رشتے دار اور پنڈ والے قافلے کے ساتھ آگے نکل گئے تھے۔ ان لوگوں کو کہیں آس پاس نہ دیکھ کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ شاید اسے امید ہو گئی بہت جلد اس کے گھر والے اسے غائب پا کر اس کے لئے واپس آجائیں گے۔ میلوں عرصوں میں جاتے ہوئے ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا' اس لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں تھی اور جب دروازے پر لوگوں نے کھٹکا کیا تو وہ جی تڑی کستی ہوئی باہر نکلی۔ لوگوں نے اس کے ہاتھ سے بچے کو لے کر ہوا میں اچھالا۔ اچھالنے والوں کے ہاتھوں میں آپ کو معلوم ہی ہے کیا تھا۔ یونٹ گی بندوق۔ اس عورت کی حالت جب بھی بگڑتی ہے ------ اس واقعہ کی وجہ سے نہیں ۔ وہ تو چالیس پینتالیس سال پرانا ہے' اپنی بیماری کی وجہ سے ------ وہ پھر اسی دنیا میں پہنچ جاتی ہے اور ان گنت بار کہتی ہے جی میں کہتی آں نئی میں کہتی آں' میں کہتی آں ' میری سنو تو سہی۔ بوھا میں نے ' بوھا میں نے اسی واسطے تے نہیں کھولا سی۔

جب میں نے سکھ فوجی کو زمین پر گرتے دیکھا تھا انہی دنوں ایک رات شور ہوا۔ پھر کسی کے چیخ مارنے کی آواز ہوا میں کھو گئی۔ اس چیخ سے میری آنکھ لمحے بھر کو کھلی اور میں پھر نیند میں ڈوب گیا۔

اگلی صبح چھوٹی سی نہر کے کنارے لڑکے جمع تھے جیسے ان کے ہاتھ ایک کھیل آگیا ہو۔ میں نے دور سے اس منظر کو دیکھا۔ اس کے چھوٹی سی بکھری ہوئی داڑھی تھی۔ ممکن ہے بڈھا ہو جیسے ہو اس کے جسم پر نہ نچلے حصے کا کپڑا تھا نہ پیروں میں جوتے۔ پتا نہیں وہ کیا تھا' کون تھا۔ قمیض البتہ پیٹنے سے چاک کر دی گئی تھی اور جہاں جہاں خون میں ڈوبی تھی بالکل کھڑنگ ہو چکی تھی۔

ہر آنے والا پوچھتا تھا کون ہے ؟

اور لڑکے جن کے ہاتھوں میں سیپیاں تھیں ایک مذہبی رسم کی طرح اس کی قمیص کے دامن کو اوپر اٹھا دیتے تھے اور جوں ہی کوئی عورت وہاں سے گزرتی تھی دامن کو دوبارہ نیچے کر دیتے تھے۔

لوگوں نے کہا رات کے چار بجے اسپیشل ٹرین نے جانا تھا۔ یہ پتا نہیں اب تک کہاں چھپا ہوا تھا بھاگ کر اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ ہمارے کیمپ کے چوکیدار نے اسے للکارا اور پھر اس نے اپنی تلوار کے ایک ہی وار سے اسے گرا دیا۔ بس فیر اوہدا اکٹری چڑھتا رہ گیا۔

چوکیدار مجھے اس وقت کہیں نظر نہیں آیا۔ اس کے بھی ایسی ہی چھوٹی سی داڑھی تھی۔ آج بھی ان

اورنگ زیب قاسمی

دونوں کی تصویریں میرے ذہن کی دیوار پر برابر لگی ہوئی ہیں۔

میں نے لوگوں کا قتل عام بھی دیکھا ہے ' حیدر آباد سندھ میں وہ جگہیں بھی دیکھی ہیں جہاں پندرہ منٹ کے اندر اندر موت کی نزدیکی سے بے خبر لوگوں کی لاشیں ایک دوسرے کے اوپر پڑی تھیں جیسے ہرنوں کی ایک ڈار پانی پینے کو تل پر آئی ہو اور پاس ہی مچان پر چھپے شکاریوں نے انھیں اس طرح گولیوں سے گھیر مارا ہو کہ ان کی لاشیں دائروں میں تل کے کنارے بکھری رہ گئی ہوں۔ یہ سب کچھ ایک ہی شام کو ایک ہی وقت پر شہر کے مختلف مخصوص علاقوں میں ہوا تھا۔

میں نے بوہری بازار کراچی کو دھماکوں کے بعد بھی دیکھا ہے جہاں عمارتوں کی دیواروں پر خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر گئے تھے اور کہیں کہیں بوٹیاں بھی ان سے چپکی ہوئی تھیں مجھے وہ نوجوان یاد آتے ہیں جو ایک جگہ رکے ہوئے یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ ان کے سامنے جو چیز ریلنگ سے چپکی ہوئی تھی گوشت کی بوٹی تھی یا کلیجی کا ٹکڑا۔

پھر لڑکیاں جنہیں یاد یا...... " (آواز مدھم ہوتی گئی اور کافی دیر تک نیچی رہی)

نو دس سال کا لڑکا اٹھا کر دوبارہ شطرنج کی میز پر جا بیٹھا تھا اور کسی کھیل کے آخری حصے کو دوبارہ اپنی یادداشت سے کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر کوئی اس کے پاس پیچھے سے جا کر کھڑا ہو جاتا تھا تو مشکوہ کہہ رہا ہے۔

"Now where was this pawn At Queens 6 and the Black Bishop, "

(اب یہ پیدل کہاں تھا ؟ ملکہ کے چھٹے گھر پر اور سیاہ بشپ ؟)

مسز فرنانڈیز نے اونچی آواز میں کہا ۔ "Man تم نے تو کہانی سنانے کی جگہ سب کو ڈیپریسڈ کر دیا ایسے یہ کلب کیسے چلے گا"

ان کی بات کا ڈاکٹر پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اگر ہوا تو اتنا کہ اچانک اس کی آواز لوٹ آئی۔ اتنی اونچی کہ لڑکا اپنے ہاتھ میں اٹھایا ہوا مہرہ پکڑے کا پکڑا رہ گیا۔

ڈاکٹر نے کہا " تعجب ہے ان سب عورتوں ' لڑکیوں ' مرنے والوں کے باپ' بھائی' بیٹوں کو میں سالہا سال سے دیکھتا چلا آرہا ہوں لیکن نہ میں نے شاید میرے کسی اور ہم پیشہ نے' نہ ہی سرحد کے پار کے کسی ہم پیشہ نے آج تک اس فرد کو دیکھا ہے جو وحشت کے عالم میں خود سائکر یٹسیٹ کے پاس چل کر آئے اور کہے میں نے ہوا میں اچھالے ہوئے ایک دودھ پیتے بچے کو اپنی رائفل کی سنگین پر لیا تھا۔

میں ان نوجوانوں میں شامل تھا جنھوں نے خطرے سے ناواقف انسانوں کے گروہوں پر ایک شام گولی چلائی تھی اور جس طرح شکاری اپنی ڈرافیاں گنتے ہیں میں نے گنا تھا ان میں سے پچاس کو خود میں نے ڈھیر کیا تھا۔

میں نے ایک لڑکی کی .... (آواز مدھم ہوگئی) کے بعد چاقو سے اس کی .... (آواز دوبارہ مدھم ہوئی) کاٹی تھیں۔"

میں نے ایک فوجی افسر پر پیچھے سے چھرا پھینک کر مارا تھا اور جب زمین پر گرتے ہوئے باپ نے خود بیٹی پر فائر کیا تھا تو مجھے افسوس ہوا تھا تو بس اتنا کہ ایک خوبصورت جسم ضائع ہو گیا ایک بغیر استعمال میں آئی (آواز مدھم ہوگئی) مجھے میرے بے رحم ضمیر سے بچاؤ۔

ایک دم بینچ پر بیٹھے ہوئے کولڈو نے کہا "تھیلما تھیلما"
اس کی طرف پلٹتے ہوئے مسٹر فرانزیز نے کہا
"Where is theme you must be dreaming old Boy."
(تھیلما کہاں ہے؟ خواب دیکھ رہے ہو؟)

("دریافت" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

رشید امجد

شہربدری

اتنے عرصے بعد مرشد کو دیکھ کر اسے کوئی خوشی نہ ہوئی۔

شہر کے بڑے چوک میں جہاں موت کا کھیل جاری تھا وہ بھی دوسروں کی طرح زمین پر لیٹا جان بچانے کی سعی کر رہا تھا۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں کسی کو خبر نہ تھی کہ ساتھ کون ہے؟ کون بچ گیا ہے اور کون ان دیکھی گولیوں کا نشانہ بن گیا ہے؟

اس لمحے جب زندگی اور موت کے درمیان فاصلے کی شناخت ختم ہو گئی تھی اسے قریب سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی اور کھلکھلاہٹ مرشد کے سوا کسی کی ہو سکتی تھی۔

اس نے سر اٹھائے بغیر کہ ڈر تھا" اٹھا ہوا سر کسی گولی کا نشانہ نہ بن جائے۔ دبی آواز میں پوچھا" یہ تم ہو ــــ"

مرشد کی ہنسی روکے نہ رکتی تھی۔

وہ گھبرا گیا۔ ۔ ۔ "کیا کر رہے ہو' اس مصیبت میں بھی تم۔" وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔

گولیاں برسانے والے دور نکل گئے تھے اور لوگ جلدی جلدی اٹھ کر ادھر ادھر ہو رہے تھے۔ مرنے والوں کی لاشوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جا رہا تھا اور دور کہیں سے پولیس کے سائرن کی آواز قریب آ رہی تھی۔

وہ کپڑے جھاڑ کر اٹھا۔

اب تو یہ روز ہی کا معمول تھا۔ کسی شاپنگ سینٹر میں' کسی بھی رش والی جگہ' اچانک کسی طرف سے وہ نمودار ہوتے اور تڑ تڑ کی آوازوں کے ساتھ دو چار زمین بوس ہو جاتے۔ لوگ افراتفری میں ادھر ادھر بھاگتے' زمین پر لیٹ جاتے تڑتڑ کی آوازیں کسی اور طرف نکل جاتیں۔

زندگی کا لمحہ وہی تھا اور جس میں کوئی سانس لے رہا تھا۔ اگلے لمحے کی کس کو خبر تھی؟ کسی کو معلوم نہ تھا کہ موت کہاں ہے اور کس روپ میں ہے؟

کون کیا ہے؟

اور اب تو شاید یہ بھی کہ میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟ ایسے میں مرشد کا ایک عرصے بعد یوں مل جانا بھی عجیب تھا۔ مدت ہوئی مرشد اپنی مرضی سے شہربدر ہو گیا تھا۔ اس نے بھی اس دوران جینے کے کئی نئے ڈھنگ سیکھ لئے تھے۔

وہ تو دن ہی اور تھے' جب وہ اور مرشد گھنٹوں شہر کی سڑکوں پر شب گردی کرتے۔ ان کا مکالمہ کئی کئی

روز جاری رہتا۔ اسے یہ جاننے کی تمنا تھی کہ وہ کیا ہے؟ یہ سب کیا ہے اور وہ جو دور سرمئی دھند میں چھپا بیٹھا ہے وہ کون ہے اور کیا ہے؟

مرشد کبھی کبھی اپنے ساتھ اسے دھند میں دور تک لے جاتا۔ اس کے سوالوں کے کبھی ادھورے، کبھی مکمل جواب دیتا جیسے وہ اس سرمئی دھند میں بہت دور تک دیکھنے لگا ہے۔

اسی دوران ملازمت مل گئی۔ ہاتھ تھوڑا سا رواں ہوا تو سرمئی دھند سے باہر کی چیزیں بھی اچھی لگنے لگیں۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر آتے ہوئے بس میں روز ملتی وہ سانولی سی صورت اتنی اچھی لگی کہ وہ اکثر مرشد کی باتیں صرف سنتا ہی سمجھ نہ پاتا۔ مرشد کائنات کے ازلی مسائل پر گفتگو کرتے کرتے اسے غیر حاضر پا تو لمحہ بھر کے لئے چڑجاتا اور اسے مجبور کر اپنی دنیا میں لے آتا۔

سرمئی دھند میں چلنے کا اپنا ایک ذائقہ تھا۔

لیکن سانولے سلونے چہرے کی بھی اپنی ایک لذت تھی جس نے آہستہ آہستہ اسے حصار میں جکڑ لیا۔ چند ہی ماہ میں شادی ہو گئی۔ اب زندگی کے نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ بچوں کی پیدائش ان کی تعلیم، گھر کی زیبائش رفتہ رفتہ مرشد اور اس کے درمیان ایک نامعلوم اور ان دیکھا فاصلہ بڑھنے لگا۔ سرمئی دھند میں چلنے کا مزا تو آتا لیکن باہر کی تیز روشنی نے آنکھوں کو اس طرح خیرہ کر دیا کہ سرمئی دھند میں گزرے چند لمحے، بس لمحے کی یاد ہی رہ جاتے۔

"میں کون ہوں؟" اس کا سوال اور مرشد سے مکالمہ مختصر سے مختصر ہونے لگا۔

چند برس عجیب کشمکش میں گزرے۔ ایک طرف سرمئی دھند کا تحیر اور مرشد کے ساتھ مکالمے کی لذت اور دوسری طرف بیوی بچے، دفتر آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تیز روشنی منظر کو واضح کرتی۔

"میں کیا کروں؟" وہ مرشد سے پوچھتا۔۔۔ "دنیاداری کا طریقہ نہیں درویشی کا ظرف نہیں۔۔۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

مرشد ہنستا۔۔۔ "کسی ایک طرف ہو جاؤ۔"

کسی ایک طرف ہونے کی شدید تمنا تو تھی لیکن کسی ایک طرف ہونا اتنا آسان نہ تھا۔

بس یہ ہوا کہ سرمئی دھند کا تحیر اور مرشد سے مکالمہ بے مزہ ہونے لگا۔ تیز روشنی میں بھی منظر دھندلایا رہتا پھر جوں جوں بچے بڑے ہوتے گئے اور ان کی ضرورتیں بڑھتی گئیں مرشد سے مکالمے میں کمی آتی گئی۔ سرمئی دھند میں دور تک چلنے کی لذت بس ایک خواب، ایک ادھوری تمنا بن گئی۔

تیز روشنی کے منظر کھلنے لگے۔ اردگرد کی چیزیں چمکنے لگیں اور اس کی دسترس میں آنے لگیں۔

بیوی ایک طویل عرصے تک جو کچھ نہ کرا سکی وہ بچوں نے دنوں میں کروالیا۔

مرشد خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی سرمئی دھند کا اسرار جاگتا تو وہ مرشد سے کہتا "اب تو سب خواب سی لگتا ہے۔"

مرشد بالیدگی سے سرہلاتا۔ "خواب کی بھی ایک لذت ہے لیکن افسوس تم اس سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہو۔"

مرشد شائد ٹھیک ہی کہتا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب وہ خوابوں کی لذت سے سرشار تھا۔ سرمئی دھند میں دور

اورنگ زیب قاسمی

اتر جانے کی خواہش اسرار کی لہریں کر اس کے اندر گدگداتی تھی لیکن اب یہ خواب عجیب طرح کی بے کلی پیدا کرتے۔ سرمئی دھند کا اسرار اجنبی لگتا ایک دھند جس میں مرشد بھی معدوم ہوا جا رہا تھا۔

ایسی ایک دھندلی شام، جب ایف ڈی ایل پر دستخط کرنے کے صلے میں اس کا بٹوہ بہت بھاری ہو گیا تھا۔ بچوں اور بیوی کے لئے ڈھیر ساری چیزیں خرید کر لوٹ رہا تھا کہ مرشد نے دفعتاً اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔۔۔ "میں شہر بدر ہو رہا ہوں۔"

وہ جو بچوں کی قلقاریوں اور بیوی کے مترنم قہقہوں کی پھوار میں سرشار تھا چونک پڑا۔۔۔ "کیا۔۔۔ لیکن کیوں؟"

مرشد نے لمحہ بھر توقف کیا پھر بولا۔۔۔ "میں شہر بدر ہو رہا ہوں۔ اس شہر سے جہاں کے لوگ زوال کے نشے میں سرشار ڈھلوان سے لڑھک رہے ہیں اور اس لڑھکنے میں بھی انہوں نے لذت کا پہلو تلاش کر لیا ہے۔ میں اس شہر سے دور نکل جانا چاہتا ہوں میری یہاں کیا ضرورت ہے؟"

مرشد نے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا۔۔۔ "تم بھی اب خاصے دنیا دار ہو گئے ہو تمہیں بھی اب میری ضرورت نہیں۔۔۔"

"لیکن" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"نہیں" مرشد مسکرایا۔ "میں اپنی خوشی سے شہر بدری قبول کرتا ہوں۔۔۔"

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا مرشد لمبے ڈگ بھرتا یہ جا وہ جا۔

تو مرشد شہر بدر ہو گیا۔ رات کو لیٹے لیٹے اسے لمحہ بھر کے لئے تاسف ہوا۔ دل میں ٹیس سی اٹھی اور آنکھیں بھر آئیں۔ صبح اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بیوی نے پوچھا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

"کچھ نہیں" وہ آہستہ سے بولا۔ "میں ٹھیک ہوں۔" لیکن اسے لگ رہا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں۔ اندر ہی اندر کچھ گڑ بڑا گیا ہے۔ دن بھر فائلوں پر دستخط کرتے مرشد بار بار یاد آیا۔

یہ صورت کئی دن رہی پھر آہستہ آہستہ مرشد دور ہو تا گیا۔ شروع میں مرشد کی شہر بدری کا منظر بڑا اداس تھا پھر یہ منظر ایک بڑے کینوس پر پھیل گیا اور سمٹنے لگا اور پھر سمٹ کر کینوس کے کسی کونے میں معدوم ہو گیا۔

اس دوران اس کی اپنی زندگی میں بڑی تبدیلیاں آئیں چھوٹے سے کرائے کے گھر سے بڑا اپنا گھر۔ ترقیاں، بنگلے، لیکن شہر کے ہنگامے اور ہی طرح کے ہوتے گئے۔ موت کا کھیل محدود دائرے میں شروع ہوا اور پھر سارے شہر میں پھیل گیا۔ تڑ تڑ کرتی گولیاں اور دیکھتے ہی دیکھتے لاشوں کا ڈھیر۔

اب کبھی کبھی مرشد کی باتیں یاد آتیں۔ زوال کا بھی ایک عجیب نشہ ہے جس قوم کو چڑھ جائے وہ ڈھلوان پر لڑھکنے میں بھی لذت محسوس کرتی ہے۔ موت کے اس کھیل میں بھی اسی طرح کی لذت پیدا ہو گئی تھی۔

وہ سوچتا مرشد جانے کہاں ہو گا۔ سرمئی دھند تو اب خواب سے بھی نکل گئی تھی۔ شہر کی فضا اب گرد آلود تھی یا تازہ لہو کی مہک تھی جو شہر کے کسی نہ کسی حصے میں ہمیشہ موجود رہتی۔ اس گھٹی اور خوف سے بولتی فضا میں مرشد کی ضرورت بھی کیا تھی، سوائے عرصے بعد اسے دیکھ کر کوئی خوشی نہ ہوئی۔

شہر کے کسی بھی چوک میں اس طرح کا واقعہ اب کوئی انہونی بات نہ تھی۔ تڑ تڑ کی آواز کے ساتھ ہی دو

چار زمین پر گرتے۔ لوگ ایک دم زمین پر لیٹ جاتے یا کسی اوٹ میں پناہ لیتے۔ چند لمحوں کے بعد تڑتڑ کی آوازیں دور ہو جاتیں اور زندگی کا دریا پھر اسی جوش سے لہریں مارنے لگتا۔ لوگ ایمبولینس میں رکھی لاشوں کو دیکھ کر اپنے بچ جانے کا شکر ادا کرتے اور پھر کسی اگلے چوک پر وہی منظر۔

موت کے اس کھیل میں مرشد کی اس بے درد ہنسی اور کھکھلاہٹ نے اسے لمحہ بھر کے لئے جھنجھوڑ دیا۔ "تو تم آگئے ہو" مرشد مسکرایا۔ "میں آیا ہوں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ شہر کا کیا حال ہے اور زوال کا نشہ کیسے سرچڑھ رہا ہے اور ابھی کھائی تک پہنچنے میں کتنا فاصلہ باقی ہے لیکن پہلے تم بتاؤ تم کس حال میں ہو؟"

اس نے شانے اچکائے۔ "ٹھیک ہی ہوں۔"

دونوں آہستہ آہستہ بازار کی طرف چل پڑے۔ بازار زندگی سے لبالب بھرے ہوئے تھے۔ وہ بولا۔ جہاں کچھ دیر پہلے موت بال کھولے ناچ رہی تھی اتنی جلدی اتنا اطمینان اور اتنا سکون؟"

مرشد مسکرایا۔ "زوال کی بھی اپنی ایک قوت ہوتی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"جب کسی قوم کو زوال میں لذت آنے لگے تو زوال اپنے اندر ایک قوت پیدا کر لیتا ہے اور کھائی میں گرنے کا عمل سست ہو جاتا ہے' معلوم ہے پھر کیا ہوتا ہے۔"

"کیا" اس نے تجسس سے مرشد کی طرف دیکھا۔

"گرنے کی بلندی اونچی ہو جاتی ہے اور اتنی اونچی کہ نیچے گر کر کچھ بھی نہیں بچتا۔"

وہ کچھ بھی نہیں بولا۔ دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔

رات گئے گھر لوٹا تو بیوی خاصی پریشان تھی۔ "اتنی دیر۔"

"بس" وہ شانے ہلا کر رہ گیا۔ اسے کیا بتاتا کہ مرشد واپس آگیا ہے اور اس سے ایک ہی ملاقات نے کتنے ہی سوئے ہوئے جذبوں کو لمحہ بھر میں جگا دیا ہے۔ مدت ہوئی مکالمہ کرنا اور سرمئی دھند کا خواب' خواب ہو گیا تھا لیکن مرشد سے چند گھنٹوں کی ملاقات نے اس کے اندر مدتوں سے محو خواب کئی سوالوں کو پھر سے زبان دے دی۔

اگلی صبح اسے بیوی اجنبی سی لگی۔

ناشتہ کرتے ہوئے بیوی نے کہا۔ "رات تم صحیح طرح سوئے نہیں کچھ اکھڑے اکھڑے سے لگ رہے ہو۔"

وہ چپ رہا۔

"چھٹی کر لو۔"

بچوں کو اسکول اتار کر جونہی دفتر والا موڑ مڑا۔ مرشد ساتھ والی سیٹ پر آبیٹھا اور بولا۔ "صبح جب لوگ گھروں سے نکلتے ہیں تو خوفزدہ نہیں ہوتے۔"

"شروع شروع میں ہوتے تھے۔" ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے جمائے اس نے کہا۔ "اب عادی ہو گئے ہیں۔ کوئی واپس آگیا آگیا نہ آیا تو اطلاع۔"

مرشد نے سرہلایا۔

سڑکوں پر مست خرام ہجوم کسی بھی انہونی سے بے نیاز وقت کے بہاؤ میں بہا چلا جا رہا تھا۔

اورنگ زیب قاسمی

اس نے کہا "اب تم ہی بتاؤ اس تیزی اور بہاؤ میں کون اپنے اندر اتر سکتا ہے۔"

مرشد کچھ دیر چپ رہا پھر بولا۔ "باہر اتنی تیز روشنی ہو تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں' اتنی کہ اندھیرے اور اجالے میں فرق محسوس نہیں ہوتا اور اندر کے منظر تو روشن آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے۔"

وہ کچھ نہ بولا۔

کئی دن بعد اس نے مرشد سے پوچھا۔ "مجھے لگتا ہے کہ کہیں آس پاس ہی بہت اندھیرا ہے۔"

مرشد مسکرایا۔ "تو تمہارے اندر کا پتھر پگھلنے لگا ہے۔"

وہ مایوسی سے بولا۔ "پگھل بھی گیا تو کیا میں شہر سے نکل کر جاؤں گا بھی کہاں؟"

"صحرا میں" مرشد نے شہر کی فصیل کی طرف اشارا کیا۔ "اس فصیل سے پرے صحرا ہے اور صحرا میں کبھی گھٹن نہیں ہوتی۔"

"لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔"

مرشد اس کے تذبذب کی تہہ تک پہنچ گیا۔ "اس کے لئے شہر بدر ہونا پڑے گا۔ جس دن تمہارے اندر کا پتھر پگھل گیا تمہارے اندر خود ہی یہ جرات پیدا ہو جائے گی' لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ اب تم پھر سوچنے لگے ہو۔"

یہ بات واقعی عجیب تھی کہ کئی برسوں بعد اس نے پھر سوچنا اور غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ شہر کا نظارہ اب اسے مصنوعی سا لگنے لگا تھا۔

"ضرور کہیں گڑبڑ ہے۔" اسے اکثر خیال آتا۔ "ایک دن جب اندھیرا اترے گا تو۔"

اس خیال ہی سے جھرجھری آجاتی۔

ایک دن اس نے مرشد سے پوچھا۔ "اندھیرا اتر آیا تو کیا بنے گا؟"

"کچھ نہیں" مرشد بولا۔ "زوال کا نشہ برداشت کی زبردست قوت پیدا کر دیتا ہے۔"

وہ چپ رہا لیکن اسے لگ رہا تھا کہ خود اس کی مدافعت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ شک اور بے یقینی اس کے اندر گھر بنا رہی ہے۔

مرشد سے ذکر کیا تو وہ بولا۔ "یہ اچھا شگون ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا نشہ اتر رہا ہے۔"

"لیکن اگر اندھیرا۔" وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔

مرشد نے شہر کی فصیل کی طرف اشارہ کیا۔ "صحرا ماں کی گود کی طرح ہے جہاں سب کو پناہ ملتی ہے۔"

مگر اندھیرے کا خوف اس کے دل سے نہ نکلا اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "کسی دن یہ سب کچھ سیاہ ہو جائے گا۔"

اور ایک صبح جب وہ دفتر جا رہا تھا بڑے چوک میں' اچانک اندھیرا شہر میں اتر آیا دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہر شے اندر باہر سے سیاہ ہو گئی لیکن وہ ذرا دیر پہلے مرشد کے ساتھ شہر کی فصیل عبور کر کے صحرا میں اتر گیا تھا۔

سارے رشتے' آوازیں۔ ہنگامے دور رہ گئے۔ اس کی بیوی روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ گھر سے تو ٹھیک ہی گئے تھے مگر گیارہ بجے اطلاع آئی کہ ۔ ۔ ۔" اس کا ایک ساتھی دوسروں کو بتا رہا تھا "دفتر سے پہلے والے چوک میں جب تڑتڑ کی آوازیں آئیں تو ہم سب ڈر کر ادھر ادھر ہو گئے لیکن اسے جانے کیا سوجھی کہ گاڑی سے اتر کر بالکل ان کے سامنے کھڑا ہو گیا بس ۔ ۔ ۔!"

("سیپ" کراچی)

پہلا پتھر

اس دن فاطمہ کے گھر پہ پہلا پتھر پڑا۔

مگر اس سے پہلے امام صاحب نے مڑ کر فاطمہ کی طرف دیکھا اور احمد سے کہا۔۔ "گھر آپ کو مل جائے گا۔ اس کی آپ فکر نہ کریں۔" اور اپنی طرف سے بات ختم کر کے پھر سے گاڑی کی ڈکی سے ایک کے بعد ایک کر کے چیزیں نکالنے اور زمین پہ بچھے تولیے پہ رکھنے لگے۔

احمد کچھ دیر چپ کھڑا ان کے مصروف ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بھی مڑ کر فاطمہ کی طرف دیکھا۔ برستی بارش میں وہ نیلے رنگ کا رین کوٹ پہنے درخت کے نیچے چپ چاپ کھڑی تھی۔ ٹیکسی والا انہیں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ احمد نے اسے کہا بھی تھا کہ وہ انتظار کرنے کے پیسے دے گا مگر وہ رکا نہیں۔ اس کے ساتھ جہاں سے جہاں تک کا طے ہوا تھا اس سے آگے وہ جا نہیں سکتا تھا۔

احمد نے پھر امام صاحب سے کہا۔۔۔ "تو صاحب پھر کب پتہ چلے گا؟"

"آپ ایسے کریں۔ اپنا فون نمبر مجھے دے دیں۔ میں خود ہی آپ کو بتا دوں گا۔" انہوں نے احمد کی طرف دیکھے بنا کہا۔

احمد فاطمہ کے پاس گیا اور اور اس سے کاغذ پہ ہوٹل کا فون نمبر لکھوا کر امام صاحب کے پاس واپس آیا اور پرزہ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ انہوں نے کاغذ کی طرف دیکھے بنا اسے اپنی جیب میں رکھا۔ پھر سیدھے کھڑے ہو کر گاڑی کا بوٹ بند کیا اور اور احمد کی طرف رخ کر کے "السلام علیکم" کہا اور تولیے پہ رکھی چیزیں سمیٹ کر گھر کے اندر چلے گئے۔ احمد کچھ دیر کھڑا لال رنگ کے دروازے کی طرف دیکھتا رہا پھر پلٹ کر فاطمہ کے پاس آگیا "چلو۔۔۔"

"کیا ہوا؟" فاطمہ نے آہستہ سے پوچھا۔

"گھر مل جائے گا۔"

اور دونوں برستی بارش میں تیز تیز چلتے۔۔۔۔۔ اپنی اپنی سوچ میں گم۔۔۔۔ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف چلے گئے۔

گھر مل جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ بن بھی جاتے ہیں مگر ان کی مضبوطی کی ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔ کتنا ہی اینٹ پتھر کوٹ کوٹ کر ان کی بنیادوں میں بھر دیں، جب گرنے پہ آتے ہیں تو ریت کی دیواروں کی طرح گر جاتے ہیں۔ کبھی آندھی طوفان کاغذی محلوں کی طرح ایک پھونک میں اڑا دیتے ہیں اور کبھی بنا کسی طوفان، کسی

اورنگ زیب قاسمی

اشارے کے، چپ چاپ بیٹھ جاتے ہیں۔ فاطمہ کا مرمر کا بنا ہوا گھر اسی طرح کھڑا تھا۔ اس کے اندر شیشے کی طرح چمکتی سجی سجائی چیزیں ویسے ہی چپ چاپ اپنی اپنی جگہ پہ تھیں جو پہلے خود اس کے اپنے اندر کی خوشی اور حرارت سے زندہ تھیں، اب بے جان اور ازلی، ابدی سکوت میں گم ہو چکی تھیں۔ اس ہی خانے سے گھبرا کر اس نے احمد سے کہا تھا "مجھے یہاں سے لے چلو۔۔" اور وہ اسے واقعی وہاں چھوڑ کر آگے چلا گیا تھا۔ اب فاطمہ کو تنہا اپنے ہی ساتھ، اپنی خاموشی اور رنج کے ساتھ رہنا تھا۔ زندگی میں انسان کو کب کب اور کیسے کیسے دکھ ملتے ہیں اور ہر بار یہی لگتا ہے کہ بس اب اس کے بعد کچھ باقی نہیں رہا۔ زندگی ختم ہو گئی ہے لیکن پھر ہر بار کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ کچھ دیر آنسو بہا کر ہم پھر سے اس جینے کی دوڑ میں شریک ہو جاتے ہیں مگر جب کوئی افسردگی ڈیرا ڈال کے بیٹھ ہی جائے۔۔ جینے ہی جینے بھی نہ دے۔۔ جینے کی دوڑ دوڑیں تو ساتھ ساتھ سائے کی طرح دوڑے۔۔ کبھی پل بھر کو پیچھے رہ کر سوچنے پہ مجبور کرے کہ زندگی سے منسا ہوا تو کیا ہوا؟ اور پھر پل بھر کے بعد ہی پھر سے برابر آئے اور زندگی اپنے ہاتھ میں لے کر بے اختیار کر دے۔۔ کچھ ایسی ہی افسردگی تھی جس نے فاطمہ کو ولایت کے اس دور افتادہ کونے میں درختوں پہ چھائی جنگلی بیلوں سے ڈھکی ایک بستی میں چھپ جانے پہ مجبور کیا تھا۔ احمد نے دو ایک بار اسے کہا بھی کہ آخر وہ کیوں اس کے ساتھ جانے پہ تنہا رہنے کو ترجیح دے رہی ہے اور اگر تنہا ہی رہنا ہے تو پھر گھر پہ ہی کیوں نہیں؟ اور فاطمہ نے ہر بار اس کی بات پہ دل ہی دل میں کہا تھا۔۔ کیسا گھر؟ اور چپ رہی تھی مگر جب وہ جواب کے انتظار میں اس کے سامنے کھڑا ہی رہا تو فاطمہ نے کہا۔۔ "پتہ نہیں مگر مجھے یوں لگتا ہے میں نے اپنا آپ کہیں کھو دیا ہے۔ میں اسے پانا چاہتی ہوں۔۔" اور یہاں سے پھر وہی بحث شروع ہو گئی تھی جو کب سے جاری تھی اور جس کا کوئی نتیجہ اس کے سوا نہیں نکلتا تھا کہ دونوں ہی بول بول کر تھک جاتے، اور پھر بھی ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھانے سے قاصر رہتے، اور دونوں ایک عجیب سی بد مزگی دونوں کے درمیان فاصلہ بن کے کھڑی ہو جاتی، اور دونوں ہی ایسے دنوں میں موقعے موقعے سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور اندر ہی اندر اپنی سوچوں کے پیچھے بھاگتے رہتے۔

فاطمہ سوچتی۔۔ احمد آخر میری بات سن کر بھی کیوں سمجھتا نہیں اب؟

اور احمد سوچتا۔ شاید میں نے اس کو کھو دیا ہے۔۔ کیا اس کو کوئی بھیت لے گیا ہے؟ اس قدر چپ کیوں ہے یہ؟ اور خاموشی اور بھی گہری ہوتی چلی جاتی۔

اس دور افتادہ جنگل میں وہ کیا لینے آئی تھی! اس کو خود بھی معلوم نہیں تھا مگر امید سی پھر بھی تھی کہ شاید چند دن تنہا رہ کر وہ اس گتھی کا کوئی ایک سرا تو ڈھونڈھ ہی لے گی۔ شاید عورتیں جسم کے لوتھ سے جلد ہی نکل آتی ہیں اور پھر ذہنی رفاقتوں کے باغ ڈھونڈتی ہیں۔ کیا چیز تھی جو اس کی زندگی سے منسا ہو گئی تھی۔ وہ عورتوں کو بچوں کے ہاتھ تھامے، قریب سے گزرتے دیکھتی تو ٹھٹک کر کھڑی ہو جاتی۔ آتی جاتی عورتوں کو بہت غور سے دیکھتی۔ خریداری کرتی عورتیں، بھاؤ تاؤ کرتی عورتیں، بازاروں میں گھومتی پھرتی عورتیں، خریداری کے تھیلے اٹھائے دھکے کھاتی عورتیں، شوہروں کے پیچھے چلتی عورتیں، بولتی عورتیں، چپ چاپ عورتیں۔۔ اور وہ ان کو غور سے دیکھتی، قریب ہو کے دیکھتی اور سوچتی ان کا فلاؤنٹس بیٹھ گیا ہے؟ ان کی زندگیاں کس سرچشمے سے حیات کا رس لیتی ہیں؟ کیا مطمئن ہیں؟ خوش ہیں؟ ان کے اندر جو ان کا اپنا بیٹھا

ہے وہ کیا ان کے باہر کے جیسا ہی ہے؟ یا ان کے بھی کچھ جن ایسے ہیں جن سے یہ اندر ہی اندر گھتم گھتا رہتی ہیں؟ یہ اپنی زندگی اپنے لئے جی رہی ہیں یا کسی اور کی خاطر؟ یہاں ولائت میں بھی اس نے ایک نظارہ بہت غور سے دیکھا تھا۔ گہرے رنگوں کے کفتان یافراک یا پچھی پتلونیں چھوٹی چھوٹی کمریں پہنے عورتیں ' بالوں پر اسکارف باندھے اپنے گھروں کے چھوٹے چھوٹے باغوں میں چھوٹی چھوٹی کھرپیوں سے پھولوں ' پودوں کی نگہداشت کرتی نظر آتیں اور وہ ان کے اس اطمینان اور شانتی کا راز جاننے کو بے چین ہو جاتی۔ شاید ان کی جذباتی اور عملی زندگیاں الگ الگ خانوں میں بڑے منظم طریقے سے رکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ شاید اپنی خواہشوں کو ادھورا رکھنے میں وہ یقین نہیں رکھتیں۔ شاید جذبات کو اپنی زندگی پر مسلط نہیں ہونے دیتیں۔ جو چاہتی ہیں وہ حاصل بھی کرتی ہیں اور کسی کو چھین لے جانے کا حق نہیں دیتیں اور جو نہیں چاہتیں وہ ان پر کوئی مسلط نہیں کر سکتا۔ ۔ ۔ شاید ان کے اس اطمینان اور سکون کا یہی راز ہو! تو پھر میں ایسے کیوں نہیں کر سکتی؟ میری زندگی کیوں بوڑھی عورت کی بے رس چھاتیوں کی طرح لٹک کر رہ گئی ہے؟؟ مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آتا۔

احمد نے ایک بار اسے کہا تھا۔ ۔ ۔ "کس چیز کی کمی ہے تمہیں؟ کیا نہیں دیا میں نے تمہیں؟ مجھ میں کچھ کمی تھی کیا؟؟"

اور وہ چپ اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ بس یہی دو سوال ؟ کھانا پینا روپیہ پیسہ ' اوڑھنا پہننا اور اپنے موڈ اور مزاج اور خواہش کے تحت اپنی جسمانی بھوک مٹا لینا۔ ۔ ۔ ۔ بس یہی دو باتیں ؟ ؟ اور اس نے دل میں کہا تھا۔ ۔ ۔ ہاں احمد ' روپیہ پیسہ بھی دیا تم نے۔ ۔ ۔ ۔ جسم کی لذت بھی دی ہے تم نے۔ ۔ ۔ ۔ مگر یہ ساری چیزیں مجھے اس وقت ملیں جب تم نے چاہیں تم بھی یہی سوچتے ہو کہ بس یہی دو باتیں عورت کے لئے کافی ہیں؟ بس یہی اس کی ضرورت ہے؟ نہیں سوچتے کہ وہ بھی انسان ہے۔ دل رکھتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ذہن رکھتی ہے دوستی ' ساتھ اور ذہن کی سنگت بھی چاہیے اسے احمد۔ ۔ ۔ ۔ چاہتی ہے کہ احساس کے جنگل میں وہ تنہا نہ رہ جائے۔ ۔ ۔ ۔ چاہتی ہے کہ کوئی پیر سے پیر ملا کر ساتھ چلے۔ ۔ ۔ ۔ لوگ بیوی کو صرف بیوی سمجھتے ہیں۔ انسان نہیں سمجھتے۔ ایک فرد کی پہچان نہیں دیتے۔ کیا تم بھی؟ احمد کیا تم بھی؟ مگر اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ صرف ایک نظر دیکھ کر رہ گئی۔ اگر وہ جانتا تو یہ سوال ہی کیوں کرتا ؟ اس بے نام سے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے ہال میں لگے آئینے میں اپنا آپ دیکھا تھا اور ہنس دی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ایک معمولی عورت کا ایک غیر معمولی فیصلہ!! اور میرے ہاتھ میں ہے کیا؟ کیا میں خود کی دیکھ بھال کر لوں گی! اور کوئی ایسی خوبی بھی تو نہیں مجھ میں! پھر کیا سوچا ہے میں نے ؟ اور آئینے نے کہا تھا "تنہائی"

"تنہائی!! وہ کچھ دیر تک کر سوچتی رہی تھی۔

"گھر میں رہ لوں گی؟"

تو پھر جب تم فیصلہ کر لینا تو میرے پاس آجانا۔ ۔ ۔ ۔ آئینے سے جھانکتے عکس نے جیسے سرگوشی کی تھی۔
مگر پھر اس کے بعد وہ آئینے سے بچ بچ کر نکلتی رہی تھی۔ کیا فیصلے کا دن قریب آرہا تھا؟ کبھی لگتا ایک لیمپ ہو ' زندگی نہ ہو۔ ۔ ۔ ۔ جس کی بے سکون ' بے رحم فضا میں وہ اپنے آپ کو ختم کرنے کی ناکام کوششوں میں ہو۔ کبھی سوچتی وہ سائبیریا تو میں پیچھے چھوڑ آئی ' پھر نجات کیوں نہیں؟ کہیں میرے فیصلے غلط تو ثابت ہو نہیں رہے؟

پھر دنوں کے بعد ایک گرم دن آیا۔ شام بھی گرم ہو رہی تھی کہ بارش آگئی۔ فاطمہ دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑی کے پاس کھڑی گرتی بارش دیکھتی رہی۔ بالکل خالی ذہن۔ ۔ ۔ ۔ وہ ساری راتیں جا چکی تھیں جب وہ رات رات بھر پڑھتی رہتی تھی۔ کبھی پڑھتے پڑھتے ایک دم چونک جاتی۔ ۔ ۔ ۔ جیسے باغ کے رستے پر چلتا کوئی اس کی طرف آرہا ہو۔ شاید احمد! شاید اپنے کاروباری دنوں کی مصروفیت کو روک کر اس نے بھی کوئی فیصلہ کیا ہو۔ شاید وہ آخر کار جان گیا ہو۔ شاید وہ درمیان آئے فاصلوں کو پہچان گیا ہو۔ ۔ ۔ ۔ شدت کے انتظار کے بعد وہ کتاب اپنے سینے پر اوندھا کر رکھ دیتی۔ کتاب یونہی اس کے سینے پر پڑی رہتی۔ رات گزرتی رہتی دور وقفے وقفے سے کوئی ٹرین گزرتی تو رات کی خاموشی تھر تھرا کر رہ جاتی۔ باہر اچانک کوئی کتا بھونکنے لگ جاتا۔ کوئی گاڑی گزر جاتی۔ کوئی رات کا پنچھی اپنی تنہائی پر روتا ' ہوکتا اس سناٹے میں کہیں گم ہو جاتا اور وہ سوچتی۔ ۔ ۔ ۔ کیا سوچتی؟؟

یونہی کھڑکی کے پاس کھڑے ' گرتی بارش کا تماشا کرتے اچانک باہر کا منظر دھندلا گیا۔ کھڑکی کا شیشہ اس کی سانس کی حرارت سے نم ہو گیا تھا اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے لئے فیصلہ کر دیا ہو ' کچھ دیر وہ یونہی ' ساکت کھڑی رہی ' پھر اس نے انگلی سے اس پر لکھا۔ ۔ ۔ "چپ" ۔ ۔ ۔ اور اسی لمحے کسی نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ وہ جیسے ایک سکتے کے عالم میں اپنی جگہ پر جامد ہو گئی۔ پھر ایک سیلاب کی طرح ہزاروں خیالات آگے پیچھے دوڑتے اس کے ذہن میں آئے۔ یہ لمحے بھر کی کیفیت گزرتے ہی اس کا پورا جسم ایک جھٹکا کھا کر یوں آگے بڑھا جیسے وہ ابھی بھاگتی ہوئی جاکر ' دروازہ کھول کر ' آنے والے سے لپٹ جائے گی۔ جیسے اسے یقین ہو کہ آنے والا وہی ہے۔ ۔ ۔ کوئی اور نہیں! جاتے جاتے دیوار کے آئینے میں اسے اپنا عکس نظر آیا ' اس کا چہرہ سفید ہو کر بھیانک نظر آرہا تھا۔ دیوار کا سہارا لے کر اس نے زور سے سانس لی ' پھر سیڑھیاں اتر گئی۔ سامنے امام صاحب کھڑے تھے۔

"جی فرمایئے۔" اس نے دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میں نے سوچا آپ سے پوچھوں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ۔ "

فاطمہ نے کہا "جی شکریہ"

فوراً" بولے "نہیں صاحب تکلف کی ضرورت نہیں۔ آپ کو روپے پیسے کی ضرورت ہو تو مجھے بتایئے۔ میں حاضر ہوں خدمت کے لئے۔ ۔ "

فاطمہ نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر اک تھوڑا سا اسے بند کرنا چاہا۔ پھر کہا۔ ۔ "جی نہیں۔ آپ کا بہت شکریہ۔ ۔ کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ۔ "

"پھر بھی صاحب۔ ۔ اگر کبھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ بلا تکلف مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔ میری گھر والی ذرا جاہل اور بے وقوف ہے وہ ایسی باتوں کو نہیں سمجھ سکتی مگر آپ مجھے سے بلاتکلف کوئی بھی کام لے سکتے ہیں۔ ۔ " اب کے انہوں نے بہت نڈر انداز میں فاطمہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی اور اپنا جملہ ختم کرتے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

فاطمہ نے کہا "جی بہتر۔ ۔ " اور پیچھے ہٹ کر خدا حافظ کہتے ہوئے زور سے دروازہ بند کر دیا۔
اچانک امام صاحب کی عنایات میں اضافہ ہو گیا اور وہ ایک حصار سا جو اس نے اپنے آس پاس باندھ کر

اورنگ زیب قاسمی

محفوظ ہو جانے کی کوشش کی تھی اس میں رخنے پڑنے لگے۔ ایک صبح اس نے دودھ کی بوتلیں اٹھائیں تو ساتھ میں کاغذ کے ایک تھیلے میں کچھ پھل بھی رکھے تھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کون رکھ گیا ہو گا۔ پہلے اس نے یہی سوچا کہ اٹھا کر اندر لے جائے۔ پھر سوچا کہ اس نے تو نہ کسی سے کہا تھا لانے کے لئے اور نہ ہی کسی نے کہا تھا کہ بھیجیں گے۔

وہ تھیلا یونہی دروازے کے پاس چھوڑ کر جانے لگی تو باڑھ کے پاس سے امام صاحب کی آواز آئی۔ "میں آپ کے لئے لایا تھا صاحب -- بازار گیا تھا آج آپ سے پوچھنا یاد ہی نہ رہا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ بہرحال یہ ایک چھوٹی سی چیز خود ہی لے آیا۔"

فاطمہ نے کہا "شکریہ - ویسے بھی مجھے ضرورت تو نہیں تھی۔ فون کر دیتی ہوں تو دکان والا خود ہی لا کر چھوڑ جاتا ہے۔ بہرحال آپ بتا دیجئے کتنے کے آئے ہیں۔ پیسے بھیج دوں گی آپ کے پاس۔"

"پیسوں کی کیا ضرورت ہے صاحب۔ اس کو آپ میری طرف سے ایک حقیر تحفہ سمجھیں۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ صرف پھلوں کا تھیلا اٹھا کر اندر چلی آئی دوپہر کے بعد وہ ان کے گھر گئی اور ان کی بیوی کو بتا کر پیسے دے دیئے۔

وہ سیدھی سادی عورت پہلے تو کچھ نہیں پھر پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگی -- "آپ تھوڑے دن کے لئے آئے ہیں۔ مہمان ہیں ہمارے۔ آپ ہیں بھی اکیلے اور تو کوئی خدمت ہم آپ کی کر نہیں سکتے۔ مزدور آدمی جو ہوئے۔ ایک یہ چھوٹی سی چیز ہی آپ قبول کر لیں۔ اگر امام صاحب میرے سے ذکر کرتے تو میں کوئی اور اچھی چیز آپ کے لئے لیتی۔ یہ پھل بھی کوئی دینے کی چیز ہوتی ہے --؟"

فاطمہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھی ان کی باتوں میں دلچسپی لینے کی کوشش کرتی رہی۔ بہت سیدھی سادی عورت تھی جو اپنی آزاد کشمیر کی ساری روایتوں کو یہاں ولائت میں بھی زندہ رکھے ہوئے تھی۔ بچوں کے سر میں جوئیں بھی تھیں۔ سال کے بعد روتے دھوتے ایک بچہ بھی پیدا کر دیتی تھیں۔ چھڑی لے کر بچوں کو مارنا' پھر بعد میں خود ہی جوؤں کی سکائی بھی کرنا بچوں کو مارنے کے قصے ہنس ہنس کر سنانا اور اپنی گئی گزری صحت کا ماتم -- سارے ہی کام بڑے شدومد سے کرتی تھیں۔

فاطمہ چپ بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی اور دل ہی دل میں سوچتی رہی -- کیا یہ عورت خوش ہے؟ شاید خوش ہی ہے -- اس لئے کہ اس کی زندگی گنجلکوں سے خالی ہے۔ سیدھی' صاف سپاٹ سڑک کی طرح جس پر ساری گاڑیاں تانگے اور موٹریں' ایک ہی رخ پر چلتے ہوں دروازے سے نکلتے نکلتے فاطمہ نے پوچھا --

"تو آپ خوش ہیں؟ یہاں ولائت میں خوش ہیں؟"

تو وہ کہنے لگیں -- "خوشی کی آپ بات نہ کریں۔ آپ پھر کسی دن آئیں تو اس موضوع پر بات ہو گی۔"

فاطمہ ان کا جملہ سن کر ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی "کیوں -- تو خوش نہیں ہیں آپ؟"

جب آٹھ نو بچوں کو پالنا ہو اور گھر کا پورا کام خود ہی کرنا ہو اور میاں کو سوائے اذان دینے اور دوسروں کے بچوں کو کبھی کبھار پڑھانے کے کچھ اور کرنے کا نہ ہو تو خوشی کے بارے میں بھی کوئی سوچتا ہے ؟؟ پھر بھی

اورنگ زیب قاسمی

اللہ کا شکر ہے کہ کونسل کا کھاتے ہیں' پیتے ہیں اور چین سے رہتے ہیں' بچوں کو سکول میں فری ڈنر ملتے ہیں۔ پڑھائیاں فری ہیں - محلے پڑوس کی لڑکیوں کو اردو پڑھا کر کچھ پیسے بنا لیتی ہوں۔ شکر ہے اللہ کا۔ اچھی گزر بسر ہو ہی جاتی ہے --- اور پھر بات تو یہ ہے کہ اگر یہی خوشی ہے تو ہم بھی خوش ہیں ---"

فاطمہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا --- "بہت ہمت والی عورت ہیں آپ۔"

"ہمت والی تو آپ بھی ہیں۔ پردیس میں اکیلی رہ رہی ہیں۔ آپ کے شوہر کو آپ سے محبت نہیں یا آپ ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں ؟ خیر کوئی تو مجبوری ہو گی۔ اس طرح کے کام کوئی معمولی حالات والا تو کرتا نہیں ---"

فاطمہ نے غور سے ان کی طرف دیکھا تو وہ اب کچھ ایسی کم عقل اور سادہ لوح بھی نظر نہیں آئیں۔ اس نے خدا حافظ کہا اور اپنے گھر کی طرف آ گئی۔

تنہائی اور خاموشی کی دیوار ڈھے گئی تھی - صبح دم یا رات گئے باغ کے رستے پر پیروں کے نشان ابھرتے اور وہ امام صاحب کے سوال جواب' ان کی متجسس' کچھ کہتی ہوئی آنکھوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتی۔ جس روز وہ پھلوں کے پیسے دے کر آئی تھی اس سے اگلے ہی روز انہوں نے آ کر بڑے رعب سے دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک طرح سے اسے ڈانٹ دیا۔ "آپ نے یہ کیا کر دیا صاحب ؟ میں پھل اس لئے لے کر آیا تھا کہ آپ اکیلے ہیں۔ پتہ نہیں کھانے پینے کا کیا سلسلہ ہو گا۔ آپ نے بیوی کو پیسے دے کر اچھا نہیں کیا۔"

فاطمہ نے کہا "مگر میں نے پھلوں کے لئے آپ سے کہا ہوتا تو اور بات تھی۔"

"وہ ہی آپ کو پتا نہیں۔" انہوں نے فاطمہ کی بات مکمل ہونے کا انتظار نہیں کیا۔ "ہم لوگوں کی عورتیں جاہل ہوتی ہیں۔ آپ لوگوں کے جیسی پڑھی لکھی سمجھدار تو ہوتی نہیں۔ اناڑین ہوتا ہے ان کا --- سیدھی بات بھی الٹی ہو کر جاتی ہے اندر -----"

فاطمہ نے کہا "ٹھیک ہے ------ آئندہ کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو کہہ دوں گی --- خدا حافظ" اور دروازہ بند کرنے کے لئے دروازے پر زور ڈالا' یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کا پیر دہلیز پر رکھا ہے۔

دروازے کا زور پڑتے ہی انہوں نے پیر ہٹایا اور گھوم کر فاطمہ کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی دروازے پر ہاتھ رکھ کر اسے بند ہونے سے روک دیا۔ "ناراض ہونے کی ضرورت کیا ہے صاحب --- ہم تو آپ کے پڑوسی ہیں۔ اس ناتے سے آپ کو پوچھنے آ جاتے ہیں اور کوئی مطلب نہیں ہمارا۔" پھر ہاتھ ہٹایا اور ماتھے پر بل ڈال کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد کچھ دیر اس نے دروازہ بند نہیں کیا اور باہر باغ میں دیکھتی رہی جہاں ایک ووڈ پیکر چونچ مار مار کر درخت کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کو وہ سب بہت سہانا لگا۔ اس وقت صبح سے برستی بارش تھم گئی اور ایک دم جیسے چاروں طرف سناٹا پھیل گیا۔

سامنے گھروں کے دروازے بند' سڑک سنسان' برستی بارش میں تو لوگ برساتیاں پہنے آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ اب بارش تھمی تو جیسے سبھی غائب ہو گئے - اچانک اسے یوں لگا جیسے اس پوری کائنات میں بس وہی ایک تن تنہا باقی رہ گئی ہو۔ تنہائی پہلے بھی تھی۔ جب وہ اندر کی دنیا میں کھوئی باہر کی دنیا سے پھر بھی کندھا

بھرائے چل رہی تھی۔ تنہائی کا وہ احساس دلگداز تھا۔ ایک لذت تھی اس میں مگر اب جو تنہائی ابھری تھی اس میں اکیلے رہ جانے کا احساس اس شدت سے ابھرا تھا کہ وہ لڑکھڑا سی گئی۔ شاید یہ کوئی کمزور لمحہ تھا اور اندر کی تنہائی اس کے امتحان کے لئے اسی لمحے کی منتظر تھی --- کیا تھا؟ --- مگر کچھ تھا۔ ایک بے چینی سی اپنے اندر سے نکل بھاگنے کی تمنا۔ کہیں جا کر چھپ جانے کی خواہش۔ کوئی ساتھ' قربت' بدن سے بدن تک کا سفر --- منفی' مثبت ساری خواہشیں ایک سیلاب کی طرح اس کے اندر اتر آئیں۔ ہال میں لگے آئینے میں اس نے خود کو دیکھنا چاہا تو آئینے کی سطح صاف نظر آئی۔ کوئی دوسرا چہرہ' اس کا عکس سا تھی --- اس پر نہ ابھرا۔ خوفزدہ ہو کر اس نے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ دیئے اور دروازہ کھول کر بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ آسمان کھل گیا تھا اور تیز دھوپ چاروں طرف پھیل گئی ۔ نم گھاس پر پیر پڑتے ہی ایک ٹھنڈک پورے بدن میں پھیل گئی اور بخار جس نے اچانک اس کے دماغ کو اپنے پنجے میں لے لیا تھا اترنے لگا۔ وہ وہیں گیٹ کے پاس منڈیر پر بیٹھ کر تیز دھوپ میں سانس لیتی سڑک کو دیکھنے لگی۔ اس وقت ساتھ کے گھر سے ایک آدمی باہر نکلا اور بڑی قینچی سے گلاب کے پودوں کی فالتو ٹہنیاں کاٹنے لگا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی اور اٹھ کر قریب چلی گئی۔ یہ باہر کی دنیا سے رابطے کی خواہش تھی---- کسی دوسرے سے بات کرنے کی خواہش --- اس سے پہلے بھی وہ اکثر باغ کی دیکھ بھال کرتا نظر آیا تھا مگر سوائے آتے جاتے سر ہلا کر ایک دوسرے سے آگاہی کا ثبوت دینے کے کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ قریب جا کر پہلے تو اس نے روایتاً" موسم کی بات کی پھر باغ کے پھول پتوں کی تعریف کی۔ پھر اپنے باغ کی دگرگوں حالت کا ذکر اور اپنے عارضی قیام کا حوالہ اور جب دل کی دھک دھک اپنی عام حالت میں واپس آئی تو اس سے پوچھا کہ کیا وہ اس کے باغ کی گھاس بھی کاٹ دے گا؟

وہ ہولے سے ہنس دیا اور کہا " نہیں ۔"

فاطمہ نے کہا " اچھا کسی اور کو جانتے ہو جو یہ کام کر دے ---"

اس نے پھر مسکرا کر کہا " نہیں ۔"

" مگر میں مفت کام نہیں کراؤں گی ۔"

اس نے ہاتھ روک دیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا یہ کونسل کا گھر ہے اور اس میں جو عورت رہتی ہے وہ اندھی ہے ۔ میں کونسل کی طرف سے اس گھر کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ سامنے گھروں کی قطار میں یہاں سے دیکھیں تو تمہارے گھر سے دائیں ہاتھ پانچواں مکان میرا ہے ۔ اس کی دیکھ بھال بھی میں ہی کرتا ہوں -----"

فاطمہ نے بھی غور سے اس کی نیلی آنکھوں میں دیکھا۔ شاید غصے یا ناگواری کی کوئی تحریر!! مگر وہ شرارت سے مسکراتی رہیں --- " دراصل اجنبیوں کو یہاں کے طور طریقے معلوم نہیں ہیں۔ جو لوگ سرسری قیام کے لئے یہاں آتے ہیں وہ ایسی باتوں کو جانتے نہیں ۔"

فاطمہ مسکرا دی اور شکریہ کہہ کر واپس جا کر منڈیر پر بیٹھ گئی۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔ یہ چپ چاپ بیٹھی اسے کام کرتا دیکھتی رہی۔ اچانک دھوپ پھر غائب ہو گئی۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف نگاہ کی تو سامنے گھر کی کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور امام صاحب وہاں کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ وہاں سے اٹھی اور اندر چلی آئی۔

اورنگ زیب قاسمی

شام میں وہ پھر آن پہنچے ؟ " دیکھیے صاحب آپ کو ان انگریزوں سے بات نہیں کرنی چاہیے۔ ہم جو ہیں یہاں۔ جو کام ہو' کوئی بات ہو --- ہم سے کریں آپ۔" انہوں نے آنکھوں سے شہوت کے جام لنڈھاتے ہوئے کہا۔

فاطمہ نے رکھائی سے انہیں دیکھا اور ان کی بات جیسے ان سنی کرتے ہوئے کہا --- " آپ کو کیا کام ہے؟"

" کام ؟" اب وہ تھوڑا سا ہنس دیئے "صاحب کام تو کوئی آپ ہمیں کرنے ہی نہیں دیتے --- آپ کیا کہہ رہے تھے اس بدبخت سے ؟؟"

" دیکھئے امام صاحب ۔ میرے معاملات میرے اپنے ہیں۔ میں اگر کسی سے بات کروں تو آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ اس کے لئے مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے --- یا ہر کام کی رپورٹ آپ کو دینی چاہیے ---" فاطمہ نے اچانک تیزی سے کہا۔

وہ پھر ہنس دیئے " غصہ کیوں کھاتے ہیں آپ صاحب --- اب دیکھئے نا میری بیوی شیفیلڈ گئی ہوئی ہے میں بھی اکیلا ہوں۔ آپ بھی اکیلے ہیں۔ میں نے سوچا چلو آپ ہی سے کچھ بات کر لوں۔ ہم دونوں ہی تنہا ہیں اور پڑوس سے آپ بات کر سکتے ہیں تو میرے سے کرنے میں کیا حرج ہے؟ میں تو آپ کا اپنا آدمی ہوں۔" بات ختم کرکے وہ ہے ہے کرکے ہنسنے لگے۔

فاطمہ کا جی چاہا وہ ان کو ایک اچھا سا ------ خوب کس کے تھپڑ لگائے اور کہے کہ آئندہ اس طرف کا رخ کیا تو اچھا نہ ہوگا۔ اس نے دروازے پر سے ہاتھ ہٹا کر دونوں ہاتھ پہلو میں گراتے ہوئے بہت تلخی سے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ امام صاحب پورا دروازہ کھول کر اندر آگئے اور آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھنے ہی والے تھے کہ فاطمہ نے کھلے دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھ کر بہت غصے اور تلخی سے انہیں نکل جانے کو کہا۔ امام صاحب بیٹھتے بیٹھتے پھر کھڑے ہو گئے اور واپس مڑ کر اس کے سامنے آکر ٹھہر گئے۔ ان کی آنکھوں میں اب شہوت کی جگہ نفرت اور کینہ تیر رہا تھا ۔" آجاتی ہیں رنڈیاں شریفوں کے محلوں میں ماحول خراب کرنے کو --- تو کیا سمجھتی ہے یہاں رنڈیاں نہیں ملتیں؟ تیرے سے اچھی صورت شکل اور بدن کی ملیں گی مجھ کو۔ میں تو انسانی ہمدردی کے جذبے سے آیا تھا تیرے پاس ۔ تجھے بدیسی گوشت کی بھوک ہے تو جا کر کسی بدیسی محلے میں مر --- یہاں شریفوں کے محلے کا ماحول خراب کرنے کیوں آئی ہے ؟"

اور باہر نکل کر انہوں نے پوری طاقت سے گلا کھنچ کر صاف کیا اور زمین پر یہ بڑا لوتھڑا بلغم کا پھینک کر تیز تیز چلتے چلے گئے ---

یہی دن تھا جب فاطمہ کے گھر پر پہلا پتھر گرا --- مگر پتھر مارنے والا نظر نہیں آیا تھا۔ یونہی ایک اتفاقی حادثہ سمجھ کر وہ اسے بھول بھی گئی تھی مگر جب دوسرے روز وقفے وقفے سے اس کی کھڑکیوں پر ' دروازے پر ' دیواروں پر پتھر گرنے لگے تو اسے تشویش ہوئی اور پریشانی میں گھر سے باہر نکل کر گیٹ کے پاس کھڑی ہو گئی۔ برابر میں وہی آدمی آج گھاس کاٹ رہا تھا۔ وہ قریب جا کر کچھ کہنے کو ہوئی تو وہ گھاس کاٹنے کی مشین گھسیٹا دوسری طرف چلا گیا۔ اسی وقت گیٹ کے پاس سے دو انگریز بڑھیاں گزریں اور اس کی طرف سے یوں لاتعلق گزریں جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

کے لئے پکارنے لگی۔ شعلوں کی روشنی میں اس کا وحشت زدہ چہرہ اور کھلے منہ سے نکلتی بے آواز چیخ سامنے گھر کی کھڑکی میں کھڑے امام صاحب نے سنی اور جب فاطمہ کا چہرہ اور شیشے پر رکھے ہاتھ آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے نیچے گر گئے اور دور کہیں آگ بجھانے کے انجنوں کا شور ابھرا تو امام صاحب نے بھی کھڑکی کا پردہ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اندر جا کر پلنگ پر لیٹے اور ہاتھ بڑھا کر دوسری کروٹ سوئی ہوئی بیوی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

"ستیا ناس!" بیوی نے منہ ہی منہ کہا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر خود کو امام صاحب کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

(مطبوعہ "فنون" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

ڈاکٹر سلیم اختر

آخری تدبیر

آئینہ عجب بے رونق صورت دکھا رہا تھا۔ اندر کو دھنسی آنکھیں ان ویران گھونسلوں جیسی تھیں جن سے نظر کی چڑیا پرواز کرنے کو ہو۔ پیشانی کی گہری لکیریں بے آرام بستر کی میلی سلوٹوں کا منظر پیش کر رہی تھیں' مونچھوں کے سربلند کنارے' شکست خوردہ پرچم کی مانند سرنگوں تھے' منہ پر ہاتھ پھیرا تو بڑھی شیو کے کھردرے بالوں کی نوکیں سوئیوں کی مانند چبھیں۔ دھندلائی نظروں سے آئینہ کو تکا کیا حتیٰ کہ جسم نے جھرجھری سی' لگا جیسے رندھ رہا ہو' آنکھوں کے گدلے شیشے نمی سے دھندلے ہونے کو ہوں' شاید بازو میں رعشہ بھی محسوس ہو رہا تھا یا پھر کچھ بھی نہیں تھا' سب وہم تھا اور دل کی دھڑکن کا مدوجزر محض وسوسہ تھا۔

تب آئینہ مخاطب ہوا:

"پریشان ہو؟"

"نہیں تو!"

"پشیمان ہو؟"

"نہیں تو!"

"پھر یہ منہ کیوں لٹکا رکھا ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم' جو دکھا رہے ہو وہی دیکھ رہا ہوں۔"

"تو کیا میں غلط دکھا رہا ہوں؟"

"نہیں تو!"

"تم خوش تو ہو نا؟"

"یقیناً۔"

"سوچ لو۔"

"سوچنے کی کیا بات ہے' میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے خوشی خوشی' اپنی بیوی کے لئے کیا ہے۔"

"بیوی کے لئے.....؟" آئینہ نے بیوی کی "ی" کو عجب لہجہ میں کھینچا۔ تحقیر' تمسخر' طنز' استہزاء؟

"تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟"

"یہ تاب' یہ مجال' یہ طاقت نہیں مجھے۔"

"پھر یہ طعنے کیوں دے رہے ہو؟"

"طعنے تو نہیں صرف سوال کر رہا ہوں ؟"

"کیا تم خود سے سوال کرنے کی جرات رکھتے ہو ؟"

اچھا بک بک مت کرو ۔ وہ بے چاری جاگ جائے گی۔"

" بے چاری جاگ جائے گی ۔۔۔ ہاہاہا!"

اس نے بے زار ہو کر آئینے سے منہ موڑا تو بستر پر نظر پڑی' بیوی نیند کے گہرے پانیوں میں اتری ہوئی تھی' نقاہت کے باوجود چہرہ پر اب عجب سی رونق دکھائی دے رہی تھی۔ چہرہ پر کھنڈی وہ زردی جو پہلے موت کی کہانی کی تمہید دکھائی دیتی تھی' اب صحت کے عنوان میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ماتھے اور تکیے پر بکھرے بال مریض چہرے کی تصویر کو حاشیہ کئے ہوئے تھے ۔ بھرے بھرے لب اس وقت ماند اور سیاہ سیاہ سے تھے 'مگر جانتا تھا کہ جلد ہی صحت مند خون انہیں سرخ کر کے مکھڑے کی پھانک کا رس بھر دے گا۔ بھاری پپوٹوں میں ملفوف آنکھوں سے مرض کی چلمن سرکی تو یہ شربت کے کٹوروں میں تبدیل ہو جائیں گی۔

وہ دیر تک کھڑا اسے دیکھتا رہا' پھر احتیاط سے بستر کے سرہانے بیٹھ کر پیار سے اس کے بکھرے بالوں کو سمیٹا مگر اس احتیاط سے کہ چھو جانے سے نیند خراب نہ ہو جائے۔ اسے بہتر دیکھ کر فخر و انبساط کی لہروں نے اعصاب میں سرشاری کی کیفیت پیدا کر دی۔ بیوی کی محبت میں اس نے وہ کر دکھایا تھا جو کسی بھی شوہر کے بس کا نہ تھا جسے وہ اپنی جان اور جان سے پیاری کہا کرتا تھا' اس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ واقعی جان سے پیاری ہے۔ وفور جذبات سے آنکھیں بھیگ گئیں !

نہ تو اس کا باپ فرغانہ کا حکمران مرزا شیخ تھا اور نہ ہی ماں کا نام قتلوغ نگار خانم تھا مگر اس کے باوجود دونوں نے بیٹے کا نام ظہیرالدین بابر رکھا' محض اس لئے کہ باپ تاریخ کا استاد تھا اور اسے تمام تاریخی شخصیات میں سے بابر کی شخصیت اور کردار بے حد پسند تھا۔ اگر بادشاہوں کے نام پر ہی رکھنا مقصود تھا تو ناموں کی کمی نہ تھی۔ شہنشاہ ہند اکبر اعظم' جہانگیر اور پھر شاہجہاں۔۔۔۔۔ مگر اس کا ہیرو تو بابر ہی تھا لہٰذا اس کے نام سے ہی اپنی پوجا کا آغاز کیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ استاد کا بیٹا نہ کسی سلطنت کی بنیاد رکھے گا نہ محل' باغ اور باغیچے بنوائے گا' حتی کہ ثواب دارین حاصل کرنے کے لئے کوئی مسجد بھی کھڑی نہیں کر سکتا ہے۔

اگر معلم تاریخ نے یہ سوچا کہ نام کے اثرات کے باعث بیٹا' بابر ہی کی مانند جلال و جمال کا امتزاج ثابت ہوگا اور اولو العزمی' عالی ظرفی اور بلند ہمتی جیسے بابری اوصاف سے شخصیت جگمگا اٹھے گی تو اندازہ غلط ثابت ہوا اور توقعات پوری نہ ہوئیں یعنی نام نہند بر عکس والی بات درست ثابت ہوئی کہ شاہانہ اوصاف کے برعکس عجب کمینی طبیعت کا نکلا اور اس کی پیدا کردہ جملہ خامیوں نے کم ظرفی اور بالخصوص کنجوسی کی صورت میں اظہار پایا۔ بیسہ خرچتا تو کہا کلہ خیر بھی منہ کے بٹوے میں بند رکھتا۔ جس صبح قلش کر دیتا سارا دن خود کو فضول خرچ محسوس کرتا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ اطوار میں پختگی آتی گئی جو پہلے عادات اور پھر فطرت ثانیہ میں تبدیل ہو گئے۔ ویسے بقول والدہ محترمہ وہ دل کا برا نہ تھا شاید یہ سچ ہو کیونکہ جب اس کا دل ثمینہ پر آیا تو اس کی کایا کلپ ہو گئی یوں کہ وہ کسی لحاظ سے بھی برا نہ رہا۔

اس نے ثمینہ کو ایک شادی میں دیکھا۔ نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس جھل مل کرتی ثمینہ دل میں سما گئی' وہ اسے ہی دیکھتا رہا ۔ دوپٹہ گرانے کا انداز اور دوپٹہ اٹھانے کا اسلوب' چلتے چلتے گردن موڑ کر یوں ہنسنا کہ

کانوں میں گڑھے پڑ جائیں۔ بالوں کی لٹ کا سیاہ ہالہ اور چہرے کا بدر ۔ الغرض وہ سراپا کی سالم سمائی دل میں ۔۔۔۔۔!

ظہیرالدین بابر پہلی مرتبہ محبت کی برکھا میں یوں بھیگا کہ دل کی شور زمین میں محبت کا گلاب مہک دینے لگا اور یہی گلاب اس نے ثمینہ کے جوڑے میں سجا دیا۔

یہ عجب اتفاق یا پھر حسن اتفاق تھا کہ ثمینہ' بابر کے برعکس کھلی ڈلی 'کھلے دل اور کھلے ہاتھ کی' بے تکلفی سے قہقہہ لگانے والی جس کا دل 'زبان اور عمل ایک۔ ثمینہ کی محبت اور اس کے جسم کی گرم جوشی نے بابر کی فطرت پر جمی برف جب پگھلا دی تو اندر سے ایک خوبصورت بابر برآمد ہوا۔ شاید اسے ان ہی چیزوں کی ضرورت تھی اور ان کے فقدان کے باعث شخصیت زنگ آلود ہو چکی تھی اور اب ثمینہ اسے صیقل کر رہی تھی اور جب زنگ کا کرخت چھلکا اتر گیا تو ظہیرالدین بابر کی شخصیت کا کندن نکل آیا۔ اب وہ کنسل سے لکالش لش کرتا' نیا نکور سکہ تھا۔ ایسا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ عورت' مرد کو کیسے برباد کرتی ہے اس کی مثال بیوی پیش کرتی ہے اور عورت' مرد کو کیسے آباد کرتی ہے اس کی بھی مثال بیوی ہی پیش کرتی ہے۔ ثمینہ نے یہ پرانی بات سچ کر دکھائی۔

ظہیرالدین بابر خوش تھا' بے حد خوش' گویا اس نے اپنی مغل سلطنت کی بنیاد استوار کر لی ہو' اس امر کے باوجود کہ ثمینہ ولی عہد دینے کی اہل نہ تھی۔ ماہم بیگم کی مانند !

ثمینہ کو آئینہ میں دیکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ آنکھوں میں سرمہ ڈال رہی ہے' لپ اسٹک لگا رہی ہے' کانوں سے بندے اتار رہی ہے' بیڈ روم کی دیوار کے نیلے رنگ کے پس منظر میں فریم کا سنہری رنگ خوب ابھرتا تھا اور اسی کے بیضوی فریم میں وہ ثمینہ کے چہرے کا حصہ' بازو کی جھلک' ہاتھ کا کلوز اپ' دیکھتا رہتا' اسے ثمینہ کو مکمل دیکھنے کے مقابلے میں یوں قسطوں میں دیکھنا زیادہ پسند تھا۔ تھوڑی تھوڑی جرعہ جرعہ !

وہ بستر پر لیٹا نہ دیکھنے کے انداز میں آئینے میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بال سنوار رہی تھی' ان بالوں کو سلجھا رہی تھی جنہیں رات بابر نے بڑی مشکل سے الجھایا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں کھوئی کھوئی سی تھی' ذہن کہیں اور مگر ہاتھ میکانکی انداز میں برش چلائے جا رہا تھا پھر وہ خود بخود یوں شرما گئی جیسے کسی شرم دلانے والی بات نے چٹکی لی ہو وہ مسحور سا اسے دیکھا کیا۔

اسی آئینے میں ان دونوں نے خود کو پہلی مرتبہ یکجا دیکھا تھا۔

" دیکھو " وہ اس بچے جیسے پرجوش لہجہ میں بولا جو پہلی مرتبہ تتلی دیکھ رہا ہو۔

" ہٹو بھی ! بے شرم کہیں کے ۔!"

اور اب اسی بیڈ روم کی نیلی دیوار پر آویزاں سنہری فریم والا بیضوی آئینہ مریضہ کی نقاہت بھری ساکت تصویر دکھا رہا تھا۔ ایسی ساکت تصویر کہ فوٹو گرافی کی تصویر محسوس ہو۔

ثمینہ جب بیمار ہوئی تو کسی نے بھی بطور خاص تشویش کا اظہار نہ کیا چنانچہ عورتوں کی عام بیماری سمجھ کر محلہ کی لیڈی ڈاکٹر سے دوا لے لی گئی مگر جلد ہی مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی جیسا عالم ہو تا گیا۔ زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ مرض کی تشخیص نہیں ہو رہی تھی جس کے نتیجہ میں پہلے طرح طرح کے ٹیسٹ اور اسپیشلسٹ پھر حکیم اور ہومیو پیتھک اور اب آخر میں مزاروں پر منتیں اور پیروں کے تعویز ..... مگر سب بے

اورنگ زیب قاسمی

سو، ثمینہ نامعلوم مرض کی دلدل میں دھنستی ہی گئی۔

ظہیر الدین بابر کی زندگی اب تک امن اور سکون کا گہوارہ تھی مگر اب پہلی مرتبہ اسے زندگی کی بنیادوں میں زلزلہ محسوس ہو رہا تھا۔ زندگی کی مرکز و محور بیوی موت کا لقمہ بننے کو تھی، یہ اب تلخ مگر اٹل حقیقت تھی اور بابر کے لئے بذات خود یہ تصور موت سے کم نہ تھا۔

آئینہ جس تیمار دار کا چہرہ دکھاتا وہ بھی مریض ہی معلوم ہوتا۔

ایک رات ثمینہ کی آنکھ کھلی تو بابر پٹی سے لگا دکھائی دیا۔ چہرہ بیوی کا عکس بنا اور آنکھیں نیند سے بوجھل۔ خاوند کی محبت پر اس کا دل بھر آیا۔ اسے بھی اب اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا۔ پہلے تو موت کا تصور سوہان روح تھا، رات کے پچھلے پہر کی خاموشی میں وہ موت کے سرد ہاتھ کو اپنی جانب بڑھتا محسوس کرتی تو لرز جاتی مگر اب نہیں۔ اب اس نے یقینی موت سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور اس عالم یاس میں خدمت کرنے والے خاوند کی محبت ہی اس کا سب سے بڑا سہارا تھی بلکہ وہ تو یہ بھی سمجھتی تھی کہ اب تک وہ جو زندہ ہے تو یہ صرف خاوند کی لگن کی وجہ سے ہے۔

اس نے بابر کے ہاتھ پر اپنا سوکھا ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟"

وہ خاموش اسے دیکھتا رہا۔ بولنا چاہا مگر ہونٹوں کے کنارے کپکپا کر رہ گئے۔

"مولا سب ٹھیک کر دے گا۔"

اس نے کہنا چاہا "نہیں! اب کچھ بھی ٹھیک نہ ہوگا۔" مگر خاموش رہا البتہ چہرہ کی زرد تھکان سب کچھ کہہ رہی تھی۔

ثمینہ کا مرجھایا ہوا ہاتھ اس کے اعصاب میں عجیب طرح کی کپکپی پیدا کر رہا تھا بابر کو اس ہاتھ کی انگلیوں کے نیچے پڑنے والے گڑھوں کا گداز یاد آ رہا تھا۔ تب ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ بچوں کی مانند بلک بلک کر رو رہا تھا۔ بستر پر، ثمینہ کے سر کے قریب سر رکھے سسکیوں سے سارا جسم ہل رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ گزشتہ ایام کی تھکن، کلفت، تناؤ دکھ اور پریشانی، سب کا مظہر یہ آنسو تھے۔ وہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ رونا چاہتی تھی مگر نقاہت نے جسم سے شادابی کے ساتھ آنسو بھی چوس لئے تھے۔

پھر وہ آہستہ آہستہ سکون پذیر ہو آ گیا۔ پلنگ پر سے سر اٹھایا اور سامنے آئینہ میں آنسوؤں سے بھیگا اپنا چہرہ دکھائی دیا۔ اور تب اندھیری رات میں بجلی کا کوندا چمک کر لمحہ بھر کے لئے جس طرح تاریک منظر اجاگر کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح پریشان ذہن میں آخری تدبیر نے لشکارا مارا۔

بابر نے آئینے سے نظریں ہٹا کر مریضہ کو دیکھا جو پریشان نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ کچھ دیر تک بابر کی نظریں ثمینہ کے چہرے کا جائزہ لیتی رہیں، دونوں کی نظریں ملیں۔ ثمینہ، بابر کے چہرہ کے تغیر سے پریشان ہو رہی تھی۔ وہ جو مدت سے مسکرایا نہ تھا، کھل کر ہنس رہا تھا۔

"تم اب ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

وہ اسے بے اعتباری کی خاموشی سے دیکھتی رہی:

"ہاں ہاں!" وہ گنگناتے لہجہ میں بولا "تم قطعی طور پر تندرست ہو جاؤ گی۔"

اورنگ زیب قاسمی

ثمینہ نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر وہ بے صبری سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولا "مایوسی کی باتیں کر کے میرا شگون نہ خراب کر دینا۔"

"شگون؟"

"ہاں ہاں ابھی ابھی انسپریشن ہوا ہے۔ سنو!"

کہیں یہ پاگل تو نہیں ہو گیا، ثمینہ نے دکھ سے سوچا، میری مسلسل بیماری اور تیمار داری کی مسلسل پریشانی اور اب مایوسی سے یقیناً اس کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ اسے دکھ، رحم اور محبت بھری نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں، یقیناً یہ پاگل ہو گیا ہے۔

وہ انگلی کھڑی کر کے بولا: "تم اسے راز ہی رکھنا۔" اس نے سرگوشی کی "گھر میں کسی کو ہوا بھی نہ لگے، نہ اماں کو، نہ ابا کو اور نہ تمہارے کسی رشتہ دار کو۔" وہ عجیب سے لہجہ میں بول رہا تھا "یہ ہمارا تمہارا راز ہے۔ میاں بیوی کا۔" اور ایک مرتبہ پھر ہنسا، عجیب سی ہنسی، شاید وحشت بھری ہنسی۔

"تم پاگل ہو گئے ہو۔" وہ بالآخر بولی۔

"ہاہاہا!" وہ جواب میں ہنس دیا۔ وہ متوحش ہو کر دیکھ رہی تھی۔ "خدا کے لئے سوچو تو ..... کیا کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔" وہ خوشی سے چٹکی بجا کر بولا۔

"ابھی سمجھ میں آ جائے گا۔" وہ تسلی دیتے ہوئے بولا۔

وہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر ایک دم اٹھا۔

"کہاں جا رہے ہو۔" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"وضو کرنے۔"

"ہائے اللہ!"

تب ظہیر الدین بابر نے بڑے اہتمام سے وضو کیا اور دو نفل پڑھے۔ وہ دیر تک ہاتھ اٹھائے دعا مانگتا رہا۔ ثمینہ اسے متوحش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ جانماز سے اٹھا اور ثمینہ پر دعا کی پھونک ماری۔ پھر وہ اس کے سرہانے کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں بولا ..... ایسی بلند آواز کہ ثمینہ نے محسوس کیا سارا شہر جاگ جائے گا۔

"اے خدا! میں اپنی بیوی کی بیماری اپنے سر لیتا ہوں۔"

ثمینہ رو رہی تھی!

مگر وہ اس کے آنسوؤں سے لاتعلق، مریض کے پلنگ کے گرد چکر لگا رہا تھا اس کی چال میں مستانگی کی عجب لڑکھڑاہٹ تھی کسی غیر مرئی نقطہ پر مرکوز اس کی آنکھیں اندرونی روشنی سے دمک رہی تھیں، گردن فخر سے تنی، وفور شوق سے جسم میں لرزش، مگر پاؤں میں استقامت وہ ہر چکر کے بعد باآواز بلند پکارتا:

"اے خدا! میں اپنی بیوی ثمینہ کی بیماری اپنے سر لیتا ہوں۔"

ظہیر الدین بابر کو لگا جیسے کمرہ ان دیکھے وجودوں سے بھر گیا ہے، شاید وہ فرشتے تھے جن کے مقدس پروں کی پھڑپھڑاہٹ "آمین! آمین!!" کہہ رہی تھی۔ فضا میں کسی عجیب اور نامانوس موسیقی کی لہروں کو جسمانی طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔ موسیقی کے سروں کے ساتھ کچھ سرگوشیاں بھی سنائی دے رہی تھیں، تعجب اور مسرت

کی۔ شاید ظہیر الدین بابر بادشاہ ' اس کا بیٹا ہمایوں اور مغل امراء اور وزراء کی روحیں اسے برکت دینے کو آئی تھیں۔ درو دیوار " آمین آمین " پکار رہے تھے ' جسم کا رواں رواں پکار رہا تھا " آمین آمین !! "

نیلی دیوار پر سنہری بیضوی فریم والا آئینہ عالم حیرت میں گم !

" اللہ اکبر ! اللہ اکبر ! اللہ اکبر !! " موذن کی اذان گونجی۔

" دیکھا ! " وہ پرجوش لہجہ میں بولا۔ " خدا نے میری التجا سن لی۔ "

ثمینہ روئے جارہی تھی مگر اسے وہ آنسو گویا دکھائی نہ دے رہے تھے ' وہ اسی پرجوش لہجہ میں بولا: " تم اب ٹھیک ہو جاؤ گی ...... میری التجا قبول ہو چکی ہے۔ "

" اور تم ..... ؟ " وہ بے وقت بولی۔

" میں ؟ " وہ ہنسا " میرا کیا ہے۔ " وہ پھر ہنسا " بھلا میرا کیا ہے ؟ "

..... اور واقعی معجزہ رونما ہوگیا' ثمینہ بتدریج ٹھیک ہوتی جارہی تھی' سب اسے نئے اینٹی بایوٹک کیپسول کا کرشمہ قرار دے رہے تھے مگر اصل سبب میاں بیوی ہی کو معلوم تھا۔ بیوی کی صحت کے تناسب سے خاوند کمزور ہوتا جارہا تھا اور اس پر وہ خوش تھا کہ خدا نے اس کی جان کا نذرانہ قبول کرلیا تھا۔ کئی صدیوں بعد اس نے عظیم مغل تاجدار کے نام کی لاج رکھ لی تھی' وہ محض ہم نام ہی کا نہیں بلکہ عمل کا بھی بابر ثابت ہوگیا تھا۔ پھر بابر نے ولی عہد کو بچایا تھا کہ مغل سلطنت داؤ پر لگی تھی مگر اس نے تو اپنی محبت کو حیات نو دی تھی۔ یہ کام تو شاہ جہاں بھی نہ کرسکا تھا۔ شاہی خزانہ ہو تو تاج محل بنوانا آسان کام ہے مگر جان کے بدلے جان کا سودا کسی عاشق' محبوب اور شوہر نے نہ کیا تھا۔ اس احساس کے پیدا کردہ فخر و انبساط سے بیٹھ تن جاتا۔

" دیکھا میں نہ کہتا تھا ؟ " وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا : " تمہارا ہاتھ اب نرم ہوتا جارہا ہے۔ " وہ اس کی انگلیاں سہلا کر بولا: " میں نہ کہتا تھا ..... ؟ " اس کے ہاتھ پر آنسو کے قطرے گرے۔

" پگلی۔ " وہ ثمینہ کے گال پر پیار سے چپت مار کر بولا۔

عین اس وقت آئینہ سے آنکھیں چار ہوگئیں۔ اس نے پہلی مرتبہ غور سے اپنا منہ' پژمردہ چہرہ دیکھا تب آئینہ مخاطب ہوا:

" پریشان ہو ؟ "

" نہیں تو۔ "

" پشیمان ہو ؟ "

" نہیں تو۔ "

" پھر یہ منہ کیوں لٹکا رکھا ہے ؟ "

اسے یقین تھا کہ وہ جاگ رہا ہے' کمرہ میں بلا دستک ایک انسانی پنجر داخل ہوگیا اور بے معنی اچھل کود شروع کردی۔ ایک اور' اور پھر ایک اور ..... وہ ان کی ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ صاف سن سکتا تھا' پھر ان کھڑکھڑاتے ڈھانچوں نے پنگ پانگ کھیلنی شروع کردی۔ وہ ان کا کھیل بڑے غور سے دیکھتا رہا' تب اسے اندازہ ہوا' انسانی کھوپڑی گیند بنی ہے اور تب انکشاف ہوا کہ یہ تو اسی کی کھوپڑی تھی۔ کمرہ کافور کی تند بو سے بھرا بھرا تھا۔ اس نے گھبرا کر ثمینہ کی جانب دیکھا۔ وہ سکون کی نیند سو رہی تھی' سانس ہموار اور خزاں زدہ چہرہ پر آنے والی

اورنگ زیب قاسمی

بہار کی آمد کے آثار ہویدا تھے۔ پھر اس کی نظریں آئینہ کی جانب اٹھ گئیں مگر وہ بھی خالیا" آنکھ بند کئے تو خواب تھا۔ بابر نے کلمہ کا ورد شروع کردیا تاہم رات بھر نیند نہ آئی!

جنازہ تیار تھا۔ سفید کفن میں لپٹی نعش کے گرد والدین ' عزیز و اقارب اور احباب رو رہے تھے پھر فضا میں آواز گونجتی ہے:

" کلمہ شہادت !"

جنازہ اٹھایا جارہا ہے۔ گھر میں کہرام بپا ہے۔

اس کے چہرہ پر سے کفن سرکایا جاتا ہے۔ تیز دھوپ آنکھوں میں کھب جاتی ہے۔ ساتھ ہی فل میک اپ اور سرخ جوڑے میں ملبوس ثمینہ اس پر جھکتی ہے ' اس کی مسکراتی آنکھیں اسے عجب دلربا انداز سے دیکھ رہی ہیں۔

" گڈبائی مائی ڈارلنگ۔ " وہ اٹھلا کر کہتی ہے' وہ ہنستی ہے۔ " یو سِلی سینٹی مینٹل فول ! " ..... وہ کفن کا سرا یوں بے پروائی سے چھوڑتی ہے گویا صندوق کا ڈھکن بند کر رہی ہو۔ وہ چیخ مار کر بیدار ہو جاتا ہے۔ اس کی دانست میں یہ چیخ سارا شہر بیدار کرسکتی تھی مگر ثمینہ کی نیند کے گہرے پانیوں پر بیداری کی ذرا سی بھی لہر رونما نہیں ہوتی۔ وہ بے ترتیب سانس درست کرتا ہے۔ ہاتھ سے پسینے کے قطرے پونچھتا ہے' پانی پینے کو اٹھا تو سامنے آئینہ تھا۔

" مجھے کچھ نہیں معلوم ' جو دکھا رہے ہو' وہی دیکھ رہا ہوں۔ "

" تو کیا میں غلط دکھا رہا ہوں ؟ "

" نہیں تو! "

" تم خوش تو ہو نا ؟ "

" یقیناً "

" سوچ لو ! "

" سوچنے کی کیا بات ہے ' میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے ' خوشی خوشی' اپنی بیوی کے لئے کیا ہے۔ "

" بیوی کے لئے ..... ؟ آئینہ نے بیوی کی " ی " کو عجب لہجہ میں کھینچا۔ تحقیر' تمسخر' طنز' استہزاء ؟

ثمینہ کی بیماری سے پریشان گھر والوں کے لئے اس کی بیماری مزید پریشانی کا باعث بن رہی تھی' اس کی ماں کو اب پختہ یقین ہو چکا تھا کہ کسی بدخواہ نے ان کے گھر پر تعویذ کرادیے ہیں۔

نائٹ میئرز کا سلسلہ جاری رہا' تقریباً" ہر خواب میں قبرستان' قبریں اور اپنا مردہ دیکھتا' کار خیر کے باوجود خود کو قبر کے عذاب میں مبتلا دیکھتا۔ بچھو ڈنک مارتے' کن کھجورے جسم پر سرسراتے' بڑے بڑے بازوؤں والی چمگادڑیں خون چوستیں اور الو دیدے نوچتے ..... عظیم قربانی کا یہ اجر ؟

اپنی خاموش چیخوں سے اس کی روح تک پر لرزہ طاری ہو جاتا!

اس رات اسے نیند نہ آرہی تھی۔ تمام رات دیوار کے ساتھ تکیہ لگائے' نیم دراز' گزرتی رات کی چاپ سنتا رہا۔ ثمینہ صحت کی نیند سو رہی تھی اور وہ خود ..... ؟

کھلی کھڑکی سے اپریل کے پھولوں کی مہک اندر آرہی تھی۔ وہ کھڑکی میں جا کر کھڑا ہوا۔ لمبی سانس سے

پھیپھڑوں میں مشک بھری ہوا کی بھولی انڈیل لی۔ خنک چاندنی اسے پرسکون کر رہی تھی۔ کھڑکی میں دونوں بازو پھیلائے وہ خوابیدہ شہر اور بیدار آسمان کو تکتا رہا۔ وہ خود کو عجب عالم میں محسوس کر رہا تھا۔ تب چاندنی گویا بجلی کے کوندے میں تبدیل ہوگئی۔ اندھیری رات میں لمحہ بھر کے لئے ابھر کر ہو جانے والے منظر کی مانند ان دونوں کے امراض کے خاتمہ کے لئے آخری تدبیر آشکار ہوگئی۔

بیوی کے ساکت جسم سے تکیہ اٹھا کر ہٹا تو آئینے سے سامنا ہو گیا۔

"تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟"

"یہ تاب' یہ مجال' یہ طاقت نہیں مجھے!"

("رابطہ" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

شبنم شکیل

لال دیدی

"میں لال دیدی نہیں بن سکتی' یہ بات تو طے ہے۔" علیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "یہ بات میری مٹی میں نہیں ہے کہ چپ چاپ ظلم سہتی رہوں اور احتجاج نہ کروں۔ صبح سے لے کر شام تک میری عزت نفس کو مجروح کیا جاتا ہے مجھ سے توقع رکھی جاتی ہے کہ ہر کواس کے جواب میں جی ہاں' جی ہاں کہتی رہوں اور پھر رات کو ایک ستی ساوتری کی طرح پھولوں کی سیج سجا کر ایس۔ ایم۔ نصیر صاحب چیف اکاؤنٹنٹ کے بیڈروم میں پدھارنے کا انتظار کروں' نہیں نہیں' مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔ حد ہوتی ہے ہر بات کی میں نے فیصلہ کر لیا ہے شبنم کہ الگ ہو جاؤں گی نصیر سے۔ تمہیں پتہ ہے مجھے یہ سب کچھ برداشت کرتے ہوئے آج دس سال آٹھ مہینے اور پانچ دن ہو گئے ہیں "But no more this lal didi business" اس نے آنکھوں میں آئے ہوئے موٹے موٹے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"لال دیدی کون ہے علیہ؟" میں نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ جنہیں میں بھی پچھلے دس سال آٹھ مہینے اور پانچ دن سے سن رہی تھی۔

"تھا ایک ہندو لڑکی کا کردار' میری ماں کا آئیڈیل' بچپن میں روز مجھے کہانی سنایا کرتی تھیں' اس کی' کہتی تھیں بیٹا اس کہانی سے سبق سیکھو۔" علیہ نے اپنی ماں کے لب و لہجے کی نقل اتارتے ہوئے طنزیہ کہا۔

"کیسی صابر و شاکر لڑکی کی کہانی میں نے پوچھا۔"

"بالکل ٹھیک سمجھیں تم" علیہ نے تمسخرانہ انداز میں جواب دیا۔

کیا کہانی تھی؟ مجھے بھی سناؤ نا۔" میں نے ایک ماہر سراغ رساں کی طرح اس کے دل میں چھپے ہوئے چور کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کی کوشش کی۔

اس نے کافی کا گھونٹ پیئے بغیر پیالی میز پر واپس رکھی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "شبنم صاحبہ ایک بات کا اقرار تو آپ بھی فرمائیں گی کہ مجھے اتفاق سے سائیکالوجی سے متعلق سرگرمیوں کی حد تک گہرا تعلق ہے۔"

"بالکل بالکل۔" میں نے فوراً" تائید کی۔

تو اگر تمہارا خیال ہے کہ لال دیدی کے کردار کے ذریعہ تم میری تحلیل نفسی کرو گی اور اس طرح میرے تحت الشعور میں چھپے ہوئے کو مپلیکسز کو سامنے لاسکو گی تو تمہارا خیال بالکل ..... صحیح ہے۔" علیہ نے آنسوؤں بھرا قہقہہ لگایا۔ "اس لئے میں تمہیں یہ کہانی ہرگز نہیں سناؤں گی۔"

فون کی گھنٹی بجی' عطیہ نے ریسیور اٹھایا۔ لارنس کالج گھوڑا گلی سے اس کے بیٹے عرفان کا فون تھا۔ میں باہر ٹیرس پر آگئی۔

" عرفان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ بہت تیز بخار ہے اسے ۔" میں واپس اندر آئی تو اس نے مجھے بتایا۔ وہ بہت متفکر معلوم ہو رہی تھی ۔" رو رہا تھا میرا بچہ۔ کہتا تھا مجھے فوراً" کر لے جائیں۔"

" تو لے آؤنا ۔" میں نے کہا۔

" نصیر نہیں لانے دے گا۔" وہ کہتا ہے کہ بچوں کو رف اینڈ ٹف ہونا چاہیے۔ بہت جھگڑا کرے گا اور ابھی تو صبح کی لڑائی ....."

" ویسے تو بہت خیال رکھتے ہوں گے وہاں بچوں کا' آخر اتنا نامور ادارہ ہے علاج بھی ہو رہا ہو گا فکر نہ کرو۔" میں نے عطیہ کو تسلی دینے کے لئے اور میاں بیوی کے ایک اور متوقع جھگڑے کے خیال سے کہا۔

" ہاں بہت خیال رکھتے ہیں وہاں بچوں کا' تم بھی اپنے بچے اسی نامور ادارے میں رکھوا دو' تمہارے تو تین ہیں میرا تو اکلوتا بیٹا ہے ۔" اس نے پھر طنز کیا۔

" میں نصیر بھائی سے بات کروں گی عرفان کی ۔" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

" ضرور کرنا اور پھر ایک لمبا لیکچر سننے کے لئے تیار رہنا چیف اکاؤنٹنٹ' ایس ایم ....." اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ پورچ میں ہونڈا سوک کا ہارن سنائی دیا۔

" یہ آج اتنی جلدی کیسے آگیا ۔" عطیہ نے تیوری چڑھائی۔

" میں چلتی ہوں " میں جلدی سے اٹھی " بچے کھانے پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے' ڈیڑھ بج گیا ہے ۔" پھر میں نے ساری سچویشن سے بچنے کا راستہ تلاش کیا۔

" ابھی تو کہہ رہی تھیں نصیر سے بات کرو گی' اب بھاگنے لگی ہو ۔" عطیہ نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

" اسے عرفان کا بتاؤ میری تو صبح سے بول چال بند ہے ۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

" کیسی ہیں بھابھی آپ ؟ ہماری بیگم کہاں ہیں' اور اب ان کا موڈ کیسا ہے ؟ " نصیر بھائی نے اپنا بریف کیس میز پر رکھا۔

" کیا خراب تھا موڈ ؟ " میں نے انجان بن کر کہا ۔" وہ تو شاید اپنے کمرے میں گئی ہے کسی کام سے ۔"

" اسے سمجھائیں بھابھی پاگل ہے بالکل آپ کی سہیلی ۔" وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھے اور میری گھر جانے کی کوشش ناکام ہوتی نظر آرہی تھی۔

" کیوں کیا ہوا ؟ " میں نے حیرانی کی ایکٹنگ کی۔

" ایسی احمقانہ باتوں پر جھگڑا کرتی ہے کہ حیران رہ جاتا ہوں ' ابھی شاید اس نے آپ کو تازہ ترین معرکے کی تفصیلات نہیں بتائیں' ٹریجڈی یہ ہے صاحب کہ ہمارے گھر میں لڑائی ہمیشہ دوسرے لوگوں کی وجہ سے ہوتی ہے' ہے نا بچگانہ پن۔"

" نصیر بھائی لڑائی تو سب میاں بیوی ہوتی ہے' نارمل سی چیز ہے۔" میں نے حالیہ قصے کو غیر اہم بنانے کی کوشش کی۔

" مگر کوئی معقول وجہ تو ہو ۔" وہ ذرا غصے میں آئے " اب دیکھیے صبح عطیہ کے ماموں پر جھگڑا ہوا۔

اورنگ زیب قاسمی

موصوف یہاں واپڈا میں کلرک ہیں۔ ان کی گوجرانوالہ ٹرانسفر ہو گئی تھی۔ جو روٹین میں ہو جایا کرتی ہے' موصوف جانا نہیں چاہتے تھے۔ عطیہ نے مجھ سے کہا " رکوائیں ان کی ٹرانسفر....."

" تو رکوائی آپ نے ؟ " میں نے جان بوجھ کر ان کی بات کاٹی۔

" اس کی نوبت ہی کہاں آنے دی انہوں نے' جاکر اپنے چیف انجینئر سے ملے۔ مجھ سے اپنی عزیز داری انہیں سمجھائی اور کہا" وہ میری ٹرانسفر رکوانے کی کوشش کر رہے ہیں" ابھی مجھے (Relieve) نہ کیجئے " چیف انجینئر نے مجھے فون کیا۔ میں نے کہا' صاحب اگر کوئی میری بیگم کا ماموں بن کر آجائے تو یقین نہ کر لیا کریں فوراً"۔ اب بھابھی آپ انصاف کریں۔ یہ زیادتی ہے یا نہیں جب کہ میں نے عطیہ کو بہت واضح الفاظ میں ہدایات دے رکھی ہیں کہ وہ اپنے رشتے داروں کو میرا نام استعمال کرنے کی اجازت نہ دے میں تو انہیں حماقتوں کی وجہ سے اس کا اپنے گھر والوں سے ملنا جلنا بھی پسند نہیں کرتا۔"

بہت پریشان رہے ہوں گے بیچارے' اس لئے آپ کا نام لے دیا۔ حاجت مند تو دیوانہ ہوتا ہے ۔" میں نے صفائی پیش کی۔

" جی ہاں' دیوانہ بکار خویش ہوشیار۔" نصیر بھائی نے جواب دیا۔ " قصہ دراصل یہ ہے بھابھی کہ عطیہ کا فیملی بیک گراؤنڈ ہے بہت ہمبل (Humble) اور مسئلے اس طرح کھڑے ہوتے ہیں کہ یہ ابھی تک اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ (Adentify) کرتی ہے' بہرحال آپ تو جانتی ہی ہیں سارے حالات' بس اسے سمجھائیں کہ کم از کم میرے (Status) کا خیال ....."

" نصیر بھائی' عرفان کی طبیعت بہت خراب ہے عطیہ اسے تھوڑے دنوں کے لئے گھر لانا چاہتی ہے' بہت پریشان ہے' اسے مری جانے دیں ۔" میں نے پھر ان کی بات کاٹی۔

" عرفان کو معمولی سا فلو ہے میری آج صبح پرنسپل سے بات ہوئی ہے ڈاکٹر برابر اسے دیکھ رہا ہے۔ آخر بچہ ان کی ذمے داری ہے ۔ PAY کرتے ہیں ہم ہر چیز کے لئے یہ تو بچے کو بگاڑنے والی بات ہوئی ناکہ جیسے ہی اس نے ضد کی ماں باپ نے ہتھیار ڈال دیئے ۔"

وہ ناصحانہ انداز میں بولے۔

" دراصل مائیں بچاری " ...... میں نے کوئی دلیل تلاش کرنے کی کوشش کی۔

" سب مائیں نہیں بھابھی۔" انہوں نے بہت حتمی انداز میں کہا۔ "میں اپنے کولیگز کی بیویوں کو دیکھتا ہوں بہت ریزن ایبل ہیں اولاد کے معاملے میں ' مگر عطیہ اس مڈل کلاس ریموشنل ازم سے بھی باہر نہیں آسکتی' خیر چھوڑیے اس بحث کو آپ سے بات کر کے دل ذرا ہلکا ہو گیا۔ آپ کہتی ہیں تو بلوالیتا ہوں عرفان کو ' مگر عطیہ کو جانے کی ضرورت نہیں' ڈرائیور لے آئے گا۔ اچھا اب ذرا اپنی سہیلی کو کمرے سے نکال کر لائیں' اسے ایک خوشخبری بھی سنایئے گا۔ ہم لوگ پندرہ دن کے لئے لندن جا رہے ہیں' سیمینار ہے ایک وہاں' یہ شاپنگ کر لے گی لندن میں۔" .....

فون کی گھنٹی بجی ۔" ارے کب آئیں تم لندن سے ؟ " میں نے عطیہ کی آواز سن کر خوشی سے کہا " کہاں کہاں گھومیں ؟ ابھی گھر ہی ہو نا' میں تمہاری شاپنگ دیکھنا چاہتی تھی ۔"

" میں نے نصیر کا گھر چھوڑ دیا ہے۔" اس کی آواز میں گہری سنجیدگی تھی ۔ میں۔ "چونکی تو کہاں سے بول

رہی ہو؟"

"یہاں کرشن نگر میں ایک ڈاکٹر کی دوکان سے بول رہی ہوں۔ یہ کوئی ڈاکٹر فتح محمد ہیں۔ چائلڈ اسپیشلسٹ ان کی ساتھ والی گلی میں میری باجی کا گھر ہے وہیں آگئی ہوں۔"

"پورا پتہ سمجھاؤ میں ابھی آتی ہوں۔"

عطیہ نے گلی اور مکان کا نمبر بتایا۔

کرشن نگر کی ایک تنگ سی گلی کے ایک پرانے مکان پر عطیہ کے بہنوئی کے نام کا بورڈ لگا ہوا تھا دروازہ کھلا تھا میں اندر داخل ہوئی۔ عطیہ کی شکل و صورت کی ایک خاتون صحن میں لگے نلکے پر بیٹھی برتن مانجھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھے اور کھڑی ہو گئیں۔

"سامنے والے کمرے میں ہے آپ کی سہیلی۔" انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "یہاں صبح سے بجلی غائب ہے گرمی اور اندھیرے میں بیٹھی ہے میں صحن میں کرسیاں لگوا دیتی ہوں' باہر لے آئیں اسے۔"

قلیجے سے سرخ رنگ کی دری کمرے کی واحد کھڑکی کے پاس بچھی تھی اور عطیہ اس پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کی بہن کے دونوں بچے اس کے پاس بیٹھے شاید اپنا ہوم ورک کر رہے تھے۔

"تو آخر تم نے فیصلہ کر ہی لیا میں نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ کیا بہت سیریس بات ہو گئی تھی کوئی؟"

"حد ہو گئی تھی' لندن میں اس شخص نے میری ذلت کی انتہا کر دی' میں نے وہیں فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس کے ساتھ نہیں رہوں گی۔"

"پوری بات بتاؤ۔" میں نے پہلی مرتبہ اس کے معاملے میں سنجیدگی سے دخل اندازی کی۔

نصیر کے ایک دوست کے گھر ٹھہرے تھے ہم وہاں' فارن سروس میں ہے' نصیر سارا دن اس کی بیوی سے میرا مقابلہ کرتے رہتے تھے۔ بہت زیادہ متاثر ہو گئے تھے ان بیگم صاحبہ سے' اٹھتے بیٹھتے مجھے مشورہ دیا جاتا تھا کہ میں ان سے زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھوں۔ یقین کرو میری اتنی تذلیل ..... " عطیہ نے مجروح نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"کیا بہت توپ چیز تھیں وہ؟" میں نے پوچھا۔

"خاک۔" عطیہ نے حقارت سے کہا "بس ایسے ہی تھیں جیسی ہمارے ہاں کی اکثر بیگمات ہوتی ہیں وہی کٹے ہوئے بال' وہی تصنع کے بوجھ سے کراہتا ہوا انداز' وہی انگریزی لہجہ' اور سطحی قسم کی گفتگو' کسی فیڈرل سیکرٹری کی بیٹی ہے' ڈولی ہے نام' مگر دونوں ایک دوسرے کو چندا اور جانی کہہ کر بلاتے ہیں۔"

"بھئی پنچ لائن (Punch Line) کیا تھی' پورے قصے میں' مجھے تجسس ہوا' کوئی افیئر وغیرہ کا چکر تو نہیں تھا دونوں میں۔"

"نہیں ایسا چکر کوئی نہیں تھا۔" عطیہ نے بہت یقین سے کہا "سچ پوچھو تو پنچ لائن بھی کوئی نہیں ساری کہانی میں' بس ایسے ہے شبنم کہ آپ کسی چیز کو ایک حد تک سٹریچ کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد بریکنگ پوائنٹ آجاتا ہے اس کا' اب وہ آگیا تھا میرے اور نصیر کے تعلقات میں" عطیہ کی آواز رندھ گئی "وہاں ایک دن کھانے پر بیٹھے تو میرے شوہر نامدار بہت چہک رہے تھے' فرمانے لگے' ڈولی بھابھی' آپ لوگوں کے ہاں آکر طبیعت خوش ہو گئی ہے میری' ایک فضا ہے آپ کے ہاں' ٹھنڈی ٹھنڈی' کیسی ہارمونیکل کرانس کی

اورنگ زیب قاسمی

گنجائش ہی نہیں اس میں' دراصل آپ دونوں میاں بیوی ایک ہی ویو لنتھ پر ہیں نا" اسی لئے اتنی انڈر اسٹینڈنگ ہے آپ میں' مگر بھابھی میں تو اس کا سارا کریڈٹ آپ ہی کو دوں گا۔ بس ایک نوازش مجھ پر بھی کر دیں۔ میری بیوی کو بھی اپنے جیسا بنا دیں۔ اسے خواہ مخواہ کے جذباتی پن سے نکالیں۔ شبنم یقین کرو میرا دل ڈوب مرنے کو چاہا۔ میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ اب الگ ہو جاؤں گی۔" عطیہ نے بمشکل اپنے آنسو روکے۔

"نصیر نے رابطہ کیا ہے تم سے۔" میں نے پوچھا۔

"نصیر تو لندن سے واپسی پر کراچی میں رک گئے تھے' کوئی کام تھا انہیں' میں اکیلی پہنچی ہوں کل لاہور۔ آج صبح اپنے دو سوٹ کیس اٹھائے اور یہاں آگئی باجی کے پاس۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے عطیہ کی طرف دیکھا۔

"میں شادی سے پہلے والی سروس جوائن کروں گی' ان لوگوں پر بوجھ تھوڑا ہی بنوں گی وہ میرا مطلب سمجھ گئی تھی۔ "گھر میں رہوں گی یہیں۔" اس نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔

"میرے بہنوئی بہت نیک آدمی ہیں' بہت تسلیاں دے رہے تھے مجھے' سچ میری باجی کے گھر میں بہت عزت ہے۔" عطیہ بڑی دیر تک اپنے بہن بہنوئی کی محبت بھری زندگی کا تذکرہ کرتی رہی۔

"میں چلتی ہوں۔" میں نے باہر اندھیرا گہرا ہوتے دیکھ کر کہا "کل صبح گاڑی بھیجوں گی تمہیں لینے کے لئے۔ میرے پاس رہنا سارا دن۔" ....

دوسرے دن ڈرائیور عطیہ کو لینے گیا۔

"بیگم صاحبہ تو بہت صبح اپنے گھر واپس چلی گئیں۔ ان کی ہمشیرہ نے بتایا ہے۔" اس نے واپس آکر کہا۔

"تو چلو مجھے نصیر صاحب کے ہاں لے چلو۔" میں نے ڈرائیور سے کہا۔

عطیہ کے بیڈروم کا دروازہ بند تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی' مگر شاید ائرکنڈیشنر کے شور میں اسے میری دستک سنائی نہیں دی۔ میں نے ناب گھمایا۔ وہ لاک نہیں تھا وہ اپنے بیڈ پر بے سدھ سو رہی تھی۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ کر اس کے جاگنے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کی آنکھ ملازم کے دروازہ کھٹکھٹانے سے کھلی جو اس کے لئے جوس کا گلاس لے کر آیا تھا۔

"تم کب آئیں؟ مجھے جگایا کیوں نہیں۔ باجی کے ہاں گئی تھیں۔ وہیں سے پتہ چلا ہو گا"

اس نے سب ایک ساتھ کہا۔

"باجی سے ہی پتہ چلا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"شبنم یقین کرو۔ میں کل پوری رات جاگتی رہی ہوں' ایک لمحے کے لئے جو آنکھ لگی ہو۔ اتنی گرمی تھی وہاں کہ تم اندازہ کر سکتیں اور پھر اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

"وہاں ٹریفک کا شور بھی بہت سنائی دیتا ہے۔ ذرا میری شکل دیکھو۔ ایک رات میں میری آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے ہیں۔"

میں خاموش رہی۔

"صبح پانچ بجے کے قریب تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں زندہ درگور ہو گئی ہوں' سچ قبرستان گیا تھا کرو۔"

اس نے وحشت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"اچھا اب اگر نیند پوری ہو گئی ہو تو میرے لئے چائے بنوا دو ۔" میں نے اپنے لہجے کو پوری طرح نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

"تم اس اینٹی کلا ئمکس پر کوئی تبصرہ نہیں کرو گی ۔" اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتی ۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر تم اپنے دل میں تو ضرور ہنس رہی ہو گی خیر تمہیں اجازت ہے۔ میں وہاں نہیں رہ سکی۔ دراصل قصہ یہ ہے کہ مجھے ..... میرا مطلب ہے کہ میں ....." اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ شاید اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"اچھا سنو' لال دیدی کی کہانی سنو گی۔ تم سننا چاہتی تھیں نا" اس نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ اس نے آنکھیں جوس کے گلاس پر گاڑ رکھی تھیں۔

میں خاموش رہی۔

"سناؤں" اس نے بہت لجاجت سے پوچھا۔

میں مسکرائی۔

"لال دیدی بہت نیک لڑکی تھی ۔" عطیہ نے رات کی جاگی ہوئی سرخ آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اس کے غریب ماں باپ نے اس کی شادی بچپن ہی میں کر دی۔ رخصتی کے وقت انہوں نے اسے نصیحت کی ۔ دیکھو لال دیدی ' آج سے تم پرائے گھر کی ہوئیں۔ اب ہم تمہارے منہ سے سسرال کا کوئی شکوہ شکایت نہ سنیں۔ تمہیں گذارا کرنا ہے وہاں صبر شکر کے ساتھ' ہمارا سر نیچا نہ ہونے دینا' کوئی طعنہ نہ ملے ہمیں تمہارا۔"

"تو بس بڑے تحمل سے لال دیدی نے اپنی ساس کے' بڑی خدمت کی اپنے سسرال والوں کی ' برتن مانجھے' چکی پیسی' سارے گھر کے کپڑے دھوئے ' کئی کئی میل دور پہاڑوں سے پانی بھر کے لاتی رہی' ساس کی ماریں کھائیں' بڑی تپسیا کی لاتی مگر اف نہ کی۔ ساس سارا دن اس سے دس آدمیوں کا کام لیتی اور رات کو چھر کے ایک پیالے میں دو مٹھی ابلے ہوئے چاول اسے کھانے کو دے دیتی۔ وہ صبر شکر کر کے کھا لیتی۔

ایک دن اچانک لال دیدی کا باپ اپنی بیٹی کو دیکھنے اس گاؤں میں آنکلا' جب اسے اکیلا گھر میں پایا تو آہستہ سے پوچھا "کہو بیٹی کیسی ہو' سب اچھا تو ہے نا؟"

"بہت سکھی ہوں پتاجی" لال دیدی نے چہک کر کہا "بہت ہی سکھی۔ بھگوان کی کرپا اور آپ کے آشیرواد سے کوئی دکھ آیا ہی نہیں مجھے ' راج کرتی ہوں یہاں' اور دن آپ رات کو اور ماتا جی کو دعائیں دیتی ہوں۔"

سارا دن گزر گیا۔ رات کو لال دیدی کے باپ نے واپس جانے کی اجازت چاہی۔

ساس بڑی خوش تھی کہ بہو نے اپنے باپ سے اس کی کوئی شکایت نہیں کی۔ سو اس نے اوپرے منہ سے کہا "بھوجن کر کے جائیے گا" باپ دل رکھنے کو بیٹھ گیا۔

مگر ساس ذرا پریشان ہو گئی کہ آج باپ کے سامنے لال دیدی کو دو مٹھی چاول کیسے دے' اگر زیادہ دیتی

ہے' تو اس کی عادت خراب ہو جائے گی۔ لال دیدی اپنی ساس کی پریشانی بھانپ گئی۔ اس نے اپنے پیالے میں دوچار چھوٹے بڑے پتھر ڈالے اور اپنے باپ سے چھپا کر چپکے سے پیالہ اپنی ساس کو پکڑا دیا۔ پھر سرگوشی میں بولی ان پر دو مٹھی چاول ڈال دیجئے' پیالہ بھرا ہوا لگے گا اور پتاجی کو کچھ پتہ نہ چلے گا۔"

"مگر میں لال دیدی نہیں بن سکتی' یہ بات تو طے ہے۔" عطیہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

("افکار" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

طلعت حسین

اورنگ زیب قاسمی

قصہ ایک دوپہر کا

برسات میں وقت کا احساس معطل ہو جاتا ہے۔ صرف بارش کی بوندوں کی آواز' بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور ماحول کی سیلن میں لپٹا ہوا دکھ اور خوشیاں یاد رہ جاتی ہیں پھر یہ باتیں ساری زندگی یاد آتی رہتی ہیں' کھیلتے میں چھپی ہوئی پھانس کی دکھن کی طرح۔

ان دنوں ہم کراچی میں سرکاری ملازمین کی ایک کالونی میں رہتے تھے۔ یہ کالونی ۱۹۴۷ء میں نئی مملکت کی انتظامیہ کی بڑھتی ہوئی آبادی کے سر چھپانے کے لئے جلدی جلدی میں تعمیر کی گئی تھی اور شہر کے باہر جیل کے اردگرد پھیلے ہوئے لق و دق میدان میں ایک طرف کو واقع تھی' کالونی کے بیچوں بیچ ایک مسجد تھی جو کالونی کے لوگوں نے خود بنائی تھی' شہر کالونی سے تقریباً" دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر بنے ہوئے بنگلوں تک آکر ختم ہو جاتا تھا۔ شہر سے آنے جانے والی بس کا آخری اڈہ بھی انہی بنگلوں کے پاس تھا۔ جیل سے اگر کوئی قیدی بھاگ نکلتا تھا تو فوراً" پکڑا جاتا تھا کیونکہ میدان میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ جب بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آتا۔ (ایک دو مرتبہ سزا کاٹتے ہوئے چور بھاگ نکلے تھے) تو پولیس والوں کی سیٹیاں بجنی شروع ہو جاتی تھیں اور کوارٹروں کے نوجوان ہتھیار اور ڈنڈے لے کر باہر نکل آتے تھے۔ پولیس کی مدد کرنے کے لئے .....

گارے اور بھوسے کی چھتوں والے کوارٹروں کی اس کالونی میں نہ بجلی تھی اور نہ پانی۔ رات کو دیئے اور لالٹینیں جلتی تھیں اور پانی کے لئے جیل کے گیٹ پر میونسپلٹی کا ایک نلکا تھا جہاں سے لوگ یا تو خود بالٹیاں بھر بھر پانی لاتے تھے یا ماشکی سے پانی بھروالیتے تھے ۔ گرمیوں میں آس پاس کے میدانوں میں ریت کے بگولے ناچتے پھرتے تھے۔ سردیاں آتی تھیں تو کوئٹہ کی سرد ہواؤں کے ساتھ مٹی اڑتی تھی اور پہلی بارش کے ساتھ بھیگی ہوئی مٹی کی سوندھی خوشبو کا سرور گلیوں کے کیچڑ اور کوارٹروں کی ٹپکتی ہوئی چھتوں کی نذر ہو جاتا تھا۔ کوارٹروں کے پیچھے کی طرف سبزیوں کے کھیت تھے جن میں تازہ سبزیاں سستے داموں ملتی تھیں۔ کالونی اور سبزیوں کے کھیتوں کے درمیان سے ایک پتلی سی سڑک گزرتی تھی جس پر رات کو اندھیرا ہو جاتا تھا اور سڑک کے قریب بنے ہوئے کوارٹروں کے نمازی عشاء کی نماز اپنے اپنے گھروں پر ہی پڑھ لیتے تھے۔ نیم روشن راتوں کے اس دور میں ابھی چاندنی راتوں کی پراسراریت اور نانی دادی کی کہانیوں پر سے اعتبار نہیں اٹھا تھا۔ ہم دیو' جن ' پریوں اور شہزادوں کی کہانیاں سنتے اور ان پر یقین کرتے تھے۔ ہمیں " بدی " کی قوتوں سے ڈر لگتا تھا اور نیک مخلوق کی کامیابیوں سے اچھے اچھے خوابوں والی نیند آتی تھی۔

لیکن یہ سب باتیں سلیٹی رنگ کی بھیگی ہوئی دوپہر سے پہلے کی ہیں۔ بہت پہلے کی تو نہیں ' بس کچھ ہی

پہلے کی ..... " کچھ پہلے " کی بھی نہیں ۔ بس پہلے کی ..... اور پہلے کی بھی کی ..... بس یوں سمجھ لیں کہ یہ سب باتیں اس دوپہر سے پہلے کی ہیں جس دوپہر کا یہ قصہ ہے ۔ ویسے بھی اس قصے میں ساعتوں اور لمحوں کی ترتیب اتنی اہم نہیں ہے۔

خیر..... تو جس دوپہر کا یہ قصہ ہے اس وقت تک ہماری کالونی کے آس پاس مزید دو تین کالونیاں آباد ہو چکی تھیں' پان سگریٹ کی دکانیں اور راشن شاپ کھل چکی تھیں' ہمارے کوارٹروں کی پکی چھتیں پڑ چکی تھیں' کوارٹروں کے درمیان کولتار کی سڑکیں بن چکی تھیں' بجلی اور پانی آچکا تھا۔ سبزی کے کھیتوں کی جگہ بڑے بڑے مکانوں کی ایک بڑی بستی آباد ہو چکی تھی۔ شہر پھیل کر جیل سے بہت آگے نکل گیا تھا اور شہر کو آنے جانے والی بسوں کا آخری اڈہ بنگلوں سے اٹھ کر جیل کے قریب نئی بستی میں آگیا تھا اور بارشوں کی مشکلات ختم ہونے کے ساتھ ساتھ پہلی بارش میں مٹی کی مہک بھی اے حمید کے رومانوی افسانوں کی جیسی لگنے لگی تھی۔ ان سب تبدیلیوں کے باوجود زندگی میں معصومیت کا عنصر ابھی باقی تھا۔ شادی بیاہ کے گیتوں کی اداس خوشیوں اور موسموں کی مناسبت کے ساتھ دل کی دھڑکنوں میں اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا تھا۔ سردیاں آتی تھیں تو ٹھیلے والے ریوڑیاں' گزک اور خشک میوے لے کر نکل آتے تھے اور گرمیوں میں دہی بھلے اور سوڈا واٹر والے گلی گلی میں آوازیں لگاتے پھرتے تھے اور برسات میں آم اور جامن کے ٹھیلے لگتے تھے' ریڈیو پر برسات کے گیت بجنے شروع ہو جاتے تھے اور نوعمر لڑکے اور لڑکیاں اپنے کوارٹروں کے دروازوں کی چوکھٹوں یا کیاریوں میں لگے ہوئے درختوں پر جھولے ڈال لیتے تھے اور گھروں سے گلگلے اور پکوڑے تلنے کی خوشبوئیں اٹھنے لگتی تھیں۔

اس دوپہر..... جس دوپہر کا یہ قصہ ہے ..... سات دن کی جھڑی رکی تھی ..... ماحول پر برسات کے بعد کا سناٹا طاری تھا۔ میرا دل گھر میں نہیں لگ رہا تھا لیکن اماں کی ناراضگی کے خیال سے میں اپنے آپ کو دبا رہا تھا اچانک باہر کسی لڑکے کی آواز آئی۔

" اڈے بچے والی جیل چلو وووو ....."

یہ ایک خفیہ نعرہ تھا جو ہم لوگ ایک دوسرے کو وقت بے وقت گھر سے باہر بلانے کے لئے لگاتے تھے تاکہ بڑوں کو پتہ نہ چلے کہ بقول ان کے کون " آوارہ گردی " کر رہا ہے ۔ اس کے باوجود اس نعرے کی آواز کان میں پڑتے ہی اکثر بڑے بوڑھے گھر کے بچوں کو خواہ مخواہ کے کسی کام پر لگا دیتے تھے لیکن اس دوپہر اماں نے صرف اتنا کہا کہ کہیں دور نہ نکل جانا۔ ان کی اس بات سے شہ پاکر میں گھر سے باہر نکل آیا۔ باہر ہلکے سرمئی رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے میں نے کوارٹر کے سامنے کیاری کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ذرا فاصلے پر سلیم اپنی بیٹھک کے پاس سر جھکائے زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا ۔ میں سڑک کے کنارے کچی زمین پر جگہ جگہ کھڑے برسات کے پانی سے بچتا بچاتا اس کے پاس چلا گیا۔

" کیا کر رہے ہو ..... بیر بہوٹیاں پکڑ رہے ہو !"

سلیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی طرح بیٹھا زمین کو کریدتا رہا۔ میں بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔

" کیا بات ہے ....." میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ....."

میں خاموش رہا۔

کسی بھی کہانی میں یہ ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں لکھنے والے کو وقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کم از کم میرا تو یہی حال ہے۔ خاصتاً" داخلی کیفیت کو بیان کرنا ہو تو آدمی یا تو صفحے کے صفحے سیاہ کرے یا پھر اپنے ماحول کی تصویر کشی کا سہارا لے کر علامتی طور پر اس کیفیت کا اظہار کرنے کی کوشش کرے۔ دونوں صورتوں میں اسلوب کا نیاپن اور تجربے کی اصلیت سچائی متاثر ہوتی ہے لیکن اس مرحلے سے گزرے بغیر کہانی آگے بھی نہیں بڑھتی۔ بہرحال!

میں خاموش ہو رہا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے ... دیر تک ... ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں ہماری خاموشی کا بوجھ بڑھتا گیا... پھر سلیم یکایک اٹھ کھڑا ہوا۔

"چل یار ..."

"کہاں ....." میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کوارٹروں کے پیچھے سے گزرنے والی سڑک کی طرف چل پڑا۔

سڑک کے ساتھ ملی ہوئی بیرکوں میں ایک بیرک ایسی تھی جس کے کونے کے کوارٹر کے ساتھ بنا ہوا چبوترہ ہماری دل پسند جگہ تھی۔ اس کوارٹر سے موسموں کے سارے رنگ زندہ حالات میں نظر آتے تھے۔ ہم لوگ اکثر اس چبوترے پر بیٹھ کر اندر ریڈیو پر بجتے ہوئے گانے سنتے تھے۔ میں اور سلیم بارش کے پانی اور کیچڑ سے بچتے بچاتے وہیں جا بیٹھے۔ اندر ریڈیو پر برسات کے گیت بج رہے تھے۔ پھر پتہ نہیں کب سلیٹی رنگ کی روشنی دھندلا گئی اور مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی۔

"ارے کوئی جیلہ کو اٹھاؤ ..... سوئے جا رہی ہے۔" ایک عمر رسیدہ خاتون نے ریڈیو بند کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں اٹھتی بجی' کئی مرتبہ جگانے کی کوشش کر چکی ہوں۔" ایک لڑکی نے جواب دیا۔ "آپ نے ریڈیو کیوں بند کر دیا۔"

"اذان ہو رہی ہے لڑکی ..... نماز نہیں پڑھو گی؟" بجی نے تنبیہہ کے انداز میں جواب دیا اور پھر بڑبڑانے لگیں۔

"ناول پڑھنے اور گانے سننے سے فرصت ملے تو روزے نماز کی سوجھیں' ایک ہے تو پکوڑے تل رہی ہے' دوسری ہے تو اسے سونے ہی سے فرصت نہیں ملتی' یہ ہیں تو ناول اور گانوں ہی سے ان کا جی نہیں بھرتا..... پتہ نہیں ان لڑکیوں کا کیا بنے گا' جس کے گھر جائیں گی سر پہ ہاتھ رکھ کر روئے گا یا چپا سے پکڑ واپس چھوڑ جائے گا....."

"اماں ایسے تو نہ کہیں....." ایک عورت نے احتجاج کیا..... "جوان لڑکیاں ہیں....."

"اچھا بس..... چپ ہو جاؤ..... نماز پڑھنے دو مجھے....."

ہمارے چاروں طرف گہرے بادلوں کا بڑھتا ہوا اندھیرا' خاموشی اور جھینگروں کی آوازیں تھیں۔ تھوڑے

اورنگ زیب قاسمی

تھوڑے فاصلے پر کوارٹروں کی کھڑکیوں کی روشنی جگہ جگہ کھڑے ہوئے برسات کے پانی میں جھلملا رہی تھی۔

"دیر ہو گئی ہے..... چلیں؟"

"ہاں یار..... اماں ناراض ہوں گی.....؟" ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"پتہ نہیں ابا کو کیا ہو جاتا ہے....." سلیم نے دکھ سے کہا۔

"کیا ہوا.....؟"

"ایک دم سے چڑچڑے ہو جاتے ہیں..... اچھا نہیں لگتا مجھے۔"

"ناراض ہیں....."

"ہاں....."

"کیا ہوا تھا..."

"سکول کی یونیفارم پھٹ گئی ہے روز دھل دھل کر..... اماں نے نئی یونیفارم لانے کو کہہ دیا تھا....."

میں خاموش رہا..... کیا کہہ سکتا تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسی ناراضگیوں کے نتیجے میں والدین کی محبتوں کے درمیان بٹ کر کیسا لگتا ہے۔ ہم دونوں چپ چاپ پانی سے بچ بچ کر چلتے رہے۔

"اچھا میں چلتا ہوں....." سلیم نے اپنی بیرک کے پاس پہنچ کر کہا اور اپنے کوارٹر کی طرف مڑ گیا۔

میرا دل نہیں چاہ رہا تھا گھر جانے کو..... میں اپنے کوارٹر کی کھڑکی کے نیچے پڑے ہوئے بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ اندر خاموشی تھی۔ تھوڑی دیر بعد باورچی خانے سے چپاتی پکانے کی آواز آنے لگی۔ بھیگے ہوئے ماحول پر آہستہ آہستہ پھیلتی ہوئی تازہ روٹی کی خوشبو سے میری بھوک جاگ اٹھی اور میں اندر چلا گیا۔

"کہاں چلے گئے تھے ایسی حالت میں۔" اماں نے مجھے باورچی خانے کے نزدیک منڈلاتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"کہیں نہیں..... کونے تک گیا تھا سلیم کے ساتھ۔"

"اتنے کیچڑ اور پانی سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہیں بلا لیتے اسے۔"

"مجھے بھوک لگی ہے۔"

"جاؤ جا کر منہ ہاتھ دھو پہلے..... روٹی پکاؤں تو دیتی ہوں کھانا' ابا بھی آتے ہی ہوں گے دفتر سے۔ آج کھانا بھی لے کر نہیں گئے..... بھوکے ہوں گے۔"

اس رات مجھے بستر میں بسی ہوئی سیلن کی وجہ سے دیر تک نیند نہیں آئی۔ بس اتنا سا قصہ ہے اس دوپہر کا..... سچ مچ!

("دریافت" کراچی)

عطیہ سید

آخری کہانی

اس دن دوپہر بارہ بجے اسے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ جس وقت ڈاکٹر اسے بتا رہا تھا کہ اب وہ اس کے لئے مزید کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لئے اسے چھٹی دے دی گئی ہے' اس وقت مہترانی جنرل وارڈ کے فرش پر بڑے خضوع و خشوع سے پوچا لگا رہی تھی اور اس کا بانس کے سخت تنکوں والا جھاڑو قریب ہی فرش پر رکھا تھا۔ جانے کیوں یہ سین ------ یہ روز مرہ کی معمولی سی تفصیل اس کے ذہن میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ ڈاکٹر کی طرف توجہ دے سکے اور سمجھ سکے کہ وہ چیچک کے داغوں والا سڑیل ڈاکٹر اس سے کیا کہہ رہا تھا۔ دراصل اسے اس ڈاکٹر سے شدید چڑ تھی۔ ویسے تو وہ جب سے ہسپتال میں تھا' اسے یہاں کی ہر چیز سے تنفر محسوس ہوتا تھا ---- وارڈ میں سپرٹ کی بو' بستر پر سرکاری سرخ رنگ کا کمبل' بے حس ڈاکٹر' سفید وردی والی نچلے متوسط طبقے کی سستی رومانوی ذہنیت والی نرسیں' لالچی مہترانیاں اور وہ ٹنڈ منڈ درخت جو اسے وارڈ کی کھڑکی سے مستقل طور پر دکھائی دیتا تھا اور اسے اپنے وجود کی یاد دلاتا تھا لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ چیچک کے داغوں والا سڑیل معالج جو شہر کا مشہور ڈاکٹر تھا۔ اس شخص کی بدمزاجی اس کے اندر کینگی کو برانگیختہ کرتی تھی۔ کیا ہوا جو وہ سڑیل معالج شہر کا مانا ہوا ڈاکٹر تھا۔ وہ بھی تو اعلیٰ پائے کا ادیب تھا۔ ایسا صاحب طرز جو صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اس بد ذوق 'کوڑھ مغز' الو کے پٹھے ڈاکٹر کو اس کے مقام کا علم نہیں تھا۔ سو وہ بھی ہر وقت اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کو تیار رہتا تھا۔ ڈاکٹر کی تیوری کے جواب میں وہ بھی خشمگیں نظروں سے اسے گھورتا۔ اس کی بدتمیزی کے رد عمل کے طور پر بیہودگی کا مظاہرہ کرتا' اور سب سے بڑھ کر یہ اس کی ہدایات پر بالکل عمل نہ کرتا کئی دفعہ ڈاکٹر کی موجودگی میں انجیکشن لگانے والی نرس کو اپنے بڑھے ہوئے ناتراشیدہ ناخنوں سے اس زور کی چٹکی کاٹتا کہ وہ بلبلا کر رہ جاتی۔ بد مزاج ڈاکٹر غصے سے بل کھا کر رہ جاتا یا پھر الٹے قدموں لوٹ کر رخصت ہو جاتا۔ اس سے زیادہ وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا' کیونکہ اس کی حالت اتنی نازک تھی کہ ڈاکٹر میڈیکل اخلاقیات کی رو سے اسے کسی قسم کی سزا دینے یا ضابطے کی کارروائی کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بطور نفسیات شناس ادیب ہونے کے جانتا تھا کہ اس کے اور ڈاکٹر کے درمیان جو کشمکش جاری تھی ' وہ شخصیات کے ٹکراؤ کا مظہر ہے' لیکن اس غیر جانبدار نفسیاتی تجزیے کے باوجود اس گرما گرم جنگ میں ملوث تھا' یوں لگتا تھا جیسے ہسپتال میں آنے کے بعد سے اس کے اندر صدیوں کا ذخیرہ زہر ایک نقطے پر مرکوز ہو چکا تھا اور وہ نقطہ تھا چیچک زدہ چہرے والا ' کینہ پرور' اکھڑا ہوا ڈاکٹر۔

اورنگ زیب قاسمی

لیکن آج نجانے کیا بات تھی کہ سفاک مغرور ڈاکٹر نادم نادم سا دکھائی دیتا تھا اور اس سے نگاہیں ملانے سے کترا رہا تھا شاید اس لئے کہ اسے معلوم تھا کہ وہ مریض کے ہاتھ میں پروانہ مرگ تھما رہا تھا لیکن خود مریض کے لئے یعنی اس کے لئے اس روح فرسا خبر میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ عرصے سے باخبر تھا کہ وہ ایسی ڈھلان پر سے تیزی سے لڑھک رہا تھا جو پاتال کی طرف جاتی تھی اسے معلوم تھا کہ اس کی زیست کا ہر پل اسے موت سے قریب تر کر رہا تھا۔ اس کی ہستی کی عمارت کتنی بودی تھی ' وہ اس سے بخوبی واقف تھا۔ اس کی ابتدا بھی صفر' اور اختتام بھی صفر تھا اور صفر جمع صفر کا حاصل صفر ہی ہوتا ہے۔ وہ تھا بھی کیا اس مادہ پرست معاشرے کی نظروں میں ------ ایک لٹ پونجیا 'کنگلا' قلاش جس کی متاع زیست مادی پیمانوں کے حوالے سے کچھ بھی نہیں تھی۔ یہ سچ تھا کہ اس نے بطور ادیب بڑا نام کمایا تھا' بڑی شہرت پائی تھی مگر اس سے کیا حاصل ہوا؟ دو وقت کی روٹی بھی نہیں۔ اس نے ساری زندگی انتہائی عسرت میں بسر کی تھی۔

اس کا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے تھا۔ اس لئے وہ غربت کے باوجود اپنے لباس کا خاص خیال رکھتا تھا۔ ہمیشہ سفید لٹھے کی قمیض اور علی گڑھ پاجامے میں ملبوس رہتا جو ان دہائیوں میں برصغیر کے دانشوروں کا مقبول لباس تھا۔ اس وقت جب کہ اس کے خالی ہاتھ میں سفر آخرت کا ٹکٹ تھا اور وہ انجام سے بہت قریب تھا' تب بھی ہسپتال سے نکل کر سڑک پر چلتے ہوئے اسے اس بات سے شدید کوفت ہو رہی تھی کہ اس کی قمیض ملی ہوئی اور پاجامہ میلا تھا مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا' اسے کسی طرح بھی گھر پہنچنا تھا' لیکن گھر جانے سے پہلے اس ہسپتال کے قریب واقع شہر کے بارونق بازار انار کلی میں اپنے دوست حافظ سے ملنا تھا تاکہ اس سے کچھ روپے شراب کے لئے ادھار لے جا سکیں۔ ابھی شراب پاکستان میں ممنوع نہیں ہوئی تھی اور کھلے بندوں فروخت ہوتی تھی۔ البتہ جیب میں نقدی کا ہونا لازمی تھا' جو اس کے پاس نہیں تھی۔

حافظ کے پاس جانے کے لئے وہ نرسوں کے ہوسٹل کے پاس سے گزر کر ڈھلوان سڑک سے نیچے اترا تو اس کا دم بری طرح سے پھولنے لگا۔ سامنے ایک برگد کا پیڑ تھا۔ اس نے رینگ کر اس کی چھاؤں میں پناہ لی اور راہگیروں کی چبھتی ہوئی نظروں کی پروا کئے بغیر درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور کان اس کی دھڑکن سے شوں شوں کر رہے تھے۔ جسم کی طنابیں تڑاخ سے ٹوٹنے کو تھیں۔ شراب کی بے پناہ طلب محسوس ہو رہی تھی۔ حلق میں کانٹے سے پڑ گئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی چٹخی ہوئی ہڈیوں اور اعصاب کی تنی ہوئی کمانوں کو صرف شراب کا تریاق ہی نئی زندگی بخش سکتا تھا ------ ایک عارضی سی تجدید جسم و جاں جس کے بعد وہ پھر اسی جہنم میں ہوگا۔ شراب ------ ہاں یہی وہ چار حروف تھے جن میں ڈوب کر کم از کم چند گھڑیوں کے لئے اس نے ہمیشہ اپنے آپ کو پایا تھا۔ اس کا ایک دوست بھنگ پیتا تھا جو شراب کے مقابلے میں سستی بھی تھی لیکن اسے بھنگ سے کراہت کا احساس ہوتا تھا کیونکہ بھنگ ذہنی بالیدگی کو تقویت دینے کے بجائے تخلیقی اور ذہنی قوتوں کو بانجھ کر دیتی ہے۔ یہ اس کی ذاتی رائے تھی کہ شراب سے ذہنی قوتیں جلا پاتی ہیں۔ ویسے بھی سوم رس تو ہندوستان پر حملہ آور ہونے والے چھ فٹے' سرخ و سفید ' نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والے آریاؤں کا مشروب تھا' اور وہ اس کے آباء بھی تو تھے ------ پھر اسے خود ہی اپنی تعقیل (Rationalization) پر ہنسی سی آجاتی تھی۔ وہ اپنے کریہہ کرچی کرچی وجود کو سمیٹنے کے لئے جو جتن کرتا تھا' اس کے لئے کیسے کیسے عقلی جواز ڈھونڈنے کی

کوشش میں مصروف تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے ہمیشہ اپنا وجود ایک پھٹے پرانے بوسیدہ کوٹ کی طرح محسوس ہوتا تھا جسے کسی نے تفننِ طبع کے لئے لنڈے سے خریدا ہوا اور پھر بیکار سمجھ کر گودام میں ڈال کر ہمیشہ کے لئے بھول گیا ہو------ یا پھر وہ پیک آلود اخبار کا ٹکڑا جو کسی نے پان کی گلوری کھانے کے بعد فٹ پاتھ پر پھینک دیا ہو۔ اپنی کم مائیگی اور ٹھکرائے جانے کا احساس اس کے من کے اندر ایک شیش ناگ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا تھا اور اس شیش ناگ نے ڈس ڈس کر اس کا وجود نیلا کر دیا تھا۔ اس زہر کا تریاق صرف شراب ہی تھی۔

اس نے جٹاؤں والے برگد کی گھنی شاخوں میں سے نیلے آسمان کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ احساسِ کم مائیگی ------ یہ کیڑا جو اس کی سوچ میں رینگتا رہتا تھا جانے کب سے اس کی روح کی اندھی گہرائیوں میں پھل پھول رہا تھا۔ شاید ہمیشہ سے ------ کم از کم جب سے اس نے شعور سنبھالا تھا۔ اس کی ماں اس کے باپ کی دوسری بیوی تھی لیکن وہ روایتی دوسری بیویوں کی طرح لاڈلی نہیں تھی۔ دوسری شادی کے کچھ ہی عرصے بعد اس کے باپ کے دل میں ایک نہ سمجھ آنے والے پچھتاوے نے گھر کر لیا اور وہ واپس پہلی بیوی اور بچوں کے پاس چلا گیا۔ تیکھے تیکھے نفیس نقوش والے بیٹے کی پیدائش بھی اس کے دل کو گداز نہ کر سکی۔ مہینے میں ایک آدھ بار وہ اس کی ماں کے پاس آتا مگر ٹھنڈا ٹھنڈا، کھنچا کھنچا رہتا۔ اس کی ماں میں شدید احساسِ محرومی پیدا ہو گیا تھا اور وہ اس میں یوں غلطاں و پیچاں رہتی تھی کہ اپنے نفیس سے نستعلیق بچے کو وہ توجہ نہ دے پاتی تھی جس کا وہ طلب گار تھا۔ وہ اپنے آپ میں کھوئی تھی، یوں لگتا تھا کہ وہ خود رحمی سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو کسی المیے کی ہیروئن تصور کر لیا تھا اور اپنی محرومیوں سے ایک طرح کی لذت حاصل کرتی تھی۔

سو اس نے جب آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو شیطان اور گہرے سمندر کے بیچ پایا۔ باپ کے لئے وہ ایک فالتو بوجھ تھا اور ماں کے لئے موجود ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے اندر گم تھا۔ کائنات کی بسیط وسعتوں میں وہ اکیلا تھا۔ وہ اکثر سوچتا رہتا کہ وہ اگر ہے تو کیوں ہے؟ ایک ایسا سوال جس کا جواب وہ اب تک حاصل نہیں کر سکا تھا۔ یہ الگ بات کہ بڑا ادیب بننے کے بعد اس کے وجود کے بیکار اور فالتو ہونے کے احساس پر انا اور خود بینی کا خول چڑھ چکا تھا، مگر اس خول کی تہہ میں کوئی ناسور تھا، جو اب بھی رستا رہتا تھا۔

دوپہر سے شام ہونے کو آئی اور وہ وہیں برگد کے نیچے بیٹھا اپنے وجود کی گرتی دیوار سنبھالنے میں مصروف تھا۔ کائیں کائیں اور چیں چیں کی آوازوں نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ بوڑھے برگد کی شفیق شاخوں میں جانے کس کس کا بسیرا تھا۔ برگد کی پھیلی ہوئی ٹہنیوں سے ادھر، کھلے آسمان پر ڈھلتے سورج کی مدھم ہوتی ہوئی، روشنی میں بہت سی چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ وہ جانے کیوں برگد کے اوپر اور ارد گرد چکر لگا رہی تھیں۔ شاید انہیں ماس کی بو آ گئی تھی---- مردار ماس کی۔ انہیں ان کی جبلت بتا رہی تھی کہ کوئی مر رہا تھا، اور وہ اس کے مردہ گوشت کو نوچنے کے لئے بے قرار تھیں۔

اس کا ذہن پھر خارج سے داخل کی طرف لوٹ آیا، ان یادداشتوں کی طرف جو مدتوں پہلے وہ طاقِ نسیاں میں رکھ کہیں بھول گیا تھا------ ان گتھیوں کی طرف جن کے سرچشمے اس کے لاشعور میں دفن ہو گئے تھے لیکن آج جبکہ اس کی نظر دھندلا رہی تھی، وہ سب کچھ اسے واضح طور پر یاد آ رہا تھا۔ وہ جب ٹھکرایا گیا تو اسے

اورنگ زیب قاسمی

خود اپنے آپ سے وحشت سی ہونے لگی، بلکہ شدید نفرت اور اس نے حرفِ مکرر کی طرح اپنے آپ کو مٹانے کی مقدور بھر سعی کی۔ اس نے سوچا اور غلط سوچا کہ منفی جمع منفی کا حاصل شاید ریاضی کی طرح اصل زندگی میں بھی مثبت میں ڈھل جاتا ہے۔ اس نے سخت گیر باپ کے سامنے کبھی زبان نہیں کھولی تھی، لیکن اپنے ہر عمل سے باپ کے ہر عقیدے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اس کا باپ ایک زاہد خشک، صوم صلوٰۃ اور شریعت کا پابند شخص تھا۔ باپ کے برعکس وہ کسی قسم کے مذہبی فرائض اور رسوم کی ادائیگی کو ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے باپ کا خدا کی ذات پر پختہ ایمان تھا۔ اس نے اگرچہ کبھی خدا کے وجود کے مابعد الطبیعیاتی مسئلے پر سوچا نہیں تھا، مگر نہ جانے کیوں اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ خدا اگر ہے تو وہ بھی یقیناً اس کے باپ کی طرح کوئی جابر اور ضابطوں پر سختی سے عمل کروانے والی بے جذبات ہستی ہو گی۔

اس کا باپ روایتی اخلاقیات کا پابند تھا اور وہ------ اس نے عنفوانِ شباب ہی سے آوارگی اختیار کر لی تھی۔ دن بھر چادر تان کر سوتا اور شام ڈھلے سو کر اٹھتا۔ رات آوارہ منش بوہیمین صحبت میں بسر کرتا۔ شب بھر وہ ان کے ساتھ شہر کی سڑکوں کی خاک چھانتا۔ بہت جلد وہ ایسے مشاغل کا عادی ہو گیا، جن میں روپے پیسے کی ضرورت پڑتی تھی یعنی جوئے اور شراب کی لت۔ ان مشاغل سے پہلے اس کی زندگی سپاٹ اور بے معنی تھی۔ ان چیزوں نے جیسے اس کے لئے وقت گزارنے کا ذریعہ مہیا کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بے راہروی ہے، مگر وہ تو تھا ہی کجرو، اور اسی کجروی سے وہ اپنے وجود کا اثبات کرتا تھا۔ جوئے میں ہار جیت کے نامعلوم ہونے اور سب کچھ داؤ پر لگانے میں جو لطف تھا، اس نے اسے جوئے کا رسیا بنا دیا۔ جہاں تک شراب کا تعلق تھا، اس سے اس کی بصیرت میں اضافہ اور ادراک میں وضاحت پیدا ہو جاتی تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ کڑواہٹ بڑھ جاتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ بڑی تیزی سے ذلت آمیز پستیوں کی طرف گر رہا ہے مگر شاید وہ ایک ایسا شخص تھا جو بڑی محبت، محنت اور احتیاط سے اپنے لئے خود ایک ایسا قید خانہ تیار کر رہا تھا جس سے سوائے موت کے کوئی مفر ممکن نہ تھا۔

اس دوران اس نے کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ بہت جلد اسے خود اور دوسروں کو بھی احساس ہو گیا کہ اس بھٹکے ہوئے نوجوان میں ایک بڑا ادیب سانس لے رہا ہے۔ اس کا ذہن کمپیوٹر کی سی تیزی اور فنی چابکدستی سے کہانیاں گھڑتا اور اپنے اس تخلیقی عمل سے محظوظ ہوتا۔ وقت گزرتا گیا۔ اس کی آوارگی، مے نوشی اور فن کی عظمت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لیکن اس کا افلاس اپنی جگہ قائم رہا۔ اس کی عظیم کہانیاں جن کا ہر لفظ صدیوں کے عذاب کا حاصل تھا اور ہر سطر اس نے اپنے لہو میں قلم ڈبو کر لکھی تھی، ان کی قیمت دنیا نے کیا لگائی؟ چند ٹکے------ صرف چند ٹکے------ اور یوں وہ اپنے خوبصورت اور بصیرت افروز افسانے چند روپوں کے عوض فروخت کرتا رہا تاکہ اس کی مے نوشی جاری رہ سکے۔ نان نفقے کی اسے پروا نہ تھی۔ وہ اس کے لنگوٹیے یار حافظ کے ذمے تھی۔ حافظ ایک غیر ادبی قسم کا اوسط درجے کی عملی ذہانت کا مالک تھا۔ ان دونوں میں کوئی اشتراکِ خیال یا ذہنی یگانگت نہ تھی، نہ ہو سکتی تھی، لیکن دونوں میں بچپن سے ایک ناقابلِ فہم جذباتی لگاؤ تھا جو اب تک قائم تھا۔ ویسے بھی حافظ کے گھریلو اخراجات بہت کم تھے کہ وہ مجرد تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ حافظ نے بیوی بچوں کے بدلے اسے زندگی بھر کے لئے قبول کر لیا تھا اور یہ پیمان وفا وہ اب تک نبھا رہا تھا۔

اس وقت وہ حافظ کی دکان تک پہنچنا چاہتا تھا' مگر یہ جوئے شیر لانے کے برابر تھا حافظ کی دکان انارکلی کے آخری سرے پر ایک تنگ گلی میں تھی اور وہ اپنے نحیف ونزار جسم کا مردہ بوجھ اٹھا کر دو قدم چلنے کا متحمل بھی نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی بچی کھچی توانائی اکٹھی کی اور منٹوں کی مسافت صدیوں میں طے کرتے ہوئے بالآخر وہ حافظ کی دکان تک پہنچا۔ دکان بند پڑی تھی۔ ساتھ والے دکاندار نے بتایا کہ ایک گھنٹہ پہلے حافظ کے کسی دور کے عزیز کی مرگ کی خبر ملی تھی۔ لہٰذا حافظ دکان بند کر کے چلا گیا تھا۔

اس کے سر کی نسیں جیسے پھٹنے کو تھیں اور شریانوں سے خون ابلنے کو تھا۔ بوٹی بوٹی میں چھریاں چبھ رہی تھیں۔ سانس پھولا جارہا تھا پہلو میں دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اس کیفیت میں میکلوڈ روڈ تک اپنے ایک کمرے کے فلیٹ تک جانے کی حالت میں نہ تھا۔ سو اس نے جیب میں صرف آٹھ آنے ہونے کے باوجود ہسپتال روڈ سے تانگہ لیا اور تانگے والے کو میکلوڈ روڈ پر اپنے فلیٹ کا پتہ سمجھا کر خود تانگے کی پچھلی سیٹ پر لیٹ گیا۔

تانگہ شہر کی مختلف سڑکوں سے مینڈک کی طرح پھدک پھدک کر گزر رہا تھا۔ کئی جگہ مریل گھوڑا تانگے والے کی چابک سے اڑیل بھی ہو جاتا اور جھٹکے سے کھڑا ہو جاتا تانگے والا اسے پچکارتا یا نیچے اتر کر اسے غصے سے کھینچتا تو وہ کافی اڑی کے بعد چلنے کو تیار ہوتا۔ سفر لمبا ہوتا چلا جارہا تھا اور اس کی حالت دگرگوں۔ خدا خدا کر کے تانگہ منزل پر پہنچا۔ اس کی جیب میں آٹھ آنے تھے جو اس نے تانگے والے کو تھما دیے۔ تانگے والے کے چہرے پر مایوسی کے آثار ظاہر ہوئے' لیکن اس نے دیکھا کہ آدمی سفید پوش اور پڑھا لکھا لگتا ہے' حالت بھی بہت خراب ہے' شاید آخری دموں پر ہے' سو وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو رہا۔

وہ تانگے سے نیچے اترنے لگا تو ضعف سے لڑکھڑا سا گیا اور اس کے علی گڑھ پاجامے کا کھلا پائنچہ پائدان میں اٹک گیا۔ وہ گرنے لگا تھا' لیکن سنبھل گیا۔ اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ وہ سنبھل گیا تھا' ورنہ بھرے بازار میں چاروں شانے چت گرنا اس کے وقار کے کس قدر خلاف تھا۔ پہلے ہی تانگے والے کو پورا کرایہ نہ ادا کرنے کے سبب وہ شرمندہ سا تھا۔

"وقار؟" اس کے لبوں پر طنز سے کسیلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ "کیا اس کا بھی کوئی وقار ہے؟" وہ کتنا حساس تھا اب تک ان معمولی معمولی باتوں کے بارے میں' حالانکہ وہ دنیا بھر کی ذلتوں اور رسوائیوں کو خود لبیک کہنے والا تھا۔

تانگے والا تشویش سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "باؤجی۔ میں آپ کو اوپر چھوڑ آؤں' سہارا دے کر۔ سیڑھیاں ہیں۔"

"نہیں بھئی' نہیں۔ میں پہنچ جاؤں گا اوپر' کسی نہ کسی طرح۔"

وہ اندھیری سیڑھیوں سے دیوار کے سہارے' ٹٹولتے ہوئے اوپر دوسری منزل میں پہنچ گیا اور فلیٹ نمبر ۲ کا مقفل دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ بجلی کا بٹن دبایا' کمرہ روشن ہو گیا۔ چالیس واٹ کے بلب کی روشنی پیلی پیلی خیالی سی تھی۔ چھوٹے سے کمرے میں بان کی ایک چارپائی پڑی تھی جس پر مسلا ہوا اور گندا بستر تھا ایک کونے میں لکڑی کی بوسیدہ سی الماری تھی جس کے پاس لکڑی کی بے ڈھنگی سی میز تھی۔ میز کی کھردری سطح پرانے اخبار کے صفحات سے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ میز پر ایک دو کتابیں اور کچھ پریشان اوراق تھے۔

اورنگ زیب قاسمی

کمرے کے دوسرے کونے میں مٹی کی صراحی تھی جس پر شیشے کا گلاس اوندھا رکھا ہوا تھا۔ اس نے کمرے پر طائرانہ نگاہ دوڑائی ——— "تہی دامن" اس نے سوچا "کسمپرسی کی تصویر۔ بالکل اس کی زندگی کی طرح۔"

کمرے میں ایک چھوٹے سے غسل خانے کا دروازہ اور ایک کھڑکی تھی جو میکلوڈ روڈ کی طرف کھلتی تھی۔ سامنے شہر کا مشہور سینما "رتن" تھا۔ اس نے کمرے کی گھٹن کم کرنے کے لئے کھڑکی کھول دی۔ باہر لاہور کی دھواں دھواں سی شام تھی۔ سڑک پر پیدل لوگ' سائیکل سوار اور تانگے ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی موٹر کار بھی دکھائی دیتی تھی۔ سامنے سینما کا صحن اس وقت ویران تھا۔ اس نے سینما کی عمارت کے ماتھے پر لگے ہوئے دیو قامت پوسٹروں کو دیکھا۔ ہر اداکار کا جسم اور آنکھیں اصل جسامت سے اس قدر بڑے تھے کہ مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔ اسے ابکائی سی آنے لگی وہ جلدی سے غسل خانے میں گیا۔ قے کے بعد اسے قدرے سکون محسوس ہونے لگا۔ واپس آکر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ زندگی کے پچھلے پہر' موت کے قدموں کی بڑھتی ہوئی چاپ میں' وقت کے بجتے پائلوں کے زور پر تکا کے شور میں' وہ تن تنہا تھا' نہ کوئی ساتھی' نہ حاصل نہ حصول' نہ کوئی رشتہ نہ بندھن۔ سچ کہنے کے جنون' دیانتداری کے خبط' بے باکی کی عادت' اور خود بینی نے اس کی کسی دوستی کو بھی پنپنے نہیں دیا تھا۔ بس ایک ڈور تھی جو برسوں سے اس نے تخلیق سے باندھ رکھی تھی ——— مگر شراب سے قطرہ قطرہ اس کا ذہن پگھل چکا تھا۔ اس کے دماغ کے خلیے ریزہ ریزہ ہو چکے تھے۔ تخلیق کے سوتے جو اس کے ذہن کی کوکھ سے پھوٹتے تھے اور پل بھر کو اس کی سنگلاخ چٹانوں جیسی حیات کو گلنار کر دیتے تھے' سوکھ چلے تھے۔ الفاظ اس کی گرفت میں نہیں تھے' اب وہ کہانیوں کے پیکر شیشے میں اتارنے سے قاصر تھا۔ خیالات کے تھرکتے سڈول بدن اس کے ہاتھ نہیں آتے تھے' جو ساقی اس کا مقدر تھی۔ کچھ عرصے سے اس کے لکھنے کی صلاحیت' کہانی کہنے کا قرینہ' جدت کا سلیقہ' سب زنگ آلود قفل تھے' جنہیں وہ کوشش کے باوجود کھول نہیں سکتا تھا اس کے ہاتھوں کی طرح اس کے ذہن میں لرزش سی تھی' اور اس پر قیامت یہ کہ وہ اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ وہ اب جو کچھ لکھ رہا ہے بکواس ہے۔ فن ——— اس کا آخری رفیق سفر بھی اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اس نے زندگی بھر ذلتیں اٹھائی تھیں۔ لوگوں نے اس پر جی بھر کر کیچڑ اچھالا تھا اور اس نے کیچڑ میں لت پت ہو کر جینا بھی سیکھ لیا تھا' مگر وقت نے اس پر سب سے بڑا ستم یہ ڈھایا تھا کہ جس فن نے اس کی عزت نفس کا بھرم اور پندار رکھا ہوا تھا اس کی آخری رمق بھی مسلسل اور بے تحاشا مے نوشی نے نچوڑ لی تھی۔ اب اس کی تخلیقی صلاحیت ایک نچڑا ہوا بوسیدہ کپڑا تھی جس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ المیہ یہ تھا کہ وہ اب بھی ایک بوڑھی ہوتی ہوئی طوائف کی طرح اپنے تن جسم اور سرد جذبات کے کاروبار میں مصروف تھا' حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اب یہ جنس فروخت کے قابل نہیں اور دیانت کا تقاضہ تھا کہ اسے بازار میں نہ لایا جائے۔

وہ ابھی خیالات کی رو میں بہہ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟"

"طاہر۔"

"دروازہ کھلا ہے۔ اندر آجاؤ۔"

طاہر کھاتے پیتے گھرانے کا نوجوان تھا۔ اس کے باپ کا کارخانہ تھا' لیکن اسے نہ جانے کیسے پڑھنے پڑھانے

کی لت پڑ گئی تھی اور اس نے ادیبوں میں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ چینیز لنچ ہوم میں ایک دن طاہر کی اس سے ملاقات ہو گئی تو اس کے ساتھ ایسا منتھی ہوا کہ چوبیں گھنٹے چپکا رہتا۔ شام کو مال روڈ پر اپنی شیورلٹ میں سیر کرواتا۔ رات کو وسکی کی ایک بوتل بھی لے آتا اور دونوں اس کے فلیٹ پر شغل کرتے۔ طاہر کے ذہن میں افسانہ نگار بننے کا سودا سما گیا تھا۔ اس نے کئی ایک افسانے لکھے اور اسے اصلاح کے لئے دیئے' مگر وہ انہیں دوبارہ لکھنے کو کہتا۔ یہ استادی شاگردی کا سلسلہ کچھ عرصے چلتا رہا۔ ایک دن اچانک طاہر غائب ہو گیا۔ جس طرح یکدم وہ اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا' اسی طرح وہ اس سے نکل بھی گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ اسے معلوم نہ ہو سکا۔ آج تین برس بعد وہ پھر ڈرامائی انداز میں نمودار ہوا تھا۔ طاہر کی آمد سے اسے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ مسرت اس لئے کہ اس کے ذہن میں گزشتہ تجربے کی بنا پر طاہر اور وسکی لازم و ملزوم بن چکے تھے اور اس وقت جب کہ اس کے وجود کی کشتی ڈانواں ڈول تھی تو وسکی کا ایک کوارٹر آب حیات کے چند قطروں سے کم نہ تھا۔

طاہر اندر داخل ہوا' تو اسے دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اس کے ہاتھ میں لفافے میں لپٹی ہوئی کوئی بوتل نہیں تھی۔ وہ اتنے برسوں بعد آیا بھی تو خالی ہاتھ۔ طاہر نے نہ علیک سلیک کی اور نہ اس کا حال پوچھا' بلکہ چھٹتے ہی مطلب کی بات کی۔ شاید اسے خبر تھی کہ وہ زندگی کے آخری سرے پر اٹکا ہوا ہے' جہاں دنیاداری اور رسمیات بے معنی ہو جاتی ہیں " میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔"

اس نے لبوں پر ایک کڑوی کسیلی مسکراہٹ ابھری اور اس نے عینک کے شیشوں میں سے اپنی ایکس رے نگاہیں طاہر پر مرتکز کر دیں " طاہر میں مر رہا ہوں۔" اس نے چھری کی کاٹ جیسی حقیقت پسندی سے بے جذبات آواز میں کہا۔

" جی - میں جانتا ہوں۔" طاہر بھی اسی طرح کی حقیقت پسندی اور عدم جذباتیت سے بولا' لیکن اس کا لہجہ انتہائی مودبانہ تھا۔

" پھر بھی' اس وقت میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔"

" بہت کچھ۔"

" کیا؟"

" آپ جانتے ہیں کہ مجھے جنون کی حد تک شوق ہے کہ میں افسانہ نگار بن جاؤں' اور میرے افسانے مستند اور معتبر ادبی جرائد میں چھپ سکیں۔"

" مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم صحیح معنوں میں لکھ نہیں سکتے۔"

" جی - ہاں۔" طاہر نے بڑی بے باک دیانت داری سے اعتراف کیا۔ " مگر ---"

اس نے سوچا کہ اب طاہر اس سے کہے گا کہ وہ اسے اپنا کوئی تازہ افسانہ دے تاکہ طاہر اسے اپنے نام سے کسی رسالے میں چھپوا سکے۔ سو اس نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ " میں نے کافی عرصے سے کچھ نہیں لکھا' اور اب ---- اب تو دم رخصت تمہیں مجھ سے ایسی کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔"

" نہیں - میں جانتا ہوں کہ آپ ایک عرصے سے کچھ نہیں لکھ سکے۔"

اسے یوں لگا جیسے کسی نے بھرے بازار میں اس کے منہ پر زناٹے سے تھپڑ مار دیا ہو لیکن اس نے اپنی

اورنگ زیب قاسمی

اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ " تو پھر ---؟"

" میری آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ اپنا نام میرے حوالے کر دیں تاکہ میں اپنی تحریریں آپ کے نام سے مشہور رسائل میں شائع کرواسکوں آپ تو اب رخصت ہو جائیں گے۔ آپ کو اس سے کیا فرق پڑے گا کہ آپ کے نام کو کون استعمال کر رہا ہے۔"

صدمے سے اس کی زبان جیسے گنگ ہو گئی۔ طاہر جو عرصے تک اس کی دوستی کا دم بھرتا تھا کس قدر ذلیل تھا۔ وہ خود بھی قباحتی تھا' پھبتیوں کا دلدادہ ' ذاتوں کو گھگے لگانے والا' معاشرے کی روایتی اخلاقی اقدار کی نفی کرنے والا' لیکن وہ اتنا کمینہ نہیں تھا کہ دم واپسیں کسی سے اس کی متاع زیست چھین لے' کسی خون آلود لاش کے سر کا سودا کرے۔ اس کے پاس تھا کیا سوائے ایک نام کے اور یہ شخص مرتے وقت اس سے وہ بھی چھین لینا چاہتا تھا۔ اس کے دل سے لہو ٹپکا' مگر آنکھ میں کوئی آنسو نہ تھا۔ اس معاشرے میں جہاں لین دین نفع اور نقصان کے اصول پر ساری حیات ایک کاروبار ہے' وہاں کسی سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

" لیکن تمہیں اس سے کیا حاصل ہوگا؟"

طاہر کی آنکھیں مسکرانے لگیں اس کی سادگی پر۔ پھر نہایت شستہ انداز میں بولا۔ " آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اتنے بڑے افسانہ نگار اور اتنی سی بات سمجھ نہیں پائے۔ مجھے مادی اور روحانی دونوں طرح سے فائدہ ہوگا۔ میں لوگوں سے کہوں گا کہ آپ مرتے وقت اپنے غیر مطبوعہ افسانے میرے حوالے کر گئے ہیں اس طرح میں ان کے مجموعے چھپوا کر' بیچ سکوں گا اور اس سے مجھے مالی فائدہ بھی ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح Vicarious Satis faction حاصل ہوگی کہ آخر میری تحریریں بھی شائع ہو گئیں' چاہے میرے نام سے نہیں آپ کے نام سے ہو گئیں۔ آپ کا نام اتنا بڑا ہے کہ لوگ میری تحریروں کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔"

اسے یوں محسوس ہوا جیسے طاہر اس تصور سے چٹخارے لے رہا ہو ------ تاجر' بنیا۔ تاجر کا بیٹا آخر کاروباری نہیں ہوگا تو کیا ہوگا

پھر اسے خیال آیا کہ وہ چند گھڑی کا مہمان ہے۔ روح کی ابدیت پر اس کا کوئی ایمان نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں مٹی مٹی میں اور راکھ راکھ میں مل جائے گی' اور بس اس کا شعور بھی جسم کی طرح فانی ہے۔ مرنے کے بعد اسے کسی قسم کا احساس نہ ہوگا کہ اس کے نام کا کیا حشر ہوا۔ مگر اس پل --- اس پل تو وہ زندہ ہے' سانس لے رہا ہے۔ دکھ اور سکھ ' اذیت اور لذت کو محسوس کر سکتا ہے' تو پھر کیوں نہ وہ شام کے اس کنارے چند گھڑیاں کیف و سرور کی گزارے' فروغ مے سے کیوں نہ اپنے املتاس چہرے کو گلابی کرے۔ اس تجارتی معاشرے میں اپنی زندگی کے ڈراپ سین سے پہلے کیوں نہ ایک آخری سودا کرے' حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ گھاٹے کا سودا ہے اور اس کی موت کے بعد یہ سوداگر اس کی کھال کھنچوا کر اپنے لئے جوتے بنوائے گا۔ مگر کیا ہوا ان چند بچی کچی گھڑیوں کی تلچھٹ تو پی جاسکے گی ----- اور اس نے اپنا سب کچھ اس آخری داؤ پر لگانے کا سوچ لیا۔ آخر وہ ایک جواری جو ٹھہرا' لمحوں میں زندہ رہنے والا اور ابھی وہ اس لمحے زندہ تھا۔ کیا ہوا کہ وہ گھڑیوں میں رخصت ہونے والا تھا۔

" طاہر! ٹھیک ہے - جو جی میں آئے کرو' لیکن مجھے اس وقت وسکی کی اشد ضرورت ہے۔ ہو سکے تو لے آؤ۔ وسکی کی ایک بوتل کے عوض میرا نام ----- یہ کوئی مہنگا سودا نہیں۔"

طاہر پلک جھپکنے میں گیا اور وسکی لے کر واپس بھی آ گیا۔ ساتھ میں اخبار کے کاغذ میں لپٹے ہوئے تکے کباب بھی تھے۔ غالباً طاہر کو اندازہ تھا کہ وہ صبح سے بھوکا ہوگا۔ "معلوم ہوتا ہے طاہر پہلے ہی سے وسکی اور کباب لے کر آیا تھا مگر بدذات نے جان بوجھ کر سودا بازی کی نیت سے اسے سیڑھیوں کے روشن دان میں چھپا دیا تھا۔" اس نے سوچا "انسان کی پستی کی شاید کوئی حد نہیں ہوتی۔"

سینما کا آخری شو بھی ٹوٹ چکا تھا۔ سینما بین کب کے گھروں کو جا چکے تھے۔ سڑک پر سے کوئی تانگہ گزرتا تو گھوڑے کی دور ہوتی ہوئی ٹاپوں کی آواز دیر تک سنائی دیتی' پھر فاصلوں میں ڈوب جاتی۔ اس نے دو تکے کباب کھائے۔ وسکی کی بوتل کھولی اور مٹی کی صراحی پر اوندھے گلاس میں انڈیل دی ایک چوتھائی بوتل پینے کے بعد جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس نے آہستہ آہستہ چسکیاں لیتے ہوئے ایک چوتھائی اور پی لی۔ سرور کی لہریں سی رگ و جاں میں دوڑنے لگیں۔ اس کی بوٹی بوٹی میں پھیلی ہوئی دکھن' اس کے رگ و ریشے میں سرایت کیا ہوا درد' اس کے پور پور میں رچی اذیت' سب مدھم پڑنے لگیں۔ وہ جیسے اپنے جسم سے باہر نکل کر علیحدہ کھڑا تھا۔

یہ کیفیت کچھ دیر قائم رہی۔ جیسے مریض مرنے سے پہلے سنبھالا لیتا ہے' چراغ گل ہونے سے پہلے بھڑک اٹھتا ہے' ایسے ہی اس کے ذہن کی راکھ کریدنے سے بچی کھچی چنگاریاں دہک اٹھیں۔ اس نے اٹھ کر لکڑی کی بے ڈھنگی میز چارپائی کے سرہانے جوڑ کر رکھی' پھر اس پر وسکی کی بوتل اور گلاس سجا کر رکھا چارپائی کے سرہانے سے تکیہ اٹھا کر اسے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا جس کے ساتھ چارپائی جڑی ہوئی تھی۔ میز سے دس بارہ میلے کچیلے سادہ کاغذ اٹھائے اور لکھنا شروع کر دیا۔ اس کے ذہن میں خیالات کی فراوانی' الفاظ کی روانی' اور کہانی کے واقعات کی مسلسل آمد نے خود اسے حیران کر دیا تھا۔ ایسا بہت مدت بعد ہوا تھا' ورنہ اب تو وہ کوشش کے باوجود لکھ نہیں پاتا تھا۔

وہ لکھتا رہا' سحر ہونے تک ' اپنی آخری کہانی۔ صبح کو جب سورج کی پہلی کرنیں کھڑکی سے داخل ہو کر اس کے چہرے پر رقصاں ہوئیں تو انہوں نے اس کے چہرے پر ایک گہری آسودگی اور عجیب قسم کی طمانیت پائی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی' تکمیل آرزو کی۔ وہ پورا ہو چکا تھا۔ وہ اپنا آخری شاہکار مکمل کر چکا تھا ---- آخری کہانی ---- اور یہ اس کی اپنی کہانی تھی ---- اس کے اس دنیا میں آخری دن کی کہانی۔

اسی دن شام کو حافظ گجرات سے لاہور واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ ہسپتال سے چھٹی کے بعد انتہائی نازک حالت میں اس کی دکان پر آیا تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی وہ اس کے فلیٹ پر پہنچا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ حافظ اندر داخل ہوا تو اسے سامنے چارپائی پر اس حالت میں پایا کہ اس کا سر پاس رکھی تپائی پر گرا ہوا تھا۔ وسکی کی بوتل میز پر الٹی پڑی تھی' شیشے کا گلاس نیچے گر کر چور چور ہو چکا تھا۔ بوتل میں سے بہتی ہوئی وسکی ان کاغذوں کو بری طرح سے آلودہ کر چکی تھی جن پر ٹیڑھے میڑھے الفاظ اور شکستہ جملوں میں شاید کچھ لکھا ہوا تھا۔ کچھ کاغذ میز پر تھے جو مکمل طور پر بھیگ کر اکڑ گئے تھے' کچھ زمین پر بکھرے تھے' مگر وہ بھی اتنے داغدار کہ ان پر لکھی تحریر کی سیاہی پھیل چکی تھی۔

حافظ کوئی خاص پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا۔ پرائمری سے آگے وہ مدرسے میں تعلیم حاصل نہیں کر سکا تھا۔

اورنگ زیب قاسمی

ادب شناسی تو کیا وہ صحیح طور پر اردو پڑھ لکھ بھی نہیں سکتا تھا' اور نہ ہی اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ غور کرتا کہ میز اور فرش پر بکھرے کاغذوں پر کیا لکھا ہے۔ البتہ اسے صفائی کا مالیخولیا تھا اور ہر چیز کو قرینے سے رکھنے کا جنون۔ سو اس نے سب سے پہلے اس کی اوندھے منہ پڑی لاش' جس کا سر میز پر ٹکا تھا' سیدھی کر کے بستر پر لٹا دی۔ پھر وسکی کی خالی بوتل کو اٹھا کر غسل خانے کے ایک کونے میں رکھا۔ گلاس کی کرچیاں وسکی سے داغدار کاغذ پر میز پر پڑے پرانے اخبار میں سمیٹے اور انہیں اٹھائے ہوئے فلیٹ کا دروازہ بند کر کے سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر آ گیا۔

تجہیز و تکفین کی تیاری کے لئے جانے سے پہلے حافظ نے پرانے اخبار میں لپٹی سب چیزیں قریب ہی کوڑے کے ایک ڈھیر پر پھینک دیں۔ انہی میں اس کی آخری کہانی تھی۔

(”فنون“ لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

ماسی حاجن اور چوہا چور

ماسی حاجن اور چوہا چور ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان کے اصل ناموں کی اس کہانی میں کوئی اہمیت نہیں۔ گاؤں کا نام لکھنا بھی ضروری نہیں۔ کیا پتا وہ میرا ہی گاؤں ہو۔

چوہا چور کوئی نامی گرامی چور نہیں تھا۔ وہ جس زمانے کا چور تھا' اس میں چوروں کا بھی ضابطۂ اخلاق ہوتا تھا مگر وہ اس کا بھی پابند نہیں تھا۔ مثلاً اس نے اکثر چوریاں اپنے ہی گاؤں میں کیں حالانکہ مشہور تھا کہ جس گاؤں میں چور پیدا ہو جائے' وہاں کے لوگ رات کو سکھ کی نیند سوتے ہیں۔ ساتھ کے گاؤں میں اس کے ہم عصر کریم چور نے بڑا نام پیدا کیا تھا' اس کے ہوتے اس کے گاؤں میں کبھی چوری نہیں ہوئی تھی۔

چوہا چور ایک ہی ضابطۂ اخلاق کا قائل تھا کہ چور کو چوری کرنی چاہیے۔ خواہ وہ اپنے ہی گھر میں کیوں نہ ہو۔ مشہور تھا کہ پورا ایک سال اسے چوری کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ یا تو چوکیدار اسے عین موقع پر آلیتا۔ اور وہ فرار ہونے پر مجبور ہو جاتا یا گھر کے لوگ جاگ اٹھتے۔ زچ ہو کر اس نے اپنے ہی گھر میں چوری کر لی تھی------ اپنے چھوٹے بھائی کے ہاں جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔

گھر کا جو کمرہ اسے بٹوارے میں ملا تھا' اس کے پیچھے کوٹھڑی تھی۔ دلہن نے "بھڑولے" کی تہ میں اپنے زیور رکھے ہوئے تھے۔ بھڑولے میں گندم بھری ہوئی تھی۔ اس نے گلی کی طرف سے نقب لگائی اور بھڑولے کے سوراخ پر مٹی سے چپکا ہوا ڈھکنا ہٹایا۔ بھڑولے نے بہت سی گندم باہر انڈیل دی۔ فرش پر ڈھیر سا لگ گیا۔ تہ میں رکھی پوٹلی کو ٹٹول کر نکال لینے میں اسے کوئی خاص دقت نہ ہوئی۔ کھرا (قدموں کے نشان) اس نے پکی سڑک پر جا کر گم کر دیا۔

پھر چوہا چور نے کہا: "وڑی! یہ کارستانی چوہدری کریم کی ہے۔ دیکھتا ہوں کہ اسے میرے گھر میں چوری کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔" وہ کریم چور کے گاؤں گیا یا کالے چور کے' کسی کو کھوج لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ سبھی کو یقین تھا کہ زیور خود چوہا چور نے چرائے ہیں چوری کا چسکا بھی شراب کے نشے سے کم نہیں ہوتا۔ جو منہ کو لگ جائے تو چھٹتی نہیں۔ وہ ایک رات باہر رہ کر واپس آیا تو زیوروں کی پوٹلی بھرجائی کو دے کر بولا: "وڑی! دیکھ لے کوئی زیور کم تو نہیں؟"

اسے چوہا چور کا جو لقب ملا تھا' اس کی وجہ تسمیہ کچھ یوں ہے۔ وہ ایک "چھچھیکا" سا جوان تھا------ دبلے پتلے پھرتیلے جسم کا مالک۔ بدن میں بہت لچک تھی۔ سکڑ سمٹ کر چھوٹے سے سوراخ سے بھی گزر جاتا۔ اس کی لگائی ہوئی نقب سے چوہا گزر جائے تو گزر جائے' کسی آدمی کے بچے کا گزر ممکن نظر نہیں

آتا تھا۔

اوپر میں نے کریم چور کو چوہدری کہا ہے' اس لئے نہیں کہ چور اپنا چوہدری ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ رات کو وہ چور ہوتا اور دن کو چوہدری دس بارہ گھماؤں زمین کا مالک بھی تھا۔ لٹھے کا کرتہ اور تہبند' سر پر کلف والی پگڑی جس کا طرہ بھی نکلا ہوتا' پاؤں میں نازک سی دیسی جوتی اور ان کے نیچے سبک رفتار گٹھے ہوئے جسم والی گھوڑی۔ سنا تھا کہ گاؤں کی پنچایت کا اکثر اسے سرپنچ بھی چنا جاتا۔

میں نے اپنے لڑکپن میں اسے دیکھا تھا' اپنے ننھیالی گاؤں میں جہاں وہ ایک شادی میں شریک ہوا تھا میں نے اپنے ماموں سے جو اس گاؤں کے پیر تھے' اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر گاؤں کے تکیے میں گئے جہاں برات اتری ہوئی تھی۔ کریم انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

میرے ماموں نے کہا: "چوہدری کریم! یہ لڑکا تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

اس نے جھک کر میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور بولا: "چھوٹے پیر جی! آپ نے یہاں آکر میری عزت بڑھائی۔ فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

میں نے ہچکچا کر کہا: "چاچا یونہی ..... میرا مطلب ہے ..... ہمارے گاؤں میں بھی ایک چور ہے کیا آپ اسے جانتے ہیں میں نے اپنے گاؤں کا نام بتایا؟"

چوہدری کریم کھلکھلا کر ہنسا: "کیوں نہیں؟ ..... جانتا ہوں ..... چوہا چور کو کون نہیں جانتا ..... اپنا دوست یار بھی ہے۔"

"لیکن وہ آپ کی طرح کا کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ میرے سوال پر کچھ دیر خاموش رہا' پھر مسکرا کر کہنے لگا: "بھتیجے! وہ صرف چور ہے چوہدری نہیں .... اپنے ہی گاؤں میں چوری کرتا ہے ..... لیکن کالے کوسوں دور کسی گاؤں میں ہونے والی چوری میں بھی پولیس اسے دھرلیتی ہے۔ میں تھانے کے اندر بھی چوری کر لوں' پولیس مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔"

چوہدری کریم کی یہ منطق فوراً میری سمجھ میں آگئی۔ وہ چور ضرور تھا لیکن رکھ رکھاؤ کا قائل' وضع دار قسم کا' طرہ اونچا رکھ کر چوری کرنے والا چور۔ صرف اسے لوٹتا جو لوٹے جانے کے قابل ہوتا۔ پھر سخی بھی تھا۔

چوہا چور بھی دو چار کھیتوں کا مالک تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی سے مل کر ایک مشترکہ کنویں پر زراعت بھی کی لیکن چوہدری کبھی نہ بن پایا۔ دن کو نہ رات کو۔ میلے کچیلے کپڑے' ڈیڑھ ہاتھ کا صافہ سر پر' پاؤں میں تڑخے ہوئے ٹوٹے پھوٹے جوتے۔ اگر کبھی دھلے کپڑے اور نئے جوتے پہن لیتا تو وضع قطع سے بے تکا معلوم ہوتا۔ اسے کبڈی کھیلنے کا شوق تھا۔ کبڈی ڈالنے جاتا تو بڑی ترت پھرت دکھاتا لیکن کچھ ڈالنے والے حریف سے دو چار قدم دور رہ کر۔ مجال ہے کہ بدن پر ہاتھ لگنے دے۔ وہ کبڈی کا ایسا کھلاڑی تھا جو کسی کو مارتا ہے نہ خود مرتا ہے' تماشا دیکھنے والا جس لطف کی تلاش میں آتا ہے وہ ہیرا پھیری کر کے اسے بھی چرالیتا ہے چوہا چور اکثر چوری کرکے پکڑا جاتا۔ دوسروں کی چوری بھی اس کے نام لگ جاتی۔ اسے اپنے ہی گاؤں کے لوگوں کے سامنے مار پڑتی۔ مار پڑتی تو چلاتا بہت تھا۔ ایک بار چیخ و دہاڑ سن کر میں بھی نمبردار کی حویلی میں چلا گیا جہاں پولیس آکر ٹھہری تھی۔ ایک پولیس مین اسے پیٹ رہا تھا۔ اور غلیظ گالیاں بھی دے رہا تھا۔ روتے روتے وہ ایک دو گالیاں تماشا دیکھنے والوں کی طرف سے بھی پھینک دیتا۔ میں نے عزت سادات

خطرے میں دیکھی تو وہاں سے کھسک آیا۔

پھر یہ خبر اڑی کہ چھاچھا چور نے چوری مان لی۔ اس نے کماد کے ایک کھیت میں مال دبا رکھا تھا۔ دو سپاہیوں کی حفاظت یا حراست میں وہ کماد میں گھس گیا۔ جب باہر نکلا تو ایک گٹھڑی اس کے سر پر تھی۔ اب حویلی کے اندر کا منظر پبلک کے لئے ممنوع قرار دے دیا گیا۔ گاؤں کے دو نمبردار تھے وہ بتاتے تھے کہ ہماری موجودگی میں گٹھڑی کھولی گئی۔ جس کی چوری ہوئی وہ بھی موجود تھا۔ اس نے کہا کہ جناب کپڑے تو پورے ہیں لیکن پانچ تولے کا زیور کہاں گیا۔ اب چھاچھا چور کے بجائے بیچارے "سادھ" کو فکر پڑے۔ نمبرداروں کی سفارش پر دو چار تھپڑوں ہی پر اکتفا کر لیا گیا۔ ایک کورے کاغذ پر اس سے انگوٹھا لگوا لیا گیا کہ مال پورا ہے۔ معلوم ہوا کہ بلے گا اس وقت جب عدالت سے چور کو سزا مل جائے گی۔ چھاچھا چور ایک ہفتہ پولیس کا مہمان رہا۔ وہ تو چھوٹ گیا لیکن بے چارے سادھ کو کپڑوں کی گٹھڑی بھی نہ ملی۔ البتہ عدالت میں پیشیوں سے بچ گیا۔

میں نے ایک دن مروتاً اس سے پوچھا: "چاچا اللہ رکھے! کیا چوری ہونے والا مال مل گیا؟"

"بھتیجے! مال کیا ملتا؟ دو تین مرغیاں تھیں وہ بھی ہلیے چٹ کر گئے پھر بھی اللہ کا شکر ہے کہ عزت بچ گئی۔"

میں ایک عرصے تک اپنے آپ سے پوچھتا رہا کہ چاچا رکھے کی عزت کس مٹی سے بنی تھی کہ مال گنوانے اور فکر کھانے کے بعد بھی بچی رہی۔ ابھی تک مجھے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔

چھاچھا چور شاکی تھا کہ رکھے نے رپٹ لکھوا کر اسے مال کھانے دیا نہ خود واپس لے سکا۔ "بلاشک میں اس تھانے کا سب سے بڑا چور ہوں پر پولیس مجھ سے بھی بڑی چور ہے۔"

اور مجھے اس محاورے کی عملی تفسیر مل گئی کہ چوروں کو مور کیسے پڑتے ہیں۔

مائی حاجن کے ہاں جو چوری چھاچھا چور نے کی، وہ میرے ہوش سے پہلے کی ہے لیکن یہ واقعہ میرے گاؤں میں بہت اہمیت کا حامل تھا، اس لئے ایک دو نسلوں تک چلا اور اب میں یہ کہانی لکھ کر اپنے سے بعد کی نسل کو پہنچا رہا ہوں۔ یہی دو چار کہانیاں تو گاؤں کی کل کائنات ہوتی ہیں۔

مائی حاجن بڑی دیندار خاتون تھی۔ ابھی جوان ہی تھی کہ حج کا شوق اس کے دل و دماغ میں چھا گیا۔ اس نے پیسہ پیسہ بچا کر حج کے لئے رقم جمع کی اور جب رقم پوری ہوئی تو وہ ادھیڑ عمر کی ہو چکی تھی۔ ہزار ڈیڑھ ہزار روپے کے سکے تھے جو اس نے لوہے کی ایک صندوقچی میں ڈال کر گھر کی سب سے پچھلی کوٹھری کے فرش میں دفن کر دیے تھے۔ اس کا پتا صرف اس کے خاوند کو تھا۔

کہتے ہیں کہ چور کو قدرت نے ایک حس زیادہ دی ہوتی ہے جی تو نہیں مانتا کہ قدرت نے چھاچھا چور پر بھی یہ مہربانی کی ہوگی پر اس نے عین اسی کوٹھری میں نقب لگائی جہاں صندوقچی دبی ہوئی تھی اور فرش بھی وہیں سے کھودا جہاں صندوقچی دبی ہوئی تھی جس طرح آیا تھا اسی طرح سے واپس چلا گیا لیکن صندوقچی لے کر۔

صبح گلی میں سے گزرتے ہوئے کسی نمازی نے نقب دیکھی اور چلا کر کہا: "گھر والو! تم لٹ گئے ہو۔"

مائی حاجن بڑی صبر و شکر والی خاتون تھی۔ جزع فزع سے باز رہی۔ چور کو بددعا بھی نہ دی۔ صرف اتنا کہا: "اللہ کو مجھ گنہگار کا حج منظور نہ تھا۔"

گاؤں کے لوگ چاہتے تھے کہ چھاچھا چور کو مسجد میں لے جا کر قرآن اس کے سر پر رکھیں اور قسم لیں

لیکن مائی نے منع کر دیا۔ کہنے لگی: "اس کا وبال اس کی اولاد پر پڑے گا۔"

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیوں اور کیسے اسی دن سے لوگ اسے مائی حاجن کے نام سے پکارنے لگے۔

ایک روایت یہ بھی مشہور تھی کہ مائی کو خواب میں حج نصیب ہو گیا تھا۔ گاؤں کے واحد حاجی بابا اللہ داد نے مائی کی زبانی اس کا خواب سنا تو رونے لگا۔ اس نے خواب میں دیکھی ہوئی ہر تفصیل کی تصدیق کی اور کہا: "ہم اتنی تکلیفیں برداشت کر کے حج تو کر آئے پر کیا پتا ہمارا حج قبول بھی ہوا یا نہیں اور اس لڑکی کو خدا نے خواب میں حج کرایا' تو سمجھو اسے قبول بھی کر لیا۔"

پر چھاچھا چور چوری سے باز نہ آیا۔ چور سے قطب بننے والے لوگ اور ہی ہوتے ہیں۔ نظر کیمیا اثر بھی تو جوہر قابل ہی کو متاثر کرتی ہے۔

دو اڑھائی سال بعد چھاچھا چور نے اپنی بیٹی کی شادی خاصی دھوم دھام سے کی اور اسے جہیز بھی اچھا دیا۔

مائی نے کہا: "چلو میرا پیسہ میری دھی کے تو کام آیا۔"

ایک چوری میں وہ پکڑا گیا' مقدمہ بنا اور اسے تین سال کی سزا ہو گئی چھوٹ کر آیا تو سیدھا مسجد میں پہنچا۔ غسل خانے میں نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنے اور اعلان کر دیا کہ آج سے وہ چوری سے تائب ہو گیا ہے۔

مشہور ہے کہ چور چوری سے جائے تو جائے لیکن ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ ایک بار وہ دیسی شراب کی خفیہ بھٹی چلانے پر پکڑا بھی گیا۔ پھر مشہور ہوا کہ وہ پڑیاں بیچتا ہے۔ گاؤں میں کئی نوجوان پڑیوں کے عادی ہو گئے اور چوریاں بڑھ گئیں۔ گاؤں کی ایک مسجد سے پنکھے اور کلاک غائب ہوئے' دوسری میں پانی کے لئے جو موٹر لگی تھی' وہ کسی نے انجیئر کر بیچ کھائی۔ یہ کام پڑیوں کے عادی نوجوانوں نے کیا۔

لوگوں نے کہا کہ ان کا گناہ بھی چھاچھا چور کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا اور ایک دن گاؤں کی بڑی مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوا کہ "فلاں " چودھری حج پر جا رہا ہے۔ کسی کو اس سے کچھ لینا دینا ہو تو مسجد میں آ جائے۔

اس اعلان کے پیچھے صرف اتنی سی داستان ہے کہ اس چودھری کے ایک بیٹے نے شہر میں جا کر ٹریکٹروں کی مرمت کا کام سیکھا اور اپنے گاؤں میں ورکشاپ کھول لی۔ اس کی ورکشاپ چل نکلی۔ اس نے اتنی رقم پس انداز کر لی کہ باپ کو حج پر بھیج سکے۔ پر اس کے باپ نے بہت لیت و لعل سے کام لیا اور کہتا رہا کہ حج کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا' پہلے اپنا مکان پکا کر لو' اپنی زمین پر ٹیوب ویل لگاؤ اور ٹریکٹر خرید کر کرائے پر چلاؤ۔

لیکن بیٹے کی ایک ہی رٹ تھی کہ ابا حج پر جاؤ۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو چور کی بجائے ایک حاجی کا بیٹا کہلوانا چاہتا تھا۔ چنانچہ مجبور ہو کر چھاچھا چور نے باقاعدگی سے مسجد میں جانا شروع کر دیا' داڑھی رکھ لی' کچھ مسئلے مسائل بھی سیکھے۔ لوگ کہنے لگے کہ اب وہ سچے دل سے تائب ہو گیا ہے۔

جب نماز روزہ پکا ہو گیا تو اس نے بیٹے سے کہا "اب میں حج پر جانے کو تیار ہوں۔"

مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر جو اعلان ہوا وہ مائی حاجن نے بھی سن لیا۔ وہ اعلان کروائے بغیر حج پر چلا جاتا تو مائی کچھ نہ کہتی۔ اب اس پر فرض عائد ہو گیا تھا کہ مسجد میں جائے اور اپنا مقدمہ دائر کرے۔

اورنگ زیب قاسمی

چنانچہ جب وہ مسجد کے صحن میں پہنچی، اس وقت چوہا چور اجلے کپڑے پہنے، نمازیوں کے جھرمٹ میں دلہا بنے بیٹھا تھا کیونکہ وہ تین ہار اس کے گلے کی زینت تھے۔

جونہی مائی نے مسجد کے صحن میں قدم رکھا، مسجد کی فضا میں ایک عجیب سی سنسناہٹ پیدا ہوئی اور لوگوں نے جانا کہ ہوا کا کوئی تیز جھونکا اس کے رونگٹے رونگٹے کو سرسرا کر گزر گیا ہے۔

چوہا چور کانپنے لگا۔

مولوی صاحب نے پوچھا: "مائی! تم کیوں آئیں ؟"

مائی نے چوہا چور کی طرف اشارہ کر کے پوچھا: "مولوی جی! کیا اس کا حج قبول ہو جائے گا؟"

"یہ تو اللہ کو معلوم ہے مائی! میں کون ہوتا ہوں کہ حج کے قبول ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ دے سکوں" مولوی صاحب بولے۔

"کیا اسے یقین ہے کہ اس کا حج قبول ہو جائے گا؟" مائی نے پھر پوچھا۔

"اس کا جواب تو چوہدری ہی دے سکتا ہے مائی حاجن!" مولوی صاحب نے جواب دیا۔

سارے نمازیوں کی نظریں چوہا چور کے چہرے پر جم گئیں جس پر لہو کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا تھا ----- چند لمحوں کے بعد کہ جو لوگوں کو بہت ہی طویل محسوس ہوا، وہ آنکھیں جھکا کر بولا: "مائی حاجن ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میرا حج قبول نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں ابا!" اس کے بیٹے نے گھبرا کر پوچھا۔ چوہا چور بیٹے کو ایک نظر دیکھ کر زار و قطار رونے لگا۔

مائی نے اس سے مخاطب ہو کر کہا: "اللہ کے بندے! تمہیں اتنا بڑا بول نہیں بولنا چاہیے۔ دنیا میں کون ہے جو لینے دینے کا پورا حساب چکا سکتا ہو .... میں نہ تم ..... اچھا اپنا حساب تم جانو۔ میرا تم سے کوئی لینا دینا نہیں ..... اللہ تمہارا حج قبول کرے!" یہ کہہ کر مائی حاجن مسجد سے چلی گئی۔

چوہا چور کچھ دیر گھٹنوں میں سر دیئے روتا رہا۔ پھر اس نے گلے سے ہار نوچے، گریبان پھاڑا اور پگڑی گلے میں ڈال کر مسجد سے نکل گیا جب وہ گلی میں پہنچا تو زور سے چلایا: "لوگو! سن لو، میرا حج قبول ہو گیا۔ میرا حج قبول ہو گیا۔"

وہ گلیوں سے ہوتا ہوا قبرستان میں جا پہنچا اور وہاں ایک کونے میں ایک ببول کے سائے تلے بیٹھ گیا اور منہ پہ چپ کی مہر لگا لی کیا چور قطب ہو گیا تھا؟

اللہ جانے!

لیکن سعادت مند بیٹے کو ساری عمر یہ افسوس رہا کہ وہ اپنے آپ کو حاجی کا بیٹا نہ کہلوا سکا!

("نردبان" سرگودھا)

اورنگ زیب قاسمی

جب موج ہوا زنجیر بنی

معززین شہر نے میت کو کاندھا دینے اور نماز جنازہ میں شرکت سے انکار کر دیا۔ محلے کے نائی، دھوبی، قصائی، ماچھی، حلوائی اور ریڑھی والوں نے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ نماز جنازہ میں شرکت کرنے والوں قبر میں اتارنے والوں اور مٹی ڈالنے والوں میں وہ لوگ شامل تھے جنہیں معززین شہر سے کوئی سند یا مقام حاصل کرنے میں دلچسپی نہ تھی دن بھر خودکشی کرنے والی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ گلی کے موڑ پہ، مسجد کے سامنے فیکے حلوائی کے تھڑے پہ لوگوں نے خودکشی کے اسباب پہ غور کیا اور آخر اس نتیجے پہ پہنچے کہ سبب خواہ کوئی بھی ہو خودکشی حرام فعل ہے اور معززین شہر کا فیصلہ درست ہے۔

میں نے برسوں پیش کار کی حیثیت سے ملازمت کی ہے اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ عدالت کے سامنے مقدس کتاب پہ ہاتھ رکھ کر جھوٹی قسمیں کھانے والے بے گناہوں کو سزائیں دلوانے والے اور مقدس رشتوں کو پامال کرنے والے اکثر معززین شہر ہوتے ہیں لہٰذا میرے لئے ان کا کوئی فیصلہ بھی قابل قبول نہیں مجھے یقین ہے کہ وقت اور حالات کے تحت انسان کے اندر جو تبدیلیاں آتی ہیں وہ دنیا والوں سے پوشیدہ نہیں رہتیں۔ اس لئے کہ ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے اس کی بنا پہ انسان اپنے لئے اصول وضع کرتا ہے اور جینے کا ڈھب سیکھتا ہے۔ گو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ شریعت بھی کلام سے جاتی نہ رہے گی نہ مشورت مشیر سے نہ کلام ہی سے پھر بھی کوئی اچانک بدلتا ہوا لمحہ انسان کو ایسا جھٹکا دیتا ہے کہ شریعت مشورت یا کلام کا سارا بے معنی ہو جاتا ہے اور انسان اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے غالباً سوہا بھی کسی ایسے جھٹکے کا شکار ہوئی ہوگی مجھے کیا؟ ہوئی ہوگی۔ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں اور جانے والے کی جگہ کبھی خالی نہیں رہتی۔

وہ کہاں سے آئی تھی کہ کسی کو علم نہ تھا اس کا تعلق کس شہر یا کس دیس سے تھا یہ جاننے کی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ وہ ہمارے محلے میں آتے ہی یوں گھل مل گئی جیسے یہیں کی باسی ہو۔ بچوں کو ٹیوشن دیتی مگر یوں لگتا کہ ان کے والدین کو محبت و اخلاص کا درس بھی دیتی ہے۔ میاں بیوی کے جھگڑے ہوں یا لوگوں کے ذاتی مسائل وہ ماہر نفسیات کی مانند سب کا حل جانتی تھی دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ اور دوسروں کے راز کو اپنا راز سمجھتی تھی اس لئے کئی بی بی کے نام سے جانی اور پہچانی جاتی تھی۔ میرے نزدیک یہ ہی اس کے کردار کی سب سے بڑی خامی تھی۔ لوگ اپنے مصائب کے من گھڑت قصے سنا کر اسے رام کر لیتے اور وہ دامے، درمے سخنے ان کی مدد کے لئے تیار ہو جاتی۔

شام کی اذان ہوتے ہی بازار کے واحد کھمبے کا بلب روشن ہوا تو نمازی ایک ایک کر کے مسجد کی جانب

روانہ ہوئے۔ ماسکے نے بوسیدہ تھیلے سے ریوڑیاں نکال کے ریڑھی پہ ڈھیر کیں اور گیس کا لیمپ جلایا۔ زندگی بظاہر معمول پہ آگئی اور رات کی تاریکی میں منتقل ہونے والی ساعتیں اس معمول کو برقرار رکھنے میں نمایاں کردار ادا کر رہی تھی اب فیکے حلوائی کی دکان پہ دودھ اور لسی پینے والوں کی نسبت ان لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جو موہنا کی اچانک موت پہ افسردہ تھے اور اس کا سبب جاننا چاہتے تھے۔ وہ سوالیہ نشان بنے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اگر اس گتھی کا کوئی سرا کسی ایک کے ہاتھ میں آجائے تو وہ مطمئن ہو کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ سکیں گے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے موہنا کو دفن کرنے کے لئے شہر کے قبرستان کی نسبت فضلو کے کلر زدہ کھیت کو ترجیح دی تھی اور یوں اپنی دانست میں معززین شہر کی توہین کی تھی ---

جس کھیت میں وہ دفن کی گئی تھی کمہار کا کھیت نہ تھا پھر بھی پردیسیوں کے دفن کے لئے تیس روپوں میں خریدا گیا تھا۔ کھیت خواہ کمہار کا ہو یا چمار کا۔ اس میں پردیسی دفن ہو یا کوئی پردیسن یہ بات واضح ہے کہ اس کی خرید و فروخت میں ملوث حضرات ہمیشہ بے خبر ہوتے ہیں کہ وہ تاریخ میں کسی نئے باب کا آغاز کرنے جا رہے ہیں جس طرح زمانہ ماضی کے لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ کمہار کا کھیت " خون کا کھیت " کہلائے گا اسی طرح ہم سب لاعلم ہیں کہ آنے والا کل فضلو کے کلر زدہ کھیت کو کس نام سے یاد کرے گا۔ البتہ فضلو نے اپنے کھیت کی وصول شدہ رقم سے گنی بی بی کے نام کا کتبہ بنوایا اور قبر کے چاروں اطراف ہری جھنڈیاں لگا کر اعلان کر دیا کہ گنی بی بی زندہ رہے گی۔ اسے یقین تھا کہ وہ تیسرے دن قبر سے باہر نکل آئے گی یا کم از کم اسے ضرور نظر آئے گی۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح لوگوں کے مسائل حل کرے گی اور دکھی دلوں کی ڈھارس بندھاتی رہے گی۔

موہنا سے میری پہلی ملاقات ماسکے کی معرفت ہوئی تھی۔ مالک مکان نے اس پر مقدمہ کر دیا تھا مگر وہ مکان خالی کرنے پہ آمادہ نہ تھی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں نہ سبز ---- بھوری تھیں نہ سلیٹی بلکہ رنگوں کا امتزاج مقناطیسی کشش لئے مجھے اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ اسی لمحے میں نے طے کر لیا کہ اب یہ آنکھیں صرف اور صرف میری راہ دیکھیں گی۔ " یہ محلہ میری پناہ گاہ ہے " موہنا کی آواز میں بے بس پرندے کی پھڑپھڑاہٹ تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ صورت حال میری منشا کے مطابق نکلی۔ کوئی کام خواہ کتنا ہی سہل ہو اسے مشکل ترین بنا کر پیش کرتا ہوں تاکہ احسان کرنے اور طلب کرنے میں سہولت رہے۔ موہنا کے سلسلے میں بھی یہ ترکیب کام آئی میں وقتاً فوقتاً موہنا کے گھر جاتا رہا اور اسے باور کراتا رہا کہ مقدمہ جیتنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔ وہ جس قدر پریشان ہوتی میں اسی قدر مسرور ہوتا اور اس کی قربت حاصل کرنے کے لئے نت نئے بہانے تلاش کرتا ------ اسے موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا میں نے راگوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اسے ادب سے دلچسپی تھی میں نے اس کے پسندیدہ ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں پڑھ ڈالیں یہاں تک کہ ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب میں کچہری کے شور اور جھگڑنے والے ہنگاموں سے جان چھڑا کر سیدھا موہنا کے ہاں پہنچتا تو اس کی جھیل آنکھیں میری منتظر ہوتیں۔ وہ میرے لئے چائے بنا کر میرے سامنے بیٹھ جاتی ہم گھنٹوں ادیبوں شاعروں اور راگوں پہ گفتگو کرتے۔ میری دن بھر کی تھکن دور ہو جاتی اور میں تازہ دم ہو کے اپنے گھر پہنچتا۔

اورنگ زیب قاسمی

موہنا کا شمار ان معدودے چند خواتین میں سے ہے جو مرد کے وجود کی تصدیق کرتی ہیں۔ ان کی تھکن دور کرتی ہیں مگر معاوضے میں کچھ بھی طلب نہیں کرتیں۔ میں ایسی عورتوں کو احمق سمجھتا ہوں جو بے لوث محبت کے نام خود اپنا استحصال کرتی ہیں۔ بنا مانگے کسی کو کچھ نہیں ملتا۔ میں تو جانتا ہوں کہ 'چھینا' جھپٹی اور لوٹ کھسوٹ والے ہمیشہ فائدے میں رہتے ہیں میری گنہگار آنکھوں نے کبھی کسی ظالم کو ملزم کے کٹہرے میں نہیں دیکھا اس لئے میرے نزدیک حق تلفی کا کوئی مفہوم نہیں۔ موہنا مجھے اچھی لگتی تھی۔ اس پہ تسلط جمانا میرا حق تھا میں اس کے حصول میں کوئی بھی روپ کوئی بھی شکل اختیار کر سکتا تھا۔ کاش میں ان ہواؤں کا رخ بدل سکتا جو میری رضا کے بغیر اسے سانس لینے پہ آمادہ کرتی تھیں۔ کاش میں اس کے مداحوں اور خیر خواہوں کو ایک ہی وار میں قتل کر سکتا۔ لیکن میں کوشش کے باوجود بھی کچھ نہ کر سکا۔ وہ اپنی طرح زندہ رہی اور اپنی مرضی سے اپنے اسٹائل میں مر گئی۔

میں نے اسے اکثر واضح الفاظ میں سمجھایا تھا کہ میری آنکھ نے ہر رشتے کو شک سے دیکھنے کی تربیت حاصل کی ہے۔ میرے ہاں مقدس نام کی کوئی اہمیت نہیں اس کے باوجود بھی اس نے مجھ سے توقعات وابستہ کیں مجھے سمجھنے کی کوشش کی اور قدم قدم میرے ساتھ چلنا چاہا۔ توقعات وابستہ کرنے کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ مجھے اپنا قد چھتناور پیڑ کی مانند پھیلتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور میری انا کو تسکین ملتی ہے میں صاحب اختیار حضرات سے اچھے مراسم رکھتا ہوں تاکہ ضرورت مندوں کے کام نکلوا کے اپنی طلب کا اظہار کر سکوں۔ میں اپنے اس اظہار سے کبھی نادم نہیں کہ دنیا میں بلا سبب 'بلا جواز' بلا معاوضہ کچھ نہیں ہوتا۔ میرا ایمان ہے کہ طالب و مطلوب صرف دو رشتے سچے اور کھرے ہیں' بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ان کی شکلیں بدل سکتی ہیں مگر خاصیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ موہنا اس قدر احمق تھی کہ مجھے یا میرے موقف کو سمجھنے سے قاصر رہی اور دوستی میں مساوی حقوق کا مطالبہ کرنے کے باوجود بھی میرے جال میں پھنس گئی میں جو چاہتا اسے باور کراتا اور جیسے چاہتا اسے ٹریٹ کرتا۔ وہ آمنا و صدقنا کہتی رہی اور میں رفتہ رفتہ اس پہ زندگی کا دائرہ تنگ کرتا رہا۔ اسے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ وہ جو آزاد پنچھی کی مانند پرواز کیا کرتی تھی اس کے پر کاٹ دیئے گئے ہیں اب وہ میری آنکھ سے دیکھتی' میرے کانوں سے سنتی اور میری زبان بولتی تھی۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اگر ہر آسودہ حال بیوی اپنے پیچھے نگاہ ڈالے تو اسے کسی نہ کسی تھکن دور کرنے والی کی آرزوؤں کا خون بکھرا ہوا نظر آئے گا۔ میری بیوی جو میرے نام کی چھتر چھایا میں پھل پھول رہی ہے اچھی طرح جانتی ہے کہ میرے مزاج میں تحمل اور بردباری کا سبب موہنا کی توجہ اور خلوص ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو صاحب جائیداد بنایا اسے دنیا کی آسائشوں سے نوازا پھر بھی اس کے اندر کوئی خوشگوار تبدیلی نہیں آئی وہ اسی طرح دن بھر کڑک کی مانند نزاتی پھرتی ہے اور رات کو دیر سے گھر لوٹنے پہ مجھے یاد کراتی ہے کہ میری حیثیت کشکول میں پڑے کھوٹے سکے کی سی ہے دونوں عورتیں ہیں اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے میں محسوس کرتا ہوں جسے خسارے میں نہیں رہنا چاہیے وہی خسارے میں رہی۔ ہم مردوں کا شیوہ ہے کہ صرف اپنی شناخت چاہتے ہیں۔ بیوی خواہ کتنی ہی بدسرشت و بدخو ہو ہمارے حوالے سے جانی اور پہچانی جاتی ہے اس لئے ہم انہیں ہر حال میں برداشت کرتے ہیں۔ موہنا میری دوست تھی اور دوستیاں اچھا وقت گزارنے کے لئے کی جاتی ہیں۔ ایسی عورتوں کو ہم اپنے حوالے سے جینے کا حق اور اپنی شناخت کیونکر دے

سکتے ہیں۔ خسارے میں رہنے والیاں سب کچھ جانتی ہیں پھر بھی گھاٹے کا سودا کرنے پہ تیار ہو جاتی ہیں۔ وہ ہر بار ڈسی جاتی ہیں پھر بھی غلطیاں دہراتی ہیں۔ اور یوں وہ خود ازیت کا شکار ہو جاتی ہیں۔

میں فیکے حلوائی کی دکان پہ بیٹھا لوگوں کے افسردہ چہرے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا جس دن موما نے مجھ پہ اعتماد کیا تھا اسی دن اس کی زندگی کے تاریک باب کا آغاز ہوا تھا۔ میں نے موما سے جو کچھ بھی حاصل کیا اس کے بدلے میں اس کے کئی کام سنوارے تھے۔ مجھے اس کے بچھڑنے کا کوئی ملال نہیں اسی لئے میں نے اس کی میت کو کاندھا دیا نہ ہی نماز جنازہ میں شرکت کی۔ میرے لئے موما یا موما جیسیاں سب غیر اہم ہیں۔ مجھے تو نہیں اور ہی کے منشور پہ عمل کرنا اچھا لگتا ہے کسی اور مکان میں کوئی اور ماتواں۔ تما قرض منہ میری منتظر ہوگی بلکہ یہ انتقام تو میں نے اس کی زندگی میں ہی کر لیا تھا۔ اگر سمندر میری دسترس میں ہو اور مجھے یقین دلایا جائے کہ عمر بھر اس کا پانی میرے تصرف میں رہے گا پھر بھی میں قبابل انتقام رکھوں گا یہ میرے مزاج کا خاصہ ہے صائمہ بھی موما کی طرح اپنے کسی کام کے سلسلے میں میرے پاس آئی تھی اور میں اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ تھکن دور کرنے والیاں محبت و ایثار کرنے والیاں سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ہمدردی کے چند بے دہا جملوں اور جھوٹی قسموں سے ورغلائی جا سکتی ہیں۔ میں نے دکان سے اٹھ کے صائمہ کے گھر جانے کا قصد کیا تھا کہ ماکھے نے مجھے دیکھ لیا۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کے فیکے حلوائی کی دکان کے سامنے کھڑا کر دیا اور بلند آواز سے ایک ایک کو مخاطب کیا ' بوجھ کئی بی بی تمہاری کیا لگتی تھی ؟" فیکے فضلو' دھوبی' ناکی اور اسی قبیل کے لوگوں کی آوازیں سارے میں پھیل گئیں۔

" کئی بی بی میری ماں تھی "

" کئی بی بی میری بہن تھی "

" کئی بی بی میری بیٹی تھی "

بازار میں عجیب شور تھا۔ نمازی مسجد سے باہر نکل آئے۔ سب فیکے حلوائی کی دکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی مقدمے کا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ ماکھے نے ایک ٹیپ میری جانب بڑھا دی۔ میں نے ٹیپ ہاتھ میں لے کر اسے بغور دیکھا اسے پہ سفید کاغذ چپکا تھا اور جلی حروف میں سورۃ القلم کی آیت لکھی ہوئی تھی میں نے موما کی تحریر پہچان لی تھی۔ کیا لکھا ہے ؟ لوگوں نے تجسس کا اظہار کیا تو میں بے اختیار پڑھنے لگا۔

" ایسے کی باتیں نہ سننا جو بڑا قسمیں کھانے والا۔ طعنے دینے والا' ادھر کی ادھر لگاتا پھرنے والا درشت خو ہے اس پہ طرہ یہ کہ اس کی اصل میں خطا ہے۔ "

پورے بازار میں سناٹا چھاگیا۔ ماکھے نے میرے ہاتھ سے ٹیپ لے کر فیکے کی دکان پہ رکھے ٹیپ ریکارڈ پہ لگا دی۔ مجھے شدید جھٹکا محسوس ہوا۔ ٹیپ لگتے ہی میری آواز سارے میں پھیل گئی۔ صائمہ کو پھنسانے کے لئے۔ اس کی توجہ کا مرکز بننے کے لئے میں نے موما کے کردار پہ کیچڑ اچھالا تھا۔ ماکھے' فیکے' فضلو اور نہ جانے کس کس کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر یہ سب باتیں تو نہایت راز داری کے ساتھ صائمہ کے ڈرائنگ روم میں ہوئی تھیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صائمہ میری گفتگو ٹیپ کر کے موما کو بھجوا دے گی۔

" تف ہے شک کرنے والے پر " ماکھے نے زمین پر تھوکا۔

" تف ہے۔ تف ہے تف " کئی لوگوں کے تھوکنے کی آواز آئی۔

لوگوں پہ موما کی خود کشی کا سبب واضح ہوگیا۔ وہ حقارت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ یوں محسوس ہوا جیسے بھرے بازار میں برہنہ کر دیا گیا ہوں اور سب لوگ مجھ پہ تھوکنے کے لئے میری جانب بڑھ رہے ہیں۔

نہیں ۔۔۔۔۔ بلکہ میں دیکھ رہا ہوں ان کے ہاتھوں میں ٹوکے' کلہاڑے اور چھرے بھی ہیں اس سے پہلے کہ وہ میری تکا بوٹی کرنے میں کامیاب ہو جائیں مجھے بھاگ جانا چاہیے۔ میں بھاگ رہا ہوں۔ پکڑو پکڑو کی آوازیں میرا تعاقب کر رہی ہیں میں کہاں جاؤں۔ میں کہاں جا سکتا ہوں۔ میں عمل اور ردعمل کے دائرے میں پھنس گیا ہوں۔ باہر نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ کوئی راستہ نہیں۔

اگلے دن معززین شہر نے اخبار میں پڑھا کہ پیش کار جان محمد بن فلاں ابن فلاں کئی بی بی کے مزار کے قریب مردہ پایا گیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اس نے رات کے کسی پہر خواب آور گولیاں کھائی تھیں محلے کے نائی' دھوبی قصائی اور اسی قبیل کے دیگر افراد نے متفقہ فیصلہ کیا کہ وہ نماز جنازہ میں شرکت نہ کریں گے۔

("تجدید نو" اسلام آباد)

اورنگ زیب قاسمی

انتظار گاہ

میں جہاں ہوں' اس آبادی کی بیشتر بڑی بوڑھیوں کا معمول ہے کہ ہر شام چادروں اور سفید برقعوں میں لپٹی لپٹائی اپنے گھروں سے نکلتی ہیں اور گرتی پڑتی مشرق کی جانب کھڑی ترائی میں اتر جانے والی ڈھکی تک آکر پہروں چپ چاپ بیٹھی رہتی ہیں۔ اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں پر دونوں ہتھیلیوں کے سائبان لئے نیچے ترائی میں جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ پوچھو تو بتاتی نہیں' اور یوں ہی پہروں منتظر بیٹھ کر واپس ہو لیتی ہیں۔

نیچے ترائی میں آبادی سے کوس بھر کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے پتھریلے میدان کو سرخ اینٹوں کی چنی ہوئی قد آدم دیوار نے چاروں اطراف سے گھیر رکھا ہے اور بس۔ اس تنگ حصار کا آبادی کے رخ پر ایک ہی بڑا دروازہ ہے جو ہر دم کھلا رہتا ہے اور اس چار دیواری میں سے باہر نکلتے میں نے کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔

ایک زمانہ تھا جب اس چار دیواری کے اندرونی معاملات کی نگہداشت اور آبادی کے رخ پر اس میں جڑے ہوئے آہنی دروازوں کو کھولنے اور بھیڑنے کی خاطر کئی افراد پر مشتمل باقاعدہ ایک عملہ مامور تھا۔

اس تنگ حصار میں قید جنگلی سوروں کا ایک ریوڑ تھا' جسے کسی پل چین نہ تھا۔ وہ کھروں سے پتھریلے میدان کو ادھیڑتے نہ تھکتے تھے۔ البتہ اپنے مدمقابل کے انتظار میں کھلتے ہوئے سوروں کے ریوڑ کی بے چینی نے ساری بستی کا سکون لوٹ رکھا تھا۔ اس بھری پری آبادی میں کوئی بھی تو ایسا نہیں تھا جسے مقابلے کے دن اور تاریخ کا علم ہوتا۔

اس پتھریلی چار دیواری پر مامور عملے کا جب کوئی رکن اپنے خچر پر خالی بورا سنبھالے بستی سے سودا سلف کھینچنے کی خاطر آبادی کا رخ کرتا تو اسے مشرقی ڈھکی چڑھتے ہی بچے گھیر لیتے اور مقابلے کا دن اور تاریخ دریافت کرتے' دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چوگرد لوگوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ جم جاتا' یہاں تک کہ خچر سوار کو اپنے چاروں اطراف میں چابک لہرا لہرا کر بازار میں سے گزرنے کا راستہ بنانا پڑتا۔ وہ ہر سوال کے جواب میں چپ رہتا اور اپنے کام سے غرض رکھتا۔

یہ کیفیت اس وقت تک رہتی جب تک کہ وہ بازار میں گھوم پھر کر اپنے لدے پھندے خچر کی باگیں تھامے ڈھکی نہ اتر جاتا۔ شاید سوروں کے ریوڑ کی نگہداشت پر مامور عملے کے فرائض منصبی میں چپ رہنا بھی شامل تھا۔ سو وہ آتے' بے چین ہجوم کے سوالات کے جواب میں خاموشی کے ساتھ سودا سلف کھینچتے' چابک لہراتے لدے پھندے خچر کے آگے جما کر قدم رکھتے ترائی میں اتر جاتے۔

عجیب بات تھی کہ جس دن خچر سوار آبادی کی طرف پھیرا لگاتا اس کے اگلے روز آبادی میں سے پانچ جوان لاپتا ہو جاتے۔ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ مقابلے کے مخصوص دن سے پہلے کسی ذی نفس کو اس تنگ حصار

اورنگ زیب قاسمی

کا رخ کرنے کی اجازت نہیں تھی' اور اس مخصوص دن کا پوری آبادی میں کسی کو علم نہیں تھا۔

ان کے ڈھکی چڑھنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا اس لئے آبادی کے لوگ لوہا کوٹتے' بان کی پھلیاں بناتے' چاک گھما کر کوزے تراشتے' کولہو میں سرسوں پیلتے اور کپڑا کاتنے والی کھڈیوں کو متحرک رکھنے میں جتے رہتے اور بے کار اور ناکارہ بڈھے دن بھر بیٹھے تمباکو پھونکتے رہتے۔ لے دے کر بچے رہ جاتے تھے جو آبادی میں مکتب نہ ہونے کے سبب مشرقی ڈھکی پر منڈلاتے رہتے اور جب خالی بورا سنبھالے خچر سوار آبادی کا رخ کرتا تو اسے گھیر لیتے۔ تب "سڑز سڑز" ان کے سروں پر چابک لہراتا اور وہ بچ بچ جاتے۔ یہ سب کیا تھا؟ اس راز کی حقیقت جاننے کی خاطر میں نے اپنے بچپن اور لڑکپن کا بیشتر وقت روتے اور احتجاج کرتے گزار دیا۔

میں سخت شرمسار ہوں کہ میرا بچپن اور لڑکپن اس تنگ حصار کی اصل حقیقت کو جانے بغیر بیت گیا اور باقی وقت میں سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے چپ رہا۔ لیکن مجھے اس بات کا فخر بھی حاصل ہے کہ اس بھری پری آبادی کے سال خوردہ افراد میں سے شاید ایک میں ہی ایسا بڈھا بچا ہوں جسے اس تنگ حصار میں اپنے کھروں سے زمین ادھیڑتے سوروں کے ریوڑ کی اصل حقیقت معلوم ہے۔ میں اس خطرے کے پیش نظر کہ آج ہوں اور کل نہیں رہوں گا' آپ کو اپنے اس راز میں شریک کر رہا ہوں۔

یہ درحقیقت ایک ایسی شام کا قصہ ہے جب میں اور میرے دو بچپن کے ساتھی فیکا اور کیما باہر کوٹ والوں کی شادی کی رونق دیکھنے کے بہانے سب کو جل دے کر چھپتے چھپاتے اس تنگ حصار کی جانب اتر گئے تھے۔ ہم نے ترائی اترنے سے پہلے اپنی چپلیں اتار چھوڑی تھیں اور بغیر کوئی آواز پیدا کئے اندھیرے میں اترتے چلے گئے تھے۔

وہ غضب کی رات تھی۔ آسمان پر چھدرے بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں چاند کے چہرے کو کبھی تو پوری طرح ڈھانپ دیتیں اور کبھی دور سے سج سج اس کی طرف بڑھتے ہوئے محض اپنے دامن کو اس کی جانب لہرا کر پرے سے نکل جاتیں۔

چھاگن کی کیا تاریخ تھی ٹھیک طرح یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ جب ہم تینوں اندر کوٹ کے شہید بابا کے مزار پر اکٹھے ہوئے تھے اور ترائی کا منصوبہ بنایا تھا تو ہم تینوں کے جبڑے سردی سے کھٹ کھٹ بج رہے تھے اور ٹھیک طرح بات منہ سے نکلتی نہیں تھی۔

ترائی اتر کر اس تنگ حصار تک کوس بھر کا سفر ہم نے منٹوں میں طے کر لیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' جب ہم ہوا میں تیرتے ہوئے ایک کے بعد ایک اس سرخ اینٹوں کی قد آدم دیوار تک پہنچے تھے تو موٹے اون کے سوکڑ اور گاڑھے کے شلوار کرتوں میں ہم تینوں پسینے میں نہائے ہوئے تھے اور دل سینے میں سماتا نہیں تھا۔

باہر کوٹ والوں کی شادی پر مجرے کی محفل جمی تھی اور ہمیں جانے کیوں یہ یقین سا تھا کہ تنگ حصار پر مامور پورے کا پورا عملہ وہاں سے غیر حاضر ہے۔ یہ خیال ہمارے ذہنوں میں شاید اس لئے سمایا کہ ہمیں ترائی اترتے اور سرخ اینٹوں کی دیوار تک آتے کسی نے روکا نہ تھا۔

ہم نے اس خیال خام میں خاصی لاپروائی برتی۔ ایک موقع پر فیکے کا پیر رپٹ گیا اور وہ اوندھے منہ نیچے آ رہا۔ اس غلطی کی سنگینی کا احساس اس وقت ہوا جب سرد اندھیرے کو چیرتی ہوئی پکی بندوق کی دو گولیاں کیمے اور میرے سروں پر سے گزر گئیں۔ خیر اس میں گزری کہ اس وقت بدلیوں نے چاند کے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا اور وہ چھاگن کی ایسی سرد رات تھی جس میں تنگ حصار کے کارندوں نے پڑتال کو ضروری نہ

سمجھایا شاید ایک دن ایسا ہونا ہی تھا' ورنہ آج میں یہ سچ سچ تحریر کیا چھوڑ کر مرتا؟ کیمے اور فیکے کی طرح اس راز کو سینے میں سنبھالے اپنی گور اتر جاتا۔

خیر' بندوق داغنے کے بعد دیر تک ڈیوٹی پر موجود کارندے ایک دوسرے سے باآواز بلند پوچھ گچھ کرتے رہے اور پھر چپ کی بھاری چادر تن گئی۔ ہم دیوار کی اوٹ میں دم سادھے پڑے رہے تھے۔ ایسے میں یوں محسوس ہوا جیسے کئی موسم آئے اور بیت گئے ہم میں اٹھنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔

رات کے دوسرے پہر' اس تنگی حصار کے اندر یکلخت ہلکدڑ کی کیفیت پیدا ہوئی اور ہمیں گھٹی گھٹی انسانی چیخیں سنائی دیں۔ لیکن یہ سب کچھ تھوڑی دیر ہی کے لئے تھا۔ اس کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے اندر کی حیوانی مخلوق کو سرکاری کارندے ہانکنے میں لگ گئے اور یہ عمل بہت دیر تک جاری رہا۔

رات کا آخری پہر ہوگا جب میں نے ہمت کر کے کیمے اور فیکے کے سہارے اس تنگی حصار کے اندر جھانک کر دیکھا۔

آسمان پر رواں بدلیوں میں سے چاند کی چھدری روشنی میں تنگی حصار میں محصور غلہ سوروں کے ریوڑ کو حصار کے دوسرے نصف میں ہانکنے کے بعد کٹے پھٹے انسانی اجسام کو ٹانگوں میں رسیاں باندھ کر کھینچے لئے جا رہا تھا۔ ان بے طرح ادھڑے ہوئے لاشوں کو وہ میرے دیکھتے دیکھتے گھسیٹ لے گئے۔ اس وقت روندے جانے والوں کی پہچان مشکل تھی لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ کٹے پھٹے اجسام تعداد میں پانچ تھے۔

اس وقت میں کیمے اور فیکے کے سہارے کھڑا تھا اور نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دیوار کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا' لیکن میں نے جو کچھ دیکھا' اس نے میرے ہاتھ پاؤں شل کر دیئے اور میں نیچے کی سمت دھنستا چلا گیا۔ اس وقت کیمے اور فیکے نے بغیر کوئی آواز پیدا کئے بڑی ہمت کے ساتھ مجھے نیچے اتارا۔

اگلے روز فیکا اور کیما جب میرا پتا کرنے میرے گھر آئے تو میں بخار میں بری طرح پھنک رہا تھا اور ان کے آنے سے قبل بے ہوشی کے عالم میں رات کا مشاہدہ اپنی ماں کو سنا چکا تھا۔

وہ نیک بخت فیکے اور کیمے کو اندر میرے پاس لے آئی اور ہم تینوں سے اپنی قسم دے کر یہ وعدہ لیا کہ ہم رات والی بات کسی سے نہیں کریں گے' شکر الحمد اللہ کہ ہم تینوں نے اس کے جیتے جی اپنا وعدہ نبھایا۔ لیکن اس شرمندگی کا کیا کروں' جس نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ لیا۔

میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا وہ من و عن سپرد قلم کر دیا۔ حاشا' رنگین بیانی اور عبارت آرائی سے کبھی دلچسپی نہیں رہی اور سچ پوچھیں تو بات سے بات پیدا کرنے کی اس فقیر کو توفیق ہی نہیں ملی۔

آبادی کے رخ پر کھلنے والے اس بھاری آہنی دروازے کو کھولنے اور بھیڑنے والا عملہ نہ رہا' تمبو پر غلاف پورا سنبھالے "سرڑ سرڑ" چابک لہرانے اور ڈھکی چڑھنے والے نہ رہے۔ لوہا کوٹنے اور چاک پر کوزے تراشنے والے مٹی میں مٹی ہوئے۔ اب تو سرسوں کی جگہ جانے کیا کچھ چل نکلا اور کھڈیوں کی جگہ بڑے بڑے کارخانوں نے لے لی ہے۔ لیکن' کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ اس بچی کھچی آبادی کے آثار میرے کہے کی تصدیق کرتے ہیں اور ہماری بڑی بوڑھیاں اپنی آنکھوں پر دونوں ہتھیلیوں کے سائبان لئے اپنے جگر گوشوں کی راہ تکتی ہیں؟

("معیار" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

محمد خالد اختر

جوڈی اور میں

جوڈی السیشین نسل کا ایک کتا ہے جو میری زندگی میں اس وقت داخل ہوا جب میں پنشن ملنے پر بہاولپور میں اپنے آبائی گھر میں آ آباد ہوا۔ میرے بھائی کے بچے بھی لاہور جانے کے بجائے' جہاں میرے بھائی کی نہر کے محکمے میں پوسٹنگ تھی' اسی گھر میں منتقل ہو گئے آبائی مکان کی تقسیم یوں ہوئی تھی کہ آدھا مکان میرے حصے میں آیا تھا اور دکھنی طرف کا آدھا مکان بھائی کے حصے میں۔ جوڈی میرے بھائی کا کتا تھا۔ ایک صبح وہ رحیم یار خان سے گھر کے سامان اور دو بکروں کے ساتھ ٹرک میں بہاولپور آیا۔ میرے بھائی کو پالتو جانور رکھنے کا شوق ہے۔ اس کے پاس دو گھوڑے بھی تھے۔ (دراصل وہ گھوڑوں کا عاشق ہے) اور ایک گھوڑے کو میں نے کھانے کی میز پر ایک بڑی پلیٹ میں کھاتے بھی دیکھا ہے۔) اس نے یہ دونوں گھوڑے چک عبداللہ میں اپنے فارم پر بھجوا دیئے تھے' کیوں آبائی مکان میں ان کی دیکھ بھال ممکن نہ تھی۔

میں نے کتا کبھی نہیں رکھا۔ (حقیقت میں میں سب جانوروں سے بیزار ہوں' خواہ وہ کتے ہوں یا بلے یا گھوڑے یا کوئی اور چوپایہ۔ مجھ میں اور جانوروں میں کبھی اتفاق رائے نہیں ہو سکا اور ہم اپنی مختلف راہوں پر چلتے رہے ہیں۔) پہلے پہل میں نے کتے اور بکروں کو محفوظ فاصلے پر رکھا اور ان کے معمولات اور افعال پر مطلقاً کوئی توجہ نہ دی' مگر رفتہ رفتہ میں نے دیکھا کہ ہم ایک دوسرے کی زندگیوں پر چند لطیف اور پراسرار طریقوں سے اثر انداز ہو رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے بیوی بچے ابھی کراچی میں تھے' اور بھائی کے بچے بھی اکثر ایک ایک دو دو مہینوں کے لئے لاہور آتے جاتے رہتے تھے' اس لئے کئی بار اس مکان میں یہ جانور ہی میرے ہمجولی اور ہم صحبت ہوتے' سوائے اس چھوٹے بچے شادی خان کے جس کا ذکر میں پھر بھی کروں گا۔ اس طرح جب بھائی کے بیوی بچے لاہور چلے جاتے تو جوڈی اور بکروں کی دیکھ بھال کی ذمے داری مجھ پر آن پڑتی اور میں ایک طرح ان کا گارڈین بن جاتا۔

جوڈی ایک اونچا' جواں سال السیشین تھا۔ آنکھیں زرد کرنجی' معصوم تھوتھنی اور نوکیلے مستعمل کان۔ اس کی پوستین گہری گرے تھی جس میں کہیں کہیں تھوڑی سی سفیدی جھلکتی تھی۔ جوڈی کا اگلا بایاں گھٹنا رحیم یار خان میں ایک اسکوٹر کو سامنے سے لپکنے کی کوشش میں کچلا گیا تھا اور وہ یہ پنجہ کچھ اوپر اٹھائے تین ٹانگوں پر چلتا تھا۔ تم اسے لنگڑا کہہ سکتے ہو' مگر وہ اس معذوری کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ جب وہ آیا تو اچھا خاصا چاق و چوبند' ٹھیک ٹھاک کتا تھا اور اس کی پوستین صاف' مزے دار تھی۔ پھر خدا جانے اس کو نئی جگہ کی آب و ہوا راس نہ آئی یا کسی پراسرار بیماری نے اس کے بدن میں گھر کر لیا' کہ وہ سست اور نڈھال رہنے لگا اور اتنا دبلا ہو گیا کہ اس کی پسلیاں نکل آئیں۔ ناتوانی کی وجہ سے اس کا دایاں کان 'جو لووں پر سے کچھ کترا ہوا تھا' سیدھا

کھڑا رہنے کے بجائے نیچے ڈھلک آیا۔ اسے دیکھ کر ترس آتا تھا۔ بھائی کے بچے' کتوں کے عاشق نہ ہونے کی وجہ سے' اسے زیادہ منہ نہیں لگاتے تھے۔ کوئی اسے سلوتری کے پاس لے کر نہ گیا۔ بھابی البتہ اس کا خیال کرتیں اور دو وقت کی روٹی اور دودھ اسے دیتیں۔ جب بھائی کا کنبہ پہلی بار ایک دو مہینے کے لئے لاہور گیا تو میرے علاوہ گھر میں جوزی' میانوالی کے دو بکرے' دو سالہ بچہ شادی خان اور اس کی نیم پاگل ماں رہ گئے۔ زمانے کی ستائی ہوئی منکوحہ مائی میری روٹی پکا دیتی اور میں اپنے کمرے میں لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتا۔ بکرے جوزی کے چارج میں تھے' یعنی جوزی سے یہ ڈیوٹی متوقع تھی کہ وہ بکروں پر نظر رکھے اور ان کو کوٹھی کے احاطے سے باہر سڑک پر نہ جھٹکنے دے۔ جوزی اپنی اس ڈیوٹی کو خوبی سے انجام نہ دیتا۔ ویسے بکرے تھے بڑے نٹ کھٹ اور سیلانی۔ وہ جوزی کی بخ بخ اور گھیرے کی پرواہ نہ کرتے۔ اور کوٹھی کے احاطے میں جہاں چاہتے گھومتے پھرتے اور چھلانگیں کرتے۔ انھیں چارپائیوں پر چڑھنے اور وہاں ضروریات سے فارغ ہونے کا بہت شوق تھا۔ آہستہ آہستہ انھوں نے جوزی کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور جوزی بھی انھیں ناقابلِ اصلاح جان کر ان کی بدافعالیوں سے درگزر کرنے لگا۔ اپنی ڈیوٹی سے جوزی کی اس غفلت نے' جو میرے نزدیک اس کی انتہائی سستی تھی مجھے تین چار موقعوں پر طیش سے پاگل کر دیا اور میں نے بید سے اس کی بری طرح ٹھکائی کی۔ جوزی نے اسے کبھی معاف نہیں کیا' مگر یہ بعد کی بات ہے' پہلے پہلی باتیں۔

بھائی کے بچوں کے جانے کے بعد میں نے جانوروں کی دیکھ بھال کی ذمے داری اپنے سر لیتے ہوئے جوزی کے قریب آنے اور اسے دوست بنانے کا ارادہ باندھا۔ وہ ان دنوں بڑی افسوس ناک اور تباہ حالت میں تھا اور میں نے محسوس کیا کہ جوزی کو پیار محبت اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ اس دوستی میں بھی پہل جوزی کی طرف سے ہوئی۔ جوزی کی عادت تھی کہ جب بھی میں کسی کام یا سیر کی غرض سے کوٹھی کے باہر جاتا تو وہ لنگڑا کر بھاگتا ہوا پھاٹک پر پہنچ جاتا اور اپنے کولھوں پر بیٹھ کر رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھتا کہ میں اسے اپنے ساتھ آنے دوں۔ میں پھاٹک بھیڑ کر اسے پیچھے جانے اور بکروں کی رکھوالی کرنے کا آرڈر دیتا اور وہ دبک کر مایوسی کے عالم میں لوٹ جاتا۔ پھر مارچ کے شروع میں' جب ہوا میں بہار کی خوشبوئیں رچی تھیں' میں نے ڈاکٹر کی ہدایت پر صبح کے وقت کی لمبی سیر کا آغاز کیا۔ سپیدہ صبح نمودار ہونے سے پہلے میں چائے اور سگریٹ پی کر اور بوٹ پہن کر اپنے کمرے سے نکل کھڑا ہوتا۔ جوزی پہلے ہی جاگا ہوا اور ہوشیار' پھاٹک پر میرا منتظر ہوتا۔ ایک دو دن تو میں نے اسے "گیٹ بیک' جوزی!" کہہ کر واپس بھیج دیا' پھر سیر کے لئے اس کا شدید اضطراب اور اشتیاق دیکھ کر اسے اپنے ساتھ سیر پر لے جانے لگا۔ اور پھر وہ آدمی اور کتے کی لمبی سیریں!

جوزی کی یہ اضطرابی کیفیت اور مسرت مجھے حیران کر دیتی۔ وہ سینٹرل لائبریری کے پارک میں سے گزرتے ہوئے ہر جھاڑی کو سونگھتا' کھڑے ہوئے پانی میں سے چھپ چھپ کرتا' چھینٹے اڑاتا' گزرتا' چڑیوں اور کووں کو تاکتا اور ان کے تعاقب میں بھاگتا۔ ایک دفعہ میں نے اسے ایک شریر تیتری کو پکڑنے کے لئے دیوانہ وار ایک ہی جگہ گھومتے اور چکر کاٹتے دیکھا۔ وہ اٹھکیلیاں کرتا' کھیلتا اور پگل سیتاں کرتا۔۔۔ کتنے انسان ہیں' میں سوچتا ہوں' جو قدرت کی جمال آرائیوں' رنگینیوں اور حیرتوں کو اس طرح اپنے رگ و پے میں محسوس کرتے ہوں گے جیسے جوزی ان سیروں میں کرتا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے آگے دوڑ جاتا اور راستے پر کھڑا ہو کر میرے آنے کا انتظار کرتا۔ سینٹرل لائبریری کے باغوں کو پار کر کے جب ہم کچہریوں کے پاس سے گزرتے تو وہ وکیلوں

اورنگ زیب قاسمی

کے کیسوں کا تفصیلی جائزہ لیتا اور پھر اچانک مڑ کر کسی غیر متوقع گوشے سے اپنی مضحک صورت دکھاتا۔ (اگر کتے ہنس سکتے ہیں تو جوزی اس وقت ہنس رہا ہوتا۔) دو ڈھائی میل کی اس سیر کے بعد کتا اور آدمی گھر لوٹ آتے۔ جوزی بھوکا ہوتا اور اپنے ناشتے کے لئے بے تاب۔ میں اسے برآمدے میں چھوڑ کر اس کے لئے ڈبے کا دودھ بناتا اور اسے ایک برتن میں انڈیل کر باہر برآمدے میں رکھ دیتا۔ میرے برتن نیچے رکھنے سے پہلے ہی جوزی بے صبری سے اس پر پل پڑتا اور ایک منٹ میں دودھ کو چاٹ کر مجھ سے مزید دودھ کا طلب گار ہوتا۔ یہ ہمارا روز کا معمول ہو گیا اور ہم بڑے اچھے دوست بن گئے۔ کئی بار جب مجھے صبح تیاری میں دیر ہو جاتی' جوزی اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر برآمدے میں کھلنے والی میرے کمرے کی بند کھڑکی پر پنجے مارتا اور چیاؤں چیاؤں کی آواز نکالتا۔ میں اس کی نوکیلے کانوں اور معصوم تھوتھنی کو کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھتا اور اسے تقریباً یہ کہتے ہوئے سنتا: "میاں جی' کیا بات ہے؟ کیا تم باہر نہیں آؤ گے؟ سیر میں چوک نہیں ہونی چاہیے۔" دو تین بار جب کسی وجہ سے میں سیر کے لئے نہیں جاسکا' جوزی کو میرا نہ جانا سمجھ میں نہ آیا اور اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ ان سیروں میں' جن میں چھوٹا شادی خان بھی بعض دفعہ ہمارے ساتھ ہوتا تھا (اپنی آڑی ٹانگوں سے لپکتا ہوا)' ایک خرابی تھی جو بعد میں جوزی کی عادات اور نفسیات کو بدلنے کا موجب بنی۔ (میرے بھائی نے مجھ سے کہا کہ مجھے جوزی کو سیر نہیں لے جانا چاہیے تھا۔) وہ خرابی یہ تھی:

جوزی کی موجودگی پڑوس کے کتوں میں مشہور ہو گئی۔ ان میں سے چند ایک نے پھاٹک کی درزوں میں سے جھانک کر چتک دار پوتین اور بے تر وضع کے اس کتے کو' جو کسی جج کی طرح سنجیدہ معلوم ہوتا تھا' ضرور دیکھا ہوگا اور اپنے ساتھیوں کو اس کی اطلاع پہنچا دی ہو گی۔ چنانچہ جس صبح جوزی اور میں پہلی بار سیر کو نکلے لائبریری کے پارک کے وکٹ گیٹ سے اندر جاتے ہوئے مختلف قدوقامت اور وضع قطع کے کتوں کی فوج کی فوج جوزی کی آؤبھگت کے لئے موجود تھی۔ جوزی کو دیکھتے ہی وہ بخ بخ کرتے' غراتے اور کھکھیاتے ہوئے اس کی پیشوائی کو آگے لپکے۔ ان کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ جوزی ہف ہف کر کے دو تین کی طرف لپکا' مگر پھر یہ دیکھ کر کہ وہ بہت سے ہیں' میرے ساتھ ساتھ لگ گیا۔ میرے پاس چھڑی نہ تھی جس سے انھیں ڈرا بھگاتا۔ میں نے ایک سفید کتیا کو' جو دوسروں سے بڑھ کر کھکھیاری تھی اور غالباً" اس ٹولی کی سرغنہ تھی' ہاتھ سے ڈرا کر دور رکھنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے سفاک دانتوں کو مسوڑھوں تک ننگا کیے مجھ پر لپکنے کو ہوئی۔ میں اس سے کچھ ڈر سا گیا' اگرچہ میں بالعموم کتوں سے نہیں ڈرتا۔ اس کتیا نے پھر اپنا ارادہ بدل دیا' مگر اس نے اور اس کے ساتھیوں نے بھونکتے ہوئے ہمارا محاصرہ جاری رکھا۔ انھوں نے لائبریری کے پرلے پھاٹک پر رسم مشایعت عمل میں لا کر ہم کو رخصت کیا۔

سیر سے لوٹنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو مسلح کرنے کا فیصلہ کیا اور دوسرے روز شاہی بازار میں سوٹوں کی واحد دکان سے پیتل کی ٹوپی والی ایک پتلی چھڑی چھانٹ پھٹک کر خرید لایا۔۔۔ اس قسم کی چھڑی جو گھڑ سوار اپنی رانوں کو تھپتھپانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ (یہ چھڑی کئی بار غائب ہونے کے بعد اب بھی میرے پاس موجود ہے اگرچہ جوزی اور میں نے اپنی سیریں ایک عرصے سے موقوف کر دی ہیں۔) یہ چھڑی بہت مفید ثابت ہوئی اس سے میں بڑی آسانی اور اعتماد کے ساتھ جوزی کے مخالفین کی روک کر سکتا تھا۔ اس کے بیری مجھے ہتھیار بند دیکھ کر ذرا فاصلے سے غراتے۔ جوزی خود کو محفوظ محسوس کرنے لگا بلکہ شیر ہو گیا۔ اب

میرے ساتھ رہنے کے بجائے وہ اپنے مخالفوں کو جواب آں غزل دیتا' موثر طور پر بھونکتے ہوئے ان کا تعاقب کرتا۔ دو تین بار اس نے چند کتوں کی گردن ناپی اور انہیں پچھاڑ دیا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ بھاڑ کرنے والے کتے حقیقت میں اس نووارد کے متعلق محض متجسس تھے اور اس کا دم خم آزما کر اس سے راہ و رسم پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ چند بار مجھے شک سا گزرا کہ جوڈی کھڑا ہو کر ان واویلا مچاتے ہوئے پلوں کو حسرت سے دیکھ رہا ہے جیسے وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر کھیلنا کودنا اور دھینگا مشتی کرنا چاہتا ہو۔ ان کی طرف جوڈی کاانداز شدید معاندانہ نہ رہا' آہستہ آہستہ اس میں ایک قسم کی نرمی اور بردباری سی آگئی۔ کیا وہ اچھی بڑھیا نسل کے ہونے کی غیرت کھو رہا ہے؟ مثل ہے کہ آدمی ایک سوشل یا معاشرتی حیوان ہے۔ میرے خیال میں کتا آدمی سے بھی کہیں زیادہ سوشل حیوان ہے۔ تم نے کتے کو سرِ راہ' اکیلے جاتے کم ہی دیکھا ہو گا۔ بیشتر وہ ٹولی بنا کر گھومتے پھرتے ہیں جیسے کسی پارٹی میں جا رہے ہوں یا کسی پارٹی سے آرہے ہوں۔ اس کے باوجود وہ بعض دفعہ ناپسندیدگی کا اظہار کر کے ایک دوسرے کو گھرکتے اور کاٹتے ہیں۔ جلد ہی بغیر کسی جھگڑے کے ان میں صاحب سلامت ہو جاتی ہے۔ نسل' پوشین کی رنگت' شکل و شباہت اور سائز کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ ممکن ہے اس فوری دوستی میں جنس کا بھی کچھ دخل ہو' مگر قیاس لگاتا ہوں کہ ان کی سوسائٹی پرمسو (Primissive) یا جنسی طور پر آزاد سوسائٹی ہے اور ان کی جنسی عادتیں اور رسمیں جدید امریکیوں سے ملتی جلتی ہیں۔ انہیں کی طرح وہ اختلاطی یا گروہی سیکس' بیوی کے باہمی تبادلے اور برسرِ عام اختلاط وغیرہ کے قائل ہیں (گو جہاں تک میں جانتا ہوں' وہ ہومو نہیں ہوتے جیسا کہ بعض انسان ہوتے ہیں) البتہ ان کا ان حرکتوں اور جولانیوں کا ایک موسم ہوتا ہے جس کے گزرنے کے بعد وہ جنس میں دلچسپی کھو دیتے ہیں۔

اب جوڈی کی طرف واپس آتے ہوئے' ایک شام میں اور شادی خاں جوڈی کو لائبریری کے میدانوں میں پھرا کر واپس آرہے تھے کہ اسکوٹر پر سوار' مقطع داڑھی والے ایک موٹے آدمی نے سکوٹر میرے پاس روکا۔ اس نے ایک نظر جوڈی پر ڈالی اور پھر مجھ سے کہا کہ وہ میری تلاش میں آیا ہے۔ اس کی ایک السیشین کتیا تھی اور وہ جاننا چاہتا تھا کہ آیا میں جوڈی کا اس سے میل کرانے پر رضامند ہوں گا۔ میں نے کھرے لہجے میں جواب دیا کہ ہم جوڈی کا السیشین کتیا یا کسی اور کتیا سے میل کرانے پر تیار نہیں۔ مقطع داڑھی والا شخص ایسی بے ہودہ' مخرب اخلاق بات کیوں کر کہہ سکتا ہے' میرا خون ابلا۔ اس نے پھر میری طرف اس امید سے دیکھا کہ شاید میں اس کی درخواست مان جاؤں گا۔ جوڈی نے غالباً تاڑ لیا کہ ہم اس کی باتیں کر رہے ہیں' اور وہ ہمارے پاس آگیا۔ اس کی پسلیاں نکلی ہوئی تھیں اور حالت اتنی خستہ اور ماتم خیز تھی کہ مجھے اس کی جنسی اہلیت کے بارے میں شک تھا۔ اگر وہ یہ کرتب انجام نہ دے سکا تو جوڈی کا مالک ہونے کی حیثیت سے میری کرکری ہوگی۔ میں نے حتمی طور پر "نہیں" کہا اور وہ آدمی اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔ ہو سکتا ہے میرے اس انکار میں میرے اپنے جنسی ٹیبوز (Taboos) اور خوف بھی کارفرما ہوں۔ سیکس ایک ذاتی فعل تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ جوڈی کو اس مضحکہ خیز' نامعقول آزمائش میں ڈالا جائے جس سے اس کا عہدہ برآ ہونا بھی یقینی نہ تھا۔

اب میں سوچتا ہوں کہ میرا فیصلہ درست تھا۔ جوڈی کو سیکس میں زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی' اور میرا خیال ہے اب بھی نہیں' جہاں تک میں جانتا ہوں۔ اس نے کوئی شدید جوشیلی قسم کی "ڈیٹنگ" (Dating) اپنی اس وقت تک کی زندگی میں نہیں کی۔ غالباً وہ جتی ستی ہوئی ہے' اب تک ایک ورجن۔ جوڈی کے ساتھ

اورنگ زیب قاسمی

ان سیروں میں میں کتوں کی دنیا سے آگاہ ہو گیا اور سڑک پر ان آوارہ کتوں کو جو مجھے راہ میں ملتے' ان کی نسل اور قبیلے کے مطابق شناخت کرنا میرا تفریحی مشغلہ بن گیا۔ بے شک یہ غیر ملکی پالتو بورژوا کتے نہ تھے' گلیوں میں پلے بڑھے اور تازہ قسم میں پلے۔ یہ پرول (Prole) کتے تھے' اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ اپنے حلیے اور قد کاٹھ میں اپنے بدیسی بھائیوں سے کافی ملتے جلتے ہیں اور آسانی سے کلاسی فائی کئے جاسکتے ہیں۔

جوڈی کے ساتھ میری یہ صبح کی سیریں جاری رہیں مگر ان سے اس کی صحت بہتر نہ ہوئی۔ وہ دبلا اور کمزور ہو گیا اور اس کی پسلیاں اور نمایاں ہوتی گئیں۔ وہ کسی پوشیدہ عارضے میں گھلتا نظر آتا تھا جس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

پھر اس کے ساتھ میری سیروں میں ناغے آنے لگے اور رفتہ رفتہ وہ بالکل بند ہو گئیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں' مگر میں سمجھتا ہوں ایک خاص واقعہ جو ہمیں پیش آیا' سیر کے خاتمے کا سبب بنا۔ ایک صبح میں اور جوڈی جا رہے تھے۔ جب ہم پولیس اسٹیشن سے آگے نالے کے پل پر آئے تو اس کے کنگورے پر تین چار نوجوان لونڈے بیٹھے تھے انہوں نے ہمیں گستاخانہ تمسخر سے دیکھا اور ہمارے نالے کے کنارے پر مڑتے ہی ایک نے دوسرے سے کہا "جیسا آدمی ہے ویسا ہی کتا ہے۔" ان کا اشارہ ہماری خستہ حالی کی طرف تھا۔ اس پھبتی پر میں جل بھن کر رہ گیا۔ میں نے پلٹ کر ان سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم اپنی راہ چلتے گئے .... اگلے دن میں سیر کے لئے تیار ہو کر نہ نکلا' اور اس سے اگلے دن بھی نہیں' جوڈی ان سیروں کے بند ہونے پر حیران اور مایوس ہوا ہو گا۔ جب میں کمرے سے باہر برآمدے میں نکلتا تو وہ امید کی نظروں سے دیکھتا کہ شاید میں سیر کے لئے جا رہا ہوں اور اسے بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جوڈی مجھ سے کچھ روٹھا روٹھا اور کھنچا کھنچا رہنے لگا ہے۔ ہماری دوستی اور رفاقت میں ان سیروں کے بند ہونے سے رخنہ پڑ گیا جو بعد میں کبھی پوری طرح پاٹا نہ جاسکا۔

انہیں دنوں جوڈی میں ایک تبدیلی رونما ہونے لگی۔ شاید اس کا تعلق کچھ کچھ اس پراسرار دکھ سے تھا جو اسے کھائے جا رہا تھا وہ تیزی سے ایک قسم کی بے حسی اور زوال حالی کی طرف سفر کرنے لگا۔ اس نے ہر چیز میں دلچسپی کھو دی اور بے پروا اور لاتعلق سا ہو گیا۔ اب اس نے میاں والی کے بکروں کی رکھوالی کی ذمے داری بھی تج دی۔ پہلے وہ ان کی حرکات پر آنکھ رکھتا تھا: جب وہ پھاٹک سے باہر سڑک پر نکلنے کی کوشش کرتے' جوڈی ان کے گرد واگرد کچھ فاصلے سے بھونکتا (وہ بکروں کے سینگوں سے ڈرتا تھا) اور گھیر گھار کر ان کو اس ارادے سے باز رکھتا تھا۔ اب وہ بکروں پر بالکل توجہ نہ دیتا۔ وہ جہاں چاہتے آتے جاتے' گھومتے پھرتے' جوڈی کی بلا سے۔ وہ اگلی ٹانگوں پر سر رکھے' پژمردہ آنکھوں سے انہیں پھاٹک سے باہر جاتا دیکھتا رہتا' اور کھڑا ہو کر انہیں تنبیہ کرنے کو ہلکی سی بخ بھی نہ کرتا۔ یہ بکرے بھی ایک مصیبت تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن منظوراں مائی مجھے اطلاع دیتی کہ ایک یا دونوں بکرے غائب ہیں۔ پھر وہ بے چاری برقع اوڑھ' ہاتھ میں درخت کی ایک شاخ لئے شادی خان کے ساتھ انہیں ڈھونڈنے نکلتی اور دور سڑک پر سے یا لائبریری کے میدان سے انہیں ہنکا کر لے آتی۔ اس کام میں شادی خان اس کی مدد کرتا۔

ایک دن ایک بکرا سچ مچ گم ہو گیا۔ منظوراں مائی نے اور میں نے اس کو سڑک پر اور محلے میں ہر جگہ ڈھونڈا مگر وہ نہ ملا۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ اس کو کسی نے پکڑ کر باندھ لیا ہو گا کیوں کہ یہ بکرے اسپیشل اور اعلیٰ

تھے) اور اب اس کے لوٹ آنے کی کوئی صورت نہیں۔ مجھے اس کے کھو جانے پر بہت فکر تھی۔ جب بھائی اور بچے لاہور سے آئیں گے تو میں ان کو کیا منہ دکھاؤں گا کہ ہم بکروں کی رکھوالی نہ کر سکے۔ میں نے بکرے کے کھوئے جانے کا قصور وار جوذی کو ٹھہرایا۔ یہ سب اس کی غفلت اور فرض ناشناسی کی وجہ سے ہوا۔ میں نے غصے میں آکر اپنی چھڑی لی جس سے میں جوذی کا دوسرے کتوں سے بچاؤ کیا کرتا تھا' اور اس سے اسے خوب پیٹا۔ میں بہت غصے میں تھا۔ بے چارے جوذی کو کیا پتا کہ اسے کیوں پیٹا جا رہا ہے۔ اسے غالباً یہ علم نہ تھا کہ اسے بکرے کی محافظت کے فرض میں کوتاہی کی سزا دی جا رہی ہے۔ پہلے وہ حیران ہوا اور اس کی آنکھیں یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں: "دیکھو تم کیا کر رہے ہو!" وہ مار کھاتا رہا۔ میرے سر پر بھی بھوت سوار تھا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ شاید میں اپنی مایوسیوں اور تلخیوں کا غصہ بے چارے کتے پر اتار رہا تھا۔ اس کہاوت میں بڑی صداقت ہے کہ کم زور آدمی کا پارہ بہت جلدی چڑھتا ہے' اور شاید ہم میں سے بہت سوں کے اندر ایک مارکی دساد (Marquis de Sade) چھپا ہوتا ہے جسے ایذا رسانی سے ایک گونہ راحت نصیب ہوتی ہے۔ بے دردی اور اذیت رسانی کے اس بدنما جذبے سے میں ایک مدت سے آگاہ ہوں۔

جوذی مار کھا کر ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ میں نے باہر جا کر دیکھا مگر اس کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ "یہ بدبخت کہاں چلا گیا!" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اس کے خلاف میرا غصہ اب ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ بکرے کے گم ہونے میں جوذی کا اتنا قصور نہ تھا۔ گھنٹہ گزر گیا' دو گھنٹے گزر گئے' جوذی نہ لوٹا اور میں سوچنے لگا شاید وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ کچھ اور وقت گزرنے پر میں فی الواقع اس کے بارے میں فکر مند ہو گیا۔ آخر اس کو ہوا کیا؟ میں نے منظوراں مائی سے کہا کہ جوذی ناراض ہو کر چلا گیا ہے اور اب کہیں بھی نہیں ہے۔ اس نے کہا: "پتا نہیں جی کہاں گیا ہے۔ میں جوذی کو ٹول لاؤں (تلاش کر لاؤں)؟" وہ برقع اوڑھ کر شادی خان کو گود میں لئے جوذی کی کھوج میں گئی۔ جب آدھ گھنٹے بعد واپس آئی تو اس نے بتایا کہ جوذی سینٹرل لائبریری کے میدان میں کتوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ منظوراں نے جوذی کو ساتھ لے آنے کی کوشش کی تھی مگر جوذی نے اس کی بات نہ سنی اور اسے دیکھ کر پرے بھاگ گیا۔ "وہ نہیں آتا جی۔ اب کیا کیجئے جی؟" میں سوچنے لگا کہ جوذی کو کیا ہوا' کیا اس کا دماغ چل گیا ہے؟ اس نے اپنی خاندانی شرافت کو بھلا کر پرول کتوں کی صحبت میں پناہ ڈھونڈی تھی' اور ان سے دوستی استوار کر کے ان کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گیا اور چھڑی ہاتھ میں لے کر میدان میں پہنچا۔ میں نے اسے آواز دی: "جوذی! جوذی 'کم آن'!" اس نے مجھے دیکھا' میرے ہاتھ میں چھڑی دیکھی' اور آنے سے قطعی انکار کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے منا کر ساتھ لے جانے کی کوشش فضول ہے۔ میں واپس آ گیا۔ منظوراں مائی کے مطابق جوذی شام کو سورج ڈوبنے سے پہلے گھر واپس آ گیا تھا' مگر اس نے اپنے آپ کو میری نظروں سے اوجھل رکھا ہو گا کیوں کہ میں نے اسے دوسرے دن دوپہر کو دیکھا۔ وہ پچکا سا بنا ہوا' سر اگلی ٹانگوں پر دھرے 'بے حد ملول' برآمدے میں لیٹا تھا۔ خوف اب تک اس کی آنکھوں میں تھا اور اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے ہم اجنبی ہوں۔ میں نے اسے سر پر تھپکا۔ ایک بجلی سی سرسراہٹ ہوئی' مگر اس نے جواب میں میرے ہاتھ کو چاٹنے کے لئے گردن ٹیڑھی نہ کی۔ جوذی کا چہرہ پتھر تھا۔ ہم اب بیگانے تھے۔ بھروسا اور رفاقت اب گزری بات تھی۔ اس کی جگہ عدم اعتماد اور غیریت نے لے لی تھی۔ میں نے جان لیا کہ میرے اور جوذی کے تعلقات

اورنگ زیب قاسمی

اب پہلے کے سے کبھی نہیں ہوں گے۔

اب جوذی کی زندگی میں ایک نیا دور آیا۔ وہ مجھے ڈر اور نفرت اور انتہائی بدگمانی کے ساتھ دیکھنے لگا۔ اب نہ تو وہ مجھے پھاٹک تک چھوڑنے آتا اور نہ ہی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہونے والے کتوں سے غرض رکھتا۔

انہیں دنوں میرے بھائی کے بچے آ گئے اور مجھے دو تین مہینوں کے لئے کراچی جانا پڑا۔ جب میں لوٹا تو جوذی بدستور بیمار اور کم زور تھا۔ اس نے مجھے بے تعلق اور شاید خوف سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے کوئی خوش آمدید نہ تھی۔ ہمارے تعلقات پھر پہلی ڈگر پر کبھی نہ آ سکے۔ میں نے بھی اسے تھپکنا اور بلانا چھوڑ دیا اور وہ بھی مجھ سے لاتعلق ہو گیا۔ پھر میں کچھ مدت کے لئے لاہور اپنے ایک زین بدست دوست کے پاس ٹھہرنے چلا گیا اور جب لوٹا تو جوذی میں ایک خوش گوار تبدیلی دیکھی۔ اس کا بدن بھر چکا تھا اور پسلیاں نظر نہیں آتی تھیں ـــــ شاید پراسرار عارضے نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ میرے پیٹھ تھپتھپانے پر نہ تو اس نے دوستی کا اظہار کیا اور نہ ہی خوف سے سمٹا۔ وہ ہماری پرانی لاگ کو بھولا نہ تھا۔ گل شیر نے مجھے بتایا کہ اس کی حالت خود بخود ہی "زروئی" ہوتی گئی اور اب وہ بھلا چنگا ہے۔

میں نے نوٹ کیا کہ کتوں کے اندر آنے پر وہ واویلا نہ کرتا مگر ان سے زیادہ دوستی بھی نہ کرتا۔ بہت کم کتے البتہ اب کوٹھی کے اندر آتے۔ ساری مدت میں میں نے دو ہی دیکھے۔ ایک تو لال تھوتھنی والی مفلوک الحال جھبری کتیا تھی۔ اس کی پوستین کا رنگ گدلا سفید تھا۔ میں اسے اکثر بھگاتا رہتا تھا کیوں کہ وہ مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ کوٹھی کو کچھ کچھ اپنا گھر سمجھتی تھی۔ کھیت میں سونگھتی پھرتی یا راستے پر پڑی رہتی۔ میں نے جوذی کو کبھی اس کے پاس جا کر لاڈ کرتے نہیں دیکھا۔ ممکن ہے اس کے دل میں جوذی کے لئے چاہت ہو اور "وقتاً" اسے دیکھنے کے لئے آ جاتی ہو۔ دوسرا ملاقاتی ایک چھوٹے قد کا سفید کتا تھا' مگر وہ بھی کبھار ہی آتا تھا۔ "ظاہراً" جوذی کے پہلے دوستوں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی ان سے دوبارہ آشنائی پیدا کرنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ وہ اب پھاٹک سے باہر بھی نہ جاتا' اور اگر جاتا بھی تو حوائج ضروری سے فارغ ہونے کی خاطر۔ وہ یہ کام گھر کے اندر کبھی نہیں کرتا تھا' جوذی میں اتنی سمجھ تھی۔ خدا جانے یہ خوش سلیقگی اس نے کس سے سیکھی تھی۔

جوذی اب پرانا عناد بھول کر مجھ سے مانوس سا ہونے لگا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس نے مجھے "تقریباً" معاف کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے میرے متعلق اس کے چند وسوسے اور شکوک ابھی پوری طرح اس کے شعور سے نہ نکلے ہوں۔ میں لان میں بیٹھا سرما کی دھوپ میں ایک ناول پڑھ رہا تھا۔ جوذی مجھ سے کچھ فاصلے پر پہلو کے بل لیٹا تھا۔ پھر وہ اٹھ بیٹھا اور پچھلے بائیں پاؤں سے اپنا پیٹ اور سر زور زور سے کھجانے لگا جیسا کہ وہ ان دنوں اکثر کرتا رہتا تھا۔ (وہ نہانے کا زیادہ قائل نہیں اور پانی سے الرجک۔) اس حالت میں وہ مجھے بڑا تماشا سا لگا اور میرا دل اسے پیار کرنے کو چاہا۔ میں نے اسے بلایا: "کم آن' جوذی!" (جوذی انگریزی زبان بخوبی سمجھتا ہے مگر اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا۔) وہ کھجانا بند کر کے اصالت سے میرے پاس آ گیا' مگر پراشتیاق مستعدی سے نہیں۔ میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور سر کو سہلایا۔ وہ اپنا سر میرے ہونٹوں میں گھسیڑ کر ان کو چاٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے دل میں دھک سی ہوئی۔ اب پہلی محبت میں سے کچھ

حصہ لوٹ آیا تھا اور ہم کسی قدر دوست ہو گئے تھے۔ اتنے میں محلے کی بوسیدہ وردی والی کتیا پھاٹک کے نیچے سے گزر کر اندر آئی۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے جوزی سے کہا: "جوزی' گیٹ ہر!" (جوزی' اسے بھگاؤ!) جوزی نے میری بات پوری طرح سمجھ لی مگر نہ تو کتیا کی طرف جنبش کی اور نہ بھونکنا مناسب سمجھا۔ میں نے اسے کان سے پکڑ کر ذرا کڑک دار آواز میں پھر کہا: جوزی' آئی سے گیٹ ہر!" اور میں نے دیکھا کہ خوف پھر اس کی آنکھوں میں لہرایا اور وہ سست سا گیا۔ اس نے خیال کیا ہوگا کہ میں اسے اس نافرمانی کی پہلے کی طرح سزا دوں گا۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کے لئے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔

چند دن ہوئے مجھے بھابی اور بھتیجی سے جوزی کی اصل عمر کا پتا چلا اور میں جان کر متعجب ہوا کہ اپنے قد کاٹھ کے باوجود جوزی نے ابھی اپنے بچپن کو پار نہیں کیا تھا۔ میں نے جوزی کو دیکھتے ہوئے بھابی سے پوچھا: "جوزی کی عمر کیا ہوگی؟" وہ سوچ کر اور حساب لگا کر کہنے لگیں: "ہمارے پاس جب آیا تو نومولود تھا۔ ایک سال تو ہمارے پاس رحیم یار خان میں رہا' اور پھر دو سال ہمیں یہاں بہاولپور میں ہو گئے ہیں۔ اس طرح جوزی تین سال سے زیادہ عمر کا نہیں ہو سکتا۔" حالانکہ میں نے ہمیشہ جوزی کو ایک سیانا بالغ کتا سمجھا تھا اور اسی طور پر اس سے برتاؤ کیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کتے کی نارمل عمر کیا ہوتی ہوگی' کتنے برس میں وہ جوان ہوتا ہے۔ میں نے کئی لوگوں سے پوچھا۔ ایک نے کہا کہ کتے کی اوسط عمر اٹھارہ سال ہوتی ہے' دوسرے نے کہا تیس سال۔ کسی کو پورے طور پر یقین نہ تھا۔ پھر میں نے "بک آف نالج" میں ڈھونڈ کر پتا لگایا کہ کتے کی اوسط عمر چالیس سال ہوتی ہے۔ آدمی کی طبعی عمر اگر اسی برس پر رکھیں تو اس حساب سے ایک "آدمی سال" کے دو "کتا سال" بنتے ہیں۔ آدمی اگر سولہ برس کی عمر میں بلوغت کو پہنچتا ہے تو کتا آٹھ سال کا ہونے پر عنفوان شباب میں ہوگا۔ اور جوزی کی عمر تو ابھی بمشکل تین "کتا سال" یا چھ "آدمی سال" ہے' یعنی مکتب میں داخل ہونے کی عمر۔ جوزی کے جوان ہونے میں ابھی پانچ برس اور پڑے ہیں۔ جوزی کی قد و قامت اور وقار دیکھ کر میں "بک آف نالج" کی معلومات اور اپنے حساب کے بارے میں الجھن میں پڑ جاتا ہوں (مجھے وہ بالکل بالغ لگتا ہے)' اور ہندی کی چندی کرنے کے لئے میں اپنے زین بدست دوست کو خط لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں جس نے ایک السیشین کتا بارہ سال اپنے ساتھ رکھا اور جس کا اب السیشین یا کسی دوسری نسل کے کتوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہاں' چغتائی کے پاس بھی تو ایک السیشین کتا ہے: اس سے پوچھوں گا۔ بعد ازاں پچھلے دنوں میرا زین بدست دوست لاہور سے آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ السیشین کتے کی نارمل زندگی کتنی ہوتی ہے۔ اس نے اپنے تجربے کی روشنی میں بتایا کہ ہماری آب و ہوا میں دس بارہ سال سے زیادہ نہیں۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ کتے سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ زندگی نہیں پاتے' اور یہ کہ میری کتاب میں درج کتے کی عمر صحیح نہیں ہو سکتی۔ میرے دوست کے کہنے کے مطابق انسانی زندگی کے چھ برس کتے کی زندگی کے ایک برس کے برابر ہیں۔ جوزی اب تین "کتا سال" کی عمر کا ہے' گویا اٹھارہ "آدمی سال" کا یعنی عین عنفوان شباب میں۔ اس کے کھیلنے کھانے کے دن ہیں مگر وہ مزاجاً' افسردہ اور خاموش طبع کتا ہے۔ اس کی طبیعت میں ہنگامہ خیزی نہیں' لیکن چند روز ہوئے جب میں رات کے بارہ بجے کسی کھانے سے لوٹا تو میں نے اس کے ساتھ دو کتیاں دیکھیں۔ ایک تو وہی بوسیدہ پوستین والی تھی اور دوسری کھڑے بادامی کانوں والی چست سی کتیا۔ جوزی بھونکتا' اچھلتا' کودتا' مجھ پر سو جان سے نثار ہوتا' مجھے پھاٹک سے میرے کمرے تک چھوڑ گیا۔ مجھے اندر

اورنگ زیب قاسمی

سلامت اور محفوظ چھوڑ کر وہ پھر اپنی دوست کتیوں کے پاس جا پہنچا۔ میں نے سوچا کہ جوزی محض زاہد خشک نہیں: اسے جنس لطیف میں دلچسپی پیدا ہو رہی ہے اور اس عمر میں ہونی بھی چاہیے۔ میں ان معاملات میں اتنا پروڈ (Prude) نہیں رہا جتنا کہ کبھی تھا۔

جوزی کا یہ مرقع مکمل کئے مجھے چار ہی روز ہوئے تھے کہ جوزی مر گیا۔ وہ بڑے پراسرار حالات میں مرا اور میں سمجھتا ہوں کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ وہ دن صبح کے وقت باہر جاتے ہوئے میں نے اسے برآمدے میں دیوار کے ساتھ اپنی مقررہ جگہ پر لیٹے ہوئے نہ دیکھا مگر اس کے نہ ہونے پر کوئی دھیان نہ دیا۔ اگلے دن دوپہر کے وقت میں اپنے کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ گیلری میں میرے بھتیجے نبیل کی آواز آئی کہ جوزی سخت بیمار ہو گیا ہے۔ اتنے میں مائی منظوراں بھی خبر سنانے میرے کمرے میں آئی۔ "صاحب' جی' وہ ساڈا جوزی ہے نا' وہ شدا بڑا بیمار ہے۔ کوئی بلا اسے چمٹ گئی ہے۔ اسے خون کی الٹیاں اور دست لگے ہیں۔ فیر جی ہن کیا کریئے؟" اس نے میری طرف توقع سے دیکھا جیسے میں جوزی کو بچانے کے لئے کچھ کروں گا۔ میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا مگر میں فوراً جوزی کو دیکھنے نہ گیا کیوں کہ میرا خیال تھا کہ جوزی اپنی بیماری پر غالب آ جائے گا۔ بھلا جوزی کیسے مر سکتا ہے؟ لڑکے خواہ مخواہ فکر مند ہو رہے ہیں۔ پھر چھوٹا شادی خان آیا' بے حد مضطرب اور چھوٹی آنکھیں پھیلی ہوئی۔ "صاب!" اس نے کہا۔ "تیکوں پتا اے ساڈا جوزی مرا پیا ہے۔ بچارے تے مکھیاں بھمدیاں پیاں ہن۔ چل جوزی کوں ڈیکھ!" میں اٹھا اور شادی خان کی انگلی پکڑ کر جوزی کو دیکھنے چل پڑا۔ گیلری میں لڑکوں کے ٹیپ کی آواز آ رہی تھی۔ وہ جوزی کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے اپنے بھتیجے نبیل سے کہا کہ وہ جوزی کو گاڑی میں ڈال کر وٹرنری ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ اس نے کہا کہ جوزی کو منہ سے خون آنے اور دستوں کی تکلیف ہے' اسے ہسپتال نہیں لے جایا جا سکتا۔ اندر کے برآمدے میں جوزی کچن کی دیوار کے پاس لیٹا تھا ---- بے سدھ' تھوتھنی پر خون جما ہوا اور نیلا دھڑ ایک پرانے کمبل میں لپٹا ہوا۔ بے شمار مکھیاں اس کے اوپر بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کی کرنجی نیلی آنکھیں موت دیکھ رہی تھیں۔

میں اس کے پاس گیا اور اس کا سر سہلایا۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ اس کی آنکھیں بے حد نیلی پڑ گئی تھیں اور ان میں بے بسی اور بے پروائی تھی۔ دودھ کا پیالہ اس کے پاس جوں کا توں پڑا تھا۔ وہ بہت خستہ حالت میں تھا۔ شادی اور میں اسے کچھ دیر دیکھتے رہے۔ پھر میں نے نبیل سے کہا: "ہمیں اس کو بچانے کے لئے کچھ تو کرنا چاہیے۔ تم موٹر سائیکل پر جا کر وٹ کو یہاں لے آؤ۔" نبیل نے کہا: "انکل' اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ وٹ کچھ نہیں کر سکے گا۔" پھر بھی وہ میرے اصرار پر گیا اور تھوڑی دیر بعد وٹ کے اسسٹنٹ کو لے آیا۔ یہ شلوار قمیض میں ملبوس' افسرانہ برتری جتانے والا ایک نوجوان تھا جو اسسٹنٹ کا بھی اسسٹنٹ لگتا تھا۔ اس نے جوزی کو دیکھا' اسے ٹٹولا اور بولا: "اسے تیز بخار ہے۔" پھر اس نے پوچھا یہ کوٹھی سے باہر تو نہیں چلا جاتا تھا۔ میں نے جواب دیا: "بس کبھی کبھی پھاٹک کے باہر چلا جاتا تھا۔" کچھ دیر اور جوزی کو دیکھنے کے بعد اس نے کہا: "یہ زندہ نہیں بچے گا۔ اس کی زندگی بس دو تین گھنٹے باقی ہے۔" یہ ایک ایسی خبر تھی جسے شاید ہم پہلے ہی جانتے تھے۔ نبیل اسے اپنی موٹر سائیکل پر ہسپتال چھوڑنے اور وہاں سے کوئی دوا لینے چلا گیا۔ میں نے جوزی کو یہ جانتے ہوئے کہ اب موت اس سے زیادہ دور نہیں' آخری بار دیکھا اور مائی منظوراں کو وہاں بیٹھا چھوڑ کر چلا آیا۔ وہ چارپائی پر اکڑوں چڑھی بیٹھی' ہاتھ ٹھوڑی پر رکھے' جوزی کو

مرتا دیکھتی ہوئی کوئی جادوگرنی لگتی تھی۔ دس منٹ بعد جل کی موٹر سائیکل کے لوٹنے کی پھٹ پھٹ سنائی دی اور پھر ایک لڑکے نے دوسرے سے کہا کہ کسی گیراج میں سے لے آؤ۔ کسی کی آخر کیا ضرورت پیش آگئی؟ ہو گا' لڑکے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ وینٹ کے اسسٹنٹ نے جوڈی کو تین گھنٹے کا وقت دیا تھا' اس لئے مجھے یہ خیال نہ آیا کہ جوڈی ختم ہو چکا ہے اور کسی اس کی قبر کھودنے کے لئے درکار ہے۔ آدھ گھنٹے بعد جب میں نے جل سے وینٹ کی دوا کے بارے میں پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ انہوں نے سبزی کے کھیت سے پرے گڑھا کھود کر جوڈی کو دفن بھی کر دیا ہے۔ اداسی سی میرے اوپر چھا گئی۔ سو جوڈی دیکھتے ہی دیکھتے ہم سے دور چلا گیا تھا' اور اب ہم اس سنجیدہ اور پروقار کتے کو کبھی نہ دیکھ سکیں گے --- پھر میں نے اس کی موت کو قبول کر لیا جس طرح ہم کسی دیرینہ رفیق کی ابدی جدائی کو قبول کر لیتے ہیں۔ سوچا جائے تو کتے اور آدمی کی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ موت ہر زندگی کا انجام ہے۔

جوڈی کو مرے دو دن ہوئے تھے۔ چھوٹا شادی خان اور میں ناشتہ کر رہے تھے کہ شادی نے کہا: "صاب! ہمارا کتا مر گیا ہے۔ ہمارا پکا دوست تھا۔ پہلے مجھے چک مارتا تھا' پھر دوست ہو گیا۔ تیرا نہیں' میرا دوست' میں اسے بلاتا تھا تو آجاتا تھا' پھر مجھ کو پیار کرتا تھا۔"

"ہاں' جوڈی اچھا کتا تھا" میں نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد شادی چمچ سے چائے میں بھگوئی ہوئی ڈبل روٹی کھاتے ہوئے بولا: "صاب! تو بڈھا تھیندا ویندیں۔ میں بڈھا نہیں ہو رہا!"

"ہاں شادی میں بڈھا ہو رہا ہوں اور پھر مر جاؤں گا جیسے ہمارا جوڈی مر گیا۔"

"وہ کوئی بات نہیں" شادی نے مجھے تسلی دی۔ "پھر ہم تم کو جوڈی کی طرح پور دیں گے (دفن کر دیں گے)۔"

"تم مجھے یاد نہیں کرو گے شادی؟"

"پھر تو مر جائے گا تو میں تیرے دراز سے سب پیسے بھی لے جاؤں گا" شادی نے معاملے کے مثبت پہلو پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "پھر صاب! تو مجھے منع بھی نہیں کر سکے گا۔"

("آج" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

محمد سعید شیخ

دھوکے

انٹر کام نے "ٹوں ٹوں" کی تو اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے بڑے صاحب کی آواز آئی۔

"شیخ صاحب! میرے کچھ مہمان آگئے ہیں۔ میں انہیں اٹنڈ کرنے گھر جا رہا ہوں۔ میری عدالت میں کچھ سائل بیٹھے ہیں۔ آپ میرے چیمبر کے راستے وہاں آجائیں اور ان کی درخواستیں نپٹا دیں۔"

اس نے ریسیور رکھا' ڈائری اور پنسل سنبھالی اور اپنے چھوٹے سے دفتر سے باہر نکل آیا۔ برآمدے کے اس طرف چند قدم کے فاصلے پر ایک ہی بڑی بلڈنگ میں بڑے صاحب کا شاندار دفتر تھا۔

نائب قاصد نے بڑے صاحب کے دفتر کا ہینڈل گھمایا۔ پہلے ایک اور پھر دوسرا دروازہ کھول دیا۔ بڑے صاحب جا چکے تھے۔ صاحب کے شاندار دفتر کے اندر سے ایک دروازہ پرلی طرف عدالت میں کھلتا تھا۔ چیمبر سے عدالت میں جانے کے لئے بڑے صاحب کے لئے یہ راستہ تھا۔ اس کے صاحب کا یہ دستور تھا کہ ہفتے میں دو دن وہ مقدمات کی سماعت کرتے تھے اور عام لوگوں کے مسائل سنتے تھے' ان کی درخواستوں پر مناسب حکم لکھتے تھے۔ ان میں سے بہت سی درخواستیں کارروائی کے لئے شیخ صاحب کے پاس آتی تھیں۔

اس علاقے میں اور بھی بہت سے افسر تھے مگر لوگوں کی تسلی تبھی ہوتی تھی جب بڑے صاحب ان کی درخواستوں پر خود اپنے قلم سے حکم لکھیں۔

لوگ سمجھتے تھے صاحب بڑے بااختیار تھے' ان کے قلم میں بڑی طاقت تھی۔ بڑے صاحب اس پورے علاقے کے انچارج سمجھے جاتے تھے ان کی انصاف پروری لوگوں میں کافی مشہور ہو چکی تھی۔

شیخ صاحب بڑے صاحب کے ماتحتوں میں سے ایک تھے فرق صرف یہ تھا کہ انہیں بڑے صاحب کے سٹاف افسر کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ جس چیمبر سے گزر کر شیخ صاحب عدالت میں پہنچے وہ صاحب کے دفتر کے طور پر کام آتا تھا۔

چیمبر کا دروازہ عدالت کے پلیٹ فارم پر کھلا۔ شیخ صاحب نے آج پہلی مرتبہ غور سے وہ بڑی سی خوبصورت میز اور کرسی کو قریب سے دیکھا جس پر بیٹھ کر بڑے صاحب عدالت کا کام کرتے تھے۔

گھومنے والی کرسی کے عقب میں دیوار پر قائداعظم کی بڑی تصویر آویزاں تھی۔ نیچے فرش پر دری بچھی تھی اور عدالت کے چاروں طرف کرسیوں پر سائل اپنی اپنی درخواستیں لئے بیٹھے تھے۔ شیخ صاحب کو پتہ تھا' یہ سائل دور دور سے اپنے دکھ کاغذوں پر لکھ کر لاتے تھے اور ان کے دل میں امید ہوتی تھی کہ بڑے صاحب کا قلم ان کے دکھوں کا مداوا لکھے گا۔

شیخ صاحب نے ان سائلوں کو سن کر ان کی درخواستوں پر بڑے صاحب کی طرف سے حکم لکھنا تھا۔ شیخ صاحب کی اپنی ایسی کوئی حیثیت نہ تھی کہ وہ ان درخواستوں پر کوئی حکم لکھ سکتے۔ انہیں اس حقیقت کا علم تھا مگر یہ بات ایسی تھی کہ ان سائلوں کو اگر بتادی جاتی تو ان کی امیدوں پر اوس پڑ جاتی۔ پھر ذاتی طور پر شیخ صاحب یہ بھی جانتے تھے کہ ان سائلوں کے مسائل ان کے کسی بھی حکم سے اتنی جلدی کب دور ہونے والے تھے۔ یہ تو قسمت اور نصیب کی بات تھی۔

بڑے صاحب کی طرف سے حکم لکھنے کے لئے شیخ صاحب کو بڑے صاحب کی گھومنے والی کرسی پر بیٹھنا بھی لازمی ہوگیا تھا۔ کرسی کے سامنے بڑی شاندار میز کے دائیں بائیں چھوٹے اہلکاروں کی دو کرسیاں تھیں۔ شیخ صاحب اگر ان میں سے کسی بھی کرسی پر بیٹھ جاتے تو سائلوں کی تسلی ہونا ممکن نہیں تھی۔ وہ سمجھتے کہ ان کی درخواستیں کسی صاحب نے نہیں بلکہ کسی اہلکار نے وصول کی ہیں۔ ان درخواستوں پر لکھے گئے حکم کی قیمت جب سائلوں کے اپنے دل سے ہی نکل جاتی تو آگے ان کا کیا اثر ہونا تھا۔ اور شیخ صاحب کا یہ بھی فرض تھا کہ آج وہ سائلوں کو بڑے صاحب کی عدم موجودگی کا احساس بھی نہ ہونے دیتے ورنہ انہیں اگلے روز پھر بڑے صاحب کے پاس آنے کی ضرورت محسوس ہوتی لوگوں کا یقین تھا کہ بڑے صاحب کا حکم بہت چلتا ہے۔ انہیں کوئی نہیں بتاتا تھا کہ ان کے مسائل کا حل اب کسی صاحب کے حکم میں نہیں بلکہ نظام کی تبدیلی میں تھا۔ یہ تبدیلی کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ تبدیلی سے سب ڈرتے تھے۔

شیخ صاحب نے چند ثانیوں میں بہت کچھ سوچ لیا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ عدالت میں موجود بہت سے سائلوں کو تو شاید اس بات کا بھی علم نہ ہو کہ آج اصلی صاحب وہاں موجود ہی نہیں ہے۔

پھر ان کے اندر ہی اندر کہیں یہ حسرت بھی چھپی بیٹھی تھی کہ کسی دن وہ بھی بڑے صاحب کی اس گھومنے والی کرسی پر بیٹھیں۔ زندگی میں انہیں جو کچھ بھی ملا تھا اس سے وہ بہت حد تک مطمئن تھے۔ انہیں پتہ تھا ان کے کیرئر میں اس کرسی تک پہنچنا اب بہت مشکل ہوگیا ہے ان کے پاس کوئی اسم اعظم نہیں تھا اور وہ سوسائٹی کے اس مراعات یافتہ طبقے سے بھی تعلق نہیں رکھتے تھے جن کے لئے بعض اوقات ایسی کرسیاں خالی بھی رکھی جاتی ہیں۔ انہیں خواجگی کے گر نہیں آتے تھے۔ جو درد مندی انہوں نے اپنے وجود میں پالنا شروع کر دی تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ خاک نشین ہو جاتے اس لئے اس کرسی کو دیکھ کر وہ عجیب سا محسوس کر رہے تھے۔

عدالت میں اس سٹیج کے دائیں جانب دیوار پر لکڑی کا خوبصورت تختہ لگا تھا جس پر آج تک اس کرسی پر بیٹھنے والوں کے نام اور ان کا عرصہ لکھا ہوا تھا بہت سے نام تھے جن سے دوسرے لوگ کیا خود شیخ صاحب بھی واقف نہیں تھے۔

شیخ صاحب نے سوچا چلو چند لمحوں کے لئے ہی سہی' اس کرسی پر بیٹھ کر دیکھ تو لیں کہ اس میں کتنے اسرار چھپے ہیں پھر اس کرسی کی گود میں آخر کیا طلسم ہے کہ جو بیٹھتا ہے اللہ کی مخلوق اس سے دور ہٹتی چلی جاتی ہے' انسان سکڑتے اور چھوٹے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے اس نے اپنے اندر کوئی کیمیائی تبدیلی کا احساس ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

کرسی پر بیٹھتے ہی اسے جمعدارنی کی کہانی یاد آگئی وہ روز بادشاہ کا کمرہ صاف کرتی تھی۔

اورنگ زیب قاسمی

جب وہ بادشاہ کا بستر درست کرتی تو اسے دیکھ کر ایک عجیب سا خیال اس کے دماغ میں بھنبھنانے لگتا۔ وہ سوچتی بادشاہ جب اتنے آرام دہ مخملیں بستر پر سوتا ہوگا تو اسے کیا محسوس ہوتا ہوگا۔

روز اس کا جی چاہتا کہ کیوں نہ تھوڑی' بہت ہی تھوڑی دیر اس بستر پر لیٹ کر دیکھے تو سہی کہ اس بستر کا کیا سواد ہے۔ وہ ڈر جاتی اور اس خیال کی گرفت سے بچنے کی کوشش کرنے لگتی۔

ایک روز اس خیال نے اتنی طاقت پکڑلی کہ وہ نوکرانی اس سے مغلوب ہوگئی۔ اس نے سوچا بادشاہ کو کیا پتہ چلے گا میں نے چند لمحے ہی تو لیٹنا ہے' پھر اس وقت بادشاہ کے ادھر آنے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔

اس نے خود کو تسلی دی اور حوصلہ کرکے بادشاہ کی سیج پر لیٹی۔ پاؤں پسارے' بازو سیدھے کئے اور آنکھ بند کرکے اپنی حالت کو محسوس کرنے کی کوشش کرتے ہی نیند نے اس پر غلبہ پالیا۔

اسے پتہ اس وقت چلا جب بادشاہ اس کے سر پر کھڑا غضب ناک نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جمعدارنی خوف سے لرز لرز گئی۔ وہ بہت گڑگڑائی بادشاہ کے پاؤں پڑی۔

ایک جمعدارنی کی یہ جرات کہ وہ بادشاہ کی سیج پر سو جائے۔ اس کی گستاخی کسی بھی طرح قابل معافی نہیں تھی۔ بادشاہ کے حکم پر کوڑے برسا برسا کر اس کی چمڑی ادھیڑ دی گئی جب بہت کوڑے لگ چکے تو اچانک وہ زور زور سے ہنسنے لگ گئی۔ بادشاہ آگ بگولا ہوگیا۔

اتنی سزا کے بعد بھی وہ گستاخ ہنس رہی تھی وجہ پوچھی تو کہنے لگی۔

"بادشاہ سلامت! میں اس بستر پر سونے کا مزہ چکھنا چاہتی تھی۔ چند لمحے سونے کی یہ سزا مجھے ملی ہے۔ سوچتی ہوں آپ پتہ نہیں کب سے اس سیج پر سوتے آرہے ہیں آپ کا کیا حال ہوگا۔"

کہتے ہیں جمعدارنی کی بات سن کر بادشاہ نے تخت و تاج چھوڑ دیا اور جنگلوں کو نکل گیا۔

اس کہانی کو یاد کرتے ہوئے شیخ صاحب نے سوچا اس کرسی تک پہنچنے کے لئے نہ جانے کتنے طلسمات' کتنی مہمات سر کرنا پڑتی ہیں۔ پھر بھی یہ کرسی کتنا بڑا سراب ہے کہ اس میں بیٹھ کر آدمی دوسروں کو وہ کچھ نظر آنے لگتا ہے جو وہ اصل میں نہیں ہوتا۔

"بڑے صاحب کو پتہ چلے کہ میں ان کی اس کرسی پر بیٹھا تھا تو نہ جانے وہ کیا سوچیں' کیا محسوس کریں۔"

مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ آخر کو انہوں نے سائلوں کی تسلی کرنا تھی۔

سائل باری باری اٹھ کر کرسی کے سامنے آتے' اپنا اپنا مسئلہ بیان کرتے اور شیخ صاحب اس پر برائے ضروری کاروائی علاقے کے کسی چھوٹے صاحب کو بھیج دیتے۔

سب سوالی نپٹ گئے۔

اتنی کھلی عدالت میں ایک سائل رہ گیا۔ وہ بڑے صاحب کی لمبی چمکدار میز کے ساتھ لگے لمبے تختے پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

"لائیے باباجی! اپنی درخواست!"

اس نے بابا کے خالی کانپتے ہاتھ دیکھ لئے تھے۔

"میری عرض تو زبانی ہے صاحب!"

"اسے لگا جیسے کہیں اس نے اس بابے کو دیکھا ہو۔

"جی فرمائیں!"

"میری تین جوان بیٹیاں ہیں۔ کھانے کے لئے کچھ نہیں۔ امداد چاہیے!!"

بابے نے جیسے منت کی۔

"درخواست لکھوا لائیں بابا جی! میں زکوٰۃ کے محکمے کو بھیج دیتا ہوں۔"

اس کا قلم والا ہاتھ حکم لکھنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا اب بڑے صاحب کی اس کرسی سے اٹھ جائے۔

"نہیں صاحب جی! تیرے پلے سے کچھ چاہیے۔"

بابے نے ضد کی۔

اس کا جی چاہا کہہ دے "میرے پلے تو کچھ نہیں۔"

اس کی بجائے اس نے کہا۔

"ہم دفتروں میں اس طرح تو امداد نہیں بانٹتے۔"

"تو اتنی اونچی کرسی پر بیٹھا ہے۔ تیری جیب سے کچھ چاہیے۔"

بابے نے اب شیخ صاحب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے کوئی پیشہ ور بھکاری ہے۔ مجھے نفسیاتی حربوں سے قابو کرنا چاہتا ہے۔"

پھر اس کا جی چاہا کہہ دے۔

"یہ میری کرسی نہیں ہے بابا جی۔"

"میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ میرے ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ بس کچھ دنوں کا راشن چاہیے۔ صرف دو سو روپے۔ تیری جیب میں ہیں۔"

اسے یاد آیا۔ صبح جب وہ کپڑے پہن رہا تھا تو اس نے بیگم سے کہا تھا۔

"میری جیب میں کچھ پیسے رکھ دینا۔ کہیں ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

"دفتر میں کیا ضرورت پڑے گی؟"

بیگم نے پوچھا تھا۔

"پھر بھی خالی جیب نہیں ہونا چاہیے۔"

تو اس کی بیگم نے اس کے کوٹ کی جیب میں دو سو روپے رکھ دیئے تھے۔

"دو چار دن بچا کر رکھیں۔ میرے پاس اور گنجائش نہیں ہے --- پہلے ہی آپ کی لائی تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا۔"

"عجیب سائل ہے! اسے تو یہ بھی پتہ ہے کہ میری جیب میں دو سو روپے ہیں ---" اس نے نظر بھر کر سامنے کھڑے بابے کو دیکھا۔

"ہو سکتا ہے یہ ضرورت مند نہ ہو --- مجھے دھوکہ دے رہا ہو --- دیانت دار جیسا نظر آتا ہے۔"

"اتنی اونچی کرسی پر بیٹھے ہو --- حوصلہ بھی اتنا ہی بڑا چاہیے' دو سو روپے کیا چیز ہے؟"

بابے نے اسے سوچتے دیکھ کر کہا۔

اورنگ زیب قاسمی

"ہو سکتا ہے یہ واقعی کوئی سوال ہو --- سوالی کو موڑنا نہیں چاہیے۔ پھر ہو سکتا ہے یہ میرا امتحان ہو۔ کوئی دیکھنا چاہتا ہو کہ میں کسی اہل ہوں بھی یا نہیں ---" شیخ صاحب نے سوچا۔

"اللہ کے بندے نہ جانے کیا کیا بھیس بدل کر اس دنیا میں لوگوں کو امتحان میں ڈالتے رہتے ہیں۔"

"اب خیر ڈال بھی دو!" سوالی نے جیسے اکتا کر اس کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔

شیخ صاحب کو یاد آیا۔

وہ میاں جی کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا ایک چوک میں ریڈ سگنل کی وجہ سے اسے رکنا پڑا۔ ایک بھکاری گاڑی کو ٹٹولتا ہوا اس کی کھڑکی کے نزدیک آیا اور ہاتھ پھیلا کر بولا۔

"اندھے فقیر کو دے جی بابا!"

"تو اندھا تو نہیں لگتا!"

اس نے بھکاری کی اندھی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"مگر تو تو اندھا نہیں بیٹا!" میاں جی نے کہا۔

"اس کا پھیلا ہوا ہاتھ دیکھ! --- کیا پتہ وہ واقعی حاجت مند ہو۔" اور اس نے اپنے پرس میں سے دس روپے نکال کر فوراً اس اندھے فقیر کے ہاتھ پر رکھ دیئے تھے۔

اب پھر ایک ہاتھ اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔

"اپنی اس اونچی کرسی کی خیرات دے دو صاحب!"

سائل نے شاید آخری سوال کیا۔

اس نے سوچا۔

اس سوالی کو کیا پتہ یہ کرسی' یہ عزت میری ہے یا نہیں --- یہ تو مجھے ہی عزت دار سمجھتا ہے۔ اسے کیا پتہ میں اصلی ہوں یا نقلی۔ اس کرسی پر جب بیٹھ ہی گیا ہے تو اب اس کی قیمت بھی ادا کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

ساری عدالت خالی تھی۔

شیخ صاحب نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور جتنے پیسے ہاتھ میں آئے نکال کر سائل کے دست دراز پر رکھ دیئے۔

جب وہ سوالی خوش خوش دعائیں دیتا عدالت سے نکل گیا تو شیخ صاحب نے بڑے صاحب کی کرسی چھوڑ دی۔ اپنے ہاتھ سے اسے ایک دفعہ گھما کر دیکھا اور پھر عجیب سا احساس لئے سٹیج سے نیچے اتر گیا۔

("اوراق" لاہور)

دریائے درینا کا پل ۔ ایک نئی داستان

"اس وقت جب تم اپنے گلاس میں اسکاچ انڈیلتے ہو' کاک ٹیل مارتے ہو یا اپنی گھڑی دیکھتے ہو جب تم اپنی ٹائی درست کرتے ہو ۔۔۔۔۔ لوگ مر رہے ہیں
مختلف نیم نامو ں والے شہروں میں "گولیوں سے چھلنی ہو رہے ہیں' شعلوں میں جھلس رہے ہیں اور زیادہ تر نہیں جانتے کہ کیوں لوگ مر رہے ہیں۔
ان چھوٹی جگہوں پر جنہیں تم نہیں جانتے لیکن وہ اتنی بڑی ہیں کہ انہیں چیخنے یا خدا حافظ کہنے کی مہلت بھی نہیں دی جاتی۔ لوگ مر رہے ہیں۔"
لوگ مر رہے اس وقت جب تم تغافل اور ضبط نفس وغیرہ کے نئے پیٹرن کا انتخاب کر رہے ۔۔
اسی لئے لوگ مر رہے ہیں۔"

"ڈیر رانکو

"تمہاری نظر سے جوزف برادسکی کی یہ نظم گزری؟ اس نظم کا عنوان ہے A Tune For Bosnia یہ وہی برادسکی ہے جسے ۱۹۸۷ء کا نوبل انعام ملا ہے۔ تم بھی نوبل انعام حاصل کرنے کے لئے بے چین تھے بلکہ تمہیں تو یقین تھا کہ ۱۹۹۳ء کا نوبل پرائز تمہیں ہی ملے گا۔ اس کے لئے تم نے ناول لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ تمہیں یہ نظم ضرور پڑھنا چاہیے اور پوری نظم پڑھنا چاہیے۔ مجھ سے تو پوری نظم نہیں پڑھی گئی۔ چند مصرعے پڑھ کر ہی میرے دھڑکتے دل اور دھندلاتی آنکھوں نے سارا صفحہ سیاہ کر دیا تھا۔ پھر میرے سامنے وہ صفحہ نہیں تھا جس پر یہ نظم چھپی ہوئی تھی بلکہ ایک بہت بڑا سیاہ حاشیہ تھا۔ وہ سیاہ حاشیہ جو پورے گلوب اور پوری کائنات پر پھیلا ہوا تھا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جیسے میری بینائی جاتی رہی ہو۔ جیسے ساری دنیا کی بینائی جاتی رہی ہو اس وقت میں نے تمہیں خط لکھنے کا سوچا ....."

اس نے کہا" میں بوسنیا کا رہنے والا ہوں۔ سرب ہوں لیکن میں نے قرآن اور حدیث پڑھی ہے۔"
میں نے غور سے اس کا منہ دیکھا۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ مگر اس کا جھوٹ مجھے اچھا لگا۔ وہ میرا دل رکھنا چاہتا تھا اور میں بھی اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا اس لئے میں نے بھی اس پر یہی ظاہر کیا کہ مجھے اس کی بات کا پورا اعتبار ہے۔ پھر وہ اپنے الجھے بالوں اور الجھی ڈاڑھی میں کھڑا ہنستا رہا اور میں اس کا ساتھ دیتا رہا۔

میں ادیبوں کی اس سالانہ کانفرنس میں شرکت کے لئے بلگریڈ گیا تھا جس کا نام Encounter تھا اور جس میں غیر جانبدار ملکوں کے ادیب شرکت کرتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ اپنی وزارت تعلیم اور اپنی ائیر لائنز

اورنگ زیب قاسمی

کی مہربانی سے میں اس دن پہنچا تھا جب کانفرنس میں شرکت کرنے والے سارے ادیب اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے۔ اور ایئر پورٹ پر مجھے لینے کوئی نہیں آیا تھا۔

یہ ۱۹۷۶ء کے اکتوبر کا مہینہ تھا۔ ایئر پورٹ سے باہر دھوپ خوب چمک رہی تھی لیکن سردی اس بلا کی تھی کہ مجھے سب کے سامنے اپنا سوٹ کیس کھول کر گرم جرسی نکالنا پڑ گئی تھی۔

مجھے لینے کوئی نہیں آیا تھا مگر مجھے وہاں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ ایئر پورٹ پر اترتے ہی اپنائیت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس اپنائیت کا پہلا احساس تو اس وقت ہوا جب میں نے کرنسی تبدیل کرائی۔ مجھے ڈالر کے بدلے جو سکہ ملا اس کا نام دینار یا دینار تھا۔ پھر انفرمیشن کے کاؤنٹر پر بیٹھی جس خاتون نے یہ مشورہ دیا کہ ایئر پورٹ پر سردی میں مرنے کی بجائے پارک ہوٹل پہنچ جاؤ اور وہاں سے رائٹرز یونین کے دفتر فون کر لو'وہ بھی اپنے جیسے کی ہی کوئی مسلمان خاتون معلوم ہوئیں۔ اور پھر جب بس کا انتظار کر رہا تھا تو جو بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت اپنی طرف آتے دکھائی دیئے انہیں دیکھ کر تو یچ یچ لگا کہ وہ اپنے گلگت یا ہنزہ سے چلے آ رہے ہیں۔ وہی پہاڑوں کی سرد ہواؤں میں جھلسے سرخ سرخ چہرے۔ وہی گٹھا ہوا جسم اور مدھر قد' وہی گھیرے دار شلوار' وہی کھلے کھلے کرتے اور وہی کڑھائی کی ہوئی واسکٹیں۔ عورت کے سر پر جو رومال بندھا تھا وہ بھی دوپٹہ ہی معلوم ہوتا تھا۔

وہ دونوں اس طرح مسکراتے میری طرف بڑھے جیسے مجھے پہچان گئے ہوں ۔ وہ بھی مجھے اپنا ہی سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی زبان میں کچھ کہہ کر گردن جھکائی۔ میں نے بھی اسی طرح سلام کا جواب دیا۔ پھر بڑے میاں نے کچھ کہا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ میں نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے اشارہ کیا کہ بس آنے ہی والی ہے۔ وہ مطمئن ہو گئے اور انہوں نے آپس میں باتیں شروع کر دیں میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرا پول نہیں کھلا تھا۔ اصل بات ظاہر کر کے میں ان کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جب بس میں سوار ہوئے تو بڑے میاں میرے ہی پاس آ کر بیٹھ گئے۔ میں ڈرا کہ اب میرا امتحان شروع ہوا اور واقعی میرا امتحان شروع ہو گیا۔ بڑے میاں نے اپنی زبان میں مجھ سے باتیں شروع کر دی تھیں۔ لیکن وہ کوئی ایسی بات کر رہے تھے جس میں شاید میری شرکت کی زیادہ ضرورت نہیں تھی کیونکہ میرے ہوں ہاں سے ہی وہ مطمئن ہوتے رہے۔ ہاں' انہیں اور اپنے آپ کو شرمندگی سے بچانے کے لئے میں نے اتنی احتیاط البتہ کی کہ جونہی بس رکی میں نے چھلانگ لگائی اور ان دونوں کے اترنے سے پہلے ہی اپنا سامان لے کر ہوٹل روانہ ہو گیا۔

"۔۔۔۔ رانکو' تم نے میرے کئی خطوں کا جواب نہیں دیا ہے۔ تمہارا آخری خط ۱۹۹۱ء کے آخر میں آیا تھا۔ اس خط میں تم نے اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا تھا کہ جس ملک جس قوم اور جس سوسائٹی کے بارے میں تم ناول لکھ رہے تھے اس کا تانا بانا بکھر رہا ہے۔ تمہاری سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ اب تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ تم نے ایسے لکھا تھا جیسے تم مجھ سے مشورہ مانگ رہے ہو۔ بھلا میں تمہیں کیا مشورہ دے سکتا تھا۔ میری تو اپنی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میری کیا' کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ اور میں نے یہی بات اپنے خط میں لکھ دی تھی۔ اور تمہارے جواب کا انتظار کرنے لگا تھا۔"

ہوٹل میں اس نے دونوں بازو پھیلا کر ریچھ والی ہنسی ہنسی تو اس کے منہ سے اٹھنے والے شراب کے

جھکوں اور اس کے کالے اور کوٹ سے آنے والی بساندھ کے باوجود مجھے اس میں بھی اپنائیت کی خوشبو آئی۔

" میرا نام رانکو ہے "

" رانکو ؟ " میں نے اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کی۔

" ہاں رانکو ' رانکو آرسوویچ ---- مگر تم ہنسے کیوں ؟ "

" میں معافی چاہتا ہوں " مجھے اپنی گستاخی پر سچ مچ شرمندگی محسوس ہوئی تو مگر اب کیا کر سکتا تھا اس گستاخی کا جواز پیش کرنا بھی ضرور تھا۔ " دراصل ہمارے ہاں رات کو کا مطلب ۔ ایٹ نائٹ "

یہ بات سن کر ہی وہ مجھ سے ریچھ کی طرح چمٹا تھا اور اپنی الجھی داڑھی سے میرے گال اور میری گردن لال کر دی تھی۔ اور شاید اسی بات نے ہم دونوں کے درمیان دوستی اور بے تکلفی کی بنیاد ڈال دی تھی۔ وہ جیسے ایک دم کھل گیا ---- " بالکل ٹھیک کہتے ہو میں وہی ہوں جو راتوں کو دن بناتے ہیں۔ مجھے تو تم بھی ایسے ہی معلوم ہوتے ہو ..... "

نہیں --- نہیں --- میرا مطلب یہ نہیں تھا میں تو ..... " میں وضاحتیں کر رہا تھا اور وہ میری ایک نہیں سن رہا تھا۔

" ہاں ہاں' میں جانتا ہوں۔ میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اتنی دیر سے یہاں کیوں آئے ہو۔ تمہیں قاہرہ کی لڑکیوں نے پکڑ لیا ہوگا۔ قاہرہ کے راستے آرہے ہو نا ؟ "

" میں قاہرہ کے راستے ہی آرہا ہوں مگر..... "

" اگر مگر کچھ نہیں ۔ بس میں تمہیں سمجھ گیا۔" اور ہماری دوستی ہو گئی ۔ اس نے پھر سے کوٹ میں جکڑ لیا ---- مجھے اپنا یہ تعارف کچھ ایسا برا بھی نہیں لگا۔ چلو اگر یہ ایسا سمجھتا ہے تو یونہی سہی۔ آدمی اچھا ہے۔ دلچسپ ہے اور کھلے دل و دماغ کا ہے۔

" تم بہت ہی بد قسمت ہو " اب وہ اور بھی کھلتا جا رہا تھا ۔ " کانفرنس میں ایک ویلش شاعرہ آئی تھی جانتے ہو نا ؟ ۔ ویلز کے لوگ اپنی زبان میں شاعری کرتے ہیں انگریزی میں نہیں کرتے۔ کیا قیامت لڑکی تھی وہ سچ تم اسے دیکھتے تو زندہ اپنے وطن واپس نہ جاتے "

" مگر تم تو زندہ ہو ۔" میں نے بھی مذاق کیا ۔ مگر وہ میری نہیں سن رہا تھا۔ اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔

" تمہاری زبان میں " چیئرز " کو کیا کہتے ہیں ؟" اس نے اچانک سوال کر دیا۔

چیئرز " میری سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہہ رہا ہے۔

" وہی جو جام پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا کہتے ہیں ہماری زبان میں ؟ مگر ہمارے ہاں شراب کہاں پیتے ہیں ؟ کیا شراب نہیں پیتے ہمارے ہاں ؟ تو پھر کیا کہتے ہیں ؟ اسے کوئی اردو کا لفظ ضرور بتانا چاہیے۔

" سلامتی۔" کسی کا بتایا ہوا لفظ مجھے یاد آگیا تھا۔

" ویلش میں کہتے ہیں یاہو! "

" کیا .... ؟ " میری ہنسی پھر نکل گئی۔ یہ تو پنجابی کی گالی معلوم ہوتی ہے

" پنجابی ؟ "

" یہ ہماری ایک زبان ہے "

" جس زبان میں اتنی خوبصورت گالیاں ہیں وہ تو بہت اچھی زبان ہوگی۔ ؟ "

پھر اس نے کانفرنس کے بارے میں بتایا۔ کون کون آیا تھا کون کون نہیں آیا۔ کیا باتیں ہوئیں کیا جھگڑے ہوئے اور اس ویلش شاعرہ کے پیچھے کون کون لگا رہا۔ چلتے وقت ایک بار اس نے پھر مجھے دبوچا اور بولا ۔

" بھول نہ جانا۔ کل رائٹرز یونین کے دفتر پہنچنا ہے۔ آج کا دن تمہارا اپنا ہے جو جی چاہے کرو ۔ مگر خیال رکھنا یوگوسلاویہ کی لڑکیاں کاٹ کھاتی ہیں۔ " اور اس دن اور اس شام میں بازاروں' سڑکوں اور پارکوں میں گھومتا پھرا بھوک لگی تو دو فٹ لمبائی بھٹا تریا جو بہت میٹھا اور بہت رسیلا تھا۔ مگر آدھے سے زیادہ نہیں کھایا جا سکا۔ آدھے میں پیٹ بھر گیا تو کوڑے کے ڈرم میں ڈال دیا۔ رات کو ہوٹل میں چھلانگیں لگاتے ان مردوں اور عورتوں کو دیکھتا رہا جو رقص کے نام پر ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے نٹ کا تماشا دکھا رہے تھے۔

دوسرے دن صبح صبح پاکستانی سفارت خانے فون کرنے کے لئے ریسیور اٹھایا تو دنیا بھر کی شیرینیوں میں ڈوبی آواز آئی " سوبلم " جی چاہا اس خاتون آپریٹر سے پوچھوں کہ کہیں یہ عربی کا " نعم " تو نہیں ہے ؟ اس میں سے اپنائیت کی خوشبو کیوں آرہی ہے ۔؟

" ... رانکو' میں تو تمہارے ملک پر فریفتہ ہوتا جا رہا تھا۔ تمہارے بے ساختہ پن نے ہی مجھے پاگل نہیں بنایا تھا' مجھے تو ہر چیز اپنی سی لگ رہی تھی۔ حتیٰ کہ دمشق کے ایئرپورٹ پر میری جو گھڑی بند ہو گئی تھی اسے ٹھیک کرانے جب ایک چھوٹی سی دکان میں گھسا تو وہاں بیٹھا موٹا تازہ گورا چٹا آدمی بھی اپنا ہی کوئی پٹھان بھائی معلوم ہوا۔ اس نے گھڑی بھی ٹھیک کی اور لال لال مشروب سے بھرا گلاس بھی پیش کیا۔ وہ اسی طرح میرے سر ہو گیا تھا جیسے پٹھان اپنے مہمان کے سر ہو جاتے ہیں اور میں نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی تھی۔ اس نے گھڑی ٹھیک کرنے کے صرف تین دینار لئے تھے جو ہمارے دو روپے بھی نہیں ہوتے ..... "

رائٹرز یونین کے دفتر میں مادام گروزدنا' میرو سلاو کیسیوچ ' ملان آندریچ' اور دوسرے کئی ادیب ہمارا انتظار کر رہے تھے کانفرنس میں شرکت نہ کرنے پر میں نے کچھ اس طرح معذرت کی اور کچھ ایسی وضاحت پیش کی کہ انہوں نے مجھے معاف کر دیا۔ وہاں موجود لوگوں میں انگریزی صرف گروزدنا جانتی تھیں یا پھر رانکو جانتا تھا جو میری اور دوسرے لوگوں کی ترجمانی کر رہا تھا۔ عالمی ادب کے بارے میں مادام گروزدنا کی معلومات خاصی وسیع تھیں لیکن پاکستان اور اس کے ادب کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں۔ کئی بار ہندوستان ہو آئی تھیں لیکن وہاں کے جو ادیب انہیں یاد تھے ان میں ایک تو ڈاکٹر ذاکر حسین تھے اور دوسری تھیں امرتا پریتم۔ میں نے انہیں پاکستانی ادب کے بارے میں تھوڑا بہت بتایا اور وہ چند کتابیں پیش کیں جو میں اپنے ساتھ لے گیا تھا اس معذرت کے ساتھ کہ انگریزی میں ہمارے ادب کا بہت کم ترجمہ ہوا ہے ۔ پھر یوگوسلاویہ کے ادب پر بات شروع ہو گئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے صرف ایوو آندریچ کو پڑھا ہے جنہیں ادب کا نوبل انعام ملا تھا۔

" کون سا ناول پڑھا ہے ان کا ؟ "

" دریائے درینا کا پل " سچ بات ہے میں نے یہی ناول پڑھا تھا ۔ اسلام آباد میں یوگوسلاویہ کے سفارت خانے نے افسانوں کا جو مجموعہ دیا تھا اسے نہیں پڑھ سکا تھا۔

" ہاں ' وہ ناول ہماری قوم پرستی کا ناول ہے ۔ " مادام نے بڑے فخر کے ساتھ کہا ۔ " بوسنیا ہرز گووینا کے

اورنگ زیب قاسمی

عوام نے ترکوں کے خلاف جو آزادی کی جنگ لڑی تھی وہ ناول اس کی داستان ہے۔ ترکوں نے جو مظالم .....

" بولتے بولتے وہ ٹھہر گئیں۔ شاید انہیں یاد آیا کہ میں پاکستانی ہوں اور مسلمان بھی۔ وہ ٹھہریں پھر جلدی سے بولیں۔ " کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ترکوں کے خلاف ناول ہے اس میں ترکوں کے مظالم کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن آپ ہی بتائیے کہ کیا ترک حملہ آور نہیں تھے؟ کیا وہ غاصب نہیں تھے؟ "

میں اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اچانک میکیسموویچ اپنی زبان میں کچھ بول پڑے۔ اس پر سب نے قہقہہ لگایا۔ میں نے مدد کے لئے رانکو کی طرف دیکھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر یہ ظاہر کیا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن مادام گروزدنا شاید نہیں چاہتی تھیں کہ میرے دل میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو اس لئے انہوں نے کہا۔ " میرو کہہ رہے ہیں شاید آپ کے اندر کا مسلمان جاگ اٹھا ہے؟

" ہاں جاگ تو اٹھا ہے " میں نے بھی اسی لہجہ میں کہا جس میں وہ بات کر رہی تھیں۔ اس پر پھر سب ہنس پڑے۔

" دراصل ہر شخص اور ہر قوم کے پاس اس کے عمل کے لئے کوئی نہ کوئی جواز ضرور ہوتا ہے۔ " رانکو نے میرا دل رکھنے کی کوشش کی۔ " ہیرو کے پاس اگر اس کے عمل کے لئے دلائل ہوتے ہیں تو ولن کے بھی اپنے دلائل ہوتے ہیں .....

" لیکن ہم ایسا نہیں سوچتے " مادام نے رانکو کی بات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ اپنی پہلی بات جاری رکھنا چاہتی تھیں شاید انہیں خطرہ تھا کہ کوئی خطرناک بحث چھڑ جائے گی لیکن میں وہاں جھگڑا کرنے تو نہیں گیا تھا۔

" ہم انسان اور انسانیت کے حوالے سے سوچتے ہیں " وہ کہہ رہی تھیں "انسان خواہ کہیں کا بھی ہو' کوئی بھی ہو اس پر ظلم ہرگز جائز نہیں ہے۔ " اس کے بعد انہوں نے اپنی قوم کی انسان دوستی اور قومی یک جہتی کی باتیں شروع کر دیں۔

رانکو ہلم برانڈی کے گلاس پر گلاس چڑھائے جا رہا تھا۔ وہ دوسروں کی طرح برانڈی کے ساتھ کافی نہیں پی رہا تھا کہ خواہ مخواہ اپنا نشہ ہرن کرتا بلکہ وہ " چیزر " کے طور پانی کے گھونٹ لے رہا تھا۔ ایک جرعہ برانڈی کا اور اس کے فوراً بعد آدھا گھونٹ پانی کا۔

" ..... ہاں رانکو' تم نے وہاں سے واپسی میں ہی بتایا تھا کہ تم بھی ایک ناول لکھ رہے ہو۔ اس کی تھیم تم نے سویڈش اکیڈمی کے سیکرٹری کو بھی سنائی تھی۔ اور تم نے بتایا تھا کہ سیکرٹری نے تمہیں یقین دلایا ہے کہ اس پر تمہیں نوبل پرائز ضرور ملے گا۔ لیکن تمہارا خیال تھا کہ جس محنت سے تم وہ ناول لکھ رہے ہو اس میں دس بارہ سال تو لگ جائیں گے۔ اس لئے تمہیں ١٩٩١ یا ١٩٩٢ء میں انعام ملے گا ....."

پھر رانکو مجھے شہر کی لائبریروں' آرٹ گیلریوں اور میوزیموں میں گھماتا پھرا۔ شام ہوئی تو ایک ہوٹل سے دوسرے ہوٹل اور ایک بار سے دوسری بار کے چکر لگاتا رہا۔ وہ مسلسل بول رہا تھا دنیا بھر کے ادب پر' دنیا بھر کی فلموں پر۔ اس نے وہ ساری کتابیں پڑھ رکھی تھیں جو میں نے پڑھی تھیں اور وہ سب فلمیں دیکھی تھیں جو میں نے دیکھ رکھی تھیں وہ دو بچپن کے زمانے میں بننے والی چیکوسلاواکیہ کی فلموں کا زبردست مداح تھا اور جب اسے پتا چلا کہ وہ فلمیں میں نے بھی دیکھی ہیں تو خوشی سے ناچنے لگا۔

" یہی تو میں کہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ مجھے اتنی قربت کا احساس کیوں ہوتا ہے۔ میں تو تمہیں پہلی نظر

میں ہی پہچان گیا تھا۔"

اور دوسری شام ہم اس کے گھر بیٹھے تھے۔ اس کی بیوی کا نام میری سمجھ میں نہیں آیا تھا البتہ وہ اسے آسکا کہتا تھا۔ اس لئے میں نے بھی اسے آسکا ہی کہنا شروع کر دیا۔ آسکا چوبیس پچیس سال کی نوجوان عورت تھی۔ یوگوسلاویہ کی عورتوں کی طرح خوبصورت۔ براؤن بال' بادامی آنکھیں اور گالوں سے ٹپکتا لال لال خون۔ رانکو کی طرح پھرتیلی اور تیز تیز باتیں کرنے والی۔ اب رانکو بھی اپنا کالا اوور کوٹ اتار کر اور غسل خانے سے صاف ستھرا ہو کر آیا تو وہ بھی خاصہ خوبصورت نوجوان نظر آ رہا تھا۔ وہ اس وقت مجھے اتنا اچھا لگا کہ بے ساختہ اس کے ساتھ مذاق کرنے کو جی چاہا۔ اور تو کچھ سوجھا نہیں میں نے آسکا کو مخاطب کیا۔ " تم اس ریچھ کو کیسے برداشت کرتی ہو اس کے ساتھ تو ایک منٹ بھی نہیں رہا جا سکتا۔"

آسکا بھی کچھ کم نہیں تھی' جھٹ جواب دیا " تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں اسے چھوڑ دوں گی۔ " یہ کہہ کر اس نے رانکو کی طرف دیکھا اور دونوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔

رانکو میرے بارے میں آسکا کو اتنا بتا چکا تھا کہ وہ فوراً ہی گھل مل گئی۔ وہ کسی اخبار میں کام کرتی تھی۔ اور دنیا بھر کی سیاست کے بارے میں خوب جانتی تھی۔ رانکو کہاں کام کرتا تھا؟ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ وہ رائٹرز یونین میں ایک قسم کا رابطہ افسر یا ترجمان تھا۔

وہ دونوں میاں بیوی میری خاطر کر رہے تھے۔ اور میرا برا حال تھا۔ میں رانکو کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اور وہ میرے ساتھ زبردستی کئے جا رہا تھا۔ آخر آسکا میری مدد کو آئی۔ اس نے پھلوں کی ٹوکری میرے پاس لا کر رکھ دی۔ تھوڑی دیر بعد رانکو اٹھا اور کاغذوں کا ایک پلندہ لا کر میرے سامنے ڈال دیا۔ " یہ ہے میرا وہ عظیم ناول جس پر مجھے نوبل انعام ملے گا۔ میں اس ملک کا دوسرا ایوو آندریچ ہوں گا۔"

"پہلے یہ مکمل تو ہو جائے۔" آسکا نے پیار بھرے طنز سے کہا۔ "یہ تو لکھا جاتا ہے اور پھاڑ دیا جاتا ہے۔"

"اچھے ناول ایسے ہی لکھے جاتے ہیں۔ کتنی ہی مرتبہ پورے پورے مسودے ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔" رانکو سینہ پھلا کر بولا۔ اور پلندہ اٹھا کر بیٹھ گیا۔ آسکا سمجھ گئی کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ شاید وہ اس تجربے سے پہلے بھی کئی بار گزر چکی تھی اس لئے اس نے نیند کا بہانہ بنایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اب رانکو بڑے پیار سے ان کاغذوں کو تھپ تھپا رہا تھا اور ساتھ ساتھ ناول کی تھیم بتاتا جا رہا تھا۔ وہ ناول اس عظیم جدوجہد کی کہانی تھا یا کہانی بننے والا تھا جو اس ملک کو متحد کرنے کے لئے مختلف لوگوں اور مختلف علاقوں نے کی تھی۔ ہٹلر کے جرمنی سے لے کر جنگ عظیم کے بعد ابھرنے والی سپر طاقتوں تک کی ریشہ دوانیاں اس کا موضوع تھیں۔ ناول کی کہانی جس علاقے یا جس مقام سے شروع ہوتی تھی وہ وہی علاقہ اور وہی مقام تھا جو ایوو آندریچ کے ناول کا مقام تھا یعنی بوسنیا اور دریائے درینا کا پل۔

" بس یوں سمجھ لو کہ آندریچ نے جہاں اپنا ناول ختم کیا تھا وہاں سے میرا ناول شروع ہوتا ہے " رانکو کہہ رہا تھا۔ " میں نے اسے آگے بڑھایا ہے ایک نئی ڈائمنشن کے ساتھ۔ یہ پانچویں ڈائمنشن ہے ---"

پیارے رانکو' کس نے کہا تھا کہ تاریخ ہمیشہ ماضی ہوتی ہے۔ ہم بھی تاریخ میں نہیں جی رہے ہوتے' ہاں جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ہمارے اوپر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوتا ہے کہ ہم تو تاریخ میں جی رہے تھے اور جب مرتے ہیں تو تاریخ میں شامل ہو جاتے ہیں ------ ذرا سوچو' یہ بات مجھے اس وقت کیوں یاد آئی ہے؟"

اورنگ زیب قاسمی

میں چار دن بلگریڈ میں رہا لیکن رانکو کا بے تکلفی ' اس کا بے ساختہ پن اور شور و ہنگامے نے وہ چار دن چار صدیوں پر پھیلا دیئے تھے۔ پھر جب وہ ایئرپورٹ پر مجھے رخصت کرنے آیا تو جوش میں اس نے اس زور سے میرے بازو پر مکا مارا کہ بے ساختہ میرا مکا بھی اسی زور سے اس کے بازو پر پڑ گیا اور اس کی داڑھی کے الجھے بال اور لبادہ سے بھرا لوور کوٹ میرے گرد حائل ہو گیا۔ " چلو ' اور کچھ نہیں تو یہ مکا تو یاد رہ جائے گا۔"

پھر ہم اس وقت تک ایک دوسرے کو خط لکھتے رہے جب تک ساری دنیا ہی الٹ پلٹ نہ ہو گئی۔ جب تک اس سیاسی پیراہن کا ایک ایک تار نہ بکھر گیا جس نے اپنے پیچھے سب کچھ چھپا رکھا تھا۔ ہماری یہ خط و کتابت اس وقت تک جاری رہی جب تک دریائے درینا کے پل پر دوبارہ وہ بانس نہ گڑ گئے جن پر انسانوں کو اس طرح بٹھایا جاتا ہے کہ بانس کی تیز نوک انسان کے اندر آہستہ آہستہ سب کچھ کاٹتی پھیلتی سر کے راستے باہر نکلتی ہے اور وہ سسک سسک کر مرتا ہے ------ پھر میں نے اسے ایک اور خط لکھا۔ اس کا بھی جواب نہیں آیا۔

" ہاں رانکو' میں نے کئی خط لکھے۔ مجھے ایک کا بھی جواب نہیں ملا۔ اب براؤنگ کی نظم پڑھ کر تمہیں پھر خط لکھ رہا ہوں۔ کہاں ہو ؟ کیسے ہو ؟ دیکھ رہے ہو تم دریائے درینا کے پل پر آج کیا ہو رہا ہے ؟ جو کل تک اپنا لگتا تھا اچانک اجنبی کیسے ہو گیا؟؟ اسی سرائیوو میں آسٹریا کا شہزادہ قتل ہوا تھا تو پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی تھی اور آج ہزاروں لاکھوں شہزادے دن رات مارے جا رہے ہیں اور کسی کے دل کی ایک دھڑکن بھی کم نہیں ہوتی۔ معصوم بچوں سے بھری بسوں پر نشانہ بازی کی جا رہی ہے اور کسی کی ایک رات کی نیند بھی حرام نہیں ہوتی - سربیا کے کنسنٹریشن کیمپوں سے ہزاروں ہڈیوں کے ڈھانچے برآمد ہو رہے ہیں اور کسی کو بھی ہٹلر یاد نہیں آتا۔ ایوو آندرچ کو ترک اور ان کے مظالم اتنے یاد تھے کہ صدیوں بعد بھی اس نے ناول لکھا اور اسے نوبل انعام ملا۔ آج دریائے درینا کے پیچھے سے بے گناہوں کا جو بیتا بیتا خون بہہ رہا ہے اسے کون یاد کرے گا ؟ اس کے لئے ایوو آندرچ کہاں سے آئے گا ؟ کیا تم لکھو گے اس خون کی داستان ؟ دریائے درینا کے پل کی نئی داستان رقم کرو گے تم ؟ ....

تمہارے ناول کا مرکزی مقام بھی تو یہی بوسنیا اور دریائے درینا کا یہی پل ہے ؟ لکھو گے نا یہ نئی داستان ؟ ..... لیکن مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس وقت تم کہاں ہو اور کس کے ساتھ ہو ؟ !!

(" دریافت " کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

سالانہ ڈنر

یہ کسی ادارے کے سالانہ ڈنر کا ذکر نہیں بلکہ مسٹر اور مسز ہاشمی کی وہ دعوت ہے جو ہر سال بہار کے دنوں میں وہ دیا کرتے تھے۔

" یہ ہماری بیگم کا آئیڈیا تھا " ہاشمی صاحب اکثر بڑے فخر سے کہتے " اور دیکھو کتنا پاپولر ہوا ہے۔"

اور یہ دعوت واقعی بہت مقبول تھی۔ موسم بہار کے دن ہی کتنے ہوتے ہیں چند ہفتوں میں گزر جاتا ہے مگر ان میں کم از کم ایک رات چودھویں کے چاند کی ہوتی ہے جو مستقل طور پر اس دعوت کے لئے مخصوص تھی۔ کوئی مہینہ بھر پہلے - بیس پچیس جوڑوں کو دعوت نامے مل جاتے کوٹھی کے کھلے لان میں چار پانچ میزیں لگ جاتیں۔ ہر ایک پودے کے قریب مرد اور عورتیں بیٹھ جاتے۔ وہ چار موم بتیاں ہوتیں اور کچن کے علاوہ پورے گھر اور لان میں کوئی بلب نہ جلتا تاکہ چاندنی مجروح نہ ہو۔ نتیجہ یہ تھا کہ چمکدار اجلی چاندنی پھوار بن کر ہر چہار گرتی اور ماحول میں وہ طمانیت اور سکون رچ جاتا جو چاندنی کے علاوہ اور کسی روشنی میں نہیں ملتا۔ پھولوں کی کیاریوں پر البتہ پتوں میں چھپی ہوئی اور اوپر سے ڈھکی ہوئی بجلیوں سے دھیمی دھیمی روشنی پڑتی رہتی۔ پھولوں کے رنگ اور بھینی بھینی خوشبو مسحور کن ماحول کے حسن کو اور بھی ابھار دیتے۔

پینتیس سالہ مسز ہاشمی بہت حسین تو نہ تھی مگر قبول صورت کے ساتھ لباس بہت سلیقے سے پہنتی تھی۔ ہر شے میں اچھا ذوق بات چیت میں شائستگی اور حرکات و سکنات میں کلچر اور توازن تھا۔ بچپن میں سرخ و سفید ہونے کی وجہ سے پنکی (Pinky) کہلاتی تھی اور وہی نام عمر بھر کے لئے ساتھ چپک گیا تھا اکثر لوگوں کو اصل نام کا اندازہ بھی نہ تھا۔ ہاشمی صاحب چار پانچ سال بڑے تھے۔ ہنس مکھ اور ملنسار تھے اس جوڑے کا شمار سلجھے ہوئے اور سمارٹ لوگوں میں ہوتا تھا۔ کچھ صرف بچوں کی تھی۔ دوسری دفعہ بچہ ضائع ہونے پر بیگم کی صحت کی خاطر آپریشن کرنا پڑا تھا - اور اب پندرہ سالہ شادی بے اولاد تھی۔ مگر اس کا نتیجہ یہ تھا کہ میاں بیوی کا آپس میں بہت لگاؤ تھا۔

اس روز سالانہ ڈنر کی رات تھی اجلی چاندنی اور دھیمے اندھیرے آپس میں گھتم گتھا تھے جیسے کسی آرٹسٹ نے وسیع کینوس پر رنگوں کی بجائے روشنی اور سائے انڈیل دیئے ہوں۔ ایک طرف میزوں پر بڑے بڑے ڈونگوں میں کھانا سجا تھا۔ کوئی ڈونگا کمزور سائے میں کوئی شاخوں سے چھن کر آنے والی چھدری روشنی میں کوئی دھلی ہوئی شفاف چاندنی میں وہاں سے پلیٹوں میں ڈال کر سب مہمان اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر کھا رہے تھے جہاں نشست مخصوص کرنے کے لئے ناموں کے کارڈ رکھے تھے ------ دھیمی باتیں - حزرنم ہنسی۔ ہلکے پھلکے

موضوع تیکھی جملہ بازیاں اور پہیلیں --- چہروں اور جسموں پر کہیں چمکدار چاندنی کے چھینٹے اور کہیں نیم تاریک اور بے اثر سایوں کی ہلکی چھاؤں۔ جیسے پہاڑوں پر پچھلے پہر کی دھوپ اور چھاؤں باہم بغل گیر ہوتی رہتی ہیں۔ فرش پر چاندنی وسیع چادر کی طرح پھیلی تھی جس پر کھانے والوں کے اعضا اونچے نیچے چوکور تکون اور بے ڈھنگے سائے کشیدہ کاری کے انداز میں ڈال رہے تھے۔

" پنکی - یہ روسٹ تو بہت ہی عمدہ ہے " جاوید نے کانٹے سے نوالہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ پنکی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تھا اور سامنے میز پر اس کے نام کا کارڈ کھڑا تھا۔

" شکر ہے - آپ کو پسند آیا " پنکی نے پہلو بدل کر کہا۔ بیچ میں اس کا پاؤں جاوید کے پاؤں سے ٹکرایا۔ اور جاوید نے " سوری " کہہ کر پاؤں ذرا پیچھے کھسکا لیا۔

" میری بیوی دوسری ٹیبل پر بیٹھی ہے۔ ورنہ وہ آپ سے ضرور پوچھتی کہ یہ کیسے پکایا ہے " جاوید کہنے لگا۔

" صرف آپ ہی کی بیوی کیوں۔ ہمیں بھی تو حق ہے کہ یہ قیمتی راز حاصل کریں" ایک اور مہمان خاتون نے پوچھا۔

دو ایک خواتین نے تائید کی۔ اور پنکی اس کا طریقہ سمجھانے لگی۔

پکانا، کپڑے اور رشتے خواتین کے محبوب موضوع ہیں۔ ایک دفعہ چل پڑیں تو بات لمبی ہی ہوتی جاتی ہے چنانچہ یہاں بھی بات چلتی رہی اور گرمجوشی بڑھتی گئی۔

اس گرمجوشی میں پنکی کا پاؤں ایک دفعہ پھر جاوید کے پاؤں سے ٹکرایا۔ جاوید نے سوچا کون بار بار معذرت کرتا رہے اور خاموشی سے پاؤں ذرا سمیٹ لیا۔

ایک مہمان نے کہا " پنکی - اس چاندنی میں میز پر کٹلری اور سلور کی ہر چیز چمک رہی ہے - مگر یہ کیا بات ہے کہ ان سب سے بڑھ کر آپ کی گھڑی چمک رہی ہے۔

پنکی مسکرائی " نئی جو ہوئی "

" Congratulations "

" مبارک "

" کب خریدی ؟ " کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

پنکی چہک کر بولی " گھڑی وڑی ہم نہیں خریدا کرتے --- یہ تو میاں کا تحفہ ہے۔ شادی کی سالگرہ پر۔"

اس خبر سے گویا مہمانوں کے موڈ میں بھونچال آگیا کیونکہ شادی کی سالگرہ کا تحفہ دوہری حیثیت رکھتا ہے۔ جس خاتون کو ملے اس کے لئے خواتین کے باہمی مقابلہ میں ٹرافی کی حیثیت۔ اور باقی سب خواتین کی طرف سے ان کے خاوندوں کے لئے چارج شیٹ کی حیثیت۔ اس لئے سب آگے جھک کر گھڑی دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کرنے لگے۔ اور پنکی اپنا بازو پھیلا کر اور تھوڑا آگے جھک کر پہلے بائیں طرف اور پھر دائیں طرف مہمانوں کو گھڑی دکھاتی رہی۔ اس طرح دائیں بائیں جھکنے میں اس کا گھٹنا پھر جاوید کے گھٹنے سے آن لگا۔

ایک دم جاوید کو احساس ہوا کہ گھڑی کی نمائش ختم ہو چکی ہے۔ اور پنکی سیدھی بیٹھی کھانا کھا رہی ہے مگر اس کا گھٹنا ابھی تک وہیں ہے۔ جاوید کی ساری حسیات جیسے بجلی کا بٹن دبانے سے ایک دم بیدار ہو گئیں۔ اور

اورنگ زیب قاسمی

پورے جسم میں گویا بجلی رو دوڑنے لگی۔

جاوید پلے بوائے (Play Boy) ٹائپ ہرگز نہ تھا وہ پنکی سے چند سال چھوٹا ہی ہوگا۔ عورتوں کے معاملے میں اس کے محدود تجربے رومان کے ابتدائی مراحل تک ہی رہے تھے کیونکہ وہ خواتین کی " نہ " میں یہ فرق کبھی نہ جان سکا کہ کون سی اصلی انکار والی " نہ " ہے اور کون سی سطحی گریز اور " ہاں " والی " نہ ہے "۔ اس فرق کو جانچنے کے لئے مرد کو جس ذہانت کی ضرورت ہے وہ یا تو اسے ملی ہی نہ تھی یا خوشگوار تجربوں کی کمی کی وجہ سے ابھر نہ سکی تھی اور پتھر تلے دبے ہوئے بیج کی طرح گھٹ کر رہ گئی تھی ----- اس نے البتہ اپنے دوستوں سے بڑی بڑی کہانیاں سنی تھیں۔ اور وہ حیران ہوتا رہتا تھا کہ کاسانووا (Casanova) بننے کے لئے وہ ہوائی ڈینگیں مار رہے ہیں۔ یا واقعی حوا کی تسخیر میں اتنے ہی معرکے سر کر چکے ہیں ----- اس کی اپنی زندگی کا مجموعہ یا تو ایسے چہروں پر حسرت بھری نظریں تھیں یا ایسی جذباتی کشمکش تھی، جو لڑکیوں کی موہوم دعوت کے جواب میں ایک قدم آگے بڑھاتی اور ان کے اصلی یا نقلی گریز سے ڈر کر کئی قدم پیچھے ہٹ آتی تھی --- چند سال سے اپنی شادی کے بعد تو اس میں جمود آگیا تھا۔ اور وہ بیوی اور ایک بچی کے ساتھ یکسانیت کی پٹڑی پر رواں دواں تھا۔

یہ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ جنس مخالف کی طرف سے از خود لمس کے پھول گر رہے تھے۔ وہ بے یقینی کے عالم میں چند لمحے دم بخود سا بیٹھا رہا --- پلیٹ میں سے نوالہ اٹھانا بھی بھول گیا ----- اور ہاتھ میں چھری کانٹا ایسے جم گئے جیسے ٹیلی ویژن پر ایک شاٹ منجمد ہو گیا ہو۔ گو اس ساکت خاکے کے اندر رگوں کا خون آبشاریں بننے لگا تھا۔

پھر وہ سنبھلا ----- آہستہ آہستہ کھانا کھانے لگا ----- ساتھ ہی دل و دماغ کی ساری توجہ میز کے نیچے فوکس ہو گئی۔ جیسے سمندر کی سپاٹ سطح سے دور نیچے ایک نئی رو پیدا ہو گئی ہو۔

گھٹنا ابھی تک وہیں تھا۔

میں اب کیا کروں --- مجھے کیا کرنا چاہیے ----- اس حالت میں تیز قسم کے لوگ کیا کرتے ہیں۔

اس کا دماغ تیزی سے گھوم رہا تھا۔ گویا پہاڑوں کی چٹانیں ڈھلانوں سے لڑھک رہی تھیں۔

پھر اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے وہ پنکی سے مخاطب ہوا " آپ نے سب کو گھڑی دکھائی۔ مگر مجھے نہیں دکھائی "

وہ خوش دلی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی " ایسے بدذوق کو کیا دکھاؤں جو ساتھ والی کرسی سے بھی بے خبر ہے ----- آپ میرے پاس بیٹھے ہیں۔ آپ کو تو خود ہی سب سے پہلے دیکھ لینا چاہیے تھی " --- پھر اس کی آنکھوں میں کچھ لہرایا --- نہ معلوم کیا --- مگر وہ سایوں کی چھاؤں میں بھی واضح تھا --- ایک لہر جاوید کے سارے جسم میں دوڑ گئی --- لیکن جب تک اس جملے پر لوگوں کی ہنسی ختم ہوئی، وہ سنبھل کر بولا " ہم سا بدذوق نہیں - بلکہ ذوق کھانے کی داد دینے میں مصروف تھا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی - " چلو آپ نے کسی چیز کی تو قدر کی --- جائیے معاف کیا --- لو اب گھڑی دیکھ لو "

سڈول کلائی جاوید کی طرف بڑھی - اس نے بظاہر گھڑی اور کلائی دونوں کو دیکھا - مگر دراصل دونوں ہی

دھندلا رہی تھیں۔ جیسے کیمرے کا فوکس بگڑ جائے۔

"یہ آپ کی پسند تھی۔ یا (Surprise) تحفہ تھا" جاوید نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کو پوچھا۔

"ہم تو ہمیشہ سے (Surprise) کے مرید ہیں ------ زندگی میں ہر اچانک موڑ سے ہی آتش بازی چھوٹتی ہے۔"

"بہت عمدہ ہے ------ مبارک ہو"

بات ختم ہوئی تو جاوید کا دل اور دماغ پھر قلابازیاں کھانے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

صدیوں سے روایت ہے کہ جب ہونی ہونے لگتی ہے تو حالات کے تمام دھارے موافق رخ اختیار کر جاتے ہیں۔ ابھی جاوید ذہنی اور جذباتی تناؤ کے پل صراط پر ہی لڑکھڑا رہا تھا کہ اندرونی گھبراہٹ کی وجہ سے کانٹا منہ میں ڈالتے ہوئے نوالے کا ذرا سا حصہ گر گیا اور گود میں پڑے ہوئے نیپکن کی سلوٹ میں اٹک گیا۔ جاوید ہاتھ مار کر نیپکن صاف کرنے لگا تو کپڑا نیچے گر گیا۔ اسے جھک کر اٹھانے اور دوبارہ گود میں جمانے کے دوران نہ معلوم دل یا دماغ کے کس حصے نے اس کی رہنمائی کی کہ لمحہ بھر کے لئے اس کے ہاتھ نے اپنے گھٹنے سے ملا ہوا پنکی کا گھٹنا دبا کر چھوڑ دیا اور اپنی گھبراہٹ میں نادانستہ قدرت کے ازلی جنسی قانون کی تصدیق کر دی کہ تحریک حوا کی اور تعمیل آدم کی۔

پنکی سامنے والے مہمانوں سے ایسے باتیں کرتی رہی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ------ اس کا گھٹنا البتہ بیدار ہو گیا۔ پہلے وہ بے جان سا لگا تھا۔ مگر اب قدرے دباؤ کے ساتھ جاوید کے گھٹنے پر زور ڈالنے لگا۔

"جاوید کا گھٹنا گویا خود ہی جوابی دباؤ میں مصروف ہو گیا.....

خوف، جھجک اور تذبذب کی غیر یقینی دھند ایک دم صاف ہو گئی۔ افق پر تحلیل ہونے والے بادلوں کی طرح جاوید کے ذہن سے پردہ سا ہٹ گیا۔ اسے یقین آگیا کہ یہ پنکی سے ایک نئے رشتے کا آغاز ہے اور اسی احساس سے اس کے رگ و پے میں بلا ساختہ دھیرے دھیرے چھانے لگا۔

میز کے اوپر چاندنی میں کھانا ------ اور میز کے نیچے اندھیرے میں یہ کھیل اس وقت تک جاری رہا۔ جب مہمان میٹھا کھانے کے لئے اٹھنے لگے۔ لیکن جب سب پلیٹیں بھر کر واپس آئے تو جاوید کے لئے بے چین انتظار کے باوجود پنکی واپس اپنی جگہ نہ آئی بلکہ سب میزوں کے آس پاس گھوم کر نہایت مستعدی سے میزبانی کا حق ادا کرنے لگی۔ کنکھیوں سے اس کے تعاقب میں جاوید کی آنکھیں دوڑ کرنے لگیں۔ وہ بار بار بے چینی سے پہلو بدلتا تھا مگر پنکی برآمدے سے ایک اور کرسی اٹھا لائی اور دوسری میز پر بیٹھ گئی۔ جو جاوید کی پشت پر تھی۔

اناڑی جاوید کی پریشانی اب دوسرے رخ چل پڑی ------ کیا وہ ناراض ہو گئی ہے ------ کیا مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا ------ شاید وہ رفع شر کی خاطر اس وقت تو خاموش رہی مگر اب پہلا موقع ملتے ہی اٹھ کر چلی گئی ہے ------ شاید اب وہ کسی سے شکایت کرے --- کیا بات باہر نکل جائے گی ------ بہت بدنامی ہو گی ---- بیوی کیا کہے گی ------ اس کا دل بیٹھنے لگا۔

کھانے کے اختتام کے قریب مہمان ادھر ادھر کھڑے باتیں کر رہے تھے مگر گھبراہٹ میں جاوید روشی کے قریب بھی نہ گیا۔ اس کا منہ اور حلق خشک ہو رہے تھے ------ تھوڑی دیر بعد میزبان میاں بیوی لان کے

اورنگ زیب قاسمی

کنارے کھڑے ہو گئے۔ اور مہمان باری باری ان کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلنے لگے ------ جاوید اور اس کی بیوی بھی اپنی باری پر آگے بڑھے۔ میزبانوں کا شکریہ ادا کیا تو پنکی بولی "جاوید بھائی۔ آپ لوگ سال کے سال صرف اس ڈنر کے لئے نہ مخصوص ہو جائیں۔ بیچ میں بھی کبھی چکر لگا کر خبر لے لیا کریں کہ آیا کوئی جیتا ہے یا مر گیا ہے۔"

جاوید نے معذرت سے کہا "یہ بات ہرگز نہیں۔ مگر پچھلے دنوں میں دفتر میں بہت مصروف رہا ہوں۔"

"مصروف تو سبھی رہتے ہیں۔ مگر کبھی کبھار فون کرنے کے لئے تو سارا دن نہیں چاہیے۔ آپ لوگ تو یہ بھی نہیں کرتے۔"

"آئندہ یہ قصور نہیں ہو گا" جاوید کی بیوی ہنس کر بولی۔

اطمینان کا لمبا سانس لیتے ہوئے جاوید بیوی کا ہاتھ پکڑے جلدی سے کھسکا کہ شکر ہے بات نہیں بگڑی ------ اس کا مطلب ہے وہ ناراض نہیں تھی --- ویسے ہی مصروف تھی۔

کار میں چابی گھماتے ہوئے اسے اپنے اندر اعتماد کی زور دار لہر کا ریلا محسوس ہوا۔ سیٹ میں مچل کر ایکسیلیٹر دبانے لگا تو اس کی بیوی قریباً چیخ کر بولی "کیا ہوا تمہیں جاوید --- گاڑی غلط ہاتھ پر چلا رہے ہو" ---

رات کو وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ کیا فون والی بات روایتی رواداری تھی۔ یا ڈھکا چھپا پیغام تھا---- اگر پیغام نہیں تھا اور اس نے فون کر دیا تو کہیں بات بگڑ نہ جائے --- بدنامی۔ جگ ہنسائی۔ گھر میں جھگڑا --- اور وہ پھر کروٹ بدل لیتا --- آنکھیں بند سانس کی چال بگڑی ہوئی۔ دماغ اور کنپٹیاں جیسے کسی اندرونی سورج کی تیز روشنی سے چندھیائے ہوئے --- نیند کیسے آتی ---

اگلے تین دن اور تین راتیں وہ اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ فون کرے یا نہ کرے --- اگر کرے تو کب کرے --- اور کیا کہے

چوتھے روز وہ دفتر سے فون کرنے لگا۔ مگر ڈائل پر دو ہندسے گھما کر چھوڑ دیا۔

بالآخر پانچویں روز وہ ہمت کر سکا ------ جب دوسری طرف سے گھنٹی کی آواز سنائی دی تو اس کا دل بھی گھنٹہ گھر کی طرح بجنے لگا--- نہ معلوم کون اٹھائے گا------ اگر کسی اور نے اٹھایا تو میں بند کر دوں گا۔ بولوں گا ہی نہیں۔

خوش قسمتی سے پنکی کی ہی آواز ابھری "ہیلو۔"

"ہیلو ..... جی ..... میں ..... مم میں ..... جاوید بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف پٹاخہ چھوٹا "اخاہ جاوید بھائی ------ آپ کہاں سے بھول پڑے۔"

جاوید کے سارے اعصاب پر جیسے سکون کی پھوار پڑنے لگی۔ زبان اور لہجہ اعتماد میں لتھڑ سا گیا "بس تعمیل ارشاد کر رہا ہوں کہ فون نہ کرنے سے باغی قرار پاؤں گا۔"

"اگر یہ بات ہے تو تعمیل میں اتنی دیر کیوں کی؟"

جاوید کرسی میں پھیل کر بیٹھ گیا "کہتے ہیں دیر آید درست آید"

"جی نہیں۔ دو سو سال پرانی کہاوتیں آج کی جیٹ سیٹ (Jet Set) زندگی پر لاگو نہیں ہوتیں"

"تو آج کل کیا ہوتا ہے؟"

" جناب یہ (Instant Coffee) اور فاسٹ فوڈ اور (Disposable) چیزوں کا زمانہ ہے ۔"

" تو پھر ..... میں ..... فوراً حاضر ہو جاؤں ..... ابھی ..... Instantly "

جواب میں کھنکھلاتی ہنسی ابھری۔ فون کے تار کو ستار کی سروں سے بھرتی ہوئی " جی نہیں۔ میں ابھی باہر جا رہی ہوں ۔"

" واپس کب آئیں گی "

" معلوم نہیں۔ ابھی سوچا نہیں "

" کہاں جا رہی ہیں ؟ "

" ذرا لائبریری تک جانا ہے "

" کیوں پھر سے تعلیم شروع کر دی ؟ "

" تعلیم تو ساری عمر چلتی ہے ------ (ہنسی) ابھی تو آپ کو بھی بہت کچھ سیکھنا ہے (اور ہنسی) میں دراصل گارڈننگ کے کچھ میگزین دیکھنا چاہتی ہوں ۔"

" اچھی لائبریری ہے ؟ "

" بہت اچھی ---- باہر بہت بڑا گارڈن بھی ہے ----- پڑھنے سے دل تھک جائے تو انسان وہاں بیٹھ کر باتیں کرتا رہے "

" اگر میں وہاں آجاؤں تو باتیں ہو سکتی ہیں "

" میں نے تو نہیں کہا "

" مگر میرے آنے پر آپ کو اعتراض تو نہیں "

" لائبریری سب کے لئے ہوتی ہے۔ میں کون ہوں اعتراض کرنے والی "

جاوید نے پتہ لیا' وقت مقرر کیا اور فون بند کر کے بے دم سا ہو کر میز پر جھک گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ حالات کا دھارا اتنا موافق بھی جا سکتا ہے۔

نجی نے بہت احتیاط سے کپڑوں کا انتخاب کیا ---- قمیض کا گلا کتنا نیچا ہونا چاہیے۔ اس کا رنگ سفید ہو یا کچھ اور ----- اس سے نیچے پہننے والے کپڑوں کا رنگ کیا ہو۔ تاکہ وہ اچھی سی جھلک دے سکیں۔

لائبریری کے لان میں وہ کافی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے ------ ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں ----- مشترک دوستوں کے دلچسپ قصے ----- من وتو کی ابتدائی باتیں ----- جس میں ایک دوسرے کی شخصیت میں قوس قزح کے رنگوں کی جھلکیاں ڈھونڈتے رہے --- جب اٹھنے لگے تو جاوید نے کہا " تو آج آپ ہمیں اپنے ہاتھ سے (Instant Coffee) پلا رہی ہیں "

" اگر ہمارے ہاتھ والی کافی چاہیے تو وہ آج نہیں ملے گی۔ بلکہ کل ملے گی "

" آج کیوں نہیں ؟ "

" آج ملازم گھر میں ہے ----- اس کے ہوتے ہوئے میں کیسے بناؤں گی ---- کل اسے چھٹی دے دوں گی تاکہ خود بنا سکوں "

واپسی پر جاوید گاڑی چلاتے ہوئے یوں محسوس کر رہا تھا جیسے خوبصورت سرسبز پہاڑوں کے اوپر نیلے

اورنگ زیب قاسمی

آکاش میں وہ ہوائی جہاز سے اٹھکیلیاں کروا رہا ہے ۔ اور اردگرد فضا میں ہزاروں لاکھوں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں۔

اگلے دن اس نے گاڑی نجی کے گھر کے گیٹ کے اندر موڑی تو وہ سامنے ہی لان میں نظر آئی ------ گاڑی رکتے رکتے وہ بھی پاس آگئی۔ جاوید دروازہ کھول کر اترنے لگا تو اس نے پھر سے دروازہ دھکیل کر بند کر دیا۔

" یہ جوتی مہاراج گاڑی ساتھ والی مارکیٹ کے سامنے کھڑی کر کے آئیں "

" کیوں ؟ " جاوید اس اچانک تجویز کے لئے تیار نہ تھا۔

" اس لئے کہ پیدل چلنا صحت کے لئے اچھا ہوتا ہے ------ اور ذرا تیز تیز چل کر آئیں "

ہدایت پر عمل کرنے کے بعد وہ واپس پہنچا۔ تو گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ گھنٹی دیئے بغیر سیدھا اندر چلا گیا۔ نجی لاؤنج میں کھڑی ٹیلی فون کا ڈائیل گھما رہی تھی ۔ وہ بھی ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا ------ " توبہ ! اتنی دیر سے فون کر رہی ہوں ۔ نمبر ہی نہیں ملتا " نجی شکایتاً بولی ------ پھر نمبر مل گیا۔

" ہیلو ! ہاشمی صاحب سے ملایئے "

" .... "

" میں ان کی بیگم بول رہی ہوں "

" .... "

" ہیلو۔ کیا حال ہیں ؟ آج آپ جلدی چلے گئے ------ ناشتے پر بھی ملاقات نہ ہوئی۔ مجھے اتنا برا لگ رہا ہے ۔"

" تو کیا ہوا۔ مجھے جگا لیتے۔ ایسے نہ کیا کریں۔ میں نے تو ابھی تک ناشتہ نہیں کیا۔"

" .... "

" نہیں ۔ اکیلی ناشتہ کرنے کا موڈ نہیں ہے میں یہاں بور ہو رہی ہوں۔ میرے پاس یہاں آپ کے دفتر والی چہل پہل تو نہیں ہے نا ..... "

" .... "

" نہیں کوئی خاص بات نہیں ۔ میں نے تو ویسے ہی فون کیا کہ ذرا دل بہل جائے "

" .... "

" اوہو ۔ تو میٹنگ ہو رہی ہے ------ میں بند کرتی ہوں ..... نہیں کوئی خاص بات نہیں "

فون ریسیور رکھتے رکھتے وہ چہک کر بولی " تھری چیرز فار میٹنگز " Three Cheers For Meetings

" اور پھر ایسی مسکراہٹ برساتی نظروں سے جاوید کو دیکھا کہ وہ بے تاب ہو کر اس کی طرف لپکا۔

قریباً دو گھنٹے بعد جاوید گھر سے نکلا ۔ اور انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھتا مارکیٹ میں گاڑی تک پہنچا۔ بیرونی لاپرواہی اور اندرونی عجلت سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا۔ چابی گھما کر موڑی۔ جب دونوں ہاتھ سٹیرنگ پر رکھے تو بازو پر ناخن کی لمبی خراش پر نظر پڑی۔ اور وہ جھرجھری سی لے کر زیر لب بولا " توبہ ! بھوکی شیرنی ہے یہ تو "

اب وہ دونوں اکثر ملنے لگے ۔ زیادہ تر نجی کے گھر میں جسے وہ فون پر نمبر ایک کہتے تھے ۔ کبھی نجی کی ایک رازداں سہیلی کے گھر میں۔ جو انہیں گھر چھوڑ کر خود بازار چلی جاتی۔ اس جگہ کو وہ فون پر نمبر دو کہتے تھے۔ اور کبھی جاوید کے ایک دوست کے گھر میں۔ جس کی بیوی بھی ملازمت کرتی تھی۔ اور بچے دوسرے شہر میں ہوسٹل میں رہتے تھے۔ یہ جگہ نمبر تین تھی۔ وہ فون پر رابطہ کرکے وقت مقرر کر لیتے۔ پھر اپنی اپنی گاڑی میں پہنچ جاتے ۔ گاڑیاں ادھر ادھر کھڑی کر کے پیدل منزل پر پہنچ جاتے۔ یہ ملاقاتیں بڑی پوشیدہ ہوتی تھیں ------ بظاہر ہاشمی صاحب اور جاوید کے گھروں میں سوشل ملاقاتیں اتنی زیادہ نہ تھیں کہ کسی کو کچھ شک گزرتا۔ دوستوں کے گروپ میں البتہ مشترکہ پروگرام بنتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کوئی پانچ چھ دوست جوڑے مری کے علاقے میں ایک دن کی پک نک کے لئے گئے ۔ شہر میں جانے کی بجائے ذرا کھلے علاقے میں درختوں کے جھنڈ کے نیچے دریاں بچھا کر کیمپ سا بنا لیا۔ عورتیں کیرم' لوڈو' تاش اور میوزک میں مصروف ہوگئیں۔ بچے کھیل کود' دھینگا مشتی اور بال کھیلنے میں لگ گئے ۔ اور مرد ٹولی بنا کر سیر کو نکل پڑے ------ مگر میدانی علاقوں والے پہاڑوں کے پیچ و خم کو سمجھ نہ سکے ۔ جاتے وقت ڈھلانوں پر پانی کی طرح شاداں و فرحاں بہتے چلے گئے ۔ مگر واپسی پر وہی راستے چڑھائیاں بن گئے۔ ہر چند قدم بعد سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگے ۔ رفتار چیونٹی کے برابر ہوگئی۔ دوپہر کے کھانے تک واپس پہنچنے کے سارے اندازے غلط نکلے۔ گرتے پڑتے ڈھلتی سہ پہر تک کیمپ پر واپس آئے۔ تو مذاق بھری نگاہوں اور طنزیہ قہقہوں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ کیونکہ کافی انتظار کے بعد عورتیں اور بچے کھانا کھا چکے تھے۔

لیٹے ہوئے سانس درست ہوئے ۔ ٹانگیں سلامت بچیں۔ ذرا دم لے لیا تو ایک چادر بچھائی گئی جس پر مردوں کے لئے کھانا لگ گیا۔ اور وہ بھوک کی شدت سے پل پڑے ------ اور اسی سرگرمی سے نجی بھی اس دعوت میں شامل ہوگئی۔

"کیوں دوبارہ بھوک لگ گئی" خاوند نے ہنس کر پوچھا۔

"کمال ہے" وہ گلے کے لہجے میں بولی "آپ یہ بھی بھول گئے کہ میں آپ کے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتی۔"

"سوری بیگم ۔ یہ تو میں جانتا ہوں ۔ مگر آج تو بہت دیر ہوگئی تھی"

"تو کیا ہوا ۔ خواہ کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو جائے"

ہاشمی صاحب کا چہرہ کھل اٹھا۔ ان کے ساتھ جاوید بیٹھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر فخر سے بولے "دیکھا!! بیوی ہو تو ایسی ہو"

جاوید نے نظر بھر کر نجی کو دیکھا اور تعریفی انداز میں سر ہلانے لگا------ ساتھ ہی اس کے ذہن میں وہ سارے لمحات ایک بجلی کی طرح کوند گئے جو اس نے نجی کے ساتھ تخلیئے میں گزارے تھے۔

ان لمحوں میں نجی بالکل مختلف شخصیت تھی ۔ خاوند کا دم بھرنے والی یا ڈرائنگ روم والی انتہائی نکھری خاتون جو بڑے سلیقے اور رکھ رکھاؤ سے مہذب اور سلجھی ہوئی باتیں کرتی تھی' کہیں غائب ہی ہو جاتی۔ اس کی بجائے ایک بے تکلف اور تیز طرار جنسی مخلوق ابھر آتی جو ایسے چٹخ بلکہ فحش انداز میں جملے کستی کہ جاوید کو بھی پسینے آنے لگتے ------ عام گفتگو کا رنگ بھی ایسا ہوتا جس میں نجی عقل کل اور جاوید ایک نادان سا بچہ

اورنگ زیب قاسمی

لگتا۔ ان لمحات میں نجی کا محبوب موضوع اپنے جاننے والوں کے یا دوسروں سے سنے ہوئے سکینڈل ہوتے اور وہ مزے لے لے کر ان کی تفصیلات یا تو خود بیان کرتی یا کرید کرید کر جاوید سے پوچھتی۔ وہ اکثر لاعلم ہوتا تو نجی اس کی ناک مروڑ کر کہتی "بدھوجی مہاراج ۔ آنکھیں کھول کر زندہ رہنا سیکھو۔ ہمارے ارد گرد چوبیس گھنٹے اتنا کچھ ہوتا رہتا ہے کہ زندگی ایک دلچسپ سی سرکس لگتی ہے ------ ایک دم سٹیج شو ------ کچھ پردوں کے سامنے ------ کچھ پردوں کے پیچھے ------ کہیں واضح چہرے ------ کہیں میک اپ ------ کہیں تہ در تہ نقاب ------ صاف نظر نہ آئے تو پردوں اور نقابوں کی سلوٹیں دیکھو ------ اللہ قسم بہت کچھ پتہ چل جاتا ہے۔"

ایک دن ایسی ہی گفتگو کے دوران نجی نے اسے ایک نئے سکینڈل کی تفصیلات سنائیں۔ میاں بیوی دونوں بہت تیز تھے۔ ایک دوسرے سے چھپ کر ادھر ادھر رومان چلاتے رہتے تھے۔ مگر بالآخر طلاق ہوگئی ------ بے وقوف نکلے ------ ذرا احتیاط کرتے تو بات نہ نکلتی اور عمر بھر عیش کرتے رہتے۔

جاوید نے کہا "تمہاری باتوں سے یوں لگتا ہے کہ ہر طرف رومان ہی رومان بکھرے ہیں۔ مگر ہم بھی عورتوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ہمیں تو ایسی چیزیں شاذ ونادر ہی نظر آتی ہیں۔"

وہ تالی بجا کر ہنسی "ارے تم مردوں کو عورتوں کا پتہ ہی کیا ہے ------ بچو جی! عورت کو سمجھنا مرد کے بس کا روگ نہیں ------ مرد تو صرف اس پھل کو جانتا ہے جو درخت سے اس کی جھولی میں آن گرتا ہے۔ باقی باغ سے وہ بے خبر ہی رہتا ہے۔ عورتوں کو ویسے ہی تو مستورات نہیں کہتے۔ یہ واقعی مستور ہوتی ہیں۔ ڈھکی چھپی۔ مخفی پوشیدہ ------ عورت کی تہ تک مرد کبھی نہیں پہنچ سکتا۔"

"اس کا مطلب ہے عورت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا" جاوید نے کہا۔

"نہیں ---- یہ غلط ہے عورت کو عورت خوب سمجھتی ہے ۔ اسی لئے مشہور ہے کہ عورت کی عورت بیری ہوتی ہے ------ عورتیں جو کچھ دوسری عورتوں کے متعلق جانتی ہیں' اگر اس کا دسواں حصہ بھی مردوں کو پتہ چل جائے تو اللہ قسم وہ عورت سے الرجک (Allergic) ہو جائیں۔"

"مگر عورتیں کیا آپس میں کانفرنس کرکے بتاتی رہتی ہیں۔" جاوید نے طنزیہ پوچھا۔

"کانفرنس تو باتوں کے لئے ہوتی ہے ۔ مگر عورت تو ان کہی سمجھتی ہے"

"وہ کیسے ؟"

"وہ ایسے کہ تم مردوں کے صرف حواس خمسہ ہوتے ہیں۔ پانچ حسیات کسی نے تیر مارا تو چھٹی حس بھی مل گئی۔ مگر عورتوں کے پاس چھ سات' بارہ تیرہ' نہ معلوم کتنی حسیات ہیں کہ وہ ہونٹ ہلنے سے پہلے ہی دوسروں کے خیالات' اور محسوسات جان جاتی ہیں۔ وہ جبلی طور پر جان جاتی ہیں کہ دوسرا کیا محسوس کر رہا ہے۔ ایسا نہ ہو تو وہ بچے کیسے پالے گی ۔ گونگے کی رمزیں اس کی ماں ہی سمجھتی ہے' باپ نہیں سمجھتا' کیونکہ عورت کا شعور (Iceberg) کی طرح ہے۔ سطح سے اوپر بہت کم اور سطح سے نیچے بہت زیادہ ۔ تم مرد لوگ تو محض سطحی مخلوق ہو۔ تمہارا کیکڑے کا شعور ہے۔ گہرے پانی کی مچھلی والا شعور نہیں ---- اسی لئے جتنے دھڑلے اور کامیابی سے عورت جھوٹ بول سکتی ہے مرد نہیں بول سکتا کیونکہ عورت اپنے اندر بہت کچھ چھپا سکتی ہے۔"

"یہ تمہاری اپنی ہی تھیوری ہے' یا اس کی کوئی شہادت بھی ہے" جاوید نے پھر مذاق اڑایا۔

"شہادت سی شہادت!" وہ جوش میں اٹھ کر بیٹھ گئی "لاکھوں کروڑوں صدیوں کی شہادت --- عورت آج تو نہیں بنی نا ----- وہ تو شروع سے ہے جب انسان جنگلوں اور غاروں میں رہتا تھا----- ہر مخلوق کی مادہ کی طرح یہ بھی ایک مادہ ہے جس نے اولاد کو پیدا ہی کرنا ہے۔ پالنا بھی ہے حفاظت بھی کرنی ہے درندوں سے بچانا ہے۔ موسم سے بچانا ہے۔ دشمنوں سے بچانا ہے۔ ہر ناگہانی آفت اور حملے سے بچانا ہے۔ نر تو خوراک ڈھونڈنے چلا جاتا تھا اپنی قوت بازو کے سہارے۔ بعد میں مادہ اکیلی ڈھیر سارے بچوں کی حفاظت کیسے کرتی۔ اسی لئے قدرت نے اسے بہت سی حسیات کا ترکش دے دیا۔ ممتا۔ صبر و استقلال' ہمت' ایثار' چال بازی' فریب' مکاری' دھوکہ دہی ----- یہ سبھی اس کے تیر ہیں ----- ٹھیک ہے اب یہ مادہ غاروں میں نہیں رہتی بلکہ گاڑیوں میں گھومتی ہے' مگر قدرت کے دیئے ہوئے تیر تو سبھی اس کے پاس ہیں نا ----- اسی لئے عورت کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے ----- ایک طرف بے لوث ممتا کا ایثار ہے۔ دوسری طرف سوتیلی ماں کا ظلم ہے۔ اور تیسری طرف سوکن کا لامحدود حسد اور تخلیقی چالبازیاں ہیں ----- جس وقت جس تیر کی ضرورت ہوتی ہے وہ بغیر جھجک کے اور پوری یکسوئی سے استعمال کرتی ہے۔"

"تم آزادی نسواں کی لیڈر تو نہیں بن رہیں؟" جاوید نے پھبتی کسی۔

"دیکھو بدھو! اس موضوع پر تمہارا علم بہت کمزور ہے۔ جب تھوڑی دنیا دیکھو گے۔ کچھ عورتوں سے تمہارا پالا پڑے گا۔ تو پھر شاید بات کر سکو ----- فی الحال بحث چھوڑو۔ اور میرے ساتھ لگ جاؤ ----- قدرت نے مرد کو صرف اسی لئے بنایا ہے کہ جب عورت کا دل کرے وہ اس سے پیار کرے"

"یہ کیسے تمہیں کس نے سکھلایا ہے؟"

"یہی تو میں کہتی ہوں کہ جو کچھ واضح طور پر زمین آسمان اور فضا میں لکھا ہے' تم اسے بھی نہیں دیکھ سکتے --- چلو میری بات نہ مانو۔ جاکر برنارڈ شا کو پڑھو۔ وہ عورت کو زندگی کا سرچشمہ (Life Force) کہتا ہے اور مرد کا کام صرف یہ ہے کہ اس کی خدمت کرے اور سرچشمہ جاری رکھے --- آجاؤ ادھر ----- دیر نہ کرو"

چند مہینے اسی طرح گزر گئے۔ راز داری کی ملاقاتیں اور والہانہ پیار ----- مخالف جنس کسی بھی مرد یا عورت پر مرمٹے تو اس کا اپنی ذات میں اعتماد بڑھ جاتا ہے۔ مگر جاوید کے لئے تو یہ بالکل انوکھا تجربہ تھا جس میں رومان کے علاوہ مہم جوئی بھی تھی۔ وہ اس کھیل میں ایسا ڈوبا کہ سب کچھ بھول گیا۔ دفتر کے کام میں دلچسپی کم ہو گئی۔ دو ایک دفعہ بیوی نے بھی جھگڑا کیا کہ گھربار میں اس کی دلچسپی ختم ہوتی جا رہی ہے تب اسے ضمیر نے تھوڑی ملامت کی۔ اسی ذہنی کیفیت میں اس نے ایک دفعہ نگی سے اپنی الجھن کا ذکر کیا تو وہ ہنس کر بولی "چھوڑو ایسی باتوں کو --- تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ میاں بیوی کا تو رشتہ ہی بددیانتی کا ہے؟ یہ کیسے؟ نکاح تو پرخلوص اعتماد کا نام ہے" جاوید نے کہا۔

"مگر ہوتا کیا ہے؟" نگی چمک کر بولی "میں جنسی بے وفائی کی بات نہیں کر رہی۔ اس کی ہمت تو سب لوگوں میں نہیں ہوتی۔ نہ ہی سب کو موقع ملتا ہے۔ مگر ویسے تو ہر جوڑے میں کھینچاتانی رہتی ہے۔ کبھی ایک ہاتھ اوپر رکھنا چاہتا ہے کبھی دوسرا۔ دونوں سینکڑوں چیزیں ایک دوسرے سے چھپاتے رہتے ہیں۔ دونوں کو اپنے اپنے رشتے دار بندوقیں بھر بھر کر دیتے رہتے ہیں کہ دوسرے پر داغ دو۔ یہ بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے؟

اورنگ زیب قاسمی

اور یہ بددیانتی صرف شادی کے رشتے میں ہوتی ہے اور کسی رشتے میں نہیں ہوتی۔"

"نگی تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ تم کہتی کچھ ہو کرتی کچھ ہو۔ اب پچھلے مہینے ہاشمی بھائی بیمار ہوئے تو تم نے ان کی تیمار داری میں دن رات ایک کر دیئے ----- ویسے بھی تم ان کا کتنا خیال کرتی ہو ----- ان کے آرام کا۔ ان کے کپڑوں کا۔ ان کی خوراک کا ----- سبھی لوگ تمہاری بے جا تعریف کرتے ہیں کہ بڑی خدمت کرنے والی بیوی ہو۔ اور مجھے تم یہ باتیں سناتی ہو۔"

"ارے بھولے بادشاہ ----- میاں میرے گھر کی خوشی ہے۔ وہ خوش ہے تو میرا گھر خوش ہے۔ اور یہ عمر بھر کی خوشی ہے ----- اور تم میرے دل کی خوشی ہو جو کبھی کبھی ملتی ہے' اور وہ بھی تھوڑے وقت کے لئے ----- اب جسے یہ دونوں خوشیاں ملتی ہوں۔ وہ خوش قسمت ہے یا نہیں۔"

"اگر تمہاری بات درست مان لی جائے" جاوید چیلنج کے انداز میں بولا "تو وہ جو عورت کی عصمت کا تصور ہے ----- عفت ----- عزت --- وفاداری اور نہ معلوم کیا کیا۔ اس کا کیا بنے گا"

"دیکھو جاوید' میرا منہ نہ کھلواؤ --- عصمت اور عفت کے نعرے تو مرد لگاتے ہیں ----- کبھی کسی عورت کو بھی اس کا ذکر کرتے سنا ہے؟ ----- سچی اور کھری بات یہ ہے کہ پرانے زمانے میں مرد بیویوں کو Chastity Belt باندھتے تھے اب اس کی جگہ عصمت کے نظریات سے باندھتے ہیں ----- مقصد دونوں کا ایک ہی ہے کہ عورت صرف ایک مرد کی بنی رہے۔ یعنی مرد تو ادھر ادھر مزے کرے اور عورت کو ویسے ہی مزوں سے محروم رکھے۔"

"مجھے نہیں سمجھ آتیں تمہاری باتیں" جاوید زچ ہو کر بولا۔

"جناب یہی تو میں کہتی ہوں کہ مرد کم عقل ہیں۔ وہ عورت کو نہیں سمجھ سکتے۔ لہٰذا تم بھی مجھے سمجھنے کی کوشش چھوڑ دو۔ بس (Enjoy) کرو --- جو چند مرد عورت کو تھوڑا بہت سمجھ سکتے ہیں' وہ عمر بھر عورتوں سے عیش کرتے ہیں۔"

"لیکن اگر تمہارے میاں کو پتہ چل گیا تو کیا کرو گی؟"

"پتہ کیسے چلے گا ----- میاں کو بیوقوف بنانا تو عورت کے لئے آسان ترین کام ہے --- چوبیس گھنٹے کرتی ہے۔"

"پھر بھی۔ اگر شک پڑ گیا"

وہ لاپروائی سے ہاتھ ہلا کر بولی "دیکھا جائے گا۔"

"کیسے دیکھو گی؟" اس نے اصرار کیا

"دیکھنا کیا ہے۔ جب تک اس کے پاس ثبوت کوئی نہیں' فکر کی کوئی بات نہیں ----- جو خاوند بغیر ثبوت کے شک کرے گا' خود ہی شکی مزاج کہلائے گا اور لوگوں میں کو بنے گا۔"

"تو شک کا کیا سوچا ہے؟"

"اوں ہوں' کچھ نہیں سوچا ----- اور جو اس وقت سوچوں گی وہاں تک تم مردوں کا دماغ بھی نہیں پہنچ سکتا --- چھوڑو اب ان فضول باتوں کو"

ایک دن نگی کا فون آیا "کل ملیں گے۔ نمبر دو میں۔ آنے سے پہلے کچھ کھانا نہیں۔ میں تمہارے لئے

کوئی مزیدار چیز بناؤں گی۔"

" یہ دعوت کس خوشی میں ہے ؟"

" کل بتاؤں گی "

" کوئی (Surprise) ہے ؟ "

" ایک دم (Surprise) ہے "

اگلے دن وہ بڑے موڈ میں تھی۔ پہلے تو خوب ٹوٹ کر پیار کیا۔ پھر ساتھ لیٹے لیٹے پچھلی ملاقاتوں کی دلچسپ یادیں دہرانے لگی۔۔۔ وہ قصہ یاد ہے ۔۔۔۔۔ جب یہ ہوا تھا ۔۔۔۔۔ جب وہ ہوا تھا ۔۔۔۔ فلاں دن بڑا مزاہ آیا تھا ۔۔۔۔۔ مگر فلاں دن نہ جانے تمہیں کیا ہوا تھا کہ میرا موڈ بھی خراب کر دیا۔ وغیرہ وغیرہ ۔ وہ حسب معمول بڑی بے تکلفی سے تفصیلات گزاری تھی۔

پھر اس نے میز پر گرم گرم سوپ' روسٹ چکن' ٹوسٹ' مکھن اور دیگر لوازمات سلیقے سے چن دیں۔

" اور ہاں یہ تو بتایا نہیں کہ (Surprise) کیا ہے " کھانا ختم کر کے جاوید نے پوچھا۔

(Surprise) یہ ہے کہ یہ الوداعی دعوت ہے "

" کہیں جا رہی ہو ؟ "

بند مٹھی کو ہوا میں بلند کر کے اس نے انگلیاں پھیلا دیں " بس !! پنچھی اڑ رہا ہے۔"

" کیا مطلب ؟"

" مطلب یہ کہ ہر اچھی چیز کو ختم ہونا ہوتا ہے ۔ اس لئے اب یہ سلسلہ بھی ختم کرنا ہوگا۔"

" مگر وجہ ؟ " جاوید نے بے صبری سے پوچھا۔

" وجہ یہ کہ ۔۔۔۔ ایسے معاملے زیادہ لمبے نہیں چلانے چاہئیں ۔۔۔۔۔ بات باہر نکل جاتی ہے "

" کسی کو شک پڑا ہے کیا ؟ "

" نہیں تو ۔۔۔۔۔ مگر کسی کو شک پڑنے سے پہلے ۔۔۔۔ یا ثبوت ملنے سے پہلے ختم کر دیں تو بہتر ہے"

" ہاں ۔۔۔ " جاوید بولا " ابھی تو بمشکل چند ماہ ہوئے ہیں"

" پورے دس مہینے ۔" وہ دس انگلیاں کھڑی کر کے بولی " اگر کوئی خوشی اتنا عرصہ بغیر کسی رکاوٹ یا الجھن کے ملتی رہے تو یہ بڑی بات ہے ۔"

اب جاوید نے سنجیدگی سے بحث شروع کی۔ مگر وہ مانتی ہی ۔ تھی ۔۔۔۔۔ جاوید نے ایک آخری ملاقات کی تجویز پیش کی تو وہ اس پر بھی راضی نہ تھی۔

" آخری کیوں ؟ ۔۔۔۔۔ بہت ملاقاتیں ہوں گی ۔۔۔۔۔ ہوتی رہیں گی ۔۔۔۔۔ مگر بس دوستوں کی طرح۔ جیسے پہلے ملا کرتے تھے ۔۔۔۔ یوں سمجھیں گے کچھ ہوا ہی نہیں تھا"

" تو مجھے (Disposable) چیز بنا رہی ہو " ؟

بنگی صرف مسکراتی رہی۔

" لیکن اگر میں تمہارا پیچھا نہ چھوڑوں۔ تو تم میرا کیا کرو گی ؟ " جاوید نے پوچھا۔

بنگی نے اسے نظر بھر کر دیکھا " میں تو کچھ نہیں کر سکوں گی ۔۔۔ مگر شاید ۔۔۔ تمہاری بیوی ۔۔۔ یا

اورنگ زیب قاسمی

میرا میاں بہت کچھ کر لیں گے آخر ان کو بھی تو خبر مل سکتی ہے ۔"

" ہوں " جاوید اسے گھورتے ہوئے بولا " تو دھمکی دے رہی ہو !"

" اوں ہوں " ۔۔۔۔۔ حقائق بگھاری ہوں ۔۔۔۔۔ ان معاملوں میں زبردستی نہیں چلتی "

جاوید کچھ دیر سوچتا رہا" اچھا مجھے منظور ہے ۔۔۔۔۔ اس امید پر کہ تمہیں دوبارہ منالوں گا۔"

بنگی نے مسکرا کر گردن ذرا ٹیڑھی کی اور آنکھیں ملا کر منہ چڑاتے ہوئے بند مٹھی کے اوپر کھڑا انگوٹھا اس کے چہرے کے سامنے ہلانے لگی۔ جاوید ششدر ہو کر پوچھنے لگا کہ اسے ہوا کیا ہے ؟ اس اچانک تبدیلی کی وجہ کیا ہے۔

وہ سامان سمیٹتے ہوئے بولی " چلو تم نکل کر جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد نکلوں گی۔ دونوں کے درمیان کچھ وقفہ ہونا چاہیے ۔"

اگلے چند دنوں میں جاوید نے دو چار دفعہ فون کر کے ملاقات کی دعوت دی۔ مگر پہلے تو وہ ہنس کر ٹالتی رہی ۔۔۔۔۔ پھر یہ کہہ کر جان چھڑانے لگی کہ گھر میں مہمان بیٹھے ہیں۔ یا ہاشمی صاحب آنے والے ہیں۔ یا میں باہر جا رہی ہوں۔

سردیاں ختم ہو رہی تھیں ۔۔۔۔ فضا کی خنکی میں گرم گود کے سکون جیسی لہر دوڑنے لگی۔ لوگ بسنت کی تیاریاں کرنے لگے۔ فضا میں اکا دکا پتنگ نظر آنے لگے۔ درختوں کی ننگی بانجھ شاخوں پر نئے نمو کی شاخیں ابھرنے لگیں۔ اور ایک دن ڈاک میں جاوید کو مسٹر اور مسز ہاشمی کی طرف سے موسم بہار کے سالانہ ڈنر کا دعوت نامہ ملا۔

وہ دو ایک دن سوچتا رہا۔۔۔۔۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے میز پر پڑا ہوا دعوت نامہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے ۔ تیسرے دن اس نے بنگی کو فون کیا " اگر میں نہ آؤں تو کیسا رہے گا ؟ "

" تم پچھلے پانچ برسوں سے آ رہے ہو۔ جب سے ہم نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ اب بیوی کو قطع تعلق کی وجہ کیا بتاؤ گے ؟ "

" کچھ بتادوں گا"

" اور باقی لوگ ؟ ۔۔۔ وہ بھی تو سوچیں گے "

" سوچنے دو "

" عجیب گھا مڑ انسان ہو ! " وہ ہنس کر بولی " آگ جلتی رہی تو سب سے چھپالی۔ اب بجھ گئی ہے تو اس کی راکھ سب میں بانٹ کر خود اشتہار دو گے ۔۔۔۔۔ میری مانو تو سیدھے سیدھے چلے آؤ ۔۔۔۔۔ اور کسی کو قیاس آرائی کا موقعہ نہ دو۔ حالات معمول کے مطابق چلتے رہیں تو کوئی سوال نہیں پوچھتا۔"

جاوید اس کی عملی سمجھ داری کا قائل ہو گیا ۔۔۔۔۔ ساتھ ہی ذہن میں امید ابھری کہ شاید وہ پھر مہربان ہو جائے اور پچھلے رنگین دن لوٹ آئیں تکلیف دہ انتظار کے بعد دعوت کی رات آ گئی۔ حسب معمول چاندنی کا پرسکون پھیلاؤ تھا۔ دھیمے اندھیروں کی پراسرار سنگت تھی۔ میٹھی میٹھی گفتگو کے پر تکلف جملے دبے دبے قہقہوں میں رچ رہے تھے ۔ بنگی مستعد میزبانوں کے انداز میں ادھر ادھر گھوم کر مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ جاوید پر اس نے انتہائی رسمی خوش آمدید نچھاور کیا۔ مگر اس کی بیوی کو بڑی گرمجوشی سے گلے لی۔ ابھی

پرانے دوست شریک تھے ۔ مگر کچھ نئے چہرے بھی تھے۔ بچی نے ان دونوں کو ان سے بھی ملوایا۔ اور پھر میزبانی کی مصروفیات میں کھو گئی۔

ملازم ٹرے میں ٹھنڈے مشروبات رکھے ۔ پیش کرنے آیا تو جاوید نے کہا "دیکھو میرے لئے امریکہ سے ایک فون کال آئے گی۔ میں نے یہاں کا نمبر دیا ہے۔ جب کال آئے مجھے فوراً بلا لینا۔"

تھوڑی دیر بعد پلیٹوں میں کھانا ڈال کر مہمان میزوں پر اپنا اپنا نام کارڈ تلاش کرنے لگے۔ جاوید نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو بچی دوسری میز پر بیٹھی تھی اور اس کے بالکل ساتھ کوئی نیا مہمان تھا جسے وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا۔

نیم تاریک اندھیروں اور دھیمی چاندنی کے خاموش معانقوں کے زیر سایہ کھانا آہستہ روی سے جاری رہا۔ ساتھ ساتھ خوشگوار گفتگو کی موسیقی جاری رہی۔

اتنے میں ملازم بھاگا آیا اور جاوید ٹیلی فون سننے کے لئے اندر لاؤنج کی طرف لپکا ۔۔۔۔ لان میں تو چاندنی کی روشنی تھی مگر برآمدے میں بجلی نہ جلنے کی وجہ سے اندھیرا تھا ۔ اور عجلت میں جاوید ایک دو کرسیوں سے ٹکراتا ہوا بالآخر فون تک جا پہنچا۔

بات ختم ہوئی تو باہر نکلتے نکلتے اس نے دیکھا کہ ساتھ والی میز پر ایک ٹارچ پڑی ہے۔ اس نے بٹن دبا کر دیکھا تو وہ بالکل ٹھیک کام کر رہی تھی چنانچہ برآمدے کی ٹھوکروں سے بچنے کے لئے اس نے ٹارچ اٹھالی۔ اور روشن کرکے باہر کو چل دیا۔

ہر بالغ کی شخصیت کے اندر جو دبا گھٹا بچپن ہوتا ہے' اس کے تحت وہ چلتے چلتے ٹارچ کی روشن لکیر ویسے ہی ادھر ادھر گھما رہا تھا اچانک وہ ٹھٹکا......

ٹارچ کا گول دائرہ جس محدود جگہ پر فوکس ہوا' وہاں میز کے نیچے بچی کا ننگا پاؤں ساتھ والے مرد کے جراب والے پاؤں کو دبا رہا تھا ٹارچ اس کے ہاتھ سے گرنے لگی مگر جاوید نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

وہ ششدرر سا ہو کر اپنی جگہ جا بیٹھا ۔۔۔۔۔۔ اور بے جان انداز میں کھانا کھانے لگا۔

اتنے میں اس نے دیکھا کہ بچی اپنی جگہ سے اٹھ کر گھر میں ملازم سے کچھ کہنے کو جا رہی ہے ۔

"ادھر اندھیرا ہے۔ یہ ٹارچ لیتی جائیں" جاوید کرسی سے اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگا۔

بچی رک گئی۔ اور مڑ کر بلند آواز میں بولی "بہت شکریہ جاوید بھائی ۔ ۔ بہت خیال کیا آپ نے میرا"

جاوید لپک کر اس تک پہنچا ۔ ۔ ٹارچ آگے بڑھائی ۔ ۔ بچی نے پکڑی ۔ ۔ مگر جاوید نے ٹارچ پر گرفت ڈھیلی کرنے کی بجائے بڑی طنز سے دھیمی آواز میں کہا "اس ٹارچ نے آج دو پاؤں کو آپس میں معانقہ کرتے ہوئے دیکھا ہے!!"

نیم اندھیرے میں ہی جاوید نے محسوس کیا کہ بچی اپنی جگہ منجمد ہو گئی ہے۔

مگر وہ فوراً ہی سنبھلی اور دھیمی آواز میں درشتی سے بولی "تمہاری کوئی حق تلفی نہیں ہوئی جاوید ۔ ۔ ہر دفعہ یہ معاہدہ صرف سال بھر کا ہی ہوتا ہے۔"

ایک جھٹکے سے اس نے ٹارچ چھین لی۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتی گھر کے اندر چلی گئی۔

("فنون" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

مشرف احمد

وجود

میں کافی دنوں سے ایک کشادہ مگر سستے کرائے کے مکان کی تلاش میں تھا۔ اور اس سلسلے میں اکثر ایک پراپرٹی ڈیلر کے پاس جایا کرتا تھا۔ لیکن شہر کی پررونق اور معیاری تصور کی جانے والی آبادیوں میں چونکہ کرائے اور ایڈوانس کی رقم بہت زیادہ طلب کی جاتی تھی اس لئے میں اکثر مایوس اور ناکام لوٹتا تھا۔ ایک دن جو میں پراپرٹی ڈیلر کی دکان پر گیا تو اس نے یہ کہتے ہوئے میرا استقبال کیا کہ آج جو مکان وہ مجھے دکھانے والا ہے وہ میرے معیار اور پسند کے مطابق ہو گا۔

یہ علاقہ جہاں وہ مجھے لے کر جا رہا تھا' اس آبادی سے جہاں میں قیام پذیر تھا' کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ دونوں علاقوں کے درمیان سیمنٹ کے بڑے بڑے قطر والے پائپ ڈال کر ایک پل بنا دیا گیا تھا جس کے اندر نالے کا گندا پانی بہتا رہتا تھا۔ میں "تقریباً" روزانہ ہی بس میں بیٹھے بیٹھے ادھر سے گزرا کرتا تھا لیکن آج تک اس طرف جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی اور ادھر کی دنیا میرے لئے اجنبی اور نامعلوم تھی۔ چونکہ بستی کے اندر جانے والا نشیبی راستہ بس میں بیٹھے ہوئے نظر آتا تھا اس بنا پر بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی یہ معلوم تھا کہ وہاں ایک آبادی ہے۔

پراپرٹی ڈیلر اپنی گفتگو کے دوران اسے گوٹھ کہہ کر پکار رہا تھا اس کا کہنا تھا کہ گوٹھ والے خاصی مدت سے زمین کا کچھ حصہ پلاٹ بنا بنا کر فروخت کر رہے تھے۔ یہی باتیں کرتے ہوئے ہم نے پل پار کیا۔ اور دوبارہ ذرا بلندی پر آ کر میں نے ایک طائرانہ نظر اردگرد ڈالی نالے سے پرے نئی آبادی کے کئی کئی منزلہ مکان دور سے نظر آ رہے تھے۔ کچھ خالی پلاٹوں پر لوگوں نے حفاظت اور قبضے کے خیال سے چار دیواری بنا رکھی تھی۔ ایک جانب خودرو جنگلی جھاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ اندر آبادی میں کچی سڑک دور تک جاتی نظر آ رہی تھی۔ سڑک کے ایک جانب آبادی کے نئے مکینوں اور دوسری جانب پرانے باشندوں کا علاقہ تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ شہر اپنے راستے میں آنے والے گوٹھ سے فاتحانہ سلوک کرتا ہوا۔ یہاں تک آ پہنچا تھا۔ مگر ابھی اس کے پاؤں پوری طرح جمنے نہ پائے تھے۔ مکانوں کی تعمیر اور اس کے پورے ماحول سے اس آبادی کے اضمحلال کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔

اس لمحے میں عجیب وغریب کیفیت سے دوچار تھا۔ آج یہاں آ کر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میں شہر کے اتنے قریب گوٹھ کی موجودگی سے ابھی تک بے خبر تھا اس کے ساتھ ساتھ مجھے کچھ ایسی مسرت بھی محسوس ہو رہی تھی جو اچانک کسی گمشدہ شے کے ملنے پر ہوتی ہے۔ مجھے اپنی جانب متوجہ نہ پاکر اور میری حیرت واستعجاب کو

دیکھتے ہوئے یہ اپنی ڈیٹیل کہنے لگا۔

" صاحب حیران کیا ہو رہے ہیں ۔ بہت سے ایسے گوٹھ شہر میں گم ہو چکے ہیں۔"

میں نے کسی رد عمل کا مظاہرہ نہ کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ اب تک ہم خاصا فاصلہ طے کر کے سڑک کے بائیں جانب واقع قبرستان کے بیچ پہنچ چکے تھے۔ یوں تو یہ قبرستان پل عبور کرتے ہی نظر آجاتا تھا۔ مگر اب ہم اس کے قریب سے گزر رہے تھے۔ یہ عام قبرستانوں سے مختلف تھا۔ مٹی کی ڈھیریاں عام قبروں کی طرح بلند تھیں۔ لیکن ہر قبر کے اردگرد چونے سے پتی ہوئی اینٹوں کو تکونے انداز میں زمین میں گاڑ دیا گیا تھا۔ جس کی بنا پر یوں لگتا تھا کہ وہ قبریں نہ ہوں کیاریاں ہوں۔ قبروں کی ڈھیریوں پر بھی سفید چونا کیا ہوا تھا۔ اور ہر قبر کے سرہانے پیلے پیلے پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر لوح مزار بنا دیے گئے تھے مجھے یہ قبرستان روایتی تصورات سے الگ انفرادیت لئے ہوئے نظر آیا۔ ان قبروں کے آس پاس نہ تو جھاڑیاں تھیں اور نہ ہی درخت۔ یہ مزار گور غریباں بھی نظر نہ آتے تھے اس سے ذرا آگے جا کر بلند وبالا درختوں کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک راستہ سڑک سے الگ ہو کر اندر گوٹھ میں جا رہا تھا اور اسی جگہ سے تقسیم واضح ہو گئی تھی مجھے یوں لگا کہ گوٹھ نئے مکانوں سے منہ موڑے کھڑا ہوا ہے یا نئی آبادی اس کے وجود سے اغماض برت رہی ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ انسانوں کی طرح آبادیاں کا بھی حسب نسب اور اپنا اپنا رنگ و روپ ہوتا ہے۔ اور آبادیوں بھی بہت دنوں تک اپنے وجود اور پہچان کی جنگ لڑتی ہیں۔

اب ہم دونوں اس خالی مکان تک پہنچ چکے تھے۔ مجھے پہلی ہی نظر میں مکان پسند آگیا تھا۔ اتنا وسیع اور کشادہ مکان شہر کے کسی اور علاقے میں کم ازکم دوگنے کرائے پر ملتا اردگرد کئی پلاٹ خالی پڑے تھے۔ کھلی آب و ہوا تھی۔ کچھ حصے پر مکانات بن چکے تھے۔ بہت سے مکان بھی پلاسٹر کے بغیر تھے۔ اور شاید اسی بنا پر اس علاقے کا ماحول اداس سا لگتا تھا۔ میرے خیال میں بس ایک ہی تکلیف تھی کہ بس سٹاپ تک جانے کے لئے زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر تک تمام پہلوؤں پر غور کر کے مکان کرائے پر لینے کا فیصلہ کر لیا۔

وہاں منتقل ہونے کے چند ہی دنوں بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ نئے پرانے سب ہی لوگ اچھے تھے۔ ہر آبادی کے مکینوں کی طرح یہاں بھی سب کی خواہش یہی تھی کہ یہاں آباد ہونے والے سارے لوگ اچھے ہوں۔ اور ان کا شمار شرفا میں ہوتا ہو' تاکہ آبادی کی قدروقیمت میں اضافہ ہو اور رہنے والے آرام و سکون سے زندگی بسر کرتے رہیں۔ شہر کی پرشور سڑکوں اور پھر اس آبادی کے برابر والی نسبتاً" پرسکون آبادی سے گزر کر جب میں اس قصباتی ماحول میں داخل ہوتا تو دل کو ایک عجیب طرح کی کشادگی اور طمانیت کا احساس ہوتا اور میں یوں محسوس کرتا گویا ایک وقت شہر اور دیہات میں رہ رہا ہوں۔ آبادی کی مرکزی سڑک سے آتے جاتے مجھے ہمیشہ گوٹھ کا خیال آتا اور قبرستان سے گزرتے ہوئے ایک مغربی سیاح کا فقرہ یاد آیا کرتا کہ ایشیائی شہروں کی قدامت کا اظہار سب سے زیادہ اس کے قبرستانوں سے ہوتا ہے شاید اسے کا خیال درست ہو لیکن گوٹھ کا یہ قبرستان اپنے نئے پن سے قدامت کے ہر تصور کو جھٹلاتا نظر آتا تھا۔ قبریں تو شاید پرانی ہوں گی میں سوچتا مگر وہ انہیں لیپ پوت کر ہمیشہ نیا رکھتے ہیں۔

ہفتہ واری تعطیل کے دن صبح سویرے میرے دفتر کا ایک ساتھی مجھ سے ملنے میرے گھر آیا۔ شاید اسے

اورنگ زیب قاسمی

مکان ڈھونڈنے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لہٰذا دروازہ کھولتے ہی بغیر دعا سلام کے کہنے لگا " بڑی مشکل سے تمہارا گھر ملا ہے۔ بندہ خدا تمہارے گھر کا کوئی نمبر ہی نہیں ہے وہ تو میں نے تمہارے بتائے ہوئے درخت کی نشانی سے پہچانا "

میں نے اس کی پریشانی پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ۔ " دروازے پر نمبر تو ایک ہی جگہ دو دو پڑے ہوئے ہیں مگر ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ " دراصل " میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ۔ " آبادی اور علاقے کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے والی اس علاقے کی دو تنظیمیں ایک دوسرے کے کاموں میں رکاوٹ ڈالتی رہتی ہیں۔ چنانچہ مکانوں کے نمبروں کے سلسلے میں بھی یہاں یہی مسئلہ در پیش ہے۔ ایک تنظیم' دوسرے کے نمبروں کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے " میں نے اپنی خفت مٹاتے ہوئے اسے دروازے پر لکھے ہوئے دو مختلف نمبروں کی طرف توجہ دلائی جن پر کراس کا نشان پڑا ہوا تھا۔ میرا دوست دروازے کے منسوخ شدہ نمبروں کو دیکھ کر مسکرایا ۔ میں نے اپنا سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا " دراصل مکان کرائے پر لیتے ہوئے مجھے یہ معلوم نہ تھا اور شاید یہ ایسی کوئی پوچھنے والی بات بھی نہیں تھی " اس نے ہنس کر کہا ۔ " یہ تو اک طرح کا بے شناخت رہنا ہوا"

" ہاں مجھے بات تو پوری کر لینے دو ۔" میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ۔ " یہاں ہفتے میں ایک بار ڈاکیہ آتا ہے اور ایک دکاندار کو جو پوری آبادی میں محبوب چچا کہلاتا ہے' ڈاک دے کر چلا جاتا ہے۔ میں بھی اور لوگوں کی طرح ہر ہفتے وہیں جا کر اپنی ڈاک دیکھ آتا ہوں "

اب شاید میری باتوں میں اس کی دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ اس نے لاتعلقی سے کہا ۔ " اچھا چھوڑو یہ سب باتیں' یہ بتاؤ قبرستان کس کا ہے "

" کیا باہر کھڑے ہی سب کچھ پوچھ لوگے' اندر آجاؤ سب باتیں اطمینان سے ہوں گی ۔"

" یہ قبرستان گوٹھ والوں کا ہے ۔"

اس میں صرف وہی لوگ دفن ہوتے ہوں گے ؟

" یہ تو ابھی مجھے معلوم نہیں ۔" میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ البتہ اس کے سوال نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ پہلی مرتبہ پل پار کر کے آنے والے ہر آدمی کی طرح اس کا پہلا سوال تو فطری تھا۔ اور میں بھی اس سوال سے دوچار ہوا تھا لیکن دوسرا سوال میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

" نئے لوگوں کے لئے شاید قبرستان دوسرے ہیں ۔" اس نے کہا۔

" ہاں شاید " میں نے اسے بتایا کہ پرسوں رات غالباً دس ساڑھے دس بجے کا وقت تھا۔ گھر واپس آتے ہوئے میں ادھر سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک میت کو قبر میں اتار رہے تھے۔ گیس لیپ کی روشنی میں وہ سب سائے لگ رہے تھے۔ اس جگہ منتقل ہوتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ رات کے وقت ادھر سے گزرتے ہوئے خوف آیا کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا حالانکہ سردیوں کی راتیں ہیں۔ آبادی کم ہے اور رات کے وقت ادھر راہگیر بھی کم ہی آتے جاتے نظر آتے ہیں۔"

میرے دوست کی یہ مخصوص عادت ہے کہ وہ دوران گفتگو سامنے والے کی کسی بات پر اپنے رد عمل کا اظہار کرنے کے بجائے کوئی اور بات کہہ کر گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھاتا ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی اس نے کئی

کیا اور بولا ۔ " شہر کے بیچ میں ایسی بستیاں بھی ہیں جن کا شہر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مگر وہ موجود ہوتی ہیں۔"

" ہاں میرے لئے بھی یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ " میں نے اپنے دوست سے کہا۔ " بوڑکر کے ساتھ یہاں آنے سے پہلے میں نے صرف یہ سن رکھا تھا کہ پل سے ادھر ایک گوٹھ آباد ہے۔ اس کا کہنا تو یہ ہے کہ میں بھی یہاں ایک پلاٹ خرید لوں۔ چند برسوں میں جب یہ باقاعدہ شہر کا حصہ بن جائے گا تو زمین بہت قیمتی ہو جائے گی۔"

" بوڑکر کا خیال غلط ہے ۔ یہاں ایک ناقابل تنسیخ دیوار موجود ہے ۔" میرے دوست نے پر یقین انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا ہم بہت دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ رخصت ہو گیا۔

دفتر میں وہ مجھ سے دیگر ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ قریب تھا۔ ہم ایک ساتھ ہی دفتر سے اٹھا کرتے اور اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونے سے قبل دفتر کے ساتھیوں اور حالات حاضرہ پر گفتگو کرتے ہوئے بس سٹاپ تک آیا کرتے تھے۔ لیکن جب سے وہ نئی بستی میں مجھ سے ملنے میرے گھر آیا تھا اس دن کے بعد سے ہماری گفتگو کا موضوع اکثر گوٹھ اور اس سے ملحق آبادی ہوتا تھا۔

ایک دن میں نے اسے بتایا کہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ علاقے کے نئے پرانے لوگوں میں بیک وقت لاتعلقی بھی ہے اور تعلق بھی ہمارے والے علاقے میں وہ ذرا کم ہی نظر آتے ہیں ۔ ان کے ٹرک سوزوکیاں اور پیدل آتے جاتے لوگ قبرستان کے برابر سے گزرتے ہوئے درختوں کی چھاؤں میں لیٹے ہوئے راستے سے جہاں گوٹھ نئی آبادی سے منہ موڑے کھڑا ہے گم ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے آگے ان کے علاوہ اور کوئی آدمی نہیں جا سکتا۔ ان کے ہاں شادی بیاہ کی تقریب ہوتی ہے تو گوٹھ کے اجتماعی صحن سے باہر درختوں کی حد بندی اور قبرستان کے درمیان پھیلے ہوئے قطعہ زمین پر اونچے اونچے شامیانے لگتے ہیں اور رات رات بھر طوائفیں اور ہیجڑے رقص کرتے ہیں ایسے مواقع پر وہ ہماری آبادی کے واقف کار مکینوں کو بھی بلاتے ہیں لیکن ایک بات عجیب سی محسوس ہوتی ہے "

" وہ کیا ؟ " میرے دوست نے سوال کیا۔

" قبرستان میں تدفین کے وقت صرف ان کے اپنے لوگ وہاں نظر آتے ہیں ۔ " میں نے جواب دیا۔

میرے دوست کو ایک دن اپنے بچے کا بستہ خریدنا تھا۔ لہٰذا ہم صدر میں کئی دوکانوں پر بستہ تلاش کرتے ہوئے جب ایک موڑ پر نکلے تو میں نے ایک مختصر سے بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

" یہ کفن بکس سروسز کا بورڈ دیکھ رہے ہو ۔"

" ہاں دیکھ رہا ہوں۔ اب تو ایسے بورڈ کئی جگہ نظر آجاتے ہیں ۔ " اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ " مگر اب سے بیس پچیس برس پہلے شہر میں اتنی کفن بکس سروسز موجود نہ تھیں۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ جب میں نیا نیا اس شہر میں آیا تھا تو میں نے اس قسم کا بورڈ دیکھا بھی تھا یا نہیں ؟"

" ہاں بہت کچھ بدل گیا ہے میرے دوست ! اس زمانے میں شہر میں آہنی دروازے بھی کہاں تھے ؟ اخبار میں حاکم کے حوالے سے ایک مرتبہ خبر شائع ہوئی تھی کہ شہر میں کئی ہزار آہنی دروازے ہیں ۔"

اورنگ زیب قاسمی

" کئی ہزار ؟ " اس نے استعجاب اور استہزا کے ملے جلے انداز میں کہا " مبالغہ لگتا ہے ۔"

" مگر اب وہ دروازے اور وہ موٹے موٹے ستون گرے پڑے ہیں۔ تھوڑے دنوں میں ہم بھول جائیں گے کہ وہاں دروازے بھی تھے ۔" میں نے کہا۔

" یار کہیں وہ دروازے .... " ہمارے درمیان اتنے میں ایک ٹھیلا آگیا اور اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ جب ہم دوبارہ یک جا ہوئے تو میں نے اس سے کہا ۔ " ہم ابھی کفن بکس سروسز " کی بات کر رہے تھے ۔ میں نے اور بھی کئی جگہ ایسے بورڈ آویزاں دیکھے ہیں تمہارا کیا خیال ہے ؟" اس نے جواب دیا۔ " شاید اب سے پہلے ہم زندگی اور خواہوں سے اتنے معمور تھے کہ اس طرف دھیان ہی نہ جاتا تھا ۔"

" میں تمہاری بات کی تائید کرتا ہوں۔" ویسے تو ہم پیدائش کے ساتھ ہی مرنا شروع ہو جاتے ہیں اور جب لمحہ آجاتا ہے' یعنی آخری لمحہ تو ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص مر گیا" مگر اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے ۔ میں اس بڑے شہر میں ہی آکر اس تصور سے آشنا ہوا کہ آدمی مرے کہیں بھی لیکن دفن اپنے آبائی شہر میں ہو۔ یا تو میرے بچپن میں لوگ یہاں آتے نہیں تھے یا میں نے اپنے آبائی شہر میں' جسے میں اپنا آبائی شہر کہتا ہوں' رہتے ہوئے بھی یہ نہیں سنا تھا کہ کسی کی لاش اس شہر سے آئی ہو۔"

" شاید واپسی ہر ایک کے لئے ممکن نہیں " میرے دوست نے جواب دیا۔ " البتہ یہ تصور طمانیت بخش ہے کہ ہم ایک دفعہ پھر چاہے تابوت میں بند ہو کر دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کر ہی سہی' انہی مقامات اور جگہوں پر لائے جاتے ہیں' جہاں ہمارا بچپن گزرا تھا۔ اور جن جگہوں سے ہم اپنی جوانی کے ساتھ ہی رخصت ہو کر اجنبی جگہوں کے لئے نکلے تھے۔ میرے خیال میں ایک آدمی کے مرنے کے ساتھ ساتھ وہ جگہیں وہ گلیاں محلے بھی مر جاتے ہیں جن میں وہ رہا ہو۔ ایک زمانے میں میں بھی یہی سوچا کرتا تھا کہ مرنے کے بعد اپنے آبائی شہر کو واپس جاؤں گا۔

ہم ایک ریستوران میں جا بیٹھے۔ شام کا اخبار اپنی اعصاب شکن خبروں کے ساتھ ہمارے سامنے تھا۔ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔ " تو اب تم نے' میرا مطلب ہے خدا تمہاری عمر دراز کرے' اپنا ارادہ بدل دیا ہے ۔"

دراصل جس چھوٹے سے شہر سے میں آیا تھا' وہ اصطلاحی معنوں میں میرا آبائی شہر نہیں ہے ۔ ہم وہاں نووارد تھے ۔ شاید میرے والد ساری عمر وہاں نووارد ہی رہے۔ مگر میں اتنی چھوٹی عمر میں وہاں آیا تھا کہ میرے حافظے میں ان جگہوں کے وہ نقش و نگار جنہیں میرے گھر والے یاد کرتے رہتے تھے' موجود ہی نہ تھے۔ یوں میرے اور ان کے آبائی شہر جدا جدا ہو گئے ۔ یہاں قیام کے دوران ابتدائی برسوں میں تو یہی ارادہ کرتا رہا کہ واپس اپنے آبائی شہر جاؤں گا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ یہ خیال اپنی اہمیت کھوتا رہا۔ حالانکہ میں دوسروں کو دیکھتا ہوں' مگر میرا تعلق ان لوگوں سے ہے جن کے نزدیک زمین کی کوئی اہمیت نہیں تھی ۔"

میری باتوں پر اپنے کسی رد عمل کا اظہار کرنے کے بجائے وہ بولا " یار جب وہاں کسی کی تدفین ہوری ہو تو مجھے بھی بلا لینا۔"

میں نے جواب دیا۔ " یہ ناممکن ہے ۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ وہ کسی کو اطلاع نہیں دیتے' وہ تو بس اتفاق سے وہاں سے گزرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں کسی کا انتقال ہو چکا ہے ۔"

ایک دن ہم حسب معمول دفتر سے اکٹھے نکلے۔ صدر میں کافی دیر ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ایک کیفے میں بیٹھ کر چائے پی۔ اور پھر اپنے اپنے گھروں کے لئے روانہ ہوئے۔ اگلے روز دفتر میں اس کے بھائی نے فون پر ایک حادثے میں اس کے زخمی ہونے کی اطلاع دی۔ میں اسی روز عیادت کے لئے ہسپتال پہنچا۔ وہ شدید زخمی ہوا تھا۔ اور بے ہوش تھا۔ اس کا ایک آپریشن ہوا۔ اور رفتہ رفتہ صحت بحال ہوتی چلی گئی۔ میں اکثر شام کو اس کے پاس ہسپتال چلا جاتا تھا۔

ایک روز جب میں اس کے پاس پہنچا تو مختلف موضوعات پر باتیں کرتے ہوئے اس کے آپریشن کا بھی تذکرہ نکل آیا۔ وہ کہنے لگا۔ "آپریشن کے دوران بے ہوشی نے مجھے عجیب تجربے سے دوچار کیا۔ میں اس شہر میں طویل عرصے سے رہتا چلا آرہا ہوں۔ لیکن بے ہوشی کے دوران مجھے اس شہر کا کوئی منظر، کوئی عمارت، سڑک، حتیٰ کہ اپنا دفتر اور اپنے کسی آشنا کا چہرہ نظر نہ آیا۔ گھر والوں کے کہنے کے مطابق میں چار گھنٹے آپریشن تھیٹر میں رہا اور آپریشن کے بعد بھی کئی گھنٹے غفلت میں رہا۔ لیکن اس تمام مدت میں مجھے اپنا آبائی شہر، اس کی گلیاں، بازار، سڑکیں، کئی کئی منزلہ پرانے مکان، اپنے گھر کا صحن، اس کی کھڑکیاں، دروازے نظر آتے رہے۔ اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ اپنے آبائی مکان میں گزارے ہوئے ماہ و سال بھی خواب میں اسی ترتیب سے گزارے، جن سے میں گزر چکا تھا۔"

میں حیرت اور دلچسپی کے ساتھ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے اس کے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی سیاہ جلد والی ایک کتاب دیکھ کر پوچھا "کیا کوئی کتاب پڑھ رہے ہو۔"؟

اس نے مسکراتے ہوئے وہ کتاب میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "اب تم سے چھپانے سے کیا فائدہ؟ میری ایک ہابی ہے جس کا تذکرہ اب تک تم سے نہیں کیا، لو دیکھو۔"

دراصل وہ ایک پرانی ڈائری تھی۔ میں نے صفحات پلٹے تو اس میں جگہ جگہ اخباری تراشے چسپاں تھے۔ ان سب کی عبارتیں معمولی سے ردوبدل کے باوجود تقریباً یکساں تھیں۔ اور ان میں مرنے والوں کی ان کے آبائی قبرستانوں میں تدفین کی اطلاعات تھیں۔ بعض میں یہ بھی تحریر تھا کہ مرنے والوں کی میتیں فلاں فلاں تاریخوں کو ان کے آبائی شہر میں پہنچیں گی اور انہیں اسی دن ان کے آبائی قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔"

("سیپ" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

بالجبر

یہ سامنے سنگ مرمر کی بنی ہوئی سفید منزل دیکھ رہے ہیں آپ کتنی خوبصورت ہے جتنی سفید دودھ جیسی جاذب نظر، خواب آلود۔ اس عمارت میں ایک خوفناک حادثہ گزرا ہے۔ ایسا حادثہ جس کی مثال نہیں ملتی اس حادثے میں کوئی توڑ پھوڑ نہیں ہوئی کسی کو ضرب نہیں آئی چوٹ نہیں لگی۔

اگرچہ یہ حادثہ ڈکیتی قسم کا حادثہ تھا۔ لیکن کسی قسم کا نقصان نہیں ہوا۔ نہ رقم نہ زیور نہ کوئی چیز کسی فرد پر زیادتی نہیں ہوئی صرف ٹیلی فون کی تار کٹی ہوئی ہے۔ باقی سب لوگ اور چیزیں جوں کی توں موجود ہیں۔ حتیٰ کہ تجوری کی چابیاں بھی میز پر پڑی ہیں۔ اس کے باوجود سب کچھ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہے سفید منزل کے مکینوں کے دلوں پر ایسی ضرب پڑی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے داغدار ہو گئے ہیں۔

میں نے کہا نا یہ ایسا حادثہ ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔

سفید منزل کے مین گیٹ پر نیم پلیٹ لگی ہے۔

"سلطانہ شاہین"

سلطانہ کو آپ نے ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ ایک ایسی شخصیت ہے جو آپ دیکھیں نہ دیکھیں، دکھے بغیر نہیں رہتی۔ اس کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو وقار ہے۔ اتنا وقار ہے کہ لگتا ہے جیسے شہزادی ہو۔ سچ مچ کی شہزادی اتنا وقار ہے کہ مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی جی چاہتا ہے پر دیکھا نہیں جاتا۔ اس کی شخصیت کا دوسرا پہلو حسن ہے اتنی جاذب نظر ہے کہ جی چاہتا ہے مڑ مڑ کر دیکھیں اک شگفتگی ہے تازگی ہے فرحت ہے لگتا ہے جیسے بھورے میں لپٹی ہوئی ہو۔ آنکھوں میں ننھے ننھے بلبلے ناچتے ہیں جگمگ کر رکھ دیتے ہیں۔ سلطانہ کی عمر ۴۴ سال ہوگی۔

سیانے کہتے ہیں نسائیت کو اپنے جوبن پر دیکھنا ہو تو چالیس کے لگ بھگ دیکھو آج کل نسائی جوبن شاید دیہات میں نظر آتا ہو شہروں میں تو عورتیں ہوتی ہی نہیں۔ لڑکیاں ہی لڑکیاں۔ جوان لڑکیاں۔ ڈھلکی ہوئی لڑکیاں بوڑھی لڑکیاں۔ پتہ نہیں سلطانہ میں شہری ہونے کے باوجود نسائی جوبن کیسے آیا تھا۔ صاحبو اللہ تعالیٰ کی باتیں بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ خود ہی اصول بناتا ہے خود ہی اسے توڑتا ہے۔ پھر ٹوٹ میں سے تازہ نمو پیدا کرتا ہے۔ ایسے تماشے لگا رکھے ہیں کہ دیکھتے رہو۔ ذرا نہ اکتاؤ۔ بہرصورت سلطانہ میں نسائی جھلک اتنی تھی کہ چھینٹے اڑتے تھے ایک ساعت کے لئے لڑکیوں کے دلدادہ بھی دیکھ کر بھونچکا جاتے تھے۔

اب تو خیر وقار ڈھال بن گیا ہے۔ ایک سال پہلے نسائیت کی جھلک نے ہوری مچا رکھی تھی۔ اگرچہ ثانوی

تھا۔ لیکن وقار جب بھی موجود تھا شاید آپ نے نوٹ کیا ہو کہ تسلی ہونی از خود پر وقار ہوتا ہے۔ ایک بے نام شیرازہ محور کی تمکنت۔

ایک سال پہلے ایک دل خراش واقعہ رونما ہوا تھا۔ سلطانہ کے میاں سکندر شاہین ہوائی حادثے میں فوت ہوگئے تھے۔ وہ تاجر تھے بڑی املاک تھی۔ بکھری پڑی تھی۔ دفعتاً" کاروبار اور املاک کی تمام تر ذمہ داری سلطانہ پر آپڑی تھی اور وہ مردانہ وار میدان عمل میں نکل آئی تھی۔ یوں ضرورت کے تحت نسوانی کشش پر وقار کا محافظ بیٹھ گیا تھا۔

رات کے بارہ بجے تھے۔ گھر میں سات "جی" تھے سلطانہ اس کے بوڑھے والد بڑے ملک اس کی تین نوجوان بیٹیاں ایک دس سال کا بیٹا اور ایک پھوپھی بہن۔ وہ سب ٹیلی ویژن لونج میں بیٹھے لانگ پلے دیکھ رہے تھے۔ ڈور بل بجی کسی نے اسے اہمیت نہ دی۔ بڑے ملک اٹھ کر دروازہ کھولنے گئے۔ دھم سی پکڑ دھکڑ کی آواز آئی پھر وہ تینوں سامنے آکھڑے ہوئے۔ لوٹے لیے۔ چہروں پر ڈھاٹا باندھے جس میں سے قہر آلود آنکھیں لاٹیں مار رہی تھیں۔ دو نے ہاتھ میں پستول پکڑے ہوئے تھے۔ تیسرے نے ایک ہاتھ بڑے ملک کے منہ پر رکھا ہوا تھا۔ دوسرے بازو سے انہیں لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

ایک بولا "خبردار جو آواز پیدا کی تو۔ چپ چاپ بیٹھے رہو" اس نے دوسرے پستول والے کو اشارہ کیا۔
"جاؤ۔"

دوسرا پستول والا گھر کے اندر داخل ہوگیا۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔
اندر جانے والا گھوم پھر کر واپس آگیا۔ "سب ٹھیک ہے۔"
تیسرے نے بڑے ملک کو چھوڑ دیا۔ "بیٹھ جاؤ" وہ بولا "شور مچانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تمہارے فون کا تار کاٹ دیا گیا ہے۔"

سلطانہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی غصے میں بولی "تم چاہتے کیا ہو؟" "ابھی معلوم ہو جائے گا"۔ تیسرا دھیمے لہجے میں بولا۔

سلطانہ نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور بڑی تمکنت سے ان کے قدموں میں پھینک کر بولی۔ "یہ لو چابیوں کا گچھا۔ جو چاہتے ہو نکال لو اٹھالو اینڈ گٹ آؤٹ" وہ غرائی۔ کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔
پھر پستول والے نے فرش سے گچھا اٹھایا اور تیسرے آدمی کو پیش کر دیا۔ جو ان کا سردار معلوم ہوتا تھا۔
سردار نے میز کی طرف اشارہ کیا "رکھ دو" وہ بولا۔ پستول والے نے چابیاں میز پر رکھ دیں۔
پھر وہ ان سب سے مخاطب ہوا "سب کھڑے ہو جاؤ۔ لائن بنا لو۔" وہ سب لائن میں کھڑے ہو گئے۔
تم دونوں دو قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔ اس نے بڑے ملک اور لڑکے کو ڈانٹا۔ اور خود خواتین کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ اس نے پہلی خاتون کی ٹھوڑی کو ہاتھ سے اوپر اٹھایا۔ دونوں طرف سے چہرے کو غور سے دیکھا۔ پھر وہ اس کا بدن ٹٹولنے لگا۔ یوں جیسے بکرا منڈی میں بکرے کو ٹٹولتے ہیں۔ باری باری اس نے ہر لڑکی کو دیکھا، ٹٹولا۔

آخر میں سلطانہ کی باری تھی۔ سلطانہ نے اس کے بازو کو جھٹک دیا۔ دونوں ہاتھوں سے اسے دھکیلا۔ یہ دیکھ کر پستول والا سردار کے قریب آکھڑا ہوا۔ سردار نے پستول والے کو گھورا اور نفی میں سر ہلا دیا۔۔۔

اورنگ زیب قاسمی

"اس کمرے کو دیکھو" سردار نے پستول والے کو کہا اور سامنے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا۔ "ٹھیک ہے" پستول والے نے جواب دیا۔ "دیکھ لیا ہے۔"
سردار نے سلطانہ کو دونوں بازوؤں پر اٹھا لیا۔ سلطانہ چیخ رہی تھی ٹانگیں چلا رہی تھی۔ سردار نے پستول والوں سے کہا۔ "ہوشیار رہنا" اور خود سلطانہ کو اٹھائے ہوئے بیڈ روم میں داخل ہو کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ سلطانہ نے اس کے ہاتھ پر کاٹ کھایا۔ سردار نے اسے غصے سے جھنجھوڑا اور بیڈ پر دے مارا۔ سلطانہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اٹھ کر اس پر جھپٹی۔
"مت کرو" وہ غصے میں دہاڑا اور ایک ایک کرکے اس کے کپڑوں کو چیر پھاڑ دیا۔
سلطانہ تھک ہار کر بیڈ پر گر گئی۔ جبر کے خوف سے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جسم کے بند بند کو جکڑ لیا۔

صدیاں گزر گئیں جسم جکڑے جکڑے تھک کر ڈھیلا پڑنے لگا سلطانہ کو غصہ آرہا تھا۔ یہ کیا کر رہا ہے کیوں وقت ضائع کر رہا ہے۔ مجھے سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ جو کرنا ہے کرے جان چھوڑے۔
وہ اس قدر عاجز آچکی تھی کہ پہلے جس بات سے خوف زدہ تھی اب اس کی منتظر تھی۔
اس نے آدھی آنکھ کھولی اور آدھ کھلی سے دیکھا وہ پلنگ کے ساتھ کرسی لگائے اس کی لمبی جرابیں اتار رہا تھا۔
"باسٹرڈ" وہ بن بولے غصے میں چلائی۔ اسے اتنا بھی پتہ نہیں کہ سٹاکنگز چڑھی ہوں یا اتری ہوں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ غصے میں اس نے اپنے دونوں پاؤں جھلائے شاید اس لئے کہ اس کی توجہ پاؤں سے ہٹا کر کسی اور جانب کر دے وہ پھر اپنا جسم جکڑ کر پڑ گئی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کے جسم کو سہلا رہا تھا۔ چوم رہا تھا۔
اس کے لمس میں تنگی نہ تھی تندی نہ تھی خواہش کی آگ نہ تھی۔ اتنی اپنائیت تھی اتنی (Tenderness) تھی کہ سلطانہ کا جسم ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا۔ برف پگھل رہی تھی الو کا پٹھا یہ کیا کر رہا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی۔
پھر اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ اس کے اندر کی عورت جسے اس نے پتھر بنا رکھا تھا جاگنے لگی تھی۔ اندر اک سلگاؤ سی لگی تھی جاؤں مت جاؤ جاؤں مت جاؤ۔ کتنی بے حیا ہے کمینی۔ کنجری۔ اسے اپنی اندر والی پر غصہ آرہا تھا۔
کھڑ کھڑ کی آواز سن کر اس نے پھر کانی آنکھ سے دیکھا وہ الماری کھول رہا تھا۔ ارے یہ کیا کر رہا ہے۔ الماری میں کیا دھرا ہے۔ تجوری کی چابیاں کس حقارت سے میز پر رکھوا دی تھیں۔ اب الماری کھول رہا ہے۔ پاگل خانے سے چھوٹا ہوا تو نہیں۔
پھر وہ سلطانہ پر چادر ڈال رہا تھا۔ چادر ڈالنے کے بعد اس نے سلطانہ کا سر اٹھایا۔ اس کی ٹھوڑی پیشانی اور بال چومنے لگا۔ چومتا رہا۔ دفعتاً" وہ مڑا اور دو لمبے ڈگ بھرے اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
سلطانہ نے چھلانگ لگائی اور دروازے کی کنڈی چڑھا دی پھر وہ شیشے سے باہر جھانکنے لگی۔
وہ غصے بھری آواز میں سب کو ڈانٹ رہا تھا۔ پھر وہ آدمی لپک کر دروازے کی طرف بھاگے تیسرا پستول

لئے پچھلے قدموں پر چلتا رہا۔ کھڑاک سے دروازہ بند ہو گیا۔ وہ جا چکے تھے۔

کچھ دیر بعد گھر والے سلطانہ کے بیڈ روم کا دروازہ بجا رہے تھے۔ بجاتے رہے۔ سلطانہ نے کنڈی نہ کھولی۔ انہوں نے دروازے کے شیشے سے ٹارچ کی روشنی پھینکی وہ چادر میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور سفید منزل پر بھیانک خاموشی چھا گئی۔

لیکن سلطانہ کے دل میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ وہ حیران بیٹھی تھی۔ یہ کیا ہوا کچھ بھی نہیں ہوا لیکن ان کے سامنے کیسے جا سکتی ہوں۔ نہیں نہیں۔ کیا منہ لے کر جاؤں گی۔ میری بیٹیاں کیا سوچیں گی۔ میرے ابا ------ کہ بند کمرے میں کیا ہوا۔ نہیں نہیں کوئی نہیں مانے گا --- ماننے والی بات ہو تو مانے --- کاش وہ تجوری کھول کر کوئی رقم یا زیور لے جاتے --- جاتے ہوئے نیلی وڈیو ہی اٹھا لیتے --- اس سے تو یہی بہتر تھا کہ کچھ ہو جاتا۔ جب وہ جاتے تو میں بے ہوش پڑی ہوتی۔ جسم پر پکڑ دھکڑ کی خراشیں ہوتیں۔ نیل پڑے ہوتے۔ جگہیں سوجی ہوئی ہوتیں--- میں تو آنکھیں بند کرکے پھر بھی انتظار کرتی رہی --- لیکن کچھ بھی نہ ہوا ایسا کیوں ہوا۔ اس کے بس میں جبر نہیں تھا۔ کتنی اپنائیت تھی۔

نہیں نہیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں انہیں اپنا منہ نہیں دکھا سکتی۔ کیسے دکھاؤں۔ تذلیل کی اس انتہا کے بعد کیسے دکھاؤں دفعتاً" اس کی نگاہ میز پر جا پڑی جہاں فوٹو فریم تھا جس میں سلطانہ اور سکندر دونوں کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

فریم اکھڑا پڑا تھا لپک کر اس نے فریم کو اٹھایا وہ خالی تھا۔ تصویر نیچے گری ہوئی تھی۔ اس نے تصویر اٹھائی۔ وہ پھٹی ہوئی تھی۔ سکندر والا حصہ موجود تھا۔ سلطانہ والا غائب تھا۔ دفعتاً" اسے لاکٹ کی چوری کا واقعہ یاد آیا۔

شیرا انگوری کا بدمعاش تھا۔ انگوری۔ واڑی پہاڑ پر چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ وہ ایک صحت افزا مقام ہے۔ انگوری کی دو جگہیں مشہور ہیں۔ ایک تو ہنگو جھیل ہے۔ یہ مقام بے حد خوبصورت ہے۔ جھیل کا پانی یخ ٹھنڈا ہے اور اس میں ٹراوٹ مچھلی کی بہتات ہے حیرت ناک بات یہ ہے کہ جھیل کے عین درمیان میں ایک چھوٹا سا چٹانی جزیرہ ہے جس میں ایک پیالہ نما گرم چشمہ ہے جس کا پانی ہر وقت کھولتا رہتا ہے جھیل سے دو تین کلو میٹر دور ایک چٹان ہے۔ اس چٹان پر مکلاوہ تو چٹان سے گرم پانی کا ایک چھینٹا اڑتا ہے۔ دور دور سے سیاح انگوری کو دیکھنے آتے ہیں وہاں کنڈی لگا کر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔

انگوری گاؤں سے ذرا ہٹ کر ایک دو منزلہ ہوٹل بنا ہوا ہے ہنگو ریسٹ ہاؤس جہاں سیاح آکر ٹھہرتے ہیں۔

ایک ڈیڑھ سال ہوا سلطانہ کو سکندر کا کویت سے فون آیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ فوراً" انگوری چلی جاؤ وہاں ہنگو ریسٹ ہاؤس میں آٹھ دن قیام کرو۔ حالات کا جائزہ لو۔ یہ ہوٹل بک رہا ہے۔ کیا ہم اسے خرید لیں کیا یہ سودا منافع بخش رہے گا۔ وہ اسی انیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل کا جائزہ لیتی رہی۔ وہاں اس نے شیرے کو پہلی بار دیکھا تھا۔

جب وہ وہاں پر پہنچی تو سب کمرے لگے ہوئے تھے۔ صرف انیکسی خالی تھی۔ ریسپشنسٹ نے کہا " اس کے ڈبل چارجز ہوں گے۔"

اورنگ زیب قاسمی

پہلے روز ہی جب وہ گردوپیش کا جائزہ لینے کے لئے باہر نکلی اور ایک پگ ڈنڈی پر جا رہی تھی کہ دور سے ایک آدمی شور مچاتا ہوا آیا۔ نہ بی بی نہ۔ ادھر مت جاؤ " جب وہ قریب آیا۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

چند ساعتوں کے بعد سلطانہ بولی " تم کون ہو " وہ چونکا۔ بولا " بیگم صاحب ادھر نہ جائیں۔ آگے دلدل ہے۔ ادھر جائیں۔"

وہ ادھر چل پڑی دور جا کر اس نے مڑ کر دیکھا وہ وہیں کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

اگلے روز وہ انیکسی میں آ گیا۔ بیگم صاحب جی کوئی کام ہو تو بتائیں۔

" تم کون ہو " سلطانہ نے غصے میں پوچھا۔

" بیگم صاحب جی میں ادھر چوکیدار ہوں "

شام کو سلطانہ نے ہوٹل کے بیرے سے پوچھا۔

وہ بولا " میڈم ہمارا چوکیدار چھٹی پر گیا ہوا ہے یہ اس کی عوضی ہے یہ شیرا ہے گاؤں کے ہر شخص کے کام آتا ہے ویسے دس نمبریہ ہے پر مجھے لوگ کہ اس علاقے کا رکھوالا ہے۔"

شیرا روز کسی نہ کسی بہانے انیکسی میں آ جاتا تھا۔ جھکی جھکی نگاہوں سے کھڑا سلطانہ کی آواز سنتا رہتا تھا۔

پھر ایک روز سلطانہ کا سونے کا لاکٹ گم ہو گیا۔ اسے شیرے پر شک تھا۔ اس نے تھانے دار کو رپورٹ کرنے کے لئے ڈائل گھمایا تو شیرے نے اپنا ہاتھ سلطانہ کے ہاتھ پر رکھ دیا کہنے لگا " نہ بیگم صاحب شیرے کو ذلیل نہ کرو بے شک قتل کا الزام اغوا کا الزام ڈکیتی کا الزام چوری کا الزام لگا کر شیرے کو ذلیل نہ کرو۔"

" بس وہی تھا " سلطانہ نے اپنے آپ سے کہا۔ " وہی۔ وہ اپنی ذلت کا بدلہ لینے آیا تھا۔ اس نے مجھے کسی جوگا نہیں چھوڑا۔ نہ باپ جوگا نہ اولاد جوگا۔ لیکن وہ میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا۔"

وہ اٹھ کر باتھ روم میں گئی۔ منہ ہاتھ دھویا۔ پھر کپڑے بدلے۔ پیچھے جین چڑھائی اوپر جیکٹ سر پر فلیٹ ہیٹ اس نے اپنا بٹوہ جیب میں ڈالا سیف سے پستول نکالا اسے لوڈ کیا اور کار کی چابیاں اٹھا کر دبے پاؤں باہر نکل گئی تاکہ گھر والوں کو پتہ نہ چلے۔

ہنگو ریسٹ ہاؤس میں اس نے اپنا نام میڈم شاہباز لکھوایا دو دن وہ انیکسی میں بیٹھی شیرے کا انتظار کرتی رہی جو ابھی تک گاؤں واپس نہیں پہنچا تھا۔ انیکسی سے شیرے کے گھر کا پچھواڑہ صاف نظر آتا تھا۔

تیسرے دن سلطانہ نے دیکھا کہ پچھواڑے میں ایک گھوڑی بندھی ہوئی ہے۔ وہ سارا دن انتظار کرتی رہی۔ رات کے آٹھ بجے وہ انیکسی سے نکلی۔ شیرے کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ چپکے سے اندر داخل ہو گئی۔

کمرے میں لالٹین جل رہی تھی قریب ہی شیرا اپنے لمبے رائڈنگ بوٹ کی مرمت کر رہا تھا۔

سلطانہ نے پستول نکالا اور کمرے میں داخل ہو گئی " ہینڈز اپ " وہ بولی۔

شیرا چونکا۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ " بیگم صاحب جی مجھے پتہ تھا کہ تم آؤ گی " ۔ وہ بولا۔

" مارو۔ مارو مجھے " وہ بولا۔ " چلاؤ گولی۔"

" میں تجھے نہیں بخشوں گی " وہ غصے میں چلائی " تو نے مجھے اسقدر ذلیل کیا ہے کہ " --- وہ رک گئی۔

" ہاں " وہ بولا۔ میں نے اپنی ذلت کا بدلا لینے کے لئے تیرے گھر ڈاکہ ڈالا تھا۔ ڈاکہ ڈالنا میرے لئے کچھ

مشکل نہیں۔

بیگم صاحب جی یہ میرا دھندا ہے تم نے میری طرف چابیاں پھینکی تھیں تو میں نے ان کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ میرا مقصد تجھے ذلیل کرنا تھا۔ پھر میں تجھے اٹھا کر اندر لے گیا۔ میں نے تیرے کپڑے پھاڑ ڈالے تو میرے سامنے پڑی تھی۔" وہ رک گیا " بیگم صاحب جی بڑی کوشش کی کہ تجھ سے برا کروں بڑی کوشش کی لیکن ایسا نہ کر سکا۔"

" بیگم صاحب جی ہم بدمعاش لوگ ہیں ہم جسے اپنا یعنی اپنا سمجھ لیں اس سے برا نہیں کر سکتے۔ اسے دغا نہیں دے سکتے۔ " وہ خاموش ہو گیا۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر وہ بولا " بیگم صاحبہ جی پہلے روز ہی میں نے تجھے اپنا لیا تھا۔ تو مجھے اچھی لگی تھی۔

اس رات تو میرے سامنے پڑی تھی تو تیرے بدن سے مجھے اپنائیت کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس لئے میں اسے چومتا رہا۔ چومنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اب مجھے چلا کر دیکھ کیا رہی ہے تجھ سے لیلیٰ دیالی نہیں جاتی تو آ کر دبا دوں " وہ سلطانہ کی جانب چل پڑا۔

سلطانہ کا سر گھوم رہا تھا سارا کمرا گھوم رہا تھا۔ وہ گھورے جا رہی تھی۔ " تو " ---- وہ مدھم آواز میں بولی " تو نے مجھے کسی جوگا نہیں چھوڑا "

" میں بھی تو کسی جوگا نہیں رہا بیگم صاحب جی ---- " سلطانہ کے ہاتھ سے پستول گر گیا اور وہ اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔

("مستقبل" اسلام آباد)

اورنگ زیب قاسمی

نشاء یاد

جادوگر کیسے بنتے ہیں

بچوں کے ایک رسالے کا کہانی نمبر شائع ہو رہا تھا۔ ایڈیٹر کے بار بار خط اور ٹیلیفون آ رہے تھے۔ اس نے وعدہ کر لیا تھا' لیکن جم کر بیٹھنے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ پھر جب فرصت ملی تو موڈ نہ بنا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا ہفتہ بیت گیا اور وہ کچھ بھی نہ لکھ سکی۔

اسے لگتا جیسے وہ کہانی لکھنا بھول گئی ہو اور جس طرح عرصے تک کسی مشین کو چلایا نہ جائے تو اس کی گراریوں کو زنگ سا لگ جاتا ہے' کہانی سوچتے ہوئے اس کا ذہن بھی جھٹکے سے کھانے لگا۔ پھر جب بڑی مشکلوں سے گزشتہ روز سلسلہ ذرا چلا تو پیرس سے میاں کی ٹیلیفون کال آ گئی' مگر فوراً" ہی کٹ گئی۔ وہ ان کی واپسی کا پروگرام تک نہ جان سکی اور رات بھر اس انتظار میں جاگتی رہی کہ شاید دوبارہ ٹیلیفون آ جائے۔ دن کو بھی وہ گھر سے باہر کہیں نہ گئی اور گھر اور غسل خانے میں بھی کارڈلیس ٹیلیفون اپنے ساتھ رکھا۔

آج اس کا ارادہ کہانی مکمل کرنے کا تھا' اس لئے اس نے کھانا جلدی لگوا دیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ ملازمین کو ضروری ہدایات دے کر اور بچوں کو ہوم ورک کرنے کی تاکید کر کے اپنے بیڈ روم میں آئی تو کمرہ ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس نے اے۔ سی کو ایڈجسٹ کیا اور سائڈ ان کی رائٹنگ ٹیبل کا بلب روشن کر کے سامنے بیٹھ گئی اور گھر گھر سے لائے ہوئے خوبصورت اور طرح طرح کے قلموں میں سے اپنی مخصوص ساخت پنسل تلاش کرنے لگی' پھر اسے تراشتے ہوئے گزشتہ شب کی نامکمل اور کچی پکی تحریر پڑھنے لگی۔

گزشتہ رات شہزادہ اپنے ساتھیوں سے جدا ہو کر' دلفریب نغمے کا تعاقب کرتا ہوا جادوگر کے حصار میں داخل ہو چکا تھا اور جونہی وہ باغ کے بڑے پھاٹک سے اندر آیا تھا جادوگر نے' جو اپنے طلسمی شیشے میں سب کچھ دیکھ رہا تھا' خوشی سے قہقہہ بلند کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی شہزادہ راہ طوطے میں اور سارا باغ ایک وسیع و عریض طلسمی پنجرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس سے آگے اسے یاد تھا کہ جادوگر کو شہزادے کا بھیس بدل کر شاہی محل میں جانا اور شہزادی سے ملنا تھا' مگر وہ یہ لکھ نہ پائی تھی۔

اس نے پنسل اٹھا کر کہانی کو آگے چلانا چاہا' مگر ذہن میں لفظوں اور خیالوں کی عجیب سی آنکھ مچولی شروع ہو گئی تھی۔ سارے خیالات جیسے کونوں کھدروں اور پردوں کے پیچھے چھپ گئے تھے اور الفاظ ہر طرف شریر بچوں کی طرح ہڑبونگ مچانے لگے تھے۔

اس نے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ پندرھویں یا سولھویں رات کے "گوڑا" لگا کر طلوع ہونے والے چاند کی سرخ سرخ چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ٹیرس پر ایک طرف دیس دیس کی خوبصورت آوازوں' سوچی

صورتوں اور رنگا رنگ مناظر کے جگنو پکڑنے کے لئے ذہن اشیتا نے اپنا بڑا سا پیالہ نما منہ کھول رکھا تھا۔ اسے لگا کر اس کے اندر کے اشیتا پر بھی دور دور سے سگنلز آرہے ہیں' مگر کوئی تصویر نظر نہیں آتی' آواز سنائی نہیں دیتی۔ ضرور ٹیلی ویژن کی طرح اس کے اندر کوئی سوئچ بھی بند ہوگا۔ بند کمرے میں اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ دروازہ کھول کر ٹیرس پر آگئی۔

باہر کی ہوا اندر کی ہوا کی طرح خنک نہیں تھی' لیکن اسے تازگی کا احساس ہوا۔ بڑی دیر تک گارڈن چیئرمیں دھنسی' قدرت کے روشن اور لمحہ بہ لمحہ سفیدی میں ڈھلتے رخسار میں کہانی کی پرچھائیاں تلاش کرتی رہی' مگر کہانی اس کے ذہن کی گرفت سے پھسل پھسل جاتی۔ پھر وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی اور ٹہلتے ٹہلتے تھک گئی' مگر کہانی کا اختتام بالکل نہیں سوجھ رہا تھا۔ وہ یہ سوچ کر کہ واقعی وہ کہانی لکھنا بھول گئی ہے' پریشان ہوگئی' لیکن پھر اچانک اسے لگا جیسے کسی نے اس کے ذہن کے بند کمرے کے سارے کواڑ کھول دیئے ہوں یا خود بخود کوئی سوئچ آن ہوگیا ہو۔ اسے کرداروں کی صورتیں اور واقعات کی کڑیاں صاف دکھائی دینے لگیں۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اندر آئی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر لکھنے لگی' مگر ابھی کھوئے ہوئے شہزادے کے روپ میں جادو گر شہزادی کے محل میں داخل ہی ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

" مے آئی کم ان ماما ؟ "

" یس ٹوٹو ـــ کم ان ۔"

ٹوٹو کے پیچھے ارم اور پوپی بھی اندر آگئے۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا اور بولی : " تم لوگ سوئے نہیں ابھی تک ؟ " " یہ ضد کر رہا ہے ماما " ارم نے ٹوٹو کی طرف اشارہ کیا: " کہتا ہے ماما کے پاس سوؤں گا۔ اور کہتا ہے 'کہانی بھی سنوں گا " پوپی نے اضافہ کیا۔

" نہیں بیٹے ـــ میں مصروف ہوں " وہ بولی : صبح چھٹی ہے۔ تم لوگ وہ مووی لگا کر دیکھ لو جو اس روز پاپا لائے تھے۔"

" نہیں ماما " ٹوٹو نے ضد کی: مووی نہیں کہانی ! "

" کل سناؤں گی چالاک ! " اس نے ٹوٹو کے گال تھپتھپا کر کہا: " آج مجھے یہ کہانی مکمل کرنا ہے ۔ بہت ضروری ہے۔"

" مجھے نہیں پتا " ٹوٹو بیڈ پر دراز ہوگیا: " میں آج ہی سنوں گا۔ کل پاپا آجائیں گے۔"

" ہاں شاید " وہ پریشان ہوگئی: " اسی لئے میں آج کہانی مکمل کر لینا چاہتی ہوں ۔"

" سنا دیجئے نا " ارم نے التجا کی: " پلیز ماما۔"

" تو تم بھی اس سازش میں شریک ہو ؟ "

" ہاں ماما ـــ ہم سب کا بہت جی چاہ رہا ہے آج آپ سے کہانی سنیں اور آپ کے پاس ہی سوئیں۔"

" او مائی پوئر چلڈرن " اس کی کوکھ میں جیسے ٹیس سی اٹھی: " کم آن ـــ آل آف یو "

اور وہ یوں جلدی جلدی تکیے اور کشن لے کر اس کے پہلو میں لیٹ گئے جیسے انہیں ڈر ہو کہیں وہ اپنا ارادہ نہ بدل لے۔

" میں ایک جادوگر اور راہ طوطے کی کہانی لکھ رہی ہوں۔ وہی سنا رہی ہوں "

اورنگ زیب قاسمی

" نہیں ماما وہ تو ہم چھپنے پر خود پڑھ لیں گے " ارم نے کہا۔

" آپ تو کہانیاں بنا سکتی ہیں ماما " پوپی بولا : کوئی دوسری والی سنایئے ۔"

" ماما ! آپ بچوں کے لئے ہی کیوں کہانیاں لکھتی ہیں ؟ " ارم نے پوچھا " بڑوں کے لئے کیوں نہیں ؟"

" اس لئے کہ مجھے تم سب سے پیار ہے۔ مجھے سارے بچے اچھے لگتے ہیں' یا پھر تمہارے پاپا کے کہنے کے مطابق میرا ذہن بڑا نہیں ہوا' اب تک بچوں کی طرح سوچتی اور بی ہیو کرتی ہوں ۔"

" آپ بڑوں کے لئے لکھ تو سکتی ہیں نا ماما ؟ " پوپی فکر مند ہوگیا۔

" پتا نہیں " اس نے جواب دیا: " میں نے کبھی کوشش ہی نہیں کی' شاید میں اندر سے سچ مچ بچہ ہی ہوں۔"

" آپ لکھ سکتی ہیں " پوپی نے کہا: " مجھے پتا ہے ۔"

" ماما ـــ راہ طوطا کیا ہوتا ہے ؟ " ٹوٹو کی سوئی اب تک کہیں اور ہی اٹکی ہوئی تھی۔

" ایک عام سا طوطا ہوتا ہے' سیاہ گلی والا' اسے جنگلی یا کانٹھا طوطا کہتے ہیں۔ لاکھ سر کھپاؤ یہ بولنا نہیں سیکھ سکتا۔ مگر راہ طوطا سیکھ سکتا ہے ۔ دیکھنے میں دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں مہندی رنگے' مگر راہ طوطے کے گلے میں کنٹھی نہیں ہوتی اور اس کے کندھے سرخ ہوتے ہیں' جیسے مہندی کا رنگ چڑھ رہا ہو۔

" میں جادوگر اور راہ طوطے کی کہانی سنوں گا " ٹوٹو نے فرمائش کی۔

" نہیں ہم دوسری والی سنیں گے ماما " ارم اپنی ضد پر قائم تھی۔

" ماما جادوگر کیسے بنتے ہیں ؟ پوپی نے پوچھا۔

اس نے چونک کر پوپی کی طرف دیکھا اور بولی : اچھا سوال ہے ۔ گڈ ـــ چلو آج میں تمہیں ایک نئی کہانی سناتی ہوں ۔"

بیچ میں نہیں بولنا ٹوٹو " ارم نے یاد دلایا: " ورنہ ماما کو کہانی بھول جائے گی۔"

" میں نہیں بولوں گا یہ بولے گا " ٹوٹو نے کہا۔

" تم ہی بولو گے دیکھ لینا " پوپی بولا۔

" تم دونوں چپ نہیں رہ سکتے " ارم نے ڈانٹا " ماما کہانی سوچ رہی ہیں۔"

" ایک دفعہ کا ذکر ہے " اس نے دھیمے لہجے میں کہانی شروع کر دی : دیووں پریوں کے دیس کوہ قاف میں ایک ننھی منی خوبصورت پری رہتی تھی۔ نام تھا اس کا کرن۔ وہ دن بھر اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی کودتی' جھولے جھولتی اور ہرے بھرے باغوں میں اڑتی پھرتی۔ اس کا باپ آدم زاد تھا' لیکن بہت سے دیو اس کے غلام تھے' جن کے ذریعے وہ اپنی لاڈلی بیٹی کے لئے دور دور سے سوغاتیں اور پوشاکیں منگاتا۔ وہ یہ خوبصورت اور انوکھی چیزیں پا کر خوش ہوتی اور اپنی سہیلیوں کو دکھاتی' لیکن اس کا آدم زاد باپ خوش نہیں تھا۔ کوہ قاف میں لڑائی جھگڑے بہت تھے۔ ہر کوئی دوسرے کو نیچا دکھانے اور مطیع کرنے میں لگا رہتا۔ آئے روز جنوں' بھوتوں' دیووں اور جادوگروں میں ٹھنی رہتی۔ چٹانیں اور بڑے بڑے درخت اکھاڑ کر ایک دوسرے پر پھینکے جاتے' آگ اور پانی کے طوفان اٹھائے جاتے' تند وتیز ہواؤں کے جھکڑ چلتے اور چنگھاڑنے کی خوفناک آوازیں گونجتی رہتیں۔ کبھی کوئی کسی کو غلام بنا لیتا' کبھی طاقت سے کچل دیتا جادو کے زور سے اس کی جون بدل ڈالتا۔

کوہ قاف میں دو ہی چیزوں کا راج تھا: سینہ زوری اور جادوگری۔ خود کرن پری کا باپ بھی جادو ٹونا جانتا تھا' اسی لئے بہت سے دیو اس کے غلام تھے' لیکن وہ جادو کو پسند نہ کرتا تھا نہ اپنی بیٹی کو سکھانا چاہتا تھا۔ خود اسے بھی آدم زاد اچھے لگتے تھے' جن کی باتیں وہ اپنے باپ سے سنتی رہتی تھی۔"

"جادو حرام ہوتا ہے نا --- ماما؟" بونی نے پوچھا۔

ٹوٹو نے مسکرا کر سب کی طرف دیکھا جیسے اپنے نہ بولنے پر داد وصول کرنا چاہتا ہو۔

"ہاں بیٹے" اس نے بات جاری رکھی: "جادو حرام ہوتا ہے' اسی لئے ننھی پری کا باپ چاہتا تھا وہ جادو نہ سیکھے' علم حاصل کرے --- وہ علم جو خدا نے بنی آدم کو عطا کیا ہے اور جس کی وجہ سے وہ زمین پر اس کا نائب مقرر ہوا' مگر کوہ قاف میں جادو سیکھے بغیر چارہ نہ تھا ورنہ وہاں رہنا دشوار ہو جاتا' اس لئے کرن پری کے باپ نے کوہ قاف کی حکومت چھوڑ کر انسانوں کی ایک بستی میں رہائش اختیار کر لی تاکہ اپنی بیٹی کو جادو کی بجائے تعلیم کے زیور سے آراستہ کر سکے' لیکن اس کی دیو زاد بیوی کو انسانی بستی کی گرد و غبار اور دھوئیں سے اٹی فضا راس نہ آئی اور وہ کچھ عرصہ بیمار پڑ کر مر گئی۔"

"مر گئی؟" ٹوٹو پریشان ہو گیا۔

"ہاں مر گئی اور کرن اکیلی رہ گئی۔ اس کے باپ نے بستی کے بڑے بازار میں نوادرات کی دکان کھول لی تھی اور اس کا زیادہ تر وقت وہیں گزرتا تھا البتہ گھر میں کرن کی دیکھ بھال کے لئے ایک بوڑھی خادمہ موجود تھی۔"

"پھر ماما؟"

"پھر وہ آہستہ آہستہ ماں کے بچھڑ جانے کا غم بھولنے لگی اور جی لگا کر پڑھنے لگی۔ سکول سے آ کر کھانا کھاتی اور ہوم ورک کر کے سو جاتی۔ شام کو اڑوس پڑوس کی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ کھیلتی اور ٹی-وی دیکھتی' رات کا کھانا ابا کے ساتھ کھاتی' کچھ دیر سکول کا کام کرتی' پھر سو جاتی'۔ انسانوں کی بستی میں آ کر شروع شروع میں اسے گھٹن کا احساس ہوتا رہا لیکن جلد ہی اس کا جی لگ گیا حالانکہ یہ گھر چھوٹا تھا اور اس کے آس پاس کھیت تھے نہ کوئی باغ اور نہ یہاں نت نئی سوغاتیں لا کر دینے والے جن اور دیو تھے۔ پھر بھی اسے یہ بستی اچھی لگی - لوگ سادہ' معصوم اور سچی محبت کرنے والے تھے۔ مل جل کر رہتے اور ایک دوسرے کے کام آتے تھے --- اس کے ابا نے اس خیال سے کہ کسی کو پتا نہ چلے وہ اصل میں پری ہے' اس کے پنکھ اتروا کر صندوق میں بند کر دیئے تھے اور اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ کسی کو نہ بتائے کہ وہ اصل میں پری تھی۔"

"کیوں ماما؟"

"اس لئے بیٹے کہ آدمی جن لوگوں میں رہتا ہو پھر انہی کی طرح کا بن کر رہنا چاہیے ورنہ اسے غیر سمجھا جاتا ہے اور کوئی اسے پسند نہیں کرتا۔"

"پھر کیا ہوا ماما؟"

"پھر ایک روز وہ اپنی ہم جولیوں کے ساتھ سکول سے لوٹ رہی تھی کہ راستے میں ایک جگہ مداری کا تماشا ہو رہا تھا - وہ تماشا دیکھنے کے لئے رک گئی۔ اس نے مداری کے کرتب پہلے بھی دیکھے تھے' لیکن آج

اورنگ زیب قاسمی

اس نے یہاں ایک ایسے لڑکے کو دیکھا جس نے مداری کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ جونہی مداری ایک کے دو اور دو کے چار روپے بناتا' ایک گلاس کا پانی دوسرے گلاس میں انڈیل کر اس کا رنگ تبدیل کرتا یا کسی کی جیب سے غائب کی ہوئی انگوٹھی برآمد کرنے لگتا' اس لڑکے کو مداری کی چالاکی کا فوراً علم ہو جاتا اور لوگ مداری کی بجائے اسے داد دینے لگتے۔ وہ مداری سے ٹھٹھا کرتے اور کہتے - "یہ لڑکا تو مداری کا بھی باپ ہے۔" مداری شرمندہ سا ہو کر جواب دیتا "آپ سب میرے مائی باپ ہیں۔ اسے یہ ذہین لڑکا بہت دلچسپ اور اچھا لگا۔"

وہ جیسے دم لینے کو رک گئی۔ ارم کو پتا نہیں کیا جلدی تھی' بولی: "پھر ماما؟"

"آپا خود بول رہی ہیں" ٹوٹو کہاں چوکنے والا تھا۔

"پھر بچو -- وہ بڑی ہو گئی۔"

"آپا جتنی؟" بونی نے پوچھا۔

"بیچ میں مت بولو" ارم نے ڈانٹا - شاید وہ نہیں چاہتی تھی کسی کو پری کی صحیح عمر کا پتا چلے۔

"ہاں تمہاری آپا جتنی -- یا شاید اس سے کچھ بڑی۔"

اور جیسے ماں نے اس کا کوئی اہم راز ظاہر کر دیا ہو ارم کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے پائنتی پر پڑی چادر اپنے اوپر کھینچ لی اور بولی: "ماما ٹوٹو مجھے ٹانگیں مار رہا ہے۔"

"نہیں کرو ٹوٹو آرام سے لیٹو" اس نے کہا۔ پھر کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی: "پھر وہ اور بڑی ہو گئی اور کالج میں داخل ہو گئی اور اسے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ ذہین لڑکا بھی اسی کالج میں پڑھتا تھا۔ اس کا نام سحاب تھا اور وہ کالج کا بہترین اتھلیٹ' ڈیبیٹر اور شاعر تھا۔ کالج کے فنکشنز اس کے بغیر ادھورے رہتے۔ وہ ڈراموں میں بھی حصہ لیتا اور گٹار بجا سکتا تھا اور مشکل سے مشکل پہیلیاں اور حسابی سوال پلک جھپکتے میں حل کر سکتا تھا۔ استاد اس پر فخر اور اس کے ساتھی لڑکے اس پر رشک کرتے۔ یوں سمجھو بچو -- جیسے کالے طوطوں میں ایک راہ طوطا ہو ایسے ہی وہ اپنے ساتھیوں اور ہم جماعتوں میں سب سے زیادہ ذہین تھا۔ ہر امتحان میں اس کی پوزیشن آتی' اخبار میں تصویریں چھپتیں اور ریڈیو اور ٹی وی پر اس کے انٹرویو دکھائے جاتے۔ پھر پتا نہیں اسے کیسے پتا چل گیا اس کے کالج میں ایک ایسی لڑکی پڑھتی ہے جو اصل میں پری ہے۔ اس نے اسے مخاطب کر کے کتنی ہی نظمیں غزلیں لکھیں جنہیں پڑھ کر وہ اس کی اور بھی گرویدہ ہو گئی اور وہ دونوں کالج کے باہر بھی ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ وہ بہت اچھی باتیں کرتا تھا۔ اس کا جی چاہتا وہ اس کی باتیں سنتی رہے لیکن کالج کا زمانہ پلک جھپکتے بیت گیا اور وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ کچھ عرصہ وہ اسے خط لکھتا اور فون کرتا رہا' لیکن پھر وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے بیرون ملک چلا گیا اور وہ اپنے گھر میں اکیلی رہ گئی۔ اس کے ابا نے دوسری شادی کر لی تھی" لیکن وہ اس کی نئی امی کو گھر نہیں لائے تھے۔ ہاں' اسے ملوانے کے لئے کبھی کبھار اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ وہ اداس رہنے لگی' اس کا جی چاہتا اڑ کر سحاب کے پاس پہنچ جائے' مگر وہ سات سمندر پار چلا گیا تھا اور شاید بہت مصروف ہو گیا تھا کہ خط تک نہیں لکھ پاتا تھا۔ آخر اس نے کسی طرح اس صندوق کی چابی تلاش کر لی جس میں اس کے ابا نے اس کا رخت چھپا دیا تھا۔ اس طرح وہ راتوں کو چوری چھپے اڑ کر سات سمندر پار اس کے پاس جانے لگی۔ دونوں رات رات بھر خوبصورت اور روشن سڑکوں پارکوں میں ایک ساتھ ٹہلتے اور باتیں کرتے' مگر صبح ہونے سے پہلے وہ واپس اپنے گھر پہنچ

جاتی۔ اس دوران میں اس کے کتنے ہی اچھے اچھے رشتے آئے مگر اسے سحاب کا انتظار تھا۔ اس کے ابا کا خیال تھا اس نے پردیس میں شادی کر لی تھی اور تعلیم کے بعد وہیں ملازمت بھی اختیار کر لی تھی' اس لئے اس کا انتظار بیکار تھا' مگر وہ ایک روز بچ مچ واپس آگیا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ وہ نہ صرف لوٹ آیا تھا بلکہ اکیلا ہی آیا تھا۔ اس کے پاس بہت سی ڈگریاں تھیں اور اس کی زبان میں بلا کی مٹھاس تھی۔ اسے بہت جلد ایک عمدہ سی ملازمت مل گئی۔ پھر ان دونوں کی شادی ہو گئی اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔"

"بس ماما؟"

ارے نہیں ۔۔ اصل کہانی تو اب شروع ہوئی ہے۔ وہ دلہن بن کر خوش خوش اس کے گھر آئی۔ وہ اسے لڑکپن سے جانتی تھی' لیکن اسے لگا وہ اسے پہلی بار مل رہی ہے۔ اس میں اور بہت سی خوبیاں تھیں' جن کا اس سے پہلے اسے بالکل علم نہیں تھا۔ پتا نہیں اس نے یہ سب کچھ کہاں سے سیکھا تھا۔ اسے مردوں کے ہی نہیں عورتوں کے بھی کام کرنا بھی آتے تھے کھانا پکانا' سینا پرونا اور سویٹر بننا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر' مشکل مشکل کتابیں پڑھ کر اور بھانت بھانت کے لوگوں سے مل کر اس نے اور بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ وہ دنیا کا ہر کام کر سکتا اور ہر موضوع پر گفتگو کر سکتا تھا۔ وہ چکھے بغیر کھانے کا ذائقہ بتا سکتا' مڑ کر دیکھے بغیر اپنے عقب کی چیزیں دیکھ لیتا' اندھیرے میں اور آنکھیں بند کر کے کتاب پڑھ لیتا' جہاں موجود نہ ہوتا وہاں کا احوال جان لیتا اور جیسے اس کے اندر طاقتور راڈار اور انٹینے لگے ہوئے ہوں' دور دور کی چیزیں اور منظر دیکھ لیتا ان کی اور محض سوچی ہوئی باتیں سن لیتا' مستقبل قریب اور بعید میں پیش آنے والے واقعات کے ٹھیک ٹھیک اندازے لگا لیتا' دوسروں کی کمزوریوں' عیبوں اور کوتاہیوں کا اسے خود بخود علم ہو جاتا۔ یوں لگتا جیسے اس کے سر میں دماغ کی بجائے کمپیوٹر نصب ہو۔ سکول اور کالج کے بعد اب گھر اور دفتر میں بھی اس کی ذہانت اور قابلیت کی دھاک بیٹھ گئی۔ محفلوں میں اس کا طوطی بولنے لگا۔ اوسط ذہانت کے آدمی اس کے سامنے پانی بھرنے لگے۔ وہ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا تھا۔ اس کے سینئیرز ہر معاملے میں اس سے مشورہ کرنا اور ماتحت ہدایات لینا ضروری سمجھتے۔ اس کی ساری حسات اتنی تیز اور بیدار رہتیں کہ وہ خطرے کی بو بہت دور سے سونگھ لیتا اور ہوا کا رخ پہچان لیتا۔ اس نے اپنے حاسدوں اور مخالفین کو ایسے ایسے چکروں میں پھنسایا کہ وہ چکرا کر رہ گئے۔ اس کے دوست اور سینئیرز بھی اس سے ڈرنے لگے اور وہ جلد جلد ترقی پاتا ہوا ایک اتنے اونچے عہدے پر فائز ہو گیا کہ اسے اپنے اردگرد کے لوگ بونے نظر آنے لگے۔ اسے کسی کا کوئی کام پسند نہ آتا' کسی کھانے میں لذت محسوس نہ ہوتی اور کسی کی کوئی بات اچھی نہ لگتی۔ اس کے چیزوں' ذائقوں باتوں اور کاموں کے معیاروں پر کوئی بھی پورا نہ اترتا۔ تب اسے اندازہ ہونے لگا کہ اس کا شوہر آدمی نہیں' جن تھا یا پھر جادو سیکھ چکا تھا اور جن اور دیو اس کے قبضے میں تھے۔ وہ جس سے ناراض ہوتا یا جس کی کوئی بات یا کام اسے پسند نہ آتا اس کی جون بدل ڈالتا۔ ایک ایک کر کے کچھ ہی عرصے میں اس نے آس پاس کے بہت سے لوگوں کو چیونٹیوں کوتروں کالے طوطوں اور مکھیوں میں تبدیل کر دیا۔ لوگ اس سے ڈرنے اور کترانے لگے۔۔ ماتحتوں اور ملازموں کی اسے دیکھ کر گھگھی بندھ جاتی۔"

"اور وہ پری' ماما ۔ اس کی بیوی؟"

"ہاں وہ پری ۔۔ وہ جادوگروں' جنوں اور دیووں کو پسند نہ کرتی تھی۔ وہ تو کوہ قاف سے اس بستی میں

انسانوں کی معصومیت سادگی اور محبت کے قصے سن کر آئی تھی' اس لئے اس نے اس کے پر توڑ ڈالے اور اسے فاختہ بنا کر سونے کے پنجرے میں بند کر دیا۔"

"وہ کیوں ماما؟"

"تاکہ وہ اسے چھوڑ کر نہ جا سکے۔ حالانکہ وہ اسے قید نہ کرتا تب بھی وہ کہیں نہ جا سکتی تھی کیونکہ جادوگر کے گھر میں اس کے بچے بھی رہتے تھے۔"

"ماما ۔۔ یہ دونوں تو سو گئے ۔"

"ارے ۔۔ ہاں!"

"اچھا ماما ۔۔ پھر کیا ہوا؟"

"پھر ایک دن ۔۔"

اچانک وہ چونک پڑی ۔ گاڑی کا ہارن سنائی دے رہا تھا پھر کوٹھی کے پھاٹک کے کھلنے اور ملازموں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے گراؤنڈ فلور پر بھونچال آگیا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور بولی ۔ شاید تمہارے پاپا آگئے ارم ۔۔ وٹ اے سرپرائز؟"

ارم نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور بولی ۔ "یس ماما ۔۔ پاپا ہی ہیں۔"

وہ چپل سنبھال کر باہر دوڑی ۔ پھر دروازے میں رک کر پھولی ہوئی سانس پر قابو پاتے ہوئے بولی ۔ تم باری باری ان دونوں کو اٹھا کر ان کے کمرے میں پہنچا دو ۔۔ بستر اور ساری چیزیں سمیٹ کر کے کمرہ خالی کر دو ۔ ہری اپ پلیز۔"

اور وہ تیز تیز چلتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی۔ کہانی پھر ادھوری رہ گئی تھی۔

("علامت" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

لینڈلیڈی

پھر ایک بار میں لمبے وقفے کے بعد وطن لوٹا تھا۔ میرے عزیز مجھے رواج کے مطابق گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے آباؤاجداد کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے لئے لے کر گئے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ قبرستان کے گرد چار دیواری بنا دی گئی اور لوہے کا گیٹ لگا ہوا تھا۔ پرانی قبریں جنہیں میں پہلے وقتوں سے جانتا تھا' بدستور کچی تھیں۔ مگر نئی قبریں پکی بنی ہوئی تھیں اور ان پر سنگ مرمر کے کتبے لگے ہوئے تھے۔ قبروں کی قطاروں کے درمیان پھول دار پودوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں اور قبرستان کا ماحول بے حد خوش گوار لگ رہا تھا' جس میں قبرستانوں والی سوگواری نام کو بھی نہ تھی۔ پہلے وقتوں میں کیکر کے پیڑوں اور جنگلی جھاڑیوں کے سبب قبرستان بالکل اجاڑ لگتا تھا جس میں انسان دن کے وقت بھی داخل ہونے سے ڈرتا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں قبرستان کا کوئی چوکیدار نہ تھا اس وجہ سے پرانی قبریں اکثر ٹوٹ پھوٹ کر ڈھے جاتی تھیں اور بہت بھیانک صورت اختیار کر لیتی تھیں۔ اب کے میں نے دیکھا کہ ایسی کوئی گری ہوئی قبر نظر نہ آ رہی تھیں۔ پورے رقبے پر مٹی ڈال کر زمین کو برابر کر دیا گیا تھا۔ قبرستان میں یہ خوشگوار تبدیلی دیکھ کر مجھے بے حد حیرت اور مسرت ہوئی مگر مجھے اس وقت تک پتہ نہ تھا کہ گاؤں میں اس سے بڑھ کر حیران کن تبدیلیاں میری راہ تک رہی تھیں۔

سب سے پہلی چیز جو میں نے نوٹ کی' وہ یہ تھی کہ گاؤں میں بجلی آ گئی تھی اور اکثر مکانوں کے اوپر لگے ہوئے اینٹینے اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ گھروں میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو لگے ہوئے تھے میرے بچپن کے دنوں میں گاؤں میں بجلی نہ آئی تھی اور ٹیلی ویژن تو اس زمانے میں ابھی ہمارے ملک میں پہنچا ہی نہ تھا۔ شہروں میں لوگوں کے گھروں میں اکا دکا ریڈیو سیٹ ہوا کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں پہلا ٹرانسسٹر میرے ایک چچا' جو سیلانی آدمی تھے' یورپ کے کسی سفر سے ساتھ لائے تھے مگر وہ ابھی بہت ابتدائی صورت میں تھا۔ ریڈیو سگنل تک رسائی کی خاطر انہوں نے حویلی کے عین درمیان اگے ہوئے کیکر کی چوٹی پر اینٹینا لگایا تھا۔ پھر بھی دن کے وقت کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ صرف رات کے وقت بہت توجہ سے سننے سے انسان بے حد مدھم آواز میں ریڈیو نشریات سن سکتا تھا۔

دوسری چیز جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ گاؤں کی گلیوں کو اینٹوں سے پختہ کر دیا گیا تھا اور جگہ جگہ پر اسٹریٹ لائٹ کے بلب لگے ہوئے تھے۔ ہمارے خاندان کی حویلیاں اور مکانات تو خیر ہمیشہ سے پکے تھے' میں نے دیکھا کہ دوسرے مکانات جو پہلے وقتوں میں چھپروں اور گارے سے بنے ہوئے تھے' بھی پختہ بن چکے تھے مجھے بتایا گیا کہ یہ تو کچھ بھی نہ تھا مجھے گاؤں کے گردونواح میں بن جانے والے بنگلوں کو دیکھنے کے لئے جانا چاہیے

اورنگ زیب قاسمی

جن کے نقشے یورپ سے بن کر آئے تھے۔ ان کے بنوانے والے ہمارے گاؤں کے وہ باسی تھے' جو یورپ میں مقیم ہیں مگر گاؤں سے اپنی وابستگی کو زندہ رکھنے کے لئے وہاں پر مکان ضرور تعمیر کرواتے ہیں۔

مولوی سعید ہمارے گاؤں کا پہلا شخص تھا' جو نوکری کرنے کی خاطر انگلستان گیا تھا' اس کا باپ مسجد کا امام الصلوٰۃ تھا اور اس نے اپنے بیٹے کو بھی اسی پیشے کے لئے تیار کیا تھا۔ اس نے خود اسے قرآن پڑھایا تھا اور نماز روزہ کے احکام سکھائے تھے اور دوسری ساری باتیں بتائی تھیں جن کا جاننا ایک مولوی کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے چوکور رومال تو خیر اس کے کندھے پر ہمیشہ سے ہوا کرتا تھا۔ داڑھی نکل آنے پر وہ ہیچ مچ کا مولوی لگنے لگا تھا باپ نے چھوٹے بچوں کو بغدادی قاعدہ پڑھانے کا کام اس کے سپرد کر دیا اس طرح وہ نہ صرف باپ کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ بلکہ دھیرے دھیرے اس کی جانشینی کے لئے تیار ہو رہا تھا ان کی مسجد سڑک کے کنارے پر واقع تھی اور سڑک پر سے گزرنے والے اونٹوں اور خچروں کے کارواں جو اس زمانے میں مال برداری کا کام کرتے تھے مسجد کے کنویں سے پانی بھرنے کے لئے رکا کرتے تھے بعض اوقات کوئی اکا دکا مسافر رستے میں رات پڑ جانے پر مسجد میں ٹھہر جایا کرتا تھا۔ اس کے لئے خورد و نوش کا سامان گاؤں کے گھروں سے جا کر لانے کا کام مولوی سعید کے سپرد تھا۔ خود اس کے خاندان کی روٹی بھی گاؤں کے باسیوں کے ذمے تھی' اگرچہ اس کے باپ نے آہستہ آہستہ تھوڑی بہت زمین خرید لی تھی اور کھیتی باڑی بھی کرنے لگا تھا اس طرح کچھ زائد آمدنی پیدا ہونے لگی تھی' مگر مولوی سعید اس بات سے مطمئن نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مستقل آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ نکل آئے۔ چنانچہ اس نے سڑک کے کنارے مسجد کے ساتھ ایک کوٹھڑی بنا کر اس میں چائے خانہ کھول دیا۔ شہر تک سواریاں پہنچانے والی موٹر وہیں پر آن کر رکنے لگی اور تانگوں کا اڈا بھی اسی جگہ پر بن گیا۔ چائے خانے کے باہر دو چارپائیاں اور دو تین کرسیاں پڑی رہتی تھیں اور چلم اور حقہ ہر وقت موجود رہتے تھے۔ آنے جانے والے لوگ بھر کے لئے رک کر ایک آدھ سوٹا لے لیا کرتے تھے انہی میں سے کسی نے مولوی سعید کو انگلستان کے بارے میں بتایا تھا جہاں پر دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں اور مزدوروں کی بے حد مانگ تھی۔ اور پھر ایک روز چپکے سے مولوی سعید چلا گیا تھا۔ ایک عرصے تک کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں پر ہوتا تھا اور کیا کرتا تھا۔ چائے خانے کا کام اس کے چھوٹے بھائی نے سنبھال لیا تھا اور وہی باپ کا ہاتھ مسجد کے کاموں میں بٹانے لگا تھا اس طرح پانچ برس گزر گئے۔ اس دوران میں اس کا باپ مر گیا۔

پھر ایک روز اچانک مولوی سعید واپس لوٹ آیا۔ پتہ چلا کہ وہ بلیک برن کے کوئلے کی کانوں میں مزدوری کرتا رہا تھا۔ مگر اس کے جلد دولت مند بن جانے والے سارے خواب ٹوٹ گئے تھے پاکستان کے حساب سے وہ وہاں پر خوب پیسے کماتا رہا تھا مگر خرچ وہاں پر انگلستان کے حساب سے کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے جب وہ واپس لوٹا تو اس کے پلے کوئی دولت نہ تھی۔ جب وہ موڈ میں ہوتا تھا۔ تو انگریز میموں کے قصے سنایا کرتا تھا۔ جو دیسی لوگوں کو بہت پسند کرتی تھیں اگر وہ چاہتا تو شادی بھی کر سکتا تھا۔ دو تین میموں نے اس کا بہت پیچھا کیا تھا۔ مگر وہ اسے قابو میں نہ کر سکی تھیں۔ پھر دھیمی آواز میں جیسے اسے خطرہ ہو کہ کہیں اس کا مرحوم باپ اس کی بات کو سن نہ لے وہ اپنی فتوحات کے قصے سنایا کرتا تھا اس کی وجہ سے مولوی سعید کا چائے خانہ گاؤں کے بے فکروں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ اس کی باتیں سن سن کر ہر جوان آدمی کے دل میں اس جنت ارضی میں جانے کی خواہش پیدا ہونے لگی۔ وہ لوگ مولوی سعید سے سنے ہوئے قصوں کی صداقت کے اس درجہ قائل ہو چکے

تھے کہ اپنے بڑے بزرگوں کی بات پر کان دھرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ لالہ خان بہادر اور دوسرے بڑھے جو پہلی اور دوسری عالمی گیر جنگوں میں حصہ لے چکے تھے اور یورپ میں گھوم پھر آئے تھے۔ مولوی سعید کی باتوں کے سحر کو توڑنے میں ناکام رہے۔

اس زمانے میں ہمارے گاؤں کے کچھ لڑکے نیوی میں ملازم تھے۔ ان کے جہاز گاہے بگاہے مرمت کی خاطر یا ٹریننگ کے پروگراموں کے سلسلے میں انگلستان جاتے رہتے تھے۔ ایک روز خبر آئی کہ ایک جہاز کا سارا عملہ لیور پول میں اپنے جہاز کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ انہوں نے قرب وجوار کے شہروں میں رہائش اور ملازمت تلاش کر لی تھی اور وہیں پر رہ گئے تھے۔ ہمارے گاؤں کا ایک لڑکا بھی ان بھگوڑوں میں شامل تھا لمبے عرصے تک اس کا کوئی خط نہ آیا کیوں کہ اس بات کا خطرہ تھا کہ حکومت کو اس کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا تو پولیس اس کو گرفتار کر کے انگلستان سے واپس کر دے گی۔ مولوی سعید نے انگلستان میں اپنے واقف کاروں کے ساتھ مل کر گاؤں کے لڑکوں کو بھجوانے کا بندوبست کر لیا۔ پہلے پہل یہ سروس دوستی یاری میں ہوتی رہی۔ پھر باقاعدہ ایجنسی کی صورت اختیار کر گئی مولوی سعید کو آمدنی کا ایک نیا ذریعہ مل گیا اور گاؤں کے لڑکے بالے انگلستان میں جا کر مزدوری کرنے لگے۔

جب میں جرمنی میں اپنی تعلیم کی تکمیل پر چند ہفتوں کے لئے پاکستان آیا تو گاؤں میں رشتہ داروں نے میری بہت عزت دای کی باری باری سب گھروں میں دعوتیں دی گئیں۔ ماسٹر قربان جس کے ساتھ ہماری دور کی رشتہ داری تھی' آؤ بھگت کرنے میں سب سے آگے آگے تھا۔ وہ مجھ سے کرید کرید کر جرمنی کے حالات پوچھتا رہا آخر تان اس بات پر آن کر ٹوٹی کہ وہ مجھ سے جرمنی ساتھ لے جانے کا خواہشمند ہوا۔ مجھے پتہ تھا کہ اس کی اچھی بھلی زمینداری تھی۔ پھر ایک قریبی گاؤں کے مدرسہ میں وہ استاد تھا' جہاں سے اسے ماہوار آمدن ہو جاتی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ جس شخص کی گزر اوقات گھر بیٹھے اچھی خاصی ہو رہی ہو اسے بھلاسات سمندر پار جا کر مزدوری کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا اور بالآخر اس نے اپنی دانست میں سب سے اہم دلیل دی۔ اس نے کہا کہ گاؤں کے اتنے بہت سے لڑکے انگلستان میں جاکر دولت کما رہے تھے۔ ان کے ساتھ اس کی دوستی اور بھائی چارہ تھا۔ جب وہ لوگ کسی شادی بیاہ کے سلسلے میں گاؤں میں آتے تھے اور ناچ گانے کی محفل لگتی تھی تو اسے ایسے موقعوں پر بے حد شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی' کیوں کہ وہ اپنے ہاں کے دستور کے مطابق اپنے دوستوں کے نام پر ایک یا دو روپے کی بیل دیتا تھا' جب کہ اس کے انگلستانی دوست دس روپے کی بیل اس کے نام پر دیتے تھے۔ جب مراثی اس بات کا اعلان کرتا تھا' تو وہ شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتا تھا' کیونکہ اس کی مالی حیثیت ایسی نہ تھی کہ پوری رات ان کے مقابلے میں دس دس روپے کی بیلیں دے سکے۔ اس وجہ سے وہ چاہتا تھا' کہ جرمنی میں جاکر خوب پیسے کمائے اور جب اگلی بار اس کے انگلستانی دوست دس روپے کی بیلیں دیں' تو وہ بیس بیس روپے کی بیلیں دے کر ان سے بدلہ لے۔ مجھے اس کی بات پر بے حد ہنسی آئی اور میں نے کہا کہ یہ بھی خوب رہی کہ تم میراثیوں کو بیلیں دینے کے لئے جرمنی جانا چاہتے ہو۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس نے کہا کہ وہ گاؤں کا آخری آدمی نہیں ہونا چاہتا تھا' جسے یورپ جانا نصیب نہ ہو اور جس کی زندگی کو لہو کے بیل کی طرح گاؤں اور مدرسہ کا چکر لگاتے لگاتے تمام ہو۔ اس زمانے میں چونکہ انگلستان میں داخلہ پر پابندیاں لگ چکی تھیں' اس لئے وہ جرمنی جانا چاہتا تھا۔

میں جرمنی واپس لوٹا' تو اقوام متحدہ کی ایک ذیلی آرگنائیزیشن کی طرف سے میری مصر میں تقرری کا پروانہ آیا ہوا تھا' جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ جلد از جلد قاہرہ جا کر چارج لے لوں۔ میں نے ماسٹر قربان کو اس نئی صورت حال کی اطلاع دی اور لکھا کہ وہ جرمنی آنے کا پروگرام میری مصر سے واپسی تک ملتوی کر دے۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک ماہ کے اندر اندر ضروری انتظامات کرنے کے بعد مصر چلا جاؤں گا۔ میری روانگی سے عین ایک ہفتہ قبل ماسٹر قربان کا ٹیلیگرام آگیا جس میں اس کی ہمبرگ میں آمد کا وقت اور فلائیٹ نمبر درج تھا۔ اب صرف ایک دن کے اندر اندر مجھے اس کی رہائش کا انتظام کرنا تھا اور کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا تھا' جو میری نیابت میں ماسٹر قربان کو رہائش کا پرمٹ دلوا سکے اور کام کا بندوبست کر سکے۔ میں نے اپنی پریشانی کا ذکر اپنی سیکرٹری سے کیا' جو ایک پادری کی بیوی تھی اور جس کے بارے میں مجھے پتہ تھا کہ وہ غیر ملکیوں کی امداد و معاونت کرنے میں بہت مستعد تھی۔ سیکرٹری نے کہا کہ اس کے خاوند کے چرچ کے ساتھ' جہاں پر ان کی اپنی رہائش بھی تھی' ایک بلڈنگ میں کمرہ خالی تھا' جس میں ماسٹر قربان کو ٹھہرایا جاسکتا تھا۔ ان کے تعلقات فارن پولیس کے محکمہ کے ساتھ اچھے تھے اور انہیں یقین تھا کہ وہ اسے رہائش اور کام کا پرمٹ لے کر دے سکیں گے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں اسی ہفتے مصر کے لئے پرواز کر گیا' جہاں پر میری زندگی اس درجہ مصروف تھی' کہ خط و کتابت کے لئے بھی وقت نکالنا مشکل تھا۔ اس طرح میرا رابطہ ماسٹر قربان کے ساتھ قائم نہ رہ سکا اور مجھے بالکل پتہ نہ چل سکا کہ اس کی زندگی جرمنی میں کیسے بسر ہو رہی تھی۔

نصف سال کے بعد جب میں مصر میں اپنے قیام کے خاتمے پر جرمنی واپس آیا' تو اس وقت تک ماسٹر قربان بدستور پادری کی فیملی کے ہاں مقیم تھا۔ اس کو کام مل گیا تھا اور اس نے ایک گرل فرینڈ بھی بنالی تھی۔ میری سیکرٹری نے بتایا کہ وہ اس کی سترہ سالہ بچی تھی' انہیں دونوں کی دوستی پر کوئی اعتراض نہ تھا' مگر وہ شادی کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ چونکہ دونوں کی عمروں میں بہت فرق تھا' اس لئے انہیں خطرہ تھا کہ یہ رشتہ پائیدار ثابت ہوگا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ماسٹر قربان سے اس سلسلے میں بات کروں۔ میں نے جب اس سے بات کرنا چاہی' تو وہ صاف انکار کر گیا کہ اس کا لڑکی کے ساتھ کوئی واسطہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ دراصل ماں باپ اپنی پاگل سی لڑکی کو اس کے سرمنڈھ دینا چاہتے تھے۔ پھر مجھے پتہ تھا کہ پیچھے گاؤں میں اس کی بیوی موجود تھی۔

چند ہفتوں کے بعد میری سیکرٹری نے بتایا کہ اس کی بچی حمل سے تھی' اس لئے انہوں نے اسے ماسٹر قربان سے شادی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ جرمنی میں تعدد ازدواج قانوناً" ممنوع ہے۔ اس وجہ سے ایک سرٹیفکیٹ کا پیش کیا جانا لازمی ہوتا ہے کہ شادی کا طالب پہلے سے متزوج نہیں ہے' یا اگر پہلے شادی شدہ تھا' تو اس دوران میں طلاق لے چکا ہے۔ مجھے پتہ نہیں ہے کہ ماسٹر قربان نے مطلوبہ سرٹیفکیٹ کیسے حاصل کیا تھا' جعلی بنایا تھا یا کسی طریق سے رشوت دے کر نکلوایا تھا۔ بہرصورت ان کی شادی ہو گئی' جس میں مجھے شامل ہونے کی دعوت نہ دی گئی۔ غالباً" ماسٹر قربان مجھ سے شرمندہ تھا اور پھر اسے خطرہ ہوگا کہ کہیں میں اس کا راز نہ فاش کر دوں۔ اس کے بعد ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا اور مجھے آئندہ سالوں میں کوئی پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں پر ہوتا تھا اور کیا کرتا تھا۔

قبرستان سے نکل کر ہم رستے کنویں کا پانی پینے کے بعد گاؤں کی گلی میں داخل ہوئے' جہاں پر پہلی حویلی

اورنگ زیب قاسمی

ماسٹر قربان کی پڑتی ہے۔ میں اس وقت اس کی بیوی پریشانی کے عالم میں ننگے سر دروازے سے باہر نکلی۔ اس نے ایک ٹیلی گرام ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور کسی انگریزی داں سے اسے پڑھوانا چاہتی تھی۔ مگر جس کسی کو اس نے ٹیلی گرام دکھایا تھا' وہ عبارت کو سمجھنے میں ناکام رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ عبارت جرمن زبان میں تھی۔ میں اسے پڑھ کر بھونچکارہ گیا' کیوں کہ اس میں ماسٹر قربان کی اچانک وفات پاجانے کی خبر تھی اور لکھا تھا کہ مارتھا خود اس کا جنازہ لے کر اگلے روز گاؤں میں پہنچ رہی تھی۔ یہ سنتے ہی ماسٹر قربان کی بیوی چیخ مار کر زمین پر بیٹھ گئی اور سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔

اس اچانک خبر کے سبب میرے گاؤں میں آنے کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ سارے رشتہ داروں اور واقف کاروں کو ماسٹر قربان کی بیوی کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ ہر کوئی مجھے خوش آمدید کے بول کہنے کے بعد جلد از جلد رخصت چاہتا تھا مجھے بھی یوں لگا' جیسے میری گاؤں میں آمد ایک منحوس لمحے میں ہوئی تھی اور یہ کہ میں نہ آتا تو شاید ماسٹر قربان نہ مرتا اور گاؤں کا امن و امان اس طرح نہ ٹوٹتا۔ مگر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے' تو میری وجہ سے ماسٹر قربان کی بیوی مبارک کو بیٹھے بٹھائے جرمن زبان کا مترجم مل گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مارتھا کو' جو نعش کے ہمراہ آرہی تھی' انگریزی نہ آتی تھی' اور گاؤں میں میرے سوا کوئی شخص موجود نہ تھا' جو اس سے جرمن زبان میں گفتگو کر سکتا۔

میرا قیاس درست نکلا۔ مارتھا کو صرف جرمن آتی تھی۔ اس نے جرمن ایئر لائنز لفتھانزا میں سفر نہ کیا ہوتا' تو اسے شاید گاؤں تک پہنچنے میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ مبارک نے بتایا کہ مارتھا ستر اسی برس کی بڑھیا تھی اور ماسٹر قربان کی لینڈ لیڈی تھی۔ اس نے اس کی بہت تعریفیں کیں' کیوں کہ وہ اس کا اور اس کے بچوں کا بہت خیال رکھتی تھی۔ جب بھی ماسٹر قربان سال دو سال کے بعد وطن آتا تھا' تو اس کے ہاتھ تحفے تحائف اور بچوں کے لئے کپڑے اور کھلونے بھیجا کرتی تھی۔ بلکہ وہی ماہوار ان کو منی آرڈر بھیجتی تھی۔ اس نے کہا کہ ایسی نیک عورت شاید سارے جرمنی میں کوئی اور نہ ہوگی۔ اب اسی بات کو دیکھ لیں کہ ماسٹر قربان کا جنازہ لے کر خود آرہی تھی' جب کہ اس عمر کی عورتیں تو ہمارے ملک میں چلنے پھرنے سے بھی لاچار ہو جاتی ہیں۔

جنازہ پہنچا تو میں نے دیکھا کہ مارتھا پینتیس چالیس برس کی عورت تھی' جو غالباً میری سابقہ سیکرٹری کی بیٹی اور ماسٹر قربان کی منکوحہ بیوی تھی۔ وہ مبارک سے گلے لگ کر بے حد روئی اور اس نے مجھے کہا کہ صرف مبارک اس کے غم کو پوری طرح سمجھ سکتی تھی' کیوں کہ وہ ماسٹر قربان کی بہن تھی' جسے اس کا مرحوم میاں بہت عزیز رکھتا تھا اور ساری عمر اس نے نوجوانی میں بیوہ ہو جانے والی بہن اور اس کے یتیم بچوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے رکھا تھا۔ وہ ان کی ایک ایک خواہش پوری کرتا تھا اور سال دو سال کے بعد ضرور گاؤں کا چکر لگاتا تھا' تاکہ ان کی دیکھ بھال میں کوئی کوتاہی نہ ہونے پائے۔

سارا گاؤں جنازے میں شریک ہوا۔ مولوی سعید سب سے آگے تھا۔ پتہ چلا کہ وہی قبرستان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ یورپ میں وفات پاجانے والوں کی لاشوں کو گاؤں میں واپس لانے کی ایجنسی بھی اس نے کھول رکھی تھی' اور وہی قبروں کو پختہ کرواتا تھا اور ان پر سنگ مرمر کے کتبے لگواتا تھا۔ اس نے ایک مالی کو ملازم رکھا ہوا تھا' جو پودوں کو لگاتا اور انہیں پانی دیتا تھا۔ فرمائش پر قبروں پر حجرے اور باقاعدہ مقبرے بنانے کا انتظام بھی

اورنگ زیب قاسمی

موجود تھا۔ یہ تھڑے پر یا دوسرے تہواروں پر قبروں کو پھولوں سے سجانے اور ان کو معطر پانی سے غسل دینے کا انتظام کیا جاسکتا تھا۔ ایک حافظ قرآن کی خدمات حاصل کرلی گئی تھیں' جو مخصوص دنوں میں قبروں پر تلاوت قرآن کرتا تھا۔

مارتھا ہفتہ بھر گاؤں میں ٹھہری رہی اور میں بطور مترجم کے اکثر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ اسے اس بات پر کسی قدر حیرت ضرور ہوئی کہ ماسٹر قربان کی بہن مبارک' جو جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی' اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے سال ایک بچہ جنتی رہی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ ہمارے رسوم و رواج کے بارے میں بہت زیادہ نہ جانتی تھی اور نہ ہی اپنے عیسائی اخلاقی اقدار کو ہم پر ٹھونسنا چاہتی تھی' کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں بیوہ عورتوں کا اپنے خاوندوں کے مر جانے کے بعد بچے جننا معیوب نہ سمجھا جاتا ہو۔ دوسری طرف مبارک کو جرمن عورتوں کی صحت مندی پر رشک آرہا تھا' جو ستر اسی برس کی عمر میں بالکل جوان لگتی تھیں' اس نے کہا کہ اگر اسے ماسٹر قربان نے نہ بتایا ہوتا کہ اس کی لینڈ لیڈی مارتھا اس قدر عمر رسیدہ عورت تھی' تو وہ ماننے کے لئے تیار نہ ہوتی کہ مارتھا کسی طریق سے بھی چالیس سے بڑی عمر کی تھی۔

("نیا دور" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

حاجی اللہ دتہ اچار والے

حاجی اللہ داد کو جاننے والے عموماً" حاجی اچار والے ہی کہتے تھے کسی کو ان کے بارے میں کچھ کہنا ہوتا تو وہ یہی نام لیتا تھا اللہ دتہ نہیں کہتا تھا حاجی صاحب کی عزت سارا شہر کرتا تھا ان کے گاہک دور دراز تک پھیلے ہوئے تھے لوگ کہا کرتے تھے جو مزا حاجی صاحب کے اچاروں میں ہے شہر کی کسی اور دوکاندار کے اچاروں میں نہیں ہے۔

یوں تو حاجی صاحب کی دوکان میں ہر قسم کے اچاروں کے مرتبان اور کنستر بھرے رہتے تھے مگر ان کا بنایا ہوا آم کا اچار سب سے زیادہ مقبول تھا اور اس کی مانگ کبھی ختم نہیں ہوتی تھی۔

آم کا اچار بنانے میں وہ ساری ہنر مندی صرف کر دیتے تھے آغاز کار سے لے کر اچار بننے تک وہ سارے مراحل بڑی احتیاط اور سوچ بوجھ سے کرتے تھے ان کا ایک شاگرد بھی تھا رشید جو ان کی دکان پر اس وقت آیا تھا جب اس کی عمر چھ سال سے زیادہ نہیں تھی اور اسے دوکان میں حاجی صاحب کا ہاتھ بٹاتے آٹھ سال گذر گئے تھے اسی دوران اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا اور بڑی خوش اسلوبی سے اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہا تھا۔

رشید ادھر ادھر کی بیشتر دوکانیں کھلنے سے پہلے ہی اپنی دکان پر آجاتا تھا دوکان کی صفائی کرتا تھا جھاڑ پونچھ سے فارغ ہونے کے بعد حاجی صاحب کے حقے کی طرف متوجہ ہوتا' اسے تازہ کرتا اور چلم بھرنے کے لئے حاجی صاحب کا انتظار کرنے لگتا۔

حاجی صاحب ناشتہ کرکے سیدھا دوکان کی طرف آتے تھے اس وقت تک گاہک آنا شروع ہو جاتے تھے حاجی صاحب کو دیکھتے ہی رشید چلم بھر کر حقے پر رکھ دیتا تھا اور گاہکوں سے نپٹنے لگتا تھا۔

حاجی صاحب آتے ہی واقف کاروں کے سلام کا جواب مسکرا مسکرا کر دیتے تھے پھر دوکان کی دو سیڑھیاں چڑھ کر اپنی مخصوص پیڑھی پر بیٹھ جاتے تھے حقے کی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے اور کھلے ہوئے صندوقچے پر جس میں پیسے جمع ہوتے رہتے تھے ایک سرسری نظر ڈال کر حقے کے کش لینے لگتے تھے۔

رشید کو ساتھ ساتھ ہدایات بھی دیتے تھے تاکید بھی کرتے رہتے تھے کھلے دل سے اچار ترازو کے پلڑے میں ڈالا کرو زیادہ ہو تو کوئی بات نہیں سونے کی طرح مت تولو گاہک خوش جاتے تھے اور یہ گاہکوں کی خوشی حاجی صاحب کی خوشی ہوتی تھی۔

حاجی صاحب کی بیوی کو فوت ہوئے تیرہ برس بیت گئے تھے اولاد ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا بیٹی بڑی تھی

رحمت اس کا نام تھا حاجی صاحب نے اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی تھی اور رحمت اپنے گھر میں بڑی خوش تھی بدقسمتی یہ ہوئی کہ شادی کے چار سال بعد اس کا شوہر ٹریفک حادثے میں فوت ہوگیا اس وقت رحمت کی بیٹی کی عمر تین سال تھی۔

رحمت کا شوہر نہ صرف اپنے گھر کے اخراجات پورے کرتا تھا بلکہ اپنے ماں باپ کی بھی مدد کرتا تھا اس کے مرنے کے بعد دونوں گھروں کی ساری آمدنی ایک مکان کے کرایہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

حاجی صاحب نے جب یہ صورت حال دیکھی اپنی بیٹی اور اپنی نواسی کو اپنے گھر لے آئے دوکان کی خاصی آمدنی تھی گھر بھی خوشحال تھا حاجی صاحب کا بیٹا لڑکا غفور باپ کی امیدوں کے برعکس ثابت ہوا کام کاج سے اسے بہت کم دلچسپی تھی جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جا رہی تھی اس کی بری عادتوں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا چودہ سال کی عمر میں وہ گھر کا جمع جتھا اپنے سوٹ کیس میں ڈال کر بھاگ گیا حاجی صاحب کو اس کے آنے کی توقع تھی جو پوری نہ ہوئی اور اس سے ان کے ذہن پر کافی ناخوشگوار اثر پڑا کبھی کبھی وہ بہت مغموم بن جاتے تھے بولتے چالتے نہیں تھے غفور کہاں چلا گیا تھا حاجی صاحب کو اس کا کوئی علم نہیں تھا ایک سال بعد کسی نے انہیں بتایا کہ وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ امریکہ چلا گیا ہے حاجی صاحب کو امید تھی کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے باپ اور بہن کو بھولے گا نہیں مگر ان کی یہ توقع بھی پوری نہ ہوئی غفور نے گھر والوں سے کوئی تعلق بھی باقی نہ رکھا اور ایک ایسی لاتعلقی اختیار کر لی گویا اس کا اپنا کوئی گھر تھا ہی نہیں۔

حاجی صاحب پہلے حقے کے رسیا تھے بیٹے نے جو انتہائی افسوس ناک بلکہ سفاکانہ سلوک کیا تھا' اس کے بعد تو حقہ ان کے شب و روز کا ساتھی بن گیا تھا۔

وہ دمے کے مریض بن گئے تھے رحمت ان کی حقہ نوشی کی سخت خلاف تھی وہ سمجھتی تھی کہ اس کے باپ کی بیماری اسی بری عادت کے کارن ہوئی ہے چنانچہ باپ کی نظروں سے حقہ چھپاتی تھی مگر اس کا یہ طریق کار زیادہ کارگر ثابت نہ ہوا حاجی صاحب کی دوکان پر تو حقہ تیار ہی ہوتا گھر واپس آتے وقت وہ اسے گھر ساتھ ہی لے آتے تھے۔

حاجی صاحب جب کھانستے تھے تو کھانستے ہی چلے جاتے تھے رحمت ان کی یہ حالت دیکھ کر کڑھتی رہتی تھی مگر کیا کر سکتی تھی اور جب اس نے پوری طرح محسوس کرلیا تھا کہ اس کا باپ حقے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تو اس کی اپنی کوشش بھی دھیمی پڑ گئی یہاں تک کہ باپ کی بیزاری کی وجہ سے وہ صبح ناشتے تیار کرنے کے بجائے حقہ تازہ کرکے باورچی خانہ میں رکھ دیتی تھی کیونکہ پراٹھا اور چائے کا ناشتہ کرنے کے فوراً" ہی بعد حاجی صاحب کی نظریں حقہ تلاش کرنے میں بے تاب ہو جاتی تھیں۔

رات کے وقت رحمت باپ کی چارپائی کے ساتھ جگ پانی کا بھر کر رکھ دیتی تھی گلاس بھی وہیں رہتا تھا حاجی صاحب پر کبھی کبھی تو کھانسی کا دورہ اس شدت سے پڑتا تھا کہ وہ بے دم ہو کر رہ جاتے تھے ایسے میں رحمت فوراً" چارپائی سے اٹھ کر بجلی کا بلب روشن کرکے جگ سے گلاس بھر باپ کے ہونٹوں کی طرف بڑھا دیتی تھی۔

کھانسی حاجی صاحب کو خود گلاس پکڑنے کا موقع نہیں دیتی تھی رحمت ہی کو پانی ان کے ہونٹوں سے لگا کر بمشکل سے دو تین گھونٹ حلق سے اتارنے پڑتے تھے کھانسی کسی قدر تھم جاتی تھی بیٹی اپنے دوپٹے سے باپ

" تو علاج باقاعدہ ہونا چاہیے تا ہم ایسی بیماریوں کا گھر میں علاج نہیں ہوتا انہیں تو ہسپتال لے جانا چاہیے ہسپتال والے ڈاکٹر بڑے سیانے ہوتے ہیں خدانخواستہ ایسی ویسی بات ہوگی تو داخل کر لیں گے میں تو کہتی ہوں داخل ہی کرا دو اللہ نے چاہا تو بالکل ٹھیک ہو کر گھر آئیں گے میری شاہدہ کے ابا نے ہسپتال کے کئی کمروں کی مرمت کروائی ہے ڈاکٹروں سے ان کے تعلقات بڑے اچھے ہیں شام کو گھر آئیں گے تو ان سے بات کروں گی "

زینت چند منٹ اور بیٹھ کر حاجی صاحب کو ہسپتال میں لے جانے کا اصرار کر کے چلی گئی شام کے بعد وہ پھر آگئی حاجی صاحب بھی گھر میں موجود تھے۔

" السلام علیکم حاجی صاحب میں دوپہر کو بھی آئی تھی " حاجی صاحب نے سلام کا جواب دے کر اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا " غفور کا کوئی خط پتر " حاجی صاحب زینت کے پہلے فقرے پر مایوس ہو گئے تھے اس سے زینت نے یہ دوسرا فقرہ کہہ دیا حاجی صاحب کے اندرونی زخم پر کوئی انگلی رکھ دیتا تھا تو ان میں بولنے کی کوئی سکت بھی باقی نہیں رہتی تھی۔ " اچھا اللہ کی مرضی حاجی جی میں نے شاہدہ کے ابا سے بات کی ہے آپ بڑے ہسپتال ضرور جائیں اللہ بہتری کرے گا " حاجی صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

" ڈاکٹر آپ کی چھاتی کا ٹیسٹ کر کے ٹھیک علاج کریں گے مہربانی "

زینت ذرا فکر مند ہوگئی اصل بات تو اس نے حاجی صاحب سے کہی ہی نہیں ہے۔

" حاجی جی ایسی مرض کا کیا ہے وہ ..... تپ دق ..... اس کا علاج ہسپتال میں ہی ٹھیک طرح ہوتا ہے۔ ڈاکٹر داخل کریں تو ضرور داخل ہو جائیں چند دن کی تو بات ہے اللہ مہربانی کرے گا میں ان کو تاکید کرتی ہوں کہ حاجی جی کا خاص خیال رکھے۔

حاجی صاحب نے حقے کو نہیں دیکھا تھا جو نجو ان کے پاس آہستہ سے رکھ کر چلی گئی تھی۔

حقے کو دیکھتے ہی ان کا ہاتھ بے اختیار ان کی طرف بڑھ گیا اور پہلا کش لیتے ہی اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا زینت خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی کیونکہ وہ حاجی صاحب کے اندر سے نکلنے والی تھوکوں کی زد میں آگئی تھی۔

" توبہ میری کیا برا حال ہوگیا ہے رحمت! خدا کے لئے انہیں جلدی لے جایئے خدانخواستہ مرض بڑھ جائے گا اور " زینت دروازے کی طرف جانے لگی ہاں اس نے یہ ضرور کیا کہ دوسرے دن صبح کو اس ڈاکٹر کا نام بتا گئی جس کے پاس حاجی صاحب کو علاج کے لئے جانا تھا۔

ہسپتال پہنچنے کا ایک مسئلہ پیدا ہوگیا رشید نے کہا حاجی جی دوکان پر بھائی کو بٹھا دیتا ہوں۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا حاجی صاحب کو یہ بات منظور نہیں تھی تاہم وہ رشید کے اصرار پر راضی ہوگئے اصل میں وہ دوکان کسی اور کے سپرد کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

وہ حقے کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے رشید رحمت اور نجو نے بڑی مشکل سے انہیں حقے سے منع کر کے تانگے میں بٹھا دیا سب سے پہلے پرچی بنوائی گئی رشید نے حاجی صاحب کی تکلیفیں لکھوانے کی کوشش کی مگر اس شخص نے صرف دمہ لکھ کر اور باقی نام اور پتہ وغیرہ کا اندراج کر دیا پرچی رشید کے حوالے کر دی۔

پرچی بنانے والے نے مطلوبہ ڈاکٹر کے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا تھا وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ دروازہ بند ہے ایک آدمی جو دروازے سے باہر کھڑا ہے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دروازے کے آگے

اورنگ زیب قاسمی

کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں اور پانی سے گیلی ٹھوڑی کو پونچھتی تھی وہ ان سے کچھ نہیں کہتی تھی مگر باپ سمجھ لیتا تھا کہ اس کی بیٹی کیا کہنا چاہتی ہے۔

" کھانسی نے مار ڈالا ہے " خود بھی ہاتھ سے گردن تک پھیلے ہوئے پانی کو پونچھتے۔

" ابا جی " اتنا کہتے ہی اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

" نہیں بیوں کا پھینک دوائے توڑ ڈالو اسے ۔ " وہ ہاتھ بڑھا کر حقے کو پھینکنے کی کوشش کرتے تھے رحمت جلدی سے حقے کو اٹھا لیتی تھی " نہ ابا جی نہ " وہ خوب جانتی تھی کہ اس کے ابا جی کا ہاتھ اول تو حقے تک پہنچے گا ہی نہیں اور پہنچے گا بھی تو وہ صرف چھو کر رہ جائے گا حاجی صاحب کلیے ایک محض وقتی جذبہ ہوتا صبح جاگتے ہی ان کے حقے سے محبت جاگ اٹھتی تھی۔

حاجی صاحب کے دمے نے کئی بیماریوں کو جنم دیا تھا کھانستے کھانستے بے ہوش ہو جاتے تھے ان کی غذا کم ہوگئی تھی چلتے وقت ٹانگیں لڑکھڑانے لگی تھیں سر ہر وقت بھاری رہتا تھا بلغم چھاتی میں رک جاتا تھا تو ان پر قیامت گذر جاتی تھی اب حاجی صاحب دوکان پر دن میں ایک بار ضرور جاتے تھے مگر ڈیڑھ دو گھنٹے سے زیادہ وہ وہاں بیٹھ نہیں سکتے تھے رشید گاہکوں کے ساتھ نمٹنے میں مصروف رہتا تھا اور وہ اپنے کسی پرانے دوست سے باتیں کرتے رہتے تھے جو ادھار لینے وہاں آجاتا تھا۔

دوست اپنی طرف سے گہری ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا۔

" حاجی صاحب اولاد ماں باپ کا خیال رکھنے والی ہو ورنہ نہ ہو "

حاجی صاحب یہ فقرہ سن کر منہ سے ایک لفظ تک نہ کہتے ایک لمحے کے لئے اوپر چھت کو دیکھتے آہ بھرتے اور پھر سر جھکا کر انگلیوں سے آنکھیں صاف کرنے لگتے تھے یا داڑھی میں پھیرنے لگتے تھے۔

رات کے وقت حاجی صاحب کی کھوں کھوں سے ہمسایوں کی نیند میں خلل پڑتا تھا چنانچہ جب ایک دوپہر حاجی صاحب دوکان پر چلے گئے تھے اور رحمت اپنی بیٹی نجو کے ساتھ گھر کے کاموں میں مصروف تھی کہ ٹھیکیدار امجد علی کی بیوی زینت آئی قیمتی لباس میں ملبوس دونوں ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں۔

رحمت اسے آتے دیکھ کر حیران رہ گئی کیونکہ زینت ایک لمبی مدت کے بعد آئی تھی۔

آیئے زینت بہن! بیٹھیے۔

زینت گھر کی واحد کرسی میں بیٹھ گئی۔

" حاجی صاحب کہاں ہیں رحمت بہن! " زینت نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

" وہ تھوڑی دیر کے لئے دوکان پر چلے جاتے ہیں۔"

زینت کے چہرے پر مصنوعی غم کے اثرات چھا گئے۔

" ہائے میرے اللہ ۔ بیمار ہیں کیوں جاتے ہیں دوکان پر ۔"

" کوئی کام نہیں کرتے آپ کو بتایا ہے نا ابا جی نے اس دکان سے کتنی محنت کی ہے دوکان میں تو ان کی جان ہے "

" وہ تو ٹھیک ہے لیکن حاجی صاحب بوڑھے ہیں بیمار بیمار بھی رہتے ہیں کیا تکلیف ہے انہیں ۔"

" ایک بیماری ہو تو بتاؤں دمے نے تو ابا جی کا برا حال کر دیا ہے "

کھڑے ہوئے لوگوں میں سے کسی ایک کو اندر جانے کی اجازت دے دیتا ہے باقی کھڑے رہتے ہیں یا ایک طرف ہو کر دیوار کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں۔
وہ ساڑھے آٹھ بجے وہاں پہنچے تھے اور اب بارہ بج گئے تھے اور ابھی تک دروازہ کے گرد پھیلے ہوئے لوگوں میں سے کوئی نمایاں کمی نہیں آئی تھی۔
دروازے والے آدمی نے ہجوم سے مخاطب ہو کر کہا آپ لوگ جائیے کل صبح سویرے آیئے۔
پہلا تجربہ ناکام رہا۔ حاجی صاحب کو بے کار کھڑا رہنے سے تکلیف اس وجہ سے ہوئی کہ کئی گھنٹے وہ حقے سے محروم رہے دوسرے روز بھی یہی واقعہ ہوا تیسرے روز حاجی صاحب دروازے کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے انہوں نے سلام کے بعد زینت کی ہدایت کے مطابق اپنی طرف سے بڑے ادب سے کہا " جی ٹھیکیدار امجد علی نے بھیجا ہے۔"
ڈاکٹر نے اپنے سر کو ذرا سی جنبش دی حاجی صاحب کو سٹول پر بیٹھنے کے لئے کہا پرچی پر ایک نظر ڈالی سٹیتھسکوپ سے ان کی چھاتی اور پیٹھ کو پرکھا اور بولے " غفلت برتی ہے بابا بیماری کا ٹھیک علاج ہونا چاہیے ؟ ڈسپنسری سے دوا لے لو' دو دن بعد آنا " اور اس کے جاتے ہی ڈاکٹر کی انگلی نے میز پر پڑی گھنٹی کو دبا دیا۔ دروازہ کھلا اور ایک نیا مریض اندر آنے لگا۔ ہسپتال کی ڈسپنسری کے سامنے کم و بیش اتنا ہی ہجوم تھا جتنا ڈاکٹر کے دروازے کے سامنے حاجی صاحب دیکھ چکے تھے۔ کافی دیر بعد ان کی باری آئی تو ڈسپنسر نے رشید کے ہاتھ میں ایک چھوٹے سے لفافے کے اندر چند پڑیاں ڈال کر تھمائیں اور ساتھ ہی کہہ دیا شربت بازار سے خریدیں " جب دونوں گھر پہنچے تو تھکاوٹ اور انتظار کی کوفت سے حاجی صاحب کا برا حال تھا۔
رشید تو پڑیاں اور شربت کی بوتل رحمت کو دے کر چلا گیا اور حاجی صاحب چارپائی کے اوپر نیم بے ہوشی سے پڑے رہے دوسرے روز صبح ہی صبح رشید آگیا۔
" آپا! دوا دی ؟ " اس نے رحمت سے پوچھا۔
" ہاں دی " رحمت نے بیزاری سے کہا۔
" آپا! میں نے تہیہ کر لیا ہے یہ ڈاکٹر جو ہے ناہسپتال میں مریضوں کو بس یونہی دیکھتا ہے ۔ جو مریض اس کے اپنے کلینک میں جاتے ہیں ان کا باقاعدہ علاج کرتا ہے ۔ ہم بھی یہی کرتے ہیں آپا!"
رحمت نے اثبات میں سر ہلایا۔
" نہیں' نہیں میں اور دھکے نہیں کھاؤں گا " حاجی صاحب بول اٹھے۔
" وہاں ایسا نہیں ہوگا حاجی جی! میں نے ڈاکٹر کی کوٹھی کا پتہ معلوم کر لیا ہے۔ شام کو پانچ بجے "
حاجی صاحب نفی میں سر ہلاتے رہے۔ رحمت نے اشارے سے رشید سے کچھ کہا اور وہ خاموش ہو گیا۔
تین دن بعد رشید حاجی صاحب کو کینال پارک میں ڈاکٹر کی شاندار کوٹھی کے اندر اس کمرے میں لے گیا جہاں مریضوں کی کافی تعداد ڈاکٹر کا انتظار کر رہی تھی۔
سارے مریضوں کے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر نے حاجی صاحب کو اندر بلایا۔
ڈاکٹر نے حاجی صاحب کو پہچان لیا تھا۔ ملائمت سے انہیں کرسی میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ ان کی چھاتی اور کمر ٹھوک بجا کر دیکھی اور ایک کاغذ پر چند لمحے کچھ لکھتا رہا پھر رشید سے مخاطب ہو کر بولا۔

اورنگ زیب قاسمی

" کل صبح نو بجے یہ سارے ٹسٹ ہوں گے شام کو انہیں میرے پاس لے آنا۔"
رشید نے ڈاکٹر کی فیس سو سو کے دو نوٹوں کی صورت میں رکھ دی۔
" ٹسٹ ضرور ہوں گے۔ کوٹھی کے باہر لیبارٹریز ہیں سمجھ لیا نو بجے ٹسٹ شروع ہو جاتے ہیں۔"
رشید نے بہت اچھا جی کہا اور حاجی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آیا۔
دوسرے روز ابھی پورے ٹسٹ نہیں ہوئے تھے کہ حاجی صاحب نے وہاں مزید ٹھہرنے سے انکار کر دیا۔ رشید نے بتیرا سمجھایا وہ نہ مانے وہاں رحمت اور نجو بھی تھیں۔ انہوں نے بھی زور لگایا۔
" نہیں .... گھر چلو .... میں نہیں رکوں گا۔"
حاجی صاحب دیکھ رہے تھے کہ قدم قدم پر رحمت اپنا پرس کھول کر نوٹ نکالتی ہے اور رشید کے حوالے کر دیتی ہے۔ " ابھی علاج شروع بھی نہیں ہوا اور ٹیسٹوں پر اتنا خرچ " حاجی صاحب نے سوچتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر دیوار کا سہارا لے لیا۔
رحمت' رشید اور نجو ..... تینوں حاجی صاحب کی ضد کے سامنے مجبور ہو گئے۔
گھر پہنچ کر کچھ دیر تو حاجی صاحب چارپائی پر بیٹھ کر اور اپنا سر دیوار سے لگا کر آنکھیں بند کر کے نہ جانے کیا سوچتے رہے۔ رحمت نے دو تین بار بلانے کی کوشش کی لیکن ان کی حالت میں کوئی فرق نہ پڑا۔
اس روز انہوں نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ حقے کی طرف بھی اپنا ہاتھ نہ بڑھایا۔ چند منٹ بعد آنکھیں کھولتے اور جیسے ہی رحمت یا نجو ان کی طرف تکتی' وہ پھر آنکھیں بند کر لیتے۔
شام کے قریب نجو ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔
" بابا جان!"
حاجی صاحب کے دائیں ہاتھ کو حرکت ہوئی یہ ہاتھ آگے بڑھتا رہا۔ نجو نے اپنا سر ان کے ہاتھ کے قریب کر دیا۔
" بابا جان!"
حاجی صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو نجو ان کے بالکل قریب ہو کر ان کے سینے سے لگ گئی۔
" نجو!" باریک سی آواز ابھری۔
" جی بابا جان!"
" دعا کرو نجو .... دعا کرو ...."
حاجی صاحب آگے کچھ نہ کہہ سکے البتہ انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔
نجو اپنے بابا جان کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے پوچھ رہی " کیا دعا کروں بابا جان " کہ حاجی صاحب کی آنکھوں کی طرح ان کے ہونٹ بھی بند ہو گئے ان کی نواسی چپ چاپ دیکھتی رہی پھر گھر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹانے گئی۔
گھر کے تینوں افراد بے دلی کی ایک گہری اور گھمبیر حالت میں اپنی اپنی زندگی کا ثبوت دے رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف فضا اپنا سارا بوجھ ان پر اس طرح ڈال رہی تھی کہ وہ محسوس کرتے تھے جیسے وہ ایک دلدل میں نیچے ہی نیچے اترتے چلے جا رہے ہیں۔

حاجی صاحب پر کھانسی کا دورہ پڑا تو رحمت کے منہ سے ایک دبی دبی چیخ نکل جاتی۔
"ابا جی! پانی لے لو"
رحمت ان کے منہ سے گلاس لگا دیتی "علاج نہیں کروایا" اور وہ اپنے آنچل سے ان کی آنسو بھری آنکھوں اور ناک سے نکلتے ہوئے پانی کو صاف کرنے لگی۔
حاجی صاحب دو تین گھونٹ حلق سے اتار کر دونوں ہاتھوں سے رحمت کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کرنے لگے۔

"دعا کرو رحمتے! نجو کہاں ہے وہ بھی دعا کرے" انہوں نے بیٹی سے کہا۔
"کیا دعا کروں ابا جی؟"
"اللہ تمہارے بھائی کو سیدھے راستے پر لے آئے"
رحمت کا پیلا چہرہ غصے کے شدید احساس سے سرخی مائل ہو گیا۔
"مرن جوگا آپ عیش کر رہا ہے اور باپ کی یہ حالت ہے۔ دفع دور کرو بابا!"
نہ نہ رحمتے نہ۔ یہ نہ کہو۔ آخر تمہارا بھائی ہے!"
"ابا جی" رحمت پھٹ پڑی "ٹھیکیدار امجد علی کے چھوٹے بیٹے اکرم کا خط آیا تھا اس نے لکھا تھا کہ غفور نے ایک میم سے بیاہ کر لیا ہے۔"
حاجی صاحب نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی اوپر اٹھائی اور اپنا سر چارپائی کے پیچھے دیوار سے لگا دیا۔ وہ کچھ کہہ رہے تھے اتنے مدھم لہجے میں کہ رحمت اپنا سر ان کے کانوں کے قریب کرنے کے باوجود کچھ بھی نہ سن سکی اور ایک لمبی آہ بھر کر پیچھے ہٹ گئی۔
جنوری کے نو دن بیت گئے تھے ان نو دنوں میں خشک سردی پڑی تھی آخری دو دن تو فضا ابر آلود سی رہی تھی۔ تیسرے روز آسمانوں کے مشرقی گوشے سے سورج آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ حاجی صاحب کھانسی کے ایک جانکاہ دورے کے بعد ضعف کی شدت سے کمبل میں لپٹے ہوئے مردہ دکھائی دے رہے تھے رشید نے حسب معمول سب سے پہلے دروازہ کھٹکھٹایا تھا وہ صبح صبح ہی گائے کا تازہ دودھ لے کر آتا تھا اور حاجی صاحب کی خیریت پوچھ کر دکان کھولنے کے لئے چلا جاتا تھا۔ اسے گئے ہوئے پندرہ سولہ منٹ ہو چکے تھے۔ رحمت نے دودھ ابالنے کے لئے چولہے پر رکھ دیا تھا اور دیگچی کو دیکھ رہی تھی جس میں دودھ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ نجو نے نلکے کے نیچے پیڑھی پر بیٹھ کر رات کے جھوٹے برتن دھونے شروع کر دیئے تھے۔
دروازے پر دستک ہوئی۔
دونوں ماں بیٹی نے بیک وقت دروازے کی طرف دیکھا اور دونوں کے ذہن میں یہ خیال آیا۔ رشید تو دودھ دے کر چلا گیا ہے۔ اب کون آیا ہے۔
"نجو! کون آیا ہے!"
"پتا نہیں بے بے!"
"دودھ کا خیال رکھو" اور یہ کہہ کر رحمت دروازے کی طرف جانے لگی۔ نجو چولہے کے پاس آ گئی۔
دروازہ کھلا۔ ایک سوٹڈ بوٹڈ نوجوان اندر آیا۔

"سلام علیکم باجی!"
آؤ اکرم! خیر تو ہے کب آئے امریکہ سے؟"
اکرم ٹھیکیدار امجد علی کا چھوٹا بیٹا تھا جو کسی کورس کی تکمیل کے لئے کئی سال سے امریکہ گیا ہوا تھا۔
"خیر ہے باجی۔ بالکل خیر ہے حاجی جی کو ایک بڑی اچھی خبر سنانی ہے۔"
اس وقت اکرم کی نظر چارپائی کے اوپر کمبل پر پڑی۔
"حاجی جی نہیں؟" اکرم نے رحمت سے مخاطب ہو کر پوچھا۔
"وہی ہیں پر سو رہے ہیں"
اکرم نے نہ معلوم رحمت کا یہ فقرہ سنا تھا یا نہیں تھا۔ وہ تیزی سے کمبل کی طرف جانے لگا۔
"حاجی جی" اس نے حاجی صاحب کو پکارا اور ہاتھ سے ان کے چہرے کے اوپر سے کمبل ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ رحمت اور نجو بھی آ چکی تھیں۔
حاجی صاحب نے آنکھیں کھولنے کی کوشش میں اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرنے شروع کر دیئے تھے۔
"حاجی جی! میں وہاں اپنے غفور سے مل کر آیا ہوں"
حاجی صاحب ادھ کھلی آنکھوں سے اکرم کو دیکھ رہے تھے۔
"حاجی جی! غفور گھر آ رہا ہے۔ ساتھ حاجی صاحب سمجھ نہیں سکے تھے کہ رحمت اور نجو کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ "میں نے اسے بڑا شرمندہ کیا تھا۔ بڑا شرمندہ ہو گیا تھا۔ آ رہا ہے حاجی جی۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے بڑا مالدار ہو گیا ہے"
نجو دودھ کی دیگچی کی طرف بھاگی اور اسے چولہے سے اتار لیا۔
"نجو کرسی لاؤ"
نہیں باجی! بیٹھوں گا نہیں ایک دوست آ رہا ہے۔ ایئر پورٹ پر اسے ریسیو کرنا ہے یہ بات بہت ضروری تھی۔ بتانے آیا"
"چائے پیتے جاؤ"
"نہیں باجی! وقت نہیں ہے پھر آؤں گا اور وہ حاجی جی خوش ہو جاؤ غفور آنے ہی والا ہے" کہہ کر دروازے سے نکل گیا۔
"سنا ابا جی!"
"کیا کہا ہے اس نے۔ یہ ٹھیکیدار امجد کا چھوٹا بیٹا ہے نا اکرم!"
"ہاں ابا جی! غفور آ رہا ہے"
حاجی صاحب کی آنکھیں پوری طرح کھل چکی تھیں اور انہوں نے بیٹھ کر اپنی پیٹھ دیوار سے لگا دی تھی۔
"ماموں آ رہے ہیں نانا جان!" نجو کی آواز میں وفور مسرت نے ایک لرزش سی پیدا کر دی تھی۔
"بولو تو سہی اکرم نے کہا کیا ہے" حاجی صاحب ابھی تک بے یقینی کے عالم میں تھے۔
"ابا جی بتایا تو ہے غفور آ رہا ہے۔"
"کس نے بتایا ہے" نہ جانے حاجی صاحب کس کشمکش میں مبتلا ہو گئے تھے۔

اورنگ زیب قاسمی

" ہائے میرے اللہ " رحمت نے اپنا ہاتھ اپنے ماتھے پر مارتے ہوئے کہا اور اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہہ سکے نجو نے اپنا منہ اپنے ناناجان کے کان سے لگا دیا اور پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر بولی۔

" نانا جان غفور ماموں جان آرہے ہیں۔"

رحمت کو بیٹی کی اس حرکت پر غصہ آگیا " نجو انسان ہو "

حاجی صاحب رحمت کی آواز تو نہ سن سکے مگر انہوں نے اس کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ بیٹی کو ڈانٹ رہی ہے

اللہ میاں کے صدقے جاؤں۔ اکرم جھوٹ بولنے والا لڑکا نہیں ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔"

انہی لمحوں میں حاجی صاحب کی نظر اپنے ہدم دیرینہ پر پڑگئی جو چارپائی سے پرے اداس پڑا تھا کئی روز سے کسی نے اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

" نجو!"

" جی نانا جان "

" میرا حقہ ...... دیکھ تو کیا حال ہوگیا ہے اس بے چارے کا"

" لاتی ہوں نانا جان " یہ کہتے ہوئے نجو حقے کی طرف بھاگ گئی۔

اس دن سے ایک ایک گھڑی بڑی مشکل سے کاٹی جارہی تھی۔ حاجی صاحب گھر سے نکل کر دکان کی طرف جاتے تھے تو جو شخص بھی سلام کرتا تھا اسے روک کر کہتے تھے۔

" اپنا غفور پھر آرہا ہے۔"

" مبارک ہو حاجی جی۔"

حاجی صاحب ہر ایک سے مبارک لیتے ہوئے دکان پر جاتے تھے وہاں بھی کوئی واقف گاہک آتا تو اسے یہ خوش خبری سنا دیتے تھے بدھ کی صبح نجو ہاتھ میں پلاسٹک کا لوٹا لئے اوپر چھت پر جارہی تھی کہ جلد ہی اسی حالت میں سیڑھیاں طے کرکے واپس آنے لگی۔

" آہستہ آہستہ اتر۔" گر پڑے گی رحمت چلائی۔

نجو کے اختیار میں نہیں تھا ورنہ نیچے چھلانگ لگا دیتی۔ اضطراب کی حالت میں اس کے ہاتھ سے لوٹا نکل گیا اور آخری سیڑھی پر آپڑا۔

" کیا ہوا نجو! پاگل ہو گئی ہے۔"

" بے بے بنیرے تے کاں بول رہا ہے آج ماموں جان ضرور آئیں گے۔"

" اللہ کرے۔"

نجو گھڑے کو ذرا سا الٹ کر دوبارہ لوٹا بھرنے لگی وہ بے اختیار یہ مصرع دہرا رہی تھی " بنیرے تے کاں بولے۔"

اور اس کی ماں اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور حاجی صاحب دالان میں اپنی چارپائی پر لیٹے ٹکٹکی باندھ کر اوپر ان ابر پاروں کو دیکھ رہے تھے جو تیز ہوا میں اڑے چلے جارہے تھے۔

اور اسی روز جب مائی حسو تنور کا کام ختم کرکے اپنا سامان سمیٹنے میں مصروف تھی تو اس نے ٹھیکیدار اجمد

اورنگ زیب قاسمی

گلی کے نکڑ نما مکان کے سامنے جہاں گاڑیاں اور تانگے رک جاتے تھے کیونکہ آگے گلی تنگ ہو جاتی تھی۔ ایک ٹیکسی کو دیکھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی مگر جس وقت اس میں سے ایک شاندار انگریزی لباس میں ملبوس ایک شخص اترتے ہی ایک فراک پہنے ہوئے چھ سات سال کی لڑکی کو بازوؤں میں لے کر ایک زمین پر کھڑا کیا تو وہ ایک جذبہ بے اختیار کے زیر اثر ٹیکسی کی طرف جانے لگی۔

لڑکی کا رنگ بھورا تھا گہرے سیاہ رنگ کے بال رخساروں پر پھیلے ہوئے تھے۔

ٹیکسی کا ڈرائیور ٹیکسی سے سامان اتارنے لگا تھا حسو بڑے غور سے ٹیکسی سے اترنے والے کو دیکھ رہی تھی یک لخت چیخ اٹھی۔

" بابو غفور۔"

" او مائی حسو۔"

" ہائے تو تو پہچانا ہی نہیں جاتا۔ شکر ہے آگیا ہے تو تیرے گھر والے تو تیرے لئے پاگل ہو گئے ہیں۔"

مائی حسو کی چیخ ادھر ادھر فضا میں گونج اٹھی تھی اور وہ لڑکے جو ذرا دور کھیل رہے تھے اور وہ لوگ جو گلی سے نکل رہے تھے یا آرہے تھے فوراً" ادھر قدم اٹھانے لگے۔

حیرت انگیز مسرت اور مسرت انگیز حیرت کی کیفیت میں مصافحوں اور معانقوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس عمل کے دوران ماشاء اللہ اور چشم بددور کے فقرے بھی لبوں پر بے اختیار آنے لگے تھے۔

جو شخص بھی غفور سے مصافحوں ' معانقوں یا دونوں کی سر انجام دہی کے بعد فارغ ہوتا تو اس سلیٹ فام بچی پر ضرور نظریں ڈالتا جو غفور کی ٹانگوں سے لگ کر کھڑی خوف زدہ نگاہوں سے اس عجیب و غریب منظر کو دیکھ رہی تھی۔ نظریں ڈالنے والا سر ہلا کر مسکرانے لگتا تھا۔ زبان سے کہتا کچھ نہیں تھا مگر اس کے چہرے کے تاثرات بتا دیتے تھے کہ وہ اس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔

مائی حسو نے سب سے پہلے اس لڑکی کو دیکھا تھا وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرنے لگی۔ لڑکی باپ سے بری طرح لپٹ گئی۔

حسو نے اس سے اپنا ہاتھ الگ کر لیا۔

" تنگ نہ کرو حسو!" اس کے خاوند نے بیوی سے کہا گھبرا رہی ہے بچی۔

حسو مسکرائی " گھبراتی ہے تو کیا ہے ...... یہ تو اب ہماری بھی بابو غفور! اس کی ..... "

حسو کے شوہر نے گھور کر بیوی کو دیکھا۔ حسو اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

پندرہ بیس منٹ بعد غفور اپنی بچی کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف جانے لگا۔ رشید اور اس کے بھائی نے غفور کے سوٹ کیس اٹھا لئے۔ ایک چھوٹا سا جلوس بن گیا جو حاجی صاحب کے مکان کی طرف رواں دواں تھا۔ اور لوگ آتے تو جلوس رک جاتا تھا۔

غفور گھر سے کچھ فاصلے پر تھا کہ نجو بھاگتی ہوئی اور ماموں کہہ کر بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

" نجو ارے تو "

" بڑی ہو گئی ہے جب گئے تھے پتہ تو یہ شاید تین ساڑھے تین سال کی تھی " حسو نے غفور کی معلومات میں اپنی طرف سے اضافہ کیا رحمت چادر میں لپٹی لپٹائی دروازے پر کھڑی تھی۔

" آپا!"

" بھیا میرے " رحمت نے غفور کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دھارا بہہ نکلا۔

غفور نے دروازے کے اندر قدم رکھنے سے پہلے ہی چارپائی کے اوپر باپ کو دیکھ لیا۔ وہ تیزی سے جانے لگا۔ حسو اور رشید کے سوا باقی سب لوگ دروازے کے باہر رہ گئے!

حاجی صاحب نے غفور کو دیکھ لیا اور اب وہ چارپائی سے نیچے اتر کر پاؤں میں جوتے ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ غفور ان کی طرف سے جلدی سے لپکا اور ان کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

حاجی صاحب چند لمحے تکنے کے عالم میں کھڑے رہے پھر ہاتھوں کو غفور کے دونوں رخساروں پر پھیرنے لگے۔

ابا جی! آپ سب کا قصور وار ہوں میں بہت ہی شرمندہ ہوں۔ معاف کر دیں ابا جی! مجھے معاف کر دیں غفور کی آواز میں ندامت اور اعتراف جرم کا احساس نمایاں تھا۔ حاجی صاحب غفور نے بیٹے کے رخساروں سے دونوں ہاتھ ہٹا کر انہیں نفی کی صورت میں لہرا دیا اور اوپر دیکھنے لگے۔

جیسے کہہ رہے ہوں۔ اللہ میاں کی یہی مرضی تھی کچھ کو مت۔

" آپا! ابا جی کی حالت "

" فالج ہے " رحمت نے بھائی کو جواب دیا۔

" علاج نہیں ہوا؟ "

" ہوا ..... کیوں نہیں ہوا..... "

رحمت وہ سارے تجربے بتانے لگی تھی جو ہسپتال اور پرائیویٹ ڈاکٹر کی کلینک میں آئے تھے کہ رشید نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ جیسے کہہ رہا ہو یہ مناسب موقع نہیں ہے۔

" مونا " غفور نے اپنی بیٹی کو آواز دی۔ نجو بچی کا ہاتھ پکڑے پاس آگئی۔

" مونا " گھبرائی ہوئی بچی نے باپ کو دیکھ کر سر ہلایا۔

" Your Grand Father " سلام کرو انہیں " غفور نے باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بیٹی سے کہا۔ مونا نے آہستہ سے قدم اٹھائے پھر رک گئی۔

" سلام علیکم کہو مونا "

" سا..... لام " وہ سلام پورا نہ کر سکی۔

رحمت نے اسے گود میں اٹھایا اور حاجی صاحب کے پاس لے گئی۔

" یہ دادا جان ہیں تمہارے مونا "

حاجی صاحب نے رحمت کی گود سے لڑکی کو اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔ وہ اسے بے تحاشا پیار کر رہے تھے اور لڑکی تھی کہ بری طرح گھبرا رہی تھی۔

" تو..... تو..... مونا ہی از یور گرینڈ فادر " He is Your Grand Father

کیا کہہ رہے ہو غفور!

اورنگ زیب قاسمی

" مونا سے کہہ رہا ہوں گھبراؤ نہیں یہ تمہارے دادا جان ہیں۔"

حاجی صاحب نے اسے گود سے اتارنے کی کوشش کی تو نجو نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔

یہ بدھ کا دن تھا یہ دن سالہا سال کے بعد اپنی روشنیاں لے کر حاجی صاحب کے صحن میں اتر رہا تھا۔ ان روشنیوں سے ان کے گھر کے در و دیوار روشن ہو گئے تھے۔ مایوسی بیزاری اور دل گرفتگی کے وہ سائے جو ہر آن اس گھر میں منڈلاتے رہتے تھے۔ اب ان میں اجالے سے چھپنے لگے تھے۔ مرجھائے ہوئے چہروں پر زندگی کی رونق جاگ اٹھی تھی حاجی صاحب نے عادتاً" نہیں" حصول لذت کے لئے حقہ کے کش لینے شروع کر دیئے تھے وہ پہلے بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر دکان پر جاتے تھے۔ اب ان میں کچھ ایسی ہمت بیدار ہو گئی تھی کہ اپنی پرانی لاٹھی کے بغیر بھی راستے میں جانے والوں کے سلام لیتے ان کی خیریت دریافت کرتے" سہولت اور آسانی سے گلی کی مسافت طے کر کے دکان پر پہنچ جاتے تھے۔

واپس آتے تو غفور کہتا۔

" ابا جی! جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جایئے سب سے پہلے آپ کا علاج ہو گا۔"

" علاج کس کا علاج " حاجی صاحب بیٹے کو گھور کر پوچھتے۔

" آپ کا اور کس کا؟ " رحمت بول اٹھتی۔

" میرا علاج کیا کر رہی ہے رحمتے! میں ٹھیک ہوں۔ کیا ہوا ہے مجھے! آپ بتاؤ کیا ہوا مجھے؟ میں اللہ کے فضل سے اچھا ہوں۔ چلتا پھرتا ہوں۔ کھاتا پیتا ہوں۔ اور کیا چاہیے؟"

" ابا جی ..... رات بھر تو آپ کھانستے رہتے ہیں۔ " رحمت کہتی

" ابا جی اب حقہ چھوڑ دیں " غفور نے مشورہ دیا۔

" وہ کیوں چھوڑ دوں۔ میرا پرانا ساتھی ہے۔ پرانے ساتھی کو چھوڑتے ہوئے دکھ ہو گا مجھے۔" اور وہ اپنے رفیق کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔

غفور گھر میں زندگی کی زیادہ سے زیادہ آسائش فراہم کرنے کی خاطر دریا دلی سے خرچ کرتا تھا۔ حاجی صاحب بار بار اسے فضول خرچی پر ٹوکتے تھے۔ مگر وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہہ دیتا تھا۔

" ابا جان! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں بہت پیسہ کما کر لایا ہوں۔"

غفور نے گھر کی کایا پلٹ دی تھی۔ نئے فرنیچر سے گھر کے کمروں اور صحن کے علاوہ باورچی خانے کو بھی سجا دیا گیا تھا۔ وہ شاید غیر شعوری طور پر اپنے اس گناہ کا احساس دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو اس نے گیارہ برس گھر والوں سے بے نیاز ہو کر دور پردیس میں رہ کر کیا تھا۔ اسے اپنے گھر آئے ہوئے دو ہفتے گذر گئے تھے اور رات حاجی صاحب اور ان کے سارے گھر والوں نے جاگ کر گزارنے کی گویا قسم کھائی تھی۔ سب جاگ رہے تھے اور ہنسی مذاق کی باتیں ہو رہی تھیں۔

حاجی صاحب پلنگ پر تکیے سے پشت لگائے نیم دراز تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر حقے کی کش لگا کر کھانس بھی لیتے تھے۔ باقی تمام افراد پلنگ کے اردگرد بچھے بڑے قالین پر بیٹھے تھے۔ پلیٹوں پر ڈرائی فروٹ پڑا تھا۔ جس کی طرف سے نجو کے علاوہ سب نے نظریں ہٹا لی تھیں۔ نجو اپنے لئے نہیں مونا کے لئے بار بار اپنا ہاتھ بادا موں اور دوسری چیزوں کی طرف بڑھا دیتی تھی۔ اور بڑے پیار سے کھلا دیتی تھی۔

باتیں ماضی کی' حال کی' بیاہ شادیوں کی اور ایسے ہی خوشی کے موقعوں کی ہو رہی تھی۔ حاجی صاحب یہ باتیں سن رہے تھے۔ اور کبھی کبھی اپنا سر بھی ہلا دیتے تھے۔ اسی اثناء میں انہوں نے تکیے کی ٹیک لے کر اپنے ہونٹوں سے ہٹا کر غفور کو دیکھا اور اپنا دایاں ہاتھ اس طرح بلند کیا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ غفور کے علاوہ باقی سب گھر والے بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

" غفور پتر! تم آگئے ہو۔ مجھے سچ مچ ہی زندگی مل گئی ہے۔"

" ابا جی! آپ کمال کر رہے ہیں۔ علاج کی بات کرتا ہوں تو آپ ..... "

لو پترا! " حاجی صاحب نے غفور کا فقرہ مکمل نہ ہونے دیا مجھے کیا ہے جو علاج کرواتا پھروں غفور نے کہنا چاہا لیکن حاجی صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

" پتر سنو۔ فضول خرچی نہ کرو۔ تم پر بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ تم اپنی آپا کو خوش رکھو بے چاری نے بیوہ ہو کر بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ میری پیاری نواسی نجو کی شادی کرنی ہے میری پوتی کی شادی کرنی ہے۔ یہ عزت والی شادیاں ہوں گی۔ اور سنو " حاجی صاحب کو اتنی لمبی بات کرنے پر کھانسی کا دورہ پڑا رحمت پانی کا گلاس لے آئی کئی لمحوں بعد ان کا سانس درست ہوا۔ "اور میرے پتر غفور رشید کو اپنا بھائی سمجھو یہ یتیم لڑکا ہے۔ بھائی بہن کا بوجھ اس پر ہے۔ اس نے میری اور دکان کی بڑی خدمت کی ہے۔ سارا دن اور آدھی رات تک کام کیا ہے۔ دکان اسی کو دے دو۔"

" بہتر ابا جان!" غفور نے سر ہلا کر باپ سے کہا۔

ہنسی خوشی کی باتوں میں حاجی صاحب کو ان فقروں نے سب پر اور اداسی کا تاثر چھوڑ دیا۔

" رحمتے!"

" جی ابا جان!"

" یہ حمی ہماری اپنی ہے۔ ہمارا خون ہے "

" جاتی ہوں ابا جان!"

اور حاجی صاحب نے اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے اب ان میں بولنے کی سکت نہیں ہے۔ ان کے ہونٹ چند لمحے ہلتے رہے اور پھر بند ہو گئے آہستہ آہستہ سب کمرے سے جانے لگے۔ رحمت نے جاتے ہوئے باپ کے اوپر کمبل ٹھیک طریقے سے پھیلا دیا صبح طلوع ہوئی۔

یہ ایک اداس مضمحل اور افسردہ صبح تھی۔ اس کی روشنی پھیکی اور زردی مائل تھی۔ بوجھل قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ بازار اور گلی کی ساری دکانیں کھل گئی تھیں۔ مگر وہ دکان جس کے اوپر ایک بڑے سے بورڈ پر جلی حروف میں

" حاجی اللہ دتہ اچار والے " لکھا تھا۔ ابھی تک بند تھی۔

لوگ اس دکان کے قریب سے گزرتے تھے غم زدہ نظروں سے اس بورڈ کی طرف دیکھتے تھے اور دھیرے دھیرے قدم اٹھا کر اس دری پر جا کر بیٹھ جاتے جو حاجی صاحب کے گھر کے سامنے بچھی ہوئی تھی۔ اور صبح کی پھیکی روشنی میں اداسیوں کا رنگ گہرا ہوتا جارہا تھا۔

("ماہِ نو" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

نجم الحسن رضوی

بھوکے پیاسے

سانس چڑھا ہوا' رنگ اڑا ہوا' گال کی زرد شاخ پر سرخ تتلی' لگتا تھا جیسے اڑنا بھول گئی ہو' ہونٹ کا ایک کنارہ سوجا ہوا --- شاکی کی حالت بالکل ایسی تھی جیسے بلی کے پنجوں سے چھٹنے کے بعد کسی فاختہ کی ہو سکتی ہے۔

اوما کو اس وقت اس پر رحم بھی آیا اور غصہ بھی ---

پولیس انسپکٹر نے بیان لکھتے ہوئے پوچھا--- "اگر وہ سامنے آئے تو کیا آپ اسے پہچان لیں گی ؟ "

شاکی نے نفی میں گردن ہلائی - " نہیں وہاں سخت اندھیرا تھا اور ------ ! "

پولیس انسپکٹر نے کہا ------ " ٹھیک ہے ہم دیکھتے ہیں دراصل آج کل ایسے واقعات ہو رہے ہیں مگر آپ لوگوں کو بھی خیال رکھنا چاہیے اور تنہا سنسان جگہوں پر ------ "

سنسان جگہیں ہی ---- " پولیس انسپکٹر کا جوان مسکرایا ------

گھروں میں زبردستی گھسنے کی بھی وارداتیں ہوئی ہیں ------ ! ------ "

اوما نے دل میں کہا ------ اب یہ کچھ زیادہ ہی ڈرا رہا ہے بیچاری شاکی کو ------ ! ------

اسے کوفت ہو رہی تھی آخر شاکی کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی اس نے تو منع کیا تھا' مگر ------

شاکی اس کی دوست تھی' وہ سامنے والوں کے یہاں گھریلو ملازمہ کی حیثیت سے کام کرتی تھی' دونوں ایک ہی فلور پر رہتے تھے اوما کو یہاں آئے ہوئے سال بھر گزرا تھا مگر شاکی برسوں سے یہیں تھی۔ وہ عمر میں اس سے بڑی تھی اس کے بچے بھی بڑے بڑے تھے اور سب تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ شاکی کا شوہر بھی یہیں پر تھا مگر وہ ٹرک ڈرائیور تھا اور زیادہ تر سفر میں رہتا۔ کبھی کبھی وہ ملنے آجاتا۔ شاکی سنجیدہ عورت تھی اور اسے اچھے لوگ ملے تھے۔ مرد کسی کمپنی میں منیجر تھا اور عورت سکول میں ٹیچر ------ دونوں نے اپنے گھر کو اس پر چھوڑ رکھا تھا' سودا سلف گھر کا نظم و نسق' بچوں کی دیکھ بھال!

مگر اوما کو اپنے لوگ پسند نہ تھے - مالک ایک جھکی بڈھا تھا جس کے پرانے فرنیچر کی دکان تھی اور جس کی بیوی گٹھیا کی مریضہ ہونے کی وجہ سے عموماً کمرے میں ہی بند رہتی۔ کہیں آنے جانے سے اسے تکلیف ہوتی تھی۔ اوما رنگین مزاج' گھومنے پھرنے کی شوقین' چنچل ہانپ کی' چٹا چور گرم قسم کی ------ یہاں وہ ہرگز نہ آتی اگر ------

باپ نے دوسری شادی کر لی تھی اور ماں خرچے کے لئے پریشان رہتی تھی۔ اس کے کئی بھائی بہن تھے جنہیں پالنے پوسنے کے لئے معقول آمدنی کی ضرورت تھی' پھر بھی ماں نے اس کی شادی کردی تاکہ اوما کی زندگی سنور جائے۔

مگر اوما --- اوما نے خود سے کہا ---- ماں نے کتنا غلط سوچا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے آدمی سے بہت خوش تھی' وہ نکھٹو سہی مگر اس کا تو تھا وہ نوکری کرتی تھی اور وہ آوارہ گردی کرتا تھا مگر جب وہ رات میں گھر واپس آجاتا تو وہ خوش ہو جاتی۔ اس کی بانہوں میں سمٹ کے وہ اس کے سارے قصور معاف کر دیتی۔ مگر پھر ایک دن وہ اس کے سارے گہنے چرا کے بھاگ گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو کسی اور عورت کے ساتھ اپنی راتیں بتانے کا عہد و پیمان کر چکا ہے۔ اس بات کو اوما نے کبھی معاف نہیں کیا' اس نے گہنے چرائے تو اوما کو اتنا رنج نہیں ہوا جتنا یہ سن کر کہ اس نے اس کی محبت بھی چرالی تھی۔ اس دن کے بعد سے اوما نے اس کا نام اپنے دل کی سلیٹ سے ہمیشہ کے لئے کھرچ کر پھینک دیا تھا۔ اس کا یہی خیال تھا۔ مگر اوما یہاں بھی خوش نہ تھی۔ وہ تو یہاں پھنس کے رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی اسے دوسری میڈز پر رشک آنے لگتا۔ وہ کیسی کیسی سیریں کرتی تھیں اور اپنے مالکوں کی منہ چڑھی تھیں۔ وہ انہیں کیسی کیسی پوشاکیں دیتے تھے اور بخشش ---- ! کونے والے فلیٹ کی فلپائنی میڈ صوفی کیسا اترا اترا کے بتاتی کہ اس کو کیسے لاڈ کیا جاتا ہے ' خاص طور پر مالک ---- وہ تو اس کے گالوں کے گلاب پر فریفتہ تھے' وہ بہانے بہانے سے انہیں چھونے کی کوشش کرتے' کہیں رنگ کچا تو نہیں ----

اوما نے ٹھنڈا سانس بھرا' اور اپنی قسمت میں وہی بڈھے کھڈے !

اچھا تو ---- پولیس انسپکٹر نے انگلی سے اپنی مونچھ کے سوالیہ نشان کو ذرا اور نوکیلا بنایا --- کبھی بلڈنگ میں آپ لوگوں کو کوئی اجنبی تو نظر نہیں آیا ---- ؟

شانتی چپ رہی مگر اوما نے کہا ---- اجنبی تو نہیں ہاں کبھی کبھی سامان بیچنے والے آتے ہیں ---- !

سامان بیچنے والے ---- پولیس انسپکٹر نے زور سے میز پر ہاتھ مارا' کسی کو گھروں پر جا کر سودا بیچنے کی اجازت نہیں ----

اور وہ لوگ ---- ؟ شانتی کو اچانک کچھ یاد آیا۔

کون ---- ؟ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ارے وہی ---- شانتی نے اوما کی طرف دیکھا۔

وہ چھریاں تیز کرنے والے ---- !

اور وہ فرش چمکانے والے ---- !

اور وہ ٹیلی فون کے تار اور بجلی کا میٹر چیک کرنے والے ۔!

ہاں وہ بھی آتے ہیں ---- ! اوما نے کہا۔

اور وہ کون تھا جسے تو اس دن پانی کا گلاس تھما رہی تھی ۔ ؟

کون وہ ---- ؟ اوما نے جواب دیا --- وہ تو پلمبر تھا' ٹپکتے نل کو ٹھیک کرنے آیا تھا-----

اورنگ زیب قاسمی

پیاسا تھا بیچارہ ---- !

اور وہ جو ایک دن کوریڈور کے بڑے دروازے کے پاس بیٹھا کھانا ٹھونس رہا تھا' تو نے اسے روٹیاں دی تھیں ---- ؟

اچھا وہ ؟ وہ تو قلعی کرنے والا تھا برابر والوں کے یہاں سفیدی کر رہا تھا' دوپہر میں اسے بھوک لگی تو ---- !

ٹھیک ہے ٹھیک ہے ۔ پولیس انسپکٹر اکتا کے بولا۔ آپ لوگ خیال رکھیں۔ ان لوگوں کی وجہ سے پرابلم ہوگیا ہے' بہت شکایتیں ملی ہیں ---- !

سلطان بولا ---- خیر کچھ دنوں کی بات ہے ان سب کا بھی بندوبست ہونے والا ہے ۔ ان تمام لوگوں کے لئے جو بغیر فیملی کے ہیں اور یہاں اکیلے رہتے ہیں الگ بستی بنائی جائے گی ---- !

پولیس انسپکٹر نے کہا ---- اچھا آپ لوگ آنے جانے والوں پر نظر رکھیں اور اگر کوئی مشکوک آدمی نظر آئے تو فوراً ہمیں اطلاع دیں۔

شانتی نے آنسو پونچھ لئے۔

راستے میں اوما نے کہا--- بس ہو گئی حسرت پوری' وہاں جاکے بھلا کیا ملا۔ خواہ مخواہ کی مصیبت' سوال' سوال اور سوال ---- تمہارا مالک تو پھر بھی اچھا آدمی ہے لیکن اگر میرے والے کو پتہ چل گیا تو جانتی ہو ---- وہ بڈھا اسے بالکل پسند نہ کرے گا ---- اسے یہ گوارا ہی نہیں کہ میں ذرا دیر کو باہر جاؤں ---- اور بھی نوکری میں چھوڑنا نہیں چاہتی ---- !

شانتی نے کہا ---- مگر میں کیا کرتی' یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا ----

اوما کو پتہ تھا' واقعی سب کچھ اچانک ہی ہوا تھا ۔ وہ کوڑے سے بھرا ہوا سیاہ تھیلا باہر رکھنے گئی تھی کہ سیڑھیوں کے دروازے سے شانتی داخل ہوئی ---- سانس چڑھا ہوا' رنگ اڑا ہوا' گال کی زرد شاخ پر سرخ تتلی---- ہونٹ سوجا ہوا ---- آنکھوں میں آنسو ----

اوما اسے دیکھتی ہی رہ گئی کیا ہوا ---- ؟ اس نے حیرانی سے پوچھا ----

شانتی سسکتی ہوئی اس کے سینے سے لگ گئی ----

وہ نیچے سیڑھیوں کے قریب ----

اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

کیا ہوا سیڑھیوں کے پاس ---- ! اوما نے پوچھا ----

شانتی نے کہا ---- وہ ایک آدمی تھا لمبا تڑنگا' اچانک وہ اندھیرے میں سے جھپٹا اور ----

اور ---- ! اوما نے تڑپ کے پوچھا۔

میں نے چیخ ماری تو اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ مگر ---- یہ دیکھو' یہ دیکھو ---- ! شانتی نے اپنا چہرہ آگے کیا۔ یہ رات کا واقعہ تھا مگر اس کے گال پر ----

پولیس کو اطلاع تو ضرور تھی ---- شانتی بولی ---- مالک نے بھی یہی کہا تھا۔

یہ واقعات بڑھتے جارہے ہیں۔ تمہیں پتہ نہیں کل بلاک سترہ میں بھی یہی ہوا ---- شاید وہ تاک میں

رہتا ہے اور جیسے ہی اندھیرا ہوتا ہے اور سیڑھیاں سنسان ہوتی ہیں اور وہ اچانک کہیں سے آ نکلتا ہے۔

اوما نے کہا ــــــ چلو اب احتیاط کرنا ــــــ!

شانتی بولی ــــــ تم بھی بہت خیال رکھا کرو۔ تمھیں میں نے دیکھا ہے' اجنبیوں کی بڑی آؤ بھگت کرتی ہو۔ کبھی کسی کو خیرات دے رہی ہو تو کبھی کسی کو پانی پلا رہی ہو ــــــ!

اوما کو تعجب تھا' کون ہو سکتا ہے وہ؟ اپنے گھر کی بالکونی میں کھڑی دیر تک سڑک پر گزرتے لوگوں کو دیکھتی رہی۔ بے شمار لوگ آجا رہے تھے۔ زیادہ لوگ اپنے بچوں کے ساتھ تھے۔ میاں آگے' بیوی اس کے پیچھے' ساتھ ہی کھیلتے کودتے بچے' سارا بازار جاگ رہا تھا کار پارکنگ میں گاڑیاں آکے رکتیں اور ان میں سے جوڑے اترتے۔ البتہ سامنے دو دھیا قمقموں کی روشنی میں نہائے ہوئے سموسوں اور قیمہ روٹی کے سینڈوچوں کے اسٹال پر بہت سے ایسے لوگ بھی کھڑے تھے جن کے ساتھ کوئی عورت نہیں تھی ــــــ ایک آدمی قیمہ روٹی کا سینڈوچ خرید رہا تھا۔ جیسے ہی سینڈوچ اس کے ہاتھ میں آیا اس نے لپک کے اس میں اپنے دانت گاڑ دیئے اور آس پاس والوں کی پروا کئے بغیر اسے نہایت وحشیانہ انداز میں بھنبھوڑنے لگا۔ اس کا دہانہ اتنے مشینی انداز میں کھلتا بند ہو رہا تھا کہ اوما کو ہنسی آگئی' بھوکا بیچارہ پھر اس کی نظر دور ایک آدمی پر پڑی جو مشروبات کی مشین پر جھکا ہوا۔ اس میں سے اپنے لئے پیپسی کا ڈبا نکال رہا تھا۔ اوما کا دل زور سے دھڑکا' پشت سے وہ بالکل اس کے مرد کی طرح کا تھا' ویسے ہی نکلتا ہوا سر اور گدی پر بالوں کا الجھا ہوا ڈھیر ــــــ ارے ــــــ اس نے دل میں کہا ـــ یہ کمبخت یہاں کہاں ــــــ

اتنے میں وہ آدمی پلٹا' اور اوما نے دیکھا' وہ تو کوئی اور تھا ــــــ

وہ بالکونی کے پاس سے ہٹ گئی۔ آج اس کے بڈھے' بڑھیا جلدی سونے چلے گئے تھے لہٰذا اسے کوئی کام نہ تھا۔ وہ کچھ دیر ٹی۔وی دیکھتی رہی مگر نجانے کیوں شانتی والا واقعہ اس کے دل سے محو نہیں ہو پا رہا تھا اسے اکیلے پن سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

پھر جب وہ بستر پر لیٹی تو اس کو بہت دیر تک یہی وہم رہا کہ کمرے کے کسی اندھیرے کونے میں کوئی کھڑا اسے گھور رہا ہے اسے خواب میں بھی یہی کچھ نظر آیا کہ جیسے کوئی اس پر ٹوٹ پڑنے کو تیار کھڑا ہے۔ پھر اس کا خواب لمبا ہو گیا۔ اس نے اچانک خود کو سیڑھیوں پر پایا۔ سیڑھیوں کا ایک سرا اس کے بدن کی فصیل سے لگا ہوا تھا اور دوسرا نیچے اندھیروں میں گم تھا۔ وہ چپ چاپ سیڑھیاں اترتی گئی۔ سہارے کے لئے دیوار ساتھ تھی اچانک اس کا ہاتھ بجلی کے سوئچ پر پڑا۔ اس نے بٹن دبایا اور روشنی ہو گئی۔

اور اس نے دیکھا' یہ خواب نہیں تھا حقیقت تھی۔ وہ بیرونی دروازے کے پاس سیڑھیوں کے پاس کھڑی تھی۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا ڈیوڑھی سنسان تھی اور آس پاس کوئی موجود نہ تھا۔

("اوراق" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

ندرت الطاف

دیدۂ نمناک

"ماما ایک شعر سنیں

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

امی نے پیار سے میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھا" ابھی بہت صبح ہے سو جاؤ" ـــ حالانکہ ان کو ہمیشہ ابا سے اور مجھ سے یہی شکایت رہتی تھی کہ ہماری شام بہت طویل ہوتی ـــ اور صبح بہت دیر سے طلوع ہوتی ہے ــــــ دو بجے سے پہلے نہ ابا سوتے نہ میں ـــ اسی حساب سے صبح اٹھتے ــــــ ہاں اگر ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کا مقدمہ ہوتا جس میں ابا کو پیش ہونا پڑتا۔ تو بیچارے سوتے تو اسی وقت لیکن اٹھتے صبح پانچ بجے ـــ

ایک بار یونہی میں نے کہہ دیا ـــ "ابا آپ نے تو اب عید بقر عید کی نماز بھی چھوڑ دی۔"

"بلو میرے لئے تو وہ پھر ہائی کورٹ ہی ہو جاتا"

اب "بلو" کہنے والا کون رہ گیا!

"بچے کو یہی ڈر آپ سے بڑی ہے۔ لیکن اپنے محلے کے سوشل فنکشن ابھی تک بھگتاتی ہے۔"

"بلو وہ فیتہ کاٹنا یا کسی ریسپشن پر چلے جانا تو اتنا بڑا کام نہیں۔ عدالت میں کھڑے ہو کر دلائل دینے پڑتے ہیں۔"

ابا جس قسم کے فنکشن وہ بھگتاتی ہے وہ ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کی حاضری سے کم نہیں ہوتے ہر وقت چہرے پر مسکراہٹ چپکائے رہنا۔ اور پروٹوکول کا خیال رکھنا کچھ کم بڑی بات نہیں۔"

میں گھبرا کر بستر سے اٹھی

"امی آج تو ابا کا سوئم ہے۔ ان کا سوئم بھی اور ان کی سالگرہ بھی۔

گزشتہ دو تین برس سے وہ ہمیں دھمکا رہے تھے جب بھی وہ کیک کاٹتے۔ یہی کہتے ـــ "شاید یہ میری آخری سالگرہ ہے"

اور اس بار وہ سالگرہ سے دو دن پہلے ہی چل دیئے۔

"سو جاؤ ۔ سو جاؤ ۔ ابھی بہت وقت ہے" ہاں۔ ایک بار جب ابا نے میرے کمرے میں آکر کہا تھا" بلو میرے پیپے اور سگریٹ" وہ سپریم کورٹ جا رہے تھے۔ اور میں نے دفتر سے چھٹی کر لی تھی۔ تب بھی میں گھبرا

اٹھی تھی ---

لحاف ایک طرف پھینک کر --- اور ابا نے کہا تھا نہیں نہیں بستر سے ایک دم نہیں نکلنا چاہیے۔ پانچ منٹ تک لیٹے رہنا چاہیے۔"

" لیکن آپ کو دیر جو ہو جاتی "

" اس کی خیر ہے "

دراصل آفس چ ابا کا کافی لحاظ کرتے تھے خود ہی کہہ دیتے " چوہدری صاحب

You would like to come after tea_break' wouldnt You

انہیں ابا کی صبح اٹھنے کی کمزوری کا علم تھا--- اور ابھی کل رات میں نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا تھا---اس کی گاڑی کے پاس جاکر۔وہ کار سٹارٹ کرچکا تھا۔

J,R,I want Abba

وہ خود بھی رو پڑا تھا۔ اور رندھی ہوئی آواز میں اس نے کہا تھا۔

Grow Up_ Grow Up-- and use your talent.

اور اب بلیو اٹھی ہے۔ اور رات بھر بیٹھ کر اس نے اپنی گیارہ سالہ بچی کا ایک سوٹ میرے لئے ٹھیک کیا ہے۔ میرے اپنے کپڑے تو بالکل ڈھیلے ڈھالے ہو چکے ہیں۔ وزن اس تیزی سے گرا ہے۔ اور اب اس نے میرے بالوں میں شیمپو کیا۔ اور کہا

" دیکھو سوی جب پہلے تم بیمار ہوئی تھیں تو میری کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ میں سنگل تھی۔ نہ میاں نہ بچی --- میں نے تمہیں سنبھال لیا تھا اب میں کیا کروں --- تم بال بھی نہیں دھوتیں اگر دھوتی بھی ہو۔ تو شیمپو نہیں لگاتیں--- تمہارے سب بال گر جائیں گے۔ میں کہاں تمہارے لئے WIG ڈھونڈتی پھروں گی۔"

یہ بات اس نے ابا کی زندگی میں بھی کی تھی اور ابا نے کہا تھا۔ بلو اسے لے چلو کسی ڈاکٹر کے پاس --- یہاں یہ میلے کپڑے پہنے گھومتی رہتی ہے۔ میرے (Clients) آتے ہیں کیا کہتے ہوں گے۔"

اور ابا مجھے چیک دیتے ۔ بنک میں بھیجنے کے لئے --- تو (Deposit Book) کے تین چار صفحے خراب ہوتے --- جب کہیں ایک چیک بھرا جاتا --- وہ بھی خان صاحب کی مدد سے ۔ جن کی اپنی نظر بھی ایسی ویسی تھی۔

اور ایک روز روتے ہوئے میں نے بلیو سے کہا تھا۔

" بلیو دراصل میری نظر خراب ہوگئی ہے مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔"

" کیوں کیا ہوا تمہاری نظر کو ؟ "

" دراصل میں ایک مہینے تک مستقل (Gontact Lense) پہنے رہی۔ چوبیس گھنٹے۔ اتارے ہی نہیں مجھے خیال آتا تھا کہ نہ معلوم ابا کب اپنی ایمرجنسی بیل بجا دیں۔ پھر کیا ہوگا۔"

" تم چشمہ پہن سکتی تھیں۔ "

" وہ تو کہیں کھو گیا"

دراصل جب سے امی ابا دونوں ایک وقت بیمار ہوئے --- اور یہ گھر کی مرمتیں شروع ہوئیں۔ میری

اورنگ زیب قاسمی

کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں ہے۔

ابا سے بھی ایک دن میں نے گلہ کیا تھا۔ کہ آخر یہ چھتیں بدلوانے کی ضرورت کیا تھی۔

انہوں نے آہستہ سے کہا تھا--- " بلو میں نے کہا۔ تمہیں بعد میں تکلیف نہ ہو"

میں تو شاید یہ شروع نہ ہونے دیتی۔ اگر معلوم ہوتا کہ مرمتیں شروع ہونے کے دو دن بعد امی کو ہلکا سٹروک ہو جائے گا۔ چھڑی کے سہارے وہ چل پھر تو لیتی تھیں۔ لیکن اپنا گھر نہیں سنبھال سکتی تھیں۔

" سوی You are bad news "

" گھر میں جب کوئی کرائسس آتا ہے۔تم اس سے بڑھ کر(Crisis)پیدا کردیتی ہو--- غضب خدا کا --- تم نے آنکھوں جیسی پیاری چیز قربان کر دی۔ اچھا میں کل تمہیں (Specialist) کے پاس لے چلوں گی۔ شاید زیادہ (Damage) نہ ہوا ہو --- بلیو نے کہا

مجھے کچھ نظر نہیں آرہا۔ اور میں کسی کو پہچان نہیں رہی۔ اور لوگ آرہے ہیں۔ اور لوگ جارہے ہیں۔

اور ابھی کچھ دن پہلے ابا نے کہا تھا--- " اور یہ مت بھولو کہ تمہاری امی نے اور میں نے بہت وقت ساتھ گزارا ہے (Good or Bad) جیسا بھی تھا۔ اور اب ہم دونوں (Down hill) جارہے ہیں " ایک آنسو ان کی پلکوں پر لرزا ----- اور ان کی آنکھیں جھک سی گئیں ---- " اب طبیعت بھی بجھی سی رہتی ہے بلو " --- جیسے ان کو علم تھا کہ وہ اس دنیا سے اپنا بھرا پرا گھر چھوڑ کر جارہے ہیں۔

اور لوگ کسی کو پکڑ کر لا رہے ہیں۔

موت کے اتنے ہنگامے میں بھی لوگوں کو تخریب کاری کا نشہ رہتا ہے۔

جیسے میرا بیگ پہلے مل ہی نہیں رہا تھا ملا تو آٹھ ہزار روپیہ غائب

مشکل سے اس گرفتار شدہ شخص کو میں نے پہچانا۔ اور وہ بھی آواز سے --- اوہ ! یہ تو امین ہے۔ سلیم کا بھائی وہ ابا سے کوئی سفارش کروانے آرہا تھا اور اس نے باقاعدہ ابا سے وقت لے رکھا تھا۔ باہر اس نے اتنا مجمع دیکھا۔ تو گھبرا گیا۔اور کسی سے ابا کے بارے میں پوچھا۔ کہ وہ کہاں ہیں۔ کسی زیادہ پڑھے لکھے شخص نے اس کو جواب دیا کہ وہ تو دنیا سے پردہ کر گئے۔

" پردہ ----- پردہ ----- مجھ سے تو یہاں کوئی پردہ نہیں کرتا ----- امین کی سمجھ ایسی ہی تھی۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے

ابا نے ایک بار مجھے بتایا تھا۔ کہ میاں کو ریولوا بہت آتا تھا۔ ایک وکیل لائل پور سے ان سے مشورہ کرنے آیا۔ اور ان کے بارے میں پوچھا۔

لوگوں نے جنازے کی طرف اشارہ کیا۔ کہ وہ جارہے ہیں۔"

اور یہ امی کے گھٹنے سے لگا کون بیٹھا ہے اوہ یہ تو خالد ہے۔ وہ ہمارا ایک پرانا ملازم تھا۔ پانچویں تک اسے پڑھایا' گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی وہ کرتا تھا۔ پھر اس نے کہا کہ وہ رکشا چلانا چاہتا ہے۔ تب اس کو لائسنس لے کر دیا۔

اور امی پوچھ رہی ہیں " خالد تمہیں کیسے پتہ چلا ؟ " ---

" جی میں نے چوہدری صاحب کی تصویر دیکھی اخبار میں --- پھر میں نے خبر پڑھی۔ مجھے یقین نہیں آیا۔

میں نے کہا ــــ شاید میں غلط خبر پڑھ رہا ہوں۔ پھر میں نے وہ خبر پڑھوا کر سنی۔ تو جی پھر میں آگیا"

" اب تم کیا کرتے ہو "

جی۔ اب دودھ کا کاروبار کرتا ہوں۔ دو بھینسیں رکھی ہوئی ہیں۔"

اور باہر سے سیسوں کی ایک بچی آئی اور پیغام آیا۔ کہ چودھرائن سے ملنا ہے۔ کتنے عرصے کے بعد میں نے یہ لفظ " چودھرائن " سنا ہے۔

اوہ! یہ تو فضل کریم ہے ابا کا پرانا منشی (Early Thirties) آری تھرٹیز میں جب ابا نے وکالت شروع کی تو اس نے ان کے ساتھ کام شروع کیا تھا۔ پاکستان آکر اس نے آڑھت کی دکان شروع کی۔ اور اب تو ماشاء اللہ بہت فارغ البال تھا۔

اسی کے دوسرے گھٹنے سے حاجاں بیٹھی تھی وہ فضل کریم کی بیوی تھی۔ جب جعفر پیدا ہوا تھا۔ تو اس نے امی کی بہت خدمت کی تھی۔

مجھے تو اتنا ہی یاد ہے کہ میں سکول میں آتی تھی۔ تو ایک گندو سا بچہ جھولے میں پڑا تھا۔ اور اس کو گلابی رنگ کی جالی سے ڈھانپ رکھا تھا۔ کہ کوئی الاکا مچھر دھیت بن کر کمرے میں گھس ہی آئے۔ تو اسے نہ ستائے۔

مجھے بتایا گیا۔ کہ یہ میرا دوسرا بھائی ہے اور وہ مجھے بہت پیارا لگا تھا۔

اور فضل کریم نے روتے ہوئے مجھ سے گلہ کیا

" بی بی آپ نے مجھے ٹیلی فون ہی کر دیا ہوتا۔ میرا نمبر ان کے رجسٹر میں تھا۔ میں ان کا آخری دیدار تو کر لیتا۔"

میں اس سے کیا کہتی۔ کہ اس وقت لوکل کال کا بھی ہوش نہیں تھا۔ نہ کہ فیصل آباد کا نمبر تلاش کرنا۔

اور ابا کا رجسٹر کافی پیچیدہ چیز تھا۔ شروع کے صفحات میں انہوں نے ضروری (Ruling) لکھ رکھی ہیں۔ اور اس کے آخری صفحات میں ٹیلی فون نمبر اور کہیں کہیں کوئی شعر ـــ

اور اب فضل کریم اور حسنٰی جا رہے ہیں۔ جعفر باہر کھڑا ہے ۔ فضل کریم نے اس کے قریب رک کر کہا۔ اور حسنٰی کی طرف اشارہ کیا۔

" یہ تمہاری دائی ماں ہیں "

جعفر نے تپاک سے فضل کریم سے ہاتھ ملایا' اور فضل کریم اور حسنٰی نے اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ رکھا ـــ وہ چھوٹا سا گلابی گلابی رنگت کا بچہ اب جوان تھا۔ اور اسے حسنٰی سے پیار لینے کے لئے جھکنا پڑا تھا۔

اور صبح میں نے امی سے کہا تھا۔ اماں بھلا شعر بھی ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ نہیں ہو سکتا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ ابھی ابھی مجھے ایک مصرع یاد آیا ہے۔

اسیں دل دیاں لیراں سی لیاں

بھلا اس کا ترجمہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اور اچانک مجھے پنجابی ادب سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ کتنا (Rich) ادب ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

اسیں دل دیاں لیراں سی لیاں

میں نے آہستہ سے دہرایا

وہ جو ہے

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہو گا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

اس کا بھی ترجمہ نہیں ہو سکتا۔

اس آخری بیماری میں ابا یا تو پنجابی میں بات کرتے تھے یا انگریزی میں ــــ اردو سے جیسے انہیں کوئی چڑ سی ہو گئی تھی۔ حالانکہ بچپن سے ہم اردو میں بات چیت کرتے چلے آئے تھے۔

سیاہ لباس دیکھ دیکھ کر میرا دل الجھ گیا ہے اور کچھ خواتین باقاعدہ گپ درازی (Gossip) کر رہی ہیں۔ اور بیشتر خواتین کو تو پڑھنا ہی نہیں ہو گا۔

مجھ جیسا لاائق آدمی بھی ایسے موقعوں پر جب کہیں جاتا ہے۔ تو تیسواں سیپارہ پڑھ ہی لیتا ہے۔ دراصل صرف تیسواں سیپارہ ہی صحیح طور پر پڑھا تھا۔ بعد میں جب قرآن مجید پڑھا تو اردو یا انگریزی میں ــــ خاص طور پر غلام عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ مجھے بہت پسند تھا وہ ابا کے ٹیوٹر تھے اور ابا ان کے بہت بڑے (Admirer) تھے۔ کہا کرتے تھے بلو صرف ایک (Stanza) پڑھاتے تھے۔ لیکن کیسے پڑھاتے تھے کہ واہ واہ ــــ لیکن اتنا بڑا آدمی ہائیڈ پارک میں ایک بنچ پر تنہا دنیا سے رخصت ہو گیا۔"

اور میری آنکھوں میں سخت تکلیف ہے۔

مجھے کچھ نظر نہیں آرہا۔ اور پانی بہہ رہا ہے جس میں آنسو بھی شامل ہیں۔ میں ابا کے کمرے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

ابا آپ کا وہ حساس خوبصورت چہرہ ــــ اور وہ بڑی بڑی اداس آنکھیں ــــ یہ قریب قریب خاندان کی پہچان بن گئی ہیں۔ اور عمر تو بالکل ابا کا (Replica) ہے۔ وہی (Brownish Grey) آنکھیں ــــ

کسی نے دروازہ کھولا۔ وہ بلیہ تھی۔ " خدا کے واسطے اس کمرے کو (Lock Up) کر دو۔ ورنہ یہ رو رو کر مر جائے گی۔ کہاں ہے اس کی چابی ۔ اس (Agony) میں تو انسان کسی جانور کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

" چابی میرے بیگ میں پڑی ہے ۔"

ابا میں نے آپ کو بہت دکھ دیئے۔ ان آخری چند ہفتوں میں بھی ــــ منہ کھول کھول کر دوائیاں کھلائیں۔ انجکشن لگانے پر مجبور کیا۔ اتنی دفعہ خون ٹیسٹ ہوا ــــ اور (Prick) جو خون لینے کے لئے آپ کے لگتا " ـــــــ تیر کی طرح میرے دل میں بھی چبھتا تھا۔

ابا کے ڈیسک پر اسی طرح ان کی کتابیں اور فائلیں رکھی ہیں۔ سونا تمرا راج پڑا ہے۔ دیکھو کتنا کاج پڑا ہے ابھی ابا کی (Absence) سے آنکھیں اور دل مانوس نہیں ہوئے۔

عامر نے ایک روز کہا تھا " ایک روز بابا مجھے دفتر میں اپنی کرسی پر بیٹھے نظر آئے۔ میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ پھر وہ غائب ہو گئے " ـــــ ایک آنسو اس کی پلکوں پر جھلملا سا گیا۔

عمر اپنی مجروح معصومیت لئے میرے کھڑا ہے۔ اس کے دادا ابو اس کی Appeal Last Court of

تھے۔ سپرائٹ بھی ہے ---- کوئی سارا ڈرنک لے لو۔"
لیکن وہ یہی کہتا " میں سیون اپ لوں گا۔" جب میں انکار کرتی۔ تو وہ ابا سے جا کر شکایت کرتا پھپھو جی مجھے سیون اپ نہیں دیتیں ؟ "
ابا پکارتے۔ اس کو سیون اپ دے دیا کرو بیٹی۔"
سیون اپ گلاس میں ڈال کر وہ میرے گلاس سے گلاس ٹکراتا۔ اور کہتا " چیئرز"
اسی طرح وہ ایک روز ابا کے پاس چلا گیا۔ ابا نے پوچھا " کیا پی رہے ہو ؟ "
اس نے آرام سے کہا " شراب "
ابا بے چارے ہکا بکا رہ گئے۔
ہماری بہت کم تعداد تھی۔ لیکن ہر فرد کی آنکھوں میں اداسی سی رہتی تھی۔ جیسے بہت دکھ دیکھے ہوں۔ اور ابھی معلوم نہیں کیا کیا دیکھنا ہے۔ کتنا کم کام کیا۔ اور کتنا بہت سا کرنا باقی ہے۔
اس وقت وہی اداسی عمر کی آنکھوں میں ہے۔ وہ سی ایم ایچ کے سامنے سے گزرتے ہوئے چیخیں مارتا ہے۔
" میرے دادا ابو فوت ہو کر یہاں ہیں۔ مجھے ان کے پاس جانا ہے ۔"
اور اس وقت وہ نمناک آنکھوں کے ساتھ مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ دادا ابو گھر کب آئیں گے ؟
" بیٹا جب تم بڑے ہو جاؤ گے۔ تو وہ آجائیں گے۔"
" بڑا تو ہو گیا ہوں سوئی پھپھو۔
پچھلے (Happy Birth Day) پر میں تین سال کا ہو گیا تھا۔
" معلوم ہے میں کیا کروں گا سوئی پھپھو ---- میں ایک بہت بڑا انجکشن لے کر سی ایم ایچ جاؤں گا اور دادا ابو کو لگا دوں گا۔ پھر وہ ٹھیک ہو کر گھر آجائیں گے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا سوئی پھپھو ---- پھپھو جی میں رات کو ان کو یاد کر کے بہت رویا۔"
میں کیا جواب دوں ----
یہ گھڑی محشر کی ہے ---- !!
اور ابھی چند دن پہلے ابا نے کہا تھا
" ہاں وہ کیا نظم تھی۔ اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے ----"
گھر میں شعر سپلائی کرنا میرا کام تھا۔ بلیو میڈیکل مشورہ دیتی تھی۔ عامر نہ صرف مفت مقدمہ لڑتا تھا بلکہ کورٹ فیس بھی جیب سے لگاتا تھا۔ جعفر ملازمتیں دلواتا تھا ----
لیکن ابا سے لے کر ڈرائیور تک ۔ جب شعر و شاعری کی ضرورت پڑتی۔ تو میری طرف آتے۔ خان صاحب کا بیٹا جب وہ میٹرک کر رہا تھا۔ ایک روز کاپی لے کر آیا۔
سوئی بی بی۔ ماسٹر صاحب نے کہا ہے۔
" دس اچھے اچھے شعر لکھ کر لاؤ ---- میں نے ابو سے کہا وہ کہتے ہیں۔ سوئی بی بی کے پاس چلے جاؤ۔"
میں نے شعر لکھوا دیئے

اورنگ زیب قاسمی

اور کل میں ابا کی قبر پر گئی تھی۔ گلاب کے پھولوں کی چادر پڑی تھی اور (Wreaths) بھی تھے۔ یہ آج مرجھا جائیں گے۔ میری آنکھوں نے ہر چیز کو چھوا تھا۔ اور پیار کیا تھا۔ اس قبر کا ایک نقش میرے اندر جذب ہو گیا تھا میں نے قبرستان میں موت کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔ آج تک کسی موت نے مجھے اس طرح ہٹ جذب ہو گیا تھا میں نے قبرستان میں موت کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔ آج تک کسی موت نے مجھے اس طرح ہٹ نہیں کیا تھا۔
" تازی ماڑا اڑا نہ پاہو
اساں آپے اڑان ہارے ہو"
اور ابا کے رجسٹر میں آخری صفحہ پر لکھا تھا

انشا جی اٹھو اب کوچ کرو
اس شہر میں جی کا لگانا کیا

اور اب میں قبر کے قریب کھڑی رو رہی تھی۔ جمشید جسے ہم پیار سے کبھی کبھی مانو کہتے ہیں۔ میرے پاس ہے۔ اور میرا ہاتھ تھام کر کہہ رہا ہے۔
" سوئی پھپھو روتے نہیں ورنہ اللہ میاں گناہ دیتا ہے ---- اور پھر میں جو ہوں' میں نے پانچ سالہ مانو کو پیار کیا۔
پھپھو جی پھول مرجھا رہے ہیں"
ہاں یہ پھول مرجھا جائیں گے۔ لیکن یادوں کی تمام گردشوں میں جو سمن اور گلاب کے پھول کھل رہے ہیں۔ وہ ابد تک میرے ساتھ رہیں گے۔ اور شاید کبھی نہ مرجھائیں اور دائمی ہوں۔
اور وہ چمکتی دمکتی آنکھیں ------ وہ درخشندہ آنکھیں ------ وہ کہاں گئیں۔ ان کا کیا حشر ہوا۔
Dust unto dust ashes unto ashes
ہاں یہ سچ ہے۔
But the show must go on
اور میں نے بلیو سے کہا تھا۔ پہلو کی جگہ تو ابا نے امی کے لئے رکھی تھی۔ مجھے تم ان کی پائنتی دفن کر دینا۔ اور کتبہ پر لکھوا دینا۔
" روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل   آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر "
معلوم نہیں کس نے کس کو دفن کرنا ہے " اور وہ رو دی
اور اب لوگ آرہے ہیں۔ اور لوگ جا رہے ہیں اور ندرت نوکروں کو ناگفتہ جگہ پر فرج باندھنے کی دھمکی دے رہی ہے۔ اور ساتھ ہی مجھ سے کہہ رہی ہے۔ " ان کو تو خوف خدا بھی نہیں ہے ہر وقت برف کھاتے رہتے ہیں۔ آج راجو کو میں نے وہ کٹ ماری۔ وہ کٹ ماری کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔"
پچھواڑے کے لان میں لیفٹا مالی کھڑا ہے۔ اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔ لیفٹا دو ہی دن میں بڈھا پڑ گیا ہے اور اس وقت وہ مجھ سے پوچھ رہا ہے۔
سوئی بی بی ۔ یاد ہے ---- پچھلے محرم پر ہم چوہدری صاحب کو کس مشکل سے قبرستان لے کر گئے تھے۔"

ابا دسویں محرم کو دادی اماں کی قبر پر ضرور جاتے تھے۔ قبرستان کا محافظ جسے سب سائیں کہتے تھے دھو دھلا کر قبر تیار رکھتا تھا ۔۔۔۔ اور پانی کی باٹیاں اور منگے بھی۔ ابا اپنے سامنے قبر دوبارہ دھلواتے ۔۔۔ فاتحہ پڑھتے ۔۔۔ اور ہم سب مل جل کر اگر بتیاں جلاتے ۔۔۔ اور قبر پر پھول ڈالتے۔

ہاں گذشتہ محرم پر ہم بہت مشکل سے انہیں لے کر گئے تھے۔ چلنا ان کے لئے اب بہت دشوار ہو گیا تھا اور واپسی پر کرسی پر بٹھا کر لانا پڑا تھا۔

میں نے نیتے کو ایک نظر دیکھا اور کہا۔

"ہاں بہت مشکل سے لے کر گئے تھے۔ وہ کس قدر تھک گئے تھے۔

"اب وہ کچے ہی ادھر چلے گئے ہیں" اور یہ کہتے ہوئے

نیتے کا رنگ اور بھی پیلا پڑ گیا۔ اور آنکھیں بھر آئیں۔

ادھر سلیم سیڑھیوں پر بیٹھا رو رہا ہے۔

"چھوٹے تمہیں کیا ہوا ہے سب لوگ کھانا کھا رہے ہیں اور تم یہاں بیٹھے ہوئے

اس نے آنکھیں پونچھیں۔ اور جب میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ تو وہ اور بھی رو دیا۔

"سوی بی بی مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"چلو اٹھو۔ تھوڑا سا کھا لو"

"جی۔ جب میں کہتا تھا۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ تو چوہدری صاحب کہتے تھے۔ تم نہیں کھاؤ گے تو میں بھی نہیں کھاؤں گا۔"

اور یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

فضول بات کرتا۔ تو رشید کرتا۔ ایک روز کہنے لگا۔ ابی ہم بھی آپ کے بھائی ہیں۔ کچھ ہم سے بھی کہو۔ پہلے تو آپ ریکاشکا بھی مار لیتے تھے۔ اب بالکل ہی چپ رہتے ہو۔"

میں پھر بھی چپ ہی رہی

بلاق کو نظر نہیں آرہا تھا۔ کہ میں اپنے ماں باپ کو موت کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔

وہ تھا ہی ایسا! پان ہمیشہ اس کے کلّے میں رہتا۔

اور وہ پان کی پیک ادھر ادھر تھوکتا رہتا۔ امی ہمیشہ اسے ڈانٹتیں اور اس دن ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ جب اس نے گملے پر تھوک دیا۔ اس ڈانٹ ڈپٹ میں کبھی کبھار میں بھی امی کے ساتھ شامل ہو جاتی۔

ابا سے ملازم بہت خوش رہتے تھے۔ کیونکہ وہ انہیں دل سے چاہتے تھے۔ کسی کے ناخوش ہونے یا چلے جانے کے خیال ہی سے وہ گھبرا جاتے تھے۔ اگر وہ گھر میں کوئی نئی ملازمہ دیکھتے۔ تو گھبرا کر پوچھتے ۔۔۔ "وہ پہلے والی چلی گئی ابی سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

مزید جرح۔

"جی میرا مطلب ہے کہ رفتری ہے۔"

"نیک بخت اس کو پہنتا کون کون ہے؟"

"جی۔ جس کو ضرورت ہو پہن لیتا ہے۔"

اورنگ زیب قاسمی

ابا ٹھیلے میں اتر کر ننگے سر دفتر کی طرف چل دیئے۔ ابا چھوت چھات بہت کرتے تھے۔ اور یہی بات آگے ان کے بچوں میں بھی آ گئی تھی۔ اور سب سے زیادہ جعفر میں تھی۔ جس کو پیار سے ہم J.K کہتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کا چیف سیکرٹری بھی اسی نام سے پکارتا۔

جب وہ بہت چھوٹا تھا۔ تو ایک دن غسل خانے میں روتا ہوا پایا گیا۔ اس کی عادت تھی کہ اگر وہ کسی بات پر (Upset) ہو جائے۔ تو یا تو اپنے غسل خانے میں جا کر کونے میں منہ دے کر کھڑا ہو جاتا۔ یا جھولے پر اوندھا لیٹ جاتا۔

جب اس سے پوچھا گیا۔ کہ وہ کیوں رو رہا ہے تو اس نے جواب دیا۔ "عامر بھائی نے میری بنیان پہن لی ہے"

عامر نے فوراً "بنیان" اتارنے کی پیش کش کر دی۔ لیکن جعفر نے لینے سے انکار کر دیا ۔۔۔ "اب تو اس میں جراثیم ہو گئے ہیں۔ اب کیا کروں گا لے کر ۔۔۔۔۔۔

لوگ آرہے ہیں۔ لوگ جارہے ہیں۔ اور میں سیڑھیوں پر بیٹھی خیالوں کے تانے بانے بن رہی ہوں۔ اور ابھی ابھی رافع آیا ہے ۔۔۔ "پھوپھو جی سردی ہے۔ آپ یہ میری جیکٹ لے لیں۔" اس نے اپنی جیکٹ زبردستی میرے کندھوں پر ڈال دی۔

میں زندگی کو رفو کرنے کی کوشش میں ہوں۔ اور ابھی ابھی یہاں سے جیتا گزرا ہے۔ جیتا سلیم کا بڑا بھائی ہے۔ اور اس نے چھ برس ہمارے ہاں ملازمت کی تھی۔ پھر بقول ان کے وہ بڑا ہو گیا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی سلیم ہمارے پاس آگیا۔ اور جیتے کو اباّ نے کسی فیکٹری میں ملازم کروا دیا۔ اب تو وہ پکا ہو چکا تھا۔

ایک بار ہم جیتے کا کوٹ لے کر آئے۔ لنڈے سے ۔۔۔۔۔ سیاہ بخمل کا کوٹ ۔۔۔۔۔ جیتا اسے (Formal Occasion) پر استعمال کرتا۔ بہت فخر سے میں نے ابا سے کہا۔ "ابا دیکھیے اس کوٹ کی قیمت صرف گیارہ روپے ہے۔"

"اچھا ہے بلو ۔۔۔ لیکن تمہیں معلوم ہے۔ سکول کے زمانہ میں نیرا ایک کوٹ سلائی سمیت سات روپے میں بنا تھا۔ اور ایک روز جب ہیڈ ماسٹر صاحب بورڈنگ ہاؤس کا معائنہ کرنے آئے۔ تو بار بار میرے کوٹ کو چھو رہے تھے۔ برخوردار اس کوٹ کا کپڑا تو بہت اچھا ہے۔ یہ کہاں سے لیا ۔۔۔ میں نے کہا بھائی دلی گئے تھے۔ وہیں سے لے کر آئے تھے۔

بڑے ابا نے ابا کو ہاتھوں چھاؤں پالا تھا۔ میاں تو ابا کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ بڑے ابا تھے تو سوتیلے بھائی لیکن سگے بھائیوں میں اتنا پیار نہ ہو گا جتنا ان دونوں میں تھا۔

ابا بھی جب اپنی سوتیلی والدہ کا ذکر کرتے تو ہماری بڑی والدہ کے الفاظ استعمال کرتے؟ " تب میں انہیں اطمینان رہتی۔ کہ پرانا ملازم یا ملازمہ اپنی جگہ پر موجود ہے۔ اور خوش و خرم ہے اور جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ تب وہ مطمئن ہو کر سر ہلاتے۔

"اچھا تو یہ ایڈجسٹل ہے۔ پھر ٹھیک ہے۔"

ملازموں کے بارے میں ابا کی پالیسی تھی۔

The more the merier

نہ انھیں یہ خیال آتا کہ تنخواہ بھی دینا پڑتی ہے۔ کھانے کپڑے کا خرچ بھی ہے۔ صابن تیل بھی ہے۔ اور ملازم ہی کیا۔ اس گھر میں کوئی بھی جو ایک دفعہ آجائے۔ وہ جانے کا نام نہ لے۔ اسی میں ان کی خوشی تھی۔ وہ سوکھی روٹیاں کھائے۔ یا پراٹھے --- اس سے انھیں کوئی مطلب نہیں تھا۔ یہ ڈیپارٹمنٹ امی کا تھا۔

اور ابھی میں نے امی کو کرسی پر بیٹھے دیکھا ہے۔ ان کے اردگرد ان کے وظیفہ خوار جمع ہیں۔ شریفاں کے بیٹے کو (جو برتن مانجھنے آتی تھی) ٹی بی ہوگئی تھی۔ اس دکھیا کے تین چار بچے ای ٹی۔ بی کے ہاتھوں جا چکے تھے۔ امی نے بڑی مستقل مزاجی سے سال بھر اس کا علاج کروایا --- ساڑھے چار سو روپے مہینے کی دوائی آتی۔ جو امی خاموشی سے اس کے حوالے کر دیتیں --- اب وہ بالکل ٹھیک تھا۔

کسی کے بیٹے کو امی نے میٹرک تک تعلیم دلوائی تھی اور کسی کے بیٹے کو ملازمت دلوائی تھی۔

اس گھر میں کتنے یتیم پلے بڑھے تھے۔ کتنی بیواؤں کی مدد کی جاتی تھی۔ یہاں حاجت مندوں پر ہمیشہ رحم کیا جاتا تھا۔

باہر نکل کر میں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ ماسٹر اسد اللہ میرے قریب آئے اور افسوس کرنے لگے۔

ماسٹر جی جب بھی آتے۔ ابا انھیں کام ضرور دیتے۔ نئے کپڑے پڑے ہوتے تو سلوالیتے۔ جو کبھی کبھار ہی پہنے جاتے۔ ورنہ ان کے وہی جاڑوں کے دو کوٹ --- اور گرمیوں کی دو شرٹیں تھیں۔ وارڈروب بھرا پڑا تھا۔ کپڑوں سے۔ لیکن کیا درویشی تھی طبیعت میں۔ وہی ایک ہلکا کوٹ اور دو بھاری کوٹ جاڑوں میں۔ اور وہاں دو تین سیاہ کوٹ عدالت کے لئے۔

اگر ماسٹر جی آئیں --- اور کوئی نیا کپڑا نہ ہو سلوانے کے لئے --- تو ابا کچھ پتلونیں نکال کر انھیں دیتے
"ماسٹر جی ان کو ڈھیلا کر لائیں۔"

ماسٹر جی کر لاتے --- یہ الگ بات ہے کہ دو تین مہینے کے بعد جب ماسٹر جی آتے۔ تو انھیں پتلونوں کو پھر تنگ کروایا جاتا۔

"اسے ضرورت ہوگی پیسوں کی بلو" کا جواز تھا۔ ہم سب ہنستے۔

ہاں ابا کے پاس ایک شیروانی اور ایک رین کوٹ بھی تھا۔

ایک روز ہم چھاتا لینا بھول گئے اور نہ ہی ابا نے برساتی پہنی تھی۔ رستے میں بارش شروع ہوگئی۔ دفتر کے سامنے پہنچ کر جب گاڑی رکی۔ تو ابا نے خان صاحب کو بھیجا کہ اگر دفتر میں کوئی چھتری وتری ہو تو وہ لے آئیں۔ خاں صاحب چھتری تو کیا لاتے۔ غفور آیا ایک برساتی لئے ہوئے۔

"غفور یہ برساتی کس کی ہے۔" ابا نے جرح کی

"جی اپنی ہے"

اور ان باتوں کو یاد کرنے سے کیا حاصل --- مجھے صاف نظر بھی نہیں آرہا اور (Eye Spcialist) نے کہا تھا۔ شکر کریں (Inflamation) سے آنکھیں بچ گئی ہیں --- غضب خدا کا۔ ہارڈ لینز --- اور آپ نے انھیں مہینہ سوا مہینہ آنکھوں سے نکالا ہی نہیں۔"

اور میں نے امی سے کہا تھا۔ "امی آپ لوگوں کی کوئی نیکی میرے کام آگئی ہے ورنہ میری آنکھیں نہ بچتیں۔ گھر میں صرف بلو اور امی کو علم تھا کہ میں نے اپنی آنکھوں کا یہ حشر کیا اور سب لاعلم تھے۔ اور

اورنگ زیب قاسمی

عجیب بات ہے۔ بہت سی باتیں جو ہم نوٹ نہیں کرتے اچانک سامنے نظر آجاتی ہیں۔ ہم ہمیشہ ہی دادی اماں کی قبر پر جاتے تھے۔ لیکن جب اب میں ابا کی قبر پر گئی۔ تو میں نے پہلی بار دیکھا کہ قبرستان میں چچا معین قریشی کے بیٹے کی قبر رستے میں ہے' اسے عین نوجوانی کے زمانے میں کسی نے گولی چلا کر مار ڈالا تھا۔ چچا حسین قریشی بالکل گنگ ہو گئے تھے۔

بالکل (Senile) مستقل ابا کو (Pester) کرتے تھے۔ کہ گورنمنٹ پر سوا کروڑ روپے ہرجانے کا دعویٰ ان کی طرف سے کر دیں۔ بیٹا بریگیڈیر تھا۔ معلوم نہیں ان کو ڈیڑھ کروڑ روپیہ کیا کرنا تھا۔

("تجدید نو" اسلام آباد)

الٹے پیروں والے

بندر کے ہاتھ میں ڈگڈگی تھی اور سارا مجمع ناچ رہا تھا۔

"استغفراللہ!" ایک بڑے میاں' جو مجمعے سے بے تعلق سے کھڑے تھے' انہوں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھا اور بولے:

"یہ ناچنے کا کون سا موقعہ ہے۔ بندر کی ڈگڈگی پر پوری خلقت کو ناچتے ہم نے یہیں دیکھا ہے۔"

انہوں نے ذرا آگے بڑھ کر لوگوں کو مخاطب کیا۔

"خدا کے بندو' کیوں چکر گھنی بن رہے ہو؟ بہتر ہو گا تم اپنے گھروں میں بیٹھ کر سورۂ یوسف کا ورد کرو اور اس خواب کو دھیان میں رکھو کہ سات موٹی گائیں جن کو سات سوکھی گائیں کھا رہی ہیں۔ سات خوشے سبز ہیں اور سات خوشے خشک اور کچھ شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔"

"جناب آپ شاید میرا مطلب ہے اس طرف ---" مجمعے میں سے ایک ادھیڑ عمر کا شخص بڑے میاں کے پاس کھسک آیا اور اپنی مخملی ٹوپی کو ترچھا کرتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"محض خرافات ---" بڑے میاں نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور اچٹتے ہوئے مجمعے پر نظر ڈالی۔

"کس طرف کے ہیں؟" ایک اور شخص' جو سرمئی شیروانی پہنے ہوئے تھا' اس کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے منہ میں دبے ہوئے پان کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے پچکاری زمین پر ماری اور مخملی ٹوپی والے کے کان کے پاس منہ لے جا کر بولا۔

"اندرونِ سندھ تیتر کے شکار پر بھی پابندی لگ گئی۔ خان صاحب کی دو نالی کا کیا بنے گا؟"

"ناچے گا' خان صاحب بھی ناچے گا۔ یہ شعری کا وقت ہے ناچنے کا کام۔ بھلا تم لوگ ادھر کیا اپنی لوگ ادھر کیا اپنی مسجد بناتا ہے! ادھر ہمارے ساتھ آکر ناچو۔" ناچتے ہوئے مجمعے میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر بڑے میاں کا بازو کھینچا۔

"خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا۔" بڑے میاں غرائے۔

بندر زور زور سے ڈگڈگی بجا رہا تھا اور سارا مجمع ناچ رہا تھا۔ پیڑ کے نیچے مجمع نیم دائرے کی شکل میں جمع ہونا شروع ہوا تھا۔ ڈگڈگی کی آواز کے ساتھ گھروں سے عورتیں' مرد' بچے نکلنے شروع ہو گئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا بے پر بھیڑ لگ گئی۔

"شاید شمید کی بری ہے۔" لال ٹوپی والا بولا۔

"عقل ماری گئی ہے۔" بڑے میاں خود ہی خود بڑبڑائے۔

وہ بدلتی ہوئی رت کا وقت ہوتا تھا جب دن بڑے ہونے شروع ہو جاتے تھے اور شام میں سوندھی مٹی کی مہک گھل جاتی تھی۔ اس وقت میٹھے پانی کے کنویں کے قریب نیم کے پیڑ کی چھاؤں میں بندر والا زور زور سے ڈگڈگی بجاتا اور سارے بچے گلی میں نکل آتے اور بندر کا تماشا شروع ہو جاتا۔

ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ کرتا آیا
بندر والا بندر لایا
بندر کے ساتھ ایک بندریا
پہنے ہوئے ہے لال گھگھریا
جوں ہی بندر والا آیا
سب بچوں نے ٹھٹھا لگایا
لے کر "ڈنڈا" رکھ کر بھولا
بندر والا ہنس کر بولا
ناچو بیٹا ناچو بیٹا
بندر نے بھی بدن سمیٹا
اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر
گردن اور کولہے مٹکا کر
جھمکا اور نہ کچھ شرمایا
تھرک تھرک کر ناچ دکھایا
دیکھو اب سسرال کو جاتا
بیوی کو بھی ساتھ میں لاتا
بیوی پہلے تو شرمائی
پھر وہ چھم چھم کرتی آئی
بچوں نے بندر کو ستایا
بندر کو بھی غصہ آیا
بھپکا ان پہ ڈنڈا لے کر
ان کو ڈرایا گھڑکی دے کر
کر کے تماشے ایسے ایسے
سب بچوں سے مانگے پیسے

کھیل اپنے عروج پر پہنچ کر ختم ہو جاتا تھا۔ بندر والا پیسے بٹور کر اپنی راہ لیتا۔ بچوں کی بھولی بھالی نگاہیں دور تک اس کے ساتھ جاتیں۔

"اور یہاں --- لاحول ولا قوۃ" بڑے میاں نے اپنی آنکھوں کو بند کیا اور پھر کھولا۔

ڈگڈگی اب کسی علاقائی دھن میں بج رہی تھی۔ مجمع ناچتے ناچتے بے حال ہو چکا تھا۔ عورتیں' مرد' بچے' جوان اور بوڑھے سب اپنے سروں کو جھٹک جھٹک کر اور بالوں کو جھٹک جھٹک کر ناچ رہے تھے۔ پیڑ کے

پیچ کا میدان سیاسی دنگل بھورا ہو چکا تھا۔ بندر خوش تھا۔ وہ بھی اپنے پیر دیکھتا اور کبھی ناچتے ہوئے لوگوں کے۔ سب پیر ایک ہی انداز میں اٹھ رہے تھے: الٹے ' پلٹے۔

" میاں جی تم بھی ٹھمکا لگاؤ۔" ناچتے ہوئے مجمعے میں سے ایک اور شخص نے بڑے میاں کے کرتے کا کونا کھینچا۔

" خبردار۔ اپنے ہوش میں رہو۔" بڑے میاں نے نوجوان کو جھڑکا اور اپنی جگہ پر کچھ اور جم کر کھڑے ہو گئے۔

" ہم سب بڑی تیزی سے پلٹ رہے ہیں۔"

ناچتے ہوئے مجمعے میں سے ایک اور شخص بولا۔ اس نے آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ صورت شکل اور اپنے حلیے سے کوئی فلاسفر دکھائی دیتا تھا۔

" تمہیں اپنی جڑوں کی تلاش ہے ؟" فلسفی نے بڑے میاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا اور پھر کسی دانشور کی نقل اتارتے ہوئے منہ کو ٹیڑھا کر کے کہا:

" ناحق تم اپنی صلیبیں اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے ہو حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ تمہارے خیالات بانجھ ہو چکے ہیں۔"

نوجوان نے چشمے کے اندر سے بڑے میاں کو گھورا جو بونقوں کی طرح منہ کھولے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے اور انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انہوں نے نوجوان کی کوئی بات نہیں سنی --- ہیجانی انداز میں ناچتے ہوئے گروہ کو دیکھ کر وہ سرد آہ بھر کر شیروانی والے سے مخاطب ہوئے جو ان کے برابر ہی کھڑا تھا اور منہ میں دبے ہوئے پان کی پیک سے دیوار پر گلکاری کر رہا تھا:

" میاں میں تو بس ان سب سے ایک ہی بات کہتا ہوں کہ وہاں تو ------"

" بولتے کیوں نہیں ؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ؟"

چشمے والا نوجوان ناچتے ہوئے بولا۔

" ہم وقت کے تقاضے پورے کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ہمارا مشن : طاؤس و رباب اول --- شمشیرو سناں آخر ' ہے۔ چلے آئیے رنگ میں بھنگ ڈالنے۔ مجذوب میاں۔" فلاسفر نے فرمایا۔

" شکل سے جاسوس دکھائی دیتا ہے۔" شیروانی والا بولا۔

" بھائی یہ سب اس دانے کا کرشمہ ہے۔ امریکی گندم کھا کر انسان یوں ہی اچھلنے لگتا ہے۔ دیکھ نہیں رہے اس قوم کو' آسمان پر تھگلی لگا دی۔ اول کلی ٹوپی والے نے کہا۔

" اور وہ بجری بیڑہ' نری ہوائی۔ دوسروں پر تکیہ کرنے کا حشر دیکھ لیا۔ اتنا سب کچھ کھو کر بھی عقل نہیں آئی۔ خدا معلوم یہ کس بات کا جشن منا رہے ہیں ناعاقبت اندیش کہیں کے ! سارے جذبے ہی سرد پڑ گئے۔"

بڑے میاں نے سرد آہ بھری اور کھڑے کھڑے بہت دور پہنچ گئے' وہاں جہاں آہنی کنٹوں کے پیچھے نوے ہزار قیدی امید و بیم میں دن گزار رہے تھے۔ ذلت و رسوائی کا داغ اپنے سینے پر لئے وہ کبھی اپنی تنی ہوئی چھاتیوں کو دیکھتے کبھی ہاتھوں اور کبھی پیروں کو۔

نٹ کا تماشا موسم کے بدلنے کے ساتھ زور پکڑتا تھا۔ کنکوے اور پتنگ بازی کے مقابلے۔ مانجھے سرسوں پھولنے کے ساتھ ساتھ سوتنے شروع ہو جاتے تھے۔ جیسے ہی دن میں پھولی ہوئی سرسوں کی پیلاہٹ کھلنی شروع

ہوتی دکاندار آٹے کی لگدی پکا کر مانجھے سوتنے شروع کر دیتے۔ گیس کی لالٹینوں کی روشنی میں سڑک کے کنارے مانجھے سوتنے والے لڑکے کرسے کر ملا کر بیٹھ جاتے۔ اور پھر ساری رات لطیفے بازی ہوتی۔ کوٹھوں اور چھجوں پر سے " ظاہر دار بیگ " اترنے شروع ہوتے۔ کڑھے ہوئے کرتے' دوپلی ٹوپیاں' ہاتھوں میں موتیا اور مولسری کے گجرے۔ منہ میں خوشبودار قوام کی گلوریاں: " خراماں خراماں معطر معطر نسیم آ رہی ہے کہ وہ آ رہے ہیں ۔" کوٹھے سے آوازیں آتیں اور ادھر تو نرے لال بیگ ہیں۔ بڑے میاں نے سوچا۔

" یہ قبر تک ساتھ جائیں گے۔" شیروانی والے نے کہا۔

" وقت وقت کی بات ہے۔"

" تم کس وقت کی بات کرتا ہے ؟" مجمعے میں سے ایک پگڑی باندھے ہوئے آدمی نے آواز نکالی۔

" بھائی تم ناچا کیوں نہیں ؟" اس آدمی نے ٹوپی والے سے پوچھا۔

" ناچ کے لئے رنڈی کا کوٹھا ہے۔ اتی ناچ بھی بس دیکھ لیا۔ گیا دور سرمایہ داری گیا۔" ٹوپی والے نے سرد آہ بھری۔

" یہ بھی کوئی بات ہوئی سب بندر ہی بن بیٹھے !" بڑے میاں نے پھر ناچتے ہوئے مجمعے کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور بڑبڑائے۔

" میاں جی دیکھتے جاؤ وہ وقت بھی دور نہیں جب یہ ساری خلقت اپنے پیروں میں لمبے لمبے بانس باندھے تاروں پر قلابازیاں کھاتی ہوئی نظر آئے گی۔ ہم تم تو بس اپنی اپنی بولیاں بول کر اڑ جائیں گے۔"

شیروانی والے نے کہا۔" اگر ایسا وقت آنے والا ہے تو خداوند تو اس سے پہلے میرا پردہ ڈھک لے۔"

" بڑے میاں کے قریب ہی ایک ادھیڑ عمر کی عورت آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے کالا برقع پہن رکھا تھا جس کے سر والے حصے پر تیل کا چیکٹ جما ہوا تھا۔ لٹھے کا غرارہ' جو برقعے سے باہر نکلا ہوا تھا' اس کی گوٹ مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ وہ جلدی جلدی اپنے جبڑوں کو حرکت دے رہی تھی اور تیز تیز بول رہی تھی۔

" آپ بھی شاید --- ؟" شیروانی والے نے خاتون کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا اور جب اطمینان ہو گیا کہ وہ بھی کوئی غدر کی ماری ہوئی شہزادی ہیں تو وہ ان کے برابر کھسک آیا اور بولا: " آپ کے پاس پان ہو گا ؟ "

" پان کہاں رکھا ہے۔ جنگ نہ جنگ کی گت۔ پندرہ دن کی اس طمنچے بازی نے یہ غضب ڈھایا کہ پاندان پر ہی جھاڑو پھر گئی۔ ان سالار کے بچوں نے تو میرا بیت ہی خراب کر دیا۔ ہر وقت ریاح بھرے رہتے ہیں۔ اور میرے میاں کو تو رات سے جلاب لگے ہیں۔ مار سالار کی گڈیاں کی گڈیاں ۔ٹھکس گئے۔ اور سنو۔ اب وہ ہم سے ہی پوچھتی ہے پاکستان کی بکھیاں کیا ناچ رہی ہیں ؟ ذرا میرے سامنے آکر پوچھے' قطامہ کی زبان نہ کھینچ لوں ! ناچ رہی ہیں تیرا کلیجہ ۔" عورت نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔

" ارے غضب ! آپ شیرازی بیگم پان والی ہیں !" ٹوپی والے نے ان کو پہچانتے ہوئے کہا۔ " آپ کا کاروبار تو اب ختم ہی سمجھو۔ پان آنا بالکل بند ہو گیا۔"

" قاتلیں بانی شروع کر دی ہے۔" سوکھی چھالیہ کا پھنکا لگانے کے بعد وہ اکڑ کر بولی۔ " کئی قسم کے قاتلیں بننے میں میرے میاں کو کمال حاصل ہے ۔"

" پھر کیوں اب تک پان بیچ کر اپنی اوقات گنوا رہے تھے ۔" ٹوپی والے نے کہا۔

اورنگ زیب قاسمی

" واہ۔ اوقات گنوانے کی بھی تم نے اچھی کہی۔ یہ تو ہمارا آبائی پیشہ ہے۔ ان کے بزرگ شاہان اودھ کی گلوریاں بنانے پر مامور تھے۔ ان گلوریوں کا جواب نہیں تھا۔ ایک سائز اور ایک وزن کی گلوریاں! چھ چھ گلوریاں تو ایک ساتھ صاحبزادیاں منہ میں رکھ کر شہد کے گھونٹ کی طرح پی جاتی تھیں۔ شہزادے بیگ کی پچکاریاں لونڈیوں باندیوں کی تنی ہوئی چھاتیوں پر مارتے تھے جن سے دنوں خوشبو کے بھبکے اٹھتے رہتے تھے۔ پان کا اور ہمارا ساتھ تو صدیوں پرانا ہے۔ یہ چھوٹا تو سمجھو دنیا چھوٹی۔ اور اب زندگی میں رہ بھی کیا گیا ہے۔ نہ کوئی رنگ نہ خوشبو' لنڈھے میں لپٹی ہوئی ایک سرد اور بے جان لاش۔" اس نے نقاب اٹھا کر گردونواح کا جائزہ لیا۔ شیروانی والا اس کے قریب کھسک آیا تھا۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا " آپ کو اس عینک کا علم ہے؟"

" حبیب اللہ کے چشمے کو پوچھو ہو۔ توبہ توبہ!" عورت نے نقاب چہرے پر ڈال کر اپنے دونوں گالوں کو پیٹ ڈالا۔

" کیا چشمے سے آرپار' اندر سے لے کر باہر تک!" محترمہ نے بوکھلاتے ہوئے پوچھا۔

" اری خالہ سب کچھ بھتیرا اندر ------ ایک دم مادر زاد ------"

" تم میں سے کسی نے لگا کر دیکھا ہے؟" عورت نے بیک وقت سب سے پوچھا۔

" توبہ کریں جی۔ وہ ناہنجار حبیب اللہ لگائے لگائے شہر میں گشت کرتا پھرتا ہے۔ کم بخت پڑھتا بھی لڑکیوں کے ساتھ ہے۔ اب ماں بہنوں کی عزت بھی محفوظ نہیں۔" بڑے میاں نے کہا۔

" ہے ہے۔" محترمہ نے گھبرا کر برقعے کو اپنے گرد لپیٹا۔ اپنے جسم کو اچھی طرح چھپا کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گلی میں چلی گئی۔

بندر بدستور ڈگڈگی بجا رہا تھا اور مجمع بدستور ناچ رہا تھا۔ بڑے میاں کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں ابھر آئی تھیں۔ کبھی وہ ناچتے ہوئے مجمع کو دیکھتے اور کبھی آسمان کو۔ صاف شفاف آسمان پر دور دور تک کوئی پرندہ نظر نہیں آرہا تھا۔

" آپ پھر پر سانے والا ابابیلوں کے منتظر ہیں ------ کسی معجزے کے! حد ہے رجعت پسندی کی!" فلاسفر نے اپنے چشمے کے شیشوں میں سے بڑے میاں کو گھورا۔

" وہی چشمہ! دھوئیں کے رنگ کے دھندلے شیشوں والا خاص بدیسی مال۔" شیروانی والے نے چونک کر فلاسفر کو دیکھا۔

" اور خیالات بھی!" ٹوپی والے نے کہا۔

" خیالات کا بھی سودا ہوتا ہے' تف ہے ہمارے حال پر۔ بندر کے اشاروں پر ناچنے کا انجام آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔" گلی کے گھر میں سے ایک اور صاحب نکلے۔ انہوں نے گلی والا کرتا اور تنگ مہری کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔

" جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔"

" کیوں صاحب۔ دیکھنا نہ دیکھنا اپنے اختیار کی بات ہے۔ آپ گھنٹہ بھر سے ادھر کھڑے ہیں۔ لاحول بھیج کر چلے کیوں نہیں جاتے۔" نووارد نے بڑے میاں سے کہا۔

" میں ان لوگوں سے ایک بات کہنے آیا تھا۔ یہ کہ بھلے لوگو' گھروں میں بیٹھ کر سورہ یوسف کا ورد کرو اور اس خواب کو ذہن میں رکھو کہ سات موٹی گائیں جن کو سات سوکھی گائیں کھا رہی ہیں ------ سات خوشے

اورنگ زیب قاسمی

سبزیں اور ساتھ خوشے خشک اور کچھ خشک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔"

" آپ بھی بچھر میں جونک لگانے چلے ہیں۔ تضیع اوقات سے فائدہ۔ میں تو سبزی خریدنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ پتا چلا بشیر سبزی فروش دکان بند کرکے صبح سے ادھر ہی کو لگے مٹکا رہا ہے۔ میری بیگم کو " دلما" پکانے کے لئے دیسی ٹنڈوں اور کچی املیا کی ضرورت ہے۔" نووارد نے کہا۔

" بیگم بھی بڑی ناعاقبت اندیش ہیں۔ بھلا یہ دلمے اور قلیے کا وقت ہے۔ سارا ملک کڑھائی مرغی اور بالٹی گوشت کا دیوانہ ہے اور ان کو دیسی ٹنڈوں کی تلاش ہے۔ آثار قدیمہ۔ بڑے میاں تو بڑے بھولے میاں سبحان اللہ۔" فلاسفر جھلایا۔

شیروانی والا بھی دل ہی دل میں بیگم کی عقل پر کف افسوس ملتا ہوا بڑے میاں کے ذرا اور قریب آگیا اور ان کے کان کے پاس منہ لے جا کر بولا:

" حضور آپ اپنی راہ لیجئے۔ خدا دو زخیوں کی یوں ہی رسی دراز کرتا ہے۔ ہم' آپ تو نہیں ہوں گے' مگر میری بات لکھ لیجئے' یہ صدیوں تک یوں ہی ناچتے رہیں گے۔ بندر ان کو گھن چکر بنا کر دم لے گا۔"

" مجھے بھی یہی غم ہے۔" بڑے میاں نے افسردگی سے کہا۔

" قاضی جی تم کاہے کو دبلا ہوتا ہے۔" پگڑی والے نے دائرے میں سے ہی آواز لگائی اور بڑے میاں کو اشارے سے بلانے لگا۔ بڑے میاں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اب وہ سڑک کو گھور رہے تھے۔ خاموش سڑک پر ان کو ساری مخلوق ناچتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ زور زور سے اچھلتی ہوئی یہ مخلوق کسی علاقائی دھن پر اپنے جسم کو زور زور سے ہلا رہی تھی جیسے وہ اچھلتے ہوئے آسمان پر جا پہنچے گی۔

" خدا وند تو ہی راہ راست دکھا ان کو۔" بڑے میاں نے آستین کے دامن سے اپنی آنکھوں کو پونچھا اور قدرے آگے بڑھ گئے۔ اب وہ ناچتے ہوئے گروہ سے کافی فاصلے پر کھڑے تھے۔ تن تنہا ------ ایک ٹھنٹھ کی طرح!

گھروں سے لوگ جوق در جوق نکل رہے تھے اور آواز کی طرف دوڑ رہے تھے۔ مجمع بتدریج بڑھتا جارہا تھا۔ ڈگڈگی مستقل بج رہی تھی۔ بڑے میاں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اب ان کے قریب ٹوپی والا تھا نہ شیروانی والا۔ دیسی ٹنڈوں کی تلاش میں جو صاحب نکلے تھے وہ ناچنے والے گروہ میں شامل ہو چکے تھے۔ وہ اس گروہ میں شامل ہو کر بشیر سبزی فروش کو تلاش کر رہے تھے۔ ان کی بیگم کو دوپہر کے کھانے کے لئے دلما پکانا تھا۔

" بھائی تم بھی کیا بات کرتا ہے۔ آج کے دن بشیر سبزی فروش کو تلاش کرتا ہے۔ تم بالٹی گوشت کیوں نہیں کھاتا۔ بے فکری سے ناچو۔" لوگوں نے ان کو چکر دیتے ہوئے کہا اور وہ بھی اچھل اچھل کر ناچنے لگے۔

" لاحول ولا قوۃ" بڑے میاں نے بے اختیاری سے اپنی آنکھوں کو مسلا اور پھر اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ شیروانی والا اور ٹوپی والا بھی ان کے پاس سے کھسک گئے تھے۔

" وہ بھی گئے ------" بڑے میاں نے گہرا سانس لیا۔

" وہ کدھر جاسکتے ہیں!" انہوں نے خود سے پوچھا' اپنے اردگرد کو ٹٹولا' سڑک کو گھورا۔ بجری کٹی ہوئی لمبی سڑک' بیچ کے پیچھے اچھلتی ہوئی خلقت' بندر اور ڈگڈگی اور ایک جانی پہچانی علاقائی دھن ------ اور ادھر کونے میں' دیوار کا سہارا لئے ہوئے دبکا سمٹا ایک تنہا انسان۔ بڑے میاں کو اپنا حلق خشک ہوتا ہوا محسوس

ہوا۔ انھوں نے پھر شیروانی والے اور ٹوپی والے کو ڈھونڈا اور ایک بار پھر ناچتے ہوئے مجمعے پر نظر ڈالی اور وہ بھونچکا ہو کر رہ گئے۔ ٹوپی والا اپنے منہ پر ٹوپی رکھے ناچ رہا تھا۔ اس کے پیچھے شیروانی والا تھا۔ اس کی شیروانی کے بٹن کھل چکے تھے اور شیروانی کے اندر سے اس کا مگلیا کڑھا ہوا کرتا نظر آ رہا تھا۔

"لعنت ہے تم پر ------" بڑے میاں نے جھلاتے ہوئے کہا اور دیوار سے ذرا اور پرے ہٹ گئے۔

آوازیں اب بھی آ رہی تھیں لیکن ان کے کان سن اور زبان گنگ ہو گئی تھی۔ دیوار کا سہارا لئے وہ تنہا کھڑے تھے۔ کبھی بے چارگی سے ناچتے' کودتے' اچھلتے اور خوش ہوتے ہوئے مجمعے کو دیکھتے اور کبھی خود کو ۔ اتنے اکیلے تو وہ کبھی بھی نہیں تھے۔ گھر والے سب ختم ہو گئے تو کیا ہوا' مانوس آوازیں اور خوش گواریاں تو تھیں۔

آم کے پیڑ پر بور اور کوئل کی کوک۔ نیم کے درخت سے گرتی ہوئی پکی پکی نبولیاں۔ بارش کی پھوار' کڑاہیاں' جھولے اور دھلی دوپٹے۔ "چلی آئی رے بدریا ساون کی" انھوں نے ذہن پر زور ڈالا۔ ہر آواز ان کا ساتھ چھوڑتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اور یادیں! اب انہیں کچھ یاد نہیں تھا۔ ان کو اپنا ذہن ماؤف ہوتا ہوا لگا۔ ان کے سامنے تو بس بندر تھا جس کے اشارے پر ایک خلقت ناچ رہی تھی۔ بڑے میاں نے اس مرتبہ غور سے ناچتی ہوئی مخلوق کو دیکھا۔ مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ کسی تنی چھاتیوں اور سڈول پنڈلیوں کو اچھال اچھال کر عورتیں دیوانگی کے عالم میں ناچ رہی تھیں۔ کپڑوں میں چھپا ہوا ان کا جسم سارے کا سارا ہیجانی انداز میں متحرک رہا تھا۔ بڑے پر اسرار انداز میں وہ جسم کو بل دیتی ہوئی ہم رقص مردوں کی کمر میں ہاتھ ڈالے جھول رہی تھیں۔ بڑے میاں کو جھرجھری سی آئی۔ اسی لمحے ان کی نظر اپنے قریب ہی اچھلتی ہوئی عورت پر پڑی۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے سواتی کرتے کے اندر لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔ بڑے میاں کی آنکھیں پھٹنی شروع ہو گئیں۔ پیشانی کے اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں ابل کر ساری کی ساری باہر آ گئیں۔ جسم کے اندر کوئی چیز آہستہ آہستہ پگھلتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ ان کے سامنے گداز اور صحت مند پنڈلیاں حرکت کر رہی تھیں۔ عریاں اور نیم عریاں جسم ڈگڈگی کی تال پر جھوم رہے تھے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑے میاں کی چندھی آنکھوں میں بہت سے رنگ بھر گئے۔ عورت کے سواتی کام کے کرتے کے اندر پھر کوئی چیز اچھلی۔ بڑے میاں کے چلتے ہوئے قدم یک دم رک گئے۔ انھوں نے دیوار کا سہارا لیا۔ لمحے بھر کو وہ ٹھہرے۔ انہیں نہیں معلوم کہ وہ کب چلے' کیسے چلے اور کب چلتے ہوئے ناچتے ہوئے گروہ میں شامل ہو گئے۔

فلاسفر نے دیکھا اب بڑے میاں سواتی کرتے والی کی کمر سے کمر ملائے ناچ رہے تھے اور اونچے اونچے قہقہے لگا رہے تھے۔ ناچتے ناچتے انھوں نے فلاسفر کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا:

"اجی چھوڑیں بھی وہاں کا کیا ذکر' وہاں تو بس بندر ناچتا تھا۔"

("سویرا" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

ہے کہاں روشنی؟

لپ اسٹک کھول کر وہ آئینے کی طرف مڑی' نارنجی رنگ اس کی سنہری رنگت پر خوب جچتا تھا۔

"آئینے سے کیا پوچھ رہی ہو میری جان! میری طرف دیکھو"

اس کے لب جواب دینے کی حسرت میں کپکپا کے رہ گئے۔ لپ اسٹک بے دلی سے ڈریسنگ ٹیبل پر پھینک کر وہ بغیر اس کی طرف دیکھے بولی "چائے گرم ہے ۔ پی لیجئے اور ناشتے کو جب جی چاہے فیروزہ ماسی سے کہہ دیجئے گا" الماری سے پرس نکال کر وہ "تقریباً" بھاگتے قدموں باہر نکل گئی۔

بس کا ڈرائیور برابر ہارن دیئے جا رہا تھا۔ صفورا اور اسد کب کے بس میں بیٹھ چکے تھے۔ وہ پھولے سانسوں بس میں چڑھی اور بغیر کسی کی طرف دیکھے "ہیلو ۔ السلام علیکم" کہہ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

غصہ بھری نگاہیں' نفرت اگلتی نظریں اس کے چہرے پر رینگنے لگیں ------ یہ روز کا معمول تھا۔ وہ کتنی ہی سویرے اٹھتی پھر بھی کچھ نہ کچھ دیر ہو ہی جاتی تھی۔ اور اس تاخیر میں ہمیشہ ایاز کا ہاتھ ہوتا تھا۔ وہ دانستہ کوئی ایسا کام کہہ دیتا۔ جس میں دس پندرہ منٹ ضائع ہو جاتے اگرچہ وہ کام کوئی ایسا ضروری نہ ہوتا اور واپس آکر بھی کیا جا سکتا تھا ------ بہرحال اس تاخیر پر بس میں بیٹھی اس کی کولیگز خوب اچھی طرح اس کے بخیئے ادھیڑنے کے بعد زہریلی نظروں سے اس کا سواگت کیا کرتیں' اور جب وہ بنا کچھ کہے 'سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر کے نظاروں میں کھو جاتی تو ان کا غصہ کچھ اور سوا ہو جاتا۔

"سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو؟؟" وہ سب دل ہی دل میں بڑبڑاتیں۔

"ہاں ------ تو کیا سمجھتی ہیں آپ خود کو جناب یاسمین صاحب" اس نے بڑے ادب سے خود کو مخاطب کیا۔ یہ انداز اس نے بابا جانی سے سیکھا تھا۔ وہ خود کلامی کے دوران ہمیشہ اپنا نام بلند آواز سے لیا کرتے تھے۔ ممی ان کی اس عادت سے بہت چڑتی تھیں۔ دراصل اس طریقے سے خود سے بات کرنے سے خود اعتمادی بڑھتی ہے۔ اپنے آپ پر یقین پختہ ہوتا ہے۔ یعنی ہم ہم ہیں کوئی ایرے غیرے نہیں' وہ ممی کو سمجھاتے ------

ہاں تو یاسمین! ان زہریلی نظروں کے پیچھے جو غصہ ہے وہ اس بات کا کہ آخر میں انہیں اپنے دل کی بات بتاتی کیوں نہیں ہوں؟؟ ------ میں کیا جانتی نہیں ہوں وہ کیسے ہمدرد بن کر میٹھے میٹھے دوستانہ انداز میں ایک دوسرے سے ان کے گھریلو راز معلوم کر لیتی ہیں اور پھر خوب مرچ مسالے لگا کر انہیں ہر محفل میں بیان کرتی ہیں ۔ کتنے بھدے اور بدصورت جھگڑے اسی بات پر اٹھ کھڑے ہوئے تھے ------ میں کیا جانتی نہیں کہ اپنے راز دوسروں کو بتا کر انسان خود ہلکا ہو جاتا ہے کم عزت ہو جاتا ہے۔

اس نے گردن کچھ اور اوپر کر لی اور چہرے پر دلآویز مسکراہٹ سجائے برابر کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

خلاف روم میں چھوٹی سی بات پر بلند ہونے والا سب سے بڑا قہقہہ اسی کا تھا " یار صبا ! پوری شے ہو تم تو
--- " وہ چلتے چلتے اٹھی اور کولر کے پاس جا کر پانی پینے لگی۔
" بہت خوش ہے آج کل یاسمین " کسی نے سرگوشی کی۔
" میاں نے کام پر جانا شروع کر دیا ہوگا " دوسری سرگوشی۔
" شیطان کے کان بہرے ' اگر میرا میاں نکھٹو ہوتا تو وہ جوتے مار کر گھر سے نکال دیتی۔ "
" بیچاری ! مجھے تو بہت ترس آتا ہے اس پر ------ اتنی اچھی شکل اور قسمت دیکھو۔ "
ترس --- ہمدردی ---- یاسمین کے ہاتھ کانپے ۔ گلاس کولر کے پاس لوندھا کر وہ جلدی سے سٹاف روم سے باہر نکل آئی کھلی فضا میں لمبے لمبے سانس لے کر اس نے بے اختیار چھلکتے آنسوؤں کو اندر قید کیا۔ اگلا پیریڈ گیارہویں کلاس میں تھا اور وہ لڑکیاں جس ٹیچر کو اپ سیٹ دیکھتیں اسے چٹکیوں میں اڑا دیتی تھیں۔ خود کو (Compose) کرنے کی خاطر وہ درخت کے نیچے بنے ہوئے سیمنٹ کے بنچ پر بیٹھ گئی۔

" میں بھلا کون ہوں ؟
کیا ہے میرا جواز ؟
یاد رکھنا ہے کیا ؟
بھول جانا ہے کیا؟
کون بتلائے گا
کس سے مانگوں جواب
اپنی سوچوں میں یونہی الجھتی رہوں
پیچھے دیکھوں کہ آگے کو بڑھتی رہوں "
پیچھے دیکھوں ----
مگر پیچھے کے تو تمام راستے بند تھے

(اس سے کہہ دو۔ کبھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔ پیچھے کے تمام راستے بند ہیں۔ بابا جانی مجھے میں ہی سے کہہ رہے تھے
" سوچ لو بیٹی۔ ابھی وقت ہے' ایسا نہ ہو یہ وقت نکل جائے اور تم پچھتاوؤں کی زد میں آجاؤ ")
آپ نے ٹھیک کہا تھا ممی میں پچھتاوؤں کی زد میں آچکی ہوں۔ مگر یہ کیا کروں۔ مجھے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا ------ پیچھے کا راستہ میں خود بند کر چکی ہوں اور آگے بھی اندھیرا ہی اندھیرا ہے ----
گیارہویں کلاس کی لڑکیوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ برابر کے کمرے سے درشہوار نے جھانکا " کس کا پیریڈ ہے یہ ؟ ؟ " اس نے گرجتی آواز میں پوچھا۔
" میڈم ۔ مس یاسمین کا ------ "
" جائیے انہیں بلا کر لائیے ۔ "
" میڈم ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ دوائی لے کر (Sick_Room) میں لیٹی ہوئی ہیں۔ "
درشہوار نے کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا۔

" آجاتی ہیں ملازمت کرنے ' ان ساری (Frustrated) عورتوں کو کالج سے نکال دینا چاہیے۔ یہ بھلا کیا (Goods Deliver) کر سکتی ہیں جن کے اپنے ذہنوں میں سکون نہیں۔ جبھی تو یہ قوم روز بروز بگڑتی جاری ہے ۔ " اس نے اپنی ڈائری میں چند سخت قسم کے جملے نوٹ کئے ' اگلی میٹنگ میں یہ پوائنٹ اٹھاؤں گی۔
پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا کس قدر سکھ دیتا ہے۔
کچن میں ماسی فیروزہ کے ساتھ مل کر ڈنر کی تیاری کرتے ہوئے وہ بے ساختہ گنگنانے لگی۔
ایاز نے اپنے چند ایک دوستوں کو کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ پونے آٹھ کے قریب اس نے کچن میں جھانکا "Everythiny Ready" سیاہ ڈنر سوٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح اچھا لگ رہا تھا۔
" نظر لگانے کا ارادہ کیا ؟ ؟ "
وہ جھینپ کر ہنس دی " اچھے خاصے نظر بٹو تو ہیں آپ ' آپ کو کون نظر لگا سکتا ہے ؟ "
" ماشاء اللہ ۔ آپ کی حس مزاح بھی آپ کی طرح ------ "
باہر گھنٹی بجی اور وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر لپکا۔ یاسمین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل پڑ گئی۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا کتنا سکھ دیتا ہے مگر کیا یہ ممکن ہے ؟ ؟ ؟
" یہ ------ یہ تصویریں بنائی ہیں آپ نے ؟ " تصویروں کا لفافہ کاؤنٹر پر پھینک کر وہ غرائی۔
فوٹو گرافر نے کاؤنٹر پر بکھری تصویریں سمیٹ کر مسکین سی شکل بنا کر پوچھا " کیوں میڈم ؟ پسند نہیں آئیں آپ کو ؟ "
" پسند ؟ ایسا لگتا ہے آپ فوٹو گرافی کی الف ب سے بھی واقف نہیں۔ یہ کلوز اپ ذرا دیکھیے ------ اوہ مائی گاڈ ۔ " وہ تصویر دوبارہ پھینک کر مزید غصے سے بولی۔ اچانک اس کی نظر فوٹو گرافر کی بائیں جانب کھڑے اس لمبے تڑنگے آدمی پر پڑی جو زیر لب مسکرا رہا تھا اگرچہ اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹ مسکراہٹ دبانے کی کوشش میں لرز رہے تھے۔
" اور یہ ؟ ------ کون ہیں آپ ؟ ؟ کیا آپ نے اس سے قبل کبھی ایسی مخلوق نہیں دیکھی جسے عورت کہتے ہیں " وہ اس لمبے تڑنگے آدمی کو مسکراتے دیکھ کر خواہ مخواہ اس سے الجھ پڑی۔
" یہ مسٹر بیگ ہیں۔ آپ کی طرح ہمارے (Client) معاف کیجئے مسٹر بیگ ' میڈم کو اپنی تصویریں پسند نہیں آئیں۔ اس لئے غصہ میں ہیں۔ "
" کوئی بات نہیں۔ " مسٹر بیگ نے فراخدلی سے کہا اور سٹوڈیو سے باہر نکل گیا۔
" دراصل میڈم ' آپ بجا فرما رہی ہیں " کاؤنٹر پر بکھری تصویریں ایک مرتبہ پھر سمیٹتے ہوئے فوٹو گرافر بولا " یہ تصویریں اتنی خوبصورت نہیں جتنی کہ ------ " وہ غور سے یاسمین کے چہرے کو دیکھتے ہوئے چاپلوسی کے انداز میں بولا " جتنی کہ یہ ہونی چاہئیں تھیں ------ آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ اگر آپ ہمیں ایک چانس اور دے دیں تو ہم آپ کی شکایت دور کر دیں گے۔ "
یاسمین نے اگلے روز آنے کی حامی بھرلی۔ اگلے روز وہ پھر موجود تھا۔ وہی لمبا تڑنگا۔ مونچھوں تلے مسکراتا ہوا۔
" یہ کیا آپ کی دوکان پر ملازم ہیں ؟ " اگرچہ گزشتہ روز فوٹو گرافر اس کا تعارف کرا چکا تھا مگر وہ جان

اورنگ زیب قاسمی

بوجھ کر اسے بے عزت کرنے کی خاطر بولی۔
" جی نہیں ۔ یہ مسز ایاز بیگ ہیں۔ انہیں بھی آپ کی طرح اپنی تصاویر پسند نہیں آئیں۔ دوبارہ بنوانے آئے ہیں۔"

" یہ چاہے دس بار کھنچوالیں انہیں اپنی تصویریں بھی پسند نہیں آئیں گی۔" وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔
لمبے تڑنگے آدمی نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ " ماشاءاللہ ! آپ کی حس مزاح بھی آپ کی طرح ------ "
مگر اس کی غصیلی نظروں کی تاب نہ لا کر اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
اسد کی پیدائش کے دوران ہی اس کے دل میں اپنے فیصلے پر پشیمانی کا شدید احساس جاگ اٹھا---- یہ میں نے کیا کر دیا ؟ ؟ ایاز بیگ کے لمبے تڑنگے چوکھٹے پر مر مٹی۔
پر اندر سے تو خالی نکلا
کوئی ایسا ویسا خالی ---- !
ادھر یونیورسٹی کے لا ابالی ، بے فکرے دنوں میں تو یوں ہوتا تھا کہ جو نہی " رومیو " شکل سے پیدل ملا' پہلے یہ احساس دوسری ملاقات میں جاگا یا دسویں میں' اس سے دامن چھڑا لیا۔ مگر یہ " رومیو" تو قاضی کے دو بولوں سے ہمیشہ سے اس کا ہو چکا تھا۔
(بابا جانی نے کہا تھا مستقبل کے فیصلے بہت سوچ سمجھ کر کرنے چاہئیں بیٹا۔ یہ گاڑی تو نہیں کہ پسند نہ آئی یا کوئی پرزہ خراب ہو گیا۔ تو بیچ کر نئی لے آئے ۔ " You will have to stick to it
اور ماں نے کہا : Ill have to stick to it ۔ مگر یہ گاڑی کیسے چلے گی ؟ ؟
" کیا آپ نے Art Buchwald کو پڑھا ہے ؟ "
" یہ کیا بلا ہے ؟ "
" کالم نگار ہے۔ جب میں یونیورسٹی میں تھی تو یہ" ڈان " اخبار میں لکھا کرتا تھا۔ آج کل "دی نیوز " میں ----- "

" چھوڑو بھئی یہ بیکار کی باتیں ۔ سنو آج اجمل کے ہاں برج نائٹ ہے۔ چلو گی نا ؟ "
اس کا ذرا سا منہ نکل آیا (Art Buchwald) نہیں چلے گا یاسمین بی بی۔ یہاں گندی ذہنیت کی سستی سستی خبریں چلیں گی۔
" نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی ۔"
" کیوں ؟ مسز اجمل سے تو تمہاری دوستی ہے "
" ارے بھئی تم لوگ رات بھر برج کھیلتے ہو۔ لیڈیز فیشن کی اور نوکروں کی باتیں کر کر کے جب تھک جاتی ہیں تو بیک بائٹنگ پر اتر آتی ہیں۔ " I simply hate it
" گھر پہ اکیلی کیا کرو گی ؟ "
" اکیلی کیوں ؟ اسد جو ہے۔ فیروزہ ماسی بھی ہے اور میری ڈھیر ساری خوبصورت کتابیں ۔"
" ٹھیک ہے As you wish"
As you wish ! ---- اس نے مایوس ہو کر سوچا ۔ میری خوشی ؟ میری خوشی کیا ہے بھلا میں اپنی خوشی

اورنگ زیب قاسمی

پوری کر سکتی ہوں ؟ ؟ ؟
شادی کی پہلی سالگرہ پر اس نے چپکے چپکے خوبصورت کتابیں خریدیں' کچھ کلاسیک کچھ نئی۔ اور گفٹ پیک تیار کروا کر اپنے تئیں بے انتہا خوش۔ کیک کاٹنے کے بعد ایاز نے بے صبری سے پیکٹ کھولا۔ ارنسٹ ہیمنگوے کی Old man and the sea ---- اس کے نیچے سارتر کی words ----- پھر ----- لفظ بھر کے لئے وہ بھونچکا رہ گیا۔
" یہ کیا ؟ ---- تمہیں معلوم ہے میں کتابیں نہیں پڑھتا ۔"
" میں نے سوچا ----- " وہ بچوں کی سی معصومیت اور خوشی سے بولی " میں نے سوچا۔ آپ کا ذوق ----- "
" ذوق ! To hell with my " وہ کتابوں کے پیکٹ کو پرے دھکیلتے ہوئے بڑبڑایا " سنو یاسمین بیگم ! آئندہ اپنی حد سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا ۔" وہ ادھ کٹا کیک میز پر چھوڑ کر سگریٹ کی ڈبیہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ " I hate intellectual woman" باہر جاتے جاتے اس نے غصہ سے تقریباً" چلاتی آواز میں نعرہ اچھالا۔
یاسمین نے کتابوں کا پیکٹ سمیٹا اور انہیں سینے سے لگائے اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔ سائڈ ٹیبل پر کتابوں کو رکھتے ہوئے وہ یکلخت ان پر سر رکھ کر رونے لگی !
" آپ نے ایل ایل بی کیا ہوا ہے نا ----- ؟ " جاڑوں کی ایک دوپہر لان میں دھوپ میں کرسی ڈالے وہ اونگھتے ہوئے بولی۔
" ہاں ----- پھر ؟ "
" پھر ----- آپ پریکٹس کیوں نہیں کرتے ؟ " (سارا دن گھر پہ بیکار رہ کر تنگ نہیں آجاتے ۔ یہ جملہ اس نے دل میں کہا۔
" اس سے کیا فرق پڑ ے گا ؟ "
" بہت --- ایاز۔ بہت۔ میں بھی سر اٹھا کر چل سکوں گی ۔"
" کیا مطلب ؟ ؟ میں نے تمہارے سر پر بوجھ لاد رکھا ہے کہ تم سر اٹھا کر نہیں چل سکتیں "
" ارے آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ بات یہ ہے کہ شادی کے بعد عورت کا وقار اس کے میاں کے Status سے بنتا ہے۔ جتنی اچھی پوسٹ پر وہ ہو گا اتنا ہی وہ سر اٹھا کے چلے گی۔"
" ہنہ ----- یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ " وہ کان میں انگلی ڈال کر اسے زور زور سے ہلانے لگا ----- " تمہیں کمی ہے کس چیز کی --- ؟ "
" کمی ----- "
بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
ہر بات کو روپے پیسے کے ترازو میں تولنے والا شخص میری بات کیسے سمجھے گا ----- میں اسے کیسے سمجھاؤں میری کمی وہ اس جنم میں تو پوری نہیں کر سکتا۔

"میں نے کہا نا بات صرف روپے پیسے کی نہیں ہے ۔"

" یاسمین " وہ قمیض کے دامن سے انگلی صاف کرتے ہوئے بولا " میری جان ' یہ سب صرف اور صرف کتابی باتیں ہیں۔ بہت دنوں خوابوں کی دنیا میں جی لیں ' اب آنکھیں کھولو اور زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کا حوصلہ پیدا کرو ۔"

خواب ------ خواب ہی تو ہمارا سرمایہ ہوتے ہیں ایاز جی ! لڑکیاں اگر خواب نہ دیکھیں تو مر جائیں ۔ سچ کہتی ہوں

خواب گر نہ دیکھیں تو
لڑکیاں ادھوری ہیں

اسد اور صفورا جونہی سکول جانے کے قابل ہوئے ' یاسمین نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ملازمت کرے گی۔

" ملازمت ------ " ایاز بیگ نے غصے اور تعجب کے ملے جلے جذبے کے تحت اسے گھورا " اور تم ؟؟

" ہاں میں ------ ایاز ' مجھے ایسا لگتا ہے میں اپنی شناخت کھو بیٹھی ہوں۔ میں کچھ کرنا چاہتی ہوں تاکہ اپنے زندہ رہنے کا جواز تلاش کر سکوں ۔"

" پھر وہی فضول باتیں۔ تم جاب نہیں کرو گی "I dont like working woman

" مگر کیوں ؟ ------ کوئی وجہ بھی تو ہو ---- "

" وجہ میں نے بتا دی۔ مجھے پسند نہیں ۔"

(مجھے پسند نہیں ! ------ یہ تین حرفی فقرہ اس کا جی چاہا واپس اس کے منہ پر دے مارے۔ مجھے نفرت ہے تم سے ۔ تم دوٹکے کے آدمی مجھ پر اپنی پسند ناپسند کا لیبل لگاتے ہو !)

میں نے تو زندگی بھر بھی تم جیسے بھٹ . جیسوں سے راہ و رسم نہیں رکھی۔ یہ تو میرا غلط فیصلہ تھا جس کی سزا بھگت رہی ہوں۔ اس نے کہنا چاہا مگر ایاز کے تیور دیکھ کر خاموش رہی۔

(" غلط فیصلے جونکوں کی مانند ہوتے ہیں " بابا جانی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا " جس طرح جونک چمٹ جائے تو خون پی جاتی ہے اسی طرح ایک غلط فیصلہ انسان کی زندگی بھر کی خوشیوں کا قاتل بن جاتا ہے ")

میں اپنے غلط فیصلے کی سزا کاٹ رہی ہوں ------

بہت دنوں بعد عاصمہ کا فون آیا " کیسی ہیں آپ باجی ؟ "

عاصمہ کی آواز سنتے ہی اس کا جی بھر آیا۔ " ٹھیک ہوں عاصمہ۔ تم سناؤ کیسی ہو ؟ "

" آپ کی آواز سے تو بالکل ٹھیک نہیں لگ رہیں باجی ۔"

" کچھ زکام سا ہو رہا ہے ۔ " اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

" دوائی لے رہی ہیں ؟ " عاصمہ کی فکر مند آواز۔

" ہاں ------ تم سناؤ ۔ می بابا جانی ٹھیک ہیں ؟ "

" سب ٹھیک ہیں باجی پچھلے دنوں ارشد بھیا اور بھابی آئے ہوئے تھے۔ بہت رونق رہی۔"

اورنگ زیب قاسمی

ارشد بھیا واپس چلے گئے ------ ؟ " دل میں ہوک سی اٹھی۔

" وہ آپ سے ملنا چاہتے تھے ------ " عاصمہ کی آواز میں شرمندگی تھی " مگر ایک تو ان کی چھٹی بہت کم تھی۔ دوسرے بابا جانی نے بہت سے کام ان کے لئے اٹھا رکھے تھے۔ ویسے وہ آپ کا بہت پوچھ رہے تھے۔ اچھا آپ سنائیں اسد اور صفورا کیسے ہیں ؟ "

" ٹھیک ہیں۔ سکول گئے ہوئے ہیں ۔"

" اب تو خاصے بڑے ہو گئے ہوں گے۔ کیا صفورا آپ کی طرح خوبصورت ہے ؟ "

" پتہ نہیں عاصمہ ' میں نے کبھی اسے غور سے دیکھا ہی نہیں "

عاصمہ کی مخصوص بچوں والی ہنسی " اور کیا۔ دولہا بھائی کو دیکھنے سے فرصت ملے تب نا۔ اچھا باجی ! اپنا خیال رکھا کریں ۔"

سینے کی دیواروں سے ٹکرانے والی چیخیں باہر نکلنے کو بے قرار تھیں ---- فیروزہ مائی ویکیوم کلینر چلا رہی تھی۔ غسل خانے میں شاور کے نیچے ایاز بیگ خوش دلی سے گنگنا رہا تھا اور اس کے گلے میں آنسوؤں کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اوندھے منہ بستر پر گری اور تکیے میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ دن معمول کے مطابق گزرا۔ رات جونہی وہ کھانے کی میز پر سے اٹھی ' آنکھوں کے یکلخت اندھیرا چھا گیا۔ اس نے مدد کے لئے کسی کو پکارنا چاہا مگر زبان نے ساتھ نہ دیا اور وہ کرسی سمیت زمین پر آرہی ' صفورا اسے گرتے دیکھ کر چلانے لگی

"بابا ------ بابا ۔"

ایاز بیگ غسل خانے کی طرف جاتے جاتے بیٹی کی چیخ پر پلٹا۔ لمحہ بھر تو وہ اس بدلی ہوئی صورت حال کو سمجھ ہی نہ پایا۔ ابھی پل بھر پہلے تو وہ سب کے ساتھ ہنسی مذاق میں شامل تھی۔ کھانا بھی معمول کے مطابق کھایا تھا۔ پھر یہ ایک دم کیا ہو گیا ؟؟؟

" ان کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھ گیا ہے " ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد بتایا۔

" مگر کیوں ؟ " ایاز نے قدرے ناگواری سے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھا مگر اس احمقانہ سوال کو نظر انداز کر گیا۔

فوری طور پر یاسمین کو چند دوائیں دے کر اور لمبا چوڑا نسخہ لکھ کر ڈاکٹر چلا گیا۔

دو دنوں میں ایاز اس " افتاد " سے گھبرا اٹھا۔ " تمہیں ہسپتال نہ شفٹ کر دوں ؟؟ "

" ہسپتال ؟ کیوں ؟ کیا مجھے کوئی چھوت کی بیماری لگ گئی ہے ؟ "

" اوہو ! بھئی مجھے گھر میں یہ قبرستان جیسا ماحول اچھا نہیں لگتا۔ بچے الگ سہمے ہوئے ہیں۔ میں دو دن سے ڈھنگ سے سو نہیں پایا۔"

یاسمین بے بسی سے اس کی طرف دیکھنے لگی '

میرے اندر خلا سا ہے
دماغ افکار سے خالی ہے
دل جذبات سے خالی ہے
میں شاید مر چکا ہوں

میں شاید مر چکی ہوں ----- اس نے زیرلب دہرایا۔

ہاں - موت بھی ایسی ہی ہوتی ہوگی۔ ایاز بیگ! کتنی دفعہ موت کی سزا سناؤ گے تم مجھے -----

بہت دنوں وہ سر جھاڑ منہ پہاڑ پھرتی رہی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایاز سے لڑتی۔ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ بچوں سے کھیلنا اور انہیں کہانیاں سنانا بھی ترک کر دیا۔ ہر بات بے معنی اور بے مقصد لگتی' حتیٰ کہ اپنا وجود بھی ----- ہر شے سے دلچسپی جاتی رہی۔ اور ایسا ہوتا تھا کہ ایاز نے بھی اس میں دلچسپی لینا یکسر چھوڑ دیا۔ اب وہ باہر جاتے سے جھوٹے منہ بھی اس سے نہ پوچھتا کہ چلو گی۔ بس تیار ہو کر چابی گھماتا چل پڑتا۔ اس کی گنگناہٹ بڑھ گئی تھی اور وہ اس صورت حال سے مسرور نظر آتا تھا۔

مگر مسئلہ بوں کا توں تھا۔ وہ کسی صورت یاسمین کو جاب کرنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔

پھر یاسمین نے پینیترا بدلا۔ اس نے پھر سے خود کو سنوارنا شروع کر دیا۔ بوتیکس پر جا کر اپنے لئے چند ایک اچھے ملبوسات خریدے۔ بیوٹی پارلر پر جا کر اپنے بالوں کی مناسب تراش خراش کرائی۔ باقاعدگی سے اپنے چہرے کو فیشل' مساج اور ماسک کے ذریعے شگفتہ اور تروتازہ بنانے کی کوشش کرنے لگی۔

ہاں تو بلاوجہ ہی تم نے ایک مرد کے رویہ سے دل برداشتہ ہو کر خود سے منہ موڑ لیا۔ وہ اپنے آپ کو سنوارتے ہوئے خود سے کہتی' تمہارا اپنا ایک وجود ہے' اپنی الگ شخصیت۔ بجائے اپنی شخصیت پامال کرنے کے' تم اپنی شخصیت کے بھرپور وار سے اس کی انا کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہیں کر دیتی ہو؟

ایک رات ایاز بیگ کے بازوؤں میں سمٹ کر ایک عجیب سا خیال اس کے من میں ابھرا۔ (جی نہ چاہتے ہوئے بھی ایاز بیگ کے بستر کی ساتھی تھی۔ قاضی کے دو بولوں سے وہ اس کے جسم کا مالک جو بن چکا تھا) کیوں نہ میں ان کمزور لمحوں سے اپنی مراد پاؤں -----

سو اس نے ایاز بیگ کی خاطر پھر سے بننا سنورنا شروع کر دیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر شادی کے ابتدائی دنوں کی سی بن گئی۔ آتے جاتے' اس کی گردن میں بازو ڈال کر اس سے لپٹ جاتی۔ (Intellectual Talk) طاق پر اٹھا کے رکھ دی ایاز کے silly and Stupid Jokes پر خوش دلی سے قہقہے لگاتی۔ اور ایسی ہی ایک رات بے تحاشا پیار کی دولت نچھاور کرتے ہوئے وہ انتہائی میٹھے لہجے میں بولی ----- "جان جی! مجھے جاب کرنے دیں نا!"

اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتا' کوئی انکار بھرا جملہ' کوئی اعتراض' اس نے اپنے لبوں سے اس کے ہونٹوں کو سی دیا۔ جب وہ دوبارہ (Relax) کر گیا تب پھر اس نے ٹھنڈے میٹھے لہجے میں اپنی درخواست کو دہرایا۔ بھیگتی رات کے کسی لمحے میں' پیشتر اس کے کہ وہ تسکین پائے' شیا یاسمین نے اپنی مراد پالی۔

سٹاف روم میں گپیں چل رہی تھیں۔ وہ بھی گاہے گاہے ان کی باتوں میں شامل ہو جاتی۔ سامنے تپائی پر کاپیاں کھلی پڑی تھیں اور ہاتھ میں سرخ پین۔

"آپ کے میاں کیا کرتے ہیں؟؟" وہ نئی بھرتی تھی' بے حد تیز طرار' ہر ایک سے فوراً بے تکلف ہونے والی۔

"Lawyer ہیں -" وہ مختصر سا جواب دے کر پھر کاپیوں پر جھک گئی۔

"How nice میرے میاں بھی وکیل ہیں۔ کیا نام ہے آپ کے میاں کا؟؟؟"

اورنگ زیب قاسمی

"ایاز بیگ"

اس نے یکلخت محسوس کیا کہ پورے کمرے میں سناٹا چھا گیا ہے اور سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔

"نام سنا تو نہیں۔ میاں سے پوچھوں گی' میرے میاں کا نام اعجاز ہے۔ اعجاز کاظمی اور میں شگفتہ ہوں -"

"یاسمین -----" اس نے مختصر سا تعارف مناسب سمجھ کر ایک اور کاپی اٹھائی۔

"کتنے بچے ہیں آپ کے؟"

یاسمین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کو تھا" وہ -----"

بیٹے یا بیٹیاں -----"

"ایک بیٹا عمر چھ سال - نام اسد - بیٹی صفورا۔ عمر پانچ سال - ابھی کچھ اور پوچھنا ہے آپ نے تو جلدی سے وہ بھی پوچھ ڈالیے۔ میرا پیریڈ شروع ہونے والا ہے" وہ دانت کچکچا کر بولی۔

اس کے تند اور تلخ لہجے پر سٹاف روم میں قہقہہ پڑا۔ شگفتہ اعجاز گڑبڑا کے رہ گئی۔ "معاف کیجئے میں تو یونہی پوچھ رہی تھی" وہ کھسیانی سی ہو کر بولی۔

یونہی ----- یاسمین نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا۔ کرید کرید کر دوسروں کے حالات جاننا اور پھر چٹخارے لے لے کر باتیں کرنا اور کہتی ہے' یونہی -----! (My Foot) غصے میں آدھی کاپیاں تپائی سے نیچے گر گئیں مگر اس نے پرواہ کی اور گھنٹی کا انتظار کئے بغیر سٹاف روم سے باہر نکل گئی۔

کھلے دروازے میں سے ایک زوردار قہقہہ باہر لپکا۔ ارے آپ لوگوں نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ یہ خاتون تو خاصی کھسکی ہوئی لگتی ہیں۔"

"بیچاری حالات کی ماری ہوئی ہے ----- ماں باپ کی ناراضگی مول لے کر لو میرج کی۔ میاں نکھٹو نکلا۔ کہنے کو وکیل ہے۔ مگر آج تک کسی نے اسے بار روم میں نہیں دیکھا۔ تھوڑی سی زمین اور کچھ دوکانیں ہیں بس اسی پر اینٹھتا ہے۔ سارا دن چارپائی توڑتا ہے اور شام کو کلب میں جا بیٹھتا ہے -"

دور تک ہمدردی کے پردے میں دل دکھانے والی باتیں اس کا پیچھا کئے گئیں۔

کوئی جائے پناہ نہیں۔

یاسمین! کوئی جائے پناہ نہیں۔

ایسا کب تک چلے گا؟؟؟

اس نے پرس میں سے ٹشو نکال کر آنکھوں کی نمی کو جذب کیا۔ اور سنو خدا کے لئے کبھی بھی (Self-Pity) کا شکار مت ہونا۔ بے موت مر جاؤگی۔ تم کیوں ان گئے گزرے کی عورتوں کی پروا کرتی ہو۔ زندگی تمہاری ہے۔ تمہارا جی چاہے اسے جس طرح' جس انداز سے گزارو کسی کو اس سے کیا؟؟؟

ہاں ----- کسی کو اس سے کیا؟؟

اس نے سر اٹھا کر لمبا سانس بھرا۔ لگتا ہے بلڈ پریشر پھر بڑھ گیا ہے۔ اور آج تو چھینے میں بھی درد ہے۔ کلاس لینے کے بعد (Sick-Room) جاؤں گی -----

ایاز بیگ صبح سے باؤلا ہوا جا رہا تھا۔ چائے کی پیالی ٹھنڈی تھی اس نے اٹھا کر پٹخ دی۔ بیڈ روم کے پچھلے

نیلے رنگ کے قیمتی کارپٹ پر اتنا بڑا دھبہ پڑ گیا۔ یاسمین نے نظریں چرالیں۔ صبح صبح جھگڑا کھڑا کرنے سے فائدہ؟ یوں بھی وہ تقریباً" ہمیشہ ہی لیٹ ہو جاتی تھی۔

"فیروزہ ماسی' صاحب کے لئے تازہ چائے دم کرکے لاؤ۔" اس نے صلح کل لہجے میں کہا یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"تم آج کالج نہیں جاؤ گی۔" ایاز کمبل پھینک کر اٹھ بیٹھا۔

یاسمین نے بالوں کا برش آہستگی سے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اور آئینے کی راہ اس سے نظریں ملائیں "کیوں؟" اس کے لب گولائی کی صورت میں کھلے رہ گئے۔

"میں نے کہہ دیا ہے"

"مگر کوئی وجہ بھی تو ہو"

"وجہ ----- ؟ سنو گی ----- ؟" وہ پنجرے میں بند شیر کی طرح غرایا "کل طارق کے ہاں اس کی مسز نے میرا تعارف یوں کرایا ----- یہ یاسمین کے میاں ہیں۔ وہ جو کالج میں لیکچرر ہیں۔ انتہائی انٹلیکچویل اور خوبصورت خاتون -----"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟؟" وہ بڑے رسان سے بولی۔

"فرق ----- ؟" وہ ابلتے ہوئے غصے سے دھاڑا "میں یعنی ایاز بیگ ایک عورت کے حوالے سے پہچانا جاؤں۔ Shit"

"کیوں ----- عورت ہونا کوئی گالی ہے کیا ؟؟" وہ برابر بحث پر اڑی رہی۔

"زیادہ بک بک مت کرو۔ سنا تم نے؟ آج سے تمہارا کالج جانا بند ہے۔"

"میں جاب نہیں چھوڑوں گی۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور ڈریسنگ ٹیبل پر سے برش اٹھا کر بالوں کو سنوارنے لگی۔ ابھی کسی لمحہ بس آجائے گی اور مجھے پھر ان زہر اگلتی نظروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

"اسد! صفورا! بیگ سنبھالو بچو اور باہر بھاگو ----- شاباش۔ بس آنے والی ہوگی۔ اور سنو فیروزہ ماسی سے اپنا لنچ بکس لے لینا۔ یاد سے -----" وہ اپنی کانپتی آواز کو نارمل بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جونہی بچے ماسی کی ہمراہی میں گیٹ سے نکلے' ایاز نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے برش چھین لیا "میں نے کہہ دیا ہے تم کالج نہیں جاؤ گی۔"

"تم مجھے کالج جانے سے نہیں روک سکتے۔" اندر ہی اندر کھولتا غصہ اسے کمزور کئے دے رہا تھا۔

"اچھا ----- ؟؟" وہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں تولتا ہوا آگے بڑھا اور اسے بازو سے کھینچ کر صوفے پر دھکیل دیا "اب اٹھ کے دکھاؤ۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اٹھنا چاہا۔ مگر یہ کیا! اس کے اپنے جسم نے اس کی خواہش کو رد کر دیا۔ ایاز بیگ جو ایک بلند ستون کی مانند اس کے عین سامنے کھڑا تھا' اندھیرے میں دھندلانے لگا ----- پانی! ----- ایک ناقابل فہم خوف سے اس نے چلانا چاہا مگر آواز حلق سے باہر نکل نہ پائی۔

ایاز بیگ نے غسل خانے کی طرف بڑھتے ہوئے اس کا سر صوفے پر ڈھلکتے ہوئے دیکھا -----

"ہنہ ----- ڈرامے کرنے کی عادی ہے۔"

وہ اس کے ہاتھ سے چھینا ہوا ہیئر برش ہاتھوں میں اچھالتا غسل خانے میں گھس گیا۔

("فنون" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

نیلم احمد بشیر

تھوڑی کھلی تھوڑی بند آنکھیں

مظفر نے ٹیلے پر بیٹھ کر' پورے ماحول پر ایک بھرپور نظر ڈالی' سب کچھ ہر لحاظ سے ٹھیک تھا۔ اس کا آئیڈیل گھر' اب اس کی ملکیت تھا' جس کا سب سے پرکشش حصہ اس کا نیلا نیلا بڑا سا سوئمنگ پول' ایک خوبصورت نیلے ہیرے کی طرح جگمگا رہا تھا۔

اس دوپہر آسمان بھی حیرت انگیز طور پر بدلیوں سے بالکل پاک اور نکھرا تھا۔ نیلے بے داغ سوئمنگ پول میں نیلے آسمان کا عکس اتنا واضح تھا کہ پل بھر کو تو مظفر کو یوں محسوس ہوا گویا اس نے سوئمنگ پول کے ساتھ ساتھ آسمان کے ایک ٹکڑے کو بھی قید کر لیا ہو' اور آسمان قبضے میں ہو تو کس کافر کا جی نہیں چاہتا کہ وہ اس گز بھر آسمان پر ہی چہل قدمی کرنے کی حسرت پوری کرلے۔

مظفر بھی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا اوپر ہی اوپر کو اٹھتا چلا جا رہا تھا' پرواز کر رہا تھا۔

خدا نے اس کا برسوں پرانا خواب پورا کر دیا تھا۔ اس کا اپنا ذاتی سوئمنگ پول اس کے پاس تھا' اس کے لئے وہ جتنی بھی خوشی مناتا کم تھی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اس خواب کی بچپن سے پرورش کی تھی' مگر جوان ہو کر کالج میں داخلہ لینے کے بعد سے تو اس نے اٹھتے بیٹھتے' اس خواب کو ہر دم اپنا ساتھی پایا تھا۔

گجرات شہر کے نواح کے ایک چھوٹے سے چک سے نکل کر جب وہ لاہور شہر کے بڑے سے میڈیکل کالج میں داخل ہوا تو گھبراہٹ کے مارے اس کا برا حال ہو گیا۔ اس وقت اس کی حالت اس مرغی کے بچے ایسی تھی جو پہلی بار مرغی کے پروں کے نیچے سے نکل کر باہر کی دنیا دیکھتا ہے۔ ذرا ذرا سہما سہما۔

جب پہلی بار اسے میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں رات گزارنی پڑی تو اس کے ہوش ہی اڑ گئے۔ کہاں وہ ماں کے ساتھ چمٹ کر سویا کرتا تھا اور کہاں اب ایک کھردرا' تنہا کمرہ اور محبت سے خالی بستر' ساری رات وہ اپنی ماں کے دوپٹے کی خوشبو یاد کرتے کرتے خاموشی سے آنسو بہاتا۔ ڈرتا تھا کہ کسی لڑکے نے اسے اس طرح روتا دیکھ لیا تو سارے ہاسٹل میں اس کا وہ مذاق اڑے گا کہ اس کا جینا دوبھر ہو جائے گا۔

وہ سوچتا تھا یہ سب لڑکے کس طرح ہنستے' بولتے' خوش باش رہ کر وقت گزار لیتے ہیں؟ کیا انہیں اپنے ماں باپ یاد نہیں آتے؟ کیا انہیں اپنے اپنے گھر' اپنے گاؤں کی یاد نہیں تڑپاتی؟ پچھلا سب کچھ بھول جانا ان کے لئے اتنا آسان کیسے ہو کر رہ گیا تھا؟

ہر جمعرات کی شام' وہ باقاعدگی سے اپنے گاؤں جانے کے لئے ہاسٹل سے نکل کر بس میں سوار ہوتا' راستہ کچھ ایسا لمبا تو نہ تھا لیکن اسے بہت لمبا لگتا۔ اپنے گھر' گاؤں' یار بیلیوں کے حسین تصورات میں ڈوبا وہ

پچکولے کھاتی بس میں بیٹھا اونگھتا رہتا۔

اس کی آنکھیں تھوڑی کھلی اور تھوڑی بند رہتیں۔ تھوڑی کھلی اس لئے کہ کہیں وہ نیند خرابی کے عالم میں اپنی ویگن کا سٹاپ مس ہی نہ کر دے اور تھوڑی بند اس لئے تاکہ وہ اس اذیت سے اپنی جان کو کچھ کچھ بچا سکے کہ ابھی اتنا راستہ اور پڑا ہے۔ اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے بہلاوے، کچھ دھوکے اور تسلیاں دیتا وہ اپنے من کو بہلائے رکھتا اور راستہ کٹ جاتا۔

گاؤں آتا تو وہ جلدی جلدی اپنا سفری بیگ تھامے، دوڑ کر چاچا برکت کے تانگے پر سوار ہو جاتا۔ چاچا برکت اسے بچپن سے ہی اپنے تانگے پر مفت سیر کروا دیا کرتا تھا۔ اسے مظفر سے ہمیشہ سے لگاؤ رہا تھا۔

"چاچا! تجھے کیسے خبر ہوئی کہ میں اسی بس سے اور اسی وقت اتروں گا؟" مظفر لاڈ سے پوچھتا۔ تو چاچا ہنس کر جواب دیتا۔

"لو بھلا مجھے کیسے خبر ہو سکتی تھی؟ تانگہ اتفاق سے خالی تھا، سواری ہی کوئی مل نہیں رہی تھی تو کیا کرتا ..... بس کھڑا رہا اور تم آگئے!"

چاچا جھوٹ بول جاتا جس پر وہ دونوں مل کر ہنس پڑتے اور مظفر لپک کر سوار ہو جاتا۔ اپنی گھوڑی سندری دوڑاتے دوڑاتے چاچا اسے بچتے بھر کی گاؤں کی خبریں سنانے لگتا۔ کس کی بیٹی کی شادی کس کے ساتھ ہوئی۔ کس کے بیاہ کا کھانا بدمزہ تھا، کون کھیتوں میں کس کے ساتھ پکڑا گیا اور کس کے بیٹے نے شہر سے اب کی بار ماں باپ کو زیادہ پیسے بھیجے۔

ان دنوں بیرون ملک جانے کا اتنا رواج نہیں تھا اس لئے لوگوں کے کماؤ پوت شہروں سے ہی اپنے ماں باپ کو پیسے بھیجا کرتے تھے۔ باتیں کرتے کرتے جھٹ سے مظفر کا گھر آجاتا۔ جہاں اس کی پیاری ٹھنڈی میٹھی چھاؤں جیسی ماں اور لاٹ صاحب جیسا فخر رکھنے والا ابو اسے دیکھ کر صدقے واری ہونے لگ جاتے۔

اماں اسے بچتے بھر کا بھوکا سمجھ کر کھلانے پلانے لگ جاتی اور ابو اس کی پڑھائی کے متعلق سوالات کرتے کرتے، اسے گاؤں کے حالات بھی بتاتے جاتے۔

ان کی زمینوں کو کلر کھا رہا تھا ابا چاہتے تھے کہ اپنی زمینیں جس طرح بھی ہوں بیچ کر شہر چلے جائیں اور اپنے بیٹے کے ساتھ رہیں، مگر ایسا کرنا ابھی اتنا آسان نہ تھا۔ زمینوں کا گاہک ان کی مرضی کی قیمت دینے کو تیار نہ ہوتا تھا اور اونے پونے بیچنے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا۔

"بس بیٹا! ہم تو دن رات تیرے ڈاکٹر بن جانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ دن جلد لائے اور ہم تیرے ساتھ ہی رہیں۔ اس مرتے ہوئے گاؤں اس کی گندی سیاستوں کو گولی ماریں اور سکھ چین سے زندگی گزاریں!"

ابا مزاجاً شہری تھے۔ انہیں تو ان کے آباؤاجداد نے نسل در نسل زمینوں کے چکروں میں پھنسا دیا اور خود قبروں میں سکون سے جا لیٹے۔ ورنہ ابا خود اپنی پسند سے کبھی بھی گاؤں میں رہنے کو تیار نہ ہوتے۔

انہیں شہر کی اونچی اونچی عمارتیں، سینما بینی، سیر تفریح، رنگینیاں سب بہت اچھی لگتی تھیں۔ جب بھی عدالت کچہری یا کسی اور کام سے شہر جانا پڑ جاتا تو ہمیشہ دو تین دن اوپر ہی لگا کر لوٹتے تھے۔ شہر انہیں جیسے روک سا لیتا تھا۔

گوالمنڈی کی مچھلی، لوہاری کا فالودہ، یار دوستوں سے ملنا ملانا ایک سے بعد ایک چسکہ پورا کرتے۔ چٹکیوں میں وقت گزر جایا کرتا تھا گاؤں بڑی بے دلی سے واپس آتے۔ ان کی ہنگامہ پرور طبیعت، گاؤں کے ٹھہرے پانی اور جیسے سکون اور گھسی پٹی بوسیدہ کہانیوں سے اکتا جاتی، اور وہ کھوئے کھوئے سے رہنے لگتے۔

اماں، جو ان کی طبیعت سے واقف تھیں کبھی کبھی جھلا اٹھتیں۔

"اب واپس آجایئے اصلی دنیا میں چوہدری صاحب! مشتاق ماما کب سے ٹیوب ویل کے پانی کی تقسیم کا جھگڑا نپٹانے کے لئے چکر لگا رہا ہے انھیں اور جا کر اسے مل تو آئیں! آخر ہمسائیگی بھی کوئی چیز ہے!"

ابا جی انہیں ان کے اتنے حسین خواب سے جگا دینے پر برا سا منہ بناتے اور اٹھ کر پگڑی سر پر جما کر بادلِ نخواستہ جوتا تلاش کرنے لگ جاتے۔ مظفر چھٹی پر آتا تو گھر میں گویا بہار ہی آجاتی۔

اس کی بہن عظیم کی لاتعداد، ہرنی کی مانند قلانچیں بھرتی سہیلیاں حیرانی اور تجسس بھری شرمیلی آنکھوں سے اسے دیکھتی اور پلکیں جھپکاتی رہ جاتیں۔ بہانے بہانے عظیم سے ملنے یا اسے بلانے کے لئے آنے لگتیں تو اماں ابا بھی زیرِ لب مسکرانے لگتے۔ ان لڑکیوں کی ماؤں کو بھی عظیم کے گھر لڑکیوں کے جانے پر کوئی ایسا اعتراض نہ ہوتا کیونکہ آخر کو عظیم کا بھائی ڈاکٹر بننے والا تھا، اور اس کے ڈاکٹر بننے میں کوئی خاص دیر بھی نہ تھی۔

مظفر اپنے بچپن کے دوستوں کے ہمراہ بنے کی پرلی طرف والے جوہڑ میں خوب نہاتا۔ جوہڑ کا پانی صاف تھا حالانکہ اس میں بھینسیں بھی نہایا کرتی تھیں مگر مظفر اور گاؤں کے دوسرے لڑکوں کو اس پر کبھی کوئی اعتراض نہ ہوا تھا۔

بچپن سے لے کر جوانی تک جوہڑ میں نہاتے نہاتے مظفر کو اچھی خاصی تیراکی آگئی تھی اسی لئے جب اس نے میڈیکل کالج کا سوئمنگ پول دیکھا تو خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اتنے صاف ستھرے، باقاعدہ قسم کے سوئمنگ پول میں بھی نہا سکے گا، اس لئے جب بھی اسے اس کا موقعہ ملا تو اس نے اس کا خوب خوب فائدہ اٹھایا۔

وہ پڑھائی کے بعد کا سارا وقت سوئمنگ پول میں گزارنے لگا اور سوئمنگ پریکٹس کرتے کرتے اتنا مشاق ہو گیا کہ متعدد بار اس نے کالج میں ہونے والے تیراکی کے مقابلوں میں حصہ لے کر نمایاں پوزیشن بھی حاصل کی۔

میڈیکل کالج کے آخری سال تک پہنچتے پہنچتے اس کے معمولات میں کچھ تبدیلیاں آچکی تھیں۔ اب وہ گھر، ہر جمعرات کے بجائے ہر دوسری جمعرات کو جانے لگا تھا۔

کالج کے سوئمنگ پول میں نہانے کی اتنی عادت پڑ گئی تھی کہ اب گاؤں کے جوہڑ کا پانی اسے گدلا گدلا، گندا اور جراثیم سے پر لگنے لگا تھا، اس کے بچپن کے دوست جب اسے نہانے کے لئے لینے آتے تو وہ کہتا۔

"یار مجھے تو جوہڑ میں نہانے کے بعد جسم پر کھجلی ہونے لگے گی"

اب وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرنے سے بھی کترانے لگا تھا۔ دراصل اب ان میں سے آتی لسی اور گوبر کی ہلکی ہلکی باس سے کالج کے دوستوں کے کولون کی مہک یاد دلا دیتی تھی۔ وہ کتاب آگے رکھ کر پڑھائی کا بہانہ بنا لیتا۔ اور وہ مایوس لوٹ جاتے۔

اورنگ زیب قاسمی

میڈیکل کالج کے آخری سال کے آخر تک پہنچتے پہنچتے اس کے خیالات میں' خوابوں میں ' ایک چاندی کی دیواروں والے خوبصورت محل نما گھر نے بھی پاؤں جمانے شروع کر دیئے تھے۔

اس خوبصورت گھر میں بڑے بڑے 'کمرے اور ایک سوئمنگ پول بھی موجود تھا۔ کمروں میں چلنے پھرنے والی ایک حسین مورت یعنی اس کی بیوی اور ایک دو شرارتی بچے بھی نظر آتے تھے تو اس کے تن بدن میں گرمی سی پیدا ہونے لگتی۔

ایک کمرے میں اس کے ماں باپ بھی آرام چین سے رہتے نظر آتے' اور اس خواب کو جلد از جلد پورا کرنے کے لئے وہ انتہائی جانفشانی کے ساتھ پڑھائی کرنے لگ جاتا۔

میڈیکل کالج کا آخری سال اس کے ماں باپ کی آرزوؤں اور امیدوں کی ناآسودگی کا بھی آخری سال تھا۔ ان کی تنگدستی کے دن دور ہونے والے تھے۔

"مجو کے ڈاکٹر بنتے ہی ہم شہر چلے جائیں گے۔ یہ ٹوٹا پھوٹا گھر بیچ کر کسی اچھی' بارونق' ماڈرن آبادی میں نیا گھر لیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟" ابا حقے کی گڑگڑاہٹ روک کر اماں کو مخاطب ہو کر کہتے۔

"ہاں! ٹھیک ہے۔ ہم بھلا اکیلے یہاں رہ کر کیا کریں گے۔ آخر شمیم کے مستقبل کا تو ہمیں ہی سوچنا ہے۔ یہاں گاؤں میں رہے تو اپنے دہی دقیانوسی' لڑاکے رشتہ داروں میں دینی پڑ جائے گی۔ شہر میں ہو سکتا ہے ..... میرا مطلب ہے مظہر کے دوست ڈاکٹر بھی تو گھر پہ آیا کریں گے آخر .....!"

اماں کی آنکھوں میں امید کے دیئے جھلملانے لگتے اور شمیم بھی پردے کے پیچھے چھپی ایسی باتیں سن کر مسکرانے لگ جاتی۔

مگر نہ جانے کیسی آندھی آئی کہ ان کے سب خواب بھک سے اڑا کر لے گئی' اماں ابا اور شمیم کو تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے۔ مگر مظہر بہت خوش تھا' اس کے اپنے ذاتی' چاندی کے محل جیسے گھر کے خواب کے پورا ہونے کی باری اس کی توقع سے بھی جلدی آگئی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ ڈاکٹری پاس کرکے ہسپتال میں ہاؤس جاب کرتا اسے امریکہ جانے کا ویزا مل گیا۔ اس کے دوستوں کے جتھے کے جتھے امریکہ کو روانہ ہوگئے اور مظہر نے بھی اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

اماں ابا کو تو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے کتنے ہی سالوں سے ایک ساتھ' ایک اچھے گھر میں رہنے کے خواب کی پرورش کی تھی۔ وہ ان کا محبوب خواب ان سے کس طرح چھن سکتا تھا؟ انہیں اکیلا چھوڑ کر بھلا کیسے جاسکتا تھا؟

"لیکن آپ سمجھنے کی کوشش کریں نا! میں امریکہ جا کر وہی روپیہ تیزی سے کماؤں گا جو یہاں کماتے کماتے میں شاید بوڑھا ہو جاؤں۔ اس لئے ایک طرح سے اچھا ہی ہوا ہے۔ آپ لوگ کچھ سال اور صبر کرلیں۔ پھر میں آپ کو جلد ہی اپنے پاس بلوا لوں گا اور ہم اکٹھے رہیں گے۔ آپ مجھے موقع تو دیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں واپس آکر یہیں ایک شاندار پریکٹس کا آغاز کروں۔ یہیں آپ کو وہ سب آسائشیں دے دوں جن کے آپ حقدار اور میں خواہشمند ہوں!"

مظہر اپنے بوڑھے ماں باپ سے ان کے پرانے خوابوں کے ڈبے لے کر اور انہیں نئے نکور خوابوں کے

اورنگ زیب قاسمی

بند ڈبوں کا تحفہ ہاتھ میں تھما کر امریکہ جانے والے جہاز میں سوار ہوگیا۔ اماں ابا نے اس کے جانے کے بعد ڈبے کھولے۔ ان میں خواب تو کم و بیش پرانے ہی تھے لیکن ان پہ نیا ملمع اور قلعی چڑھا دی گئی تھی۔ ڈبے پہ رنگین کاغذ اور گوٹا بھی بالکل نیا تھا۔

اب انہوں نے امریکہ سے آنے والے نیلے خطوں کا انتظار شروع کر دیا۔ کچھ لوگوں کی قسمت میں صرف انتظار ہی لکھا ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انتظار کی نوعیت البتہ بدلتی رہتی ہے۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب انتظار ہی زندگی کی وہ واحد مثبت طاقت بن کر رہ جاتا ہے جو وقت کے تپتے ریگستان میں انہیں گرتے پڑتے مگر بار بار اٹھ کر چلنے پہ مجبور کرتا ہے' کیونکہ منزل ہمیشہ ہی ریگستان کے اس پار سے چمکتے ہوئے سراب کی مانند انہیں اپنی طرف بلاتی نظر آتی ہے۔

یہ انتظار کچھ زیادہ ہی لمبا ثابت ہو رہا تھا' سالوں کے بعد سال یوں گزرتے چلے گئے جس طرح بارش میں ایک قطرے کے بعد دوسرا قطرہ تواتر کے ساتھ چلا آتا ہے۔

مظہر نے روپیہ پیسہ بھیجنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اماں ابو نے گاؤں والے مکان کی حالت بہت اچھی کرلی۔ باغ بھی لگوالیا' سوچتے تھے جب تک بیٹے کے ساتھ نہیں رہنے لگتے اپنے پرانے مکان کو بہتر بنا لینے میں ہی کیا حرج ہے۔

مکان کے بہتر ہوتے ہی شمیم کے لئے ایک اچھے گھر سے رشتہ بھی آگیا اور شمیم اپنے پیا کے دیس سدھار گئی۔

ابا جو ہمیشہ سے ہنگاموں' رونقوں اور رنگینیوں کے شہر لاہور میں رہنے کے تصور میں گم رہتے تھے اب امریکہ کے خیال سے دل بہلاتے بہلاتے بوڑھے ہونے لگے۔ انہیں پتہ تھا مظہر نیویارک میں رہتا ہے اس لئے وہ اکثر اخباروں ' رسالوں سے نیویارک کے بارے میں مضامین ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتے اور معلومات اکٹھی کرتے رہتے۔ سوچتے رہتے لاہور کے بدلے نیویارک ' کچھ ایسا برا سودا تو نہیں۔ خوب مزا آئے گا وہاں تو رہ کر۔

اماں البتہ' اب اس معاملے میں خاموشی اختیار کر چکی تھیں' ان کی بیٹی شمیم اور اس کے بچے ان کا دل بہلانے کو اکثر آتے جاتے رہتے تھے اس لئے وہ بیٹے کی یاد کو کلیجے کی ہوک سمجھ کر اندر ہی اندر دبائے رکھتیں۔ اپنے میاں کی حالت پہ انہیں ترس آتا تھا۔ انہیں دیکھ کر سوچتی رہتیں اور دعا کرتیں یااللہ ان کا بیٹا انہیں امریکہ ضرور بلالے۔ " جتنا انہیں بڑے بڑے شہروں میں رہنے کا شوق تھا اتنا ہی بڑے شہر انہیں اپنے سے دور رکھنے پہ تلے ہوئے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اماں کے دل میں امریکہ جا کر بس جانے کی امید دم توڑنے لگی' کیونکہ مظہر نے چند ایک سالوں سے اس موضوع پہ بات کرنا تقریباً" ختم کر دی تھی۔ شاید اسی میں اس بات کا بھی کوئی دخل تھا کہ مظہر نے وہیں ایک امریکن لڑکی سیلی سے شادی کر لی تھی۔

مظہر نے لکھا تھا کہ سیلی بہت اچھی لڑکی ہے۔ شادی سے پہلے اس نے اسے نیویارک کی سب سے بڑی مسجد میں لے جا کر باقاعدہ مولوی کے ہاتھ پہ اسلام قبول کروایا تھا اور اس کا اسلامی نام سلمیٰ رکھا گیا تھا۔

اماں ابا نے سن کر فوراً" ہی لال عروسی جوڑا بھجوادیا اور تاکید کی کہ شادی پاکستانی' رسم و رواج کے مطابق کی جائے اور لال جوڑا ہی دلہن کو پہنایا جائے سیلی اور مظہر کی شادی کی تصویریں آئیں تو اماں ابو نے انہیں

چوما' آنکھوں سے لگایا' سارے گاؤں کو دکھایا اور اتنی خوبصورت گوری چٹی دلہن پر خوب داد پائی۔
سفید ' روایتی کڑھائی والے عروسی لباس میں دلہن واقعی بہت پاکیزہ اور معصوم لگ رہی تھی۔ مظہر نے بھی سوٹ زیب تن کیا تھا اور ہوٹل کی تصاویر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ شادی کی پارٹی بہت زبردست انداز میں دی گئی تھی۔

کچھ عرصے بعد جب پھر سے تصاویر آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی بہو سلمیٰ نے اب کی بار شلوار قمیض پہن رکھی ہے۔ اماں ابا نے سارے گاؤں میں فخریہ طور پر وہ تصویریں دکھائیں اور اترا کر بولے۔
" بھئی آخر اپنے بچے نے اسے اپنے طور طریقے پر ہی تو چلانا ہے۔ مسلمان کرکے شادی کی ہے اور اہل کتاب تو وہ پہلے سے تھی' اس لئے سمجھو کہ ایک عیسائی کو مسلمان کرکے اس نے ایک نیک کام انجام دیا ہے !"
لوگ مطمئن ہوگئے۔ اماں ابا کی عزت رہ گئی۔
کچھ سال اور بیت گئے۔

لوگ جب کچھ چہ میگوئیاں کرتے اماں بڑے حوصلے سے کہتیں نہ بہن بڑی اچھی ہے ہماری بہو ! آٹھ سال شادی ہونے کو آئے۔ مجال ہے اس نے بچو پر کوئی غلط اثر ڈالا ہو۔ برابر اسی طرح ہمیں ماہوار خرچ بھیجتا ہے جس طرح شادی سے پہلے بھیجتا تھا۔ یہی تو فرمانبرداری ہے اس کی۔ اگر کوئی اور ہوتی تو اب تک تو کان بھر کر ہمارا خرچ بند کروا چکی ہوتی۔ بچوں کے بھی عید کارڈ اور تصویریں آتی رہتی ہیں ' ہمیں باقاعدگی سے سلام لکھواتے ہیں ہمیں آخر اس عمر میں اور کیا چاہیے۔ عزت اور عزت کی دو روٹیاں ۔ الحمد للہ خیر صلا اور وہ ہمیں مل رہی ہیں بس جی اللہ کا بڑا کرم ہے !"

اماں کو اپنے دوپٹے کے پلو سے چپکا کالج جاتے وقت رونے والا بچو یاد آتا تو خواہ مخواہ اپنے پرانے صندوقوں کو الٹ پلٹ کرنے لگ جاتیں جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں مگر پتہ نہ چل رہا ہو کہ کھویا کیا ہے۔
اب تو انہیں ایسے لگنے لگا تھا جیسے ان کا کوئی بیٹا تھا ہی نہیں وہ کوئی دور پار کا رشتہ دار تھا جو دور پار کے کسی ملک میں قیام پذیر تھا' جس کا بھی کبھار خط' ڈرافٹ ' کارڈ' تصویریں آجایا کرتی تھیں' مگر اک آنچ لگی سی آس تھی جس کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں ٹوٹتا تھا۔

پہلے پہل مظہر لکھتا تھا کہ وہ فلیٹ میں رہتے ہیں اور فلیٹ میں اتنی جگہ نہیں ہوتی کہ زیادہ آدمی آرام سے رہ سکیں' پھر اس نے لکھا کہ اب وہ شہر سے باہر ایک چھوٹے سے قصبے میں شفٹ کر رہا ہے۔ وہاں سکون اور چین کے علاوہ بڑے بڑے خوبصورت کئی کئی ایکڑ زمین پر پھیلے ہوئے گھر ہیں جن میں سے اس نے ایک پسند کرکے خرید لیا ہے۔

سترہ سال امریکہ میں گزار لینے کے بعد اب وہ مکمل طور پر وہاں سیٹل ہو چکا تھا اس لئے اب اس نے ایک بڑا گھر لینے کے بعد انہیں یہ اطلاع دے کر حیران کر دیا تھا کہ وہ انہیں اب کی بار گرمیوں میں امریکہ بلانے کا پکا ارادہ رکھتا ہے۔

چونکہ پچھلے چند سالوں سے مظہر نے انہیں یہ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ وہ انہیں مستقلاً بلائے گا اس لئے وہ اچھی طرح جانتے اور سوچنے سمجھتے تھے کہ اب وہ صرف وہاں وزٹ کے لئے ہی جائیں گے ۔ مل کر واپس

آجائیں گے ' ایک دوسرے سے اس موضوع پر بات کرتے تو یہی کہتے کہ ہم اس عمر میں اپنا ملک اپنے لوگ اپنے رشتہ دار' دوست چھوڑ کر جا بھی کیسے سکتے ہیں۔
" آخر علیم بھی تو ہے ! میں تو اپنی بچی کو اکیلی چھوڑ کر کبھی نہ جاؤں ' وہاں مستقلاً" رہائش کے لئے !" اماں ' ابا کو خالی خولی سمجھانے لگتیں ۔ ابا پہلے ہنکارے بھرتے پھر کہتے۔
" ہاں اپنے سنگی ساتھیوں کے بغیر تو میں بھی اس عمر میں اب نہیں رہ سکتا بھئی۔ وہ اگر ہمیں مجبور کرکے روک لے تو بھی کئی بار تو سوچنا پڑے گا مجھے بھی !" وہ بھی بھاروں پر چڑھ جاتے' اور اشارۃً اپنے یاروں' دوستوں کی اس منڈلی کا ذکر کرتے جو ہر شام مغرب کے بعد بڑے پیپل کے نیچے بچھائے گئے بڑے سے پلنگ پر جما کرتی تھی۔

" ہنی ! کیا واقعی تمہارے والدین اس بار گرمیاں گزارنے یہاں آرہے ہیں ؟ " مظہر کی بیوی سلمیٰ نے اوون میں سے کیک نکالتے ہوئے پوچھا۔
" ہاں ڈیئر ! میرا خیال ہے اس بار انہیں بلوا ہی لیں تاکہ یہ کام بھی پورا ہو۔ ورنہ یو نو ! ساری عمر میرے سر پر یہ تلوار لٹکی رہے گی کہ میرے والدین نے یہاں آنا ہے ۔"
" ہاں یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ جو کام ہونا ہے ہو جائے تاکہ ہم لوگ پھر سکون سے اپنا بھی کچھ پلان بنا سکیں۔ تمہیں پتہ ہے نا اس سال بچوں کو ڈزنی لینڈ اور ہلانٹ رش موور دکھانے کا وعدہ کیا ہوا ہے ؟ "
سیلی نے یاد دلایا۔
" یاد ہے بابا سب یاد ہے ! تم فکر کیوں کرتی ہو۔ میں اپنے بچوں کی خوشی کے لئے انہیں ان کی پسندیدہ جگہوں پر بھلا کیوں نہ لے جاؤں گا' ایسا کیسے ممکن ہے !"
سیلی بچوں کو لے کر پیانو سبق کے لئے ان کی پیانو ٹیچر مسز راجر کے گھر چلی گئی اور مظہر' کچن میں رات کا ڈنر بنانے کے لئے کھانے کا سامان چیک کرنے لگا۔

سامان کاؤنٹر پر سیٹ کرکے وہ گھر کی صفائی میں جٹ گیا' وہ اور سیلی گھر کی صفائی خود ہی مل جل کر کرتے تھے۔ ہیوی کلیننگ کے لئے البتہ کبھی کبھار ایک میڈ بلوالی جاتی تھی۔
صفائی کرنے کے بعد وہ اپنے بڑے سے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھ کر آرام کرنے لگا۔ اسے اپنے نئے' بڑے سے گھر کو دیکھ کر ایک عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کہاں سے چلا تھا اور کہاں آگیا تھا۔ اسے اپنے اوپر فخر سا محسوس ہونے لگا۔

پتھر اور ماربل سے ملا کر تعمیر کئے گئے اس گھر کی شان ہی نرالی تھی۔ اس چھوٹے سے ٹاؤن میں اس سے زیادہ خوبصورت اور اچھا گھر شاید ہی کوئی اور رہا ہوگا۔ اور قیمت بھی بہت مناسب تھی صرف ایک لاکھ ڈالر ۔ رقم کی ادائیگی بھی اس پر بوجھ نہیں بنی تھی کیونکہ بیس ہزار ڈاون ' منٹ دے کر باقی رقم بینک نے مارگیج کی تھی جس کے تحت پندرہ سال میں گھر کی پوری رقم کی قسطوں میں ادائیگی ممکن ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے مظہر نے بڑے آرام سے یہ گھر خرید لیا تھا اور اب اسے وہ اور اس کی فیملی بھرپور طریقے سے انجوائے کر رہے تھے۔
گھر میں تین بیڈ روم نیچے تھے اور دو اوپر کی منزل میں جو گیسٹ روم کے طور پر استعمال کئے جاسکتے تھے۔

اورنگ زیب قاسمی

بڑا سا خوبصورت' ماڈرن اشیاء سے مزین کچن تھا جس میں کھانا پکانا بھی راحت محسوس ہوتا تھا۔

ڈرائنگ روم کی بڑی سی کھڑکی سے نیچے جاتی ہوئی مڑتی تڑتی سڑکوں کا نظارہ اتنا دلکش دکھائی دیتا تھا کہ مظہر گھنٹوں وادی کے حسن پر نظریں ٹکائے مبہوت کھڑا رہتا' رات کو چاروں طرف سناٹا اور تاریکی کا راج ہو جاتا تو جلتی بجھتی بتیاں ایک طلسمی انداز میں ٹمٹمانے لگ جاتیں۔ یوں لگتا جیسے جگنوؤں کے ان گنت قافلے اپنی منزلوں کی جانب رواں دواں ہوں۔

سارا گھر ایک پروقار' پرشکوہ محل کی مانند تھا مگر اس کا جو حصہ مظہر کو سب سے زیادہ عزیز تھا وہ اس کا طالب علمی کے زمانے کا خواب' ایک طویل و عریض سوئمنگ پول تھا گھر کے پچھلے حصے میں جہاں باؤنڈری کے ساتھ ہی پہاڑیاں شروع ہو جاتی تھیں' یہ پول جھلملاتے ہوئے نیلے صاف پانی سے مزین ایک نیلا نگینہ ہو ہو دکھائی دیتا۔

سوئمنگ پول کے دو حصے تھے۔ ایک کم گہرا اور ایک زیادہ گہرا اور ایک مضبوط ریشمی رسی ان دونوں کی تقسیم کی نشاندہی کرنے کے لئے پول کے بیچوں بیچ بندھی رہتی تھی۔

گہرے پانی والے حصے کے سرے پر ایک لمبا سا' لچکدار ڈائیونگ بورڈ بھی نصب تھا جسے غوطہ خوری کے لئے استعمال کیا جاسکتا تھا پول کے ساتھ ساتھ اس کے لوازمات بھی خرید کر رکھے گئے تھے جن میں کلورین کی وافر مقدار میں سپلائی اور ایک پول ویکیوم کلینر سرفہرست تھے۔

سردیوں میں تو خیر پول کو ہر وقت پول کے لئے بنے ہوئے ایک خاص قسم کے ترپال لما کور سے ڈھکنا ہی کافی تھا مگر گرمیوں میں اس کی دیکھ بھال کے لئے خاصے انتظامات کرنے پڑتے تھے۔

مظہر صبح سویرے ناشتے کے بعد پول کی صفائی کے لئے لمبے لمبے ربڑ پائپ والا ویکیوم کلینر لگا کر پانی میں سے رات بھر کے گرے ہوئے کیڑے مکوڑے پتے اور الم غلم صاف کرتا۔ اگر کچھ کوڑا بچ جاتا تو بڑی سی جالی والی ایک چھجا نما چیز ڈال کر اس سے خود ہاتھوں سے نکال دیتا۔ اس کے بعد واٹر ہیٹر آن کر دیتا کیونکہ گرمیوں کے موسم میں بھی پانی کبھی اتنا گرم نہیں ہوتا تھا کہ اس میں یونہی جا گھسیں' اسے نیم گرم ٹمپریچر پر لانے کے لئے واٹر ہیٹر کی ضرورت پڑتی تب جا کر وہ کہیں نہانے کے قابل ہوتا۔ گھر میں پول کے ہونے کی سب کو بہت خوشی تھی۔

غم تھا تو صرف ایک کہ آؤٹ ڈور پول تھا اور گرمیوں کا موسم اتنا مختصر اور کم گرم کہ وہ اسے زیادہ عرصے کے لئے استعمال نہیں کر سکتے تھے ۔ مئی سے لے کر جولائی تک یوں تو موسم گرما ہی ہوتا ہے لیکن ویسٹرن نیویارک جیسے ٹھنڈے علاقے میں ہر شہر اور ہر قصبے میں اتنی معمولی سی گرمی پڑتی ہے کہ لوگ گرمی کے لئے ترستے ہی رہ جاتے ہیں ۔ اور سوئمنگ کے لئے تو معمولی سی گرمی سے کام نہیں چلتا۔ گنتی کے چند ہی ایسے گرم دن آتے ہیں۔ جن میں درجہ حرارت اسی یا نوے ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے ایسے دنوں کو بہت خاص تصور کرکے ان ہی میں سارے فنکشن' پارٹیاں اور پکنکیں رکھی جاتی ہیں ایک دوسرے سے میل ملاقات کی جاتی ہے تاکہ گرمی کا جشن منایا جاسکے۔

مظہر اور اس کی فیملی روز ٹی وی پر موسم کی پیشین گوئی سنتے اور امید کرتے کہ ٹی وی گرم دنوں کی نوید دے گا کیونکہ جس دن ذرا سی بھی گرمی ہو اس دن سوئمنگ پول میں نہانے کا بہت لطف آتا اور سوئمنگ

پول تو پوری فیملی کی جان تھا۔

ان کے گھر کے بیرونی حصے کے خاتمے کے ساتھ ہی ننھی ننھی خوبصورت سرسبز پہاڑیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ اس علاقے میں قدرتی حسن کی اتنی بہتات تھی کہ کبھی کبھی تو ایسا لگتا جیسے اللہ میاں خود نیچے اتر کر اپنے ہاتھوں سے وہاں حسن' رنگ و بو کا چھڑکاؤ کر گئے ہوں۔

گرمی والے دن مظہر' اس کی بیوی اور بچے پورا دن پول کے کنارے گزارنے کا پروگرام رکھتے۔ پہلے وہ چاروں جی بھر کے سوئمنگ کرتے' پھر تین چار بجے کے قریب سوئمنگ کا سلسلہ بند کر دیتے۔

اگلے پروگرام کے تحت وہ سب ٹریک شوز پہن کر ہائکنگ کے لئے پہاڑیوں میں بنی ننھی ننھی پگڈنڈیوں کی سیر کو نکل جاتے۔ چھوٹا بیٹا جنگلی سٹرابیریز اور دوسرے جنگلی پھول اکٹھا کرنے لگ جاتا اور بڑا اپنے باپ کے ساتھ اوپر ہی اوپر بڑھتے چلے جانے کی ریس لگاتا۔ واپسی میں وہ لوگ گھر آکر اپنے جوتے اور جیکٹس اتارتے' امریکن لوگوں کی طرح آتش دان کی جلتی آگ پر مارش میلوز سینک سینک کر کھاتے اور ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتے ۔

کبھی کبھی انہی پہاڑیوں پر سے کوئی آوارہ ہرن بھٹک کر نیچے اتر آتا اور ان کے سوئمنگ پول کی باؤنڈری کے اس پار حیرت سے کھڑا ادھر ادھر تاکنے لگتا تو سیلی اور مظہر جلدی جلدی اپنے بچوں کو بلا کر کھڑکی میں سے انہیں یہ نظارہ دکھا کر خوش ہوتے۔

اماں اور ابا کے آکر رہنے کا ایک چھوٹا سا مسئلہ یہ بھی تھا کہ سیلی اور بچے ان سے اردو پنجابی نہیں بول سکتے تھے۔ ابا تو خیر کچھ انگریزی بول لیتے تھے لیکن اماں یس نو سے زیادہ آگے نہ جا سکتی تھیں۔

مظہر نے اسی لئے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی تھی تاکہ انہیں گھر پر خود اٹینڈ کر سکے' اور دونوں پارٹیوں کے درمیان رابطہ قائم کروا سکے۔

اماں ابا اپنے بیٹے کے طویل و عریض بنگلے اور شان و شوکت کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کا بیٹا اب اتنا بڑا ڈاکٹر بن گیا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں رب کا شکر آنسو بن کر چمکنے لگا۔

اپنے پوتوں کو دیکھ کر تو وہ خوشی سے کھل اٹھے۔ اتنے پیارے اور گورے بچے تھے۔ رنگ کے معاملے میں چلو اچھا ہی تھا کہ اپنے مظہر پر نہیں گئے تھے کیونکہ اس کا رنگ گندمی سے کچھ گہرا تھا۔ نقش و نگار البتہ اس کے بہت اچھے تھے لیکن بچے ماں پر چلے گئے تھے جن کے نقش و نگار کچھ ایسے برے بھی نہیں تھے۔

فر فر انگریزی بولتے ہوئے امریکن بچے' اپنے دادا دادی کو کسی دوسرے سیارے سے آئی ہوئی مخلوق سمجھ کر کچھ کھنچے کھنچے سے تھے۔ مظہر نے انہیں گودی میں بھر بھر کر اپنی اماں اور ابا کے قریب لا کر بٹھانے کی کئی بار کوشش کی مگر وہ ہر بار کوئی بہانہ بنا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

مظہر نے اپنے ماں باپ کو اپنے گھر کا گریڈ ٹور دیا۔ ایک ایک چیز دکھائی' ان سے امریکہ' اپنی زندگی' اپنے مسائل کی باتیں کیں۔ وہ بھی اس سے شمیم' اس کے بچوں' اپنے رشتہ داروں' اس کے پرانے دوستوں کی باتیں کرتے رہے جنہیں وہ مصنوعی دلچسپی سے سنتا رہا۔

ابا اس سے اپنی گروی زمینوں کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے کہ وہ کیا کریں ؟ کیا وہ ان کے بک جانے اور اچھی قیمت ملنے کی امید میں رہیں' اسی حالت میں اپنی پوری زندگی انتظار کریں یا اس نے کچھ اور ان کے

اورنگ زیب قاسمی

لئے سوچ رکھا تھا؟ گھڑی گھڑی وہ یہ بات سنجیدگی سے کرنے کے لئے موقع ڈھونڈتے مگر ہر بار مظفر اتنا مصروف نظر آتا کہ چپکے رہ جاتے۔

کبھی وہ بچوں کو گیمز پر لے جارہا ہوتا' کبھی سیلی کے ساتھ مل کر کچن میں کوکنگ کررہا ہوتا اور کبھی اپنے لاڈلے سوئمنگ پول کی صفائی کرتا نظر آتا ایک بار جب ابا نے سوئمنگ پول کے پاس جاکر اس سے یہ بات کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیا تو مظفر بات سن کر پل بھر کو خاموش ہو گیا۔

" ابا آپ ایسا کریں جو بھی قیمت ملے بیچ دیں اور گاؤں سے نکلنے کی کریں۔ لاہور جاکر کوئی گھر وغیرہ کرائے پر لے لیں۔ خرچ تو میں آپ کو بھیج ہی رہا ہوں تو آپ کو کیا ضرورت ہے کہ آپ ان بیکار زمینوں کی حفاظت کے لئے وہاں بیٹھے رہیں۔ اچھا ذرا یہ کلورین کی باٹل تو مجھے پکڑایئے - پانی میں کلورین کی کچھ کمی ہوگئی ہے اور اس کی مقررہ مقدار رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے ورنہ پانی نہانے کے قابل نہیں ہوتا!"

ابا اس کی اپنی زمینوں کے بارے میں اتنی سی دلچسپی دیکھ کر خاموش ہوگئے اور اسے کلورین' سوئمنگ پول کے شفاف پانی میں ملاتے دیکھنے لگے اتنا شفاف پانی تو انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کبھی ان کی زمینیں بھی اتنی ہی کھری اور بے داغ ہوا کرتی تھیں۔

"کیا کبھی سوئمنگ پول کے پانی کو کلر کیا جا سکتا ہے؟" ابا اپنے آپ سے ہی بڑبڑا کر سوال کرنے لگے۔

رات اماں اور ابا اوپر کے گیسٹ روم میں لیٹے آپس میں ایک دوسرے سے یوں نظریں چرا رہے تھے جس طرح دونوں ایک دوسرے سے اپنے اپنے قصور چھپا رہے ہوں۔ جس طرح دونوں ہی مجرم ہوں۔

انہیں اس پہاڑی وادی میں ڈھلکے چھپے اس شاہانہ گھر اونچے لونچے سپل کے درخت' سائیں سائیں کرتی خاموشی اجنبی مکینوں اور غیر غیر سے ماحول میں وحشت سی محسوس ہونے لگی تھی۔

نہ جانے یہ کس کا گھر تھا؟ وہ کہاں پڑے ہوئے تھے؟ جو کچھ بھی تھا' اپنا نہیں بلکہ غیر تھا۔

" یہ تو سارا وقت سوئمنگ پول کی صفائی یا پھر اپنے بچوں کے ساتھ سوئمنگ کرنے میں ہی لگا رہتا ہے!"

ابا ہلکی سی شکایت کرتے ہوئے اماں سے کہتے۔

" آپ کو تو پتہ ہے اسے بچپن سے ہی نہانے کا کتنا شوق تھا۔ سارا سارا دن جوہڑ میں گھسا بھینسوں کے ہمراہ نہاتا رہتا تھا۔ اب اللہ نے اسے اتنا خوبصورت جوہڑ دے دیا ہے تو اچھا ہے نا۔ اللہ اسے اور ترقی دے۔ ہم تو خوش ہیں اگر وہ خوش ہے!"

اماں کی آواز میں جابجا ٹھنڈی سانسیں تھیں اور انہیں اپنی آواز اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ دوپہر کے وقت مظفر اور لڑکے پول میں چھلانگیں مارتے' تو سیلی ایپرن باندھے ان کے لئے کبھی ڈرنکس' کبھی سنیک تو لئے اور کبھی سنیکس لا کر انہیں دیتی رہتی۔ پول کے اردگرد کرسیاں اور میز پڑے رہتے تھے جن پر بیٹھ کر اماں ابا یہ نظارہ دیکھ کر وقت گزارا کرتے۔

انہیں امریکہ آئے ہوئے اب دو ہفتے گزر چکے تھے۔ اس دوران مظفر سے کرنے والی سب باتیں ان کے پاس ختم ہوگئی تھیں۔ حیرت کی بات تھی ورنہ وہ تو سوچتے تھے کہ اتنے بہت سے سالوں کی باتیں کرتے انہیں کچھ سال تو لگ ہی جائیں گے۔ سب رشتہ داروں کا سرسری طور پر حال وہ بھی پوچھ ہی چکا تھا۔ زمینوں کا

اورنگ زیب قاسمی

موضوع بھی کلر زدہ اور بوسیدہ ہو چکا تھا۔

فورتھ آف جولائی کا لانگ ویک اینڈ آرہا تھا۔ امریکنوں کو تین دن لمبے ویک اینڈ کی ہمیشہ ہی بہت خوشی ہوتی ہے اس لئے وہ اس چھٹی کو بھرپور طریقے سے منانے کے لئے کوئی نہ کوئی سیر تفریح کا پروگرام 'کوئی گیٹ ٹوگیدر ضرور رکھتے ہیں۔

مظفر اور سیلی نے بھی اس بار فورتھ آف جولائی کے یوم آزادی کے ویک اینڈ پر ایک بہت بڑی پول پارٹی کا انتظام کیا تھا۔ پول کے اردگرد کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ مظفر اور سیلی نے اپنے کچھ امریکن دوستوں اور نواحی علاقوں میں رہنے والے پاکستانی ڈاکٹروں کی فیملیوں کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔

تیز موسیقی کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مگر اس تیز شور میں بھی ابا اور اماں کو غسل خانے میں ظہر کی نماز کے لئے وضو کو جاتے ہوئے کچھ آوازیں سنائی دے گئیں۔ مظفر اور سیلی اپنے بیڈ روم میں تھے۔ نہ جانے کیا مسئلہ تھا۔ مظفر کچھ ملتجیانہ سے انداز میں سیلی سے کہہ رہا تھا " ہنی میں سمجھتا ہوں! مگر پلیز تم بھی تو ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ ایک (Conservative) سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر تمہیں مردوں کے ساتھ اور نہانے کے کاسٹیوم میں ملبوس دیکھ لیا اور نہ جانے کیا سوچیں گے! انہیں اچھا نہیں لگے گا!"

" حد ہوتی ہے مظفر! کتنے دنوں سے میں نے صرف اسی لئے سوئمنگ نہیں کی کہ سوئمنگ کے لباس میں مجھے دیکھ کر وہ اچھا نہیں محسوس کریں گے آخر آج پول پارٹی ہے! اتنا گرم دن ہے! آج بھی میں سوئمنگ نہ کروں' یہ تو میرے ساتھ بے انصافی ہے! آخر سوئمنگ سوٹ میں عریانی کہاں سے آگئی؟ تم لوگوں کے کلچر کو میں تو خیر بالکل نہیں سمجھ سکتی!" سیلی کا "بایا" منہ پھلا کر بیٹھ گئی تھی کیونکہ کچھ دیر کے لئے کوئی آواز نہیں آئی۔

" تمہیں پتہ ہے کتنے تھوڑے سے گرم دن نصیب ہوتے ہیں سوئمنگ کے لئے - وہ بھی ہم چھوڑ دیں صرف اس لئے کہ انہیں میرا سوئمنگ کا لباس پہننا گوارا نہیں ہوگا۔ میں تو اس منطق کو بالکل قبول نہیں کر سکتی۔ اگر ایسا ہی تھا تو انہیں سردیوں میں بلا لیا ہوتا۔ کم ازکم ہماری بیوٹی فل سمرویکیشن تو ضائع نہ کرتے یہاں آکر! سارا سمر گزار کر جب وہ جائیں گے تو نہانے کے لئے وقت ہی کون سا بچے گا اور پھر اگلے سال تک کا انتظار کرنا ہوگا! میں تو گھٹ کر مرجاؤں گی اس طرح!"

ابا ساری انگلش سمجھ رہے تھے مگر انہیں اماں کو ترجمہ کرکے بتانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے سب کچھ اماں کے گوش گزار کر دیا۔

اماں اور وہ دونوں مجرموں کی طرح شرمندہ سے اپنے کمرے میں بند سے ہو کر رہ گئے۔ انہیں تو خبر بھی نہیں تھی کہ وہ اتنے قصور وار تھے۔ مگر اب کیا کرتے۔ وہاں تو بیٹے کے رحم و کرم پر تھے۔ اور کوئی جگہ ہوتی تو بھاگ کر ٹانگہ پکڑ لیتے اور اپنے گھر کی راہ لیتے مگر اس پہاڑ کی چوٹی تو ایک ایسے جزیرے پر واقع تھی جس کے چاروں طرف گہرا سمندر تھا' اور اتر کر بھاگنے کی کوئی صورت ممکن نہیں تھی۔

ایک پاکستانی ڈاکٹر کی بیوی نصرت' اماں جی کو سلام کرنے اندر آگئی اور خوب گھل مل کر باتیں کرنے لگی۔ اماں خوش ہو گئیں' کتنے عرصے بعد اپنی زبان میں کسی سے بات کرنے کا موقع ملا تھا۔

"چلئے نا اماں جی! آپ کہاں اندر گھسے بیٹھے ہیں دونوں! باہر چل کر دیکھیں پول پارٹی کتنے زوروں سے چل رہی ہے چلئے نا میں آپ کو برگر کھلاؤں۔ اتنا گرم دن ہے تو۔ ہم لوگ تو ایسے گرم دن کے لئے ترس کر رہ جاتے ہیں یہاں۔"

نصرت بڑی ہنس مکھ تھی ضد کرکے اماں کو کھینچ کر باہر لے گئی اور اماں ابا لوگوں کی رونق دیکھ کر کچھ دیر کے لئے خوش ہو گئے۔

"یار! بڑا خوش نصیب ہے تو! کاش میرے والدین بھی زندہ ہوتے تو میں بھی انہیں یہاں بلاتا! کتنا عرصہ رہیں گے یہ لوگ؟"

نصرت کا شوہر ڈاکٹر علی کوک کی چسکیاں لگاتا مظہر سے گفتگو کرنے لگا۔

"میری خوش نصیبی ہے کہ یہ لوگ یہاں آ گئے ہیں! یار کئی سالوں سے کہہ رہا تھا مگر اماں ابا مانتے ہی نہیں!" مظہر نے جواب دیا۔

"چل یار اب تو انہیں چار چھ ماہ رکھ کر اپنی ساری حسرتیں پوری کر لے!"

مظہر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

"نہیں یار! اتنا لمبا عرصہ تو یہ نہیں رہ سکتے یہاں کیا کریں گے بور ہو جائیں گے' بوڑھے لوگ اپنے ٹھکانے پر ہی ٹھیک ہوتے ہیں! یہ تو بس اگلے ہفتے جا رہے ہیں سمر ویکیشن کا ٹائم ہے' پھر ہم لوگوں کے کچھ اپنے بھی پلانز ہیں!"

مظہر نے اپنے بڑے بیٹے کو ایک اونچی چھلانگ مار کر ڈائیو کرتے دیکھ کر دل ہی دل میں ایک فخر سا محسوس کیا۔

"کم آن ڈیڈی جوائن اس!" اس کے دونوں بیٹے اسے پکارنے لگے۔

"آئی ایم کمنگ!" اس نے جلدی سے اپنی کمر کے گرد لپٹا تولیہ اتار پھینکا بورڈ سے اچھل کر ایک زبردست ڈائیو لگا کر نیلے نیلے خوبصورت سوئمنگ پول کی گود میں یوں سما گیا جس طرح بچپن میں وہ اپنی ماں کے خوشبودار پلو میں سما جایا کرتا تھا۔

("اوراق" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

تنوع
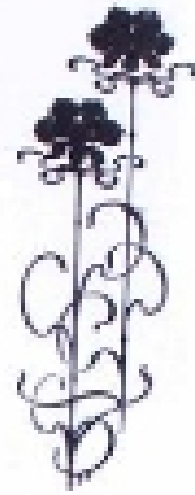
انسائیکلوپیڈیا غلطانیکا

(آ)

آلو: آلو بنیادی طور پر ایک ترکاری ہے جو کھانے اور رکھنے (کولڈ سٹوریج میں) کے کام آتی ہے۔ اس کا شوربہ بعض معزز گھرانوں میں شوق سے پیا جاتا ہے۔گوف اور گھامڑ شخص کو پیار سے آلو شوربہ کہتے ہیں۔ کلین شیو آدمی کو چھلے ہوئے آلو سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ شعراء ہر دور میں آلو کا قافیہ بے دریغ استعمال کرتے آئے ہیں۔ چودھویں صدی ہجری کے ایک معروف سیاست دان کی شان میں لکھے جانے والے قصیدے کا مطلع ملاحظہ فرمائیں:

آرزو بھنڈی ہے کہ آلو ہے ہمارا لیڈر
کس کی خالہ کا ہے خالو یہ ہمارا لیڈر

آم: منطقہ حارہ کا ایک لذیذ پھل ہے جسے اس کی قدرے فحش اور قطعی نامناسب شکل و صورت کی وجہ سے کھایا کم اور چوسا زیادہ جاتا ہے۔ عام روایت کے مطابق آم پھلوں کا بادشاہ ہے شاید اسی لئے مشہور اردو شاعر مرزا غالب نے اس کے چند نثری قصیدے بھی رقم کئے ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں برصغیر کے طول و عرض میں عوام نہایت رغبت سے آم کھاتے تھے جبکہ خواص نہ صرف آم کھاتے بلکہ پیڑ بھی گنتے تھے اسی طرح سرکاری اہل کار آموں کی گٹھلیاں شمار کرتے اور حکام بالا ان کے دام کمانے میں مصروف رہتے۔ آم پارٹیوں کے نام پر سماجی تعلقات کو فروغ دیا جاتا اور کام نکلوانے کے لئے آموں کی ڈالیاں نذر کی جاتیں۔ اس زمانے میں سیاست دان بھی ایک دوسرے کو آموں کے ٹوکرے ارسال کرتے جس کو اصطلاحاً" چونسا ڈپلومیسی کہا جاتا۔ ابتدا میں آموں کی صرف ایک ہی قسم تھی یعنی میٹھے آم: سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ کئی اور اقسام بھی دریافت ہوئیں جیسے تخمی' قلمی وغیرہ' سرکاری ادیب عام طور پر قلمی آم استعمال کیا کرتے تھے بعدازاں طوطا اور لنگڑا آم مشہور ہوئے۔ جدید ترین قسم انور رٹول کی رینجل پرائس سب سے زیادہ رہی اور سندھری آم کو ایک ایسے وزیراعظم سے منسوب کیا گیا جس کو اس دور کے فوجی آمر نے عہدے سے برطرف کر دیا تھا۔

آمریت: مطلق العنانی یعنی کسی شخص کا کلی طور پر اختیار و اقتدار پر قابض ہونا آمریت کہلاتا ہے۔ یہ نظام سراسر غیر اسلامی ہونے کے باوجود نہ صرف مسلمانوں کے مزاج کے عین مطابق ہے بلکہ زیادہ تر رائج بھی رہتا ہے۔ ہر آمر گنتی کے چند دنوں کے لئے آتا ہے مگر چند دنوں بعد ہی گنتی بھول جاتا ہے۔ میرے ایک قول کے مطابق آمریت ایسا نامکمل ضابطہ حیات ہے جو مکمل طور پر واہیات طرز زندگی کو جنم دیتا ہے۔ زیادہ تر آمر

باوردی پیدا ہوتے ہیں مگر شیروانی اور جناح کیپ میں فوت ہونا پسند کرتے ہیں۔ مختصر سے مختصر آمریت تقریباً" دس سال حکومت کرتی ہے اس کے بعد اگلے دس سال آمریت کی باقیات حکمران رہتی ہیں۔ دانشور صحافی اور کالم نگار آمر کا حلقہ انتخاب ہوتے ہیں جو چند مہینوں میں مفادات کے عوض اسے کروڑوں عوام کا واحد نجات دہندہ ثابت کر دیتے ہیں۔ ایک آمر جماعتی سیاست کو نماز باجماعت کی حد تک ہی برداشت کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ لسانی اور نسلی تعصبات کے بل پر اقتدار کو طول دیتا ہے۔ عوام کی دگرگوں حالت پر آنسو بہانا اور غیر ممالک میں بینک اکاؤنٹ کو ترقی دینا آمریت کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ہر آمر ملکی بقا کے نام پر حکومت سنبھالتا ہے اور ذاتی بقا کے اختتام پر ہی جان چھوڑتا ہے۔

(ا)

اتفاق: باہمی میل جول ' اتحاد اور محبت کو اتفاق کہتے ہیں جبکہ قرضے لے کر معاف کرانے کو حسن اتفاق کا نام دیا جاتا ہے۔ جو چیز اچانک وقوع پذیر ہوا سے بھی اتفاق کا کرشمہ تصور کرتے ہیں۔ مثلاً" اچانک کوئی شوگر مل لگا لینا یا دفعتاً" کوئی بینک خرید لینا وغیرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کے دوران اتفاق میں کافی برکت رہی۔ غیر نمائندہ حکمرانوں کے درمیان عوام کا خون چوسنے کے نقطے پر مکمل اتفاق تھا۔ علماء دانشور اور ادیب زیادہ ذاتی ترقی پسندی سے اتفاق کرتے تھے۔ عوام کی خدمت کے لئے قائم سرکاری و نیم سرکاری ادارے لوٹ کھسوٹ کے نظام کے ساتھ مکمل طور پر متفق تھے۔ تیسری دنیا کے ممالک کو اپنی توانائی فراہم نہ کرنے' جہالت کو دور نہ کرنے اور لوگوں کو بنیادی سہولیات زندگی فراہم نہ کرنے جیسے اہم مسائل پر بڑی عالمی طاقتوں میں کامل اتفاق رائے موجود تھا۔ پاکستان میں جدید سائنسی تحقیق کے دوران خون کا ایک نیا گروپ دریافت ہوا جسے اتفاق گروپ کا نام دیا گیا۔ مگر یہ خون صرف اراکین پارلیمنٹ اور بیورو کریسی کو ہی لگایا جاسکتا تھا۔

استاد: علم کی روشنی پھیلانے والے برگزیدہ اور محترم انسان کو کسی زمانے میں استاد کہا جاتا تھا۔ عصر حاضر میں صورت حال یکسر مختلف ہے۔ فراڈ اور دھوکہ دہی میں یدطولی رکھنے والے ہر شخص کو استاد کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اکثر استاد اپنے آپ کو سرکا خطاب دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں ماسٹر بھی استاد ہی کی متبادل چیز ہے مگر بدقدری زمانہ کے باعث کپڑوں کی سلائی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

معاشرے میں استاد کی برکت سے ہی تعلیمی ادارے ویران اور ٹیوشن سنٹر آباد ہیں۔ امتحانات کے سنٹر ٹھیکے پر لینا پرچے آؤٹ کرنا اور گائیڈیں لکھ کر رزق حلال کمانا استادوں کے دل پسند مشاغل ہیں۔ ایک زمانے میں استاد نالائق شاگردوں کو مرغا بناتے تھے لیکن جدید دور میں لائق شاگرد (خصوصاً" بڑے ہو کر سی ایس پی بننے والے) نالائق استادوں کو مرغا بناتے ہیں۔ ویسے بھی آج کل کے استادوں کو عزت سے زیادہ اچھی تنخواہ کی ضرورت ہے۔ فی زمانہ معلمی کو کوئی اچھا پیشہ تصور نہیں کیا جاتا اور ایسا کوئی استاد مشکل سے ہی ملتا ہے جس کی تین چار منگنیاں نہ ٹوٹ چکی ہوں۔ استاد کتابوں سے اتنا ہی دور بھاگتا ہے جتنا شاگرد استاد سے جو استاد شومئی قسمت سے نوکری کے تیس سال پورے کرلے محکمہ تعلیم اسے ترقی دینے پر غور شروع کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسی فیصد استاد نوکری کے ساتھ ساتھ پرچون کی دوکان کرنے پر مجبور ہیں۔

افسر: انسانی خدوخال کی مالک اکڑی ہوئی بے حس چیز کو افسر کہتے ہیں ماتحتوں کی اے سی آر کو دی سی

اورنگ زیب قاسمی

آر کا اہم قیمت بنانا اور اعلیٰ حکام کی سرزنش کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ایک نجیب الطرفین خوشامدی افسر کے بنیادی اوصاف ہیں اس کے علاوہ فائلوں کو دبانا" سلانا یا بھگانا کسی بھی افسر کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

قوم کا یہ خود ساختہ خادم عمر عزیز کے ساٹھ سال سرکاری ٹیلی فون گاڑی اور گھر کے حصول میں صرف کرنے کے بعد باعزت ریٹائرڈ ہو جاتا ہے دوران ملازمت اسے کافی ملکی اور غیر ملکی دورے پڑتے ہیں مگر ملازمت کے بعد صرف ایک دورہ پڑتا ہے جسے دل کا دورہ کہتے ہیں اور یہ واحد دورہ ہوتا ہے جس کا کوئی ٹی اے ڈی اے نہیں ملتا۔ ایک افسر عام انسانوں سے زیادہ فری ہونا افورڈ نہیں کرتا۔ اس کی اس ادا کو تجاہل افسرانہ کہتے ہیں۔ افسر کی شدید کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے رشتے ملازمت کے دوران ہی طے کر دے تاکہ شرح طلاق میں زیادہ اضافہ نہ ہو۔ بعد از ریٹائرمنٹ جسے کوئی سلام نہ کرے وہ افسر نہایت سخت تصور کیا جاتا ہے۔

ایسے افسران بہت کم عرصہ زندہ رہتے ہیں۔ بعض پرائیوٹ ادارے ٹیکس بچانے اور دیگر ہیرا پھیریاں کرنے کے لئے ریٹائرڈ افسروں کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں۔ افسر اور گریڈ کا چولی دامن کا ساتھ ہے چولی تنگ کرنے اور دامن پھیلانے والے افسر کو کامیاب افسر کہا جاتا ہے۔

انڈہ: انڈہ مرغیوں کی طرف سے انسانوں کو رشوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے تاکہ وہ ان بے چاریوں کو "کڑک ہونے" تک چھری نہ پھیریں۔ انڈے کو استعمال کرنے کے کئی طریقے ہیں فرائی، آملیٹ، حلوہ وغیرہ ابلے ہوئے انڈے کو "آنڈہ" کہتے ہیں۔ انڈوں کا تیل یعنی روغن بیضہ مرغ بعض انسانی اعضا کو فعال بنانے کے لئے اکسیر ہے۔ سونے کا انڈہ دینے والی مرغیوں کی اس انحطاط پذیر معاشرے میں بڑی قدر ہے جبکہ بارش مرغ حضرات بانگیں دے کر قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے پر مامور ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں انڈے کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کا رواج عام ہوا۔ یہ ہتھیار مخصوص افراد کے خلاف ہی استعمال کیا جاتا مثلاً" سیاست دانوں، فرقہ پرست علماء شاعر اور عوامی اداکاروں وغیرہ۔ موجودہ دور میں استاد جن شاگردوں کو زیادہ قابل اور کسی لائق سمجھیں انہیں امتحان میں نمبروں کی بجائے انڈہ دیتے ہیں۔ ایسے ہی ایک شاگرد نے "زمین گول" ہے کے موضوع پر اپنا مقالہ تحریر کرتے ہوئے دلیل دی کہ:

سر گول ہے جناب کا ڈنڈا گول ہے

استاد نے اس مصرعے پر یوں گرہ لگائی:

دیکھو جو آنکھیں کھول کے انڈہ بھی گول ہے

(ب)

بادشاہ: سلطان، شاہ، مالک، حاکم، سردار، یہ سب بادشاہ کی معنوی اقسام ہیں جبکہ صحیح تلفظ پادشاہ ہے۔ ہر نسل اور قوم کا بادشاہ الگ ہوتا ہے دیگر حیاتیات بھی اپنا بادشاہ رکھنا پسند کرتی ہیں۔ گلاب پھولوں کا بادشاہ ہے۔ آم پھلوں کا اور کریلا سبزیوں کا۔ ہر بادشاہ سر پر تاج پہننا اور رعایا سے نفرت کرنا ضروری خیال کرتا ہے۔ خراج لینا، سزا دینا نشہ کرنا، مالش کروانا، ایک بادشاہ کے روایتی مشاغل ہیں اکثر بادشاہ بر سر دربار خواجہ سراؤں سے اظہار محبت کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ سال میں ایک بار اپنے وسیع حرم کا دورہ کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود کثیر الاولاد کا اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ کچھ بادشاہوں کو کبوتر بازی کے ساتھ

ساتھ انصاف پسند کہلوانے کا بھی شوق تھا۔ اس مقصد کے لئے وہ کوٹھوں پر گھنٹیاں اور دروازوں پر زنجیریں نصب کراتے سائلوں کے سر قلم کرکے انصاف کا بول بالا کرتے۔ ایک بادشاہ کے عہد میں تو داد رسی اور وظیفہ زوجیت ہم معنی الفاظ قرار دیئے گئے۔

انیسویں صدی عیسوی میں ہر لوفر لفنگا اور آوارہ گرد کو بادشاہ کہہ کر پکارا جانے لگا۔ یہ حضرات دوکانوں کے تھڑوں پر تشریف فرما رہتے اور ملکی و عالمی سیاست پر سیر حاصل بحث کرتے کبھی کبھار نماز اور سگرٹوں کے ٹوٹے چننا ایسے بادشاہوں کا خاص وطیرہ تھا۔ الیکشن کے دنوں میں یہ عزت مآب ہستیاں اپنے خادموں یعنی امیدواروں کو باقاعدہ درشن کرواتیں اور الیکشن کے بعد فوراً" اپوزیشن میں شامل ہو کر دوبارہ اپنے پرانے منشور پر عمل پیرا ہو جائیں یعنی ناکام۔ ناکام اور صرف ناکام

بجلی: طوفان باد و باراں کے دوران بادلوں میں قیام پذیر یہ آفت سماوی پہلے تو خوب کڑکتی ہے۔ پھر چپکے سے کسی غریب کی جھونپڑی پر گر جاتی ہے آج کل مصنوعی برقی قوت کو بجلی کہتے ہیں جو عام طور پر پانی کو آہنی پنکھے پر گرا کر حاصل کی جاتی ہے۔ اسی بجلی دنیا پر حکومت کرنے کا ایسا راز ہے جسے غریب ممالک بھی نہیں پاسکے شاید اسی لئے وہ اسے چرانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں ہمارے ہاں جو مولوی زیادہ زور لگا کر تقریر کرے اسے مولانا بجلی کہتے ہیں اس کے علاوہ سولہ سال سے کم عمر کی حسیناؤں کے انگ انگ میں جو سیمابی کیفیت پائی جاتی ہے اسے بھی ماہرین طب شرقیہ نے بجلی ہی کا نام دیا ہے۔

لوڈشیڈنگ پر قابو پانے کی خاطر واپڈا نے مندرجہ بالا دونوں ذرائع پر توجہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ بجلی جاتی بہت ہے مگر آتی صرف بل کی صورت میں ہے۔ بادل بجلی اور برسات کو شاعروں کے علاوہ فلم سازوں نے بھی بہت استعمال کیا ہے نتیجتہ" حکومت بجلی کے علاوہ بادل اور برسات پر بھی اقرا سرچارج عائد کرنے پر غور کر رہی ہے۔ قدیم اردو شاعری میں آشیانے پر بجلی گرا کے عاشق کو ناکوں چنے چبوائے جاتے ہیں آج کل محبوب کی بجلی کٹوا کر اسے زیر کیا جاسکتا ہے۔

بکری: بکری انتہائی مفید جانور ہے قبل از پیدائش سے بعد از مرگ تک دودھ گوشت اور ایندھن کی فراہمی کا ذریعہ ہے معاشرے کے کمزور اور بے سہارا افراد کو بکری کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ فلموں میں ہیرو جب اپنے دس بارہ "پٹ کے" مخالفین کو "بکری" کہہ کر للکارتا ہے تو فوراً" تتر بتر ہو جاتے ہیں اردو زبان کے مشہور ادیب منشی پریم چند کا قول تھا کہ جسے کوئی غم نہ ہو وہ بکری خرید لے مگر اس کے باوجود حکمران طبقہ اراکین اسمبلی کے ساتھ ساتھ غریب لوگوں کی خرید و فروخت کے دھندے میں مصروف رہتا ہے۔ بکری کو بعض معاملات میں انتہائی معصوم چیز تصور کیا جاتا ہے۔ جبکہ بکرا اپنے پورے اعضائے رئیسہ کے ساتھ کافی سرکش اور خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ بکریوں کو ریوڑ کی صورت میں رکھا جاتا ہے اور چھری پھیرنے سے ذرا پہلے قصائی حضرات ان کی معقول آؤ بھگت کرتے ہیں فیشن ایبل بکریوں کو "ٹیڈی بکری" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بکریاں بہبود آبادی کے پروگرام سے مستثنیٰ قرار دی گئی ہیں۔ بکری اور بکرے کے حیاتیاتی مسائل کو شعراء نے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ ایک شاعر یا شاید شاعرہ کا شعر ملاحظہ ہو:

بکری کے ساتھ ساتھ تنانے کی ضد کریں
بکرے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

اورنگ زیب قاسمی

(پ)

پارلیمنٹ: پارلیمنٹ ایک ایسی جگہ ہے جہاں سب " اہل زبان " اور صرف ایک " صاحب کلام " ہوتا ہے - پورے ایوان میں جو شخص سب سے کم بولے اسے سپیکر منتخب کر لیا جاتا ہے۔ اپنی ساخت کے اعتبار سے یہ چیز انتہائی نازک واقع ہوئی ہے۔ لہٰذا بار بار ٹوٹ جاتی ہے۔ ایک سیاسی مفکر نے تجویز پیش کی تھی کہ جو اسمبلی تین بار ٹوٹ جائے اس کا نام " دل عاشق " رکھ دیا جائے۔ پارلیمنٹ میں کئی طرح کے بل پیش ہوتے ہیں مثلاً " کیفے ٹیریا کا بل' اراکین کی مراعات کا بل' ایسے بلوں کی تو اپوزیشن بھی مخالفت نہیں کرتی۔ پارلیمنٹ میں اراکین چھیڑ چھاڑ کے انداز میں ایک دوسرے پر ہلکے پھلکے الزامات عائد کر کے خوب ڈیسک بجاتے ہیں اگر کبھی کوئی رکن غلطی سے یا جذبات میں آکر استعفیٰ پیش کر دے تو اسے فوراً" عوامی مفاد کے کسی بل کی طرح نامنظور کر دیا جاتا ہے۔

پارلیمنٹ میں آنے کے لئے اراکین الیکشن کے آتشی گولے سے گزرتے ہیں اور پھر اس کو اپنی جنم بھومی تصور کر لیتے ہیں اراکین سے پارلیمنٹ کو خالی کرانے کے لئے کبھی سارجنٹ ایٹ آرمز اور کبھی مارشل لاء کی مدد حاصل کی جاتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ادارہ قانون سازی کے لئے ہے مگر یہاں قرضوں کی منظوری' گلیوں اور نالیوں کی تعمیر' پلاٹوں کی الاٹمنٹ اور گھوڑوں کی خرید و فروخت جیسے اہم ضروری کام سرانجام دیئے جاتے ہیں۔

(ت)

تاریخ: کسی زمانے میں یہ چیز اپنے آپ کو بہت دہراتی تھی مگر اب نجانے کیوں اسے چپ سی لگ گئی ہے۔ رشتے میں جغرافیہ کی رضاعی بہن ہے پہلے صرف بھائی کو ہی بدلنے کی عادت تھی مگر اب بہن بھی اسی راہ پر چل پڑی ہے مسلمانوں کی تاریخ مہینے کی آخری تاریخوں کی طرح انتہائی درد ناک ہے مگر اس کے باوجود وہ مستقبل کو یکم تاریخ کی طرح روشن قرار دینے پر مصر ہیں۔ مورخ حضرات زیادہ تر حکمرانوں کے ساتھ غیر ملکی دوروں پر رہتے ہیں نتیجتہ" ہر جابر حکمران ایک دو سال کے بعد نیک دل اور فرشتہ سیرت مشہور ہو جاتا ہے۔

ہماری تاریخ کا سب سے روشن باب عدالتی تاریخ پر مشتمل ہے - مقدمات زیادہ تر تصفیہ طلب رہتے ہیں سائلان اور مسئول علیہاں کے مابین تاریخ لینے پر بحث تکرار ہوتی ہے۔ مسئول علیہاں زر کثیر صرف کر کے لمبی تاریخ ڈلوا لیتے ہیں اور سائل بے چارہ کبھی انصاف اور کبھی وکیل کے دروازے پر دستک دیتا رہتا ہے۔
موجودہ دور میں تاریخ کی جن اقسام کا چرچا ہے وہ درج ذیل ہیں :

انسانی حقوق کی تاریخ' جبر کی تاریخ' تاریخ فرشتہ' اور مہینے کی پہلی تاریخ وغیرہ وغیرہ۔

تبخیر: مسک بھاپ' خفیف سی حرارت' وہ بخارات جو کھانا کھانے کے بعد دماغ کو چڑھتے اور جسم کو بھی قدرے گرما دیتے ہیں اگر بخارات جذبات پر اثر انداز ہوں تو پھر جذباتی تبخیر کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ کچی عمر کے عشق کو عام طور پر جذباتی تبخیر کا شاخسانہ تصور کیا جاتا ہے۔ تبخیر معدہ کے شکار لوگ اپنی آدھی عمر بیت

اورنگ زیب قاسمی

کی خدمت اور باقی آدھی بیت سے نفرت میں بسر کرتے ہیں۔ یہ لوگ جب زندگی سے مایوس ہو جائیں تو پھر حقے سے دل بہلاتے ہیں یا پھر سیاسی جلسے سنتے ہیں۔ سیاسی تبخیر کے غبار سے مارشل لاء کا جن برآمد ہوتا ہے جس کو دوبارہ بوتل میں بند کرنے میں ایک عشرہ لگ جاتا ہے اسی طرح ادبی تبخیر انشائیہ' ہجو اور نثری نظم تخلیق کرتی ہے بھاری بھر کم نقاد عموماً" تبخیری تنقید کے قائل ہیں اور اصطلاحوں کی جگالی کو اسلوب تصور کرتے ہیں۔ ادب میں تخریبی اور تعمیری تنقید کے درمیانی عرصے میں تبخیری تنقید سے ہی کام چلایا جاتا ہے۔ اس دوران ادب کی سالانہ تبخیری کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں اور تبخیر ایوارڈز کا اجراء ہوتا ہے جس کی شکل حقے سے ملتی جلتی ہے۔ بہترین ادیب کو تمغہ حسن تبخیری کار کردگی دیا جاتا ہے جس پر حسب ذیل مصرعہ کندہ ہوتا ہے۔

تبخیر وستاں اول طاؤس و رباب آخر

(ٹ)

ٹانٹ : کھوپڑی' چندیا .... ان نحوی مطالب کو فقروں سے واضح کرنا مقصود ہو تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ دارا حضور کی ٹانٹ کتنی روشن ہے یا پھر حضرت لنگر لے شاہ کی ٹانٹ مبارک پر کوے ٹھونگے مار رہے ہیں مگر انیسویں صدی عیسوی میں ٹانٹ کا مطلب سر کے بالصفا حصے پر چپت رسید کرنا لیا جاتا ہے۔ مثلاً " جلسہ عام میں کسی سیاست دان سے اگر کوئی عام فانی انسان اس کی خفیہ دولت کے بارے میں سوال کرتا تو ارشاد ہوتا کہ بیٹھتے ہو یا ایک ٹانٹ لگاؤں .... ! اسی طرح کسی عالم دین : دنیا سے اس کے پانچوں عقد مبارک کی شرعی حجت کے بارے میں استفسار پر کچھ اس اس طرح کے پھول جھڑتے ..... ایک ٹانٹ دو اس شیطان کو !

ان بے تقصیر دہ پہ تاثیر مفاہیم کے علاوہ لفظ ٹانٹ ذرا کم برے معنوں میں بھی یوں استعمال ہوتا یعنی اس نے مجھ پر ٹانٹ کی یا وہ میری ٹانٹ برداشت نہ کر سکا۔

جدید لفظی تحقیق کے مطابق ماہرین موسیقی خالصتاً" طوائفانہ آہنگ سے گانے والی کو " تائی " کہتے ہیں اور اگر گانے والی کی عمر چالیس سے زائد ہو تو پھر اسے " آنٹی تائی " کہا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مرزا ظاہر دار بیگ اور پدرم سلطان بود قسم کے افراد کو " ٹانٹے خاں " یا نشینے خاں " کہتے ہیں - ہارس ٹریڈنگ کے دور میں جس غائطہ بانڈہ سے نشستوں کی بندربانٹ ہوئی اس کے نتیجے میں پیدا شدہ صورت حال کی وضاحت کے لئے " ٹانٹ بانٹ " کی اصطلاح وضع ہوئی استعمال ملاحظہ ہو:

وزیراعظم نے صوبوں کی تقسیم کے سلسلے میں ٹانٹ بانٹ کا مظاہرہ کیا ہے یا ------ وزیراعلیٰ ناجائز طور پر وزارتوں کی ٹانٹ بانٹ کر رہے ہیں۔

(" رجحانات " لاہور)

صلاح الدین حیدر

دو حکایتیں

شکراجی بھگت اور خونی کبوتر

سنا ہے ایک جنگل کے کسی گھنے درخت پر ایک شکراجی حکمران تھے۔ ان کی عقابی نظروں اور فولادی پنجوں کی دہشت اس قدر تھی کہ پرندے اپنے گھونسلوں میں ہی ان کی لمبی عمر کی دعائیں مانگتے ہوئے مرجایا کرتے تھے اور وہ کبھی اف بھی نہ کرتے تھے' بلکہ اس کے برعکس شکراجی کے نفس کی پاکیزگی سادگی اور رزق حلال سے خصوصی دلچسپی کا بہت احترام کرتے تھے۔

شکراجی جب کبھی درخت پر چکر کاٹ کر کسی چڑیا' لالی یا کبوتر کو اپنی فولادی گرفت میں لیتے اور اس کے پھڑ پھڑاتے وجود میں اپنی شفیق چونچ سے رنگ بھرتے تو ایسے مرحلے پر درخت کے کم و بیش تمام پرندے مل کر شکراجی کی عظمت کے گن گاتے۔ وہ جس پرندے کو بھی اپنی نظر عنایت سے نوازتے۔ تو پہلے اپنا احترام اس کی روح کی گہرائیوں میں اس طرح اتار دیتے کہ پرندے کو شکراجی کے پنجوں میں موت حیات ابدی معلوم ہونے لگی۔ شکراجی پرندے کو نوچتے ہوئے باور کراتے کہ گدھ ایک ناپاک جاندار ہے اور اس کی چونچ سے کسی پرندے کے گوشت کا نوچا جانا ایک بڑی بدبختی ہے۔ پس عظمت اس میں ہے کہ طاقت ور شاہین کی چونچ کے روبرو خوشی کے ساتھ اپنا سر گوں کر دیا جائے۔ اس درخت پر ایک فلسفی الو بھی رہتا تھا جو ایک فاصلے پر مستقل مزاجی کے ساتھ بیٹھا شکراجی کو شاہینی نظروں سے گھورتا رہتا۔ کئی بار شکراجی نے سوچا کہ الو پر حملہ کیا جائے لیکن وہ اس کی نظروں کی تیزی اور تلوار کی طرح چمکتی چونچ کی تاب نہ لاسکے اگرچہ انہیں یقین تھا کہ وہ دنیا کے ہر پرندے کو شکست دے سکتے ہیں البتہ کسی کے بارے میں شبہ ہو جائے کہ وہ طاقت میں برابر ہے تو یقین پر خوف کی مصلحت حاوی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ شکراجی کو ڈر تھا کہ کہیں چھوٹے پرندے الو کی مقناطیسیت کی زد میں آکر بغاوت نہ کر دیں چنانچہ انہوں نے کئی پرندوں کو الو کا ایجنٹ ہونے کے شبہ میں اپنے پنجوں کی گرفت میں بھینچا اور پھر اپنی تفتیشی چونچ سے ٹکڑے کرتے ہوئے الو کی نحوست سے تعاون کے جرم میں اعتراف جرم بھی کرایا۔ لیکن ان تمام جارحانہ کاروائیوں کے باوجود فلسفی الو کے استقامت بھرے انداز سے گھورنے کے عمل میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ شاید یہ حالات تھے یا شکراجی کی باطنی دنیا میں کوئی انقلاب برپا ہورہا تھا کہ انہوں نے پہلی بار الو کی محبت کی نظر سے دیکھتے ہوئے صوفیانہ گداز کے ساتھ اعتراف کیا کہ بڑھتی ہوئی ضعیفی کے پیش نظر اب ان کے لئے "جھپٹنا پلٹنا" اور اس نوعیت کی دیگر سرگرمیوں کا جاری رکھنا ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں کمزور پرندوں پر طاقتور چونچ سے زخم لگا کر شکار کرنا بھی پرندوں کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی

اورنگ زیب قاسمی

ہے۔ لہذا کیوں نہ "ترک چونچ" مذاکرات کا آغاز کیا جائے ------ الو میاں نے یہ بھاشن سن کر فلسفیانہ انداز سے دیدے گھمائے اور شکراجی کو مخاطب کرکے آگاہ کیا کہ بھائی! یہاں صرف میں ہی ایک پرندہ نہیں ہوں۔ جب تک آپ چھوٹے پرندوں کو مذاکرات کی دعوت نہیں دیتے' میں بھی آپ کے مفادات پر نظر رکھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ علاوہ ازیں صرف بیانات سے سالہا سال کی کشیدگی دور نہیں ہو سکتی لیکن شکراجی نے الو کی باتوں پر توجہ دیئے بغیر یک طرفہ اور رضا کارانہ طور پر چونچ کا استعمال ترک کرنے کا اعلان کر دیا اور ایک اونچی اور سرسبز شاخ پر اپنے پروں میں خون آشام' چونچ کو لپیٹ کر جا بیٹھے۔ کئی پرندوں نے تو شکراجی کے بھگت ہونے کا فوراً" یقین کر لیا۔ کبوتروں کی کئی ٹکڑیوں نے اعلان کر دیا کہ ہم نے اپنی غٹرغوں سے شکراجی کو بھگا دیا ہے۔ تاہم بعض سبزہ سیاہ تھے اپنی عظمت و پاکیزگی کی بنیاد پر "نقابوات" برپا کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ بعض کبوتروں نے تو شکراجی کے انداز میں گردن پھلا کر اور چھوٹے پرندوں کو اپنی مغرور نظروں سے ڈرا کر "لا اینڈ آرڈر" قائم کرنا شروع کر دیا۔ کئی کلوٹیوں نے مار مار کر جنگلیوں کو لہولہان کر دیا۔ ان حالات میں ایک دن الو نے پھر امن و امان کے مسائل کی طرف شکراجی کی توجہ دلائی اور درخت پر لمبی چونچ کی ذمہ داریوں سے انہیں آگاہ کیا۔ ان حالات میں درخت کی اونچی شاخوں پر پہلی "شکراجی' کبوتر" کانفرنس منعقد ہوئی جس میں کبوتروں کی طرف سے فاختائی نے خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے شکراجی کی قیادت' شرافت اور گوشت نوچنے کی غلاظت آمیز قدیم پالیسیوں کو خلوص دل کے ساتھ سراہا اور ان کے بھگت بننے کے نئے اعلان نامے کا بھی خیر مقدم کیا لیکن جن کبوتروں کو اپنے ہی جیسے کبوتروں کے خون کی چاٹ لگ گئی تھی وہ اس محفل میں شکراجی کو شاہینی نظروں سے دیکھتے ہوئے شریک ہوئے۔ شکراجی بھگت نے کبوتروں کے لئے جام صحت تجویز کیا اور ترک چونچ مذاکرات کامیاب بنانے پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ پھر کبوتروں کی طرف سے فاختائی آگے بڑھے۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے شاہین کو گلے لگایا۔ جس کے جواب میں شکراجی نے اپنی چونچ سے کبوتر فاختائی کا بوسہ لیا ------ اور اس طرح انہیں گلے لگایا کہ پنجوں سے نکل کر فاختائی کے گوشت کے پرزے دور دور تک بکھر گئے ------ اور درخت کی شاخ ایک عرصہ بعد کبوتر کے گرم خون سے رنگ دار ہو گئی ------ اور یوں درخت پر پرندوں کے لئے ایک نئے پرامن زمانے کا آغاز ہوگیا۔

چڑیا کی کہانی

ایک بار شکراجی بھگت لمبی اڑان کے بعد درخت پر پرندوں کو اپنی آنکھوں کی پر استقامت وحشت سے نواز رہے تھے کہ گدھ جی کی جہالت اثر مسکراہٹ نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا جو ان کی لمبی اڑان پر طنز کرتے ہوئے فرما رہے تھے کہ پہاڑوں کی چٹانوں اور درختوں کی اونچی شاخوں پر بسیرا کرنے کے باوجود آپ تنہا ہیں اور کوئی چڑیا بھی کبھی آپ کے خوابوں کی دنیا میں نہیں مسکرائی۔

شکراجی نے اپنی آنکھوں کی پراسرار چمک سے درخت کے ہر گوشے پر وار کرتے ہوئے کہا "بھائی گدھ جی! شکرے کے نصیب میں تو تنہا رہنا لکھا ہے۔ آپ مردار خور ہیں۔ جہاں چاہیں منہ مار سکتے ہیں' لیکن بندے کی کوسٹ محنت تو ان چھوٹے پرندوں کے ساتھ ہے جنہیں عام زبان میں رزق حلال کہتے ہیں۔ اب آپ خود غور فرمائیں کہ کیا کوئی ایسا نیک نسب اور شریف خاندان کا چڑا ہے جو اپنی چڑیا سے میرا بیاہ کرنا پسند کرے؟"

کرنا اتفاق ہوگا۔ جی ہاں شاعر کو اتفاق ہوگا۔ گلوکاری کے بارے میں ہمارا تو اتنا ہی علم ہے کہ جو بات کہتے ہوئے شرم آئے اسے گا دو' لیکن جب لتا جی نے کہا کہ " مہدی حسن صاحب کے گلے میں بھگوان بولتا ہے۔ " تو ہم نے فوراً یقین کر لیا' کیونکہ گاتے ہوئے جیسے وہ منہ بناتے ہیں اس سے تو واقعی لگتا ہے کہ ان کے گلے میں کوئی ہے۔ اردو ادب میں گلے کے زور پر بڑی شاعرات نمایاں ہوئیں۔ گوہر بائی بھی گلے کے زور پر شاعرہ کہلائی یہ تو بعد میں عورتوں میں بند گلے کا ڈیزائن رواج پایا۔ پھر بھی خوبصورت شاعری وہ شاعری ہوتی ہے جسے کوئی خوبصورت کرے۔ ایک شاعرہ نے کہا لگتا ہے اب میں موٹی اور بھدی ہوگئی ہوں۔ پوچھا " آپ کیسے کہہ سکتی ہیں ؟ " کہا " اب نقاد میرے شعروں میں وزن کی غلطیاں نکالنے لگے ہیں۔ " بہرحال پروفیسر صاحب شاعری کو کام سمجھ کر کرتے ہیں ! اس پر ہمیں اعتراض نہیں مسئلہ یہ ہے کہ وہ جب کام شروع کرتے ہیں تو پھر کام تمام کرکے چھوڑتے ہیں۔ وہ ہر کام محنت سے کرتے ہیں۔ آرام بھی کر رہے ہوں تو لگتا ہے کہ محنت کر رہے ہیں۔ ہم نے پوچھا "طالب علمی میں کبھی کلاس میں لیٹ ہوگئے۔" کہا " ہمارے زمانے میں کلاس میں طلبہ آپ کی طرح لیٹ نہ جاتے تھے بیٹھے رہتے تھے۔" زمانہ طالب علمی میں موصوف امتحان کے دنوں میں نہانا اور کپڑے بدلنا بند کر دیتے۔ یوں طلبہ انہیں سونگھ کر اندازہ لگاتے کہ امتحان میں کتنے دن رہ گئے ہیں۔ ان دنوں موصوف صفائی کا اس قدر خیال رکھتے کہ تولیے سے منہ تک نہ پونچھتے کہ کہیں تولیہ میلا نہ ہو جائے۔ چارپائی پر بیٹھ کر پڑھائی کر سکتے ہیں مگر بیٹھے یوں جیسے پڑھائی نہیں کر رہے چڑھائی کر رہے ہیں تب تک چارپائی پر بیٹھے رہتے جب تک چارپائی نہ بیٹھ جاتی۔ فائنل کے امتحان کے بعد جب کمرے سے نکلے تو ان کا بیس پونڈ وزن کم ہو چکا تھا بعد میں نہائے تو پانچ پونڈ اور کم ہوگیا۔

بحیثیت ڈاکٹر انہوں نے ملک سے سگریٹ ختم کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اب تو اتنے ماہر ہوگئے ہیں کہ بیس پچیس سگریٹ منٹوں میں ختم کر سکتے ہیں۔ شکر ہے کہ ملک سے شراب ختم کرنے کی نہیں ٹھانی۔ ویسے شراب پینا چھڑانے کا ایک طریقہ ہے کہ شراب کو فریز کر لیا جائے اور پھر اسے پینے کی بجائے کھلایا جائے۔ انہوں نے " رقعہ " لکھا دلیب مرزا نے اسے فلم بنا کر دل جیت لیا۔

ہماری پنجابی فلموں میں آجکل کود اتنی ہوتی ہے کہ فلمی ہیروئین کو عام زندگی میں بھی دیوار دیکھتے ہی کودنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔ مگر ڈاکٹر امیر صاحب فلموں میں کوانٹٹی کی بجائے کوالٹی کے قائل ہیں۔ کوانٹٹی کے قائل ہوتے تو فلم کی ہیروئین "انجمن" ہوتی ویسے پروفیسر صاحب خواتین پر نظریں ڈالتے ہیں جیسے ڈال نہیں رہے نظر اتار رہے ہیں۔ جیسے ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب کے چہرے پر ایسا " مذہبی پن " ہے کہ وہ پلے بوائے بھی پڑھ رہے ہوں تو یہی لگتا ہے کہ گرو گرنتھ پڑھ رہے ہیں ایسے ہی ڈاکٹر زاہد امیر صاحب کے چہرے پر اتنی ڈاکٹری ہے کہ شعر بھی سنا رہے ہوں تو ہم جیسوں کو لگتا ہے دل کی بیماریوں پر اردو میں لیکچر دے رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میری دو کتابیں آچکی ہیں تین اور آرہی ہیں مگر اس انداز سے کہتے ہیں کہ جیسے اطلاع نہیں دے رہے دھمکی دے رہے ہیں۔ اتنی سادہ طبیعت کہ جو بندہ ان سے ایک بار مل لے انہیں ان کے پروفیسر ڈاکٹر ہونے پر شک اور شاعر ہونے پر یقین ہو جاتا ہے' البتہ ان کے پروفیسر ڈاکٹر ہونے پر یقین کرنے کے لئے ان کی شاعری پڑھنا پڑتی ہے۔ انہوں نے ڈاکٹری میں نام کمایا دام کے دام میں نہ آئے۔ اس دور میں جب کسی کے پاس شوگر فیکٹری ہے تو کسی کے پاس وولن فیکٹری' شعبہ طب کے یہ پروفیسر ہیں ان کے پاس بڑی نایاب فیکٹری ہے وہ ہے سیٹس فیکٹری (Satis- Factory)۔

(" رجحانات " لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

اکبر حمیدی

اتفاق سے

نیوٹن صاحب بھی بلا کے آدمی تھے!

میں نے سنا ہے کہ انہوں نے کشش ثقل یعنی زمین میں اتنی کشش ہے کہ کسی چیز کو اوپر نہیں جانے دیتی بلکہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے جیسی حقیقت کو دریافت کیا تھا۔ کہتے ہیں اتفاق سے ایک روز نیوٹن صاحب سیب کے ایک درخت کے نیچے سوگئے اتفاق سے درخت پر سیب لگے تھے۔ اتفاق سے ایک سیب جو عین نیوٹن صاحب کی ناک کے اوپر تھا شاید ہوا سے یا کسی سیب خور پرندے کی عدم مہارت سے یا پھر تقدیر سے " کہ خداوند تعالیٰ کو کشش ثقل کا راز منکشف کرنا تھا" شاخ سے جو ٹوٹا تو عین اپنے ہدف یعنی نیوٹن صاحب کی ناک پر آرہا اتفاق سے نیوٹن صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ غصہ تو بہت آیا مگر سیب پکا ہوا تھا دیکھ کر نرم پڑ گئے۔ پہلے تو سیب کو مزے سے اڑایا پھر جو طبیعت ذرا خوش ہوئی تو سوچنے لگے اگر یہ سیب زمین کی طرف آنے کی بجائے اوپر آسمان کی طرف چلا جاتا تو وہ اس دعوت کام ودہن سے محروم رہتے ! سو انہوں نے اس بات پر سوچنا شروع کر دیا کہ آخر یہ سیب زمین ہی کی طرف کیوں آیا ------ اوپر آسمان کیطرف کیوں نہیں گیا۔ حالانکہ بہت سی چیزیں آسمان کی طرف بھی جاتی ہیں۔ مثلاً " سیب کے درخت پر ہی غور فرماتے تو معلوم ہوتا کہ سیدھا آسمان کی طرف جارہا ہے لیکن اتفاق سے انہوں نے سیب کے درخت کی بجائے سیب کے پھل پر غور فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیوٹن صاحب کی دلچسپی درخت سے زیادہ پھل کے ساتھ تھی بالکل میرے ہموطنوں کی طرح !!

اس واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ نیوٹن صاحب نے اپنی ساری زندگی میں پہلی دفعہ کسی چیز کو زمین پر گرتے دیکھا تھا یا پھر پہلے انہیں کبھی اس پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اب کے اتفاق سے سیب کو انہوں نے گرتے وقت دیکھ لیا تھا اس لئے ان کی دلچسپی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ! اور اس کے نتیجے میں کشش ثقل کا اصول دریافت ہوگیا ! کہ انہوں نے سیب کو ہی سہی بالآخر کسی چیز کو زمین پر گرتے دیکھ تو لیا ------ پھر اس پر غور فرمانے کی زحمت بھی گوارا کی اور دنیا ایک بہت بڑی دریافت سے متعارف ہوئی ------ ظاہر ہے یہ سب اتفاق ہی سے ہوا !!

اس ساری کہانی پر اگر آپ غور فرمائیں گے جس میں واقع بہت سے اتفاقات کی میں نے نشاندہی نہیں کی تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کشش ثقل دریافت ہونے میں بے شمار اتفاقات کا دخل ہے ! مثلاً " اس چھوٹے سے اتفاق ہی کو لیجے کہ اگر نیوٹن صاحب سیب کے درخت کے نیچے نہ ہوتے ؟ ------ یا اگر سیب مذکور عین نیوٹن صاحب کی ناک پر آکر نہ گرتا تو کیا پتہ ابھی تک کشش ثقل دریافت کرنے کا عظیم کارنامہ سرانجام

پاتا بھی یا سرانجام نہ پاتا۔ یہ بھی سوچئے کہ جس درخت کے نیچے نیوٹن صاحب سوئے تھے وہ اگر سیب کا درخت نہ ہوتا بلکہ کسی ایسے پھل کا درخت ہوتا جسے کھا کر نیوٹن صاحب پھر سے میٹھی نیند سو جاتے اور یوں ان کی طبیعت سوچ بچار کی طرف مائل ہی نہ ہوتی جیسا کہ ہمارے ہاں ہو رہا ہے!

بات قدرے طویل ہوگئی ہے تاہم عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کشش ثقل کی دریافت جیسا عظیم کارنامہ محض اتفاق سے ہو گیا ------ بلکہ سچ پوچھئے تو اس سارے واقعہ میں نیوٹن صاحب سے زیادہ اہمیت سیب کی معلوم ہوتی ہے۔

کچھ ایسی ہی صورت حال کولمبس صاحب کی ہے جو گھر سے تو نکلا تھا برصغیر آنے کے لئے اور پہنچ گیا امریکہ! آپ یوں سمجھئے جیسے آپ کے صاحبزادے گھر سے کالج کے لئے نکلیں مگر جا نکلیں سینما گھر!

تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ کولمبس پرلے درجے کا لالچی شخص تھا۔ ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھ کر جس طرح غزنوی اور غوری سے کئی حضرات تیر و تلوار لے کر ادھر آجاتے تھے اور سیدھے دلی جا پہنچتے تھے " وہ تو خدا کا شکر ہے کہ راستے میں پانی پت کا میدان پڑتا تھا اور کبھی کبھار کسی کو یہاں بھی رک جانا پڑتا تھا " اس طرح کولمبس کی رال بھی یہاں کے مال و دولت پر ٹپک رہی تھی سو کسی ایک بادشاہوں کی اشیرباد لے کر ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ سمندر میں پھرتے پھراتے راستہ بھول گیا ------ شاید کسی بادشاہ نے اسے نقشہ غلط فراہم کر دیا تھا تاکہ واپس آکر کہیں اس کا ملک دریافت نہ کرے ------ یہ بالکل اسی طرح ہوا جس طرح مہابلی اکبر نے بہرام خان کی بغاوتوں سے تنگ آکر اسے حج کے لئے روانہ کر دیا تھا جہاں سے وہ حسب توقع واپس نہ آیا ------ کچھ ایسا ہی معاملہ کولمبس سے کیا گیا ------

راستہ بھول کر کئی ہفتے تک وہ سمندر میں ٹھوکریں کھاتا پھرا ------ معاملہ یہاں تک آن پہنچا کہ اس کے ساتھیوں نے اسے قتل کر کے اس سے گلو خلاصی کا پروگرام بنا لیا مگر اتفاق سے عین وقت پر اسے دور بہت دور زمین دکھائی دے گئی اور وہ پاگلوں کی طرح " لینڈ لینڈ " کہتا ہوا اس زمین پر اتر گیا۔ اسے کیا پتہ تھا یہ امریکہ ہے!!!

ایسے ہی اتفاقات مجھے اور آپ کو روز مرہ زندگی میں ہوتے رہتے ہیں مگر ہم نے کبھی تاریخ کو اتنی اہمیت نہیں دی کہ ان اتفاقات کو تاریخ میں شامل کر دیں...... ویسے بھی ہمارے آپ کے اتفاقات ایسے نہیں ہیں کہ ہم انہیں تاریخ کے سپرد کر دیں! یہ بات میں بلاوجہ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں نے تاریخ عالم سے لے کر عالمی ایجادات تک غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کے دوران کئی مرتبہ اتفاق سے ایسے ایسے رموز و اسرار مجھ پر منکشف ہوئے ہیں کہ ان اسرار و رموز کو باقاعدہ ادب عالیہ کا حصہ بنایا جاسکتا ہے! مثلاً مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ ہوائی جہاز کیوں ایجاد کیا گیا؟؟

" یہاں میں چاہتا ہوں کہ اپنا ایک ذاتی راز آپ کو بتاؤں کہ اکثر ایسی گہری باتیں معمولی غور و خوض سے معلوم ہو جایا کرتی ہیں "۔

میں اسلام آباد سے اپنے گاؤں جا رہا تھا ------ راستے میں ایک جگہ اچانک محسوس ہوا جیسے میں پانی پت کے میدان میں پہنچ گیا ہوں بسیں، کاریں، ٹرک، ٹریکٹر، ریڑھے، گدھے، گھوڑے دکھائی دیئے۔ سڑک ہر طرف سے بلاک تھی۔ آس پاس کھڑی ان گنت بسیں آمنے سامنے ایک دوسری کے سینگ میں سینگ پھنسائے کھڑی تھیں ------ کئی گھنٹے تک انتظار کیا ------ پسینے چھوٹ گئے ------ بہتیرا پوچھا یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

اورنگ زیب قاسمی

------ مگر کوئی جواب نہ آیا ------ تب میرا خیال ہوائی جہاز کی طرف گیا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ ہوائی جہاز کے موجد کو ہوائی جہاز کیوں ایجاد کرنا پڑا!!

گاؤں جانے میں مجھے بڑی مشکلات پیش آرہی ہیں ------ شاید اتنی مشکلات گاؤں سے آنے میں مجھے پیش نہیں آئی تھیں!

اس سلسلے میں اتفاق سے ایک تجویز میرے ذہن میں آئی ہوئی ہے ------ میں چاہتا ہوں یہ تجویز اپنی حکومت کو بھیج دوں۔ مجھے احساس ہے کہ اس وقت بھی حکومت مالی بحران میں مبتلا ہے اس لئے میری تجویز کو شاید قبول تو کرے مگر ممکن ہے اس پر زیادہ خرچ نہ کر سکے۔ سو میں تجویز بھیجنا چاہتا ہوں کہ اگر میرے گاؤں میں رن وے حکومت بنوا دے اور کراچی جانے والی ہوائی بسوں ہی کی طرح کی دو چار ہوائی بسیں بھی لگا دے تو اسلام آباد سے اپنے گاؤں تک فضائی سڑک تیار کروا کر دینا میری ذمہ داری! سڑک پر ہونے والے تمام اخراجات رضاکارانہ طور پر میں اپنے ذاتی وسائل سے ادا کروں گا! آخر میری بھی کچھ ذمہ داری ہے!!

یہ تو مقامی قسم کی باتیں ہیں مجھے پورا بھروسہ ہے کہ عالمی سطح کے مسائل کے حل بھی میں اسی طرح پیش کر سکتا ہوں ------ مثلاً " اگر امریکہ عراق پر حملہ کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کر لیتا تو اسے دنیا میں اتنی بڑی فتح سے دوچار نہ ہونا پڑتا ------ اتفاق سے اس مسئلے کا حل میرے پاس موجود تھا اب اگرچہ اس حل کے انکشاف کی اتنی اہمیت نہیں رہی پھر بھی یہ حل ایک ایسا مستقل اور دائمی قدروں پر مشتمل حل ہے کہ آئندہ بھی انہی بنیادوں پر چل کر دنیا کو خون خرابے سے بچایا جاسکتا ہے۔ مثلاً " اس وقت اصل مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح کویت کو عراق کے ناجائز قبضے سے رہائی دلائی جاسکے۔ اس سلسلے میں مجھے پختہ یقین ہے کہ جتنے ڈالر کا بارود عراق پر گرایا گیا تھا اگر امریکہ اتنے ڈالر عراق کو نقد دے دیتا تو وہ کویت پر قبضہ بڑی خوشی سے چھوڑ دیتا!

ایک اور حل بھی میرے پاس ہے جو تیسری دنیا کے مبتلا ممالک کے سربراہوں کے بارے میں ہے مگر شاید آپ اسے سن کر غیر سنجیدہ ہو جائیں!!

کہتے ہیں اتفاق میں بڑی برکت ہے ------ آپ مانیں یا نہ مانیں " اور اگر مان لیں تو آپ کی آسانی ہو جائے " مگر میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میری زندگی کے تمام اہم کام اتفاق سے ہوئے ہیں۔ آپ بھی اپنی زندگی پر غور فرمائیں گے تو یہ جان کر حیران ہوں گے کہ خود آپ کی زندگی کے اہم کام بھی محض اتفاق سے ہی ہوئے ہیں! اپنی ولادت باسعادت ہی پر غور فرمالیں ------ کیا یہ محض اتفاق نہیں کہ آپ اس ترقی یافتہ دور میں پیدا ہوئے ہیں؟ ممکن ہے آپ پتھر کے زمانے میں پیدا ہو جاتے!! زمانہ قبل از تاریخ میں جنم ہو جاتا ------ انسانی ارتقا کے کسی نازک موڑ پر بھی آپ کی ولادت متوقع تھی ------ مزید غور آپ خود فرمالیں ------ میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا!!

ویسے تو پیدائش ایک ایسا مسئلہ ہے کہ نہ ہاتھ باگ پر ہیں نہ پا ہے رکاب میں کی سی صورت حال ہے۔ کسی کی پیدائش کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ یہ سارا کھیل اتفاق ہی سے ہو رہا ہے ------ مگر جب اپنے ہموطنوں کے اس سلوک کو دیکھتا ہوں جو وہ گزشتہ نصف صدی سے وطن عزیز کے ساتھ کر رہے ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ حضرات اتفاق ہی سے اس ملک میں پیدا ہو گئے ہیں!!

(" نیرنگ خیال " راولپنڈی)

جمیل آذر

ایک ضروری اعلان

آج صبح نصف جنوری کو نقطہ انجماد میں ڈوبی ہوئی فضا میں حسب معمول گھر سے باہر جو سیر کو نکلا تو ایک عجیب جادوئی منظر اپنی نظروں کے سامنے پھیلا دیکھا۔ فطرت نے نہایت سلیقہ اور ہنر مندی سے تمام فضا کو سفید دھواں رنگ دھند کی دبیز شال کچھ اس طرح اوڑھا دی تھی کہ چند قدم کے فاصلے کے بعد ہر چیز نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ اکا دکا موٹروں اور بسوں کی دھند میں لپٹی مدھم روشنیاں اور ان سے بجتے ہارن گاڑیوں کی آمدورفت کی نشاندہی کر رہے تھے' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت نے موسم سرما کے دلکش شباب کو دھند کی گھنی افشاں سے سجا دیا ہے۔

میں ابھی اس انبساط خیز منظر سے لطف اندوز ہو ہی رہا تھا کہ ایک مینارہ مسجد سے لگے لاؤڈ سپیکر سے یہ آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے " حضرات ایک ضروری اعلان سنیے۔ قضائے الٰہی سے چوہدری الف دین صاحب انتقال فرما گئے ہیں۔ ان کی نماز جنازہ آج بعد از نماز عصر ادا کی جائے گی ..... " مجھے ایسا لگا کہ اس سحر انگیز اور انبساط خیز ارضی منظر پر موت رقص کرنے لگ گئی ہے ۔ ابھی میں چند قدم اور آگے بڑھتا ہی ہوں کہ ایک اور مینارہ مسجد سے ایسا ہی ضروری اعلان بلند ہوتا ہے اور تمام فضا میں مرتعش ہو جاتا ہے میں اس وقت میری نگاہ ایک ٹنڈ منڈ پیڑ پر پڑتی ہے جس کی مختلف ننگی شاخوں پر سیاہ پرندے اپنی چونچوں کو اپنی گردنوں میں دھنسائے گنجھڑیوں کی صورت بالکل ساکت وصامت بیٹھے ہیں۔ وہ اس دود حیا منظر میں چھوٹے چھوٹے سیاہ دھبوں کی صورت نظر آرہے ہیں۔ شاید انہوں نے بھی یہ ضروری اعلان سن لیا ہے۔

میرے لئے یہ اعلان کوئی نیا نہیں تھا میں یہ اعلان ہر روز ان مسجدوں کے میناروں سے بلند ہوتا سنتا ہوں مگر آج کی دھند میں لپٹی صبح نے موت کے منظر نامے کو جلی حروف میں پیش کرکے اس عالم رنگ و بو میں متقابل جوڑوں کی بڑی گہری اور واضح تصویریں بنا دی تھیں۔ واقعی نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا! زندگی اور موت' بلندی اور پستی' عمود اور افق' انسان اور حیوان' یہ کیسا حیرت انگیز تار حریر دورنگ سے قائم سا تخیلاتی منظر نامہ ہے۔

موت ہماری ہنستی بستی پر مسرت زندگی میں ڈرامائی انداز میں وارد ہوتی ہے اور آناً فاناً اپنے ہیبت و جلال کا سکہ قائم کر جاتی ہے ابھی آدمی ہشاش بشاش ہے' صبح کی سیر' جاگنگ اور ورزش سے فارغ ہو کر کاروبار حیات میں بھرپور شرکت کرنے کی تیاری کرتا ہے کہ فرشتہ اجل اچانک چپ چاپ نمودار ہوتا ہے اور بندہ بشر یہ جا وہ جا' ہم لاکھ آنسو بہائیں' دہائی دیں' ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کے دروازے کھٹکھٹائیں' موت ہے

اورنگ زیب قاسمی

اٹل' بالکل ساکت و صامت! کتنی سنجیدہ' بارعب و پروقار! قطعاً مذاق' بھانڈپن' ہنسی دل لگی' طنز و مزاح' نقل نخباڑہ قسم کا بازاری پن اس کی فطرت سے کوئی لگا نہیں کھاتا۔ یہ تو بالکل مکمل المیہ ہے' یونانی المیہ ڈراموں کی طرح ناقابل فراموش کلاسیک!

دراصل اس ذی وقار شے کے کئی رنگ' کئی شکلیں' اور کئی ادائیں ہیں ۔ یہ کبھی سمندر کی طرح گہری' آسمان کی طرح وسیع اور جنگل کی طرح پراسرار اور کبھی کالی دیوی کی طرح ہیبت ناک ہے! میں نے ایک روز اپنے ایک معزز دوست سے نہ جانے کس موڈ میں کہہ دیا کہ جناب ہم تو بس خالق حقیقی سے پرامن اور آسان موت کی دعا مانگتے ہیں وہ بولا۔ جناب ایسی کوئی موت نہیں ہوتی۔ موت تو ہمیشہ اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ " ہم نے جواب میں عرض کیا کہ نہیں جناب ۔ ہم نے کئی بزرگوں کو اس جہان فانی سے کوچ کرتے دیکھا ہے انہوں نے وضو کیا' نماز پڑھی اور پھر عزیز و اقربا کو نہایت پرسکون انداز میں الوداع کہتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کے جسم و جان کا رشتہ کب منقطع ہوا مگر یہ لوگ وہ ہوتے ہیں جو زندگی کے تحفہ کو ایک نعمت مستعار سمجھ کر گزارتے ہیں نہ کہ قبضہ گروپ کی طرح حیات مستعار پر پکا قبضہ کرنے کی ٹھان لیتے ہیں۔ قبضہ گروپ قسم کے لوگوں کو اپنے پیچھے آتے موت کے صبا رفتار رتھ کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی نہیں دیتی۔ انہی لوگوں پر موت اور زندگی کی ایسی مضحکہ خیز گرہ بن جاتی ہے کہ ہاتھوں اور میتوں نہیں کھلتی۔ جن درویش صفت لوگوں کے دلوں میں اس سنجیدہ اور شائستہ دیوی کی شبیہہ ہروقت موجود رہتی ہے ان پر موت ہمیشہ پرسکون و بلا تکلیف طاری ہوتی ہے ان کا چہرہ موت کے بعد بھی گلاب کے پھولوں کی طرح کھلا ہوا ہوتا ہے' تروتازہ اور شاداب!

موت بھی عجیب شے ہے جوں ہی بندہ وجود میں آتا ہے وہ اپنی پوری شخصیت کے ساتھ سائے کی طرح اس کے پیچھے لگ جاتی ہے پیدائش کے فوراً بعد بچے کی چیخ شاید اس کا ڈراؤنا روپ دیکھنے ہی کی وجہ سے نکلتی ہو۔ اپنی بقا کے لئے ساری عمر بندہ اس سے بچنے کی تگ ودو میں لگا رہتا ہے کبھی دوسروں کو مارتا ہے اور کبھی اپنوں کو۔ لیکن بالآخر موت اسے دبوچ ہی لیتی ہے اور اس کا تمام کاروبار حیات' اس کا اقتدار' اس کا مرتبہ' اس کے پلاٹ' اس کی کوٹھیاں اور بنک بیلنس دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور دیکھنے والے خود تصویر حیرت بن جاتے ہیں۔ لیکن مرنے کے بعد یکایک وہ شخص ایک عجیب مقدس ماب نظر آنے لگتا ہے ایک پراسراریت کا دائرہ نور اس کی شخصیت کے گرد قائم ہو جاتا ہے۔ وہ کسی اور ہی دنیا کا باسی دکھائی دینے لگتا ہے' وہ دنیا جو زندوں کی دنیا سے ماورا ہوتی ہے ۔ دور بہت دور ناقابل دسترس' بس موت کا یہی مقدس حسین پہلو ہے جو مرنے والے کو زندوں سے بہت بلند اور افضل کر دیتا ہے۔ ہم بصد احترام اسے لحد میں اتارتے ہیں۔ اس کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھاتے ہیں اور عرق گلاب کا چھڑکاؤ کرتے ہیں' اس کے غم میں ماتمی لباس زیب تن کرتے ہیں۔ تعزیتی اجلاس منعقد کرکے اسے خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور اس کی تمام کمزوریوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ تھوڑے عرصہ بعد اس کی قبر پر کوئی یادگار مقبرہ بنا کر عقیدت و احترام کا اظہار کرتے ہیں اور یہ کتنا بڑا ضروری اعلامیہ بن جاتا ہے!

حقیقت میں جب تک انسان موت کی نامعلوم وادی میں نہیں چلا جاتا ہم اس کی زندگی کا احاطہ کر ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ جونہی وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوتا ہے اس کی پوری شخصیت نکھر کر ہمارے سامنے آجاتی

ہے ۔ اس کی زبان مرنے کے بعد ہم سے زیادہ واضح طور پر ہمکلام ہونے لگتی ہے۔ اس کے بارے میں ہمارے تمام تعصبات ختم ہو جاتے ہیں۔ بیشتر شخصیات کو ہم نے ان کے اس دار فانی سے سدھارنے کے بعد ہی زیادہ وسیع اور نمایاں پس منظر میں سمجھا ہے اور ان کا صحیح مقام متعین کیا ہے۔ کئی عظیم لوگ جنہیں زندگی میں وہ اہمیت نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے مرنے کے بعد انہیں وہ مقام و مرتبہ نصیب ہوا جس کا وہ اپنی زندگی میں تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لوگوں نے بچ مچ انہیں دیوتا بنا لیا۔ حیرت ہے کہ انسان کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے اس کی طبعی موت کا المیہ کتنا ضروری ہے مگر وہ لوگ جو اپنی زندگی میں اپنے لئے تو سیعی اجلاس منعقد کرواتے ہیں کسی سٹیج کے مزاحیہ کردار سے کم معلوم نہیں ہوتے۔

متعدد شعراء کرام نے موت کے اس عظیم المیہ کردار پر اپنا خوبصورت کلام پیش کر کے اس کی عظمت کا دل سے اقرار کیا ہے اور اس کی شخصیت کا متنوع استعاروں میں اظہار کیا ہے کسی نے اسے آگے کے سفر پر جانے کے لئے محض دم لینے کا " وقفہ " قرار دیا' کسی نے اسے امیر و غریب کے فرق کو مٹا کر ایک ہی سطح پر لانے والا کردار کہا۔ کسی نے اسے دکھوں اور غموں سے نجات دینے والا محسن تصور کیا۔ انگریزی کا ایک نابغۂ روزگار شاعر جان ڈن تو اس کے تصور عشق میں ایسا مبتلا ہوا کہ اس نے اپنی ایک خوبصورت اور پینٹنگ بنوائی جس میں وہ سفید کفن میں لپٹا ہوا مردہ حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ " اس پینٹنگ کو ہمیشہ اپنے سلیپنگ روم میں اپنے بستر استراحت کے سامنے دیوار پر آویزاں کئے رکھتا تھا۔ کیا عجب انداز فکر تھا!

اب جو صبح کی سیر سے واپس لوٹتا ہوں تو ایک عجیب حیات بخش منظر میرے سامنے نمودار ہوتا ہے دھند کی گہری تہی شال تار تار ہو کر بکھر جاتی ہے ۔ مشرق سے آفتاب عالمتاب اپنی پوری توانائی و رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا ہے ٹنڈ منڈ پیڑ پر بیٹھے خاموش پرندے اب چہک چہک کر اوپر دائرہ نما شکل میں پرواز کر رہے ہوتے ہیں۔ سڑکوں پر پوری رفتار سے ٹریفک کا بازار گرم ہے ملی جلی آوازوں کا زور شور ہے۔ خوبصورت ننھے منے بچے اور خوبرو نوجوان اپنے اپنے سکولوں اور کالجوں کی طرف بسوں اور موٹروں میں ' سائیکلوں اور سکوٹروں پر اور پیدل رواں دواں ہیں۔ لاؤڈ سپیکر سے بلند ہونے والے ایک ضروری اعلان کی جگہ زندگی کا اہم اعلان میری روح میں اتر جاتا ہے اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی ایک نظم کا مصرعہ بے ساختہ میری زبان پر مچلنے لگتا ہے :

In My End Is My Beginning

میرے انجام میں ہے میرا آغاز زیست

(" اوراق " ' لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

شہزاد احمد

ایک دروازہ

مجھے اب تک بھی یہ اندازہ نہیں ہو پایا کہ وہ دروازہ راستہ چلتے ہوئے کہاں سے آ گیا تھا۔ میں جس جادے پر سفر کر رہا تھا وہ ایک ہموار اور چٹیل میدان تھا' جس میں کوئی عمارت یا کوئی فصیل نہیں تھی' پھر اچانک مجھے یوں لگا کہ میرے سامنے ایک مٹیالے سے رنگ کا خستہ حال دروازہ ہے اور میں اس کی طرف کھنچا چلا گیا' پھر وہ دروازہ مجھ پر کھل گیا اور میں بے جھجک اس کے اندر داخل ہو گیا' بس اندر داخل ہونے کی دیر تھی کہ پورا منظر یکسر تبدیل ہو گیا' اب چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور یہ اندھیرا بارش کی صورت میں برس رہا تھا اور میں اس اندھیرے میں بھیگتا چلا جا رہا تھا' تھوڑی دیر میں مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں بالکل شرابور ہو گیا ہوں' اندھیرے کی سیلن میری ہڈیوں میں سرایت کر گئی ہے۔ پھر مجھے یہ یخ بستہ اندھیرا خون میں شامل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے لگا کہ وہ میری رگوں میں سرک رہا ہے' خون کے سرخ ذروں اور سفید ذروں میں اب کچھ سیاہ دھبے بھی تیرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور آہستہ آہستہ مجھے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

وہاں کچھ عجیب طرح کی تنہائی تھی' اس میں کوئی آشنا چیز موجود نہیں تھی مگر نامانوس چیزیں اس قدر زیادہ تھیں کہ ہر لمحہ میں خود کو زیادہ سے زیادہ اجنبی محسوس کرتا چلا جا رہا تھا' ان ناپاک اور نامانوس چیزوں میں سے کسی نے بھی میری طرف بڑھنے کی کوشش نہ کی مگر میں چاہتا تھا کہ وہ سب ایک ہی بار مجھ پر حملہ آور ہو جائیں اور میری تکا بوٹی کر دیں ایک لمحے کے لئے میں نے خود کو بکھرتے اور ریشوں میں تقسیم ہوتے دیکھا تھا' پھر مجھے یہ لگا تھا کہ میں اس نامانوس شے کا بنا ہوا ہوں' جسے میں نے اب اندھیرا کہنا شروع کر دیا ہے' وہ کیا چیز تھی جو اس قدر نامانوس' کراہت انگیز' اور ناخوشگوار لگنے کے باوجود میرے وجود کا کوئی حصہ محسوس ہوتی تھی ' مجھے یوں لگا تھا جیسے میں صدیوں پہلے اسی جگہ تخلیق کیا گیا ہوں اور مجھے خلق کرتے وقت جو مواد استعمال کیا گیا ہے وہ نہایت رکیک اور کثیف ہے۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ گویا میں صدیوں تک وہاں کھڑا رہا ہوں اور تاریک خیالات کا ایک سیلاب میرے اردگرد ایک فصیل بنائے ہوئے ہے' ایک ایسی فصیل جس کا کوئی دروازہ نہیں ہے ' پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ دروازے کو توڑتی ہوئی ایک کرن میری طرف بڑھ رہی ہے میں دہشت سے چیخ اٹھا' میرے لئے کسی صورت یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اس کرن کو روک سکوں' مجھے واضح طور پر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر یہ کرن مجھے چھو گئی تو میں بھسم ہو جاؤں گا اور میری خاک باقی نہ رہے گی۔

پھر وہ کرن میرے سینے کے اندر داخل ہوئی اور مجھے کاٹتی ہوئی یوں گزر گئی جس طرح گرم پانی کی دھار برف کی سل میں سوراخ کرتی ہوئی گزر جاتی ہے میرے سینے میں دو درازیں پیدا ہو چکی تھیں اور ان میں سے اندھیرا آہستہ آہستہ باہر گر رہا تھا جیسے کولتار کے گرم ڈرم سے لک باہر گرتی ہے مجھے لگ رہا تھا کہ میں اندر سے خالی ہوتا چلا جا رہا ہوں۔ مگر اب مجھے سانس لینے میں آسانی محسوس ہونے لگی تھی۔ میرے سینے کے اندر ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ جسے بھرنے کے لئے صحرا کی خشک ہوا آندھی کی طرح آگئی تھی اب میرے اندر روشنی اور اندھیرے کی لڑائی کے ساتھ ساتھ' خشک ہوا اور نمدار فضا کی لڑائی بھی تھی۔ اندھیرے کی بارش رک گئی تھی آسمان آہستہ آہستہ صاف ہوتا چلا جا رہا تھا کہیں کہیں ستارے نظر آنے لگے تھے۔ مگر ان ستاروں کے درمیان فاصلے پر ایک سیاہ آنکھ مجھے گھورنے لگی تھی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں زندگی کے اس دور میں داخل ہو گیا ہوں جہاں رنگوں کا کوئی وجود سرے سے تھا ہی نہیں' صرف سیاہی تھی اور روشنی تھی' یوں لگتا تھا کہ کوئی ڈراؤنی بلیک اینڈ وائٹ فلم چل رہی ہے۔ اس فلم کا ہر فریم بے حرکت تھا مگر یہ تمام بے حرکت فریم یکے بعد دیگرے ظاہر ہو کر ایک تیز رفتار حرکت پیدا کر رہے تھے اور میں اس سیلاب میں بہتا چلا جا رہا تھا۔

میرے لئے دو سیلاب بیک وقت موجود تھے ایک سیلاب آسمان پر تھا جس میں ستارے حبابوں کی طرح دکھائی دیتے تھے اور دوسرا سیلاب میرے اندر تھا جس میں حباب ستاروں کی طرح لگتے تھے میں بجلی کے ان دو پاٹوں میں پس رہا تھا اور ریزہ ریزہ ہو کر مشت خاک کی طرح اڑنے کو پر تول رہا تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی' پانی آہستگی سے بہہ رہا تھا' سطح پر اپنے آپ لہریں سی ہویدا ہو رہی تھیں جو بجتی کم تھیں اور تڑتی زیادہ تھیں۔

اندھیرے کی دیوار اگرچہ ٹوٹ رہی تھی' اس میں اتنے روزن پیدا ہو گئے تھے کہ اب روشنی کا احساس ہونے لگا تھا مگر اندھیرے کی بارش وقفوں وقفوں سے اب بھی جاری تھی میں جس لباس میں تھا وہ ابھی تک گیلا تھا اور میری ہڈیاں ابھی تک اس سیلن کو محسوس کر رہی تھیں' جس میں میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس دھندلائی ہوئی روشنی میں میں نے دیکھا کہ زمین پر ایک کریہہ المنظر مخلوق سرک رہی ہے معلوم نہیں کیا وجہ تھی مجھے اس سے خوف نہیں آیا' میں کانپ تو رہا تھا مگر اس کی وجہ سردی کا احساس تھا خوف نہیں تھا' بلکہ مجھے تو محسوس ہوتا تھا کہ اگر یہ جاندار میرے قریب آجائے اور مجھ سے لپٹ جائے تو میرے اندر حرارت جاگ اٹھے گی' اب حرارت میرا مقصود تھی' میری آرزو تھی' ہم گرمی تو کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیتے ہیں مگر سردی کا احساس ہمیں بے بس کر دیتا ہے۔ سردی' سرد مہری' تنہائی' بیگانگی' یہ سب ایک ہی قبیل کے لفظ ہیں' اور میری ان لفظوں سے دیرینہ آشنائی ہے' شاید ایسا ہی کوئی لفظ انسان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہو' انسان کے متعلق بھی شاید کسی بے وارث شے کے ہوں' اسی لئے تو اسے دوزخ کی نوید سنائی گئی ہے اور وہ تمام افعال سے یہی ظاہر کرتا ہے کہ اسے دوزخ ہی کی تلاش ہے۔ انسان اندھیرے کی سیلن کو برداشت نہیں کر سکتا مگر حرارت اور روشنی کی ہر مقدار کو گوارا کر لیتا ہے' بلکہ ان کا متلاشی رہتا ہے۔

یہ باتیں جو میں نے آپ سے بیان کی ہیں' مجھ پر اس لمحے یا اس صدی میں منکشف ہوئی تھیں جب میں نے چلتے چلتے ایک دروازے کو دریافت کیا تھا' یا یہ بھی ممکن ہے کہ دروازے نے مجھے ڈھونڈ نکالا ہو' میں اب بھی اس دروازے کی دوسری طرف ہوں' جہاں آپ کھڑے ہیں وہ دروازے کا الٹا رخ ہے' یہ دروازہ جو بند ہو چکا ہے' کب کھلے گا' کیوں کھلے گا میں کچھ کہہ نہیں سکتا' ممکن ہے کبھی نہ کھلے اور یہ بھی ممکن ہے کہ

اورنگ زیب قاسمی

جب میں سامنے پڑے ہوئے کاغذ سے نگاہ اوپر اٹھاؤں تو وہ دروازہ موجود ہی نہ ہو' جس طرح میں آپ کے لئے موجود نہیں ہوں' بس ایک کاغذ پر چند الفاظ لکھے ہوئے ہیں مگر اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ الفاظ کس کے ہیں' الفاظ تو ویسے بھی کسی کے نہیں ہوتے حالانکہ سب لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ جو الفاظ وہ ادا کر رہے ہیں وہ انہی کے ہیں' ہم جس کائنات میں رہتے ہیں' وہ ہماری ہے کیوں کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہماری ہے مگر کائنات کے باہر سے دیکھا جائے تو ہمارا موجود ہونا یا نہ ہونا آخر کس اہمیت کا حامل ہے ہم فلسفیوں کی طرح یہ تو نہیں سوچ سکتے کہ یہ جہان اس لئے موجود ہے کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں' یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ اگر مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا تو میں بھی ناموجود ہوں۔ آخر موجود ہونے یا نہ ہونے میں فرق تو آگیا اور آگہی ایک نامحسوس چیز ہے' کئی بار ہمیں آگہی ہوتی ہے مگر ہم اس کے بارے میں کوئی شعور نہیں رکھتے' یہ وہ مقام ہے جس سے لاشعور کی اقلیم وسعتیں متعلق ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ وہ دروازہ جس میں میں داخل ہوا ہوں' موجود تھا' اور اگر وہ موجود نہیں تھا تو جن احساسات کو میں نے بیان کیا ہے' مجھ پر کس طرح وارد ہوئے تھے' کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ہمارا معلوم ہمارے نامعلوم سے بہت چھوٹا ہے' معلوم اور نامعلوم میں وہی تناسب ہے جو درخت اور بیج میں ہوتا ہے' نامعلوم سے معلوم پیدا ہوتا ہے اور نامعلوم سے نامعلوم!

میں ابھی تک اس دروازے کے اندر ہوں' آپ باہر ہیں' میں آپ کے لئے نامعلوم ہوں آپ میرے لئے نامعلوم ہیں' مگر کسی ایک ڈوری میں بندھے ہوئے ضرور ہیں' اس ڈوری کے کئی سرے ہیں' ایک میرے ہاتھ میں ہے' ایک آپ کے پاس ہے مگر ڈوری کا ایک سرا دوسرے سرے کو نہیں جان سکتا۔ مگر یہ آگہی اسے ضرور ہوتی ہے کہ کوئی اور سرا موجود ہے' اور شاید یہ آگہی ہی وہ دروازہ ہے جس کے اندر میں داخل ہوا ہوں' آپ چاہیں تو آپ بھی اس دروازے کے اندر آ سکتے ہیں مگر کب کیسے ـــــ اس سوال کا کوئی ایک جواب ممکن نہیں ہے ممکن ہے آپ کا اگلا قدم آپ کو اس دروازے تک لے آئے مگر اس میں داخل ہونے سے پہلے یہ سوچ لیجئے گا کہ آپ یہ سب کچھ جاننا بھی چاہتے ہیں یا نہیں؟

("اوراق" لاہور)

اورنگ زیب قاسمی

بلڈ گروپ

کل ایک صاحب تشریف لائے۔ ان سے بس رسمی سی ملاقات تھی۔ کبھی کبھی قصائی یا سبزی فروش کی دوکان پر ملاقات ہو جاتی۔ یا سیر کے دوران دور ہی سے ایک دوسرے کو 'ہیلو' ہیلو' کہتے اور گزر جاتے۔ وہ میرا نام جانتے ہیں لیکن میں نے ان کا نام پوچھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ نام کا پوچھنا یا جاننا تعلقات کی تمہید ہوتی ہے اور میں تمہید سے گریز کرتا ہوں۔ حتیٰ کہ کتاب کی تمہید بھی نہیں پڑھتا' خیر اس بات کو چھوڑیئے' انہوں نے آتے ہی پوچھا۔۔۔ "جیلانی صاحب آپ کا کون سا بلڈ گروپ ہے۔" میں نے جلدی سے جواب دیا "اے پازیٹو یا نیگیٹو" انہوں نے مزید استفسار کیا۔ میں ایسی عضمی گفتگو کے لئے چنداں تیار نہیں تھا کیونکہ یہ سوال تو میرے خاندان کی حیاتیاتی تاریخ معلوم کرنے کے مترادف تھا' آدمی خواہ جیسا بھی ہو اپنی جیالوجی کی تو تشہیر نہیں کرتا! چنانچہ میں نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ "میاں! میں نے خون خود تھوڑا ہی بنایا ہے مجھے تو مکان' دکان کے علاوہ یہ بھی ورثے میں ملا ہے۔" وہ صاحب اس جواب سے کچھ شرمندہ بھی ہوئے لیکن اہل غرض کی طرح اپنی گفتگو کو جاری رکھتے کہنے لگے "جیلانی صاحب! دراصل بات یہ ہے کہ میرے ہاں بچہ ہونے والا ہے۔ میرا مطلب ہے میری بیوی کا۔ زچہ کی صحت کمزور ہے اس لئے ڈاکٹر نے بطور احتیاط خون کی سپلائی کا آرڈر دے دیا ہے یوں تو میرا اپنا خون بھی کام آسکتا ہے لیکن ہمارے مزاجوں میں اختلاف پایا جاتا ہے' ممکن ہے ہمارے بلڈ گروپ میں بھی اختلاف رائے ہو۔ میں نے مناسب سمجھا کہ آپ سے درخواست کروں' آپ شکل وصورت سے بھلے مانس لگتے ہیں اس لئے اس معاملہ میں آپ میری دستگیری کر سکتے ہیں۔" میں نے انہیں بتایا کہ میرے خون میں تشکیکات کی خاصی کی ہے۔ ایسا خون زچہ اور بچہ کے لئے خاصا غیر مفید ہو سکتا ہے' بہتر یہی ہے کہ وہ کسی اور صاحب سے رجوع کریں' گفتگو یہاں ختم ہو گئی اور وہ صاحب خاموشی سے رخصت ہو گئے۔

اگر معاملہ یہاں تک رہتا تو مجھے پریشانی نہ ہوتی۔ میری بدقسمتی یہ ہے کہ میرے ذہن کی ساخت بالکل کمپیوٹر کی طرح ہے آپ ایک دفعہ کوئی معمولی سی بات بھی (Feed) کریں۔ تو وہ اسے کم ظرف آدمی کی طرح صرف محفوظ ہی نہیں کر لیتا' بلکہ موقعہ' مناسب یا غیر مناسب آدمی تک اس کی ترسیل بھی اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے چنانچہ رات جب میں سونے لگا' تو میرے اندر سے آواز آئی۔ "آخر اس نے آپ سے ہی بلڈ گروپ کیوں پوچھا؟" بات بھی ایک حد تک سچ تھی۔ میرا تو اس شخص سے تعارف بھی محض رسمی سا ہے اور پھر یہ میرا اخلاقی فرض تھوڑا ہے کہ میں زچہ اور بچہ کی خون کی ضروریات کو پورا کروں یہ ضرور ہے کہ

میں ایک دفعہ بچوں کے میلہ میں شامل ہوا تھا لیکن وہاں تو مجھے صرف بچوں اور ان کی ماؤں کی تفریح کے لئے بلایا گیا تھا۔ آخر اس نے میرا بلڈ گروپ کیوں پوچھا۔ رات بھر میرا ذہن گراموفون کی سوئی کی طرح اسی جگہ اٹکا رہا۔ میں جب بھی اسے آگے یا پیچھے کرنے کی کوشش کرتا تو۔۔۔۔۔

خون کا گروپ ٹیوٹوریل کا ہم زلف ہے' جس طرح ہر ٹیوٹر کو مختلف جماعتوں کے طلبا دے دیئے جاتے ہیں کہ وہ ان سے ایک گروپ کی تشکیل کرے اسی طرح ہر خاندان اپنا ایک گروپ بنالیتا ہے جس میں خون کا اشتراک ہوتا ہے پھر وقتی اور سیاسی اور نسلی ضروریات کی روشنی میں اس میں کچھ ایسے افراد بھی شامل کر لئے جاتے ہیں جن کے خون میں توانائی کے وافر ذخیرے موجود ہوں' یہ نئے لوگ عام طور پر چوری' رسہ گیری' قتل' ڈاکہ' اغوا کے راستے سے ہو کر اعلیٰ نسبی کے اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں آدمی اپنا شجرہ نسب ازسرنو تحریر کرتا ہے پھر وقت کے ساتھ اسی گروپ میں کچھ فضلا اور شعرا بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ ابتدا میں تو گروپ خوش ہوتا ہے کہ اسے شرافت کا تمغہ امتیاز بھی مل گیا ہے لیکن جب اشراف کا یہ مختصر سا طبقہ خاندان کے بردار افراد پر غالب آجاتا ہے' تو پھر گروپ میں زوال کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔ البتہ جو گروپ زمانہ شناس ہوتا ہے اور تاریخ کے مزاج کو سمجھتا ہے' وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد باہر سے کچھ رسہ گیر' قاتل اور باہمت افراد نسبی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے برآمد کرتا رہتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی سرداری کو برقرار رکھتا ہے ورنہ افغانوں' مغلیوں اور افغانوں کی طرح تاریخ کے بہاؤ میں بہہ جاتا ہے اور اس کا خون بازار میں بکنے لگتا ہے اور زچہ' بچہ کے کام آتا ہے۔ اس عمل میں تاریخ کی حرمت کے علاوہ فیملی پلاننگ کا بھی تصور بھی ہو سکتا ہے۔ انگلستان کا شاہی خاندان فطرت کے اس سربستہ راز سے آشنا ہے' چنانچہ وہ ہر دو سو سال کے بعد باہر سے نیا بلڈ گروپ لے آتا ہے کبھی جرمنی سے کبھی یوریا سے کبھی سکاٹ لینڈ سے' اس طرح مین پاپ تو وہی رہتا ہے' لیکن ادھر ادھر سے اس میں چھوٹے پانی آکر مل جاتے ہیں' اور پانی گدلا ہونے کے باوجود حیاتیاتی قوت نمو سے مالا مال ہو جاتا ہے۔

میں جب یہاں تک پہنچا تو ٹک کی آواز آئی۔ شاید فیڈ بیک ختم ہو چکا تھا۔ رات بھی اپنے آخری مرحلہ میں داخل ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ "بیگم تمہارا بلڈ گروپ کون سا ہے۔" لیکن میں جلدی میں ان صاحب سے یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا تھا کہ ان کی بیوی کا بلڈ گروپ "اے پازیٹو" ہے یا "اے نیگیٹو" اس سے پہلے کہ میرا کمپیوٹر پھر بیدار ہو جائے میں نیند کی پراسرار وادی میں داخل ہو گیا۔

("اوراق" لاہور)

سید منظور حسین یاد

ہاتھ باگ پر

ہم آدمی کے ہاتھ کو تو کمزور یا طاقتور کہہ سکتے ہیں' لیکن عنان کائنات کے ضمن میں ایسا نہیں کہہ سکتے وہ اپنی جملہ وسعتوں اور ہمہ گیری کے باوصف ہماری چنگل میں آسکتی ہے اور آجاتی ہے۔ جس طرح عنان کائنات کا ہماری چنگل میں آجانا کوئی معجزہ نہیں' اسی طرح عنان کائنات کو ہمارا چنگل میں لے لینا بھی کوئی معجزہ نہیں۔ یہ دونوں کام ہی انسان کی زندگی کے معمولات میں سے ہیں۔ البتہ انسان کے پاس یقین کی دولت نہ ہو تو اس کا ہاتھ بے حد کمزور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہے کہ اگر اس کے پاس یہ دولت ہو تو اس میں' یعنی آدمی میں' طاقت بھی بہت آجاتی ہے ---- یقین دو طرح سے حاصل ہوتا ہے' اول علم و حکمت کے ذریعے اور دوم جہالت کے ذریعے۔ علم و حکمت والے یقین کے اثرات انسانی زندگی پر کائنات سمیت ہمیشہ مرتب ہوتے ہیں' جب کہ جہالت کے ذریعے ہونے والے یقین کے اثرات ہمیشہ منفی پڑتے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ جہالت کا توڑ علم نہیں ہے -(۱) لہٰذا عالم آدمی جاہل ہو سکتا ہے ---- کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حکمت و دانش کے ساتھ صحیح معنی میں یقین کا تعلق قائم ہے' اسی طرح علم و جہالت کے ساتھ نہیں' علم اور جہالت کے ذریعے حاصل ہونے والا یقین بہت ناپائیدار ہوتا ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے' اس کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس حکمت اور دانش کے ذریعے حاصل ہونے والے یقین کو ہم ایک اعتبار سے ہمیشہ باقی رہنے والا کہہ سکتے ہیں۔

ہاں تو بات عنان کائنات اور آدمی کے ہاتھوں کی ہو رہی تھی۔ ویسے تو کائنات کی باگ ڈور قدرت کے ہاتھوں میں ہے' لیکن جب انسان اس کو یعنی عنان کائنات کو چھوتا بھی ہے تو پوری کائنات میں ایک عجیب انداز کا نشہ سا بکھر جاتا ہے' جس کو ہم بیک وقت نشہ ادراک بھی کہہ سکتے ہیں اور نشہ اختیار بھی۔ اس بات کو واضح الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ جس وقت انسان اپنے لئے کوئی معمولی سے معمولی ذمہ داری بھی قبول کرتا ہے' تو اس وقت ایک طرح سے عنان کائنات اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ کائنات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر آدمی کائنات کا رخ تو بظاہر تبدیل نہیں کرتا لیکن عنان کائنات کی اور خود کائنات کی کم ازکم آبرو ضرور رکھ لیتا ہے ---- کم از کم میں نے اس لئے کہا ہے کہ ذمہ داری قبول کرکے کائنات اور عنان کائنات کی آبرو رکھنا انسان کا معمول ہے' ورنہ سچ پوچھیے تو کبھی کبھی انسان ذمہ داری قبول کرکے کائنات کی آبرو کو چار چاند بھی لگا دیتا ہے ---- ہر ذمہ دار انسان کائنات کے خوابوں کی تعبیریں مہیا کرنے کا سبب ہوا کرتا ہے اور

اورنگ زیب قاسمی

اس میں بھی کوئی حیرت کی بات نہیں' اگر یہ ذمہ دار انسان کائنات کے خوابوں کی بذات خود تعبیر بن جائے۔

انسان کی ذمہ داری کائنات کے مقصد کو آگے بڑھاتی ہے۔ اس کے یعنی کائنات کے راز فاش کرتی ہے اور پھر یہ ذمہ داری یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ان فاش شدہ رازوں سے کائنات کی رونق میں اضافوں کا باعث بھی بنتی ہے ---- غرض ایک ذمہ دار انسان کائنات کے حسن و جمال کا سب سے بڑا محافظ ہی نہیں ہوتا' اس کے حسن و جمال کی تخلیق میں سب سے بڑا معاون بھی ہوتا ہے۔ معاونت کا تصور جس قدر اجاگر ہو کر ایک انسان کی ذمہ داری میں ظہور پذیر ہوتا ہے شاید اس کی مثال ہمیں اور کہیں نہیں ملتی۔ معاون و مددگار فرد کی حیثیت دوسرے درجہ پر ہوتی ہے لیکن ذمہ داری میں کوئی شخص دوسرے درجہ پر نہیں ہوتا۔ بطور دیکھا جائے تو ایک ذمہ دار انسان براہ راست قدرت کا معاون و مددگار ہوتا ہے' اور اسی لئے معاونت میں اس کا درجہ سب سے بلند تسلیم کیا گیا ہے۔

ذمہ دار ہونے میں ایک لطف کا پہلو یہ بھی ہے کہ معمولی سے معمولی ذمہ داری بھی ہر فرد بشر کے لئے ایک نیا میدان مہیا کرتی ہے - نئی ذمہ داری' نئی کائنات' گویا ہر ذمہ دار شخص اپنی کائنات کا بادشاہ ہوتا ہے۔ آپ اس کو سفید و سیاہ کا مالک بھی کہہ سکتے ہیں' لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس کے لئے سفید و سیاہ میں تمیز قائم رکھنا بے حد ضروری ہے ---- ذمہ دار آدمی کبھی ظالم نہیں ہو سکتا۔ عدل ذمہ داری کی اولین شرط ہے۔ اگر یہ شرط پوری نہیں ہوتی تو ذمہ داری کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جاہل کا یقین تو اسے لغویت اور بے ہودہ کاری کے خطرہ میں مبتلا رکھتا ہی ہے' عالم کا یقین بھی حکمت و دانش کے بغیر اسے اس طرح کے خطرہ میں کم مبتلا نہیں رکھتا ---- حقیقت یہ ہے کہ جاہل کے ہاتھ میں عنان کائنات نہیں ہوتی' اس کی اپنی ذات کی لگام ہوتی ہے۔ جس کو وہ جا و بے جا کھینچ کھینچ کر نہ صرف اپنی ذات کو لہولہان کر رہا ہوتا ہے' بلکہ دوسروں کو بھی تباہ و برباد کرتا ہے ---- وہی بات کہ حکمت و دانش کے بغیر تو عالم شخص کا یقین بھی اس طرح کی تباہی پھیلانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ گویا ذمہ داری کے لحاظ سے نرے عالم اور نرے جاہل میں کوئی خاص فرق نہیں۔ ذمہ داری کا اصل روپ تو حکمت و دانش کے ساتھ مل کر ہی صحیح معنی میں سامنے آتا ہے۔

عنان کائنات اور دست بشر کے ضمن میں یہاں غالب کے اس مشہور شعر کا ذکر بھی کم دلچسپی کا باعث نہ ہوگا:

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے' نہ پا ہے رکاب میں

بظاہر غالب نے ہماری بات کے برعکس بات کی ہے اور انسان کے مجبور محض ہونے کا اظہار کیا ہے۔ بقول غالب راہوار حیات دوڑا چلا جا رہا ہے' جب کہ اس کے سوار کی یہ حالت ہے کہ نہ اس کے ہاتھ باگ پر ہیں اور نہ اس کے پاؤں رکاب میں۔ یعنی انسان کی زندگی بڑی تیزی سے گزر رہی ہے' مگر اسے یعنی انسان کو اس پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ بظاہر غالب کی اس بات میں صد فیصد صداقت معلوم ہوتی ہے کہ اگر انسان غور و فکر سے کام نہ لے تو پھر اس کو اپنی زندگی میں کوئی مقصد نظر نہیں آتا اور وہ مجبور محض ہو کر رہ جاتا ہے' یا خود کو ایسا محسوس کرتا ہے لیکن جبر کی یہ صورت اسی وقت تک قائم رہتی ہے' جب تک انسان غور و فکر سے کام نہیں لیتا۔ جیسے ہی وہ غور و فکر کا آغاز کرتا ہے تو اسے اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس ہونے لگتا ہے اور

ذمہ داری کے اس احساس کے ساتھ ہی عنان کائنات اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بظاہر وہ اب بھی ہمیں کائنات کا کوئی رخ موڑتا ہوا نظر نہیں آتا' لیکن ذرا غور سے کام لیں تو پتہ چلتا ہے کہ بباطن وہ کائنات کا رخ بھی موڑ رہا ہوتا ہے ----- جی ہاں' احساس ذمہ داری کے ساتھ ہی انسان کے ہاتھ میں معنی کائنات کی لگام آجاتی ہے اور پھر یوں کائنات کے رخ کا مڑ جانا ایک بہت ہی سیدھی سی بات بن جاتی ہے' جس کو سمجھ لینا کوئی اتنا مشکل کام نہیں۔ ایسی صورت حال میں زمام کار اور زمام معنی میں بھی کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔۔۔ البتہ زمام کار ہو' یا زمام معنی' اس کو پکڑنے کے لئے چابک دست شہسوار ہونے کی ضرورت ہے' ایسا اناڑی ہونے کی نہیں کہ لگام کو دونوں ہاتھوں میں لے کر رہوار کی گردن ہی میں جھول جائے ----- بس اس لگام کو تو محض چٹکی سے پکڑنے کی ضرورت ہے۔ دیکھ لیجئے' غالب نے بھی اپنے شعر میں یہی کہا ہے ' " نے ہاتھ باگ پر ہے " مطلب یہ ہے کہ باگ کو ہاتھ میں نہیں بلکہ چٹکی میں نہ لینے کا شکوہ کیا ہے۔ غالباً یہاں یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں ہونی چاہیے کہ نزاکتوں اور لطافتوں سے نمٹنے والا ہاتھ کمزور نہیں ہوتا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی مضبوط اور طاقتور ہوتا ہے جبھی تو وہ صرف چٹکی کے ذریعے پورے لگام کو تھام لیتا ہے اور پھر کیا مجال جو راہوار میں ادھر ادھر بدکنے کی یا بلاوجہ سرپٹ دوڑنے کی جرات پیدا ہوسکے۔ جدید مثال سے اس طرح سمجھ لیجئے کہ اناڑی ڈرائیور موٹر کے سٹیرنگ وہیل کو مضبوطی سے پکڑتا ہے اور ماہر ڈرائیور کی محض انگلیوں کے اشارے پر موٹر کار فراٹے بھرتی چلی جاتی ہے۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ زندگی کا اپنے معمول پر چلتے رہنا بہت بڑی نعمت اور برکت کا باعث ہوتا ہے کیونکہ زندگی معمول پر چلتی ہے تو آدمی کا ذہن مجموعی اعتبار سے معمول پر رہتا ہے اور یہ تو آپ اچھی طرح جانتے ہی ہوں گے کہ آدمی کا ذہن معمول پر رہے تو زندگی میں دل خوش کن' غیر معمولی واقعات وقوع میں آتے رہتے ہیں اور یوں زندگی اپنے ارتقاء کے منازل نہایت خوبی سے طے کرتی چلی جاتی ہے۔ شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ آدمی کی زندگی میں معمولات حیات' بوریت یا اکتاہٹ پیدا نہیں کرتے۔ انسان کا اپنے معمولات سے تغافل برتنا ہی اس کی زندگی میں اکتاہٹ اور بوریت پیدا کرتا ہے اور اس حقیقت سے کون آگاہ نہیں کہ انسان کا اپنے معمولات سے تغافل برتنے کا مطلب غور و فکر سے گریز کرنا ہے۔ انسان کے ذمہ دار ہونے کا یعنی انسان کی ذمہ داری کا سب سے بڑا کرشمہ یہی ہے کہ وہ انسان کو غور و فکر کے لئے ہر وقت مستعد اور تیار رکھتی ہے ہاتھ باگ پر ہے تو سمجھ لیجئے' آدمی سوچ بھی رہا ہے۔

حواشی:

(۱) جہل کی ضد عقل ہے۔

("شام و سحر" لاہور)

پروین عاطف

کھلاڑی گھاٹ

ہوٹل ہلٹن' ہاکی کے کھلاڑی اور آرگنائزرز سے مچھلی گھاٹ کی طرح کھچا کھچ بھرا تھا۔ خواتین کی کھیل میں شمولیت جس طرح ہمارے ہاں سیاسی چوگان کھیلنے والوں کی تقاریر کا موضوع بنتی ہے یا مولانا حضرات کے تن بدن میں آگ لگاتی ہے دوسرے ممالک میں اس سے بالکل الٹا رد عمل ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے ہاں خواتین کا ورزش یا کھیل میں شامل ہونا محترم اور پروقار سمجھا جاتا ہے۔ - بیشتی - بلویہ گویچی - کے ناموں کے لاکٹ لوگ عزت کے طور پر اپنی گردنوں میں لٹکائے پھرتے تھے۔

میں لاؤنج میں داخل ہوئی تو کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ میں کون تھی اور کہاں سے آئی تھی' گمشدگی کا لذیذ احساس میرے حواس پہ طاری تھا۔ یہ احساس میری پختہ عمری کی دین تھا۔ نوجوانی میں یہ احساس اندر سے زخم زخم کرتا تھا۔ میں ہوں میں ہوں کی رٹ تعزیلت میں گراتی تھی۔ اب شاید تھوڑی سکت پیدا ہوتی جاری تھی کہ کبھی کبھی اپنا آپ بک سے اتار کر اردگرد دیکھ سکوں۔ یا شاید میرا وہم تھا کہ ایسا ہے۔ لیکن اجنبی بستیوں میں سڑکوں پر بہت سے غیر زبانوں میں لکھے ان کی منزلوں کی نشان دہی کرتے سنگ میل اپنے اپنے دائروں اپنی اپنی جبلتوں کے مطابق زندگی گزارتے لوگوں کے اجنبی گروہ حوصلے کا باعث بنتے ہیں ..... کبھی کبھی پیرس کے انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن پہ کھڑے کسی فرنچ خاندان یا قاہرہ کے کسی قہوہ خانے میں قہوہ پیتے مصریوں کو دیکھ کر ہونٹوں پر منتقمانہ سی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے ..... یہ سوچ کر کہ ان سب میں سے کوئی ایک شخص بھی میری حیات کے ان تمام لمحوں سے ناواقف ہے جو میں نے دھرتی پہ آنے کے بعد بسر کئے اور نہ ہی اپنی اس بات کا کوئی علم ہے کہ ..... میری زندگی کا سارا ہوم ورک مجھ سے غلط ہو چکا تھا۔ اور اب میں کانٹوں اور دھبوں سے بھری اس کاپی کو غرقاب کرنے کی خاطر قریہ قریہ بھٹک رہی تھی۔

کھلاڑنیں: رات کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ یونانی دیویوں کے صحت مند سڈول بدنوں اور تروتازہ چہروں والی کھلاڑی لڑکیاں دن بھر کی محنت کے بعد صوفوں' کرسیوں پر ڈھیلی ڈھالی دراز آپس میں گپ شپ میں مصروف تھیں۔ کھیل کے غیر تحریری قانون کے مطابق ..... کسی کھلاڑی یا کھیل رات کو دنیا کے کسی بھی معاشرے میں ہم تمام لیٹ نائٹ یا گڈ ٹائم کی اجازت نہیں ہوتی ..... ورلڈ کپ کی تمام کھلاڑیوں کا تعلق سفید فام اقوام سے تھا ..... میں نے چائے کا ایک پیالہ لیا اور ان ڈوریام درخت کے سائے میں بیٹھ کر اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔

فرانسیسی ٹیم کی کلارا جرمنی کی کاربلانچ کو ایک نوجوان کی رنگین تصویر دکھا رہی تھی۔۔۔ اور وہ

خوبصورت واقعی خوبصورت ..... مجھے ملتا تو تم سے چھیننے کی کوشش کرتی۔ کہاں ہے آج کل ..... ملنے نہیں آیا؟

ایک شادی شدہ عورت اچک کر لے گئی ..... دو بچوں کی ماں ..... پچھلے ہفتے دیکھا تھا۔ اسے پھول مارکیٹ میں اس عورت کا پہلا بچہ کندھے پہ دھرے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے' یوں اچک اچک کر چل رہا تھا جیسے پہلی پہلی بار چاند پہ اترا ہو ..... اس جہاندیدہ عورت کے پاس دولت کے سوا "فنر" کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ کالر بلانچ ..... کچھ بھی نہیں۔ "کاربلانکا" نے طویل ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ لیکن ..... میں کوئی پرانے زمانے کی محبت میں ہاراکیری کرنے والی جاپانی عورت نہیں ہوں۔ ہاکی کی کھلاڑی ہوں ..... یہ "فنر" کی دین ہے کہ اس کی بے وفائی کے بعد میں نے رات رات بھر اکیلے ہاکی کھیلی ..... اور دنیا کے چیدہ کھلاڑیوں میں شمار ہوئی۔ وہ کون ہوتا ہے میری عزت نفس کو روند کر نکل جانے والا۔" اور وہ ہاکیوں کے تھیلے سے ٹیک لگا کر بیٹھی لانبے سیاہ بالوں والی ہسپانوی ٹیم کی کپتان۔ انگریز فل بیک کو بتا رہی ہے۔ "میلانو" میں میں اور "انٹینیو" ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے ..... برسوں بعد دوبارہ ملے تو وہ بل فائیٹنگ رنگ میں ایک بہترین بل فائٹر کی حیثیت سے کھڑا تھا ..... پتا نہیں اس نے وہاں تلوار لے کر بل کے پیچھے بھاگتے ہوئے مجھے پہچان لیا۔ بپھرے بل کے تیکھے سینگوں میں تلوار دھنس دینے کے بعد پھولوں کا گلدستہ لئے جب وہ روسٹرم کے سامنے سے گذرا تو اس نے گلابوں کا گلدستہ میری طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ مارگریٹا ..... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے سنا گریس کبھی پہلے سنی ایسی دیوانگی؟ اور انٹونیو نے اسی شام میرے گھر آکر مجھے منگنی کی انگوٹھی پہنا دی تھی ..... وہ کہتا ہے وہ اخباروں کے ذریعے ہمیشہ میرا پیچھا کرتا رہا ..... تم مان سکتی ہو "گریس" ہم دو بین الاقوامی شہرت کے کھلاڑی یون میڈیول (Medieval) زمانوں کی طرح رشتہ ازدواج میں منسلک ہو رہے ہیں ....."

وہ زور سے ہنسی ..... اور وہ لاؤنج کے قریبی کونے میں اردگرد سے بے خبر ڈچ کھلاڑی میز پہ کھڑی ورلڈ کپ جیت کر وکٹری سٹینڈ پہ کھڑے ہونے کی ریہرسل کر رہی تھی۔ کوئی ملک کا لال ورلڈ کپ کو ہالینڈ سے لے جانے کی جرات کر کے دکھائے۔ کوئی ہے۔ کوئی ہے اور میں چائے کا آخری گھونٹ گلے سے نیچے اتارتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

اگر دلی میں ہلاھوری کا باپ بھی تو گلی والی کے جھگڑے میں گھر اجاڑتا ہے۔ لاہور والی نزہت نے اپنے منگیتر کی کار میں کسی دوسری لڑکی کو دیکھ کر گولیاں کھالیں۔ اور "زاہدہ" کے "مقومیرا" نے اپنی زندگی دہشت گردی کی وجہ سے تباہ کرلی۔ اور ہم سب حیات کے اس سیاہ سمندر میں ڈگو ڈولے کھاتے اتھاہ پستی کی طرف رواں دواں ہیں۔ تو پھر؟ تو پھر؟؟

شاید ہم ابھی تک اپنے ایپ (APE) رویوں میں گرفتار ہیں۔

ڈیوٹی: کمرے میں گئی تو ڈیوٹی روسٹرم کی کاپی میری دہلیز میں پڑی تھی۔

آسٹریلیا بمقابلہ آئرلینڈ۔ اٹلی بمقابلہ انگلستان۔ گراؤنڈ نمبر دن وقت ..... باپ کی کھلی ہوئی پیجیرو کے مزے لوٹنے والے ناکارہ نوجوانوں کی طرح ہاکی کے سرخاب کا پر جو میں اپنے سر پہ سجائے پھرتی تھی میرا بالکل نہیں تھا ..... اسی کا تھا۔ جس نے چلتے چلتے بے دھیانی میں اپنے نام کا منگل سوتر میرے گلے میں پہنایا۔ اور

اورنگ زیب قاسمی

لب میں اس کی شہرت کا دیا اپنی ہتھیلی پہ دھرے گھر گھر گھومتی پھرتی تھی۔

خواتین ہاکی ورلڈ کپ میں پاکستان کی طرف سے مجھے بطور ہاکی جج بھیجا گیا تھا۔ ہاکی کے جج کی حیثیت اس جج سے یقیناً مختلف ہوتی ہے جو لوگوں کو پھانسی کی سزا سناتے ہیں۔ یا موڈ اچھا ہو تو قاتل کو باعزت بری کرتے ہیں ..... ہاکی کا جج اس جیوری کا ممبر کہلاتا ہے۔ جو میدان کے ایک سرسبز کونے میں بیٹھی مزے مزے سے میچ بھی دیکھتی ہے۔ میچ کے اور گراؤنڈ میں ہونے والی تمام اونچ نیچ کی ذمہ داری بھی اٹھاتی ہے۔

ہی مجھے یقین ہے کہ ادب کے رسیا قارئین کا علم کھیلوں کی انتظامیہ یا آرگنائزیشن کے بارے میں اتنا ہی ہوگا جتنا اس ناچیز کا ڈاکٹر عبدالسلام کی مشہور زمانہ فزکس کی تھیوری کے بارے میں ہے جس میں انہوں نے کائنات کے صدیوں پرانے اصول تبدیل کر کے رکھ دیئے۔ لیکن زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم۔ اسی لئے چاہتی ہوں۔ آج کچھ "ٹوئیں۔ ٹوئیں" باتیں آپ کو ان لوگوں کے متعلق بتلا جاؤں جو یوں تو کھیل کے میدان کے سرسبز کونے میں بیٹھے چائے کافی اڑا رہے ہوتے ہیں۔ لیکن درپردہ میچ کی تمام واردات انہی پہ وارد ہوتی ہے۔ ہر نوع کے میچ انہی کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ جیوری بیک وقت چار ججوں اور ایک ٹیکنیکل ڈیلیگیٹ پہ مشتمل ہوتی ہے۔ ایمپائرز الگ۔ ہاکی کے جج کی حیثیت عدالت میں بیٹھنے والے اس جج سے ملتی جلتی بالکل نہیں ہوتی جو اپنے یا اپنی بیگم کے موڈ کے مطابق گنہگاروں اور بے گناہوں کو یکساں پھانسی اور عمر قید کی سزا سناتا ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت کچھ کچھ اس ہیڈ کلرک سی ہوتی ہے جس کی ہر فائل پر حتمی نوٹ لکھا جاتا ہے اور جو ریٹائرمنٹ کی گھڑی تک اس کا متن سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ فائلیں پنڈ (Pend) کرتی ہیں۔

ٹیکنیکل ڈیلیگیٹ

ہاکی کے ہاری ساری کی کیا حیثیت کہ وہ ان صاحب کو قریب سے جاننے کی جرات کرے ..... یہ نہ صرف اپنے علم کے دانائی لائے ہوتے ہیں بلکہ کھیل کی سیاست میں برسوں چوگان کھیلنے کے بعد اس مقام پہ براجتے ہیں۔ دوران ٹورنامنٹ پیشانی پہ ہمارے صوبے کے چیف سیکرٹری جیسی تیوری اور گردن میں اس جرنیل جیسا خم ہوتا ہے جو مارشل لاء لگانے کی سازش کر رہا ہو۔ مسکراہٹ میں فلور کراسنگ کے عادی ایم این اے جیسی کچھ کچھ عیاری ..... یہ صاحب یا صاحبہ ٹورنامنٹ کے مطلق العنان حاکم کہلاتے ہیں ..... ان کے لئے کھیل کا میدان روم کا ایمفی تھیٹر (Amphetheatre) ہوتا ہے چڑیا پر پھڑپھڑائے تو ان کی اجازت لے کر' ان کے ابرو کے اشارے پہ ٹیمیں ڈس کوالیفائی ہو جاتی ہیں ..... میچ کا ٹکس پہ میچ کر کینسل کر دیا جاتا ہے۔ ایمپائرز وسل بجاتے ریٹائر ہو جاتا ہے۔ کپتان کی شادی عین موقع پہ رک جاتی ہے ..... بس کچھ نہ پوچھئے ان کی مطلق العنانی کے بارے میں ..... پھر مفت کی سیاحت ..... سفر خرچ۔ فائیو سٹار ہوٹل۔ پوتے پوتیوں کے کھلونے۔ بیوی کی پرفیومز ایل جی کی شال۔ اپنے لئے "جنس سنگ ٹانک"..... بھی میزبان ملک کے ذمہ ..... اسی لئے بے چارے ہاکی کے سفید فام بیہودہ بادل نخواستہ۔ اپنی چلبلی نوجوان سیکرٹریوں کے نہ نہ کرنے کے باوجود ..... بڑے اہم مقامات کی ڈیلیگیشن خود بھگتا لیتے ہیں۔ اور ہمارے افرو ایشیائی کینڈی ڈیٹ "کب سے ہے اپنا مقدر یہ تماشا دیکھنا" کے مصداق' مسلمان کی پہلی راندہ درگاہ بیوی کی طرح دل مسوس کر رہ جاتے ہیں ..... یا پھر جب بھی ٹوکیو وغیرہ میں کوئی ٹورنامنٹ مقرر کرایا جائے تو ہردیال سنگھ یا سری لنکا کے "رانے ڈی سلوا" کی باری بھی آجاتی ہے کیونکہ آپ تو جانتے ہیں ..... سفید فام

بجھوڑ لیکٹو وغیرہ کے شہوت پرست ' کبھی پھر سے بے حد خائف ہیں ..... ایک بار میرے ناتواں کندھوں پر بھی ٹی ڈی کا خلف ڈالا گیا تھا ۔ برسوں اسی حسرت میں چمگادڑ کی طرح ہاکی کے بوڑھے درخت سے چمٹی رہے کہ شاید پھر سے بہار آ جائے۔

امپائرنگ: جی۔ پی وکٹ کے پیچھے کھڑے ڈھلی عمر کے اس شخص سے آپ اچھی طرح واقف ہیں جو اپنے مجرب بدن پہ کھلاڑیوں کی چابیاں۔ ٹوپیاں۔ سویٹر لٹکائے میکانکی انداز میں انگلیوں سے چوکے چھکے بتاتا رہتا ہے یا ملک الموت کی طرح کھلاڑی کے آؤٹ ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

سالہا سال اپنی شہادت کی انگلی سے کھلاڑیوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرتے ہوئے اس میں اک گونہ دھیج پیدا ہو جاتا ہے لیکن ہاکی والا اونسوں۔ جبلی طور پر اس کا مزاج کچھ ہٹ دھرمی والا یا طوفان میل قسم کا ہوتا ہے ..... ادھر بے چارے کھلاڑی نے میدان میں کان کھجایا' ادھر سیٹی بجی اور سرزنش والی ہری جھنڈی اس کی نگاہوں کے سامنے لہرانے لگی۔ ان لوگوں کا محبوب مشغلہ' ایک تو کسی بوڑھے کی نوجوان محبوبہ کی طرح بات بات پر ٹھنکنا یا پھر دھانسو شوہروں کی طرح پکی پالی میں کوکٹ نکال کر اپنا آپ منوانا ہے کھیلوں کی طرح بین الاقوامی امپائر ورلڈ میں اب یہ اہم گردانے جاتے ہیں۔

ستو بھائی - ہاں آئی لینڈ میں تمہارے اور تمہاری بیوی کے پندرھویں ہنی مون کا انتظام کر دیا گیا ہے ۔ لیکن لازم ہے کہ اگلے ہی فائنل میں ہماری ٹیم جیتے ..... ان صاحب کی قانونی عمر پچاس برس ہے ۔ ڈاکٹر کہتے ہیں ۔ پھر جسمانی قوت کم ہونے لگتی ہے لیکن یار زندہ صحبت باقی "بھلا ہو پولی کلرنیوں اور پرسلین کی بیسیوں کلی چند ایسے محترم حضرات کو بھی جانتی ہوں۔ جنہوں نے قریباً" آدھی صدی پہلے مجھے اپنی پھوٹی بھاگی گردش کر منہ دکھلائی دی تھی - سنا ہے مشہور زمانہ امپائر محمد دین تو میچ سے پہلے باجھاگی ڈور لے کر بتیسی کو آپس میں اچھی طرح باندھتے ہیں۔ دوران میچ سیٹی کہیں زور سے بجانی پڑ گئی تو پھر سے بتیسی اڑ کر اسٹرو ٹرف پر نہ جا پڑے ۔

جج : آدم بر سر مطلب - ہاکی میں جن حضرات کو وقتاً "فوقتاً" اس باعزت فائیشل سے نوازا جاتا ہے' وہ ہرگز عدلیہ کے ان ججوں میں سے نہیں ہوتے ..... جو بوجوہ ' کبھی بے گناہوں کو پھانسی پر لٹکاتے ہیں ' اور کبھی گناہ گاروں کو ..... موسم سرما کی بانجھ بھڑ کی طرح ہاکی کے جج کے ڈنک ' بے ضرور ہوتے ہیں۔ ٹورنامنٹ کے دوران ان کی کل ملکیت یا ان کا کل کنٹرول صرف بھونپو اور میچ کے اوقات پر قابو رکھنے والی سٹاپ واچ ہوتی ہے۔

سٹاپ واچ : حیرت کہ وقت کی اور میری ہندو مسلم جنگ آج بھی جاری ہے ..... نسل پرست گورے کی طرح وقت کو جب بھی موقع ملا اس نے میری پشت پر چڑھ کر مجھے رگیدنا شروع کر دیا ..... یہ کم ظرفی نہیں تو اور کیا ہے ..... ؟ اوپر سے یہ سٹاپ واچ ؟ ؟ توبہ میری الھڑی کے کندھوں پر دھری صلیب ۔ ہر اہم ٹورنامنٹ پر جانے سے پہلے ' میں نے راتیں جاگ جاگ کر شل تسبیح اس کے ہندسے پھیر ڈالے ۔ لیکن جب بھی کوئی اہم میچ میرے ہاتھ لگا بے وفا موئی سٹاپ واچ مجھے جل دے گئی۔

ورلڈ کپ سیمی فائنل اور سٹاپ واچ: یہ ورلڈ کپ حاصل کرنے کا اہم ترین میچ جرمن اور ہالینڈ کے درمیان تھا۔ مختلف جنگوں میں جرمن قوم کی تاریخی کامیابیوں کی وجہ سے یورپی اقوام اس سے خوف زدہ

اورنگ زیب قاسمی

ہونے کی بنا پر اس سے نفرت کرتی ہیں ..... اس لئے جرمن ہاکی ٹیم کی جیت کے امکانات سے سارا پنڈال جھنجھلایا ہوا تھا ۔ ہالینڈ کی ٹیم آگ اگل رہی تھی۔

" آج ہاکی کے اس بین الاقوامی ہجوم میں مجھے اپنی ہنرمندی ثابت کرنا ہوگی ۔ " میچ کے چلتے چلتے ۔ لحات میں میں نے سٹاپ واچ کے بٹنوں کو پیار سے سہلاتے ہوئے کہا ..... وی آئی پی لاؤنج میں جیوری وطے کی صوفے پر ہالینڈ کی ملکہ بی اے ٹرس (Beatrus) بچوں کی طرح کرسی پر اچک کر بیٹھی تھی۔ پورے پنڈال میں ایک پُر شور سناٹا چھایا تھا ..... ہالینڈ کی ٹیم کو " کارنر " ملا - جسے گول کرنے کا سنہری موقع سمجھا جاتا ہے لوگ اپنی اپنی کرسیوں پہ کھڑے ہو گئے سانس رک گئے ' دل کی دھڑکنیں بند ہونے لگیں۔ نظر سکور بورڈ پر پڑی ..... میچ کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ ہالینڈ کے کھلاڑی نے گول کرنے کو ہاکی ہوا میں لہرائی ..... افسوس' وقت کبھی کسی کی ہارجیت کا انتظار نہیں کرتا۔ فرض کی ادائیگی جذبوں سے مبرا ہوتی ہے ..... سٹاپ واچ ..... سٹاپ واچ کے سارے ہندسے مردہ تھے۔ میں نے صور پھونکنے والے فرشتے کی طرح بھونپو اٹھایا اور پورے زور سے بٹن دبا کر میچ کے خاتمے کا اعلان کر دیا ..... یکا ایکی ہاکی گراؤنڈ میدان حشر میں تبدیل ہو گئی ..... ڈچ ٹیم خونخوار انداز میں ہاکیاں لہراتی ہمارے زرد تمبو کی طرف بھاگی ..... اوہ نو ..... اوہ نو کے نعرے سنائی دینے لگے ..... میں بھونچکی تھی ..... ملکہ بی اے ٹرس سے لے کر بال بوائے تک کے منہ سے کف جاری تھا۔ مجھے یہ لوگ جون آف آرک کی طرح ابھی بیچ پنڈال زندہ جلا ڈالیں گے کیا ہوا میں نے اپنی ساتھی جج سے پوچھا جو کھڑی ہو کر دل کے مریض کی طرح ہوا میں جیسے سانس لے رہی تھی ..... اس نے جرمن نازی کی طرح میرے پورے سراپے پر ایک قہر آلود نگاہ ماری اور بنا کچھ بولے جلدی سے چبوتری نمکل سے نیچے اتر گئی۔

ٹیکنیکل ڈیلیگیٹ بوڑھی آسٹریلین جو میچ کے آخری لحات میں جذباتی ہو کر آگے جھکے سے جاگی تھی اور جس نے محض ہاکی کی الفت میں کبھی شادی نہیں کی ..... اور اپنی ستر سالہ دوشیزگی اس کھیل کی قربان گاہ پر چڑھا دی' ہانپتے کانپتے میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ بس مس گلمور۔ میں نے اسے جاں کنی کی کیفیت میں مبتلا دیکھ کر پوچھا میرا چالیس سالہ ہاکی کا کیریر تباہ ہو گیا۔ سٹر ماطف۔ ابھی ورلڈ کپ کے سمی فائنل میں پورے دو منٹ باقی ہیں۔ مس گلمور کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ میں نے انکھیوں سے اپنی گود میں پڑی سٹاپ واچ کی طرف دیکھا۔ کومے میں جانے والے مریض کی طرح اس کے ہر ہندسے کی دھڑکن بند تھی۔ اور وہ لمحہ جس پہ وہ بند کھڑی تھی' کسی دوسرے سے لگا نہیں کھاتا تھا۔

آسٹریلیا کی مس گلمور کو آخر میں کیسے کہتی ..... کہ میرا شعور تو میرے اندر کی سٹاپ واچ کی اس ساعت سے بے خبر ہے ۔ جب اس کی نبض ڈوبنا شروع ہوئی تھی۔ اس بے حیثیت سے ہاکی کپ کا پورا سمی فائنل کیسے نبھتا؟

میں کمرے میں اوندھا لیٹے پڑی رہی' کسی دوسرے کی شہرت کے درخت تلے بیٹھنے کے نتائج اکثر ایسے ہی ہوا کرتے ہیں' شوہر کی محبت۔ آخر تا کجے ...... کھلاڑی لڑکیاں ریزہ ریزہ ہو گئی ہوں گی۔

مجھے ان سے معذرت کرنی چاہیے۔ حوصلہ رکھنا ہوگا۔ میں نے شام کو کمرے سے باہر جاتے ہوئے سوچا ..... ڈرتے ڈرتے لڑکیوں کے فلور میں داخل ہوئی ..... میرا خیال تھا یا تو وہ ہمت سے تیر لے کر میرے لئے زہر میں بجھا رہی ہوں گی ..... یا غم سے مٹی کا ڈھیری ہوں گی ..... یا اللہ خیر میں نے ان کی ٹی وی لاؤنج کا بوجھل شیشہ

آہستہ سے سرکایا ..... نہیں نہیں ..... یہ کھلاڑیوں کا طور نہیں ہو سکتا..... رنگ نغمے خوشبو ..... ! طور پہ لیلی بازار لاہور کی چاند رات کا سماں تھا..... سمی فائنل کی لاش کب سے وقت کے اتھاہ سمندر میں ڈوب چکی تھی ..... لمحہ جو مٹھی میں ہے ..... زندگی سے کھیلتا ..... دھڑکتا ..... وہی اہم ہے۔

کھلاڑی کی زندگی اسی موو گرام سے چلتی ہے ۔ وہ ساری کھردرے نکر کرتوں اور مردانہ بوٹوں میں گیند کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتی ..... جنہیں دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتی تھی۔ اس صنف درشت سے سوائے منتیامارے بلغمی بوڑھوں کے کبھی کوئی شادی نہیں کرے گا..... جانے اس شام کہاں تھیں ..... !

" کم جائن اس مسز عاطف "

ایک کیوٹکس سے رنگین ہاتھ شفقت اور چاہت سے میری طرف بڑھا.....

" نہیں نہیں " " گریس " ..... یہ تم نہیں ہو سکتی ۔ انگریزی ٹیم کی رائٹ ہاف ..... شام کے گلابی لباس اور کندھوں تک پھیلے سنہری بالوں میں وہ کچھ کچھ پرانی ایکٹریس "گریس کیلی " (ملکہ موناکو) " سی لگ رہی تھی اور وہ بڑی بڑی کلائیوں والی آئرلینڈ کی " میگی " جو کوزف مشین میں سلہ اڑس کر قاتا نکال رہی تھی ..... اس نے دوستانہ انداز میں گلاس میری طرف بھی بڑھایا چیرز (Cheere) میں خشکی میں نے جھجکتے ہوئے گلاس پکڑا اور وہ لانبے سیاہ بالوں میں پھولوں کا طلائی گھاڑ سے اوپر اکاتی ای کو سوفیا دراصل رائٹ ان تھی .....
اس نے گاتے گاتے میری طرف ایک اداسک سی مسکراہٹ بھیجی۔ واقعی بڑی بھلی کیونکہ تھی کھلاڑیوں کی بہت قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا..... میکسیکو کے ہل فائنز سے اسلام آباد کی شاٹلک نورین تک ..... سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے زندگی کے ہر رخ کا سمی فائنل ڈٹ کر کھیلنے والے ..... عذر گوہر مقصود کے آگے تمام تجربے تمام تمنائیں ہیچ .....

وکٹری سٹینڈ پر کھڑے ہونے کی خاطر یہ لوگ چالیس برس پہلے سے بھوکے پیاسے بیٹھ سکتے ہیں۔ بن باس لے سکتے ہیں جان سے پیاری محبوبہ کو ہلاکو خان کی طرح پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی سے نیچے دھکیل کر میچ کھیلنے جاسکتے ہیں۔ ان کی تپیا ان کا فلسفہ حیات الگ تھلگ ۔ عام انسانوں کے فہم سے باہر ہوتا ہے۔

روح دل و دماغ مکمل کر ور تک سے پاک سچا شفاف ہوتا ہے ..... شخصیتیں ... لا ... کرکٹ کے عمران خان 'کھلی کتابیں ..... جو صفحہ چاہے کھول لیجئے ..... تمام ورق پھیلے سب کے سامنے بی تھوون (Bethoven) ریمبرانٹ (Rambrant) سومرسٹ ماہم (Somerset Maughum) بھی یقیناً" اپنی ہی ذات کو پوجتے پوجتے تخلیق کاری کی لازوال عظمت تک پہنچے ۔ فرق صرف داخلی اور خارجی سطح کا ہے ۔ کھلاڑی لوگ اپنے جھلمل سنہری بدنوں کو اسی طرح پوجتے ہیں' جیسے بین الاقوامی کانفرنس' کسی جھمکیا آسکر ایوارڈ کی محفل میں اگر آپ کسی خاتون یا صاحب کو کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشوں یا کاریڈورز میں سب آئینوں میں اچک اچک کر اپنے عکس پر قربان ہوتے دیکھیں تو فوراً" سمجھ جائیے آپ کے سامنے کوئی مشہور کھلاڑی یا کھلاڑن ہے ۔ جذب کے اس لمحے جب یہ اپنے آپ میں گم ہوں۔ تیسری منزل سے گر کر آپ اگر ان سے یہ کہیں میری ٹانگیں میرے بازو میری کھوپڑی سب چور چور ہو گیا..... تو وہ سنی ان سنی کر کے اپنے کسی خوبصورت گلابی پٹھے کو پچکارنے لگیں گے ..... یا اپنے ہی بدن کے کسی عام سے مسے پر ٹالسن کا لیپ شروع کر دیں گے۔ جاپانی گیشاؤں کی طرح اگر یہ اپنے قیمتی اجسام کو صنم خانہ بنا کر نہ رکھیں تو شاید ان کا پنڈا اکھوٹا ہونے لگے۔

اورنگ زیب قاسمی

شہرت نامی ..... خیرہ کر دینے والی روشنی اور جسمانی قوت ..... ٹورنامنٹ در ٹورنامنٹ جیتے جانے کے بعد وائلن اور ستار کی طرح جذبوں سے چھڑ جانے والی گھڑی پیچیدہ حیات کو پرکھنے یا بیتنے کا ان کے پاس وقت ہی کہاں ہوتا ہے نہ کوئی تھرمامیٹر.....

("تخلیق" 'لاہور)

سات سمندر پار

۳ جون کو چار بجے شام ہمارا دانہ پانی ٹورانٹو سے اٹھا اور ہم اکرام بریلوی صاحب اور ان کے فرزند نسیق کی معیت میں' اور انہیں کی گاڑی میں' کولمبس (اوہایو) جانے کے لئے مسی ساگا سے چلے اور ٹورانٹو ایئرپورٹ پہنچے۔ امریکہ اور کینیڈا میں گاڑیوں کی پارکنگ ایک مسئلہ ہوتی ہے' انتظامی مسئلہ بھی اور اقتصادی مسئلہ بھی۔ پانچ سات ڈالر تو ہر پارکنگ میں ادھر ادھر ہو ہی جاتے ہیں۔ جگہ ملنا بھی ایک شرط ہے' سو ہم کو ایئرپورٹ کے صدر دروازے پر اتار کر وہ اپنی گاڑی کو ٹھکانے پر باندھنے کی فکر میں لگ گئے اور اکرام صاحب ہماری فکر میں' مگر ہم نے اکرام صاحب کو بہ اصرار رخصت کیا۔ اکرام بریلوی نئی دنیا میں پرانی دنیا کے سفیر ہیں۔ ابھی تک انسانی اور اخلاقی اقدار کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ گفتار اور کردار میں کرسٹل کی طرح صاف اور شفاف ہیں' (Angular) نہیں ہیں' بقول سوز ناروری

آپ تو پان پھول سے بھلے
بات سو لاکھ من سے بھاری ہے

اکرام صاحب گئے تو محسنین (محسن احسان اور محسن بھوپالی) آگئے' پیچھے پیچھے عارفین (عارف عبدالمتین اور بیگم عارف) بھی اور حفیظ تائب ان کے ساتھ ساتھ۔ ٹکٹ کاؤنٹر والوں نے تو ہم کو فوراً فارغ کر دیا تھا مگر بورڈنگ کارڈ نہیں دیا۔ کہا کہ وہ گیٹ نمبر ۵۵ پر ملے گا۔ وہاں جہاز میں داخلے کے لئے مختلف گیٹ ہوتے ہیں اور ہر گیٹ پر متعلقہ ہوائی کمپنی کا کاؤنٹر اور انتظار گاہ میں نشستوں کا انتظام (کچھ اسی طرز کا انتظام کراچی میں "جناح ٹرمینل" کے عنوان سے کیا گیا ہے) راستے میں ریستوانوں' کتابوں اور کاسمیٹکس کی دکانیں' بجلی کے ذریعہ جوتا پالش کا انتظام الگ۔ جو تپالش کرنے والوں کو ہم نے غور سے دیکھا تو ان میں سے بیشتر اپنے چہرے مہرے اور رنگ ڈھنگ سے ایشیائی نظر آئے۔ وہاں یہ کام کیا کوئی کام بھی معیوب نہیں ہے' (سکالپش سے بہرحال بہتر ہے) محنت کی عظمت دیکھنی ہو تو مغربی ممالک میں جا دیکھو۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے یار لوگ گیٹ ۵۵ کی طرف دوڑتے جاتے تھے اور اپنے سوٹ کیسوں کو دوڑاتے جاتے تھے۔ کچھ فاصلہ پاؤں پاؤں طے کیا تو کچھ خود کار راستوں کے ذریعے ------ مگر گیٹ ۵۵ کے کاؤنٹر پر جا کر معلوم ہوا کہ ہمارے پاس "اسٹینڈ بائی" کا ٹکٹ ہے یعنی "کھڑے رہو ایک طرف" ------ انتظار ویسے بھی دل والوں کا مقسوم ہے کافی انتظار کے بعد ہم نے ٹہلنا شروع کیا اور ٹہلتے ٹہلتے کافی پی! مگر ستارے موافق نہ تھے۔ محسن احسان نے کاؤنٹر کی لڑکیوں پر اپنی "استادانہ انگریزی" کا بہت رعب جمانا چاہا مگر وہ ان کی سرو قدی سے تو متاثر ہوئیں انگریزی سے

اورنگ زیب قاسمی

نہیں۔ سیٹیں تو نہیں دیں گے مگر اگلے جہاز میں قسمت آزمائی کا مشورہ مفت دیا۔ اگلی فلائٹ سات بجے کی تھی' ڈھائی گھنٹے میں ڈھائی اونس خون تو جل ہی جاتا مگر ایئرپورٹ کی خوبصورتی' مسافروں کی رنگا رنگی اور دکانوں کی چمک دمک نے بہلائے رکھا۔ اللہ اللہ کر کے پونے سات بجے جہاز میں داخلے کا پروانہ ملا۔ عارف عبدالمتین صاحب کو علالت اور پیرانہ سالی کے سبب چلنے پھرنے میں تکلف تھا اس لئے وہ وہیل چیئر پر سوار سب سے پہلے اپنی بیگم کی رفاقت اور حفیظ تائب کی حفاظت میں جہاز تک پہنچے' باقی مسافر بعد کو۔ وہاں بیماروں' کمزوروں اور معذوروں کے لئے ہر جگہ' ہر شعبے میں ضروری سہولتیں موجود رہتی ہیں۔

جہاز میں سب کچھ وہی تھا جو ہوتا ہے ------ مسافر' جہاز کا عملہ' خوبرو میزبان' چائے' کافی' جوس' بھنے بادام' نمکین مونگ پھلی اور حسب الطلب' کچھ "مشروبات مکروہہ" بھی! ہمارے دائیں بائیں "محسنین" تھے اس لئے کچھ نہ کچھ تو ہونا تھا۔ کسی نے کہا کہ "محسنین" کا نون اول بالفتح نہیں بالکسر ہے' مگر حفیظ تائب نے' جو عربی داں بھی ہیں' فرمایا کہ نہیں اگر دو ہوں تو نون بالفتح' دو سے زیادہ ہوں تو بالکسر ------ یعنی ان دونوں کو "حسنین" کے نون کی طرح ادا کریں گے۔ لیجئے جھگڑا ختم ہوا۔ عاشقی اور شاعری میں بھی سارا مسئلہ "میں" کا ہوتا ہے سو حفیظ صاحب نے سارے مسائل بہ یک جنبش زباں حل کر دیئے۔

سو اتفاق کہ ہمارا سامان پچھلی فلائٹ سے جا چکا تھا اور اس کے جانے کے بعد یہ مصرع بار بار زبان پر آرہا تھا

اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

خیر' ہم دوسرے جہاز سے پہنچے۔ ایئرپورٹ پر ہمارے میزبان خاص جناب ماجد علی خان اور ان کے رفیق کار محمد عثمان صاحب ہمارے انتظار میں خستہ ہو چکے تھے مگر ہم کو دیکھ کر تازہ دم ہو گئے۔ محمد عثمان صاحب "بزم اردو ادب" کولمبس (اوہایو) کے صدر اور ماجد علی خان آرگنائزر اور "جشن بہار انٹرنیشنل مشاعرہ ۱۹۹۲ء" کے کنویز تھے۔ انہوں نے اس موقع پر ایک خوبصورت مجلہ بھی شائع کیا تھا۔ اس مشاعرے کی مشاورتی کونسل میں ڈاکٹر جمیل جالبی (مدیر "نیا دور" کراچی) کے برادر کوچک سہیل خان جالبی (مدیر "نیا دور" کولمبس) بھی شامل تھے جو کولمبس میں رس بس گئے ہیں۔ ماجد علی خان حیدر آباد (دکن) سے تعلق رکھتے ہیں اور افسانہ نگار رضاء الجبار کے کزن ہیں۔ انہوں نے ہم کو اپنے ہاں ٹھہرایا جبکہ باقی احباب دو جگہ تقسیم ہو گئے محمد عثمان اور سہیل جالبی کے ہاں۔ کولمبس ایئرپورٹ پر ہمیں اپنے سامان کی فکر تھی مگر وہ امانت خانے میں بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا' ہم کو دیکھتے ہی ہمارے ساتھ "چل پڑا" ------

ایئرپورٹ سے چلے تو ہمارا پہلا پڑاؤ سہیل جالبی کے ہاں ہوا۔ وہاں جمال پانی پتی پہلے سے موجود تھے جو اونچے سروں کے ساتھ گلے ملے۔ اطمینان ہوا کہ ابھی تک تحت اللفظ میں سفر رہا تھا' اب ترنم کے ساتھ ہوگا' سہیل خان کے ہاں چائے پی کر ہم ماجد صاحب کے ساتھ ان کے گھر پہنچے۔ وہاں گھر سب "تقریباً" ایک نمونہ کے ہوتے ہیں' صرف چھوٹے بڑے کا فرق ہوتا ہے بیگم ماجد کھانے پر ہماری منتظر تھیں۔ کھانے میں حیدر آباد بول رہا تھا۔ بڑے مزے کی ڈشیں تھیں۔ ان کی تفصیل میں ہم نہیں جاتے' یہ آپ محسن بھوپالی صاحب کے سفر نامے میں پڑھ لیں!

دوسرے دن ماجد صاحب ہم کو گھمانے کے لئے ڈاؤن ٹاؤن لے گئے۔ یہاں ہر شہر کا اپنا ڈاؤن ٹاؤن ہوتا

ہے (یعنی کاروباری علاقہ) جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے ہم کو دیر تک اپنی گاڑی میں بٹھا کر ٹہلایا۔ پھر" تھہر بیر تھیٹیشر " اوہایو اسٹیٹ یونی ورسٹی " لے گئے جہاں رات کو مشاعرہ ہونا تھا وہاں انہوں نے انتظامات کا جائزہ لیا اور ڈائس کی ترتیب و تہذیب کے سلسلے میں اخلاقاً" ہم سے بھی مشورہ کیا۔

رات کو مشاعرہ ہوا ------ " پہلا بین الاقوامی جشن بہار کا مشاعرہ " ----- اول اول سامعین ضرورت سے کم تھے مگر آخر آخر ضرورت سے زیادہ ہو گئے۔ نظامت کی ابتدا محمد عثمان صاحب نے کی مگر مشاعرہ شروع ہوتے ہوتے مائک ماجد علی خان کے سپرد کر گئے۔ ماجد صاحب سفید سلک کی چست شیروانی، چوڑی دار پاجامے اور سلیم شاہی میں خاندان مغلیہ کا کوئی جیتا جاگتا کردار معلوم ہو رہے تھے۔ نظامت بھی انہوں نے شاہانہ انداز سے گھڑی دیکھ دیکھ کر کی۔ ہر شاعر کو وہ اپنے حساب سے دل ہی دل میں وقت دیتے' گھڑی دیکھ کر ہم پکارتے" مائک کو شاعر کے یا یوں کہیے کہ شاعر کو مائک کے' حوالے کرتے اور ٹہلتے ہوئے ڈائس سے پرے چلے جاتے۔ پھر چند منٹ بعد' خراماں خراماں ڈائس پر واپس آجاتے اور یوں شاعر کو احساس ہو جاتا کہ اس کا وقت ختم ہو رہا ہے صدارت حسب توقع عارف عبدالمتین نے کرسی پر بیٹھ کر کی۔ کولمبس میں مدت مدید کے بعد اتنا بڑا اور اتنا کامیاب مشاعرہ ہوا تھا' منتظمین بھی خوش' سامعین بھی خوش' شعراء بھی خوش۔

ہم مشاعرے میں گئے تھے تو کھانا نہیں کھایا تھا۔ واپس آئے تو تھکن کے سبب بھوک غائب تھی مگر بیگم ماجد نے کہا۔ " نہیں بھائی! کچھ تو کھانا ہی پڑے گا۔" ہم نے کہا " بھابی! ہم ہلکے پھلکے سے ہیں سو ہم کو ہلکا پھلکا سا ماحضر عنایت کر دیجئے چائے البتہ ضرور دیں گے' ایک نہیں' دو پیالی " کہتے ہیں دانے دانے پر آدمی کا نام لکھا ہوتا ہے لیکن ہمارا نام تو بہت طویل ہے " مرزا عظیم احمد بیگ چغتائی ' عظیم رومانی' بی۔ کام " ----

ہم ابتدا میں اپنے نام کے ساتھ " بی کام " بھی لکھتے تھے۔ آنجہانی خوشتر گرامی' مدیر ماہنامہ " بیسویں صدی " دہلی کو شاعروں ادیبوں کے ناموں کے ساتھ ان کی ڈگریاں چھاپنے کا بہت شوق تھا ایک بار انہوں نے ہمارے نام کے ساتھ ایم۔ اے چھاپ دیا ہم نے ان کو لکھا کہ برادر بزرگ! ہم " ایم اے " ضرور ہیں مگر شروع میں ہیں "آخر میں نہیں ------ سو آپ ہمیں " ایم اے عظیم رومانی " تو لکھ سکتے ہیں " عظیم رومانی' ایم اے " نہیں۔ اس ترتیب سے تو قانون حرکت میں آسکتا ہے جواب آیا کہ یہ کیا حرکت ہے! ہم نے تم کو گریجویٹ سے پوسٹ گریجویٹ کر دیا اور تم اعتراض کر رہے ہو! لو سنو' کرشن چندر ان دنوں بیمار ہیں اس لئے اب کے ہمارے پرچے میں کوئی " ایم اے " نہیں تھا تم دوست ہو' یہ پھندا تمہارے گلے میں فٹ آیا۔ بس خاموش ------ ایک لفظ منہ سے نہ نکالنا۔

تو صاحبو! ہم سن چوان' بچپن تک اپنے نام کے ساتھ " بی کام " کالاحقہ لگاتے رہے مگر ایک محفل میں ایک پڑھی لکھی خاتون نے اعتراض کیا کہ بھئی رومانی اور بی کام کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں ہے' چھوڑیے بھی ڈگری کو! بس تب سے ہم نے اس تکلف کو ترک کیا۔

کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا۔ اس تحقیق کو پانچ سو سال ہو گئے۔ کولمبس اوہایو میں اس کی ۵۰۰ ویں سالگرہ منانے کے لئے ایک بہت بڑی نمائش کا انتظام کیا گیا تھا مگر ہمارے پاس وقت نہ تھا اگلے دن صبح گیارہ بجے ماجد علی خان ہم کو ایئر پورٹ لے گئے۔ اسی دن رات کو شکاگو میں مشاعرہ تھا۔ ابھی اردو میں سفر کی تھکن اترنے بھی نہ پائی تھی کہ انگریزی میں سفر شروع ہو گیا۔ عثمان صاحب بھی اپنے مہمانوں کو لے کر آگئے۔ مگر

وہی ہوا جس کا دھڑکا تھا' یعنی جہاز میں جگہ نہیں ملی۔ " اسٹینڈ بائی " کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آگیا' اب کیا کیا جائے۔ میزبان شریف ابن شریف تھے۔ عارف صاحب اور ان کی بیگم کو خدا کے بعد حفیظ تائب صاحب کے سپرد کر کے' ہم کو محسن بھوپالی' محسن احسان اور جمال پانی پتی کو گاڑی میں بٹھا کر کافی دور ایک اچھے سے رستوران میں لے گئے جہاں انہوں نے ہم کو اچھے سے برگر کھلائے اور ٹھنڈا ٹھار کوک پلایا اور باقی دوستوں کے لئے برگر بندھوا کر ہم کو واپس ایئر پورٹ پہنچا دیا۔ بارہ بج چکے تھے۔ دوسرا جہاز دو بجے جانا تھا لہٰذا ہم نے ان کو واپسی کا ویزا دیا" اور گلے مل کر اور ان کی محبت آمیز میزبانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کو رخصت کیا' انہوں نے بھی جوابا" ہم کو اللہ کے سپرد کیا۔

وقت کافی تھا۔ محسن احسان نے کہا' آؤ ایئر پورٹ کا جائزہ لیتے ہیں۔ سامنے کتابوں کی ایک دکان میں ایک خاتون کھڑی تھیں۔ محسن احسان نے ان سے کہا' ہم آپ کی تصویر کھینچنا چاہتے ہیں۔ وہ فورا" راضی ہو گئیں۔ پھر محسن احسان نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " مگر ان کے ساتھ کھینچنا چاہتے ہیں' یہ بڑے اچھے شاعر ہیں اور ابھی ابھی آپ کی تعریف کر رہے تھے۔" ہم خاصے شریف آدمی ہیں' سنانے میں آگئے' مگر وہ بہت خوش ہوئیں۔ ہمارا بہت شکریہ ادا کیا' اور ہمارے ساتھ خوشی خوشی تصویر بنوا کر رخصت ہونے سے پہلے ایک بار پھر گرمجوشی سے ہمارا شکریہ ادا کیا۔ وہ چلی گئیں تو ہم نے کہا۔ امریکہ زندہ باد یہ واقعہ اگر ہمارے ملک میں پیش آیا تو ہم اور محسن احسان دونوں اس وقت کسی سرکاری ہسپتال میں مہمان ہوتے۔

دو بجے کے جہاز سے ہم شکاگو کے لئے روانہ ہوئے تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ برادر بزرگ عارف عبدالمتین وہیل چیئر پر بیٹھ کر جہاز کے دروازے تک گئے' پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنی سیٹ کی طرف گئے جو بہت پیچھے تھی۔ ان کی بیگم ان کے ہمراہ تھیں حسن اتفاق سے آگے کی دو سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ پھر یوں ہوا کہ بھائی عارف نے حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ دوڑ لگائی اور آنا" فانا" ان نشستوں کو فتح کر لیا۔ محسن بھوپالی کہاں چوکنے والے تھے بولے " دیکھ رہے ہو اگر اسی طرح دو چار سیٹیں انہوں نے اور حاصل کر لیں تو وہیل چیئر چھٹ جائے گی' بالکل نارمل ہو جائیں گے!" ہم نے کہا " تمہارے منہ میں گھی شکر۔"

شکاگو کے ایئر پورٹ پر ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی نجم الدین فاروقی اور ان کے بھانجے موجود تھے۔ ہم سب پہلے مظفر الدین صاحب کے ہاں لے جائے گئے۔ ان کا گھر خاصا کشادہ ہے مگر عارف' بیگم عارف' حفیظ تائب اور محسن بھوپالی کے جم کے بعد تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ سو محسن احسان' جمال پانی پتی اور ہم' نجم الدین فاروقی کے مہمان ہوئے۔ نجم الدین صاحب کے اہل خانہ ہندوستان گئے ہوئے تھے لہٰذا پورا گھر ہمارے تصرف میں رہا۔ بس تھوڑی سی تشویش کچن کی طرف سے رہی۔ اس دوران میں ہم نے مظفرالدین فاروقی صاحب کے ہاں (The Seven Commandments) دیکھی' ایسے ٹی وی اسکرین پر جو سینما کے اسکرین سے تھوڑا ہی چھوٹا تھا۔ فلمیں اور بھی تھیں مگر ہم نے کمائی اعمال اتنا ہی ثواب کافی ہے بیگم مظفر الدین فاروقی بے حد متواضع خاتون ہیں۔ فاروقی خاندان کا تعلق بھی حیدر آباد دکن سے ہے' سوان کے ہاں' دوسری ڈشوں کے ساتھ ساتھ' حیدر آباد کا سواد بھی ملا۔ بیگم فاروقی اور ہماری بھتیجی (یعنی ان کی بیٹی) نے مسلسل پانچ دن تک اتنے بہت سے مہمانوں کی تواضع بڑی خندہ پیشانی اور خوش دلی سے کی۔

مظفر الدین فاروقی صاحب اردو کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ پاکستان میں کم اور ہندوستان میں زیادہ جانے

اورنگ زیب قاسمی

بچانے جاتے ہیں۔ ایک شام انہوں نے اپنے کچھ افسانے سنا کر حیرت میں ڈال دیا۔ وہیں ڈاکٹر کنیز بتول چغتائی سے بھی تعارف ہوا' جو ادب کا اچھا ذوق رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر فاروقی نے بیانیہ افسانے کو جدید اسالیب سے ملا دیا ہے۔ وہ کسی ایک اسلوب کے قیدی نہیں ہیں۔ اسلوب ذریعہ ہوتا ہے مقصد نہیں۔ یہ انسان کی تخلیق ہے' انسان اس کی تخلیق نہیں۔ فاروقی صاحب جس اسلوب سے جہاں چاہیں پوری طرح کام لے سکتے ہیں۔ ان کو زبان و بیان پر بھی عبور حاصل ہے اور فکر و خیال پر بھی' ہم نے کہا چلیے اقدار کے لکھنے والوں میں ایک اچھے افسانہ نگار کا اضافہ ہوا۔

علی گڑھ مسلم المنائی ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام اور اتر پردیش ایسوسی ایشن کے اشتراک سے "ساتواں بین الاقوامی مشاعرہ" ناتھر ہائی سکول' نشن ایویلو کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا تو ایک بھرپور مشاعرے کا احساس ہوا۔ محسن بھوپالی نے صدارت اور ڈاکٹر عابد اللہ غازی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ غازی صاحب عالم ہیں' شاعر ہیں اور سماجی کارکن ہیں' اقراء انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے بھی صدر ہیں' اقراء بک سینٹر کے بانی اور نگراں ہیں۔ ان کی نظامت نے مشاعرے میں جان ڈال دی۔ اس مشاعرے میں شکاگو کے اچھے شاعروں کی ایک کہکشاں نظر آئی۔ افتخار نسیم' ڈاکٹر خورشید خضر' ڈاکٹر وحید الدین قمری' یوسف اعظمی' مولانا رحمان سعید صدیقی' عقیل عالم ڈاکٹر شفیع الدین' واحد نسیم' خالد انور اور ششی سنگھ ------ ششی سنگھ ایک سکھ خاتون ہیں جو پنجابی اور اردو' دونوں زبانوں میں شعر کہتی ہیں اور بڑے اعتماد کے ساتھ پڑھتی ہیں مشاعرے میں شرکت کے لئے نیویارک سے ہماری میزبان اول حمیرا رحمان بھی آئی تھیں۔ انہوں نے کئی تازہ غزلیں سنا کر مشاعرہ لوٹ لیا۔ ڈاکٹر عابد اللہ غازی نے اس مشاعرے میں تمام شعراء (خصوصاً" بیرونی شعراء) کا تعارف ان کے سیاق و سباق کے ساتھ نہایت شگفتہ انداز میں کروایا۔ مشاعرہ آدھی رات تک جاری رہا۔ چائے کے وقفے میں افتخار نسیم سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کل آپ کو ہمارے ہاں آنا ہے۔ دوسرے احباب بھی ہوں گے' مل بیٹھیں گے اور بہت سی باتیں کریں گے۔ ہم نے کہا' کیوں نہیں آپ کا مہمان ہونا "باعث افتخار" ہے۔

دوسرے دن صبح نجم الدین فاروقی کی قیادت میں ہمارا چار نفری قافلہ (ہم' محسن احسان' محسن بھوپالی اور جمال پانی پتی) شکاگو کی سیر کو نکلا تو "بہائی ہال" کی زیارت بھی ہوئی۔ خوبصورتی اور نزاکت' شان اور شوکت' جلال اور جمال میں اس عمارت کا کم از کم شکاگو میں کوئی جواب نہیں ہے۔ اس کے گنبدوں اور ستونوں پر جو نقش بنائے گئے ہیں دل و نگاہ کو کھینچتے ہیں یہ بہائیوں کا ایک تبلیغی مرکز ہے جہاں زور سے بولنا بھی منع ہے۔ حیرت ہے کہ ساری دنیا کو "ایک فیملی" کہنے والوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے۔

رات کو "محسنین" اور ہم افتخار نسیم کے مہمان ہوئے۔ ان کے ہاں جاتے ہوئے' دریا کے کنارے کنارے میلوں تک مسلسل آنکھ مچولی کرتے ہزاروں ماہتاب نظر سے گزرے۔ افسوس کہ وہ مناظر دیکھنے کے قابل تو بہت تھے' بیان کے لائق بالکل نہیں ہیں۔

ساحل کو دیکھ کر جو اسے شرم آئی ہے
دریا میں آفتاب نے ڈبکی لگائی ہے

افتخار نسیم کا فلیٹ کشادہ' آراستہ پیراستہ' دریا کے کنارے واقع ہے۔ اس شام وہاں دو گلوکار اپنے ساز و سامان کے ساتھ افتخار کی غزلیں سنانے کے لئے موجود تھے (ان کو سنا تو جانو افتخار نسیم کو ترنم سے سنا) وہیں

اورنگ زیب قاسمی

پہلی بار سائیں سچا (مشتاق احمد) اور بیگم مشتاق سے ملاقات ہوئی۔ حاضرین میں افتخار نسیم کی بہن اور بہنوئی بھی تھے۔ دونوں گانے والوں نے جم کر گایا۔ پھر گفتگو کا دور چلا جو صبح سویرے تک جاری رہا۔

ہم نے کہا "آپ کے کیسے کیسے مہمانوں میں آج ہم لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں۔" وہ بہت ہنسے۔ "نہیں نہیں' میں نے جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے ------ مگر آپ تو بہت شریف آدمی ہیں۔"

شریف آدمی کہلانا کبھی کبھی بہت کھل جاتا ہے مگر افتخار کا ریمارک بے حد مخلصانہ تھا۔ اس گفتگو میں سائیں سچا کے ساتھ ساتھ ان کی بیگم بھی شریک رہیں۔ وہ بیچ بیچ میں ایسا برجستہ ہوا فقرہ جڑ دیتیں کہ داد دینی پڑتی۔ افتخار نسیم کے ہاں ایک اور اہم شخصیت سے تعارف ہوا۔ پریم جی سے جو' جو افتخار نسیم کے گھر کے نگراں اور منتظم اور روح رواں ہیں۔ پریم جی بڑے سگھڑ اور متواضع انسان ہیں۔ انہوں نے اپنے تمام مہمانوں کا فردا" فردا" خیال رکھا۔

دوسرے دن صبح نسیم ہم تینوں کو ڈاؤن ٹاؤن لے گئے خوب گھمایا پھرایا' بڑے بڑے سٹور دکھائے اور ایک بڑے جانکار رستوران میں دوپہر کا کھانا کھلایا گیا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہاں ایک کوچہ گاندھی جی کے نام سے موسوم ہے تو ایک گلی "محمد علی جناح" کے نام سے بھی منسوب ہے۔ یہ دراصل ان پاکستانیوں کی کامیابی ہے جو وہاں رہتے بستے ہیں۔

شام کو اقراء بک سینٹر جانا تھا اور رات کا کھانا وائسرائے آف انڈیا ہوٹل میں ڈاکٹر عابداللہ غازی اور ان کے احباب کی طرف سے تھا نسیم ہم کو پہلے اقراء بک سینٹر لے گئے جہاں ڈاکٹر غازی نے اس کے سب شعبے دکھائے۔ اچھا ذخیرہ کتب تھا اور خاص کر باقاعدہ دینی تعلیم کے لئے اچھا مواد تھا۔ خطاطی (نسخ اور نستعلیق) تک پر مشتمل کتب نظر سے گزریں۔ جی خوش ہوا کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ وائسرائے آف انڈیا ہوٹل میں ڈاکٹر عابد اللہ غازی اور خورشید عالم نے استقبالیہ تقریریں کیں۔ جوابی تقریر ہم سب کی طرف سے محسن احسان نے کی۔ بعد ازاں "اردو کے مستقبل" کے موضوع پر کھل کر گفتگو ہوئی جس میں افتخار نسیم نے بھی حصہ لیا اور دو ٹوک باتیں کیں۔

اگلے دن اعجاز ہاشمی کے ہاں عشائیہ تھا۔ عشائیے کے بعد شعری نشست ہوئی۔ شعراء میں ہمارے علاوہ محسن بھوپالی' جمال پانی پتی' محسن احسان' حفیظ تائب' عابد اللہ غازی اور عارف عبدالمتین تھے۔

دوسرے دن عیدالاضحیٰ تھی۔ ہم' جمال پانی پتی' عارف صاحب اور حفیظ تائب ادائے نماز کے لئے ایم آر بی کے اسلامک سینٹر گئے' جہاں ایک بہت بڑے ہال میں نماز ہوئی۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا اور یہ دیکھ کر حیرت آمیز خوشی ہوئی کہ ان میں اکثریت نوجوانوں کی تھی' پیش امام نے انگریزی میں اثر انگیز تقریر کی مسلمانوں کی حالت زار پر روشنی ڈالی اور ان کو اتحاد عملی کا مشورہ دیا۔ نماز کے بعد ان سے ملے تو معلوم ہوا کہ وہ پاکستانی طالب علم ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لئے وہاں گئے ہوئے ہیں۔ وہ بڑی گرمجوشی سے ملے' اہل دل معلوم ہوتے تھے۔ گفتگو کرتے ہوئے ان کی آنکھیں بار بار بھیگ جاتی تھیں۔

خیر تھوڑی دیر کو تو معلوم ہوا کہ عید ہے' باقی دن بھر عید کا احساس ہی نہیں ہوا۔ یہ ہمارا شکاگو میں قیام کا آخری دن تھا ہماری اگلی منزل "ڈیٹ رائٹ" مشی گن کا مشہور شہر (Detroit) تھا۔ یہ وہی ڈیٹ رائٹ ہے جس کے ایئرپورٹ کی زیارت بارتھ ویسٹ ایئرلائنز کی عنایت سے' ہم اب تک کئی بار کر چکے تھے اور جس کا نام ہم نے ویٹس رائٹ رکھ دیا تھا۔

(اقدار' کراچی)

ہمارے رویے اور قومی خودکشی

تمہید: کسی نے ایک عقلمند سے پوچھا کہ اس نے عقل کہاں سے سیکھی۔ وہ کہنے لگا "بیوقوفوں سے ------ یعنی جو وہ کرتے ہیں۔ میں وہ نہیں کرتا"

یہ منفی طریقہ اپنی جگہ درست ہے۔ مگر اتنا ہی موثر ایک دوسرا مثبت طریقہ بھی ہے کہ انسان دوسرے عاقلوں کو دیکھے کہ وہ کیا کرتے ہیں اور اس سے کچھ سیکھے۔

میں نے دنیا کے بہت سے ممالک کا سفر کیا ہے۔ بطور افسر کم کم۔ اور بطور سیاح اور ٹورسٹ کافی زیادہ --- اس سیاحت سے ذہن میں سوچ کے ان گنت چشمے پھوٹے ہیں۔ کچھ افسانوں میں ڈھل گئے۔ اور کچھ دیگر تحریروں میں۔ مگر ان سب سوچوں کا نتیجہ ایک ہی نکلا کہ اگر ہم واقعی آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں عقل سیکھنے کے لئے دونوں طریقے اپنانے پڑیں گے ------ اور اگر ہم یہ نہیں کریں گے تو پھر ہمارے ہمہ جہت زوال کی موجودہ رو تیز تر ہوتی جائے گی۔ اور ہم اکیسویں صدی کے شودر ------ یا کمین ------ بن جائیں گے۔

زندگی کا سمندر رویوں کی لہروں اور دھاروں سے بنا ہے ------ بعض رویے گہرے اور شفاف نیلے پانی کی طرح واضح اور نکھرے ہوتے ہیں۔ بعض گدلے۔ ٹھہرے ہوئے اور بدبودار پانی کی طرح غیر واضح اور الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور بعض صرف جھاگ ہی جھاگ جن میں کچھ بھی ٹھوس نہیں ہوتا ------ جیسے رویے ہم اپناتے ہیں۔ ویسی ہی معاشرے کی فضا بن جاتی ہے ------ محبت بھرے رویوں سے زندگی مسلسل غزل لگتی ہے۔ اور نفرتوں کے چھلکتے ہوئے رویوں سے زندگی مرثیہ بن جاتی ہے۔

اپنے سفر کے دوران میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ زندگی کے بارے میں مختلف قوموں کے رویوں سے واقف ہو سکوں اور ساری سیاحت اور سوچوں کا نچوڑ یہی ہے کہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ قومیں صحت مند اور مثبت رویے اپناتی ہیں۔ مگر ہماری قوم --- بلکہ امت مسلمہ ------ کے بیشتر رویے منفی ہیں ------ بلکہ زیادہ تر رویے ایسے ہیں جو ہماری قومی اور انفرادی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں ------ اور حیف یہ ہے کہ ہم ان مہلک رویوں میں تبدیلی کے لئے بھی ہرگز تیار نہیں ------ اس لحاظ سے ہم دانستہ خودکشی کر رہے ہیں۔ بقول علامہ اقبال:

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اس خودکشی کی واضح مثال یہ ہے کہ الہامی مذاہب میں سب سے نو عمر ہونے کے باوجود اسلام سکڑ رہا

اورنگ زیب قاسمی

ہے۔ پہلے سپین سے مسلمان مٹ گئے۔ پھر فلپائن سے۔ آج بوسنیا سے مٹائے جا رہے ہیں۔ اور ادھر برعظیم میں ہندو پوری قوت سے مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اور یہاں مسلمانوں کے حالات قریباً ویسے ہی ہیں جیسے سپین میں مٹنے سے پہلے مسلمانوں کے حالات تھے۔ یعنی اپنے مٹائے جانے میں ہم ہندو کی مدد کر رہے ہیں۔

اگر ہم اپنے رویوں کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر رویوں نے یا تو ہمارے معاشرے کی جاگیردارانہ ساخت سے جنم لیا ہے۔ یا مذہب کے متعلق غلط نظریات سے اس لئے اگر ہم ان منفی رویوں سے جان چھڑانا چاہتے ہیں تو ہمیں نہ صرف معاشرے کی ساخت کو بدلنا ہوگا۔ تاکہ یہ فیوڈازم سے پاک ہو جائے۔ بلکہ مذہب کے معاملے میں بال جبریل میں علامہ اقبال کے اس الزام کو بھی تسلیم کرنا ہوگا:

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

صحت مند رویے اپنانے کے لئے ہمیں " خرافات " اور روایات " دونوں سے جان چھڑانا ہوگی گویا اسلام کے روایتی تصور میں اصلاح کرنا ہوگی ------ یا بالفاظ دیگر اجتہاد کرنا ہوگا۔

ضروری نہیں آپ اس مرحلے پر مجھ سے اتفاق کریں۔ لیکن اگر سچے واقعات پر مشتمل آپ یہ قسط وار تحریر مکمل طور پر پڑھ لیں گے تو متفق ہوں یا نہ ہوں۔ کچھ سوچنے پر مجبور ضرور ہو جائیں گے۔ اس تحریر کا واحد مقصد یہی ہے کہ قاری کو سوچنے پر آمادہ کیا جائے۔ ذہنوں پر صدیوں پرانے زنگ کو دھونے کے لئے سوچ پہلا موثر مرحلہ ہے اور تبادلہ خیالات دوسرا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اردو نامہ کے صفحات تبادلہ خیالات کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں۔ مگر یہ آپ کو سوچنے سے یقیناً نہیں روکیں گے۔

تعلیم دشمنی: " شہاب نامہ " میں قدرت اللہ شہاب نے جاگیرداروں کی تعلیم دشمنی اور تعلیم کی طرف پاکستانی حکومتوں کی سرد مہری کا موثر انداز میں ذکر کیا ہے (دوسرا ایڈیشن۔ صفحات ۵۲۶، ۷۶۸ اور ۸۴۳) ان کے مشاہدات کے علاوہ بھی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تواریخ کے ہر جاگیردارانہ دور میں عوام کو تعلیم سے محروم رکھا جاتا ہے تاکہ ان کی آنکھیں نہ کھل سکیں۔ بدقسمتی سے پاکستان میں بھی یہی صورت حال ہے اور تمام حکومتوں میں جاگیرداروں کے زور کی وجہ سے ہر حکومت تعلیم کو دانستہ نظر انداز کرتی رہی ہے۔ چنانچہ تعلیم کو پس پشت ڈالنا اب ہمارا قومی رویہ بن چکا ہے۔ (بلکہ سیاست اور مذہب کے متعلق غلط نظریات کی وجہ سے یہ سارے اسلامی ممالک کا غالب رویہ ہے) ذرا اس کا موازنہ مندرجہ ذیل واقعے سے کریں۔

میں ایشیائی ترقیاتی بینک کی ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۸۹ء میں منیلا منتقل ہوگیا۔ وہاں کی سانٹو تھامس (Santo Thomas) یونیورسٹی چھ سو سال پرانی ہے۔ ایک شام دفتر سے فارغ ہو کر میں وہاں چلا گیا۔ شہر کے پرانے علاقے میں پرانی دو منزلہ عمارتوں کے چند بلاک خاصی خستہ حالت میں ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ بیچ میں چھوٹے چھوٹے لان طلباء سے بھرے پڑے تھے۔ میں نے ایک سے پوچھا کہ میں شام کے کورسوں کے لئے معلومات کہاں سے حاصل کروں۔ وہ سامنے والی عمارت کی طرف اشارہ کر کے بولا "وہاں رجسٹرار سے مل لیں" رجسٹرار ؟ میں چونک گیا۔ ہمارے ملک میں تو رجسٹرار کے پاس پہنچنے کے لئے انتظار یا سفارش کی ضرورت ہوتی ہے۔ " میں نے ان سے ملاقات کا وقت نہیں لیا"

"کوئی بات نہیں۔" وہ کہنے لگا "آپ کسی بھی وقت مل سکتے ہیں۔"

تھوڑا تعجب کرتے ہوئے میں اس طرف چل دیا۔ عمارت میں داخل ہوا تو ایک بڑے ہال میں چالیس کے قریب میزیں تھیں جن کے ساتھ سٹاف کے لوگ بیٹھے تھے۔ اکثریت عورتوں کی تھی۔ اسی کمرے میں کونے والی میز پر رجسٹرار کی تختی پڑی تھی اور ایک ادھیڑ عمر خاتون کرسی پر بیٹھی تھی۔

"میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟" اس نے شائستگی سے پوچھا۔

میں نے بتایا کہ میں شام کے کورسوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

"آپ پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں۔ یا کوئی اور کورس؟" وہ نرمی سے پوچھنے لگی۔

"اگر آپ سب کورسوں کے متعلق مجھے کوئی کتابچہ دے سکیں تو مجھے انتخاب میں آسانی رہے گی۔ کیونکہ میرے پاس محدود وقت ہے"

وہ مسکرائی "آپ یہاں نئے آئے ہیں"

"جی ------ ایک مہینہ ہوا ہے"

"ابھی آپ کو ہمارے سسٹم سے واقفیت نہیں --- آپ کو انتخاب کی تکلیف نہیں کرنا پڑے گی ----- آپ صرف اپنی ضروریات بتائیں۔ باقی انتظام ہم اس کے مطابق خود کر دیں گے۔"

مجھے حیران دیکھ کر اس نے تمام سسٹم سمجھایا۔ یونیورسٹی میں کورسوں کے کئی مدارج ہیں۔ ہر درجے میں ہر لیکچر دن میں پانچ دفعہ دیا جاتا ہے۔ صبح ------ دوپہر سے پہلے ------ دوپہر کے بعد ------ شام کو ------ اور پھر رات کے وقت۔ طالب علم کی سہولت کے مطابق اسے کسی لیکچر میں ڈالا جاسکتا ہے۔

جو لوگ کسی وجہ سے عام دنوں میں نہیں آسکتے۔ یا جو فیلا سے باہر ریاست میں رہتے ہیں۔ ان کے لئے سپیشل کورس ہیں جن میں چھٹی کے دو دنوں (ہفتہ اور اتوار) میں لیکچر دیئے جاتے ہیں۔ وہ بس اور ٹرین پر ہفتے کی صبح فیلا پہنچ جاتے ہیں۔ دن بھر کلاسوں میں مصروف رہتے ہیں۔ رات کسی ہوٹل میں یا کسی عزیز کے پاس ٹھہرتے ہیں اور اتوار کی شام فارغ ہو کر گھروں واپس چلے جاتے ہیں۔

"آپ کی کوئی بھی مجبوری ہو۔ ہمارے پاس اس کا علاج ہے۔ آپ صرف مضمون کا انتخاب کریں اور اپنی مصروفیات کا اندازہ دے دیں۔ آپ کے تعلیمی معیار کے مطابق مناسب درجے کا چناؤ کر کے اپنا نام تجویز ہم دیں گے۔ جو آپ کی فراغت کے عین مطابق ہوگا" اس نے پیشہ ورانہ فخر سے بات ختم کی۔" --- اسی لئے ہماری یونیورسٹی میں ہر عمر اور ہر پیشے کے لوگ اپنا تعلیمی معیار بڑھانے کے لئے آتے رہتے ہیں۔"

میں نے اس نظام کے لئے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ تو وہ مسکرا کر کہنے لگی "یونیورسٹیاں لوگوں کے لئے ہوتی ہیں۔ نہ کہ لوگ یونیورسٹیوں کے لئے۔"

پاکستان کی طرح فلپائن بھی دوسری جنگ عظیم کے بعد آزاد ہوا ایک (Crash Programe) کے مطابق نظام تعلیم کی اس طرح تنظیم کے بعد ان کے ہاں خواندگی کا تناسب اسی فیصد تک پہنچ چکا ہے۔ جبکہ پاکستان میں یہ ابھی چوبیس فیصدی ہے مزید برآں فلپائن میں اسی فیصدی میں بہت غالب اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کی ہے۔ جبکہ پاکستان کے چوبیس فیصدی خواندہ لوگوں میں بہت غالب اکثریت صرف ایسے لوگوں کی ہے جو صرف قرآن پڑھ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہماری حقیقی خواندگی بہت ہی کم ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

دوسری جنگ عظیم کے بعد چند سالوں تک مشرق بعید کے تمام ممالک پاکستان سے بہت پیچھے تھے۔ مگر اب انہوں نے ایسی ترقی کر لی ہے کہ ہمیں کہیں پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تمام ممالک میں تعلیم کو اولین ترجیح دی جاتی ہے۔ بلکہ سنگاپور اور ملائشیا میں تو تعلیم یافتہ جوڑوں کو زیادہ بچے پیدا کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اور جاہل والدین کو کم بچوں کی۔

۱۹۶۲ء میں کوریا پاکستان سے اتنا پیچھے تھا کہ ایک سرکاری وفد ہمارے ہاں یہ دیکھنے آیا کہ پاکستان اتنی ترقی کیسے کر رہا ہے۔ یہاں سے بنیادی جمہوریت کا راز سیکھنے کے بعد کوریا نے اپنے گاؤں کو فعال بنایا اور اب ترقی کی اس منزل پر پہنچ گیا ہے۔ جس کا پاکستان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اب کوریا میں خواندگی کا تناسب چھیانوے (۹۶) فیصدی تک پہنچ گیا ہے۔

آزادی کے بعد کے چھیالیس سال میں تعلیم کو دانستہ نظر انداز کرنے میں ہم کم و بیش دو نسلوں کا قتل عام کر چکے ہیں۔ حیف یہ ہے کہ احساس زیاں بھی نہیں ہے۔ خود کشی کی گواہی کے لئے تعلیم دشمنی کا رویہ ہی کافی ہے۔

ریسرچ دشمنی: تین واقعات پیش کرتا ہوں۔

i) واشنگٹن میں (Air and Space Museum) میں ہوائی اور خلائی سفر کے تمام مدارج کی مستقل نمائش ہے۔ غبارے سے ہوائی جہاز اور پھر خلائی راکٹوں تک ہر مرحلہ ماڈل، فلم یا چارٹ کی مدد سے عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کولمبس نے ۱۴۹۲ء میں امریکہ دریافت کیا۔ اور ۱۹۹۲ء میں اس کا پانچ سو سالہ جشن منایا جا رہا تھا میں اس میوزیم کے (Planetarium) کے گھپ اندھیرے میں گم تھا۔ اور کائنات کا وسیع و عریض ماڈل دیکھ رہا تھا۔ کمنٹری کرنے والے نے بڑے فخر سے بات شروع کی کہ پچھلے پانچ سو برسوں میں ہم کائنات کا چپہ چپہ دریافت کر لیا ہے ------ پروگرام کے اختتام پر وہ کہتا ہے کہ دنیا کی دیگر مخلوقات تو آرام سے زندگی بسر کرتی ہیں۔ مگر نہ معلوم انسان کو کیوں ایسی بے چین روح ملی ہے کہ وہ پہلے روئے زمین اور اب کائنات کی دریافت میں پاگل ہو رہا ہے ----- شاید ہمیں کبھی مستقبل میں اس کا جواب مل جائے۔ فی الحال تو تازہ ترین ریسرچ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسانی دماغ کے ------ خلیوں (Cells) کی تعداد بالکل اتنی ہے جتنے ہمارے کہکشاں میں ستارے ہیں۔ اب یہ وقت ہی بتائے گا کہ نسل انسانی کس انداز میں باقی کائنات سے منسلک ہے۔

گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا میں سوچ رہا تھا کہ ریسرچ دوستی کے مثبت رویے کی وجہ سے ان لوگوں کا علم ایک ہزار سال میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا ------ مگر ہم مسلمانوں کی ریسرچ کہاں ہے؟

ii) ۱۹۷۰ء میں حکومت پاکستان کا تین رکنی وفد جاپان سے متعارف ہونے کا دورہ کر رہا تھا۔ وہ ہمیں جاپان کی زندگی کے نمائندہ گوشے دکھا رہے تھے۔ ان کی عظیم اور ماڈرن فیکٹریاں دیکھنے کے بعد ہم صنعت کاروں سے گفتگو کر رہے تھے ------ میں نے صرف ایک ہی سوال پوچھا کہ اتنی تیز رفتار ترقی کے لئے آپ ریسرچ کو کیسے منظم کرتے ہیں جواب ملا کہ ہر صنعت اپنے طور پر ریسرچ پر بہت توجہ دیتی ہے اور مکمل راز داری میں کثیر رقوم خرچ کرتی ہے۔ مگر جیسے ہی کوئی ایجاد کمرشل طور پر منظر عام پر آتی ہے تو راز داری ختم ہو جاتی ہے ------ اور بنانے والے کو ریسرچ کا سارا مواد حکومت کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد یہ علم عوام

کی میراث بن جاتا ہے اور پھر تمام صنعت کار اسی راز داری سے "فوراً" اسے آگے بڑھانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح ترقی کی یہ سیڑھی اوپر ہی اوپر چڑھتی جاتی ہے۔
میں سوچنے لگا ------ ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔

(iii) یاد نہیں پڑتا کس ملک میں دیکھا تھا۔ مگر ایک ریسرچ کے ادارے نے کچھ اس قسم کا بورڈ لگا رکھا تھا "ہم ہر مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔ اگر آسان ہے تو فوراً" ------ مشکل ہے تو تھوڑی دیر میں ------ اور ناممکن ہے تو ذرا زیادہ دیر میں"

یہ تینوں واقعات ایک مسلسل مثبت رویے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یعنی حقیقت کی تلاش میں تحقیق کرنا۔۔۔ مغرب کی ساری ترقی اسی مثبت رویے کی وجہ سے ہے۔ ویسے تو ہم بڑے شوق سے اس حدیث کا اعلان کرتے رہتے ہیں کہ علم حاصل کرنے کے لئے اگر چین بھی جانا پڑے تو جاؤ ------ مگر اس پر عمل کرنے کے لئے جس تحقیقی مزاج کی ضرورت ہے۔ اسے ابھرنے نہیں دیتے۔۔۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے ؟؟

اس کی وجہ ہمارا منفی رویہ ہے کہ صدیوں سے ہمارے ہاں " سوال " اور " سوچ " کی اجازت نہیں ۔ حالانکہ یہ دونوں ریسرچ کے ماں باپ ہیں۔ ان کے بغیر تحقیق جنم لے ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا ان کے قحط میں تحقیقی مزاج ابھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مسلمانوں میں " سوال " اور " سوچ " کو بند کرنے والی دو تاریخی قوتیں ہیں۔۔۔ پہلی تو ملوکیت یا ڈکٹیٹر شپ یا جاگیرداری ------ جو کسی نہ کسی شکل میں تمام عالم اسلام میں چھائی ہوئی ہے ------ یہ سوال اور سوچ کی اجازت اس لئے نہیں دیتی کہ جمہوریت کے زمانے میں لوگوں کی آنکھیں نہ کھل سکیں اور ان کے اقتدار کو خطرہ نہ پیدا ہو ------ دوسرے بگڑے ہوئے مذہب کی بندش ---- جس نے دسویں صدی میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا۔ اور ساری امت کی بجائے چند علماء نے مل کر فیصلہ کیا کہ آئندہ سے آزادانہ سوچ کی اجازت ------ نہیں اور جو کچھ چار فقہوں میں لکھا جاچکا ہے۔ وہ امت اسلامیہ کے لئے آخری حرف ہے ۔ چند علماء کا یہ فیصلہ تمام امت کے لئے مذہب بن گیا۔ اب ایک ہزار سال سے ملا اور ملوکیت کے گٹھ جوڑ کی وجہ سے " سوال " اور " سوچ " ملت اسلامیہ کی برادری سے خارج ہو چکے ہیں۔ بعد ازاں مصلحت کاروں نے دین میں غلط روایات داخل کیں اور دین کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ تو کسی نے حقیقت کو روایت سے الگ کرنے کے لئے ذرا بھی ریسرچ کی کوشش کی تو وہ گردن زدنی ٹھہرا۔ کیونکہ اس سے حکومت کا اقتدار اور مصلحت کاروں کا اسلام خطرے میں آجاتا تھا۔ بعد میں جب مصلحتیں ہماری عادت بن گئیں تو ریسرچ دشمن ہمارا مزاج بن گیا۔ اسی وجہ سے بیسویں صدی میں ہماری سوچیں دسویں صدی کی سطح پر منجمد ہیں۔

اس کی واضح مثال یہ ہے کہ حدیث کا علم پہلے دو سو سال میں جمع ہوتا رہا۔ اس کے بعد امام بخاری نے حقیقت کو روایت سے الگ کرنے کی ضرورت محسوس کی اور بیس برس کی تحقیق کے بعد حدیث صحیح بخاری مرتب کی۔ اس ریسرچ میں انہوں نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف سات ہزار کو درست تسلیم کیا (یعنی قریباً" ایک فیصدی ------ ۱۶۔۱ فیصدی) اور ان میں بھی سند کے حساب سے مدارج بنائے۔ امام بخاری ۲۵۶

اورنگ زیب قاسمی

ہجری میں فوت ہوئے ------

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام کے بعد پہلے اڑھائی سو سال میں حقیقت جاننے کے لئے ریسرچ کی ضرورت تھی تو اس کے بعد اگلے بارہ سو برسوں میں یہ ضرورت کیوں نہیں۔ اس دلیل کا اطلاق چاروں فقہوں پر بھی ہوتا ہے۔ جو اسلام کے بعد پہلے تین سو برس میں مکمل ہو چکے تھے۔ اس کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند کر کے اگلے گیارہ سو برس میں سوچ اور تحقیق کو مسلمانوں کے ذہن سے جلا وطن کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے ریسرچ دشمنی ہمارا رویہ بن گیا۔

یہ اسی ریسرچ دشمنی والے مزاج کا شاخسانہ ہے کہ ہم اپنے قومی المیوں کے متعلق آج تک ریسرچ کے بعد کوئی مستند کتاب نہیں لکھ سکے اور ان کتابوں پر انحصار کر رہے ہیں۔ جو غیر پاکستانی مغربی مصنف لکھ رہے ہیں۔

مذہب کا غلط تصور: سال ۱۹۸۳ء تھا' مقام تھائی لینڈ کا ایک دور افتادہ قصبہ تھا۔ اور موقع اورک پانسہ (Orak Pansa) کی مذہبی تقریب تھی۔

موسم برسات میں بدھ مت کے بھکشو زندگی سے تمام رابطے توڑ کر مندر یا خانقاہ میں بند ہو جاتے ہیں۔ اور تین ماہ تک گیان دھیان میں مصروف رہتے ہیں۔ عمارت سے باہر نکلنا گناہ کبیرہ کے مترادف ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں گاؤں کے لوگ ثواب کمانے کے لئے ان کو کھانا دیتے رہتے ہیں۔ چلہ کی مدت ختم پر ایک تقریب منعقد ہوتی ہے۔ جو بھکشو کے دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنے کی علامت ہوتی ہے۔ اس میں لوگ ان کو تحفے دیتے ہیں۔ جو روز مرہ کام آنے والی اشیاء پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جیسے صابن' تیل' تولئے' برتن اور خوراک وغیرہ۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی تھائی لینڈ کی آئل اینڈ گیس کارپوریشن کے گورنر تھے اور وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے تھے۔

تقریب مندر کے اندر تھی۔ وسیع ہال میں اونچے چبوترے پر مہاتما بدھ کا لیٹا ہوا مجسمہ تھا۔ اس حالت میں جب پینتالیس برس کی تبلیغ کے بعد اسی برس کی عمر میں آخری لیکچر دیتے ہوئے وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے تھے۔ چبوترے کے سامنے وسیع سٹیج بنا تھا۔ جس کے پالش شدہ چوبی فرش پر اجلی چاندنی بچھی تھی۔ اور مہمان خصوصی پتلون اور بش شرٹ میں اور تقریب کے کارکن بھکشو روایتی زرد چادروں میں ملبوس بیٹھے تھے ان سے قریباً" بیس فٹ دور اس سٹیج کے کنارے دس بھکشو قطار میں بیٹھے تھے جو اپنا چلہ یا مراقبہ ختم کر کے اب دنیاوی زندگی میں واپس آرہے تھے سٹیج سے ہٹ کر ہال میں ایک طرف سو کے قریب کرسیاں پڑی تھیں۔ جن پر مدعوئین بیٹھے تھے۔ اور باقی ہال گاؤں والوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ جو زیادہ تر کھڑے تھے یا بنچوں پر بیٹھے تھے۔

تقریب شروع ہوئی۔ کچھ مذہبی اشلوک پالی یا سنسکرت میں پڑھے گئے۔ پھر مہمان خصوصی نے اپنی تقریر میں زندگی کی طرف دوبارہ لوٹنے والے بھکشوؤں کو خوش آمدید کہا۔ اور پھر باری باری ان کی خدمت میں تحفے پیش کرنے لگے جو ------ سجی ہوئی ٹوکریوں میں رکھے تھے۔ اور رنگدار کاغذوں' سبز پتوں اور تازہ پھولوں سے بڑے سلیقے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ کارکن ایک ٹوکری مہمان خصوصی کو دیتے۔ وہ دو چار قدم چل کر آگے جاتے ------ پھر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو جاتے ------ پھر گھٹنوں پر ہی رینگ کر بھکشو تک پہنچتے۔

اسے جھک کر ڈوری پیش کرتے ----- گھٹنوں پر ہی پیچھے سرکتے ----- اور آدھے راستے میں کھڑے ہو کر بغیر پشت موڑے الٹے چلتے جاتے ----- گویا تحفہ وصول کرنے والا بھکشو اپنی جگہ سے نہیں اٹھتا تھا بلکہ مہمان خصوصی گھٹنوں پر رینگ کر اس تک پہنچتے تھے۔

میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے مقامی مہمان سے وجہ پوچھی۔ تو وہ مذہبی فخر سے کہنے لگا " بھکشو کے پاس پاؤں پر چل کر جانا انتہائی بے ادبی اور گستاخی ہے ----- ہم ہمیشہ گھٹنوں کے بل اس تک پہنچتے ہیں "

میرا اس وقت کا اچنبھا بعد میں سوچ اور پھر کرید میں بدل گیا۔ چنانچہ بدھ مت کے متعلق کچھ مطالعہ کیا۔ کچھ بدھ دوستوں سے بات چیت کی۔ تو انکشاف ہوا کہ یہ مذہب اس خاموش حقیقت کی بڑی واضح مثال مہیا کرتا ہے کہ مذہب کے ٹھیکیدار کس طرح مذہب کے نام پر اپنی حکومت عوام پر مسلط کرتے ہیں ----- نام " خدا " کا۔ مگر تسلط ان کا ----- احکام " خدا " کے۔ مگر حکم ان کا ----- بول بالا دین کا۔ مگر اقتدار ان کا ----- بظاہر " فرمان الٰہی " مگر دراصل مصلحت بھکشو -----

بدھ مت میں خدا کا کوئی تصور نہیں۔ پیغمبری کا کوئی تصور نہیں۔ اور عبادت کا بھی کوئی تصور نہیں ---
گوتم بدھ سے لوگوں نے خدا کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ جو چیزیں انسان کی سمجھ سے باہر ہیں۔ ان کے متعلق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔--- اس کے علاوہ انہوں نے بار بار کہا کہ وہ پیغمبر نہیں۔ بلکہ انسانی دکھ گھٹانے پر گہرا غور کرنے والے انسان ہیں ----- مرنے سے پہلے اپنے چیلے آنندا کے سوال کے جواب میں کہا کہ صرف اپنی ذات پر بھروسا رکھو۔ اور کسی قسم کی عبادت نہ کرو۔ تمہاری بہترین عبادت میری تبلیغ پر عمل ہے ----- اسی وجہ سے پہلے چار پانچ سو سال تک بدھا کا کوئی بت نہ تھا۔ اور کوئی شبیہہ نہ تھی۔ بلکہ اسی دور کے جتنے ستوپا (Stupas) برآمد ہوئے ہیں۔ ان میں گوتم بدھ کو صرف علامتی انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ جیسے پاؤں کا نقش دھرم چکر۔ یا وہ درخت جس کے نیچے انہیں نروان ملا تھا ----- مگر جب وقت گزر گیا۔ تو مذہب کے ٹھیکیداروں نے پہلے تو مندروں میں بدھا کے بت سجائے۔ پھر بدھا کو خدا بنا ڈالا۔ پھر اس خدا کے حضور ہفتہ وار عبادت شروع کر دی۔ اور اپنے لئے عزت کا وہ مقام سادہ لوح عوام پر ٹھونسا کہ بھکشو کو عوام گھٹنے ٹیک کر ملیں۔ بادشاہ بھی جھک کر سلام کرے۔ مگر بھکشو کسی کے سامنے نہ جھکے۔ سوائے بدھا کے خود ساختہ بت کے ----- اس یقین کے ساتھ کہ اپنے " خدا " کا جتنا درجہ وہ بلند کرے گا۔ عوام اتنے ہی مرعوب ہوں گے۔

بدھ مت انسان کو اپنی ذات سے باہر کسی خدا کی عبادت کا تصور نہیں دیتا۔ بلکہ اپنی ذات میں غوطہ لگا کر تزکیہ نفس کے لئے گہری سوچ (Meditation) اور گیان دھیان کی ہدایت کرتا ہے اور اس میں جنت' دوزخ' گناہ اور ثواب کا بھی تصور نہیں۔ بلکہ خود بینی کے ذریعے اپنے آپ کو بہتر انسان بنا کر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دکھوں میں کمی کرنے کا آئیڈیل ہے یہ خالص انسانی فطرت کا مذہب ہے۔ انسانی زندگی کی مشکلات کو انسانی ذہن سے انسانی سطح پر حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر بھکشو نے اس خالص انسانی تحریک پر خدا کا خول چڑھایا اور خود ساختہ عبادات اور روایت کے تازیانے لگا کر عوام کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

آج کل تھائی لینڈ میں ایک تحریک چل رہی ہے۔ کہ مندروں میں نہ تو گوتم بدھ کا بت ہونا چاہیے اور نہ

اورنگ زیب قاسمی

ہی عبادت کی رسم ہونی چاہیے۔ بلکہ یہ عمارتیں صرف گیان دھیان اور خود بینی کے لئے استعمال ہونی چاہیں اس تحریک کی زیر نگرانی چند ایک مندر بھی تعمیر ہوئے ہیں۔ مگر ملک بھر کی ملائیت کی طرف سے ان پر کفر کے فتوے لگ رہے ہیں۔

تھائی لینڈ کی یہ مثال اس لئے پیش کی گئی ہے کہ یہ پاکستان پر بھی بھرپور انداز میں لاگو ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں بھی بعض مذہبی رہنماؤں نے مذہب کو اتنا مسخ کر دیا ہے کہ اصل اسلام کی صورت نہیں پہچانی جاتی--- قرآن خدا نے دیا--- سنت رسول ﷺ نے دی--- اور فقہ انسان نے دی ----- مگر ان حضرات نے قرآن اور سنت کو نظر انداز کر دیا۔ اور فقہ کو مذہب پر حرف آخر بنا دیا (یعنی خدا کے الہام کے اوپر انسان کی دماغی تشریح کو ترجیح دی) پھر چاروں فقہوں کے اختلافی مسائل کو اچھال اچھال کر اپنے آپ کو " علمائے کرام " میں شامل کیا اور اپنی اہمیت جتائی (حالانکہ بیسویں صدی کے ماڈرن علم کے حصول میں یہ حضرات ----- بالکل نابلد ہیں) اگر کسی نے خدا کے الہامی احکام کی ماڈرن زمانے کے مطابق تشریح کرنے کی کوشش کی۔ تو اسے کافر بنا ڈالا۔

اگر تمام مذاہب کی تواریخ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر مذہب میں مذہبی ٹھیکیداروں کی بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ وہ خدا اور اس کے احکام کے متعلق اپنا تصور عام لوگوں پر ٹھونستے رہیں ----- جیسے جاگیردار کا منشی جاگیردار کے نام پر مزارعوں کو اپنے تسلط میں رکھتا ہے وہ خدا کے نام پر اپنی حکومت قائم رکھتے ہیں۔ پرانے مذاہب میں انسانی قربانی کی رسم' ہندوؤں میں ستی کی رسم ' عیسائیوں میں اختلافی عقائد پر زندہ جلانے اور (Inquisition) کے واقعات اس کی مثالیں ہیں ---- پچھلی کی صدیوں سے عالم اسلام بالعموم اور پچھلے کئی برسوں سے پاکستان بالخصوص اسی انداز سے اسی قسم کے مذہبی رہنماؤں کے تسلط میں گرفتار ہیں۔ اور بالکل غلط تصورات کو مذہب کے نام پر اتنی سختی سے عوام پر ٹھونسا جاتا ہے کہ ہر اختلافی آواز کو کفر اور الحاد کہہ کر گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے۔ اور اصل حقیقت جاننے کے لئے مذہب میں ریسرچ کی ہر کوشش کو زندقی الدین کہا جاتا ہے ۔ حیف یہ ہے پاکستان کا تعلیم یافتہ طبقہ یہ سب کچھ محسوس کرنے کے باوجود ان کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا ----- نتیجہ یہ ہے کہ ان کے غلط تصورات مذہب کے نام پر امت کی شہ رگ کے گرد مہلک پھندا بن گئے ہیں۔ اور قوم کی خود کشی کے عمل کو تیز تر کر رہے ہیں۔ چند مثالیں غور طلب ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ہمارے بچپن میں مساجد میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال گناہ کبیرہ سمجھا جاتا تھا خصوصا" نماز باجماعت کے وقت۔ جمعہ کے دن ہم مسجدوں کے منبروں سے دھواں دھار۔ وعظ سنا کرتے تھے۔

اگر امام اپنے سامنے مائیکروفون رکھتا ہے تو وہ خدا کو سجدہ کرنے کی بجائے مائیکروفون کو سجدہ کرتا ہے۔ اس لئے مسجد میں لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے والا اور نماز پڑھانے والا کافر ہے ----- آج پچاس برس گزرنے کے بعد وہی مولوی لاؤڈ سپیکر کو ایمان اور اسلام کا ایسا اٹوٹ حصہ سمجھتا ہے کہ ضرورت کے تقاضوں اور حقوق العباد کو بھول کر اس کا ایسا غلط استعمال کر رہا ہے کہ اس نے طالب علموں' بیماروں اور سکون کے متلاشی شہریوں کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ پچاس سال میں نہ تو خدا بدلا ہے ' نہ ہمارے نبی ﷺ نے دین بدلا ہے۔ تو پھر لاؤڈ سپیکر کی ماہیت کیسے بدل گئی ہے کہ کل کا کفر آج کا ایمان بن گیا ہے۔ گویا کفر اور ایمان کی حد خدا نہیں بلکہ مولوی حضرات کرتے ہیں۔

بالکل ایسی ہی مثال عورتوں کے پردے کی ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو پاکستان کی پہلی سالگرہ پر جب سارا لاہور مال روڈ پر فوج کی پریڈ دیکھنے کو امنڈ آیا۔ تو وہاں ننانوے فیصدی عورتوں نے کالے برقعے پہنے تھے۔ بعد ازاں جب معاشرتی اور معاشی مجبوریوں کی وجہ سے برقع کا رواج کم ہونے لگا تو ان مذہبی ٹھیکیداروں نے کفر کے فتووں کی بوچھاڑ کر دی۔ مگر آج کسی بھی اجتماع میں چلے جائیں۔ وہاں ننانوے فیصدی عورتیں بغیر برقع کے ہوں گی۔

ایک اور عصری مثال یہ ہے کہ دینی مدارس میں جو نافرسودہ کورس صدیوں سے پڑھایا جاتا ہے (جس میں سائنس، حساب اور انگریزی شامل نہیں) اس میں ملا کسی بھی تبدیلی کو خلاف اسلام سمجھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کے فارغ التحصیل لڑکے اپنی عمر کا بہترین حصہ تعلیم پر صرف کرنے کے باوجود اس قابل نہیں ہوتے کہ ملازمت زندگی کی ملازمتوں کے تقاضے پورے کر سکیں۔ اور وہ صرف اسی قابل ہوتے ہیں کہ امام مسجد بن سکیں۔ چنانچہ معاشیات کے بنیادی اصول کے مطابق ان کو اپنی کفالت کے لئے کسی مسجد کی اسی طرح ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح کسی دوسرے تعلیم یافتہ انسان کو کاروبار یا دفتر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کثیر تعداد میں ناجائز مساجد کی غیر قانونی تعمیر ہوتی رہتی ہے۔ اور ہمارا وطن اس سارے عمل کو مذہب کا نام دیتا ہے۔ اور تعلیم یافتہ طبقے سمیت ساری قوم اسے خاموشی سے برداشت کرتی رہتی ہے۔

چند اور مثالیں مجھے انڈونیشیا کے سفر کے دوران میں ملیں۔ میں ۱۹۸۰ء کے رمضان المبارک میں جکارتہ کے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل (Hotel Borobodur) میں پہنچا۔ تو کمرے میں ایک نوٹس پڑا تھا کہ فلاں تاریخ کو عید الفطر کی وجہ سے ہمارا سٹاف کم ہوگا۔ اس لئے کسی انتظامی کوتاہی کو درگزر فرمائیں ---- چند لمحے سوچنے کے بعد میں نوٹس لے کے منیجر کے پاس چلا گیا۔ اور اس سے پوچھا کہ ہوٹل کی انتظامیہ کو عید سے اتنے دن پہلے کیسے پتہ چلا کہ فلاں تاریخ کو عید ہوگی۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور کہا کہ انہیں حکومت نے بتایا ہے۔ "حکومت کو کیسے پتہ چلا؟"

وہ بھی حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ تو میں نے اپنی معقولی میں کہا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں اور ہمارے ملک میں رمضان کے آخری دنوں میں چاند دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ عید کس دن ہوگی۔ ان کی حکومت کو چند روز پہلے عید کا کیسے پتہ چل گیا۔

جتنی دیر میں اسے اپنا پاکستانی سسٹم سمجھاتا رہا۔ وہ میری طرف ایسے دیکھتا رہا۔ جیسے میں کوئی پاگل یا سرپھرا ہوں۔ پھر اپنی جان چھڑانے کو بولا "ہمیں تو ہر سال رمضان سے کئی ہفتے پہلے ہی حکومت رمضان کی اور عید کی تاریخ بتا دیتی ہے۔ اور ہم اعلان کر دیتے ہیں ---- بہتر ہوگا کہ اگر آپ حکومت کے متعلقہ محکمہ سے پوچھ لیں۔"

اگلے دن میں سرکاری دفاتر میں میٹنگ کے لئے گیا۔ تو استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ انڈونیشیا میں مصری کیلنڈر اور فلکیاتی حساب سے چاند کے ظہور کی صحیح پیش گوئی کی جاتی ہے۔ اور اسلامی تہواروں کے لئے کبھی بھی چاند دیکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی۔

میں سوچتا ہی رہ گیا کہ پاکستان میں رویت ہلال کمیٹی کی ضرورت کیا ہے۔ اور عید کے موقع پر دو تین عیدوں کی ابتری اور افراتفری کو بڑی آسانی سے دور کیا جاسکتا ہے ---- مگر بدقسمتی سے مذہبی دانشوروں کا

اورنگ زیب قاسمی

یہ فیصلہ ہمارے ہاں مذہب کے نام پر برداشت کیا جاتا ہے۔

عید بھی آگئی۔ پارک کے دوسرے کنارے پر عید گاہ تھی۔ ایک وسیع و عریض گول دائرے کے حصار پر پانچ چھ منزلہ گول عمارت کھڑی تھی۔ اور اس کے اندر چوڑا چکلا صحن ہر منزل سے پورا نظر آتا تھا۔ مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل پورے پورے کنبے جوق درجوق نماز عید کے لئے آرہے تھے۔ اس اہتمام کے ساتھ تمام عورتوں نے سفید چوغے یا گاؤن پہن رکھے تھے جو ان کو سر سے پاؤں تک ڈھانکتے تھے۔ بیچ میں سے صرف چہرہ نظر آتا تھا اور پورا گاؤن گردن کے گرد ایک تسمے کے سہارے لٹکا ہوا تھا۔ تیسری منزل پر اپنی جگہ بیٹھ کر میں نے دیکھا۔ تو شطرنج کے بورڈ کا نقشہ نظر آیا۔ کیونکہ سفید چوغوں میں ملبوس عورتیں اکٹھی مل کر ایک بلاک کی شکل میں بیٹھی تھیں۔ ان سے آگے مردوں کا بلاک تھا۔ اس سے آگے پھر عورتوں کا بلاک اور ان متصل مربعوں کی وجہ سے پورے صحن پر شطرنج کے سفید اور رنگدار مربعوں کا گمان گزرتا تھا۔

نماز کے بعد خطبہ شروع ہوا۔ سب لوگ خاموشی سے سن رہے تھے۔ کہ ایک بلاک میں ایک عورت کھڑی ہوئی اس نے گردن کے گرد تسمہ ڈھیلا کر کے گاؤن اتار دیا۔ اندر سے سکرٹ کا لباس برآمد ہوا---- پھر وہ پرس سے شیشہ نکال کر کنگھی کرنے لگی ---- اس کے بعد دوسری عورت اٹھ کھڑی ہوئی ---- پھر تیسری۔

چند ہی لمحوں بعد تقریباً تمام عورتیں کھڑی تھیں۔ سب کے گاؤن غائب ہو رہے تھے۔ اور ان کی بجائے سکرٹ یا جینز یا قومی لباس نظر آرہے تھے۔ کوئی لپ سٹک لگا رہی تھی۔ کوئی بچوں کے بال سنوار رہی تھی۔ اور کوئی دوسری عورت کا لباس درست کر رہی تھی۔

خطبہ جاری تھا۔ اور سارے مرد بیٹھے سن رہے تھے جب کہ عورتوں کی غالب اکثریت کھڑی ہو کر اپنا آپ درست کر رہی تھی ---- گاؤن سارے غائب ہو چکے تھے۔

میرے لئے یہ منظر اجنبی تھا۔ کیونکہ پاکستان میں اسی منظر کا اگر ہزارواں حصہ ہی نظر آئے تو اسلام خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ مگر وہاں سب مرد بڑے اطمینان سے خطبہ سن رہے تھے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اگلے دن سرکاری افسروں کی میٹنگ میں چائے کے وقفے کے دوران میں نے اس منظر پر تعجب کا اظہار کیا تو سننے والے میرے تعجب پر متعجب ہونے لگے۔ گفتگو چلی تو وہ سب یہ زودیک زبان تھے کہ مذہب میں اصل اہم چیز یہ ہے کہ عورتیں اور بچے عبادت کے لئے مسجد میں آئیں کیونکہ عبادت بنیادی چیز ہے۔ باقی سب کچھ ثانوی ہے۔ یہ بات بالکل اہم نہیں کہ وہ کیا پہنتے ہیں۔ سوشل انداز بدلتے رہتے ہیں۔ لباس کے طور طریق بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اور آپ ان کو بدلنے سے روک نہیں سکتے ---- نہ ہی انہیں روکنا چاہیے ---- اور نہ ہی انہیں لباس کی تبدیلی کی وجہ سے عبادت سے روکنا چاہیے ---- میں نے کہا کہ اس طرح تو عین ممکن ہے کہ اگلی سٹیج میں عورتیں سکرٹ کے ساتھ نماز باجماعت پڑھیں۔ وہ کہنے لگے کہ اگر ہمارے معاشرے میں سکرٹ کی قبولیت بالکل عام ہو گئی تو کوئی حرج نہیں کہ وہ سکرٹ میں ہی نماز پڑھیں۔ آخر یورپ، ترکی اور افغانستان میں بھی تو عورتیں سکرٹ کے ساتھ مذہبی فرائض ---- انجام دیتی ہیں۔

ایک اور مثال ملائشیا میں دیکھی۔ کوالالمپور میں غالباً ۱۹۸۸ء میں حکومت کی جانب سے ایک حکم نامہ جاری ہوا کہ آئندہ کوئی عورت پردے کے نام پر اپنا چہرہ نہیں ڈھانپے گی۔ کیونکہ چہرہ ڈھانپنا اسلامی دستور نہیں

بلکہ قبائلی عربوں کا دستور تھا۔ چونکہ آجکل چہرہ ڈھانپنے سے سیکورٹی کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ اس لئے اس عربی رسم کو ختم کرنا چاہیے۔ جو غلط پروپیگنڈے کی وجہ سے اسلامی رسم کے نام پر رائج ہے۔

مجھے مشرق بعید کے کئی ملکوں میں عید کی نماز اور دیگر نمازیں ادا کرنے کا موقع ملا ہے۔ اور وہاں مجھے اکثر اپنے بچپن کا وہ واقعہ یاد آتا تھا جب ہم لاہور میں عید کی نماز کے لئے گئے تو جماعت کے فوراً بعد سلام پھیرتے ہی چند لوگ صفوں میں کھڑے ہو کر شور کرنے لگے کہ چھ کی بجائے سات تکبیریں ہوئی ہیں۔ اس لئے نماز نہیں ہوئی۔ چند ہی منٹ بعد وہاں اتنا دنگا شروع ہو گیا کہ ہم نے اپنے بزرگوں کے ساتھ بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔ مگر ملایشیا، تھائی لینڈ اور انڈونیشیا میں عید کی نماز میں کہیں چھ، کہیں نو اور کہیں بارہ تکبیریں بھی پڑھی گئیں اور کسی جگہ لوگوں کو اس بنا پر دنگا کرتے نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ عام نمازوں میں سارے مشرق بعید میں (اور سعودی عرب میں بھی) لوگ صرف فرض ادا کرتے ہیں اور سنت یا نفل کوئی نہیں پڑھتا۔

ایک اور منظر ۱۹۷۶ء میں ترکی اور اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس تھی۔ اجتماع استنبول میں تھا۔ ایک شام سب مندوبین کو سابقہ سلطنت عثمانیہ کے شاہی محل (توپ کاپی محل) میں کھانے پر مدعو کیا گیا تھا۔ سلطان محمد خان فاتح نے ۱۴۵۳ عیسوی میں قسطنطنیہ (جو اب استنبول کہلاتا ہے) فتح کیا۔ اور بعدازاں یہ محل تعمیر کیا۔ یہ شہر سوا گیارہ سو سال تک عیسائی حکومت کا دارالخلافہ رہا۔ اور پھر پونے پانچ سو برس کے قریب اسلامی خلافت کا دارالحکومت رہا۔ علامہ اقبال نے اسے "امت کی سطوت کا نشان پائیدار" کہا تھا۔

کھانے کے بعد تمام مندوبین اور قریباً دو ہزار کے قریب مقامی مدعوین محل کے وسیع لان میں بیٹھے تھے۔ سامنے محل کے پورچ (Porch) میں سٹیج بنا تھا۔

"جس مقام پر سٹیج (Stage) بنا ہے۔ انٹافسر کہہ رہا تھا" یہاں سابقہ سلطنت عثمانیہ کے سلاطین خود کھڑے ہو کر اسلامی لشکروں کو الوداع کہا کرتے تھے۔ جب وہ مختلف مہموں پر جہاد کے لئے روانہ ہوا کرتے تھے۔ بعض دفعہ لشکر اتنا بڑا ہوتا تھا کہ ان کو کئی کئی گھنٹے کھڑا رہنا پڑتا تھا۔"

ان مہموں میں کشمیر پر حملہ شامل تھا۔ ہنگری پر دو حملے شامل تھے۔ آسٹریا کے موجودہ دارالخلافہ وی آنا (Vienna) کے دو محاصرے بھی شامل تھے۔ ۱۶۰۰ء عیسوی میں جب سلطنت عثمانیہ یورپ ایشیا اور افریقہ میں دور دور تک پھیل چکی تھی۔ تو یہی توپ کاپی محل اسے کنٹرول کرتا تھا۔ (صرف سلطان محمد فاتح کے عہد میں بارہ سلطنتیں یا ریاستیں۔ اور دو سو سے زیادہ شہر اور قلعے فتح ہو کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوئے تھے)

آج ہم یہ محل بیسویں صدی میں دیکھ رہے تھے ------ تعمیر کے قریباً چھ سو سال بعد۔ مختلف احاطوں میں بنا ہوا یہ عظیم الشان محل کانفرنس کے مندوبین کے لئے کھول دیا گیا تھا اور وہ کھانے سے پہلے اس میں گھومتے پھر رہے تھے۔

ایک وسیع کمرے میں چھت سے ذرا نیچے چند قرآنی آیات نہایت خوبصورت انداز میں لکھی تھیں۔ میں دیکھتے ہی بلند آواز میں پڑھنے لگا۔ تو میرے پیچھے کھڑے ہوئے چند ترک مہمان حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔

"آپ یہ پڑھ سکتے ہیں؟" ان میں سے ایک حیران سا ہو کر بولا۔

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی "کیا آپ نہیں پڑھ سکتے؟"

"نوں ہوں" اس نے نفی میں سر ہلایا "ترکی میں بہت کم لوگ عربی رسم الخط پڑھ سکتے ہیں۔ ہمارا رسم

اورنگ زیب قاسمی

الخط اب رومن ہے۔"

"ہم تو اپنا ماضی فراموش کر رہے ہیں ---- خدا کا شکر ہے آپ کا رشتہ ابھی ماضی سے باقی ہے' دوسرا ترک کہنے لگا۔

"نہیں ------ ہمارا بھی رشتہ بالکل ٹوٹ چکا ہے" میں نے کہا" ہم بھی صرف پڑھ سکتے ہیں سمجھ نہیں سکتے۔"

کھانے کے بعد رات نو بجے کے قریب پروگرام کا آغاز ہوا۔ سٹیج پر پندرہ ' بیس لوگ نصف دائرے کی شکل میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ اور ایک سرے پر بیٹھنے والے صاحب نے نہایت خوش الحانی سے قرآن پاک کی تلاوت شروع کی ------ ہم نے سمجھا کہ پروگرام کا آغاز تلاوت سے ہو رہا ہے ------ مگر تلاوت لمبی ہوتی گئی اور قریباً آدھ گھنٹہ بعد جب ختم ہوئی۔ تو سامعین نے اگلے اعلان کی توقع پر کان کھڑے کئے ------ مگر اعلان کی بجائے اگلے صاحب نے تلاوت شروع کی۔ جو کم و بیش اتنا ہی عرصہ جاری رہی۔

ہوا میں خنکی بڑھ رہی تھی ۔ لوگ صوفوں اور کرسیوں میں سکڑنے لگ گئے تھے۔ اسی لئے منتظمین کمبل اور رضائیاں تقسیم کرنے لگے۔ جس اندازہ ہوا کہ پروگرام کافی دیر چلے گا۔

تلاوت جاری رہی۔ دوسرے کے بعد تیسرا ------ اس کے بعد چوتھا ------ اسی طرح پندرہ لوگوں نے باری باری قرآت کی۔ اور قریباً رات کا ایک بج گیا۔ یعنی تلاوت میں چار گھنٹے گزر گئے۔

اس کے بعد ترکی میں نعت خوانی شروع ہو گئی۔ اور جب آخری نعت رات کے دو بجے پڑھی گئی۔ تو آہستہ آہستہ سارا مجمع بھی شامل ہو گیا۔ اور محل سینکڑوں لوگوں کی نعت خوانی سے گونجنے لگا۔

اس کے بعد دس پندرہ منٹ تک صدارت کرنے والے وزیر حکومت کے حق میں نعرے لگتے رہے (ان کا نام اربا کان تھا) جن کی سیاسی جماعت نے یہ پروگرام ترتیب دیا تھا۔ یہ جماعت ہماری جماعت اسلامی کی طرح ترکی سیاست میں اسلامی مسلک کا پرچار کرتی تھی۔ اور ان دنوں اقتدار میں شامل تھی۔

پروگرام کے درمیان زیادہ تر مندوبین اور دیگر مہمان اٹھ کر چلے گئے تھے۔ مگر میں آخر تک بیٹھا رہا۔ اور صوفے پر ٹانگیں بکھیرے ۔ کمبل اوڑھے کل اور آج کا موازنہ کرتا رہا۔

کل جہاں امیر المومنین کئی گھنٹے کھڑے ہو کر مجاہدین کے دستوں کو رخصت کرتے تھے۔ آج اسی جگہ صرف تلاوت اور نعت خوانی ہوتی رہی۔ وہ مجاہد کی ایڑیوں کی کھنک تھی۔ یہ ملا کے لبوں کی آواز ہے۔

کل جب خلیفہ فوج کو خطاب کرتے تھے تو سپاہی ان کا پیغام سمجھ کر اپنا فرض ادا کرتے جاتے تھے۔ آج ہزاروں کے اس مجمع میں صرف چند ہی لوگ اس تلاوت کا مطلب سمجھتے تھے۔ خدا کے پیغام سے بے رابطگی یا (Communication Gap) آج کے مسلمان کی ٹریجڈی ہے۔

کل خلیفہ کا پیغام حالات حاضرہ کے حقائق کے مطابق ہوتا تھا۔ آج یہ ناقابل فہم تلاوت حالات حاضرہ کا کوئی تجزیہ نہیں کرتی۔ اور ملا اس کے پیغام کی روشنی میں حالات حاضرہ کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہے۔

کل ہمارا قرآن عمل کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ آج صرف تلاوت کی برکت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

کل اس قرآن کی آیات میں ہدایت تھی۔ یہ زندگی کا منشور تھا۔ مگر آج یہ آیات صرف تعویذوں' وظیفوں ' دعاؤں اور موت کے بعد ایصال ثواب کی تکرار بن گیا ہے۔

وہ کل کا اسلام تھا ------ یہ آج کا اسلام ہے۔

سردی سے سکڑتے ہوئے مجھ پر علامہ اقبالؒ کے چار مصرعوں کا مفہوم زیادہ واضح ہونے لگا:

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدامست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

(بال جبریل)

اس کل اور اس آج میں کئی صدیاں حائل ہیں --- عروج کی صدیاں --- زوال کی صدیاں ---- خود ملامتی اور مایوسی نے تشکیک کو ابھارا جس نے ہولے سے سر اٹھا کر میرے ذہن میں یہ سوال داغ دیا کہ وہ اسلام درست تھا۔ یا یہ اسلام درست ہے ؟ اور اگر آج کا اسلام درست نہیں۔ تو پھر ہم اسے تسلیم کیوں نہیں کرتے ؟ چیلنج کیوں نہیں کرتے ؟ ببانگ دہل احتجاج کیوں نہیں کرتے ؟ ------

مگر یہ پہل کون کرے ؟ ملاؤں کے جبر نے پہل کرنے کا یہ حق مسلمان فرد سے چھین لیا ہے اور ملا خود ساختہ جج بن گیا ہے کیونکہ تعلیم یافتہ طبقہ بے حس ہے۔ اور ملا کے جبر کے خلاف آواز اٹھانے کو تیار نہیں۔

مسلمان اور خدا کے درمیان ٹوٹتے ہوئے رابطے کی ایک اور مثال آج کل ہر جمعہ کے روز فیصل مسجد اسلام آباد میں ملتی ہے۔ جہاں خطبے کے علاوہ امام کا خطاب بھی عربی میں ہوتا ہے۔ اور تمام نمازی ایک آدھ گھنٹہ تک بتوں کی مانند خاموش بیٹھے امام کے ہونٹوں کو ہلتا دیکھتے رہتے ہیں۔ بغیر یہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کسی زمانے میں عیسائیت اسی طرح لاطینی کے ناقابل فہم پردے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی جس طرح آج کا اسلام عربی کی دیوار کے پیچھے پاکستانی مسلمان کی سمجھ سے باہر ہے ----- یورپ کی زندہ قوموں نے ایک حقیقت پسندانہ حل نکال لیا۔ ہم نہ معلوم کب سمجھیں گے۔

ایک اور پہلو !!

انڈونیشیا میں غالب آبادی مسلمانوں کی ہے۔ ملائیشیا میں ۸۵ فیصد مسلمان ہیں۔ مگر ان کے بازاروں میں سور کے گوشت کی دکانیں ہیں۔ کیونکہ غیر مسلم باشندے اور سیاح یہ گوشت کھاتے ہیں۔ مسلمان نہیں کھاتے۔ مگر اس کے باوجود ان کا اسلام کبھی خطرے میں نہیں پڑتا۔

ان ممالک میں گھومتے ہوئے مجھے اکثر وہ واقعات یاد آتے تھے۔ جن سے میں ۱۹۶۷ء کے لگ بھگ پاکستان میں دوچار ہو چکا تھا۔

ان دنوں میں لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ صدر ایوب کے پاس کئی دفعہ شکایات پہنچیں کہ ملک بھر میں جنگلی سوروں نے زمینداروں کی زندگی عذاب کر دی ہے۔ خاص طور پر دریائی علاقوں میں نہ صرف فصلیں بلکہ مویشی اور بعض دفعہ اکیلے بچے بھی محفوظ نہیں۔ حکومت نے ضلع انتظامیہ کی وساطت سے سارے ملک کے شکاریوں سے اپیل کی کہ وہ جنگلی سوروں کو ختم کریں۔ شکاریوں کو ہر قسم کی مراعات دی گئیں۔ گاڑیاں' پولیس کا تعاون' لوگوں کے امدادی گروپ اور گائیڈ وغیرہ ----- کچھ عرصہ مہم زور و شور سے چلی۔ تھوڑا سا فائدہ ہوا۔ مگر پھر ماند پڑ گئی -----

اورنگ زیب قاسمی

تب حکومت نے عوام سے اپیل کی کہ وہ خود جنگلی سور ماریں۔ اور مقامی دفتر میں مرے ہوئے سور کی دم لا کر دکھائیں۔ تو ان کو دس روپے فی دم انعام ملے گا (ان دنوں دس روپے کی بہت قیمت ہوتی تھی) مگر کچھ عرصہ بعد یہ سکیم بھی ناکام ہو گئی۔ کیونکہ مردہ سوروں کی دموں کا ایک کاروبار کھل گیا۔ اور ایک ہی دم پر دس دس لوگ انعام لینے لگے۔ یہ معاملہ ضلع کی ڈسٹرکٹ کونسل کے سامنے رکھا گیا۔ کافی بحث کے بعد یہ تجویز زیر غور آئی کہ حکومت کسی بیرونی ملک والے کو ٹھیکہ دے کہ وہ یہاں سے سور پکڑ کر لے جائیں۔ کیونکہ ان کے ہاں سور کا گوشت حرام نہیں۔ ان لوگوں کو خوراک ملتی رہے گی اور ہماری فصلیں بچ جائیں گی۔ مگر اس تجویز پر اخباروں میں لوگوں میں اور سرکاری حلقوں میں بھی بہت سخت ردعمل ہوا کہ سور کا کاروبار غیر اسلامی ہے---- اسلام کی حمایت میں شور بھی کرتے رہے مگر یہ کسی نے غور نہ کیا کہ جب خالص پاکستانی شہری مردہ سور کی ایک دم سے ناجائز انداز میں بددیانتی سے پیسہ کماتے رہے تو یہ کاروبار غیر اسلامی نہ تھا۔ مگر جب غیر مسلم لوگ غیر ممالک سے آکر سور مار کر لے جائیں گے اور اس سے اس مسلمان ملک کے مسلمان کاشتکاروں کی فصلوں کو فائدہ پہنچے گا تو یہ کاروبار غیر اسلامی ہو جائے گا ----- جو چاہے ملا کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

مندرجہ بالا سطور میں مذہب کے غلط تصور کی چند سطحی مثالوں کا بہت سرسری انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ مگر درحقیقت یہ موضوع بہت گہرائی اور گیرائی والا تجزیہ چاہتا ہے۔ اس پر مفصل مضامین لکھنے کے لئے میرا علیحدہ پروگرام ہے۔ فی الحال زیر نظر تحریر کی وساطت سے صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی دنیا میں گھومنے سے اسلام کی اتنی شکلیں نظر آتی ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سا صحیح اسلام ہے۔ جیسے کسی نے سوشلزم کے بارے میں کہا تھا کہ: It is like a cap which has lost its shape because Every body wants to wear it his way

کہیں فقہ کی فلاوت سے اور کہیں علاقائی تہذیب کے رنگ کی وجہ سے مختلف تصورات ناگزیر ہیں۔ لیکن اگر کسی مخصوص تصور والوں کو اصرار اور ضد ہے کہ ان کے انداز فکر سے ہٹ کر سوچنے سے اسلام خطرے میں پڑ جائے گا۔ تو یہ خود فریبی ہے۔ جو وقت کے ساتھ خود کشی کا پھندا بن جاتی ہے۔ ہر تعلیم یافتہ اور روشن دماغ فرد کا یہ حق ہے کہ وہ دانستہ طور پر فیصلہ کرے کہ اس قومی خود کشی میں شریک ہو یا نہ ہو۔ یا بالفاظ دیگر وہ خود سوچے کہ چونکہ میں نے اپنی زندگی خود گزار کر اپنی قبر میں جانا ہے۔ اور خدا کے سامنے اکیلا جوابدہ ہونا ہے۔ اس لئے میں مختلف جھوٹے اور سچے تصورات میں سے مذہب کا وہ تصور اپناؤں گا جو میری سمجھ میں آتا ہے۔ یا میری ریسرچ اور تحقیق کے نتیجے میں نکلتا ہے۔ ایک ان پڑھ اور ضدی ملا کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ جبر اور دھونس سے مذہب کے متعلق اپنا تصور میرے اوپر ٹھونسے اور میں قیامت کے روز اپنی سمجھ کی بجائے اس کی سمجھ کی سزا بھگتنے لگوں۔ بقول اقبالؒ:

اپنے دنیا ہے کیوں دانائے دیں

اگر تمام تعلیم یافتہ لوگ اس انداز میں سوچ کر اور خود مذہب کا مطالعہ کر کے سمجھنے کی کوشش شروع کر دیں۔ تو خود بخود ابتداء شروع ہو جائے۔ (جیسے عورتوں کے پردے۔ لاؤڈ سپیکر کے استعمال' فوٹو گرافی اور نسوانی تعلیم کے معاملے میں ہوا) اس کے بعد ملا نہ تو مصوری کو خطاطی تک محدود کر سکے گا۔ نہ موسیقی کو

قوالی نعت اور مرثیے تک محدود کر سکے گا اور نہ ہی فوٹو گرافی اور بت تراش کو بت پرستی کے ساتھ گڈ مڈ کر سکے گا۔ علامہ اقبال کے کہنے کے مطابق ہر تعلیم یافتہ انسان اپنا فیصلہ خود کر سکتا ہے:

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

کسب حلال: دسمبر ۱۹۹۲ء میں ہم اپنے لڑکے کی گریجویشن (Graduation) میں شرکت کے لئے پرڈو یونیورسٹی (Purdue University) امریکہ گئے ہوئے تھے۔ دوپہر سے ذرا پہلے شہر کے چوراہے میں ہماری گاڑی کا ایک اور کار سے سخت ٹکراؤ ہوگیا۔ دو منٹ کے اندر اندر چاروں سڑکوں سے پولیس کی گاڑیاں اور ایمبولینس ایسے جھپٹ کر آئیں جیسے امریکی فلموں کے مناظر ہوتے ہیں۔ میری ٹانگ زخمی تھی مگر بیگم کی کمر کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ (یہ بعد میں ہسپتال والوں نے بتایا) ایمبولینس ہمیں ہسپتال لے گئی۔۔۔۔ ایمرجنسی روم میں چار پلنگ پڑے تھے۔ تھوڑی دیر بعد باقی دو پر بھی مریض آ گئے۔ دو تین ڈاکٹر سب کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔

چند میڈیکل (Tests) اور مرہم پٹی کے بعد مجھے تو کوئی چار گھنٹے بعد ڈسچارج کر دیا گیا۔ مگر بیگم کو ہسپتال ہی میں زیر مشاہدہ رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

ان چار گھنٹوں کے دوران ایک لمبے سے نوجوان سے واسطہ پڑا۔ جو چاروں مریضوں کی تیمارداری میں اس طرح ہاتھ بٹا رہا تھا جیسے موٹر گیراج میں مستری کی مدد کے لئے اناڑی سا امدادی لڑکا ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر آتے تو وہ ان کے آلات اٹھا کر لاتا۔ ان کی مدد کرتا۔ مریضوں کو تھرمامیٹر لگاتا۔ پانی پلاتا۔ اگر قے آتی تو برتن سامنے پکڑتا۔ خون وغیرہ پلنگ یا فرش پر گرتا تو اسے صاف کرتا ۔۔۔۔۔ شام کے وقت بیگم کو چھ منزل اوپر کمرے میں لے جانے لگے تو پہیوں والے پلنگ کو وہی نوجوان دھکیل رہا تھا۔ میں بھی ساتھ ساتھ لنگڑے قدموں سے چل رہا تھا۔ قدرتی طور پر ہماری بات چیت شروع ہوگئی۔ تو وہ مجھے بہت سلجھا ہوا اور معقول شخص لگا۔

بیگم کو کمرے میں منتقل کر چکے تو وہ واپس جانے لگا۔ میں نے اسے کچھ ٹپ دینے کی کوشش کی تو اس نے سلیقے سے انکار کر دیا۔ اور چلا گیا۔

آدھی رات گئے میں ایک دوائی لینے نیچے فارمیسی میں گیا۔ تو وہاں وہ نوجوان بھی بیٹھا تھا۔ ہماری بات چیت میں وہ پاکستان کے سیاسی حالات کے متعلق سوال کرنے لگا۔ پہلا' دوسرا اور تیسرا مارشل لاء۔ بھٹو کی پھانسی ۔ بے نظیر حکومت کی برطرفی اور ہند پاک جنگیں ۔۔۔۔۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ وہ ہمارے ملک کے متعلق اتنا علم کیسے رکھتا ہے۔

کہنے لگا ۔ " میں اسی یونیورسٹی میں (Constitutional Law) میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی (PHD) کر رہا ہوں۔ اور کرسمس کی چھٹیوں میں عارضی طور پر ہسپتال میں کام کر رہا ہوں۔ تاکہ کچھ آمدنی ہو جائے ۔۔۔۔۔ پاکستان میں جمہوریت سے آنکھ مچولی ہمارے لئے اچھی کیس سٹڈی (Case Study) ہے ۔"

میں رات بھر سوچتا رہا۔۔۔۔ کیا پاکستان میں ایسا ممکن ہے کہ اس درجے کا طالب علم ایسے امدادی کام کرے ؟ ۔۔۔ سوچ نے بتایا کہ یہ خارج از امکان تو نہیں۔ مگر ہمارے قومی رویے اس کی حوصلہ افزائی نہیں

اورنگ زیب قاسمی

کرتے۔ بلکہ شدت سے حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ پہلے تو ایسا کرنے والا خود ہی خفت چھپاتا رہتا ہے ۔ پھر جاننے والے بھی مسلسل طعنہ زنی کرتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ افرادی قوت (Human Resource) کو بہتر بنانے کے بالکل جائز طریقے سے قوم محروم رہتی ہے ۔۔۔۔۔۔ دراصل ہمارا یہ رویہ بھی اسی جاگیردارانہ نظام کا شاخسانہ ہے۔ جس نے ہاتھ سے کام کرنے والے "کمین" قرار دے رکھا ہے۔ اور زمینداری کو افضل مقام دے رکھا ہے۔ اسی لئے ہر شخص کوشاں رہتا ہے کہ دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو بڑا'جاگیردار' صاحب اقتدار' نواب یا ان سے قرابت رشتہ داری یا دوستی کا غلط تاثر دیتا رہے۔ اس رویے نے محنت کی جائز کمائی کی عزت (Dignity Of Labour) ختم کر دی ہے اس کی بجائے صاحب اقتدار کی حاشیہ نشینی اور خوشامد سے حاصل کی ہوئی ناجائز مراعات اور رشوت کو بہت اونچا مقام دے رکھا ہے۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کردار کی پستی قومی خود کشی کی طرف ایک مہلک قدم ہے۔

دیگر رویے: ان کے علاوہ چند دیگر رویے ہیں۔ جن کا پاکستان میں قدم قدم پر سامنا ہوتا ہے۔ اور بیرونی سیاحت کے دوران مثبت رویوں سے واضح تضاد نظر آتا ہے۔ ان کی مثالیں دینے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے انداز میں ان سے ہمہ وقت دوچار رہتا ہے۔ یہ رویے ہیں:

(i) منافقت (ii) حقائق سے فرار اور چشم پوشی ۔ کلمہ حق کہنے سے گریز (iii) قانون شکنی میں فخر محسوس کرنا کیونکہ قانون سے بالاتر ہونا معاشرے میں بااقتدار یا زور آور ہونے کی نشانی ہے ۔ (iv) خوشامد

اگر صدق دل سے تجزیہ کریں۔ تو ان چاروں رویوں نے بھی جاگیردارانہ نظام اور مذہب کی مسخ شدہ شکل سے جنم لیا ہے۔ ہم تسلیم کریں یا نہ کریں۔ مگر ان چاروں رویوں کی وجہ سے ہمارا سماجی ماحول اتنا پراگندہ ہوگیا ہے جس میں فرد کی تعمیری اور تخلیقی صلاحیتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ اور سفلہ ذہنیت پروان چڑھتی ہے۔ اگر اقبال کی " ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ " والی بات درست ہے۔ تو ملت کے افق پر تیرگی کے سوا اور کچھ نہیں آسکتا۔ اور یہی قوم کی خود کشی ہے۔

اختتامیہ: اس قومی خود کشی سے بچنے کے لئے ہمیں ان رویوں سے چھٹکارا پانا ہوگا۔ مگر اس کے لئے نہ تو کوئی نبی یا مصلح آئے گا اور نہ ہی حکومت یا کوئی ادارہ جامع منصوبہ بنائے گا قومی رویے کا آسمان سے نہیں برستے بلکہ خودرو گھاس کی طرح زمین پر ہی پھیلتے جاتے ہیں۔ اس کا حل صرف وہ ہے جو تھامس کارلائل نے لکھا ہے کہ ہم پورے معاشرے کی اصلاح میں تو کامیاب نہیں ہوسکتے مگر ایک اصلاح میں یقیناً کامیاب ہوسکتے ہیں کہ اپنے آپ کو سدھار کر پورے معاشرے میں سے ایک عدد غلط انسان کی کمی کر سکتے ہیں۔ جو بہت بڑی کامیابی ہے:

"We can make one rogue less in the society"

رویوں کی تبدیلی اسی طرح شروع ہوتی ہے اور قومی خود کشی کے موجودہ عمل کو روکنے کا واحد طریقہ بھی یہی ہے۔

("اردو نامہ" / "زیر وزبر" لاہور)

سید ضمیر جعفری

بحراوقیانوس کے اس پار

سفید جشن: امریکہ ہسپانوی ملاح کولمبس نے دریافت کیا تھا۔ یہاں اگلے برس کولمبس کی پانچ سو سالہ (۵۰۰) سالگرہ منائی جائے گی۔ تقریب کی تیاریاں ابھی سے بڑے زور شور سے شروع ہو چکی ہیں۔ مگر امریکہ کے " کالے باشندے " اس تقریب کو سفید امریکیوں کا " سفید جشن " کہتے ہیں۔ ریاست کالوراڈو کے کالوں کی انجمن کی طرف سے تو گورنر کو اس مضمون کا مختصرنامہ بھیجا گیا ہے کہ کولمبس ایک قزاق تھا۔ تم غلاموں کی تجارت کرنے والے ایک لیٹرے کو " سلامی " دینا چاہتے ہو' ہم اس توہین آمیز تماشے کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ تمہیں اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔ " کالوں " نے مطالبہ کیا ہے کہ امریکہ میں کولمبس کے نام کی جو یادگاری لوح نصب ہے کہ اس نے امریکہ کی زمین پر اپنا پہلا قدم یہاں رکھا تھا وہ اتار دی جائے۔ انہوں نے اعلان کیا ہے کہ جہاں جہاں کولمبس کے مجسمے نصب ہیں۔ ہم براہ راست ان سے نمٹ لیں گے۔ محضرنامے میں کہا گیا ہے کہ اس ملک کے اصل وارث ہم کالے لوگ ہیں مگر ہمیں بے روزگاری اور مفلسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ کالوں نے غم و غصے کے جذبات میں بڑا ابلتا ہوا محضرنامہ گورنر کے ہاتھ میں دیا ہے۔ دیکھیے!

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

جج کا مقدمہ: مسٹر کلیرنس ہائی کورٹ کی جج سے سپریم کورٹ کا جج بنتے بنتے خود عدالت کے کٹہرے میں جا کھڑے ہوئے پروفیسر " انیتاہل " (Hill) نے اگلے دن ایک " پریس کانفرنس " میں جو ٹیلی وژن کے بھی " ہیتیوں " سے نشر کی گئی۔ جج صاحب کی " جنسی چھیڑ دستیوں " کی روداد کو کچھ اور زیادہ نوکیلا بنا کر پیش کیا۔ قبول صورت اور جواں سال پروفیسر نے اپنے الزامات کی تائید میں جو چند گواہ (بلکہ گواہن " پیش کی ہیں' وہ بھی انہی کی طرح کی " دشمن تمکین ہوش " تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ہم مرد کی آنکھوں میں جنس کی اڑتی چڑیا پکڑ لیں۔ انیتا کے معاملے میں تو ان کی جنسی رغبت ان کے چہرے پر لکھی دکھائی دیتی تھی۔ ادھر " سینٹ " نے اس قصے کو ایک سیاسی معرکہ آرائی بنا لیا ہے۔ " ڈیموکریٹک " حزب مخالف کے اکثر ممبر جج صاحب کے خلاف لاوے کے مرغولے اگل رہے ہیں۔ امریکہ کا جمہوری نظام " پیانو باجے " کی طرح ہے کہ آوازیں اس کے " سفید پردوں " میں سے بھی نکلتی ہیں۔ اور سیاہ پردوں سے بھی۔ " سینٹ " کو آج اس مقدمے کا فیصلہ کرنا تھا۔ مگر مسٹر جسٹس تھامس نے خود اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے کچھ مزید مہلت مانگ لی

جس پر فیصلے کا اعلان ایک ہفتے کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ یوں آج کی گرما گرم بحث کے بعد جب ووٹ گنے گئے تو ۴۱ ووٹ جج صاحب کے حق میں نکلے اور ۴۱ ووٹ انیتا کے حق میں۔ اٹھارہ ممبروں نے ووٹ ڈالنے سے احتراز کیا۔ انہوں نے کہا۔ ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ جج اور انیتا میں سے راستی پر کون ہے۔ جس وقت " سینٹ " میں اس مسئلے پر بحث ہو رہی تھی۔ یونیورسٹی کی طالبات کا ایک " پری وش طائفہ " ------ انیتا کی حمایت میں مظاہرہ کرنے کے لئے ایوان کے اندر گھس آیا تھا نعرہ ہر نوک زبان یہ تھا ------ " ہمیں مردوں کی درندگی سے بچاؤ " ------ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔

جج صاحب بھی بڑے مضبوط اعصاب کے شخص معلوم ہوئے کہ اس نہایت ناگوار اور انتہائی تند و تیز طوفان بدتمیزی میں بھی ہر وقت مسکراتے ہوئے نظر آئے۔ ان کی خوبصورت سفید فام بیوی سہارا دینے کے لئے شوہر کے پہلو میں موجود تھی۔

امریکن پریذیڈنٹ: ایک کتاب میں امریکی پریذیڈنٹوں کے بعض دلچسپ ذاتی کوائف نظر سے گزرے۔

جان آدم (Adam) سب سے ژولیدہ لباس صدر تھے لباس کی تراش خراش کا قطعا کوئی خیال نہ رکھتے۔ دس برس تک ایک ہی ٹوپی پہنے رہے۔ جس ٹوپی میں " وائٹ ہاؤس " (ایوان صدارت) میں داخل ہوئے' جب نکلے تو وہی ٹوپی سر پر تھی۔ گیے بھی تمام وکمال تھے۔ ان کے برعکس صدر آرتھر (Arthur)' جن کو امریکہ کا ذوالفقار علی بھٹو کہنا چاہیے تھا' جتنا خوش شکل تھا اتنا ہی خوش لباس تھا۔ تقریباتی رکھ رکھاؤ کو بھی یہ صدر مملکت قدم قدم پر ملحوظ رکھتا۔ ان کے پاس کپڑوں کے اسی (۸۰) جوڑے ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ بعض جوڑے ہندوستانی مہاراجوں نوابوں کی بیگمات کی طرح غیر مستعمل بھی رہتے صدر کلیو لینڈ (Cleave land) کا پورا تالو ربڑ کا تھا۔ جارج واشنگٹن کے سب دانت مصنوعی تھے۔ اور " ہاتھی دانت " سے ڈھلوائے جاتے تھے۔ (شاید اسی لئے عالمی معاملات میں آج بھی ہاتھی کی طرح امریکہ کے کھانے کے دانت اور ہیں اور دکھانے کے دانت اور) اپنے مصنوعی دانتوں کے باعث صدر واشنگٹن اپنا منہ اکثر بند رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کے ان انسانوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے منہ کو کم سے کم غلط استعمال کیا۔

دانتوں کے تذکرے پر ایک امریکی صدر کی " آنکھ " یاد آگئی۔ صدر روز ویلٹ " کانے " تھے۔ رنجیت سنگھ کی طرح پیدائشی " کانے " نہیں تھے۔ ایک آنکھ ایک حادثے کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ (بلکہ چڑھا دی تھی) قصہ یوں ہے کہ آپ کو " باکسنگ " کھیلنے کا شوق تھا۔ صدر مملکت کی حیثیت سے وہ یہ شوق ایوان صدر کے اندر ہی اپنے " باڈی گارڈ " کے ایک نوجوان کپتان کے ساتھ چند کے کھیل کر پورا کر لیتے تھے۔ " نورا کشتی " کے قائل نہ تھے۔ بلکہ اگر کپتان کی طرف سے کبھی کوئی نرم مکہ آتا تو خفا ہونے لگتے۔ ایک روز کپتان کا ایک بہت کسا ہوا مکا صدر مملکت کی آنکھ پر اس طرح آکر بیٹھا کہ ان کی آنکھ ہمیشہ کے لئے بیٹھ گئی۔ (کتاب میں یہ وضاحت موجود نہیں کہ اس پیش دستی پر اس گستاخ کپتان کو کیا سزا دی گئی۔ فوج میں اس کی نوکری قائم رہی کہ " بارہ پتھر " کر دیا گیا)

داڑھی مونچھ اور قدوقامت میں ------ صدر ٹفٹ (Taft) اپنی چھ فٹ چار انچ کی بلند و بالا قامت کے ساتھ ------ سب سے لمبے صدر تھے۔ ان کے بعد واشنگٹن اور جیفرسن (دونوں کا قد چھ چھ فٹ دو دو انچ) پست قامتی میں اب تک مسٹر میڈیسن پہلے نمبر پر چلے آرہے ہیں۔ (کل پانچ فٹ چار انچ) ------

اورنگ زیب قاسمی

"بنا کر چار انگل کا قد اکے ہاتھ کیا آیا" ------ قد کے علاوہ صدر جیمز زون میں بھی دھان پان آدمی تھے۔ صرف ایک سو پونڈ۔ ادھر نکلے ادھر ڈوبے۔

داڑھی کا رواج کم دکھائی دیتا ہے داڑھی والے تین یا چار صدر گزرے ہیں جن میں گرانٹ اور گارفیلڈ کی داڑھیاں اپنی گھنے واری کے لئے بہت منفرد ملی جاتی ہیں۔ یہ عجیب کہ بیک وقت "داڑھی مونچھ" آنے والے چاروں پانچوں صدر نسل کے ساتھ سریر آرائے مسند صدارت ہوئے۔ داڑھی کے بغیر مونچھ کے رکھنے والے سربراہان مملکت کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں۔ ان میں "روز و یلٹ" "ٹافٹ" اور "کلیولینڈ" بڑے "مونچھیل" سمجھے جاتے ہیں۔ (اس معاملے میں ہمارے سردار عبدالرب نشتر کے سامنے امریکہ کے چاروں مونچھوں والے صدر مل کر بھی مقابلہ نہ کر سکیں) ------ امریکہ کی تاریخ میں ۷۲ برس کا ایک مسلسل عرصہ ایسا گزرا ہے کہ اس میں تواتر کے ساتھ داڑھی مونچھ منڈے ------ مفاچٹ صدر "آتے رہے ہیں ------ ہارڈنگ خوبصورت ترین صدر مانے جاتے ہیں۔ مگر لباس کی نوک پلک کا کچھ ایسا خیال نہیں رکھتے تھے۔

وزن میں اولیت کا اعزاز ٹافٹ کو حاصل ہوا۔ (۳۳۲ پونڈ)۔ وہ ایک مرتبہ ایوان صدر کے غسل خانے کے "ٹب" میں پھنس گئے تو بڑی مشکل سے نکل سکے۔ (بلکہ نکلوائے گئے) اس پر ہمیں اپنے ہاں فیلڈ مارشل ایوب خان کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ اسلام آباد میں "شہرزاد" کے نام سے موسوم "پرشکوہ عمارت" جس میں وزارت خارجہ کے دفاتر ہیں' تعمیر کے آخری مراحل میں پہنچی تو ایک موقعہ پر صدر ایوب خان معائنہ کے لئے تشریف لائے۔ وزیر تعمیرات رانا عبدالحمید خان' جو تن توش میں امریکی صدر ٹافٹ سے کم نہ تھے' فیلڈ مارشل کے ہمراہ تھے۔ معائنہ کے دوران صدر ایوب خان کو غسل خانے کچھ تنگ معلوم ہوئے۔ تو انہوں نے اپنا اطمینان کرنے کے لئے رانا صاحب سے ایک غسل خانے میں داخل ہونے کو کہا۔ رانا صاحب کسی طرح داخل تو ہو گئے لیکن ان کی بازیابی میں دارالحکومت کے ترقیاتی ادارے کے چیئرمین مسٹر ڈبلیو اے شیخ اور ناظم اعلیٰ تعمیرات عبدالحمید چوہدری کو خاصی مشقت کرنا پڑی۔

جان آدم جن کا ذکر خیر پہلے بھی ہو چکا' علی الصبح اٹھ کر شہر سے دور ایک ویرانے میں واقع ایک چھوٹے سے تالاب میں جا کر نہایا کرتے تھے۔ محلے کا کوئی محافظ بھی اس وقت ساتھ نہ ہوتا اور جب نہاتے تو کپڑے اتار کر تالاب کے کنارے پر رکھ دیتے۔ ایک مرتبہ کوئی "خوش مذاق چور" ان کے کپڑے چرا کر اڑنچھو ہو گیا۔ صدر مملکت کافی دیر تک تالاب سے برآمد نہ ہو سکے!

ایک کیفیت: بھابھی انعام قاضی اور یاسمین کل صبح لاہور جا رہی ہیں رات ہم نے ان کو اور نعیم کے بڑی بچوں کو اپنے ہاں کھانے پر بلا رکھا تھا۔ دن بھر کئی دوسطری خط ------ الطاف حسن قریشی' غلام ربانی اگرو' کرنل محمد خان' ڈاکٹر وزیر آغا" "سنگ میل" لاہور کے نیاز احمد' سلطان رشک' گلزار جاوید اور عزیزان احتشام' حسن رضا اور برادران ریاض جمیل و جہانگیر بخاری کے نام لکھ کر انکے سپرد کئے کہ لاہور جا کر ڈاک کے سپرد کر دیں۔ گویا ان کا جانا ہمارے بہت کام آیا۔ مگر ہمیں بھی بہت کام کرنا پڑا ------ دل اداس بھی بہت ہوا۔ یہاں پہلے ہی پاکستانی کتنے بہت کم تھے۔ ان میں بھی ہمارے میل ملاقات والے کم تھے۔ ان کے جانے کے بعد اور کم رہ گئے ------ وطن کی مٹی میں کتنی زبردست کشش ہوتی ہے! (۸۔ اکتوبر)

اورنگ زیب قاسمی

امریکہ کی جھلکیاں: قتل و غارت فتنہ گردی اور ٹریفک کے حادثات یہاں معمول کی واردات ہیں۔ زندگی کسی پاگل مشین کی طرح چنگھاڑتی ہوئی دوڑی جا رہی ہے۔ سورج کا چہرہ دھوئیں کی چادر ڈھانپے رکھتی ہے۔ آلودگی کی "کہر" نے منظروں کو مسخ کر دیا ہے۔ اخبارات روزگار کی خالی آسامیوں' موٹروں کی فروخت اور کتوں اور بلیوں کے لئے لذیذ و مفید غذاؤں کے اشتہارات سے بھرے رہتے ہیں۔ اسی طرح جنسی جرائم کے واقعات سے بھی۔ بے حد کشادہ سڑکوں اور شاہراہوں کے وسیع تانے بانے کے باوجود' جو مسلسل میلوں تک ایک دوسری پر گزرتی چلی گئی ہیں ٹریفک کے حادثات کی بھرمار ہے۔ صرف ہماری کالورڈو ریاست' میں سال رواں میں اب تک چار سو انسان ٹریفک کے حادثوں کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ کوئی ایک ماہ قبل ------ پہاڑی علاقے میں ایک مال گاڑی پٹڑی سے اتر کر کھڈ میں جا پڑی۔

موٹروں کے حادثے عموماً شرابی ڈرائیوروں کے ہاتھوں سرزد ہوتے ہیں۔ اخبارات ان خبروں کو تشویش کے ساتھ نمایاں طور پر چھاپتے ہیں۔ مجرموں کی کھل کر مذمت کی جاتی ہے۔ کچھ ہی دن ہوئے امریکہ کے ایک خاصے بارسوخ گھرانے کا ایک نہایت خوبصورت تعلیم یافتہ نوجوان ------ "مارک مولر (Moller) شراب کی جھونجھ میں موٹر کا حادثہ کر بیٹھا تو عدالت نے اگرچہ اس کو چھ برس قید کی سزا سنائی مگر اخبارات دہائی دے اٹھے کہ نہ نہ ہمیں مزہ نہیں آیا۔ اتنی معمولی سزا سے معاشرے کے ضمیر کی تشفی نہیں ہوئی۔ کہ اس سنگین حادثے میں نوجوان مولر نے سڑک کے کنارے سے ہٹ کر بیٹھی ہوئی ایک خاتون اور اس کی دو چھوٹی چھوٹی بچیوں کو کچل دیا تھا۔ ماں نے وہیں دم توڑ دیا۔ بچیاں زخمیوں سے جانبر تو ہو گئی ہیں مگر مدت تک ہسپتال میں رہنا ہوگا۔ پلاسٹر پٹیوں میں بندھا بندھا۔

ڈینور شہر فتنہ گردی کی گرفت میں ہے۔ بیشتر واقعات شراب خانوں اور قمار گاہوں کے اندر وقوع پذیر ہوتے ہیں یا ان مقامات کے آس پاس۔ شراب خانوں کے نواح میں تو شاموں کے جھٹپٹے پر فتنہ عناصر اور شریف امن پسند شہریوں کے درمیان باقاعدہ صف آرا معرکے پڑتے ہیں۔ شراب تو توڑنے والے "شرفا" نے بھی پی رکھی ہوتی ہے۔ مگر وہ گھر سے "پی" کر نکلتے ہیں۔ ان کا محاذ شراب کے خلاف نہیں ہوتا فتنہ گردی کے خلاف ہوتا ہے۔ کئی "معززین" نوجوانوں کو مے نوشی کا "سلیقہ" سکھاتے سکھاتے اس "محاذ" میں کھیت ہو چکے ہیں۔ اٹھارہ برس سے کم کے نوجوان بے شک چسکی لگا تو سکتے ہیں' مگر برسرعام جام لنڈھانے کی ممانعت ہے۔ یہ الھڑ مے نوش سرشام ہی سرعام موٹروں میں مے وبادہ کی شیشہ گاہیں قائم کر لیتے ہیں۔ اور پھر بدمستی کے عالم میں رات گئے۔ (بلکہ صبح آئے) تک پیش دستی کرتے اور ہمارے (پنجابی فلم اسٹار) سلطان راہی کی طرح "بڑھکیں" مارتے رہتے ہیں۔

شراب ام الخبائث ہے تو جواء جرائم کا باپ ہے۔ ڈینور میں جب سے ایک کاروباری ادارے نے ایک وسیع کیسینو کھولا ہے' شہر میں جرائم کا گویا سیلاب آگیا ہے۔ یہاں کے "جوئے خانوں" میں کوئی کھلاڑی ایک مشین پر بیک وقت پانچ ڈالر سے زیادہ کا پانسہ نہیں پھینک سکتا۔ تاکہ مشینوں پر لوگوں کی بھیڑ لگی رہے۔ سو بھیڑ لگی رہتی ہے۔

پی آئی اے: واپسی کے ٹکٹوں کی توسیع کے سلسلہ میں نیویارک کے جناب جلال حیدر کے اختیارات کی تحدیدات کے پیش نظر ہم کراچی میں "پی آئی اے" کے ڈائریکٹر تعلقات عامہ جناب خالد بٹ سے رابطہ

کرنا چاہتے تھے " نیو یارک آفس " سے خالد بٹ صاحب کا ٹیلی فون نمبر دریافت کرنا چاہا۔ نیویارک میں " پی آئی اے " کے مواصلاتی نظام کے غرفے سے ایک خاتون نے' جو آواز سے ابھی بالی عمریا کی چوکھٹ پر سے مستقبل کو آوازیں دے رہی تھیں) ہم نے ان سے رہنمائی چاہی۔ وہ صرف اس قدر رہنمائی کر سکیں کہ اس وقت نہ جلال حیدر صاحب دفتر میں موجود تھے۔ نہ ان کے نائب رئیس شفقت جناب ناصر علی۔ ہم نے پی پی سے عرض کیا کہ کیا وہ کراچی میں پی آئی اے کے ڈائرکٹر تعلقات عامہ خالد بٹ صاحب کا ٹیلی فون نمبر بتا سکتی ہیں۔ پی پی نے کورا سا جواب دیا۔

" مجھے افسوس ہے مجھے معلوم نہیں "

ہم نے نیجنگ ڈائرکٹر نواد صاحب کا نمبر پوچھا' ادھر سے اسی لفظی سی معذرت میں جواب ملا۔ البتہ ازراہ ہمدردی ہمیں کوئی نصف گھنٹے کے بعد رجوع کرنے کی ہدایت کی گئی۔ تعمیل کی گئی۔ اب کے انہوں نے ایک ایسے " امرت دھارا " فون نمبر سے استفادہ کرنے کو کہا جو دنیا بھر میں کسی شہر کے کسی آدمی کا ٹیلی فون نمبر بتاتا ہے۔ ہم نے ٹیلی فون کے اس " عالمی اکھاڑے " میں اترنے کے بجائے کراچی میں ائرپورٹ سیکورٹی فورس کے نائب کمانڈر کرنل عاشق جنجوعہ سے رابطہ کرنا زیادہ دلچسپ اور نتیجہ خیز سمجھا۔ کرنل جنجوعہ اور ایئرپورٹ سیکورٹی فورس کے کمانڈنٹ بریگیڈیر نیب الرحمن فاروقی میرے بیٹے کرنل احتشام کے " کمان افسر " رہ چکے ہیں عسکری رفاقت کے اس تاریخی پس منظر میں ہم اپنی چھوٹی موٹی " ایمرجنسیوں " میں ان کی کمک پر بھروسا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ٹیلی فون ہی سے ہمیں خالد بٹ سے مربوط کر دیا۔ خالد بٹ صاحب کی باتوں میں تعلقات عامہ کی مخصوص حلاوت' گرمجوشی اور خوشبو محسوس ہوئی۔ وہ کچھ عرصہ پہلے لاہور میں متعین تھے۔ ہم نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا۔ آپ جلال حیدر صاحب سے ایک برقیہ مجھے بھجوا دیں۔ پھر دیکھے خدا کیا کرتا ہے ------ ذرائع مواصلات کی ترقی سے دنیا کس قدر سمٹ کر رہ گئی ہے !

(۹۔ اکتوبر)

سنہرا دن : راولپنڈی سے پیارے کرنل محمد خان کا خط ملا۔ آج کا دن (بلکہ سارا ہفتہ) سنہرا ہو گیا۔ تحریر کو عجلت میں لکھی ہوئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کرنل صاحب بھچوال جانے کے لئے موٹر میں بیٹھ رہے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ خط بھی لکھ رہے ہیں۔ یا پھر لاہور سے اسد اللہ غالب اترے ہوئے ہیں۔ مگر وہی ابن انشا والی بات کہ صاحب طرز لکھنے والا اگر الٹے ہاتھ سے بھی دو لفظ لکھ دے تو اس کے اسلوب کی لذت خوشبو اور خوبصورتی چھلکے بغیر نہیں رہتی۔ اندوہ تو اپنی دیکھ بھال خود کر لیتا ہے لیکن انسانی زندگی کی مسرتوں کو شان گری کی مسلسل ضرورت رہتی ہے۔ جس کے لئے اردو ادب کی آبیاری میں جنرل شفیق الرحمن اور کرنل محمد خان جیسی کوئی دوسری مثال موجود نہیں کہ ان کی تحریر پڑھ کر آدمی آگے بڑھ کر زندگی بسر کرنے لگتا ہے ۔ خط لکھنے کا حق تو شاید اسی خط سے ادا ہوا' جو آج تک شاید کوئی شخص بھی نہیں لکھ سکا۔ ذاتی طور پر ہمارے نزدیک بہترین خط وہ ہوتا ہے کہ جس کو پڑھنے کے فوراً بعد چھپا دینا چاہیے (بلکہ جلا دینا چاہیے) بہرحال کرنل محمد خان کا جو خط بھی ہمارے نام آیا' اس نے ہمیشہ دل و جان کو روشن کر دیا۔ آج کی " ڈائری کے " کے لئے اس سے زیادہ اہم سوغات کیا ہو سکتی ہے۔ سارا امریکہ ایک طرف اور کرنل محمد خان ایک طرف !

پیرو مرشد" ------ بلد ملا۔ جن چڑھ گیا۔

اورنگ زیب قاسمی

اگر آپ کا خط آج کی بجائے دو دن پہلے جمعہ کو پہنچ جاتا تو نہ صرف میری ہفتوں کی رکی ہوئی انگڑائی دو دن پہلے ٹوٹ جاتی بلکہ شفیق الرحمن بھی آپ کے خط سے ایک دو نوالے توڑ لیتے۔ اب انہیں اگلے جمعہ کا انتظار کرنا پڑے گا۔ (یہ دونوں دوست گزشتہ تقریباً پندرہ سولہ برس سے جمعہ کے جمعہ گیارہ سے بارہ بجے ایک گھنٹہ ہنسنے بولنے کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں کبھی کبھی سلطان رشک ' بریگیڈیئر صدیقی اور راقم الحروف بھی اس " چاہت چوپال " میں حاضر ہوتے ہیں ۔ لیکن ان دونوں کی ملاقات میں شاید ہی کبھی ناغہ ہوا ہو۔ ق)

تو آپ امریکہ جاتے ہوئے برطانیہ کو بھی شکار کرتے گئے۔ برطانیہ میں تو آپ کے مریدوں کی فوجیں ہیں۔ بلکہ ہر دورے کی طرح اس دفعہ بھی بے شمار نئے پرستار بیعت کو حاضر ہوئے ہوں گے۔ میں نے آج سے بیس سال پہلے کا لندن دیکھا تھا۔ یہ پڑھ کر لندن اور جوان ہو گیا ہے دل نے ایک فوری جھرجھری لی اور اسے ایک بار پھر دیکھنے کو جی چاہا۔ مگر یاد آ کہ بوڑھا دل کیا اور اس کی جھرجھری کیا حسن یورپ (و امریکہ) سے فیض پانے کے لئے تو ضمیر کی جوانی چاہیے ------ سولہ عزے پیرو مرشد !

اور ایک لفظ ------ " جھرجھری " ------ لکھا ہے یہ زندگی میں غالباً پہلی بار نوک قلم پر آیا ہے۔ خدا جانے کیوں ؟ شاید لاشعور میں انشا کا ایک شعر جاگ اٹھا ہو غالباً دسویں جماعت میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق سے سنا تھا۔

اک جھرجھری جو تیرا خاک بسر لیتا ہے
تھام جبرئیل امیں اپنا جگر لیتا ہے

امتحان کے متعلق یہ پڑھ کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ محنت مزدوروں کی طرح کرتا ہے مگر رہتا رئیسوں کی طرح ہے۔ ماشاء اللہ میرے ذہن میں معاً وہ لوگ بھی آ گئے جو آسودہ رئیسوں کی طرح ہیں۔ مگر رہتے مزدوروں کی طرح ہیں ------ امریکہ اچھی طرح دیکھ لیں۔ اس کی خوبیوں اور خرابیوں کا خوب مطالعہ کر لیں۔ پھر ہو سکے تو ایک آدھ " خرابی " ہمارے لئے بھی لیتے آئیں۔ مگر " پیرو مرشد " یہ کیا کہ مرشدانی بھی اب کے ہم سفر ہیں۔

اس سوراخ سے تو مومن گزشتہ ۳۵ برس سے ڈسا جا رہا تھا۔

(۱۰۔ اکتوبر)

(" چہارسو " راولپنڈی)

آزادی نسواں

(ستر کے عشرے کے شروع میں پاکستان ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والی طویل ترین تقریر کا متن)

اس سال کی ہیروئن عورت ہے۔ چاند کی تسخیر اور ویت نام کی جنگ کا مسئلہ حل ہو چکا اس سال عورت کے متعلق کچھ فلوک رنگ ہوں گے۔ کچھ نئے زاویوں سے اس کی سمجھ بوجھ پیدا ہوگی۔ حسن اتفاق سے آج یہاں بہت سے دانشور موجود ہیں میری آرزو ہے کہ یہ نشست مثبت ہو اس میں ذہانت کی چمک کم اور نیک آرزوئیں زیادہ شامل ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ سب میری رہبری کریں گے۔ اور ہم سب مل کر مسائل کو جنم نہیں دیں گے۔ بلکہ انہیں سلجھانے کی کوشش کریں گے۔ کیونکہ ابلاغ عام میں یہ خرابی بھی کبھی خود ہی پیدا ہو جاتی ہے کہ مسئلے سلجھانے کے بجائے وہ انہیں اگیکٹ کرنے اور بڑھانے میں بھی مدد دیتا ہے۔ اور مسائل کی نئی پنیری لگانے میں بھی غیر شعوری طور پر معاون ثابت ہوتا ہے۔

وہ غالباً آپ سب مجھ سے اتفاق کریں گے کہ عورت کا مسئلہ کچھ معاشرے کے دوسرے مسائل سے علیحدہ نہیں ہے۔ اور اس کو سمجھنے اور سلجھانے کی ضرورت اس لئے پیش آ رہی ہے۔ کہ انسان سوشل جسٹس پر بنیاد رکھ کر ہر قسم کے ظلم کو معاشرے سے نکالنا چاہتا ہے تاکہ آزادی' محبت اور یگانگت کی فضا میں ہر شخص اپنی شخصیت اور ذات کی تکمیل کر سکے۔

جس وقت بچے سکول جاتے ہیں گھریلو کام سے فرصت ملتی ہے۔ گھر دوبارہ آباد ہونے سے پہر بھر پہلے ہر عورت کے لئے لمحہ فکریہ ہوتا ہے اس وقت عورت کھری چارپائی پر بیٹھ کر دوپٹہ اتار کر پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کریدتے ہوئے سوچتی ہے۔ کیا زندگی اسی کا نام ہے۔ ساڑھی اتار کر پیٹی کوٹ' بلاؤز میں فوم کے پلنگ پر اوندھی لیٹ کر جب تعلیم یافتہ ماڈرن عورت تیسرا سگریٹ سلگاتی ہے تو اپنے آپ سے پوچھتی ہے کیا بچے پیدا کرنا؟ انہیں انگلش میڈیم سکول میں پڑھانا' ترقی کا عاشق بنانا' یورپ کے سفر کرنا۔ شوہر کی زندگی بسر کرنا معراج نسوانیت ہے؟ کیا میری اصلی اندرونی ذات کا یہی تقاضا ہے کیا میں صرف یہی کچھ چاہتی ہوں؟

مرد جس وقت دفتر سے لوٹتا ہے؟ چاہے وہ سائیکل پر ہو چاہے بریف کیس کو ساتھ والی سیٹ پر بٹھائے خود کار چلا رہا ہو جس وقت چوراہے کی بتی اسے روکتی ہے سردیوں کی دھوپ اندر باہر شام کر رہی ہے اور چوراہے کے سامنے والے راستے پر کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے لوگ کسی جنازے کو آخری آرام گاہ کی طرف لے جاتے نظر آتے ہیں۔ ہر مرد سوچتا ہے زندگی کیا ہے؟ زندگی نوکری ہے؟ کہ بزنس؟ زندگی کلب ہے کہ عورت کا عشق؟ ------ کار سے آخری آرام گاہ تک یہ سارا فاصلہ کیسا ہے؟ اور کیوں ہے؟ اور اس سے

اورنگ زیب قاسمی

میرے اندر کے وجود کا کیا تعلق ہے۔ عورت کا احساس بے مائیگی مرد کی بے نام سی بے چینی دراصل اصلی مسئلہ یہی بے اطمینانی ہے۔ سارے مسائل بالآخر اس احساس کی تنگ گلی کی طرف نکلتے ہیں اور (Cosmic Conciousness) میں ختم ہوتے ہیں۔ عورت کا مسئلہ مرد کے مسائل طے کئے بغیر حل نہیں ہو سکتا اور مرد اپنی الجھنوں کو عورت کی اعانت کے بغیر سلجھا نہیں سکتا۔ کیونکہ روپے کے چاہے دو رخ ہوں روپیہ ہمیشہ ایک ہوتا ہے۔ یہ جب بھی (Devaluate) ہوتا ہے تو اس کے دونوں رخ ایک ہی وقت بے حیثیت ہو جاتے ہیں۔

آج کی نشست چونکہ خصوصی طور پر عورت' اس کے مسائل' اس معاشرے میں مرد کی دنیا میں اس کی حیثیت پر مبنی ہیں اس لئے مرد کے مسائل آج ضمنی رہیں گے۔ حالانکہ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر مرد کے مسائل طے ہو جائیں تو خود بخود عورت کے مسئلے طے ہو جائیں گے۔ کیونکہ مرد مثل چارپائی کی چوکھاٹ کے ہے اور عورت ادوائن اور بان ہے۔ اگر چوکھاٹ برساتوں کی وجہ سے خراب ہو جائے تو پھر صرف ادوائن اور بان کے ڈھیلا کرنے اور کسنے سے چاروں پاؤں ٹھیک ٹھیک طور سے فرش پر نہیں ٹکتے۔

مرد کو اپنی خود ساختہ مشینری' ٹیکنالوجی' تعلیم اور ترقی کا غور سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اسے بار بار سوچنا پڑے گا کہ (Paper Currency) نے دنیا کو کتنا سکھ اور کتنی منگائی عطا کی ہے ------؟ اسے اپنی ایجادات کو علیحدہ علیحدہ کر کے ان کی شکل پہچاننا پڑے گی۔ ورنہ دنیا میں آخر کو صرف ہتھیار اور ایٹم بم رہ جائیں گے اسے اپنے تعلیمی ادارے اپنی سیکولر سوچ کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھنا ہوگا اپنے گھڑے ہوئے قانون کو بھی کسوٹی پر پرکھنا ہوگا مرد جو کہ عورت اور بچے کے تحفظ کے لئے پیدا کیا گیا تھا اس کی تجویزوں نے عورت کی زندگی بچے کی نشوونما میں سہولت پیدا کی ہے کہ ان دونوں کے لئے مرد کے بنائے ہوئے معاشرے میں جینا دشوار ہوگیا ہے۔ مرد کی اس (Complex Machinery) جس کا نام شہر ہے اور شہری معاشرہ ہے۔ آج کی عورت اس معاشرے میں کہاں کھڑی ہے؟ اس کی سائیکی کیا چاہتی ہے؟ کیا وہ فقط ناشکری ہے؟ کیا وہ صرف مظلوم ہے؟ کیا عورت اپنی حیاتیات ' ہسٹری' اقلیت سے پرے کچھ نہیں؟ کیا عورت اپنے کروموسوم اپنے جینز کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے؟ کیا عورت مرد کی ایجادات کے خلاف ایک مثبت سنگ میل ہے۔

سب سے پہلے ہم عورت کی ساخت سے چلتے ہیں عورت کی جسمانی ساخت مرد سے مختلف ہے۔ اس قدر مختلف ہے کہ کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ مرد اور عورت دو مختلف (Species) سے تعلق رکھنے والے نہ ہوں؟ ایک مرتبہ ایک قاز اور ایک سور جنگل میں جا رہے تھے۔ کسی نے دریافت کیا کہ بھلی بظاہر تم دونوں میں واضح اختلاف ہے ضرور کوئی قدر اشتراک بھی ہوگی۔ جس کے باعث تم دونوں ہر وقت اکٹھے رہتے ہو۔ دونوں پشیمان ہو کر بولے بدقسمتی سے ہم دونوں لنگڑے ہیں۔ غالباً مرد اور عورت میں بھی اس قسم کی ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں جنت سے ایک وقت میں نکالے گئے تھے اور زوج ہونے کی حیثیت سے جب بھی یہ دونوں باغ بہشت میں داخل ہوں گے اکٹھے ہوں گے تاکہ یہ ایک دوسرے سے استادی کریں اس معاملے میں ایک دوسرے کو (Double Cross) نہیں کر سکتے۔

واضح فرق جو مرد اور عورت میں ہے اس قدر ہے کہ ایک (Negative Pole) ہے اور دوسرا (Positive Pole) ہے۔ ان دونوں کے اتصال کے بغیر بجلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ روشنی نہیں ہوتی۔ نسل انسانی آگے

نہیں بڑھتی۔ لیکن بد قسمتی سے دونوں ایک دوسرے کی ہمدردی محبت' دشمنی یا مقابلے کے باوجود ایک سے نہیں ہو سکتے۔

اس بنیادی فرق کے باعث کچھ ذمہ داریاں دونوں پر الگ الگ صورتوں میں عائد ہو جاتی ہیں۔ کچھ سطحی' کچھ عمیق' کچھ اغراضی واضح کچھ غیر واضح' کچھ وابستگی دائمی کچھ ناپائیدار' کچھ حقیقتیں اصلی کچھ جعلی' کچھ مسائل حل طلب کچھ لاینحل ابھرتے رہتے ہیں ان دونوں کی (Biology) گہری تبدیلی سے تعلق رکھتی ہے۔ بچپن' جوانی' درمیانی عمر اور بڑھاپا ہر مرحلے پر ان کے بدلتے رہتے ہیں۔ توڑ پھوڑ تعمیر کا عمل جاری رہتا۔ عورت کا سب سے بڑا مسئلہ جو اس سے پیدا ہوتا ہے عمر کا مسئلہ ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے مرد موت سے ڈرتا ہے' موسموں کا بدلنا' سفروں پر جان' دوستوں سے بچھڑنا' ہر قدم پر وہ موت کے بھوت سے بھاگتا ہے۔ عورت کی جوں جوں عمر بڑھتی ہے وہ بدشکلی' بدقتی' بڑھاپے سے خوفزدہ ہوتی ہے۔

مرد چونکہ زچگی کا بوجھ نہیں اٹھاتا' بچے کی پرورش میں اس کا رول بار بردار جانور کا سا نہیں ہے۔ اس لئے اس کی کاٹھی میں ہر عمر کی ضربیں کافی دیر تک چھپی رہتی ہیں۔ ماڈرن تعلیم یافتہ مرد جو مغربی تہذیب اور سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہو اور شہری زندگی بسر کرتا ہو وہ عمر سے خوفزدہ ہو کر اپنی ساری پوٹنسی' کو بینک بیلنس' حیثیت' ساکھ' عزت آبرو میں بدلنے لگتا ہے۔ لمبی سی کار سے اترنے والا جس کے دروازے کھولنے کو چپراسی اور بریف کیس اٹھانے کو پی اے ہو کار سے اترتے وقت اس کی پتلون کی کریس جوتی میں تھکے۔ کولون' چیک بک اور پائپ کا دھواں اس کی (Freshness) میں اضافہ کر رہے ہوں۔ جس کے گھر میں شلوار ہاٹ کولڈ باتھ ہائی فائی اور رنگین ٹیلی ویژن ہو۔ جو آئے تو رونق کا پیغ گے۔ جائے تو اداسی کا شبہ ہو۔ ایسے مرد کے سائیڈ برنس اگر سفید بھی ہوں اس کے گلیمر اس کی پوٹنسی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور کچھ نہیں تو اپنی سیکورٹی' شان اور سٹیٹس کی خاطر لڑکیاں اسے توجہ طلب سمجھیں گی اور زندگی کا راستہ بنسی خوشی اس کے ساتھ گزارنے پر آمادہ ہو جائیں گی۔

اس کے برعکس ایک پچاس سالہ عورت کو میک اپ سے ہر طرح مرمت کر کے دولت کی تمام نمائشی جھنڈیاں لگا کر گزار دیجئے۔ تمام تر حسن (Over hand) کو دیجئے۔ پھر بھی پرانے ماڈل کی کار خریدنے پر شاذ ہی کسی کو رضامند کیا جا سکے گا۔

جب عورت کے گھٹنے بھاری ہونے لگتے ہیں وہ منہ اور ٹانگیں کھول کر سونے لگتی ہیں۔ گھر میں اس کی باتیں ملازمہ اور جمعدارنی کے علاوہ کوئی نہیں سنتا۔ جب گھر کے بچے اسے ماں کہتے ہیں اور گلی کے چھوکرے اسے دادی اماں بلانے لگتے ہیں۔ یہ عمر عورت کے لئے خوفناک عمر ہے۔ اس وقت اس کے اندر سانسوں کا سائفن لگ جاتا ہے جو پچھلی کمائی ہوئی خوشیاں باہر پھینکتا جاتا ہے اور اس کے بدلے جھریاں۔ بلڈ پریشر' بک بک' جھک جھک کی عادت خالی دن خالی راتیں عطا کرتا جاتا ہے۔ اس عمر کا خوف اسے جوانی میں ہی عطا ہو جاتا ہے جب کبھی وہ اچانک کسی بوڑھی عورت کو دیکھ لیتی ہے تو سوچتی ہے کہ کیا کبھی میں بھی اسی طرح ہو جاؤں گی؟

یہ مسئلہ عورت کی (Biology) کا ہے۔ بنیادی ہے اور اس کا مداوا کوئی حل نہیں ہاں اگر تمام مردوں میں وہ وسعت قلب پیدا ہو جائے جو رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجہ کے معاملے میں دکھائی تو یہ مسئلہ

اورنگ زیب قاسمی

حل ہو سکتا ہے ------ میک اپ Grooming دولت سب وقتی علاج ہیں اور ان کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔

برٹرنڈ رسل نے گو اپنی زندگی میں کسی مثال سے تو اس مسئلے کا حل نہیں کیا لیکن کچھ نظریات ایسے پیش کئے ہیں جن سے اس مسئلے کی کچھ وضاحت ہو سکتی ہے۔ برٹرنڈ رسل کا کہنا ہے کہ عورتیں عموماً مرد کے کردار سے محبت کرتی ہیں اور مرد عورتوں سے ان کی ظاہری بناوٹ' جاذبیت اور جوانی کے باعث محبت کرتا ہے۔ چونکہ محبت ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس لئے ہر شخص پرستش کرنے والے کے سامنے مجبور ہے وہ بندگی کرنے والے کے آئیڈیل میں ڈھلنا چاہتا ہے تاکہ محبت کرنے والے کا صدقہ جاریہ چلتا رہے۔ اور آئیڈیل سے گرنے کے جرم میں محبت کی بنیادی ضرورت تشنہ نہ رہ جائے۔ عورت کا آئیڈیل مرد کو شاعر' انجینئر' آئن سٹائن' دانشور' ادیب' ایکٹر' موسیقار بننے پر مجبور کرتا ہے۔ مرد کی محبت عورت کو کلچی کیلنڈروں پر چھپنے والی تصویر' ایکٹرس نما حسینہ فاحشہ (Pin up Girl) بننے پر اکساتی ہے۔ بڑے سے بڑے آدمی کی محبت نے وہ پابندگی پیدا نہیں کی۔ جو معمولی سے معمولی عورت کی محبت نے مرد میں ابھاری ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو مرد اور عورت ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ زندگی کے ہر دور میں ان کی نظر ایک دوسرے پر ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے توقعات وابستہ کئے رکھتے ہیں۔ انسانی ترقی اور تنزل کے ساتھ ساتھ ہر عہد میں ہر ملک میں نئے آئیڈیلز پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ فیشن اس بات کا مظہر ہے کہ پچھلے آئیڈیلز کی شکست وریخت ہوتی رہتی ہے پاکستان کے پاس ابھی ۱۹۶۰ء تک عورت کا جو آورشی تصور تھا وہ آج کی تعلیم یافتہ ماڈرن لڑکی سے بہت مختلف تھا۔ ۱۹۶۰ء کی مس پاکستان کی اساس مذہب تہذیب اپنی زبان اپنے لباس پرانے رسم و رواج اور اس ملک کی (Geology) پر تھی۔ یہ تصور ایک پاکباز عفت مآب عورت کا روپ تھا جو بہرطور غم ہنسی صبر کرتی اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے بغیر ہر رنگ موسم اور حال میں وفا کی دیوی تھی۔

پچھلے پندرہ سالوں میں مغرب سے ابلاغ عام کے طفیل بہت سے آئیڈیلز بھی امپورٹ ہو گئے ہیں اب ان گنت کتابیں' بے شمار فلمیں' کئی قسم کے (Gadgeets) نے مرد کی ضروریات اس کی آرزوؤں کا دھارا آہستہ آہستہ موڑ دیا ہے کاما سوتر سے لے کر (Kinsey Report) تک اور منی سکرٹ سے لے کر میکسی گاؤن تک ہر تبدیلی نے مشرق کے مرد کے آئیڈیل میں کئی قسم کے شگاف ڈال دیئے ہیں۔ آج کا مرد شدید تضاد کا شکار ہے۔ اب مغربی علوم ان کے نظریات ان کے کلچر ان کی آزادی نے پچھلے بدن میں نئی روح پھونک دی ہے فرائیڈ نے جب سے جنس کی اہمیت جتلائی ہے ہمارے مرد بھی (Nympho Manic) لڑکیوں کے متعلق خوش خلقی سے سوچنے لگے ہیں اب ہمارے معاشرے میں بھی (Amber Dolita) اور میڈیم بواری نظر آنے لگی ہیں۔

ظلم سہنے والی صبر کرنے والی وفا کی دیوی اب مڈل کلاس نظر آتی ہے اور رفتہ رفتہ آؤٹ آف ووگ ہو رہی ہے۔ آج کا نیا مرد مشرقی لڑکی کی جگہ جنسی کشش والی جو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی ہو اس کا خواب دیکھتا ہے جس کا میک اپ اتنا ستھرا ہوتا ہے جیسے قلم پر (Solution) کی (Coating) چڑھی ہو ایسی لڑکی کو دیکھنے کے بعد چھچھوندر کی طرح دیواروں کے ساتھ ساتھ چلنے والی مشرقی لڑکی بے آب بے رنگ اور بے ذائقہ لگتی ہے۔ بھاگ بھاگ کر سسرال والوں کی خدمت کرنے والی ساس نندوں کے طعنے سہنے والی مرد کو

مجازی خدا سمجھنے والی کے ساتھ آج ماڈرن مرد کا دل نہیں لگتا۔ مرد نے جب سے محبوبہ کا آئیڈیل تبدیل کیا ہے مشرقی عورت کا سب سے پیچیدہ مسئلہ مرد کے آئیڈیل کو نہ سمجھ سکنے کا مسئلہ ہے۔

ہمارا مرد تیزی سے علم میں کلچر میں مادی ترقی میں مغرب کی تقلید کر رہا ہے عورت چودہ سو سال پردے میں رہی ہے اس نے اس صدی میں گھر کی دہلیز کو چھوڑا ہے کچھ عورتیں مرد کے موجودہ آئیڈیل کو غیر شعوری طور پر محسوس کرکے معاشرے کی متعین شدہ حدوں سے بہت دور نکل گئی ہیں کچھ تضاد کا شکار ہیں اگر اپنے مذہب کو معیار زندگی بنائیں تو ان کی مارکیٹ ویلیو کم ہو جاتی ہے مغربی سانچے میں ڈھلیں تو پبلک اوپینین زیادہ تر خلاف رہتی ہے۔

مرد کا حصول چونکہ عورت کی فطرت میں چھپا ہے اس لئے اس تضاد کا اثر ان کی ساری زندگی کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ مادی ترقی نے جس آئیڈیل عورت کی تشکیل کی ہے وہ نئی کار' خوبصورت گھر' اونچے بیورو کریٹ کی زندگی میں فٹ آنے والی لڑکی ہے۔

پاکستان کی ذہین تعلیم یافتہ لڑکی اپنے اوپر انحصار کرنے والی اس آئیڈیل پر کلی ایمان نہیں رکھتی۔ وہ اپنی تعلیم کی وجہ سے معاشی آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ وہ مرد کی خاطر (Seny Susan) بھی بننا چاہتی ہے لیکن چینی اور روسی نظریات پڑھ کر اسے مخلص زندگی کا بھی شوق ہوتا ہے۔ بڑے بوڑھوں سے پیار اس وقت تک ملتا ہے جب سر پر اوڑھنی اور ہونٹوں پر جی حضوری ہو۔ ایک طرف عمر کا جن بڑھ رہا ہے وقت کم ہے سانچے زیادہ ہیں۔ ڈھلے تو کس میں ڈھلے؟ یہاں مسئلہ اور الجھ جاتا ہے۔

کیا عورت صرف ڈھلنا چاہتی ہے؟ کیا وہ پلاسٹر آف پیرس ہے؟ کیا اس کی اپنی کوئی (Ambition) نہیں؟

کیا وہ صرف مرد کے چوکھٹے میں فٹ ہونے والی تصویر ہے۔

مشکل یہ ہے کہ عورتوں کے متعلق جو بھی (Data) اکٹھا کیا گیا ہے۔ اسے مرد نے اکٹھا کیا ہے۔ اس لئے اس میں ویسے ہی نقائص موجود ہیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے (Gazallers) تھے۔ مرد عورت کے متعلق کبھی (Objective) ہو کر نہیں سوچتا۔ وہ یا تو محبت میں سرشار ہو کر غزلیں لکھتا ہے نظمیں کہتا ہے۔ اور تحقیق کرتا ہے یا محبت میں ناکام ہو کر دشمنی اور حسد پر مبنی ایسے مقالے لکھتا ہے جو چاہے شوپنہار کی قلم سے نکلیں چاہے بسنتسے سے سرزد ہوں جن میں عورت کی برتری سے خوفزدہ ہو کر مرد اپنے زخموں کی زبان سے لکھتا ہے۔

یہ عورت جو مرد سے خوفزدہ ہے جو مرد کے آئیڈیل سے سہمی ہوئی ہے جسے اپنی تعلیم کے نکاس کی صحیح صورت نظر نہیں آرہی ہے۔۔۔۔

یہ عورت کون ہے؟ کیا یہ عورت آزادی چاہتی ہے؟

اگر یہ عورت جو مشرق اور مغرب کے درمیان فیصلہ نہیں کرسکتی آزادی چاہتی ہے تو وہ آزادی کیسی ہوگی؟

کیا اس کا نمونہ یورپ سے آئے گا کہ چین سے میں چین اور روس کی عورتوں سے ان کی جدوجہد سے اس جدوجہد کی مخفی قباحتوں سے واقف نہیں ہوں۔

لیکن مغرب کی عورت نے سب سے پہلے تعلیم' ووٹ کا حق' جائیداد کی خرید و فروخت اور پیشے کے

اورنگ زیب قاسمی

انتخاب کی آزادی چاہی۔ مرد کے تعصبات اور اس کے ساختہ قانون نے عورت کو عرصہ تک معاشرے میں (Third Rate Citizen) کی حیثیت دی ہے۔ کہیں وہ جائیداد کی شکل میں غلام تھی۔ کہیں معاشرے میں گلدان کی طرح نمائشی چیز تھی۔ کچھ نے انہیں جنسی لذت کا سمبل بنا رکھا تھا۔ بطور انسان ان کی حیثیت ثانوی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں انگلستان کے سرمایہ دارانہ نظام میں پہلی مرتبہ عورتوں کو ووٹ کا حق ملا۔ ۱۸۸۲ء میں شادی شدہ عورتوں کو جائیداد رکھنے کے قابل سمجھا گیا۔ اب وہ جو کچھ فیکٹریوں میں کام کرنے کے بعد حاصل کرتی تھیں۔ اس پیسے کو اپنے پاس رکھنے کا قانونی حق انہیں مل گیا تھا۔ ٹائپ رائٹر کی ایجاد نے کمرشل دنیا کے دروازے عورتوں پر کھولے۔ اب فیکٹریوں کے "فان سکلڈ" لیبر کے ساتھ ساتھ وہ دفتروں میں بھی جانے لگیں۔ ۱۸۶۵ء میں پہلی لیڈی ڈاکٹر (Elizabeth Anderson) میڈیکل پروفیشن میں وارد ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں لبنان' (Turi)' یونائیٹڈ عرب ری پبلک میں عورتوں کو ووٹ دینے کا بنیادی حق ملا۔ ۱۹۵۹ء میں ایران اور افغانستان میں عورتوں کو یہ اجازت دی گئی کہ نقاب کے بغیر زندگی کی جملہ سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہیں۔ پاکستان میں گو عورتوں کو ووٹ کا حق ۱۹۵۲ء میں ملا تھا۔ لیکن ووٹ کی اہمیت اس کی بنیادی ضرورت سے ابھی مرد بھی اچھی طرح سے آگاہ نہیں ہے۔ اس لئے اگر عورتوں کو اس حق کا حصول اور استعمال ابھی اچھی طرح سے پتہ نہیں چلا تو زیادہ تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

پیشے کے انتخاب میں عورت بچے کی وجہ سے ہمیشہ بڑی دبدھا میں رہی ہے۔ مرد کے لئے سدا سے ہزاروں پیشے کھلے رہے ہیں۔ اور عورتوں کے لئے لے دے کے گھریلو کام کاج اور گھرداری کا پیشہ سرفہرست رہا ہے۔ عورت چاہے بچہ پالنے کے اہل نہ ہو۔ سینا پرونا نہ جانتی ہو۔ کھانے پکانے میں مشاق نہ ہو اس سے ایک ہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ گھریلو امور خوب جانتی ہو۔ مردوں کے لئے چونکہ پیشے ان گنت ہیں اس لئے وہ اپنی طبیعت کی لائن دیکھ کر کسی نہ کسی (Specialize) کرکے دور نکل جاتا ہے۔ عورت زندگی کے مختلف مقامات پر مختلف رول ادا کرتی رہتی ہے اور کسی پیشے میں (Specialize) نہیں کرسکتی۔ کبھی وہ ماں ہے کبھی باورچن ہے کبھی دھوبن ہے' کبھی نرس' اس میں چھپے ہوئے جواہر کو زندگی بکھیر دیتی ہے۔ بیشتر اس کے اندر ودیعت کی ہوئی خاصیتوں کو پہچاننے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ جس وقت یورپ میں صنعتی انقلاب آیا اور شہری آبادی نے مشینوں کے باعث ترقی کرنا شروع کی۔ دیہات سے لوگ شہروں کی طرف آنے لگے۔ شہری مرد آبادی فیکٹریوں کا رجوع کرنے لگی۔ لیکن سرمایہ دار استحصال کے معاملے میں ذہین ہوتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ عورت اور بچے کم اجرت پر زیادہ گھنٹے کام کرنے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ مزدور مل کر یونین بنا لیتے ہیں۔ اور سرمایہ دار کو تنگ کرتے ہیں عورت اور بچہ ذرا یا دھمکایا بھی جاسکتا ہے۔ بہت جلد انگلستان میں عورتیں اور بچے دھڑا دھڑ کام کرنے لگے اور جب تک قانونی طور پر بچوں پر فیکٹریاں بند نہیں کی گئیں اور عورتوں نے اپنے حقوق کے لئے جدوجہد شروع نہیں کی سرمایہ دار چوکنا نہیں ہوا۔ یہاں ایک مخفی بات یہ بھی کھلتی ہے کہ دیہاتی عورت کا آزادی نسواں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (Liberation Movement) دراصل صنعتی انقلاب پیدا ہونے والے مسئلوں میں سے ایک ہے۔

پہلے گلوں سے آباد ہونے قصبے بنے۔ قصبے بڑھے شہر بنے۔ شہر گنجان مجمع ہوئے۔ بڑے شہروں میں راتوں کو بجلیاں جلیں اور دن کے وقت مشینوں کا شور چمنیوں کا دھواں اٹھا تو انسانی ذہن ملاف ہونے لگا۔ پھر نیچر کے

قریب رہنے کی وجہ سے جس آزادی خوشی اور رواداری کا احساس ہر وقت رہتا تھا کم ہونے لگا۔ اب تنگ گھروں میں تنگ گلیوں میں بچے زیادہ اور رزق کم لگنے لگا۔ اب حقوق کی باتیں ہونے لگیں۔

☆ ووٹ کا حق
☆ پیشے کے انتخاب کا حق
☆ پیشہ منتخب کرنے کے بعد مرد کے برابر محنتانہ پانے کا حق
☆ پراپرٹی بیچنے اور رکھنے کا حق

یہ تمام بنیادی حقوق شہری نظر کے ہیں جہاں تعلیم (Technology) جمہوریت (Paper Currency) عہد دوران کے چالو بست ہیں۔

ہمارا ملک زرعی خوشحالی پر زندہ ہے۔ اس کی سوچ سائنگی اور فلاح زراعت پر منحصر کرتی ہے۔ عورت جس طرح صدیوں سے مرد کے تعصبات کا شکار رہی ہے اسی طرح موجودہ دور میں دیہات بڑے شہروں کے تعصبات کے ہاتھوں سنگ رہے ہیں۔ بڑے شہری کی بولی' لباس' دولت کی نمائش' سوچ کا رنگ ڈھنگ' قصبوں اور دیہاتی آبادی کو احساس کمتری میں مبتلا کرتا ہے۔ دیہات کی عورت کے لئے تعلیم کے مساوی حقوق' ووٹ کی حیثیت اور پیشے کا انتخاب کی اتنا ہی بے معنی مسئلہ ہے جتنا شہری مزدور یا دیہاتی کسان کے لئے۔ اس کے لئے تو برتھ کنٹرول اور (Counterceptives) بھی بالکل عجیب لفظ ہیں۔ اور ماڈرن تعلیم یافتہ عورت کی طرح وہ ان کا خیر مقدم نہیں کر سکتی کیونکہ زیادہ اولاد ان کے لئے تحفظ کا باعث بنتی ہے۔ اور کھیتی باڑی میں بہت جلد ان کا ہاتھ بٹانے لگتی ہے۔ شہری عورت امیر (Parasite) کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اسے پیشے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا شوہر حکومت' معاشرے اور دولت کی ایک اہم کڑی ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ووٹ کی اہمیت کو بھی بے معنی سمجھتی ہے۔ پراپرٹی والے پر اس کا دبدبہ اس قدر چھاتا ہے کہ وہ ایک طاقتور آدمی پر حکمرانی کرنے کی وجہ سے جائیداد اس کے گرد طواف کرتی ہے وہ جائیداد کے گرد نہیں گھومتی۔

غریب عورت چاہے وہ شہری ہو یا دیہات کی بھوک کی سطح سے اوپر کچھ نہیں سوچتی اس کے لئے ہر مسئلہ دو وقت کی روٹی ہے۔ سر چھپانے کو آسرا ہے۔ تن ڈھانپنے کو کپڑا ہے۔ وہ اپنی قمیص پر کڑھائی کا نہیں سوچتی اس پر بٹن نہیں ٹانکتی اسے رنگتی نہیں صرف تن چھپانے کا وسیلہ بناتی ہے۔ غریب عورت اور مرد بھی پیشے کا انتخاب نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے پاس تعلیم اور اثاثہ دونوں نہیں ہوتے جن سے کوئی لائن چنی جا سکتی ہے۔ پراپرٹی ان کے پاس نہیں ہوتی کہ بانٹ سکیں۔ ووٹ کی حقیقت سے ان کی روح خوب واقف ہوتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا۔

اس وقت متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ قدرے ترقی پسند عورت تحریک آزادی کی بانی ہے۔ تعلیم یافتہ مرد ہر قدم پر اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کیونکہ وہ دریدہ شہری صنعتی میکانکی تقاضوں سے تنگ آچکا ہے۔ اور اب اکیلا معاشی گاڑی نہیں چلا سکتا۔ وہ چاہتا ہے کہ گھریلو اخراجات میں عورت اب خود کفیل ہو بچے زیادہ نہ ہوں تاکہ چھوٹے گھر میں بچوں کی وجہ سے کہرام نہ مچا رہے۔ اسی لئے اس نے (Conteraceptives) ایجاد کر لئے ہیں۔ ماڈرن تعلیم یافتہ مرد کو اب بیوی نہیں چاہیے۔ اسے ایک (Courtesan) درکار ہے جو اپنا خرچ بھی ادا کرتی ہو کسی بچے کی وجہ سے گھر بھی نہ بندھی رہے اور مرد کے ساتھ ساتھ گھومتی پھرے آج کے

اورنگ زیب قاسمی

اشتہار T.V.Ads' رسالے سب غور سے دیکھیے جن دبلی پتلی لڑکیوں کو (Idolize) کیا جارہا ہے وہ آپ کو باورچی خانے میں اوپری نظر آئیں گی۔ بچے پیدا کرنے سے نااہل دکھائی دیں گی۔ اور کپڑے دھوتے وقت عجیب سی محسوس ہوں گی۔

عورت مرد کی ایما سے حاصل کردہ اپنی نو یافتہ آزادی سے خوش ہے۔

میں عورت کی آزادی کے خلاف نہیں ------

میں مرد کی آزادی کے خلاف نہیں۔ آزادی ہر انسان کا بنیادی حق ہے لیکن جس آزادی کے لئے کوشش کی جاری ہے اس کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ مرد نے پیشے کے انتخاب میں آزادی حاصل ہے جو ووٹ دے سکتا ہے۔ جائیداد رکھ سکتا ہے۔ جو جنسی' معاشی' معاشرتی کئی قسم کی مراعات حاصل کر چکا ہے سکون کسی منزل پر ہے؟ عورت کو یہ بھی جانچنا ہوگا کہ سرمایہ دار ملکوں میں جہاں بنیادی شہری حقوق مردوں اور عورتوں کے "تقریباً" برابر ہیں۔ وہاں کی معاشرتی زندگی کیا ہے۔ سویڈن کی عورت کیا پرسکون زندگی بسر کر رہی ہے۔ نیویارک کی خواتین کیا پرامن ہیں؟

پراپرٹی کے لالچ نے آج کے سرمایہ دار نظام میں مرد کو اس قدر لالچی بنادیا ہے کہ نہ وہ زمین کو خدا کی سمجھتا ہے نہ عورت کو خدا کی مخلوق۔ یہ دونوں اس کی جائیداد کی شکل میں ہوں تو بہتر ورنہ وہ ان کے لئے فساد پھیلاتا رہے گا۔ کچھ عرصہ پہلے عورت مرد کو ان گناہوں سے بچانا اپنی زندگی کی معراج سمجھتی تھی جو دولت کی غلط بانٹ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اب عورت مرد کو جائیداد دولت ترقی سے پیدا ہونے والے مسائل سے بچانا نہیں چاہتی بلکہ مرد کی طرح خود اپنے لئے یہ مسئلے پیدا کرنا چاہتی ہے۔ ان مسائل سے پیدا ہونے والی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہتی ہے وہ یہ نہیں چاہتی کہ مرد وراثت اور جائیداد کا تصور ہی یک قلم چھوڑ دے بلکہ وہ اپنے لئے بھی ایسے تصورات کو ناگزیر سمجھتی ہے اسے یہ فکر نہیں کہ مرد آلودہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بلکہ مقابلے کے طور پر وہ اپنے سگریٹ اپنی شراب اور اپنے گناہ اکٹھے کرنے میں مصروف ہے۔ شہری زندگی جہاں مقابلہ سخت ہے۔ "ناریا" عورت مرد کے ظلم و استبداد سے بچ بھی نہیں سکتی۔ ظلم سے بچنے کی "ناریا" واحد صورت یہی ہے کہ ظالم کا آدھا ظلم ہتھیا کر اس کی طاقت آدھی کردی جائے۔

ووٹ کی اہمیت پسماندہ ملکوں میں جس قدر ہے اس کی حقیقت کچھ آپ سے مخفی نہیں ہے۔ ایک ووٹ سے کسی عام شہری کی زندگی کس قدر سنورتی ہے یہ بات واضح ہے۔ لیکن یہ خصوصی حق مردوں میں ایک خاص قسم کی خصوصی برتری پیدا کرتا ہے۔ عورت کو ووٹ نہیں چاہیے۔ وہ اس کی اہمیت اس کی وقعت سے آگاہ بھی نہیں لیکن وہ یہ حق اس لئے مانگتی ہے کہ مرد کی یہ خصوصی برتری آدھی رہ جائے۔

تعلیم اب ابلاغ کی شکل اختیار کرتی چلی جارہی ہے۔ اس میں بلاامتیاز سن و سال بلا تخصیص ذہن رسا بغیر سوچے سمجھے کہ تھوک کے حساب سے ملنے والی تعلیم سے معاشرے میں تلخ کی صورت کہاں تک پیدا ہو سکتی ہے۔ تعلیم اب کھلی دوکانوں پر ملتی ہے۔ حالانکہ اس کے راشن ڈپو ہونے چاہیے تھے۔ تعلیم کے اعتبار سے سرمایہ دار مطلق حکومتیں عروج پر ہیں۔ مرد اور عورتیں وہاں ایک دوسرے سے قطعی پیچھے نہیں۔ لیکن لمحہ بھر رک کر ان تعلیم یافتہ لوگوں کے معاشرے کو غور سے دیکھنا پڑے گا۔ ان کے ہاں منشیات کا استعمال اس قدر عروج پر کیوں ہے۔ شادی کی (Institution) آخری مرحلوں پر کیوں ہے؟ گروپ Marriages

اور Perimissive سوسائٹی کیوں بن رہی ہے۔

☆ بوڑھے گھروں میں کیوں جذب نہیں ہو سکتے۔

☆ حرامی بچوں کی تعداد کیوں بڑھ رہی ہے۔

☆ طلاق کیوں وبائی شکل اختیار کر رہی ہے۔

ان امیر ملکوں میں تعلیم عروج پر ہے۔

ترقی عروج پر ہے ' جمہوریت عروج پر ہے۔ آزادی عروج پر ہے۔ پھر صوفی سنٹر وہاں کیوں کھل رہے ہیں۔ کس چیز کی کمی ہے کہ سڑکوں پر لوگ ہرے رما ہرے کرشنا پکارتے پھر رہے ہیں۔

(Z.In.) کا مسلک کیوں پھیل رہا ہے؟

شاید سارا قصور خوابوں کا ہے۔ مرد اور عورت اب جب بھی بہتر زندگی کا خواب دیکھتے ہیں۔ اس کی شکل مادی ترقی کی ہوتی ہے۔ وہ اب عقل کی مطابقت میں اپنی بہشت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی بہشت جذبہ قلب اور اقدار سے نہیں بنتی۔ مرد کو تو اصلی جنت بھولے بڑی دیر ہو چکی ہے۔ لیکن ہر عورت کے پاس زندگی میں بہشت کے چھوٹے چھوٹے (Ambassaders) آتے رہتے ہیں۔ وہ عورت کی زبان میں بات نہیں کر سکتے۔ لیکن عورت ان کی بولی خوب محسوس کرتی ہے۔ عورت کی ذمہ داری تھی کہ وہ بہشت کے چھوٹے ایلچی کی بات (Interpret) کر کے مرد تک پہنچاتی لیکن اس کے اپنے خواب اب بہت مادی ہو چکے ہیں۔ بچے اپنے ساتھ بہشت کا تصور ضرور لاتے ہیں۔ لیکن وہ اب خود نہیں سمجھ سکتی تو مرد کو کیا سمجھائے کہ:

☆ بچوں کے پاس کوئی ووٹ نہیں ہوتے۔

☆ ان کی جیبوں میں (Paper Currency) نہیں ہوتی۔

☆ ان کی کوئی جائیداد وراثت میں نہیں بٹتی۔

☆ وہ کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔

☆ وہ کسی شے پر قابض نہیں ہوتے۔

☆ وہ نہ ماضی کی یاد میں مگن ہوتے ہیں نہ مستقبل سے ہراساں رہتے ہیں۔

☆ وہ کالے ہوں گورے ہوں پیلے ہوں ان کے لئے ہر رنگ بے معنی ہوتا ہے۔

ہر نوزائیدہ بچہ اپنے وجود کے ساتھ اپنی مکمل بے بسی کے باوصف ہر عورت کو مکمل (Liberation) کا سچی آزادی کا خوشی کا تصور عطا کرتا ہے۔ یہ عورت کی اور عورت سے منسلک مرد کی بدنصیبی ہے کہ وہ بچے کی طرح معصوم ہونے کی بجائے رفتہ رفتہ بڑی دانشمندی ہوشیاری اور تجربوں سے بچے کو اپنے جیسا بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

سوچنے کی بات یہ نہیں کہ حقوق کیوں مانگے جا رہے ہیں۔ کب ملیں گے؟ کیسے ملیں گے؟ لمحہ فکریہ ہے کہ جب معاشی جدوجہد کے مثبت نتائج نکل آئے۔ شہری زندگی میں مرد اور عورت برابر ہو گئے تو کیا انسانی زندگی (Utopia) بن جائے گی۔ کیا مرد مطمئن ہو جائے گا۔ عورت شانت نظر آئے گی۔ مسائل ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت عورتوں کی (Liberation) موومنٹ میں ایک بڑی قباحت موجود ہے جو اس تحریک کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔ (مجموعی طور پر بھی اور فرداً" فرداً" بھی۔ کوئی کوئی عورت کسی کسی خاص مرد

اورنگ زیب قاسمی

سے بدلہ لینے کے لئے تحریک میں گرم جوشی دکھا رہی ہے۔ ان کا رویہ نشیے اور شوپنہار جیسا ہے۔ ان کی ضرورتیں نہیں زخم بولتے ہیں۔ کچھ عورتیں خوفزدہ ہیں کہ یہ تحریک کہیں ان خاص مردوں کو ان سے چھڑوا نہ دے جن کے لئے وہ زندہ ہیں۔ کچھ عورتیں محض میلہ گھومتی ہیں۔ تحریک کو پکنک شو کی طرح (Enjoy) کرتی ہیں اور گھر جا کر مردوں سے مل جاتی ہیں۔ دراصل ہر انقلاب کی اساس نفرت ہوتی ہے۔ صرف تحریک آزادی نسواں کی بنیاد نفرت نہیں محبت ہے۔ ہر جگہ ظلم برداشت کرنے والا ظالم کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ ظلم ختم ہی اس وقت ہوتا ہے جب ظالم نہ رہے مزدور سرمایہ دار کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتا ہے۔ مزدور کسی لمحے بھی کسی سرمایہ دار کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کا (Ideal) بننا نہیں چاہتا۔ نیگرو سفید بالادست کو اپنی راہ کا روڑا سمجھتا ہے۔ لیکن عورت کا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے۔ وہ ظالم سے محبت بھی کرتی ہے اور اس سے انصاف بھی چاہتی ہے۔ مرد عورت سے محبت بھی کرتا ہے اور اسے دبا کر بھی رکھنا چاہتا ہے۔ کوئی عورت کسی سوشلسٹ مزدور کی طرح یہ خواب دیکھنے کی جرات نہیں کر سکتی کہ جب وہ مکمل طور پر آزاد ہوگی تو مرد اس دنیا سے ختم ہو چکے ہوں گے۔ تحریک ہے تو فقط اتنی کہ دنیا میں اس کی معاشی بدحالی مکمل (Dependency) کے باعث کئی (Handicaps) ہیں۔ جن کی وجہ سے مرد کے لئے اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس بات کا عورت کو شعوری اور غیر شعوری طور پر احساس ہے کہ مرد جب اس سے محبت نہیں کر رہا ہوتا اس وقت اسے کمتر' جاہل' احمق' اور غیر ضروری سمجھتا ہے اور اس احساس کی وجہ سے وہ بھی اپنے آپ کو کمتر سمجھنے لگی ہے اور صرف اس کی وجہ اتنی ہے کہ مادی دنیا میں مرد کی (Know how) زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ماڈرن زندگی کی تفریحات نے عورت کی اہمیت کو اور بھی کم کر دیا ہے۔ عورت نے اس مسئلے کا حل صرف یہی دیکھا ہے کہ اب مرد کے پلے گراؤنڈ میں جا کر کچھ کارنامے کئے جائیں تاکہ مرد کو احساس رہے کہ اگر اس نے عورت کا ساتھ نہ دیا تو وہ خود مقابلے پر دھڑلے کے ساتھ آجائے گی۔ ہر تحریک میں یہ آزادی موجود ہوتی ہے کہ ظالم سے نفرت کو جائز سمجھا جاتا ہے بلکہ اس نفرت کے (Banner) بنتے ہیں۔ نعرے جنم لیتے ہیں۔ اور ان ہی سے انقلابوں کا (Role) جنم لیتا ہے۔ اور اسے اونچا کیا جاتا ہے۔ آزادی نسواں میں بڑی قباحت یہ ہے کہ بلیا چھندر کی اس نگری میں کسی عورت کی روح مرد سے نفرت پر آمادہ نہیں ہوگی۔ نہ بالادست مرد عورتوں کی چیخ وپکار کے باوجود عورتوں سے نفرت کر سکیں گے۔

اپنی اس (Liberation Movement) کی اصل روح اس مصرعے میں پنہاں ہے کہ

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

اس تحریک کے دوغلے پن کو سمجھ کر عورتوں کی مکمل آزادی کا تصور ناممکن نہیں تو قریب قریب ناممکن ضرور ہو جاتا ہے۔ اور اسی لئے یہ (Movement) اس قدر (Complex) بھی ہوتی جا رہی ہے۔

سائمن ڈی Beauvoir نے گو آزادی نسواں کے لئے سب سے بڑی شرط معاشی آزادی کی لگائی ہے لیکن عورت کا مسئلہ مزدور کے مسئلے کی طرح سپاٹ نہیں ہے یہ مسئلہ بظاہر معاشی بحالی کا سہی لیکن در پردہ اس میں نیگرو کی (Self Respect) بحال کرنے کا بھی مسئلہ ہے۔ عورت نہ اپنی عزت کرتی ہے نہ اپنی ہم جنسوں کی نہ مرد کو اپنی عزت کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ بطور فرد کے کہ ابھی تک اس کا تشخص نہیں ہو سکا۔ (Mother Hood) کی جائز تعظیم اور اہمیت کا بھی حصہ ہے اور پھر اپنی حیثیتیں منوانے کے بعد

اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ مرد کی توجہ کا مرکز ثقل رہے اس طرح جس ظالم (Charannistve-Domineering) مرد کے خلاف وہ جدوجہد کر رہی ہے اس کی توجہ محبت و احترام دوستی کے لئے بھی خون پسینہ ایک کر رہی ہے۔ یہی اس تحریک کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

اس اعتبار سے یہ انقلاب دنیا کی (Envolution) میں بالکل منفرد حیثیت رکھتا ہے یہاں معاشی آزادی کے بدلے مرد کے محبت بھرے تحفظ سے آزادی حاصل کرنے کا مقصد نہیں۔ یہاں برابری کا دعوے کر کے مرد کی بے اتفاقی مول نہیں لی جاسکتی۔

مقصد ہے تو فقط اتنا کہ اگر مجھے طعنہ دو گے کہ میری جنس میں (Genius) نہیں ہے تو میں گھروں کو ویران کردوں گی۔ تمہارا (Genius) جھٹیالوں گی۔ اور تم پر یہ بھی ثابت کردوں گی کہ ماں پن میں دنیا کا سب سے بڑا حسن چھپا ہے مجھے پاؤں کی جوتی نہ سمجھو ورنہ جوتی تمہارے پاؤں سے اتر کر بے کار نہیں پڑی رہے گی کسی اور کے پاؤں پر فٹ آکر بھی دکھا دے گی۔ تم مجھے گھر میں محبوس رکھ کر مجھے بوجھ ہونے کا طعنہ نہ دو ورنہ میں گھر سے نکل کر نہ صرف تمہارا گھر ہی بے رونق کردوں گی بلکہ تمہارے روزگار میں برابر کی شریک ہو کر تمہیں بھی بے روزگار کردوں گی پھر تمہیں چوراستوں میں اشتہار لگا کر صدا لگانی پڑے گی۔

Wanted a good wife new or used

مشکل اس وقت یہ نہیں ہے کہ عورت آزاد کیوں ہو رہی ہے۔ آزادی بابرکت چیز ہے اور انسان کو بیج سے استکار کرتی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ اگر مردوں نے کسی طور پر عورت کو اس کی اہمیت کا احساس جلد نہ دلایا تو عورت تین گروہوں میں بٹ جائے گی۔ اس وقت عورت کی جبلت میں وحدانیت سے تثلیث پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح عورتوں کا ایک گروہ بچے پیدا کرنے پر مامور ہوگا۔ دوسرا گروہ مردوں کے مقابلے کے لئے سرگرم رہے گا تیسرا گروہ (Parasites) کا ہوگا جو صرف (Courlescans) کی طرح زندہ رہے گا۔ جب تک بکتی چیڑی مسلی خوب کھائی بعد ازاں کوڑے کے ڈھیر بن گئے۔

ادھر عورت مقابلے پر اتر آئی ہے ادھر مرد صدیوں عورت کی (Mother Hood) سے جلتا رہا ہے وہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ اس کا رقیب آغوش میں پلتا ہے ہمارے باپ دادا اسی لئے بچوں کو اس قدر مارتے پیٹتے تھے ہماری (Age Group) کے مرد زیادہ مہذب ہو کر (Sulk) کرتے ہیں لیکن ماڈرن آدمی بہت ذہین ہے اس نے ایک ہی فیصلے سے عورت کو مات دینے کی ٹھانی ہے وہ جانتا ہے کہ باہر کی دنیا دوزخ ہے وہ اب عورت کو اس کا ایندھن بننے سے نہیں روکتا بلکہ مصر رہتا ہے کہ تھوڑی سی تو بھی تپ کے دیکھ (Contraceptives) ایجاد کر کے وہ بانس سے بانسری کو علیحدہ کر دینا چاہتا ہے جب دنیا میں عورت نکل آئی اور بچے ضمنی حیثیت کے ہوگئے تو پھر ہر جگہ گھر پر اور باہر مرد کو عورت کی رفاقت نصیب ہوگی اور اس چیز کی مرد کو تلاش ہے۔

میرا سوشلزم کا مطالعہ کم ہے چین جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جو چند کرم فرما گرما گرم سوشلسٹ ہیں۔ اور دائی ہیں کہ چین کی عورت کو کوئی غم نہیں یہ دوست قابل اعتبار نہیں کیونکہ یہ سب قول کے نمازی ہیں اور بڑی آرام دہ زندگیاں بسر کرتے ہیں وہ اپنا گھر اپنی مراعات اپنی دولت کسی اور کے ساتھ بانٹ کر استعمال نہیں کرتے ان کے گھر آراستہ کاریں لمبی اور بچے ہمیشہ یورپ میں تعلیم مکمل کرتے جاتے ہیں مجھے یقین ہے کہ

اورنگ زیب قاسمی

چین میں عورت کے مسائل کم ہوں گے۔

لیکن جہاں مزدور کا مسئلہ ختم ہو جاتا ہے وہاں عورت کا مسئلہ ختم نہیں ہوگا۔ اس لئے چین میں بھی عورتوں کے مسائل ضرور ہوں گے۔ پچھلے دنوں مجھے (Cehite Laired Girl) چینی اوپرا دیکھنے کا اتفاق ہوا تو خیال گزرا کہ جس وقت یہ خوبصورت اوپرا چین کے عوامی تھیٹر میں نمائش کے لئے آیا ہوگا۔ اس وقت ہال میں ایک ایسا مزدور بھی آیا ہوگا۔ جس کی بیوی اس کے ساتھ ہوگی۔ دونوں کی معاشی حالت برابر ہوگی۔ اوپرے کی ہیروئن کو گو فنکار مزدور عورت جتنا ملتا ہوگا لیکن اس کی (Recognition) سارے ہال میں تالیاں بن کر گونج رہی ہوں گی۔ اوپرے سے متاثر ہو کر مزدور شوہر نے گرین روم میں جانے کی آرزو کی ہوگی۔ اور چونکہ چین میں مزدوروں سے ہیروئن آسانی سے مل جاتی ہے اس لئے وہ گلدستہ لے کر اپنی بیوی کے ساتھ تحسین اور محبت کے جملوں کے ساتھ گرین روم میں پہنچا ہوگا۔

اس وقت مزدور عورت کے لئے چین جیسے ملک میں ایک مسئلہ ضرور پیدا ہوا ہوگا۔ (Recognition) کا مسئلہ (Approval) کا مسئلہ (Public Opinion) کا مسئلہ۔

آج کی عورت اس کمی کو شدت سے محسوس کر رہی ہے پبلک لائف میں اس کے حصے کی تعریف کہاں ہے۔؟ وہ ایسے کارنامے کیوں سرزد کرنے کی اہل نہیں جس سے گھر پر شہر میں ملک میں اس کی بے بے کار بھی ہو۔ اس سے ہمیشہ گھریلو کام کاج کی توقع کی جاتی ہے جس کام کی نہ کوئی شدت نہ اہمیت ہے اور جو بالکل (Thankless Job) ہے۔

معاشی آزادی کے بعد عورت (Recognition) کے میدان میں آئے گی۔ اس کے بعد وہ جذباتی مساوات چاہے گی۔ اگر معاشی آزادی نسوانی معراج ہوتی تو تحریک آزادی بھی مغرب سے نہ چلتی۔ امریکہ کی عورتیں سب سے زیادہ پرسکون فارغ اور مسرور نظر آتیں۔ امیر عورتوں کو کبھی سائیکو تھیراپی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ غریبی کے جھنجھٹ سے نکلتے ہی سوچنے سمجھنے محسوس کرنے جائزہ لینے نتیجے اخذ کرنے کو وافر وقت ہوتا ہے۔ یہی وافر وقت میں سوچ بے اطمینانی کا بیج ہوتا ہے۔ جب پہلی بار آزاد عورت کو ساحل ملتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ طوفان میں موت کا ڈر تھا اور ساحل پر زندگی کا۔

دراصل تحریک آزادی نسواں کچھ عورتوں کا انقلاب نہیں مرد اور عورت کی خوشی راحت اور آزادی کی کوشش ہے پسماندہ مرد سوشل جسٹس چاہتا ہے پسماندہ عورت معاشی انصاف کے لئے جھگڑتی رہتی ہے۔ (Double Standards) برداشت کرنا کسی (Depressed Class) کے لئے بھی مشکل ہوتا ہے۔ راحت خوشی اور آزادی کی جدوجہد مثل ایک زینے کے ہے۔ سب سے پہلی ایک سیڑھی سوشل جسٹس کی ہے اس سیڑھی پر مسئلہ عورت اور مرد کا سانجھا ہے انسانی جسم کی راحت کے لئے چاہے ملیریا کے خلاف جہاد ہو چاہے طبقاتی نظام کے خلاف جدوجہد ہو وہ اکٹھے لڑتے ہیں لیکن ذہنی سکون قلبی راحت کے وقت دونوں ایک دوسرے کے حریف بن جاتے ہیں مرد اپنی (Self Respect) کو زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔ عورت کی شدید رغبت کے باعث جو مرد میں جبلی طور پر موجود ہے مرد اسی مجبوری سے جھنجھلایا رہتا ہے۔ اسے اپنا آقا کو قید کرنے کا جب بھی موقعہ ملتا ہے۔ وہ گن گن کر بدلے لیتا ہے۔ اور بے حد تفصیل (Domineering) اور کینہ ثابت ہوتا ہے مرد کی سائیکی جانتی ہے کہ عورت اور بچہ مکمل یونٹ ہے کھیتی کا دھرتی کے ساتھ گہرا

رشتہ ہے۔ ہوا میں اڑنے والا پرندہ اپنی مجبوری سے گو بظاہر آگاہ نہ ہو لیکن یہی وہ اڑان ہے جس سے اپنے بنائے ہوئے معاشرے میں (Double Standard) اظہار کرتا ہے عورت ان دوہری اقدار کے باعث بڑی مجبوب رہتی ہے اور سوچتی ہے کہ پروانہ صورت جو جلنے کی رات کو ملا تھا وہ کون تھا؟ اور پیر کی صبح کو شمع کرتے منہ پھلانے والا ڈوک کون ہے۔ محبت کے جوش میں غزلیں لکھنے والا کون تھا۔ اور گھر میں تھانیدار کی طرح داخل ہونے والا کون ہے؟ آج کے تعلیم یافتہ شہری کے لئے یہ دوہری اقدار اور بھی ظالم صورت اختیار کرتی جاری ہے وہ آزادی سے پھرنے والی گستاخ لڑکی سے مرعوب ہوتا ہے۔ پھر اس منہ زور گھوڑے کی محبت میں سرشار ہو کر اسے سدھانے کے لئے شادی کرتا ہے۔ جس سے اندر ہی اندر ہار جاتا ہے اسی پر حکومت کرنا چاہتا ہے اس لئے شادی کی دوسری صبح وہ شدت سے (Double Standard) کا شکار ہو جاتا ہے پل کی ماڈرن لڑکی سے اس کی توقع ہوتی ہے کہ وہ اطاعت گزار بھولی بھالی سلیقہ شعار بن جائے نہ اس کے منہ میں زبان ہو نہ پیٹ میں دل عورت ہارتی ہے تو دل جان سے مرد کی برتری قبول کر لیتی ہے اس لئے کوئی لڑکی اپنے ماڈرن شوہر سے یہ امید نہیں رکھتی کہ شادی کی دوسری صبح وہ داڑھی رکھ کر ٹوپی پہن کر اس کے ابا جی کی طرح فجر کی نماز پڑھنے مسجد چلا جائے گا۔ مرد اپنی مجبوری کو چھپانے کی خاطر توڑ پھوڑ کرتا ہے برتری ثابت کرنا چاہتا ہے عورت کی شراب اس کے منہ کو ضرور لگ جاتی ہے لیکن اس شراب کے ساتھ وہ کبھی ذہنی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے خود بخود اس میں اس ذہنی کیفیت کی وجہ سے (Double Standand) پیدا ہونے لگتے ہیں عورت نسل بڑھانے کی خدمت پر مامور ہے اس لئے اس کی سمت ہمیشہ ایک رہتی ہے اور اس میں جھلاہٹ اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب مرد کی دوہری اقدار کو نہ سمجھتے ہوئے وہ مرد کو اپنی راہ پر لانے کی کوشش کرتی ہے مرد نے اپنے لئے سماج کے بہت سے راستے کھول رکھے ہیں اپنی بقا کے لئے کئی قانون بنا رکھے ہیں اپنی کمزوریوں کو کبھی بیالوجی کا سہارا دیا ہے۔ کبھی (Anthropology) کا۔ عورت مرد کے اس (Double Standand) سے اس قدر بوکھلا گئی ہے کہ شاہی لاک کی طرح اس ظلم کے خلاف بلبلا اٹھی ہے۔

مارگریٹ میڈ کا خیال ہے کہ مغرب کے معاشرے میں عورت اپنی رول میں فٹ نہیں ہے وہ ساموا کی عورت کی مثال دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ جب تک عورت اپنے عورت پن پر فخر نہ کرے گی اور مرد کی تقلید اس کی ہمسری یا اس سے تقابل کرنا نہ چھوڑے گی اس کے بیشتر مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ مشکل یہ ہے کہ شہری زندگی میں جنگل کا قانون نہیں چلتا۔ دیہات کا رواج بھی نہیں چلتا ساموا کا رہن سہن بھی رائج نہیں کیا جا سکتا تا وقتیکہ سارا معاشرہ ہی اتنی بڑی تبدیلی پر رضامند نہ ہو۔ شہری معاشرے کا قریباً سب کچھ ان نیچرل اور انسان ساختہ ہوتا ہے۔ یہاں بیٹی ماں اور بہن کے روپ میں چونکہ عورت کا نیچرل ہوتا ہے اس لئے اس کا تحفظ بھی طبعی جذبات سے کیا جاتا ہے ان (Roles) کو چونکہ معاشرے نے نہیں لوٹنے جنم دیا ہے۔ اس لئے ان میں تمام نمائشی فرضی اقتصادی واجبات بھی نہیں ہوتے۔ محبوبہ کا روپ بھی قدرتی ہے اس روپ میں محبوبہ کسی قسم کی بغاوت پر آمادہ نہیں ہوتی۔ کسی تحریک آزادی میں شامل نہیں ہوتی کیونکہ اس حالت میں اس کے صرف حقوق ہوتے ہیں وہ کسی قسم کے فرائض بجا نہیں لاتی۔

آفت بیماری کی اصلی جڑ عورت کا وہ روپ ہے جب وہ بیوی بنتی ہے اور پھر بیوی بنی رہتی ہے اس رول

اورنگ زیب قاسمی

میں ہر سال کے ساتھ ساتھ اس کے حقوق کم ہوتے جاتے ہیں اور فرائض دن پر دن بڑھتے لگتے ہیں قدرتی رشتوں جیسا طبعی تحفظ اسے نہیں ملتا۔ حقوق کی تکرار سے زندگی میں پابندی بے زاری اور بے لطفی کا بڑھنا یقینی امر ہے۔ چاہے رعایا حکومت سے حقوق مانگے ملازم افسر سے یا بیوی شوہر سے مانگنے والا اپنا حق سمجھ کر اصرار کرتا ہے اور دینے والا بنک کے قرض کی طرح اسے روز افزوں بڑھتا پا کر ناگواری کا اظہار کرتا ہے۔ ماں بیٹی اور بہن کے روپ کا غور سے مطالعہ کیجئے اس میں عورت لاکھ غریب خاندان کی ہو وہ جذباتی طور پر کبھی (Under Preveiledged) نہیں ہوتی مشرقی ممالک میں تو خاص طور پر مفلوک الحال بسا اوقات ان رشتوں کے لئے رحمت کا باعث ہوتی ہے۔ عموماً غریب اولاد ہی ماں کے پاؤں تلے جنت تلاش کرتی ہے امیر بھائی کبھی بہن کی آبرو بچانے کے لئے جان کی بازی نہیں لگاتے۔ بیٹی کی خوشی کی خاطر سارا خاندان تباہ کرنے والے بھی عموماً بہت غریب ہوتے ہیں۔ یہاں رک کر لمحہ بھر کے لئے سوچنا پڑتا ہے کہ اس تین قدرتی رشتوں میں عورت اتنی مطمئن کیوں ہے خاندان کے مسائل اس کے مسائل ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن گھر میں اسے کوئی غیر ترقی یافتہ ملک کی طرح بے مایہ بے حیثیت اور کمتر ہونے کا احساس نہیں دلاتا محبوبہ کے روپ میں وہ ہمیشہ (Ord) دینے کے قابل ہوتی ہے۔ صرف جس وقت حسن اور محبت کی بجلیوں سے شادی کا پنجرہ بنا کر امیر شوہر کا پھاٹک اور بچوں کے تالے لگا کر معاشرہ عورت کو اس میں بند کرتا ہے اس کے ذاتی انفرادی اور پیچ در پیچ مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔

ایک بار پھر اس بات کا اعادہ کرنا چاہتی ہوں کہ مشرقی معاشرے میں ماں بیٹی اور ماں کو مسائل سے چھٹی نہیں ہوتی انہیں مشکلات درپیش ہوتی ہیں اور رہتی ہیں۔ لیکن ان کی (Anthoriling) ان کی محبت ان کی شخصیت کو نہ کوئی چیلنج کرتا ہے نہ (Question) کرتا ہے جس وقت عورت کی شادی ہوتی ہے شکایات بڑھتی ہیں جوں جوں سننے والے کی بے حسی بڑھتی ہے عورت اپنا (Amplifier) اونچا کرتی جاتی ہے رفتہ رفتہ شادی بیاہ پر بجنے والے سپیکرز کی طرح آواز تو آتی رہتی ہے لیکن سننے والے موجود نہیں ہوتے۔

عورت کی زندگی کا مشکل ترین مسئلہ اس وقت پیش آتا ہے جب حسن اور محبت کو قانونی بندھن میں بدل کر آگ اور پانی ملا کر پینے کا حکم ملتا ہے۔ شادی اور حسن ہر فرد کی زندگی میں چوراہے کی بتی بن کر کھڑے ہیں شادی لال بتی ہے۔ جو ضبط و نظم پیدا کرتی ہے حقوق و فرائض کی پابندی کراتی ہے۔ دوسروں کے پاؤں پر گل بیٹھ چلنے سے روکتی ہے۔ حسن کی ہری بتی کھلا راستہ ہے (Accelerator) پر پاؤں ہوتا ہے تیز رفتاری کی وجہ سے نہ حادثے کا خوف ہوتا ہے نہ چالان کی کی فکر۔

محبت اندھی ہے نہ بتی دیکھتی ہے نہ راستہ وہ ایک ایسی کار کلہاڑن ہے جس کی تاریں کہیں اندر ہی اندر مل جاتی ہے پھر دیوانہ وار جد هر بھی جائیں ہارن پر ہاتھ رکھیں نہ رکھیں دل کا ہارن بجتا رہتا ہے۔

اگر حسن فطری امر ہے اور محبت غیر اختیاری فعل ہے تو انسان کی جسارت دیکھیے کہ اس نے یہ دو بڑی بے بس کرنے والی طاقتوں پر شادی کا بڑا (Grid) باندھ کر سارے معاشرے میں پکا چوندہ پیدا کر دی ہے انسان بڑا مشکل پسند اذیت طلب اور سم جو ہے۔

اس لئے اس نے شادی ایجاد کی ہے جو رابطوں کی مشکل ترین مشکل بھی ہے معراج بھی۔

جمہوریت، سوشلزم، مذہب اور شادی کی کڑی شرط یہ ہے اگر (Conviction) نہ ہو ایمان پختہ نہ ہو

تو یہ سارے نظریے بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں اس صدی میں چونکہ چھان پھٹک زیادہ ہے اور عقیدہ ایمان اور (Conviction) ثانوی چیزیں ہیں اس لئے شادی کے لئے یہ صدی بڑی خطرناک ہے کیونکہ اس میں اول و آخر حسن و محبت کا احتساب ہوتا ہے۔ غریب مرد عورت زیادہ وقت بھوک کے بھاؤ کو دروازے سے باہر دھکیلنے میں لگے رہتے ہیں یہاں مارپیٹ بہت ہوتی ہے لیکن جنس اور محبت کو گھر سے باہر تلاش کرنے کے لئے عموماً" نہ افلاط ہوتا ہے نہ وقت اس لئے شادی کا سرکٹ بہت کم شارٹ ہوتا ہے۔

مڈل کلاس کی عورت اور مرد دونوں (Ambition) میں ڈوبے ہوئے ہیں انہیں اوپر والے طبقے میں داخل ہونے کا فکر ہوتا ہے۔ اس طبقے کی عورت کے پاس بحثی زیور بھی ہوتا ہے اور مغربی تعلیم بھی میک اپ کا سامان بھی ہوتا اور ہلا کی چھوٹی سی سرخ کتاب بھی یہاں بیچ کر بار بار شادی کے فیوز اڑانے لگتے ہیں۔

امیر عورتیں اپنے باشکرے مردوں کی طرح سب کچھ پالینے کے بعد زندگی سے (Advcutiral) اور (E xcilentor) کا تقاضا رکھتی ہیں وہ شوہروں کی دولت پر شکم پروری کرنے کے بعد شوہروں کو سوزاسنٹ کی طرح استعمال کرتی ہیں ان کے لئے شادی کی (Boredon) کو ختم کرنے کے لئے تفریحات درکار ہوتی ہیں بہت جلد تفریحات سے اپنی اہمیت اجاگر ہونے کی بجائے بے وقتی کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے کار کی مشین کی طرح ہر چیز (Duplicate) ملتا ہے ہر خوشی راحت (Spare Parts) میں دستیاب رہتی ہے شادی کے بغیر بھی گزارہ ہو سکتا ہے شادی کے ساتھ بھی چلتی رہتی ہے۔

دیہاتی شادی میں ایمان سب سے بڑا جزو ہے۔

مرد کو کھیتوں کھلیانوں میں سچے ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے گھر پر اسے بچے پالنے والی درکار ہوتی ہے جو اس کی زمین کے جائز وارثوں کو محبت پر پروان چڑھا سکے۔ کہ ماں کو بچے درکار ہوتے ہیں کیونکہ وہ شہری آبادی کی تنگ سی گلی کے تنگ سے مکان میں نہیں رہتا۔ چونکہ شادی یہاں بچی تچھلی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے کی جاتی ہے اس لئے عورت کے لئے یہاں مسائل کم پیدا ہوتے ہیں۔

شہروں میں خاص کر بڑے شہروں میں شادی اور مذہب پر سے لوگوں کا اعتقاد اٹھتا جارہا ہے۔

یہاں شادی نظریات کی وجہ سے کی جاتی ہے۔

تعلیم یافتہ نو مغرب زدہ طبقہ محبت کے ہما کو زیر دام لانے کے لئے شادی کرتا ہے۔

(Ambitions) مرد عورتیں اپنا (Status) اپنی حیثیت بڑھانے کے لئے اس غیر فطرتی بندھن کی سختیاں قبول کرتے ہیں۔

کبھی کبھی شادی خاندانوں کو طاقتور بنانے کے لئے ظہور میں آتی ہے کچھ شہری آبادی جو بوجوہ اپنے خاندانوں سے کٹ جاتی ہے تنہائی کے ہاتھوں مجبور ہو کر شادی پر ایمان لے آتی ہے۔

ایسی شادیاں یورپ اور امریکہ میں کثرت سے ہوتی ہے۔

کچھ شادیاں جنسی تجسس کی تسکین کے لئے ہوتی ہے۔

کہیں ناک کٹ جانے اور کہیں شملہ اونچا کرنے کی سوچ ہوتی ہے شہر کے افراد چونکہ انسان ساختہ چیزوں کے قریب ہوتے ہیں اور فطرت سے کٹے ہوتے ہیں اس لئے انہیں اپنے نظریات بہت پیارے ہوتے ہیں۔ جوں جوں وہ اپنی (Ideology) میں راسخ ہوتے جاتے ہیں دوسروں کے ساتھ میل جول میں مشکلات پیش

اورنگ زیب قاسمی

آنے لگتی ہیں۔ کیونکہ دوسرے شہریوں کو بھی اپنے نظریات عزیز ہوتے ہیں۔ اسی لئے شہری شادی میں ہمیشہ ٹائم بم چھپے ہوتے ہیں۔

ایک طرف بیرونی نظریات کا تصادم۔

دوسری طرف خود اپنے نظریات کا ارتقا؟

نظریاتی شادیوں کے نبھانے کا بوجھ زیادہ تر عورتوں کے کندھوں پر ہوتا ہے اسی لئے تصادم کی صورت میں متاثر بھی وہی زیادہ ہوتی ہیں۔ نظریے کچھ ابلاغ کی وجہ سے کچھ زیادہ میل جول کے باعث سوشل لائف کی وجہ سے جلدی جلدی باطل ہوتے جاتے ہیں۔ عورتیں جو ایک نچلی فکشن کے لئے بنی تھیں زیادہ وقت ان نظریات کے الٹ پلٹ میں گزارتی ہیں۔

پہلے شادی سے فقط ایک امید رکھی جاتی تھی کہ بچے پیدا ہوں گے نسل انسانی آگے بڑھے گی چونکہ انسانی بچہ دیر تک دیکھ بھال چاہتا ہے اور سازگار ماحول میں بہتر پرورش پاتا ہے اس لئے محض امید یہ بھی رکھی جاتی تھی کہ ماں باپ یکانگت اور محبت سے بھی رہیں گے تاکہ بچہ زندگی سے مقابلہ کرنے کے لئے جسمانی ذہنی اور جذباتی طور پر زیادہ مضبوط ہو۔

اب شادی تنہائی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔

جنسی آسودگی کا کم قیمت اور آسان طریقہ ہے۔

سوسائٹی میں اوپر چڑھنے کا زینہ ہے۔

ذرا غور کیجئے کہ کئی صدیوں سے مرد اور عورت نے عقیدے کے طور پر جنس اور محبت کے تمام قدرتی حقوق کی قربانی دے کر بچے کی پرورش کو انسانی زندگی کی معراج سمجھا تھا۔ یہ اس کا ایمان تھا کہ قبر سے ادھر گھر انسان کا محفوظ ترین مسکن ہے۔

لیکن ماڈرن زندگی میں بچہ ایسی زنجیر رکاوٹ اور بے معنی چیز ہے جو زندگی کی گہما گہمی کو بے لطف کر دیتا ہے۔ عورت اس بورنگ کام کے لئے نہ نوکری چھوڑ سکتی ہے نہ (Self) کو تقویت پہنچانے والی کوئی (Activity) ختم کر سکتی ہے لیکن جہاں قدرتی اہمیت ختم ہو جائے وہاں غیر فطری اہمیت بارہا نکھر ہوتی رہتی ہے۔ ماڈرن تعلیم یافتہ شہری عورت کا مقصد حیات دھندلا چکا ہے اس لئے کبھی وہ دفتر میں مرد کی رفاقت کرنا چاہتی ہے کبھی دوست بن کر اس کے غم بٹانا چاہتی ہے کبھی حریف بن کر اسے نیچا دکھانے کے لئے آگے بڑھتی ہے۔ ماڈرن تعلیم یافتہ مرد اس بکھری ہوئی کیفیت سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ وہ اسے اور بکھیر دینا چاہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جب بھی عورت مجتمع ہو جاتی ہے ہمیشہ مرد کی مکمل ہار کا باعث بنتی ہے۔

اب عورت کے لئے شادی کے بعد مسئلے ہی مسئلے ہیں۔ نوکری کرے یا چھوڑ دے۔ خاندان میں رہے کہ الگ ہو کے رہے۔ شوہر کے دوستوں کے ساتھ بنا کر رکھے کہ اپنی لائف کو تقویت دے۔ اب عورت نہ بچے کی پیدائش پر خود خوش ہوتی ہے نہ فیملی پلاننگ والے اسے خوش ہونے دیتے ہیں۔ مرد نے اپنی ایجادات سے اتنا تسلط جمایا کہ اب ہر نیا بچہ (News) نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ دنیا کا ہر کالا گورا پیلا بچہ مرد کی انوکھی ترین ایجاد سے عجیب تر ہوتا ہے۔ اب دنیا میں واقعی کوئی پیغمبر نہیں آسکتا۔ کیونکہ پیغمبروں کو جنم دینے والی مائیں اب صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہیں۔ اب عورت کا وہ ملال دستیاب ہوتا ہے تنے اپنے پیغمبر ہونے کا فکر درپیش

ہے۔

ماڈرن عورت کے لئے شادی فروعی چیز ہے کیونکہ بچہ ماڈرن دنیا کے لئے بوجھ ہے عورت کی اہمیت' حیثیت اور ساکھ اسی وقت بہتر ہوگی جب سوسائٹی کو بچے درکار ہوں گے۔ کیونکہ بچہ مرد اور عورت کے درمیان پل ہے۔ ایک پشت سے دوسری پشت کے درمیان جوڑنے والی کڑی ہے۔ بچہ زندگی کا سب سے بڑا ولن بھی ہے اور ہیرو بھی۔ وہ مرد کا سب سے بڑا رقیب بھی ہے کیونکہ گود کا بچہ ولن کی طرح بڑک نہیں مارتا۔ ہیروئن کو اغوا نہیں کرتا فریبی نہیں ہوتا۔

لیکن دیکھ بھال چاہتا ہے۔ گود کا بچہ فلم نہیں دیکھتا۔ پیسے نہیں مانگتا آپ پھولوں کا گلدستہ لے کر جائیں بیکار رہے گا۔ اس سے ٹیلی ویژن کی باتیں نہیں کی جاسکتیں۔ تعریف کرکے دیکھ لیں وہ توجہ نہیں دیتا۔ محبت کے وہ تمام طریقے جو عام طور پر قول و فعل سے تعلق رکھتے ہیں بچے کو متاثر نہیں کرتے۔

وہ صرف دیکھ بھال پرورش چاہتا ہے۔

اس ایثار میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔

پھر یکدم خزاں آجاتی ہے۔ عورت آئینہ دیکھتی ہے تو سوچتی ہے' اس شادی سے مجھے کیا ملا؟ -----

میں نے اپنی زندگی کی ساری تفریحات کہاں گنوائیں جو میرے ساتھی کے لئے میسر تھیں۔

مرد کی وہ محبت کہاں جو میرا حق تھی۔ وہ منفرد ترقی وہ اہمیت کہاں گئی جو کالج میں مجھ سے دو قدم پر تھی۔

پھر وہ غصے طنز اور نفرت سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتی ہے۔ جس نے بچے کو اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بنایا اور دور نکل گیا۔

وہ اپنے ساتھی سے لڑتی ہے' جھگڑتی ہے' اور اپنے احسانات گنتی ہے۔ قرض مانگتی ہے۔ مرد پریشان مجوب گناہ گار بوڑھا ہو جاتا ہے اور دیوار سے لگتا جاتا ہے۔

حالانکہ شادی کا اصل ولن شوہر نہیں بچہ ہے لیکن بچہ نہ احسان جانتا ہے نہ ماں کی آرزوؤں کو اہمیت دیتا ہے۔ مرد نہ کسی عورت کی آزادی چھین سکتا ہے نہ چھینتا ہے لیکن بچہ ایثار چاہتا ہے۔ پرورش کی بھٹی میں وقت بھی صرف ہوتا ہے اور خوشیاں بھی جلتی ہیں اور جوانی بھی راکھ ہو جاتی ہے۔

شادی کے بند پنجرے میں عورت شیرنی کی مانند رہتی ہے جس کے سامنے مرد کا پھاٹک کبھی کھلتا ہے کبھی بند ملتا ہے۔ لیکن بچوں کی شکل میں اس پنجرے پر چھوٹے بڑے کئی تالے پڑے ہوتے ہیں۔ اگر شیرنی بھاگ جانے کا عزم کرے تو پھاٹک کبھی نہ کبھی ضرور کھلا ملتا ہے۔ اس کی فرار میں مدد کرتا ہے۔ لیکن تالے چاہے سب کھل جائیں ٹوٹ جائیں وہ جہاں بھی جائے گی چھوٹے چھوٹے کھلے کنڈے اس کے دل میں پنجرے کی یاد تازہ رکھیں گے۔

شادی میں جھگڑا مرد اور عورت کا نہیں ہے۔ یہ دونوں سوختہ جان مشیت کے ہاتھوں میں تختہ مشق بنے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں تو (Complimantary) زاویوں کی طرح مل کر رہیں تو ہی زاویہ قائمہ بنتا ہے۔ ایک چھت ہے تو دوسرا ستون بغیر چھت کے ستون بے کار ہے۔ بغیر ستون کے چھت نہیں پڑ سکتی۔ ہاں دونوں مل کر رہیں تو بارش آندھی سے بچنے کا آسرا ہو سکتا ہے۔

جہاں تک بچے کا مسئلہ ہے مرد پر نیچر کی طرف سے اس کا بوجھ مقرر نہیں ہوا۔ دردزہ' بچے کی پرورش

اورنگ زیب قاسمی

اور اس کی آگ میں جلنے کی سزا بلوغت میں ہی تجویز ہوتی ہوگی۔ اس لئے اس مسئلے کا حل اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک انسانی تجویز مشیت الٰہی سے ٹکر نہ لے اور ایسے ٹیکے ایجاد نہ کرے جن کی مدد سے باپ بھی بچے جننے لگیں یا کچھ ایسے (Harmoons) مردوں کے (System) میں داخل نہ کئے جائیں جن کی طفیل یکدم ان میں ماں جیسی محبت نہ جاگ اٹھے۔ یا پھر مرد اور عورت کی (Evolution) سے (Mono Sex) نہ پیدا ہو جائیں جو کینچوے کی طرح خود ہی نر ہوں اور خود ہی مادہ اور افزائش نسل کے لئے کسی دوئی تحریک کا محتاج نہ ہو۔

بالفرض کسی طرح بچے کا مسئلہ طے بھی ہو جائے تو بھی عورت کے مسائل رہیں گے کیونکہ یہ دروپدی کی ساڑھی کی طرح جس قدر کھلتے ہیں اسی قدر اور پیدا ہو جاتے ہیں۔

بالفرض اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو کر عورت اپنے اصل مشن کو بھول کر دانشور' فلاسفر' سائنس دان' انجینئر پیدا کرنے لگے۔ اسے مرد کے برابر کا ہر وسیلہ مل جائے گا۔ مردوں جیسی (Recognition) ملنے لگے۔ تب بھی شاید آخری سطح پر پہنچ کر عورت کا مسئلہ رہے گا

کیونکہ مرد اور عورت کی سائیکی مختلف ہے۔

مرد کی سائیکی تلاش ہے۔

عورت کی سائیکی قیام ہے۔

مرد حضرت ابراہیمؑ کی طرح چاند ستاروں کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ اور اگر اس کا خدا اسے راستہ نہ دکھائے تو واقعی وہ گمراہوں میں سے ہو جاتا ہے۔ عورت تخلیق کرنے والی ہے وہ گھاس کی طرح پھیلتی ہے اور رفتہ رفتہ اس کی جڑیں پاتال میں اترتی جاتی ہیں۔ لیکن وہ بھی گمراہ نہیں ہوتی۔

عورت مرد کا آخری مسئلہ روح کی تسلی کا ہے (Cosmic Conciousness) ہے۔

انسان کہاں سے آیا ہے؟

وہ کہاں چلا جاتا ہے۔

اس ناپائیدار قیام میں اتنی تبدیلی اتنی جدوجہد اور اتنے مسائل کے باوجود سکون اور امن کو قیام کیوں نہیں؟

مسئلے سلجھنے کے باوجود کیوں پھر سے پیدا ہو جاتے ہیں؟ ہر تعمیر میں تخریب کیوں پیدا ہوتی ہے؟ ہر انقلاب میں نئے انقلاب کا بیج کیوں ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہر شخص کو زندگی کے مختلف مقامات پر حیل لنا سے پرے کی آواز آتی ہے ----- یہ آواز اس قدر (Low Frequency) کی ہوتی ہے کہ اس کا زیر و بم انسان کی روح کو بے چین تو کرتا ہے لیکن سنائی نہیں دیتا۔ بچے کی روح اس آواز کی مطابقت میں رہتی ہے اس لئے (Cosmic Concio-usness) کی یہ آواز اللہ کی یہ صدا اسے بے چین نہیں کرتی۔ جوں جوں وہ بالغ ہوتا ہے پھر جوان ہوتا ہے کبھی کبھی اچانک کسی دن کسی رات اس کی روح بے چین ہونے لگتی ہے۔ مسائل سلجھتے جاتے ہیں بے چینی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ گھبرا کر اس آواز کے منبع کو تلاش کرتا ہے ترقی میں۔ ایجادات میں۔ دولت میں۔

عورت کی سائیکی چونکہ قیام ہے وہ اس نہ سنی جانے والی آواز کا تعاقب اسی حد تک کر سکتی ہے جہاں

تک اس کی جڑیں ہوتی ہیں۔ وہ بھی مرد میں اس آواز کا منبع تلاش کرتی ہے کبھی بچوں سے لگ کر آواز حق ہے۔ پھر پوتوں نواسوں کی صورتیں دیکھ کر آواز کو پہچاننے کی کوشش کرتی ہے۔

لیکن آواز چھپتی ہے او جھل ہو جاتی ہے پکڑی نہیں جاتی۔

کئی صدیوں تک عورت نے ہر قسم کی تلاش مرد پر چھوڑ رکھی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ ضرور کسی روز مرد کے سینے میں پسلی بن کر پیوست ہو جائے گی اور جب مرد آواز حق کو پہچان لے گا تو اس کی سائیکی خود بخود مرد کے ساتھ (Cosmic Conciousness) کا حصہ بن جائے گی۔ لیکن اب عورت مایوس ہو گئی ہے اس لئے وہ بہشت میں داخل ہونے کا اپنا شارٹ کٹ بنانا چاہتی ہے۔ مرد بھی اب چوری چوری (Over Night) عورت سے نظر بچا کر اپنے رب کے حضور پہنچنا چاہتا ہے۔

لیکن پو لیبا چاہے دنیا کا ہو چاہے بہشت کا ------ معاشرہ چاہے بابا نوح کا ہو چاہے چین کا جب بھی مرد عورت داخل ہوں گے اکٹھے ہوں گے کیونکہ نکالتے وقت اللہ نے ان کی رفاقت پر مہر لگا دی تھی۔ آدم اب کسی کو رشوت دے کر جنت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہاں چیکنگ سخت ہے اور کم عقل والوں کے داخلے بالکل ممنوع ہیں۔

اب چاہے اور مور کی جبلت مختلف ہو چاہے Biology چاہے ان کی سائیکی علیحدہ علیحدہ ہو ان کے مسئلے ایک وقت میں طے ہوں گے۔ معافی دونوں کو ایک وقت میں ملے گی۔ کیونکہ ان میں گناہ گاری کی قدر مشترک ہے اور یہی انہیں ایک راستے پر چلنے کے لئے ہمیشہ مجبور کرتی ہے۔ اور یہی سانجھا کھاتا برابر کرنے کے بعد وہ جنت میں ساتھ ساتھ پوری آزادی کے ساتھ داخل ہو سکیں گے۔

("چہار سو" راولپنڈی)

اورنگ زیب قاسمی

تراجم

(پشتو سے ترجمہ)
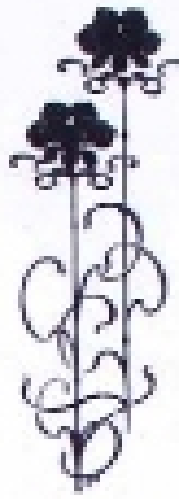
گنہگار

کلو نے جو اس گھر میں آنے سے پہلے کلیم تھا۔ اپنی آنکھوں سے آج کے دن کے حصے کے آخری آنسو پونچھ ڈالے تو اسے یاد آیا کہ سرسوں کے تیل والا دیا اس کی کھٹولی کے نیچے پڑا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ کافی دنوں سے وہ اس کے ساتھ کھیلا بھی نہیں تھا۔ پچھلے دنوں کلو خاصا کی خوش فہمی میں مبتلا ہو چلا تھا اور بچپن کے اس ساتھی دیئے کو بھول چکا تھا اور اب اسے اس کی خوب خوب سزا بھی مل گئی تھی۔

بات دراصل یہ تھی کہ یہ دیا وہ سیانے بابا کے مزار کی چراغی سے اٹھلایا تھا جسے وہ رات کو جلا لیتا اور اس کی لو کے آگے اپنے ایک ہاتھ کی کھلی انگلیوں کا سایہ سامنے کی دیوار پر ڈالتا رہتا جس سے دیوار پر رنگ رنگ کی شبیہیں بنتیں بگڑتیں کلو کو کبھی ڈراتیں اور کبھی وہ ان سے اتنا محظوظ ہوتا کہ کھلکھلا کر وہ قہقہوں سے دیر تک ہنستا رہتا۔ خوش ہوتا رہتا۔ یہ ایک طرح سے اس کی تفریح بھی تھی اور اس کی تنہائی کا مداوا بھی۔

ویسے تو جج صاحب کے بنگلے کے عقب میں بنی اس کوٹھڑی میں بجلی کا ایک بلب بھی لگا تھا جو ضرورت کے وقت جلایا جاسکتا تھا لیکن اس کی روشنی سے وہ یوں اپنی مرضی سے کھیل نہیں سکتا تھا۔ دوسرے بجلی کا وہ بلب کافی اونچا تھا اور اتنی اونچائی پر لگا کلو جیسے چھوٹے قد کاٹھ کے بچے کی پہنچ سے کافی دور تھا اتنا دور جتنا کہ وہ آج اپنے بچپن کی سرحدوں سے دور بھاگا تھا۔ وہ سرحدیں جنہیں وہ اب چھونا بھی گناہ سمجھ رہا تھا۔ وہ پلک جھپکتے میں اچانک جوان ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے بچپن کو خود ہی پرے دھکیل دیا تھا۔ اس نے اپنے ہر ایسے احساس کا گلا گھونٹ دیا تھا جو اسے ایک بچہ ہونے کے ناطے اپنی کم عمری کا احساس دلا سکے۔

اس نے جج صاحب کے بنگلے کے عقب میں بنی اس کوٹھڑی کا اکلوتا دروازہ اندر سے بند کیا ہوا تھا جس میں وہ رات کو سویا کرتا تھا۔ وہ اپنے آخری آنسو پونچھ چکا تھا۔ اس کی دبی دبی ہچکیاں بھی کب کی بند ہو چکی تھیں۔ وہ اپنے بستر سے نیچے کو جھک کر ٹھٹک گیا لیکن پھر کچھ سوچ کر بستر سے زمین پر کود پڑا۔

کمرے میں اندھیرا تھا مگر اس کے اندر کا اندھیرا اس سے بھی زیادہ گمبھیر اور بھیانک تھا۔ اتنی دیر میں اس کے بچے ذہن میں جانے کتنے ہی کچے پکے خیالات در آئے تھے۔ اپنی طبعی عمر سے کئی گنا بڑے۔ وہ یکدم سے جیسے بالغ آدمی بن چکا ہو۔ پورا جوان آدمی۔ اس نے اپنے بالغ بازوؤں کے سخت اور کرخت ہاتھوں کی جوان انگلیوں سے رات کے اندھیرے میں پلنگ کے نیچے ٹٹول کر وہ دیا ڈھونڈ نکالا۔ جسے وہ رکھ کر بھول چکا تھا۔ وہ بھی تو کتنا پاگل تھا۔ اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں اپنی بوسیدہ کھٹولی کے نیچے کتنے ہی ٹوٹے پھوٹے وہ کھلونے جو جج صاحب کے پوتے پوتیاں توڑ کر پھینک دیتے تھے سارے اکٹھے کرکے وہ اپنی کھٹولی کے نیچے سنبھال کر رکھ لیتا

اورنگ زیب قاسمی

تھا۔ کبھی کبھار وہ رات کے اندھیرے میں جب اکیلا ہوتا تو ان کھلونوں کے ساتھ کھیلا بھی کرتا تھا۔ چنانچہ ان تمام کھلونوں کے اندر سے اس نے وہ دیا نکالا جو کافی راتوں سے جلایا نہیں گیا تھا اس نے شہادت کی انگلی سے چھو کر دیئے میں پڑے تیل کا اندازہ لگایا۔ میلے کچیلے چکٹ تکیے کے نیچے سے ماچس کی ڈبیہ نکالی۔ اسے لگا جیسے ڈبیہ میں ایک بھی ثابت تیلی نہیں ہوگی۔ اسے آج ہر چیز بجھی بجھی لگ رہی تھی۔ دیا ہاتھ میں تھامے وہ زمین سے اٹھا اور بستر کے پاس تھوڑی دیر کو کھڑا رہا۔ جج صاحب کے ہاں بات بے بات چھوٹے بچوں کی مار تو وہ روز کھایا کرتا تھا اور رات کو اپنے بستر پر لیٹ کر یا بیٹھ کر دن بھر کی تھکاوٹ اور جھلاہٹ کا غبارہ آنسوؤں سے دھولیتا تھا کیوں کہ جن باتوں پر اسے مار پڑا کرتی تھی ان میں سے اکثر کام اور واقعات وہ ہوا کرتے تھے جن میں اس کا اپنا قصور نہیں ہوتا تھا اور اگر کوئی غلط کام اس سے سرزد ہوا بھی ہوتا تو وہ جج صاحب کے پوتے پوتیوں کی شرارتوں سے کم تر درجے کا ہوتا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ ان بچوں کے کئے کی سزا بھی کلو کو بھگتنا پڑتی جنہیں وہ بچوں کے پارک میں کھیلنے لے جایا کرتا تھا۔ یہ تو تھا تقریباً" روز کا معمول لیکن جو کچھ اس کے ساتھ آج ہوا وہ بالکل ہی الگ نوعیت کا تھا۔

دراصل کلو چند روز سے انجانے میں جج صاحب کے پوتے پوتیوں کے اتنے قریب جا چکا تھا کہ وہ اسے اپنا ہم عمر ہی نہیں بلکہ اپنے ہی جیسا ایک بچہ سمجھنے لگے تھے اسی لئے تو وہ ان کے کھیلوں میں برابر کا شریک ہونے لگا تھا۔ ویسے تو کلو کے روزانہ کے کاموں کی فہرست روز روز بدلا کرتی تھی۔ کبھی تو وہ بنگلے میں جھاڑ پونچھ کرتا نظر آتا کبھی چھوٹے موٹے سودے سلف لانے پر مامور ہو جاتا تو کبھی استری اور جوتے صاف کرنے کا کام اس کے سپرد کر دیا جاتا مگر ان سب کاموں کے علاوہ یہ اس کی ایک طرح کی مستقل ڈیوٹی تھی کہ شام کے وقت کالونی کے بچوں والے پارک تک جج صاحب کے پوتے پوتیاں حفاظت سے گھر سے لے جاتا اور جب وہ کھیل کر تھک جاتے تو انہیں اسی طرح سے گھر لے بھی آتا۔ اس کی گود میں جج صاحب کے کوئی نہ کوئی چھوٹا پوتا پوتی ضرور ہوتے۔

وہ خود بھی تو دس گیارہ سال کا بچہ ہی تھا مگر تین چار سال سے وہ یہ ڈیوٹی بڑی باقاعدگی سے بغیر کسی بھول چوک کے نبھا رہا تھا اور آج اسے خیال ہی نہیں رہا کہ جج صاحب کا دس گیارہ سال کا پوتا وسیم کلو کو پتہ چلے بغیر پارک سے گھر تک اکیلا چلا آیا تھا پارک اور بنگلے کا درمیانی فاصلہ اتنا بڑا تو نہ تھا جتنی بڑی سزا اسے اس لاپرواہی پر ملی تھی۔ اتنے چھوٹے سے گناہ کی اتنی کڑی سزا کہ آج وہ اچانک خود کو ایک پورا جوان آدمی سمجھنے لگا تھا۔ ہوا یہ کہ جونہی وہ منی کو گود میں اٹھائے بڑے چھوٹے بچوں کو ساتھ لئے گھر میں داخل ہوا تو ایک بپھری ہوئی ناگن کی طرح وسیم کی ماں اس پر جھپٹ پڑی۔ اپنے منہ پر زنانے وار تھپیڑوں کی یلغار میں کلو کے کانوں نے سنا۔

" لو! اسے دیکھو۔ اتنا بڑا بھینسے کا بھینسا۔ بچوں میں بچہ بن کر کھیلتا ہے۔ چوکیدار جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ منی کو بھی یونہی زمین پر بٹھا کر خود کھیلنے لگ جاتا ہے۔ تجھے اس لئے نوکر رکھا گیا ہے کہ تو بچوں کے ساتھ مل کر کھیلے؟ تیری یہ مجال؟؟ تجھے پارک میں کھیلنے کا حق کس نے دیا ہے؟ تو پارک میں جا کر ہمارے بچوں کی طرح کھیلنے لگا اور یہ بھول گیا کہ معصوم بچہ چل کر کہاں گیا؟؟ اگر وسیم گھر نہ پہنچتا تو ..... ؟؟"

اور کلو نے جس کا اپنا نام کلیم تھا جج صاحب کے بنگلے کے عقب میں بنی کوٹھڑی میں دھری کھٹولی کے نیچے

بڑے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کے بیچ میں سے وہ دیا نکلا جو وہ سیانے بابا کے مزار سے کافی عرصے پہلے اٹھا لایا تھا۔ اس نے ماچس کی ڈبیہ میں پڑی تیلیوں میں سے ٹٹول کر ایک تیلی نکالی۔ دیئے کی بتی کو دکھائی۔ دیا روشن ہوا تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اس نے دیوار پر پڑے اپنے چہرے کے مہیب سائے پر بڑی سی ناک کے نیچے مٹھی بھرائی بڑی بڑی مونچھیں دیکھیں۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ کا سایہ دیوار پر ڈالا تو مختلف شیپوں کی جگہ پانچ الگ الگ سائز کی انگلیوں کے چھوٹے بڑے سائے اسے دکھائی دیئے۔ اس نے محسوس کیا کہ جس طرح ایک ہاتھ کی پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح ان کے سائے بھی چھوٹے بڑے ہوا کرتے ہیں۔ اس کو اپنا آپ چھوٹے قد کاٹھ کا ایک بونا سا مگر پورا جوان آدمی دکھائی دیا۔ جس کے ذمے ایک کام یہ بھی تھا کہ جج صاحب کے پوتے پوتیوں کو کالونی کے بچوں والے پارک میں کھیلنے لے جایا کرے۔ خود پارک میں نہ کھیلے کہ پارک میں اسے کھیلنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔

("معیار" کراچی)

قیوم مروت
ترجمہ: فاروق سحر
(پشتو سے ترجمہ)

بغاوت

پورے قصبے میں قبرستان کی سی پراسرار ویرانی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے نیند کی دیوی نے سب گھروں پر اپنی کالی چادر پھیلا رکھی ہو۔ تھوڑی دیر پہلے بجلی کی کڑک، رعد کی گڑگڑاہٹ اور شمال کی طرف سے آنے والی ہوا کی سرسراہٹ نے کچھ ایسی خوفناک کیفیت پیدا کر رکھی تھی، جیسے کوئی کالا جھکڑ دو گلیوں میں دیوانہ وار بھاگ رہا ہو لیکن اب طوفان میں کچھ کمی آ چکی تھی۔

ایک گھر کا دروازہ انتہائی آہستگی سے کھلا۔ ایک سایہ چوروں کی طرح اس میں سے برآمد ہوا اور لمبی گلی میں سرکنے لگا کچھ دیر پہلے اس کے اندر بھی ایک طوفان برپا تھا، لیکن اب اس کے قدموں سے قدرے اطمینان کا پتہ ملتا تھا۔

یہ ایک عورت تھی جو ایک لمبی چوڑی چادر میں پوری طرح ملفوف تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور یاس کا تلخ دھواں بھر گیا تھا۔ وہ گلی کے نکڑ پر گزرنے والی ندی کے پل پر آئی جو لکڑی اور مٹی کا بنا تھا۔ اس نے سوچا ------ "شاید میں اس ندی کو پھر کبھی نہ دیکھ سکوں۔" یہ وہی جگہ تھی جہاں بچپن میں وہ اپنی ہجولیوں کے ساتھ کھیلتی، کودتی، گدکڑے لگاتی تھی۔ کچھ آگے ایک باغیچہ تھا جس کے اردگرد لکڑیوں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ اس نے باغیچے کو بھی اسی حسرت آمیز نظر سے دیکھا جہاں وہ اپنی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی گڑیا گڈے کے بیاہ کا کھیل کھیلتی تھی اور دف بجاتی تھی۔

گلی کے آخر میں ایک مکان کے سامنے وہ رک گئی اور اس کے دروازے پر بے تحاشا دستکیں دینا شروع کر دیں۔ اس سے رات کا کافی حصہ گزر چکا تھا۔ خوابیدہ لوگ کئی کروٹیں لے چکے تھے۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہو اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟ یہ میں کس کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہوں؟" وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔ "یہ تو گلبانہ کا گھر ہے، مجھے تو اس عورت سے سدا نفرت رہی ہے، یہ آج اس کے گھر کے سامنے میں کیسے کھڑی ہوں؟ کیوں؟ ---- میں اس سے نفرت کیوں کرتی رہی؟ اور آج مجھے کون سی مجبوری یہاں لے آئی؟" اس کا ہزاروں سوالات کا ایک پہاڑ بن کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

اس نے ماضی کے اندھیرے کنویں میں جھانک کر کچھ یادیں ٹٹولنی شروع کر دیں۔ اسے یاد آیا کہ ایک دن جب وہ ننگے سر گلی میں بھاگ رہی تھی تو اس کا خاوند اس کے پیچھے بھاگتا ہوا اس پر سنگ باری کر رہا تھا۔ وجہ

اورنگ زیب قاسمی

یہ تھی کہ قصبے میں چاچا ستار کے بیٹے کی شادی تھی اور عورتوں کی محفل میں اسے وقت کا احساس نہ رہا اور گھر ذرا دیر سے پہنچی تو خاوند نے' جو بھرا بیٹھا تھا' اسے اس کی سزا دینے کے لئے اس کے پیچھے چھرا اٹھائے تو وہ واپس گلی میں بھاگ گئی۔ خاوند نے اس کا پیچھا کیا اور وہ بھاگتے بھاگتے واپس شادی والے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ جب اس کی نظر دروازے پر پڑی تو سامنے ادھیڑ عمر' سرخ و سفید رنگ کی موٹی گلبانہ کھڑی تھی۔ اس کا یوں حشر دیکھ کر وہ مسکرانے لگی۔ اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ "ڈائن یہ ویسے بھی مجھے اچھی نہیں لگتی' اور آج مجھے اس حال میں دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اس کی جی میں آیا کہ اس سرخ گالے کو ذبح کر کے اس کی تکا بوٹی کر ڈالے لیکن خاوند کے تعاقب اور چھروں کی بوچھاڑ نے اسے ایسا کرنے کا موقع نہ دیا۔

پھر اسے وہ دن یاد آیا' جب اس نے کنویں سے پانی نکالا تو بوکے میں ایک مردہ چوہا بھی آ رہا۔ اس دن پھر اس کے خاوند پر جن آگیا تھا۔ "اچھا' تو تو ہمیں اب تک چوہے کا سرکہ پلاتی رہی ------ !" اس کا دل دہل گیا۔ "اللہ قسم! اگر میں نے اس میں چوہا ڈالا ہو' وہ خود کہیں گر گیا ہو گا ------ اور پھر ------ اتنے گہرے کنویں میں چوہا نظر کہاں آتا ہے؟ خدا کے لئے مجھے مت مارو' میں بے قصور ہوں ------"

لیکن اس کے خاوند پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا' اس نے انار کے درخت سے ایک چھڑی توڑی اور اس نے اس کا خوبصورت جسم داغ داغ کر دیا۔ مار سہہ کر جب اچانک اس نے دروازے کی طرف دیکھا تو گلبانہ کا سرخ چہرہ اسے مسکراتا دکھائی دیا۔ وہ بل کھا کے رہ گئی۔ "یہ عورت کیوں مجھ پر ہر وقت ہنستی ہے؟" اس نے کچھ سوچنا چاہا' لیکن چھڑی کے پے بہ پے واروں نے اس سے سوچ کی ساری صلاحیتیں چھین لی تھیں۔

گاؤں کی اکثر عورتیں اس سے پوچھا کرتی تھیں۔ "تمہیں گلبانہ سے خواہ مخواہ کی چڑ کیوں ہے؟ اس نے تمہارے ساتھ کیا برائی کی ہے؟" ------ لیکن وہ کسی کو اس کی وجہ نہ بتا سکی۔

پھر اسے وہ دن یاد آگئے' جب اس کا خاوند بہانے بہانے سے اس کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑتا اور اسے رات کو نیند نہ آتی تھی۔ وہ کم خوابی کا شکار ہو گئی اور جب کبھی اس کی آنکھ لگتی تو وہ یہی خواب دیکھتی کہ اس کا خاوند اس کے بدن کا گوشت نوچ رہا ہے۔ کبھی دیکھتی کہ اس کے خاوند نے چھت کی کڑی سے اس کی چٹیا رسی سے باندھ کر اسے چھت سے لٹکا دیا ہے۔ وہ چیخ رہی ہے' چلا رہی ہے' مگر اس کے خاوند کو اس پر کوئی ترس نہیں آتا۔ اس حال میں وہ دھڑام سے چارپائی سے نیچے آ رہتی اور وہ جاگ اٹھتی اور پھر صبح ہونے تک خوف اور وہم کے بخار میں تپتی جاگتی رہتی۔

ایک دن اس کے خاوند نے غصے سے کہا۔ "یہ صحن اتنا گندا کیوں ہے؟ صفائی کیوں نہیں کرتی؟" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "میں تو ہر وقت جھاڑو کرتی ہوں اس میں' لیکن بیت جھڑ ہے' درخت مٹھیاں بھر بھر پتے پھینکتے ہیں۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ ادھر جھاڑو پھیری' ادھر دوسری طرف پھر اور پتے گر پڑے" ------ لیکن وہ کہاں ماننے والا تھا۔ اس نے اسے اس وقت پھوڑا جب اس کے دو دانت توڑ کر رکھ دیئے۔

اس دوران جب اس کی نظر پھر دروازے کی طرف گئی تو گلبانہ اسی طرح زہر خند کھڑی تھی۔ اسے خاوند سے زیادہ گلبانہ پر غصہ آیا اور چاہا کہ ایک جست لگا کر اس کا گلا دبوچ کر اسے ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کر دے' لیکن خاوند کے مکوں اور لاتوں نے اسے ایسا کرنے نہ دیا۔

اورنگ زیب قاسمی

اس نے سوچا "میرا خاوند مجھے کیوں مارتا تھا؟ جبکہ میرا کوئی قصور بھی نہ ہوتا تھا۔ ہماری شادی کو پانچ سال ہو گئے۔ پہلے تین سال تو اس نے مجھے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ پھر اس کے بعد دو سال تک وہ میرا دشمن کیوں بنا رہا؟ شاید اس لئے کہ میری گود ہری نہ ہوئی لیکن نہیں ------ اولاد کی تو اس نے کبھی خواہش ہی نہیں کی تھی۔ اس نے تو اسی دن سے آنکھیں پھیلی تھیں جب ایک دن وہ گھر میں ایک اٹھارہ سالہ نوجوان کو لے کر آیا تھا' اور مجھے اس کے سامنے لا کر میرا گھونگٹ اٹھا کر اس سے پردہ نہ کرنے کو کہا اور جب میں نے انکار کیا تو وہ آگ بگولا ہو گیا اور پھر میں نے اس سے پردہ ختم کر لیا۔

پھر ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ "وہ لڑکا فلاں گھر میں اکیلا بیٹھا ہے اور تمہیں بلا رہا ہے۔" یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں رونے لگی' لیکن اس نے مجھے اتنا مجبور کیا کہ مجھے وہاں جاتے ہی بنی۔ جب میں اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی تو کچھ دیر تو وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے میرے ساتھ غیر اخلاقی حرکتیں شروع کر دیں۔ میں نے سامنے بیٹھے ہوئے اپنے خاوند کی طرف دیکھا' اس خیال سے کہ شاید اسے کچھ غیرت آجائے' لیکن اس کے چہرے پر کچھ اور ہی رنگ تھا' وہ ہم دونوں کی حرکات سے لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن میرے اندر کی غیرت بھڑک اٹھی اور اس لڑکے کو ایسا تھپڑ رسید کیا کہ گال پر ہاتھ رکھے نکل بھاگا لیکن اس واقعے کے بعد سے بد نصیبی میرا مقدر بن گئی میرا خاوند میرا دشمن بن گیا۔

چند دن تو وہ روتا رہا اور کہتا رہا۔ "تمہاری وجہ سے میرا محبوب مجھ سے جدا ہو گیا اور ناراض ہو کر چلا گیا ہے' خدا جانے کہاں اور کس حال میں ہو گا؟" اور پھر رفتہ رفتہ اس نے اپنے اندر کا سارا غصہ مجھ پر نکالنا شروع کیا۔

وہ یادداشتوں کے اژدہوں سے سہم گئی اور اس نے ان سے پیچھا چھڑانے کی خاطر ایک دفعہ پھر گلبانہ کے دروازے پر دستکوں کی بارش شروع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد جب گلبانہ نے دروازہ کھولا تو حیرت سے بت بنی دروازے کے کھڑی رہ گئی۔

"فاطمہ' تم ------؟"

"ہاں گلبانہ! میں ---"

گلبانہ نے کہا۔ "فاطمہ تم تو مجھ سے نفرت کرتی تھیں' آج اور ------ اس وقت ------ یہاں کیسے ------؟"

گلبانہ! مجھے اپنی ماں' والدین اور لوگوں نے یہ سکھایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے بعد دوسرا درجہ خاوند کا ہے ------ خاوند جیسا بھی ہو' بیوی کو اف تک نہیں کرنا چاہیے' لیکن تم نے ایسا ظلم کیا کہ اپنے خاوند کا قتل کیا' چودہ سال قید کاٹی ------ اسی لئے میں تم سے نفرت کرتی تھی' تم مجھے عورت کے ماتھے پر ایک بدنما داغ نظر آتی تھیں۔"

"میں بھی یہی سمجھتی تھی فاطمہ!" گلبانہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "میرا خاوند مجھ پر بے پناہ مظالم ڈھاتا تھا اور جب ظلم اپنی حد سے بڑھ گیا اور میرے ماں باپ سے بھی میری یہ حالت دیکھی نہ گئی تو پھر مجھے اور کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔ آخر میں بھی انسان تھی' بغاوت پر آمادہ ہو گئی۔"

"ہاں گلبانہ! ------" فاطمہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو' ظلم اور بے

افساق جب اپنی سرحدوں کو پار کر لیتی ہے تو برداشت ختم ہو جاتی ہے اور انسان باغی ہو جاتا ہے ------ " یہ کہہ کر فاطمہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ------

" تم رو رہی ہو ------ ؟ "

فاطمہ مسلسل روئے جا رہی تھی اور پھر جب روتے روتے اس نے چادر سے ہاتھ باہر نکالے تو اس کے دونوں ہاتھ خون سے سرخ تھے۔ اس کا ایک ہاتھ خالی تھا دوسرے میں خون آلود خنجر ------ اور پھر اس نے گلبانو کو یوں دیکھا' جیسے کہہ رہی ہو ------ " میں بھی آج باغی ہو گئی ہوں۔ "

("اقدار" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

افضل احسن رندھاوا
ترجمہ: عائشہ رندھاوا

(پنجابی سے ترجمہ)

جفتی

گھوڑوں کو مالش کروا کے دانہ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے ڈالا۔ میرا مشکی گھوڑا پیار سے سہلا رہا تھا۔ میں نے اسے تھپکی دی تو گھوڑا اپنا دایاں سم زمین پہ مارنے لگ گیا۔ میں نے پانی کی بالٹی اس کے سامنے رکھی تو اس نے اپنے نتھنے پانی میں ڈبو کے پھڑ پھڑا مارا تو میں نے جان لیا کہ اسے پانی نہیں چاہئے۔ نوکر سے گھوڑوں کو پچھاڑیاں ڈلوا کے میں اپنے ٹینٹ کی طرف چل پڑا۔ میلے کا شور جیت کی اس رات کا سینہ چیر رہا تھا۔ گھوڑوں کی کاٹھی کاٹھے ادھق ہنہناہٹوں کے بادلوں کی گرج نے جیسے ساری منڈی کو صرف نروں کا طویلہ بنا کے رکھ دیا تھا۔ صبح میری اور مرادی بلوچ کی سیکشن (Section) نے فائینل کھیلنا تھا۔ فائینل میں تو ہمیشہ ہی مرادی کے ساتھ پہنچ جایا کرتا تھا مگر آگے ------ آگے مرادی نے مجھے کبھی جیتنے نہیں دیا تھا۔ اور صبح پھر میرا اور مرادی کا مقابلہ تھا۔ میں اس مقابلے کے لئے بہت تیار تھا اور مجھے یقین بھی تھا کہ اس دفعہ مرادی مجھ سے یوں آسانی کے ساتھ نہ جیت سکے گا پر ہار جیت تو رب سچے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

مرادی بلوچ بار کا مشہور نیزہ باز تھا۔ اس کا باپ رحمت بلوچ بھی سنا ہے کہ اپنے وقت کا بڑا نیزہ باز تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ رحمت بلوچ تیس برس کھیلا مگر ایک بار کوئی مائی کا لعل اسے جیت نہ سکا۔ سارے پنجاب میں ساندل بار کے رحمت بلوچ کے سانگ مارنے کی بڑی دھوم تھی۔ پھر ایک روز اچانک اس نے نیزہ بازی میں اس وقت چھوڑ دی۔ جب اس کے فن کا سورج نصف النہار پر تھا اور پورے پنجاب میں اس کو ناقابل شکست تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس کا بیٹا مرادی کھیلنے لگ گیا۔ سنا ہے کہ جب مرادی نے میلے منڈیوں میں بڑے مشہور شہسواروں اور نیزہ بازوں کے ساتھ کھیلنا شروع کیا' تب اس کی عمر صرف پندرہ برس تھی۔ پہلی بار جب وہ لائل پور کی منڈی میں دوڑا تو اس کے نیچے رحمت خان کا مشہور نیزہ گزار گھوڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں رحمت خان والی خوبصورت سانگ تھی۔ اور جن مشہور ' نیزہ بازوں کو رحمت خان بڑی محنت مشقت سے ہرایا کرتا تھا' ان کو مرادی نے بڑے آرام سے مار لیا' جیسے وہ لڑکا رحمت سے بھی بڑی بلا ہو۔ وہ دن اور آج کا دن' مرادی نے کبھی کسی سے شکست نہیں کھائی تھی۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی شہرت بڑھتی گئی اور فن نکھرتا گیا۔

میں نے جب پہلی بار مرادی بلوچ کو کھیلتے دیکھا تھا' تب میں بچہ تھا اور اپنے چاچا کے ساتھ امرتسر والی منڈی دیکھنے گیا تھا۔ میرے چاچا کو بھی نیزہ بازی کا بڑا ٹھرک تھا اور وہ خود بھی بڑی اچھی سانگ مار لیا کرتا تھا مگر

اس برس تو اس کی ٹیکشن فائینل تک بھی نہ پہنچ سکی تھی ۔ مہاراجہ پٹیالہ کی ٹیکشن میرے پچا کی ٹیکشن کو بڑے آرام سے مار کر فائینل میں پہنچ گئی۔ مجھے ابھی بھی پٹیالے کی ٹیکشن یاد ہے فائینل تک ان کے آگے کوئی ٹیکشن نہ ٹھہری مگر فائیل میں وہ ٹیکشن بھی مار کھا گئی' پتہ ہے' کس سے ؟ مرادی بلوچ کی ٹیکشن سے۔ تب پہلی بار میں نے مرادی بلوچ کو دوڑتے دیکھا تھا اور تب ہی میں نے اپنے دل میں یہ عہد کیا تھا کہ ایک نہ ایک دن میں رب سچے کے حکم سے' مرادی کو ماروں گا۔ دس پندرہ برس کی محنت شاقہ کے بعد جب میں پہلی بار اپنی ٹیکشن لے کر مرادی کے مقابلہ میں کھیلا تھا تو مرادی کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اس دفعہ جیتنے کے بعد مرادی مجھے ملا تو اس نے مجھے سینے سے لگا کر کہا تھا۔

" نوجوان ! تمہارے گھوڑے پر بیٹھنے کا ڈھنگ اور سانگ مارنے کا انداز' تو بہت بڑے نیزہ بازوں کا سا ہے۔"

اس کے الفاظ کی شفقت ' لہجے کے فخر اور سرپرستانہ رویے پر میرے کان جلے اور شرمساری سے سرخ ہوگئے۔ میں نے بڑے صاف لفظوں میں اپنے دل کی بات مرادی سے کہہ دی۔ میں نے مرادی سے کہا تھا۔ " مرادی خان ! کسی دن آخر میں تمہیں مار جاؤں گا۔ "

یہ سن کر مرادی بلوچ بڑے زور سے ہنسا تھا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا تھا۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا' مجھے بازو سے پکڑ کر بولا تھا " بندے کا کام ہے سانگ مارنا' آگے کلہ (کیلا) تو اللہ سائیں کے حکم سے لے جایا کرتے ہیں ------ اس میں بندے کی کیا بڑائی ؟ "

" جو بھی ہو! " میں اسے اپنا آپ دکھانا چاہتا تھا شاید۔ " تمہیں ایک روز ماروں گا ضرور ۔"

وہ گھڑی بھر تو میری آنکھوں میں چپ چاپ دیکھتا رہا پھر بولا تھا۔ " مجھے بھی لگتا ہے کہ تم مجھے کھیل سے ہٹاؤ گے ضرور۔ بس میں ایک بار کسی سے ہار گیا تو کھیلنا چھوڑ دوں گا ہمیشہ کے لئے۔"

اور پانچ برس گزر گئے۔ میں مرادی بلوچ کو کبھی کسی میدان میں نہ ہرا سکا۔ مگر میرا اس سے مقابلہ بڑا کٹھن ہوا کرتا۔ ان دنوں دوسری مشہور سیکشنوں میں نواتوں' نولوں' دڑکوں اور رجوعہ کے سیدوں کی ٹیکشن بہت اچھی تھی انہیں تو میں بڑے آرام سے مار لیا کرتا تھا مگر آگے فائینل میں مرادی بلوچ میرے پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹکنے دیتا تھا۔ دیکھنے والے تو کہتے ہیں کہ میں سانگ تو مرادی سے بھی ستھری مارتا ہوں۔ مگر بات تو ساری نصیبوں پر جاکے ختم ہوتی ہے اور نصیب مرادی بلوچ کے بہت ہی اچھے تھے۔

اس روز میں گھوڑوں کو اپنے سامنے مالش کرواکے' انہیں دانہ خود اپنے ہاتھوں سے ڈال کر' اپنے خیمے کے سامنے آکر کھڑا ہی ہوا تھا کہ مرادی آگیا' وہ نماز پڑھ کر آرہا تھا۔

" بیٹھ جا بھائیا!" میں نے کہا " نئے تازہ شدہ حقے کا ایک آدھ کش لو ------ اور سناؤ کیا حال ہے ؟ "

چارپائی پر میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس نے حقے کا ایک لمبا کش لیا اور بولا " خیر ہے اللہ سائیں کی۔ " پھر اپنے کندھے والی سفید صاف سوتی چادر سے اس نے اپنی گردن اور چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا " اس دفعہ تو تم بڑی فارموں میں ہو۔"

مجھے اس کے سرپرستانہ رویے سے ہمیشہ چڑ رہی تھی۔ پھر میں صبح ہونے والے فائینل مقابلے کی وجہ سے بڑے اضطرار اور جوش میں تھا تاہم میں نے بڑے ٹھنڈے دماغ کے ساتھ بڑی نرمی سے مرادی کو کہا " صبح سب پتہ چل جائے گا۔"

مرادی نے حسب معمول ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور بولا : " جسے اللہ کی ذات دے "

اگلے روز فائینل میں مقابلہ میری اور مرادی کی ٹیکشن کے درمیان تھا۔ عام دنوں سے ہجوم دوگنا تھا۔ گھڑ دوڑ کے میدان کے دونوں طرف خلقت کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ دائیں طرف درمیان میں بنی ہوئی سٹیج پر حاکم اور بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ لاٹ صاحب اس میلہ میں انعام تقسیم کرنے آیا' سب سے اونچی کرسی پر براجمان ہوا تھا۔ دونوں سیکشنیں میدان میں نکلیں۔ مرادی بلوچ کی ٹیکشن کے چاروں گھوڑے نقرے تھے۔ سفید شلواروں پر بوسکی کے کھلے کرتے پہنے سروں پر گلابی پگڑیاں باندھے بلوچ سوار بڑے خوبصورت لگ رہے تھے' مرادی کے ہاتھ میں پکڑی نئی رنگ برنگی سانگ اور اس کے پیچھے نئی ولائتی سپات کا چمڑا خوب چمک رہا تھا۔ اس کا تازہ دم' نہایا دھویا نقرہ' نئی دلہن کی طرح بھلے چھلے زیوروں سے سجا ہوا تھا۔ میں نے اپنے سواروں کو ہدایتیں دیں اور گھوڑے کو میدان میں دوڑ کی پٹی کے ساتھ ساتھ لے چلا۔ اگلی طرف سے مرادی بھی گھوڑے کو پٹی کے ساتھ ساتھ کام میں لئے آرہا تھا۔ میرے پاس پہنچ کر اس نے گھوڑا روکا۔ دونوں گھوڑے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنہنائے۔ مرادی مضطرب سا' گمبھیر لہجے میں بولا:

" احمد خان ! ہزاروں دفعہ ہزاروں میدان دوڑا ہوں مگر آج پہلی بار اس میدان میں خوف آرہا ہے ۔"

میں نے اسے ایک ماہر فن کا نخرہ ہی جانا اور خوش دلی سے کہا۔ " بھلے میرے ! گھوڑے اور مرد کو تو نت میدان پڑے ہی رہتے ہیں ------ خوف کیسا ؟ "

" ہاں ! " اس نے کہا۔ جو بچی سرکار کرے ۔"

مقابلہ شروع ہوا۔ مرادی نے حسب معمول دوڑنے میں پہل کی۔ اس کا گھوڑا اٹھا جیسے کمان سے تیر نکلا ہے۔ مرادی دائیں رکاب میں آرہا تھا۔ اوھر اس نے سانگ سنبھالی تولی' اوھر اس کا گھوڑا کلے کے سر پہ جا کے کر سے بالکل زمین کے ساتھ لگ گیا۔ مرادی نے حسب معمول نعرہ مار کر سانگ سے کلے کی شست لی کانٹی میں سیدھا ہوتے ہوئے جب اس نے سانگ گھمائی تو کلہ سانگ میں پرویا پڑا تھا۔ واہ واہ کا شور اٹھا ------ اس کا دوسرا سوار دوڑا پھر تیسرا اور پھر چوتھا ------ اور دوڑ جاری رہی۔ پہلی دوڑ میں میری اور مرادی کی ٹیکشن کے پوائنٹ برابر تھے۔ دوسری دوڑ میں میرے ایک بہت ماہر نیزہ باز نے دو پوائنٹ گنوا دیئے۔ اب ہار میرے سامنے کھڑی تھی اور خلقت کو بھی مرادی کے جیت جانے کا یقین ہو چلا تھا۔ مرادی نے جوش بھرے لہجے میں اپنے دوڑنے والے سوار کو للکارا۔ میری تو جیسے سانس ہی رک گئی مگر اس کا سوار زیادہ اتھو میں ففاول کر گیا۔ مرادی کا چہرہ ہاتھ آئی فتح کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر غصے سے سرخ ہو گیا۔ مگر میری جان میں جان آگئی کہ دو پوائنٹ مرادی کا سوار بھی گنوا چکا تھا۔ اب تک کا معاملہ پھر برابر تھا۔

تیسری دوڑ شروع ہوئی۔ لاٹ صاحب کرسی پر بیٹھا اضطراب اور بے صبری سے پہلو بدل رہا تھا کیونکہ اس دوڑ میں بھی دونوں ٹیکشن برابر کے پوائنٹ حاصل کر رہی تھے۔ پھر چوتھی دوڑ میں بھی ایسا ہی ہوا تو لاٹ صاحب نے کمشنر بہادر کو بے صبری کا اشارہ کیا۔ کمشنر نے ایک نظر پانی سے بھیگ رہے سواروں' رانوں' کمر اور چھاتی پر جھاگ سے بھرے اور بارش کی طرح پسینہ برساتے ہوئے گھوڑوں اور پتھر کے بتوں کی طرح دھوپ میں کھڑی خلقت پر ڈالی اور کچھ سوچتے ہوئے مقابلہ کے منصفوں کو بلایا' ساتھ مجھے اور مرادی بلوچ کو بھی۔

اورنگ زیب قاسمی

منصفوں سے اس نے پوچھا: "ہاں بھئی ' اب یہ فیصلہ کس طرح ہوگا ؟"

منصفوں نے عرض گذاری: "عالی جاہ! سیکشنیں اکٹھی دوڑیں یا علیحدہ علیحدہ ' آج کی طرح' تو دو تین باریوں میں فیصلہ اپنے آپ ہی ہو جاتا ہے۔ مگر یہ دونوں سیکشنیں اس طرح پھنس گئی ہیں کہ کوئی فریق ایک آدھ پوائنٹ بھی نہیں چھوڑ رہا۔ تو فیصلہ کیسے ہو سوہنیاں والیوں۔"

" اکیلا اکیلا دوڑیں ؟" کمشنر جو نیزہ بازی کا شوقین تھا اور جسے یقین تھا کہ لاٹ صاحب پر کسی کھلی جگہ پر عوام کے ساتھ اتنی دیر بیٹھنا نہایت گراں گزر رہا ہے مگر اسے یہ بھی یقین تھا کہ لاٹ صاحب اس مقابلہ کا انجام دیکھنے کے لئے بھی بہت بے تاب ہیں لہٰذا اس نے یہ راستہ نکالا اور منصفوں سے کہا: " اکیلا اکیلا' سیکشنوں کے دونوں لیڈر ------ کیا نام ہے ؟"

" مراد خان بلوچ اور احمد خان ورک سرکار !" سارے منصف بیک وقت بول اٹھے۔

"مگر کیا انہیں منظور ہے ؟" کمشنر نے مرادی اور میری طرف دیکھتے ہوئے منصفوں سے پوچھا۔

"ہمیں منظور ہے' جناب !" مرادی اور میں نے جواب دیا۔

مرادی بلوچ نے اپنی پگڑی اتار کر اپنے اک ملازم کو پکڑا دی' دوسرے سے کندھے والی چادر لے کر اپنے پسینے سے بھیگے ہوئے ہاتھ خشک کئے۔ گھوڑا بدلا اور مقابلہ پھر شروع ہوگیا۔ اتنا بڑا ہجوم تھا مگر لوگوں کے سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تھکن مرادی کے جسم پر تو اثر انداز ہوتی بالکل نظر نہیں آرہی تھی مگر میرا تو جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا اور فریاد کر رہا تھا مگر میں اپنے آپ کو بلا شیری دے رہا تھا کہ میں آج مرادی کو نہ مار سکا تو کبھی بھی نہیں مار پاؤں گا۔ مجھے موت بھی قبول تھی مگر مرادی کو جیتنے کے بعد۔ میں نے دوبار گھوڑا بدلا۔ مرادی بڑے اطمینان اور تسلی کے ساتھ کھیل رہا تھا گو اتنے طویل اور خلاف توقع مقابلے سے وہ کچھ چڑا ہوا تھا۔ مگر یہ بات اس نے اپنی کسی بھی حرکت سے ظاہر نہیں ہونے دی۔ ہم پانچ میدان دوڑے مگر برابر رہے۔ ہار جیت کا فیصلہ نہ ہوسکا۔

ایک بار پھر لاٹ صاحب بہادر نے کرسی پر پہلو بدلا' کمشنر کی طرف بے صبری کا اشارہ کیا کمشنر اور اس کے سارے ماتحت افسر دوڑے ہوئے لاٹ صاحب کی کرسی کے آگے رکوع کی حالت میں کھڑے ہوگئے۔ لاٹ صاحب نے آہستہ آواز میں کچھ کہا۔ جواب میں سارے افسروں کے سر اثبات میں ہلے۔ واپسی پر کمشنر بہادر نے پھر مرادی کو اور مجھے سٹیج کے قریب بلایا۔ شاید لاٹ صاحب نے انہیں کچھ ذرا قرار دے دینے کا حکم صادر کیا تھا۔

" اب !" کمشنر بہادر بولا! " جوانو! آپ کا فیصلہ کیسے کرائیں ؟"

مرادی میری بے صبری دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے رکابوں میں کھڑے ہو کر اپنی سانگ والی بانہہ بلند کی اور وسیبوں کے پورے زور سے کہا: میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر دوڑوں گا۔ بس ایک میدان اور دے دیں۔"

خلقت میں تحسین کی ایک لہر اٹھی۔ خلقت کا شوق دیکھ کر کمشنر بہادر نے لاٹ صاحب کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا جس نے سر کی ایک خفیف سی جنبش سے ایک آخری دوڑ کی اجازت عطا فرما دی۔ میری نظریں مرادی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں' جہاں میں اپنی کہی کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے سرخ و سفید شگفتہ چہرے پر تو کئی رنگ آآ کے گذر رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں جیسے آگ کی ایک لہر اٹھی اور بیٹھ گئی۔

اورنگ زیب قاسمی

اب کے چہرے پر موت ایسی زردی تھی۔ گھڑی بھر تو وہ بول ہی نہ سکا۔ پھر بڑی آہتگی کے ساتھ گھوڑے پر سے اترا' میرے پاس سے گذر کر وہ آگے بڑھا اور کافی بلند آواز میں' کہ سٹیج پر بیٹھے ہوئے لاٹ صاحب' کمشنر صاحب' دوسرے افسر اور تمام لوگ سن لیں' کہا: احمد خان جیت جائے۔ میں اپنی ہار مانتا ہوں!"

اس کے لہجے میں گھن گرج تو پہلے جیسی تھی مگر آواز لگ رہا تھا کہ کسی اندھے کنویں میں سے نکل رہی ہو۔ اور وہ ساری خلقت سے بے پرواہ ' گھوڑے کی لگام انگلی میں اٹکائے' سر جھکائے میدان میں سے نکل رہا تھا۔ وہ جدھر سے بھی گذرتا' خلقت پانی کی لہروں کی طرح پھٹ کے راستہ سے ہٹ کے' اسے راستہ دے رہی تھی۔ لوگوں کا اک بڑا ہجوم اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ جو اس کی بہادری اور فراخدلی پر اسے مسلسل تحسین کر رہا تھا۔ کمشنر لاؤڈ سپیکر پر شاید جیت کا انعام دینے کے لئے مسلسل میرا نام پکار رہا تھا پر میں تو شاید پاگل ہوچکا تھا۔ میں اپنے گھوڑے سے چھلانگ لگا کر اترا۔ مرادی کے پیچھے بھاگا۔ اسے بانہہ سے پکڑ کر میں پاگل غصے میں بولا۔ " تم نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے مرادی! تمہیں میرے ساتھ فیصلہ کرنا پڑے گا۔ میں تمہیں ہرا کر جیتوں گا۔ یوں نہیں۔"

" احمد خان! حوصلہ کر میرے شیر ------ حوصلہ!" اس نے بڑی نرمی کے ساتھ میری سخت گرفت سے اپنا بازو چھڑاتے اور اپنے راستے پر چلتے ہوئے کہا: " تم جیت چکے ہو۔ میں نے اپنی ہار تو مان لی ہے۔"

" نہیں! میں نے اسے پکڑ کر میدان کی طرف کھینچتے ہوئے کہا: " تمہیں میرے ساتھ دوڑنا ہی پڑے گا۔"

" میرے ساتھ آؤ!" اس کے لہجے میں کچھ تھا جو وہ مجھے پکڑ کے اپنے ٹینٹ میں لے گیا۔ پھر پیچھے آنے والے ہجوم اور اپنے ساتھیوں کو باہر نکال کے' اس نے مجھے ٹینٹ میں پڑی چارپائی پر بٹھایا اور سامنے پڑی لکڑی کی کرسی پر بیٹھ کر' اس نے چادر کی ڈب سے اپنے زرد چہرے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا: " تمہیں رسول ﷺ کا واسطہ ہے' پہلے میری بات سن لو۔"

" ہاں!" میں نے غصے میں کھولتے ہوئے کہا: " بات کر مرادی! پر تمہیں میرے ساتھ دوڑنا ہی پڑے گا۔ میں اس دن کے لئے پندرہ برس سے جان مار رہا ہوں اور ------ اور آج وقت آیا ہے تو تم راہ سے ہی بھاگ نکلے ہو۔"

مرادی میرے اشتعال دلانے پر غصے سے سرخ ہوگیا ایک بار تو۔ پھر جب ذرا سی دیر میں اس کے چہرے کی کرختگی نرمی میں ڈھلی تو وہ اپنے پٹوں (لمبے بالوں) میں انگلیاں پھیرتا ہوا سوچ سوچ کے بولا: " تمہارے دل میں جو آئے کہو۔ پر قسم قرآن پاک کی' میں تمہارے ساتھ کھیلوں کا ہرگز نہیں۔"

" مگر کیوں ؟ " بے صبری سے میری منہ سے نکلا۔

" حیدر بلوچ کا نام سنا ہے کبھی تم نے ------ بڑا زبردست نیزہ باز تھا ؟ " اس نے پوچھا۔

" ہاں! تو ؟ "

" تو حیدر بلوچ بڑا بڑا سوہنا ستھرا گبھرو تھا۔ سانگ تو وہ بہت ہی خوب مارتا تھا۔ میرا باپ جتی یوں تو اس کھیل کا بادشاہ تھا مگر نوجوان حیدر اٹھا تو دنوں ہی میں میرے باپ جتی کے مقابلہ میں آن کھڑا ہوا۔ حیدر بلوچ جتنا شکل کا امیر تھا' اس سے کہیں بڑھ کر نصیبوں کا سکندر تھا۔ سچ پوچھو تو نیزہ بازی کا بادشاہ رحمت بلوچ' میرا باپ جتی' جس کے نام کا ڈنکا سارے ملک میں بج رہا تھا' کل کے اس چھوکرے حیدر سے خوف کھانے لگ

گیا۔ آج کے اس ہی میدان میں' آج ہی کی طرح ان دونوں کی سپکشنیں پھنس گئیں۔ پھر آج ہی کی طرح وہ دونوں بھی دوڑے مگر فیصلہ نہ ہو سکا۔ تب پھر حیدر بلوچ نے میرے باپ جتی کو للکارا اور کہا تھا: میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر تمہارے ساتھ دوڑوں گا رحمت خان۔"

"پھر وہ دوڑا تھا' آنکھوں پر پٹی باندھ کر؟"

"ہاں! وہ دوڑا تھا' آنکھوں پر پٹی باندھ کر!"

"پھر؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"وہ دوڑا مگر اس کی زین کا دوسرا تنگ ٹوٹ گیا عین کلّے کے اوپر جا کے وہ گردن کے بل گرا۔ منکا ٹوٹ گیا اور ساتھ ہی اس کی جان نکل گئی ----- لوگوں کو آج تک اس کی جوان موت نہیں بھولی۔ اس دن بلکہ اس لمحے میں ہی میرے باپ جتی نے نیزہ بازی چھوڑ دی ہمیشہ کے لئے۔ بلکہ دنیا بھی چھوڑ دی اس نے۔ وہ سارا سارا دن مسجد میں بیٹھا روتا رہتا حیدر بلوچ کو ----- وہ جب تک بھی زندہ رہا' حیدر کو روتا رہا' مرتے وقت بھی اس کی روح کو چین نصیب نہ ہوا۔ مرتے وقت ہی اس نے یہ کہانی مجھے سنائی اور تم دوسرے انسان ہو جو یہ کہانی سن رہے ہو مگر یہ کہانی پھر بھی دہرائی نہ جائے گی ----- اور ---- اور مجھے یقین ہے کہ میں اس وقت بھی میرا باپ جتی کہیں جنت میں بیٹھا' حیدر بلوچ کو ہی رو رہا ہو گا۔"

میں رحمت بلوچ اور حیدر بلوچ کے پسینے میں بھیگے ہوئے چہرے اور چمکتے جسموں والے گھوڑے دیکھتا ہوا' حیرت میں گم' بول اٹھا: "مگر ----- اگر حیدر بلوچ گھوڑے سے گر کر مر گیا تو بات تو بہت صدمے والی ہوئی ----- مگر اس میں تمہارے باپ کا کیا دوش؟"

مرادی کا رنگ بالکل سرسوں کے پھولوں جیسا زرد ہو گیا۔ اس نے نظریں جھکائیں اور میرا ہاتھ دبا کر بڑی دھیمی آواز میں بولا: "حیدر بلوچ کے گھوڑے کا تنگ ٹوٹنے میں میرے باپ جتی کا ہاتھ تھا۔"

اسی رات' کسی وقت مرادی بلوچ اپنے گھوڑے لے کر ساتھیوں سمیت میلے سے نکلا اور اپنے چک چلا گیا۔

اگلے روز میلہ ختم ہو جانے پر ہم واپس جانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ میرا ایک نیزہ باز سودا سلف لے کر شہر سے لوٹا اور کہنے لگا "مرادی بلوچ رات میلے سے واپس جاتے ہوئے گھوڑے سے گر کر مر گیا ہے۔ موت' گردن کا منکا ٹوٹنے سے ہوئی اس کی۔ کیوں نہ ہم اس کی فاتحہ پڑھ کر ہی اپنے چک جائیں۔"

("ادبیات" اسلام آباد)

اورنگ زیب قاسمی

انور علی
ترجمہ شازیہ رحمٰن

(پنجابی سے ترجمہ)

طوطے

اگر آج فرائیڈ ہوتا تو پتا نہیں اس بارے میں کیا کہتا۔ پر مجھے طوطے زہر لگتے ہیں۔

پہلا طوطا سلیم تھا' پتا نہیں کس نے اس کا نام طوطا رکھا تھا پر اس کا ناک بالکل طوطے کی چونچ جیسا تھا۔ وہ پڑھنے لکھنے میں بڑا ہوشیار تھا۔ لڑکے کہتے کہ وہ آدھی آدھی رات تک پڑھتا رہتا ہے مگر جب ماسٹر نے اس کو مانیٹر بنایا تو اس کی آدھی رات بھی ماری گئی۔ وہ رات بھر اس غم میں جاگتا رہتا کہ جس دن اس نے پچیس سے کم شکایتیں کیں اس دن ماسٹر اس کی مانیٹری چھین لے گا اور اختیار کی خاطر بندہ کیا کچھ نہیں کرتا۔ اس نے میری کوئی دس ہزار سے زائد شکایتیں کی ہوں گی۔ میرا بس چلتا تو اسے بڈھے دریا کے سب سے گہرے ڈہ میں دھکا دے آتا۔ آج کل وہ ولایت میں ہے اور انگریزوں کے بچوں کو انگریزی پڑھاتا ہے۔ جب کبھی وہ لاہور آتا ہے تو مجھے ضرور ملنے آتا ہے اس طرح جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ سلیم خود تو ولایت چلا گیا مگر میرے پیچھے طوطے لگا گیا۔ طوطوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ جیتے جی مجھے سکون کے ساتھ جینے نہیں دینا اور مجھے لگتا ہے کہ میرے مرنے پر انہوں نے میری قبر کے اوپر گھونسلے بنانے ہیں۔

مجھ سے پہلے میرے فلیٹ میں ایک پارسی رہتا تھا۔ جب میں یہ فلیٹ کرائے پر لینے کی غرض سے دیکھنے گیا تو اس نے اپنا ٹیک وڈ کا فرنیچر میرے سر منڈھنے کی کوشش کی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب پاکستان ابھی ابھی بنا تھا اور میں اپنی چارپائیاں اور پیڑھیاں لدھیانے چھوڑ آیا تھا۔ میں ہرمزی کا فرنیچر ضرور خرید لیتا مگر جب اس نے مجھے یہ بتایا کہ فرنیچر کے ساتھ ایک طوطا مفت ملے گا تو میں طوطے کی چال سمجھ گیا۔ یہ طوطا بہت بوڑھا تھا اور آنکھوں سے معذور۔ ہرمزی جب اسے کہتا "آؤ" تو وہ آواز کی سیدھ میں آ کر اپنی چونچ پنجرے سے باہر نکال لیتا۔ ہرمزی اس کی چونچ کو پیار کرتا تو وہ پھر اپنی ٹیک پر جا بیٹھتا۔ اندھے حافظوں کی طرح اسے پنجرے کا جغرافیہ اچھی طرح حفظ تھا۔ اس کی یہ باتیں دیکھ کر شاید کوئی چھوٹی موٹی عقل کا بندہ دھوکا کھا جاتا پر میں کہ طوطوں سے واقف تھا۔ فٹ سمجھ گیا کہ مجھے پھنسانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ حافظ جی کی چال نہ چلی۔

اصل میں اس سے تھوڑے عرصے پہلے ایک طوطے نے مجھے بڑا خراب کیا تھا اور زخم ابھی ہرا تھا۔ میں لدھیانے سے پاکستان آ رہا تھا گاڑی کی چھت پر بیٹھ کر۔ گاڑی جگہ جگہ رکتی اور میں ہر جگہ اتر کر اپنی بیوی سے اپنا بیمار بیٹا پکڑ کر اسے تازہ ہوا کھلاتا۔ اسی گاڑی کے ایک دوسرے ڈبے میں ایک طوطا تھا' ایک بوڑھی مائی کے پاس پنجرے میں بند۔ جہاں بھی گاڑی رکتی اور میں اپنے بیمار بیٹے کو ہوا کھلانے کے لئے اترتا' وہ بوڑھی

مائی مجھے پنجرا پکڑا دیتی اور کہتی " بیٹا اس بے زبان کو بھی ہوا کھلوا دے " میں بوڑھی مائی کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے ایک کندھے پر گگو اور ایک ہاتھ میں طوطے کا پنجرہ پکڑ کر ریل کی پٹڑی کے ساتھ پھرتا اور طوطا اس طرح پر مارتا اور ٹیں ٹیں کرتا جیسے کوئی پہلوان کشتی جیت کر " یا علی " کے نعرے لگا رہا ہو اور بلوچ سپاہی اپنی رائفلوں کے کندے دکھا دکھا کر مجھے کہتے " او طوطے باؤ گاڑی پر چڑھ جاؤ اگر جان کی خیر چاہتے ہو۔ " اب آپ خود ہی بتائیں اگر کوئی آپ کے دشمن کا نام ایک ہی سانس میں لے تو آپ پر کیا بیتے گی۔ اولاد بڑی انوکھی شے ہے اور اس کی خاطر بندے کو طرح طرح کے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ ایک بار گگو کہیں سے دو طوطے لے آیا۔ ان طوطوں نے میرے ساتھ جو کیا وہ میں ہی جانتا ہوں۔ ان دونوں کا ایک ایک کندھا ٹوٹا ہوا تھا۔ دن بھر وہ آزاد پھرتے اور رات کو گگو انہیں ایک پنجرے میں بند کرکے موسم کے مطابق کمرے کے اندر یا باہر صحن میں رکھ دیتا۔ ٹیں ٹیں کرتے اور جگہ جگہ بیٹھیں کرتے وہ اس طرح اندر باہر پھرتے جیسے وہ گھر کے مالک ہوں اور جب میں مزدوری کرکے گھر پلٹتا تو وہ میرے پاؤں کے پیچھے آنے کی کوشش کرتے۔ ان میں شہادت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور وہ بھی میرے پیروں کے پیچھے آکر شہید ہونے کا۔ میرا جی چاہتا کہ انہیں اٹھا کر احاطے میں پھینک دوں لیکن پھر مجھے خیال آجاتا کہ وہ طوطوں کے بغیر کیا کرے گا۔ دوسرے یہ طوطے بڑی چالاکی سے گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے تھے جیسے سب ایک خاندان کے بندے ہوں، صرف راشن کارڈ میں ان کے نام درج نہیں تھے۔ اب بندہ اپنے گھر کے افراد کو تو گھر سے باہر نہیں نکال دیتا ناں۔ ہاں میں خود گھر کے ان نئے افراد سے تنگ آکر زیادہ وقت باہر گزارتا اور رات گئے گھر پلٹتا۔

ایک دن میں رات پڑنے پر گھر پلٹا تو گگو دروازہ کھولتے ہی بڑا منہ بنا کر کہنے لگا " ڈیڈی طوطے گم ہو گئے ۔" میرا جی چاہا کہ ابھی جاکے دوکانیں کھلواؤں اور محلے کے لڑکوں کو بلا کے شیرینی بانٹوں پر اولاد اولاد ہے۔ میں نے یہ نہ کہا، یہ ضرور ہے کہ میرے منہ سے نکل گیا " بیٹا بلی کھا گئی ہوگی " اور گگو نے اور بھی رونی شکل بنا لی۔ اگلے دن صبح سویرے گگو آیا اور کہنے لگا۔ " ایک طوطا مل گیا۔ وہ کھانے کے کمرے کے دروازے کے پیچھے بیٹھا تھا۔" اس دن گگو بہانہ بنا کر گھر میں ہی بیٹھا رہا۔ سکول نہ گیا اور میرے جانے کے بعد دوسرے طوطے کو ڈھونڈنے لگا۔ اس نے ڈھونڈ نکالا کہ دوسرا طوطا سامنے والی بالکونی کے پرنالے میں گر پڑا ہے۔ اس کی تحقیق ٹھیک نکلی، جب اس نے ایک چھوٹا سا روڑا پرنالے میں پھینکا تو طوطے نے نیچے سے ٹیں ٹیں کرکے جواب دیا۔ یہ دیگی لوہے کا پرنالہ دیوار کے ساتھ ساتھ کوئی بیس فٹ نیچے جا کر دوکانوں کے تھڑے میں چلا جاتا ہے اور تھڑے کے اندر ایل کی شکل بنا کر سڑک کے نالے کے اوپر جا نکلتا ہے۔ طوطا اس ایل کی کہنی میں پھنسا بیٹھا تھا۔ تھڑا تڑوانے کے لئے گگو راج مزدور بلا لایا۔ مزدوروں کو دیکھ کر دوکاندار اکٹھے ہوگئے پھر راہ چلنے والے لوگ بھی رک گئے۔ طوطے نے بڑا اکٹھ کر لیا اور اس اکٹھ کے سارے لوگوں نے دو ٹولیاں بنالیں۔ آدھے بندے گگو کے ساتھ ہوگئے اور آدھے دوکانداروں کے ساتھ، دوکانداروں کی ایک ہی ضد تھی کہ یہ تھڑا ان کا راستہ ہے، ایک دوسرے کے پاس آنے جانے کے لئے اور وہ ایک زخمی طوطے کی خاطر تھڑا تڑوانے نہیں دیں گے۔ گگو کے ساتھیوں کا کہنا تھا کہ گھڑی دو گھڑی کی تکلیف سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر چھوٹا بچہ یہ بھی تو کہتا ہے کہ وہ تھڑا دوبارہ بنوا دے گا۔ اب چلتے پہلوان کے بندے بھی اکٹھ میں آن ملے۔ انہوں نے سوچا کہ شاید اس جھگڑے میں کچھ آمدن کی صورت نکل آئے۔ وہ تو تھانہ دور ہی تھا، نہیں تو پولیس

اورنگ زیب قاسمی

والے بھی نقص امن کی دفعہ لے کر پہنچ جاتے۔ راج مزدوروں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ انہوں نے گگو کو سمجھایا کہ تھڑا توڑنے سے طوطا بھی مر جائے گا۔ اب گگو اور ترکیبیں سوچنے لگ پڑا۔ اس نے میری مچھلیاں پکڑنے والی ڈوری کے ساتھ ایک روڑا باندھا اور اسے پرنالے میں اتار دیا۔ جب روڑا طوطے کو لگا تو اس نے ٹیں ٹیں کرکے ڈوری پکڑ لی۔ پھر ڈوری کو پرنالے کی سیدھ میں رکھ کر آہستہ آہستہ کھینچ اور کلمہ پڑھتے ہوئے گگو نے آخر طوطے کو باہر نکال لیا۔ اس کے کندھے لہو لہان ہو رہے تھے اور وہ پرنالے سے نکلتے ہی گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا۔ اب گگو اپنی ماں کو جلدی سے چائے بنانے کے لئے کہہ کر الماری میں سے برانڈی ڈھونڈنے میں مصروف ہوگیا۔ اس پاگل کو یہ اچھا بھلا پتا تھا کہ میں اور میرا پڑوسی الماری میں کوئی پینے والی چیز نہیں چھوڑتے تاکہ باسی نہ ہو جائے۔ اس رات میں گھر پھر دیر سے پہنچا اور پھر گگو نے دروازہ کھولا اور میرے پوچھے بنا یہ کہنے لگا " ڈیڈی دوسرا طوطا بھی مل گیا ہے۔ " مجھے غصہ تو بہت آیا مگر یوں ہی اس کا دل رکھنے کی خاطر پوچھ بیٹھا " کہاں سے " اور اس نے طوطے، پرنالے اور تھڑے کی مکمل کہانی سنا دی۔ مجھے اس وقت یہ یقین ہوگیا کہ گگو بڑا ہو کر ایک لکھاری بنے گا اور اپنی آنسو بھری کہانیوں کے ساتھ دنیا کے تمام سربلند لکھاریوں میں بڑا لکھاری مانا جائے گا اور اپنے ماں باپ کا نام روشن کرے گا۔ میں یہ اس لئے کہتا ہوں کہ میرے اور طوطوں کے درمیان پرانی دشمنی کے ہوتے ہوئے بھی میری آنکھیں بھر آئیں۔ گگو نے طوطے کے پنجرے کے اوپر کمبل ڈال کر اسے ہیٹر کے نزدیک رکھا ہوا تھا۔ میں کمبل اتارنے کے لئے آگے بڑھا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا۔ " نہیں ڈیڈی ابھی چائے پی کر سویا ہے۔ صبح سویرے دیکھ لیجئے " میری آنکھیں مڑ کر سوکھ گئیں۔ گگو کے بارے میں میری ملی تلی سوچ ایک دم رک گئی اور یہ آٹھ فٹ اونچا لکھاری مجھے ایک گٹھ مٹھیا بونا لگنے لگا۔ گگو جیسا گھٹیا انسان کبھی بھی لکھاری یا فنکار نہیں بن سکتا۔

اس کے بعد طوطے پھر اندر باہر بیٹھیں اور ٹیں ٹیں کرتے پھرتے اور میرے پیروں کے پیچھے آکر شہید ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ ایک دن رحمی کے ہاتھ سے چارپائی گر پڑی۔ اس کا ایک پایہ ایک طوطے کی پیٹھ میں لگا اور وہ وہیں پر شہید ہوگیا۔ دوسرے دن دوسرے طوطے نے سامنے والی بالکونی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ساتھی کے جانے کے بعد بن باسی بنا چاہتا تھا اور اس نے بالکونی سے اڑان کی ہو۔ پر وہ ایک بات بھول گیا تھا، وہ یہ کہ اس کا ایک کندھا ٹوٹا ہوا ہے اور وہ سڑک کے درمیان جا گرا۔ ادھر لاہور اومنی بس والوں نے ایک تین نمبر چلائی ہوئی تھی جس کی ٹائمنگ انہوں نے اس طرح نکالی ہوئی تھی کہ وہ کل سٹاپوں پر رکتے، سواریاں لیتے، سائیکل سواروں، ریڑھیوں اور رکشوں سے بچتے ہوئے عین اس وقت نکلسن روڈ کی اس جگہ پہنچے جہاں آدھ سیکنڈ پہلے ایک طوطا گرا تھا۔ یہ طوطا آدھا تو بس کے اگلے دائیں ٹائر کے ساتھ چلا گیا۔ باقی آدھا گگو سڑک سے کھرچ کر لایا اور اس کی قبر احاطے میں پہلے طوطے کی قبر کے بالکل ساتھ بنائی۔

وقت گزرتا گیا اور میں طوطوں کو بھول سا گیا۔ کبھی کبھی میں یوں بھی سمجھنے لگا کہ طوطے مجھے بھول گئے۔ پر ایک دن غسل خانے میں نہانے سے پہلے اونچا اونچا گا کر بے خبرسی کو بھگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ پھر وہی ٹیں ٹیں کی آواز میرے کانوں میں پڑی مجھے کپکپاہٹ نے آ لیا۔ نہائے بغیر ہی میں باہر نکل آیا۔ نوراں نے ایک طوطا پکڑا ہوا تھا اور چھوٹی مائی رو رو کر کہتی تھی " چھوڑ دے، چھوڑ دے " پر نوراں بڑے غور سے

طوطے کی چونچ کی کینٹھی ' کو دیکھتی رہی۔ جب میں نے طوطے سے زیادہ زور سے نوراں کو تنگ کیا تو نوراں نے اپنی نوکری جانے کے ڈر سے طوطے کو چھوڑ دیا۔ اس نے جانا کہاں تھا' اس نے مشکل سے میرا گھر تلاش کیا تھا' وہ سڑ کر گھگو کے کمرے میں جاگھسا اور اس کی چارپائی کے سرہانے جا بیٹھا میں نے کہا کہ یہ طوطا مجھے بیمار لگتا ہے اور اس کے مرنے کا ہمیں یونہی عذاب چڑھے گا اسے پکڑ کر باہر اڑا دو۔ گھگو اپنے کرکٹ کے دستانے پہن کر سیٹیاں بجاتے ہوئے اس پکڑنے کے لئے آگے بڑھا مگر طوطا اس سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ اس نے سیٹیوں کا جواب سیٹیوں سے دیا اور تین سیکنڈ رک کر دو مرتبہ اپنا نام بتایا "میاں مٹھو۔" اب نوراں نے شور مچایا کہ بی بی یہ طوطا تو بولتا ہے۔ اسے رکھنا چاہیے۔ طوطے کو حاصل کرنے کے لئے ماسے اپنا پاندانا اٹھا لائی اور ماسے کی ماں اپنی ہنڈیا روٹی چھوڑ کر طوطے کو دیکھنے آئی مجھے یوں لگا جیسے پانی پت کے میدان میں چت پڑا ہوں اور بابر کے سپاہی کھڑے ہنس رہے ہیں۔ جب مجھے کچھ ہوش آیا تو پنجرے کے بارے میں باتیں میرے کانوں میں پڑیں۔ گھگو غائب ہو گیا اور ساتھ ہی میری گاڑی بھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ لنڈے سے ایک پنجرہ لے آیا اور مہینے کی تیئیس تاریخ کو مجھ سے پانچ روپے نکلوا لئے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے پانچ میں سے کم از کم دو روپے ضرور تنگ لئے ہوں گے۔ اب اس طوطے کو میری صبح کی چائے سے پہلے چوری ملتی ہے اور وہ کاکے اور ماسے کو پاس بٹھا کر "میں میاں مٹھو - چوری کھائی ہے" اور اس طرح کی دوسری بکواس کرتا ہے۔ میں پاس سے گذرتا ہوں تو وہ کھانستا ہے' سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی سلیم سے پوچھے کہ کسی کی اولاد کو ساتھ ملا کر اسے اس طرح تنگ کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ کمینگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

("ادبیات" اسلام آباد)

اورنگ زیب قاسمی

فرخندہ لودھی
ترجمہ: عطا حسین ہاشمی

(پنجابی سے ترجمہ)

قسم خدا کی

رحمت بی بی کئی دنوں سے واویلا کر رہی ہے۔

"قسم خدا کی میں ملک کے سارے سمجھ والوں' پڑھنے والوں اور جاننے والوں کی عدالت میں جو کہوں گی سچ کہوں گی' سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گی۔ قسم مجھے لوگوں کی ...... قسم مجھے پیارے پاکستان کی اس کی شان کی ..... اس کے ان مان کی۔"

رحمت بی بی کی بہو زینو کی عمر بھی کوئی اٹھارہ سال ہوگی۔ اس کا شوہر شیر محمد خوبصورت خدوخال والا جوان نہیں جیسی کہ زینو تھی۔ چہیتا اور اکلوتا ہونے کی وجہ سے ماں باپ وہ کرتے جو بیٹا چاہتا۔ اس نے باپ دادا کا آبائی کام بھی نہ سیکھا۔ بڑھئی کا کام بھی کوئی کام ہے۔ وہ چاہتا تو سکول چلا جایا کرتا۔ سکول سے روٹھتا تو پھر باپ کے ساتھ رندا لگانا شروع کر دیتا۔ شیر محمد کا باپ علم دین برادری میں کوئی اتنی بڑی حیثیت کا آدمی نہیں تھا کہ دوسرے اس سے پوچھ کر کوئی قدم اٹھائیں بلکہ اس سے زیادہ اس کی بیوی رعب والی تھی' برادری میں اٹھنے بیٹھنے والی' ہر بات کی خبر رکھنے والی بوڑھی رحمت بی بی اپنے شوہر علم دین کا دایاں ہاتھ تھی ..... بڑا کام کراتی۔ گھر اور گھر سے باہر کے بہت سارے کام اس نے اپنے ذمے لئے ہوئے تھے۔ علم دین تو سارا دن اپنے کارخانے میں مصروف رہتا۔

گاؤں میں دونوں کی بڑی عزت تھی۔ ہر منصوبے کو اپنی اولاد کے بارے میں فکر کرنے کی جلدی یہ ہوتی ہے کہ بیٹے فوراً" کام سیکھ کر ماں باپ کا ہاتھ بٹائیں' شیر محمد اٹھارہ سال کا ہو گیا تھا اور اسے ابھی تک تقل و نگار والا پایہ بنانا بھی نہیں آتا تھا۔ زیادہ قصور رحمت بی بی کا تھا۔ وہ کہتی "پھر کیا ہوا ..... میرے گھر میں کھانے کی کیا نہیں - خود ہی عقل آجائے گی ..... ایسا نہ ہوا تو کچھ دے دلا کر بھرتی کروا دوں گی ..... بس آٹھ تو جماعتیں پاس کر لے -"

اٹھارواں سال ختم ہوتے ہی رحمت بی بی اپنی بھتیجی زینو کو بیاہ لائی۔ زینو شیر محمد کی بچپن کی منگیتر تھی۔ ایسا قد و قامت ...... سولہ سال کی تھی اور بیس کی نظر آتی تھی۔ رحمت بی بی کا بھائی آتے جاتے زور دیتا کہ "بہن! لے جا اپنی امانت مجھ سے زیادہ دیر نہیں رکھی جاتی ..... میں نے اور بیٹیوں کی شادی بھی کرنی ہے۔"

ادھر شیر محمد نے نویں جماعت سے چھوڑ کر تعلیم پوری کرلی۔ زینو اونچی' لمبی دوشیزہ اور دودھ کی طرح

سفید' پودے کے تنے کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ شیر محمد اس کے مقابلے میں کمزور۔ شکل سے تو تھاہی مگر دن رات سگریٹیں پینے سے اس کے دانت کالے سیاہ ہوگئے تھے۔ کپڑے کی چھت کے عارضی سینماؤں میں ایک ساتھ تین تین فلمیں دیکھ دیکھ کر اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔

زیبو اس کے ارمانوں کے عین مطابق تھی۔ فلموں میں ناچتی پیار کرتی دو شیزائیں' پتہ نہیں اس سے ایسے انداز سیکھ کر گئی تھیں ..... شیر محمد کو دلہن میں جو خوبیاں درکار تھیں زیبو میں اللہ کی طرف سے وہ سب موجود تھیں۔ لمبے بالوں میں لال پراندا ڈالتی تو وہ ٹخنوں تک جھول جاتا۔ رحمت بی بی اور علم دین کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے۔ ماں صدقے واری جاتی۔ بلائیں لیتی۔ اللہ نے اس کی مرادیں پوری کی تھیں۔ ایک فکر تھی کہ لڑکے نے کوئی اچھا کام نہیں سیکھا تھا۔ آٹھ نو جماعتیں پڑھ لینے سے اسے اٹھنے اور بات چیت کرنے کا طریقہ آگیا تھا۔ اب وہ لکڑی پر رندا تیسہ چلانے سے کتراتا تھا۔

اللہ نے کرم کیا' علم دین اپنی جمع پونجی' خرچ کرکے ' نمبردار کے بیٹے کی منت سماجت کرکے شیر محمد کو پولیس میں بھرتی کروانے میں کامیاب ہوگیا۔ نمبردار کا بیٹا پولیس میں ڈی ایس پی تھا اور علم دین کی شرافت اور ایمانداری کی بڑی قدر کرتا تھا۔

رحمت بی بی اور علم دین کے گھر کی رونق اور بڑھ گئی۔ زیبو جیسا اب کون تھا' ان کا قدم آنگن میں آتے ہی شیر محمد سرکاری اہلکار بن گیا تھا۔ وردی پہن لی۔ بوٹ جرابیں پہن لیں ..... زیبو بھی اب فخر سے چلتی ..... اس کی تو چال ہی بدل گئی تھی۔

ماں باپ دونوں کو دیکھ کر کہتے " جیتے رہیں' جوانیاں مانیں' ہمارا آنگن ہمیشہ آباد رہے ..... خدا کی نظر رحمت رہے۔"

گاؤں دیہاتوں میں کسی پولیس والے یا فوجی کا ماں باپ ہونا کوئی چھوٹی بات نہیں۔ قد اونچا ہو جاتا ہے اور لوگ ایڑیاں اٹھا کے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ کام' سفارشیں' درخواستیں' خط ..... سارا گاؤں پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ کسی کو کچھ ملے نہ ملے پر کچھ مرعوب سے ہو جاتے ہیں۔

علم دین بڑھئی کا گھر اب اچھا خاصا گھرانہ بننے کے قابل ہوگیا تھا۔ شیر محمد کے بھرتی ہونے سے پہلے علم دین عزت والا آدمی سمجھا جاتا تھا' اب تو خیر..... جب شیر محمد ریکروٹ ٹریننگ مکمل کرکے گاؤں واپس آیا تو علم دین نے سارے گاؤں کو کھانا کھلایا۔ مبارک بادیں وصول کیں۔ سر اونچا کرنے کی جو شرائط ہیں علم دین کا گھرانہ انہیں پوری کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔

ہاتھ لگانے سے میلی ہونے والی زیبو کا پاؤں اب بھاری تھا۔ اللہ اس آنگن کی رونقیں بڑھانے والے تھا۔ چاروں گھر والے بہت خوش تھے۔ " خدا کرے کسی کی نظر نہ لگے ۔" رحمت بی بی ہر وقت دعائیں کرتی رہتی۔

جاڑے کا دن جھولے کے جھولنے کی طرح ابھی دھوپ ابھی چھاؤں ہوتا ہے ..... زیبو اور اس کی ساس قریبی چک سے کپاس چن کے جلدی جلدی گھر پہنچنے کے لئے پگڈنڈی پر آگے پیچھے دوڑتی ہوئی آرہی تھیں کتک مہینے کی شام ان سے بھی جلدی میں تھی سورج تیزی سے حرکت کرتا ہوا درختوں کے پیچھے چھپ گیا۔ پگڈنڈی کی دوسری طرف نئے نئے گندم کے ہرے کھیت اتنے دلکش لگ رہے تھے کہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے

اورنگ زیب قاسمی

زیبو کی چال ذرا آہستہ ہو جاتی تو پیچھے آتی ساس سر پر رکھی ہوئی گانٹھ کو سنبھالتی ہوئی کہتی " زیبو میری بچی ..... ادھر ادھر نہ دیکھ ..... جلدی کر..... کھانے کا وقت ہوگیا ہے تیرا باپ انتظار کر رہا ہوگا۔"

زیبو کا دل چاہ رہا تھا کہ ہلکی ہلکی روشنی میں ڈوبتے کھیتوں کو اپنے بازوؤں میں لے لے اور بلند آواز میں گیت گائے پیار کا۔ دھرتی کے پیار کا جو اپنے روپ دکھا رہی تھی۔ فصلوں میں سے دھوپ سے پگھلی ایسی خوشبو آرہی تھی جس کا کوئی نام نہیں' اگر کوئی ہے تو وہ جوانی ہو سکتا ہے۔ زیبو کو اپنے اردگرد آسمانوں تک جاتی زمین اپنا آپ لگ رہی تھی۔ ساس کی آواز سن کر اس نے چال تیز کر دی۔ اب اس کے اور ساس کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ زیبو دوڑتی جارہی تھی' اتنے میں بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ رحمت بی بی راستہ دینے کے لئے ایک طرف ہوگئی۔ بہو ساس میں فاصلہ مزید بڑھ گیا اس نے زیبو کو آواز دی " اری زیبو ! ذرا رک ری ..... راستہ دے ری ..... لڑکی۔"

رحمت بی بی نے دیکھا اس کے پاس سے گزرنے والے تینوں پولیس والے تھے ..... وردیاں پہنے ہوئے' پیٹیاں بندوقیں ہاتھوں میں ..... ٹھک ٹھک کرتے پاس سے گزرے تو رحمت بی بی کا کلیجہ کانپ اٹھا حالانکہ اب اس کے بیٹے نے وردی پہن لی تھی لیکن اسے ہمیشہ وردی والوں سے ڈر لگتا تھا..... اس نے زیبو کو ایک اور آواز دی " اری او ..... ری ..... زیبو ! ذرا راستہ دے ری ..... حاکموں کو گزر جانے دے ....."

زیبو پگڈنڈی سے اتر کر کیاری میں کھڑی ہوگئی اس نے دونوں ہاتھ سر پر رکھی بھاری گانٹھ کر ڈالے ہوئے تھے رحمت بی بی کی نظریں بہو پر لگی ہوئی تھیں جس کے دہکتے چہرے کو سورج کی سرخی نے اور سرخ کر دیا تھا۔ تب پتہ چلا پولیس والوں نے زیبو کا بازو پکڑ لیا ہے اور کھینچتے ہوئے دائیں طرف کی کیاریوں میں لے گئے۔ تیسرے نے دوڑ کر آتی ہوئی رحمت بی بی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ساس بہو کی گانٹھیں کہیں کی کہیں بکھر گئیں زیبو کا منہ پتہ نہیں انہوں نے بند کر دیا تھا۔ کوئی آواز کوئی چیخ نہیں آئی تھی۔ بائیں طرف والی فصل میں گری رحمت بی بی چیختی رہی " رے ..... رے لڑکے ..... رے میں تیری ماں جیسی ہوں ..... رے ..... رے۔ میں بھی ایک پولیس والے بیٹے کی ماں ہوں ۔"

جب رحمت بی بی نے کھڑے ہو کر اپنے اترے کپڑے سنبھالتے ہوئے آس پاس نظر دوڑائی تو اس نے دیکھا کہ پگڈنڈی کی دوسری طرف تقریباً" دس گز کے فاصلے پر گندم کی گھنی فصل ایک طرف زمین پر گری ہوئی ہے اور ادھر سے کتوں کی طرح بھونکنے اور انسانوں کی طرح چیخنے کی آوازیں آرہی ہیں۔

" زیبو ..... زیبو ..... " اس نے آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا سورج پتہ نہیں کب کا غروب ہو چکا تھا۔ "زیبو ..... ری زیبو ۔" اس کی صدائیں اندھیرے میں گم ہوگئیں۔

اس شام کے بعد یوں لگتا ہے رحمت بی بی ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔ وہ اس اندھیرے کو عدالت اور سرکاری اہلکار سمجھتی ہوئی کہتی ہے۔

" قسم خدا کی میں جو کہوں گی سچ کہوں گی' سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گی۔"

علم دین کے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتا رہتا ہے ..... شیر محمد میں کیس کی پیروی کرنے کا حوصلہ نہیں' زیبو کے مرنے کا دکھ اپنی جگہ مگر دونوں باپ بیٹا کراچی بہو لانے کے چکر میں پڑ گئے ہیں' گھر بار کی حفاظت کرنے اور کھانے پکانے کے لئے کوئی عورت تو ہو۔ رحمت بی بی اس کام کی نہیں۔ وہ رات دن صرف قسم کی سولی پر جھولتی رہتی ہے۔

(" ادبیات" اسلام آباد)

مسرت کلانچوی
ترجمہ: سجاد حیدر پرویز

(سرائیکی سے ترجمہ)

نقاب کے ادھر

موٹر کے پیچھے بھاگتے ہوئے بچے دیواروں سے جھانکتی عورتیں' کھیتوں میں کام کرتے کسانوں کا کام روک کر کھڑے ہو جانا' جانوروں کا چھلانگیں لگا کر بھاگنا۔

یہ منظر ریتا کے لئے بالکل نیا نہ تھا مگر خاصا دلچسپ ضرور تھا۔ اس نے موٹر چلاتے وہاب کو دیکھا جو اسے چھوٹے بچوں کی طرح بیٹھا سمجھا رہا تھا۔

" دس از فیلڈ ۔ دے آر فارمرز "

" اوہ' آئی نو ویری ویل مسٹر وہاب۔" ریتا کچھ بور ہو کر بولی۔

وہ اس بستی کی وہاب کی نگاہ سے نہیں' بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے صرف اپنی ڈائری کے ورق ہی نہیں بھرنے تھے۔ بلکہ وہ اپنے دل' اپنے ذہن اور اپنی آنکھوں کو ان نظاروں سے بھر لینا چاہتی تھی۔

ریتا ایک سیاح تھی ------ وہ ایشیاء کے دیہاتی کلچر پر ریسرچ کر رہی تھی۔ وہ جاپان گئی تو اس کے پاس اسپیلا تھی۔ پر اس سرزمین سے اسے وہاب کی صورت میں ایک پاکستانی فین بھی مل گیا۔

وہ یہ پچھا جھلتی اس بستی تک آگئی تھی اور پھر وہاب اسے اپنی بڑی سی حویلی میں لے آیا۔ وہ اپنے بابا سائیں کو بتا رہا تھا۔

" بابا سائیں۔ ریتا دیہاتی کلچر پر ریسرچ کر رہی ہے۔ یہ ہماری بستی کے ماحول اور یہاں کے لوگ گیتوں کو یورپ میں متعارف کرائے گی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ میرے بابا یونیورسٹی میں زبان و ثقافت کے پروفیسر تھے۔ ریٹائر ہونے تو زمینوں پر اپنی حویلی میں لائبریری آبنائی تھی۔ بابا سائیں ------ ریتا کو آپ کی لائبریری دیکھنے کا شوق جاپان سے یہاں لے آیا ہے ۔"

بابا سائیں نے عینک کے شیشوں میں سے دیکھا۔

" بڑی خوشی کی بات ہے۔" بابا سائیں نے حقے کی نوسنہ میں ڈالی۔

" ریتا یہ میری ماں ہے ۔" وہاب اپنی ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا ---

" ماں کا کوئی تعارف نہیں ہوتا وہاب ------ مائیں خود بخود پہچانی جاتی ہیں --- "

ریتا زور لگا کر اپنے مخصوص لہجے میں سرائیکی بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اورنگ زیب قاسمی

" یہ میری بہن سارہ ہے بڑی شریر ------ ویسے کھانے بہت مزے کے بناتی ہے ۔ یہ تمہیں ڈولی' ساباجوں اور سرسوں کا ساگ پکا کر کھلائے گی۔ "

--- سارہ اپنے دوپٹے کا پلو منہ میں ڈال کر ہنسنے لگی۔

" یہ ہے ہمارا بہت پرانا ملازم بخشو' ملازم کیا' بس گھر کا آدمی ہی سمجھئے ۔"

جیتا رہو ----- بیٹا --- " بخشو وہاب کے سر پر ہاتھ پھیر کر چائے پانی کا انتظام کرنے چلا گیا--- "

" بس یہی کچھ ہے ہماری اس بڑی سی حویلی کی چھوٹی سی کائنات --- "

اس تمام تعارف کے دوران بابا سائیں نظریں جھکائے بیٹھے کچھ سوچتے رہے وہ بولے۔

" سارہ بیٹا ------ ریتا کو اپنی شلوار قمیض لا دو --- "

سارہ نے ریتا کی کسی ہوئی جینز کو بڑی شوق سے دیکھا اور اندر چلی گئی۔

شلوار قمیض ------ یہ واحد علاقہ تھا۔ جہاں اسے سب سے پہلے مشرق کا یہ تحفہ ملا تھا--- کھلی کھلی شلوار قمیض میں وہ بدلی بن کر اڑتی پھر رہی تھی۔ کبھی دراوڑ کا قلعہ --- کبھی روہی کے ٹیلے' کبھی چنن پیر کا مزار اور کبھی خانقاہ شریف۔

وہ کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھتی ------ پڑھتی ------ کچھ سمجھنے کی کوشش کرتی اور پھر کمرے کی بند کھڑکی کو دیکھنے بیٹھ جاتی۔

" بابا سائیں۔ جب تک میں باہر نہ نکلوں گی ۔ مجھے اندر کا پتہ کیسے چلے گا ؟ "

" ٹھیک ہے ------ ! " بابا سائیں نے عینک اتار کر اپنے رومال سے صاف کیا ---

" مگر اب تم باہر وہاب کے ساتھ نہیں جایا کرو گی --- بلکہ سارہ اور اس کی ماں تمہیں باہر لے جائیں گی --- "

" بٹ --- وائی ؟ " ریتا چیخ پڑی --- اسے یہ دونوں منکر نکیر لگیں --- وہ اب لائبریری سے نکل کر قبر میں حساب کتاب دینے نہ جاسکتی تھی۔

اس لئے ریتا --- ! " بابا سائیں نے حقے کی چلم میں جھانکتے ہوئے کہا ---

" ہمارے کلچر میں بیٹیاں نا محرموں کے ساتھ باہر نہیں نکلتیں۔ وہ صرف اپنے محرموں کے ساتھ ہی کہیں جاسکتی ہیں "

" وہاب محرم نہیں ہے " ریتا نے حیرانگی سے آنکھیں پوری کی پوری کھول دیں۔

بابا سائیں نے اپنے ثقیل اور ڈھکے چھپے لفظوں سے محرم اور نامحرم کی وضاحت کی مگر ریتا کو کچھ سمجھ نہ آیا ---

" بابا سائیں --- وہاب میرا محرم کیسے بن سکتا ہے --- ؟ "

بابا سائیں اس سوال پر حیران پریشان ہو گئے --- وہ چاہتے تو اس سفید جلد والی لڑکی کو کھڑے کھڑے باہر نکال دیتے۔ مگر انھوں نے خود کو یورپ کے اخباروں رسالوں میں ریتا کے مضمونوں کے ساتھ کھڑا دیکھ لیا تھا۔ اس لئے خاموش ہو گئے۔

سورج کی شعاعیں حویلی کی ایک ایک چیز کو نئی صبح کا پیغام دے رہی تھیں۔ چڑیوں کی چہکار اور مرغیوں کی

کراکر میں اماں بی بی کی لسی بلونے کی آواز عجیب مزہ دے رہی تھی۔ لسی بلوتے ہوئے اماں بی بی کی ساری توجہ مٹی میں ابھرتے مکھن پر تھی۔ بابا سائیں حقہ سلگا کر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہاب کچھ دنوں کے لئے شہر چلا گیا تھا۔ سارہ بیٹھی پراٹھے بنا رہی تھی اور حویلی کی ایک کمر میں بخشو ذندال سے گوبر اکٹھا کر رہا تھا۔

اس چھوٹی سی کائنات کے یہ تھوڑے سے لوگ چپ چاپ کام میں مصروف تھے اور ربتا کی نظریں حویلی کی اونچی اونچی دیواروں پر تھیں۔ آخر اس نے اس خاموشی میں اپنی آواز کی گھنٹیاں چھنکائیں۔

" ان اونچی دیواروں میں تمہارا دل نہیں گھٹتا ؟ "

" دل گھٹنے کی وجوہات اور ہوتی ہیں ربتا بی بی ---"باباسائیں نے اخبار کا ورق پلٹتے ہوئے جواب دیا---

سارہ نے عجیب حسرت سے دیواروں کو دیکھا ------ اس کی انگلی توے پر لگ گئی۔ اس نے گھبراہٹ کے ساتھ انگلی منہ میں ڈال لی۔

" دراصل بیٹا --- " اماں بی بی نے لسی میں ہاتھ مارتے ہوئے کہا--- " ہم عزت داروں کے دوہرے پردے ہوتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کوئی اس حویلی کے قریب سے اونٹنی پر گزرے تو اندر جھانکتا جائے --- "

" دوہرے پردے --- وٹ از دیز؟ " ربتا نے بابا سائیں کی طرف دیکھا۔

" ڈبل پردہ --- ! " بابا سائیں نے مطلب بتایا۔

" کیا ڈبل بیڈ شیٹ کی طرح پردے بھی ڈبل ہوتے ہیں --- ؟ اوہ نو ----- " ربتا نے خود ہی دل میں بات کر کے اس کی تردید کر دی ---- پھر جیسے اونٹنی کی سواری کا خیال ربتا کے دماغ میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا ----

" اماں بی بی --- آج ہم اونٹنی پر سواری کریں گے --- " ربتا نے بڑی محبت سے کہا ---

ربتا کی بات پوری ہوئی--- ناشتے سے فارغ ہو کر بخشو اونٹنی لے آیا۔ سارہ کی خوشی کی انتہا تھی---

وہ ربتا کے گلے میں بازو ڈال کر بولی --- " باجی آپ کی وجہ سے ہمارے بھی عیش ہو گئے --- "

ویسے تو سارہ کی وجہ سے ربتا کو بھی بہت کچھ ملا ہوا تھا۔

" سارہ بیٹا --- ربتا کو اپنا دوسرا برقعہ دے دو --- " بابا سائیں بولے'

ربتا برقعہ ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئی --- " بابا سائیں --- میں برقعہ نہیں پہنوں گی --- "

" ہم نہیں چاہتے کوئی تمہیں دیکھنے کے بہانے ہماری بچی کو ایک نظر بھی دیکھے ۔ " بابا سائیں غصے سے بولے " ایک نظر دیکھنے سے کیا ہوتا ہے بابا سائیں --- ؟ " ربتا نے برقعے کے بٹن کھولتے ہوئے پوچھا---

" ڈیول کمزور " بابا سائیں نے آہستہ سے جواب دیا ---

" اوہ --- " ربتا کی آنکھیں کھل گئیں --- " یہاں ڈیول اتنی جلدی آجاتا ہے۔ ہمیں تو ڈیول کو چائے پر انوائیٹ کرنا پڑتا ہے۔"

ربتا نے برقعہ پہن لیا --- بابا سائیں خاموش ہو کر چلے گئے ---

بخشو اونٹنی کی مہار پکڑے ہوئے تھا۔ سارہ اور ربتا کجاوے میں بیٹھی جھولے لگا رہی تھیں --- کھلے کھیت بکھرے پڑے تھے۔ ابھی بستی کے کچے پکے مکانوں کا سلسلہ ختم نہ ہو رہا تھا۔ ان گھروں کی دیواریں نیچی تھیں۔ اونٹنی پر ہچکولے کھاتی ربتا نے دیکھا۔ چھوٹی چھوٹی حویلیوں میں جٹیاں بیٹھی اوپلے تھاپ رہی تھیں

کوئی جھاڑو لگا رہی تھی۔ اور کوئی لیپا تاپی کر رہی تھیں --- یہ دوشیزائیں ربتا کو بہت پیاری لگیں۔ پھر ایک عجیب سا خیال اس کے دل میں آیا۔ اس نے سارہ سے پوچھا---

" سارہ ------ اگر اس وقت اونٹنی پر تمہاری بجائے وہاب ہوتا تو کیا وہ نیچے اتر کر چلتا--- ؟ "

" نہیں باجی ---- "

سارہ نے کچھ حیران ہو کر جواب دیا۔

" یہ ہمارے مزارعے ہیں باجی ۔ ان کے مرد ہماری زمینوں پر کام کرتے ہیں اور عورتیں ہمارے گھروں کے کام کرتی ہیں --- "

" سارہ ------ یہ لوگ عزت دار نہیں ہیں --- ؟ "

" کیوں نہیں باجی ------ شریف لوگ ہیں --- "

" پھر تم انہیں اونچی دیواریں کیوں نہیں تعمیر کرا دیتے --- ؟ "

بخشو کے ہاتھ سے اونٹنی کی نکیل چھوٹ گئی ---

" یہ تو کمی ہیں نا باجی --- " سارہ پریشان ہو گئی تھی ---

" کیا --- کمین ------ ؟ " ربتا کا منہ کھل گیا۔

بخشو نے مڑ کر دیکھا۔ سارہ نے جلدی سے ربتا کے منہ پر انگلی رکھ دی۔

" چپ ----- "

" واقعی سارہ --- دل گھٹنے کے سبب دوسرے ہوتے ہیں --- یہاں تو کوئی اونچی دیوار نہیں --- "

ربتا دکھی سی ہو گئی۔

ایک دن سارا اور اماں بی بی ربتا کو چاچا میاں کی حویلی لے گئیں ۔ ربتا کے اردگرد عورتوں کا میلہ لگ گیا تھا۔ اماں بی بی ربتا کے بارے میں بیٹھی وضاحت کر رہی تھی۔ جہاں اس وضاحت میں اسے مشکل ہوتی۔ سارہ اس کی مدد کر دیتی۔

ہر کسی نے ربتا کو ایسے دیکھا جیسے چڑیا گھر میں نیا جانور آیا ہو --- پھر آہستہ آہستہ لوگ بکھرتے گئے اور صرف گھر والیاں رہ گئیں --- عورتیں شکوے شکایتوں میں مصروف ہو گئیں --- ربتا سارہ کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی سیر کرنے گی۔ وہ پلنگوں پر بچھی رنگ برنگی تو شک اور دریوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتی تھی۔ سرکنڈے کی بنی کرسیاں اور مٹی کے رنگ برنگے نمائشی برتن اسے بہت بھلے لگے۔

ذرا دور ایک الگ کمرہ تھا۔ ربتا نے اس کی طرف قدم بڑھائے۔ تو سارہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

" باجی وہاں نہ جائیے۔ یہ مردوں کا ڈیرہ ہے۔ یہاں عورتوں کا جانا منع ہے --- "

" کیوں --- ؟ " ربتا نے پوچھا۔

" بس مرد ہوتے ہیں نا وہاں --- "

" چلو سارہ ہم بس کھڑکی سے جھانک لیتے ہیں --- "

" نہیں۔ نہیں --- " سارہ بہت گھبرا گئی ------ " چاچا میاں نے دیکھ لیا تو مار ڈالیں گے --- "

ربتا الجھ گئی۔ "مگر میرا سسٹم مجھے مار ڈالے گا--- "

اورنگ زیب قاسمی

" نہ باجی --- " رینا نے اس کا ہاتھ کھینچا---

" سارہ --- میں جب تک تمہارے اندر جھانک کر نہ دیکھ لوں میرا تھیسس کیسے مکمل ہو سکتا ہے ؟ "

رینا نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ ایک بڑے سارے کھٹولے پر چچا میاں دھرنا مارے بیٹھے تھے۔ ایک مزارعہ بیٹھا ان کے پاؤں دبا رہا تھا---- دوسرا سر میں تیل کی مالش کر رہا تھا--- اردگرد کچھ اور زمینداروں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ ان کے آگے تاش کے پتے بکھرے پڑے تھے ۔ ایک مزارعہ اوکھلی میں سبز ٹھنڈائی گھوٹ رہا تھا اور دوسرا پیالے بھر بھر بانٹ رہا تھا۔

سارہ واپس چلی گئی' رینا نے اس طرح کھڑکی سے آنکھ لگائے ہوئے دیکھا۔ باہر سے ایک کمزور اور غریب بوڑھا اندر آیا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے اور اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ وہ ایسے ہی تھرکتے وجود کے ساتھ چچا میاں کے پاؤں میں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر چچا میاں کے پاؤں بھگونے لگے۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ مگر آواز نہ نکلتی تھی---

" فکر نہ کریا کرم دین --- " چچا میاں اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا ۔ " نمبرداروں نے تمہاری ایک بیٹی اغوا کی ہے۔ ہم ان کی دس عورتوں کو بھگا کر لے آئیں گے --- انہوں نے ابھی ہم جوانوں کی چال دیکھی نہیں ہے۔"

تاش کھیلتے ہوئے زمیندار کھل کھلا کر ہنس پڑے اور تاش کی چال بھی بدلنے لگی۔

کرم دین نے پھر نظریں اٹھا کر چچا میاں کو دیکھا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

" اوئے ! کرم دین کو سبز ٹھنڈائی پلاؤ --- " چچا میاں بولے ۔ " اس نے جوانی میں ہماری بڑی خدمت کی ہے ۔ خون خرابہ --- عورتوں کے بکھیڑے ۔ پانی کاٹنے پر لڑائیاں۔ کس کام میں کرم دین ہمارا شریک کار نہیں رہا--- ؟ "

کرم دین کی چیخ نکل گئی ۔ " تبھی تو بڑھاپے میں خدا نے ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ذلیل وخوار ہو گیا ہوں-- میاں سائیں۔ ناک اٹھا کر چل نہیں سکتا--- آنکھیں جھک گئیں ہیں --- "

" اوئے بزدل نہ بن کرم دینا۔" چچا میاں نے پھر اس کے کندھے پر زور کا ہاتھ مارا ۔ " تو ہم جوانوں کا مزارعہ ہے۔ ناک اٹھا کر چل۔ " چچا میاں نے مونچھوں کو تاؤ دیا----

رینا کو زور کا جھٹکا لگا لالی بی بی اس کا بازو کھینچ کر کہہ رہی تھی ۔ " اری عورت --- کیا تانک جھانک لگا رکھی ہے --- ؟ اس لئے تو تمہیں اپنے ساتھ نہیں لائی --- "

○

رانی پھلاں۔
ساہوریاں دی دیوانی
ویران پر تیا آندا ہے۔
رانی پھلاں

(شان میں رانیوں جیسی اور رنگ و روپ میں پھولوں کی طرح ہے جسے میرا بھائی بیاہ کر لے آرہا ہے۔ یقیناً" یہ اپنے سسرال کو دیوانگی کی حد تک چاہنے والی ثابت ہوگی)

رینا نے گھاگرا' چنری پہنا ہوا ہے۔ اس کے بازوؤں میں چوڑیوں کا سیٹ اور ماتھے پر ٹیکہ ہے۔ اس کی ہتھیلیوں پر سرخ مہندی رچی ہے۔ اس کے پاؤں میں پازیب ہے۔

وہ گیت گانے والی دوشیزاؤں کے ساتھ کھڑی ہے۔ دو شیزاؤں کی نظروں میں اس کے لئے پسندیدگی ہے' حیرانی اور مزاح بھی ہے۔ مگر کسی آنکھ سے پہچان کی ایک شعاع بھی نہیں نکل رہی۔ وہ اپنی دلہن کے لئے سہرے گا رہی ہیں۔ دعائیں دے رہی ہیں۔

رینا چپ چاپ زبان سے کھڑی کہہ رہی ہے۔

" سہیلیو --- مجھے پہچانو --- میں وہی دلہن ہوں --- جس کے خوبصورت مستقبل کی امیدیں تمہارے دل سے خوشبو کی طرح پھوٹ رہی ہیں۔ میں تمہارے ساتھ روہی کے صحرا میں صدیوں سے ہیلمو چن رہی ہوں۔ ان ہیلمو کے جال سے میری چنزا الجھ الجھ جاتی تھی۔ ان شاخوں سے میری چنزا کی دھجیاں آج بھی جھول رہی ہیں۔ میں سالوں سے تمہارے ساتھ کنوئیں پر مٹکے بھرتی رہی ہوں۔ کنوئیں کے کنارے میرے مٹکے کی ٹھیکریاں بکھری پڑی ہیں۔

تم سے بچھڑ کر میں گر گر کھوئی ہوں۔ موسموں نے میرے نقش بدل دیئے تو کیا ہو گیا۔ میں جہاں گئی۔ عورت ہی رہی --- دلہن ہی بنی۔

آج میں وہی گھگرا کرتا پہنے تمہارے سامنے کھڑی ہوں --- تم مجھے کیوں نہیں پہچانتی ؟

میں یہ کنگن --- یہ جھومر پہن کر اور کہاں کھوؤں --- ؟ کہاں جاؤں --- مجھے پہچانو نا --- ؟ " اسے کسی نے نہ پہچانا۔ وہ باہر صحن میں نکل آئی۔ سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اونچا لمبا گبھرو جوان' رینا کو دیکھ کر اس کی نظروں میں پہچان آگئی۔

وہی پہچان --- جو رینا کے لئے فرانس کے ہوٹل میں مائیکل کی آنکھوں میں ابھری تھی۔ وہی پہچان جو امریکی ہوائی جہاز میں جیک کے چہرے پر چمکی تھی۔ وہی پہچان جو جرمنی میں گوگول نے تلاش کر لی تھی۔

رینا نے پریشان ہو کر دروازے کے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں سے سارہ نکل رہی تھی۔ اس جوان کو دیکھ کر اس نے چوکڑی بھری اور واپس اندر بھاگ گئی۔

اتنے میں وہاب بھی آگیا۔

" رینا --- یہ میرا ماموں زاد ہے۔ فاروق --- اس کے ساتھ ہمارے گہرے رشتے ہیں۔ یہ اپنی سارہ کا منگیتر بھی ہے ۔ "

فاروق کی نگاہیں رینا پر جم گئیں تھیں۔

وہاب اس کے ساتھ انگریزی میں باتیں کرنے لگا شہر جانے کی وجہ --- دیر سے آنے کی وجہ --- حال احوال --- اس دوران فاروق مکمل طور پر ڈنکرے مشین بن کر وہیں بیٹھا رہا۔ وہاب کو بھی رینا اس لباس میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ فاروق کو کسی نے آواز دی۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔ وہاب نے رینا کی تعریف کی۔

وہ اداس لہجے میں بتانے لگی۔

اورنگ زیب قاسمی

"میری بھی شادی ہوئی تھی۔ میں سفید فراک اور سر پہ جھالر پہن ویلم کے ساتھ گرجے گئی تھی۔ پادری نے ہمیں دعائیں دے کر رخصت کیا۔ میرے ساتھ میرا باپ نہ تھا۔ وہ بزنس ٹور پہ تھا اور ماں کسی فیسٹول پہ گئی تھی۔ کسی نے میرے سر پہ ہاتھ نہ رکھا۔ کسی نے نہ پوچھا۔ طلاق کیوں ہوئی ؟"

"لوئے وہاب یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔" اماں بی بی نے غصیلی آنکھوں سے دونوں کو دیکھا۔

"جاؤ ڈیرے پہ جا بیٹھو! اور ریتا --- تمہارا یہاں کون سا کام پھنسا ہوا ہے ؟"

اماں نے کھردری آواز میں کہا --- "آؤ! اندر آ بیٹھو!"

سات سہاگنیں دلہن کے سر پہ دوپٹہ تانے کھڑی تھیں۔

آڑی بندی یا نگیناں دا جوڑا

جوڑے دا سوہا رنگ لال --- میڈی بنری دا

(آؤ دلہن آؤ عروسی کپڑے پہن لو --- اس لباس کا رنگ شادی بیاہ والا سرخ رنگ ہے جو میری دو لہیا کے لئے ہے)

دو شیزائیں کھڑی گا رہی تھیں۔ ایک سہمی سہمی سی عورت آگے بڑھی اور دوپٹے کے نیچے جھانکنے لگی تو ایک بوڑھی عورت نے اس کی چٹیا کھینچ لی۔ "دور --- طلاق یافتہ عورت --- منحوس سایہ ڈال رہی ہے" عورت چکرا کر نیچے جا گری۔ ریتا نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پہ رکھ لئے اور پھر باہر نکل گئی۔

"سارہ تم فاروق سے پردہ کیوں کرتی ہو ------ ؟" ریتا نے پوچھا --- وہ بڑی مشکل سے فاروق سے پیچھا چھڑا کر سارہ کے پاس آبیٹھی تھی۔

"دراصل باجی۔ وہ میرا منگیتر ہے نا۔" سارہ سرخ ہو گئی اور دوپٹے سے کھیلتے ہوئے بولی ---

"مجھے شرم آتی ہے --- "

"مگر سارہ --- تمہارا دل تو کرتا ہوگا --- اس کے ساتھ بات کرنے کو --- اسے دیکھنے کو --- ؟"

"نہیں باجی --- " سارہ نے گھبرا کر نظریں جھکالیں۔

"اس کا مطلب ہے تمہیں فاروق اچھا نہیں لگتا ----- "

سارہ پلکیں جھپکنے لگی۔

"یہ تمہارے ساتھ زبردستی ہوئی ہے سارہ ؟"

"نہیں باجی -- میں -- ایسے ہی -- دراصل ہمارے میں رواج نہیں ہے۔ ہم پردہ کرتی ہیں نا --- نہیں تو بڑے ناراض ہوتے ہیں۔"

"اور پھر سارہ تم ------ "

سارہ نے وہاب اور بابا سائیں کو آتے دیکھا۔ گھبرا کر سرگوشی کی۔ "چپ"

"ریتا --- ! تمہارا تجسس ابھی مکمل نہیں ہوا۔" اب بابا سائیں کچھ اکتائے ہوئے تھے۔

"میں بابا سائیں ! بہت جلدی چلی جاؤں گی --- یہ کہانیاں کبھی مکمل نہیں ہو سکتیں ------ "

وہاب ریتا کے لئے کچھ نئے میگزین لے آیا تھا --- وہ آکر ریتا کے ساتھ ایک کہانی پر ڈسکشن کرنے لگا --- بابا سائیں قہر کی آنکھ ڈال کر چلے گئے۔

اورنگ زیب قاسمی

ریتا کھڑکی میں کھڑی تھی۔ رات کی تاریکی میں اس کے دل میں بھی اندھیرا ہوتا جاتا تھا۔ وہ اداس اداس۔ پریشان پریشان -- کھڑی تاروں کو دیکھ رہی تھی۔

ریتا کے کمرے کا دوسرا پلنگ خالی تھا۔ سارہ کی چتی پلنگ تلے پڑی تھی۔ اس کی جوتی بھی نیچے الٹی پڑی تھی۔ مگر سارہ وہاں پہ نہیں تھی۔ وہ بہت دیر پہلے ریتا کو سوتا دیکھ کر باہر چلی گئی تھی۔ ریتا نے کھڑکی سے باہر دیکھا --- ایک سایہ --- پچھواڑے سے نکل کر دیوار کے ساتھ ساتھ لگتا گیٹ سے باہر نکل گیا تھا۔ ریتا نے پہچان لیا۔ وہ فاروق تھا ---

کچھ دیر بعد پیچھے کھٹکا ہوا۔ ریتا نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں سارہ کھڑی تھی۔ کم گہرے اندھیرے میں سارہ کے منہ پہ پسینے کے قطرے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ ریتا کو دیکھ کر سارہ کا سانس رک گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کانپتی ہوئی اپنے پلنگ پہ آئی اور پشت کرکے سوگئی۔ صبح ہوئی۔ مگر روشن کرنوں نے اندھیروں کی چغلی نہ کھائی۔

آج بھی اماں بی بی روز کی طرح لسی بلو رہی تھی۔ بابا سائیں اخبار پڑھ رہے تھے۔ سارہ بیٹھی پراٹھے پکا رہی تھی۔ بخشو گوبر اکٹھا کر رہا تھا۔ وہاب۔ ایک کمرہ میں ورزش کر رہا تھا۔

ریتا کمرے سے نکلی۔ اس نے جینز اور بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ اس کے کاندھے پہ سفری بیگ لٹک رہا تھا اور ہاتھوں میں سارہ کا برقعہ۔

اس نے حویلی میں بیٹھے سب لوگوں پہ نظر ڈالی اور بولی --- "آپ کی مہربانی کا بہت بہت شکریہ --- آپ کا پیار --- آپ کا خلوص ! میں کبھی نہ بھولوں گی۔ میں یہاں ریسرچ کرنے آئی تھی ---- آپ نے میرا بہت ساتھ دیا --- آج رات میری ریسرچ مکمل ہو گئی ہے میں نے جان لیا ہے کہ مغرب پردے سے باہر ہے اور مشرق پردے کے اندر --- "

پھر اس نے سارہ کی طرف برقعہ بڑھا کر کہا ----

"یہ لو سارہ اپنا کالا نقاب --- "

("ادبیات" اسلام آباد)

امر جلیل
ترجمہ: اکبر لغاری

(سندھی سے ترجمہ)

دھرتی کی دھول، آسمان کے تارے

جس دن اس نے اس کی عزت لوٹی تھی اس دن اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ فقط کچھ مہینے بعد وہ اس کا جینا محال کر دے گی اور زندگی عذاب کر دے گی۔

جب وہ گاؤں سے لوٹا تو سراج نے اسے بتایا "شاہو! ہلی کے پیٹ میں تیرا بچہ ہے!"

مسلسل خیالات کے سلسلے نے شاہو کے دماغ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک غریب اور مفلس "۔" بھیلن "اس کے لئے مسئلہ بن گئی تھی ایک آزاد، بے پرواہ شخص کے پاؤں میں جیسے زنجیریں پڑ گئی تھیں۔ وہ اس دن کو سٹے لگا جس دن "بھیلوں کی ٹولی نے روہڑی اسٹیشن کے نزدیک اپنے میدان میں اپنی جھگیاں بنائی تھیں۔ ان میں ہلی بھی تھی۔ میلی، گدلی اور جوؤں والی ہلی۔

ان دنوں "شاہو" (Vacation) میں گاؤں آیا ہوا تھا۔ جوانی کی روانی کی نہ ذات پات روک سکتی ہے اور نہ ہی دین دھرم دھیما کر سکتا ہے۔ ہلی کی چھلکتی جوانی جلد ہی روہڑی شہر کی نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ اس کی بدمست جوانی پیوند لگے ہوئے کپڑوں سے جھانک رہی تھی۔ آوارہ تو بدنام ہوتے ہیں۔ ان کا عشق تو آنکھوں کے اشاروں اور دوچار میٹھے بولوں تک محدود رہتا ہے۔ لیکن جن شریفوں کو عطر اور سینٹ سے مہکتے جسم میسر تھے وہ بھی اپنی چمکتی ہوئی گاڑیاں اور تانگے رکوا کر ہلی کو راضی کرنے لگتے تھے۔

لیکن وہ جنگلی پھول تھی جس کسی نے بھی ہاتھ بڑھایا۔ زخمی ہی کے لوٹا۔ وہ آدم سے حوا کا انتقام تھی۔ اس کا کام تھا... صبح سے شام تک ٹوکرے بنانا شام کو جب وہ دوچار ٹوکرے لے کر بیچنے کے لئے نکلتی تھی تو سارے دن کی تھکان دور کرنے کے لئے اپنے جسم کو سانپ کی طرح بل دیتی ہوئی جاتی تھی۔ آخر کون کہاں تک ڈسے جانے سے بچ سکتا تھا۔

وہ تھی بھی بے حد سلونی۔ پہلے دن ہلی کو دیکھ کر سراج نے "شاہو" کے کان میں کہا تھا۔

"لڑکی نمکین ہے"

"قہر کرے گی یار" شاہو نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا

"روہڑی کو اردو بنا دے گی"

"اس کی رگوں میں کسی نیک خاندان کا خون ہے"

شاہو نے تیز سی آنکھ سے سراج کی طرف دیکھا۔ طنز برداشت کرتے ہوئے کہا۔

"بھیلوں، میگھواڑوں، اور اچھوتوں کے جسم میں بڑے بڑے شریف خاندانوں کا خون ہوتا ہے"

"ہلی کسی بہترین پیوند کا پھول تھی" شاہو ہلی کے لئے بھٹکنے لگا۔ شاہو کے علاوہ سب نوجوان قسمت آزمائی کر چکے تھے لیکن ہر کسی کا منہ دیوار سے ٹکرا چکا تھا۔ امیدوار نوجوانوں میں بس شاہو ہی ایک ایسا تھا جس سے ہلی کا ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔ شاہو پرانا پاپی تھا عورتوں کے معاملے میں تیز طرار رہتا تھا چکر بازیوں سے پوری طرح واقف تھا کالج سے لے کر پڑوس کی جوان عورتوں میں سے کوئی بھی اس کے جال سے نہیں نکل سکتی تھی۔ عورتوں کے پھانسنے اور راضی کرنے کے اس کے اپنے طریقے تھے۔ آزمائے ہوئے نسخے تھے اور جانے پہچانے راستے تھے۔

پہلے اس نے ہلی کو نظرانداز کر دیا۔ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اس پر اپنی شرافت کا رعب جمانے کے لئے سر پر ٹوپی رکھ کر اس کے آگے سے گذر کر مسجد میں جاتا تھا۔ مسجد کے دروازے پر ٹھہر کر اسے تیز سی آنکھ سے دیکھ لیتا تھا۔ ہلی کی آنکھیں اکثر اس کے تعاقب میں مسجد کے دروازے تک جاتی تھیں۔ وہ نماز پڑھے بغیر، مسجد کے پچھلے دروازے سے نکل کر "جمال قصائی" کے جوئے کے اڈے پر جا پہنچتا تھا۔

سراج، شاہو کی چالبازیوں اور حرکتوں سے پوری طرح واقف تھا لیکن جو چال وہ ہلی کے ساتھ چل رہا تھا، اس نے سراج کو بھی حیران کر دیا۔ ایک دن سراج نے شاہو کے بازو میں چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

"شہر کے چکن، تکے کھا کھا کر اتنا جی بھر گیا ہے تیرا کہ جنگلی تیتر کو خاطر میں ہی نہیں لاتا"

شاہو نے کھنکھار کر گلا صاف کیا، اور کہا۔

"ابابیلوں کا شکار تیتر سے نہیں کیا جاتا۔"

ایک دن شاہو نے ہلی سے ایک ٹوکرا خریدا۔ ہلی نے سامنے رکھا ہوا ٹوکرا شاہو کی طرف بڑھایا۔ شاہو نے دوسرے ٹوکرے کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں نہیں یہ نہیں، وہ..... وہ جو اس طرف رکھا ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی، ایک انگڑائی لی اور ٹوکرا لے آئی، شاہو نے ٹوکرے کی طرف دیکھا اور کہا

"اس میں تو بڑی بڑی تیلیاں ہیں"

"کس لئے خرید رہے ہو؟"

شاہو چونک گیا۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے ہلی کی آنکھوں میں دیکھا۔ ہلی کے ہونٹوں پر دلوں کو موہ لینے والی مسکراہٹ تھی۔ دوبارہ پوچھا۔

"کس لئے خرید رہے ہو؟ آموں کے لئے یا کھجور کے لئے؟"

شاہو نے اپنا سانس آزاد ہوتا ہوا محسوس کیا۔ اور کہا... "کھجور کے لئے"

"ٹھہرو! کھجور کے لئے ٹوکرا ڈھونڈ کر دیتی ہوں"

وہ ٹوکرے اوپر نیچے کرنے لگی اور ایک ٹوکرا لے آئی۔

"یہ ٹوکرا ہے کھجور کے لئے"

ٹوکرا لیتے ہوئے شاہو نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اور سمجھا کہ اس کی آنکھوں کے گہرے ساغر میں

اورنگ زیب قاسمی

ڈوب جائے گا۔ جاتے جاتے اس نے کہا۔
" ایک اچھا ٹوکرا بنا کے رکھنا۔ کل لینے آؤں گا " اس نے بالی کی طرف پیسے بڑھائے
" ٹوکرا لینے آئے گا تو پیسے بھی کل ہی دینا " اس نے گردن کو خم دیتے ہوئے کہا۔ شاہو کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔
دوسرے دن ٹوکرا لینے گیا تو بالی نے کہا۔ " یہ ٹوکرا تیرے واسطے بنایا ہے۔ "
" میرے لئے "
" ہاں " وہ ٹوکرا لے آئی اور اسے شاہو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا..... " کھپال سے بنایا ہے "
" سچ ؟ "
" ہاں "
" کیوں ؟ "
بالی سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ گلا صاف کرتے ہوئے کہا " تو نمازی ہے نا اس لئے "
شاہو نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور کوئی جواب نہیں دیا۔
بالی نے کہا " اس ٹوکرے کے دو روپے لوں گی "
" کیوں ؟ "
بالی سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ گلا صاف کرتے ہوئے کہا " تو نمازی ہے نا اس لئے "
شاہو نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور کوئی جواب نہیں دیا۔
بالی نے کہا " اس ٹوکرے کے دو روپے لوں گی "
" کیوں ؟ "
" کھپال سے جو بنایا ہے " بالی نے گردن کو خم دیا اور شاہو کو گھور کر دیکھا
شاہو اس سے آنکھ نہیں ملا سکا۔ اس سے پوچھا
" دن میں کتنے ٹوکرے بنا لیتی ہو ؟ "
" کبھی تین، کبھی چار "
" پھر تو کافی کمالیتی ہو گی "
" سارے تھوڑا ہی بکتے ہیں، کبھی دو کبھی تین "
" پھر بھی تیرے لئے کافی ہیں "
" میں اکیلی تو نہیں ہوں نا۔ میری بوڑھی ماں ہے، اندھا باپو ہے "
بالی نے عام سے لہجے میں کہا
" تیرا باپ اندھا ہے ؟ " شاہو کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
" ہاں "
" کیسے کہہ سکتی ہوں ؟ " شاہو کے لبوں پر مسلسل مسکراہٹ مہک رہی تھی۔
بالی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے سوالوں کی تہہ تک نہ پہنچ سکی۔ پھر بھی کہا

اورنگ زیب قاسمی

" میرا باپو اندھا ہے۔ میں اسے پانی پلاتی ہوں وہ دیکھ بھی نہیں سکتا"
" اچھا اب میں سمجھا، وہ اندھا شخص تیرا باپ ہے "
" شاہو کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اور اس نے ہولے سے کہا " بے چارہ "
" بالی کی حیرت دور نہیں ہوئی۔ اس کے ہاتھ آدھے بنے ہوئے ٹوکرے پر رک گئے۔
شاہو نے ایک ہی سوال سے ٹھہرے ہوئے پانی کی گہرائی ناپ لی تھی۔ بات کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے اس نے کہا
" آپس میں کتنے بہن بھائی ہو ؟ "
" ایک بھائی اور دو بہنیں ؟ "
" وہ بھی ٹوکرے بناتے ہیں ؟ "
" اوں ہوں " اس نے ٹوکر اٹھاتے ہوئے کہا " میرا بھائی گدھوں پہ مٹی اٹھاتا ہے "
" اور " بہنیں "
اس نے سر اٹھا کر شاہو کو دیکھا۔ کچھ لمحے شاہو کو دیکھنے کے بعد اس نے سر جھکا اور جواب دیا " دونوں دھندہ کرتی تھیں "
" کیا ! " شاہو حیرت سے چیخ پڑا
" چلتی تھیں " بالی کے ہونٹوں پہ زہر آلود مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے دونوں پر طنز کر رہی ہو۔
" پھر ؟ "
بڑی ایک پنجابی بدماش سے شادی کر کے بھاگ گئی " اس نے ٹوکرے کو کستے ہوئے کہا
" اس نے جا کر اسے بازار میں بٹھا دیا"
چھوٹی بہن کے بارے میں شاہو نے کچھ نہیں پوچھا اس نے خود ہی بتایا
" چھوٹی ایک بلوچ کے ساتھ سکاؤ پوز بھاگ گئی۔"
وہ اچانک اداس ہو گئی۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا
" کچھ دنوں کے بعد میری بہن کو نکالا اس سندھو کے کنارے پڑا ہوا تھا"
اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
شاہو نے کمزور سی آواز میں کہا " مرد بے حد ظالم ہوتے ہیں بالی "
" تو بھی تو مرد ہے شاہو "
" میں باغی ہوں، بالی "
اس نے کوئی جواب نہیں دیا خاموش رہی۔ شاہو بھی خاموش رہا۔ اس نے ٹوکرا اٹھایا اور سر جھکا کر آگے نکل گیا۔ شاہو بحری قزاق کی طرح ہوا کے رخ کا انتظار کرنے لگا۔ ایک دن مسجد کی طرف جاتے ہوئے بالی کے پاس ایک لمحے کے لئے رکتے ہوئے کہا
" بالی ! تجھ جیسی مخلص لڑکی میں نے پوری عمر نہیں دیکھی۔"
اس نے چہرہ اوپر کر کے کالے کالے نینوں سے شاہو کی طرف دیکھا۔ شاہو نے اس کے ذہن کو سوچنے کی

فرصت نہیں دی اور کہا۔

" محنت عیب نہیں ہے' محنت تو عورت کی شان ہے بالی ! "

اور جب شاہو مسجد کی طرف بڑھ گیا تو وہ پتہ نہیں کتنی دیر اپنے موٹے دماغ سے دھڑکتے ہوئے دل کو سمجھاتی رہی۔

اگلی برساتی ہوئی دوپہر کے بعد جب شام آئی تو وہ شاہو کے کمرے کی کھڑکی کے نزدیک سے گذری۔ سانولا رنگ دھوپ کی شدت سے تانبہ بن چکا تھا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ شاہو نے آواز دے کر اسے روکا۔ وہ ٹوکرے نیچے رکھ کر' کمر پہ ایک ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔

شاہو نے دروازہ کھول کر اسے اندر بلایا ... " اندر آؤ بالی' باہر دھوپ بڑی تیز ہے "

" نہیں' نہیں ..... میں ادھر ہی ٹھیک ہوں "

" مجھ سے خوف محسوس ہوتا ہے کیا ؟ "

بالی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹوکرے اٹھا کر اندر چلی گئی۔ ٹوکروں کو فرش پر رکھا۔ اور الیکٹرک پنکھے کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ ہاتھ اوپر کرکے بال سنوارے تو کنپٹیوں سے پسینے کے قطرے نیچے ٹپکنے لگے۔ شاہو نے ریفریجریٹر سے پانی کی بوتل نکال کر اسے پانی کا گلاس بھر کر دیا۔ ٹھنڈے پانی کے گلاس کو ہاتھ میں لے کر اس کے پانی کو غور سے دیکھنے لگی۔

" اور کچھ تو نہیں ہے نہ اس میں "

" میرے اوپر بھی شک کرتی ہو بالی ! "

وہی مسکراہٹ بالی کے ہونٹوں پہ پھیل گئی۔ جواب نہیں دیا اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔ شاہو نے دوسرا گلاس بھر کے دیا۔ دو چار گھونٹ لئے۔ ٹھنڈی سانس لے کر نیچے غالیچے پر بیٹھ گئی ..... سانسوں کو درست کرتے ہوئے پوچھا۔

" تو یہاں پڑھتا ہے نمازی ؟ "

" میرا نام نمازی نہیں ہے "

" میرا نام شاہ محمد ہے ۔ مجھے " شاہو " کہا کر "

" یہاں رہتے ہو "

یہاں رہتے ہو "

" ہاں ! میں یہاں رہتا ہوں "

اس نے کمرے میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ نظریں پردوں پر سے پھسلتی ہوئی شوکیس پہ جا کے ٹھہریں۔ آگے بڑھ کر شوکیس کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اسے دیکھنے لگی۔

" یہ کھلونے کیوں رکھے ہیں تم نے ؟ " اس نے شاہو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

" بچے ہیں کیا تمہارے "

" ابھی شادی نہیں کی ہے "

" پھر یہ کھلونے کیوں رکھے ہیں ؟ "

" یہ فیشن ہے ' بالی "

" بالی کو شاہو کا جواب سمجھ میں نہیں آیا۔ کھلونے دیکھتے ہوئے پوچھا ..... یہ کیا ہے ؟ "

" ریچھ "

" ریچھ تو کالا ہوتا ہے "

" کچھ ریچھ سفید بھی ہوتے ہیں "

" اور یہ بندر بھی رکھا ہے "

" ہاں ! بندروں میں ایک خوبی ہوتی ہے "

" کیا ؟ "

" بندر بہترین نقل کر سکتے ہیں " وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پوچھا

" ان سب کھلونوں کی قیمت کتنی ہوگی ؟ "

" فقط اس سفید ریچھ کی قیمت ساڑھے بارہ روپے ہے "

وہ دانتوں میں انگلی دبا کر شوکیس سے دور ہٹ گئی۔ اور جا کر کتابوں کی الماری کے پاس کھڑی ہوئی۔ کتابوں کی الماری اس کے قد سے بھی اونچی تھی۔

" یہ ساری کتابیں تو نے پڑھی ہیں "

" ہاں " شاہو کی گردن فخر سے اکڑ گئی۔

بالی پہ شاہو کے جواب کا کوئی اثر نہیں ہوا وہ واپس جا کر کھلونوں کے شوکیس کے پاس کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر دیکھنے کے بعد وہ ٹوکروں کے پاس جا کھڑی ہوئی اور پوچھا

ٹوکرا لوگے

بڑے لائی ہو

بڑا ہی لے لو

نہیں خریدوں گا تو چھوٹا ..... آج نہیں تو کل

تو پھر کل تمہارے لئے بنا کے لاؤں گی۔ وہ ٹوکرے لے کر جانے کی تیاری کرنے لگی۔

" لیکن آنا جلد "

" اسی وقت پر ہاں ؟ "

" نہیں اس وقت میں نماز پہ جاتا ہوں "

" دوپہر کو آؤں "

" ہاں " وہ چلی گئی

شاہو آنے والی دوپہر کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے کمرے کے بعد اوطاق تھی۔ اور اوطاق کے بعد تھی حویلی شاہو کو یہ بھی پتہ تھا کہ سندھ کی گرمیوں کی دوپہر' جاڑے کی آدھی رات جیسی ویران ہوتی ہے دوسرے دن دوپہر معمول سے زیادہ گرم تھی' مکانوں کی دیواریں گرم ہو کر لوہا بن گئی تھیں۔ کولتار کے راستے

اورنگ زیب قاسمی

نرم ہو گئے تھے۔ الیکٹرک پنکھے آگ برسا رہے تھے۔ شاہو دوپہر کا کھانا کھا کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ جب ساتھ والے پرائمری سکول میں چھٹی ہوئی اور بچے چیختے، کھیلتے گلی سے گذر گئے تو شاہو نے ریفریجریٹر سے "بیئر" کی بوتل نکالی اور پنکھے کے نیچے آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ نزدیک سکول کے دو بوڑھے اساتذہ گزرے گرمی سے بچنے کے لئے سر پر چادریں ڈالی ہوئی تھیں۔ شاہو کے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی دیکھ کر اس سے بولے

"چھوٹے شاہ خوش تو ہو ؟"

"آپ کی دعائیں چاہیں" شاہ نے رکھائی سے کہا

"کیوں ہم احتی گنہ گاروں کو شرمندہ کرتے ہو شاہ"

ایک ماسٹر نے نہایت احترام سے کہا "ہم پاپیوں کے دونوں جہانوں کے سہارے آپ ہی تو ہو"

شاہو نے اس کا جواب سنا ان سنا کر دیا اور منہ دوسری طرف پھیر دیا۔ اساتذہ چلے گئے۔ اس نے گلاس میں "بیئر" انڈیلا۔ ایک لمحے میں گلاس پر باہر سے موتیوں جیسے قطرے نمودار ہو گئے۔

اسی وقت بالی پینے میں تر، بانپتی، ٹوکرے لے کر پہنچ گئی۔ شاہو نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ اندر جاتے ہی ٹوکرے ایک طرف پھینک کر پنکھے کے نیچے جا کھڑی ہوئی اور ایک لمحے کے بعد بیٹھ گئی۔ شاہو نے دوسرے گلاس میں بیئر ڈال کر گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

تھکی ہوئی تھی، پیاسی تھی، دو چار گھونٹ مسلسل پی گئی۔

کڑوا لگا تو پوچھا "کیا ہے ؟"

"نیم کا شربت" شاہو نے ایک دم جواب دیا

"بوہت ٹھنڈا ہے"

"ہاں"

دو چار گھونٹ کے بعد بولی "نیم کی چھاؤں بھی ٹھنڈی ہوتی ہے"

"یہ شربت بھی ٹھنڈا ہے"

"ہاں" بالی لاپرواہی سے بولی "لیکن ہم گریب لوگ ہیں۔" ہمتو نمولیاں چوستے ہیں"

وہ منہ صاف کرتے ہوئے بولی "بوہت ٹھنڈا ہے"

"ایک اور گلاس سے پوری تھکن ختم اور تازگی محسوس کروں گی۔"

اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ شاہو نے پہلے گلاس ختم کر دیا۔ شاہو نے نمک لگی ہوئی بادامیاں اور مونگ پھلیاں لا کے اس کے آگے رکھیں۔ اور دوبارہ اسے گلاس بھر کے دیا۔ اس نے دو چار بادامیاں منہ میں رکھیں اور بیئر کا گھونٹ بھرا۔ پوچھا۔

"یہ شربت تو زوجانے پیتا ہے نماجی ؟"

"دیکھو بالی" شاہو نے اس کے بازو کو پکڑتے ہوئے کہا "مجھے نمازی مت کہا کر"

"کیوں ؟" بالی نے نخرے سے پوچھا

"بس ایسے ہی" شاہو نے بازو چھوڑ دیا۔

"پوری روہڑی میں ایک تم ہی تو اشرف ہو"

"اس نے ایک گھونٹ بھرا" دو مزے تو جیسے ۔۔۔ جیسے ۔۔۔"

اس نے جملہ پورا نہیں کیا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

شاہو نے راستے کی طرف کھلتی ہوئی کھڑکی بند کر دی۔

تو نماجی ہے، اس نے چٹخے چٹخے بیئر کا دوسرا گلاس بھی خالی کر دیا۔ شاہو نے اس کا گلاس بھرا۔ اور اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ بالی نے دو گھونٹ لئے اور بازو سر کے پیچھے دے کر لیٹ گئی۔ شاہو نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اسے پتہ تھا کہ عورت کو الجھانے کا بہترین طریقہ ہے اس کی تعریف ۔۔۔!

چاہے عورت پڑھی لکھی ہو یا جاہل، بھولی بھالی ہو یا چالاک، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہو یا پیاسی ہو۔ تعریف اور ستائش کے دو بول اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں۔

"بالی! تو کسی ملک کی رانی ہوتی"

"کیوں بھلا ؟" اس نے لاابالی پن سے کہا

"بتاؤں" شاہو نے کسی عالیجے پر نگاہ اور اس کی طرف کھسک گیا۔

"ہاں نماجی۔ بتاؤ" آواز لڑکھڑائی ... بیئر نے اس کی آنکھوں کو سرخ بنا دیا تھا۔

"تم کنتی ہو، ایماندار ہو"

"تو بھی تو ایماندار اور نماجی ہے" لفظ ٹوٹتے رہے۔

"تمہارے پاس یہ کالے کالے نین بھی تو ہیں" شاہو نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

"میری ماں کہتی ہے۔ ملاں کھو بھناک ہوتے ہیں"

الفاظ ٹوٹی ہوئی مالا کی طرح بکھرتے رہے۔

"اور میں ؟" شاہو نے اس کے رخسار پر بجلی سی تھپکی دی "میں تو خوفناک نہیں ہوں نہ"

"اوں ہوں"

"تم ہماری ملک کی رانی ہو تیں"

"کیا میں سچ مچ اچھی ہوں" بالی نے شاہو کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں پگلی" شاہو اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

"سوچتا ہوں میری بیوی تیرے جیسی ہونی چاہیے۔"

بالی نے مچھلی کی طرح شاہو کے بازوؤں میں پہلو بدلا۔ خوابیدہ آنکھوں سے شاہو کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

"اور اس کے کالے کالے نین بھی ہوں ؟"

"ہاں ... بالی ہاں"

شاہو ہوا کے رخ کو پہچان گیا۔ کانوں کی لوؤں سے انگلیاں پھسلاتا ہوا گردن تک لے آیا۔ بالی کے جسم سے سسکاری ابھری۔

"اوہ نماجی" بالی نے اپنی آنکھیں بند کر دیں۔

شاہو نے اپنا منہ بالی کے منہ کے اتنا نزدیک کیا کہ دونوں کی سانسیں ٹکرانے لگیں۔ اس نے بالی کے کان

میں سرگوشی کی " بالی "

" ہوں ۔"

" اگر تو کوٹھے پہ بیٹھنا چھوڑ دے تو میں تیرے ساتھ شادی کروں "

" لوئی اللہ ! بالی نے بند آنکھیں کھول کر شاہو کی طرف غور سے دیکھا۔

" میں پنجابی بدمعاش نہیں ہوں جس نے تمہاری بہن کو لے جا کر بازار میں بٹھا دیا تھا"

وہ پتھر کی طرح خاموش رہی۔ شاہو بولا

" میں بلوچ نہیں ہوں جس نے تمہاری بہن کی لاش سندھ کے کنارے پھینکی تھی۔

بالی آنکھوں نے جھپکنا چھوڑ دیا۔

شاہو نے اس کے ذہن کو سوچنے کی مہلت نہیں دی۔ کہا

" سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے بالی "

بالی کا سوتا دماغ لاجواب ہو گیا۔ فقط اتنا کہہ پائی۔

" مسخری تو نہیں کر رہا نماجی ؟ "

" نہیں بالی نہیں " شاہو نے فوراً کہا

" میں مکار اور فریبی نہیں ہوں بالی کہ میٹھی میٹھی باتیں کر کے تجھے لوٹ لوں "

" بالی تنہائی کے راستوں میں دور تک چلی گئی۔ الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ پنجرے اس کے ذہن کو پوری طرح جکڑ رکھا تھا۔ شاہو اپنی گرفت مضبوط کرتا ہوا بولا

" آخر ایک غریب لڑکی کی عزت لوٹتے ہوئے مجھے کیا ملے گا ؟ "

ایک لمحے کے لئے بالی کی خوابیدہ آنکھوں میں روشنی کی چمک پیدا ہوئی اور بجھ گئی۔ گلا خشک ہو گیا۔ دل نے کچھ گھبراہٹ محسوس کی الفاظ اس کے ذہن میں الجھنے لگے۔ آخر کہا...

" میں مشکین بھی تو نہیں ہوں "

میں سید ہوں۔ جنت کا حقدار ہوں۔ شاہو اس کو اپنی طرف کھینچتا ہوا بولا...

" اسلام میں سب سے زیادہ ثواب کسی غیر مسلم کو مسلمان کرنا ہے۔ میں تجھے مسلمان کروں گا"

وہ خیالوں میں بہہ گئی۔

" کہو کہ کوٹھے پہ بیٹھنا چھوڑ دوں گی " ... شاہو نے جذباتی لہجے میں کہا

" میں تیرے ساتھ شادی کروں گا' تجھے پڑھاؤں گا۔ اونچے خاندان میں اٹھنا بیٹھنا سکھاؤں گا۔" شاہو کچھ دیر بالی کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

بالی آہستہ آہستہ اپنا منہ شاہو کے سینے پر رکھتی ہوئی بولی۔

" میں کوٹھے پہ بیٹھنا چھوڑ دوں گی "

پھر بغیر کوئی وقت ضائع کئے۔ شاہو بالی پر ایسے جھپٹا جیسے باز چڑیا پر جھپٹتا ہے۔

بالی کو ایسے پکڑا جیسے بھیڑیا سہمی ہوئی بکری کو پکڑتا ہے۔ جنگلی پھول کو کانٹوں سمیت روند دیا۔ معصومیت کی کلی کو مسل دیا۔ گھائل پنچھی پر پھڑپھڑا کر گر پڑا۔

اورنگ زیب قاسمی

گرم دوپہر کے بعد جب اداس اور ویران شام کے سائے پڑے تب بالی نے اپنے آپ کو سنبھالا... بکھرے ہوئے بال سنوارے' اٹھ کھڑی ہوئی تو قدم ڈگمگائے اپنا آپ سنبھال کے ایک قدم بڑھایا۔ ایک ہاتھ سے آرام کرسی کا سہارا لے کر رک گئی۔ سر اوپر اٹھا کر ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

واش بیسن کے نزدیک جا کر چہرے پر دو چار چھینٹے پانی کے لگائے۔ اور چہرہ دوپٹے سے صاف کر دیا۔ اس کا سانولا رنگ سرخی مائل ہو گیا تھا۔ شاہو سے نظریں چرا رہی تھی۔ شاہو بھی اس سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ بولنے کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ بالی کی موجودگی میں کھسیانا سا ہو رہا تھا۔ مسکرانے کی کوشش کی تو جیسے رو پڑے گا۔ شکاری کا ترکش خالی ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کسی عورت کو حاصل کرنے کے لئے اتنی جدوجہد نہیں کی تھی۔ اتنے سوانگ اس نے کبھی نہیں رچائے تھے۔ اپنے آپ کو تھکا ہوا محسوس کرنے لگا۔ بالی کا سر جھکا ہوا تھا۔ چہرے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ وہ قدم اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کی کنڈی کھول کر باہر نکلی ..... دروازے کے درمیان قدم رکھ کر .... منہ پھیر کر شاہو کی طرف دیکھا.... وہ اداس تھی .... جیسے کسی قبرستان کی ویرانی۔

" کچھ کہنے کے لئے اس کے ہونٹ لرزے .... میں کوٹھے پہ بیٹھنا چھوڑ دوں گی "

شاہو نے کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی اس نے جواب کا انتظار کیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی چلی گئی۔ شاہو نے کھڑکی کی سلاخوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ اور جب وہ گلی کے کونے سے مڑ گئی تو ایک فتح کا قہقہہ' کامرانی کا قہقہہ شاہو کے اندر سے ابل پڑا۔

ایسے لاتعداد قہقہے اس نے جا کر کراچی کے ہوٹلوں اور کلبوں میں لگائے۔ کراچی بین الاقوامی شہر ہے جہاں لبنان' ایران اور یورپ کی حسین سا حرائیں' پاکستانی روپوں میں بکتی ہیں پتہ نہیں کتنے رتجگے لئے' کتنی حسین راتیں' شاہو نے دیسی اور ولایتی عورتوں کی آغوش میں گزار دیں۔

کہن مشق شکاری' شکار کی تعداد یاد نہیں رکھتے۔ شاہو نے بالی کو بھلا دیا۔

لیکن کچھ مہینوں بعد شاہو جب گاؤں آیا تو سراج نے اسے بتایا کہ ...

" بالی کے پیٹ میں تیرا بچہ ہے "

شاہو نے سراج کی بات مذاق میں اڑانے کی کوشش کی لیکن سراج نے اس کے بازو کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا " وہ تیرے بچے کی ماں بننے والی ہے " شاہو۔

شاہو نے اپنے آپ کو کرسی پر چھوڑ دیا۔ مٹھیاں بھینچ کر پوری قوت سے کرسی کے بازوؤں پر دے ماریں۔

" اکیلے اکیلے مال ہضم کرنا مذاق نہیں ہے سائیں "

سراج اس پر ہنستے ہوئے بولا " دوستوں کے ساتھ دغا کی ہے تم نے "

شاہو نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ سراج نے شاہو کو غور سے دیکھا' اسے سنجیدہ دیکھا تو خود بھی سنجیدہ ہو گیا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ شاہو جیسا آزاد مرد ایسے معمولی مسئلے کو اتنی اہمیت دے گا۔ لیکن سراج کے ایک ہی جملے نے شاہو کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ ایک ہی جملے نے دماغ کے کونوں کھدروں میں آگ لگا دی تھی۔ حرکتوں کے جس پہاڑ کو ڈھال سمجھا تھا وہ آتش فشاں ثابت ہوا۔ دل بجلی کے

پاؤں میں پھنستا ہوا محسوس کرنے لگا۔
"میلی کچیلی، جوؤں والی ۔ صیلن میرے بچے کی ماں!"
"نہیں، نہیں ... وہ میرے بچے کی ماں بننے کے لائق نہیں ہے"
الفاظ اس کی روح کی ویرانیوں میں گونجتے رہے۔
"بالی کے پیٹ میں گناہ"
پسینے کی دھاریں پیشانی اور لوؤں سے پھسلتی ہوئی اس کے چہرے کو تر کرتی رہیں اس کی بھینچی ہوئی مٹھیاں ڈھیلی پڑنے لگیں۔ اندر میں اٹھنے والے طوفان نے اسے کمزور کر دیا تھا۔
سراج اس کی حالت دیکھتے ہوئے بولا "بہت بزدل ہو شاہو"
شاہو خاموش رہا۔
"پتہ نہیں کتنے خاندانوں کے ناجائز بچے بھیلوں میں پرورش پا کر بھیل بن جاتے ہیں"
سراج نے اسے سہارا دینے کے لئے کہا... "تم پرواہ کیوں کرتے ہو"
"میں سید ہوں سراج" شاہو نے تلخ لہجے میں کہا
وہ کرسی سے اٹھا اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔
"کیوں گھبراتے ہو؟" سراج شاہو کے شانے پہ ہاتھ رکھتا ہوا بولا ـــ
"تم انکار کر دینا کہ بچہ تمہارا نہیں ہے"
بچے کا نام سن کر شاہو کے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی۔ اجلے من پہ میلا پانی پڑ گیا۔
"اسے بدنامی کا خوف نہیں ہے"
"بدنامی کا خوف ہوتا ہے عزت والوں کو، دو کوڑی کی گمنام ۔ صیلن، اس کی کیا عزت"
"لیکن وہ گناہ کی پرورش کیوں کر رہی ہے" شاہو نے بے چین ہو کر پوچھا
"لڑکی بہت چالاک ہے" سراج نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا
"تجھ سے کچھ پیسے چھڑانے کے چکر میں ہے"
"میں پیسے دینے کے لئے تیار ہوں۔"
"تیرے اوپر ہنسی آتی ہے یار" سراج ہنستے ہوئے بولا
"میں مذاق کے لئے تیار نہیں ہوں"
"تو جا کر کہوں اسے کہ .... گناہ کو ختم کر دے؟"
"ہاں فوراً ـ لیکن سب کچھ راز داری سے ہونا چاہیے"
"حوصلہ رکھو، فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی"
سراج باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔ شاہو نے اسے روکا۔ وہ دروازے کے پاس رک گیا ـــ "کیوں؟"
شاہو نے بھاری آواز میں کہا۔ "کسی ہسپتال میں چلنے کے لئے راضی ہو تو بہتر ہوگا۔ کچھ لیڈی ڈاکٹرز اور نرسیں میری جان پہچان کی ہیں وہ کام ہی یہی کرتی رہیں۔"

اورنگ زیب قاسمی

"یار تم تو بالکل احمق ہو" سراج بیزار ہوتے ہوئے بولا۔
"تم انکار کر دو کہ بچہ تمہارا نہیں ہے۔ وہ کوڑی کی لونڈی کون سا جا کر جہانگیری انصاف کا گھنٹہ بجائے گی؟"
شاہو خاموش رہا۔ خیال بھٹکنے لگے، لہروں میں ڈولنے لگے۔
سراج نے کہا ـــ کیا ثبوت دے سکے گی کہ بچہ تیرا ہے بولو۔ کیا ہے کوئی ثبوت؟"
شاہو نے جواب نہیں دیا۔ سراج اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ سراج نے اس سمجھاتے ہوئے کہا
"کسی کی پیشانی پہ یہ نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کون ہے؟ کس کی اولاد ہے؟ اور اگر ایسا ہوتا تو پھر دنیا کی آدھی آبادی حرامی کہلواتی ۔ تو انکار کر دے ۔"
"کیسے انکار کر دوں؟ میں کیسے انکار کر دوں... تجھے پتہ نہیں ہے؟ کیا مجھے پتہ نہیں ہے کہ بالی کے پیٹ میں میرا بچہ ہے ۔" "اس سے کیا فرق پڑے گا؟"
"کچھ بھی نہیں۔ شاہو نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا
"لیکن میں اپنے بچے کو بھیلوں کی ٹولی میں بھٹکتا ہوا کیسے دیکھ سکوں گا"
کچھ دنوں کے بعد بالی بچے سمیت دھکے کھا کر چلی جائے گی"
"اور میں بھیلوں کی ہر ٹولی میں ایک ایک بچے کو اپنا بچہ سمجھ کر سینے پہ برچھیاں کھاتا رہوں گا۔
"بچے سے تیرا کیا؟ دھکے کھانے دو"
"بے وقوف تو نہیں ہو سراج" شاہو نے غصے سے کہا
"سید کا بچہ بھیلوں میں بھٹکتا پھرے۔ یہ تیرے لئے کوئی بات نہیں ہے"
"اس کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے" سراج نے لاپرواہی سے کہا
"بالی کے بچے کو زندہ جنم نہیں لینا چاہیے ۔ کسی بھی حالت میں" شاہو نے فیصلہ کر دیا۔
سراج دروازہ دھڑام سے بند کر کے چلا گیا۔ سراج کے جانے کے بعد کمرے کی خاموشی شاہو کو ڈسنے لگی۔ دروازہ اور کھڑکیاں جیسے اس پہ دانت نکال کر ہنسنے لگے۔ ذہن کی تاب نہ لا کر اوندھے منہ بستر پر لیٹ گیا۔ اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔ ذہن بے حد پریشان تھا۔ خوفناک خواب دیکھنے لگا۔ کبھی بچھوؤں کو ڈنک اٹھا کر سینے پہ چلتے دیکھا تو کبھی سانپوں کے ہار پہن رہا تھا۔
اس نے بالی کو دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں نیزہ تھا اور اس کی تلاش میں تھی۔ ایک بدصورت جلاد اس کا سر قلم کرنے کے لئے تلوار لے کر آ رہا تھا۔ کبھی محسوس کر رہا تھا جیسے شعلوں نے پلنگ کو جکڑ دیا تھا۔ اچانک چونک کر اٹھ بیٹھا۔ بالی پہ غصہ آ رہا تھا جس نے اس کا جینا حرام کر دیا تھا۔ سامنے ہوتی تو جیسے ریوالور کی گولیوں سے اس کا سینہ چھلنی کر دیتا۔
اسی وقت دروازے پہ دستک ہوئی۔ شاہو نے پلنگ سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دروازے کے سامنے بالی کھڑی ہوئی تھی۔ چہرے پہ تکلیف کے آثار اور ہونٹوں پہ عجیب مسکراہٹ تھی۔ امید بھری نظروں سے شاہو کی طرف دیکھا۔ شاہو کی ٹانگوں کی نسیں کس گئیں۔ قدموں کو زمین نے جکڑ لیا۔
بالی کے خشک ہونٹ کچھ کہنے کے لئے لرزے ـــ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی ۔ شاہو کے چہرے کی طرف

دیکھا تو اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ دل جیسے سینے میں سکڑنے لگا۔ ہمت کرتے ہوئے کہا۔
"کسی نے بتایا ہے کہ تو آیا ہے۔"
شاہو پرس نکالتا ہوا بولا "کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟
"پیسے ... ؟"
"ہاں پیسے" شاہو نے کڑک آواز میں کہا۔
بالی پہ کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ "میں نے ٹوکرے بنانا چھوڑ دیئے ہیں"
"بکواس بند کرو" ..... شاہو نے دبی آواز میں چیختے ہوئے کہا۔
"اس گناہ کی قیمت لینے آئی ہو نا۔"
"گناہ" بالی پہ جیسے کھولتا ہوا تیل پڑ گیا اور اداس ہو گئی۔
"ہاں گناہ" شاہو نے پرس سے نوٹ نکال کر بالی کے منہ پر دے مارے'
وہ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح شاہو کی طرف دیکھنے لگی۔
"دیکھتی کیا ہو؟" اٹھاؤ یہ کاغذ کے ٹکڑے اور ہمیشہ کے لئے گم ہو جاؤ"
بالی نے اس ننھے بچے کی طرح شاہو کی طرف دیکھا جس کا کھلونا ٹوٹ گیا ہو --- دیکھتے ہی دیکھتے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رو پڑی۔
ہچکیوں کے دوران بولی۔ "میں نے ٹوکرے بنانا چھوڑ دیئے ہیں۔"
"تو پھر میں کیا کروں؟؟"
"ٹولی والے بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں"
"تم بھی یہ پیسے اٹھاؤ اور میری جان چھوڑو"
وہ خاموش رہی۔ آنسوؤں کو پی گئی۔
شاہو اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اس دوزخ میں پلتے ہوئے گناہ کو بھی ختم کر دو"
"یہ گناہ نہیں ہے" بالی نے سر اٹھاتے ہوئے کہا
"یہ گناہ ہے" شاہو نے سخت لہجے میں کہا
"میں ایماندار ہوں" بالی پہلی مرتبہ پختگی سے بولی
"میں تمہاری امانت میں خیانت نہیں کروں گی --- یہ گناہ نہیں ہے"
"میں تمہیں ریوالور کی پوری چھ گولیاں ماروں گا ---"
شاہو لوہے کی دیوار کی طرح اس کے سامنے جا کھڑا ہوا ..... میں اس گناہ کو زندہ جنم نہیں لینے دوں گا"
یہ گناہ نہیں ہے۔ تیرا بچہ ہے"
"کمینی کم ذات تم دو کوڑی کی ۔ جپسی ہو" شاہو نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ اور تجھے پتہ ہے کہ میں سید ہوں سید"
شاہو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ذرا پیچھے ہٹ کے ۔ زور سے بالی کے ابھرے ہوئے پیٹ پر گھونسہ دے مارا۔ بالی کے منہ سے صرف ایک ہچکی نکلی۔

اورنگ زیب قاسمی

کرنے پہ تھی کہ شاہو نے اسے پکڑ کر دروازے سے باہر دھکا دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ ہونٹ چباتے ہوئے بولا
"ہم اپنے امیتوں کو ہی خاطر میں نہیں لاتے۔ یہ کافر جپسی آئی ہے سید سے شادی کرنے" قہقہوں کو خوب دل کھول کر گالیاں دیں تیز تیز قدم اٹھاتا --- دیواروں پر مکے مارتا ہوا۔ اوطاق سے ہوتا ہوا۔ حویلی کی طرف چلا گیا.....
دو بھتیجیاں اور ایک بھتیجا ------ دوڑتے ہوئے آئے --- اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے ---
"چچا کھیل کھیلیں۔"
پریشان تھا۔ بے چینی دور کرنے کے لئے کہا" "آنکھ مچولی کھیلتے ہیں"
دل کو بہلانے کے لئے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا --- اس کے چھپنے کی باری آئی تو اسٹور روم میں جا کے چھپا۔ کمرے میں ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سانس اٹکا ہوا محسوس کرنے لگا۔ اسے لگا کہ گھٹن میں مر جائے گا۔ آگے بڑھا تو ٹوٹی ہوئی کرسیوں' میزوں اور خالی ٹوکریوں سے ٹکراتا ہوا پرانے پنگوڑے سے جا ٹکرایا۔
پنگوڑہ ------ چرچراہٹ کے ساتھ ہلنے لگا ..... چرچراہٹ کی آواز سے روشندان میں بیٹھے ہوئے کبوتر پھڑپھڑاتے ہوئے اڑنے لگے۔ ایک چمگادڑ چکر کاٹ کر اس کے بالوں سے ٹکراتا ہوا دیوار کے سوراخ میں گم ہو گیا۔
اس کا دل جیسے اپنی جگہ سے اکھڑ گیا اور سینے کے قید خانے میں چکر کاٹنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے دائرے رقص کرنے لگے۔ گرتے گرتے بچا تھا کہ دیوار سے ٹکرایا۔ کمرے پہ خاموشی مسلط ہو گئی۔ صرف پنگوڑے کی چرچراہٹ خاموشی کو توڑ رہی تھی --- ذہن کے گھمسان نے بگولے کی طرح اس کے خیالوں کو گھیرے میں لے لیا۔ سوچ کے ہزاروں سلسلے بنے اور ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح روشنی کی لکیر بناتے ہوئے گم ہو گئے۔
"موہنجو داڑو" ایک لمحے میں بن کر' ڈھیر ہو گیا --- روح کے کھنڈرات میں بازگشت گونجنے لگی۔
"آخر کیسے ایک ۔ جپسی کو ہمت ہوئی --- کیسے سید کے بچے کو اپنے غلیظ اور گناہ گار پیٹ میں پالنے کی ہمت کی --- میں اسے اور اس کے پیٹ میں پلنے والے بچے کو ہمیشہ کے لئے ختم کروں گا"
ایک مرتبہ پھر کمرے میں --- گہری تاریکی طاری ہو گئی۔ وحشت ناک اندھیرے اور خاموشی میں اسے اپنے دل کی دھڑکنیں سنائی دینے لگیں۔ تب اچانک --- کسی نے دو ہاتھ اس کے سینے پر رکھے۔ اور اس کی چیخ نکل گئی چھوٹے چھوٹے معصوم قہقہے کمرے میں گونجنے لگے۔
"چچا ڈر گیا' چچا ڈر گیا..."
شاہو نے اپنے بھتیجے کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور بازوؤں میں بھینچتے ہوئے بولا "ہاں ..... میں ڈر گیا تھا...... میں ڈر گیا تھا"
شاہو نے بھتیجے کو وہیں آغوش سے اتارا --- اور تقریباً" دوڑتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچا اور اوندھے منہ لیٹ گیا۔

شام کی دھیمی روشنی کو کالے بادلوں نے سیاہ کر دیا تھا۔ ماحول میں حبس تھا۔ دریا سے جیسے بھاپ اڑ رہی تھی۔ جب بھی روہڑی کی شام میں حبس اور گھٹن بڑھتی ہے تو تب کہیں نہ کہیں سے۔۔۔ ہوا کے بگولے۔۔۔ اور مٹی سے بھری ہوئی آندھی آ ٹپکتی ہے۔ شاہو کے اندر میں بے چینی تھی۔ تکیے میں منہ چھپا لیا۔

سراج نے دروازہ کھٹکھٹا کر آواز دی۔

شاہو نے دروازہ کھولا ۔۔۔ وہ ہانپتا ہوا اندر آیا۔ سرا جسم پسینے میں لت پت ہو رہا تھا لگتا تھا جیسے میلوں سے دوڑتا ہوا آرہا ہو۔ اپنے آپ کو موڑھے پر چھوڑ دیا۔ قمیض کی آستین سے پسنہ پونچھتے ہوئے بولا

"کم بخت نے بچے کو جنم دے دیا"

"اف" شاہو نے دونوں مٹھیاں بالوں میں بھینچ لیں۔ اور اپنے آپ کو پلنگ پر چھوڑ دیا۔ کتنی دیر تک دونوں دوست، خاموش رہے۔ اپنے اپنے خیالوں میں الجھتے رہے۔

"کہاں ہے ؟" شاہو نے خاموشی کو توڑا۔۔۔

"ہیرانند کی پرانی جگہ میں جا کر منہ کالا کیا۔" سراج نے جواب دیا۔

کچھ پوچھنے کے لئے الفاظ شاہو کے ہونٹوں تک پہنچ کر پیچھے لوٹ گئے۔ جو کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا اس کے لئے ہمت نہیں پا رہا تھا جواب کے تصور سے اسے کپکپاہٹ ہو رہی تھی۔

آخر پوری قوت مجتمع کرتے ہوئے پوچھا۔

"بچہ ... ! لڑکا ہے 'یا ! !۔

"لڑکی ۔"

"لڑکی" شاہو کے منہ سے چیخ نکل گئی ... ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے زمین و آسمان کے درمیان الٹا لٹکا دیا ہو۔ دنیا کو قلابازیاں کھاتے ہوئے دیکھا۔ کائنات کو چیختے ہوئے دیکھا۔

"مجھے تنہائی چاہیے ... " شاہو نے زخمی لہجے میں کہا..... "تم چلے جاؤ سراج"

سراج نے شاہو کی دلی کیفیت بھانپ لی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر شاہو کے پاس آیا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

سراج کے جانے کے بعد ہیبت ناک اندھیرے ..... تنہائی اور خاموشی میں شاہو کا دل ڈوبنے لگا۔ دو متضاد جذبوں کے گھوڑے اس کے سینے کی زمین کو روندتے رہے۔ اپنے آپ کو جس پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوا محسوس کررہا تھا۔ وہ دلدل میں تبدیل ہوگیا تھا پسینے کے ریلے ۔۔۔ کانوں کے پیچھے اور کاندھوں پہ جوؤں کی طرح رینگتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔

اس نے آنکھیں مل کر بے چینی سے پہلو بدلا

تصور خزاں رسیدہ پتے کی طرح' واہمے کی تیز ہوا میں ڈولنے لگا۔ وہ لمحہ یاد کرنے لگا۔ جب اس نے بالی کی عزت لوٹی تھی۔ وہ لمحہ یاد آنے لگا جب بالی نے دروازے سے جاتے جاتے پیچھے مڑ کر کہا تھا..... میں تو تڑے بانا شوز دوں گی"

بالی کی درد ناک نگاہیں یاد آئیں جن سے اس نے آخری بار اسے دیکھا تھا۔ اور وہ راتیں یاد آنے لگیں جن کے دوران اس نے بالی کو ہمیشہ کے لئے بھلا دیا تھا۔ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے .....

اورنگ زیب قاسمی

"ایکسلشیئر" کی یونانی رقاصہ آلفزی ہوئی ۔ جس نے آدھی رات کو اس کے کپڑے کھڑکی سے باہر پھینک کر اسے دھکا دے کر کمرے سے باہر نکال دیا تھا۔ اس شرمناک لمحے میں اس نے اپنے آپ کو ہوٹل کے برآمدے میں ننگا کھڑا ہوا پایا تھا۔ اچانک بھیلوں کی ٹولی میں اپنی پیاری بیٹی کو بھٹکتے ہوئے دیکھا ۔۔۔۔ خیرات کے لئے ہاتھ پھیلائے ہوئے دیکھا۔ اسے جوان ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ جیسے وہ ٹوکرے بنا رہی ہے۔ آخر میں کسی عیار اور مکار مرد کے وعدوں پر اپنی بیٹی کو عصمت کا انمول زیور قربان کرتے ہوئے دیکھا۔

وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ دل سینے میں جل رہا تھا خیال کسی بھٹکتے ہوئے قافلے کی طرح مختلف راہوں کی طرف رخ بدلتے رہے۔ سوچ کی لکیریں۔ کسی معصوم بچے کے بنائے ہوئے نقش' کی طرح بے ترتیب محسوس کرنے لگا ... لیکن اچانک ایک لکیر... ایک راہ اسے نظر آئی۔

وہ اچھل کر پلنگ سے اترا۔ لائٹ نہیں جلائی۔ اندھیرے میں الماری کے خانے سے ریوالور نکالا۔ ریوالور میں گولیاں بھر کر الماری سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہوگیا۔ پہلے جیسی خاموشی نہیں تھی ۔ کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں ہوا میں بجنے لگیں۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔

جلدی جلدی کمرے سے نکل آیا۔ ریوالور پہ رومال لپیٹ کر اسے جیب میں رکھ لیا۔ ریوالور کا دستہ باہر رہ گیا۔ جس کو اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کمرے کا دروازہ بند کرکے "ہیرانند" کے پرانے مکان کی طرف بڑھنے لگا۔

سارے دن کی جھلساتی ہوئی گرمی اور شام کی گھٹن کے بعد تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ شاہو آنکھیں ملتا ہوا ۔۔۔ تنگ گلیوں سے تقریبا ۔۔۔۔۔ دوڑتا ہوا "ہیرآنند" کے پرانے مکان کے باہر آکر کھڑا ہوگیا۔ اندھیرے کمرے میں تیز ہوا شور مچا رہی تھی۔

وہ برآمدے میں جا کھڑا ہوا تاریکی میں اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے جیب سے ماچس نکال کے ایک تیلی جلائی گندرف کی شعاع شعلہ بننے سے پہلے ہی بجھ گئی۔ ہوا تیز ہوتی جارہی تھی۔ اس نے آگے قدم بڑھایا۔ ساتھ والے کمرے سے بچے کے رونے کی آواز آنے لگی۔

اس کا دل کانپ گیا۔ بغیر کوئی آواز پیدا کئے۔ وہ کمرے میں داخل ہوگیا۔ قدم کسی نرم چیز سے ٹکرائے اور اس کے ساتھ ہی بچے کے رونے کی آواز میں اضافہ ہوگیا۔ اس نے یکدم اپنا پیر پیچھے ہٹا لیا جیسے کسی بلا سے ٹکرا گیا۔ دوبارہ ماچس کی تیلی جلائی ایک لمحے کو شعلہ جلا اور بجھ گیا۔ اس لمحے اس نے بالی کو دروازے کے پاس بے سدھ پڑا ہوا پایا۔

وہ کچھ دیر اپنی ہمت اور قوت کو مجتمع کرتا رہا۔

آخر کار شاہو نیچے جھکا .... اور بچی کو گود میں لے لیا۔ بچی کو ایک بازو میں لے کر دائیں ہاتھ سے ریوالور نکال کر۔ اس کے اوپر کرکے کھڑا ہوگیا۔ بچی کا منہ اتنا دور بھی نہ تھا کہ اسے نظر نہ آسکے۔ اس نے غور سے دیکھا۔ اور پھر...

ریوالور کی نال بچی کے روتے ہوئے منہ میں داخل کی۔ اچانک بچی کے رونے کی آواز بند ہوگئی۔ وہ ریوالور کی نال کے سرد لوہے کو چوسنے لگی۔

شاہو کی انگلی ٹرِیگر پہ جم کے رہ گئی۔
تیز ہوا کے جھونکے زمین سے مٹی کے بادل اٹھا کر آسمان کی طرف اڑنے لگے۔ بڑ اور پیپل کے سوکھے پتے پرانے مکان کے برآمدے میں تڑپنے لگے۔
شاہو کے دل میں خوف کے دو جذبے جاگ اٹھے۔
گناہ اور جرم کے جذبے۔
پہلے اس نے خدا کے بارے میں سوچا اور پھر پولیس کے بارے میں
اس نے سوچا پولیس کو راضی کرنا' اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دولت کی فراوانی تھی۔ پیٹھ پیچھے مضبوط لوگ تھے ایسے لوگوں کا پولیس بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ تو زائیدہ بچی تو کیا وہ اگر بھرے بازار میں کسی گھبرو کو بھی قتل کر دیتا تب بھی پولیس اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایسا ہوتا رہا تھا۔ یہی دستور تھا۔ جس سے وہ پوری طرح باخبر تھا۔ رہ گیا خدا ــــ!
تو خدا سے اس نے اتنا خوف محسوس نہیں کیا۔ اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہ کام وہ خدا کی راہ میں ہی تو کر رہا ہے۔ سادات کی بچی کو بھیلوں میں بھٹکنے سے بچا رہا تھا۔ قیامت کے دن خدا تو اسے اس بات کا اجر دے گا۔
اس نے سوچا اگر ایسا نہ ہوا۔۔۔ اور خدا ناراض ہو گیا ــــ تو پھر خدا کو راضی کرنے کے لئے اس کے پاس زبردست خاندانی شجرہ تھا۔
لوہا بنے ہوئے دماغ میں اسے خیال آیا کہ جنہوں نے اس شجرے کی ارتقاء کی تھی وہ سب جنت میں ہوں گے۔ خدا کو راضی کرنے میں دیر نہیں کریں گے۔
اس کے خیالات کا سلسلہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا۔ وہ گرنے کے قریب تھا کہ دیوار سے جا لگا۔ بالی نے اس کی ٹانگوں کو اپنے بازوؤں میں مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ شاہو کی ہمت جواب دے گئی۔
دل کا پنچھی پر پھڑپھڑانے لگا۔
"کون ہو؟" بالی کمزور آواز میں بولی
شاہو خاموش رہا۔
"کون ہے ..... ؟ میری بچی کو تو نے ہی اٹھایا ہے۔
شاہو خاموش رہا۔
"بتاتے کیوں نہیں ــــ کون ہے" بالی نے التجا کی
"کون ہے تو؟"
شاہو خاموش رہا۔
وہ رو پڑی ... تو میری بچی کو مارنے آیا ہے"
اس نے نحیف سی آواز میں کہا
"مجھے مارو ــــ اس کو مت مارو"
شاہو خاموش رہا۔ اس نے شاہو کی ٹانگیں چھوڑ دیں۔ وہ کراہ کر کھڑی ہو گئی۔ اندھیرے کی وجہ سے شاہو کو نہ پہچان سکی۔ اندھیرے میں کچھ دیر تک ' دونوں' اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔

اورنگ زیب قاسمی

لوہے کی بالی بچی کو ممتا نہ دے سکی۔ وہ رونے لگی۔
بالی سے رہا نہ گیا زخمی عقاب کی طرح جھپٹا مار کر اپنی بچی کو شاہو کے بازوؤں سے چھین لیا۔ "شاہو" نے بچی واپس لینے کی کوشش نہیں کی۔ جس ہاتھ میں ریوالور تھا اسے نیچے جھکا دیا۔
بالی نے بچی کو اپنے سینے میں چھپایا اور سہمی ہوئی نگاہوں سے شاہو کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن وہ شاہو کو نہ پہچان سکی۔ وہ آہستہ آہستہ کمزور سے فرش پر بیٹھ گئی۔ بچی کو دودھ پلاتے ہوئے شاہو سے مخاطب ہوئی۔
"تجھے خبر ہے کہ یہ کس کی بچی ہے"
شاہو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کوئی جواب نہیں دیا' خاموش رہا۔
بچی کو بازوؤں میں بھینچتے ہوئے دوبارہ کہا
"اسے مارنے آیا تھا نہ ــ تجھے خبر بھی ہے یہ کس کی بچی ہے ؟"
شاہو کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ لوؤں کی رگیں اکڑ گئیں اور دماغ دھمکنے لگا بالی کی ممتا جوش میں آ گئی۔
بچی کو پیار سے چومنے لگی۔ ریشم جیسے بال' کپاس جیسے گال اور چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھ بار بار چومنے لگی۔
اسے یوں دیوانہ وار چوما کہ بچی رونے لگی۔
"نا میری بچی تجھے کون مارے"
وہ بچی کو سہلانے لگی۔ اچانک کوئی خیال آتے ہی منہ اوپر اٹھا کر اندھیرے میں کھڑے ہوئے شاہو سے کہا
"تجھے خبر ہے یہ کس کی بچی ہے ؟"
شاہو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے خاموش پا کر بالی خود ہی بولی۔
"اس کا کوئی بھی باپ نہیں ہے۔ اس کا کوئی بھی باپ نہیں ہے۔"
بالی بلبلا کر رونے لگی۔ شاہو کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آ کھڑا ہوا۔ کچھ خشک پتے اس کے قدموں کے نیچے چرچرا کر خاموش ہو گئے۔ ہوا کا زور بڑھ گیا۔ پرانے مکان کی بنیادیں لرز رہی تھیں۔ ماحول کو تاریکی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ گھپ اندھیرے میں بالی شاہو کو پہچان نہ سکی۔

("مصرع" کراچی)

علی احمد بروہی
ترجمہ: سعیدہ درانی

(سندھی سے ترجمہ)

رانجھو مداری

میں نے اس کے ساتھ پورے سال کا سودا کیا تھا۔ ہفتے میں دو دفعہ وہ میری گلی کے کونے پر کھڑے ہو کے میری کھلی کھڑکی کو گھورتے ہوئے گاتا اور ساز چھیڑتا تھا اور راگ ختم ہونے کے بعد گردن خم کر کے خدا حافظ کہتا ہوا اپنی راہ لیتا تھا۔ اس کی دلچسپی سر سورٹھ سے تھی لیکن میری درخواست پر اس نے کچھ عرصہ سے سرمتانی الاپنا شروع کیا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ چوتارہ کی آواز کی مٹھاس اور پر لطف لے، ستار اور وائلن (Vollin) جیسے قدیم سازوں کی طرح ہے۔ رانجھو کا چوتارہ بھی میری نظر میں بہت اچھا نہ سہی لیکن پھر بھی موجودہ وقت کے سازوں سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ اس ساز کی تاروں میں ایک عجیب اور انوکھی کشش تھی، جس کو چھیڑنے سے سننے والوں کے دلوں میں بے پناہ جوش اور ہلچل پیدا ہوتی تھی۔ ہر تار کی حرکت ایک حسینہ کی سسکیوں سے شروع ہو کر گہری نیند میں سوئے معصوم بچے کی پرسکون سانسوں پر ختم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ساز کے تار سر سے ناراض ہو کر کوئی علیحدہ ہی آواز چھیڑتے تھے اور اس وقت عمر رسیدہ رانجھو چوتارہ بغل سے نکال کر سینے پر رکھ کر تاروں کی گوشمالی کرتے ہوئے ٹھیک ہوتا تھا۔

چوتارہ اپنے بجانے والے کا غمخوار تھا لیکن ساز کی صدا غم انگیزی سے پر تھی، جس سے میں متاثر ہو جاتا تھا۔ اس میں فقیر کا مخصوص حصہ بہت حد تک نمایاں ہوتا تھا۔

میری رانجھو سے پہلی ملاقات ایک اندھیری رات کو ہوئی تھی۔ میں ٹہلنے کے لئے نکلا۔ راستے میں تھکاوٹ کے سبب ایک طرف پڑے بینچ پر کچھ دیر کے لئے بیٹھ گیا۔ خزاں کا موسم تھا، درختوں کے پتے تیز ہوا سے بارش کے قطروں کی طرح زمین پر گر رہے تھے۔ میں خاموش ماحول سے متاثر ہو کر عجیب و غریب خیالوں کے عمیق دریا میں غوطہ زن تھا کہ اچانک قریب ہی باغ کے کونے سے ایک گداگر کے گانے کی آواز نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی، جیسے ہی میں اٹھا راگ کی آواز بند ہو گئی۔ گداگر کافی دیر اپنے گیت دوہراتا رہا تھا اور کنجوس سننے والوں کی قطار کو مایوس نظروں سے دیکھتا ہوا اپنے ساتھی بندر کو اپنے پھٹے ہوئے کوٹ کے دامن سے چھپاتا اپنی راہ جانے لگا۔ مجھے چوتارے یا دوسرے ایسے سازوں سے ایک خاص قسم کی کشش یا راحت محسوس ہوتی ہے گو کہ میں راگوں کے بارے میں اتنا نہیں جانتا لیکن پھر بھی اچھے اور برے راگ کا فرق محسوس کر سکتا ہوں۔ میں لمبے ڈگ بھرتا اس کے قریب پہنچا، اس کے گانے کو سراہا اور التجا کی کہ اگر وہ

اورنگ زیب قاسمی

بہت زیادہ تھکا ہوا نہیں ہے تو کچھ دیر کے لئے ساز چھیڑے۔ میری بہت زیادہ تعریف نے بھی اس پر کچھ اثر نہیں کیا کیونکہ میں نے دیکھا کہ اس کے غمگین چہرے پر ایسی بے اعتباری تھی، جس نے میرے جذبات کو مجروح کر دیا۔ گداگر نے ہکلاتے ہوئے پوچھا کہ میں شاید کسی خاص راگ کی فرمائش کر رہا ہوں لیکن یہ سارے بوجھ میں نے اس کے کاندھے ڈال دیئے۔ رانجھو نے ساز کے تار چھیڑنے شروع کئے اور ایک انگلی سے کام لیتے ہوئے ساز کو اپنے سر کی سطح پر لایا اور بجانا شروع کیا ساز سے ہاتھ ہٹا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "یہ سر صرف دوستوں کے لئے ہے۔"

یہ راگنی اور سر دونوں میرے لئے نئے تھے کیونکہ اس سے پہلے میں نے رانجھو کو کبھی گاتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ رانجھو نے راگ الاپتے ہوئے میری طرف شرمیلی نظروں سے دیکھا اور گردن جھکا کر سلام کیا۔ میں نے جواباً" سراہا کر داد دی۔ اس طرح ہماری جان پہچان ہو گئی۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ زمانے نے رانجھو کے ساتھ بے حد زیادتی کی تھی۔ اس کے عمر رسیدہ جسم پر پھٹے پرانے کپڑے تھے۔ اس کے خشک پیلے اور جھری دار چہرے پر غریبی کے آثار اس طرح نمایاں تھے کہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ پوری زندگی اس نے ناکامیوں کا منہ دیکھا ہے لیکن اس کا ساتھی بندر کس جگہ کا رہنے والا تھا، یہ معلوم نہیں ہو سکا۔

اکثر و بیشتر چاکیواڑہ اور قریب آباد کا چکر لگاتے ہوئے میری اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ہر دفعہ اس کا راگ سننے کے لئے میں کچھ دیر کے لئے اس کے پاس رک جاتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ میرے آنے پر بہت خوش ہوتا ہے۔ راستے سے آوارہ کتوں سے دوستی کرنے کے لئے ہی جیب میں حلوہ" بسکٹ روٹی کے سوکھے ٹکڑے، مصری کی ڈلی رکھتا تھا، اس کی وجہ سے بندر سے بھی میری دوستی بڑھ گئی۔ بندر اور رانجھو کے آپس میں گہرے تعلقات تھے۔ جانوروں میں ہنر سیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور ان کی ناکامی کے باوجود بھی ان سے پیار کم نہیں ہوتا۔ رانجھو نے مجھے بتایا کہ اس کی بے حد کوشش کے باوجود اس کا ساتھی کوئی کھیل نہیں سیکھ سکا ہے، اس لئے اس کو ہنر سکھانے کی کوشش بیکار سمجھ کر چھوڑ دی ہے اور ساتھ رہنے کے سوا اس کی اور کوئی ڈیوٹی نہیں ہے۔ بندر کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ عمیق سوچوں میں غرق ہے۔ ان خیالوں سے وہ کبھی کبھی جاگ جاتا تھا کیونکہ اسے خیالات میں محو دیکھ کر شہر کے لڑکے اس کی دم کھینچنے کی کوشش کرتے، جو اس کے جسم پر پھٹی ہوئی صدری سے باہر نکلی ہوئی تھی۔

میری بندر سے گہری دوستی ہو گئی تھی۔ وہ بغیر کسی ڈر کے اپنا جھریوں بھرا ہاتھ میری طرف بڑھاتا تھا اور وہ سب کچھ قبول کرتا تھا جو میں اسے دیتا تھا۔ مٹھائی اسے بہت پسند تھی۔ اس کے خیال کے مطابق سونگ پھلی دنیا کی بہترین سوغات تھی۔ رفتہ رفتہ ہماری دوستی اور گہری ہوتی گئی۔ اس طرح خزاں ختم ہوئی، سردیوں کا آغاز ہوا۔ امیر اور سرمایہ دار طبقہ گرم کپڑوں کے نت نئے فیشن ایجاد کرنے لگے اور غریب آدمی سردی کی شدت سے کانپتے رہے۔ گلیوں میں رہنے والوں کے لئے روٹی کا مسئلہ مشکلات پیدا کرتا رہا۔ سرمایہ داروں کی بند کھڑکیوں کے آگے فن موسیقی کے ماہر اپنے نفیس اور صاف ستھرے جوہر کا مظاہرہ کرتے رہے لیکن سب بیکار اور رائیگاں ہو گئے۔ رانجھو سردی میں اپنی اکڑی ہوئی انگلیوں سے چوتارے کے تار چھیڑتا، سردی سے کانپتا بندر دف بجاتا لیکن وہ میٹھے آلاپ، غمگین پکاریں اور سرد آہیں انسانوں کے پتھر دلوں پر اثر کرنے کے بجائے باہر کی سردی میں جذب ہو جاتیں۔ رانجھو کے کشکول میں بھی بارش کی بوندیں زیادہ جمع ہوتی گئیں اور پیسے کم ہوتے

گئے۔ جیسے جیسے میرے امتحان قریب آتے گئے ویسے ویسے میرے خیالات اپنی شخصیت تک محدود ہوتے گئے۔ اس طرح میں اپنے فقیر دوست اور اس کے معصوم ساتھی بندر کو جو سردی سے ٹھٹھر رہے تھے، ان کو اپنے سجے سجائے گرم کمرے میں لا کر مدد کرنے کے بجائے بھول گیا۔

امتحانوں کے بعد ایک مہینے کی چھٹی پر میں اپنے گاؤں چلا گیا اور جب کراچی واپس آیا تو نئے سال کا آغاز تھا۔ جمعہ کا دن تھا مسجد سے لوگ نماز ادا کر کے باہر نکل رہے تھے، ہمیشہ کی طرح فقیروں کی ایک لمبی قطار مسجد کے دروازے کے آگے نمازیوں کی سخاوت کے آسرے پر کھڑی تھی۔ سخت سردی کی وجہ سے فقیروں کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ ہمیشہ موجود رہنے والے گداگر، لنگڑوں اور اندھوں کے علاوہ کچھ اور بھی غربت کے نئے رنگروٹ تھے جو لوگ خاموشی سے کھڑے تھے اور دوسرے اپنے دستور کے مطابق چاروں طرف گھوم کر، چلا چلا کر اپنی کم بختی اور بدنصیبی کی تاریخ دہرا رہے تھے۔ ان میں کچھ ایسے غریب مزدور بھی تھے جن کی روزی سردی کی وجہ سے بند ہو گئی تھی اور ان کی انا سخت سردی میں بے جان ہو چکی تھی جس سے وہ بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

قطار کے آخر میں ایک بیرن فقیر چپ چاپ ہاتھ میں کشکول تھامے سر جھکائے کھڑا تھا اس فقیر کو میں نے اچھی طرح پہچان لیا وہ رانجھو تھا لیکن اس کے پاس نہ چوتارہ تھا نہ اس کا ساتھی بندر۔ پہلے میرا دل چاہا کہ قریب جا کر اس کی مزاج پرسی کروں لیکن نہ معلوم کیوں قدم اٹھ نہ سکے۔ مجھے اپنے اندر کوئی طاقت اتنا شرمسار کرنے لگی کہ میں فقیر کے آگے سر اٹھا کر بات کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ ایک بے جان بت کی طرح اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ مسجد سے بوڑھے، بچے اور جوان نکل کر جا رہے تھے، بہت سے لوگ فقیروں کے برابر سے گزرتے ہوئے کچھ دیر ٹھہر جاتے اور جیب میں ریزگاری ٹٹولتے لیکن میں نے رانجھو فقیر کے کشکول میں ایک بھی تانبے کا سکہ گرتا ہوا نہیں دیکھا۔ مسجد سے لوگ چل گئے اور فقیر بھی تھوڑی بہت خیرات لے کر اپنی اپنی راہ چلنے لگے آخر میں ایک بچہ مسجد سے نکلا اس کے ساتھ ایک دوسرا آدمی بھی تھا جو شاید اس کا والد تھا۔ اس نے فقیر کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ بچہ دوڑ کر فقیر کے پاس گیا اور ایک چاندی کا سکہ اس کے کشکول میں ڈال دیا۔ گداگر نے نہایت عاجزی سے سر خم کیا اور میں نے دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ پتہ نہیں کیوں اس بچے کے پیسے دینے سے مجھے خوشی ہوئی۔ میرے فقیر دوست نے اس معصوم کے بے بہا تحفے کو اپنے پرانے رومال کے پلو سے کس کر باندھا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی جیسے اب بھی وہ چوتارے کے بوجھ کی وجہ سے جھکا جا رہا ہو۔

اس دن مجھے کوئی خاص کام نہیں تھا، میں رانجھو کا پیچھا کرنے لگا۔ ایک دو دفعہ تو میں اس کے بالکل نزدیک پہنچ گیا لیکن جب اس کے اور میرے درمیان ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تو میں نے خود کو روک لیا۔ رانجھو میری موجودگی سے بے خبر اپنی دھن میں جا رہا تھا۔ سردی کا زور بڑھ گیا۔ سردی سے بچنے کے لئے میں نے اپنے اونی اوور کوٹ کے بٹن بند کرنے شروع کئے۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ آخر اس کا سبب کیا ہے کہ میں تو گرم اونی اوور کوٹ کا مالک ہوں اور یہ بیرن جو میرے آگے کانپتا ہوا جا رہا ہے، اس کا لباس ایک پھٹی پرانی صدری اور پرانی الفی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ کیا راز ہے کہ میرے گھر خاص طعام تیار ہوا ہے اور اس گداگر کے نصیب میں سوکھی روٹی بھی نہیں ہے۔ گرم کمرے اور بستر کے خیال نے

اورنگ زیب قاسمی

میری سردی کو کم کر دیا تھا، اور مسکین بوڑھا پورے شہر کے دھکے کھاتا بغیر کسی گرم کپڑے کے اپنی جھونپڑی میں رات گزار کر دوسرے دن پھر دربدر ہونے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ دونوں کے درمیان کیا فرق تھا؟

ان سوالوں پر غور کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ کیوں میں مسجد کے قریب رانجھو کے پاس نہیں جا رہا تھا۔ میں اپنی خوش قسمتی اور رانجھو کی بدنصیبی پر شرمسار تھا۔ مجھے اس وقت یوں محسوس ہوا جیسے اس کی کوئی چیز میرے قبضے میں ہو اور اسے واپس کرنا میرا فرض ہو۔

میں اپنے خیالوں سے چونک پڑا کیونکہ اس نے ایک مٹھائی والے کی دوکان پر کھڑے ہو کر اپنے رومال سے معصوم بچے کا دیا ہوا سکہ نکال کر دوکاندار کے سامنے رکھا۔ دوکاندار سے کاغذ میں لپٹی کوئی چیز لے کر تیز تیز قدموں سے غریب آباد کا رخ کیا۔ جانوروں کے ہسپتال کے پیچھے ایک گندی سی جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔ ایک دو منٹ کے انتظار کے بعد میں بھی اندر چلا گیا۔ کوٹھڑی میں دیئے کی ہلکی روشنی تھی، کوٹھڑی کے بیچ اپلے جل رہے تھے، جس کے دھوئیں سے گھٹن سی ہو رہی تھی۔ ایک کونے میں چٹائی پر تین بچے سو رہے تھے اور برابر کی دیوار پر قرآن شریف رکھا ہوا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی کھٹولی پر ایک بوڑھا شخص بھی تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ بندر والا فقیر دوسری کوٹھڑی میں ہے۔ میں نے دوسری کوٹھڑی کا دروازہ آہستگی سے کھول کر اندر دیکھا۔ کوٹھڑی کے بیچ لکڑیاں جل رہی تھیں۔ آگ کے قریب ایک پرانی رلی پر بندر لیٹا تھا۔ اس کے سامنے ایک اخبار کے ٹکڑے پر مصری کی ڈلی، تھوڑی سی مونگ پھلیاں اور چنے پڑے ہوئے تھے۔ مگ میں تھوڑا سا دودھ آگ پر گرم کرتے ہوئے فقیر بندر سے باتیں کر رہا تھا۔

"دیکھو تمہارے لئے دودھ گرم ہو رہا ہے ..... دودھ بھی میٹھا ہے ..... مصری ملی ہوئی ہے ..... بہت اچھی چیز ہے ..... اس کو پینے سے تم جلد ہی اچھے ہو جاؤ گے۔ پہلے دودھ پینا اس کے بعد دوسری چیزیں کھانا۔"

بندر کا سوکھا اور کمزور ہاتھ مونگ پھلیوں کی طرف بڑھا اور ایک دانہ منہ میں ڈال کر اپنا منہ پھٹی ہوئی اوڑھنی سے ڈھک لیا۔ فقیر نے دودھ گرم کر کے پیالی میں ڈالا اور بندر کے اوپر پڑی ہوئی گدڑی اتاری بندر کی آنکھیں سرخ تھیں۔ تیز تیز سانس لینے سے اس کا سینہ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ اس کا چھوٹا سا منہ پچکا اور پھیکا سا تھا۔ فقیر اس کو گود میں لٹا کر بڑے پیار اور ممتا سے چمچے سے دودھ پلانے لگا۔ بندر ایک ہاتھ رانجھو کی داڑھی پر پھیرنے لگا۔ بندر اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ گردن بھی نہیں اٹھا سکتا تھا، رہ رہ کر وہ اس طرح کھانس رہا تھا کہ پورا جسم کانپنے لگتا۔ فقیر نے غم سے گردن ہلائی اور بندر کو واپس چٹائی پر لٹا دیا۔

رانجھو کی میرے اوپر نظر پڑی تو اس کے چہرے پر عجیب حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ تمہیں اس گھر میں جاتے دیکھا تو میں بھی پیچھے پیچھے چلا آیا تاکہ میں تمہیں اپنا نیا ایڈریس بتاؤں اور سردیوں میں بجنے والے چوتارے کی دھن سن سکوں۔ چوتارے کا خیال آیا تو میں نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا لیکن چوتارہ کہیں نظر نہ آیا۔ رانجھو میرا مطلب سمجھ گیا اس نے بتایا کہ وہ اب چوتارہ نہیں بجاتا اور صرف گاتا ہے۔ جلتی ہوئی لکڑیاں، کھونٹی پر لٹکے ہوئے پرانے کمبل اور اخبار پر پڑی ہوئی مٹھائیاں دیکھ کر بات سمجھ میں آ گئی کہ چوتارہ اس وقت کہاں ہو گا۔

رانجھو کے بتانے پر معلوم ہوا کہ بندر دو ہفتوں سے بیمار ہے میں نے اور رانجھو نے بندر پر جھک کر اس کی حالت کا اندازہ لگانا شروع کیا۔ بیمار بندر نے اپنی گونگی نگاہ سے میری مدد مانگی۔ اس کی ناک بے حد گرم ہو

رہی تھی، جیسے بچوں اور کتوں کی بیماری کے وقت ہوتی ہے۔ اس کا منہ بوڑھی عورت کی طرح جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی سانس تیز اور پھیپھڑوں سے گھر گھر کی آواز آ رہی تھی۔ بندر کی بیماری سمجھنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس کی سانس کی بیماری تھی۔

رانجھو کو تسلی دے کر میں جانوروں کے ہاسپٹل سے ڈاکٹر لے آیا۔ اس نے بندر کا معائنہ کرنے کے بعد ناامیدی ظاہر کی کہ مرض لاعلاج ہو چکا ہے۔ تقریباً ایک ہفتہ مزید فقیر کی جھونپڑی میں آگ جلتی رہی اس کے بعد ٹھنڈا، اندھیرا اور خاموشی چھا گئی۔

یہ حقیقت ہے کہ رانجھو کو اس کا گروی رکھا ہوا چوتارہ واپس مل گیا اور کبھی کبھی اس کے کشکول میں پیسہ ٹکہ بھی گرتا ہوا دیکھا تھا اور یوں فقیر بھوک سے نہیں مرا۔ یہی فقیر کی زندگی کا مقصد تھا، اور اس سے زیادہ اس نے خدا سے مانگنے کی تمنا بھی نہیں کی تھی۔

موسم بہار میں ہمیشہ کے لئے کراچی کو خیرباد کہہ کر میں گاؤں آیا۔ پتہ نہیں رانجھو کہاں ہے اور اس کا کیا حال ہے۔ ابھی حال ہی میں حکومت پاکستان نے گداگروں کو کراچی سے نکالنے کا قانون پاس کیا تھا۔ میں رانجھو کی خبرگیری کرنے کے لئے کراچی آیا لیکن مجھے مایوس ہو کر واپس آنا پڑا۔ اگر کسی شخص کو رانجھو کے بارے میں علم ہو تو خدا کے واسطے مجھے مطلع کرے میں اس کا شکر گزار رہوں گا۔ اگر کبھی کسی کے کان میں چوتارے کی آواز آئے تو دروازے پہ جا کے گداگروں کو کچھ پیسے دیں۔ شاید وہ رانجھو مداری ہو۔

اگر اس کے چوتارے سے آپ لطف اندوز نہ ہو سکیں تو کچھ دور کھڑے ہو کر سنیں شاید اس طرح کچھ لطف آئے لیکن اسے مایوس کر کے واپس نہ کریں۔ اس سے سخت کلامی نہ کریں.....

مبادا وہ رانجھو ہو!

("ادبیات" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

نور الہدیٰ شاہ
ترجمہ: احمد نصیر

(سندھی سے ترجمہ)

یہ پہاڑ جیسی رات کب ختم ہوگی

سورج ڈھلتی شام کے دھندلکے میں، زخمی اور ننگے پیروں سے اڑنے والی مٹی اور دھول میں دھندلاتا جا رہا ہے۔ شام کا وقت اور اوائل نومبر کی ہلکی ہلکی سرد ہوا۔ سیاہ ناگ کی طرح بل کھاتی ہوئی تارکول کی سڑک پر سے موڑ کاٹ کر جب کار نیچے کچے راستے پر اترنا شروع کرتی ہے تو میں دور سے پہلی نظر ہی میں سانولے زرد چہروں، نحیف جسموں، بجھی بجھی آنکھوں اور جلتے ہوئے ہاتھوں میں لہراتے ہوئے جھنڈوں کو دیکھ لیتی ہوں۔

شام کا گلابی رنگ تاریکی میں تبدیل ہونا شروع ہو گیا ہے اور حد نظر تک روشنی کی کوئی کرن بھی نظر نہیں آ رہی۔ نہ بجلی، نہ لالٹین، نہ دیا اور نہ ہی کوئی الاؤ۔ بہت دور کہیں انسان کے قدم چاند پر بھی پہنچ چکے ہیں اور یہاں میری نظروں کے سامنے موجود انسانوں کے پیر شیشے کی کرچیوں اور پتھروں پر چل چل کر زخمی ہو چکے ہیں، روشنی کی ایک کرن کی تلاش میں۔ جس روشنی کی تلاش میں، میں بڑی آس اور امید سے ان کی آنکھوں میں دیکھتی ہوں، اسی روشنی کی تلاش میں وہ پاگلوں کی طرح ہماری کار کے پیچھے دوڑتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ نعرے لگا رہے ہیں، پوری طاقت سے 'حلق پھاڑ کے'، جیسے اپنے سینے چیر کے وہ نعروں کی مٹھیاں بھربھر کے چاروں طرف پھینک رہے ہوں۔ مگر ان کی آواز دھول اور مٹی سے بچنے کے لئے چڑھائے ہوئے کار کے شیشوں سے ٹکرا کر شبنم کے قطروں کی طرح پھسل جاتی ہے۔ مجھ تک پہنچ رہا ہے تو صرف ایک سناٹا! اس سناٹے کے بھی تو کوئی معنی ہوں گے جو میرے اندر لبالب پھیلا ہوا ہے۔ جواب میں، میں بھی نعرے لگانا چاہتی ہوں مگر میری زبان تالو سے چپک جاتی ہے۔ ہاتھ ہلانا چاہتی ہوں مگر ہاتھ جیسے کسی بھاری چٹان کے نیچے دب چکے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا وجود پتھر بن چکا ہے۔ وقت کی گرد مجھ پر جم چکی ہے اور اس گرد کے نیچے خدا معلوم میں ہوں بھی یا نہیں۔؟

قریب پہنچ کر وہ کار کو گھیر لیتے ہیں۔ افریقہ کے سرپھرے حبشیوں کی طرح ایک ہی تال پر رقص کر رہے ہیں جس میں نہ صرف وجود بلکہ آتما بھی ناچتی ہے سب ورکرز کار میں سے اترتے ہیں۔ باقی ورکرز بھی ان سے ہم آواز ہو جاتے ہیں اور میرا تنہا وجود ان کے ناچتے ہوئے جسموں سے کسی گیند کی طرح ٹکراتا ہے۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر لڑھکتا ہوا۔ دور کہیں مٹی کے کچے گھروں اور جانوروں کے باڑوں میں مچھروں سے بچاؤ کے لئے دہکائی ہوئی آگ کے دھوئیں کی تیز بو میرے نتھنوں میں داخل ہوتی ہے تو میرا سانس جیسے کوئی مٹھی میں لے لیتا ہے۔

(میں اپنے اندر مٹھی میں جکڑے سانس کو آزاد کرانا چاہتی ہوں۔ پھڑپھڑاتی ہوں۔ مگر میرے پر جیسے جھڑ کر زمین پر گر چکے ہیں۔ سانس مٹھی میں جکڑی ہوئی ہے۔ مگر یہ مٹھی کس کی ہے۔ میری؟ نہیں۔ میری کیسے ہو سکتی ہے۔ میرے ہاتھ تو خالی ہیں۔ پھر یہ مٹھی کس کی ہے۔ کسی کی بھی ہو سکتی ہے۔ کس کی --- ؟ مجھ سے زیادہ کسی طاقتور کی! ہاں، کسی مجھ سے بھی زیادہ طاقتور کی اور اسی میں میرا سانس جکڑا ہوا ہے)

(یہ سب لوگ بھی سانس لینا چاہتے ہیں۔ مگر کیا سانس لے سکے ہیں؟ کیا یہ اسی طرح سانس لے سکیں گے جیسے بیکراں نیلے آسمان میں پرندے پر پھیلائے آزادانہ اڑتے ہیں۔ کیا ان کے پر ہیں؟ یا ان کے پر بھی میری طرح جھڑ کر بکھر چکے ہیں۔ پھر یہ رقص کیوں کر رہے ہیں۔ کیا اندر ہی کا کوئی کرب ان سے رقص کرا رہا ہے؟ ہاں، شاید اندر کا کوئی کرب انہیں رقص پر مجبور کر رہا ہے۔ مگر میں رقص نہیں کر سکتی۔ میرا وجود پتھرا چکا ہے اور مجھے پتھرایا ہوا ہی رہنا چاہیے)

نومبر کی اس گیلی اور گدلی شام میں ہم الیکشن کے ورک کے لئے آئے ہیں۔ نامکمل خواہشیں، نامکمل ضرورتیں، نامکمل خواب اور نامکمل آدرشوں کی ایک ختم نہ ہونے والی فہرست ہے جو جھنڈوں کی طرح ان کی آنکھوں میں لہرا رہی ہے۔

(اچانک تیری یاد میرے دل پر دستک دیتی ہے)

تجھے یاد ہے ------!

کئی سال پہلے ایسی ہی کسی گیلی، گھٹی ہوئی اور بوجھل شام میں، اسی دیہات میں تو اور میں آئے تھے۔ الیکشن کے ورک ہی کے لئے تب بھی راستہ اسی طرح کچا تھا ایسی ہی تاریکی تھی۔ یہی زخمی پیر اور نحیف و نزار جسم تھے مگر اس وقت تو اور میں دونوں پرامید تھے اور یہ لوگ زندگی کی ڈور سے ٹوٹ کر موت کی آغوش میں گرنے والے کسی شخص کی طرح بالکل مایوس تھے۔ ان کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ کبھی صبح بھی ہوگی۔ اس پہاڑ جیسی رات کی کوئی انتہا بھی ہو سکتی ہے۔ ایک سکتے کے عالم میں، ٹکٹکی باندھے، منہ کھولے، بت بنے ہمیں دیکھ اور سن رہے تھے۔ تو نے اور میں نے کس کس طرح انہیں یقین نہیں دلایا کہ تمہیں پکے راستے بنوا کر دیے جائیں گے۔ بجلی ملے گی۔ تمہارے پکے گھر بنے ہوں گے۔ سکول کھلیں گے جن میں تمہارے بچے نئی اور روشن صبح کی امید کے ساتھ پڑھیں گے۔ تمہیں راستوں، سڑکوں اور کوٹھوں میں اپنے پیچھے لے کر چلنے والوں کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے۔ تم ہی تو طاقت ہو۔ تمہارے ہاتھوں میں ہی تو اس ملک کا روشن مستقبل ہے۔ آؤ۔ ہمارا --- ساتھ --- دو!

یاد ہے تجھے! جیسے جیسے تیری آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی ویسے ویسے ان کے پتھرائے ہوئے جسم موم کی طرح قطرہ قطرہ پگھلنے لگے تھے۔ آج ان یادوں کو جگ بیت گئے جیسے وہ کوئی سپنا تھا جو درمیان ہی میں ٹوٹ گیا یا ہم ہی نے تھک کر آنکھیں کھول دیں یا شاید آنکھیں کھلی تھیں جنہیں تھک جانے پر ہم نے موند لیا۔ کون جانے کہ وہ خواب تھا یا یہ سب کچھ خواب ہے۔

مجھے یاد ہے کہ تالیوں کی لے پر بے جوڑ آوازوں میں ہم سب مل کر گایا کرتے تھے۔ "یہ جیون سارا سپنا ہے۔ سپنے میں لاکھوں سپنے ہیں۔ یہ جیون سارا سپنا ہے۔" ان لوگوں کی آنکھوں میں بھی سپنے ہیں۔ یہ لوگ، اپنے دیس کے باسی، جانوروں کی طرح زندگی کا بوجھ ڈھوتے ہوئے بھی اس زندگی سے غیر مطمئن۔ اپنے

اورنگ زیب قاسمی

اندر میں دبے ہوئے، پسے ہوئے اور نیم جاں ہوتے ہوئے بھی اس سے انکاری۔ انکار کی یہی طاقت انہوں نے درمیان کے ان برسوں میں حاصل کی ہے جن میں تو نے اور میں نے مایوسی کا زہر اپنی کوکھ میں بھر بھر کے پیا ہے۔ ہم نے سوچا تھا کہ انجام کار کچھ بھی تو نہیں بدلے گا۔ سب کچھ یونہی رہے گا جیسا صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ چہرے بدل جائیں گے مگر سسٹم اسی انداز میں عوام کی محنت اور خون چوس چوس کر انہیں اندر ہی اندر کھوکھلا کرتا رہے گا۔ اور یہ بے چارے لوگ یونہی ہی، ازل سے ابد تک اسی طرح راستوں کے کنارے بیٹھے ہوئے ہاتھ ہلا ہلا کر سلامیاں دیتے رہیں گے۔ لیڈروں کے جتوں میں جان ڈالنے کے لئے نعرے لگاتے لگاتے دم توڑتے رہیں گے۔ جلوسوں میں کسی روبوٹ کی طرح مسلسل پیدل چلتے رہیں گے اور تالیاں بجاتے بجاتے آخر کسی دن ہانپتا ہوا کر بکھر جائیں گے۔ یہ زبونی انہیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی ہے اور یہ سب کرنے کے باوجود ان کے لئے کچھ نہیں بدلے گا۔ زیادہ سے زیادہ قبرستان کا رقبہ وسیع تر ہو جائے گا۔

قبرستان کا رقبہ واقعی کافی وسیع ہو گیا ہے۔ کئی فیصد بڑھ گیا ہے۔ بے کار اور مسترد کر دینے کے قابل زندگی کے ری ایکشن میں ملنے والی موت زیادہ شوخ اور تیز رفتار ہے۔ زندگی اس سے چند قدم بلکہ سینکڑوں قدم پیچھے رہ گئی ہے۔ پھر بھی، اب جبکہ میرے چاروں طرف انسانوں کا انبوہ نعرے لگاتا ہوا، محو رقص ہے تاریکی اور گہری ہوتی جا رہی ہے۔ دھوئیں کی بو اب اور زیادہ تیز ہو چکی ہے اور ان کے سروں سے بھی اونچے جھنڈے اب اور تیزی سے لہرانے لگے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے موت کے سینے میں اب بھی دل دھڑک رہا ہے، غیر محسوس طریقے سے، آہستہ آہستہ مگر میرا دل تو رک سا گیا ہے۔ بالکل ساکت۔ میں ہاتھ اٹھا کر انہیں روکنا چاہتی ہوں مگر ایک ورکر کی آواز پکار بن کر گونجنے لگتی ہے۔

"سنو!"

"سنو!!"

ہماری بات سنو! ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ تمہارے روشن مستقبل کے لئے۔ زندگی کی مسرتوں پر تمہارے حق کے لئے۔ خاموش ہو جاؤ۔ چپ چاپ بیٹھے رہو۔ ہم تم سے کچھ وعدے کرنا چاہتے ہیں۔ سچے۔ نبھائے جانے والے وعدے۔ جنہیں ہم اقتدار میں آنے کے بعد سچا ثابت کر دیں گے۔

"سنو!"

"سنو!!"

ہجوم ساکت ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ بے جان پتھروں کی طرح۔ ان کے کھلے ہونٹ آہستہ آہستہ بند ہوتے جا رہے ہیں اب صرف جھنڈے ہی ہوا میں لہرا رہے ہیں اور بس! ابھی ابھی ہجوم میں بھنبھناہٹ شروع ہو جاتی ہے جیسے شہد کے چھتے پر بہت سی مکھیوں کی بھنبھناہٹ بدن میں سرسراہٹ سی پیدا کر دیتی ہے ویسی ہی میں بھی محسوس کر رہی ہوں۔ میرے ساتھی ورکر جیسے جیسے اس بھنبھناہٹ کو دبانا چاہتے ہیں ویسے ویسے اس میں شدت آتی جاتی ہے۔

"خاموش ہو جاؤ!"

"ہم تو برسوں سے خاموش ہیں مائی باپ! برسوں سے۔ پھر بھی کہتے ہو کہ چپ ہو جاؤ۔" کہانی میں ابھی ابھی ایک بوڑھی آواز ہجوم کے آخری حصے سے ابھرتی ہے اور پھر کھانسی کے دورے میں ڈوب جاتی

ہے۔

سرگوشیاں اس جملے کے بعد اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ تاریکی کی وجہ سے چہرے غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ منظر دھندلاتے جا رہے ہیں۔ صرف آوازیں باقی رہ گئی ہیں۔ " ہم تم سے ووٹ مانگنے کے لئے آئے ہیں۔ اس لئے کہ ہم تمہارے ہی حقوق کے لئے لڑ رہے ہیں جنہیں حاصل کرنا ہی ہماری زندگی کا پہلا اور آخری مقصد ہے " تقریر کی آواز بیچ بیچ میں تالیوں کی گونج میں دب جاتی ہے۔ تقریر کرنے والا ورکر حلق پھاڑ کے اب اور بھی زور زور سے چیخنے کے انداز میں بول رہا ہے۔ جیسے اپنی تنہا آواز کا زور ان لاتعداد آوازوں پر غالب کر دینا چاہتا ہو۔ میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دینا چاہتی ہوں مگر میرے ہاتھ جیسے کسی پتھر کے نیچے دفن ہیں۔

ہجوم میں سے ایک اور آواز ابھرتی ہے۔ کمزور، شکستہ اور تھکی ہوئی آواز شاید نعرے لگا لگا کر بیٹھی ہوئی آواز۔

" بھائی ---- میرا کڑیل جوان بیٹا گزشتہ الیکشن میں تمہارے لیڈر کے لئے لڑتا ہوا بیچ چوراہے پر مارا گیا تھا۔ بس ایک ہی بار تڑپ سکا تھا اور پھر جیسے تھا ہی نہیں ۔ ؟ اس کی خون میں رنگی قمیص میں آج تک رکھے بیٹھا ہوں۔ بولو تو لا کر بھی دکھاؤں۔ اس کی آواز بھرا جاتی ہے۔ ایک پل کے لئے جیسے ہجوم کی سرگوشیوں کا گلا بھی گھٹ جاتا ہے۔

" ہم اقتدار میں آنے کے بعد تمہارے بیٹے کی موت کا معاوضہ ادا کریں گے۔ کسی کی بھی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ " ورکر پھر حلق پھاڑ کر کہتا ہے۔ کچھ لمحوں کے لئے سناٹا ... اور پھر اس سناٹے کو چیر کر ابھرتی ہوئی وہی آواز۔ " جوانی کی موت کا بھی کوئی بدل ہوتا ہے بھائی باپ! اس معاوضے سے میں دوسرا جوان بیٹا خرید سکتا ہوں کیا؟ " ایک ہی تو بیٹا تھا۔ رو رو کر میں اور اس کی ماں آخر اندھے ہو گئے مگر کوئی بھی ہمارے آنسو پونچھنے نہیں آیا۔"

" جن کے لئے لڑتے ہیں، مرتے ہیں، وہ کم سے کم ہمارے آنسو تو پونچھ دیا کریں اور کوئی سکھ دیں نہ دیں ۔" ایک دوسری آواز، ناراضگی کے تاثر میں سلگی آواز۔ فضا پر موت کا سناٹا چھایا ہوا۔ چند لمحوں قبل چیخنے والے ورکر کی آواز بھی جیسے گھٹ کر رہ گئی ہو۔ اصل مسئلہ ہے ہی آنسو پونچھنے کا۔ جو کبھی بھی، کسی نے بھی نہیں پونچھے بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب ہی کسی نہ کسی طرح بیچ چوک میں مارے جا چکے ہیں۔ گزشتہ الیکشن میں اب صرف ان کی خون سے رنگی قمیصیں باقی رہ گئیں ہیں جو اس گہری ہوتی ہوئی تاریکی میں میری آنکھوں کے سامنے لہرائی جا رہی ہیں اور ان میں سے قطرہ قطرہ ٹپکنے والے لہو سے میرے ہاتھ بھیگتے جا رہے ہیں۔ میں اپنے ہاتھوں کو کاندھوں پر اوڑھی ہوئی شال میں چھپانا چاہتی ہوں مگر ایک بار پھر مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھ کسی بھاری پتھر کے نیچے دفن ہیں۔

تجھے یاد ہے اسٹوڈنٹ لائف میں نظریاتی بحثیں کرتے کرتے اپنے گلے میں بیٹھ جایا کرتے تھے، سانس پھول جاتی تھی مگر محسوس یہ ہوتا تھا کہ جیسے آج ہم اپنے نظریات تسلیم کرا کے ہی دم لیں گے۔ انقلابی نظریات، انقلابی آورش، چیخ چیخ کر ہم کہا کرتے تھے۔ " جلا ڈالو یہ ایوان۔ مسمار کر دو یہ محلات، آگ لگا دو ان کارخانوں کو جو محض مزدور کا خون چوسنے کے لئے ہیں۔ جلا دو ان کھیتوں کو جو کسان کو پیٹ بھر اناج تک نہیں دے سکتے۔ ہم اپنے لیڈروں کے لئے اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار ہیں مگر انہیں سامراج کا ایجنٹ نہیں بننے

اورنگ زیب قاسمی

دیں گے۔ یہ دھرتی ہماری ہے اس سے جنم لینے والے سب سکھ ہمارے ہیں۔ ہمارے حوصلے بلند ہیں۔ ہم مرتے دم تک ہار نہیں مانیں گے ---- ہم ---- ہم ---- ہم ---- "

اس وقت تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم ہی کائنات کی سب سے مضبوط طاقت ہیں۔ جسم ہمارے فولاد ہیں اور رگوں میں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ جس کیسے مٹی بن جاتے ہیں اور سمندر کیسے خشک ہو جاتے ہیں اور انسان کے اندر کس طرح خزاں پھیل جاتی ہے ۔ اس وقت اس کا اندازہ ہی نہ تھا کہ دنیا جیسی اس وقت ہے سدا ایسی ہی تو رہے گی۔ کئی برسوں بعد جب تو آخری بار ملا تھا۔ (وہ بھی تو ایسی ہی کوئی سرد ہوتی ہوئی شام تھی۔ ریلوے لائن کے کنارے کنارے خاموشی سے چلتے ہوئے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ہم کچھ بولیں گے تو سچے پچھتا چور ہو جائیں گے۔ میں تیرے اور اپنے اٹھتے ہوئے قدموں کی طرف دیکھتی ہوئی چل رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ آج تو اور میں دونوں بہت تھکے ہوئے ہیں۔ دراصل میں اور تو جس راستے پر چل رہے تھے وہ محض راستہ ہی تھا۔ کسی بھی منزل کی طرف نہ جاتا ہوا رستہ! اس ایک راستے سے سینکڑوں اور راستے نکلتے تھے جن پر ہم لوگ بچھڑتے جا رہے تھے پہلے ایک دوسرے سے اور پھر اپنے آپ سے)

ریلوے لائن کے کنارے کنارے ساتھ چلتے ہوئے تو نے کہا تھا۔ " کون تبدیل ہوا ہے۔ تو اور میں ؟ یا یہ کائنات ؟ "

تو نے کہا۔

" تجھے یاد ہے ..... ؟

میں نے کہا۔

ہاں مجھے یاد ہے۔ کیا تجھے یاد ہے۔

" مگر آج بھی ! مجھے یاد ہے کہ میری مٹھی میں بند یادیں انگلیوں کے بیچ کی درزوں میں سے خود کو چھڑا کر کہیں چلی گئی ہیں اور ہماری آوازیں دور کہیں سے آتی ہوئی دھمکتی ریل گاڑی کے شور میں دب کر گم ہو گئی ہیں۔ ایک دوسرے سے اور پھر اپنے آپ سے۔ چند روز قبل جب تو جیل سے رہا ہوا تھا۔ لمبی تھکا دینے والی اور اذیت ناک قید کاٹ کر۔ پارٹی کے سب مسلمان لیڈر حکومت کی پارٹی میں وزارتیں قبول کر چکے تھے۔ تو نے خالی خالی نظروں سے خلا میں تکتے ہوئے کہا تھا۔ " میں نے اپنی زندگی کے اتنے قیمتی سال آخر کس لئے قربان کئے ؟ کون مجھے یہ سال واپس کرے گا ؟ تم ہی کہو کہ پھر ہم آورشوں کے پیچھے پاگلوں کی طرح کاہے کے لئے بھٹک رہے ہیں۔ اس وقت مجھے اپنی یہ خواہش کتنی حقیر اور بے معنی محسوس ہو رہی ہے کہ کوئی عظیم انقلاب، جادوگر کی چھڑی کی ایک ہی حرکت سے ساری کائنات کو بدل کر رکھ دے گا۔ ہم اپنے الفاظ کیا محض خلا میں اڑاتے رہے ہیں۔ کیا وہ محض ایک ناٹک تھا۔ ایسا ناٹک جس کا مقصد عام آدمی کو جنونی بنا دینا تھا۔ بچارا عام آدمی ہر مرتبہ لڑتا ہوا۔ ہر مرتبہ مرتا ہوا۔ دوبارہ اٹھ کر لڑتا ہوا اور دوبارہ مرتا ہوا اور پھر مسلسل مرتا ہوا، کھیتوں میں، چوراہوں میں، گلیوں میں، فاقوں میں، کرسی کے نیچے، جوتوں تلے، جنگ کے میدان میں، جلوسوں میں، جلسوں میں، نعروں میں، تالیوں اور نعروں کے شور میں مسلسل مرتا ہوا بچارہ عام آدمی۔ میں بھی بس وہی بچارا عام آدمی ہوں! اور یہی تو ثابت ہوا ہے کہ اتنی طویل اور تھکا دینے والی لاحاصل جنگ کے بعد بھی..." ریل کسی جنونی ہو جانے والے آورش کی طرح جیسے دنیا تیاگ کر، مٹھیاں بھینچے، چیختے چلاتے ہوئے

ہمیں اور ہماری آوازوں کو کچلتی ہوئی دوسری طرف دوڑتی چلی جاتی ہے۔

اور آج برسوں کے بعد' میں ایک مرتبہ پھر ویسے ہی " بیچارے عام آدمیوں۔" کے سامنے بیٹھی ہوئی ہوں۔ تو میرے ساتھ نہیں ہے مگر تیرے الفاظ بھی اس جھنجھناہٹ میں جیسے شامل ہو گئے ہیں۔ جھنجھناہٹ نے میرے وجود میں سرسراہٹ سی پیدا کر دی ہے۔ روشنی کرنے کے لئے کار کی لائٹس آن کی جاری ہیں اور اب روشنی بالکل سیدھی ان کے چہروں پر پڑ رہی ہے۔

ورکر بھی حلق پھاڑ کر انہیں مخاطب کرتا ہے۔

" ہم ہی تمہارے ووٹ کے صحیح حقدار ہیں۔ تمہارا ووٹ تم پر زندگی کی مسرتوں کے بند دروازے کھول دے گا۔ تم ہمیں آزما کر تو دیکھو۔ ہم سکول کھولیں گے۔ ہسپتال قائم کریں گے۔ پکی سڑکیں بنوا کر دیں گے۔ بجلی فراہم کی جائے گی۔ تمہارے کچے گھروں کو پختہ بنوایا جائے گا عوام پر ہمیشہ سے ظلم روا رکھنے والی طاقتوں کو کچل دیا جائے گا۔ ہم --- ہم --- تمہارے --- حقوق کی بقا --- اور --- تحفظ --- کے --- لئے"

ورکر کا چہرہ تاریکی میں گم ہے۔ صرف اس کا ہاتھ کار کی روشنی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں کے آگے لہراتا نظر آرہا ہے۔ اچانک ایک ہاتھ اٹھ کر آتا ہے اور ورکر کے لہراتے ہوئے ہاتھ کو کلائی سے مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔ ورکر کی چیختی ہوئی زبان جیسے تالو سے چپک جاتی ہے اور اچانک چھا جانے والے اس سناٹے میں کسی قدر بلند آواز ابھرتی ہے۔

" بکواس کرتے ہو! پچھلے الیکشن میں تم ہی تو آئے تھے۔ تم نہیں تو تمہاری ہی پارٹی کا کوئی دوسرا ورکر ہوگا۔ تم جیسا۔ وہ بھی نہیں ہوگا تو اور کوئی ہوگا۔ ہم تو سکولوں' ہسپتالوں' سڑکوں' مکانوں اور بجلی کے خواب دیکھتے دیکھتے اندھے ہوگئے ہیں۔"

تو بیچارہ عام آدمی اندھا بھی ہو چکا!! یا پہلے ہی اندھا تھا اور اب اسے محض اس بات کی آگہی حاصل ہوئی ہے۔ نابینا آدمی کے محسوس کرنے کی حس نارمل آدمی سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہے اور یہی آدمی کے بلاسٹ ہونے کی سب سے آخری حد ہوتی ہے۔ لوگ اسی آخری حد پر کھڑے ہیں۔ لوگ بلاسٹ ہونے کو ہیں۔ لوگ اندر ہی اندر تپ کر انگارہ ہو چکے ہیں۔ ورنہ میں اور تو یہ سمجھے تھے کہ لوگ اندر سے مر چکے ہیں اور اپنے اندر کے سرداخانوں میں بے جان لاشوں کی طرح پڑے ہوئے ہیں' پڑے رہیں گے۔ لاشیں جن کا کوئی بھی والی وارث نہیں مل سکا ہے۔ خود پر طاری ہوتی ہوئی بیرونی طاقت کے آگے ہتھیار ڈالے جاتے ہیں اور میں نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا ہے کہ اس بیچارے عام آدمی کی آدمیت کو بقا نہیں ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اہم تو وہ جانور ہے جس سے انسان کا ارتقاء ہوا ہے۔ بحیثیت انسان کے اسے کوئی بھی اون کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ خود بھی خود کو انسان تسلیم کرنے کے دکھوں کے بھنور میں چلا جارہا ہے۔ اس کی " انا " مر چکی ہے بلکہ اس کی " انا " تھی ہی کہاں !! اس بازی گر کی طرح جو اپنا سانس روکے' آنکھیں بھینچے' فضا میں بندھی ایک پتلی سی رسی پر قدم قدم چلتا رہتا ہے۔ محض اس لئے کہ نیچے سرکس کے تماشائی اس اذیت کی لذت میں تالیاں بجائیں۔ دراصل تو اور میں بھی تھک چکے ہیں۔ ہم بھی' بہرصورت' فضا میں بندھی ہوئی ایسی ہی کسی رسی پر آنکھیں بند کئے' سانس روکے قدم قدم چل رہے ہیں۔ اور نیچے بیٹھے ہوئے تماش بین تالیاں بجا رہے ہیں۔ تماشا بنا دینے والی اس ذلت پر ہم کبھی طاری ہی نہیں ہو سکے ہیں۔ طویل اور کبھی ختم نہ ہونے والی اس

رسی پر چلتے چلتے ہمیں یہ بھی خبر تھی کہ راستے محض راستے ہی ہوا کرتے ہیں۔ انسان کو محض دوڑانے کے لئے' چلا چلا کر تھکا دینے کے لئے۔ تھکا کر اوندھے منہ پتھریلی زمین پر گرا کر لہولہان کر دینے کے لئے۔

دیگر کئی پارٹی لیڈر بھی وزارتوں پر سودے بازی کر چکے تھے۔ کتنے ہی کارکن ان سمجھوتوں کے پیچھے اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کی خاطروں چل دیے تھے جیسے چوہوں کا غول پائپ بجانے والے کے پیچھے اندھا دھند چل دیتا ہے۔ سمندر میں غرق ہونے کے لئے۔ تجھے غیر معینہ مدت کے لئے پھر جیل بھیج دیا گیا اور میں ..... !! میں حالات کے ری ایکشن میں بے حس بن چکی ہوں۔ یاد ہے مجھے لمبی سڑک پر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے میں دل ہی دل میں تیز تیز باتیں بھی کرتی جاری تھی۔ میری زبان تالو' سے لگے اور دانتوں کے بیچ میں بالکل چپ اور بند ہوتے ہوئے بھی گویا دانتوں میں گھوم رہی تھی۔ پوری نہ ہوتی ہوئی بولنے کی خواہش شدت اختیار کرتی ہوئی۔ تجھ سے باتیں' چادر سے باتیں' دیواروں' چھتوں' خلا اور پاگل سے باتیں۔ عجیب اور کبھی ختم نہ ہونے والی باتیں۔ مگر پھر یہ باتیں آہستہ آہستہ گنگ ہونے لگیں۔ آنکھوں کے گوشوں پر اٹکی رہ گئیں۔ میں نے چپ سادھ لی۔ بالکل چپ۔ اسی چپ میں اپنے لئے میں نے پناہ ڈھونڈلی۔ تو نے کہا تھا۔ " ہم میں فرسٹریشن کے بیج باہر سے لیڈ کئے جاتے ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ کو مزید مضبوط بنانے کے لئے۔ مگر ہم اس فیڈنگ کو اسی وقت قبول کرتے ہیں جب ان کو سمالینے کا خلا ہمارے اپنے اندر پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ لوگ تو ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ سر جھکائے ہوئے' شکر گزار' تھکے ہوئے' کچلے ہوئے' چپ چاپ انہیں کچے راستوں پر چلتے ہوئے۔ آنکھوں میں وہی سکول کے مردہ خواب معلق' کھیتوں میں جانوروں کی طرح رلتے بچے' وہی تاریکی میں اندھوں کی طرح زندگی گزارتے ہوئے۔ ہسپتال کی سیڑھیوں پر دم توڑتے ہوئے۔ عدالتوں کے وسیع برآمدوں میں اپنی پگڑیاں دونوں ہاتھوں پر اٹھائے وکیلوں اور ججوں کے پیچھے منت سماجت کرتے ہوئے۔ ان ہی وعدوں' خوابوں اور ووٹوں کے انبار تلے گھٹ گھٹ کر دم توڑتی ہوئی حالت میں بہرصورت زندہ بیچارے عام آدمی !! سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ ازل سے ابد تک۔ میں اکیلی بھلا کیا کر سکتی تھی۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہ کر سکنے کی یہی اذیت شکلیں بدل بدل کر میرے اندر سر ٹکراتی رہی۔ میرے وجود کی دیواروں سے۔ میں خود بھی تو ضرورتوں' روایتوں' اور سوسائٹی کے اصولوں کی پابندیوں اور حد بندیوں کے درمیان بھٹکتی بھٹکتی کہیں کھو گئی ہوں ..... زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ بن گیا تھا کہ کس طرح اور کسی کی سفارش سے گیس کا پائپ اپنے گھر تک ڈلوا لیا جائے۔ آنکھیں' معلوم نہیں چولہے میں آگ جلاتے جلاتے ایسی سرخ ہوگئی تھیں یا مسلسل جاگنے کی وجہ سے! اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ایسا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے کہ آنکھیں بظاہر کھلی رہیں مگر اندر سے بند ہوں۔ یہی مسئلہ میں نے زبان اور کانوں کے لئے بھی محسوس کیا۔ بس یہی مسائل حل کرتے کرتے برسوں بیت گئے اور یاد بھی نہیں رہا کہ تجھے کتنے برس کی سزا ہوئی تھی؟ اور وہ ساری جذباتی اور انقلابی تقریریں راہ چلتے ہوئے کہیں پرس میں سے گر گئی تھیں اور اس کے ساتھ اور بھی بہت کچھ۔ کبھی کبھی ایک خود غرض قسم کا دکھ کسی ناگ کی طرح پھن پھیلائے اندر آ کر بیٹھ جاتا تھا کہ میں زندگی کی سہولتیں آخر کیوں حاصل نہ کر سکی؟؟۔ کارخانے' بنگلے' شوروم' بلڈنگیں' گاڑیاں شہر کے پوش علاقے اور سب کچھ بھی تو ویسے کا ویسا ہی تھا جن کے خلاف ہم جذباتی تقریریں کیا کرتے تھے۔ ایک سیاسی ورکر' انہیں جذباتی تقریروں کے ذریعے اپنے محرومیوں کے ری ایکشن میں اپنے اندر کا اظہار کرتا ہے اور بہت آگے جا کر' ایک

اورنگ زیب قاسمی

ناکام سیاسی ورکر ثابت ہونے کے بعد' کچھ بھی حاصل نہ کرسکنے کی اذیت تلے' کوئی بھی معاشی انقلاب برپا نہ ہونے اور کوشش کے باوجود غربت کے بھوت سے جان نہ چھڑا سکنے کی صورت میں اسے سارے انقلاب اور سارے آدرش بالکل بکواس محسوس ہوتے ہیں۔ وہی روٹی' کپڑے اور مکان کی جنگ اور مسلسل جنگ کے بعد بھی شکست۔ اور شکست کے بعد بھی جنگ نہ چاہتے ہوئے بھی' زبردستی بھرتی کئے گئے رنگروٹ کی طرح لڑتے رہو کیوں کہ آگے اور پیچھے دونوں طرف موت ہے سو اپنے طور پر میں نے بھی یہی طے کرلیا تھا کہ سب کچھ بکواس ہی ہے سب کچھ مردہ باد۔

آج نومبر کی اس سرد اور گہری تاریکی میں بدلتی ہوئی شام میں ایک بار پھر میں وہیں موجود ہوں۔ بالکل اس طرح جیسے کردار بغیر کسی شعوری کوشش کے تاریخ میں خود کو دہراتے ہیں۔ ایک دوسرا ورکراب کار کی ہیڈ لائٹس میں ہاتھ لہرالہرا کر تقریر کر رہا ہے اور اس سے قبل تقریر کرنے والا ورکر اپنے بے ترتیب سانسوں کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس سے قبل تقریر کرنے والا ورکر اپنے بے ترتیب سانسوں کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جیسے میلوں کا فاصلہ طے کرکے آیا ہو۔ وہ پھولی ہوئی سانس میں مجھے مخاطب کرتا ہے۔ " سنا ہے کسی زمانے میں تم بڑی اچھی تقریر کیا کرتی تھیں۔ لوگوں کا ہجوم جمع ہو جاتا تھا اور خاموشی ایسی کہ سوئی گرے تو اس کی بھی آواز آتی تھی۔ آج کیوں نہیں بولتیں !؟ " میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی ہوں۔ اس سوال کا تو کوئی بھی جواب نہیں ہے کہ میں آج کیوں خاموش ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری زبان اس ہجوم کے پیروں تلے آکر کچلی جارہی ہے۔

" صبح ضرور طلوع ہو گی۔ جمہوریت کی صبح۔ ہم آمریت کو بیچ چوراہے پر سولی چڑھا دیں گے ---- جمہوریت زندہ باد۔ آمریت مردہ باد ۔ آپ کو جمہوریت کو کامیاب بنانا ہے۔ جمہوریت --- آمریت۔ آمریت --- جمہوریت --- آ --- مر --- یت ---- مر --- دہ --- باد --- جمہو --- ریت --- زندہ --- باد --- مردہ --- باد --- زندہ --- باد ۔"

ورکر گلا پھاڑے چلا رہا ہے اور اب اس کے الفاظ معنی کھوتے جارہے ہیں۔ اچانک سات برس کا ایک میلا' گندہ اور نیم عریاں بچہ ہجوم سے نکل کر آتا ہے اور ورکر کا بازو پکڑ کر اس زور سے ہلاتا ہے کہ ورکر کی آواز بیچ ہی میں ٹوٹ کر خاموشی میں بدل جاتی ہے۔ جب کار سڑک سے موڑ کاٹ کر کچے راستے پر اتر رہی تھی تب یہی بچہ ہجوم میں سب سے آگے تھا۔ اس کے ہاتھ میں جھنڈا تھا اور یہ جھوم جھوم کر نعرے لگارہا تھا۔ یہی بچہ' جب کہ کل ہم یہاں سے گزرے تھے تو سڑک کے کنارے جھنڈا تھامے بیٹھا تھا اور ہماری کار کو اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر سلام کیا تھا اور اب ورکر کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ سر اٹھا کر ورکر کی آنکھوں میں یوں جھانکتا ہے جیسے آسمان پر عید کا چاند تلاش کر رہا ہو۔

" آمریت کیا ہوتی ہے ؟ "۔ بالکل اچانک وہ سوال کرتا ہے۔ اسے یہ بتانا' کتنا مشکل ہے کہ آمریت کیا ہوتی ہے۔ کوئی جواب پانے سے پہلے ہی وہ ایک اور سوال کرتا ہے۔ " بھلا جمہوریت کیا ہوتی ہے۔ " اور اسے یہ بتانا کتنا مشکل ہے کہ جمہوریت کیا ہوتی ہے۔ ہجوم میں سے "نعایا" اس کی ماں نکل کر آتی ہے۔ اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ کر اسے واپس ہجوم کی طرف لے جانے کے لئے۔ وہ ماں کی گرفت میں ہجوم کی طرف جاتے جاتے سر گھما کر پوچھتا ہے۔ " بھلا تین وقت کا کھانا ... بھلا پیروں ... کی جوتی ... بھلا ایک جوڑا کپڑوں کا

کون دے گا !؟ آمریت دے گی یا جمہوریت دے گی ؟؟ " آخری لفظ ادا کرتے کرتے وہ تاریکی اور ہجوم میں گم ہو جاتا ہے اور اس کو یہ بتانا کتنا مشکل ہے کہ یہی تو وہ تین چیزیں ہیں جنہوں نے لوگوں کو پاگل بنا دیا ہے یاد ہے تجھے ..... تین گھنٹوں تک پارٹی لیڈر کے پیچھے' بھری دوپہر کے جلوس میں چلتے ہوئے تو نے مجھ سے کہا تھا کہ لوگ لیڈر کے پیچھے نہیں چلتے بلکہ اپنی نامکمل ضرورتوں' اور خواہشوں کے پیچھے دوڑتے ہیں جو ان کے خیال میں لیڈر کی جیبوں میں بھری ہوئی ہیں۔ بچے کے پلٹ جانے کے بعد ہجوم پھر نعرے لگانا شروع کر دیتا ہے اور اپنے سوالوں کا گلا اپنے اپنے ذہن میں گھونٹ کر پھر ناچنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ افریقہ کے سر پھرے حبشیوں کا رقص جس میں وجود ہی نہیں آتما بھی شریک رقص ہوتی ہے۔ خواہشیں اور کبھی بھی نہ پوری ہونے والی ضرورتیں ان کے پیروں میں گھنگرو کی طرح بندھی ہوئی ہیں۔ بچے کا سوال جیسے فضا میں معلق ہو کر رہ گیا ہے۔

تین وقت کا کھانا ؟

پاؤں کی جوتی ؟

ایک جوڑا کپڑے کا ؟

میں چیختے چلاتے اس منظر سے آزاد ہونے کے لئے کہیں بھاگ جانا چاہتی ہوں مگر میرا جسم جیسے پتھر ہو چکا ہے اور میری زبان۔ اس ہجوم کے --- پیروں --- تلے --- کچلی--- جارہی ہے۔

(" ارتقا" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

کون دے گا!؟ آمریت دے گی یا جمہوریت دے گی؟؟" آخری لفظ ادا کرتے کرتے وہ تاریکی اور ہجوم میں گم ہو جاتا ہے اور اس کو یہ بتانا کتنا مشکل ہے کہ یہی تو وہ تین چیزیں ہیں جنھوں نے لوگوں کو پاگل بنا دیا ہے یاد ہے تجھے ..... تین گھنٹوں تک پارٹی لیڈر کے پیچھے' بھری دوپہر کے جلوس میں چلتے ہوئے تو نے مجھ سے کہا تھا کہ لوگ لیڈر کے پیچھے نہیں چلتے بلکہ اپنی نامکمل ضرورتوں' اور خواہشوں کے پیچھے دوڑتے ہیں جو ان کے خیال میں لیڈر کی جیبوں میں بھری ہوئی ہیں۔ بچے کے پلٹ جانے کے بعد ہجوم پھر نعرے لگانا شروع کر دیتا ہے اور اپنے سوالوں کا گلا اپنے اپنے ذہن میں گھونٹ کر پھرنا چنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ افریقہ کے سر پھرے حبشیوں کا رقص جس میں وجود ہی نہیں آتا بھی شریک رقص ہوتی ہے۔ خواہشیں اور کبھی بھی نہ پوری ہونے والی ضرورتیں ان کے پیروں میں گھنگرو کی طرح بندھی ہوئی ہیں۔ بچے کا سوال جیسے فضا میں معلق ہو کر رہ گیا ہے۔

تین وقت کا کھانا؟

پاؤں کی جوتی؟

ایک جوڑا کپڑے کا؟

میں چیختے چلاتے اس منظر سے آزاد ہونے کے لئے کہیں بھاگ جانا چاہتی ہوں مگر میرا جسم جیسے پتھر ہو چکا ہے اور میری زبان۔ اس ہجوم کے --- پیروں --- تلے --- کچلی--- جاری ہے۔

("ارتقا" کراچی)

اورنگ زیب قاسمی

۱۹۹۳ء کے مطبوعہ پاکستانی ادب کا انتخاب پیش خدمت ہے۔

یہ انتخاب اکادمی کے اس اشاعتی پروگرام کا حصہ ہے جس کا مقصد سال بہ سال ادب کی ایک جامع تصویر پیش کرنا ہے تاکہ پاکستانی ادب کی رفتار اور اس کے معیار کا اندازہ ہو سکے اور دوسری اہم بات یہ کہ پاکستانی ادب کی فکری سمت کی روشنی میں قومی تشخص کی ایک جھلک بھی سامنے آجائے۔ اس انتخاب کے حوالے سے ہم عصری فنی تخلیقی سرگرمیوں کی ایک تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں اور ان بنیادی قدروں کی پہچان بھی کر سکتے ہیں جو پاکستانی ادب کی اساس ہیں۔

اکادمی ادبیات پاکستان کے گزشتہ تین برسوں کے انتخاب ادبی حلقوں میں بالخصوص اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے عمومی حلقوں میں جس انداز سے موضوع گفتگو بنتے رہے اس سے ایک فوری یقین اس بات کا ہوتا ہے کہ ادب پڑھا جا رہا ہے اور اس پہ بات بھی ہو رہی ہے۔ کوئی بھی انتخاب ہو اس کو مکمل اور قطعی نہیں کہا جا سکتا۔ اختلاف کی گنجائش رہتی ہیں۔ معیار و میزان کے اتنے رخ سامنے آچکے ہیں کہ اس ضمن میں کسی ایک بات پر متفق ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔